ترتیب

گوشۂ عمیق حنفی

مقالات

کہانیاں

غزلیں

نظمیں

تصویر: سہیل

عمیق حنفی

پیتالیس سال علمی ادبی اشاعت

ماہنامہ

شاعر
بمبئی

جلد ۴۷ ــــــــ شمارہ ۱، ۲

۱۹۷۶ء

مدیرِ اعلیٰ:

اعجاز صدیقی

مشیر خصوصی:

یونس اگاسکر

ادارۂ تحریر و مشاورت

کرشن چندر

ڈاکٹر محمد حسن

ڈاکٹر ظ۔ انصاری

آغا رشید مرزا

ناظم: افتخار امام صدیقی

فون: ۳۵۱۹۰۲

خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ شاعر۔ قصر الادب۔ بمبئی ۴۰۰۰۰۸

منی آرڈر / ترسیلِ زر کا پتہ: ماہنامہ شاعر، مکتبہ قصر الادب پوسٹ بکس نمبر ۴۵۲۶ بمبئی ۴۰۰۰۰۸

زرِ اشتراک

سالانہ ــــ ۱۶ روپے

ششماہی ــــ ۸ روپے

یہ شمارہ ــــ ۲.۵۰ روپے

غیر ممالک ــــ ۳۰ شلنگ

جرعات

کاغذ

	سنہ ۱۹۴۷ء	سنہ ۱۹۷۶ء
سفید کتابی کاغذ	۲۲ روپے فی رِم	۷۰ روپے فی رِم
اخباری کاغذ	۱۸ روپے فی رِم	۵۷ روپے فی رِم
پیکنگ پیپر	۱½ روپے دستہ	۵ روپے فی دستہ

طباعت وکتابت

	سنہ ۱۹۴۷ء	سنہ ۱۹۷۶ء
۲۰×۳۰ فی پتھر یا پلیٹ	۱۲ روپے ہزار	۲۵ روپے ہزار
کتابت	ڈیڑھ اور دو روپے فی صفحہ	تین اور چار روپے فی صفحہ

محصول ڈاک

	سنہ ۱۹۴۷ء	سنہ ۱۹۷۶ء
پوسٹ کارڈ	۱۰ پیسے	۱۵ پیسے
ان لینڈ	۱۵ پیسے	۲۰ پیسے
لفافہ	۲۰ پیسے	۲۵ پیسے
محصول رجسٹری	ایک روپیہ	۲ روپے
منی آرڈر فیس	دو روپیہ سیکڑہ	۲ روپے ۵۰ پیسے
اخبار یا رسالہ پر	۲ پیسے	۵ پیسے

دوسری اقسام کے کاغذ کے نرخوں، لیتھو طباعت کے علاوہ، رنگین بلاک اور ٹائپ کی طباعت، محصول ڈاک، وی۔پی، انشورڈ، تار، بک پوسٹ وغیرہ کی شرحوں میں اسی اعتبار سے بھیانک اضافہ ہوا۔ ایک طرف تو حکومت کی جانب سے ملک سے گرانی ختم کرنے کی پالیسیاں وضع کی گئی ہیں، دوسری طرف نشر واشاعت، علم وادب، تعلیم وترسیل اور سفر کے تمام ذرائع گراں سے گراں تر ہوگئے ہیں۔ جتنا اخبار، جتنا رسالہ اور کتاب کون خریدے۔ بچوں کی تعلیم کا بوجھ کس طرح اٹھایا جائے؟ ملک میں بڑی تعداد تو غریبوں اور اوسط آمدنی والوں کی ہے۔ کاغذ، طباعت، ڈاک کی شرحیں اور ریلوں کا کرایہ بلکہ ضروریاتِ زندگی ہیں۔ ان کی گرانی سے پورا ملک سخت پریشانی میں مبتلا ہے۔

اس سلسلے میں تمام اخبارات ورسائل، کتب خانوں، تعلیمی اداروں اور اوسط آمدنی رکھنے والوں کروڑوں لوگوں کو آواز اٹھانی چاہیے۔ صدرِ جمہوریہ ہند اور وزیر اعظم کو خطوط لکھنے چاہئیں۔ میمورنڈم پیش کرنے چاہئیں۔

ساغر۔ بمبئی۔

شکر ہے کہ "شاعر" نے اپنے سفر کے ۴۷ سال مکمل کرلئے۔ اب سال کے پہلے دو شمارے پیش کئے جارہے ہیں۔ مارچ ۱۹۷۶ء اور ... کے دونوں شمارے بھی تیاری کی منزل میں ہیں۔ جیسے بھی ممکن ہو "شاعر" کی اشاعتوں کو پورا کرنے کی امکانی کوشش کی جارہی ہے۔ دو تین مہینے ہی میں ایک نہایت اہم "خاص نمبر" نکالنے کا منصوبہ بنایا گیا ہے۔ اس کے لئے بیحد قابلِ قدر تخلیقات حاصل کی جاچکی ہیں۔

"شاعر" کی توسیع واشاعت کے سلسلے میں جو قدم اٹھائے گئے تھے ان کے بعد اب تک کسی دوسرے شہر میں کوئی قدم نہیں اٹھا ہے اور ... کی اقدام کمیٹی کا بھی ہنوز کوئی نتیجہ سامنے نہیں آیا ہے۔ "شاعر" کے سلسلے میں ہمدردیوں کے خطوط تو بہت آتے ہیں، مگر اس کے لئے عملی تعاون نہیں ملتا۔ خال خال ہی ایسے ہمدرد ہیں جو اس کی توسیعِ اشاعت میں کبھی کبھی حصہ لیتے رہتے ہیں۔ "شاعر" بدستور اقتصادی مشکلات میں ... ہوا ہے اور اس کا سبب اخراجات کی زیادتی ہے۔

اس نئے سال سے "شاعر" کے زرِ سالانہ میں ڈھے تے ڈیڑھ ایک خفیف سا اضافہ کیا جارہا ہے۔ یعنی اب زرِ سالانہ پندرہ روپے کے بجائے ۱۶ سولہ روپے ہوگا۔ فی کاپی کی قیمت میں بھی صرف دس پیسے کا اضافہ ہے تاکہ ایجنٹوں کو بھیجی جانے والی کاپیوں کے محصول ڈاک کے اخراجات بقدر نصف برداشت کیا جاسکے۔

ہمیں بڑی مسرت ہے کہ نئے سال کے اس شمارہ سے جناب آغا وحید مرزا کو مجلسِ تحریر ومشاورت میں شامل کیا جارہا ہے۔ آغا صاحب دس بارہ سال سے نہایت خاموشی کے ساتھ "شاعر" کی ہمہ جہتی خدمت کررہے ہیں۔ وہ خود ایک ممتاز ادیب ہیں۔ ہندوستان میں ڈپٹی نذیر احمد اور راشد الخیری کے خاندانوں کی آخری یادگار۔ "شاعر" کے تمام خاص نمبروں میں ان کی نثری تخلیقات نے علمی وادبی حلقوں سے خراجِ تحسین وصول کیا ہے۔ اس شمارہ میں ان کی ایک جاندار کہانی شامل ہے۔

گزشتہ ماہ "سیماب اکادمی" کی افتتاحی تقریب بدعنوان "سیماب ..." کے سلسلے میں ادارۂ "شاعر" کے سب ہی لوگ بیحد مصروف رہے۔ ادارۂ شاعر کے کاموں پر بھی اس مصروفیت کا اثر پڑا۔ "شاعر" کی مزید تاخیرِ اشاعت کا ایک ... گزشتہ عصمت چغتائی کی بعض تحریریں بہت دیر سے وصول ہوئیں ... پہلے گوشۂ "عصمت چغتائی" شاملِ اشاعت کردیا گیا ہے۔

غزلیں

ماہر القادری

...دی رہ کو مری بڑھتی ہوئی رسوائی کی
...ک چال تھی اُس آہوئے صحرائی کی

دل کی چوٹیں ہیں ہری رُت بھی ہے پُروائی کی
آخری حد ہے مرے صبر و شکیبائی کی

ہم نے کیا اُن سے بصد عجز و نیاز
...نے بھی بہت حاشیہ آرائی کی

میں نے شکوے نہ کیے ضبط کیا شکر کیا
میں نے آہوں کی جگہ زمزمہ پیرائی کی

...بچھڑے ہوئے شخص کا غم کیا جانو
...پرچھائیں بھی دیکھی نہیں تنہائی کی

دردِ دل کی بھی وہ شدت کہ لبوں پہ دم تھا
وہ تو یہ کہیے ترے غم نے مسیحائی کی

جنوں کو [illegible] کی طلب ہے ماہر
[illegible] ضرورت ہے تماشائی کی

[illegible] ناظم آباد [illegible] پاکستان

اختر سعید

فکر و فن جاگ اُٹھے لوح و قلم جاگ اُٹھے
زندگی جن سے عبارت ہے وہ غم جاگ اُٹھے

لوگ ڈھونڈا کیے آئینوں میں اپنے چہرے
ہم نے پتھر میں بھی جھانکا تو صنم جاگ اُٹھے

یوں بھی کب رات ہمیں چین سے نیند آئی ہے
ہم بھی اے بادِ صبا چلتے ہیں ہم جاگ اُٹھے

آبلہ پا ہی سہی لیکن مری رفتار تو دیکھ
گرد میں سوئے ہوئے نقشِ قدم جاگ اُٹھے

پھر تری بھولی ہوئی راہگزر یاد آئی !
سیکڑوں مرحلے پھر زیرِ قدم جاگ اُٹھے

کتنے زخموں نے اُجالا کیا پھر سینے میں
کتنے مہتابِ سرِ شامِ الم جاگ اُٹھے

پھر ہوئی رات تری یاد نے نشتر [illegible]
[illegible] ڈوبے ہوئے تارِ غم جاگ اُٹھے

○ [illegible] بھوپال



گوشۂ
11 20
17 31
19

خاکہ

عمیق حنفی ۔۔۔ آدمی در آدمی

مجتبیٰ حسین

۲۷ رشیودی ہاؤس ۔ کیننگ ۔ روڈ نئی دہلی ۱

...درآباد میں عمیق حنفی کے ایک دوست تھے مجاہد انصاری۔ ...ق حنفی کے کچھ اتنے ناقابلِ علاج مدّاح تھے کہ ہر دوسرے تیسرے ...ر بعد کہتے "عمیق حنفی بڑے قادر الکلام شاعر ہیں"۔ اس میں کوئی کلام ...کہ میں بھی عمیق حنفی کو قادر الکلام شاعر سمجھتا ہوں۔ لیکن قادر الکلامی کا ...ب یہ تو نہیں کہ ہر دوسرے تیسرے جملے کے بعد عمیق حنفی کا ذکر کیا جائے۔ ...ن بات کا رُخ پھر عمیق حنفی کی قادر الکلامی کی طرف ہونے لگا تو ...ے مجاہد انصاری کو ٹوکتے ہوئے کہا "میں بھی عمیق حنفی کا قائل ہوں، ...انہیں صرف قادر الکلام شاعر سمجھتے ہو، میں تو انہیں عبد القادر الکلام ...سمجھتا ہوں"۔ اُس دن کے بعد سے انہوں نے پھر کبھی عمیق حنفی کے ...۔۔۔ "قادر الکلامی" کو زحمت دینے کی کوشش نہیں کی۔

...وقت تک میں بھی عمیق حنفی کی چیدہ چیدہ نظمیں اور غزلیں ...رسالوں میں پڑھ چکا ہوں۔ مگر کبھی "قادر الکلامی" سے ملنے کی ...ی آئی تھی۔ البتہ تین چار رسالوں میں ان کی ایک ہی مطبوعہ ...مختلف رسالوں میں مختلف اوقات میں نظر سے گزر چکی تھی۔ اور ...کچھ ایسی تھی کہ اُسے دیکھنے کے بعد عمیق حنفی سے ملنے کو جی نہیں ...تھا۔ یہ میں اس تصویر پارینہ کی بات کر رہا ہوں جس میں عمیق حنفی کا ...حسن کی تہمت سے پاک تھا۔ اُن کی تصویر کو دیکھ کر یوں معلوم ...جیسے آپ جزیرہ نمائے عرب کے نقشے کو دیکھ رہے ہوں، بلکہ غور سے ...دیکھئے تو اس میں کہیں کہیں عرب کا صحرا بھی صاف دکھائی دیتا تھا۔ ...چہرہ ...اور کرخت چہرہ۔ دیسے اب بھی عمیق حنفی کے چہرہ ...میں ... لگ آنے کے باوجود آپ اُن کے چہرے ...کو دیکھ کر جزیرہ نمائے عرب کا خیال آجاتا ہے۔ فرق صرف ...داڑھی کے ... کا چہرہ عرب کے جغرافیے سے قریب تھا۔

اور اب داڑھی کے بعد یہ عرب کی تاریخ اور تمدّن سے قریب ہوگیا ہے۔ اور تاریخ و تمدّن کی چونکہ جغرافیے سے زیادہ اہمیت ہوتی ہے۔ اس لئے اُن کا چہرہ اب قابلِ قبول سا بن گیا ہے۔

مجھے یاد ہے کہ ۱۹۶۹ء میں دہلی ریڈیو اسٹیشن پر "قادر الکلامی" سے میری پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ سلام مچھلی شہری نے میرا تعارف ان سے کرایا تھا۔ وہ اس وقت عجلت میں تھے۔ اور کہیں جا رہے تھے۔ تعارف کے بعد قسمت میں اُن سے مصافحہ کرنا تو لکھا ہی تھا۔ مگر انہوں نے مجھ سے کچھ اس طرح مصافحہ کیا جیسے بجلی کے تار کو چھونے جا رہے ہوں۔ ایک سکنڈ مصافحے کے نام پر وہ مجھے چھو کر یوں چلے گئے، جیسے واش بیسن میں انہیں اپنے ہاتھوں کو دھونے کی جلدی ہو۔ وہ اپنی اُن چھوٹی چھوٹی ٹانگوں کی مدد سے جو بڑی مشکل سے زمین تک پہنچ رہی تھیں، تیز تیز چلتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئے۔ یہ تک نہیں کہا کہ "مجھے آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی"۔ یہ سب کچھ اس قدر آناً فاناً ہوا جیسا کہ عام طور پر بجلی کے فلک میں ہوتا ہے کہ میں بھونچکا سا رہ گیا۔ سلام مچھلی شہری نے میرے اندرونی تاثرات کو بھانپ کر ہنستے ہوئے کہا "انھیں لوگوں سے مل کر خوشی نہیں ہوتی"۔ اور میں نے کہا "اور لوگوں کو بھی ان سے مل کر کہاں خوشی ہوتی ہے"۔ پھر بڑی دیر تک سوچتا رہا کہ کیا واقعی "قادر الکلامی" ایسی ہی ہوتی ہے۔

پھر ہم ریڈیو اسٹیشن کی سیڑھیوں سے اُتر کر آنے لگے تو دیکھا کہ عمیق حنفی اپنے پستہ قد کو زمین سے گھسیٹتے ہوئے چلے جا رہے تھے۔ پستہ قد لوگوں کو میں ہمیشہ مشورہ دیتا ہوں کہ وہ زمین پر کم سے کم چلیں۔ قدرت نے جتنا بھی قد دیا ہے اُس کی جی جان سے حفاظت کریں۔ اگر خدانخواستہ پستہ قد کثرتِ استعمال سے گھس گھسا گیا تو زمین پر آرہا...

کی بجائے ٹوپی چلے گی۔ غالباً اس بے لطف ملاقات کا نتیجہ تھا کہ جوں جوں اُنھیں دیکھتا گیا مجھے اُن کی چال ڈھال میں مزاحیہ گوشے دکھائی دینے لگے۔ اگرچہ جانتا تھا کہ کسی کی جسمانی ساخت کا مذاق اڑانا اچھے مزاح کا شیوہ نہیں ہے۔ مگر میں تو اُس وقت اندر سے جلا بُھنا تھا۔ کبھی کبھی بیسویں صدی کے آدمی میں دو ہزار سال پہلے کا آدمی بھی تو جاگ پڑتا ہے۔

۱۹۷۲ء میں جب میں مستقل طور پر دہلی آگیا تو مجھے احساس تھا کہ دہلی میں "بجلی کا ایک شاک" بھی موجود ہے۔ قسمت کا کھیل دیکھئے کہ میں افسانہ نگار آمنہ ابوالحسن کے کرزن روڈ والے مکان میں رہنے لگا تو پتہ چلا کہ عمیق حنفی کا گھر بھی اسی روڈ پر ہے۔ اور یہ ہے کہ وہ مجھ سے stone throw کے فاصلہ پر رہتے ہیں۔ اس stone throw کے فاصلہ کو ناپنے کے لئے کبھی کبھی واقعی جی چاہا کہ پتھر پھینک کر تو دیکھوں کہ آیا یہ عمیق حنفی کے لگتا ہے یا نہیں۔ اب بھلا بتائیے یہ کیسے ممکن تھا کہ دو آدمی ایک ہی روڈ پر رہتے ہوں اور کبھی اُن کا آمنا سامنا نہ ہو۔ یوں بھی دریا میں رہ کر مگر مچھ سے بیر رکھنا کوئی اچھی بات نہیں ہے۔ ابتدا میں کئی دنوں تک جب بھی مجھے سامنے سے "جزیرۂ عرب" آتا ہوا دکھائی دیتا تو میں فوراً پنواڑی کی دکان پر سگریٹ خریدنے کے لئے چلا جاتا اور جزیرۂ عرب کے گزرنے تک سگریٹ ہی خریدتا رہتا۔ لیکن ہر آدمی کی ایک قوتِ خرید بھی ہوتی ہے۔ ایک دن بالآخر اُن سے ملنا ہی پڑا۔ البتہ احتیاط یہ برتی کہ مصافحہ نہیں کیا۔ پھر اُن سے بغیر مصافحہ والی باضابطہ ملاقاتیں ہونے لگیں اور رفتہ رفتہ مجھے اُن سے مل کر خوشی ہونے لگی۔ میں یہ نہیں جانتا کہ اُنہیں بھی مجھ سے مل کر خوشی ہوتی ہے یا نہیں۔ یوں بھی آج کی دنیا میں خوشی کے معاملے میں آدمی کو خود غرض ہونا چاہئے۔ دوسرے کی خوشی جائے بھاڑ میں، مجھے کیا لینا دینا۔

مجھے ان تین برسوں میں عمیق حنفی کو مختلف زاویوں سے دیکھنے کا موقع ملا ہے۔ عمیق حنفی اصل میں کئی اچھے بُرے عمیق حنفیوں کے مجموعہ کا نام ہے۔ شاعر عمیق حنفی، تاریخ داں عمیق حنفی، فلسفہ شناس عمیق حنفی، ناقد عمیق حنفی، ریڈیو کے فیچر نگار عمیق حنفی، ہندی اور سنسکرت کے ماہر عمیق حنفی، مذہب پرست عمیق حنفی، سیکولر عمیق حنفی، مُنہ پھٹ عمیق حنفی، مقروض عمیق حنفی، پریشان حال عمیق حنفی، عجیب عمیق حنفی، غریب عمیق حنفی۔ جس شخص کی ذات میں اتنے سارے عمیق حنفی ہوں۔ اس سے ملتے ہوئے عموماً بڑی پریشانی ہوتی ہے۔ اکثر ایسا ہوا کہ میں "شاعر عمیق حنفی" سے ملنے گیا اور وہاں گیا تو دیکھا کہ "مقروض عمیق حنفی" بیٹھے ہیں۔ کبھی ناقد شاعر بھی

عمیق حنفی سے ملنے کے ارادے سے نکلا اور ملاقات ہوئی مذہب پرست عمیق حنفی سے۔ ایک آدمی کی ذات میں اتنے سارے آدمی جیسے عرب کی سالم عمیق حنفی کچھ over populated سے لگتے ہیں۔ نشا[illegible] کے بعد عموماً اس قسم کے انسانوں کی نسل ناپید ہوتی جا رہی ہے۔ غلطی سے دو چار پیدا ہو جاتے ہیں تو بالآخر لوگ اُن کا بھی "عمیق حنفی" بنا ڈا[لتے] ہیں۔ ادب، فلسفہ، آرٹ، سیاست، تاریخ، تنقید، لسانیات اور [illegible] کا شاید ہی کوئی ایسا شعبہ ہوگا جس کے بارے میں عمیق حنفی ضروری اور غیر ضروری، جائز اور ناجائز، اہم اور غیر اہم معلومات نہ رکھتے ہوں۔ جب "ریفرنس" لائبریری" بن جائے تو پھر لوگ اس کے ساتھ وہی سلوک کرتے ہیں جو عموماً لائبریریوں کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ [illegible] اور عمیق کے ایک مشترکہ دوست ہیں جنھیں "علم" حاصل کرنے کا نہ صرف شوق بلکہ ہوکا ملا ہے۔ جب تک دہلی میں رہے، ہر دوسرے تیسرے دن میرے پاس آتے اور کہتے "چلو یار! آج ذرا عمیق حنفی سے اکتساب کریں۔ تین دن سے دماغ میں ایک بھی نیا خیال نہیں آیا۔" ڈیڑھ [سال] تک وہ دہلی میں رہے اور وہ وقفہ وقفہ سے عمیق حنفی کے سامنے زانوئے ادب تہ کرتے رہے۔ اور جب جانے لگے تو اپنا زانو اپنے ساتھ لے گئے اور ادب کو پھر عمیق حنفی کے پاس چھوڑ گئے۔

بحیثیت شاعر میں عمیق حنفی کو اس لئے پسند کرتا ہوں کہ وہ ملنے والوں کو اپنے شعر نہیں سُناتے۔ دوسروں کی بات چھوڑئے مجھے شبہ ہے کہ وہ خود کو بھی اپنے شعر نہیں سناتے ہوں گے۔ میں نے ایسے شاعر بھی دیکھے ہیں جو "اسلام علیکم" کا جواب "عرض کیا ہے" سے دیتے ہیں۔ ان تین برسوں میں ایک واقعہ بھی مجھے ایسا یاد نہیں جب عمیق حنفی نے خود سے اپنا کوئی شعر سُنایا ہو۔ اُنہیں شعر سنانے پر آمادہ کرنے کے لئے عموماً وہی کچھ کرنا پڑتا ہے جو ستمگر شکاری کے لئے شکاریوں کو خصوصاً شیر کے ساتھ کرنا پڑتا ہے۔ اسی لئے جب کبھی اُن کی نظمیں سُننے کا موقع ملتا ہے تو میں اکثر دوستوں سے کہتا ہوں "بھئی! ہم کل شکار پر گئے تھے عمیق حنفی کی چند نظمیں [illegible]"

عمیق حنفی کی ایک اور خوبی یہ ہے کہ ہمیشہ غلط موقع پر صحیح [بات کہہ] دیتے ہیں۔ اور نتیجہ میں اپنے دشمنوں کی تعداد میں اضافہ کر لیتے [ہیں]۔ اس معاملہ میں اُنہیں ایسا ملکہ حاصل ہے کہ اچھے خاصے فضا کو آن کی آن میں درہم برہم کر دیتے ہیں۔ زندگی کے دو ہم [illegible]

نہیں تک اس کا حاصل کرنے کا یہ آسان طریقہ نہیں آیا کہ ہمیشہ صحیح وقت پر غلط نہ ہو جائے۔ اسی لئے بہت سے ادیب اور شاعر اُن سے کبھی اپنے بارے میں رائے نہیں پوچھتے۔ دُور کیوں جائیے۔ خود میرا شمار بھی ایسے ہی افراد میں ہوتا ہے۔ میں نے آج تک اُن سے کبھی اپنے بارے میں رائے نہیں پوچھی۔ البتہ ایک بار جب میری کتاب چھپ کر آئی تو میں نے بالواسطہ طور پر اُن کی رائے جاننے کے لئے ایک ترکیب نکالی اور اُن سے خواہش کی کہ وہ اُس کی رسمِ اجرا انجام دیں۔ انہوں نے رسمِ اجرا تو انجام دی مگر رائے ہرگز نہ دی۔ اُنکی تقریر میں ہر طرف تقریر ہی تقریر تھی، رائے بالکل نہیں تھی۔ اُن کی تقریر میں سے رائے کو تلاش کرنا ایسا ہی ہے جیسے روئی کے ڈھیر میں سوئی کو تلاش کیا جائے۔ پھر بھی میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ انہوں نے میرے بارے میں کوئی رائے نہیں دی۔ یہی بہت بڑی بات ہے ورنہ صحیح رائے دینے کے معاملہ میں وہ تو ...وں کا سا جوش و حوصلہ رکھتے ہیں۔ ایک بار ایک افسانہ نگار نے انہیں اپنا افسانہ سُنایا۔ افسانہ ختم ہوا تو افسانہ نگار نے عمیق حنفی کی رائے پوچھی۔ عمیق حنفی نے افسانہ نگار سے کہا "پہلے اپنا دایاں ہاتھ افسانہ کی دائیں جانب رکھئے اور پھر بایاں ہاتھ بائیں جانب۔ پھر افسانہ کو زور سے پکڑ کر بائیں ہاتھ کو مضبوطی سے اپنی جگہ پر قائم رکھئے اور دایاں ہاتھ افسانہ سمیت اپنی طرف کھینچئے۔" عمیق حنفی کی اس جیومیٹریکل رائے کا آسان مطلب یا ترجمہ یہ تھا کہ افسانہ کو پھاڑا جائے۔ اپنے سامنے بیچارے افسانہ نگار سے اُس کے افسانہ کے پُرزے پُرزے کروائے۔ پھر ازراہِ احتیاط یہ بھی پوچھ لیا کہ کہیں تمہارے گھر میں اِس کی فاضل کاپی تو نہیں ہے۔ نفی میں جواب ملا تو یوں مطمئن ہوگئے جیسے ادب پر سے ایک بہت بڑا خطرہ ٹل گیا۔

بہت سے شاعر اور ادیب ان کی شاعری اور علمیت سے متاثر ہو کر اُن کے پاس اپنے کلام کے مجموعوں کے مسوّدے اس لئے بھیجتے ہیں کہ وہ اُن پر "مقدمہ" لکھ دیں۔ پہلے یہ مسوّدے منگوا لیتے ہیں۔ اُن پر ایک نظر ڈالتے ہیں۔ پھر مسوّدے کو ایسی محفوظ جگہ رکھ دیتے ہیں جہاں کسی کا ہاتھ نہ پہنچ سکے۔ بیچارے غرضمند شاعر اور ادیب بہت دنوں تک ان سے "مقدمہ" مانگتے ہیں، وہ انہیں نہیں دیتے۔ پھر آخر میں جب شاعر تھک ہار کر اپنا مسوّدہ مانگتا ہے تو وہ بھی اُسے نہیں دیتے۔ میں نے بہت سے شاعروں کو ان کے گھر "مقدمہ" اور "مسوّدے" کے پھیر میں چکّر لگاتے دیکھا ہے۔ بعض اوقات تو عمیق حنفی کے قرض خواہوں اور مسوّدوں کی واپسی کے متمنی شاعروں میں تمیز کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ کیونکہ دونوں کے مانگنے کا انداز ایک ایسا ہوتا ہے۔

شاعر بیچ...

اس معاملہ میں عمیق حنفی کا استدلال یہ ہے کہ بات یہ ہے۔ اشاعتِ کلام کو اگر ہر مقدمہ نگار "مقدمہ" کے اسٹیج پر ہی روک لے تو ادب میں اتنی افراتفری نہیں پھیلے گی۔

عمیق حنفی جب بھی کسی شاعر کا خراب کلام سُنتے ہیں تو اُن کی رائے زبان پر آنے سے پہلے اُن کے چہرے پر نمودار ہو جاتی ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے انہوں نے ارنڈی کا تیل پی رکھا ہو۔ غلط بات، غلط حرکت اور غلط خیال پر یوں جھپٹتے ہیں جیسے بلّی چوہے پر۔ اس سے عمیق حنفی کو ایک فائدہ ضرور حاصل ہوتا ہے کہ ہر ایرا غیرا اُنہیں اپنا کلام نہیں سُناتا۔

اُن کے سماجی روّیے بھی عام آدمی کے روّیوں کی سے بہت مختلف ہوتے ہیں۔ اُن کے روّیوں کے بارے میں قبل از وقت اندازہ لگانا بہت مشکل کام ہے۔ اس معاملہ میں اُنکی حالت اس جاٹ لاری ڈرائیور کی سی ہوتی ہے جو ہاتھ بتلائے بغیر اچانک اپنی لاری سیدھی جانب یا بائیں جانب موڑ دیتا ہے۔ ابھی دو برس پہلے کی بات ہے کہ اترپردیش اردو اکاڈمی نے اُن کی ایک کتاب کو ڈیڑھ ہزار روپئے کا انعام دینے کا اعلان کیا۔ دن میں مجھے اس کی اطلاع ملی اور شام میں کناٹ پلیس پر عمیق حنفی مل گئے۔ اب ایسے موقعوں پر نارمل آدمی دوسرے نارمل آدمی کو مبارکباد تو دیتا ہی ہے۔ لہٰذا میں نے انہیں انعام کی مبارکباد دیدی۔ اس کے جواب میں ان کے چہرے پر اچانک ایسے آثار نمودار ہونے لگے جو عموماً مرگی کے مریض کے چہرے پر مرض کے حملے کے وقت نمودار ہوتے ہیں۔ پھر یکایک انہوں نے ہاتھ بتائے بغیر اپنی لاری کو موڑتے ہوئے کہا "گالی دینے کے اور بھی کئی مہذب طریقے شرفا نے ایجاد کر رکھے ہیں۔ اس انعام کی مبارکباد دے کر مجھے گالی کیوں دے رہے ہو۔" اب میں حیران کہ یہ کیا معاملہ ہے۔ میں نے مزید کوئی بات نہیں کی، البتہ ان کے ساتھ جو دوست اُس وقت موجود تھے۔ اُن سے پتہ چلا کہ موصوف نے ازراہِ کرم اترپردیش اُردو اکیڈمی کو یہ انعام واپس کر دیا ہے۔ جب ہم کناٹ پلیس سے واپس ہونے لگے تو عمیق حنفی نے مجھ سے کہا "بھئی میں شدید مالی بحران سے گزر رہا ہوں۔ آپ کچھ بندوبست کیجئے۔" میں نے کہا "قدرت آپ کے لئے بندوبست کرنا چاہتی ہے مگر آپکو یہ بندوبست منظور نہیں ہے۔ میں بھلا کیا بندوبست کر سکتا ہوں۔" لاکھ سمجھایا کہ فی الحال اس انعام کو لے کر اپنے مالی بحران اور قرض خواہوں کا منہ بند کیجئے۔ بعد میں اترپردیش اکیڈمی کو قسطوں میں یہ انعام واپس فرما دیجئے گا۔ اکیڈمی آپ کے منہ کبھی نہیں لگے گی۔

لیے " مانا کہ اکیڈمی سود نہیں لے گی لیکن مجھے " ڈیڑھ ہزاری منصب داروں کے زمرے میں کھڑا کر دے گی ۔ یہ سود سے زیادہ نقصان دہ سودا ہے ۔ قرض خواہ سے قرض لینے کا فائدہ یہ ہے کہ وہ صرف سود سے مطلب رکھتا ہے ۔ میری ادبی قد و قامت کے راستے میں حائل نہیں ہوتا " اس کے بعد وہ قرض خواہ اور اتر پردیش اردو اکیڈمی کے فوائد و نقصانات کی طویل فہرست کچھ اس طرح پیش کرتے رہے جیسے جغرافیہ کے پرچے میں دکن کے دریاؤں اور شمالی ہند کے دریاؤں کا تقابل کر رہے ہوں ۔ بعد میں وہ شدید مالی بحران سے گزرتے رہے لیکن انعام کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا ۔

قبل اس کے کہ میرا حافظہ کمزور ہو جائے یہاں ان کی یادداشت کی جانب بھی کچھ اشارہ کرنا چاہتا ہوں ۔ غیر شخصی واقعات کو ان کا حافظہ بڑی خوشی سے قبول کر لیتا ہے اور شخصی واقعات کو قبول کرنے کے معاملے میں ان کا حافظہ بالکل اڑیل ٹٹو بن جاتا ہے ۔ انہیں عربوں کے ہندوستان آنے کی تاریخ ، رومیوں کے زوال کے اسباب اور دنیا بھر کے فلسفیوں کے نظریات تو اچھی طرح یاد رہتے ہیں ، لیکن انہیں کسی دوست کے اپنے یہاں آنے کی تاریخ ، خود اپنے زوال کے اسباب اور اپنے اچھے بھلے شعر یاد نہیں رہتے ۔ یہی وجہ ہے کہ کسی صاحب سے بڑی گرم جوشی سے مل تو لیتے ہیں لیکن بعد میں پتہ چلتا ہے کہ جسے انجینئر سمجھ کر مل رہے تھے وہ بعد میں ڈاکٹر بن گیا ۔

ایک بار حیدرآباد سے ایک نوجوان ان سے ملنے آیا ۔ انہوں نے سمجھا کہ یہ وہی نوجوان ہے جس نے حیدرآباد میں قیام کے دوران ان کی بڑی خاطر مدارات کی تھی ۔ بڑی گرم جوشی سے ملے ۔ پھر شکایت کی کہ آپ نے خط نہیں لکھا ۔ نوجوان نے حیرانی سے پوچھا " حنفی صاحب ! آپ نے مجھے پہچانا ہے ؟" بولے " کیسے نہیں پہچانوں گا ۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ آپ سے حیدرآباد میں ملاقات ہوئی تھی ۔"

اس پر نوجوان نے کہا " صاحب ! میں آپ کے حافظہ کی داد دیتا ہوں ۔ حیدرآباد میں جس جلسے کو آپ نے مخاطب کیا تھا اس میں سامنے کی ایک نشست پر میں بیٹھا تھا ۔ آپ سے دو ایک بار نظریں چار ہوئی تھیں ۔ پھر جلسے کے بعد جب آپ جانے لگے تو میں نے بھیڑ میں آپ سے مصافحہ بھی کیا تھا ۔ مجھے حیرت ہے کہ اس کے باوجود آپ نے مجھے یاد رکھا ۔ ایسا تیز حافظہ میں نے بہت کم لوگوں کا دیکھا ہے ۔" نوجوان کہے جا رہا تھا اور عمیق حنفی بڑے شاطر بنے

معصوم نے اپنے حافظے کی گرفت کی داد وصول کی [illegible] ہو رہے تھے کہ کسی کو خبر [illegible] [illegible] بڑی اول جلول حرکتیں کرتے [illegible] کہ مجھے نہیں ہے ۔ دہلی میں کتنے برس ہو چکے ہیں لیکن انہیں یہ [illegible] بالکل نہیں معلوم ۔ اسی لئے جنوبی دہلی جانے کے [illegible] ہے ۔ غلطی سے شمالی دہلی میں پہنچ کر دم لیتے ہیں ۔ کہیں جانا ہو تو حنفی " بنا ڈالتے اوپر سراسیمگی طاری کر لیتے ہیں ۔ سراسیمگی ان [illegible] لسانیات اور ادب کی حیثیت رکھتی ہے ۔ اسی سراسیمگی کے تحت ایک ہی ضروری امر کے لئے نکلے تو اپنے گھر کی مانوس سڑک کو عبور کر رہے تھے ہوں ۔ [illegible] راہ گیر سے پوچھ بیٹھے " کیوں بھئی ! کیا یہ [illegible] ساتھ دہی سڑک

اس سراسیمگی کا ایک اور واقعہ سن لیجئے کہ [illegible] اور عمیق حنفی " اقبال سیمینار " میں شرکت کے لئے حیدرآباد والے [illegible] کا نہ صرف شوق کا ریزرویشن یہ بالکل نہیں کروا سکتے ۔ اس [illegible] تیسرے [illegible] ریزرویشن کروا دیا ۔ پھر یہ سوچ کر کہیں یہ کرہ سے اکتساب علم حیدرآباد کے راستہ کا پتہ نہ پوچھنے لگ جائیں آیا " ڈیڑھ [illegible] پر بٹھایا اور واپس چلا آیا ۔ حیدرآباد میں انہوں نے حنفی کے سامنے پڑھا ۔ جب دہلی واپس آئے تو میں ان سے [illegible] تو اپنا زانو اپنے ساتھ بیٹھے ہیں ۔ اداسی کی وجہ پوچھی تو کہنے لگے [illegible] گئے ۔ میرا سوٹ کیس چرا لیا ۔ اسی میں میرا [illegible] پسند کرتا ہوں کہ وہ کم [illegible] کا شکر ہے کہ اقبال پر جو مقالہ لکھا تھا وہ محفوظ ہے بات چھوڑئیے اُدھر کا حذف کرنے کے بعد بتایا " تب بھی یہ سفر [illegible] ہوں گے ۔ وہ کیونکہ سیمینار والوں نے [illegible] ۹ روپئے دیئے تھے [illegible] جواب " عرض کیا ہے اس کی مالیت ۔ ۹۸ روپئے کی ہوتی ہے ۔ [illegible] مجھے ایسا یاد نہیں خلاصہ سنا " یہ کہہ کر انہوں نے وہ کاغذ میری جانب بڑھا [illegible] انہیں شرمندگی پرانے سوٹ کیس ، پرانے سوٹ ، پرانے تولیہ اور اقبال پر [illegible] شکار کے مضامین کی رائج الوقت قیمتیں درج تھیں ۔ یہ ان لوگوں میں [illegible] اسی لئے بربادی کا جہاز بھی خود ہی ڈھونڈتے ہیں اور جب جہاز [illegible] سے خوش ہو جاتے ہیں جیسے " گوہر مقصود " حاصل ہو گیا [illegible]

عمیق حنفی کو جب بھی میں نے دیکھا مالی پریشانیوں [illegible] ایک حقیقت ہے کہ مالی پریشانیاں قسمت کا عطیہ ہوتی ہیں ، مگر بقول [illegible] پریشانیاں ان [illegible] " مرہون منت " ہوتی ہیں ۔ [illegible]

عمیق حنفی سے ایک ملاقات

ناصر الدین خان

لکچرار - ایس سی آر ٹی - شری آربندو مارگ - نئی دہلی - ۱۶

انہیں ٹھیک ...

... ہلے۔ ایک ...

... رائے نہیں پوچھی

... ہے۔ میں نے آج ...

البتہ ایک بار جب میری کتا...

جانے کے لئے ایک ترکیب

انجام دیا۔ انہوں نے ...

ہر طرف تقریر ہی تقریر تھی

کو تلاش کرنا ایسا ہی ہے ... عمیق صاحب سے میری شناسائی پانچ سال پرانی ہے۔
پھر بھی میں نے خدا کا شکر ہے ان کا کلام ہوش سنبھالتے ہی پڑھنا شروع کر دیا تھا۔ ان پانچ
نہیں دی۔ یہی نسبت بڑی رہی ان کا کلام سنا ہے اور ان سے مختلف ادبی اور غیر ادبی
... کا سا جوش و حوصلہ ... گفتگو کی ہے حد یہ ہے کہ خود اپنا کلام کبھی ان کو سنایا ہے۔
اپنا افسانہ سنایا۔ افسانہ ختم ہوا ... تحمل کی ایک نادر مثال ہے۔ شاعری کے علاوہ ان کی دلچسپی
عمیق حنفی نے افسانہ نگار سے ... مجھے بہت متاثر کیا ہے۔ حال ہی میں ماہنامہ شاعر بمبئی

پہلے پہل یہ احساس کب ہوا کہ شعر کہنا چاہیئے؟

عمیق حنفی: پڑھنے اور سننے کی حد تک شاعری میں دلچسپی بہت پہلے سے رہا ہے۔ میں چاہوں گا اس بظاہر رسمی سوال کا جواب بہت غیر رسمی انداز سے اور قدرے تفصیل سے دیا جا سکے۔ میرا ننھیال ہے۔ انگریزوں کی بہت بڑی چھاؤنی رہا ہے۔ اس لئے فوج میں اور فوجی اداروں میں یوپی، بہار، پنجاب، حیدر آباد،

رکھئے اور پھر بایاں ہاتھ باہر ...

کو مضبوطی سے اپنی جگہ پر ...

کھینچئے: عمیق حنفی کی اس ...

کہ افسانہ کو پھاڑا جائے ...

کے پرزے پرزے کر دئے

کمرے میں اس کی ...

ہو گئے جیسے اب ...

بہت سے شاعر ...

کے پاس اپنے کلام کے ...

لکھ دیں۔ پہلے ...

... محفوظ ...

شاعر اور ادیب ...

نہیں دیتے۔

تو وہ بھی اسے ...

اور سہو سے ...

کے فرض ... ہے ...

دشوار ہے ...

نام: (محمد) عبدالعزیز حنفی

قلمی نام: (محمد) عبدالعمیق

جائے پیدائش: مہو چھاؤنی، مدھیہ پردیش (قدیم صوبہ مالوہ میں عرض البلد شمالی ۲۲٫۳۴ اور طول البلد مشرقی ۷۵٫۴۸ پر واقع ہے اور جس کی تاریخ ۱۸۵۷ء سے پہلے ابتک تو نہیں ملی)

تاریخ و وقت: ۲۸ نومبر ۱۹۲۸ء بروز ہفتہ صبح ۷-۲۲ پر

سرکاری ریکارڈ میں ۱۹۳۳ء درج ہے۔

تعلیم: بی اے (۱۹۵۰) ایم اے سیاسیات (۱۹۵۲) ایم اے تاریخ ...

اشاعات: سالتیرں کا سنگیت (ہندی کلام) ۱۹۵۵ء

سنگ پیرہن (پہلا اردو مجموعہ کلام) ۱۹۵۸ء

انجمن ترقی اردو (ہند) کے اردو شاعروں کا انتخاب سلسلے میں کتابچہ

سندباد (طویل نظم) ۱۹۶۶ء

شب گشت (دوسرا اردو مجموعہ کلام) ۱۹۶۹ء

صلصلۃ الجرس (طویل نظم) ۱۹۷۱ء

شہر صدا (تیسرا اردو مجموعہ کلام) ۱۹۷۵ء

ہندی رسائل گیانودے، مدھوک، دھرم یگ، سریتا، ...

دن مان، انیا، راشٹروانی، ساپتاہک ہندوستان وغیرہ وغیرہ اور انگریزی کے پیٹریاٹ، انڈیا، السٹریٹڈ ویکلی آف انڈیا وغیرہ میں بھی چیزیں شائع ہو چکی ہیں۔ کئی درجن ہندی اردو میں ریڈیو ڈرامے، فیچر اور فنتاسیے نشر ہو چکے ہیں۔ اردو مضامین کا مجموعہ ... زیر طبع ...

آپ ... ۱۹۵۶ء کے آخر سے آل انڈیا ریڈیو میں ملازمت جاری ہے اور ۱۹۶۹ء سے پروگرام ایگزیکٹیو کی حیثیت سے اور آج کل ... ڈیپارٹمنٹ ...

پتہ: ... نئی دہلی ...

... "وشد عمیق" کے لئے ان سے ایک خصوصی ملاقات کی جو یہاں ملاقات ...

... ہے۔ اس ملاقات کو قلمبند کر کے پیش کیا جا رہا ہے۔

ناصر الدین خان: عمیق صاحب آپ نے شعر گوئی کب شروع کی؟ آپ کو

وغیرہ سے بڑے ... ملازمت کے سلسلے میں یہاں آ کے جاتے رہتے تھے۔ ان لوگوں کی وجہ سے ایک اچھی خاصی ادبی اور علمی فضا بن گئی ہے۔ اس کے علاوہ میرے ...

محمد یعقوب صاحب ایڈوکیٹ مجھے اپنی اولاد سے زیادہ عزیز رکھتے تھے اور میرے ذوق اور شخصیت کی تہذیب اور تعلیم و تربیت میں بےحد دلچسپی لیتے تھے۔ شروع ہی سے میر تقی میر، خواجہ میر درد، غالب، اقبال وغیرہ کے کلام سے کچھ نہ کچھ سنا کے اور اخلاقی، تہذیبی اور فکری بلندی رکھنے والی شاعری کی طرف متوجہ کرتے رہتے تھے۔ علم و ادب کا جو کچھ اثاثہ میرے پاس ہے، وہ ماموں صاحب کی بدولت ہے۔

ن، مہو چھاؤنی آپ کا وطن بھی تو ہے؟

ع ح، وطن مولود تو مہو ہی ہے۔ ویسے اندور سمجھئے۔ قصہ دراصل یہ ہے کہ مالوے کے بہت سے مسلم خاندانوں کی طرح میرے اجداد بھی یو پی کے مختلف علاقوں سے آکر یہاں آباد ہو گئے۔ میرے پردادا اپنے والد کے ساتھ معین آباد سے آئے تھے۔ اور فارسی اُردو کے استاد کے طور پر ریاست بڑوانی میں ملازم ہو گئے تھے۔ اُن کا نام بھی مولینا محمد یعقوب تھا۔ دادا بھی وہیں پیدا ہوئے۔ والد کی پیدائش اندور کی تھی۔ میرے نانا بجنور سے آکر مہو میں بس گئے تھے اور وہیں دفن ہیں۔ مولینا انور شاہ صاحب کشمیری سے بیعت تھے۔ اور دیوبندی عقائد پر عمل کرنے والے تھے۔ والد مرحوم اپنی ننھیال کی طرف سے لکھنوی تھے۔ یہاں تو صاحب ۱۹۳۶ء سے ۱۹۴۹ء تک تقریباً اپنے والدین کے ساتھ دیواس میں رہا۔ لیکن اندور اور مہو آنا جانا لگا ہی رہتا تھا۔ مہو، اندور، دیواس، میں ظاہر ہے کہ اُردو کے دیرینہ مرکزوں کی سی فضا تو تھی نہیں، البتہ مشاعرے ہوتے تھے، نشستیں جمتی تھیں، شعر و شاعری موضوع گفتگو بنے رہتے تھے۔ ہر جگہ مقامی شعراء بھی تھے اور استادی شاگردی کا سلسلہ بھی تھا۔

ن؛ کیا ان لوگوں میں سے کچھ کے نام اس وقت بھی آپ کے ذہن میں ہیں؟

ع ح، دیکھئے خدا آپ کا بھلا کرے، نواب احسان علی خان آف باندہ تھے، واثق تونکی تھے۔ ادیب سہارن پوری، شاداں اندوری، وقار و اُفق، ذبیح رتلامی، جیون لعل گوہر سلطانی، طالب دیواسی وغیرہ تھے۔ اس زمانہ میں شعر تو میں کہتا نہ تھا؛ ہاں ان حضرات کا کلام اور باتیں ضرور سُنتا تھا۔ اندور میں اس زمانہ میں نادم اندوری بھی تھے۔ جو آجکل احمد آباد میں ہیں۔ ان سے اقبال، جوش اور سیماب کی شاعری کے تقابل و توازن کے سلسلے میں

ظاہر کیں

بڑی باتیں سُننے کو ملتی تھیں۔ میرے ہمجولیوں میں صابر علی صابر، یوسف اظہر، حبیب حسین، عبدالغنی حاذق، عزیز احمد ناز وغیرہ بہت سے شاعر تھے اور نشستوں میں خوب خوب پڑھتے تھے۔ میں اُن کی شعری محفلوں میں سنجیدگی سے گم سُم بیٹھا رہتا تھا۔ اس لئے یہ لوگ چڑانے کے لئے مجھے 'عمیق' کہہ کر پکارتے۔

ن؛ چلئے اچھا ہوا آپ کو اپنا تخلص خود تلاش نہیں کرنا پڑا۔ ویسے آپ کے دوستوں نے آپکی جو چڑ نکالی تھی۔ اس میں ستائش کا ایک پہلو بھی تھا۔

ع ح؛ یہ تو اب نظر آ رہا ہے۔ ان شریروں کے ذہن میں ستائش و تائش بالکل نہیں تھی۔

ن؛ آپنے اب تک یہ نہیں بتایا کہ آپ نے شعر کہنا کب شروع کیا؟

ع ح؛ ۱۹۵۲ء کے اواخر میں۔ ایم اے (سیاسیات) کر لینے کے بعد اور ایم اے (تاریخ) کرنے سے پہلے۔

ن؛ تو لگے ہاتھ محرک کے بارے میں بھی بتا دیجئے۔ اس بیدۂ زنگاری میں ضرور کوئی معشوق ہوگا۔

ع ح؛ جی نہیں! اس کے پیچھے ایک معمر شاعر ہے۔ بندہ کبھی معشوق فریبی نہیں کر سکا۔ ایک بزرگ دوست اور کہنہ مشق شاعر جنھیں اہلِ مہو "اُستاد" کہا کرتے ہیں۔ ہاشمیہ لائبریری کی ایک ادبی نشست میں اپنی غزل پر میری تنقید سے بہت خفا ہو گئے۔ اور کہنے لگے کہ میاں، تنقید کرنا تو آسان ہے۔ شعر کہہ کر دکھلاؤ۔ خون تھوکنے لگو گے۔ کلیجہ منھ کو آ جائے گا۔ بس جناب گھر گئے۔ چیلنج قبول کیا۔ آدھی رات تک آٹھ نو شعروں کی غزل کہہ ڈالی اور اسی وقت اپنے دوستوں کو گھروں سے ایک ایک کر کے جمع کیا۔ اُستاد کے گھر دھاوا بولا۔ ایک ہوٹل میں جا بیٹھے اور غزل سنا دی۔ مطلع یاد ہے ؎

ولولے اب لبِ اظہار تک آ پہنچے ہیں
قافلے منزلِ دشوار تک آ پہنچے ہیں

ن؛ بہت خوب! یہ مطلع تو آپکے لئے فالِ نیک ثابت ہوا۔

ع ح؛ اور صاحب تخلص تو موجود تھا ہی۔ وہی دوستوں کی عطا کی ہوئی 'چڑ'، میرا تخلص بن گئی۔ اور ستم ظریفی دیکھئے کہ جاننے والوں میں سے ایک بھی ایسا نہیں جس نے ۱۹۳۶ء کے بعد

ایک شعر بھی کہا ہو۔ عبدالعزیز حنفی عمیق ایم۔ اے کے لمبے نام سے چھپا کرتا تھا۔ ظ۔ انصاری جو اُس وقت 'شاہراہ' کے ایڈیٹر تھے۔ نام کی طوالت کے پیچھے پڑ گئے اور بالآخر عمیق حنفی پر اکتفا کرنے پر مجبور کر دیا۔

ن: اِس کے بعد باضابطہ ادبی ماحول کب اور کہاں ملا؟

ع ح: یہ ملا بھوپال میں۔ محمد علی تاج، اظہر سعید اور اختر سعید کی قربتوں اور محبتوں میں۔ یہیں ریڈیو اسٹیشن پر گرجا کمار ماتھر اور بھارت بھوشن اگروال نے ہندی کی نئی شاعری کے مطالعے کی طرف راغب کیا۔ انھیں کے اکسانے پر میں نے شاعری میں تجربے کرنا شروع کئے۔ حلقۂ اربابِ ادب، حلقۂ دانشوراں اور ہوٹلوں نے بھی خوب ہوا دی۔ دلّی، بمبئی، علی گڑھ، حیدرآباد، لکھنؤ، الٰہ آباد سے کئی ادیب اور شاعر بھوپال آتے رہتے تھے۔ اور اُن سے پہلی پہلی ملاقاتیں بھوپال ہی میں ہوئیں۔

ن: مثلاً؟

ع ح: سجّاد ظہیر مرحوم، احتشام حسین (مرحوم)، آل احمد سرور، سردار جعفری، جاں نثار اختر، نیاز حیدر، رام لعل، فکر تونسوی، مخمور جالندھری، قمر رئیس، باقر مہدی، مجنوں گورکھپوری وغیرہ۔

ن: عمیق صاحب! باقاعدہ شاعری شروع کرنے سے پہلے آپ نے کن شاعروں کو خاص طور پر پڑھا تھا جو آپ کو پسند بھی آئے ہوں؟

ع ح: مہو میں محسن علی قرار اور عبدالہادی اور میں ہم تین دوست تھے۔ جنھیں رسالوں اور کتابوں میں بڑی دلچسپی تھی۔ قرار اور ہادی تو کتابیں خریدنے اور رسالے منگوانے میں حاتم تھے۔ ہم لوگوں نے فیض، احمد ندیم قاسمی، مختار صدیقی، ن۔م۔ راشد، ناصر کاظمی، اختر الایمان، مجاز، سلام مچھلی شہری، جذبی، مجروح، سردار جعفری، وغیرہ کی کتابیں بڑے چاؤ سے پڑھیں اور ان پر بہت باتیں کرتے رہے۔ شاعر، نگار، مخزن، آجکل، سویرا، نقوش، ادبِ لطیف، شاہراہ، ساقی، ماہِ نو، وغیرہ بھی ہم لوگ باقاعدگی سے پڑھتے تھے۔ یگانہ چنگیزی اور شاد عارفی کو ہم لوگ بہت دلچسپی سے پڑھتے تھے۔

ن: بھوپال کے بعد اور کوئی اہم پڑاؤ؟

ع ح: بھوپال سے پہلا مجموعہ 'شاخِ صنوبر' ۱۹۵۸ء میں شائع ہوا۔ ۱۹۶۰ء میں میرا تبادلہ دہلی ہو گیا۔ یہاں ایک طرف بشیر حسین سرور، نشاط ... شاعری یہ تھا

محمد حسن، زیدی، اور محمود ہاشمی سے ملاقاتیں رہیں تو دوسری طرف براج کومل اور ان کے چند غیر ادبی دوستوں سے۔ نشتر خانقاہی اور محمود سعیدی سے بھی بہت گاڑھی چھنتی تھی۔ اُسی زمانے میں براج کومل کو اور مجھے خصوصی دعوت پر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں آل احمد سرور صاحب نے بلایا اور سنا یا۔ منیب صاحب، خلیل صاحب، شہریار، وحید اختر، انور معظم وغیرہ سے اسی زمانے سے دوستی ہے۔ میری پہلی طویل نظم 'سندباد' کی طرح دہلی ہی میں شروع ہو چکی تھی تکمیل اندور میں ہوئی۔ ۱۹۶۲ء میں اندور میں تبادلہ ہو گیا تھا۔ وہاں ۱۹۶۹ء تک رہا۔ 'شب گشت' کی تمام تر مشمولات اسی عرصے کی ہیں۔

ن: تو عمیق صاحب، کیا یہ نتیجہ نکالا جائے کہ جگہ اور ماحول کی تبدیلی کا اثر آپ کی شاعری پر بھی پڑتا ہے؟

ع ح: میں بہت حساس اعصاب والا آدمی ہوں۔ فضا اور ماحول کا اثر یقیناً قبول کرتا ہوں، خاص طور پر اگر چیلنج کی صورت میں ہو۔ لیکن اثرات قبول کرنے کا سلسلہ ابتدا میں یعنی تجرباتی دور میں زیادہ قوی تھا۔ عادت میں پختگی آنے کے بعد تو ایسا نہیں رہا۔ خیر اندور کے اس ساڑھے ۶ برس کے قیام میں تسنیم حنفی اور سید وقار حسین سے شعر و ادب پر تبادلۂ خیال ہوتا رہا۔ ۱۹۶۹ء میں پھر دہلی تبادلہ ہو گیا۔ اسی دور میں طویل نظم 'صلصلۃ الجرس' لکھی۔ جس میں مذہبی حسیّت اور جدید حسیّت کی ہمشیرگی کو نمایاں کیا گیا ہے۔

ن: اس اہم پہلو پر بھی ایک سوال میں کرنا چاہتا ہوں لیکن اس کے پہلے یہ عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ خود اپنے سانچے بنا کر انھیں توڑتے رہنے ہی میں آپ کی تازگی اور تنوع کا راز مضمر ہے۔ اب یہ فرمایئے کہ آپ کی شاعری کی ابتدا غزل سے ہوئی۔ بعد میں بھی آپ نے غزلیں کہیں جو 'شب گشت' اور 'شجر صدا' میں شامل ہیں۔ لیکن نظموں کے مقابلے میں آپ کی غزلوں کی تعداد بہت کم ہے۔ اس کا کوئی خاص سبب ہے؟ یا آپ کا بھی یہ خیال ہے کہ

بقدرِ شوق نہیں ظرفِ تنگنائے غزل
کچھ اور چاہیے وسعت مرے بیاں کے لئے

ع ح: ناصر صاحب! یہ شعر بھی غزل ہی کا ہے۔ غالب نے اس شعر میں اس مخصوص غزل کے تنگ ... کی شکایت کی ہے اسے کہا ہے کہ

اُس کا پورا مافی الضمیر اُس کی بھرپور کیفیت اس خاص غزل میں اس خاص ردیف قافیوں میں ادا نہیں ہو سکی اور اس کے بیان کے لئے وقت کے دفتر درکار ہیں۔ آپ جانتے ہیں آپ ہی کی طرح بہت سے لوگ اس شعر کو صنفِ غزل سے منسوب کر دیتے ہیں۔ غزل کے شعر دل میں تعمیر کا یہ خطرہ لاحق رہتا ہے۔ در اصل غزل کا شعر قاری کا ہو جاتا ہے شاعر کا نہیں رہتا۔ قاری یا سامع جیسے اور جس موقع پر بھی اُسے استعمال کرے کر سکتا ہے۔ یہی خطرہ مجھے غزل گوئی سے باز رکھتا ہے۔ لیکن آج کی غزل کو میں قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہوں اور اُن غزل گویانِ جدید پر رشک کرتا ہوں جو اپنے مافی الضمیر اور دلی کیفیت یا قلبی یا ذہنی تجربے کو تمام و کمال دو مصرعوں میں سمو دیتے ہیں۔ کاش کوئی غزل کو عالمی ادب میں وہ مقام دلا دے جو مثلاً جاپانیوں نے ہائیکو کو دلوا دیا ہے۔ اسے میری معذوری اور مجبوری سمجھئے کہ غزل کہتے وقت مجھے یہ محسوس ہوتا ہے گویا میں ایک بھاری اور تنگ زرہ بکتر پہنے ہوئے ہوں جس نے میرے سارے وجود کو جکڑ رکھا ہے۔

ن: عمیق صاحب شاعر ہونا نعمت ہے یا ہنر؟

ع: دونوں۔ شعری حسّیت یا صلاحیت بڑی حد تک نعمت ہے اور شعری قالب میں اُس کا اظہار ہنر ہے۔ شاعری نیت و اتفاق، منصوبہ بندی و خود روی، آمد و آورد، اُپج اور ہنر مندی، جبر و اختیار وغیرہ جیسے ابعادِ قطبین میں تعلق و توازن پیدا کرنے کا عجیب و غریب عمل ہے اور چونکہ یہ عمل طبیعی یا کیمیاوی نہیں بلکہ ایک پیچیدہ نفسیاتی اور اعصابی عمل ہے لہٰذا اس کا تجزیہ قطعیت کے ساتھ نہیں کیا جا سکتا۔

ن: آپ بالکل صحیح فرماتے ہیں کیونکہ اظہار یا Medium پر عبور اگر ہنر نہ ہوتا تو ہمیں کسی شاعر کے کلام میں کبھی ارتقاء نظر نہ آتا۔ ابھی آپ نے تجزیے کے متعلق بھی فرمایا۔ عمیق صاحب آپ نے تنقید بھی تو لکھی ہے۔

ع: میری تنقیدی کاوش کی صورت جدید ناقدین کے کارناموں سے ذرا مختلف ہے۔ جائزہ لینا اور گہرا اور تفصیلی مطالعہ کرنا مجھے اچھا لگتا ہے۔ میں نے کالیداس، امیر خسرو، میر تقی میر، غالب اور اقبال کے مطالعات پیش کئے ہیں۔ نئی سدھانت پر لکھا ہے۔ گیت کے بارے میں اور سانیٹ کے بارے میں بھی میرے مضامین موجود ہیں۔

شاعر بمبئی

سائکیہ ودرش کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ جدیدیت کے پس منظر کی تلاش کی ہے۔ جدید شاعری میں شہری بحران اور عقیدے کے زوال کے اظہارات کا جائزہ لیا ہے۔ شعلے کی شناخت (بمرا اور بمرا) اور اُردو شاعری میں عصری آگہی کے عنوان سے اپنے شعری نظریات کے خد و خال پیش کئے ہیں۔ سردار جعفری نے جب اپنے سیاسی عقائد کی کمین گاہ سے ٹی۔ ایس ایلیٹ پر تنقید کی تو "ایلیٹ" کی پیروی میں بھی ایک مضمون میں نے لکھا تھا۔ اور میراجی کو ہندوستانی اجتماعی لاشعور اور دھرتی پوجا کی ایک مثال بنانے پر وزیر آغا نے جب عجیب و غریب تاویلات پیش کی تھیں تب بھی میں نے ان کے مفروضے کی غلط بنیادوں کی نشاندہی کی تھی۔ اور ہندو دیو مالا کی زیادہ علمی اور تحقیقی تعبیرات کی طرف انہیں متوجہ کیا تھا۔

ن: ادبی تنقید کا بنیادی مقصد اور جواز آپ کے نزدیک کیا ہو سکتا ہے؟

ع: تنقید میری نظر میں کسی فن پارے کے وسیع مطالعے، تشریح، تفسیر یا تعبیر کا نام ہے۔ نقاد در اصل شاعر اور قاری کے درمیان رابطہ یا وسیلہ بن جاتا ہے۔ اچھا نقاد تو کسی عہد کے کلام کو بحیثیت مجموعی ایک perspective دیتا ہے۔ نقاد ادب کا ایک پڑھا لکھا تربیت یافتہ، باشعور، با ذوق اور ذرا ideal قاری ہوتا ہے۔ مفتی، قاضی یا کوتوالِ شہر نہیں۔

ن: نئی شاعری کی تنقید کے بارے میں آپ کیا کہیں گے؟

ع: دیکھئے صاحب! آپا دھاپی اور دھاندلی تو تنقید کے نام پر چل نہیں سکتی۔ نئی شاعری کی کوئی 'شعریات' یا بوطیقا تو ہے نہیں۔ نہ کوئی common terms of reference ہیں۔ تو کسی شعری نمونے کی تعدیل تو ہو نہیں سکتی۔ لہٰذا جو کچھ ہے وہ ذاتی رائے ہے۔ اور وہ بھی بہت ہی arbitrary یعنی من مانی سی۔ اور اس رائے کے بنانے بگاڑنے میں دوستی دشمنی اور تعصب سبھی کچھ کار فرما ہے۔

ن: ہمارے نقادوں کے لئے مغربی تنقید یا تنقیدی رویوں سے گہری واقفیت کہاں تک ضروری اور سودمند ہے؟

ع: قومیت اور بین الاقوامیت کی تہذیبی سطح تقریباً ایک ہوتی جا رہی ہے۔ کوئی لمبا چوڑا فرق تو رہ نہیں گیا ہے۔ بڑے شہروں میں تو مشرق اور مغرب کا فرق اور بھی کم ہو گیا ہے۔ مادی اور

تکنیکی دونوں ہر جگہ ایک ہیں۔ البتہ نفسیاتی اور ثقافتی تصورات کے
درمیان خلیج پٹی نہیں ہے۔ جی ہاں! مغربی علوم سے واقفیت ضروری سمجھتا ہے اور سود مند بھی۔ لیکن سوال واقفیت کا نہیں اس کے اطلاق کا ہے۔ اُردو اور اس کی شاعری پالنی ہو کر بھی ہے تو ہندوستانی اور مشرقی۔ اس کا جسم، اس کا مزاج اس کی روح مغربیت کو ایک حد تک ہی مقبول کر سکتی ہے۔ مشرق کا مزاج تجزیاتی بہت کم رہا ہے۔ جزئیات بھی کلیات کے تابع رہی ہیں۔ ہمارا رویہ Romantic approach زیادہ ہے۔ ویسے بھی تجزیاتی طریقِ کار طبیعاتی علوم کے لئے زیادہ کارآمد ہے۔ اُردو کے ساتھ ایک مصیبت اور ہے name-dropping۔ اُردو کا نیا نقاد مغرب کے بڑے بڑے نقادوں کے ناموں کو بات بات پر تُرپ کے پتوں کی طرح پھینکتا ہے۔ تنقید کے بازار میں ناموں کی بیساکھیاں بہت کام آ رہی ہیں۔ لطف کی بات یہ ہے کہ بیساکھیاں جب سے فیشن میں آئی ہیں انہیں وہ لوگ بھی استعمال کر رہے ہیں جو 'بے دست و پا افتادہ' نہیں ہیں بلکہ جن کے ہاتھ پاؤں صحیح و سلامت ہیں۔ مگر طرزِ جدید کے فیشن نے مجبور کر دیا ہے۔

ن: کچھ دیر قبل آپ نے فرمایا تھا کہ نقاد کسی عہد کے کلام کو بحیثیت مجموعی ایک perspective بخشتا ہے۔ اس لحاظ سے جدید ترین شاعری کی تنقید کس باب میں ہے؟

ع ح: کسی باب میں نہیں۔ کسی بھی زندہ، جاندار و ساری، رواں دواں عمل کی یا طرزِ عمل کی تجزیاتی تنقید اور تقدیر و تخمین evaluation (...) تقریباً ناممکن ہے۔ نام نہاد جدید تنقید نے پہلے تو شاعروں کو گمراہ کیا [illegible] جب ترسیل و ابلاغ کے مسائل [illegible] بن گئے تب نقاد [illegible] مغرب کے [illegible] اقدار اور اہمیت کا ناجائز اور غیر واجبی حد تک بڑھ جانا کوئی اچھی بات نہیں ہے۔ بدقسمتی سے اُردو کے بہت سے تازہ واردوں نے نقاد کی جنبشِ قلم کو شاعری کا اشارۂ ابرو سمجھ کر نقاد کی تصدیق کردہ اور پسندیدہ طرز کو اپنانے ہی میں اپنی نیک نامی سمجھی ہے۔ شاعری کی تخلیق کا تعین [illegible] تنقید کو شاعری کا تعاقب کرنا چاہیے۔

ن: آپ کے بارے میں ایک شبہ ہے کہ آپ سائنس کی برکتوں اور ٹکنالوجی کی نعمتوں کے منکر ہیں۔ اور نئی تہذیب کے مخالف؟

ع ح: سخن فہمی عالمِ بالا معلوم شد۔ نہیں صاحب ایسا نہیں ہے۔ سائنس اور ٹکنالوجی ہمارا مقدر بن چکے ہیں۔ نئی تہذیب پیدا ہو چکی ہے اور اس کی ترقی کو کوئی روک نہیں سکتا۔ میں نے اپنی طویل نظموں میں خاص طور پر ایک غلط جہت کے خطرے پر توجہ مرکوز کی ہے کہ کہیں مشینوں کی صحبت ہمیں بھی مشین بنا کر نہ رکھ دے اور جسم اور مادہ ہی منزلِ مقصود نہ بن جائے۔ [illegible] قدروں کے ساتھ نئی قدروں کی تشکیل و تنظیم کی ضرورت کو رد ہی نہیں کرتا۔ حسن، خیر اور خوبی کا پرانا تصور ٹوٹ گیا ہے تو ٹوٹے مگر اس کی جگہ کوئی نیا تصور پیدا تو ہو۔

ن: لوگوں کا کہنا ہے کہ نئی شاعری نئی تجرباتی شاعری ہے لیکن آپ کی شاعری پر تہذیبی، معاشرتی اور اخلاقی مسائل، نجی تجربات کے مقابلے میں غالب نظر آتے ہیں۔

ع ح: میں تجربات، مطالعے اور مشاہدے کو خلط ملط نہیں کرتا۔ میرے موضوع علم تاریخ اور سیاسیات ہیں۔ جدید علوم انسانی سے مجھے بڑا شغف ہے۔ میرا 'درد' سماجی اور تہذیبی 'درد' ہے۔ میرے ذاتی تجربے ایک سیدھے سادے نارمل آدمی کے تجربے ہیں۔ نشہ، جرم، گناہ انہیں میں نے کبھی نہیں اپنایا۔ گرہست رہتے ہوئے سنیاس کا ڈھونگ مجھے کبھی آیا نہیں۔

ن: بعض لوگ کہتے ہیں کہ آپ کا دعویٰ یہ ہے کہ بدھ اور عیسیٰ اور محمدؐ اور مارکس میں آپ ایک وجدانی وحدت دیکھتے ہیں لیکن اس دعوے کا ثبوت آپ کی شاعری میں کہیں نہیں ملتا۔

ع ح: اس کا ثبوت وہاں ڈھونڈھا ہی کیوں جاتا ہے؟ سب سے پہلے تو یہ ضروری ہے کہ 'مبینہ دعوے' کو ذرا دیکھ لیا جائے۔ 'شجرِ صدا' کے پیش لفظ میں متعلقہ عبارات یعنی اصل [illegible] دیکھ لیں۔

ن: لائیے میں پڑھتا ہوں: 'میرا تجربہ مجرد فرد کا نہیں، عرفانی ذات کا تجربہ اور میرا مسئلہ مفروضات کا نہیں، حاضر و انسان کا مسئلہ ہے۔ چونکہ ذاتِ انسانی ایک مسلسل اور [illegible] حقیقت ہے اس لئے مجھے قدیم ساحر، وسطانی دینی [illegible] جدید [illegible] عقلی بلکہ منطقی [illegible] نظر آتے ہیں۔ بدھ، عیسیٰ، محمدؐ اور مارکس کے فکری نظاموں میں ایک وجدانی اور الہامی وحدت کا احساس

ہوتا ہے (اور ایسا بدھ کے سکوت اور مارکس کے بین انکار کے باوجود ہوتا ہے)۔

ع ح: جی: تو اب آپ خود ہی دیکھیں کہ نہ یہ دعویٰ ہے اور نہ اس کا تعلق میرے شعری عوامل سے ہے۔ اسی پیش لفظ میں آگے چل کر ان دوسروں کو میں نے قولِ محال کہا ہے اور یہ بھی کہ یہ میرا ذہنی مقام یا عالم ہے۔ ویسے میری شاعری میں یہ عالم کئی حسّی تجربوں کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ راستہ نفیٔ ذات کا ہو یا اثباتِ ذات کا، نفیٔ عمل کا ہو یا مسلسل عمل کا، دونوں راستے ایک ہی منزلِ مقصود کی طرف لے جاتے ہیں کہ انسان کو آلام و مصائب اور مختلف غلامیوں اور بندشوں سے کس طرح نجات دلائی جائے۔ آرزو اور ترکِ آرزو کے احساسات شاعری میں بھی موجود ہیں ؎

ترکِ تمنّا کر کے دیکھا اب خواہش ترکیب

(تعارف: شب گشت)

ن: اب ذرا مذہبی حسیّت کی بات بھی ہو جائے۔ اور یہ بھی دیکھیں کہ اس کا جواز آپ کے Frame work میں کہاں تک ملتا ہے۔

ع ح: تمام اچھی شاعری میں ایک قسم کی مذہبی حسیّت تو ہوتی ہی ہے۔ شاعری جزویست از پیغمبری۔ پیغمبروں پر شاعر ہونے کا شبہ کیا جاتا رہا ہے۔ اساطیر، مذہب اور شاعری میں بڑا قریبی اور خونی رشتہ ہے۔ میرا موضوع Human predicament ہے۔ ایقان کا بحران (Crisis of faith) بھی ایک زبردست مسئلہ ہے۔ "سندباد" میں بھی نقطۂ آغاز یہی ہے۔

معبدوں کے چراغوں میں روغن نہیں
آج ایمان کا کوئی مسکن نہیں

ن: ایقان کے بحران کے ذکر سے آپکی ایک غزل کا مطلع بھی مجھے یاد آ رہا ہے۔ جو مجھے بہت پسند ہے ؎

یوں ہوا ہے چاک ملبوسِ یقیں سلتا نہیں
پھینک دینا بھی ہے مشکل دوسرا ملتا نہیں

ع ح: ایمان کے مسکن و مامن کے طور پر عالمی تاریخ کا جو کردار اور شخصیت ہمیشہ سے میرے ذہن و دل کی گہرائیوں میں بسی ہوئی تھی وہ صلصلۃ الجرس، میں بہت نمایاں طور پر بلکہ مرکزی حیثیت سے ابھر آئی۔ تاریخ، شاعر بھی

سوانح، عقیدتیں، فکر و احساس کی جہتیں، تصوّرات، نظریات اور شعریت نے یکجان ہو کر اس نظم کا قالب پایا۔

ن: عمیق صاحب: کافی دن پہلے "شب خون" میں احتشام صاحب مرحوم سے آپکی خط و کتابت شائع ہوئی تھی۔ جس میں آپ نے شاعری کے ذیل میں "غیر مشروط" ذہن کی بات کی تھی۔ یہ غیر مشروط ذہن کیا ہوتا ہے؟

ع ح: وہ خط و کتابت بہت غلط رنگ میں پیش کی گئی اور اس کے ذریعہ جس آزادیٔ احساس و اظہار کی ضرورت پر توجہ دلائی گئی تھی اسے فراموش کر دیا گیا۔ اسے مناقشے اور مناظرے کی طرح دیکھا گیا اور مجھ پر بدتمیزی کرنے کا الزام بھی عائد کیا گیا حالانکہ میں نے بہت حق گوئی اور بیباکی سے کام لینے کے باوجود احتشام صاحب مرحوم کی شان میں کوئی گستاخی نہیں کی تھی۔ نئی شاعری ادبی اظہار کے ایک انحرافی اور تجرباتی دور سے عبارت ہے۔ اس کی کوئی فکری، فنی، جمالیاتی یا سیاسی اساس نہیں نہ کوئی منشور ہے نہ کوئی فلسفہ۔ پابند، آزاد، معرّیٰ، نثری ہر قسم کے فارموں اور انفرادی اسالیب اس میں ملتے ہیں۔ ہمارے بزرگ ناقدوں نے اس شاعری کو بغیر جھان پھٹک کے سارا کا سارا دریابرد کرنے کے لائق ٹھہرایا۔ مثالوں کے انتخاب میں بھی تعصب سے کام لیا۔ صرف بری مثالیں دیتے رہے۔ اس لئے ضروری تھا کہ اس شعر دشمن آمرانہ روش کی مخالفت کی جاتی۔ غیر مشروط ذہن وہ ہے جو کسی بھی قسم کا خارجی Dictation قبول نہ کرے اور بغیر کسی قسم کے خوف، لالچ، یا مادی لاگ لگاؤ کے اپنے ذوق، مزاج اور پسند کے مطابق موضوع، ہیئت اور اسلوب کا انتخاب کرتا رہے۔

ن: ایک دوسرے مضمون میں جو کتاب "لکھنؤ میں اُردو شاعری میں عصری آگہی" کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔ آپ نے مقصدیت، سماجی شعور اور سماجی ذمہ داری وغیرہ کی بات کی ہے۔ بعض لوگوں کو اس میں آپ کے غیر مشروط ذہن والے خیالات میں تضاد نظر آتا ہے۔ کیا خیال ہے؟

ع ح: اُردو کا باوا آدم ہی نرالا ہے۔ ہم سب جذباتی لوگ ہیں اور جذبہ منطق اور استدلال کی باریکیوں سے مطلب نہیں رکھتا۔ تعصب اور تنگ نظری بھی اندھا بنا دیتی ہے۔ بھلا بتایئے انسانی رائے کا اظہار کیا صرف موافقت اور اختلاف کی انتہاؤں میں ہوتا ہے،

ان کے درمیان بہتی ہوئی سوچ کی منزلیں کیا مفقود ہیں؟ میں نے یہ مضمون دہلی میں ترقی پسندوں کے ایک سیمینار میں پڑھا تھا۔ میں ادب میں اس حد تک اختلاف کا قائل نہیں کہ مخالف کا حقہ پانی بند کر دیا جائے یا اُس کی کسی تقریب میں شرکت نہ کی جائے۔ یہ مضمون، ترقی پسند محفلوں میں میری شرکت، ترقی پسند رسائل میں میری شاعری اور مضامین کی اشاعت، ویت نام اور پالو نرودا پہ میری نظمیں ـ ـ ـ سے بعض احباب کی طبعِ نازک پہ بہت گراں گزریں۔ اور پھر جدیدیت کی امامت وغیرہ کا تنازعہ بھی تھا۔ اس سلسلے میں عرض کر دوں کہ اس تنازعے میں میرا کوئی دعویٰ نہیں۔ خیر! تو ہُوا یہ کہ عصری آگہی والا مضمون جب شائع ہوا تو شور مچا کہ عمیق حنفی نے اپنا مسلک تبدیل کر لیا اور جدیدیت سے منحرف ہو کر ترقی پسند ہو گئے۔ ایک تو 'جدیدیت' کی اصطلاح میرے مزاج اور فکر کو راس نہیں آتی۔ میں نے 'نئے' اور 'جدید' کی صفات کا استعمال تو کیا ہے مگر 'جدیدیت' کا نہیں۔ ادب کی مقصدیت ادیب کی ذمہ داری اور وابستگی کا جو تصوّر ترقی پسندوں کا ہے وہ بہت مختلف ہے۔

ن: آپ کے خیال میں ادب میں مقصدیت کیا ہے؟

ع ح: سماج اور تہذیب سے لین دین بھی ایک مقصد ہو سکتا ہے۔ فن کے ذریعے اپنی ذات اور اپنی پہچان کی تلاش بھی ایک مقصد ہی تو ہے۔ کہ جزو کی پہچان کُل کی پہچان بن جاتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ ادب کا سب سے بڑا مقصد کسی شریکِ غم اور شریکِ احساس کی جستجو ہے۔

ن: عمیق صاحب! کہیں شریکِ حیات کی جستجو تو نہیں ہے؟

ع ح: وہ بھی ہو سکتی ہے لیکن اوّلین شرط حیات کا ہونا ہے۔ اور ہاں آپ کے لئے تو یہ مقصد بھی بامعنی ہوگا۔

ن: وہ تضاد والی بات رہ گئی ـ ـ

ع ح: رہ کہاں گئی، آپ شریکِ حیات کے تعاقب میں نکل گئے۔ ہاں تو عرض یہ کر رہا تھا کہ ایک بات سماجی سطح پر کہی گئی تھی یارانِ طریقت اسے نفسیاتی سطح پہ لے آئے۔ اُلجھن پیدا کرنا ان کا مرغوب ترین مشغلہ جو ٹھہرا۔ بجائے نفسیاتی اعتبار سے انسانی ذہن غیر مشروط ہو ہی نہیں سکتا۔ کسی شخص کی نسلی، تہذیبی، علاقائی روایات، اس کا خاندانی پس منظر، اُس کی صحبتیں اور یارانے، اُس کی تعلیم و تربیت، اُس کا پیشہ، اُس کے عقائد وغیرہ اس کے ذہن کو یقیناً مشروط کرتے اور رکھتے ہیں۔ اس کے باوجود وہ جبر، لالچ، خوف اور مختلف قسم کی مصلحتوں اور مادی وابستگیوں سے اُوپر اُٹھ سکتا ہے۔ اپنے ضمیر کی آواز پر کان دھر سکتا ہے۔ بعض لوگ مختلف نشّہ آور چیزوں کے استعمال سے اپنے آپ کو نفسیاتی اعتبار سے بھی غیر مشروط کرنا چاہتے ہیں اور لاشعور کے تجریدی اور تجریدی اظہار کے تجربے کرتے ہیں۔ ایسے تجربے جو بھی ہوں ادب نہیں ہوتے۔ نہ صرف زبان اور فنونِ لطیفہ بلکہ انسان کے تمام تر احساسات، مشاہدات، اور تجربات سماجی نوعیت کے ہوتے ہیں۔ اس کے تمام تر اظہارات بھی سماج سے باہر کوئی معنویت یا اہمیت نہیں رکھتے۔ جنگل کے چرند پرند فنونِ لطیفہ کے غرض مند نہیں ہوتے۔ لہٰذا اس قسم کے دعوے کہ میں صرف اپنے لئے لکھتا ہوں یا اپنے ہی جیسے دو چار دوستوں کے لئے بہت منافقانہ اور ڈھونگ معلوم ہوتے ہیں۔ لکھنے کو گر دو چار دوستوں تک پہنچنے کے لئے 'ماس میڈیا' کا سہارا کیوں لیتے ہیں۔

ن: آپکی شاعری میں ہندی الفاظ کے استعمال کے بارے میں جو کچھ پوچھنا چاہتا ہوں۔

ع ح: میں خالص شعری لفظیات کا قائل نہیں اور نہ شاعرانہ زبان کی تخصیص کا۔ جب شعر گوئی شروع ہوتی ہے تو عادت اپنے آپ الفاظ کی درو بست کرتی رہتی ہے۔ رَو میں جو بھی آ جائے۔ بعد میں کاٹ چھانٹ بھی ہوتی ہے۔ مگر فطری اور بول چال کی میری اپنی زبان حاوی رہتی ہے۔ ویسے آپ دیکھیں گے کہ ہندی الفاظ کا استعمال سے کر یہاں آرائشی یا نمائشی نہیں ہوتا۔

ن: بعض معترضین آپ سے سپاٹ بیانی کی شکایت کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ کہیں کہیں آپکی شاعری نثری آہنگ اور نثری منطق کا شکار ہو جاتی ہے۔ آپکی شاعری Statements کی شاعری ہے۔

ع ح: بیان یا Statement تو غایتِ فن ہی ہے۔ لفظوں اور سُروں ہی سے نہیں رنگوں اور پتھروں اور دھاتوں سے بھی بیان کیا جاتا ہے۔ بیان اندرونی کیفیات کا بھی ہو سکتا ہے۔ اور خارجی حالات کا بھی۔ ایک بیان کو توالی اور عدالت میں دیا

شاعر، بھی

جاتا ہے۔ ایک بیان تجریدی ہوتا ہے۔ ایک بیان وہ ہے جو کوئی
مذہبی پیشوا یا سرکاری افسر دیتا ہے۔ ایک بیان ادیب یا شاعر کا ہوتا
ہے۔ عرب اور فارس والے بھی بیان ہیں۔ استعارہ، علامت،
پیکر بیان کے آلات اور اوزار ہیں، وسیلے ہیں۔ انہیں شاعری
جان یا پہچان قرار دینا بہت بڑا غلو اور مبالغہ ہے۔ منطقی ہو یا
نفسیاتی تلازمۂ خیال میں ربط، نظم، ضبط، تسلسل، روانی ہونا ضروری
ہے۔ جدید شاعری کے مروجہ مفروضے اور سیکڑوں نزدیک بے معنی اور
بے اصل مفروضے مجھے نہیں بھاتے۔

ن: آپ کے یہاں خطابت اور بلند آہنگی بھی کہیں کہیں در آتی ہے۔
اسے بھی جدید ناقد نئی شاعری کے سلسلے میں عیب مانتا ہے۔

ع ح: آپ نے خود محسوس کیا ہوگا کہ میری آواز تیز، اونچی اور ذرا تیکھی ہے۔
اپنی شاعری کو اپنی آواز اور لہجے سے کیسے اور کیوں محروم کر دوں؟
میری سرشت میں جلال کا عنصر زیادہ نمایاں ہے۔ اس جلالی
کیفیت کو بلند آہنگی کہتے ہیں تو کہتے رہیں۔ کبھی کبھی خطیبانہ آہنگ
بھی مزا دیتا ہے۔ نئے ناقد اردو کی نئی شاعری کو انگریزی
شاعری اور تنقید کے پیمانوں سے پرکھتے ہیں۔ انگریز کے یہاں خطابت
اور بلند آہنگی کا کوئی تصور ہے ہی نہیں۔ یوں بھی وہ Under
statement پر فخر کرتا ہے۔ اور پھر صاحب میں تنقید یا نقاد
کو ذہن میں رکھ کر تو قلم اٹھاتا نہیں

رکھے ہیں داغ کبھی اشعار کی جبینوں پر
کرم یہ کم نہ کیا ہم نے شکستہ سینوں پر

ن: بہت خوب عمیق صاحب، یہ شعر تو 'سنگ پیراہن' کی کسی غزل کا ہے۔

ع ح: جی ہاں!

ن: شاعری کی زبان سے لاپروائی کی شکایت بھی بعض لوگوں کو
آپ سے ہے۔

ع ح: ضرور ہوگی۔ بات یہ ہے کہ ہمارے لسانی مزاج کی تربیت میں غزل
اور مشاعرے کی روایات اور اداروں نے زبردست حصہ لیا ہے۔
لازم تھا کہ ہماری شعری زبان کا تصور بھی متغزلانہ ہو جاتا۔ غزل
کی دلکشی اور دلربائی کے صدقے، مگر یہ حقیقت کیوں نہ بھلائیے کہ
مثنوی، قصیدہ، مرثیہ، نظم، واسوخت، رباعی اور ترکیب بند
بھی ہماری شاعری کا بے بہا سرمایہ ہیں۔ دکنی روایات کو بھی فراموش

نہیں کیا جا سکتا۔ پھر آج کی بولیوں کی، اخبارات، فلم اور ریڈیو
کی، تعلیم و تحقیق کی زبان اور لب و لہجہ کو بھی ہم نظرانداز نہیں
کر سکتے۔ ہندی جو ہماری زبان کی قریب ترین ہمسایہ زبان ہے۔
اس کی نئی شاعری کی زبان کا اثر بھی ہم پر پڑتا ہے۔ میرا ذہن
آہنگ، لب و لہجہ اور زبان کے باب میں بھی غیر مشروط ہے۔

ن: عمیق صاحب۔ اردو کے بہت کم ادیب اور شاعر آپ کی طرح کلاسیکی
موسیقی میں دلچسپی رکھتے ہوں گے۔ آپ نے راگ راگنیوں پر نظمیں
بھی کہی ہیں۔ سنگیت سے اس دلچسپی کا لاشعوری رشتہ آپ کے
اس وصف سے کہاں تک ہے۔ جسے ایک ناقد نے آپ کی "غنائی
چالاکی" سے تعبیر کیا ہے۔

ع ح: ناصر صاحب! آٹھ برس کی عمر میں میں نے کلاسیکی موسیقی سننا
شروع کیا تھا۔ گویا کہ فنونِ لطیفہ کے نام پر جس فن سے مجھے
سب سے پہلے پالا پڑا تھا وہ کلاسیکی موسیقی تھی اور موسیقی بھی
کس کی؟ سنگیت سمراٹ استاد رجب علی خان کی موسیقی۔
حقیقی کلاکار اور تانوں کے شہنشاہ کی موسیقی۔ جن کے گلے میں سوا
لاکھ تانوں کا گولا گھومتا تھا۔ تیز، طرار، تیار گائکی۔ دھیمی
لے سے تو شروع ہوتے تھے۔ سوت اور گھسیٹ کے ماہر تھے۔
مگر چند لمحوں سے چمکدار بجلیوں کے فوارے چھوڑتے تھے۔
بہت تنک مزاج تھے۔ artistic arrogance کی انتہا
سمجھئے۔ یہی وصف ان کے تان پلٹوں اور لاگ ڈانٹ میں
نظر آتا تھا۔ تو جناب والا دو ٹوک۔ استاد رجب علی خاں صاحب
کا گانا باتیں اور گالیاں سننے میں بتا چکا ہوں۔ بھیروں، ملہار،
بہار کو، رام داس ملہار، چاندنی کیدار، مجھے مسعود الاشکرا
ہے ناکے گانے راگوں کو پانی کر دیتے تھے۔ انہیں کے یہاں
مرحوم استاد امیر خان صاحب سے ملاقات ہوئی تھی جو ایک مشفق
و مہربان کی دوستی میں تبدیل ہو گئی۔ ان سے خیالوں کے اور
تراشوں کے structure اور مائیکروفون کے عہد کی گائکی
پر اور شاعری اور موسیقی کے رشتے پر گھنٹوں گفتگو ہوتی تھی۔
اس لئے کچھ عجب نہیں کہ میری شاعری کے آہنگ میں اور میرے
وزن بتلاتے ہیں، وقف و سکون کا [illegible]
وغیرہ کے مقابلے میں آزاد نظم کے structure میں

تال ملیوں کا خیال کی بڑھت کا اور سے کھیلنے کا کوئی شری
روپ آپکو سیکر یہاں مل جائے۔ اگر ایسا کچھ مل جاتا ہے تو
اُسے استاد رجب علی خاں صاحب اور استاد امیر خاں صاحب کے
فیضِ صحبت کی عطا سمجھا جائے۔

ن : عمیق صاحب! تخلیقی عمل کے لئے آپ کسی خاص وقت، مقام، کاغذ روشنائی وغیرہ کو پسند فرماتے ہیں یا اس پسندیدہ موقع اور وسیلے کے منتظر رہتے ہیں۔

ع ح : نہیں صاحب! ایسا کوئی چونچلا میں نے کبھی نہیں پالا۔ میں جب بھی شعر کہتا ہوں اندرونی دباؤ اور اندرونی فضا کو موافق پاکر کہتا ہوں۔ جس طرح انسان کے لئے جنمنے اور جینے کا کوئی خاص موسم مقرر نہیں اُسی طرح میری شاعری کے لئے بھی ایسی کوئی قید نہیں۔ بس ایکبار کوئی چیلنج، کوئی تجربہ، کوئی تحریک شاعری کا سوئچ آن کردے۔ پھر کوئی ہجوم، ہنگامہ، کوئی گوشۂ سکون، کوئی وقت یا مقام اُسے روک نہیں سکتا۔ اندرونی توجہ اور مشغولیت کی یہی عادت مجھے اُن قیود سے آزاد رکھتی ہے۔ رہ گیا پسند کا معاملہ، تو بغیر رول والا سفید کاغذ اور کالی روشنائی مجھے پسند ہے۔ فرش پر بیٹھ کر یا لیٹ کر لکھنا اچھا لگتا ہے۔ زمین سے رشتہ قائم رہے تو بات جلدی بن جاتی ہے۔ اکثر گرم گرم تپتے ہوئے تجربے کو نظم میں ڈھالنا مجھے پسند ہے۔ ویسے ان میں سے کوئی بات میرے لئے شرط کا درجہ نہیں رکھتی۔ اس معاملے میں بھی ذہن غیر مشروط رکھتا ہوں۔

ن : اپنا مذاق آپ اڑا کر خوش ہونا بھی کوئی آپ ہی سے سیکھے۔ اچھا عمیق صاحب! بہت عمدہ ملاقات رہی۔ بہت سی باتیں ذہن میں صاف ہوگئیں۔ اب اجازت چاہتا ہوں۔

ع ح : بہت بہت شکریہ۔ آپ نے اپنا بہت وقت ضائع کیا، وہ بھی مجھ ایسے بضاعت شخص پر۔ مجھے بھی بہت سی غلط فہمیاں دور کرنے کا یہ موقع اچھا ہاتھ آیا۔ اس لحاظ سے یہ ملاقات کارآمد رہی۔ ویسے بھائی شاعری پر باتیں اور چیز ہے اور شاعری اور چیز۔ دعا کیجیے کہ اچھا شاعر بن سکوں اور اس سے بھی اچھا انسان۔

○○

جاتا ہو اور جمع کے قاعدے سے بالکل واقف نہ ہو اُسے معاشیات کی اصطلاح میں "فضول خرچ آدمی" کہتے ہیں۔ لطف یہ کہ اُن کی مالی پریشانیاں بھی جاری رہتی ہیں اور دوستوں کی مہمان نوازی بھی۔ صبح یہ مالی بحران میں مبتلا ہونگے۔ وہ شام میں آپ اُن کے یہاں جائیں تو دیکھیں گے کہ کسی دوست کی پُر تکلف ضیافت ہو رہی ہے۔

یہ بحث بہت دنوں سے چل رہی ہے کہ عمیق حنفی جدید ہیں یا ترقی پسند۔ میں اس بحث میں پڑنا نہیں چاہتا۔ البتہ میں نے انہیں ہر دو فریقین سے بے تحاشہ لڑتے ہوئے دیکھا ہے۔ چونکھی لڑائی۔ میں سمجھتا ہوں جدیدیت اور ترقی پسندی عمیق حنفی کے لئے ذیلی باتیں ہیں۔ اصل اہمیت تو لڑائی کی ہے۔ آدمی کو ہمیشہ لڑتے رہنا چاہیئے۔

شاعری کے معاملہ میں بھی وہ چومکھے پن کے قائل ہیں۔ انکی نظموں میں، جہاں عُریاں اشارے ملیں گے وہیں خالص مذہبی رنگ بھی ملے گا۔ اسلئے میں ہمیشہ کہتا ہوں کہ عمیق حنفی کی شاعری کو پڑھنے اور سمجھنے کے لئے نہ صرف "مہارت" کی بلکہ "طہارت" کی بھی ضرورت ہے۔ میرا اشارہ اُن کی مشہور نعتیہ نظم "صلصلۃ الجرس" کی طرف ہے۔

عمیق حنفی کی ایک ادا مجھے سب سے زیادہ پسند ہے۔ وہ یہ کہ وہ ادب اور زندگی میں مطلق کہیں اپنے ضمیر کو بیچنا پسند نہیں کرتے۔ اور ادب اور زندگی دونوں کو اس کی بھاری قیمت ادا کرتے ہیں۔ اُن کی کمائی اور اُن کا بینک بیلنس بس یہی ضمیر ہے۔ ورنہ اِن دنوں تو انسانوں میں خالص ضمیر کا ملنا بہت دشوار ہے۔

میں آخر میں اِس خاکہ کو عمیق حنفی کی ایک نظم پر ختم کرنا چاہتا ہوں جس کا عنوان ہے "کاش آئے ایسی شام"

نظم ہے: اے مرے سائے
میں ترا خاکہ اُڑاؤں
اور تو بن جائے میرا کارٹون
تو کوئی جوسی سا گاسیپ (gossip) چھیڑ دے
میں تجھے کچھ چٹ پٹی غزلیں سناؤں
دونوں مل کر بے سُری تانیں لگائیں
قہقہوں سے چھید ڈالیں ہم اُداسی کا بدن
اور لیں شام سے پژمردگی کا انتقام
کاش آئے گی ایسی شام

اور میرا اب احساس ہے کہ عمیق حنفی کی نظم کی وہ شام آج آئی ہے۔ ۱۹

باقر

عمیق حنفی کے شجرِ صدا کے روشن پھولوں کے نام

سبزۂ اقرار سے
رنگ زارِ تماشہ کے
اظہار تک ایک کردار ہے۔

آنکھ جس کی
اُفق چاک
سفّاک
اک سنسناتے ہوئے۔
تیر سی
خاک دھول
کے علائم کو
بے پوشش کرتی ہوئی
ایک بیداری دُور و نزدیک
اوس کی
آئینہ گاہ سے
سُرخ، سیندوری
نیلاہٹوں میں
ازل لب، اَبد گوش
اَسرار تک
ایک کردار ہے۔

جس کے احساس کو
وقتِ جابر
کی تیزاب

پیچاں سیاہی
کوئی تیرہ تفسیر
زائل نہیں کر سکی
انحراف
احتجاج
روشنی
آج ..... آج
گن موجود سے
خندۂ اِمکاں
انجموں کے
بازار تک
ایک کردار ہے

جس کی محرابِ الفاظ پر
نقش ہے
اک مُسلسل تحرک
کی تہذیب کا
مژدۂ صد خبر
جہد کا
مژدۂ صد ہُنر
ذاتِ مجہول سے
ذاتِ بیدار تک
ایک کردار ہے۔

جس کے سینے کا
سیّال
آہنگِ شعلہ
ہوا گشت
شب گشت
اجر صد ؤ سال
اِک خوابِ تیشہ
کا انعامِ تہ رکار ہے

زندگی .....
.... جا
اور اُس کا
دَر کھٹکھٹا
اُسکی دہلیز پر
ایک لمحہ
ٹھہرتے ہوئے دیکھ
سامنے ہی
کی دیوار پر
آبِ روشن سے
لکھا ہُوا
تیرا ہی نام ضَو بار ہے

سبزۂ اقرار سے
رنگ زارِ تماشہ کے
اظہار تک
ایک کردار ہے۔

○ 26/15 ۔ راجندر نگر ۔ نئی دہلی ۔ ٦۔
شاعر ۔ بمبئی

عمیق حنفی : چند تاثرات

ڈاکٹر قمر رئیس
K 5/19 - ماڈل ٹاؤن - دہلی - ۹

سنگ پیرہن سے شجر صدا[1] تک عمیق حنفی کا شعور وفن جن مرحلوں سے گذرا ہے وہ اتنے پیچیدہ نہیں ہیں جتنے بظاہر نظر آتے ہیں۔ اُن کی شاعری میں جس کرب، بے چینی، تناؤ، اُلجھن اور لہجہ کی دُرشتی اور ناہمواری کا احساس ہوتا ہے وہ میری دانست میں اُن کے شخصی اور شعری مزاج کے اساسی پہلو ہیں اور اُن کی جڑیں، ماحول، حالات اور خود اپنی ذات سے ان کے مستقل غیر مفاہمانہ رویّے میں تلاش کی جاسکتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ روایت سے اُن کی بغاوت ہو یا نئے تجربات کی جسارت۔ ان کی شاعری نعرہ زنی اور نقالی دونوں کی سطحیت سے بڑی حد تک محفوظ رہی۔ اپنے شعلے کی شناخت اور پرداخت میں اُنھیں زیادہ آسانی اس لئے حاصل رہی کہ وہ اداکاری کی مشقت پر مجبور نہیں ہوئے ـــــ نئی شاعری اور نئے شاعر کو سمجھنے کا ایک آسان طریقہ یہ بتایا جاتا ہے کہ اُس کے علائم اور امیجز کو وجودی فکر کے تصوّرات اور تلازمات کا لباس پہنا دیجئے۔ وجود کی اوّلیت، انفرادی آزادی کی تڑپ، لمحہ لمحہ جینا، ذات کی شکست و ریخت، اقدار کا انکار، یاس و محرومی پر اصرار، احساسِ جبر، موت کا خوف وغیرہ۔ یہ کلیدی اشارے اپنی تاویلات میں نئے شاعر کو نیا اور بڑا بنانے میں بڑی مدد کرتے ہیں۔ لیکن میرا خیال ہے کہ عمیق حنفی کی شاعری پر یہ جکبلی قبائیں اپنی کشادگی کے باوجود تنگ نظر آئیں گی۔ عمیق حنفی کے تخلیقی شعور اور فن کا مطالعہ وجودیت یا کسی اور مغربی فلسفہ کے حوالے سے نہیں بلکہ اُن کے شعلۂ ذات اور اس معاشرتی ماحول کے حوالے سے ممکن ہے جس نے اس شعلہ کو سنگ ہی نہیں روغن بھی دیا ہے۔ انھیں خود اعتراف ہے کہ "میرا تجربہ تجرّد زدہ کا نہیں، غیر انسانی انسان کا تجربہ اور میرا مسئلہ منفردات کا نہیں، معاشرتی انسان کا مسئلہ ہے۔"[2] عمیق حنفی کے اس بیان میں کسی بناوٹ کو دخل نہیں ہے۔ اگر یہ صحیح ہے کہ یہ غیر انسانی انسان اپنی ٹھوس شکل میں کبھی کبھی عمیق حنفی کی شاعری میں متوسط طبقہ کا ایسا جذباتی فرد نظر آتا ہے جو شہروں میں صنعتی خرسامانی اور کبھی فیوڈل قصبوں کا تاراجی خائف ہو کر حسرت سے جنگل کی طرف دیکھتا ہے اور انسانی تہذیب کے ارتقا سے منکر ہو کر اُس کو بجائے تہذیب کی علامت سمجھتا ہے ریچھ گوشت کی خوشبو[3] یا پھر وہ انسان کی فطری جبلتوں کی تحریک و تسکین کے لئے جنگل اور غاروں کی پناہیں ڈھونڈتا ہے (ایک لمحہ[4] ـــــ کیوں کہ؟) فطرت کی طرف واجعت کی اس خواہش کو عصرِ حاضر کی صنعتی اور سرمایہ دارانہ تہذیب کے جبر و بیداد کے تناظر میں بھی سمجھا جاسکتا ہے۔ صنعتی عہد کی بربریت کا احساس شاید ہمیں اس لئے بھی زیادہ ہے کہ ہم ابھی جاگیرداری نظام کو فنا نہیں کر سکے ہیں اور ہم میں سے اکثر اسی ماحول میں پلے بڑھے ہیں۔ اسی لئے عمیق حنفی آج کے شہر کو قدیم سامنتی عہد کے شہر کی فصیل یا شہر پناہ سے الگ کر کے نہیں دیکھ سکے ہیں۔ انھیں فصیل شہر کے سایہ میں جوالا مکھی اور موت چھپے نظر آتے ہیں۔

دہکتی سانپ چھتری' چھاؤں
چھپائے جوالا مکھیوں کے دہانے بے شمار
چھپائے ان گنت بم مُعت
فصیل شہر کے سایہ میں گھٹی جاتی ہے یکسر

(فصیل شہر کا سایہ)[5]

لیکن جب پیٹ اور پیٹھ کی مار ـــــ یا روٹی کے مل جانے کا سوال آتا ہے تو عمیق حنفی اپنی نشست سے نیچے اُتر کر عام انسان کے چہرے کی زردی اور ضعف ہی نہیں دیکھتے اُس کے ماتھے کی شکنیں بھی گنتے ہیں یہ محنت کش انسان بیچ پاکر جو کچھ اُٹھاتا ہے وہ کا بے مجبُدلیوں کا سونا

۱ے شجر صدا - صفحہ ۵
شاعر بمبئی

۳ے نشانات، ایک تاثر Art Saga ۴ے شجر صدا صفحہ ۹ ۔ ۵ے شجر صدا صفحہ ۳۵

بن جاتا ہے اور قیمتوں کا سر آسمانوں سے ٹکراتا ہے۔ اِسے اس نظام میں اپنی محنت کا صلہ پانے کے لئے اب ایک ہی راستہ نظر آتا ہے

بیج نہیں، اب وہ مٹی کھود رہا ہوں
جس سے بارود کے ڈنٹھل پھوٹیں
آگ کی کونپل جیسے بن جائے
لاوے کی لہریں بہہ نکلیں

(مٹی بو دینے کی دُھن)

کہا جا سکتا ہے کہ اِس عہد میں جب سائنس صنعت اور ٹیکنولوجی کی برکتوں اور نعمتوں پر شہر کے اعلیٰ اور خوشحال متوسط طبقہ کا اجارہ ہے اور محنت کش غریب انسان اُن سے آج بھی محروم ہے تو تنہائی، بے گانگی اور محرومی کا حقیقی کرب تو اُسے محسوس ہونا ہی چاہیئے۔ اور وہ محسوس کر بھی رہا ہے لیکن جدید شاعر کو اتنی مہلت کہاں کہ وہ اس کی رُوح میں جھانک کر اُس لرزا دینے والے کرب کی گہرائی کا اندازہ لگائے۔ اور انسانی بے حسی کی راکھ میں ڈھل جانے والے اس کی برہمی کے انگاروں کو دیکھے —— عمیق حنفی کی بے شمار نظموں میں اس کرب و تشنج کے سانپ بھری ہوئی ناگنوں کی طرح رینگتے نظر آتے ہیں۔ انتہا ہے۔ اُبال۔ نئی حمد اور دعا جیسی نظموں میں اُنھوں نے عام انسان کے احساسِ محرومی کو جس موثر اور موزوں پیکر میں پیش کیا ہے اُس کی مثال گزشتہ چند برسوں کی اُردو شاعری میں (اخترالایمان کی نظموں کے علاوہ) مشکل سے نظر آئے گی۔

رات میری آگہی نے
روشنیٔ طبع نے
اندر اندر آسمان بنتی ہوئی سبز آگ نے
شہر کی سڑکوں کے دو رُویہ ستونوں پر سجا ڈالے ہزاروں سر
کر دیئے آراستہ دہشت سے جیسے درختوں پر
نالیاں پی لیں تو قے کر دیں وہ گندہ خون
خاک پر ٹپ ٹپ ٹپک کر جم رہا ہے
ایک کالا آئینہ سا بن رہا ہے
جس کی عبرتناک سطح
سارے گوداموں میں پوشیدہ ذخیروں
اور آمیزش کے نسخوں
اور وہ نمبر کی دولت کے ٹھکانوں کی جھلک دکھلا رہی ہے

(شاعر، بمبئی)

کچھ نہیں ہوتا یہاں میرے وطن میں کچھ نہیں ہوتا
جو بھی کچھ ہوتا ہے صدہا سال میں اک آدھ بار
یا تو اُوپر سے اُترتا ہے
یا سمندر پار سرحد پار سے آتا ہے اور چھا جاتا ہے

(انتہا ہے)

طنز کے تیکھے احساس میں شرابور یہ دردمندی اور عام انسان کے مقدر سے وابستگی اور یگانگت کا یہ احساس عمیق کی دوسری نظموں میں بھی دیکھا جا سکتا ہے۔

ذات کی شکست و ریخت، ذہنی گم گشتگی، انتشار اور ریزہ خیالی کے اس دَور میں جب کہا جا رہا ہے کہ مربوط اور مسلسل فکر اور صاف شفاف لفظی تصویروں سے آراستہ فن —— جدید نہیں ہو سکتا۔ اور یہ کہ اسی لئے یہ عہد مختصر نظم کا ابہام و علائم کا دَور ہے تو یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ عمیق حنفی طویل نظم کی طرف مائل ہیں۔ کیا اس لئے کہ روشِ عام سے گریز یا بغاوت مقصود ہے۔؟ یا اس لئے کہ سرچشمۂ معنی یا انسانیت سے اپنے کسی پُراسرار گہرے رشتے کی تحریک پر اُنھوں نے اِس عہد کے شکست و انتشار اور معدود کرب کو سمجھنے کی ریاضت کی ہے —— بے آہنگی کو ایک آہنگ دینے اور نراج یا بے ہیئتی کو ایک سیّال ہیئت میں ڈھالنے کی اس شعوری کوشش نے اُن سے وہ طویل نظمیں کہلائی ہیں جو عصرِ حاضر کی شاعری میں اُن کا منفرد حصّہ ہیں۔ میری مراد ہے سندباد۔ شہرزاد۔ شب گشت، سیارگاں اور ویت نام جیسی نظمیں —— ذاتی طور پر میں اِن نظموں کو عصرِ حاضر کی حیثیت کا بہت موثر اور معتبر اظہار سمجھتا ہوں۔ مجھے اِن نظموں میں خود اپنے ذہن کی گرہیں اور اپنی ذات کی نامعلوم پرتیں کھلتی ہوئی نظر آتی ہیں —— دس پندرہ سال پہلے میں نے عمیق حنفی کی شاعری میں جذبے کی بے جا کفایت کا شکوہ کیا تھا اور کہا تھا کہ اس کے نتیجہ میں شاعری لیک سے ہٹ کر کچھ اُبڑ کھابڑ سی زمین میں اُتر جاتی ہے۔ اب محسوس ہوتا ہے کہ اُن کے یہاں لیک سے ہٹ جانے کا جو انداز ہے۔ فکر و خیال کی بنجر اور کنواری زمینوں اور احساسات کے خاردار کنکروں میں اُتر جانے کی جو عادت ہے وہ زندگی کو ہر رُوپ میں دیکھنے پانے اور اُس سے لپٹ جانے کی خواہش کے سوا کچھ نہیں۔ زندگی اور تہذیبی ماحول سے اسی گہری وابستگی نے عمیق حنفی کی شاعری کو فکر و معنی کی شریت کا ایک انوکھا ذائقہ دیا ہے۔ زندگی —— جس کی تلاش میں وہ سرگرداں ہیں اِس عہد کے آشوب و عذاب کے صحرا میں کسی معصوم بچہ کی طرح بچھڑ گئی ہے۔

اس کی تلاش کسی بنی بنائی لیک پر چل کر پوری نہیں ہو سکتی۔ اسی لئے شاعر کبھی بحر و بر کے سیاح سندباد اور کبھی شہرزاد کا روپ بھر کر اُسے ماضی حال مشرق اور مغرب ہر جہت میں آواز دیتا ہے۔ ہر دیار، ہر کوچہ و بازار میں اسکی بے چین آنکھیں اُسے ڈھونڈتی ہیں۔

بھیڑ جاگی
چوکھٹوں پر بھیڑ
پانی کے نلوں پر بھیڑ
پاخانوں پہ بھیڑ
کوچہ و بازار چوراہوں پہ بھیڑ
مندروں اور مسجدوں میں چند سائے
آ گئے تو آ گئے نظر ورنہ نہ آئے
(شہرزاد)

طبقاتی جبر، مشینی نظام، بے دریغ استحصال اور افلاس کی بھٹیوں اور غاروں سے نکلتی ہوئی یہ برہنہ بھیڑ بے ہیئت زندگی عمیق کی نظموں میں اکثر سانس لیتی نظر آتی ہے۔ اس طرح کہ انسانی تہذیب و تمدن کی فتوحات کے سارے دعوے اس کے ننگے بدن پر کوڑھ کے داغوں کی طرح چمکنے لگتے ہیں شاعر جو زندگی کو انسانی قامت اور انسانی قدروں کی اکائی کے روپ میں پہچانتا ہے یہ سب دیکھ کر تلملا اُٹھتا ہے۔ وہ برسرِ راہ سحر بیٹھا سوچتا ہے

اس قدر روشنی میں
ڈھونڈ لینا تجھے ایسا مشکل نہ تھا
تو یقیناً مری ذات میں کھو گئی
ڈھونڈتا ہے تجھے اپنے اور لیقۂ ذات میں
اک یہی ایسی دنیا ہے جس میں ابھی
روشنی، ریڈیو، پریس، ٹیلی ویژن
کوئی پہنچا نہیں — سندباد

یہاں عمیق کی نظموں کے تفصیلی تجزیہ کا موقع نہیں ہے۔ وہ اپنی نظموں میں اکثر بول چال کی زندہ زبان سے کام لیتے ہیں اور عام انسان کے احساس و شعور یا اُس کے جذباتی آہنگ سے قریب تر رہنے کی کوشش میں ابہام سے محفوظ ہو جاتے ہیں۔ ان کی طویل بحروں کے زیر و بم میں کبھی کبھی لوک گیتوں کا سا گھریلو اور پیچ اظہار کی سادگی اور معصومی دکھائی دیتی ہے۔ اس میدان میں وہ اپنے بہت سے معاصرین سے الگ ایک ٹیلے پر تنہا بیٹھے نظر آتے ہیں۔ وہ لفظوں کی بے رنگ کوڑیوں سے بھی اپنے فکر کے رنگا رنگ منظر بنا نہیں دکھاتے

شاعر، بمبئی

پس منظر کی تفصیلات کے نقش بھی اُبھارتے ہیں۔ لیکن اُسی تسلسل اور ترتیب سے جس طرح وہ ان کے وجود میں منعکس ہوتی رہی ہیں۔ اس کے علاوہ وہ جن علامتوں اور استعاروں سے کام لیتے ہیں وہ یا تو عصرِ حاضر کی روزمرہ زندگی سے تعلق رکھتے ہیں یا پھر ایسے اساطیر داستانوں اور لوک کلا کے ایسے مظاہر سے جو ہمارے تہذیبی شعور میں رچ بس چکے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کی بیشتر علامتیں ابہام اور ژولیدگی کے بجائے زیادہ شفاف روشن اور واضح تر ترسیل کا ذریعہ بن جاتی ہیں۔ دوسری طرف اُنکی شاعری کی یہ زمینی فضا خاکِ وطن کے ہر ذرّے سے اُن کی بے پایاں محبت کا کا ثبوت ہے — اپنی تہذیب کے انمول خزانوں اور ان کے پیچھے صدیوں سے بہتے ہوئے — اہلِ وطن کی تخلیقی محنت کے نغمہ ریز دھاروں کو جس طرح اُنھوں نے دریافت کیا ہے اور اس سے کام لیا ہے وہ اُن کے کسی دوسرے معاصر سے نہ ہو سکا۔ اس آگہی نے اُن کے تخیل کو اتنا سیراب اور احساسِ جمال کو شاداب کیا ہے کہ بے آب نئی اُداس زمینوں میں بلانک کر بھی وہ شاعری کے پھول کھلانے کی قدرت رکھتے ہیں۔ ○○

نارسی سس سے آگے

شمیم حنفی
شعبۂ اردو، مسلم یونیورسٹی۔ علی گڑھ

شہرِ صدا کی ایک نظم کا اقتباس ہے:

سمندر کی سیاہی پر وہ پیلی روشنی کے پھول
جہازوں نے بکھیرے ہیں
اندھیرے میں نظر آتا نہیں جن کا کوئی مستول
جہاز آرام کرتے ہیں۔
جہازی شہر کے عشرت کدوں میں غوطہ زن ہوں گے۔

ہجومِ حشر ساماں کے سمندر میں
جہازی چند قطروں کی طرح گھل مل گئے ہوں گے
یہاں تو نارسی سس بھی جو چاہے، خود گرفتہ رہ نہیں سکتا.....

میں اُس رویے کا مخالف ہوں جو کسی نظم کو محض خیال کی دستاویز کے طور پہ دیکھتا ہے اور خیال کے کسی نقطے کو نظم کے "کُل" سے الگ کر کے، اسے ایک فکری یا سماجی مسئلے کے طور پر برتتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس طرح نظم نظم نہیں رہ جاتی، موضوعِ گفتگو کا ایک ذریعہ بن جاتی ہے۔ لیکن اس وقت چونکہ عمیق حنفی کے شاعرانہ عمل کی جانچ یا قدر و قیمت کا تعین مقصود نہیں، اس لئے میں مذکورہ اقتباس کے حوالے سے ان کے شعور کی چند جہتوں کی جانب صرف اشارے کروں گا۔

واقعے کی حد تک، اس نظم میں سمندر سے مراد —— ایک شہر کے دہانے سے لپٹا ہوا، پانی کا ایک گہرا، پُر اسرار اور بے کنار منظر ہے۔ رات کی تاریکی کے غلاف میں لپٹا ہوا شہر بھی سمندر ہے کہ وہاں قطروں کا شمار اور تفریق ممکن نہیں رہی۔ مگر ہجومِ حشر ساماں کا سمندر، جس کی ترکیب میں ٹھہرے ہوئے اور ٹھوس مظاہر شامل ہیں، اس ا، بارے اُس سیّالی اور متحرک سمندر کے مقابلہ میں کم مایہ ہے کہ اُس کی بے کرانی میں رنگ اور خط اور آواز کا ہر نقش بالآخر ڈوبتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ تجربے کے اس موڑ پر یہ نظم ایک نیم روشن علامتی زاویہ اختیار کر لیتی ہے اور واقعے کی بجائے اُس میں چھپی ہوئی لا امکاں حقیقت کا استعارہ بن جاتی ہے۔

خیال کی سطح پر —— اس اقتباس سے تجربے کی وہ جہت سامنے آتی ہے، جو مظاہر کے تماشے میں ذات کے اثبات اور اُس کی نفی کے مسئلے سے مربوط ہے۔ یہ مسئلہ عمیق حنفی کی شاعری میں، سنگ پیراہن کی سادہ فکری کے دور سے اب تک کے پیچیدہ ادراک کی منزل تک، ایک مسلسل ذہنی اور جذباتی اور حسی اور اعصابی کشمکش کے دائرے کی حیثیت رکھتا ہے۔ شعر کہنے کے ساتھ ساتھ عمیق حنفی نے اس عرصے میں چند مضامین بھی لکھے ہیں اور کچھ نئے مباحث کے محرک اور موضوع بھی بنے ہیں۔ اُن کی اس کشمکش کا دائرہ کبھی محدود دکھائی دیتا ہے۔ اور کبھی وسیع، مگر اس کا وجود ہمیں کا توں قائم ہے۔

میں عمیق حنفی کی تخلیقی زرخیزی کو، اُن کی فکر کے تحرک، رفتار اور ارتقاء کو، اُن کی آگہی کے مسلسل سفر اور جستجو کو، اس کشمکش سے الگ کر کے نہیں دیکھ پاتا۔ شاید یہ کہنا بھی غلط نہ ہوگا کہ یہ سب اُن کی اسی کشمکش کی اذیت کے عطیات ہیں۔ اور شاید اسی بنا پر، یہ احساس بھی ہوتا ہے کہ اُن کے بیشتر پیش رووں اور معاصرین کے برعکس عمیق حنفی کی شاعری واردات کا ایک بہت وسیع منظر نامہ ہمارے سامنے لاتی ہے۔ "یہاں تو نارسی سس بھی جو چاہے، خود گرفتہ رہ نہیں سکتا"۔ اُن کے پیش رووں میں کچھ نے کچھ نے خود گرفتگی کو ایک قدر کے طور پر برتا، مثلاً میراجی، اور اُن کے حلقے کے شعراء جن میں اکثر فرانسیسی عہدِ انحطاط کے شاعروں کی طرح، مانوس اشیاء اور حقائق سے ربط کو سوقیت کے مترادف سمجھتے تھے۔ اور سیاسی یا سماجی واردات کے بیان سے قصداً گریزاں تھے کہ اس طرح اپنی ذات کہیں بے چہرہ ہجوم کا حصہ نہ بن جائے۔ ایک دوسرے حلقے نے خود گرفتگی کو بیماری سمجھا، مگر ایک بیرونی منطق کے طلسم میں اس حد تک گرفتار ہو گیا کہ اس منطق کے تصور میں ادغام کے بعد، صرف اُس تصور کے حوالے سے اُس کی پہچان ممکن رہ گئی۔

یہ خود گرفتگی کی ایک اجتماعی شکل تھی۔

عمیق حنفی کی شاعری کا میرا جی کی خود گرفتگی کے تخلیقی منطقے اور ان کے مخالف گروہ کی خود گرفتگی کے نظریاتی اور اجتماعی منطقے، دونوں کی گرفت میں نہیں آتی، یا دوسرے لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ دونوں کے بیچ بیچ سفر کرتی ہے۔ "شجر صدا" میں "مقالات" کے عنوان سے اپنے ذہنی اور فنی عمل کے ذکر میں عمیق حنفی نے اس امر کی نشاندہی بھی کی ہے کہ انہیں "بدھ" "عیسیٰ" "محمدؐ" اور "مارکس" کے فکری نظاموں کا ایک وجدانی اور الہامی وحدت کا احساس ہوتا ہے۔ (اور ایسا "بدھ" کے سکوت اور مارکس کے جنّ انکار کے باوجود ہوتا ہے)" یہ وجدان یعنی ارفع تر عقل اور مادی استدلال یعنی غیر شخصی اور غیر جذباتی تعقل کو شعور کی ایک ہی سطح پر کھینچنے کی کوشش ہے۔ یہاں یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ کیا بانیانِ مذاہب کے فکری نظاموں کو جذباتی حوالوں سے آزاد کر کے دیکھا جا سکتا ہے؟ اور کیا کسی مادی اور تاریخی دائرے میں محصور نظام کو وہ ہمہ جہتی آزادی حاصل ہو سکتی ہے جو مذاہب کے حصے میں آئی ہے؟ ظاہر ہے کہ دونوں کے مابین نوعیت اور نصب العین کے فرق کا ایک لمبا فاصلہ حائل ہے۔ اس فاصلے کو عبور کرنے کے لئے، اگر اُسے عبور کیا جا سکے، ذات کے اثبات اور اس کی نفی، دونوں میں مفاہمت کی کوئی راہ نکالنی ہوگی۔ عمیق حنفی سنّاد کے شہر لاالٰہ سے گزر کر اثباتِ ذات تک پہونچے تھے، اس سفر کی اگلی منزل تک رسائی اُس تختے کی مدد سے ہوئی جسے صلصلۃ الجرس میں اُنہوں نے سفینۂ نوح سے بڑے سہارے کی شکل میں دیکھا ___ اور سفر ابھی جاری ہے۔ فقدانِ عقیدہ کے بعد عقیدے کے حصول کی وہ تصویر عمیق حنفی کی شاعری میں نہیں اُبھرتی جس کی طرف ایلیٹ نے اشارہ کیا ہے۔ ان کی کشمکش کا بنیادی سبب یہی نارسائی اور اسی نارسائی کی زائیدہ ناآسودگی ہے۔ اور چونکہ اُن کا مسئلہ معاشرتی انسان کا مسئلہ ہے (خود ان کے الفاظ میں)، اس لئے اس ناآسودگی میں مادی مسائل کی جہت یکساں اہمیت کی حامل ہو جاتی ہے اور اُس سے وابستہ سوالات کے حل کی خاطر وہ مارکسزم کے تاریخی فلسفے کی جانب قدم بڑھاتے ہیں۔

ذہن اور جذبے کی اس کھینچا تانی میں اُنکی شاعری کسی واحد المرکز تجربے کی حد قبول نہیں کرتی۔ نتیجۃً ایک دائمی جستجو اور بے چینی ان کی تخلیقی شخصیت کا استعارہ بن گئی ہے۔ "شجر صدا" کی ایک نظم "ابال" میں اس کیفیت کا اظہار عمیق حنفی نے ایک ٹھوس استعارے کی مدد سے کیا ہے:

ہزاروں برس سے مری آتما اِک نگر میں پھنسی رہ گئی تھی

جب انسان نے پتھروں کو رگڑ کر کبھی لال سورج کی سُرخ آتما کو بلانے لگا تھا۔

مگر تیز آنچ اور بہت تیز ہونے لگی پھر بجھا تو اب آنکھ پھاڑے ہوئے دم بخود ہے

اُبلنے لگیں سبزیاں پھول پھل گوشت والیں اناج

شاعر بمبئی

ابھی شور بے کے کھد کنے کی آواز چھائی ہوئی تھی

ابھی سانپ چھتری لگائے ہوئے بھاپ نیلے خلاؤں کی جانب رواں ہے۔

وہ جس کی ضیافت کی تیاریاں تھیں کہاں ہے؟

مری آتما جاگ کر چیختی ہے

یہ ہانڈی اُبلنے لگی ہے

یہ مٹی کی ہانڈی اُبلنے لگی ہے۔

یہ مٹی کی دیوانی ہانڈی اُبلنے لگی ہے

اس نظم میں عرفانی انسان کے تجربے کی حدیں بالآخر معاشرتی انسان کی حدوں سے آملی ہیں۔ ہزاروں برس پہلے، تاریخ کے دھندلکوں میں بھٹکتی ہوئی نگاہ انجام کار لمحۂ موجود میں الجھ جاتی ہے۔ یہ احساس اس آشوب کے تاثر کو اور بھی گہرا کر دیتا ہے کہ:

دائرے میں گھومنے کا نام کیوں ہے ارتقاء

دائرے کو توڑتے رہنا ترقی کی کلید

آج کا اخبار کل ردّی کی ڈھیری میں شمار

کل کی ردّی آج کا اخبار

چنانچہ دل کہتا ہے کہ:

"اس کمینے دائرے سے اپنے روز و شب نکال"

یہ جستجو اپنے ناگزیر احساسِ اذیت اور اضطراب کے ساتھ یونہی سفر کرتی رہتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ عمیق حنفی کی پوری شاعری ایک کبھی نہ ختم ہونے والے جاں گداز سفر کی روداد ہے۔ گاہے گاہے اس سفر میں منزلوں کے جن نشانات کا سراغ ملتا ہے۔ اور جنہیں "شعلے کی شناخت" میں وہ اسلام اور اشتراکیت کے جذباتی اور منطقی حوالے سے تعبیر کرتے ہیں، اُنکی جستجو اور بے اطمینانی کے تناظر میں، یہ نشانات بھی مجھے محض ایک اضطراری تشویق کا کرشمہ یا دھیان کی آتی جاتی لہر نظر آتے ہیں۔ ایسا نہ ہوتا تو شاید عمیق حنفی کی شاعری تکرار زدگی کے عیب سے خود کو محفوظ نہ رکھ پاتی۔ اُن کا امتیاز یہی ہے کہ واردات کی کسی ایک لہر یا تجربے کی کسی ایک جہت سے مشروط ہوئے بغیر اُن کا شاعرانہ تخیل منظر کی ہر سطح پر کمند ڈالتا ہے، ہر حقیقت کو اپنا تجربہ بنانے کی سعی کرتا ہے اور کسی بھی امتناع یا حجاب سے خوفزدہ نہیں ہوتا۔ فکری، جذباتی، لسانی اور فنی ہر سطح پر امتناعات کو مسترد کرنے کی وہ مثالیں جو عمیق حنفی کی شاعری فراہم کرتی ہے معاصریت سے قطع نظر، اُردو کی تمام تر شعری روایت میں کمیاب ہیں۔

جہاں تک انسانی تجربات کی عکاسی کا تعلق ہے Dehumanization

باقی صفحہ ۵۰ پر دیکھئے۔

عمیق حنفی کی غیر مطبوعہ نظمیں

اے ازل سے...

اے ازل سے تا ابد صاحب فروغ
اے جمالِ بے حجاب
اُودی کہرے سے
دھوپ سے زربفت
اور ریشم چاندنی سے
بارہا لینے کو میں نے لے لیا
لفظ، شر، رنگوں کا پیراہن مگر
پھر بھی مجھ سے سل سکا
تو تعین کی حدوں میں کیوں نہ مجھ کو مل سکا۔

▲

آئے بسنت

شہر کی آنکھوں کی سطح صاف ہو
تو دل میں اترے ڈھاک کے پھولوں کی آنچ
شہر کے نتھنے کھلیں تو موجۂ بادِ جنوب
آم پر بور آچکا ہے یہ خبر پھیلائے
شہر کے کانوں سے نکلیں شور و غل کے ڈاٹ
تو چھوئے شہ رگ کو کویل کی پکار
شہر کی جاں سے غبارِ شہر کا بادل چھٹے
تو ہوائیں خمسہ کی نگری میں بھی آئے بسنت

▲

سمندر سے پیاسوں کا رشتہ

کنوئیں کے تلے میں
کوئی پھینکے پتھر
تو ممکن ہے چنگاریاں پھوٹ نکلیں
ندی سوکھ جائے
ہواؤں سے بجنے لگے جھیل تل کی
کھنکتی ہوئی خشک مٹی
مگر
سمندر کبھی خشک ہوتا نہیں
سمندر کو بے آب ہوتے ابھی تک تو دیکھا نہیں
مگر یہ بھی سچ ہے
اگر بادلوں کی وساطت نہ ہو
سمندر سے پیاسوں کا رشتہ بھی جڑتا نہیں

▲

شاعر۔ بمبئی۔

دکانیں

عقیدے واہموں کی داستانیں بن رہے ہیں
اُجالے سنگِ مرمر کی چٹانیں بن رہے ہیں
سراپا خامشی منقار زیرِ پر سحر ہے
سکوتِ شب کے افسانے زبانیں بن رہے ہیں
الٰہی تیری دنیا میں یہ سب کیا ہو رہا ہے
صنم خانے برہمن کی دکانیں بن رہے ہیں

▲

وضع احتیاط

میں شاعر ہوں
دیوانگی میرا شیوہ
اِس لئے میرا دل مجھ سے ڈرتا بہت ہے
مجھے صحبتِ سنگ کا خبط
اور دل میرا شیشے کی مانند نازک
سنگ و شیشہ کے ٹکراؤ کے ہر نتیجے سے واقف
میرے ہر ایک محبوب پتھر کو سینے سے اپنے لگائے ہوئے ہے

▲

نتھنگ ٹو رپورٹ

سُرخ بتی جل رہی ہے
مائکروفون اور ایمپلیفائروں کا رابطہ
آواز کی لہروں کا زیر و بم
نشریئے، آلات سب کچھ ٹھیک بالکل ٹھیک
برقیوں کا آئینہ بھی صاف
پھر بھی غائب فیڈ بیک
کوئی سیٹ اِس فریکوئنسی پر نہیں ہے ٹیون
میری آوارہ صدا کو زہر کھاتا ہے خلاؤں کا جنوں

▲

آدم خور

آغا رشید مرزا
۱/۱۲، نوبتگلیس ایکسٹینشن روڈ - کلکتہ - ۱۷

سیٹھ نتھو رام اپنے کنڈیشنڈ کیبن میں گھومنے والی کرسی پر نیم دراز تھے کرسی اور میز کے درمیانی فاصلے کو اُن کی توند نے پاٹ رکھا تھا۔ جب وہ ہنستے تھے تو ایک نامعلوم گہرے سمندر کی طرح اُن کی توند میں لہریں اُٹھتی تھیں۔ چھوٹے لال اُن کی فیکٹری کا ایک معمولی کاریگر اُن کے سامنے کھڑا پانچ سو روپے قرض کے لئے گڑگڑا رہا تھا۔ صرف پانچ سو روپے میں وہ اپنی من پسند لڑکی سے شادی کر سکتا تھا۔ اپنا گھر بسا سکتا تھا۔ اپنی زندگی بنا سکتا تھا۔ وہ لڑکی کے باپ سے وعدہ کر چکا تھا۔ اگر اُس نے دو روز کے اندر اندر پانچ سو روپے نہ دئے تو وہ اُس کا رشتہ توڑ کر کسی دوسری جگہ لڑکی کی شادی طے کر دے گا۔ یہ دوسری جگہ کون سی تھی۔ چھوٹے لال جانتا تھا معلوم نہیں راجہ شراب پی پی کر بے دردانہ سانولی کی ہڈیاں توڑا کرے گا۔ یا روپیہ لے کر اُسے کہیں اور چلتا کر دیگا۔ وہ اکثر سوچا کرتا۔ اُس کا باپ اپنی بیٹی کا نیلام کر رہا ہے کیونکہ اُسے روپے کی ضرورت ہے اور یہ اُس کی مجبوری ہے۔ چھوٹے لال اپنی محبت کا نیلام ہوتے دیکھ رہا ہے کیونکہ اُس میں روپیہ دینے کی طاقت نہیں ہے اور یہ اُس کی مجبوری ہے۔ وہ مجبوریوں کی ان دونوں دیواروں کو گرا دینا چاہتا تھا اسی لئے تو وہ سیٹھ کے آگے ہاتھ جوڑ کر گڑگڑا رہا تھا۔

سیٹھ اُس کے گڑگڑانے سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ اُسے بڑی طمانیت حاصل ہو رہی تھی۔ اُس بے عزتی کے بدلے جو کچھ دن پہلے یونین کے ہاتھوں اُسے اٹھانی پڑی تھی۔

چھوٹے لال سیٹھ کے سامنے ایک اُمید و بیم کے عالم میں کھڑا تھا۔ سیٹھ کی ذرا سی مسکراہٹ سے اُس کے دل میں اُمید کی ایک لہر دوڑ جاتی اور اس کی خاموشی سے دل نا اُمیدی میں ڈوب جاتا۔ چھوٹے لال جب گڑگڑاتے گڑگڑاتے خاموش ہو گیا تو سیٹھ نے سُرور سے بند اپنی آنکھیں کھولیں جیسے اب تک وہ کوئی نغمہ سُن رہا تھا۔ اور چھوٹے لال کی طرف دیکھے بغیر بولا۔ چھوٹے لال اب تو یونین نے تمہارے ساتھ سے ایکدم ایک سو بیس کرا دئیے۔ اوور ٹائم کرا دیا۔ پراویڈنٹ فنڈ کرا دیا۔ اور کیا چاہئے تمہیں۔ جاؤ یہ بھی یونین سے کہو۔ وہی کچھ انتظام کر دیگی تمہاری شادی کے لئے بھی۔ چھوٹے لال نے پھر ہاتھ جوڑ کر گڑگڑاتے ہوئے کہا۔ نہیں سیٹھ یونین کیا کرے گی۔ کرنے والے تو سب آپ ہی ہیں۔ میں یونین کیا جانوں۔ وہ تو دھر بابو کے کہنے میں آ کر یوں ہی شامل ہو گیا تھا۔ ہونہہ! سیٹھ کی بھنوئیں غصہ سے تن گئیں۔ مجھے آفس میں بند کر کے آگے تالہ لگانے اور گالیاں دینے میں کون سب سے آگے تھا؟ تم یا دھر بابو ـــــ اتنے میں ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ سیٹھ نے ٹیلیفون اُٹھایا اور آواز سُن کر اُس کا گیا ہوا موڈ واپس آ گیا۔ غصہ کی جگہ مسکراہٹ نے لے لی۔ جیسے کسی نے بجلی کا بٹن دبا دیا ہو۔ سیٹھ نے مائتھ پیس پر ہاتھ رکھ کر چھوٹے لال سے کہا۔ اب تم جاؤ پھر کسی وقت آنا۔ لیکن چھوٹے لال کے پاس پھر آنے کا وقت کہاں تھا۔ وہ اب بالکل نا اُمید ہو گیا۔ ان چند لمحوں میں اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے اُس کی موت ہو چکی ہے۔ اور وہ اپنی لاش اپنے کندھوں پر اُٹھائے کیبن سے باہر جا رہا ہے۔

چھوٹے لال کے جانے کے بعد سیٹھ نے ٹیلیفون پر بات شروع کی: "اے یار کتنی راہ دکھائی تم نے ـــــ کچھ ہوا انتظام ـــــ تمہارے مُنہ میں گھی شکر ـــــ یہ ہوئی نا بات۔ تو پھر آج کا پروگرام پکا رہا۔ اچھا یہ بتاؤ وہ مِعاملہ ہے کہاں کا۔ جاپانی، انگلش، امریکن یا فرنچ خیر جو بھی ہو یہاں تو آم کھانے ہیں ـــــ پیڑ گننے سے کیا ـــــ ہاں دیکھ سب اپنا اپنا مال ساتھ لے کر آئیں ـــــ اور سُنو۔ میرے ساتھ دو وی آئی پی فرینڈز بھی ہیں۔ دراصل میں اُنہیں کے لئے اتنے دنوں سے تمہارے پیچھے پڑا ہوا تھا۔ اُن کے لئے بھی ایک ایک روم کا انتظام کر دینا۔ تمہارے گیسٹ ہاؤس میں کیا کمی ہے۔ مال تینوں کے لئے میں اپنے ساتھ لیتا آؤں گا اور آٹھ بجے تک پہنچ جاؤں گا۔ اپنے ملنا۔ آئی پیز کو تمہارے گیسٹ ہاؤس کا ایڈریس دے دوں گا۔ وہ پہلے پہنچ جائیں گے۔ جب تک میں نہ آؤں ذرا اُن کا خیال رکھنا۔"

اس کے بعد سیٹھ نے اپنے گھر ٹیلیفون کیا۔ اور سیٹھانی سے کہا کہ وہ آج رات کو گھر نہیں آئے گا۔ آفس سے ہی کسی کام کے لئے شہر سے باہر چلا جائے گا۔ پھر تیسرا ٹیلیفون ملایا ـــــ ہلو! کون۔ آنٹی جی ہیں۔ اُن سے کہو۔ ایم۔ این۔ سیٹھ جی لائن پر ہیں۔ ہلو۔ آنٹی ـ کیسی ہو ـــــ یہ تو بتاؤ کچھ بڑھیا چاکلیٹ ہے تمہارے سٹاک میں

اس وقت۔ تین ہیں چاہئیں آنٹی۔ دو دی۔ آئی پیز کو بھی انوائٹ کر لیا ہے۔ ہاں کچھ نہ کچھ کام دھندا تو لگا ہی رہتا ہے۔ بس ایسی چیز ہو کہ تمہارا نام رہ جائے اور میرا کام ہو جائے ـــــ وہ بات چھوڑو آنٹی ــ تم تو جانتی ہو میں کبھی بھاؤ تاؤ نہیں کرتا۔ مال پسند آنے پر بات ہے۔ میں ساڑھے سات بجے تک پہنچ جاؤنگا ــ" پھر اس نے اپنے دونوں وی۔ آئی پیز کو ٹیلیفون کیا اور انھیں آٹھ بجے تک گیسٹ ہاؤس پہنچ جانے کی تاکید کی۔

شام کے چھ بجے اس نے باتھ روم میں ہاتھ منہ دھویا۔ بسنک کے اوپر لگے ہوئے آئینہ میں اپنے چہرے کا جائزہ لیا۔ پھر بال سنوارتے ہوئے وہ سوچنے لگا' اگر بینک سے دس لاکھ کے قرضہ کی منظوری تیواری دلوا دیتا ہے۔ اور رامن پبلک آکشن کے بجائے پورا مال اس کو الاٹ کر دیتا ہے تو مہینہ بھر کے اندر اندر اپنی گرہ کا پیسہ لگائے بغیر وہ ڈھائی تین لاکھ سب دے دلا کر بنا سکتا ہے۔ ہینگ لگے نہ پھٹکری اور رنگ چوکھا آئے۔ اسی کو کہتے ہیں۔ وہ یہ سوچ کر مسکرانے لگا۔ تیواری تو خیر پرانا کھانے پینے والا آدمی ہے۔ رامن بھی آج کی گولڈن نائٹ کے بعد رستہ پر آ ہی جائے گا۔ پھر منہ مانگی رقم بھی دے رہا ہوں۔ یہ ہی سوچتے سوچتے وہ کیبن میں واپس آیا۔ اور دروازہ اندر سے بند کر کے دیوار میں اپنی پشت پر لگی تجوری کو کھولا جس میں نوٹوں کے بنڈل تاش کے پتوں کی طرح خوبصورتی سے سجے اوپر سے نیچے تک بھرے ہوئے تھے۔ اس نے سو سو کے دو بنڈل نکال کر بریف کیس میں رکھے کچھ دیر کھڑا سوچتا رہا۔ پھر دس دس اور پانچ پانچ روپے کے تین چار بنڈل اور نکال کر بھر لئے۔

کارخانہ سے جاتے ہوئے اس نے دربان سے کہا: "دیکھو آج پھر یونین کا کچھ جلسہ میٹنگ ہونے والا ہے۔ پھر ڈرائیور کو گاڑی واپس گھر لے جانے کے لئے کہا اور خود ٹہلتے ہوئے باہر آکر ٹیکسی لی اور آنٹی کے ہاں پہنچ گیا۔

آنٹی آرام کرسی پر نیم دراز اورنج جوس سپ کر رہی تھی۔ سیٹھ کو اپنے سامنے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے بولی: "سیٹھ تم اتنا جلدی آگیا۔ ابھی تو چھوکری لوگ کا ڈریسنگ میک اپ بھی نہیں ہوا۔" "کیا ضرورت آنٹی۔ مال اپنے اصلی رنگ میں ہی دکھاؤ۔" سیٹھ نے فوراً جواب دیا۔ آنٹی نے کچھ کہے بغیر گھنٹی بجائی اور ملازمہ کو اشارہ کیا۔ لمحہ بھر میں دوسرے کمرے سے تین نوجوان لڑکیاں سہمی ہوئی سی سیٹھ کے سامنے آکر کرسیوں پر بیٹھ گئیں۔ چند لمحوں کے لئے سیٹھ کی زبان گنگ ہو گئی۔ جیسے اس پر بجلی گر پڑی ہو۔ اس نے آج تک حسن میں اتنی معصومیت اور ایسی کشش کبھی نہ دیکھی تھی۔ اس وقت یہ نہیں سوچ رہا تھا کہ بھوک پیاس مفلسی اور مجبوری کے کس طوفان نے ان معصوم کلیوں کو توڑ کر بیچنے کے لئے یہاں لا ڈالا ہے۔ وہ تو یہ سوچ رہا تھا کہ کون سی کلی سے وہ رات بھر کھیلے گا شاید۔ بھیجی

اپنی سیج سجائے گا۔ اور کون کلیاں مہمانوں کے قدموں میں ڈالے گا۔ تھوڑی دیر بعد سیٹھ نے کہا" ٹھیک ہے آنٹی۔" اور آنٹی نے لڑکیوں کو اندر جانے کا اشارہ کیا۔

سیٹھ نے سوالیہ نظروں سے آنٹی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا: "ہاں تو بولو آنٹی کیا آفر کرو گی"۔ آنٹی نے اپنے دونوں ہاتھ اوپر اٹھا کر دس انگلیاں سیٹھ کو دکھاتے ہوئے کہا ــ "اونلی فار یو ــ" اور سرگوشی کے انداز میں آہستہ سے بولی۔ ایسا ایسا فلاور تم کو دیتا ہے جو ابھی تک کوئی ٹچ بھی نہیں کیا ہے۔ پھر اپنے ہاتھ کے انگوٹھے اور اس کے ساتھ ایک انگلی کو گول چھلے کی طرح ملا کر آگے پیچھے کرتے ہوئے ایک آنکھ بند کر کے کہا: "پیور ہنی"۔ خالص شہد ہے ــ" سیٹھ نے کچھ کہے بغیر بریف کیس کھولا اور سو سو کے نوٹوں کا دس ہزار کا ایک بنڈل نکال کر آنٹی کی طرف اچھال دیا۔ جسے اس نے فوراً لپک لیا۔ تب سیٹھ نے رازدارانہ لہجہ میں کہا ــ "آنٹی کہاں سے مار لائی ہو یہ مال؟ ــ" آنٹی کو یہ بات کچھ ناگوار گزری۔ اس نے نوٹوں کے اسی بنڈل کو دوبارہ ہوا میں اوپر اچھال کر لپکتے ہوئے کہا: "سیٹھ جدھر سے تم یہ مال مار کر لے آتا ہے۔ ویسا ہی ہم بھی لے آتا ہے۔" سیٹھ آنٹی کے طنز پر کچھ شرمندہ سا ہو کر خاموش ہو گیا۔ اور کرتا بھی کیا۔ اس نے بات کا رخ بدلنے کے لئے ذرا لجاجت سے کہا۔ اچھا آنٹی۔ آٹھ بجے تینوں کو گیسٹ ہاؤس بھجوا دینا۔ تم تو جانتی ہو سیٹھ بالاجی کا گیسٹ ہاؤس۔ تمہارا ڈرائیور بھی جانتا ہے۔ اور پلیز ذرا دلہن بنا کر بھیجنا۔ آنٹی نے سیٹھ کا شانہ تھپک کر تسلی دیتے ہوئے کہا: "ڈونٹ وری۔ ایک دم فرسٹ نائٹ کا برائڈ بنا دے گا۔"

گیسٹ ہاؤس میں آٹھ بجے تک سب مہمان جمع ہو گئے تھے جن کی تعداد پندرہ بیس کے قریب تھی۔ یہ سب اونچی سوسائٹی کے بڑے لوگ' سیٹھ لوگ اور افسر لوگ تھے جن میں سے کچھ کھا پی کر اور بلیو پرنٹ دیکھ کر اپنے جذبات میں ہیجان لئے وفادار خاوندوں کی طرح اپنی اپنی بیویوں کے پاس اپنے گھروں کو لوٹ جانے والے تھے۔ باقی سب کے ساتھ کال گرلز اور رات بھر کے لئے نو بیاہی ہوئی لڑکیاں تھیں جنھیں وہ ایک دوسرے کے گرل فرینڈ کہہ کر متعارف کرا رہے تھے۔

کچن میں باورچی طرح طرح کے کباب بھون کر تیار کر چکا تھا۔ سیخ کباب' شامی کباب' ٹکیہ کباب' کوفتہ کباب' پسندہ کباب جن کی خوشبو مہمانوں کے کپڑوں میں بسے لونڈر عطر اور لڑکیوں کے جوڑوں میں لگے ہوئے پھولوں کی خوشبوؤں کے ساتھ مل جل کر فضا میں پھیلی ہوئی تھی اور مہمانوں کے کام و دہن کی حس کو تیز کر رہی تھی۔ گیسٹ ہاؤس کا رنگین مزاج باورچی کام سے فارغ ہو چکا تھا۔ اس نے بوائے کو آواز دی' جسے ابھی آئے ہوئے دس مہینے سے زیادہ نہ ہوئے تھے اور جس کی عمر بھی دس سال سے زیادہ نہ تھی "بوائے اب تم جلدی سے اپنا کھانا کھا لینا۔ ہم لوگ بارہ بجے چلا جائیگا۔ آج ہم بھی پکچر دیکھنے

بھوکے رہنے سے پیٹ خاصا خراب ہو جائے گا۔ ہم صاحب کو بول دیا ہے۔" بُدّھو بچپن سے آخر میں سب کو کھانا کھلا کر کھانے کا عادی تھا۔ بولا" صاحب لوگ اور چاول لوگ کو کب ملے گا تب ہی تو ہم کھائیگا۔" باورچی نے جواب دیا: "اے بیوقوف۔ بنگلہ کا کچھ ٹھیک ہے۔ وہ آج کھانا کیا کھائیگا۔ دیکھا نہیں کیا کیا چھوکری لوگ آیا ہے۔ وہ لوگ آج خالی پیئے گا۔ کباب کھائیگا۔ بلو پرنٹ۔ ننگا پکچر دیکھے گا۔ پھر چھوکری لوگ کو کھائیگا۔ رات بھر۔ کھانا کدھر سے کھائے گا۔ جانتا ہے بلو پرنٹ!۔ ننگا پکچر۔ یہ سب بات تم نہیں سمجھے گا۔ جاؤ جلدی سے کھانا کھالو۔ پھر صاحب لوگ کا کام شروع ہو جائے گا۔ اور دیکھو یہ سب کباب کا ڈش۔ سوڈے کا باٹلی۔ گلاس۔ اُسے ہال میں میز پر سجا دے گا۔ چلتے ہوئے باورچی نے پھر ناصحانہ انداز میں بولے سے کہا — ایک بات اور تم کو بول دیتا ہے۔ جب تک صاحب بلائے گا نہیں اندر میں نہیں جائے گا۔ اور کمرے کے اندر میں کیا ہوتا ہے کسی دروازے سے بھی جھانک کر نہیں دیکھے گا۔ نہیں تو برباد ہو جائے گا۔ اتنا چھوٹا عمر میں — سمجھا! — بولے دیتا ہے۔ ہاں!

باورچی کی اتنی لمبی چوڑی تقریر سے وہ کچھ گھبرا سا گیا۔ لیکن اُس کے دل میں ایسی کوئی جستجو پیدا نہیں ہوئی اور نہ یہ خیال ہی گزرا کہ باورچی اندر جانے اور دیکھنے سے کیوں منع کر گیا ہے۔ اُس کے نافہم دماغ میں تو ایک ہی بات گردش کر رہی تھی — کھانا کیا کھائے گا۔ چھوکری لوگ کو کھائے گا رات بھر — وہ سوچنے لگا جب وہ چھوٹا سا تھا تو آدم خور جن کی کہانیاں سُنا کرتا تھا۔ دادی اماں کے الفاظ اُسے یاد آنے لگے۔ مانس گن مانس گن — جن دہاڑا۔ یہاں کوئی آدم زاد چھپا ہے" — وہ پھر سوچ میں پڑ گیا — لیکن کیا انسان بھی انسان کو کھا سکتا ہے۔ وہ بھی بے چاری لڑکیوں کو۔ اور اُسے لڑکیوں کے ساتھ ہمدردی پیدا ہو گئی۔ کاش اُس کے پاس بھی کوئی جادو کا ڈنڈا، کوئی طلسمی انگوٹھی یا علاؤالدین کا چراغ ہوتا اور وہ ان لڑکیوں کو ان آدم خوروں سے نجات دلا سکتا۔

کچھ خوف و ہراس اور کچھ بہادری اور ہمت کے ملے جُلے جذبات و احساسات لئے اُس نے کھانا کھایا۔ اور سارا کام نپٹا کر ہال کے کمرے کے سامنے دیوار سے ٹیک کر بیٹھ گیا۔ اُس کی نظریں دروازہ میں لگے شیشوں پر جمی ہوئی تھیں جن میں سے روشنی چھن چھن کر برآمدہ میں پڑ رہی تھی۔ کمرہ کا دروازہ بند ہو چکا تھا۔ صاحب کبھی کبھی دروازہ میں سے منہ نکال کر کوئی کھانے پینے کی چیز یا سگریٹ کا ڈبہ مانگ۔ لیتے وہ اندر سے ہی ہاتھ بڑھا کر لے لیتے۔ اُس کے بعد پھر دروازہ بند ہو جاتا۔ تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد ہال میں اندھیرا ہو جاتا۔ پھر بتی روشن ہو جاتی۔ کبھی ایک گہری خاموشی اور سناٹا چھا جاتا۔ کبھی وحشت ناک قہقہوں، سسکاریوں اور لڑکیوں کی دبی دبی شائد بھی

چیخوں سے پورا گیسٹ ہاؤس گونج اُٹھتا۔

ڈر اور خوف کے باوجود آخر اُس کے دل میں یہ معلوم کرنے کی خواہش آہستہ آہستہ اُبھرنے لگی کہ ہال کے اندر کیا ہو رہا ہے۔ اندھیرے کے ساتھ ساتھ اتنی خاموشی کیوں ہو جاتی ہے اور روشنی ہونے پر اتنا شور کیوں ہونے لگتا ہے۔ ننگا پکچر کیا ہوتا ہے۔ باورچی نے اُسے یہ سب دیکھنے کے لئے کیوں منع کیا تھا۔ ننگی تصویریں تو وہ کتنے کیلنڈروں میں بھی دیکھ چکا ہے۔ لیکن اس پکچر میں کیا خاص بات ہے۔ آخر وہ ہمت کر کے اُٹھا۔ کچن سے سٹول لے کر آیا۔ اُسے دروازہ کے پاس رکھا اور اوپر کھڑا ہو گیا۔ کواڑوں میں اُوپر کی طرف لگے ہوئے شیشوں میں سے جھانکا، کمرہ میں بالکل اندھیرا اور خاموشی تھی۔ دائیں طرف ایک مشین میں سے ٹارچ، بیٹری کے عکس کی طرح روشنی نکل کر دوسری طرف پڑ رہی تھی۔ اُس نے بائیں طرف کا جائزہ لیا کہ روشنی کہاں پڑ رہی ہے لیکن وہاں تک اُس کی نظر نہیں پہنچ سکی۔ کمرہ کا دروازہ بھی کچھ اس طرح سے تھا۔ اسی کوشش میں کواڑوں پر اُس کا زور پڑا اور وہ ذرا سے کھل گئے۔ اُسے معلوم ہوا کہ صاحب نے جلدی میں کواڑ برابر کر کے چھوڑ دئیے ہیں اندر سے کھٹکا نہیں لگایا ہے۔ اُس کا دل زور سے دھڑکنے لگا۔ اب وہ اندر جھانک کر سب کچھ دیکھ سکتا ہے۔ وہ سٹول سے اُترا۔ اُسے ایک کنارے رکھا اور آہستہ سے کواڑ کا ذرا سا حصہ کھول کر اندر منہ ڈال دیا۔ سامنے دیوار پر چوکور سی تیز روشنی پڑ رہی تھی — ننگی تصویریں! اُس کے دل نے کہا۔ اور وہ اور زیادہ زور سے دھڑکنے لگا۔ اُس کی آنکھیں اندھیرے سے مانوس ہو کر دیوار پر چلتی پھرتی ننگی تصویروں کو دیکھنے ہی والی تھیں کہ یکایک ہال روشنی سے جگمگانے لگا۔ اُس نے ڈر کے مارے جلدی سے اپنا منہ باہر نکالا۔ اور کواڑ بند کر دئیے۔ اُس کے بعد پھر وہی دہشت ناک قہقہے، شور، سسکاریاں۔ آوازیں جیسے جنگلی لوگ کسی انسان کی بھینٹ چڑھاتے وقت اُس کے چاروں طرف ناچتے اور شور مچاتے ہیں۔ وہ اب تھک کر اور مطمئن ہو کر خاموش بیٹھ گیا۔ لیکن اُس کے ذہن میں آدم خور جن کی کہانی اور باورچی کے الفاظ پھر رینگنے لگے۔ اب وہ خاموش بیٹھا اطمینان سے یہی سوچتا رہا کہ اندر جو کچھ بھی ہو رہا ہوگا وہ بہت خوفناک ہی ہوگا۔ اتنے میں کوٹھی کی طرف سے ٹائیگر جھومتا جھامتا گیسٹ ہاؤس کی طرف آ نکلا اور اُس کے پاس آ کر اُسے سونگھنے لگا۔ بُدّھو کو ٹائیگر سے چڑ سی تھی۔ وہ اُس سے بہت ڈرتا تھا اور جلتا بھی تھا۔ اس لئے کہ ایک تو وہ طاقت اور جُثّہ میں اُس سے بہت زیادہ تھا۔ کبھی وہ اُس کی زنجیر پکڑتا تو ٹائیگر جہاں چاہتا اُلٹا اُسے ہی گھسیٹے لئے پھرتا۔ اور پھر ٹائیگر کو ہر طرح کی چھوٹ حاصل تھی۔ وہ گندے پانی، کیچڑ کے پانوں لئے قالین پر گھسیں اور صوفے پر جہاں چاہتا بے روک ٹوک چل پھر سکتا تھا۔

بیٹھ سکتا تھا لیکن وہ کبھی ننگے پاؤں لئے چلے جاتا تو دس گالیاں پڑتیں۔ صاحب شام کو چائے بسکٹ کھاتے اور جب وہ بچے ہوئے بسکٹ جیسے ہی لے جانا چاہتا۔ ٹائیگر آموجود ہوتا۔ اور صاحب وہ بسکٹ اُٹھا کر اُس کے سامنے ڈال دیتے اُس کا دل کتنا ترستا تھا کہ وہ بھی ان خوبصورت کُرکُرے بسکٹوں کا مزہ چکھے۔ پھر وہ سہ پہر یا رات کا بچا ہوا کھانا کبھی چھوٹے بھائی بہنوں کے واسطے لے جانے کے لئے چھپا کر رکھتا اور میم صاحب کی نظر اُس پر پڑ جاتی تو وہ بھی ٹائیگر کی نذر ہو جاتا۔

لیکن اِس وقت تو ٹائیگر سے اُسکا کچھ ڈھارس بندھ رہی تھی۔ جب بھی ذرا شور کی آواز بلند ہوتی ٹائیگر مُنہ اُونچا کر کے بھونک لیتا۔ اور پھر ساری کوٹھی اور گیسٹ ہاؤس کا چکر لگا کر برآمدہ میں بُوائے کے پاس آ کر ایک چوکیدار کی طرح بیٹھ جاتا بُوائے کے دل میں پہلی مرتبہ ٹائیگر کے لئے دوستی کا جذبہ اور اس کی وفاداری کا احساس پیدا ہوا۔ اُس نے محبت سے ٹائیگر کی کمر پر ہاتھ پھیرا۔ ٹائیگر نے اپنا مُنہ اُس کی گود میں ڈال دیا اور پاؤں پھیلا کر اُس کے پاس لیٹ گیا۔

نہ معلوم کتنی رات تک بُوائے وہاں بیٹھا اُونگھتا رہا۔ پھر ہال کمرہ کا دروازہ کھلا۔ کچھ لوگ جھومتے ہاتھوں کی اُنگلیاں ہلا کر ٹاٹا کرتے گاڑیوں میں بیٹھ کر چلے گئے۔ باقی سب مہمان سونے کے لئے اپنے اپنے کمروں میں جانے لگے۔ صاحب ہر ایک کو اُس کا کمرہ بتا رہے تھے۔ بُوائے' صاحب کی آواز سُن کر اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اُسے سب سے زیادہ تشویش لڑکیوں کے بارے میں تھی۔ اُس نے دیکھا کہ وہ سب زندہ ہیں۔ کسی مہمان نے کسی لڑکی کی کمر کو اپنی باہوں میں جکڑ رکھا ہے کسی نے تکیہ کی طرح بغل میں دبا رکھا ہے۔ کوئی اُس کے شانہ پر سر رکھے نشہ میں جھومتا جا رہا ہے۔ کسی نے لڑکی کو گود میں اُٹھا کر دونوں بازوؤں میں اس طرح بھر رکھا ہے جیسے کسی بھوکے نے ایک لذیذ کھانے کا نوالہ مُنہ میں بھر لیا ہو۔ بُوائے کو پھر باورچی کی بات کا خیال آیا۔ وہ حیرت سے ہر ایک مہمان کا مُنہ تکنے لگا اور سوچنے لگا۔ کیا یہ سیٹھ لوگ' بڑے لوگ' صاحب لوگ' آدم خور ہو سکتے ہیں۔ کیا انسان' انسان کو کھا سکتا ہے — لیکن کس طرح کھا سکتا ہے؟ — بس یہیں آ کر اُس کی سوچ رُک گئی۔ اُس کی سمجھ اس معمہ کو حل نہ کر سکی اور وہ آگے کچھ نہ سوچ سکا۔ برسات کا موسم آدھی رات کی ٹھنڈی ہوا نے اُسے وہیں برآمدے میں سُلا دیا اور وہ رات بھر آدم خوروں اور اُن کی قید میں آدم زاد خوبصورت لڑکیوں کو خواب میں دیکھتا رہا۔

صبح کو باورچی نے اُسے اُٹھایا تو اُس کی آنکھ کھلی۔ اُس کے ذہن میں بہت سے جواب طلب سوال چکر لگا رہے تھے جو وہ باورچی سے کرنا چاہتا تھا۔ لیکن باورچی ناشتہ تیار کرنے میں اتنا مصروف تھا کہ اُسے کچھ پوچھنے کی ہمت نہ ہوئی شاید مجھے

دس بجے کے قریب اُس نے ہال کمرہ میں مہمانوں کے لئے ناشتہ لگانا شروع کیا وہ لوگ بہت خوش نظر آ رہے تھے اور بات بات پر ہنسی مذاق اور قہقہے لگا رہے تھے لیکن اُسے یہ دیکھ کر حیرت ہو رہی تھی کہ لڑکیوں میں سے اب وہاں کوئی نہ تھا۔ وہ پھر سوچ میں پڑ گیا۔ لڑکیاں کہاں غائب ہو گئیں۔ کتنی رات گئے تک تو وہ جاگتا رہا تھا اور صبح سویرے چھ بجے باورچی نے اُسے جگا دیا تھا جب سے اب تک تو کسی لڑکی کو اُس نے باہر جاتے دیکھا نہ تھا۔ تو پھر — اُن بے چاری لڑکیوں کا خون کہاں بہہ گیا۔ اُن کی چچوڑی ہوئی ہڈیاں کہاں پھینک دی ہیں اِن آدم خوروں نے — اُس کا دل غصہ اور نفرت سے بھر گیا۔ ناشتہ ختم کرنے کے بعد سب مہمان جانے لگے تو اُن میں سے کئی ایک نے بوائے کو بخشش دی۔ کسی نے ایک' کسی نے دو اور کسی نے پانچ روپے بھی دیئے۔ لیکن بُوائے نے کسی کو سلام نہیں کیا۔ حالانکہ باورچی نے اچھی طرح سمجھا دیا تھا کہ مہمانوں کے جاتے وقت وہ باہر کھڑے ہو کر سب کو سلام کرے۔ اور جو بخشش دے اُسے دوبارہ بخشش ملنے پر سلام کرے۔ وہ بہت بددل' رنجیدہ اور خوف زدہ تھا۔

جب وہ کچن میں پہنچا تو باورچی نے پوچھا — ابے ملا کچھ۔ کتنا ملا۔؟

اُس نے جواب میں سارے نوٹ جیب سے نکال کر باورچی کے سامنے ڈال دیئے۔ اور کچن سے باہر نکل گیا۔

سیٹھ جب گھر پہنچا تو سیٹھانی بہت پریشان بیٹھی تھی۔ اُس نے بتایا کہ رات فیکٹری میں بڑا ہنگامہ اور مار پیٹ ہوئی۔ ایک مزدور مارا گیا اور کتنے زخمی ہو گئے اور کتنوں کو پولیس پکڑ کر لے گئی ہے۔ سیٹھ سب کچھ سُن کر ایسے خاموش ہو گیا جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو اور جو کچھ ہوا وہ اُس کی اُمید کے مطابق ہوا۔ اُس نے پہلے کارخانہ ٹیلیفون کیا۔ پھر اپنے خاص آدمیوں کو ضمانت پر چھڑانے کے لئے وکیل کو ٹیلیفون پر ہدایات دیں۔ اُس وقت وہ بہت موڈ میں تھا۔ رات کا خمار اُس کی آنکھوں میں باقی تھا اور وہ اُس کا کیف ابھی تک محسوس کر رہا تھا۔ پارٹی کامیاب رہی تھی۔ اُسے اپنے دونوں متوقع کاموں کے وعدے مل گئے تھے۔

فیکٹری میں ہنگامہ کا کیس کئی مہینہ چلا۔ سیٹھ کے سب آدمی بری ہو گئے۔ یونین کے پاس اتنا سرمایہ نہ تھا کہ اتنے دنوں پیروی کرتی اور اپنے آدمیوں کو رہائی دلاتی۔ انفرادی طور پر جو اپنا خرچ اور بھاگ دوڑ کر کے بچ سکا تو بچ نکلا۔ چھوٹے لال کا تو کوئی آگے پیچھے نہ تھا۔ اِس بھری دنیا میں وہ اکیلا اور اُس کے دو ہاتھ پاؤں اور ایک ساتھی تھی جو اُس کا دُکھ درد بانٹ لیتی تھی۔ پھر کون اُس کے لئے کھڑا ہوتا اور لڑتا۔ سب سے زیادہ مار تو اُسی پر پڑی تھی۔ کیونکہ اُس نے سیٹھ کے آدمیوں کا مقابلہ کیا تھا لیکن انصاف اس کے لئے بہت

عماُس کی دسترس سے باہر تھا۔
وہ حالات کے کٹہرے میں کھڑا خاموش اپنے خلاف فردِ جرم سنتا رہا۔ اُسکا یہ جرم اتنا تھا کہ وہ زندہ رہنا چاہتا تھا اور تین چار پیسے روز کی مزدوری وہ زندہ نہیں رہ سکتا تھا، تن بھر کپڑا نہیں پہن سکتا تھا، اپنا گھر نہیں بسا سکتا تھا، گرہستی نہیں چلا سکتا تھا اور زندہ رہنے کا یہ حق اُسے ہاتھ جوڑنے، گڑگڑانے سے نہیں مل سکتا تھا۔ اِسی لئے اُس نے آواز اُٹھائی تھی۔ سیٹھ نے اُس کی آواز کو دبا دیا تھا۔ اُس کا گلا گھونٹ دیا تھا۔ اُسے اور اُسکے ساتھیوں کو چھ ماہ قیدِ سخت کی سزا ہوگئی تھی۔ لیکن اُس نے سوچ لیا تھا کہ وہ آزاد ہوکر پھر اپنے حق کے لئے لڑے گا۔ پھر یہی آواز بلند کرے گا چاہے وہ زندگی بھر جیل جاتا رہے۔

سیٹھ کے کارخانہ میں سکون تھا سیٹھ کو بھی اطمینان ہوگیا کہ اُس نے فساد کی جڑ کو ختم کر دیا ہے۔ لیکن کچھ دنوں بعد ہی چھوٹے لال کی جگہ دوسرا مائی کا لال پیدا ہوگیا۔ انقلاب زندہ باد کے نعروں سے پھر سیٹھ کا سکون چھین لیا۔ اب وہ کتنے لالوں کو چھڑائے، جیل میں ڈلوائے، جان سے ختم کروائے۔ یہ تو ایک کے بعد دوسرا، دوسرے کے بعد تیسرا کھڑا ہو جائے گا۔ وہ سوچ میں پڑ گیا۔ لیکن اُس کا دماغ ہار ماننے والا نہیں تھا۔ اُسے یقین تھا دولت کی طاقت کے سامنے یہ بھوکے ننگے لوگ کب تک ٹھہر سکتے ہیں۔ وہ چار چھ مہینے کے لئے لاک آؤٹ کر دے گا۔ پھر سالے بھوکے مرنے لگے تو عقل ٹھکانے آجائے گی۔ لیکن لاک آؤٹ سے کچھ زیادہ ہنگامہ بڑھ گیا اور حکومت کے کانوں تک بات پہنچی تو دخل اندازی بھی کر سکتی ہے اور یہ وہ نہیں چاہتا تھا اِس لئے وہ کوئی دوسرا راستہ نکالنے کی فکر میں لگا رہا۔

سیٹھ اِسی جستجو میں ہر ایک سے اپنا رونا روتا پھرتا۔ لالہ طوطا رام جی بیوپاری میں سب سے پہنچے ہوئے اور دولت مند سمجھے جاتے تھے۔ سیٹھ کے دماغ میں لالہ جی کی یہ بات بیٹھ گئی۔ جب اُنھوں نے کہا۔ بھائی میں نے تو اِسی لئے فیکٹری۔ لیبر گھیراؤ اور یونین کا سب دھندا ہی ختم کر دیا۔ جسے انڈسٹریلسٹ بنا ہو، نام اور دام دونوں کمانے ہوں، وہ اِس جھنجھٹ میں پڑے۔ اپنے کو تو صرف دام کمانے ہیں۔ روپیے جس دھندے میں بھی مل جائیں یہی سوچ کر مینوفیکچرنگ کی جگہ اسٹیٹ کا کام شروع کر دیا ہے۔ فیکٹریوں کی جو زمین شہر سے باہر تھی، وہاں گودام بنوا دیئے ہیں اور جو شہر میں تھی وہاں ملٹی اسٹوری بلڈنگیں بنوادی ہیں۔ اور خوش ہوں۔ مجھے اِس سے بہتر کوئی دوسرا کام نہیں جچتا۔ یہ بھی ایک زمینداری ہے۔ ہر مہینہ خزانہ خود بخود بھر جاتا ہے۔

سیٹھ دوسرے ہی ہفتے سے فکر میں لگ گیا۔ اُس نے سوچا وہ فیکٹری کی مشینیں کیوں فروخت کرے۔ اُسے کیوں بند کرے اور اتنی آمدنی سے ہاتھ دھوئے۔ وہ پہلے آدھا خام مال بلیک کرتا تھا اور آدھے سے پندرہ بیس روز فیکٹری چلاتا تھا۔ اب اُس نے تین چوتھائی بلیک میں دینا شروع کر دیا۔ فیکٹری کا کام مشکل سے ہفتہ بھر چلتا۔ کام نہ ہونے، مال نہ ملنے اور نقصان ہونے کا پروپیگنڈہ کچھ روز کرتا رہا۔ پھر دس دس پانچ پانچ کاریگروں کو آہستہ آہستہ دوسرے تیسرے روز علیحدہ کرتا رہا۔ بڑی احتیاط سے تاکہ کوئی ہنگامہ نہ ہو۔ وہ اُنھیں قانون کے مطابق ایک مہینے نوٹس کی تنخواہ اور تین مہینہ کی تنخواہ ہرجانہ کے طور پر دیتا رہا۔ دو تین مہینے میں سارے مزدور اور کام کرنے والے علیحدہ ہوگئے۔ اب اُس نے ساری مشینیں شہر سے بیس میل دور ایک افلاس زدہ گاؤں میں خاموشی سے منتقل کرا دیں۔ اور وہاں دوسرے نام سے کام شروع کر دیا۔ آدھی زمین جس میں کارخانہ تھا خالی ہوگئی۔ باقی آدھی زمین میں سات آٹھ سو کے قریب آبادی پر مشتمل ایک بستی آباد تھی۔ اُس میں کچھ کارخانہ کے مزدور، باقی باہر کے لوگ ہندو مسلمان ملے جلے برسوں سے رہتے تھے اُس وقت فیکٹری بھی قائم نہیں ہوئی تھی اور سارا علاقہ غیر آباد تھا۔ لیکن اب بڑی بڑی کوٹھیاں اور بلڈنگیں بن گئی تھیں۔ درمیان میں کہیں کہیں ایسی ہی بستیاں باقی رہ گئی تھیں۔ سیٹھ کے لئے اب زمین کے اس حصہ کو خالی کرانا ایک مشکل مسئلہ تھا۔ زبردستی کا تو سوال ہی نہیں تھا۔ قانوناً بھی کوشش کرتا تو کارپوریشن کے ممبر اور دوسرے سیاسی لوگ جنھیں بستی سے ووٹ ملتے تھے درمیان میں آجاتے۔ اور مقدمہ بازی میں تو برسوں لگ جاتے اور اگر روپیہ پیسے دلا کر معاملہ طے کرنا چاہتا تو چار پانچ لاکھ روپیے کی رقم لگ جاتی۔ اِس لئے وہ خاموش رہا۔

بستی میں پانی کے کُل دو سرکاری نل تھے۔ گرمیوں میں پانی کی قلت رہتی۔ پچاس پچاس مردوں عورتوں اور بچوں کی لائن صبح شام لگی رہتی۔ جھڑپیں ہوتیں۔ گالیوں اور مار پیٹ تک نوبت پہنچتی۔ لیکن جلد ہی صلح صفائی ہو جاتی۔ ایک دفعہ اچانک ایسے ہی جھگڑا بڑھتے بڑھتے خطرناک صورت اختیار کر گیا اور فرقہ وارانہ فساد میں بدل گیا۔ مار پیٹ لوٹ مار اور قتل و خون کا بازار گرم ہوگیا۔ جھونپڑیوں میں چاروں طرف آگ لگنے لگی۔ پولیس اُسی وقت آگئی۔ سیٹھ بھی ریلیف کا کام کرنے کے لئے موقع پر پہنچ گیا۔ منٹوں میں اُس نے ٹرک اور لاریوں کی لائن لگا دی۔ جہاں جہاں شہر میں کھلے میدان نظر آئے۔ ہندو مسلمانوں کے الگ الگ کیمپ کھلوا دیئے اور سب کو وہاں پہنچا دیا گیا۔ چار پانچ گھنٹے میں ساری بستی خالی ہوگئی اور فساد زدہ علاقہ میں امن ہوگیا۔ سیٹھ کی انسان دوستی دیا دھرم کی بڑی تعریف ہوئی۔ اخباروں میں بھی اُس کی بے لوث خدمت کو سراہا گیا۔

تین چار روز تک سیٹھ دونوں کیمپ میں ریلیف کا کام کرواتا رہا۔ کھانے پینے کا معقول انتظام تھا۔ کپڑا بھی تقسیم ہوا۔ اتنے عرصہ میں کارخانہ اور بستی کی زمین ہموار کر کے اُس کے چاروں طرف چار دیواری بنا دی گئی۔ اُس کے دوسرے ہی روز سیٹھ کا ریلیف کا کام بھی ختم ہو گیا۔

اُدھر چھوٹے لال چھ مہینہ کی سزا ختم کر کے رہا ہوا۔ اُس نے پہلے کارخانہ کا رُخ کیا۔ لیکن وہاں نقشہ ہی بدلا ہوا تھا۔ بستی اور کارخانہ کی جگہ صاف میدان پڑا تھا۔ مشینوں کے بجائے چاروں طرف کھدی ہوئی بُنیادوں میں سے پانی نکالنے اور اُن میں لوہے کے بڑے بڑے گارڈر ڈالنے والی مشین کام کر رہی تھی۔ چھوٹے لال دیر تک کھڑا یہ تماشہ دیکھتا رہا۔ اُسے خیال آیا وہ کتنا بیوقوف ہے کہ اتنے دنوں تک اپنے حق اور انصاف کے لئے فولاد کے ان گارڈروں سے ٹکر لینے اور زندگی بھر لڑتے رہنے کی بات سوچتا رہا۔ سیٹھ کی بُنیادیں کتنی مضبوط اور گہری ہیں۔ اِنھیں کون ہِلا سکتا ہے۔ اُس نے طے کر لیا کہ وہ اپنا راستہ بدل دے گا۔

اُس کے پاؤں خود بخود اپنی بستی کی طرف اُٹھے لیکن پھر رُک گئے۔ سانولی کی شادی تو اُس کے سامنے ہو چکی تھی اور بانکے اُسے لے کر جب ہی دوسری بستی میں چلا گیا تھا۔ سانولی کو دیکھنے کے لئے اُس کا دل تڑپ رہا تھا۔ پر وہ کیسے وہاں جا سکتا ہے۔ اُس نے سوچا۔ بانکے کیا سمجھے گا۔ پھر آخر دل کی تڑپ اُسے بستی بستی لئے ہی پھری۔ لیکن وہ اُسے اپنے دل کی بستی کے سوا اور کہیں نہ پا سکا۔

اب وہ اپنے ایک ہم وطن کی تلاش میں تھا۔ دلاور خاں۔ جس سے اُس کی ملاقات اتفاقاً جیل میں ہو گئی تھی۔ وہ اُس کا ہم وطن تھا۔ وہاں دن بھر اُس کے ساتھ باتیں ہوتی رہیں۔ گاؤں کی باتیں، بچپن کے کھیل کود کی باتیں۔ کھیت کھلیان کی باتیں۔ غربت افلاس اور بھوک پیاس کی باتیں جس سے چھٹکارا پانے کے لئے وہ گاؤں سے نکلے تھے۔ اور گاؤں کے کھلے میدانوں کو چھوڑ کر۔ دھول مٹی۔ خاک دُھول اور گندگی سے بسی ہوئی بستیوں میں آ بسے تھے۔ وطن کی کشش کتنی تیز اور گاؤں کا یہ رشتہ بھی کتنا عجیب اور مضبوط ہوتا ہے کہ دونوں سگے رشتہ داروں کی طرح گھل مل گئے۔ اور ایک دوسرے کے دُکھ درد میں شریک ہو گئے۔ چھوٹے لال نے پہلے اپنی مختصر رام کہانی سُنائی پھر اُس کی داستان سُنی اور پوچھا۔ لیکن تم یہاں کیسے پھنس گئے۔ تو اُس نے ہنستے ہوئے جواب دیا تھا۔ بھئی ہم فٹ پاتھ کے غریب کاروباری ہیں فٹ پاتھ پر دُکان لگاتے ہیں۔ ہماری چلتی پھرتی دُکان کم اور موقع کے لحاظ سے شارع عام

اپنا مال اور سامان بھی بدلتی رہتی ہے۔ اِس میں کبھی کٹ پیس، کبھی ریڈی میڈ کپڑا، کبھی ہنڈی، کبھی پھل فروٹ، کبھی بساط خانہ اور کبھی چائے خانہ بھی ہو جاتا ہے۔ محنت سے روزی کمانا کوئی جرم نہیں لیکن چور بازاری کرنے والوں کی طرح ہمیں بھی پولیس سے چوکنا رہنا پڑتا ہے اور دکان اس ڈھب سے لگانی پڑتی ہے کہ موقع پڑنے پر اُسے سر پر رکھ کر بھاگ سکیں اور کہیں جلدی سے چھُپ سکیں۔

ہم لوگوں کی کوئی چھٹی نہیں ہوتی۔ کبھی آرام نہیں کر سکتے۔ تو سرکار یوں کبھی کبھی آرام کرنے کے لئے چھٹی دلا دیتی ہے۔ دن بھر عدالت کی چہل پہل اور طرح طرح کے تماشے دیکھتے گذر جاتا ہے۔ شام کے قریب آواز پڑتی ہے تو ہم جرمانہ کی رقم فٹ پاتھ پر دوکان لگانے کا کرایہ سمجھ کر ادا کر دیتے ہیں۔ اور شام کو گھر چلے جاتے ہیں۔ آج اتفاق سے کرایہ ادا کرنے کے لئے پوری رقم جیب میں نہیں تھی تو یہاں بھیج دیا گیا۔ اس بہانہ دن بھر سرکار کے مہمان رہے۔ مہمان خانہ کی سیر ہو گئی، ایک نیا تجربہ ہو گیا۔ اور ہاں وطن کے ایک دوست سے ملاقات بھی ہو گئی۔

چھوٹے لال نے پھر سوال کیا۔ اب تو شاید فٹ پاتھ پر دکان نہیں لگا سکو تو پھر اور کیا کر سکو گے۔ اس نے جواب دیا۔ اور کر بھی کیا سکتے ہیں۔ خدا کی زمین بہت بڑی ہے۔ اس جگہ نہیں تو کسی اور جگہ لگائیں گے۔ پھر قانون بھی تو ہم لوگوں کے لئے اتنا سخت نہیں۔ ڈیوٹی پر لگے سنتری جی اُسے آسان کر دیتے ہیں۔ ہاں کبھی کبھی وہ بھی مجبور ہو جاتے ہیں۔ مجبوری سب جگہ ہوتی ہے۔ پھر شام تک اُس کے جرمانہ کا روپیہ بھر دیا گیا اور وہ چلا گیا۔

دلاور خاں نے چلتے ہوئے اُسے اپنا پتہ دیا تھا۔ اور بتایا تھا کہ وہ عموماً نئے بازار کے فٹ پاتھ پر دُکان لگاتا ہے۔ وہیں ملاقات ہو جائے گی۔ چھوٹے لال دن بھر دکانوں کے چکر کاٹتا۔ وہ جانتا تھا کہ کسی جان پہچان کے بغیر کام ملنا مشکل ہے۔ پھر بھی کوشش کرتا شاید کہیں کام بن جائے۔ شام کو روزانہ دلاور خاں کی تلاش میں گھومتا۔ رات کو تھک کر کسی دوکان کے آگے سو جاتا۔ بھوک پیاس اور تکان سے اُس کی حالت فقیروں کی سی ہو گئی تھی۔

آخر ایک روز تلاش کرتے کرتے دلاور خاں اُسے پھل منڈی میں مل گیا۔ اُن دنوں وہ بڑے بیوپاریوں سے نیلام میں پھل خرید کر چھوٹے دوکانداروں کے ہاتھ تھوک مال بیچتا تھا۔ چھوٹے لال کا خیال تھا کہ اُس کی یہ حالت دیکھ کر دلاور خاں بھی کترا جائے گا۔ مصیبت

ین کسی کا ساتھ دیتا ہے۔ لیکن خلاف امید دلاور خاں نے اُس کی یہ
ت دیکھ کر بڑا افسوس کیا اور بہت ہمدردی سے پیش آیا۔ اُسے کھانا
یا۔ اور دوسرے روز اُسے اپنے بیوپاری سے اپنی ضمانت پر پھل دلوا دیئے
روزانہ کا انتظام کرادیا کہ وہ صبح سے شام تک مال بیچ کر شام کو
پیسہ جمع کرادے گا اور دوسرے روز پھر ضرورت کے مطابق مال اٹھالے گا
اُس روز کے بعد سے چھوٹے لال پھل بیچتا رہا' فٹ پاتھ پر پھیری لگا کر
دفتروں کے سامنے' اسکولوں اور کالجوں کے سامنے' کاروباری علاقہ میں' اور
گلی محلوں میں۔ عموماً صبح سے شام تک اُس کا بھرا ٹوکرا خالی ہوجاتا اور اُسے
پانچ روپے سے آٹھ روپے تک روزانہ بچ جاتے۔ اب اُس نے بستی میں ایک کوٹھری
بھی لے لی تھی۔ وہ بے فکر تھا۔ دن جیسے تیسے محنت مزدوری کرکے گذر
رہے تھے۔

ایک روز فٹ پاتھ پر وہ اپنا ٹوکرا لئے بیٹھا تھا۔ چھٹی کا دن تھا' رات
ہوچکی تھی اور اُس کا ٹوکرا ابھی تک خالی نہیں ہوا تھا۔ یکایک دو تین پولیس
وین اُس کے پاس آکر رکیں۔ وہ گھبرا گیا کہ شاید بلا آگیا اور وہ اُسی کو پکڑنے
آرہے ہیں۔ وہ ٹوکرا اٹھاکر بھاگنے ہی والا تھا کہ پولیس والے منٹوں میں
اُترکر اُس کی پشت پر ایک بڑی خوبصورت سی بلڈنگ میں داخل ہوگئے۔
چار پانچ وہیں دروازے کو گھیر کر کھڑے ہوگئے۔ چھوٹے لال سے کسی نے
کچھ نہیں کہا تو اُس کی جان میں جان آئی۔ تب وہ بھی تماشہ دیکھنے کے لئے
وہیں جارہا۔ اور بھی بہت سے لوگ جمع ہوگئے تھے۔ لیکن پولیس والوں نے
انھیں بھگادیا۔ چھوٹے لال سوچ رہا تھا۔ چھوٹے لال سوچ رہا تھا۔ ضرور
یہاں کوئی اسمگلروں کا اڈہ ہوگا یا کھانے پینے کی کنٹرول چیزوں کا مال چھپا
ہوگا۔ اُس کا دل ان بڑے بڑے چور بازاری کرنے والے چوروں کی شکلیں
دیکھنے کے لئے بے چین ہورہا تھا۔ جن کے قصے وہ خبروں میں سُنا کرتا تھا۔
لیکن اُسے بڑا تعجب ہوا جب ایک گھنٹہ بعد پولیس باہر نکل کر آئی تو اُس کے
ساتھ کئی سوٹ بوٹ پہنے صاحب لوگ' چُنے ہوئے کُرتے دھوتیاں
پہنے سیٹھ لوگ اور اُن کے ساتھ ساتھ بہت سی طرح طرح کی نوعمر لعد جوان
لڑکیاں بھی تھیں۔ اُن کے چہرے لالی' پوڈر اور میک اَپ سے
لتھڑے ہوئے تھے۔ چھوٹے لال سمجھ گیا۔ ایک وین میں مرد اور دوسری
میں لڑکیاں لائن سے چڑھ رہے تھے۔ چھوٹے لال کی نگاہ اچانک
ایک جگہ رُک گئی۔ بے اختیار سانولی کا لفظ اُس کی زبان پر آتے آتے
اُس کے حلق میں اٹک گیا۔ پولیس کے جانے کے بعد وہ بہت دیر تک بے چین

اور کھویا کھویا سا رہا۔ پھر بیٹھا سوچتا رہا۔ اُس نے اپنی جیب میں سے
اپنی تمام جمع پونجی نکال کر گنی۔ اُس کے پاس ستر اسّی روپے تھے
تیس چالیس کا مال بھی ابھی ٹوکری میں پڑا تھا۔ اُس نے ایک فیصلہ کن انداز
سے روپے جیب میں واپس رکھے اور ٹوکرے اُٹھاکر گھر کی راہ لی۔
رات بھر وہ سو نہ سکا اور نہ کچھ کھا ناکھاسکا۔

دوسرے روز صبح چھوٹے لال اور دلاور خاں سانولی کی رہائی کے لئے
پریشان اور اسی کوشش میں سرگرداں کورٹ میں موجود تھے۔ چھوٹے لال
کو ادھر اُدھر دوڑتے ہوئے وکیل' منشی' مختار' پیشکار منہ کھولے
ہوئے گدھوں کی طرح نظر آرہے تھے۔ ابھی کیس شروع بھی نہیں ہوا
تھا کہ اُس کی جمع پونجی میں سے پچاس روپے خرچ ہوچکے تھے اس کا
دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ معلوم نہیں سانولی کو رہائی مل سکے گی
یا نہیں۔ صبح جب وہ سانولی سے ملنے تھانے گیا تھا تو اُسے دیکھ کر
سانولی کی آنکھوں سے آنسوؤں کا طوفان یوں نکلا تھا جیسے کسی دریا کا
بندھ ٹوٹ گیا ہو اور اُس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا منہ چھپالیا تھا۔
چھوٹے لال بھی ضبط نہ کرسکا تھا۔ سانولی کا دکھ اور اُس کی اپنی زندگی کا
غم — پیدائش سے لیکر اب تک وہ غموں کا یہ زہر پیتا رہا تھا۔ اور
آخر کب تک پیتا رہے گا۔ وہ سوچ رہا تھا۔ کیا کبھی وہ دن بھی آئے گا جب
کوئی سانولی نیلام نہ ہوگی۔ کوئی چھوٹے لال اور دلاور خاں دنیا کے
کے لئے ٹھوکریں کھاتا نہ پھرے گا۔ اور انسانوں کی یہ بستی آدم خوروں
سے خالی ہوجائے گی۔

○○

مہدی پرتاب گڑھی

آمدِ سحر

سال کی آخری شب اندھے کنوئیں میں ہوئی غرق
اک نئی صبح منڈیروں پر اُتر آئی ہے
خیمہ زن ہے یہیں نزدیک کہیں فصلِ بہار
بوئے گل لے کے ابھی بادِ سحر آئی ہے

کتنے فرعونوں سے ہم نبٹے ابھی پچھلے برس
کتنے ہی آگ کے دریاؤں سے پار اُترے ہیں
آبلے پاؤں کے ہم دیکھ کے گھبرائے نہیں
ریگِ مایوسی سے چشمے کی طرح اُبھرے ہیں

ہر طرف کھولے گئے دانش و حکمت کے دیار
ملک سے دُور ہوا گندی سیاست کا عتاب
یاس انگیزیٔ حالات نے روکا تھا قدم
پھر بھی تاریخ کو ہم نے دیا اک روشن باب

انقلابات سیاسی و سماجی آئے
اور ہر جسم میں پھونکی گئی اک رُوحِ عمل
ہر کلی محوِ تبسم ہے، ہر اک گُل خنداں
ہم نے اس طرح نکالا ستمِ ایام کا حل

دل میں تھا عزمِ جواں آ گئے منزل کے قریب
حق مگر یہ ہے ابھی اپنا سفر ختم نہیں
آبلہ پا ہی سہی، پھر بھی ہمیں چلنا ہے
اپنے خوابوں کا وہ منظر ہے ابھی دُور کہیں

یہ نئی صبح، نیا ذوقِ یقیں لائی ہے
گلِ اُمید سے مہکا ہے چمن زارِ حیات
ہوگی ہر لمحہ سرافرازِ بشر کی محنت
غمِ ادبار سے مل جائے گی دنیا کو نجات

اب سے گیتوں میں نہ آہیں نہ کراہیں ہوں گی
اب سے نغموں میں نہ ہوگا کہیں زخموں کا بیاں
اب کسی نوکِ قلم سے نہ لہو ٹپکے گا
اب سے ہو جائے گا لفظوں پہ شگوفوں کا گماں

یہ نئی صبح بنے گی نئی منزل کی نقیب
تیشۂ نور سے کاٹے گی ہر اک کوہِ گراں
رہگذر روکے گی نہ اذہان میں اندیشوں کو
دلیش میں رکھے گی جمہور کے دھارے کو رواں

○ معرفت ایجوکیشنل [illegible] پرتاب گڑھ

اقبال اور دانتے

ڈاکٹر تارا چرن رستوگی
پرنسپل ایس ایس کالج - ہیلاکانڈی - [illegible] آسام

شعر و فکر اقبال اساساً تو اسلامی ہیں مگر ان کے ملحقات فکر مغرب اور ادبیات مغرب پر محیط تھے۔ سیاسیات کے کاعدہ میں کسی علاقے یا سرحد کو جب وہاں سے جنگ کے ہولناک شعلے بھڑک اٹھنے کے امکانات معلوم ہوتے تھے ہیں حساس (sensitive) کہا جاتا ہے۔ اسی طرح میرا خیال ہے کہ اقبالیات میں اقبال پر دانتے کا اثر جیسا موضوع بھی بعایت حساس موضوع رہا ہے۔ مگر یہ حقیقت بھی کم افسوسناک نہیں کہ کسی نقاد نے سنجیدگی سے موضوع ہٰذا کی جانب نہ تو رجوع کیا اور نہ ایک دو جملے سے زیادہ کچھ کہا۔ ایسے ایک دو جملوں کو چاہے شعوری کاوش سمجھئے یا فقرے بازی لیکن اس سے اقبالیات کو قطعی فائدہ نہ ہوا۔ اقبال نے جاوید نامہ میں تلاش حق میں سفر کیا اور دانتے نے اپنی محبوبہ بیٹریس کو تلاش کرنے کے لئے نیز دانتے کے یہاں جو کچھ ہے وہ اسلامی ماخذ سے مستعار ہے۔ وغیرہ وغیرہ کی سرگوشیاں پڑھنے میں آتی رہی ہیں۔ ایک صاحب جن کا نام نامی لینا نہیں چاہتا اور جنہوں نے بیٹریس کی بات کچھ جلوۂ محراب و منبر کے ساتھ کہی ہے۔ اگر کہیں انہیں یہ علم ہو جاتا کہ ابن عربی کے یہاں بھی اس کی محبوبہ کا نہایت متغزلانہ ذکر موجود ہے تو انھیں نے غالباً یہ بھی ارشاد فرما دیا ہوتا کہ دانتے کی بیٹریس ابن عربی کی نظام نامی محبوبہ کے نمونہ پر ساخت کی گئی۔ صحت مند تنقیدی رُخ اور یہ کہ کے لئے تحت النظر سیاق و سباق، سوابق و لواحق وغیرہ دیکھے جاتے ہیں۔ لہٰذا اس مسئلے کو شروع سے دیکھنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔

دانتے کی Commedia جسے یعنی الطربیہ اس کی وفات ۱۳۲۱ء سے کچھ پہلے پایۂ تکمیل کو پہونچی۔ لفظ Divine کا اضافہ دانتے کے بعد کی نسلوں نے کیا کیونکہ باعتبار موضوع و فنکارانہ عظمت الطربیہ کو اتنا سر آنکھوں پہ بٹھایا گیا کہ اس کو عقیدت مندانہ طور پہ ربانی شاعری بھی

الطربیہ کہا جانے لگا۔ انگریزی کے بے شمار ترجمے دستیاب ہیں جن میں Dorothy L. Sayers کا منظوم ترجمہ خاص اہمیت و منزلت کا حامل ہے۔ Dom Miguel Asin Palacios (ڈوم مائیگل بیلسیو) نامی ایک کیتھولک پادری جس نے قرون وسطیٰ تک اسلام کا مطالعہ کیا تھا ایک کتاب تصنیف کی جس کا نام ہے (La Escat-ologia Musulmana en la Divina Comedia)۔ جس میں فاضل مصنف نے یہ ثابت کیا ہے کہ دانتے کی معروف نظم کا خاکہ تو واقعۂ اسراء سے ماخوذ ہے اور تفصیلات ابن عربی کی الفتوحات المکیہ سے لی گئی ہیں۔ اس تصنیف کا پہلا انگریزی ترجمہ ۱۹۲۶ء میں ایچ۔ سنڈر لینڈ (H. Sunder Land) نے شائع کیا۔ غالباً اسی ترجمے کو پیش نظر رکھتے ہوئے ڈاکٹر عبد العلیم نے ایک مضمون بعنوان "دانتے اور اسلام" لکھا جو مسلم یونیورسٹی علیگڑھ میگزین شمارہ ۱۹۵۹ء میں شائع ہوا۔ مضمون ہٰذا میں آسن کی معروف تصنیف متعلقہ Divine Comedy کا صاف واضح تلخیص پیش کی ہے۔ مصنف اس نتیجے پر پہونچا ہے کہ (بقول عبد العلیم)

(۱) "الروایۃ الالٰہیہ کے بہت سے بیانات اور اکثر تفصیلیں جن کی مثالیں بھی معراج کے بیانات میں نہ مل سکی تھیں۔ اسلامی ادب میں کہیں نہ کہیں موجود ضرور ہیں خواہ وہ قرآن میں ہوں یا احادیث میں، آخرت کے عام افسانوں میں ہوں یا فقہا کے عقائد میں، فلاسفہ کی تصانیف میں ہوں یا صوفیا کے ملفوظات میں"

(۲) اسلامی مصنفین میں سب سے زیادہ اس نمونے کے فراہم کرنے میں جس سے دانتے نے آخرت کی تصویر کھینچنے میں مدد لی ہے، محی الدین ابن عربی کا ہے۔ نہ صرف خاکہ بلکہ حصص کی تقسیم،

عذاب و ثواب کی نوعیت، مشاہدات اور مناظر کی کیفیت غرض
ہر چیز میں الہدایۃ الالٰہیہ اور الفتوحات المکیہ میں ایک دوسرے
سے ملتی جلتی ہیں"۔۔۔۔۔۔۔۔ دانتے کو اسلامی ادب
سے واقفیت رہی ہو، اس مسئلہ پر تین قسم کی شہادتیں پیش کی جا سکتی ہیں
(۱) یہ ثابت کیا جا سکتا ہے کہ عہد وسطیٰ میں مسیحی یورپ نے باہمی تعلقات
کی بنا پر مسلمانوں کے مذہب، رسم و رواج اور آخرت کے تصور کے
متعلق کافی علم حاصل کیا تھا۔
(۲) اس کا امکان ہے کہ دانتے نے بالواسطہ یا بلاواسطہ اسلامی ادب
سے اپنی نظم کے لئے مواد حاصل کیا ہو۔ (۳) ایسی شہادتیں موجود ہیں کہ وہ ادب اسلامی
سے شوق رکھتا تھا۔۔۔۔ دانتے کا تعلق اسلام سے صرف ادبی حیثیت
سے تھا اور مذہب اسلام نے اُس پر کچھ بھی اثر نہیں کیا۔
اس تحقیق (آسن کی) کا یہ مطلب کبھی نہیں ہے کہ دانتے کی
شہرت میں یا اُس کی بے مثل نظم کی قدر و قیمت میں کوئی بٹہ لگے۔ دانتے
ملک اور قومیت کی قیود سے مستغنی ہے اور اس کی سب سے بڑی خوبی یہی ہے
کہ اس نے تمام دنیا کے اخلاق اور تصوف کو اپنی نظم میں ایک نرالے انداز
سے جمع کر دیا ہے۔"
ڈاکٹر عبدالعلیم نے درست نتیجے اخذ کئے ہیں۔ واقعی دانتے کے شاہکار
میں الفتوحات، بخاری، تفسیر قمی، تذکرۃ الشعرانی، منہاج الغزالی،
کنز العمال، المعراج الکبیر للغیطی، حاشیہ الدردیر، الحیوان للدمیری، رسالۃ
الغفران، رسالۃ الطیرلابی، الفطرانی، امور الآخرۃ لابن مخلوف، قرآن مجید
وغیرہ کی تفصیلات و تلمیحات کی نشاندہی جو آسن نے کی ہے اس کو محض
اتفاق یا توارد ذہنی پر محمول نہیں کیا جا سکتا۔ دانتے نے یہ سب کچھ لیا ہے۔
مگر یہ سب کچھ اس کے شعری شاہکار میں آ کر اس کا اپنا سرمایہ ہو گیا ہے۔
قرون وسطیٰ میں عیسائی کلیسا کی داخلی زندگی روحانی پیشواؤں اور فرماں
رواؤں کی باہمی آویزش و کشمکش کے سبب تنگ تر ہو گئی تھی اور نتیجتاً لوگ
مذہب سے سرد مہری برتنے لگے تھے۔ طربیۂ ربانی (Divina
Commedia) کے مقاصد میں یہ خواہش بھی شامل تھی کہ کلیسا کے
تقدس اور سیاسی حکمرانی کے درمیان خط فاصل کھینچ دے تاکہ امن و
آشتی کا دور دورہ ہو اور دنیا میں خدا کی حکومت قائم ہو جائے۔ ۱۳ویں
۱۴ویں صدی میں جو صورت حال دانتے کے سامنے ابھر رہی تھی وہ یہ
تھی کہ یورپ کے عوام حامیانِ پاپائے روم اور مخالفینِ پاپائے روم
[illegible]

کے گروہوں میں بٹتے چلے جا رہے تھے۔ بہ بنائے قوم پرستی کے
جذبے سے ہم کنار ہو کر یورپ میں سلطنت پر سلطنت بننے کا دور شروع
ہو رہا تھا۔ دانتے کے فکر و شعر میں یہ دنیا و مافیہا بھی تلاش کرنے پر
بآسانی دستیاب ہو جاتے ہیں۔ یورپی مشاہیر علم و ادب نے دانتے کو
ہمیشہ سر آنکھوں پر بٹھایا ہے کچھ آراء درج ذیل ہیں:
(۱) "فنِ شاعری کا طالب علم یا اس صنعت کو چابکدستی، مہارت [illegible]
تدریج کے ساتھ شعوری طور پر کرنے والا جیسا دانتے تھا بشمول [illegible]
بہت کم شاعر اس عظمت و قامت تک پہنچتے دکھائی دیتے ہیں۔ آنے
والی نسلوں کو شیکسپیئر کی بہ نسبت زیادہ ترقی یافتہ [illegible]
زبان دینا بہ حیثیت شاعر ایک شاعر کے لئے عظیم ترین امکانی کامیابی
ہے۔ زبان کا مخدوم ہونے کے لئے اُس کا خادم ہونا ضروری ہے۔ دوسری
بڑی خوبی جو مجھے نظر آتی ہے وہ ہے اس کے جذباتی دائرہ کی وسعت۔
دانتے عظیم ترین مذہبی شاعر بھی تھا۔ حالانکہ اس کو مذہبی
شاعر کہنا اس کی آفاقیت کو کم کرنا ہے جس کا وہ حامل تھا۔ طربیۂ
ربانی بھرپور جذبہ ہے جو یہ اظہار کرتا ہے کہ انتہائی یاس (Depravity's despair) سے لے کر رویائے ربانی
(Beatific vision) تک تجربۂ انسانی کی رسائی ہو سکتی ہے۔"
(Selected Prose: T.S. Eliot: London, pp 94-96)
(۲) "دانتے عالم، خود معلم اور بہترین معلم ہے۔"
(Charles Williams: Dante, New Jersey, p 176)
غالباً یہ بات الفارابی کے تصورِ خدا سے مماثلت رکھتی ہے۔
یونانی مسیحی تصور میں ذاتِ خداوندی عقل، عاقل اور معقول بالترتیب
Moumenon, Manoon, Nous پر محیط ہے۔
(۳) "بیٹرس ۔۔۔ خدا کی حامل ایمج ہے۔" (Dorothy L. Sayers: The Poetry of Search & The Poetry of Statement p.55)
(۴) "۔۔۔ مجازیہ میں وہ دانتے اس کی تخلیق کردہ ایمج ہے اور
اس کا سفر وہ سفر ہے جو ایک بد سرشت راستے سے غلط کاری کے
بعد آدم [illegible] تاریک جنگل سے عالم نجات تک ہر شخص کو
کرنا پڑتا ہے۔"
مجازیہ میں ورجل انسانی دانش کی امیج ہے ۔۔۔ وہ بیٹرس

انسانی فلسفہ، بہترین انسانی اخلاق ہے۔ وہ شعر و فن بھی ہے اور بہترین انسانی احساس و تخیل بھی ہے۔ ...

...مجازیہ وہ (بیٹرس، کلیسا، ربانی برکت و فیضان، مریم، مسیح بنا ہے۔ غیر خودی (Not Self) کا تجربہ جو پرستشانہ عشق کو جگائے اور حضورِ خداوندی میں مکاشفہ ہے۔

مجازیہ میں جہنم روح کے اندر گناہ کے گہرے مقامات کا امیج ہے۔ گناہ کی ... تصویر

مجازیہ میں مطہرہ (Purgatory) گناہ پر ندامت کی امیج ہے۔ مجازیہ میں برکت و فیض سے معمور روح کے لئے جنت (Paradise) کی امیج پیش کی گئی ہے۔ مجازیہ میں سلطنت اور شہر (Empire & city) مراد انسان در جمعیت (Man-in-community)۔

(Dorothy L. Sayers : The Comedy of Dante Alighieri, (London) pp 67-69)

مزید براں، خوبی یہ بھی ہے کہ سب کی سب امیج بھی ہیں اور دانتے کے سامنے کی صداقتیں بھی۔ مثلاً بیٹرس اس کی محبوبہ بھی تھی۔ سلطنت اور شہر اُس زمانے کے فلورنس وغیرہ ریاستوں کے حالات بھی ہیں۔ بالفاظ دیگر دانتے کے گرد و پیش کی دنیا کی عکاسی بھی ہے اور عصری مزاج و ماحول کی آئینہ داری بھی ہے، اور دانتے کے تخیل و تصور فلسفہ و علوم متداولہ پر مصنف کی دسترس وغیرہ کی مظہر بھی ہے۔ بیٹرس کے متعلق کیونکہ ایک دو اُردو کے نقادوں نے ایک قسم کی نقرہ بازی کے رویّہ کو اپنا شعار سا بنا رکھا ہے لہذا یہاں یہ بتانا غالباً برمحل ہی ہوگا کہ دانتے نے صرف ۹ سال کی عمر میں بیٹرس کو دیکھا تھا۔ بیٹرس کی عمر بھی دانتے کی عمر کے برابر ہی تھی۔ اس کے بعد دو تین ملاقاتیں اور ہوئیں۔ دانتے کی شادی ہوگئی اور بیٹرس کی شادی بھی ہوگئی۔ دانتے اور بیٹرس ایک دوسرے کے شریکِ حیات نہ ہوئے۔ ۲۴ سال کی عمر میں بیٹرس انتقال کرگئی۔ بیٹرس زیادہ سے زیادہ ایک علامت تھی جو دانتے کو غزلیہ شاعری کی طرف ملہم کرتی تھی اور بس۔ اپنی تخیلی محبوبہ سے متعلق دانتے نے صرف ۳۱ نظمیں کہیں۔ جن کو شاعر نے مجموعی طور پر " La Vita nuova " یعنی زندگیِ نَو کا عنوان دیا۔ اس مجموعۂ کلام میں بیٹرس مرتفع ہو کر ایک فلسفہ، ایک وسیلۂ نجات ہوگئی اور دانتے نے بیٹرس کو یہاں بدل اپنی معروف تصنیف Divina Commedia میں دیا۔۔۔ جہاں تک اسلامی موثرات کا تعلق ہے، دانتے ہی کیا، اسلامی فلسفہ و تصوف نے مسیحیت پر گہرے نقوش چھوڑے ہیں۔ Ramon Lull، سینٹ تھامس ...

جان اور بہت سے ہسپانوی کیتھولک صوفیوں پر اسلامی اثرات کی نشاندہی کی گئی ہے۔ وضاحت کے لئے ملاحظہ فرمایئے:

I. Williams, A.J. Islam (New york) p.138

2. Smart, N. The Religious Experience of Mankind, London, pp. 564-5, 538-40; 463

3. تاریخ فلسفۂ اسلام، مترجمہ: عابد حسین

4. Islamic Literature, comp: Najibullah, washington, pp. 130-33, 159-61.

حقیقت تو یہ ہے کہ اسلام و مسیحیت میں جغرافیائی و ثقافتی قرب و قرابت کے پیش نظر ایک دوسرے پر اثر انداز ہونا ناگزیر تھا۔

دانتے پر اسلامی اثرات بالواسطہ پڑے یا بلاواسطہ یہ پیش نظر مضمون کا موضوع سخن نہیں ہے۔ بہرکیف یہ قرین قیاس ہے کہ دانتے کو اپنی تصنیف کے لئے ایک خاکہ ملا مگر اس کو رنگ و روغن سے مزین کرنے کا کام یقیناً دانتے کی دانش و بینش نے انجام دیا۔ اثرات کو زیر بحث لانے سے انسلاکاتِ ذہنی (Mental Associations) نے درج ذیل دو مثالوں کے نقوش جگمگا دیئے:

धनवानीति हिमदस्ते किं गतवीभवो विषादम
पयासी! कर निहत कंदुकसमा: पातोमाता
मुनुष्याणम !!

مطلب: (ہتوپدیش) "میرے رنج و محن بڑھتے ہی جاتے ہیں۔ کبھی کم ہوتے ہی نہیں۔ دورِ زماں پر تکیہ مت کر کیونکہ اس کے پٹارے میں ہزاروں بازی گری بھری ہوئی ہیں۔"

گرچہ غم و رنج من درازی دارد   عیش و طرب تو سرفرازی دارد
بر دہر مکن تکیہ کہ دورانِ فلک   در پردہ ہزار گونہ بازی دارد

(عمر خیام)

यदा किंचिज्ज्ञो ऽहं द्विपइमम दांध: समभवं
तदा सर्वज्ञो ऽस्मीत्यभवदव लिप्तं मम मन: !
यदा किंचित्किंचिद् बुधजन सकाशादव गतं
तदा मूर्खो ऽस्मीति ज्वर इव मदो मे व्य-
पगत: !!

مطلب، (بھرتری ہری) " میں سمجھتا تھا کہ میرا دل نورِ الٰہی سے معمور ہو گیا ہے۔ میں سمجھتا تھا کہ اسرارِ خداوندی وہی ہیں جو میں سمجھا ہوں۔ لیکن اب جبکہ بنظرِ دانش اپنا جائزہ لیتا ہوں تو یہ پاتا ہوں کہ جو کچھ میں جانتا ہوں وہ کچھ نہیں ہے۔"

تا بود دلم از عشق محروم نشد   کم بود ز اسرار کہ مفہوم نشد
اکنوں کہ ہمی بنگرم از روئے خرد   معلومم شد کہ ہیچ معلوم نشد

محولہ رباعیاں عمر خیّام کی ہیں جس کا ۱۱۳۲ء میں نیشاپور میں انتقال ہوا۔ ہتوپدیش ۱۲ صدی میں تصنیف ہوئی۔ بھرتری ہری کا تعلق ۷ ویں صدی سے تھا۔ ان اشلوکوں اور رباعیوں کو دیکھتے ہوئے آپ کیا کہیں گے؟ ـــ سوامی گوبند تیرتھ نے اپنی تصنیف The Nectar of Grace (برکت و فیض کا آبِ حیات) جس کو کتابستان الٰہ آباد نے غالباً تیس چالیس سال پہلے شائع کیا تھا۔ اور جو اب نایاب ہے؟ درست جواب فراہم کیا ہے کہ سنسکرت و فارسی دونوں کا گہوارہ مدتوں ایک رہا۔ بہت سے خیالات سکّہ رائج کی طرح عوام و خواص میں ردیج رواں کی حیثیت رکھتے تھے۔ لہٰذا عمر خیّام نے کہیں سے کچھ نہیں لیا۔ یہی بات دانتے کے متعلق بھی کہی جا سکتی ہے۔

مگر چونکہ یہاں اس کی ضرورت نہیں ہے لہٰذا اسلامی اثرات کو براہِ راست یا بالواسطہ کسی طرح مان لینے میں کیا حرج ہے؟ میرا خیال تو یہ ہے کہ اثرات کو قبول کرنے سے دانتے کی شعری شہرت میں چار چاند لگ جاتے ہیں DIVINNA COMMEDIA کے بارے میں یہاں جو کچھ کہا گیا ہے اُس کا مقصد یہ نہ تھا کہ اس کی خوبیوں پر روشنی ڈالی جائے۔ بلکہ مقصودِ نظر صرف یہی تھا کہ اقبال کی جانب رجوع کرتے وقت ہم دانتے کی بے جا تنقیص کرنے کو "جاوید نامہ" کی تعریف نہ سمجھ بیٹھیں۔

اقبال کی شعری و فکری استعداد معمولی نہ تھی۔ اسلامی خیالات میں مغرب کے شعر و فکر کو انتخابیت سے سمو دینا اعلیٰ ذہانت و قابلِ تعریف استعداد کا ایسا ثبوت فراہم کرتا ہے کہ عالمِ اسلام نے ہنوز کوئی دوسرا اقبال پیدا نہیں کیا ہے۔ اقبال نے کبھی Divina Commedia کی تنقیص نہیں کی۔ اپنے ایک انگریزی مضمون A plea for deeper study of the Muslim Scientists میں جو Islamic Culture بابت شائع ہوا

اپریل ۲۹ء میں چھپا تھا۔ اقبال نے برسبیلِ تذکرہ کہا کہ واقعۂ معراج نے جو محی الدین ابن العربی کے توسط سے دانتے کو دستیاب ہوا دانتے کو ایک ایسا اعلیٰ و ارفع نمونہ فراہم کیا کہ اس نے قرونِ وسطیٰ کے تہذیب و تمدن کی علامت بنا کر اپنی تصنیف طربیۂ ربّانی میں شامل کر لیا۔ اقبال میں صلاحیتِ انتقاد کافی تھی بلکہ موجود تھا اور مغرب کے مشاہیرِ علم و ادب کے مطالعہ نے اس کو دو آتشہ کر دیا تھا۔ جاوید نامہ کے لئے اقبال نے دانتے کے خاکے سے کام لیا۔ اقبال نے طربیۂ ربانی بطور موڈل استعمال کیا اس کا ثبوت درج ذیل تصانیف سے ملتا ہے۔

۱۔ ذکرِ اقبال (بزمِ ادب، لاہور) مصنفہ عبدالمجید سالک، ص ۱۴۷،۲۹

۲۔ Iqbal Singh : The Ardent Pilgrim (Orient Longman) pp. 185-187.

۳۔ L. C. Maitre : Introduction to Iqbal (Translation from French by M. A. Dar, Published by Iqbal Academy Karachi) pp. 37-38.

۴۔ A. Anwar Beg : The Poet of the East (Lahore). p. 138.

موخرالذکر کتاب میں قدرے تفصیل سے کام لیا گیا ہے۔ بیگ نے لکھا ہے کہ "معراج کو موجودہ فکر کی عبارت میں پیش کرنے کے لئے گلشنِ راز کے اسلوب میں 'معراج نامہ' تصنیف کرنے کا خیال اقبال کی توجہ کا مرکز تھا۔ دریں اثنا دانتے کی ڈوائن کومیڈی سے متعلق بہت کچھ قیمتی تنقید سامنے آئی جس سے یہ ثابت ہو گیا کہ ابنِ عربی کے 'فتوحات' سے لیا ہوا مسالا ہے۔ لہٰذا دانتے کے اسلوب میں ادبی و شعری نقطۂ نظر سے اقبال نے رویا و تخئیل کی دنیا میں پرواز سے لطف اندوز و مستفیض ہونے کی ٹھان لی۔"

واحد نے اپنی تصنیف (Iqbal His Art & Thought, London) میں لکھا ہے کہ دانتے کے یہاں جو درجہ و حیثیت ورجل کو حاصل ہے وہی اقبال کے یہاں رومی کو حاصل ہے (ص ۴۳-۴۲) دانتے نے ورجل کا انتخاب کیوں کیا اور اقبال نے رومی کو بحیثیت رہنما کیوں بنایا، ایک دلچسپ پہلو کی طرف تنقید کا رُخ موڑنے والا سوال ہے۔ تقابلی مطالعہ و تلاش کے بغیر اس سوال سے انصاف نہیں کیا جا سکتا۔

دانتے نے ورجل کی رہنمائی کس لئے پسند کی اس پر کچھ روشنی گلبرٹ ہائیٹ نے اپنی تصنیف Gilbert Highet: The classical Tradition (اوپر) میں ڈالی ہے۔ "معمولی اور اہم دونوں طرح کی بہت سی روایتوں اور متعدد واضح روحانی اسباب کے پیش نظر دانتے نے ورجل کو منتخب کیا۔ ورجل ہی ایسا وثنی (Pagan) تھا، جس سے وثنیت (Paganism) اور مسیحیت کے درمیان حائل خلیج پُر ہوتی معلوم ہوتی ہے۔ اپنے شعری شاہکار Aeneid کی وجہ سے ورجل کو یہ شہرت حاصل ہو چکی تھی کہ وہ مسیح سے پہلے ہی مسیحی تھا۔ اس کی نظم ایک روحانی صداقت کی ترجمان تھی، امن و آشتی کا دور دورہ رہنے کی شدید آرزو، نیز یہ بے صبر تمنا کہ دنیا پر آدمیوں کے متصادم خواہشات کے بجائے خدا کی حسن و خوبی کا نظام قائم ہو، یہ تھی روحانی صداقت۔ ورجل کے کردار میں مضمر اس خواب و تخئیل آگیں توانائی نے اُسے دانتے کے رہنما کی حیثیت سے زندۂ جاوید بنا دیا، اگر کوئی ورجل کا مطالعہ دانتے کی طرح ذہانت و ہمدردی سے کرتا ہے۔ تو وہ اس کو منظور کرے گا کہ تمام لوازمات کے پیش نظر ورجل ایک مسیحی روح رکھتا ہے۔ خون خرابے سے نفرت کرتا تھا۔ بے غرضانہ اخلاقی آدرشوں سے عقیدت رکھتا تھا۔ تیسرا سبب جو دانتے پر اثر انداز ہوا یہ تھا کہ ورجل رومن سلطنت کا نقیب تھا۔ دانتے کو دو چیزیں خاص اہمیت رکھتی تھیں، مسیحی کلیسا اور پاک رومن سلطنت۔ دانتے ورجل کو پیار کرتا تھا کیونکہ ورجل کو..... حالانکہ پیدائشی اعتبار سے ورجل اور دانتے دونوں اطالوی نہیں تھے۔ یہ بھی اکثر کہا جاتا ہے کہ دوسری دنیا کے سفر میں دانتے رہنماؤں میں ورجل کا عقل کا نمائندہ ہے اور بیٹرس سے مراد ایمان و ایقان ہے۔ مزید براں ورجل نے اس دنیا کے بعد کی دنیا کا ایسا سفرنامہ ودیعت کیا ہے۔ جو زندگی و مرگ کے آخری معنوں کی گہری فلسفیانہ اور اخلاقی وضاحت سے لبریز ہے۔" (Chapter: Dante & Pagan Antiquity ص ۴۳-۴۲)

اب خلیفہ عبدالحکیم کے جواب کے بارے میں رجوع کیا جائے، یعنی اس سوال کے بارے میں کہ اقبال کی نظر انتخاب بالآخر رومی ہی پر کیوں پڑی۔" اس کا جواب یہ دیا جا سکتا ہے کہ رومی کا تصوف اسلامی تصوف کی متعدد اقسام میں ایک ممتاز مقام رکھتا ہے۔ عشق و عقل کے مابین محاذ آرائی رومی کا ایک خاص موضوع تھا۔ وہ جبر کی جگہ قوتِ ارادی میں یقین کرتا تھا۔ شاعر بھی

اس کے نزدیک آدمی کا جہاد ہی تقدیر ہے..... (جو اقبال کو) ایسا فلسفہ معلوم ہوا جو ایک طرح نطشے کا پیشرو تھا۔ رومی کا اعتقاد بھی لاثانیت میں تھا۔ اور اس کے نزدیک انسان ذاتِ الٰہی میں اس طرح مُدغم نہیں ہو جاتا جیسے قطرہ دریا میں فنا ہو جاتا ہے، بلکہ وہ انفرادیت کو برقرار رکھتا ہے۔ خودی کو پختہ کرنا، شخصیت کی تعمیر نیز انا کو ادعا و کشمکش سے دوچار رکھنا جو اقبال کے خاص موضوع تھے۔ اسکو رومی کے یہاں بھی نظر آئے۔ تسخیر کائنات اور ارتقاء آدم وغیرہ سے متعلق موضوعات رومی کے یہاں بھی ملتے ہیں۔" (Iqbal as a Thinker, Lahore, pp. 201-2)

رومی کو اقبال نے بطور رہنما کیوں تسلیم کیا؟ اس پر ایم۔ ایم شریف نے بھی قدرے روشنی ڈالی ہے "معلوم یہ ہوتا ہے کہ اقبال نے رومی کو اپنا روحانی سربراہ اتفاقیہ خیال سے منتخب نہیں کیا کیونکہ حاشل دل ودماغ کا حامل تھا، ایک زبان بولتا تھا اور مشترک فلسفۂ تصوف، اعلیٰ شاعرانہ ذہنیت و استعداد، گہرا مذہبی مزاج، خدا پر یقین محکم اور حضرت محمدؐ سے والہانہ عشق کا حامل تھا۔ ایسی خصوصیات اور خوبیاں دوسروں میں بھی مل سکتی تھیں۔ اقبال نے عمر بھر کے لئے رومی کو اپنا رہنما اس لئے بنایا کہ وہ بہت سے بنیادی خیالات میں نطشے اور برگساں کا پیش رو تھا۔" (M. M. Sharif: About Iqbal & His Thought, Lahore. pp. 13-14)

بیگ اور عبدالعلیم کی آراء کی روشنی میں، غالباً یہ کہنا نادرست نہ ہوگا کہ اقبال نے شعوری طور پر رومی کو اپنا رہنما بنایا اور اس شعوری عمل کی طرف اقبال کو دانتے کے ورجل کو دیکھ کر ترغیب حاصل ہوئی ہوگی۔ طربیہ ربانی کا ورجل دانتے کے خیالات کا ترجمان ہے۔ بقول بیگ "اکثر و بیشتر اقبال کے یہاں کا رومی، اقبال ہی کا ترجمان ہوتا ہے۔" (The Poet of the East. Lahore. p. 220)

راقم الحروف کی رائے میں ایک وجہ اور بھی ہو سکتی ہے حافظ کی شان میں مندرج ذیل قسم کے اشعار نے ایک طوفان برپا کر دیا تھا۔ اور اقبال کو اسرارِ خودی کے دوسرے ایڈیشن میں ان کو حذف کرنا پڑا تھا۔ ۳۵ اشعار متعلقہ حافظ حذف کر دئے گئے، چند ایک ملاحظہ کیجئے:

ہوشیار از حافظِ صہبا گسار	جامش از زہرِ اجل سرمایہ دار

رہنِ ساقی خرقۂ پرہیز او   مے علاجِ ہولِ رستاخیز او
مسلم و ایمانِ او زنار دار   رخنہ اندر دینش از مژگانِ یار
آں فقیہِ ملتِ مے خوارگاں   آں امامِ امتِ بیچارگاں
گوسفند است و نوا آموخت است   عشوہ و ناز و ادا آموخت است
ضعف را نامِ توانائی دہد   سازِ او اقوام را اغوا کند
مارِ گلزارے کہ دارد زہرِ ناب   صید را اول ہمی آرد بہ خواب
عشق با سحرِ نگاہش خودکشی ست   کشتنش مشکل کہ تارِ خانگی ست
بادہ زن با عرفیِ ہنگامہ خیز   زندہ ؟ از صحبتِ حافظ گریز
ایں فسوں خواں زندگی را مار بود   جام او شانِ جمی از ما ربود
محفلِ او در خورِ ابرار نیست   ساغرِ او قابلِ احرار نیست
بے نیاز از محفلِ حافظ گزر   الحذر از گوسفنداں الحذر

(سرود رفتہ صفحہ ۴۳)

حافظ کے متعلق چونکہ متصوفین میں خاص تقدس کا عقیدہ تھا جس کی وجہ سے اقبال پر شدید اعتراضات شروع ہو گئے تھے۔ غالباً اشعار محولہ کے حذف کرنے سے پوری بات نہ بنی ہو لہٰذا اقبال نے رومی کی جانب رجوع کیا ہو کیونکہ رومی کو صوفیائے کرام میں بلند مرتبہ و مقام حاصل رہا ہے۔ بہرکیف؛ رومی کو مرشد کی حیثیت میں پیش کرنا شعوری اقدام تھا اور منجملۂ اسباب اقبال کی نگاہِ تہ بیں بھی تھی جو اقبال کو وسیع مطالعات سے حاصل ہوئی تھی۔ دانتے کے شاہکار سے جو ادبی تاثر یا وہ لازمی طور پر جاوید نامہ کا خاکہ بن کر ذہنِ اقبال پر جگمگا اٹھا ہوگا۔

یوس کلاد میترے نے اپنی فرانسیسی تصنیف "Introduction A La Pensee D. Iqbal" میں جاوید نامہ سے مندرجہ ذیل اشعار پیش کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "دانتے کے اس حصے کی یاد تازہ کرتے ہیں جہاں وہ اپنے آپ کو ایک تاریک جنگل میں بھٹکتا ہوا پاتا ہے (صفحہ ۲۷-۲۸ Introdu-ction to Iqbal Tr. M.A.M. Dar)

آدمی اندر جہانِ ہفت رنگ   ہر زماں گرمِ فغاں مانندِ چنگ
آرزوئے ہم نفس می سوزدش   نالہ ہائے دل نواز آموزدش
لیکن ایں عالم کہ از آب و گل است   کے تواں گفتن کہ دارائے دل است
بحر و دشت و کوہ و کہ خامش و کر   آسمان و مہر و مہ خامش و کر
گرچہ بر گردوں ہجومِ اختر است   ہر یکے از دیگرے تنہا تر است
ہر یکے مانندِ ما بیچارہ ایست   در فضائے نیلگوں آوارہ ایست
کارواں برگِ سفر ناکردہ ساز   بیکراں افلاک و شب ہا دیر یاز
ایں جہاں صید است و صیادیم ما   یا اسیرِ رفتہ از یادیم ما
زار نالیدم صدائے بر نخاست   ہم نفس فرزندِ آدم را کجاست
دیدہ ام روزِ جہانِ چار سوے   آنکہ نورش بر فروزد کاخ و کوے
از رمِ سیارہ او را وجود   نیست الا اینکہ گوئی رفت و بود
اے خوشا آں روزے کہ از ایام نیست   صبح او را نیمروزے شام نیست
روشن از نورش اگر گردد رواں   صوت را چوں رنگ دیدن می تواں
غیب ہا از تابِ او گردد حضور   نوبتِ او لایزال و بے مرور
اے خدا روزی کن آں روزے مرا   وا رہاں زیں روزِ بے سوزے مرا

دانتے کے محولہ حصہ کا ترجمہ ملاحظہ ہو۔ ترجمہ جناب اثر لکھنوی مرحوم نے کیا تھا:

طے مری عمر کا جب نصف ہوا تھا   دشتِ تاریک میں گم آپ کو میں نے پایا
جادۂ راستی و حق سے جو برگشتہ ہوا   اسکا اظہار ہے دشوار جو کچھ پیش آیا
وحشت انگیز تھا ایسا بھیانک جنگل
کہ تصور میں بسا ہے وہی اب تک جنگل
کم نہیں چاشنیٔ مرگ سے کچھ یاد اسکی   نہیں آساں کہ بیاں ہو سکے رُوداد اسکی
غم و اندوہ پہ قائم ہوئی بنیاد اسکی   چھوڑ دے فکر یہ سب اب دلِ ناشاد اسکی
ذکر اسکا ہو جو اس دشت میں دیکھا میں نے
اور انجام میں جو لطف اُٹھایا میں نے
پردے غفلت کے پڑے تھے جو مری آنکھوں پر   دھیان آتا نہیں کیونکر ہوا جنگل میں گزر
جادۂ منزل کا نہ تھا اور نہ جادے کی خبر   کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ جاتا ہوں کدھر
گرم رفتار تھا اک عالمِ مدہوشی میں
طے ہوا دشتِ بلاخیز فراموشی میں
دامنِ کوہ میں تھا، سر جو اُٹھا کر دیکھا   تابشِ مہر سے نکھرا ہوا اس کو پایا
مشعلِ راہِ ہدایت تھی مجھے اسکی ضیا   چونک اٹھا اور اُسی سمت کا رخ میں نے کیا
درد مندوں کی دعاؤں کا اثر ہونے لگا
ظلمتِ شب سے عیاں نورِ سحر ہونے لگا [1]

---

[1] استاذی اثر مرحوم کے ترجمے میں ۳۱ بند ہیں اور یہ "رنگ بست" میں شامل تھا، جو اب نایاب ہے۔ مرحوم نے مجھے ایک کاپی سے نوازا تھا۔ مرحوم کی آخری نوازش تھی اُن کی تصنیف "رنگِ اثر" جو انہوں نے بذریعہ رجسٹری پوسٹ ارسال کی تھی۔ [illegible]

اقبال اور دانتے کے تخیلی سفر حضورِ خداوندی میں ختم ہوتے ہیں۔ اقبال کا رہنما صرف ایک ہے' رومی۔ دانتے نے تین رہنماؤں کا ذکر کیا ہے' ورجل، ستیٹیس اور بیٹریس۔ خدا کے حضور میں اقبال اور دانتے دونوں تنہا اکیلے پہنچتے ہیں۔ اقبال نے تجلیٔ جلال کا ذکر اس طرح کیا ہے ؎

ناگہاں دیدم جہانِ خویش را — آں زمین و آسمانِ خویش را
غرق در نورِ شفق گوں دیدمش — سرخ مانندِ طبر خوں دیدمش
زاں تجلی ہا کہ در جانم شکست — چوں کلیم اللہ فتادم جلوہ مست
نورِ او ہر پردگی را وا نمود — تابِ گفتار از زبانِ من ربود
از ضمیرِ عالمِ بے چند و چوں — یک نوائے سوزناک آمد بروں

(جاوید نامہ)

دانتے نے تجلیٔ جمال کے حضور جس سرمدی سرخوشی میں خود کو غرق محسوس کیا اُس کا ذکر انگریزی ترجمے میں اس طرح ہے ؎

As a sudden flash of lightning sha-
-ttereth the visual spirits as to rob
the eye to realise e'en strongest
objects;
So there shone around me a light,
Leaving me swathed in such a web
of its glow that naught appeared.
Ever doth the love which stilleth
heaven, receive into itself with such
like salutation, duly to fit the taper
for its flame!
So soon as these brief words
came into me. I surmount my
proper power; and kindled me
with such new given sight that
there is no such brightness una-
-llayed that mine eyes might
not hold their own with it.
And I saw a light, in river form
glow tawny betwixt banks painted
with marvellous spring.
From out this river issued living
spark on every side into the
blossoms, like rubies set in gold,
Then as inebriated with the odours
they plunged, themselves again into
the marvellous swirl, an as one
entered issued forth another,

(Dante: Divine commedy, newyork, pp. 586-88)

اقبال نے خود کو "جلوہ مست" محسوس کیا اور دانتے نے خود کو تجلّی میں INEBRIATED سرشار، سرخوش محسوس کیا۔ معنوی اعتبار سے دونوں بیانات میں کوئی خاص فرق نظر نہیں آتا ع

"شراب ایک ہے بدلے ہوئے ہیں پیالے" اور بس۔

جاوید نامہ اور ڈوائن کومیڈی میں ایک اور لطیف مماثلت نظر آتی ہے، اور یہ مماثلت اس نوعیت کی ہے کہ تنقید اس سے چشم پوشی نہیں کر سکتی۔ جاوید نامہ میں حلاج' غالب' اور قرۃ العین طاہرہ کی ارواحِ جلیلہ کو فلکِ مشتری پر دکھایا گیا ہے۔ مزید برآں ان کی بابت بتایا گیا ہے کہ انہوں نے گردشِ جاوداں کو بہشت پر ترجیح دی۔ ملحوظ رہے کہ غالب، طاہرہ اور حلاج تینوں کا شمار ان کے ہم عصروں نے راسخ العقیدہ مسلمانوں میں نہیں کیا۔ یہ اور بات ہے کہ زمانۂ مابعد میں ان کو عزت و عقیدت کی نظر سے دیکھا گیا۔ ڈوائن کامیڈی میں ہومر' ہوریس' اووڈ اور لیوکن (Homer, Horace, Ovid, Lucan) کو Limbo میں دکھایا گیا ہے۔ عیسائی نقطۂ نظر سے' لمبو کو قریب قریب اعراف کہا جا سکتا ہے۔ دوزخ کی سرحد بھی ہے' اور جنت کی سرحد بھی ہے۔ جنت و دوزخ کے درمیان واقع مقام کو Limbo کہا جاتا ہے۔ کیونکہ ان کی وفات قبلِ مسیح ہوئی تھی لہٰذا یہ سب کے سب بغیر بپتسمہ لئے ہی اس جہاں سے رخصت ہو گئے تھے اور ان کو بہشت میں دکھانا درست نہ تھا۔ مگر کیونکہ دل و دماغ کی بدرجۂ اتم خوبیوں کے حامل تھے

لہٰذا ان کو ممتاز جگہ دینا بھی مناسب تھا۔ ابن عربی کی "فتوحات" میں کیونکہ اس قسم کا التزام دیکھنے میں نہیں آتا لہٰذا یہ قرین قیاس ہے کہ اقبال کا "گردشِ جاوداں" کی طرف متوجہ ہونا دانتے کے لمبوسے تاثر پذیری پر دلالت کرتا ہے۔

اخیر میں یہ عرض کرنا غالباً بے محل نہ ہوگا کہ اقبال کے فکر و شعر سے متعلقات پر لکھنے پڑھنے سے پہلے یہ ملحوظ رکھنا ضروری ہے، جیسا کہ شبیر احمد خاں غوری نے اپنے مضمون "علامہ اقبال اور فلسفۂ دہریت کی تجدید" (اردو ادب سہ ماہی شمارہ ۲، ۱۹۶۵ء انجمن ترقیٔ اردو، ہند) میں کہا تھا کہ اقبال نے تاریخ و فلسفۂ اسلام کا مطالعہ مغربی ماخذ کی وساطت سے کیا تھا، اسلامیات سے شناسائی کے مواقع مغرب کے مستشرقین کی نگرانی ہی میں ملے تھے۔ مزید برآں، اقبال نے صوفی تبسم کو اپنے ایک خط میں لکھا بھی تھا کہ مغربی نقطۂ نظر سے مطالعہ کرنا میری عادتِ ثانیہ ہو گئی ہے۔ اقبال کے مطالعات بہت وسیع تھے جس کے سبب اعماقِ فکر و شعر میں اترنے کے لئے نگاہِ اقبال میں بے پناہ صلاحیت پیدا ہو گئی تھی۔ دانتے کے شاہکار کے متعلق نظرِ اقبال میں وقعت تھی۔ اگر ڈوائن کامیڈی کے ڈزائن پر معراج نامہ لکھنے کا خیال اقبال کو ہوا تو اس میں کسی قسم کی تنقیص کی گنجائش نہیں ہے۔ اقبال گول میز کانفرنس کے سلسلے میں ۱۹۳۱ء کے جاڑوں میں لندن گئے تھے۔ آمد پر استقبالیہ پیش کرنے کے لئے والڈروف ہوٹل میں ایک جلسہ کا اہتمام کیا گیا تھا۔ اقبال نے میزبانِ خصوصی کی درخواست پر جاوید نامہ کی تلخیص انگریزی میں تیار کرا دی۔ اقبال بولتے گئے اور این۔ ایم خان لکھتے گئے۔ اس تلخیص میں 'فتوحات' کا کہیں ذکر نہیں ہے۔ فلسفۂ معراج برسبیلِ تذکرہ مذکور ہے اور بس۔ بعض حلقوں میں، نہ جانے کیوں جاوید نامہ کے جہاں دوست کو "شیوجی مہاراج" بتایا جاتا ہے۔ اقبال نے محولہ تقریر میں جہاں دوست کو وشوامتر بتایا ہے، ملاحظہ ہو:

(p.227. S.A. Vahid, ed. Thoughts & Reflection of Iqbal. Lahore

اس جملۂ معترضہ میں اتنا اضافہ اور کیا جا سکتا ہے کہ 'شیو' کو 'شیوجی مہاراج' پڑھے لکھے ہندو نہیں کہتے۔ بہرکیف! بیچ میں در آئے اس جملۂ معترضہ کے قطع نظر اقبال کی تلخیص متعلقہ جاوید نامہ خاصی دلچسپ بھی ہے اور قدرے معلوماتی بھی۔ کیونکہ جاوید نامہ کے ذکر کے ساتھ اس شاعر بھی

تلخیص کا ذکر ناگزیر ہی سا معلوم ہوتا ہے۔ اقبال نے معراج کے فلسفہ کو جاوید نامہ میں پیش کیا ہے اور اسکو پیش کرنے کے لئے لٹریری ماڈل کے بطور ڈوائن کامیڈی کو ملحوظ رکھا۔ اقبال کی تنقیدی نظر قابلِ تعریف تھی جس نے بتایا تھا کہ "The Divine comedy ...... symbolises the culture of medi-aeval Europe...." (P.148 Thoughts & Reflection of Iqbal, Lahore; from an article in Islamic culture. April 1929) یعنی ڈوائن کامیڈی قرون وسطیٰ کی یورپی تہذیب کی علامت پیش کرتی ہے۔ بالکل یہی رائے معروف نقاد جان اڈنگٹن سائمنڈس نے اپنی تصنیف "An introduction to the Study of Dante, London" میں (ص ۱۶۱-۲) ظاہر کی ہے اور بدیں وجہ دانتے کے شاہکار کو Epic of the Middle Ages بتایا ہے۔ اگر جاوید نامہ کے موجودہ فلسفیانہ پس منظر کو عمرانی و سیاسی (Politico - sociological) رنگ و روغن بھی بہم پہنچایا جاتا تو بالیقین جاوید نامہ کو بھی Epic of the Modern times یعنی دورِ حاضرہ کا عظیم ترین شعری شاہکار سمجھا جاتا۔ بہرکیف 'جاوید نامہ' شعرِ اقبال میں مخصوص و ممتاز مقام رکھتا ہے۔ ہیئت پر دانتے کا اثر سہی مگر مواد، فکر و تخیل سو فیصد دل و دماغ اقبال ہی کا مرہونِ منت ہے۔ چراغ سے چراغ تو جلتا ہی ہے۔ بقول ہیرلڈ بلوم کوئی بڑی نظم ایسی نہیں ہو سکتی کہ اس میں اثرات کی نشاندہی نہ کی جائے اور اس نے تنقید کے جدلیاتی پہلو کو اپنی تصنیف Anxiety of influence وضاحت و استدلال سے پیش کیا ہے۔ دانتے بھی عظیم شاعر تھا اور اقبال بھی عظیم اسلامی شاعر تھا۔

نوٹ: سنسکرت ادبیات میں ۸ پران جو پہلی اور ۱۰ویں صدی کے دوران تصنیف ہوئے خاصی اہمیت کے حامل ہیں۔ بعض لوگ انکی بہت بڑی تعداد بھی بتاتے ہیں۔ بہرکیف! ان میں جتیار یا تراؤں (سیاحت و مسافت) کا ذکر ملتا ہے۔ جو دوزخ، بہشت نیز لاتعداد لوکوں (کرہ ہا) سے متعلق ہے۔ سنسکرت کی بہت سی تصانیف کا ترجمہ عربی میں ہوا تھا۔ ابن عربی پر ان کا اثر ہے یا نہیں، مطالعہ طلب موضوع ہے۔ (رستوگی)

غزلیں

ڈاکٹر عنوان چشتی

کیا تمہارے شہر میں اک شخص بھی ایسا نہ تھا
جو بھرے بازار میں میری طرح تنہا نہ تھا

ٹوٹ کر اندر سے جب تک اِس قدر بکھرا نہ تھا
بولتے سناٹے کیا کہتے ہیں، یہ سمجھا نہ تھا

آدمی سادہ تھا، گو ظاہر میں وہ گہرا نہ تھا
پھر بھی پہلی بار اُسے دیکھا تو میں سمجھا نہ تھا

دُور تک آنکھوں میں پیلا رنگ سا پھیلا ہُوا
اِس قدر میرا کبھی اُترا ہوا چہرا نہ تھا

زندگانی کے سفر میں پھر بھی دامن تر ہوا،
راستے میں صرف صحرا تھا، کوئی دریا نہ تھا

پھر بھی جانے کیوں کفِ افسوس وہ ملتا رہا
میرے چہرے پر تو میرا مرثیہ لکھا نہ تھا

رات بھر گو دل کی صُورت جلتی آنکھیں وار ہیں
آسماں سے اوس بن کر پھر بھی وہ اترا نہ تھا

اِتنی بے رونق نہ تھی عنوانؔ میری زندگی
اُن سے مل کر جب تلک میں اپنے گھر آیا نہ تھا

○ ریڈر شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی ۲۵

اقبال ماہرؔ

بے نیازی سے ہر اک شخص نے دیکھا پتھر
ایک آذر نے مگر پیار سے چُوما پتھر

دیکھنا ضربِ محبت کا کرشمہ پتھر
لذتِ کربِ نمو کو جو سمجھتا پتھر

کبھی انجم کبھی مہتاب نے روکا نہ اُسے
رات بھر سر پہ برستا رہا کالا پتھر

چند لمحوں کے تموج کے سوا کچھ نہ ملا
ہم نے احساس کے تالاب میں پھینکا پتھر

سنگساری تو بُری چیز نہیں ہے، لیکن
جو گنہگار نہ ہو مارے وہ پہلا پتھر

ریت کا خوف نہیں دھوپ کا احساس نہیں
رکھ لیا سر کے تلے خواب کا ٹھنڈا پتھر

تا فلک ہو نہ سکی پھر کبھی سیدھی دیوار
رہ گیا ذہن کی بنیاد میں ٹیڑھا پتھر

تم نے بھیجی نہیں کیوں زخم کی سوغات مجھے
تم نے اوروں کی طرح کیوں نہیں مارا پتھر

اپنی آنکھوں کو بہر طور بچائے رکھنا
جانے کس وقت برسنے لگے اندھا پتھر

جم گیا وہ مرے ہونٹوں پہ تبسم بن کر
کسی نا اہل نے جب طنز کا مارا پتھر

طفل تو طفل یہاں صاحبِ ادراک نے بھی
کسی دیوانے کو دیکھا تو اٹھایا پتھر

چوٹ بھی کھائی تو اک پیکرِ نازک بن کر
گر کے اک شیشے کی دیوار پہ ٹوٹا پتھر

معبدِ فن ہے وہ تقدیسِ ہنر بھی ماہرؔ
بن گیا ہے مرے خوابوں کا سجنا پتھر

○ ۳۰۴ - جگدیش کالونی - الٰہ آباد ۳

افسانہ

بے چہرگی

حمید سہروردی
صدر شعبۂ اردو، نوتن کالج، بیڑ (مہاراشٹر)

جیسے ہی رات کی کالک پتھر بنی، نقش پا ملیامیٹ ہوگئے۔ پتہ نہیں یہ کونسی جگہ ہے جہاں سناٹے کی حکومت ہے جنگل سے بھاگ کر آئے ہوئے گدھے سڑکوں پر گھوم رہے ہیں۔ گدھوں کا سڑکوں پر آنا بھی عجیب وغریب لگ رہا ہے۔ یعنی خطرہ۔ کیا ــــ یہ جگہ مُردہ ہے؟۔ میں یہی سوچتا ہوا آگے بڑھا۔ کسی نے خاموشی کا پردہ چاک کرتے ہوئے آہستہ سے میرا نام پوچھا۔ میں نے پہلی مرتبہ سوچا۔ میرا نام کیا ہے ــــ؟۔ میرا نام کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ یہ احمقانہ فعل ہے کہ ہم ناموں کے حصار میں مقیّد ہوتے ہیں۔ نام 'الف' بھی ہو سکتا ہے اور 'ر' بھی۔ اور میں بے نام بھی ہو سکتا ہوں:
ہم سب اتفاقی حادثے کا روپ ہیں۔ نہ ہم اپنی مرضی سے آئے ہیں اور نہ اپنی مرضی سے جائیں گے۔ ہم وجود اور عدم کے درمیان بھی فرضی ہی تو لگتے ہیں۔ نام ــ یہ بھی اتفاقی ہی ہوتا ہے۔ وجود ہمارے چہرے کو نمایاں کرتا ہے اور عدم بے چہرہ ہوتا ہے۔ چہرے ہمیشہ دھوکہ دیتے ہیں۔ ایک ہی چہرہ لمحہ لمحہ رنگ بدلتا ہے۔ یہ سمجھنا دشوار ہوتا ہے کہ پہلی سوچ درست تھی یا موجودہ۔ نام ــ چہرے کا ہی ہوتا ہے۔ شناختی کارڈ اسلئے بنائے جاتے ہیں کہ نام اور صورت کو جان کر مطمئن ہو جائیں۔ شناختی کارڈ کا فوٹو اور نام ناخن اور گوشت کا رشتہ ہوتے ہیں۔ شناختی کارڈ کا فوٹو اور نام بیک وقت دونوں جھوٹے نہیں ہو سکتے۔ اگر ہمیں اپنے آپ کی پہچان والا نام ہو تو ہمارا فوٹو ہی معاون و مددگار ثابت ہوتا ہے۔ یعنی ہماری پوری شخصیت سمٹ کر فوٹو میں چلی آتی ہے۔ اکثر اوقات ہم بڑی معصوم اور احمقانہ باتیں سوچ سوچ کر شاداں و فرحاں ہوتے ہیں۔ کمال تو یہ ہے کہ اس کا پرچار بھی کرتے ہیں۔ اپنے ہی چہرے کو آئینے میں دیکھ کر مسرور ہوتے ہیں۔ جب کوئی ہمارے چہرے کو غور سے دیکھنے لگتا ہے تو ہم یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ ہمارا چہرہ بے انتہا اپیل کی قوت رکھتا ہے یا پھر یہ مطلب اخذ کرتے ہیں کہ سامنے والا (دیکھنے والا) ہمارا چہرہ پڑھ رہا ہے۔ یعنی چہرہ شناسی کے علم میں غرق ہو رہا ہے۔

وہ خراماں خراماں زیرِ لب مسکراتا ہوا میری طرف بڑھ رہا ہے۔ میرے نام کی صدا بھدّے ماحول میں اترتی چلی جا رہی ہے۔ لیکن میری سماعت پہ پردے پڑ چکے ہیں۔ میرا نام کیا ہے؟ میرا نام کسی نے جانا۔ میں نے خود بھی۔ میں یہ جان کر خوش ہوں۔ ناموں سے کیا ہوتا ہے۔ لیکن شہر میں تنازعہ کی فضا 'الف' اور 'ر' کی وجہ سے پھیلی ہوئی ہے

'وہ' میرے ساتھ ساتھ ہی چل رہا ہے ــ تمہارا نام ــــ

میں بے نام ہوں' بے چہرہ بھی۔

وہ تو میں دیکھ رہا ہوں۔ تمہارے چہرے پر دھبّے ہیں اور جگہ جگہ زخموں کے نشان بھی۔

وہ ایک قدم آگے بڑھتا ہے۔ پھر پوچھتا ہے ــــ تمہارا نام کیا ہے!
مجھ سے کوئی تحکمانہ انداز میں سوال کرتا ہے تو ایسا لگتا ہے کہ میں بے حد تیز آگ بنتا جا رہا ہوں۔ چاہے وہ کوئی بھی ہو۔ ماں، باپ، بھائی یا بیوی بچّے۔ نہیں نہیں، میں نہیں کہتا کہ میں نارمل نہیں ہوں۔ ساما اصطلاحیں ہماری شخصیت کو اپنے میں حلول کرنا چاہتی ہیں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ پھر عدم اور وجود ــ وجود کر یا وجود' عدم ــ ایسا ہی ہے جیسا کہ یہ کہنا کہ ابھی یہ خالی جگہ ہوتے ہوئے بھی اپنی حالت سے عدم مکمل ثبوت دے رہی ہے۔ کیا یہاں لوگ نہیں رہتے؟ ساری گلی سارے مکانات مقفّل کیوں ہیں؟ سڑکیں افسردہ اور مضمحل کیا ہو گئی ہیں؟ عدم کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھو تو ایک بے حد وسیع خلا تو کیا سب کچھ خلا سے پیدا ہوتا ہے اور اسی میں ضم ہو جاتا ہے؟ شاید سڑکوں کو بھی اپنے نام کے کھو جانے کا رنج ہوتا ہے۔ سڑکیں منجمد تو ہوتی ہیں۔ وقفے وقفے سے اُن کے ناموں میں واضح تبدیلیاں رہتی ہیں: 'الف' اور 'ر' کی طرح۔ کیوں سڑکیں ماتم کرتی ہیں۔

گدھوں کے پیروں کی بھڑ بھڑانے کی آواز آ رہی ہے۔ وہ آ رہے ہیں اور سڑک کے جسم پر سوار ہوتے ہیں۔ وہ میرا گریبان پکڑ کر کہتا

کر بتا تیرا نام کیا ہے؟ اُس کے لہجے کی کرختگی ذہن پر گراں گزرتی ہے۔ پھر میں اپنا نام بتلانے سے قاصر ہوں۔ کیوں کہ اب میرا نام میرے ذہن سے اُتر چکا ہے اور چہرہ' وہ بھی تو ایک عرصے سے' میں نے دیکھا نہیں۔

میں دیکھ رہا ہوں کہ کچھ بد ہیئت اور بد شکل لوگوں کا گروہ ہاتھوں میں مشعل، لاٹھیاں' زنجیریں اور لوہے کی سلاخیں لئے 'الف' اور 'د' کا نام گلا پھاڑ پھاڑ کر چیختے ہوئے آرہا ہے۔ میرے پیروں میں تھرتھراہٹ پیدا ہو رہی ہے۔ کیا کیا جائے — ٹوٹے ہوئے لمحے، کبھی کبھی مہمان بن کر آتے ہیں تو آنکھوں کے سامنے ریت ہی ریت پھیل جاتی ہے اور یہی ریت چہروں کو گرد و غبار سے آلودہ کردیتی ہے۔ پھر لمحے اور چہرے مسخ ہو کر رہ جاتے ہیں۔ وہ 'اصل' بجائے نقل کے الم بن کر پورے جسم کو نچوڑ کر رکھ دیتا ہے۔ اور لوگ شریر اور آتما کے درمیان حدِ فاصل کھینچ دیتے ہیں۔ پھر اپنی دانشمندی کا پروپیگنڈا کرنے لگتے ہیں۔ لوگ دراصل جسم اور رُوح کے مُنکر ہیں۔ جب جسم ہی نہ ہو تو رُوح کہاں سے پیدا ہوتی ہے۔ اِسی طرح رُوح نہ ہو تو جسم کی کیا اہمیت رہتی ہے۔

'وہ' زور زور سے ہاتھ ہلاتے ہوئے چیخ چیخ کر کہتا ہے —
ایک مل گیا — 'الف' — خوش ہوگا — "د" خوش ہوگا۔

آنے والے بد ہیئت اور بد شکل گروہ کا نام 'ہم' ہے۔ 'وہ' 'ہم' کا ہی ایک چہرہ ہے۔

ایک سے زائد بے ہنگم آوازیں سماعت کا پردہ چاک کردیتی ہیں۔ 'وہ' سالا — مجھے اُلو بنا رہا ہے۔ ابھی تک اپنا نام نہیں بتایا۔ ایک گھنٹے سے کھڑا ہوا ہے — 'وہ' ایک تھپّڑ مارتا ہے۔

'ہم' بول تیرا نام کیا ہے؟

میں بے نام ہوں۔

سُوّر کا بچّہ 'ہم' سے نام چھپا رہا ہے۔

حرام خور —

ذلیل —

کمینہ — —

مردود —

سالے نے داڑھی چھوڑ رکھی ہے۔

نہیں، یہ کوئی مخصوص نشانی نہیں رہی۔

شاعر، بمبئی

بہت ہوشیار لگتا ہے۔

ابھی دیکھتے ہیں اس کی ہوشیاری اور چالاکی۔ بیٹا بچ کر کہاں جائیگا۔

لاٹھیاں ہوا میں گھومتی ہیں۔

زنجیریں بجتی ہیں۔

سلاخیں ٹکراتی ہیں۔

ہم سے بچ کر کہاں جائے گا۔

میرے قریب مت آؤ۔ مجھے مت چھوؤ — میں آگ ہوں۔

میں چاروں دِشاؤں میں پھیل جاؤں گا۔

تمہیں بھسم کر کے رکھ دوں گا۔

سالا جوش میں آرہا ہے۔ گلا دبا دو۔ پھر دیکھو' آگ پانی کی باتیں بھول جائے گا۔

کون ہے تو بتا۔ ہم چھوڑ دیتے ہیں۔

میں بے نام ہوں۔ اور اب بے چہرہ بھی۔

تُو کہاں سے آرہا ہے۔ کہاں رہتا ہے۔ پیارے بتا دے۔ ہم چھوڑ دیتے ہیں۔

میں مٹّی سے آرہا ہوں۔

اداکاری کر رہا ہے۔

ایک سلاخ — ایک لاٹھی — ایک زنجیر —

زمین پر ڈھیر ہو گیا۔

مجھے یہاں کوئی نہیں جانتا۔ میں بے نام شہر کا بے نام باشندہ ہوں۔ میں صرف مٹّی ہوں۔ میں یہاں صدیوں سے ہوں اور صدیوں رہوں گا۔ 'ہم' محض ہوا کا ایک جھونکا ہے۔ آیا اور چلا گیا۔ لیکن یہ ہوا کا جھونکا بھی صدیوں سے موجود ہے۔ 'ہم' اپنے ہی شریر کے ایک ایک انگ کو چاٹ رہے ہیں۔ لیکن کب تک —؟

اپنے ہی شریر کی لذّت — لعنت ہے 'ہم' پر' جنہوں نے کچھ نہیں جانا — میں' میں مٹّی ہوں۔ میرے اندر کی آگ — آگ —!؟

اچانک فضا میں ایک دلدوز چیخ پھیلتی ہے گِدھوں کے پَر پھڑپھڑانے لگتے ہیں۔

○ ○

مالک، پرنٹر، پبلشر اعجاز صدیقی نے یونیورسل فائن لیتھو پریس ۲۳ نوروجی اسٹریٹ ٹھاکردوار بمبئی ۲ میں چھپوا کر دفتر — سے شائع کیا

اختر بستوی

بے بس مسافر

کون جانے مختصر ہے یا طویل
دھند میں لپٹی ہوئی راہِ حیات
اس پہ اک بے بس مسافر کی طرح
چلتے رہنا ہے مجھے دن ہو کہ رات
یہ بھی ممکن ہے کہ آجائے کہیں
کوئی ایسا موڑ بھی اس راہ پر!
راستے کا خاتمہ جس پر نہ ہو
ختم ہو جائے مگر میرا سفر

تگ و دو

عمر بھر میں دہر کے صحرا میں سرگرداں رہا
جلوہ ہائے کائنات و زیست کا خواہاں رہا
اس قدر دوڑا کہ تھک کر ہو گیا بالکل ہی چور
پا سکا اب تک نہ لیکن ایک بھی جلوے کا نور
وائے ناکامی نہ میرا غنچۂ دل کھل سکا
اپنے سائے کے سوا کچھ بھی نہ مجھ کو مل سکا۔

(بشکریہ آل انڈیا ریڈیو گورکھپور)

○ روشن محل۔ گاندھی نگر۔ بستی (یو پی)

تنہا تماپوری

ملے نہ ملے

حیات
خوشۂ انگور ہے۔
اچھلتے رہو
ملے گا کچھ تو
اسی سعیِ مستقل کے عوض
ملے نہ کچھ تو.....
یہ کہہ دینا
دانے کھٹّے ہیں

شکستِ طلسم

پہلے یہ ہونٹ
پنکھڑی سے تھے۔
چھو کے اوس ان کو، کانپ جاتی تھی
اب
وہی ہونٹ ہیں
مگر
ان پر
ایک بنیئے نے لکھ دیا ہے حساب!!

○ رنگم پیٹ۔ گلبرگہ

یک بابی ڈراما پر ایک نظر

پروفیسر خواجہ امینؔ
صدر شعبۂ اردو - رامیشور کالج - مظفر پور۔

مغربی ادبیات کی تاریخ میں یک بابی ڈراما نگاری One Act Play کا آغاز کب ہوا، قطعیت کے ساتھ کچھ کہنا مشکل ہے۔ یہ ایک بحث طلب اور متنازعہ مسئلہ ہے۔ پھر بھی ناقدین کی غالب اکثریت کا خیال ہے کہ اس کی اصل کا سُراغ پندرھویں اور سولھویں صدی عیسوی کے Miracle اور Morality ڈراموں میں لگایا جاسکتا ہے۔ البتہ عہد الزبتھ میں تاریخی یا بالفاظ دیگر ناظرین یک بابی ڈراموں Five Act Plays کی طرف کچھ ایسا مائل ہوئے کہ ایک عرصہ تک یک بابی ڈراما قبولِ عام کی سند سے محروم ہوگیا۔ لیکن سترھویں اور اٹھارھویں صدی اس کی حیاتِ نو کا پیغام لے کر آئی۔ چنانچہ ان ہی زمانوں میں اُس کا دوبارہ احیاء ہوا، خاص کر After Pieces اور Curtain Raisers جیسے ڈراماتی طریق ہائے کار سے اسٹیج پر ناظرین کے لئے ہلکی پھلکی تفریح کا سامان فراہم کیا جانے لگا۔ بقول ڈاکٹر ریڈ اسمتھ Curtain Raisers حاضرین کے مجمع عام کی تفریح و تفنّن کا ذریعہ تھے۔ جب تک مُرفہ پسند ناظرین (Fashionable Audience) کی ایک بڑی تعداد آنہ جاتی، ڈراما باضابطہ شروع نہ ہوتا۔ اس اثناء میں یا پھر باقاعدہ ڈراما کے قلیل المیعاد ہونے پر یہ After Pieces کی حیثیت سے کام آتے۔

Curtains Raisers وکٹوریائی دَور میں بہت مقبول ہوئے۔ اگرچہ فنّی طور پر ان کا تشخّص بالکل منفرد اور جداگانہ تھا لیکن یہ تفریحی مقاصد کے حصول کا وسیلہ بن کر رہ گئے۔ اٹھارھویں صدی کے Farce کی طرح یہ بھی مقصود بالذات نہ ہوکر محض ایک ذریعہ تھے۔ پھر بھی اس حقیقت سے انکار محال ہے کہ ان سے مختصر ڈراموں کی فنی روایت کو برقرار رکھنے میں بڑی مدد ملی ہے۔

اٹھارھویں صدی میں نارویے کے ہنرک ابسن نے یک بابی ڈراما کے تنِ مُردہ میں زندگی کی لہر دوڑادی۔ اس سمت میں اُن کی حیثیت ایک پیش رَو کی ہے۔ اُن کے یہاں یک بابی ڈرامے کی ایک مخصوص فنّی تراش خراش دیکھی جاسکتی ہے۔ یہاں تک کہ اُنھوں نے فکری حیثیت سے اپنے ڈراموں میں ایک واضح عصری حسیت کی ترجمانی کی اور اپنے وقت کے سماجی سیاسی، معاشی اور مذہبی مسائل کو پیش کیا۔ غایت سادگی اور متانت اُن کے یک بابی ڈراموں کا جزو اعظم ہیں۔

جُوں جُوں وقت گذرتا گیا، اس صنفِ نثر کی فنّی ہیئت واضح، بالیدہ اور متعین ہوتی گئی۔

ابسن کی تجدد پسندی بڑی دُور رس ثابت ہوئی۔ اس کے اثرات انگلینڈ میں نمایاں طور پر دیکھے جاسکتے ہیں، خاص طور پر سر آرتھر جانس پینیرو (۱۸۵۵ - ۱۹۳۴) اور ہنری آرتھر جانس (۱۸۵۱ - ۱۹۲۹)، ان دو معاصر ڈراما نویسوں نے ابسن کی قائم کی ہوئی روایتوں کو آگے بڑھایا۔ ان دو اصحاب نے یک بابی ڈراما نگاری میں حقیقت پسندی کے رجحان کی داغ بیل ڈالی۔ ان دو فن کاروں نے اپنے عصر کے معروف مسائل اور زندگی کے سنگین حقائق کو انتہائی حقیقت پسندانہ طرز کے ساتھ پیش کیا۔ پھر کیا تھا، ان کی قیادت میں دیکھتے دیکھتے ڈراما نگاروں کا جیسے ایک قافلہ ہی چل پڑا ہو جن میں برنارڈ شا، ولیم آرچر، ڈبلیو اس۔ گلبرٹ، گالزوردی، ہیرالڈ چیپن، اے اے ملنے، ہیرالڈ برگ ہاز، گرین وائل بارکر اور جے۔ ٹی گرین وغیرہ بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ ان میں بیشتر اصحاب نے تھیٹروں کی از سر نو تشکیل و تنظیم کی اور ڈراموی ادب میں تجربات کو راہ دی۔ یہاں تک کہ اپنے تجرباتی جوش و خروش میں اُن تمام فنّی رسوم و قیود کا مذاق اُڑا لیا جو یک بابی ڈراما کے ارتقاء میں حائل تھیں۔ اس طرح اُن کے یک بابی ڈرامے فطرت و حقیقی

شاعر بمبئی

زندگی کے مسائل سے ہم کنار ہوگئے۔

جب آئرش ادب (Irish Literature) کا نشاۃ ثانیہ شروع ہوا تو یک بابی ڈرامے کی طرف خصوصی توجہ دی گئی۔ اس کے فن میں توانائی پیدا ہوئی۔ اسی نشاۃ ثانیہ کا فیض تھا کہ ۱۹۰۴ء میں ڈبلن کے مقام پر ایک مشہور ایبے تھیٹر Abbey Theatre کا قیام عمل میں آیا جس میں ڈبلیو۔ بی ییٹس، جے۔ ایم۔ سنگے، لارڈ ڈنسانی اور سینٹ جان ارونگ جیسے نامور ادباء اور مصنفین کے یک بابی ڈرامے پیش کئے گئے ـــــ مذکورہ بالا تھیٹر کا قیام ہی خالص ادبی غرض و غایت کے تحت عمل میں آیا تھا۔ دوسرے تھیٹروں کی طرح اس کا مقصدِ وجود تجارتی اور مطمحِ نظر پیشہ ورانہ نہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس تھیٹر نے اس وقت کے ڈراما نویسوں کو یک بابی ڈرامے کی تخلیق کے لئے محرک بن کر اکسایا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس صنفِ نثر میں کئی خوب صورت اور جان دار فنی اور تکنیکی تجربات کئے گئے۔

اس طرح یک بابی ڈراما تیزی سے ارتقاء کی راہ پر گامزن ہوگیا۔

مزید Repertory Theatre سے بھی جس کو عرفِ عام میں Amateur تھیٹر بھی کہا جاتا ہے، یک بابی ڈرامے کو فروغ اور مقبولیت حاصل ہوئی بلکہ ڈاکٹر رے نلڈ کے الفاظ میں تو "یک بابی ڈراموں کا فروغ ہی اس Amateur تھیٹر کا مرہونِ احسان ہے"۔

بیسوی صدی کے عہدِ حاضر کا برق رفتار مزاج، اس کا عجلت پسندانہ رویہ، اس کی عدیم الفرصتی اور اس کی ہنگامہ آفریں رستخیزی تو بہرحال یک بابی ڈراما جیسی مختصر اصناف کے لئے انتہائی سازگار ثابت ہوئی ہے ـــــ مزید برآں یک بابی ڈرامے اپنے سانچے اور کینوس کے اختصار و ایجاز کے باوصف دورِ حاضر کے گوناگوں مسائل اور بوقلموں حقائق کو ٹریجڈی، کامیڈی، Farce، اوپرا، Burlesque، میلوڈراما، رزمیاتی Pastoral اور Morality وغیرہ کی مختلف شکلوں اور تکنیکوں کے ساتھ پیش کرسکتا ہے۔ انگریزی کے ڈرامائی ادب کی تاریخ سے اس کی متعدد مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں۔ جیسے جے ام سنگے کا RIDERS TO THE SEA ـــــ اپنے مزاج کے اعتبار سے ایک دردناک ٹریجڈی کا ہے۔ اس کے برعکس گالز ورڈی کا "The Little Man" ایک سبق آموز اور پُر مزاح ڈراما واقع ہوا ہے۔ لارڈ ڈنسانی کا The Golden Doom ایک شہکار خیالیہ (Fantasy) ہے۔ ڈبلیو۔ ڈبلیو جیکب کا Monkeys Paw ـــــ جہاں ایک میلوڈرامائی حیثیت رکھتا ہے وہیں ہیرالڈ چیپن کا It is the poor that help the poor اپنے طنزیہ انداز کی وجہ سے کتنی طنزیاتی واقع ہوا ہے۔ ـــــ ہیوٹن کا The child in Flanders ایک ڈراما کی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طفولیت The Nativity کو اپنا موضوع بناتا ہے۔ The two Corporals اور Discovery یہ دو یک بابی ڈرامے تاریخی حقائق پر مبنی ہیں۔ دیں الفرڈ سٹو کا A marriage has been arranged اپنے پلاٹ کے اعتبار سے ایک سماجی کامیڈی کا درجہ رکھتا ہے۔

مذکورہ بالا ارتقائی سفر کی یہ طویل تاریخ اس بات کا بدیہی ثبوت فراہم کرتی ہے: کہ یک بابی ڈرامے کی نشوونما پنج بابی ڈرامے کے دوش بدوش آزادانہ اور علیحدہ فنی نہج پر ہوئی ہے، بالکل اسی طرح جیسے مختصر افسانہ، ناول سے بالکل مختلف اور جداگانہ فنی اور تکنیکی ضوابط و قواعد کے ساتھ ارتقاپذیر ہوا ہے۔

یک بابی ڈراما اپنے اختصار اور ایجاز کے لحاظ سے جزوی طور پر مختصر افسانہ یا کہانی سے مماثل ہے۔ موضوع کا ارتکاز، مرکزی خیال کی وحدت، ایک بنیادی قصہ یا واقعہ کی پیشکش، کرداروں کی کم سے کم تعداد، غیر ضروری طوالت سے اجتناب، الفاظ کی کفایت، برق رفتار نقطۂ عروج اور تاثر کی یکتائی وغیرہ عناصر تو دونوں ہی اصناف میں مشترک ہیں۔ البتہ کردار کی عملیت Action اور تصادم clash یہ دو اجزائے ترکیبی ایسے ہیں جن میں ڈرامے کا، طویل ہو کہ مختصر کسی سے میل نہیں اور اس باب میں تمام دوسری اصنافِ نثر و سخن سے ممیز ہے۔

انگریزی کے بعض ناقدین نے تو یک بابی ڈراما کے ساتھ بھی ایک ہی نشست میں پڑھ ڈالنے کی ایک حد مقرر کردی ہے۔ ٹھیک اسی طرح جیسے ایڈگر ایلن پو نے مختصر افسانہ کے لئے نصف گھنٹے سے ایک یا دو گھنٹے تک پڑھ لئے جانے کی شرط عائد کردی تھی۔ مثال کے طور پر ایک J. W. Marriott ہی کو لیجئے۔ ان کا خیال ہے کہ "یک بابی ڈراما جو بلند آواز میں بیس منٹ سے آدھے گھنٹے تک پڑھ دیا جاسکتا ہے" یہ ظاہر کردیتا ہے کہ ایک مرکزی خیال کو کس طرح کم سے کم اسباب اور زیادہ سے زیادہ ڈرامائی تاثر کے ساتھ منتہائے عروج تک پہنچایا جاسکتا ہے۔"

یک بابی اور پنج بابی ڈراما کے درمیان مابہ الامتیاز، کردار کی تخلیق، مرکزی خیال کی پیشکش، مکالمہ نگاری اور اسٹیج کی ہدایتوں کے اعتبار سے ایک نمایاں فرق ہے۔ یک بابی ڈراما نگار جہاں ایک اور صرف ایک ہی قصہ، واقعہ

یا صورتِ حال سے تعلق رکھتا ہے وہیں پنج بابی ڈراموں میں ایک مرکزی واقعہ یا کلیدی صورتِ حال کے ساتھ ساتھ زیریں قصے بھی رُونما ہوتے رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یک بابی ڈراموں کے خالق کو الفاظ کی کفایت سے کام لیتے ہوئے بے جا طول بیانی سے اپنا دامن بچائے رکھنا پڑتا ہے۔

یک بابی ڈرامے کا ماجرا اپنے ارتقائی سفر میں بڑی سُرعت کے ساتھ بُحران یا تصادم کے مرحلے سے گزرتا ہوا نقطۂ عروج تک پہنچتا ہے اور پھر اپنے انجام کی طرف مُڑ جاتا ہے۔

طویل ڈراموں کی طرح یک بابی ڈراموں میں کردار کی بھرپور جانچ بھی نہیں ہوتی بلکہ اُس کے تنگ اور محدود تر دائرۂ عمل میں کردار کا بھرپور شخصی ارتقا بھی ممکن نہیں۔ بیشتر حالات میں تو اس کی اہم خصوصیات کو ہی اُجاگر کرنے پر اکتفا کیا جاتا ہے تاکہ پلاٹ اور کردار کا ارتقائی سفر واحد مجموعی تاثر پیدا کرنے میں مد و معاون ثابت ہو سکے۔

یک بابی ڈرامے میں مکالمہ نگاری بھی بڑی محنتِ شاقہ کی طالب ہوتی ہے۔ یوں تو مکالمے، طویل اور مختصر دونوں ہی طرح کے ڈراموں میں انتہائی اہم رول ادا کرتے ہیں لیکن یک بابی ڈراما لکھنے والے لفظوں کی اِن کی تاثیر اور معنویت کے پیشِ نظر اُن کے انتخاب میں بڑی چھان پھٹک اور ژرف نگاری سے کام لیتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ یک بابی ڈرامے کی تخلیق کرتا ہوا ایک چابک دست فن کار الفاظ کا بہترین پارکھ ہوتا ہے۔ اس ضمن میں ہڈسن کا خیال درست ہے کہ "یک بابی ڈراموں میں مکالموں کو فطری، موزوں اور ڈرامائی ہونا چاہیئے جس کا مطلب یہ ہے کہ مکالمے کلام کرنے والی شخصیت کے شایانِ شان اور حسبِ حال ہونے کے ساتھ ساتھ سہل، تر و تازہ، صاف و شفاف اور دلچسپ ہوں۔"

آیئے اب ہم اس عنصر پر بھی ایک تنقیدی نگاہ ڈالیں جس کے بغیر ڈراما کے فن کا جائزہ ادھورا رہ جائے گا ——— اور وہ ہے conflict یعنی تصادم کی فضا۔ اس مقام پر بھی یک بابی اور پنج بابی ڈراما کے درمیان ایک حدِ فاصل قائم ہوتی ہے۔ اوّل الذکر میں تناؤ یا تصادم کی فضا خارجی یا ظاہری سطح پر رُونما ہوتی ہے، جب کہ مؤخر الذکر میں اس کی نوعیت خالص داخلی یا باطنی بھی ہو سکتی ہے۔ اس کی بہترین مثال شیکسپیئر کا "میکبتھ" ہے۔ پنج بابی ڈراما کے وسیع پس منظر اور کشادہ دائرۂ عمل میں اس کے کرداروں کی پیچیدہ ذہنی کیفیات اور تہہ دار نفسیاتی محرکات کی ترجمانی تصادم کو اندرونی سطح پر برپا کر سکتی ہے

قاسم بیگی

انگریزی ادب میں طویل پنج بابی ڈرامے کو سست سیر لیکن کشادہ دریا Broad slowmoving river سے تشبیہ دی گئی ہے اور مختصر یک بابی ڈرامے کو تیزی اور تواتر کے ساتھ بہنے والے چشمے (Swift-fountain torrent) سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اس طرح دونوں کے تقابلی مطالعے میں بڑے پتے کی بات کہی گئی ہے۔ OO

بقیہ:- نارسیسس سے آگے صفحہ ۲۵

(اخراجِ بشریت ہ) کے تصور کی ترجمانی کرنے والوں نے بھی یہ فرض انجام دیا، کیونکہ غیر انسانی تجربات کے اظہار پر انسان قادر ہی نہیں ہے۔ ہر لفظ کا تصور میں انسان اور اُس کے تجربات سے الگ ہو کر کرہی نہیں سکتا۔ ہئیت پرستوں پر ایک اعتراض یہ کیا گیا ہے کہ نظم کی تعمیر یا اُس کے ڈھانچے پر اُنکی توجہ اس حد تک مرکوز ہوتی ہے کہ وہ اپنے تجربے کو ایک بسیط، ہمہ گیر اور سنجیدہ تجربہ بنانے سے قاصر رہ جاتے ہیں۔ یعنی ذہانت اور فنی مہارت کے اظہار کے باوجود اُن کا تجربہ کسی سنجیدہ مقصد یا اشیاء اور حقائق کی طرف کسی گہرے زندہ رویے کی دیرپا روشنی سے عاری ہوتا ہے۔ عمیق حنفی کی شاعری، مجموعی طور پر، مسائل اور واقعات اور کوائف کے زندہ احساس کے سبب ایک سنجیدہ آہنگ رکھتی ہے۔ اُس کا مقصد محض تجربے کی جمالیاتی ترسیل نہیں بلکہ ایک ایسی وحدت کی ترسیل ہے جس کی ترکیب میں اُنکی ذات، اُن کا زمانہ اور اُنکی کائنات، سب کے عناصر اور اجزا شامل ہیں۔ اسی لئے اُن کا تخلیقی کینوس ایک ذرے کی شان رکھتا ہے، اور ایک ایسے منظر نامے کا حکم جس کی خاکہ کشی میں ذات کے اثبات اور اُس کی نفی، دونوں کا عمل یکساں توجہ کا طالب ہے۔ گفتگو کے خاتمے پر مجھے رسکنے کے یہ چند مصرے یاد آرہے ہیں:

پرندے ——— مجھ میں ہو کر پرواز کرتے جاتے ہیں

اور وہ شجر

جس پر میری نگاہ رُکی تھی

سینے کے اندر اُگ رہا ہے۔

شجر صدا بھی عمیق حنفی کی بیرونی دُنیا کا باطنی عکس ہے۔ OO

جاری شدہ ۱۹۳۰ء
بانی: علامہ سیماب اکبر آبادی مرحوم
اردو کا ترجمان علمی ادبی اور تہذیبی
ماہنامہ
شاعر بمبئی
جلد ۴۷ | شمارہ ۲
۱۹۷۶ء
مدیر اعلیٰ
اعجاز صدیقی
مدیر معاون
یونس اگاسکر

مہتمم: ناظر نعمان صدیقی
فون نمبر: ۳۵۹۹۰۲

ترتیب

ترسیل زر کا پتہ
ماہنامہ شاعر، قصر الادب، بمبئی ۴۰۰۰۰۸
خط و کتابت کا پتہ
ماہنامہ شاعر، مکتبہ قصر الادب، پوسٹ بکس ... بمبئی ۴۰۰۰۰۸

قیمت اشتراک
زر سالانہ ... روپئے
معاونین سے ... روپئے
تاحیات خریداری ... روپئے
ممالک غیر سے ... شلنگ

اب آپ اپنی رقم کو
سات گنا
سے بھی زیادہ کر سکتے ہیں
اس کا آسان طریقہ
۲۰ سالہ
دینا بینک
کیش
سرٹیفکیٹ

مدت	جاری شدہ قیمت	مقررہ وقت پر قیمت
۲۰ سال	۱۳/۶۵ روپے	۱۰۰ روپے
	۱۳۶/۴۶ روپے	۱,۰۰۰ روپے
	۶۸۲/۳۱ روپے	۵,۰۰۰ روپے
	۱,۳۶۴/۶۲ روپے	۱۰,۰۰۰ روپے
	۶,۸۲۳/۰۸ روپے	۵۰,۰۰۰ روپے
	۱۳,۶۴۶/۱۵ روپے	۱,۰۰,۰۰۰ روپے
۱۵ سال	۲۲/۴۵ روپے	۱۰۰ روپے
	۲۲۴/۵۲ روپے	۱,۰۰۰ روپے
	۱,۱۲۲/۶۱ روپے	۵,۰۰۰ روپے
	۲,۲۴۵/۲۱ روپے	۱۰,۰۰۰ روپے
	۱۱,۲۲۶/۰۷ روپے	۵۰,۰۰۰ روپے
	۲۲,۴۵۲/۱۳ روپے	۱,۰۰,۰۰۰ روپے
۱۰ سال	۳۶/۹۴ روپے	۱۰۰ روپے
	۳۶۹/۴۱ روپے	۱,۰۰۰ روپے
	۱,۸۴۷/۰۳ روپے	۵,۰۰۰ روپے
	۳,۶۹۴/۰۷ روپے	۱۰,۰۰۰ روپے
	۱۸,۴۷۰/۳۵ روپے	۵۰,۰۰۰ روپے
	۳۶,۹۴۰/۷۰ روپے	۱,۰۰,۰۰۰ روپے
۶ سال	۵۵/۰۲ روپے	۱۰۰ روپے
	۵۵۰/۱۸ روپے	۱,۰۰۰ روپے
	۲,۷۵۰/۸۹ روپے	۵,۰۰۰ روپے
	۵,۵۰۱/۷۸ روپے	۱۰,۰۰۰ روپے
	۲۷,۵۰۸/۸۹ روپے	۵۰,۰۰۰ روپے
	۵۵,۰۱۷/۷۸ روپے	۱,۰۰,۰۰۰ روپے
۶۱ ماہ	۶۰/۲۸ روپے	۱۰۰ روپے
	۶۰۲/۷۷ روپے	۱,۰۰۰ روپے
	۳,۰۱۳/۸۳ روپے	۵,۰۰۰ روپے
	۶,۰۲۷/۶۶ روپے	۱۰,۰۰۰ روپے
	۳۰,۱۳۸/۲۸ روپے	۵۰,۰۰۰ روپے
	۶۰,۲۷۶/۵۵ روپے	۱,۰۰,۰۰۰ روپے
۴ سال	۶۹/۸۶ روپے	۱۰۰ روپے
	۶۹۸/۶۱ روپے	۱,۰۰۰ روپے
	۳,۴۹۳/۰۷ روپے	۵,۰۰۰ روپے
	۶,۹۸۶/۱۴ روپے	۱۰,۰۰۰ روپے
	۳۴,۹۳۰/۷۱ روپے	۵۰,۰۰۰ روپے
	۶۹,۸۶۱/۴۱ روپے	۱,۰۰,۰۰۰ روپے
۳ سال	۷۶/۳۱ روپے	۱۰۰ روپے
	۷۶۳/۱۵ روپے	۱,۰۰۰ روپے
	۳,۸۱۵/۷۳ روپے	۵,۰۰۰ روپے
	۷,۶۳۱/۴۹ روپے	۱۰,۰۰۰ روپے
	۳۸,۲۰۷/۴۵ روپے	۵۰,۰۰۰ روپے
	۷۶,۳۱۴/۹۰ روپے	۱,۰۰,۰۰۰ روپے

اب ۱۳,۶۴۶ روپے ۱۵ پیسے لگائیے۔ اور پوری مدت گذرنے پر ۱,۰۰,۰۰۰ روپے پائیے۔

دینا بینک کیش سرٹیفکیٹ چھوٹی رقموں کے لئے بھی ملتے ہیں جو کم مدت کے لئے ہوتے ہیں۔ اور جیسا کہ پاس کے گوشوارہ میں بتایا گیا ہے ملاحظہ کیجئے کہ یہ کتنی دلکش قیمت خرید پر ملتی ہیں۔

ضرورت کے وقت، جاری ہونے کی تاریخ سے ایک سال بعد کسی بھی وقت دینا بینک کیش سرٹیفکیٹ بھنوائے بھی جا سکتے ہیں۔ آپ ان پر بینک سے قرض بھی حاصل کر سکتے ہیں۔

بینک میں جمع رقم اور دیگر منظور شدہ رقوم سے بطور سود حاصل ہونے والی ۳,۰۰۰/- روپے تک کی سالانہ آمدنی پر انکم ٹیکس نہیں لگتا۔ بینک میں جمع اور دیگر منظور شدہ ۱,۵۰,۰۰۰/- روپے کی رقموں پر دولت ٹیکس بھی نہیں لگتا۔

دینا بینک
(گورنمنٹ آف انڈیا انڈر ٹیکنگ)
ہیڈ آفس: ہارنیمن سرکل، بمبئی - ۴۰۰۰۲۳

رفعت سروش

نئی روشنی

اک دھندلکا تھا فضاؤں میں
خلاؤں میں محیط
نفرتیں، تفرقے، شبہات، الزام
کالے نقطوں کی طرح ذہن پہ آ بیٹھے تھے

روشنی،
توڑ کے تخریب کے اندھیاروں کا سنگین حصار
مسکرائی،
تو فضاؤں میں ستارے مہکے
کتنے سورج اُفقِ ذہنِ رسا پر چمکے
روشنی جذبۂ تعمیر کی،
مشرق کے حسیں خوابوں کی
روشنی پیار کے آدرشوں کی،
روشنی امن کی آزادی کی
دلِ جمہور کی بیتاب تمناؤں کی
ذوقِ تخلیق کی،
محنت کی ہتھیلی پہ اُگے سورج کی
روشنی کا جو اُٹھا طوفان تو پھر
جگمگا اُٹھی حیات
اور فضاؤں میں اُڑے روشنیوں کے پیکر۔

یہ نئی روشنی ہے،
گاندھی و نہرو کی پروازِ خیال
فکرِ اندرا کا جمال
عزمِ محکم کا جلال
اِس سے وابستہ ہے اب ہند کی عظمت کا وقار
امنِ عالم کی بہار

○ ایس۔ ۸ - این - ۵۵۱ - آر کے پورم - نئی دہلی ۲۲

سید محمود نقوی

دستاویز

آج کی تازہ خبر
صبح کے اخباروں میں
باکس میں پہلے صفحے پر تھی یہی
رات ایک شخص نے پھر
بھوک اور پیاس کی شدّت سے فراغت پالی
مل گئی اُس کو نجات
اک پڑوسی نے مگر
حقِ ہمسایہ ادا کر ہی دیا۔
تیل مٹی کا اُدھار اُس کو دیا۔
ورنہ یہ آگ — کہاں لگتی۔
ختم ہوتی نہ کبھی۔
کشمکشِ دستِ سوال
جس کی تھی آخری خواہش بھی عجیب
'لوگ جن کو مری موت پہ کچھ ہمدردی
چندے سے پیسے ادا کر دیں۔
اِس اک بوتل کے۔
ہوں میں شرمندۂ احسانِ وفا
شکریہ'
گھر سے نکلا تھا یہی قیمتی کاغذ خالی
چار لاشوں کے سوا
لے گئی جس کو پولیس
'یہ بھی اچھا ہی ہوا'
اک پڑوسی نے کہا
جانچ تحقیق ثبوت
کام کتنے ہی ابھی باقی ہیں
اور بس
ایک یہی دستاویز

○ ۱۔ نیو برج بہاری۔ دہلی ۱۱۰

اسلوب کیا ہے؟

ڈاکٹر عصمت جاوید
۱۹-۱۰-۱۹، ۱۰، ونا گر نجیبا۔ اورنگ آباد (ایم ایس)

آپ نے دماتی ہواؤں کی تال پر پودوں کو رقص کرتے ہوئے یا دھوپ کی تمازت میں پانی کی بہتی ہوئی سلوٹوں کے درمیان ناچتے، مچلتے اور چمکتے ہوئے ستاروں دیکھے ہوں گے۔ پودوں کا ان کے والہانہ رقص اور موجوں کا ان کے اندر ٹوٹتے، بکھرتے اور لچکتے ستاروں سے جو تعلق ہے، وہی ادب کا اسلوب سے ہے۔ اسلوب ادب کی وہ مچلتی ہوئی گریزپا کیفیت ہے جس کی گرفت صرف جمالیاتی حس سے ممکن ہے اور جو فکر کی سطح پر اپنا اتا پتا دینے سے انکار کرتی ہے۔ لیکن اس چھلاوے کو شعور کے جال میں گرفتار کرنے کی سعی لاحاصل سے انسان نہ کبھی باز آیا ہے اور نہ شاید کبھی باز آئے۔ عام زندگی میں بھی ہم اسلوب سے دوچار ہوتے ہیں۔ جیسے ہم طرز، طور طریقہ، وضع قطع، چال ڈھال، رکھ رکھاؤ، آداب اور وضعداری جیسے الفاظ سے تعبیر کرتے ہیں۔ ہم کسی کے حسنِ ادا کے متوالے ہوتے ہیں۔ کسی حسینہ کے جوڑا باندھنے میں لانبی مخروطی انگلیوں کا خم اور ہاتھوں کی جنبشوں کا آہنگ ہمارے دل میں اتر جاتا ہے تو کسی کے گوشۂ چشم سے مسکرانے کی ادا ہمارا دل اڑا لے جاتی ہے۔ کسی کھلاڑی — فرض کیجئے کرکٹ کے کھلاڑی کے مخصوص انداز میں بلا گھمانے یا گیند پھینکنے کی خاص ادا ہمارے دل میں گھر کر لیتی ہے۔ اور پھر یہ پیارا پیارا دل لبھانے والا انداز ہمارے جمالیاتی ذوق میں رچ بس کر نمایاں جگہ حاصل کر لیتا ہے۔ اس طرح کے انداز، طرزِ ادا، اور اس طرح کی مخصوص کیفیت کا اظہار جب ادب میں ہوتا ہے تو ہم اسے طرزِ نگارش، اندازِ بیان، پیرایۂ اظہار، شاعر کا لہجہ یا اس کے رنگ سے تعبیر کرتے ہیں۔ سہولت کے پیشِ نظر ہم اس خصوصیت کے لئے صرف ایک اصطلاح 'اسلوب' استعمال کریں گے۔

اسلوب کو ادب کا شخصی پہلو اور اس کا ہیئتی عنصر قرار دیا جاتا ہے اور یہ بات بڑی حد تک صحیح بھی ہے اس لئے کہ اسلوب ادیب یا شاعر کی ذاتی دین ہوتا ہے۔ جس طرح ہم ایک آنکھ اوجھل شخص کو اس کی آواز سے پہچان لیتے ہیں، اسی طرح ایک ادبی فنکار اپنے مخصوص لہجے سے بآسانی شناخت کیا جا سکتا ہے۔ ہم کوئی شعر سن کر فوراً کہہ اٹھتے ہیں کہ یہ اقبال کا رنگ ہے۔ اس شعر کو اس طرح صرف غالب کہہ سکتا ہے۔ یہ میر کا انداز ہے۔ یہ سودا کا طمطراق ہے۔ یہ مومن کی آواز ہے۔ یہ میر امن کا آہنگ ہے۔ لیکن آواز یا لہجے کی شناخت ہی کو اگر ادبی فنکار کی عظمت کا واحد معیار قرار دیا جائے تو بڑی الجھنیں پیدا ہوں گی، کیونکہ نوح ناروی کا بھی اپنا رنگ ہے۔ شاد عارفی بھی مخصوص انداز میں شعر کہتے ہیں۔ ناسخ اور دبیر بھی اپنے اسلوب سے پہچانے جا سکتے ہیں۔ اور انشاء اور جرأت کو بھی شناخت کر لینا کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ تو کیا انکی شاعری کو صرف انفرادی لب و لہجہ کی بنیاد پر عظیم قرار دیا جائے؟ ہم سمجھتے ہیں کہ اس کا جواب نفی میں دینے والوں کی تعداد خاصی نکل آئے گی۔ ادب میں سوال کسی کو پہچاننے یا نہ پہچاننے کا نہیں ہے کیونکہ ادب کوئی شناختی پریڈ تو ہے نہیں۔ اصل سوال جاذبیت اور دلآویزی کا ہے، زندگی کو مخصوص زاویوں سے دیکھنے اور دکھانے کا ہے کہ "گویا یہ بھی میرے دل میں ہے"۔ غالب نے ع،

"میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے"

کہہ کر ادب کی قدر شناسی میں قاری کی فعّال شرکت کی طرف نہایت ہی لطیف اشارہ کیا ہے۔ اس لئے کہ اسلوب میں دلآویزی پائے

کے لئے قاری کی گرہ میں بھی کچھ مال چاہیئے۔ اچھا ادب جہاں ادیب کے دل پر نازل ہوتا ہے وہیں قاری کے دل پر بھی اُترتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو حُسن کے علاوہ حُسنِ نظر سے فتنے کیوں کر اُٹھ سکیں گے؟ لیکن اسلوب کی دلآویزی ہے کیا؟ اصل اس کی نے نواز کا دل ہے کہ چوب ہے؟ میر حیران ہو کر کہتے ہیں ؎

کیا جانے دل کو کھینچے ہیں کیوں شعر میر کے
کچھ طرز ایسی بھی نہیں ابہام بھی نہیں

غالب "ہمائے شاعری چیزے دگر ست" کہہ کر خاموش ہو جاتے ہیں تو حافظ "قبولِ خاطر و حسنِ سخن خداداد ست" کہہ کر اس دلآویزی کو خداداد صفت قرار دیتے ہیں، لیکن ایک صفت کو دوسری صفت کے ذریعہ سمجھانے سے بات جہاں کی تہاں رہ جاتی ہے۔ پھر یہ چیزے دگر ہے کیا؟ سوال ٹیڑھا ہے۔ اس لئے آیئے پہلے اسلوب سے متعلق کچھ اِدھر اُدھر کی باتیں کر لیں۔

اسلوب ادب کا شخصی پہلو تو بلا شبہ ہے لیکن اسے خالص شخصی پہلو سمجھنا بھی صحیح نہیں۔ کیونکہ ادب کا میڈیم زبان ہے اور زبان ایک مشترکہ سماجی عمل ہے۔ بے شک عام زبان، علمی زبان اور ادبی زبان کے درمیان بڑے فاصلے پائے جاتے ہیں۔ ایک عام آدمی روزمرّہ کی ضروریات پوری کرنے کے لئے وہی زبان استعمال کرتا ہے جو اُسے ورثے میں ملتی ہے۔ اور اس زبان کا بنیادی مقصد عملی سطح پر ترسیل ہوتا ہے۔ علمی زبان کا بھی بنیادی مقصد ترسیل ہے لیکن علمی سطح پر۔ لیکن ادبی زبان فکری اور جذباتی رویوں کی نمائندگی کرتی ہے اور اس کا بنیادی مقصد اثر آفرینی ہے۔ اس لئے اسالیب کے اعتبار سے ادبی زبان رنگا رنگ ہوتی ہے۔ سائنسداں کا معروضی نقطۂ نظر اس کی شخصیت کو اس کی تحریر و تقریر کے پس پشت ڈال دیتا ہے۔ اس لئے ہم یہ نہیں پوچھتے کہ ڈارون کا اسلوب نگارش کیا تھا یا نیوٹن کی طرز گفتار کیا تھی لیکن اسلوب ادب کی آبرو ہے۔ ادب سے حُسنِ بیان چھین لیجئے تو پھر اس کے پاس منھ دکھانے کے لئے کیا رہ جاتا ہے؟ اس لئے اسلوب بلا شبہ ادب کا شخصی پہلو ہے لیکن بات یہیں ختم نہیں ہوتی۔ کیونکہ ادب میں شخصی اسالیب کی رنگا رنگی اور ارتقاء کے باوجود اس کی ہیئتوں (GENRES) کے اعتبار سے مشترک خطے بھی ہوتے ہیں اور اس پر وقت کی چھاپ بھی ہوتی ہے۔ جس طرح ہر ادیب اپنے دور کی پیداوار ہوتا ہے اسی طرح ہر زبان بھی اپنے عہد کی دین ہوتی ہے۔ اس لئے اسلوب کو ادب کا خالص شخصی پہلو کہنا ادھوری صداقت شناسی ہے۔

کا اظہار ہے۔ انفرادی اسلوب کی تعمیر مشترکہ اسلوب کے دائرے میں ہوا کرتی ہے۔ ناول، ڈراما، افسانہ، انشائیہ، غزل، غنائی نظم، بیانیہ نظم ان میں سے ہر صنف کم و بیش ایک ہی قسم کے اسلوب کی متقاضی ہوتی ہے۔ یہی اس کا اجتماعی یا مشترکہ اسلوب ہے اور اسی پر انفرادی اسلوب کی تہہ چڑھتی ہے لیکن یہ تہہ مصنوعی نہیں بلکہ نامیاتی ہوتی ہے۔ تہہ اگر مصنوعی ہو تو اس میں اور مشترکہ اسلوب میں بہت کم فرق رہ جاتا ہے۔ اور وہ دلآویزی ختم ہو جاتی ہے جو اسلوب کی جان ہے۔ بے شک بعض جمالیاتی نقاد جیسے کروچے وغیرہ ادبی اصناف کی گروہ بندی کے قائل نہیں اور کوئی عبقری اِن روایتی حد بندیوں کو توڑ بھی سکتا ہے۔ لیکن یہ بات بھی اپنی جگہ ایک حقیقت ہے کہ مختلف ادبی اسالیب میں اپنی اپنی مخصوص خصوصیات اور انکی تکنیک کے مختلف فنی تقاضے ہوتے ہیں اور ایک ادبی فنکار کسی مخصوص ادبی صنف کے انتخاب میں غیر شعوری طور پر اس کے اسلوب کو بھی انتخاب کر لیتا ہے۔ اور زبان کے تخلیقی استعمال کے ذریعے اپنے ذاتی اسلوب کے نقش و نگار بھی بناتا ہے۔ بعض فنکار تو مخصوص اصناف ہی کے لئے پیدا ہوتے ہیں۔ پھر ایک دوسری بات بھی ہے۔ اصناف کے اسالیب سے قطع نظر ہر عہد کی اپنی زبان ہوتی ہے کیونکہ انسان کی طرح زبان بھی ایک تغیر پذیر عمل ہے۔ کسی عہد کی ادبی زبان، دیگر زبانوں کے ادب سے ربط میں آکر عام زبان کے مقابلے میں زیادہ تیزی سے اپنے خدوخال بدلتی ہے جس سے رفتہ رفتہ اور ایک حد تک عام زبان بھی متاثر ہوتی ہے۔ دیگر زبانوں کے ترقی یافتہ ادب کے مطالعے سے زبان و بیان کے نئے نئے گوشے آ جاتے ہیں۔ اسالیب کے نئے نئے تجربے ہوتے ہیں۔ اس لئے ہر ادبی عہد کے رنگا رنگ اسالیب کی تہہ میں ایک اجتماعی اسلوب بھی ہوتا ہے۔ ہمارا نثری اسلوب کہاں سے کہاں تک پہنچ گیا ہے، اسے سمجھنے کے لئے اس قدر کافی ہوگا کہ ہم حالی، شبلی یا صاحب طرز آزاد کا کوئی مضمون لے کر اس کا مقابلہ رشید احمد صدیقی یا آل احمد سرور کے کسی مضمون سے کریں۔ اسلوب کا یہ اجتماعی پہلو ہمارے قدیم نقادوں اور فنکاروں کے لئے سب کچھ تھا، اس کا ثبوت علم بیان کی تدوین ہے جسے مکتبوں میں پڑھایا جاتا تھا۔

اسلوب ادب میں صداقت کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرنے

←

کی کامیاب کوشش کا نام ہے، چاہے یہ کوشش شعوری ہو، نیم شعوری یا غیر شعوری۔ یہ کوشش ہر ادیب یا شاعر کا انفرادی مسئلہ ہے جسے وہ اپنے اپنے طور پر حل کرتا ہے۔ منٹگمری بیلجین (MONTGOMERY BELGION -) نے اپنی کتاب "سُودمند مطالعہ" (Reading for Profit -) میں بالکل صحیح کہا ہے کہ "یہ وقوف کا کیا کہنا ہے اور اُسے مناسب ترین اور موزوں ترین الفاظ میں کہہ جانا، ان دونوں کے مشترکہ نتیجے کا نام اسلوب ہے"۔ ممکن ہے کوئی یہ کہے کہ یہ تو اسلوب کی نہیں بلکہ عمدہ شعر یا عمدہ تحریر کی تعریف ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اسلوب عمدہ تحریر یا شعر کی لاینفک خوبی ہے۔ اسے ادب سے اُسی طرح الگ نہیں کیا جا سکتا جس طرح ہیئت کو مواد سے جدا نہیں کر سکتے۔ جب ہم ادب کی بجائے اسلوب کہتے ہیں تو اس وقت ہمارے ذہن میں ادب کی وہ امتیازی خوبیاں اُبھر آتی ہیں جن کا تعلق صاحبِ ادب سے ہوتا ہے اور صاحبِ ادب اُس وقت تک اپنے دل کی بات مؤثر انداز میں پیش نہیں کر سکتا جب تک وہ اس کے لئے مناسب زبان یعنی اپنے اظہار کی تلاش نہ کر لے۔ جہاں تک مواد کے لئے مناسب ترین الفاظ کی تلاش کا تعلق ہے کبھی کبھی تو تخلیق کی ایک جست میں آناً فاناً خود مواد مناسب ترین اور موزوں ترین الفاظ میں ڈھل کر شعور کی سطح پر آ جاتا ہے اور کروشے کے الفاظ میں اظہار ابلاغ بن جاتا ہے لیکن اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ مواد کے لئے مناسب قالب کی تلاش و جستجو فنکار کے لئے اوڈیسی (Odyssey) سے کم عذاب ناک ثابت نہیں ہوتی اور کبھی کبھی مواد جو قالب لے کر ظہور پذیر ہوتا ہے خود فن کار اس سے مطمئن نہیں ہوتا اور اس میں ترمیم و تنسیخ کرتا رہتا ہے۔ اسے ہم فن کار کا تنقیدی شعور کہتے ہیں، جو نقاد کے تنقیدی شعور سے مختلف ہوتا ہے۔ غرض کئی صورتیں ممکن ہیں۔ دراصل انسانی ذہن کوئی مشین نہیں ہے کہ اس سے ہمیشہ متوقع نتائج برآمد کئے جا سکیں۔ اصول پرست فکر ہم پر اس قدر حاوی ہوتی ہے کہ ہم مصنوعات کی طرح ادبی تخلیقات کو بھی بندھے ٹکے اصولوں سے جانچنے اور پرکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس سے جہاں تنقید میں بہت سی خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔ ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اسلوب کے متعلق بھی طرح طرح کی غلط فہمیاں راہ پا گئی ہیں۔

پہلی غلط فہمی تو یہ ہے کہ ادب ایک صنعت (CRAFT) ہے اور شاعر، بھی ——

ہے۔ اور اسلوب زبان کے صناعانہ استعمال سے پیدا ہوتا ہے۔ اس غلط فہمی کا سرچشمہ مواد و ہیئت کی ثنویت کا تصور ہے۔ اگر ہم اپنے ادب کی تاریخ کا مطالعہ کریں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ بعض ایسے ادبی دور بھی آئے ہیں جن میں اس ثنویت کو روا رکھا گیا ہے۔ جس کے نتیجے میں ایسا مصنوعی ادب وجود میں آیا ہے جو متعلقہ دور کے انحطاط پذیر دور کی تسکین تو کرتا ہے لیکن ادب کی صحیح تعریف پر پورا نہیں اترتا۔ ادب مواد و ہیئت کی ہم آہنگی کا دوسرا نام ہے۔ مواد کو ہیئت اور ہیئت کو مواد پر حاوی کرنے کی رسّہ کشی میں ادب باقی رہتا ہے، نہ اسلوب۔ اسلوب کوئی خارج سے مسلط کی جانیوالی شئے نہیں ہے بلکہ یہ ادب کے اندر سے نمو کرتا ہے۔ اسلوب کو اکتسابی خصوصیت سمجھنے کی غلط فہمی ادبی زبان کے اُن محسوس و دلآویز نقوش سے پیدا ہوتی ہے جو اثر آفرینی کا سرچشمہ ہوتے ہیں جنھیں دیکھ کر یہ شبہ ہوتا ہے کہ انکی نقل بھی کی جا سکتی ہے۔ جاگیردارانہ سماج میں ادب ایک ایسا "ہنر" تھا جو قربِ سلطانی کا ذریعہ بھی تھا اور ایک شریف پیشہ بھی۔ اسی لئے مصنفِ چہار مقالہ نے پہلے دو مقالے جو دبیر اور شاعر سے متعلق ہیں۔ اس ہنرمندی کے داؤ پیچ سکھانے کے لئے وقف کر دیے ہیں اور بقیہ دو مقالے دوسرے دو شریف پیشوں یعنی تنجیم اور طبابت سے متعلق رقم کئے ہیں۔ ادب کو تنجیم و طبابت کی سطح پر لانے کا نتیجہ یہ ہوا کہ کلاسیکی فنکاروں کے اسالیب کا چربہ اتارنے کی شعوری کوششیں کی جانے لگیں۔ ادبی زبان کی معنوی صنعتیں خصوصاً تشبیہیں اور استعارے مشترکہ میراث قرار پائے۔ صنائعِ معنوی کے ساتھ ساتھ صنائعِ لفظی کو بھی ادب کا زیور قرار دیا گیا۔ انشا پردازی کے ساتھ ساتھ شاعری ایسی صنعت بن گئی جسے سیکھنے کے لئے اصول وضع کئے گئے اور شاعر مرصع ساز بن گیا۔ یورپ بالخصوص فرانس میں ایسے مدرسے قائم تھے جہاں علم انشا اور فن بلاغت کی تعلیم دی جاتی تھی۔ ادبی زبان میں، عام زبان کے برخلاف، استعاروں، تشبیہوں، کنایوں، علامتوں اور شعری پیکروں سے بھر مار سے آباد ہوتی ہے۔ اس لئے یہ غلط فہمی عام ہو گئی کہ ادبی زبان کے لئے تصنع لازمی ہے۔ مڈلٹن مرے نے بالکل صحیح کہا ہے کہ ایک غیر شاعر کی نظر میں یا اس شخص کے ذہن میں جس میں وجدان کی

قوت تخلیق پڑھتی ہو' استعارہ ایک زیور ہے۔ ایک ایسی چیز جو خارج سے عائد کی جاسکے لیکن حقیقی استعارہ زیور نہیں ہوتا بلکہ یہ طرزِ احساس (MODE OF EXPERIENCE) ہے"۔ چونکہ حقیقی استعارہ ایک متشاعر یا مصنوعی انشا پرداز کی دسترس سے باہر ہوتا ہے۔ اس لئے وہ گھسے پٹے استعاروں کے ملمع چڑھے زیوروں کا سہارا لیکر خوش ہوتا ہے یا استعارہ در استعارہ کے داؤ پیچ اور کرتب بازیوں سے اپنے زعم میں نازک خیالی سے کام لیتا ہے اور لفظی رعایتوں کی مدد سے بازیگروں کا ہنر دکھاتا ہے۔ حقیقی اور مصنوعی اسلوب کے فرق کی وضاحت کے لئے کلیم الدین احمد نے دو مثالیں دی ہیں جنھیں ہم یہاں نقل کرتے ہیں۔ سودا مندرجہ ذیل قطعہ بند میں ہجر کی کیفیت اس طرح بیان کرتے ہیں ؎

تجھ بن عجب معاش ہے سودا کا ان دنوں
تو بھی ٹک اس کو جا کے ستم گار دیکھنا
نے حرف و نے حکایت و نے شعر و نے سخن
نے سیر باغ، نے گل و گلزار دیکھنا
خاموش اپنے کلبۂ احزاں میں روز و شب
تنہا پڑے ہوئے در و دیوار دیکھنا
یا جا کے اس گلی کو جہاں تھا ترا گزار
لے صبح تا بہ شام کئی بار دیکھنا
تسکینِ دل نہ اس سے کبھی پائی تو بہر شغل
پڑھنا یہ شعر، گر کبھی اشعار دیکھنا
کہتے تھے ہم نہ دیکھ سکیں روزِ ہجر کو ۔۔۔ پر جو خدا دکھائے سو ناچار دیکھنا

اس پر تبصرہ کرتے ہوئے کلیم الدین احمد نے بالکل صحیح کہا ہے کہ "ہر شعر ایک مؤثر نقش ہے اور سارے نقوش مل کر ایک نقش کامل تیار کرتے ہیں"۔ اس کے مقابلے میں ذوق کا یہ قطعہ بند ملاحظہ ہو۔ خوفِ طوالت سے ہم اس کے صرف چند شعر یہاں نقل کرتے ہیں ؎

کہوں کیا ذوق احوالِ شبِ ہجر ۔۔۔ کہ تھی اک اک گھڑی سو سو مہینے
نہ تھی شب ڈال رکھا تھا اک اندھیر ۔۔۔ مرے بختِ سیہ کی تیرگی نے
اٹھایا گاہ اور گاہے بٹھایا ۔۔۔ مجھے بے تابی و بے طاقتی نے
لگے پانی چوانے منھ میں آنسو ۔۔۔ پڑھی یٰسین سرہانے بے کسی نے
کہ قسمت سے قریب خانہ میرے ۔۔۔ اذاں مسجد میں دی ملّے کسی نے
ہوئی ایسی خوشی "اللہ اکبر" ۔۔۔ کہ خوش ہو کر کہا خود یہ خوشی نے
مؤذن مرحبا" بروقت بولا ۔۔۔ تری آواز مکّے اور مدینے

کلیم الدین لکھتے ہیں "اگر اس قطعے پر ناقدانہ نظر ڈالی جائے تو تمام اوررد کی بہتات دکھائی دے گی۔ رعایتِ لفظی کا یہ عالم ہے: گھڑی — مہینے' اک اک — سو سو' شب — اندھیر' بختِ سیہ — تیرگی؛ صاف ظاہر ہے کہ ذوق کو جذبات کی ترجمانی سے زیادہ رعایتِ لفظی کا خیال ہے۔ اس رعایتِ لفظی کی کثرت سے اگر ذاتی جذبات بھی ہوتے تو پریشان ہو کر حلقۂ شعر سے نکل جاتے"۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اگر ذاتی جذبات ہوتے تو رعایتِ لفظی کا سہارا لینے کی ضرورت ہی پیش نہیں آتی۔ بہرحال یہ قطعہ مصنوعی اسلوب کی نمائندہ مثال ہے۔ چونکہ اس کی تقلید بہت آسان ہے اس لئے کسی خاص دور کا بگڑا ہوا ادبی مذاق اس کا چلن عام کر کے اسے اس دور کا اجتماعی اسلوب بھی بنا دیتا ہے۔

اسلوب کے متعلق ایک دوسری عام غلط فہمی یہ ہے کہ وہ بڑے ریاض کے بعد حاصل ہوتا ہے۔ جہاں تک ریاض کا تعلق ہے' بے شک عالمی ادب کے ہمیں ایسی کئی مثالیں ملتی ہیں جن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ عظیم فن کاروں نے اپنی تخلیقات کی نوک پلک درست کرنے میں جگر کاوی سے کام لیا ہے۔ افلاطون کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس نے اپنے مکالمات میں سے ایک مکالمے کا پہلا پیراگراف ستر مختلف طریقوں سے لکھا تھا۔[1] ورڈز ورتھ اپنے فرمودات کو بار بار صیقل کرتا تھا۔ کارڈنل نیومن نے اپنا اسلوب کافی ریاض کے بعد "حاصل کیا تھا"۔ اسی طرح رونسرڈ (RONSARD) مانٹین (MONTAIGNE)' فٹز جیرلڈ' آسکر وائیلڈ فلابیر وغیرہم کے متعلق یہ بتایا جاتا ہے کہ وہ ہمیشہ اپنی تخلیقات پر نظر ثانی کرتے تھے۔ مقدمہ شعر و شاعری[2] میں حالی لکھتے ہیں "روما کے مشہور شاعر ورجل کے حال میں لکھا ہے کہ صبح کو اپنے اشعار لکھوا تا تھا اور ان پر غور کرتا تھا اور ان کو چھانٹتا تھا اور یہ بات کہا تھا کہ "ریچھنی بھی اسی طرح اپنے بچوں کو چاٹ چاٹ کر خوبصورت بنا تی ہے"۔ خود ہمارے ادب میں بھی اس قسم کی مثالیں ملتی ہیں۔ نسخۂ حمیدیہ اور متداول دیوانِ غالب کے تقابلی مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ غالب کس کس طرح اپنے کلام پر نظر ثانی

---

[1] لوکس۔ سٹائل۔ نٹ نوٹ میں لوکس نے بتایا ہے کہ افلاطون نے ایک مکالمے کا پہلا پیراگراف نہیں بلکہ اس کے صرف پہلے چار الفاظ کے کئی مرادفات لکھے تھے۔ ایک ہی بات ستر مختلف طریقوں سے بیان نہیں کی تھی۔

[2] مقدمہ شعر و شاعری' جامعہ ایڈیشن۔ ص ۶۰۔۶۱

کرتے تھے۔ اقبال کا بھی یہی حال تھا۔ ان تمام مثالوں سے یہ ظاہر ہے کہ اسلوب کے لئے ریاض ضروری ہے لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا کسی طرح درست نہیں کہ صرف ریاض سے اسلوب پیدا ہوتا ہے۔ جیسا کہ اثر لکھنوی نے اپنے ایک مضمون میں یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے۔ انہ ایک مضمون "اقبال اور اندازِ بیان" میں فرماتے ہیں "اسٹائل کا مادہ یونانی لفظ "STYLES" نہ کہ "STILES" جیسا کہ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے۔ یہ نوکدار آلہ کسی دھات، لکڑی یا ہاتھی دانت کا ہوتا تھا جس کے ذریعہ سے قدیم یونان میں موم کی لوحوں پر حروف کندہ کئے جاتے تھے۔ (عربی لفظ طرز یا طراز بالکل اسی مفہوم کا حامل ہے۔ صرف اتنا فرق ہے کہ طراز کے اصل معنی کپڑے پر بیل بوٹے بنانے کے ہیں۔ نقش کا تصور علیٰ حالہٖ قائم ہے) بلحاظِ زمانہ وہ آلہ جس سے نقش بٹھا دیا جاتا تھا خود ان نقوش، جملوں یا عبارت کا مفہوم ادا کرنے کے لئے استعمال ہونے لگا.... ادب میں یہی کاٹ چھانٹ، دماغ سوزی، باریک بینی، خود ادیب کی اپنی ذات کی پرکھ بن جاتی ہے... ایک ذی ہوش، خودنگر، حقیقت آشنا مصنف... کبھی گوارا نہیں کرتا کہ اُس کا تخلیقی کارنامہ کسی پہلو سے ناقص یا نامکمل رہے۔ وہ اُسے بار بار پڑھتا اور جانچتا ہے اور چین نہیں لیتا جب تک مرضی کے مطابق خراد پر نہ چڑھا لے۔ اس کے برعکس ایک سہل انگار مصنف کے نقوش بھدے، کھردرے اور غیر منظم ہوتے ہیں۔ اسٹائل کا یہی اختلاف جو مصنفوں کے مزاج کا آئینہ ہوتا ہے، اُنکی شخصیت کو نمودار کرتا ہے اور مستحق ستائش یا سزاوارِ خواہش بنا دیتا ہے۔ اس بات کو مجملاً یوں کہہ سکتے ہیں کہ اسٹائل مصنف کے گھر کا بھیدی ہوتا ہے یا بوفان کے الفاظ میں "اسٹائل ہی مصنف ہے"۔ مذکورۂ بالا اقتباس میں بوفان کے اس مشہور مقولے کی عجیب غریب توجیہہ کی گئی ہے۔ بے شک اسٹائل ایک حد تک مصنف کے گھر کا بھیدی ہوتا ہے لیکن اثر صاحب نے یہ سمجھ لیا کہ مصنف کے گھر کا صرف ایک ہی بھید ہے۔ یعنی یہ کہ مصنف مشقت پسند ہے یا کاہل الوجود اور صرف یہی بھید اس کے اسلوب سے فاش ہوتا ہے اور یہ کہ مزاج اور شخصیت کا اختلاف صرف اس میں ہوتا ہے کہ فلاں مصنف جفاکش ہے اور فلاں کام چور۔ اگر کسی مصنف نے اپنی ادبی نگارش میں دیدہ ریزی سے کام لیا ہے تو اس کی شخصیت اعلیٰ ہے ورنہ نہیں۔ اثر صاحب کے مذکورۂ بالا جملوں سے یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ اگر کوئی سہل انگار مصنف، چاہے اُس میں ادبی صلاحیت ہو یا نہ ہو۔ صرف محنت اور مشقت کے بل پر کامیاب ادیب بن سکتا ہے اور اسی محنت و مشقت کی وجہ سے اس کی ادبی شخصیت اعلیٰ بن سکتی ہے۔ کاٹ چھانٹ نہیں تو کم از کم عرق ریزی ناسخ و آتش نے بھی کی ہوگی اور انیس و دبیر نے بھی۔ میر امن کی طرح رجب علی بیگ سرور کو بھی پاپڑ بیلنے پڑے ہوں گے بلکہ شاید آتش کے مقابلے میں ناسخ، انیس کے مقابلے میں دبیر اور امن کے مقابلے میں سرور کو اپنے مصنوعی اجتماعی اسلوب کے لئے زیادہ محنت و مشقت سے کام لینا پڑا ہوگا۔ اگر صرف محنت اور دماغ سوزی ہی کو اسلوب کا معیار سمجھ لیا جائے تو ناسخ، دبیر اور سرور کو آتش، انیس اور میر امن پر علی الترتیب ترجیح دینی ہوگی۔ آگے چل کر اثر صاحب فرماتے ہیں "اُردو کے شاعروں میں سب سے پہلے میر نے طرز کو اہمیت دی اور سختی سے کاربند رہا۔" ہمارے خیال میں میر نے اپنے کلام کے سلسلے میں انتہائی لاپروائی برتی تھی۔ اگر وہ کاٹ چھانٹ، دماغ سوزی اور باریک بینی سے کام لیتے تو ان کے نہایت پست اشعار کو ان کے دواوین میں جگہ نہ ملتی۔ غالب کے متعلق مشہور ہے کہ انہوں نے اُردو میں خط و کتابت اس وقت شروع کی جب وہ فارسی میں جگر کاوی کے لئے وقت نکال نہیں سکتے تھے۔ اس لئے اپنے دوست احباب کو اردو ہی میں قلم برداشتہ خطوط لکھنے شروع کر دیئے تھے۔ البتہ اُنہوں نے جو اُردو تقریظیں مقفیٰ اور مسجع عبارت میں لکھی ہیں، اُن میں شاید عرق ریزی سے کام لیا ہو لیکن ادبی نقطۂ نگاہ سے غالب کے اُردو خطوط کا مرتبہ ان کی اُردو تقریظوں یا فارسی تحریروں سے بدرجہا بلند ہے۔ دراصل بات یہ ہے کہ اگر ادیب کی ذات میں کوئی چنگاری ہی نہ ہو تو اسلوب پر صرف کی ہوئی اسکی تمام محنت اُسی طرح رائیگاں جاتی ہے جس طرح وہ کوشش جو بندروں نے جگنوؤں کے ذریعہ لکڑیاں جلانے میں صرف کی تھی۔ عالمی ادب میں جہاں ادیبوں کے ریاض کی مثالیں ملتی ہیں وہیں برجستہ گوئی اور زود نویسی کی بھی کئی مثالیں دستیاب ہوتی ہیں۔ اگر ورجل، افلاطون اور ارسطو اپنے کلام کو خوب سے خوب تر بنانے میں اپنی ساری توجہ صرف کرتے تھے تو ڈکنس اور بلزاک جیسے ادیب بھی تھے جو اپنی تخلیقات کے سلسلے میں انتہائی بے پروائی سے کام لیتے تھے۔ داغ کے کلام میں زبان و بیان کی کئی غلطیاں نکالی گئیں۔ اگر وہ محنت اور توجہ سے کام لیتے تو شاید یہ غلطیاں اُن کے کلام میں راہ نہ پاتیں لیکن صرف زبان و بیان کی چند فروگزاشتوں کی بنا پر ادیبوں کی اعلیٰ تخلیقات ادنیٰ نہیں بن جاتیں۔ "کبلا خان" صرف ایک رات میں لکھی گئی، اور وہ بھی خوابِ بیداری کے عالم میں۔ والٹر اسکاٹ کا یہ دعویٰ تھا کہ

اس کی وہی تخلیقات بہترین ہیں جو سب سے کم وقت میں وجود میں آ گئیں۔ رتن ناتھ سرشار نے فسانۂ آزاد نہایت عجلت میں اور قلم برداشتہ لکھ کر مکمل کیا تھا۔ غرض محنت یا سہل نگاری کو اسلوب کی جاذبیت ناپنے کا معیار اور ادیب کے قد ناپنے کا پیمانہ نہیں بنایا جا سکتا۔ ہو سکتا ہے کہ نہایت غور و فکر کے بعد نپے تلے انداز میں کہی ہوئی باتیں بے جان، سپاٹ اور غلط ثابت ہوں اور برجستہ فقرے اُن کے مقابلے میں زیادہ جاندار، صحیح اور معنی خیز ہوں۔ در اصل ادبی تخلیق کے سلسلے میں شعور کے ساتھ ساتھ لاشعور کی بھی سحر طرازی اپنا کام کرتی ہے۔ تخلیقی عمل کے سلسلے میں Henri Poincare کے یہ خیالات قابلِ غور ہیں "میرے طریقۂ فکر کی تین منزلیں ہوتی ہیں، پہلی منزل شعوری کوشش، دوسری منزل غیر شعوری عمل تخمیر (Fermentation) اور تیسری منزل میں دونوں کے باہمی استعمال سے جو مرکب تیار ہوتا ہے اس کا آخری شعوری تجزیہ[1]۔ لوکس اپنی کتاب "اسٹائل" میں لکھتا ہے "تخلیقی عمل کے دباؤ اور ہیجان سے بھلا کبھی کبھی عمدہ افکار (برمحل) سوجھ جاتے ہیں۔ جیسے بات چیت کرتے کرتے ہیجان میں آ جانے سے قائل کے ذہن کو ایسے پُرمغز اور بصیرت افروز فقرے بھی سوجھ جاتے ہیں جو اسے تنہائی کے عالم میں، جب ذہن حالتِ سکون میں ہوتا ہے، ہرگز ہرگز نہ سوجھتے[2]" اسلئے وہ مشورہ دیتا ہے کہ فنکار کو اپنی تخلیق کے معاملے میں ضرورت سے زیادہ سخت گیر اور خود احتساب پسند (Self Critical) نہیں ہونا چاہیے۔ ہو سکتا ہے کہ ذہن کے شعوری حصے کی بیجا مداخلت سے جاندار تخلیق بے جان ہو جائے۔ ٹینس کھیلتے ہوئے دانت بھینچ کر اور انتہائی توجہ سے کھیلنے کا نتیجہ صرف یہ ہوگا کہ عضلات اور بھی سخت ہو جائیں گے۔ جب مشق کے بعد ضروری اضطراری حرکات پیدا ہونے لگیں تو اس صورت میں یہ کہیں بہتر ہوگا کہ دماغ سے صرف یہ سوچنے کا کام لیا جائے کہ گیند کہاں پھینکنی ہے۔ لیکن اس ارادے کو عمل میں ڈھالنے کا کام بدن کے سپرد کر دیا جائے اور اُسی پر چھوڑ دیا جائے کہ وہ گیند وہاں تک کس طرح پہونچائے گا۔[3]

مڈلٹن مرے نے اپنی کتاب "The problem of Style" (اسلوب کا مسئلہ) میں یہ بتایا ہے کہ انگریزی میں لفظ "اسٹائل" تین معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ اس کی وضاحت کیلئے اس نے یہ تین جملے مثال کے طور پر لکھے ہیں

(ا) ہم جانتے ہیں کہ گزشتہ ہفتے کے "Saturday Review" (سٹرڈے ریویو) میں یہ مقالہ کس نے لکھا ہے، مسٹر سینٹس بری (Saintsbury) کے علاوہ کون ہو سکتا ہے: اسلوب کے سمجھنے میں بھلا کوئی غلطی کر سکتا ہے؟

(ب) مسٹر ولکنسن (Wilkinson) کے خیالات بڑے دلچسپ ہیں لیکن ابھی انہیں لکھنا نہیں آتا۔ فی الحال ان کا کوئی اسلوب نہیں ہے۔

(ج) آپ مارلو کو لفاظ کہہ سکتے ہیں بلکہ اُسے مضحکہ خیز بھی کہا جا سکتا ہے لیکن اس کی ایک خوبی جو اس کی لفاظی، اس کے گھڑے پٹے اور مضحکہ خیز انداز پر حاوی ہے وہ ہے اس کا اسلوب۔"

پہلے جملے پر تبصرہ کرتے ہوئے مرے لکھتا ہے "اس جملے میں اسلوب سے مراد (اظہارِ بیان) کا وہ شخصی افتادِ مزاج (Personal Idiosyncrasy) ہے جس کی مدد سے ہم لکھنے والے کو پہچان لیتے ہیں۔ اس انفرادیت کی تشکیل و تعمیر میں کئی عناصر کارفرما ہوتے ہیں۔ دوسرے جملے میں، بقول مرے، اسلوب کو فنِ اظہار (Technique of Expression) کے معنوں میں استعمال کیا گیا ہے۔ یعنی تحریر بھی ایک فن ہے، جس کے اپنے اصول ہوتے ہیں۔ تیسرے جملے میں لفظ اسلوب 'اسلوبِ مطلق' کے مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔ بقول مرے "اس جملے میں لفظ اسلوب کا ٹھیک ٹھیک مفہوم کیا ہے، ہم نہیں بتا سکتے۔ البتہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ جو اشعار مارلو کے قلم سے نکل گئے ہیں انہیں صرف مارلو ہی لکھ سکتا تھا، شیکسپیئر بھی نہیں۔ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ مارلو کا ایک اسلوب تھا تو ہم دراصل اُس کیفیت کی طرف اشارہ کرتے ہیں جو شخصی افتادِ مزاج سے ماورا ہوتے ہوئے بھی اپنے اظہار کے لئے شخصی افتادِ مزاج کی مرہونِ منت ہوتی ہے یا ایسا محسوس ہوتا ہے! یہاں اسلوب میں ذاتیت اور آفاقیت دونوں کا مکمل امتزاج ہوتا ہے۔" اس اسلوب کو مرے 'اسلوبِ مطلق' (Absolute Style) کہتا ہے اور اسلوب مطلق، اس کے الفاظ میں وہ ہے جس میں ذاتی اور مخصوص عبارتوں میں آفاقی معنویت (Universal significance) کو مکمل طور پر "پا" لیا گیا ہو۔

اسلوب کے پہلے مفہوم میں شخصی افتادِ مزاج کلیدی حیثیت رکھتا ہے۔ مزاج اور وہ کیفیت جس کا ہم نے 'افتادِ مزاج' ترجمہ کیا ہے کیونکہ اس سے بہتر لفظ ہمیں سوجھ نہیں سکا یعنی (Idiosyncrasy

---

[1] بحوالہ لوکس از اسٹائل صفحہ ۳۲۶ [2] اسٹائل صفحہ ۳۲۲ [3] ایضاً

ان دونوں میں لطیف فرق ہے۔ انفرادِ مزاج کا ایک پہلو ہے جس میں وہ مخصوص طرزِ فکر یا شخصیت کا وہ امتیازی پہلو بھی شامل ہے جو مخصوص مزاج کی بدولت پیدا ہو۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اس مفہوم میں تکیہ کلام (man-nerism) کو بھی شامل کرنا چاہیئے جس سے صاحبِ ادب کو شناخت کرنے میں مدد ملتی ہے۔ اس مفہوم کے اسلوب میں دلآویزی کے لئے جگہ ہو بھی سکتی ہے اور نہیں بھی۔ کسی کی امتیازی خصوصیت' جس سے وہ بآسانی پہچانا جائے' پر تکلّف بھی ہوسکتی ہے' فطری بھی یا پھر عادت کا نتیجہ بھی۔ یہ دل نشیں بھی ہوسکتی ہے اور مکروہ بھی۔ اگر کسی کی زبان میں لکنت ہو تو یہ امتیازی خصوصیت ہونے کے باوجود خوبی نہیں کہلائی جاسکتی' تاوقتیکہ اُسے چشمِ مجنوں' سے نہ دیکھا جائے۔ نوحؔ ناروی کا مخصوص تکیہ کلام' ظہیرؔ دہلوی و ذوقؔ کی قافیہ پیمائی اور محاورہ بندی' ناسخؔ کا مشغوب ذخیرۂ الفاظ' ڈپٹی نذیر احمد کی بامحاورہ لیکن عامیانہ (slang) زبان کے ساتھ ساتھ عزیب عربی الفاظ کے غدود کا پیوند' یہ سب اپنے اپنے رنگ کی وجہ سے پہچانے جاسکتے ہیں۔

اسلوب کے دوسرے مفہوم میں اجتماعی اسلوب کا وہ پہلو شامل ہے جو قابلِ تقلید بھی ہوتا ہے اور آموختنی بھی' لوکس نے اپنی کتاب 'اسٹائل' میں اسلوب کو انہیں معنوں میں استعمال کیا ہے۔ اور عمدہ تحریر کی خصوصیات تفصیل سے بیان کی ہیں۔ بے شک اگر حقیقی فن کار ان گُروں کا شعور رکھے تو اس کی شراب دو آتشہ بن سکتی ہے۔ اگر ہم کسی بڑے فن کار کے اسلوب کے ارتقا کا جائزہ لیں تو ہمیں یہ ارتقائی سفر خام کاری سے پختگی کی طرف بڑھتا نظر آئے گا۔ بعض فنکاروں میں یہ ارتقا خطِ مستقیم میں نہیں ملے گا۔ بعض بڑے فن کار اپنی نومشقی اور نو آموزی کے ابتدائی دور میں کسی ایک یا کئی اساتذۂ فن کی پیروی کرتے ہوئے دکھائی دیں گے۔ پیروی مشق کے ابتدائی مرحلے میں بعض اوقات ضروری بھی ہوتی ہے۔ اپنے قدیم ادبی ورثے کا شعور اور ادبی روایات سے واقفیت چاہے آگے چل کر ان سے بغاوت ہی کیوں نہ جائے وہ نقطۂ آغاز ہے جہاں سے ادبی سفر شروع ہونا چاہیئے۔ اس لئے اساتذۂ سلف کا مطالعہ اور اسلوب کی عام اور مسلّمہ خصوصیات کا علم ممکن ہے کسی بڑے فنکار کو نومشقی کے زمانے میں کسی استاد یا اساتذہ کی پیروی پر آمادہ کرے لیکن بڑے فن کار کی پہچان یہی ہے کہ وہ اس کے یا اُن کے طلسم سے باہر نکل آتا ہے۔ غالبؔ اور شیکسپیئر کی مثالیں ہمارے سامنے ہیں۔ اگر کوئی نومشق ادیب یا شاعر اس حصار کے اندر رہ کر اپنا ذاتی اسلوب تلاش کرکے باہر نہ آسکے تو یہی پیروی نقّالی ہوکر رہ جاتی ہے۔ اس سے اُس کا اَدبی دیوالیہ پن ظاہر ہوتا ہے' اور یہ پتہ چلتا ہے کہ اس کے پاس ذاتی تجربات نہیں ہیں اور وہ زندگی کو دوسروں کی نگاہوں سے دیکھنے کا عادی ہے یا پھر اس کی نظر سستی شہرت یا بازار کی مانگ پر ہے۔ تخلیقی لگن اپنا اسلوب خود تلاش کرلیتی ہے۔

اسلوب کے تیسرے مفہوم میں مرّے نے بڑے پتے کی بات کہی ہے۔ اس کا یہ کہنا کہ "جو اشعار مارلو کے قلم سے نکل گئے ہیں' انہیں صرف مارلو ہی لکھ سکتا تھا" یہ ظاہر کرتا ہے کہ مرّے اس مفہوم والے اسلوب کو ناقابلِ تقلید سمجھتا ہے۔ ہمارے خیال میں یہی وہ واحد کسوٹی ہے جس پر کس کر ہم اُس قابلِ تقلید کو جو صرف انفرادِ مزاج کا نتیجہ ہوتا ہے' اس ناقابلِ تقلید اسلوب سے ممتاز کرسکتے ہیں جو انفرادِ مزاج سے ماورا ہوتے ہوئے بھی اپنے اظہار کے لئے انفرادِ مزاج کا مرہونِ منّت ہوتا ہے۔ قابلِ تقلید اسالیب کے مقابلے میں ناقابلِ تقلید اسالیب کو سامنے رکھا جائے تو بات صاف ہوجائے گی۔ داغؔ کا رنگ امیرؔ یا داغ کے جانشینوں کے بس کی بات نہیں تھی۔ باغ و بہار اور خطوطِ غالبؔ کا اسلوب ناقابلِ تقلید ہے۔ اسی طرح غالبؔ کا شعری اسلوب نہ تو میر مہدی مجروحؔ سے نبھ سکا' نہ عزیزؔ لکھنوی اور وحشتؔ کلکتوی سے۔ اقبالؔ کے اسلوب کی نقل نہ امین حزیں سیالکوٹی کرسکے اور نہ ماہر القادری۔ اکّا دکّا فقرہ یا شعر کسی کے رنگ میں کہہ لینا اور بات ہے' اس لئے کھرے اسلوب کی پہچان یہ نہیں کہ اس میں انفرادیت ہوتی ہے بلکہ یہ کہ وہ دلآویز بھی ہوتا ہے اور ناقابلِ تقلید بھی۔ یہ دلآویزی لہجے کے کھردرے پن میں بھی ہوسکتی ہے' تلخی میں بھی' دھیمے پن میں بھی' حزن و نشاط میں بھی' اور شاید کڑاک چمک میں بھی۔ اب اصل سوال یہ رہ جاتا ہے کہ یہ دلآویزی آتی کہاں سے ہے؟ اس طرح گھوم پھر کر ہم اسی سوال کی طرف لوٹ آتے ہیں جسے ہم نے اس مضمون کی ابتدا میں اُٹھایا تھا۔

اگر ہم اس معیار کو تسلیم کرلیں کہ لفظ و معنی ناقابلِ تقسیم اکائی ہیں تو یہ بحث ہی لایعنی ہوجاتی ہے کہ اسلوب میں فکری پہلو اہم ہوتا ہے یا جذباتی' کیونکہ فکر و جذبہ کی ہم آہنگی ہی سے ادب پیدا ہوتا ہے اور یہ ہم آہنگی اسلوب کے جمالیاتی پہلو میں کچھ اس طرح جلوہ گر ہوتی ہے کہ فکر جمالیاتی جذبہ اور جذبہ جمالیاتی فکر بن جاتا ہے جو ادب پارے سے باہر اپنا وجود نہیں رکھتے۔ فکر و جذبہ کو ادب پارے سے باہر لے جانے کا عبرتناک انجام اس لایعنی

بحث کے اندر ملتا ہے کہ ادب برائے ادب ہے یا برائے زندگی۔ زندگی برائے ادب اُس زندگی سے قطعی طور پر مختلف ہے۔ جسے ہم روزانہ کاروباری نثر کے انداز میں برتتے ہیں۔ ادب کی پیدائش اُسی صورت میں ہوتی ہے جب فکر، جذبہ اور جمالیات ایک ہی حقیقت کے مختلف پہلو بن جائیں۔ اسلوب کی دلآویزی کا راز انہیں کی ہم آہنگی میں ہے۔ عظیم ادب بے شک معنی کی بلندی سے پیدا ہوتا ہے لیکن اُسی صورت میں جب لفظ و معنی اور فکر و جذبہ میں ہم آہنگی ہو۔ یہ ہم آہنگی نچلی سطح پر بھی ممکن ہے۔ ایسا ادب عظیم بھلے ہی نہ کہلائے لیکن چھوٹی موٹی لذّت اور مسرّتوں کا سرچشمہ تو بن سکتا ہے۔ اگر کوئی میرؔ، غالبؔ یا اقبالؔ نہیں بن سکتا تو سوداؔ، نظیرؔ اور داغؔ تو بن سکتا ہے۔ شبلی کہتے ہیں "شاعر کو یہ سوچ لینا چاہیئے کہ جو مضمون اُس کے خیال میں آیا ہے اُسی درجے کے الفاظ اس کو میسّر آسکیں گے یا نہیں۔ اگر نہ آسکیں تو اس کو بلند مضامین چھوڑ کر اُنہی سادہ اور معمولی مضامین پر قناعت کر لینی چاہیئے جو اس کے بس کے ہیں۔" شبلی کا کہنا درست صحیح لیکن اُن کا مضمون و الفاظ کی ثنویت والا نظریہ ناقابلِ تسلیم ہے۔ بلند مضامین چھوٹے ذہن میں سماعت کے راستے سے غلاموں کی شکل میں داخل تو ہو سکتے ہیں لیکن ذہن کا لازمی جزو نہیں بن سکتے۔ ذہن میں اپنی جڑیں پیوست کر کے اُگنے والے بلند مضامین جو شخصیت کا لازمی جزو بن جاتے ہیں، اپنا اسلوب جلدی یا بدیر خود تلاش کر لیتے ہیں۔ چھوٹے ذہن میں ان کے لئے گنجائش کہاں؟ اسی لئے اسلوب کو شخصیت کا آئینہ کہا جاتا ہے۔ لیکن اس آئینے میں فنکار جس طرح نظر آتا ہے ضروری نہیں کہ عملی زندگی میں اُسی طرح نظر آئے۔ جو نقّاد اس گُر کو نہیں سمجھتے وہ نادانی سے فنکار کے قول و فعل میں مطابقت نہ پا کر اس پر ریاکاری کا الزام لگاتے ہیں۔ ٹی۔ ایس ایلیٹ کے نزدیک ادب جذبہ اور شخصیت دونوں سے فرار کا نام ہے۔ ایک جگہ وہ لکھتا ہے "شاعر کا کام شخصیت کی نہیں بلکہ ایک مخصوص میڈیم کی ترجمانی ہے' اور یہ صرف میڈیم ہے شخصیت نہیں۔" ٹی۔ ایس ایلیٹ کے فن سے متعلق اِس غیر شخصی نظریے کو من و عن قبول کرنا تو مشکل ہے کیونکہ فن میں شخصیت سے مکمل فرار ناممکن ہے لیکن اس بیان میں اتنی حقیقت ضرور ہے کہ فن میڈیم کا پابند ہونے کی وجہ سے شخصیت کا من و عن اظہار کبھی نہیں ہوتا۔ معاشرتی یا تاریخی نقّاد فنکار کے انفرادی خد و خال کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ اور اسلوب کے صرف فکری، معاشی، اور معاشرتی پہلوؤں سے سروکار رکھتا ہے۔ "خالص شاعری" کا علمبردار نقّاد بھی شاعر یعنی ——

فنکار کی شخصیت کو نظر انداز کر کے اسلوب کے صرف جمالیاتی پہلوؤں پر اپنی توجہ مرکوز کرتا ہے اور فکر کو نظر انداز کرنا ضروری سمجھتا ہے۔ دونوں فنکار کی شخصیت کو نظر انداز کرتے ہیں۔ نفسیاتی نقّاد شخصیت کو مرکزِ توجہ بنا کر فن کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ یہ سب افراط و تفریط کی صورتیں ہیں۔ جس طرح ڈرامہ ہیملیٹ کے فنی تقاضوں کو نظر انداز کر کے شیکسپیر کی ادبی تخلیق یعنی کردار ہیملیٹ کو تاریخی شخصیت قرار دے کر اس کے نفسیاتی اور فکری عناصر کا تجزیہ کرنا ادبی تنقید کو اس کے جائز حدود سے باہر نکالنا ہے۔ اسی طرح فن کی شخصیت اور اس کے عہد کی ادبی توانائیوں کو، جو سائنٹفک اور علمی توانائیوں ہی کا ایک پہلو ہیں، نظر انداز کر کے صرف فنی تخلیق سے سروکار رکھنا نہ ادبی تنقید کے ساتھ انصاف ہو سکتا ہے اور نہ فن اور فنکار کے ساتھ۔ اسلوب کی دلآویزی کا راز فنی تخلیق کے توسط سے فن کار کی شخصیت تک رسائی حاصل کرنے اور پھر وہاں سے اسی فنی تخلیق کی طرف لوٹنے میں ہے۔ یہ راز نہ تو فنکار کے عہد کو یکسر نظر انداز کرنے سے حاصل ہو سکتا ہے اور نہ فنکار کی شخصیت کو معاشرت اور سیاست کے دھارے میں گم کر دینے سے۔

غالباً شبلی اُردو کے پہلے نقّاد ہیں جنہوں نے اسلوب کے سلسلے میں الفاظ کے صوتی اثرات کو اہمیت دی ہے ورنہ ہماری قدیم تنقید الفاظ کے صوتی حُسن سے اپنے کان بند کر کے صرف 'صوتی تنافر' سے خائف نظر آتی تھی۔ شبلی نے الفاظ کے صوتی حُسن کو فصاحت کا معیار قرار دیا۔ اور اُن کے مجموعی صوتی تاثر کو فصاحت کی اساس ٹھہرا کر اُردو تنقید میں ایک نئی جہت کا اضافہ کیا۔ 'اسلوبیات' (STYLISTICS) علم لسانیات کی ایک جدید شاخ ہے جس میں اسالیبِ بیان کا تجزیہ صوتی، قواعدی اور لغوی نقطۂ نظر سے کیا جاتا ہے۔ اور ادیب یا شاعر الفاظ اور اس طرح اصوات کے شعوری اور غیر شعوری انتخاب اور ترتیب باہمی سے جو ایک خاص قسم کا تاثر اپنی تخلیقات کے ذریعہ پیدا کرتے ہیں ان کا تجزیہ کیا جاتا ہے۔ یہ طرزِ تنقید خود اپنی جنم بھوم یعنی یورپ میں ابھی عہدِ طفولیت میں ہے۔ اس سے متاثر ہو کر ہمارے لسانیاتی نقّادوں نے مسموع و غیر مسموع اصوات اور طویل و مختصر مصوّتوں کے سماعی اثرات کا مشہور شعراء و شاعروں کی ادبی تخلیقات کی روشنی میں تجزیے کا عمل شروع کر دیا ہے۔ ہماری بحروں میں طویل و مختصر مصوّتوں کے دروبست سے مختلف صوتی اثرات پیدا ہو کر مخصوص لہجے کی ترتیب میں مدد دیتے ہیں

(بقیہ صفحہ ۲۹ پر دیکھئے)

مخمور سعیدی

غزلیں

دو تعلق کی فضا میں زہر بھر دیتا ہوں میں
تم اگر یہ چاہتے ہو یہ بھی کر دیتا ہوں میں

ہجر کے بے برگ موسم! ہیں کچھ آنسو میرے پاس
آ ترے دامن کو ان پھولوں سے بھر دیتا ہوں میں

میں بھی ہوں گرمِ سفر جلتی زمینوں کی طرف
بادلو آؤ نشانِ رہگذر دیتا ہوں میں

روشنی ہر جادۂ شب کی مرا عکسِ صدا
ہر اندھیرے موڑ پر اک شمع دھر دیتا ہوں میں

توڑ دیتی ہیں طلسمِ شب نوائیں مری
سرد سناٹوں کو آہنگ و اثر دیتا ہوں میں

رہروِ شب کے راستوں پر پاؤں رکھنا دیکھ کر
بے بصر لمحو! تمہیں اپنی نظر دیتا ہوں میں

زندگی کے کچھ نشاں مل جائیں گے اب بھی وہاں
گمشدہ اک شہر کی تم کو خبر دیتا ہوں میں

ناگوارِ طبعِ یاراں ہے بلا نوشی مری
شام سے پینے لگوں تو صبح کر دیتا ہوں میں

ہے صراحی میں مری مخمور میرا ہی لہو
لا اسی سے تیرا پیمانہ بھی بھر دیتا ہوں میں

○

دل، کس آسیب کا ڈیرا ہے، ہراساں کیوں ہو؟
صاحبو! کچھ تو کہو اتنے پریشاں کیوں ہو؟

اور تو کون تعاقب میں تمہارے ہوگا
آپ تم اپنے ہی سائے سے گریزاں کیوں ہو؟

دیکھ کر آئینۂ حال میں چہرہ اپنا
اپنے ماضی کے خط و خال پہ حیراں کیوں ہو؟

قرض لمحوں کا، یہاں اور چکایا کس نے؟
وقت کے ہاتھ میں میرا ہی گریباں کیوں ہو؟

ظلمتِ غم میں مسرت کی کرن کیا ڈھونڈیں
کوئی سورج افقِ شب پہ درخشاں کیوں ہو؟

چارہ گر کتنے ملے، میں نے مگر سوچ لیا
تو نہیں ہے تو علاجِ غمِ پنہاں کیوں ہو؟

غم ہی سامانِ تواضع ہے یہاں تو مخمور
طلبِ عیش جسے ہو، مرا مہماں کیوں ہو؟

۹۔ انصاری مارکیٹ۔ دریا گنج۔ نئی دہلی ۲

زخمی دیوار

انور قمر
۱۴۸ مہرآباد، ہل روڈ، باندرہ، بمبئی ۔ ۵۰

میرے وزنی وجود کا بوجھ ڈھوتی پرانی سائیکل جب "شانتی نواس" کالونی میں داخل ہوئی تو مجھے اچانک محسوس ہوئی کہ خزاں رسیدہ روش میں چند پھول ضرور ایسے ہیں جو اپنی رنگت سے اپنے وجود کا احساس دِلا رہے ہیں۔ ورنہ دھوپ کی شدّت نے اکثر پھولوں سے اُنکی تمازت چھین لی ہے، اُن سے مسکرانے کا انداز غصب کرلیا ہے۔

چار منزلہ یکساں ڈیزائن کی بنی ہوئی بلڈنگوں پر سُرخ ٹائیلس (TILES) بچھی ہوئی ہیں، جن کی تپش مجھے چوتھے منزلہ کے اُس فلیٹ میں پہنچ کر محسوس ہو رہی ہے۔ مُلازمہ دروازہ کھول کر مجھے سلیقہ سے سجے ڈرائنگ رُوم میں بیٹھا چکی ہے، جس کی دیواروں کا پینٹ شاید اُسی گرمی کی شدّت سے پگھل کر بہہ چکا ہے اور اپنی نچلی تہہ کے دوسرے رنگ کو آشکارہ کر رہا ہے۔

"بائی جی نے آپ کو اندر بُلایا ہے۔"

میری نظریں اُس بہے ہوئے پینٹ سے ہٹتی ہیں اور مسز راؤ کے جسم سے بہے ہوئے رنگ پر جم جاتی ہیں۔ وہ ڈبل بیڈ پر ایک مہین چادر میں اپنا زخمی جسم ڈھانپے لیٹی ہوئی ہیں۔ آنکھیں بُجھتے ہوئے دیوں کی طرح باریک لَو دیتی ہوئی۔ لبوں پر پپڑیاں بھی اور مسکراہٹ کی لکیر بھی۔ اور موتی کی لڑیوں سے گزرتی ہوئی اُن کی مترنّم آواز "بیٹھئے! کہاں سے تشریف لائے ہیں آپ؟"

"مجھے مسز الوارث سے ملنا ہے۔"

"وہ میرے یہاں کام کرتی تھی۔ ایک مہینہ ہوا میرا کام چھوڑ چکی ہے۔ اب پڑوس کی بلڈنگ میں نوکر ہے۔"

پھر اُنہیں اُس کی جُدائی کا احساس اور پھر احساس کا تجزیہ

"وہاں اُسے زیادہ تنخواہ ملتی ہے۔"

"تو میں چلوں۔ کس بلڈنگ میں کام کرتی ہے وہ؟"

میرے سوال میں یہاں تک پہنچنے کی بیزاری ہے اور اُس میں کام تم تک پہونچانے کا جذبہ بھی شامل ہے۔ میں بے تعلقی سے کھڑا ہو جاتا ہوں۔

"B 7/67، بلاک 7، سکنڈ فلور۔"

وہ بدستور موتی بکھیر رہی ہیں۔ گویا مجھ پر جتا رہی ہوں کہ اِن کی میرے پاس کوئی کمی نہیں۔

"آپ کہیں تو میں اُسے یہیں بُلوالوں۔ ہمارے تعلّقات بگڑے نہیں ہیں۔"

وہ مجھے سمجھا رہی ہیں کہ تعلق ٹوٹ کر بھی پیار نام کی ایک ڈور سے جُڑا ہوتا ہے۔

"بہتر ہے۔ اگر آپ کو زحمت نہ ہو تو۔"

میں اُس صاحب فراش عورت کے آگے سپر ڈال دیتا ہوں۔

"گنگا ۔۔۔ او گنگا!"

بغل کے کمرے سے ایک دہاڑا سٹرین عورت آتی ہے۔

"جا تو ذرا میری کو بُلا لا جلدی سے۔ کہنا کہ ......"

وہ میری طرف دیکھتی ہیں۔ گویا پُوچھ رہی ہوں کہ آپ کا نام کیا ہے، پتہ ...... وغیرہ

میں گنگا سے کہتا ہوں: "کہو اُسے اُن کے بچّی کا سندیسہ لایا ہوں۔"

میری جیب میں الوارث کی دو ماہ کی تنخواہ کا بنڈل بھی پڑا ہے۔ میں احتیاطاً اُس کا ذکر نہیں کرتا۔ کیونکہ اگر وہ نہ ہوئی تو مجھے وہ رقم مسز راؤ کے پاس چھوڑنی پڑے گی۔

وہ قابلِ اعتماد ہیں ؟"

میں کمرے کا سرسری جائزہ لیتا ہوں۔ ٹینس کے راکٹس دیواروں پر ٹنگے ہیں۔ ایک قدِ آدم تصویر۔ کسی مصوّر کا ماہرانہ کمال، پنسل کی چند جنبشیں! ٹینس کورٹ میں ایک حسینہ بڑی ادائے دلربائی سے اپنے دائیں کو تھوڑا جھکی ہوئی زمین سے اٹھتی ہوئی گیند کو ہٹ (HIT) لگا رہی ہے۔

"یہ کون ...... ؟" میں جاننا چاہتا ہوں۔ پھر میری توجہ ایک شوکیس میں رکھی ہوئی چاندی کی ٹرافیز (TROPHIES) پر جم جاتی ہے۔ چھوٹی بڑی کئی ٹرافیاں قرینے سے رکھی ہوئی ہیں۔ میں پوچھنا چاہتا ہوں "یہ ٹرافیاں ......"

نہیں پوچھتا۔ ڈرتا ہوں کہ بستر پر پڑی ہوئی یہ بیمار عورت شاید بات چیت ہی کا کوئی بہانہ تلاش کر رہی ہو۔ موقع ملتے ہی پتہ نہیں کیسے کیسے ناخوشگوار واقعات سنانا شروع کر دے۔ میں اپنی نظریں ٹرافیوں ہی پر مرکوز رکھتا ہوں۔ اُن کی نظروں سے نہیں ملاتا۔

کمرے میں روشنی ناکافی ہے۔ عمارت کی مشرقی سمت میں ہے کمروں کے ساتھ یہی (DISADVANTAGE) ڈس ایڈوانٹیج رہتا ہے۔ میں طے کر چکا ہوں کہ اس عورت کو بات کرنے کا ہرگز کوئی موقع نہ دوں گا۔ اُف! گنگا اب تک نہیں لوٹی کیا الوارث کی بیوی پڑوس کے گھر میں موجود نہیں ؟ ٹرافیوں پر کندہ الفاظ پڑھے جا رہے ہیں۔ ٹاٹا اسپورٹس سنہ ۱۹۶۰ء۔ انعام یافتہ کا نام نہیں پڑھا جا رہا ہے۔ ویسٹرن انڈیا کلب کی ٹینس چیمپین شپ سنہ ۱۹۶۲ء انعام پانے والے کا نام اُس پر موجود ہے۔ میں اُٹھ کر نام پڑھنا چاہتا ہوں لیکن ڈرتا ہوں کہ یہ بات چیت کا سلسلہ نہ شروع کر دے۔

ڈیوس (DAVIS) کپ۔ میں چونکتا ہوں۔ بہت بڑی کامیابی۔ غیر معمولی صلاحیتوں ہی کا مالک اس ٹورنامنٹ میں حصّہ لے سکتا ہے۔ ومبلڈن (WIMBLEDON) — اُف! سنہ ۱۹۶۶ء۔ میں اپنی جگہ سے کھڑا ہوتا ہوں۔ ٹرافیوں پر ایک ہی نام کندہ ہے۔ سُچترا اسین۔ میں مُڑتا ہوں۔

شاعر، بمبئی

وہ آنکھیں مُوندے لیٹی ہوئی ہیں۔ میں پوچھنا چاہتا ہوں "کیا یہ ٹرافیاں آپ ہی نے حاصل کی ہیں یا کسی اور نے ؟"

بھڑا ہوا دروازہ کھلتا ہے۔ گنگا کمرے میں داخل ہوتی ہے۔

"بائی جی! میری بولی کہ میں ابھی آتی ہوں"

اُن کی نیند میں خلل پڑتا ہے۔ لیکن وہ مسکرا کر گنگا کی بات سُنتی ہیں۔

"اچھا! ذرا صاب کے لئے ایک لیمن جوس تو بنا دے"

میں روکنے کی کوشش کرتا ہوں۔ پیاس دبائے بڑی دیر سے بیٹھا ہوں۔ اس لئے پُوری قوت سے مزاحمت نہیں کرتا۔ اب میں پریشان ہوں۔ الورث میری کینٹین کا ککّ (COOK) ہے۔ اُس نے اپنی بیوی اور بچّوں کے لئے میرے ذریعہ اپنی تنخواہ اپنی بیوی کو بھجوائی ہے۔ میں وہ رقم الوارث کی بیوی کے سُپرد کر کے اُس پر احسان جتانا چاہتا ہوں کہ دیکھو میں نے تمہارے لئے کتنا کشٹ مول لیا ہے۔

گنگا جوس کا گلاس لے آتی ہے اور میرے سامنے پڑی ہوئی تپائی پر رکھ کر چلی جاتی ہے۔ مسز راؤ مسکراتی ہوئی مجھ سے کہتی ہیں

"پلیز ہیو اِٹ' (PLEASE HAVE IT)"

میں نے گلاس ہاتھ میں تھام لیا ہے اور اب بڑی دیر سے ذہن میں چُبھتے ہوئے اِس سوال کو زبان پر لے آیا ہوں۔

"کیا یہ ٹرافیاں آپ ہی نے حاصل کی ہیں ؟"

مسز راؤ کا چہرہ کِھل اُٹھتا ہے۔ وہ مُسکراتی ہیں اور پھر اُنکی آنکھیں نم ہو جاتی ہیں۔ وہ میری طرف دیکھے بغیر اپنی تصویر کو گھُورتی ہوئی کہتی ہیں۔

"بچپن ہی سے مجھے ٹینس کھیلنے کا بڑا شوق تھا۔ مجھے یاد ہے کہ فائنل کا امتحان پاس کرنے پر پتاجی کے بار بار اصرار پر میں نے جو چیز طلب کی تھی وہ ٹینس راکیٹ ہی تھا میں کھیل میں کمال حاصل کرنا چاہتی تھی۔ اِس لئے اُسے آدرش بنا کر کھیلتی رہی"

"شادی کے بعد گھر بار کی دیکھ بھال میں آپ کا یہ شوق ختم

ہوگیا ہوگا ؟"

"نہیں، یہ بات نہیں۔ ویمبلڈن (WIMBLEDON) کی چیمپئن شپ میں نے ۱۹۶۵ء حاصل کی۔ میرا بیاہ اُسی سال ہوا۔ بیاہ کے روز بھی میں ایزیوٹرول (AGUS-VAL) چار گھنٹے ٹینس کورٹ میں رہی۔ اور اس کے بعد کے دنوں میں بھی میرا یہی معمول رہا۔ اسکول اور کالج کے دنوں میں جب کبھی میں بیمار پڑتی اور کلب نہ جاسکتی تھی، تب میرے ہاتھوں اور پیروں میں عجیب سی تھرتھراہٹ اور بے چین کیفیت رہتی تھی۔ اور تھرتھراہٹ کا یہ عالم میرے جسم پر اُس وقت تک طاری رہتا تھا، جب تک کہ میرے کھیلنے کا وقت گزر نہ جاتا تھا۔"

بھڑا ہوا دروازہ پھر کھلا۔ ایک بھدّی سی، کالی عورت گھٹنوں تک لمبا سایہ پہنے کمرے میں داخل ہوئی۔ مسز راؤ کے چہرے پر پھر مسکراہٹ دوڑ گئی۔

"یہ ہے میری۔ الوارث کی بیوی۔"

میں اُس کیطرف متوجہ ہوا۔ "مسٹر الوارث نے آپ کو یہ پیسے بھیجے ہیں۔ بچوں کی خیریت پوچھی ہے اور آپ کو اور اپنی ماں کو سلام کہا ہے ——" میں نے جیب سے نوٹوں کا وہ بنڈل نکال کر اس کے ہاتھوں میں رکھ دیا ہے۔ جس کی گرمی سے اُس کے جسم میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ وہ اپنے دونوں ہاتھ جوڑ کر اور انہیں اپنی پیشانی تک لاکر بولی۔

"ساب، تھینک یو۔ تکلیف آپ کرنا۔"

میں اُٹھ کھڑا ہوتا ہوں اور مسز راؤ کا شکریہ ادا کرتے ہوئے ازراہِ ہمدردی پوچھ بیٹھتا ہوں۔

"یہ آپکے جسم کی اُوپری جلد......" میری نظریں دیوار کے بہے ہوئے پینٹ پر جاکر جم جاتی ہیں۔

وہ بدستور مسکرا رہی ہیں۔

"یہ ایک ڈاکٹر کے انجکشن کا نتیجہ ہے۔" وہ خاموش ہیں اور کوئی ناخوشگوار واقعہ اُن کے ذہن میں رونما ہو رہا ہے۔

"اُس روز میرے پیر میں اچانک درد اٹھا۔ اور اتنا شدید ثابت ہوا کہ میں کلب سے سیدھے اپنے فیملی ڈاکٹر کے پاس پہونچی۔ ڈاکٹر نے مجھے ایک انجکشن دیا اور اس کا نتیجہ آپ دیکھ رہے ہیں میری جلد موم کیطرح پگھل کر........." اُس کے بعد وہ سسک سسک کر رونے لگیں۔

میں نے اُن سے دِلی ہمدردی محسوس کرتے ہوئے کہا "آپ پریشان نہ ہوں۔ آپ بہت جلد اچھی ہو جائیں گی۔"

یہ کہکر بھاری قدموں سے میں فلیٹ سے باہر آگیا۔

"ساب!"

میں نے مڑ کر دیکھا، گنگا مجھ سے مخاطب تھی۔

"ساب! ابھی آپ بائی جی سے بات کرتے تھے۔ اور آپ بولے کہ وہ بوت جلدی اچھی ہو جائیں گی۔ پر ساب، بائی جی تو بارہ سال سے بستر پہ ایسیچ پڑی ہیں۔"

"بارہ سال سے۔" میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

گنگا نے کسی بُردبار شخص کی طرح اثبات میں سر ہلایا۔

پھر مجھے اچانک محسوس ہوا کہ باہر گرمی بے پناہ ہے۔ خزاں رسیدہ روش میں کوئی بھی پھول ایسا نہیں جو اپنی رنگت سے اپنے وجود کا احساس دِلا رہا ہو۔

بیان ملکیت اور دیگر تفصیلات ماہنامہ شاعر بمبئی

(مطابق فارم نمبر ۴ قاعدہ ۸)

۱۔ مقام اشاعت : بمبئی ۲۔ وقفۂ اشاعت : ماہنامہ
۳۔ پرنٹر پبلشر : اعجاز صدیقی ۴۔ قومیت : ہندوستانی
۵۔ پتہ : دیناتھ بلڈنگ۔ تیسرا منزلہ۔ فاکلینڈ روڈ بمبئی ۴
۶۔ ایڈیٹر : اعجاز صدیقی ۷۔ قومیت : ہندوستانی
۸۔ پتہ : دیناتھ بلڈنگ۔ تیسرا منزلہ۔ فاکلینڈ روڈ بمبئی ۴
۹۔ ملکیت : اعجاز صدیقی

میں اعجاز صدیقی اعلان کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا تفصیلات میرے علم و یقین کے مطابق درست ہیں

۲۸ر فروری ۱۹۷۶ء دستخط اعجاز صدیقی

ماضی، حال و مستقبل کا مثلث

یوسف عثمانی
اجنتا کلینک۔ جے سنگھ پورہ۔ اورنگ آباد

"بعض الفاظ کسی فنکار کی شناخت نہیں ہوتے بلکہ اُس کا رویہ اُس کی پہچان متعین کرتا ہے"۔ اسلوب پر گفتگو کرتے ہوئے بشر نواز نے یہ جملہ اپنے ایک مضمون میں استعمال کیا ہے۔ ممکن ہے غیر شعوری طور پر یہاں نقاد بشر نواز پر شاعر بشر نواز کی شخصیت حاوی ہو گئی ہو۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ ہم کسی بھی متحرک اور زندگی سے وابستہ فنکار کو محض اُس کے الفاظ کے دروبست سے نہیں پہچان سکتے۔ کیونکہ ہر اچھے فنکار کے لئے الفاظ ذریعہ ہوتے ہیں حاصل نہیں۔ فنکار کے اسلوب کا تعین اُس کا حیاتیاتی اور ذہنی رویہ کرتا ہے۔ موجودہ دور کے ادب کو گذشتہ ادوار کے ادب سے الگ کرنے والا عنصر بھی دراصل فنکاروں کا رویہ اور ردِ عمل ہی ہے۔ یہ ایک ضمنی بات ہے کہ رویے کی تبدیلی کے زیر اثر ڈکشن اور فارم میں بھی کچھ تبدیلیاں آئیں، لیکن یہاں یہ بات نہیں بھولنی چاہئے کہ ان ہیئتی تبدیلیوں میں کچھ تو ناگزیر تھیں اور کچھ محض تجربے کی خاطر۔ بشر نواز کا شمار اُن شعرا میں ہوتا ہے جن کے ہاں موضوع و مواد ہیئتی تجربے سے زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس کے لئے ہیئت قطعی غیر اہم شے ہے بلکہ یوں ہے کہ فن پارے کے اوپری ڈھانچے اور لفظیات کی تبدیلی، موضوع و مواد کے اندرونی دباؤ کے تحت وقوع پذیر ہوتی ہے اور تخلیقی عمل کے دوران شاعر کی نظر ہیئتی تراش خراش سے زیادہ اپنے اظہار پر رہتی ہے۔ بشر نواز اپنے اظہار کے لئے صرف انہیں وسائل کا استعمال کرتا ہے جو موقع کے لحاظ سے ضروری ہوں اور یہی وجہ ہے کہ کفایت لفظی اور ایک قسم کا فنی تناؤ اُس کی پہلی پہچان ہے۔ اُس کے فن پر زیادہ گہرائی سے نظر ڈالی جائے تو اس رویے کی نفسیاتی وجوہ روشن ہو جاتی ہیں۔ دراصل بشر نواز ذہنی اور جذباتی طور پر ایک عجیب و غریب تضاد کا شکار ہے یا یوں کہہ لیجئے کہ اس کے فن اور زندگی پر "ثنویت" (Dualism) پوری شدت سے حاوی ہے۔ اس
شاعر بیچ ـــــ

کی نظمیں ہوں یا غزلیں، نیکی بدی، صلح اور جنگ، سیاہی سفیدی، نئے اور پرانے اور اقدار کے احترام اور اُن کی شکست کے احساس کے ایسے رزمیے ہیں جن پر افسردگی کی ایک فضا مستولی ہے۔

دیوار سی حائل ہے کوئی رُوح و بدن میں
خوابوں میں وہ موجود ہے پہلو سے جُدا ہے
مدّت سے پھر رہا ہوں میں اپنی تلاش میں
ہر لمحہ لڑ رہا ہوں میں اپنے خلاف جنگ
سمجھے گا کون جاگتی آنکھوں کے کرب کو
میں اپنے حادثے کا اکیلا گواہ ہوں
میں چڑھتا ہوا کوئی دریا سہی
مقیّد ہوں لیکن کناروں کے بیچ
کوئی انجانی سی طاقت تھی جو آڑے آئی
ورنہ ہم نے تو بہر گام سنبھلنا چاہا
لڑتے رہے اک عمر کسی اور سے لیکن
دیکھا تو خود اپنے ہی کو ہر زخم لگا ہے
وہ جنگ کہ روزِ اوّل سے جاری ہے جو مجھ میں اور تجھ میں
کیا جانئے کس دن سر پہ پڑے کیا جانئے کب آرام ملے

اس رویے کی بہت ساری نفسیاتی وجوہات ہیں جن کا ذکر آگے آئے گا۔ یہاں صرف یہ اشارہ کر دینا کافی ہوگا کہ فضیل جعفری نے اپنے مضمون "نئی نظم کی زبان" میں جو یہ کہا ہے کہ "بشر نواز کی نظموں میں دو یا ان سے زیادہ سطحیں ہوتی ہیں اور الفاظ پہلی سطح پر معنی دینے کے بعد دوسری سطح پر علامت کا کام دیتے ہیں" تو اس کی وجہ بھی میری نظر میں "ثنویت" ہی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ بشر بیک وقت دو زندگیاں جی رہا ہے۔ ایک زندگی اس کی ذہنی اور جذباتی دنیا سے

وابستہ ہے اور یہی جانکاری کی سنگینی اور معصومیت کے سوز و گداز سے عبارت ہے۔ ذہنی اعتبار سے بھی ہماری تمام تر وابستگیاں گذرے ہوئے زمانوں سے ہیں۔ اس کے اندر آج بھی وہ شخص زندہ ہے جس نے سب سے پہلا خواب دیکھا تھا: اور وہ شخص بھی سانس لے رہا ہے جو "آشوبِ آگہی اور جاگتی آنکھوں کا کرب" سہہ رہا ہے۔ یہ صورتِ حال اس کے رویے کو اُن ہم عصروں سے بھی الگ کرتی ہے جن کی فنی تگ و دَو کھوئے ہوؤں کی جستجو ہے اور اُن سے بھی جدا کرتی ہے جن کے ہاں موجودہ عہد کا کرب مشینی زندگی کی اکتاہٹ اور سماج کی گھٹتی ہوئی اکائی پوری شدت سے نمایاں ہے کہ اُسے موجودہ ٹوٹتی ہوئی اقدار کے کھنڈر میں کھوئے ہوئے رشتوں کی تلاش اور پہچان کے ساتھ ساتھ اُن کی نئی ترتیب کی فکر بھی ہے۔ دو مختلف بلکہ متضاد دنیاؤں سے متعلق ہونے کی وجہ سے اُس کے فن پر کسی ایک طرح کا لیبل چسپاں کرنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ اُس کے موضوعات اور اظہارات نہ محض مادی، تجسیمی اور زمان و مکان کے اسیر ہیں اور نہ صرف رُوحانی، تخیلی اور تجریدی ہیں بلکہ اُس کے فن کا خمیر ان دونوں کیفیات کے امتزاج اور کبھی کبھی آویزش سے اٹھا ہے۔ "آنے والے منصفوں کے نام"، "دیدہ و شنیدہ" اور "بڑے شہر کا دن" اِس کی مثالیں ہیں اور "اجنبی سمندر" میں یہ کیفیت پوری شدت سے نمایاں ہے۔

"اور ہم
اپنی اپنی سوچ سے لپٹے ہوئے
خوشنما منظر، نرالے دائرے
بے ستون بیکل خلاؤں میں بناتے بہہ رہے ہیں چار سُو
اُٹھنے والے دائروں کے عکس کے
پیچھے پیچھے دوڑتے ہیں اپنی دیواروں کے ساتھ"

سچائی کے اِس شدید اور پُرکرب احساس کے ساتھ یہ خواہش ایک سوالیہ علامت کے طور پر اُبھرتی ہے۔

"اے سمندر
اُس کنارے تک کبھی جائیں گے ہم
جس کی ریت
آنے والوں کے لئے قالین ہے
اور جہاں

"عشق پیچاں کی دہکتی مشعلیں روشن ہیں جنگل راستوں کے واسطے"

نظم موجودہ معاشرے کے باشعور فرد کے کرب اور اُس کی معصوم خواہشوں کے اندرونی اور اُلجھے اُلجھے رشتوں کا احاطہ کرتی ہے۔ دراصل آج کا دل دھڑکتی تہذیب بلکہ جنگل کے معاشرے کے سائے میں اور ذہن، شعور و آگہی کی تیز دھوپ کی گرفت میں ہے۔

جنگل کے معاشرے میں انسان حیاتیاتی سطح پر زندگی گذارتا ہے اور اُس کی رہنما اُس کی جبلت ہوتی ہے، پھر وہاں کے حالات اور تقاضوں کی وجہ سے اُس کے حواس زیادہ توانا اور جبلی قوتیں پوری طرح بیدار ہو جاتی ہیں۔ حِس، سامعہ، شامّہ اور لامسہ کا استعمال قدم قدم پر ہوتا ہے۔ جنگل کی فضا اپنے اندر ہزارہا اسرار اور رُوحانی کیفیات رکھتی ہے، اسی لئے اس معاشرے سے وابستگی کے نتیجے کے طور پر مادی اجسام اور ان کا لمس، خوشبوئیں اور آوازیں غیر معمولی اہمیت اختیار کر جاتی ہیں۔ بشر نواز کی شاعری میں لمسیاتی پیکروں کی بہتات، جسم کی اہمیت اور تقدس کا احساس، شامّی پیکر و علامات اسی افتادِ ذہنی کی دین ہیں۔

ترستے جلتے ہونٹوں میں
کنول کی پنکھڑی آئی تو ایک اک رگ
عجیب جادو بھری چنگاریوں کی رہگذر ٹھہری

(مناظر تسلیاں ہیں)

ہاتھ کہیں
ان انگلیوں کو داب کے چٹخا چٹخا دیں
ہونٹوں کے لرزتے کونوں پہ
دل بولے
نوکِ زباں سے اک صدیوں کا پرانا گیت کہے

(جھوٹ تقدس رشتوں کا)

پھر یوں ہوا کہ کانپتے ہونٹوں کے لمس سے
دونوں پہ جیسے آگ کا بادل برس گیا

یہ اور اس قسم کی کئی مثالیں اس بات پر دال ہیں کہ بشر نواز کے ہاں جسم اور اس کے لوازمات، چھونے اور چھو کر محسوس کرنے کا رویہ ایک اہم کردار ادا کرتا ہے۔ قدیم انسان کے لئے تمام جبلتیں قابلِ احترام اور عقیدت کا انعام ہوتی ہیں اور جنس کے ساتھ چونکہ تخلیق کا عمل بھی وابستہ ہے اس لئے یہ جبلت سب سے زیادہ اہم اور قابلِ احترام قرار

پائی۔ چنانچہ رگ وید میں جنس و محبت کے دیوتا کام دیو کو تمام کائنات کا جوہر اور مرکز کہا گیا ہے۔ اس سیاق و سباق میں جنس کی طرف بشر کا رویہ بالکل فطری محسوس ہوتا ہے اور جنس محض لطف انگیزی کا ذریعہ نہیں، بلکہ تخلیق اور تخلیقی قوتوں میں تحرک پیدا کرنے کی ضامن بن جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے لئے موسم، زمین، آسمان اور دیگر مظاہرِ فطرت سے آپسی رشتہ اسی دھاگے سے منسلک نظر آتے ہیں۔

"پہلی بارش" میں زمین اور آسمان ناری اور نر کا روپ دھار لیتے ہیں۔ بادل ان کے پیامی بن جاتے ہیں۔ بارش کے قطرات تخلیقی مادہ اور خود موسم تخلیقی عمل کے مترادف بن جاتا ہے۔ نظم کا اختتامیہ یوں ہے:

پڑ گئے پردے ہر طرف ... اور پھر
نرم سرگوشیوں کی، بوسوں کی
دھیمی دھیمی رسیلی آوازیں
کانپتے موتیوں کی سوغاتیں

اور اس کے بعد

پردے اٹھے تھکی تھکی دھرتی
اپنے پریمی کو تن میں، من میں بسائے
منتظر ہے کہ جب سمے آئے
مست کلیوں کی، نرم انکھوؤں کی
شکل میں اپنا پیار لوٹا دے۔

تکنیک کے اعتبار سے نظم کا خارجی منظر، باطنی کیفیات کا خارجی تلازمہ (objective corrative) بننے کی بجائے بذاتِ خود موضوع بن جاتا ہے۔ چنانچہ۔ علامتیں، استعارے اور پیکر اندرونی دنیا میں یوں گھل مل جاتے ہیں کہ انہیں نظم کی فضا سے الگ کر کے دیکھا ہی نہیں جا سکتا۔ ادغام اور رچ بس جانے کی اسی کیفیت کی وجہ سے، سرسری نظر سے دیکھنے والوں کو تبسّم کی نظموں میں علامتوں اور پیکروں کی کمی کا شبہ ہوتا ہے۔ ویسے یہ ایک الگ بحث ہے کہ علامتوں اور پیکروں وغیرہ کا نظم کی فضا میں اوّلین کوشش سے علیحدہ سے پہچان لیا جانا فنی اعتبار سے خوبی ہے کہ خرابی۔ چنانچہ میں اس بحث میں نہ پڑتے ہوئے پھر سے موضوع کی طرف آتا ہوں۔ جنگل کے معاشرے میں اسرار و رموز، اچانک پن، اچنبھے میں ڈال دینے والی کیفیات ایک اہم جزو کی حیثیت رکھتی ہیں۔ یہ ذہنی کیفیات جب موجودہ دور کی تیز رفتاری کے شاخسانہ ——

لمحہ لمحہ بدلتی ہوئی زندگی اور چکرا دینے والی صورتِ حال سے دوچار ہوتی ہیں تو ان کی معنوی سطح مزید اجاگر ہوتی ہے اور یہ حیرت زدگی، اشیاء و واقعات سے لاعلمی کی وجہ سے نہیں بلکہ ان کی خلافِ توقع خصوصیات کے ظاہر ہونے کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ لاعلمی کی حیرت زدگی میں پائی جانے والی معصومیت کی بجائے یہاں جان جانے کا کرب نمایاں نظر آتا ہے ؎

جدھر بھی پیر بڑھاؤں زمین ہٹ جائے
گھرا ہوا ہوں عجب سحر ناگہانی میں
جب چلوں کوئی صدا چلتی ہے پیچھے پیچھے
مڑ کے دیکھوں تو صدا کار کوئی پاؤں نہیں

جانی پہچانی اشیاء کی قلب ماہیت اور ان کی غیر متوقع خصوصیات سے اچانک دوچار ہونے کے نتیجے کے طور پر حیرت، کرب و اضطراب میں بدل جاتی ہے اور ایک قسم کے پچھتاوے کا احساس حاوی ہونے لگتا ہے۔ یہ پچھتاوا اس بات پر بھی ہے کہ پہلے واقعات و اشیاء کو وہ کیوں سمجھ لیا جو وہ نہ تھیں اور اس بات پر بھی ہے کہ ان کے اس پہلو کو کیوں جان لیا جو توقعات کے برعکس ہے ؎

دیکھتے دیکھتے
نیلے پانی پہ لکھی ہوئی
چاند کے نرم ہاتھوں کی تحریر بھی مٹ گئی
تب نگاہیں جہاں تک میرے ساتھ تھیں
دوسرا کون تھا؟
کوئی بھی تو نہیں

پاس آتے ہی بدل جاتے ہیں چہروں کے نقوش
دور سے ان چاند کے ٹکڑوں کو دیکھا کیجے
جھوٹ ہی کہتے مگر یوں کہ سکوں مل جاتا
ایسی سچائی پہ تو پردہ ہی ڈالا ہوتا

بستی سے دور پہاڑوں کا من موہک رنگا رنگ سماں
دھندلی سی کرنوں کا سپنے میں
تتلی کے پروں کی قوسِ قزح بادل میں بنے چہروں کی جھلک
ہیں سارے تماشے چھونے تک

"پشیماں" اور "دیدہ شنیدہ" میں مسطورہ کیفیت پوری شدت سے ابھرتی ہے۔ پرانی وابستگیوں اور حقائق کے ادراک کی

کشمکش میں بشر نواز کو انسان کے بے سہارا ہو جانے اور عقائد کی سکون بخش چھاؤں سے محروم ہو جانے کا احساس تو ہے۔

سر پہ سایہ ہے نہ قدموں میں گلستاں کوئی
زندگانی ہے کہ جلتا ہے بیاباں کوئی

چار سو جلتی ہوئی ریت بچھی ہو جیسے
پا برہنہ کسی راہی کی گذرگاہوں میں
دھوپ ہی دھوپ ہے جس سمت نظر جاتی ہے

آنکھوں کے آئینوں میں چتاؤں کا عکس ہے
وہ دھوپ تھی ہر ایک سراپا جھلس گیا
چیختی دھوپ کے صحرا میں بھٹکنے والے
ٹھہر بھی جاتے مگر کوئی مکاں ہی کب تھا

لیکن اس کے ذہن میں یہ خواہش بھی ہے کہ وہ کسی پناہ گاہ کا سایا تلاش کر لے۔ گویا اس کا ذہن و دل اپنے "ٹوٹم" (Totem) کے لئے اب بھی بیقرار ہے۔ "ٹوٹم" (Totem) سے وابستگی درحقیقت قدیم انسان کی ایک باطنی ضرورت ہے اور جب خارجی حقائق نے قدیم "ٹوٹم" (Totem) کو بے نقاب کر کے اس کے سحر کو توڑ دیا تو بشر کے کلام میں وہ کرب ابھر آیا جسے ڈاکٹر عابدی کاشمیری "جدید حسیت اور اردو شاعری" میں اذیت کوشی سے تعبیر کرتے ہیں لیکن بشر نواز اپنی باطنی ضرورت پوری کرنے کے لئے اپنی پناہ گاہیں خود تراش لیتا ہے اور سکون کے لئے جھوٹ موٹ ہی کے سہی کچھ سہارے ڈھونڈ نکالتا ہے۔ اس خود فریبی کے پیچھے بھی دراصل "ٹوٹم پرستی" (Totemism) کا جذبہ کارفرما ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اب "ٹوٹم" خارجی حقیقت بجائے اندرونی کیفیت کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ کسی سہارے، سائے اور (God Father) خدائی باپ کی شدید خواہش یوں ظاہر ہوتی ہے۔

دھوپ کے صحراؤں میں کوئی سہارا تو ہو
چھت نہیں کوئی اگر ابر کا ٹکڑا ہی سہی

کسی پیڑ کی چھاؤں میں
دو گھڑی بیٹھ کر
کوئی خواب بُنے گا انسان، بس ارمان رہا

اور اس خواہش کی تکمیل خود فریبی کی اس کیفیت پر منتج ہوتی ہے

رنگ نقلی ہی سہی پھر بھی مگر چھپتے مت لے
کیا ضروری ہے کہ ہر اک شے کو پرکھا کیجئے
ڈھونڈ لیجے ان نگاہوں میں کوئی حرفِ وفا
ہاں سکوں کے واسطے خود سے بھی دھوکا کیجئے

اپنوں سے بھی غیروں سے بھی ہر لحظہ نیا کھیل نئی چال چلی جائے
کیا کیجئے اُس دور میں جس دور میں ہر سانس کی تقدیر یہی ہو

زندگی کے اچانک پن اور ایک قسم کی چکرا دینے والی صورتِ حال کے اثرات اُس کے اسلوب کی ڈرامائیت کی شکل میں نمودار ہوتے ہیں چنانچہ اس کی نظمیں بلکہ غزل کے اکثر اشعار بھی اچانک شروع ہوتے ہیں یوں محسوس ہوتا ہے کہ نظم یا شعر شروع ہونے سے پہلے بھی بہت کچھ کہا جا چکا ہے اور قاری بہت کچھ گزر چکنے کے بعد شاعر کا شریک سفر ہے۔ کچھ نظموں کے ابتدائیے ملاحظہ ہوں؛

۱۔ تو ایسا کیوں نہیں کہتے کہ یہ سینے ہی میرے کرب کے ضامن ہیں
۲۔ مگر تم نے اس درد کے ذائقے کو چکھا ہی نہیں ہے
۳۔ نہیں ... میں یوں نہیں کہتا
۴۔ اسے ان نوجوانوں نے بالآخر زمردے ڈالا
۵۔ دیکھتے ہی دیکھتے چاند اندھا ہو گیا

اس کے علاوہ نظموں میں جا بجا ڈرامائی موڑ آتے ہیں اور ہر موڑ اچانک نمودار ہوتا ہے۔ اسی کے ساتھ ترتیبِ وقت ٹوٹنے لگتی ہے اور نظم کبھی ایک اور کبھی دوسرے صیغے (Tense) سے ہو کر آگے بڑھتی ہے۔ حادثہ۔ تنہا۔ رات۔ سمندر وغیرہ اسی نوعیت کی نظمیں ہیں۔

جنگل کے معاشرے کی دوسری خصوصیات بھی مختلف جہتوں سے بشر نواز کے فن و اسلوب پر اثر انداز ہوتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ مثلاً مابعد الطبیعاتی استعاروں، پیکروں اور علامتوں کے مقابلے میں اُن کے ہاں مادی، لسانیاتی اور ارضی علامتوں اور پیکروں کا زیادہ استعمال ملتا ہے۔ قوتِ سامعہ کی کارفرمائی اس کے ڈکشن، صوتی آہنگ اور بحروں پر یوں اثر انداز ہوتی ہے کہ وہ اجنبی اصوات اور لفظیات سے گریز کرتے ہوئے بار بار مانوس صوتیات اور ڈکشن کی طرف لوٹتا ہے اور اپنے دور کے مقبول رویے یعنی کھردرے لہجے اور اکھڑے اکھڑے آہنگ کی بجائے مترنم بحروں اور خوشگوار آہنگ کو اپنا ذریعۂ اظہار بناتا ہے۔ اس نفسیاتی مطالعے کے دوران تصویر کے اس پہلو پر بھی غور کرنا ضروری

ہے جس کی طرف میں نے ابتدائی سطور میں اشارہ کیا ہے۔ میں نے عرض کیا تھا کہ بشر نواز کے ہاں ایک مجادلے (conflict) کا احساس ہوتا ہے اور یہ مجادلہ (conflict) پیدا کردہ ہے۔ مذکورہ بالا جذباتی رویئے اور موجودہ دور کے تجرباتی اور حقیقت پسندانہ ذہن کا۔ آج کے بیشتر لکھنے والوں کے ہاں یہ ٹکراؤ اساسی حیثیت رکھتا ہے اور اس کا ردِ عمل مختلف رویوں کو جنم دیتا ہے۔ بعض لکھنے والوں کے پاس مراجعت کی شکل ابھرتی ہے۔ بعض اساطیری اور دیومالائی طرزِ اظہار کو اپناتے ہیں اور بعض رومانی رویّہ اختیار کرتے ہوئے اپنے تخیل اور خوابوں کی دنیا میں پناہ گزیں ہو جاتے ہیں۔ بشر کے ہاں اس ٹکراؤ کی ایک علیحدہ جہت ابھرتی ہے۔ وہ جذباتی طور پر ماضی سے وابستہ ہونے کے باوجود حال پر نظر رکھتا ہے، اس کا تجرباتی اور حقیقت پسندانہ ذہن موجود کی قوّت اور اس کی اہمیّت کو تسلیم کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ تاہم دل کا کوئی نہ کوئی گوشہ ماضی کے تانے بانے سے الجھا رہتا ہے۔ چنانچہ باطنی شخصیّت اور خارجی ماحول کے ٹکراؤ کا نتیجہ اس ارتباط و اتحاد (fusion) کی شکل میں نمودار ہوتا ہے جو نہ صرف اردگرد کے حقائق کو روشن کر دیتا ہے بلکہ شاعر کی باطنی شخصیت کو بھی روشنی عطا کرتا ہے اور اسی روشنی میں اُسے وقت کی اَن دیکھی لیکن اُس زبردست قوت کا احساس ہوتا ہے جو ہر شے کو اپنے ساتھ بہا لے گئی اور لئے جا رہی ہے۔ یہاں وقت ایک بے رحم نہ سہی بے حس قوت کی حیثیت سے اُبھرتا ہے اور زندگی، وقت اور جذباتی وابستگی کا مثلث وجود میں آتا ہے۔ مثلث کے تینوں کونوں کی عدم مطابقت اس افسردگی کو جنم دیتی ہے جس کی طرف ابتدائی سطور میں اشارہ کیا جا چکا ہے۔ حال و ماضی کے تصادم اور اس میں وقت کے کردار کا یہ احساس ذیل کی نظم میں یوں واضح ہوتا ہے۔

بے اماں راستوں کا مسافر ہے دل
کون ساتھی بنے
برف باری میں اک ٹوٹتی شاخ سے
ایک پل کی وفا بھی خطرناک ہے
کون خود آپ ہی اپنا قاتل بنے

ٹوٹتی شاخ وہی ماضی ہے جسے وقت کی برفباری شل کر کے توڑے دے رہی ہے اور چونکہ کوئی بھی باشعور ذہن خود آپ اپنا قاتل نہیں

شاعر ہے ——

ہو سکتا اس لئے تب بے اماں راستوں کا سفر مقدر بن جاتا ہے۔ اور ٹوٹتی شاخ سے بادلِ ناخواستہ ہی سہی ناطہ توڑنا پڑتا ہے۔ نظم میں برف باری کے استعارات، انجماد اور سفیدی کو خارج کر کے صرف اس کے شل کر دینے والے اور تخریبی پہلو کی مدد سے پیکر تراشا گیا ہے۔ یعنی یہ پیکر کیفی سے زیادہ کمّی ہے۔ مرضی کے خلاف موجود کو تسلیم کرنے میں جس ذہنی اور جذباتی کشمکش کا سامنا کرنا پڑتا ہے، اس کا اظہار بشر کی شاعری میں جا بجا ملتا ہے اور یہ نفسیاتی الجھن اس کے ذہن کو زیادہ حقیقت پسند بننے پر مجبور کرتی ہے چنانچہ اس کی شاعری میں ایک مقام وہ بھی آتا ہے جب اُسے کہنا پڑتا ہے ؎

خواب کے نشّے میں تعبیر کو جھٹلاؤں نہیں
اب یہ سوچا ہے فریب اور کوئی کھاؤں نہیں
زہر امرت نہ بنے گا نہ بنا ہے اب تک
سحرِ الفاظ سے اب ذہنوں کو بہلاؤں نہیں
کسی ذرّے کو نہ خورشید نہ مہتاب کہوں
کسی قطرے میں سمندر کوئی دکھلاؤں نہیں

یہ گویا ایک عہد نامہ ہے جو شاعر اپنے آپ سے کر رہا ہے اور اس کے پیچھے مسلسل فریبِ زندگی (Disclusions) کا ایک ایسا سلسلہ ہے جسے خواہی نخواہی کوشش تا زندہ رہنے کے لئے ضروری ہو جاتا ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ بشر نواز کی شاعری میں انسانی نفسیات کے کئی چور خانے بڑی بے رحمی سے بے نقاب کئے جاتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ جذبات و احساسات بے اعترافات اور ایمانداری کے ملمع کو جتنی بیباکی سے بشر نواز نے اتارا ہے وہ جرأت بہت کم شعراء کے حصّے میں آئی ہوگی۔

روز کہاں سے کوئی نیا پن اپنے آپ میں لائیں گے
تم بھی تنگ آ جاؤ گے اک دن ہم بھی اُکتا جائیں گے
محفل محفل اپنا تعلق آج ہے اک موضوعِ سخن
کل تک ترکِ تعلق کے بھی افسانے بن جائیں گے
چڑھ گئے حق کے لئے دار پہ ہم بھی لیکن
سوچتے ہیں کہ کوئی دیکھنے والا ہوتا
یاں کون کسی سے سچا ہے الزام دھریں کیا اوروں پہ
خود اپنی بیاضِ دل پہ لکھے یاں کیسے کیسے نام ملے

یہ صورتِ حال خود شاعر کے لئے بھی دل خوش کن نہیں ہے۔

اس کے علاوہ حقیقت پسندانہ رویّے کے لئے جس معروضیت (objectivity) کی ضرورت ہوتی ہے وہ بھی شاید بشر نواز کے بس کی بات نہیں ہے، اسی لئے اشعار کے بین السطور میں دکھ اور کرب کی ایک لہر صاف نظر آتی ہے اس کی وجہ بھی میرے نزدیک شاعر کی شخصیت اور اس کے ذہن کا مجادلہ (conflict) ہی ہے۔

ابتدائی نظموں میں جذبات اور حقائق کے ٹکراؤ، جبرِ وقت کے احساس اور شکستِ فریب کا ردِ عمل جھنجھلاہٹ بلکہ اعصاب زدگی اور تشنجی کیفیت کی شکل میں ملتا ہے۔ لہجے میں جذباتیت اور چیختے ہوئے احتجاج کی لے نمایاں نظر آتی ہے۔

زندگی، زندگی پتھر کی او بے حس مورت
اب تو شانوں سے الگ کر لے یہ باہیں اپنی
دھوپ میں رکھی ہوئی برف کی صورت کب سے
پگھلا جاتا ہوں ہٹا اب تو نگاہیں اپنی

لیکن بعد کی نظموں میں شاعر نے موجودہ حقائق پر متفکرانہ سنجیدگی سے غور کر کے قطعی حقیقت پسندانہ Realistic رویّے کی طرف قدم بڑھایا ہے۔ جس کے نتیجے کے طور پر وقت اور زندگی ایک ہی راستے، لیکن مخالف سمتوں کے راہی نظر آنے لگے۔ ساتھ ہی وقت کی حرکی صفت کا بھی احساس ہوا جو ہر لمحے کو ماضی کے سمندر میں جا ڈھکیلتی ہے۔ عرفانِ حقیقت کی اس منزل پر اس کا رویّہ یوں ہو جاتا ہے ؎

یہ منظر بھی گذر جائے گا
مناظر دوڑتے جاتے ہیں۔

حقائق اور خوابوں کی اس رزم گاہ میں وقت ایک Third Person کا رول ادا کرتے ہوئے سب سے متعلق ہوتے ہوئے بھی سب سے لاتعلق ہے، سب کچھ روندتا ہوا گذرتا چلا جاتا ہے۔ چنانچہ بشر نواز کی شاعری میں ایک ایسا کردار خلق ہوا جو اپنی آنکھوں کے سامنے اپنے عزیز ترین متاع کو لمحہ بلمحہ وقت کے ہاتھوں میں اترتا ہوا دیکھتا ہوا ہوا لگتا ہے اس کا بھی شعور ہوگا اس صورتِ حال سے مفر ممکن ہے نہ فرار اور یہ بھی کہ یہ زندگی کا ناگزیر عمل ہے حقائق کے اس جان لیوا شعور کے نتیجے کے طور پر بشر کی شاعری پر ایک پُراسرار خاموشی چھا گئی ہے۔

افسردگی کی فضا طاری نظر آتی ہے اور ہر چیز کے رائیگاں ہونے کا احساس شدید ہو جاتا ہے۔

بے سمت منزلوں کا سفر درمیان ہے
رستے کے سب نشان اڑا لے گئی ہوا
اپنی وفا پہ خود ہی ندامت ہے اب مجھے
یہ ابر کس چٹان پہ جاکر برس گیا
ریت میں پھول کھلائے تھے نتیجہ دیکھا
ایک ہی موج یہ سمجھا گئی دریا کیا ہے

مناظر تتلیاں ہیں
تتلیاں پھول اٹھتے رنگوں کے سوا دیں گی بھی کیا آخر
ہر گذرنے والا میٹھی یاد سے منسوب لمحہ
ٹوٹے تارے کی طرح
تیرگی سے چھوٹ کر
تیرگی کے جسم پر
کھینچتا اک خطِ نور
جانے کس انجان تاریکی میں ہو جاتا ہے گم۔

اس صورتِ حال کا ردِ عمل شکست خوردگی یا لاتعلقی کی صورت میں بھی ہو سکتا تھا، لیکن بشر نواز کے یہاں زندگی سے رشتہ نہیں ٹوٹتا اور وہ دُکھے دل ہی سے سبھی حقائق کو قبول کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ اس طرح اس کا رویّہ اپنے بہت سارے ہم عصروں سے مختلف ہو جاتا ہے اور یہیں وقت کا سائنٹفک شعور بشر نواز کے سامنے ماضی کو ایک نئی معنویت کے ساتھ آشکار کرتا ہے۔ چنانچہ اس کے یہاں ماضی صرف از کار رفتہ لمحوں کا گنج ہی نہیں بلکہ حال اور مستقبل کا ایک لازمی شریک بن جاتا ہے۔ اس طرح بشر نواز کا فن عصری حقائق کے یک سطحی اظہار کی بجائے مختلف الابعاد اور تہہ در تہہ ردِ عمل کی عبارت ہے۔ اس میں ماضیت اور عصریت کا حقیقت پسندانہ تجزیہ خصوصی مطالعہ کی دعوت دیتا ہے۔ بقول ایلیٹ چونکہ فن کی تخلیق بساط روح و دل پر ہوتی ہے۔" اس لئے یہ ردِ عمل عمومی حقائق میں بھی تخصیصی رنگ بھر دیتا ہے۔

اب کچھ طرزِ اظہار اور فنی اسلوب کے بارے میں عرض کرنے سے پہلے، اس بات کی طرف اشارہ کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ کسی

بھی ترقی یافتہ زبان کی روایت اپنی تہہ در تہہ گوناگونی اور ہمہ رنگ کیفیات کی وجہ سے مستحکم ہوتی ہے۔ اس میں کئی دھارے وقتاً فوقتاً آ کے شامل ہوتے جاتے ہیں اور تجزیہ اور تزکیہ کے بعد ہی اُن کی انفرادیت پہچانی جاسکتی ہے۔ اچھے فن کاروں کے یہاں بڑی سے بڑی بغاوت بھی اپنی زبان اور شعری روایت کے ساتھ یوں ہم آہنگ ہوکر آتی ہے کہ اُسے بیک نظر پہچاننا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہو جاتا ہے۔ اوّلین سطح پر چونکا دینے والا تجربہ تہہ داری سے عاری اور اکہرے پن کا شکار ہوتا ہے اسی لئے دیرپا تاثر سے اس کا کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔ چنانچہ ہنگامی حالات اور وقتی مزاج کی تبدیلی کے ساتھ اس کی وقعت کھو جاتی ہے۔ برخلاف اس کے کامیاب فن پارے کی جڑیں اپنی ملکی، قومی اور شعری روایات میں دُور تک اُتری ہوئی ہوتی ہیں اور چونکانے کی قوت اُس کے ظاہری ڈھانچے سے زیادہ اس کی معنوی تہہ داری اور رویّے کے انوکھے پن میں مضمر ہوتی ہے۔ بشر نواز شعری ہیئت یا لسانی ڈھانچے کے ذریعے متاثر نہیں کرتا بلکہ موضوع کے انوکھے پن اور حسیت کی ہشت پہلویت سے قاری کو متاثر کرتا ہے۔ "رائیگاں" پر تبصرہ کرتے ہوئے شمس الرحمٰن فاروقی نے اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے۔ چنانچہ اُنہوں نے کچھ نظموں کا ذکر کرتے ہوئے کہا ہے کہ یہ نظمیں اُردو کی روایتی شاعری کے کسی خانے میں فٹ نہیں ہوتیں۔ انہیں نظموں میں "جھوٹ تقدس رشتوں کا" جیسی نظم بھی شامل ہے جسے بقول شمس الرحمٰن فاروقی اُردو کی بہترین نظموں میں شامل کیا جانا چاہیئے۔ جن نظموں کی طرف فاروقی نے اشارہ کیا ہے ان میں بھی لسانی ڈھانچے سے زیادہ رویّے کا انوکھا پن متوجہ کرتا ہے۔

بشر نواز کے یہاں تجرباتی ساخت کے مصرعوں یا انوکھے الفاظ کے استعمال سے ابہام یا اشکال کی کوئی مثال نہیں ملتی کہ یہ رویّہ سوائے پراگندگی اور انتشار (confusion) پیدا کرنے کے اور کچھ نہیں ہے۔ البتہ اس کی نظموں میں تہہ دار معنویت اور موضوعی اشکال کی صورتیں ابھرتی ہیں کہ عصری کیفیات کا اظہار اس کے علاوہ کسی اور صورت میں ممکن نہیں۔ بشر نواز کے یہاں موضوع اور ہیئت یکجان ہوکر آتے ہیں۔ نظموں کی ڈرامائی کیفیت اس کے یہاں متحرک پیکروں کو جنم دیتی ہے۔

ستارا ٹوٹتا ہے
سیہ مخمل کے پردے پر کوئی تلوار چلتی ہے
گھڑی بھر بلکہ اک پل کے لئے منظر بدلتا ہے
کوئی اک شاخ
کوئی پھول
کوئی اونگھتا پنچھی
اندھیرے کی ردا سرکا کے جیسے جھانک لیتا ہے۔

بشر نواز کی شاعری میں جامد پیکروں یا محض علامتوں کا استعمال نہ ہونے کے برابر ہے۔ وہ اپنے اظہار کے لئے موضوعی، ہیئتی یا لفظی ہچکچاہٹ اور مزاحمت (Inhebitions) کا شکار نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے یہاں عرفِ عام میں روایتی اور غیر روایتی، شاعرانہ اور غیر شاعرانہ کی کوئی تخصیص نہیں ملتی، بلکہ وہ اپنے اظہار کے لئے اُن تمام ذرائع کو استعمال کرنے سے گریز نہیں کرتا جو اس کے موضوع کے حسبِ حال ہوں۔ یہ روّیہ اسے جدید تر انگریزی شعرا خصوصاً JORGE MACBETH سے قریب کر دیتا ہے یعنی اس کی دلچسپی لسانی توڑ پھوڑ اور نئی شعری زبان تخلیق کرنے سے زیادہ انسانی رشتوں کی نفسیات سے ہے اور وہ اپنے اظہار کے لئے بلاواسطہ یا بالواسطہ کسی قسم کے بیان کو اپنانے سے گریز نہیں کرتا۔ مختصر لفظوں میں اس کے اسلوب کو نسبتاً سادہ لسانی سطح پر غیر مبہم لیکن معنوی حیثیت سے تہہ دار کہا جاسکتا ہے۔

بہرحال جدید شعرا میں بشر نواز اپنے مخصوص فکری و فنی رویّے کی وجہ سے ایک ایسی منفرد آواز ہے جسے پوری طرح سمجھنے کے لئے رائج الوقت تنقیدی کلیشے (cliche) سے زیادہ عصری باخبری اور اُردو کی شعری روایات سے پوری طرح آشنائی لازمی ہے۔ اسی کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ ہم شاعری کو حالات کا محض ایک سطحی ردِّ عمل یا ایک خود مختار لفظی ڈھانچہ سمجھنے کی بجائے جیتے جاگتے گوشت پوست کے انسان کی شخصیت کا فنکارانہ اظہار سمجھیں۔

OO

ماہر منصور

عرفان

گجر دم وقت کے کروٹ بدلتے ہی
نہ جانے کتنے لوگوں نے
نئے موسم کے آئینہ میں
اپنے گرد آلودہ رُخوں کو جانچنے کی سعی فرمائی
چلو اچھا ہُوا یُوں
آج اپنے آپ سے ملنے کی کوئی راہ تو نکلی !!

○ مقابل مسجد - وزیا نگر - جمکر

علی عبّاس اُمید

نوکِ خار

ہزاروں سال لمبا راستہ
طے کر کے ہم تہذیب کے اِس موڑ تک پہونچے

سفر کی گرد چہرے سے ابھی دھونے نہ پائے تھے
ابھی اِس موڑ کے ملنے سے ہم مسرور بھی ہونے نہ پائے تھے
— کہ پھر حوصلہ کھونا پڑا ہے
قدم صدیوں پہ رکھتا جس کی اُنگلی تھام کر سیکھا
— اُسی تہذیب کو روندنا پڑا ہے۔

○ احسن منزل نند محل، بھوپال۔ ایم - پی

شاعر۔ بمبئی

اعجاز اعظمی

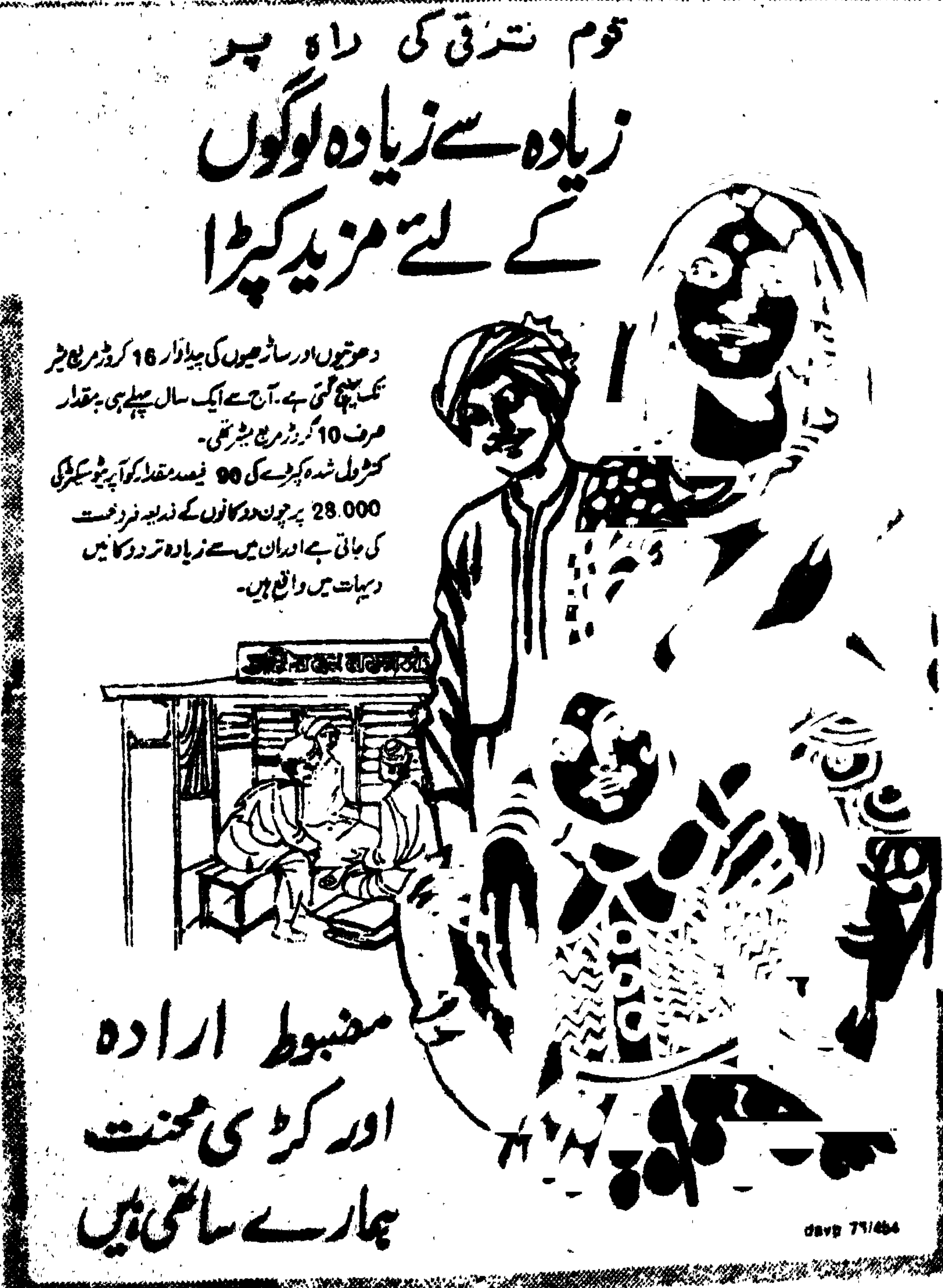
آدرشوں کے کھنڈر

ظلمتوں کے ورق
نُور کے حاشیے
زندگی کے سبق
درد کے تبصرے
گردشوں کے کھنڈر میں بھٹکتے ہوئے

حسرتوں کے دیئے
یاس کے قافلے
قربتیں کھو گئیں
منزلیں سو گئیں
دُور بھی سا عقل ہی کو آواز دو

پیار بیدار ہے
چھیڑ دو پھر کوئی داستانِ وفا

زندگی کے لئے
آگہی کے لئے


قوم ترقی کی راہ پر
زیادہ سے زیادہ لوگوں کے لئے مزید کپڑا
دھوتیوں اور ساڑھیوں کی پیداوار 16 کروڑ مربع میٹر تک پہنچ گئی ہے۔ آج سے ایک سال پہلے ہی یہ مقدار صرف 10 کروڑ مربع میٹر تھی۔
کنٹرول شدہ کپڑے کی 90 فیصد مقدار کو آپریٹو سیکٹر کی 28.000 پرچون دوکانوں کے ذریعہ فروخت کی جاتی ہے اور ان میں سے زیادہ تر دوکانیں دیہات میں واقع ہیں۔
مضبوط ارادہ اور کڑی محنت ہمارے ساتھی ہیں
davp 79/464

وقت کا گانا

نریندر سنگھ بھاٹیا
دی گورسے پورہ کیپٹن لینڈ، پوسٹ آفس گوردوارہ

لوگ کہتے ہیں کہ میں کُند ذہن ہوں۔ میری عقل ابھی ناپختہ ہے اور نا ہی مجھ میں دُور اندیشی کے خمیر کا لمس ہے۔ مجھے میری گزشتہ نوکری سے اسی وجہ سے جواب مل گیا تھا کہ میں نے مالک سیٹھ لکشمی نرائن سے صاف کہہ دیا تھا "میں آپ کے دلال کو جو مزدوروں کی بدقسمتی کی وجہ سے اُن کا رہنما بھی ہے، آپ کے دیئے چار ہزار روپئے رشوت کے طور پر سٹرائیک کو ملتوی کرنے کیلئے پیش نہیں کرسکوں گا آپ ایک دلال کے پاس جانے کے لئے کسی اور دلال کو ڈھونڈیئے۔"

ماما مزدور غریب ہے۔ اَن پڑھ ہے۔ ان میں بھیڑ چال ہے۔ مل کی یونین کے لیڈر ہر سال چُنے جاتے ہیں۔ اور یہ اتفاق کی بات ہے کہ ہر سال وہی لیڈر چُنے جائیں جو چالیس روپیہ ہفتہ کماتے ہیں۔ اور اپنے عالیشان مکانوں کی تعمیر کرواتے ہیں۔ وہ پیسہ کہاں سے آتا ہے؟ مجھے مل مالک نے کہا تھا "تم اپنا نظریہ اپنے تک محدود رکھو لیکن میری مل کی حد سے باہر ہو جاؤ۔"

آپ ہی کہیئے۔ میں نے کیا زیادتی کی۔ آپ بھی تو دن کو رات نہیں کہیں گے۔ جھوٹ اور سچ کی تمیز آپ میں بھی ہے۔ آپ ایک غیرتدار اور انصاف پسند انسان ہیں۔ کوئی بات نہیں، میں پڑھا لکھا ہوں اور نوکری تلاش کرنے میں دیر نہیں لگتی، پر میری دیانت داری مجھے وہاں بھی ٹکنے نہیں دیتی۔ میں پوچھتا ہوں "حاجی مستان کی فلم بنا کر ہزاروں لاکھوں روپئے کما کے بندرگاہ میں کام کرنے والوں کو جھونپڑیوں سے اُٹھا کر پکے مکانوں میں تو منتقل نہیں کیا گیا۔ اُن کی غربت جوں کی توں ہے۔ ..... اُن کا ماضی دھندلکوں میں کھو چکا ہے۔ کوئی کھیل یا مسرت آمیز نہیں جسے سینے سے لگایا رکھا جائے۔ مستقبل اَن دیکھا ہے۔ ایک ستارا ہے جو فلک پر ہے۔ ابھی ٹوٹ کے نہیں گرا۔ اُمید لا متناہی چیز ہے۔ خوابوں کے محلوں میں بسر نہیں ہو سکتی۔ کھوکھلا انسان ماضی اور مستقبل کچھ نہیں جانتا۔ سب سے زیادہ تلخی زمانہ حال کی ہے، جو ایک گھونٹ بھی نگلی نہیں جا سکتی۔ یہ ایک بنیادی تہمت کی طرح ٹھوس ہے، پریشان کن ہے، اور ایک جلاد کی تیغ کی طرح سامنے کھڑی ہے۔ وقت کا جلاد زیادہ انتظار نہیں کر سکتا۔ اپنی گردن جھکا دو اور سماجی ناانصافی کی راہ میں شہید ہو جاؤ۔

میں نے ایسے ہی سماجی ظلموں کے خلاف آواز بلند کی ہے۔ کچھ لوگ تھے، گو وہ کم تھے جھک سُنی گئی، جیسے مسیح، گاندھی، لنکن اور مجیب الرحمٰن اور سشی وغیرہ۔ کچھ ان میں سے اس جدوجہد میں کام بھی آ گئے، جو دن کو رات نہیں کہہ سکتے۔ یہ مجبور نہیں کئے جا سکے۔ میری آواز اتنی اُونچی نہیں یا میری فریاد ناموزوں اور بے موقع ہے۔

لیجئے، دوسرے دن کا ہی قصہ سُنیئے۔ ہمارے محلے میں ایک بیوہ رہتی ہے۔ اس کی لڑکی کی دوسرے روز شادی تھی۔ چور ایک رات پہلے اس کی لڑکی کا سارا جہیز چُرا لے گئے۔ اس کی فریاد سُن کر لوگ کہنے لگے "چور کو پکڑ کے چلاتا، ہمارے سامنے کیوں شور و غل کرتی ہو؟"

ایک اندھا فقیر بھیک کے لئے سڑک پر آتا ہے لڑکے اس کی لاٹھی چھین کر لے جاتے ہیں۔ کچھ لوگ کھڑے تماشہ دیکھتے ہیں، ہنستے ہیں، جب تک لڑکے اس کی لاٹھی واپس نہیں کرتے فقیر گالی بکتا ہے تو لوگ کہتے ہیں۔ آخر بچے ہی تو ہیں۔ وہ لوگ کیا جانیں، ایک اندھے کی لاٹھی جا ہے تو چھینے یا بُرا وہ

اپنی اندھیری دنیا میں اکیلا کھڑا کتنا گھبراجاتا ہے۔"
ایک خارش زدہ کتا ہے۔ بچوں نے اُس کی ایک ٹانگ کے ساتھ رسّی باندھ دی ہے اور دوسرے سرے سے بھاری اینٹ۔ وہ کتا دوڑ نہیں سکتا۔ رینگ رینگ کر چلتا ہے۔ رسّی باندھنے کی جگہ زخم ہوگیا ہے۔ پر کسی نے اُس کی رسّی نہیں کاٹی۔ وہ میری طرف ٹکٹکی باندھے دیکھتا ہے۔ میں اُس کی رسّی کاٹ دیتا ہوں۔ کچھ لوگ کہتے ہیں "بچوں کا کھیل تھا۔" آخر کتا ہی تو ہے۔

پیچھے سے ایک اور آدمی مجھ پر ہنستا ہے۔ "آپ نے اب کتوں کا بھی ٹھیکہ لے لیا ہے ؟"

میں جواب دیتا ہوں۔ "کتے کا صرف نام بدنام ہے۔ اس کی وفاداری کا مقابلہ کون انسان کرسکتا ہے ؟"

مجھے کسی سے شکایت نہیں، میں جو دیکھتا ہوں، سُنتا ہوں، بیان کررہا ہوں۔ پر وہ آدمی کیوں ہنسا۔ اُسے میری ہمدردی سے بھی شکایت ہے، مگر رسّی باندھنے والے سے نہیں۔ لیکن کہتے ہیں کہ انسان نے اپنے لئے ایک حرف گھڑا ہے "اشرف المخلوقات !"
میں صرف اس پر ایک قہقہہ لگانا چاہتا ہوں۔ ہا، ہا، ہا ——
لوگ سمجھیں گے میں پاگل ہوں۔ لیجئے ! — اب میں کُند ذہن سے پاگل بھی ہوگیا۔ ایک اور سند ملی۔ کیا انسانی تہذیب کا یہ سارا دَور ہی تو پاگل نہیں ہوگیا۔"

جب میرا دل نفرت اور کراہت سے بھر جاتا ہے، تو خیالات کو بدلنے کے لئے میں بازار میں گھومنے چلا جاتا ہوں۔ کہیں بیٹھے بیٹھے نفرت کا زہر میرا کلیجہ نہ چھلنی کردے۔ پر میں کسی کو کاٹ کھانے نہیں دوڑتا۔ بازار میں رونق ہے۔ خوبصورت چہرے ہیں۔ کچھ بچوں کے دلوں میں نئے غبّاروں کی حسرت ہے۔ آدمی جلدباز ہیں۔ دکانوں پر رُکتے نہیں۔ وہ اپنا بچپن بھول چکے ہیں۔ غبّاروں کا سحر اُن پر اب کام نہیں کرتا۔ عورتیں عقیدت مندانہ، شوہروں کے پیچھے چل رہی ہیں، حالانکہ اُن کا دل بہت پیچھے اُن دکانوں کے پاس ہی رہ گیا ہے۔ وہ دکانیں، جہاں سستی ساڑیاں مل رہی تھیں، ایک کھرچنا، جس کی ایک عورت کو بہت دیر سے ضرورت تھی۔ کچھ نئے پیالے، گھر میں مہمانوں کے سامنے پرانے پیالے رکھتے شرم آتی ہے۔ پر سستی ساڑیاں اور سستی کھرچنیاں پیچھے رہ گئیں۔ کیونکہ ساڑیاں، پیالیاں، شاعر، بمبئی ——

اور کھرچنیاں شوہروں کے نقطۂ نگاہ میں مہنگی تھیں اور سستی گھریلو نوکرانیاں شوہروں کے ساتھ چلتی گئیں۔ شوہروں کے آگے پیش نہیں چلی۔

میں ایک دکان میں گھستا ہوں، وہاں امیر لوگ ریڈیو گرام خرید رہے ہیں۔ اچانک میری ہی طرح کم فہم ایک انجان چھوکرا سیلزمین نیا ریکارڈ بجاتا ہے۔ یہ ریکارڈ بالکل بے موقع ہے۔ بینک فلائیڈ کا گانا ہے۔ ریکارڈ کا نام ہے "چاند کا دوسرا تاریک رُخ" —— میں سُنتا ہوں :

"ہم اور سب دُنیا میں عام لوگ ہیں
خدا جانتا ہے کہ ہماری جدوجہد ہماری اپنی مرضی کی نہیں
حکم دینے والا جرنیل پیچھے بیٹھا ہے جو ہمیں بڑھنے
کو کہتا ہے۔ اور دشمن ہماری آگے والی صف
ختم کردیتا ہے۔ پیچھے جرنیل بیٹھا لڑائی کے
میدان کی لکیریں نقشے پر دیکھتا ہے۔ کالی اور
نیلی — اور کون جانتا ہے کہ انکا مطلب کیا ہے۔
کیا کالی ہماری ہیں یا نیلی، ہماری تقدیر کی لکیریں۔
ایک پرچم بردار چلّایا اور کہنے لگا
برخوردار تم بھی ہم سے مل جاؤ
چاہے پارٹی کے اندر یا باہر رہو ہمارے طرفدار ہو کے
ہم مجبور ہیں جو کچھ بھی ہم کہہ رہے ہیں۔
پر یہ اُصولوں کی لڑائی ہے۔ اس میں سب کو
شریک ہونا ہے۔
پر کیوں اس کے باوجود
ایک معمّر انسان
چائے کی ایک پیالی اور روٹی کے ایک ٹکڑے کو
ترستا ہوا مرگیا ؟"

میں سمجھ گیا کہ نغمہ نگار اُس جدوجہد کو فضول سمجھتا ہے جو پارٹی بازی اور جنگ بازی کے جھوٹے اصولوں پر مرکوز ہے۔ اور ہر ایک کو زبردستی اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے۔ اور مجبور لوگ مُفت میں شہید ہوتے ہیں۔ اور اس شوروغل میں ایک معمّر انسان

(بقیہ صفحہ ۱۱۳ پر دیکھئے)

غزلیں

اسلم عمادی

یہ صبح و شام کا فتنہ کبھی تمام نہ ہو!
خدا کرے کہ یہ دُنیا کبھی تمام نہ ہو

نگاہیں دیکھتی جائیں بدلتے چہروں کو
اَزل اَبد کا تماشہ کبھی تمام نہ ہو

کسی کے پیار کی خوشبو ہے زندگی کی بقا
وگرنہ عمر کا صحرا کبھی تمام نہ ہو

تمام کھیتیاں چھاتی سے اُس کے لپٹی ہیں
ترے کرم کا یہ دریا کبھی تمام نہ ہو

قریب و دُور میں کتنی کشش اُبھرتی ہے
یہ وصل و ہجر کا رشتہ کبھی تمام نہ ہو

ہرے بھرے سے درختوں میں چھپ کے بیٹھے ہم
کہ اِس خیال کا سایہ کبھی تمام نہ ہو

وہ میرے ساتھ ہے کہ موسم بہت ہی رنگیں ہے
تو اسلم اب سفر اپنا کبھی تمام نہ ہو

غلام حسین ایاز

ویسے دراز قد تھا وہ مجھ سے بلند تھا
یہ عیب اس میں تھا کہ ذرا خود پسند تھا

اُس کو مجھے سمجھنے میں تاخیر یوں ہوئی
میرا وجود دُکھ بھرے لفظوں میں بند تھا

وہ اپنی تلخ گوئی سے بدنام تھا مگر
وہ صاف گو تھا اِسلئے مجھ کو پسند تھا

کیا کیا نہ تجربے ہوئے حالانکہ مجھے جناب
کچھ روز میں بھی اپنے ہی کمرے میں بند تھا

یوں تو قد آوروں کی بھی اک بھیڑ شہر میں
لیکن وہ ایک شخص جو سب سے بلند تھا

میں بھی تھا اُس نگاہ کا مرکز بنا ہوا
مجھ پر بھی اُسکے شہر کا دروازہ بند تھا

اب جو بھی اُسکے بارے میں کہئے مگر ایاز
ویسے وہ آدمی تو بڑا درد مند تھا

ارمان نجمی

خواہش نے مجھ کو ڈال دیا کس عذاب میں
پیاسا بھٹک رہا ہوں بدن کے سراب میں

بے جان سرد لفظوں میں کچھ زندگی نہیں
مُردہ پڑے ہیں سارے عقیدے کتاب میں

جاتی رُتوں کے ساتھ حرارت بھی کھو گئی
شعلے سے سرد پیرہن آفتاب میں

تعبیر سے اُمید کا رشتہ کہاں رہا؟
ہم جانتے ہیں کتنی حقیقت ہے خواب میں

کچھ روز اور اُن سے نگاہوں کو آب دو
کھو جائیں گے یہ نقش بھی ماضی کے باب میں

اک لمحہ سکوں بھی میسر نہ آسکا
میں بھی رہا دھوئیں کی طرح پیچ و تاب میں

دامن نہ اپنی پیاس کا تر ہوسکا کبھی
معدوم ہو گیا مراد ریا سراب میں

○ فاروقی منزل ۳۰۔۴۰، بابا نگر ۔۔۔ ○ عشرتکدہ ۱۲/۴۹، بام برنیو، کلکتہ ۱۵ ○ پیپلی کوٹھی، باقر گنج، پٹنہ ۴

بے بسی بس کے انتظار میں

پرویز ید اللہ مہدی
معرفت پوسٹ بکس نمبر ۲۵۰۲۹ ۔ بمبئی - ۸

آپ کو معشوق کے سوا ہر چیز کا انتظار کرنا پڑتا ہے۔ بقول شخصے انتظار دراصل اس بلا کا نام ہے جو اگر طویل ہو جائے (اور بفضل تعالیٰ یہ ہمیشہ طویل ہوتا ہے) تو جانے واردات ہی پر ایک شخص کا بلکہ کئی اشخاص کا بہ یک وقت ہارٹ فیل ہو سکتا ہے۔ گویا انتظار وہ خطرناک امتحان ہے جس میں ہارٹ کا فیل ہونا یقینی ہے۔ اور خدا جھوٹ نہ کہلوائے کسی نہ کسی قسم کا انتظار ہر وقت، ہر معاملے میں، ہر فرد کے سر پر، ہیر تسمہ پا کی طرح سوار رہتا ہے۔ کنوارے کو شادی کا (خصوصاً ڈھیر سارے جہیز کا)، نئے بیاہتا جوڑے کو اولاد کا (خصوصاً اولادِ نرینہ کا) اور ملازم پیشہ افراد کو پہلی تاریخ کا (خصوصاً تنخواہ کا)۔ البتہ کنوارے، شادی شدہ، ملازم پیشہ، بیروزگار، ہر فرد کو جو انتظار ایک ہی لاٹھی سے ہانکتا ہے، وہ ہے "بس کا انتظار" ——— متوسط طبقہ تو روزانہ بلاناغہ اس انتظار کی کوفت سے "کوفتہ" یعنی دوچار ہوتا ہے بلکہ بیشتر بدنصیب تو انجام کار اس جان لیوا انتظار کی نذر ہو جاتے ہیں۔ یعنی ناحق جاں بحق ہو جاتے ہیں۔ البتہ متوفی کے متعلقین یہ سوچ کر یہ صدمہ سہہ جاتے ہیں کہ ؎

آج وہ، کل ہماری باری ہے

ماہرین اقتصادیات، معاشیات، و بدمعاشیات کا کہنا ہے (ویسے ان حضرات کا کام صرف کہنا ہی ہے۔ اس لئے یہ ضروری نہیں کہ ان کی کہی ہوئی بات معقول ہو۔ تاہم یہ بات جو انہوں نے کہی اور میں سنانے جا رہا ہوں وہ نہایت معقول ہے) کہ شہروں میں بسنے والے نناوے فیصد عوام کی زندگی کا نناوے فیصد حصہ بس کے انتظار کی نذر ہو جاتا ہے۔ کسی آوارہ گرد مفکر کا کہنا ہے کہ جو انتظار بالآخر انتقال کا باعث بنتا ہے، وہ یا تو معشوق کا انتظار ہے یا پھر کارپوریشن کی بس کا (واضح ہو کہ مذکورہ بالا مفکر موصوف یقیناً کوچۂ جاناں یا کسی بس اسٹاپ کی "روکا لی" پیداوار ہیں)۔ اگر ملک کی آبادی اسی طرح بڑھتی اور بسوں کی تعداد گھٹتی رہی تو وہ دن دور نہیں جب بس سے سفر کرنا، دنیا سے سفر کرنے کے برابر ہو جائے گا۔ گویا ایک اچھا بھلا آدمی کا بچہ جب بس میں سفر کرنے کے ارادے سے گھر سے نکلے گا تب اُس کے ہونٹوں پر یہ شعر اور آنکھوں میں آنسو ہوں گے کہ ؎

در و دیوار پہ حسرت سے نظر کرتے ہیں
خوش رہو اہلِ وطن ہم تو سفر کرتے ہیں

اوپر کارپوریشن کا اُڑتا اُڑتا ذکر آ چکا ہے۔ لہٰذا تفصیل میں جانے سے پہلے اتنا کہنے کی اجازت دیجئے کہ ؎ زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا"

ہر شہر میں بدحال شہریوں کی ہمہ اقسام کی پریشانیوں میں خاطر خواہ اضافے اور زندگی کے ہر شعبے میں بدنظمی کے حتی المکنہ فروغ کے لئے ایک عدد میونسپل کمیٹی تشکیل دی جاتی ہے جو بدقسمتی سے عوام ہی کے منتخب کردہ نمائندوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ کارپوریشن اس کمیٹی کا تخلص ہے اور بلدیہ عرفیت ——— جس شہر کے باسیوں کی تقدیر جس قدر "باسی" یعنی میلی ہوتی ہے اُتنے ہی زیادہ محکمہ جات اس کی تحویل میں ہوتے ہیں۔ خصوصاً ٹرانسپورٹ کے محکمے پر تو کارپوریشن کا دائمی حق ہوتا ہے۔ البتہ چند دیگر محکمہ جات اس کی تحویل میں ہوتے ہیں جیسے برقی، آب رسانی وغیرہ، ان سب پر بلدیہ کا غاصبانہ قبضہ ہوتا ہے۔

کہتے ہیں کارپوریشن کی بسوں، اور اگلے وقتوں کے "بتوں" (معشوق) میں بڑی حد تک مماثلت پائی جاتی ہے۔ مثلاً نہ ان میں بوئے وفا تھی نہ ان میں خوئے محبت ——— وہ وفا نا آشنا ستم گر، وعدہ تو فلاں جگہ، فلاں وقت ملنے کا کرتے لیکن یہ وضاحت نہیں کرتے کہ کس دن ——— کل، پرسوں، یا فلاں سال کے فلاں مہینے کی فلاں تاریخ کو فلاں جگہ، فلاں وقت ——— اور اُدھر بیچارہ عاشق ستم رسیدہ

شاعر بھی ———

بھی نہ ختم ہونے والے انتظار کی اذیت ناک گھڑیاں جو صدیوں سے کم نہیں ہوتی، دوچار ہونے کے باوجود "یا رشید" نہیں ہوتا مگر گھٹتا رہتا، اور بے آب کی طرح تڑپتا رہتا۔ اور اس کی یہ تڑپ دیکھ کر بعض بزرگ دل اصحاب اُس مالکِ حقیقی کے آگے گڑگڑانے لگتے کہ اسے اوپر والے ہی سے اس نیچے والے کی یہ تڑپ دیکھی نہیں جاتی۔ یا تو اس کی محبوبِ ستم شعار کو اوپر اٹھالے یا خود اس ناہنجار کو۔ بلکہ کچھ دل کڑا کرکے خود اُسے اُوپر اٹھانے کی کوشش کرتے لیکن مسیحِ نامراد کا دم بھر بھی نہیں نکلتا کیونکہ اُسے یہ یقین ہوتا تھا کہ اس کی قسمت میں وصالِ یار لکھا ہی نہیں ہے، اگر لکھا ہوتا تو خوشی سے خود نہ مرجاتا — آج ہم بھو ان جان لیوا کیفیات سے خصوصاً وہ طبقہ روزانہ گزرتا ہے، بس کا انتظار جس کی زندگی کا لازمی جزو بن چکا ہے —:

ایک اچھے بھلے شخص کے شعور و لاشعور بلکہ تحت الشعور کی تہوں کو تہہ و بالا کرنے میں اُس کے اپنے اہل و عیال کے علاوہ، اہلیانِ محلہ اور میونسپلٹی کے اربابِ مجاز بھی برابر کے ساجھے دار ہوتے ہیں اور کسی کی بھی زندگی پر اُن کے اس بے جا عمل و دخل کا ردِ عمل زندگی کے کسی نہ کسی حصے میں ضرور رونما ہوتا ہے۔ البتہ نتائج مختلف ہوتے ہیں کیونکہ بقول شاعر ؎

عشق کی چوٹ تو پڑتی ہے دلوں پر یکساں
ظرف کے فرق سے آواز بدل جاتی ہے

کاہلیشن کی بھر بانیاں ایسے اصحاب کو بڑی آسانی سے شاعر بنا دیتی ہیں جن کی دماغی حالت مشکوک ہوتی ہے، یعنی جن کا معاشی قافیہ تنگ اور دماغ بحر سے خارج ہوتا ہے۔ بس کے انتظار کے دوران سُنا ہے ان بے بحرے شاعروں کی رگِ شاعری اس قدر پھڑکتی ہے کہ نتیجتاً دو غزلیں (بحری)، تین نظمیں (بے بحری) اور چار قطعات (بے وزن) فی منٹ کے حساب سے کثرت کے بھاؤ شعروں کا نزول ہوتا ہے۔ ایسے ہی ایک "اوکالی شاعر" کا برجستہ شعر پیش ہے ؎

اس انتظار میں کاٹی ہے زندگی اے دوست
وہ آنے والے ہیں آتے ہیں آئے جاتے ہیں

ایک مرتبہ پہلے ایک مشرع نمنگ بارِیش کو بس اسٹاپ پر گیت گنگناتے سُنا ہے — "آ انتظار ہے تیرا دل بےقرار ہے میرا" اور جب ایک عدد بس کچھ دھندلے میں بندی دور سے آتی ہوئی دکھائی دی تو مارے خوشی کے وہ سسکی کے انداز میں بہ آوازِ بلند گانے لگے ؎

تم آگئی، تو آگئی، تو آگئی ——— لیکن جب بستی خوب تیس سیٹ بس اسٹاپ پر کھڑے ہوئے مسافروں کی بے بسی پر مسکراتی ہوئی آگے بڑھ گئی تو انتظار کی دُھن بجانے کے لئے چھوڑ کر کچھ یوں لاتعلقی ہوتی ہوئی نکل گئی —

میں چلی میں چلی پیچھے پیچھے جہاں، یہ نہ پوچھو کدھر یہ نہ پوچھو کہاں!

تو وہ بزرگ حسرت و ملال کی اداس تصویر بنے یہ اثر انگیز گیت گنگنا اُٹھے ؎ آئے بھی وہ گئے بھی وہ ختم فسانہ ہوگیا۔ اکثر یوں بھی ہوتا ہے کہ بس کے دندناتے ہوئے نظروں کے سامنے سے گزر جانے کے باوجود کئی آنکھوں کو یہ یقین ہی نہیں آتا کہ ابھی ابھی جو بس ہوا کی "تیز صُورتی" برق رفتاری کے ساتھ آنکھوں میں دھول جھونکتی ہوئی گزری ہے وہ واقعی بس تھی بلکہ یوں لگتا ہے جیسے ؎

خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سُنا افسانہ تھا

چنانچہ ؎ انتظار اور ابھی اور ابھی، پھر سے شروع ہوجاتا ہے۔ اور ہر شخص اس شعر کی جیتی جاگتی تفسیر بن جاتا ہے ؎

اس انتظار کی آخر کوئی تو حد ہوگی
وہ آکے جا بھی چکے انتظار باقی ہے

برخلاف اس کے کچھ ایسے "انتظار باز" بھی ہوتے ہیں جن کا انتظار اتنی شدت اختیار کرجاتا ہے کہ اُنہیں ہر حرکت کرنے والی شے پر بس کا دھوکہ ہوتا ہے، چنانچہ اپنے اس گمان کو یقین میں بدلنے کے لیے "سراپا انتظار" بنے اپنے اطراف کے لوگوں کا ناطقہ تنگ کرتے ہیں — کسی مخصوص سمت میں اشارہ کرکے پوچھتے ہیں "وہ جو دھندلا سا ہیولیٰ اس طرف آتا دکھائی دے رہا ہے غالباً بس ہے؟" جواب ملتا ہے — "جی نہیں، وہ بس نہیں، بیل گاڑی ہے جو آ نہیں رہی ہے بلکہ جا رہی ہے" — لہجے کی جھلاہٹ محسوس کرکے اگلی مرتبہ کسی اور کو مخاطب کیا جاتا ہے — "وہ جو سڑک کے کنارے جھاڑ کے پیچھے کچھ رنگین لہریں نظر آرہی ہیں، شاید وہ بس ہے؟" جواب ملتا ہے — "جی نہیں، وہ بس نہیں لڑکیوں کی ٹولی ہے جو غالباً کالج یا دفتر جا رہی ہیں"۔

ایک مرتبہ بس اسٹاپ پر یہ بھی تماشہ ہوا کہ ایک نوجوان انتظار کی کوفت سے جھنجھلا کر بڑبڑانے لگا۔ صبح سے شام ہوگئی اور کم بخت بس کا کوئی اتہ پتہ نہیں وغیرہ وغیرہ ...... یہ سن کر پاس کھڑے ایک بزرگ کچھ اس طرح تسلی دینے لگے جیسے "صبر کرو بیٹا صبر سے سب کچھ ملتا ہے" فرمایا —

میاں صاحبزادے! اتنے برسوں میں اوسان خطا ہو گئے، مجھے دیکھو جس وقت یہاں آیا تھا تمہاری طرح جوان تھا اور اب ......" انہوں نے بات اُدھوری چھوڑ دی اور بے شمار ٹھنڈی گرم آہیں بھرنے کے بعد مزید بولے ــــ "کسی شاعر نے کیا خوب کہی ہے کہ یہی تو وہ انتظار ہے جس میں ــــ

صبح ہوتی ہے شام ہوتی ہے عمر یوں ہی تمام ہوتی ہے

وہ تو غنیمت کہ اس وقت وہاں کوئی اور عمر رسیدہ بلکہ قبر رسیدہ پیر تسمہ ظریف موجود نہیں تھے ورنہ یہ لقمہ ضرور دیتے کہ قبلہ! آپ تو جوانی میں یہاں آئے تھے اور بوڑھے ہوگئے، ناچیز کو دیکھئے یہیں پیدا ہوا ہے ــــ"

کارپوریشن کی بس دراصل منجدھار میں پھنسی کشتی سے کم نہیں جس کا محافظ خدا نہیں بلکہ ناخدا ہوتا ہے، اور بس میں سوار مسافر کشتی کے مسافروں سے زیادہ قابلِ رحم ہوتے ہیں کہ کشتی میں صرف ایک ہی ناخدا کا راج ہوتا ہے جبکہ بس میں دو عدد ناخدا اپنی اپنی خدائی میں مگن ہوتے ہیں، یعنی ایک نہ شُد دو شُد۔ ان ناخداؤں کی مشترکہ کوشش یہ ہوتی ہے کہ کم سے کم مسافروں کو "جنتِ شدّاد" یعنی بس میں سوار ہونے کا موقع دیا جائے۔ یہ ناخدا چونکہ ملّاح نہیں بلکہ مُلّا ہوتے ہیں۔ اس لئے ان کے بیچ جنتا ہمیشہ مرغی کی طرح مُردار ہوتی ہے ... عام طور سے ایک ناخدا کنڈکٹر اور دوسرا ڈرائیور تخلص فرماتا ہے۔ ڈرائیور کا کام بس کو دوڑانا ہوتا ہے اور کنڈکٹر کا کام واہ واہ کرنا یعنی بس کو مزید اسپیڈ سے دوڑانے کے لئے ڈرائیور کو اُکسانا ــــ ان حضرات کی وردی چونکہ خاکی ہوتی ہے اسلئے بجائے بس مسافروں پر خاک بلکہ 'مشتِ خاک' اُڑاتے ہوئے گزر جانا یہ اپنا فرضِ منصبی سمجھتے ہیں ــــ کنڈکٹر صاحب کو کسی بھی ناپسندیدہ یا ناخواندہ مسافر کو کہیں بھی زبردستی اُتار دینے کا دستوری حق حاصل ہوتا ہے ــــ اپنے اس حق کا استعمال وہ عموماً گھنٹی بجا کر کرتا ہے، گویا گھنٹی بجا کر وہ ڈرائیور کو بھی اپنے اس جرم میں برابر کا شریک کر لیتا ہے۔

کارپوریشن کی بسوں کے رنگ ڈھنگ اور ساخت و ہیئت میں چونکہ سرِ مو فرق نہیں ہوتا۔ اسلئے ہر روٹ کا بس کا مخصوص نمبر ہوتا ہے۔ گویا بس نمبری ہوتی ہے (اور نمبری چیزوں سے تو سارا سماج پناہ مانگتا ہے)۔ بسوں کی اس یکسانیت کے پیچھے کارپوریشن کے اربابِ مجاز کی دراصل یہ سازش ہوتی ہے کہ کوئی بھی مسافر شہر بھر میں دھکے کھائے اور چکرائے بغیر اپنے مقامِ مطلوبہ تک نہ پہنچ سکے ــــ کارپوریشن کی بسیں بولا تھی خصوصی اوصافِ حمیدہ کی حامل ہوتی ہیں لیکن نمایاں خصوصیت ملاحظہ فرمایئے عموماً جس نمبر کی بس کا شدت سے انتظار ہوتا ہے، وہ اچانک راستہ بھول جاتی ہے اور پھر تھک ہار کر کسی دوسرے روٹ والی بس میں جانے کا ارادہ کرتے ہیں وہ بس جو اس ارادے سے پہلے تک ہر دس منٹ کے وقفے سے پابندی کیساتھ آتی رہتی ہے، یوں غائب ہو جاتی ہے، جیسے ترقی یافتہ سوسائٹی کی ہوا لگنے پر عورت کی آنکھوں سے حیا اور مرد کے دل سے وفا ــــ!

عوام الناس کے سینے پر دُہری مونگ دلنے کے لئے بعض "روٹس" پر "ڈبل ڈیکرس" چلائی جاتی ہیں۔ "سنگل ڈیک" اور "ڈبل ڈیک" کے بارے میں کسی نے خوب کہا ہے کہ ایک کریلا ہے تو دوسری نیم چڑھا۔ ڈبل ڈیک کی اُوپری منزل پر بیٹھنے والے عموماً وہ حضرات ہوتے ہیں جن کی "ہوبی" (HOBBY) بس میں بیٹھے بیٹھے دوسروں کے گھروں میں جھانکنا ہوتی ہے، یا پھر ایسے لوگ جو دوسروں کے سروں پر سوار ہونے کی شدید، بلکہ "شدّاد" قسم کی خواہش کے اسیر ہوتے ہیں۔ ڈبل ڈیکر کی اُوپری منزل پر بیٹھ کر ان کی اس خواہش کی کسی حد تک تکمیل ہو جاتی ہے۔

جس جگہ پریشان حال لوگوں کا جمِ غفیر نظر آئے تو جان لیجئے کہ وہ یا تو کوئی بس اسٹاپ ہے یا ایمپلائمنٹ ایکسچینج عرف "دفترِ روزگار" ــــ ہر درمیانی بس اسٹاپ کی یہ خصوصیت ہوتی ہے کہ وہاں شاذ ہی کوئی بس ٹھہرتی ہے، اسلئے پریشان حال مسافروں کی سہولت و آرام کے پیشِ نظر، اکثر اسٹاپ چھجے دار اور سیمنٹ کی پکّی بنچوں سے آراستہ و پیراستہ تعمیر کئے جاتے ہیں تاکہ کوفت، جھلاہٹ اور اُکتاہٹ کی سیخوں سے مثلِ کباب چھدے، انتظار کی دہکتی آنچ پر تپتے ہوئے مسافر، اس شعر کی جیتی جاگتی تفسیر نظر آسکیں ــــ

کباب سیخ ہیں ہم کروٹیں ہر سُو بدلتے ہیں
جو جل اُٹھتا ہے یہ پہلو تو وہ پہلو بدلتے ہیں

معروف ترین روٹس کی بسیں عموماً دو ہی اسٹاپ پر ٹھہرتی ہیں ایک تو وہ اسٹاپ جہاں سے بس بھر کر روانہ ہوتی ہیں اور دوسرے وہ اسٹاپ جہاں پہنچ کر بس مکمّل خالی ہو جاتی ہے۔ درمیانی اسٹاپس پر ایسی بسیں چونکہ ٹھہرتی نہیں اس لئے مسافروں کی اکثریت اسٹاپ کے بجائے قریبی سگنلوں اور گنجان چوراہوں کے اردگرد نظر آتی ہے تاکہ بس کی رفتار سست ہوتے ہی قسمت آزمائی کی جا سکے۔ اس مہم میں عموماً مضبوط ہاتھ پاؤں والے افراد ہی کامیاب ہوتے ہیں۔ ویسے چلتی بسوں میں چڑھنے

کے لئے کافی تجربے اور مشق کی ضرورت ہے۔ جو لوگ عموماً اِس مُہم کو سر کرنے نکلتے ہیں وہ اپنے متعلقین سے "بولا چالا" معاف کروانا نہیں بھولتے۔ سُنا ہے اِن میں اکثریت اُن اصحاب کی ہوتی ہے جو اپنی ازدواجی زندگی سے مایوس اور بیزار ہوتے ہیں۔ درمیانی اسٹاپس پر مقدر آزمانے والے مسافروں کے تعلق سے ارباب مجاز کا کہنا ہے یہ خیال ہے کہ یہ حضرات صرف طالبِ دیدارِ بس ہوتے ہیں یا پھر بغرض تفریح جمع ہوتے ہیں یعنی صرف ہواخوری کی غرض سے یہاں چلے آتے ہیں۔

بس اسٹاپ چاہے "ایں قدر" ہو یا "آں قدر" یعنی چھوٹا ہو یا بڑا اس کے اطراف عجیب گہما گہمی نظر آتی ہے، جو بس کے آتے ہی افراتفری میں بدل جاتی ہے۔ ویسے اِن ہنگاموں میں بھی بقول شاعر ایک سلیقہ نظر آتا ہے مگر صرف دو موقعوں پر ؎ اک ترے آنے سے پہلے، اِک ترے جانے کے بعد.....

کوئی سیاسی مسئلہ ایسا نہیں جو بس اسٹاپ پر نہ حل ہو سکے، چاہے وہ قومی سطح کا ہو، بین الاقوامی سطح کا، یا کسی بھی سطح مرتفع کا ہو۔ اگر نظریں سینکنا اور دِل بھینکنا ہو تو دیوانہ وار بس اسٹاپ کا رُخ کیجئے، یوں محسوس ہوگا جیسے طرح طرح کے فیشن پریڈ اور مقابلۂ حُسن کے ہنگامے آپکی تفریح طبع، بلکہ تفریح تباہ" کے لئے منعقد کئے گئے ہوں ___ قصہ مختصر یہ کہ بس اسٹاپ ہی وہ واحد "رنگ منچ" بالفاظِ دیگر کُھلا اسٹیج ہے، جہاں جہاں بھانت بھانت کے نورنگی ڈرامے بالکل مفت پیش کئے جاتے ہیں۔ اِس کے علاوہ سڑے گلے پھلوں کے رُوپ میں بیماریاں تقسیم کرنے والے خوانچہ فروشوں، بھیک منگوں اور پرائے مال پر دیدے لال کرنے والے گرہ کٹوں کی کفالت بھی بس اسٹاپ ہی کرتا ہے۔

___ بھولے سے کوئی بھولی بھٹکی بس کسی درمیانی اسٹاپ پر آکر رکتی بھی ہے تو اس میں سوار ہونے کے لئے فری اسٹائل کشتیوں بلکہ "جوڈو" جیسے ہڈی پسلی توڑ فن سے واقفیت ضروری ہے، ورنہ اچھی خاصی بتیسی کے اپنے اصلی مقام یعنی دہنِ مبارک سے صحنِ مبارک صرف فٹ پاتھ تک پہنچنے میں دیر نہیں لگتی، گویا بس ایک ایسی بھینس ہے جس پر وہی سوار ہو سکتا ہے جسکے ہاتھ میں لاٹھی ہو ___ سچ ہے جسکی لاٹھی اُس کی بس ___

بسوں میں مسافروں کی برآمد و درآمد کے سلسلۂ لامتناہی کو پُرامن طریقے پر جاری وساری رکھنے کے لئے عموماً دو دروازوں کی گنجائش رکھی جاتی ہے۔ لیکن مسافروں کے مابین عام غلط فہمی یہ ہوتی ہے کہ اُترنے والے مسافر یہ سمجھتے ہیں کہ دونوں دروازے صرف اُترنے کے لئے ہیں۔ جبکہ سوار ہونے والے مسافر پوری قوت کے ساتھ یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ دونوں دروازے شاعر بھی ___

صرف سوار ہونے کے لئے ہیں۔ اور چونکہ سوار ہونے والے مسافروں کا جوش و خروش کچھ زیادہ ہی ہوتا ہے، اس لئے بعض مضبوط ہاتھ پاؤں والے مسافر دروازوں کے علاوہ کھڑکیوں کے ذریعہ بھی بس میں داخل ہونے میں کامیاب ہو جاتے ہیں ___ ایسا عموماً معروف ترین رُوٹس والی بسوں میں ہوتا ہے، ایسی بسوں میں سوار ہونا تو خیر کمال ہے ہی، لیکن اپنے مطلوبہ اسٹاپ پر اُترنا اس سے بھی بڑا کمال ہے کیونکہ ایسی بسوں میں سوار ہونے کے بعد اِس بات کی ضمانت نہیں دی جا سکتی کہ آپ اپنے مطلوبہ اسٹاپ پر اُتر بھی سکیں گے اور اگر حادثتاً اُتر بھی گئے تو اِس بات کی کوئی گارنٹی نہیں کہ آپکے "اعضائے رئیسہ و غریبہ" اپنے اپنے صحیح مقام پر وہ بھی اصلی حالت میں ہوں ___ !

جن رُوٹس، پر کارپوریشن کی بسیں نہیں چلتیں اُن پر "پرائیوٹ سَروِس" والے قبضہ جمالیتے ہیں۔ کارپوریشن کی بس اور پرائیوٹ بس میں وہی فرق ہوتا ہے جو تانگے کے ٹٹو اور دھوبی کے گدھے میں ہوتا ہے۔ بس چاہے کارپوریشن کی ہو یا پرائیوٹ، عموماً ردیف اور قافیے کی پابند ہوتی ہے۔ یعنی ہر بس کا ایک مخصوص رُوٹ ہوتا ہے۔ لیکن یہ ضروری نہیں کہ ہر بس اپنے مخصوص رُوٹ کی پابند بھی ہو، چنانچہ شہر حیدرآباد فرخندہ بُنیاد کا ذکر ہے کہ کچھ عرصہ پہلے کارپوریشن کی ایک بس معمولاً مخصوص روٹ پر چلتے چلتے اس قدر بور ہو گئی کہ مُنھ کا مزہ بدلنے کیلئے کسی سمت ہاتھی کی طرح جھومتی ہوئی ایک گھر کی چار دیواری کو توڑ کر بیکاری ہوئی مکان کے اندر گھس گئی کہ ؎ اونچی اونچی دنیا کی دیواریں ساری توڑکے میں آئی ہوں تیرے لئے اپنا رُوٹ چھوڑ کے

گھر کے آنگن میں ایک صحیح و سالم بس کو دیکھ کر مکینوں کا کیا حال ہوا ہوگا، اِس کا اندازہ وہی لگا سکتے ہیں جن پر اس قسم کی اُفتاد پڑ چکی ہو۔ ___ اگر کارپوریشن کی یہ بے راہ رَو بس دیوار توڑ کر ہمارے گھر میں گھس آتی تو ہم کھلے دِل سے اس کا استقبال کرتے اور چچا غالب کا یہ شعر ذرا سے اضافہ کیساتھ کچھ یوں پڑھتے ؎

وہ آئیں گھر میں ہمارے (دیوار توڑ کے)، خدا کی قدرت ہے
کبھی ہم اُن کو (مسافروں سمیت)، کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

سُنا ہے ہزاروں کی تعداد میں شائقین، جوق در جوق، دور دور سے دوڑ دوڑ کر اس نصیب زدہ بس کو دیکھنے کے لئے مقام واردات پر پہنچ گئے۔ اور ہر ندا ہے، ہر پہلو سے اس بس کا معائنہ کرنے لگے جیسے

باقی صفحہ ۲۳ پر دیکھئے

چاندی کے تار

شارق ادیبؔ
۱۲۰ حبیب ہال۔ علیگڑھ مسلم یونیورسٹی۔ علیگڑھ

رات کی سیاہ چادر موٹی اور دبیز ہو گئی تھی۔ چاند کا پھیلا ہوا مٹمٹاتا آنچل بھی اس کی تاریکی کو چھپانے میں ناکام تھا۔ حویلی پر نمازیوں سے محروم کسی مسجد کی سی ویرانی مسلط تھی۔ شیخ عبدالقادر کروٹیں بدلتے پوری رات گزار چکے تھے۔ وہ تھکن آلود بستر سے اُٹھ کر کئی بار ٹہلے بھی تھے۔ سرہانے رکھی صراحی سے کئی بار پانی بھی پیا تھا۔ مگر دل تھا کہ اسے کسی پہلو قرار نہ آتا تھا۔ ان کے دل کی دھڑکن اس طرح تو جب بھی تیز نہ ہوئی تھی جب انہوں نے پہلی بار اپنے چہیتے مرغ رستم کو پالی میں اُتارا تھا۔ نہ اس وقت جبکہ انہوں نے ہزاروں روپے ریس کورس میں داؤ پر لگا دیئے تھے۔ مگر آج تو بات ہی کچھ عجیب تھی۔

شیخ عبدالقادر کا شمار قصبے کے ہی نہیں ضلع کے متموّل ترین رؤسا میں ہوتا تھا۔ گو زمینداری رخصت ہو چکی تھی مگر اب بھی خدا کا دیا اتنا تھا کہ پُرسے کروفر اور جاہ و حشمت کے ساتھ گزر ہوتی تھی۔ بڑے شیخ کی موت کے بعد جب اُن کو بے اندازہ دولت، وسیع و عریض علاقہ اور ہزاروں کی رعیت ہاتھ لگی تو شیخ جی کھل کھیلے، مرغ بازی، بٹیر بازی، پتنگ بازی، غرض کوئی بازی اُن کے دامنِ شوق سے باہر نہ رہی۔ صوبے بھر کی کوئی نامی گرامی طوائف ایسی نہ تھی جو شیخ جی کے دربار سے فیضیاب نہ ہوئی ہو، کسی کو نوکر رکھا، کسی کے ایک مُجرے کی قیمت ہزاروں روپے ادا کی اور کسی کی طرف نغمہ اترائی پر سونے چاندی کا ڈھیر لُٹا دیا۔ اور گھنگھروؤں کی جھنکار سے دیوان خانہ گونجتا رہا۔ جوانی جہنوں رہی جب نظر سے اُتر گئی تو گھنگھرو نئے پیروں میں باندھ دیئے گئے۔

تعلقہ ختم ہوا تو نوکروں کی فوج، بیگموں کی بھیڑ، گھوڑوں ہاتھیوں کا لشکا دھتوں کا قافلہ، غرض سارے طمطراق نے جھک کر فرشی سلام کئے بغیر ہی رخصت طلب کر لی۔ آدمی وقت شناس تھے۔ بزرگوں کی روایات توڑ کر باغات کی فصل فروخت کرنی شروع کی۔ سیر کی زمین کا جائزہ لیا۔ اصطبل کو تڑوا کر جگہ سائیکل بنوا دیا۔ اور تعلقہ دار سے زمیندار بن گئے۔ سرکاری کاغذات میں ان کا شمار بھی ـــــــ

امدان ضلع کے سب سے بڑے کاشتکار کی حیثیت سے ہونے لگا۔ مگر عملاً پورے علاقے میں اب بھی شیخ جی کے نام کا سکہ چلتا تھا۔ اور چھوٹے موٹے تنازعے اسی طرح انکی ڈیوڑھی میں طے ہوتے تھے۔ صبح اُٹھ کر دیوان خانے میں آتے، منشیوں اور نمبرداروں سے سرداری کرتے، اخبار پڑھ کر سرکار کو متعلقات سُناتے اور پھر ان کے پہلے کش کے ساتھ شطرنج کی بساط بچھ جاتی۔ جب کھیلنے بیٹھتے تو صبح شام اور گھڑی گھنٹے سے بے نیاز ہو کر بیٹھتے۔ رات گئے حویلی کے اندر جاتے تو بیگم منتظر ہوتیں۔ بیگم جو حویلی میں بی بی صاحب کہلاتی تھیں ایک مشرقی شوہر پرست بیوی تھیں۔ اپنے ہاتھ سے کھانا کھلاتیں اور ساتھ ہی شکوے شکایات کا دفتر کھول دیتیں۔ سب سے بڑا اور مستقل شکوہ عطیہ کی شادی کا تھا۔ عطیہ جو شیخ جی کی اکلوتی بیٹی تھی، جس نے تیس بہاریں دیکھتے ہوئے جنم پاکر لئے تھے اور اب پختگی کی اُس منزل کو چھو رہی تھی جب لڑکیاں شادی کے بغیر عورت بن جاتی ہیں۔

"میں کہتی ہوں کوئی اچھا سا بَر دیکھ کر بیٹی کے ہاتھ پیلے کر دو۔ سال دو برس اور بیت گئے تو لڑکا ملنا مشکل ہو گا۔ بیچاری گھر بیٹھے بوڑھی ہوئی جا رہی ہے۔" بی بی صاحب کہتیں۔ شیخ جی کھانا کھاتے جاتے اور سُنتے رہتے کبھی کبھی بس اتنا کہتے: "بیگم تم تو یونہی گھُلی جاتی ہو۔ یہ بھی کوئی مسئلہ ہے۔ جب چاہیں گے کر دیں گے۔ کیا آپا بی کی شادی نہ ہوئی تھی، وہ بھی تو چھبیس برس کی تھیں؟"

شیخ جی سکون سے کھانا ختم کرتے اور اپنے چھپرکھٹ سے آنگن میں چلے آتے جہاں ان کا بستر سلیقے سے لگا ہوتا۔ وہ لیٹ کر دن بھر کی تکان اُتارتے اور پھر نئے دن کا سورج اپنی بندھی ٹکی مصروفیت کے ساتھ نمودار ہوتا۔

یہ بات نہ تھی کہ شیخ جی اپنی بیٹی کی شادی کرنا نہ چاہتے تھے۔ اب بھی اتنا تھا کہ ایک شاہانہ کی دیر تھی، سب سامان دو گھڑی میں ہو سکتا تھا۔ کچھ رشتے آئے تھے مگر اس طرف کبھی دھیان ہی نہ گیا۔ مقدمہ بازی اور شطرنج سے فرصت

لیتی تو اس طرف دیکھتی بھی نہ تھیں۔ ایک رشتہ دار کا بیٹا کالج سے آیا تھا۔ [illegible]
جائداد کا وارث تھا اور کبھی [illegible]

آج شام کو شیخ صاحب سے گھر پر آئے تو بیوی مصروف تھیں [illegible]
دبا کر شاید بہت دیر سے سوچ کے بیٹھی تھیں کہ [illegible] نے انتظار
کر رہی تھی۔ انہوں نے [illegible] دسترخوان پر ہاتھ دھوئے
اور دسترخوان پر بیٹھ گئے۔ انہوں نے سر جھکائے ہوئے کہا "عطیہ کہاں ہے"
"بیٹا تم کھانا کھا لو، وہ کسی ملازمہ سے کہہ رہی تھی"۔ عطیہ خاموش رہی۔
انہوں نے نگاہ اٹھا کر دیکھا۔ جیسے فرزانہ کے سادہ لباس میں وہ سراپا مجسمہ
تھی۔ سر سے دوپٹہ ذرا سا سرک گیا تھا۔ بالوں کے بالوں پر پڑ گئی۔ ملک کی طرح
جیسے رک سی گئی۔ عطیہ شعر جیسا نظر آ رہا تھا چمک رہے تھے۔ انہیں ایسا لگا جیسے
شاید نرم شعر کیا ہو اور شاید پڑے ہوئے ہی والی ہو۔ انہوں نے ہاتھ کا نوالہ سینی میں رکھا
اور تولیے سے ہاتھ پونچھتے ہوئے اٹھ گئے۔

بستر پر آ کر لیٹے مگر نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ اکلوتی بیٹی کے
سر پر جانے کی کھیتی پھولی رہی اور وہ گیہوں اور گنے کی فصلیں اگا کر سنا ہولتے
رہے۔ خدا خیر کرے، گھر میں جوان جوان نوکر ہیں۔ کل کلاں کچھ ہو گیا تو وہ کیسے
منہ دکھائیں گے۔

وہ دیر تک باغوں میں چھپتے اور نکلتے چاند کو تکا کیے پھر جانے کب نیند نے
ان کے تھکے ہوئے مگر مضبوط جسم کو دبوچ لیا۔

ہلکی ہلکی بھنبھناہٹ سے ان کی آنکھ کھل گئی۔ کوئی سرگوشیوں میں باتیں
کر رہا تھا۔ انہوں نے محسوس کیا کہ آواز ڈیوڑھی سے آ رہی ہے۔ عطیہ کی دبی دبی آواز
انہوں نے صاف پہچانی۔ مگر دوسری مردانہ آواز کس کی تھی ــــ شاید مجید کی، ابھی تو
ان کا نوجوان نوکر تھا۔

انہوں نے [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

تھا۔ وہ تیس دن سے میں جاگ رہی تھی۔ آخر کب تک اس کے اندر کی نسائیت کو
بند رکھتے۔ رات آوازیں آنا بند ہو گئیں۔ مگر ڈیوڑھی کا دروازہ بند ہو گیا
آہستہ بند ہوا تھا۔ ڈیوڑھی کے بھاری کواڑ ہلکی سی آواز سے کھلتے بند ہوتے
تھے۔ ایسی آواز جیسے سوتے آدمی کی نیند تو نہ کھلتی تھی مگر جاگتے میں سنائی
ضرور دیتی تھی۔ تو کیا عطیہ باہر چلی گئی؟ عطیہ ان کی اکلوتی بیٹی ان کی جائیداد
کی تنہا وارث۔ مگر دروازے پر ان کا بوڑھا نوکر رحیمو سوتا ہے لیکن اس کا
کیا بھروسہ۔ افیم کی پینک میں پڑا اونگھ رہا ہوگا۔

اچانک آوازیں پھر آنے لگیں۔ اب ان کے اندر کا زمیندار جاگ
اٹھا۔ ایسے کبھی گئے گزرے نہیں، ایک کارتوس کافی ہے۔ انہوں نے ٹارچ
سنبھالی اور ایک ہی جست میں ڈیوڑھی کے اندر تھے ــــ مگر یہ کیا، تین بیل
کی ٹارچ کی بھرپور روشنی کا ہالہ کواڑوں پر پڑ رہا تھا۔ تینوں کنڈیاں لگی ہوئی
تھیں ــــ وہ سب کچھ سمجھ گئے۔ سیدھے اندر گئے۔ چوڑے آنگن میں
ایک کونے میں بیگم سوئی ہوئی تھیں۔ دوسری طرف کھٹولے پر کوئی خادمہ بے سدھ
پڑی تھی۔ بیچ میں عطیہ کا بستر تھا۔ اس کا چہرہ مدھم چاندنی میں چمک رہا تھا۔
بشرے کو رنگ کے آثار نمایاں تھے۔ اس نے گرمی کے مارے چادر اتار پھینکی تھی۔
وہ بیٹی کے پلنگ کی پٹی کے پاس بیٹھ گئے۔ اور دھیرے دھیرے اس کے
سر پر ہاتھ پھیرنے لگے، مگر احتیاط سے مبادا اس کی آنکھ کھل جائے۔ آج انہیں
پہلی بار احساس ہوا کہ اب وہ بوڑھے ہو چکے تھے اور ان کا جسم بوجھ سے
دبا جا رہا تھا۔ عطیہ نے کروٹ بدلی۔ انہوں نے آہستہ سے اپنا ہاتھ کھینچا اور اپنے
آنگن میں چلے آئے۔

جانے کب تک ستاروں کو آنکھ مچولی دیکھتے رہے مگر نیند تو آج نہ جانے
کہاں بسیرا کر رہی تھی ــــ کہیں یہ سب سچ ہوتا تو ــــ؟ مجید کہیں مر نہ گئے
[illegible] انہوں نے فیصلہ کر لیا کہ صبح کو سب سے پہلا کام یہ
کریں گے کہ [illegible] رشتہ طے ہے۔ جب کہ [illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

میں تھا۔ منشی جی اُلٹے پاؤں لوٹے تو بھی کل سے پہلے نہ آسکتے تھے۔ پتہ نہیں کیا جواب آئے گا۔ کہیں وہ لوگ رشتہ نامنظور نہ کردیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ پیغام انہیں لوگوں نے دیا ہے، مگر آج کل کے لڑکوں کا کیا اعتبار۔ یہ بھی درست ہے کہ وہ بیٹی کو دولت کے انبار اور لمبے جوڑے جہیز کے ساتھ رخصت کریں گے اور اُن کے بعد جائیداد کی مالک بھی وہی ہوگی۔ مگر لڑکے والے بھی ٹکر کے رئیس تھے۔ اور لڑکا آئی اے ایس تھا۔ اعلیٰ افسر تھا۔ اور پھر چاندی کے تار ــــ ان کا کیا علاج ہوگا؟

دن بھر اُن کا دماغ انہیں الجھنوں میں الجھا رہا۔ کئی بار اندر گئے۔ اندر بی بی صاحبہ کے انتظامات کو بچشم خود دیکھا۔

بی بی صاحبہ اس خبر سے بے حد خوش تھیں اور اپنے گزی پائنچے سنبھالے ادھر سے اُدھر آجا رہی تھیں۔ سُنار، بزاز، درزی سب کو ایک ساتھ طلب کر لیا گیا تھا۔ ساری نوکرانیاں چاق و چوبند نظر آرہی تھیں۔ حویلی میں ایسی ہلچل مچی ہوئی تھی جیسے برات دروازہ پر آگئی ہو۔

دھیرے دھیرے دھوپ منڈیروں سے اُتر کر زمین پر آئی اور سرکتے سرکتے مغربی گوشے میں غائب ہوگئی۔ اندھیرے کے کالے میں ستارے سجائے رات حویلی میں اُتر آئی۔

سب کاموں سے فارغ ہوکر شیخ جی اپنے بستر پر آگئے۔ لیٹ کر پھر خیالات کے تانے بانے جوڑنے میں مصروف ہوگئے۔ جیسے کوئی دہقان بار بار پوٹلی کھول کر روپے شمار کرتا ہو اور ہر بار کم یا زیادہ ہوجاتے ہوں بیٹھے بیٹھے، ٹہلتے ٹہلتے وہ صُراحی آدھے سے زیادہ خالی کر چکے تھے۔ بستر یوں ہی بے داغ اور بے شکن پڑا تھا۔ رات دھیرے دھیرے اپنا آنچل سمیٹتی رہی ــــ پھر انکے خیالات کے دھارے نے رُخ بدلا۔ وہ سوچنے لگے کہ شیخ عبدالقادر کی بیٹی اور شیخ عبدالقدوس کی پوتی کا رشتہ ٹھکرا دینا ہنسی کھیل نہیں۔ لڑکا لاکھ سرکاری افسر ہے مگر ان کی زمین اور باغات میلوں کے رقبے میں تھے۔ اور یہ سب ہونے والے داماد کے تصرّف میں جانے والے تھے۔ پھر سُنا تھا کہ صاحبزادے بھی خیر سے چالیس کے پیٹے میں ہیں اور کنپٹیوں کے بال پکنے لگے ہیں ــــ اور اگر انکار کر بھی دیں تو ایک کمال پھر کیا، دس کمال پڑے ہیں۔ شیخ برادری میں کال تو نہیں پڑ گیا۔ اُنہیں لگا جیسے چاند نے بادل کی اوٹ سے جھانکا ہو اور ان کی طرف مسکرا کر دیکھا ہو۔

پھر پتہ نہیں کب اُن کی آنکھ لگ گئی۔

چڑیوں کی چہچہاہٹ کے ہلکے ہلکے سہانے شور سے اُنکی آنکھ کھل تو انہوں نے دیکھا کہ حویلی کی دیوار سے دوسری طرف بائیں باغ میں درختوں کے جھنڈ کے اس پار آسمان پر صبح صادق کی مقدس سپید روشنی پھیل رہی تھی اور دور کسی مسجد سے اذان کی ہلکی ہلکی آواز آرہی تھی۔

شاعر۔ بمبئی ـــــ

○○

بقیہ :- اسلوب کیا ہے؟ صفحہ ۱۳

لہجے کی کھنک اور کھٹک، اس کی لچک، اُتار چڑھاؤ، بہاؤ اور معنی کے پس منظر میں اس کی اثر انگیزیوں کا مطالعہ، اسلوب کے مطالعے میں نئی راہیں کھول سکتا ہے۔ اس قسم کے تجربے ادبی نثر پر بھی کئے جا سکتے ہیں۔ اس سمت میں ڈاکٹر سید عبداللہ، وقار عظیم، عبدالرحمٰن بجنوری اور کلیم الدین احمد کی کوششیں ابتدائی نوعیت کی ہونے کے باوجود نظر انداز نہیں کی جا سکتیں۔ نثری اسالیب کے مطالعے کے سلسلے میں لے دیکر محی الدین زور کی ایک مُستقل تصنیف "اُردو کے اسالیب بیان" ہے جو اس موضوع پر مزید غور و فکر کے لئے ایک عرصے سے اہلِ نظر کو بلا رہی ہے۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے ڈاکٹر ذاکر حسین کے نثری اسلوب کا جو لسانیاتی تجزیہ کیا ہے وہ لائق تعریف ہے۔ ڈاکٹر مسعود حسین خان اور ڈاکٹر مغنی تبسم نے اُردو شعر کے صوتی مطالعے سے بڑے کامیاب تجربے کئے ہیں۔ اگرچہ صوت و معنی کا باہمی رشتہ ابھی تک تخمین و ظن کا باب ہے۔ لیکن اس طرز تنقید کے مستقبل کو اُمید افزا کہا جا سکتا ہے۔ البتہ اس قسم کا مطالعہ اسلوب کے صرف ایک ہی پہلو پر سے نقاب اُٹھا سکتا ہے۔ حالانکہ اس کے اور بھی کئی پہلو ہیں۔ مثلاً زیر نظر اسلوب کا موضوع، مواد کی نوعیت اور ترتیب، صاحبِ اسلوب کے عہد کی ادبی روایات اور ان روایات کو باغیانہ طور پر برتنے کے امکانات وغیرہ اسلوب کے مطالعے کے سلسلے میں یہ اور ان کے علاوہ کئی اور پہلو زیر بحث آسکتے ہیں لیکن شرط یہی ہے کہ اسلوب کا مطالعہ ادبی تخلیق سے شروع ہو کر چاہے جس سمت میں اور جتنی بھی دور تک قدم بڑھائے لیکن آخر میں اُسے اُسی ادبی تخلیق کی طرف لوٹنا ہے۔ ورنہ جس چیز کی تلاش ہے وہ تو بغل ہی میں رہے گی اور خواہ مخواہ شہر شہر ڈھنڈورا پیٹے گا۔

○○

غزلیں

شفاعت ترنم

ہر ایک رنگ کے حقدار آپ ہی تو نہیں
ہمارے خون کی سرخی ڈھکی چھپی تو نہیں
عجیب حال ہے دل کا کہ چیخ اٹھتا ہے
یہ بے وفائی کی تہمت کوئی نئی تو نہیں
ہجوم یاس میں اک آس دل میں قائم ہے
جمی ہوئی ہے جو محفل ابھی اٹھی تو نہیں
مرے بھی گھر میں اتر آئے گی کرن کوئی
کہ آج دھوپ میں انداز بے رخی تو نہیں
خوشی نصیب اگر ہو تو مسکرا لیجے
اداس رہنا کوئی فرض منصبی تو نہیں
خیال رکھئے ترنم کی بیتی باتوں سے
نئی امید کوئی دل کی ٹوٹتی تو نہیں

○ ہمدرد آنس۔ مظفر پور بہار

آذر بارہ بنکوی

خلوص غم سے جو اک بار اختلاف کیا
تمام عمر نہ دل نے مجھے معاف کیا
شکست دل کا چھڑا ذکر جب بھی محفل میں
زباں نے عذر تو اشکوں نے اعتراف کیا
غبار کم نہ ہوا دل کا جوش گریہ سے
اس آئینے کو بہت آنسوؤں نے صاف کیا
میں انتقام غم زندگی سے لوں گا ضرور
اگر مجھے مرے حالات نے معاف کیا
نگاہ غم میں سدا محترم رہا آذر
مصیبتوں نے مرا پے بہ پے طواف کیا

○ کٹرہ امام باڑہ۔ بارہ بنکی

مسعود بیگ تشنہ

دور دور تک جیسے تھی نہ زندگی کوئی
جسم کے بگولے ہی رات بھر اڑے تنہا
کون کس کا مونس تھا، کون کس کا ساتھی تھا
درد کی پناہوں میں ہم پڑے رہے تنہا
تھوڑے تھوڑے وقفے تک ساتھ سب چلے لیکن
آخری ٹھکانے پہ ہم ہی رہ گئے تنہا
ایک صبح سورج کا انتظار کیا کرتے
درد کی فصیلوں پہ ہم ہی سج گئے تنہا
اپنی اپنی کھوجوں میں فرد فرد تنہا ہے
کیا ہوا جو ہم خود کو کھوجتے رہے تنہا

○ ۱۰۴۔ ہرا پدہ۔ بہار شریف

سلیم مالیگانوی

یوں تری یاد مرے دل میں بسی ہے آ دوست
غم کے صحرا میں کوئی پھول کھلا ہو جیسے،
تجھ سے ملنے کی تمنا تجھے پانے کا خیال
گھپ اندھیرے میں کوئی دیپ جلا ہو جیسے
دل کے گوشوں میں مہکتے ہوئے زخموں کی بہار
درد کی جھیل میں پھولوں کی قبا ہو جیسے
اشک غم یوں مری پلکوں پہ رکا ہے آ کر
اک مسافر کسی ساحل پہ کھڑا ہو جیسے
تری پازیب کی جھنکار ترے پیار کی لے
کسی ٹوٹے ہوئے لمحے کی صدا ہو جیسے

○

سماجیات

فرقہ واریت کے متضاد پہلو

حسین شاہین
پرنسپل ایم ایچ صابو صدیق پولیٹیکنک۔ ۸ شیفرڈ روڈ بمبئی ۸

بمبئی یونیورسٹی کے ڈاکٹر پی۔ کے ستاگی کے لکھے ہوئے ایک مقالہ بعنوان "مختلف فرقوں کے باہمی رجحانات و میلانات" میں ہندوستان میں رائج علاقائی و لسانی اور فرقہ وارانہ تعصبات سے متعلق کئی دلچسپ باتیں سامنے آئی ہیں۔ یہ مقالہ سماجی نفسیات کے میدان میں ڈاکٹر ستاگی کی چھ سالہ تحقیق کا نتیجہ ہے۔ جو بمبئی یونیورسٹی کے انڈر گریجویٹ اور پوسٹ گریجویٹ طلبہ کے رجحانات کے مطالعہ پر مبنی ہے۔

ڈاکٹر صاحب کی دریافتیں ہندوستان کے موجودہ قومی منظر NATIONAL Scene سے گہرا تعلق رکھتی ہیں۔ مثلاً دیگر اقلیتوں کے ساتھ ساتھ اگرچہ مسلمان ہندوؤں کو سماجی طور پر سب سے زیادہ قابل قبول گروہ یا فرقہ سمجھتا ہے۔ لیکن ہندو فرقہ مسلمانوں کی جانب وہی خوشگوار جذبات روا نہیں رکھتا۔ وہ پارسیوں اور عیسائیوں کو اُن کی برتر تعلیمی و اقتصادی حیثیت کی بنا پر ترجیح دیتا ہے۔

صوبائی اور لسانی جماعتوں کے رجحانات یہ ہیں کہ مہاراشٹر کا رہنے والا گجراتی زبان اور شمالی ہند کی ہندی زبان بولنے والے گروہوں کو زیادہ پسند کرتا ہے۔ اور تامل اور سندھی زبان بولنے والوں کو بطور خاص ناپسند۔ جبکہ تامل ناڈو کے باشندے مراٹھی بولنے والوں کو اس درجہ ناپسند نہیں کرتے۔

اس تحقیق کا ایک دلچسپ پہلو یہ ہے کہ ہر فرقہ یہ محسوس کرتا ہے کہ وہ اعلیٰ ترین خوبیوں اور فضائل کا حامل ہے۔ پارسیوں اور سندھیوں کا دعویٰ ہے کہ وہ اعلیٰ درجے کے رجحانات رکھتے ہیں۔ مگر تامل ناڈو کے لوگ اور مسلمان اپنے اپنے لسانی یا مذہبی فرقوں کے لوگوں سے ادنیٰ ترین موافق رجحانات کو منسوب کرتے ہیں۔ یعنی اِن فرقوں میں اپنے آپ کو بڑا سمجھنے کا رجحان زیادہ ہوتا ہے۔

اکثر فرقوں نے سرکاری امتیاز یا تعصب کی طرف اشارہ کیا تھا۔ لیکن خاص طور بھی نے ——

مسلمانوں نے سرکاری رویّہ کو جانب دارانہ اور امتیازی قرار دیا تھا۔ ہندوستانی سماج کے مختلف مذہبی اور علاقائی گروہوں کے مابین اس جماعتی تناؤ کے کئی سماجی، سیاسی اور اقتصادی وجوہ ہیں۔ ہندو مسلم معاملہ میں خاص طور پر اس کا ایک مخصوص تاریخی پس منظر بھی ہے۔

بین الجماعتی تعصبات بعض اوقات ایک دوسرے کے مذہبی اور ثقافتی ورثے کی اچھائیوں اور خوبیوں سے باہمی ناواقفیت یا بے علمی کی بنا پر پیدا ہوتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہر جماعت یا فرقہ دوسرے فرقہ سے اپنے آپکو بالکل جدا محسوس کرتا ہے۔

اس سلسلے میں ایک واقعہ بیان کرنا باعثِ دلچسپی ہوگا۔ جو شہر بمبئی کے ایک مشہور ماہر تعلیم کو پیش آیا تھا۔ وہ یہ کہ صاحب موصوف ہندوستانی پرچار سبھا کے زیر اہتمام طلبار کو اُردو رسم الخط سکھایا کرتے تھے۔ وہ طلبار تعلیم یافتہ اور مہذب، گجرات و مہاراشٹر کے شریف ہندو نوجوان تھے۔ ایک بے تکلف گفتگو کے دوران ایک طالب علم نے "اللہ اکبر" کے معنی پوچھے۔ صاحب موصوف نے وضاحت کی کہ عربی میں بھگوان یا خدا کو "اللہ" کہتے ہیں۔ اور "اکبر" کے معنی ہیں عظیم یا بڑا۔ اس طرح "اللہ اکبر" کے معنی ہوئے "اللہ عظیم ہے" یا بھگوان سب سے بڑا ہے۔

یہ وضاحت سُنکر وہ طلبا و بظاہر حیرت میں پڑ گئے۔ کچھ نے کہا کہ وہ اب تک یہ سمجھتے رہے ہیں کہ اللہ اکبر ایک جنگی نعرہ ہے جسے مسلمان ہندوؤں کو قتل عام کرتے وقت بلند کرتے ہیں۔ تمام ذی فہم حضرات کے لئے یہ سوچنے کا موقع ہے کہ اس طرح کے غلط تاثرات نے ہندو مسلم تعلقات کو کس قدر نقصان پہونچایا ہوگا؟

ماہر تعلیم صاحب موصوف نے مجھ سے ایک تبادلۂ خیال کے دوران اتفاقاً ذکر کرتے ہوئے بتلایا کہ اُن کے ہندو طلبار نے غالباً اللہ اکبر کے بارے میں غلط

ساتھ اس نے اپنایا ہوگا کیونکہ انہوں نے یہ پڑھا یا سُنا ہوگا کہ مسلمان جانوروں کو ذبح یا حلال کرتے وقت بھی یہ کلمہ ادا کرتے ہیں اور اتفاق سے فرقہ وارانہ فسادات کے دوران بھی اپنے اپنے ہم مذہبوں کو قتل و غارت پر اکسانے کے لئے ہندو اور مسلمان فسادیوں کو "اللہ اکبر" یا "ہر ہر مہادیو" کے نعرے لگاتے ہوئے دیکھا یا سُنا ہوگا۔

میں اپنے ذاتی تجربے کی بنا پر ایک اور واقعہ بھی بیان کرتا ہوں جس سے پتہ چلے گا کہ دراصل مذہبی تعصب کی بُنیاد صرف عدم واقفیت یا بے علمی پر ہوتی ہے۔ ایک مرتبہ میرے ایک بنگالی ہندو دوست نے (Black magic) کالے جادو اور طلسم کے موضوع پر باتیں کرتے ہوئے کہا کہ بنگال کے ہندو جادوگر انسانی ہڈیاں جمع کرنے کے لئے مُسلم قبرستانوں میں چلے جاتے ہیں تاکہ مسلمان مُردوں کی خبیث ارواح کو اپنے جادو کے زور سے جگا سکیں۔ اُسے بہت حیرت ہوئی جب میں نے کہا کہ کرناٹک اور جنوبی ہند کی دیگر ریاستوں میں مسلمان جادوگر اسی مقصد کے حصول کے لئے "ہندو مرگھٹ" کا چکر لگاتے ہیں۔ یہ ایک عجیب اور اہم اتفاق ہے کہ فرقہ وارانہ ذہنوں کے نزدیک ارواحِ خبیثہ یا خبیث روحیں ہمیشہ دوسرے فرقہ سے تعلق رکھتی ہیں!

اس طرح کے کئی واقعات گنائے جا سکتے ہیں۔ جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ فرقہ وارانہ تعصبات دراصل وہ تصورات ہیں جو عوام کی جہالت اور تنگ نظری کی بناء پر پیدا ہوتے ہیں اور پروان چڑھتے ہیں۔

ایک دوسرے کو "کافر" اور "ملیچھ" جیسے حقیر القاب سے پکارنے کے علاوہ ہندو اور مسلمان اپنے مذہبی منافرت اور عدم رواداری کے اظہار کے لئے کئی دوسرے طریقے بھی اختیار کرتے ہیں مثلاً ہندوستان کے مختلف علاقوں میں مسلمانوں کو کئی حقارت بھرے ناموں سے پکارا جاتا ہے۔ جیسے پنجاب، اتر پردیش بہار اور مدھیہ پردیش کے ہندو عام طور پر مسلمانوں کے لئے "مُوسلا"، بنگال اور آسام میں "میاں"، تامل ناڈو اور آندھرا پردیش میں "تلکا یا ترکا" (ترک کی بگڑی ہوئی شکل)، کیرالا میں "ملی" (صاحب کی بگڑی ہوئی صورت) اور مہاراشٹر میں "لانڈیا" (مسلمانوں کی مذہبی رسم ختنہ کے حوالے سے یعنی کٹا ہوا یا ختنہ شدہ)، جیسے تحقیر آمیز اور ذلیل الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں۔

اس طرح شمالی اور وسطی ہندوستان میں ہندوؤں کو مسلمان اور غیر ہندو "بنیا" اور "دھوتی پرشاد" وغیرہ ناموں سے پکارتے ہیں۔ "بنیا" کو کنجوس کے طور پر شائلاک (Shylock) کا ہندوستانی روپ کہا جاتا ہے جو حقیقتاً انسانی گوشت اور خون کا بھوکا رہتا ہے۔

ظاہر بیگ ——

"سردار جی" کے لطائف انہیں مزاحیہ ہونے کے باوجود پوری سکھ قوم کے بارے میں اپنی تضحیک کا نشانہ بناتے ہیں۔ حتیٰ کہ انتہائی ذمہ دار اور اعلیٰ عہدے پر فائز سکھ حضرات بھی "بارہ بجے" کی لطیفوں سے بُرا نہیں سمجھے جاتے۔ شاید یہ سالہا سال کے اسی تعصب کا نتیجہ ہے۔

یہ عام بات ہے کہ کٹر اور ضعیف العقیدہ مسلمان جو خود ہفتہ میں صرف ایک بار صرف جمعہ کے دن غسل کرتا ہے لیکن ہندوؤں اور دوسرے فرقوں کو خود سے زیادہ ناپاک اور گندہ سمجھتا ہے جو روزانہ نہاتے ہیں۔

میرے چند مسلمان رفقاء یہ سوچ کے بہت خوش ہوتے تھے کہ ان کے نزدیک ہندو مُردے کا چتا پر جلنا، اسی دُنیا میں نارِ جہنم کو رسید ہونے کے برابر تھا۔

اکثر ہندو حضرات اپنے مکانات کو ناپاک سمجھتے ہیں اگر غیر ہندو یا مسلمان وہاں داخل ہو جائے۔ حالانکہ دل و دماغ اور بدن کی نفاست و پاکیزگی ہر نیک و پاکباز غیر ہندو، مسلمان یا ہندو کے لئے لازمی شئے ہے۔ بہت کم ہندو دوست اس بات سے واقف ہونگے کہ ہر مسلمان کے لئے دن پانچ وقت نماز ادا کرنے سے پہلے وضو کرنا مذہباً لازمی ہوتا ہے۔

اسی طرح لسانی اور علاقائی لگاؤ اور مختلف لوگوں کی غذائی عادتوں سے متعلق بھی تعصبات دیکھنے میں آتے ہیں۔ ہمارے وطن میں لسانی جھگڑے بھی تعصب و جہالت کی دین ہیں۔ جنوبی اور مشرقی ہندوستان میں ہندی کے خلاف نفرت، شمالی اور وسطی ہندوستان کے خود ہندی بولنے والوں کی لسانی جارحیت کا براہِ راست نتیجہ ہے۔ خود کو بہتر اور برتر دکھانے کی کوشش کی بجائے اگر ہندی بھاشا بولنے والے عوام نے بنگالی اور جنوبی ہندوستان کی زبانوں کے عظیم ثقافتی اور ادبی ورثے کا عشرِ عشیر بھی سیکھنے اور اپنانے کی کوشش کی ہوتی تو اب تک ہندی زبان سرکاری معاونت کے بغیر ہی پوری ہندوستانی قوم کی منظورِ نظر بن چکی ہوتی۔

گوشت خوروں اور سبزی خوروں کے باہمی اختلافات سے قطع نظر دونوں گروہوں کے افراد بہت حقارت سے ایک دوسرے کو "ہڈی چبانے والا" یا "گھاس کھانے والا" کہتے ہیں۔ میرے کئی شمالی ہند کے دوستوں کو حیرت ہے کہ "مدراسی" (یہ نام عام طور سے غلط طور پر تمام جنوبی ہند والوں کے لئے استعمال ہوتا ہے) "املی، سانبر" اور "رسم" وغیرہ جیسے عجیب و غریب پکوان کھا کر کیسے زندہ رہتے ہیں؟ اس کے جواب میں جنوبی ہند کے رہنے والے شمالی ہند والوں کی پوری کھاتے اور

بھیل پوری کھانے کی عادت کا مذاق اڑاتے ہیں۔ واگر شمالی ہند والوں کے حلق سے اڈلی سامبھر اور ڈوسا نہیں اُترتا تو جنوبی ہند والوں کو پوری بھاجی اور بھیل پوری سے گھن آتی ہے۔ !

میرے ایک بنگالی انجینئر دوست اہلِ بہار کے ستّو اور چنے کھانے کا مذاق اڑاتے تھے۔ کیونکہ اُن کے نزدیک یہ گھوڑوں کی خوراک تھی! آسامی اور بہاری عوام اقتصادی اسباب کی بنا پر اہلِ بنگال کو "ناپسندیدہ شخصیت" سمجھتے ہیں۔ اور ان کے "رس گلّا" اور "مچھلی" کو مذاق کا نشانہ بناتے ہیں۔ بنگال اور آسام میں بہار اور یوپی کے "بھیّا" بھی نشانۂ ملامت ہیں کیونکہ ان پر الزام ہے کہ انہوں نے بنگالیوں کو بہت بُرا کھسوٹا ہے۔

فرقہ وارانہ تعصب کا یہ کینہ پرور چکّر چلتا رہتا ہے۔ کبھی مسلم قوم کے شیعہ اور سُنّی فرقوں کے درمیان منافرت اور عداوت کی شکل میں، تو کبھی عیسائیوں کے کیتھولک اور پروٹسٹنٹ فرقوں کے باہمی دشمنی کی صورت میں۔ ہندوستان کے کئی علاقوں میں الگ الگ سطحوں پر ہندو قوم کے مختلف فرقوں کے درمیان سماجی تناؤ نے بہت شدت اختیار کرلی ہے۔ اکثر پسماندہ ذاتوں اور ہریجنوں کے ساتھ بہیمانہ سلوک اور غارت گری کی خبریں ملتی رہتی ہیں۔ جنوبی ہند میں برہمن اور غیر برہمن فرقوں کے درمیان تشدد آمیز واقعات بھی رونما ہوتے رہتے ہیں۔ "ڈی ایم کے" اور "ڈی کے" دراصل برہمن اور آریہ دشمن جماعتیں ہیں۔

کچھ اعلیٰ ذات کے برہمن غیر ہندوؤں کو چھونے کے علاوہ دیکھنے سے بھی پرہیز کرتے ہیں۔ (چھونا تو کیا دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتے!) خواہ وہ کیسا ہی اونچا سماجی رتبہ رکھتا ہو۔ مجھے ایک ذاتی تجربہ یاد آتا ہے جس کو پڑھ کر یہ اندازہ ہوگا کہ تعلیم یافتہ لوگوں میں یہ سماجی برائی کس قدر عام ہے۔

مغربی بنگال کے ایک شہر میں رہنے والے میرے ایک ہندو رفیق نے شادی کے موقع پر کچھ دوستوں کو کھانے پر بلایا تھا۔ ایک برہمن مہمان نے (جو ایک الیکٹریکل انجینئر اور ہمارے دوستوں اور رفقائے کار میں سے تھے) میزبان سے کہلوایا کہ ان کے مذہبی احساسات کا یہ تقاضا ہے کہ وہ کھانا اس وقت تک نہ کھائیں گے تا وقتیکہ وہ غیر ہندو (یعنی کرمی) ان کی نظروں سے اوجھل نہ ہوجاؤں! جب میرے میزبان نے ایک دوسرے دوست کے ذریعہ مجھ تک یہ درخواست پہونچائی تو مجھے شدید صدمہ پہونچا۔ میری خودداری نے گوارا نہ کیا کہ میں کھانے کے لئے رکوں اور میں فوراً وہاں سے چلا آیا۔

فرقہ وارانہ یا صوبائی تعصبات بعض اوقات مضحکہ خیز حدوں کو چھو لیتے ہیں۔ آزادی سے قبل ریلوے اسٹیشنوں یا دوسری عام جگہوں پر اکثر بڑے دلچسپ بورڈ آویزاں نظر آتے تھے۔ جن پر لکھا ہوتا تھا "مسلمان پانی" یا "ہندو پانی"۔ خدا کا شکر ہے کہ سانس لینے کی ہوا "مسلمان ہوا" اور "ہندو ہوا" جیسی تقسیم نہ ہوسکی، ورنہ ہندوستانی عوام کا سانس لینا بھی دشوار ہوجاتا!

میں اعلیٰ متوسط طبقہ کی ادھیڑ عمر کی ایک مسلمان عورت سے واقف ہوں جو ہمیشہ "مسلمان دودھ" کے لئے ضد کیا کرتی تھیں۔ یہ سوچنے کی بات معلوم ہوتی تھی کہ آیا خاتون موصوف "مسلمان گائے کا دودھ" چاہتی تھیں۔ یا کسی مسلمان گوالے سے دودھ لینا چاہتی تھیں!

کچھ تعلیم یافتہ حضرات خواہ انتہائی مہذّب و متمدن ہونے کے داعی کیوں نہ ہوں اُن پر بھی ان تعصّبات کا اس قدر غلبہ ہے کہ انہیں مختلف فرقوں کے درمیان ہلکی سی مفاہمت و یگانگت بھی گوارا نہیں ہوتی۔ بمبئی سے شائع ہونے والے ایک فلمی رسالے کے ہندو ایڈیٹر نے ایک ہندو پروڈیوسر ڈائرکٹر کو محض اس لئے اپنے طنز و مزاح کا نشانہ بنائے رکھا، کیوں کہ اس نے ایک "گائے کا گوشت کھانے والی" مسلمان ایکٹریس سے شادی کرلی تھی۔ کاش وہ اس شادی شدہ جوڑے کے "سیکولر" اصول کی بھی کچھ تعریف و توصیف کرتا۔

اکثر و بیشتر تمام تعصّبات کی جڑ جہالت ہوتی ہے۔ چنانچہ غیر متعصب تعلیم کی روشنی کو عوام کے دل و دماغ تک پہونچانے کی کوشش کرنا چاہیئے۔ صرف ایک دوسرے کو (Tolerate) یا گوارا کرنے کی تعلیم نہیں، بلکہ مختلف فرقوں اور جماعتوں کو یہ سکھانا ہوگا کہ وہ ایک دوسرے کے لسانی، مذہبی اور ثقافتی ورثے کو سراہیں اور اُن کا احترام کریں۔ تب ہی ہندوستان کے کروڑوں عوام میں ایک صحتمند قومی کردار کی نشو و نما ہوسکے گی۔

پوری قوم کے مختلف گروہوں کے درمیان سچی جذباتی یکجہتی پیدا کرنے کے لئے ایسی مناسب قومی تعلیمی پالیسی کی اشد ضرورت ہے جو ہر قسم کی لسانی، مذہبی، فرقہ وارانہ، علاقائی، اور جماعتی تعصّب سے پاک ہو اور وسیع النظر، روشن خیال و انسانیت نواز ہو۔ ایسا نظام تعلیم ہی ہر ہندوستانی کو یہ سوچنے پر مجبور کردے گا کہ پورا وطن ہندوستان اس کا گھر اور پوری قوم اس کا کنبہ ہے۔

OO

دو بیوائیں

مسز روشن اختر کاظمی
بی ۶۶، بیشن پتھر نگر، جے پور - ۴

شہنائی کی مدھم سی آواز فضا میں گھلی ہوئی تھی جو ہوا کے دوش پر کبھی قریب آتی ہوئی محسوس ہوتی اور کبھی دور۔ یہ آواز اُسے ماضی کی بھول بھلیوں کی طرف کھینچے لئے جا رہی تھی۔ اُس کے بچپن کی پیاری پیاری یادوں میں ساجد کا ہنستا ہوا چہرہ بہت نمایاں تھا۔ اُس کا پیارا سا بھائی، چہیتا اور جھگڑالو، جو کہ بہت جلد رُوٹھ جاتا تھا۔ مگر اُسی طرح بہت جلد مَن بھی جاتا تھا۔ جانے اب کہاں ہوگا؟ اگر ابا میاں نے ساجد کو غلط نہ سمجھا ہوتا تو کیوں وہ گھر چھوڑ کر جاتا اور جیتے جی سب سے چھوٹ جاتا؟

اُس کے کانوں میں شہنائی کی گونج بہت تیز ہو اُٹھی۔ شاید بارات آگئی ہے، لوگ کہتے ہیں نجمہ کی بارات بھی بڑے دھوم دھام سے آئی تھی، اور کیوں نہ آتی، اُس کی سسرال کا خاندان اودھ کے اُن چند خاندانوں میں سے تھا جن کی عظمت کے افسانے ابھی زندہ تھے۔ خود نجمہ کا میکہ بھی بہت نامی گرامی تھا۔ بس بقول دادی صفدر: فرشتوں نے ستر گھر دیکھ کر بیٹیا کی جوڑی ملائی تھی۔ انہوں نے ہر طرح چھان بین کے بعد رشتہ طے کرایا تھا۔ ساتویں پیڑھی میں بھی کہیں سے کھوٹ نہیں تھی۔ زمینداری جا چکی تھی تو کیا ہوا، سعید میاں کے والد نے کئی ملوں میں حصے لے رکھے تھے۔ شہر میں بے شمار مکانات تھے جن کا ماہانہ کرایہ ہزاروں روپے آتا تھا۔ آموں کے باغات کی آمدنی الگ سے تھی۔ ہاتھی، گھوڑے رخصت ہوئے تو چمچماتی موٹریں آگئیں۔ غرضیکہ ہر طرح اللہ کا فضل تھا۔ رہے خود سعید میاں تو اکلوتے بیٹے تھے، کئی سال سے انگلینڈ میں مقیم تھے۔ اس لئے "بَردِکھاوا" تو ہو نہ سکا۔ دیسے سنا یہی گیا تھا کہ بہت خوبصورت ہیں۔ رنگ کا نہ سہی، ناک نقشہ کا اندازہ تو تصویروں سے بھی ہو ہی جاتا ہے۔ نجمہ کے والدین ایسا رشتہ پاکر نہال ہو گئے۔ بس خدا جانے کیوں ساجد ہی کو سعید کے نام سے چڑھ تھی۔ اُس کی مخالفت پر پہلے تو کسی نے کان ہی نہ دھرا، پھر ہر طرف سرگوشیاں شروع ہوگئیں اور سب کا مطلب یہی تھا کہ وہ تو چاہتا ہی نہیں کہ نجمہ کی شادی ہو ......

نجمہ کے والد پرانے زمانے کے رئیس تھے۔ کانوں کے کچے۔ اُن کو بھی لگائی بجھائی کرنے والوں نے نجانے کس طرح اپنی باتوں کا یقین دلایا اور ایک روز گھر میں طوفان پھٹ پڑا۔ اور پھر ساجد کسی سے بغیر کچھ کہے سُنے ہمیشہ کے لئے گھر سے چلا گیا۔ نجمہ کا پیارا بھیّا، جسے اس نے ہمیشہ سگے بھائی کی طرح سمجھا تھا۔ اتنا بڑا الزام نہ سہہ سکا اور نجمہ بیچ منجدھار میں اکیلی رہ گئی۔

آج اُسے پھر وہ ساجد کی یاد آرہی تھی، گھر میں پھر کچھ ویسی ہی ہلچل مچ رہی تھی جیسی اب سے پانچ سال پہلے ہوئی تھی۔ گھر والے فرض کی سبکدوشی پر خرّم و شاداں تھے اور سسرال والے چاند سی بہو کو پاکر نہال ہو رہے تھے۔ عورتیں بَری اور جہیز پر تبصرہ کر رہی تھیں، لڑکیاں دولہا کو دیکھنے کے لئے بے چین تھیں۔ "پھولوں کی چھڑیاں" دوپٹوں میں چھپا کر بڑے اہتمام سے دولہا کا انتظار ہو رہا تھا۔ لیکن اُن کی سب تیاری بے کار گئی۔ پتہ نہیں کیوں وہ زنان خانے میں آیا ہی نہیں۔ آرسی مصحف کی رسم بھی نہ ہو سکی اور عورتوں میں اس پر خاصی لے دے بھی ہوئی، لیکن پھر رخصتی کا ہنگامہ شروع ہو گیا۔

اُس کی شادی کے بعد ہی حالات نے عجب پلٹا کھایا۔ خود ابا میاں بھی کسی طرح اُسے دوبارہ بھیجنے پر تیار نہ ہوئے۔ اللہ کیا شاہد ہے .....

کے منھ میں دانت تھے جو اُن سے اس کا سبب دریافت کرتا۔ لیکن لوگوں کی زبان تو بند نہیں کی جا سکتی۔ جتنے منھ اتنی ہی باتیں۔ عام خیال یہی تھا کہ ارے بھئی ہم تو سمجھتے تھے کہ بھلا ولایت پلٹ لڑکا پردے کی بو بُو سے کیا نباہ کرے گا۔ اونھ گوری چمڑی سے کیا ہوتا ہے لیکن ذاکیہ بیگم تو اپنی بیٹی کو حور پری سمجھتی تھیں۔ اب بٹھائیں زندگی بھر کلیجے پر۔ رشتہ دار عورتوں کی آمد و رفت یکایک بڑھ گئی اور ہر آنے جانے والی اپنے ساتھ کچھ نہ کچھ خبریں بھی لے کر جاتی۔ واقعی عورتوں کی جاسوسی کا ڈھنگ نرالا ہوتا ہے۔ لیکن یہ ساری باتیں ذاکیہ بیگم کے پیٹھ پیچھے ہوتی تھیں۔ اُن کے منھ در منھ اب بھی کسی کو کچھ کہنے کی ہمت نہ تھی، کیونکہ وہ بھی بڑے کلّے ٹھلّے کی عورت تھیں شاندار ایسی کہ جس محفل میں بیٹھتیں اُس میں وہی وہ نظر آتیں۔ ساری زندگی راج کرتی رہیں۔ لیکن اب بڑھاپے میں پتہ نہیں قسمت اُن کو کیا دکھانا چاہتی تھی۔ نجمہ کا غم اُن کو اندر ہی اندر گھُن کی طرح ختم کئے دے رہا تھا۔

شب و روز، ماہ و سال گزرتے رہے، نجمہ کچھ دنوں بعد ہی پھر پہلے کی طرح ہو گئی۔ کم از کم دیکھنے والے تو یہی محسوس کرتے۔ وہی ہنسی مذاق، پڑھنا لکھنا، ہنستے چہچہے، ہنگامہ آرائیاں۔ اُس نے اپنے آپ کو بالکل حالات کے دھارے پر چھوڑ دیا۔ اکثر سوچتی جو ہونا تھا ہو چکا، اب سوچنے سے کیا فائدہ۔ پھر اُسے تکلیف بھی کیا تھی، بقول بڑی بوڑھیوں کے ماں باپ کا سایہ سر پر سلامت ہے۔ بہن بھائی جان چھڑکتے ہیں۔ اچھے سے اچھا کھانا پینا، پہننا اوڑھنا، مہندی چوڑی، اور پھر سب سے بڑی بات اللہ رکھے تو سہاگن۔ نکھٹو اور جھگڑالو شوہروں کی بیویاں اُسے حسرت سے دیکھتیں۔ خود نجمہ بھی اُن عورتوں کے مقابلے میں اپنے کو خوش قسمت سمجھتی۔ پھر ابھی سوچنے کے لئے تو ساری عمر پڑی تھی، وہ ہر خیال کو اپنے ذہن سے جھٹکنے کی کوشش کرتی۔ قسمت ہی تو ہے کوئی کیا کر سکتا ہے۔ اُس نے کبھی حرفِ شکایت زبان سے نہیں نکالا۔ سچ پوچھو تو اُس نے عرصے سے اپنے بارے میں سوچنا ہی چھوڑ دیا تھا۔ جب حالات بدلنا اپنے بس میں نہ ہو تو سوچنے سے فائدہ ہی کیا ہو سکتا ہے۔ پتہ نہیں کب تک وہ اسی خود فراموشی میں رہتی کہ یکایک نعیمہ کی بیوگی نے اُسے جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ ساری عورتیں اسکے شاعر بھتیجے ———

حال پر ہائے وائے کر رہی تھیں۔ کیسی غریب کی جوانی برباد ہوئی ہے۔ جو اُسے دیکھتا اُس کے حال پر چلّو بھر آنسو بہاتا۔ نعیمہ کی حالت اس کشتی جیسی تھی جس پر سے طوفان گزر گیا ہو اور اب وہ دھیرے دھیرے ساحل کی طرف رواں ہو۔ جبکہ خود نجمہ بیچ منجدھار میں پھنسی ہوئی تھی۔ پھر اس کے آگے وہ کچھ نہ سوچ سکی۔

نجمہ گھر میں پکتی ہوئی کھچڑی سے بے خبر نہ تھی، ابّا میاں کی بگڑتی ہوئی صحت اور بھائیوں کی بڑھتی ہوئی ذمّہ داریوں کا تقاضا تھا کہ اب نجمہ کو اس کے گھر بھیجا جائے۔ نجمہ نے اگرچہ عرصے سے حیرت کرنا چھوڑ دیا تھا پھر بھی اُسے تعجب ہوا جب اُس نے سنا کہ ابّا میاں اسے بھیجنے پر آمادہ ہیں۔ "میں وہاں قطعی نہ جاؤنگی، کیا آپکی جائیداد میں میرا کوئی حصّہ نہیں ہے؟" اُس نے زندگی میں پہلی بار ابّا میاں سے کھل کر بات کی۔ لیکن یہ کیا بجائے غصّے گرمی کے اُن کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں۔ "سعید کے والد نے لکھا ہے، وہ زیادہ انتظار نہیں کر سکتے۔ اگر تم کو منظور نہ ہو تو وہ طلاق دینے کو تیار ہیں اور ایسا خاندان میں کبھی نہیں ہوا ہے۔ اگر یہ ہوا تو تم مجھے زندہ نہ دیکھو گی۔" اُن کے ہاتھوں میں تسبیح لرز رہی تھی۔ اور نجمہ کا سر جھک گیا۔ وہ تھکے ہوئے قدموں سے اپنے کمرے میں واپس آ گئی۔

اور آخر آج وہ دن آ پہونچا جب اُسے جانا ہی تھا، شاید ہمیشہ کے لئے۔ گھر میں پھر سے لمبے پیمانے پر تیاریاں ہوئیں۔ کچھ عزیز رشتہ دار بھی اکٹھا ہو ہی گئے۔ اتنے میں باہر سے خبر آئی سعید میاں آ گئے۔ نجمہ کے خیالات کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ اُس کے ہاتھ سے کنگھی چھوٹ کر گر گئی۔ اُس کے ذہن میں ایک کرخت آواز کی بازگشت تھی۔ "میں نے سُنا تھا کہ تم بہت خوبصورت ہو لیکن مجھے تو حُسن نظر نہیں آ رہا ہے اور نئی نویلی دلہن کا سر خود بخود اوپر اٹھ گیا تھا۔ اُس کے سامنے ایک وحشت زدہ چہرہ تھا۔ بکھرے ہوئے بال، آنکھوں میں عجیب سی پیاس اور وہ چہرہ اس کے قریب آ رہا تھا۔ بہت قریب اور پھر آگے اُسے کچھ یاد نہ تھا۔ وہ خوف سے بے ہوش ہو گئی تھی۔ سہاگ رات کا یہ دل شکن منظر اس کے حافظے پر نقش تھا اور پھر اُس یادگار رات کی یادگار صبح کیا وہ زندگی بھر اُسے بھلا سکے گی۔ وہ چار پانچ دن بعد

ہیں اماں بیب لٹ سی گئی تھی۔ دل کے گھاؤ بھی اُسی طرح کبھی نہیں بھر پاتے جیسے جسم کے گھاؤ بھر جاتے ہیں۔ اس نے بڑے دکھ سے سوچا۔ وہ لوٹ کر حقیقت کی دنیا میں واپس آ گئی۔ بچوں کی پلٹن ہنستی ہوئی آ گئی۔ "ارے آپ کے میاں ارے تو یہ ہمارے دولہا بھائی بالکل جانگلو ہیں۔" دس سالہ کے پنکو نے اپنے پھولے ہوئے گالوں پر شرارت سے طمانچے لگاتے ہوئے فرمایا "ہاں ایسا لگتا ہے جیسے جیل سے چھوٹ کر آئے ہیں" گڑیا نے اضافہ کیا۔ "نجمہ ذرا جا کر ان کو آدمی بنانا یہ تو شاید ہپی ہو گئے ہیں" راشد بھیا برسوں بعد آئے تھے، انہوں نے بھی بچوں کی باتوں میں حصہ لیا "تم سب بے وقوف ہو نجمہ کی فرقت میں بے چارہ مجنوں ہو گیا ہے۔" خالد بھائی کا لہجہ طنزیہ تھا۔ سب کا مشترکہ قہقہہ گونج اٹھا۔ "چلو چل کر مہمانوں کی خاطر کریں۔" سب باہر کی طرف دوڑے۔ ہنسی قہقہوں میں کسی نے نجمہ کی طرف دھیان نہیں دیا۔ اس کا رنگ چھالٹین کی طرح سفید ہوتا جا رہا تھا۔ وہ چپ چاپ کرسی کا سہارا لئے کھڑی تھی۔ زرینہ کی نظر تو اتفاقاً ہی اس پر جا پڑی، وہ گھبرا کر بولی "ارے ارے تمہیں کیا ہو گیا؟" پھر جیسے وہ ایک دم بات کی تہ تک پہنچ گئی۔ "نجمہ تم نے کبھی کچھ بتایا کیوں نہیں؟ مجھ سے بھی کچھ نہ کہا، میں تو تمہاری بچپن کی دوست تھی۔"

"ہاں زرینہ! میں نے کبھی کچھ نہیں کہا، لیکن آج کہتی ہوں کہ میری اور تمہاری حالت ایک جیسی ہے۔ مگر ایک فرق ہے، بہت بڑا فرق۔ دنیا والے تمہاری حالت پر روتے ہیں مگر میری حالت پر ہنستے ہیں۔ تمہارے پاس کچھ سہانی یادیں تو ہوں گی۔ میرے پاس تو وہ بھی نہیں ہیں۔ بس مجھے ایک طلائی مقبرہ ملا ہے اور ساری زندگی اس میں دفن رہنے پر مجبور ہوں۔ خاندان اور رسم و رواج کے نام پر۔" وہ نڈھال ہو کر کرسی میں گر گئی۔

باہر برآمدے میں سمیع کے والد صاحب فرما رہے تھے: "قبلہ ڈاکٹروں نے تو یقین دلایا تھا کہ یہ شادی کے بعد بالکل ٹھیک ہو جائیگا" اور محمد اکبر حسن ایک بار پھر سوچ رہے تھے "کاش! میں نے ساجد کی بات کا یقین کر لیا ہوتا۔"

OO

(بہ شکریہ ... ایک دنیا ... پریس — ۳۳ [illegible])

شاعر [illegible] —

بقیہ: وقت کا گانا صفحہ ۲۸

کی اکیلی جان کی کوئی پروا نہیں کرتا۔ جیسے انسانیت کے سب سے بڑے دشمن بھوک نے نگل لیا اور اس دشمن کے خلاف کسی نے ایک جہتی کی لڑائی کا پرچم نہیں اٹھایا۔

میں جان گیا کہ اس کم فہم چھوکرے کو اس دکان کی نوکری سے جلد جواب مل جائے گا۔ کیونکہ اس نے موزوں وقت کا گانا نہیں بجایا۔ اس نے چاند کا رُخ روشن نہیں دکھایا اور امیر خریدار خود کو وقتی حسین دھوکا نہیں دے سکے، جس کی ان کو چاہت تھی۔ کڑوی سچائی بیان کرنا قانوناً ممنوع کیوں قرار نہیں دیا جاتا۔ تاکہ اور مسیح صلیب پر لٹکنے سے بچ جائیں، تاکہ اور لنکن اور گاندھیوں کے سینے گولیوں سے چھلنی نہ ہوں۔

OO

بقیہ: بے لبی بس کے انتظار میں — صفحہ ۳۳

مسافروں کے آرام کا اس قدر خیال تھا کہ انہیں لینے کے لئے دیوار توڑ کر خود گھر میں داخل ہو گئی۔ بیشتر شائقین بڑی حسرت سے غالباً یہی سوچ رہے تھے کہ کاش یہ باغی حسینہ در و دیوار توڑ کر ان کے گھر میں گھس آتی۔ کچھ فلاسفر قسم کے افراد نے ہو سکتا ہے اس حادثے کے بعد سے انتہائی سنجیدگی کیساتھ اس مسئلہ پر غور و خوض فرمانا شروع کر دیا ہو کہ —

"بے در و دیوار سا اک گھر بنانا چاہیے"

تاکہ اس قسم کی "بولی صفت بسو" کے گھر کے اندر آنے جانے میں سہولت ہو، گویا ادھر بس کی حاجت محسوس ہوئی۔ ادھر بس حاضر، بقول شاعر

گھر کے آنگن میں کھڑی ہے ایک بس
اک ذرا گردن گھما کر دیکھ لی

OO

مکتوبات

○ اس بار شاعر بہت پسند آیا۔ ابراہیم یوسف کے فن اور شخصیت پر انتخاب بہت اچھا ہے۔ ایڈیٹوریل نوٹ بھی اہم ہے اور ہر اُردو پڑھنے والے کے لئے قابلِ توجہ۔

۱۰۸۔ ملے معظم پورہ۔ حیدرآبادؔ — جیلانی بانو

○ شاعر کی جلد ۴۶ کا شمارہ ۱۱ پیشِ نظر ہے۔ اس کے صفحہ ۵۰ پر جناب یونس اگاسکر نے جناب طیب انصاری کی کتاب "میرا شہر میرے لوگ" پر تبصرہ کیا ہے۔ اس میں ایک جگہ وہ لکھتے ہیں — "اُردو میں شخصیات سے متعلق تحریروں کا ایسا کال ہے کہ کسی اہم آدمی کے چل بسنے پر OBITUARY کے لئے بھی مواد نہیں مل پاتا۔"

مجھے ان کے اس خیال سے اتفاق نہیں ہے۔ اس وقت شخصیات سے متعلق مندرجہ ذیل کتابوں اور رسائل کے خصوصی شماروں کے نام ذہن میں آ رہے ہیں۔

۱۔ نقوش لاہور۔ شخصیات نمبر (حصۂ اوّل و دوم)
۲۔ شوکت تھانوی۔ شیش محل
۳۔ مردم دیدہ۔ چراغ حسن حسرت
۴۔ گنج ہائے گراں مایہ۔ رشید احمد صدیقی
۵۔ ہم نفسانِ رفتہ۔ رشید احمد صدیقی
۶۔ شخصیات و واقعات جنھوں نے مجھے متاثر کیا۔ جمیل احمد
۷۔ ناقابلِ فراموش۔ دیوان سنگھ مفتون
۸۔ انجمن۔ شمس الدین احمد
۹۔ نئے پُرانے چراغ۔ مولانا علی میاں ندوی
۱۰۔ متعدد ادیبوں اور شاعروں سے متعلق۔ رسالہ شاعر کے مخصوص گوشے
۱۱۔ کرشن چندر نمبر

ان کے علاوہ کچھ نام اور ہیں جو اس وقت ذہن میں نہیں آ رہے ہیں

ہاں یہ ضرور ہے کہ ابھی تک ہمارا یہ سرمایہ شاعروں، ادیبوں، سیاسی لیڈروں اور چند بڑی شخصیتوں تک محدود رہا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اہم سائنسدانوں، ٹیکنالوجی کے ماہرین، مصوروں، سنگ تراشوں، موسیقاروں اور سماجی کارکنوں کی شخصیات پر بھی روشنی ڈالیں تاکہ زندگی کے ہر شعبے

شاعر بمبئی ———

کی ترجمانی ہو سکے۔ امریکہ اور یورپ میں ہر سال پابندی کے ساتھ اس سال کی اہم شخصیتوں کے متعلق کتابیں شائع ہوتی ہیں اور عوام اُنھیں ہاتھوں ہاتھ لیتے ہیں۔

محلہ سوتھہ۔ بدایوں — مبشر علی صدیقی

○ "شاعر" کا تازہ شمارہ ملا۔ کرشن چندر کا مضمون پڑھ چکا ہوں۔ کرشن جی کا پہلا مضمون بھی پڑھا تھا۔ جس میں اُنھوں نے لکھا تھا کہ وہ اپنی عمر کے دن انگلیوں کو تقسیم کر چکے ہیں۔ بس دو دن کی دی ہوئی عمر پر جی رہے ہیں اور تازہ "شاعر" والے مضمون میں اُنھوں نے اُن عورتوں کے نام لکھا ہے۔ "کبھی نہ کبھی یادوں کے کسی گوشے میں اور تنہائی کے کسی آنگن میں وہ اُن لمحوں کو فرد فرد یاد کریں گی جب اُن کے دلوں کو کسی اجنبی دھنک نے چھو لیا تھا۔"

کرشن جی کے ہر مضمون میں اختتام کتنا جاندار ہوتا ہے، اس سے فنکار کے حساس پن کا پتہ چلتا ہے۔ میں بھی کہانی کار ہونے کے ناطے حد درجہ حساس ہوں۔ مجھے ان مضامین میں وہ سب کچھ محسوس ہوتا ہے جسے میں بیان نہیں کر سکتا، صرف محسوس کر سکتا ہوں۔

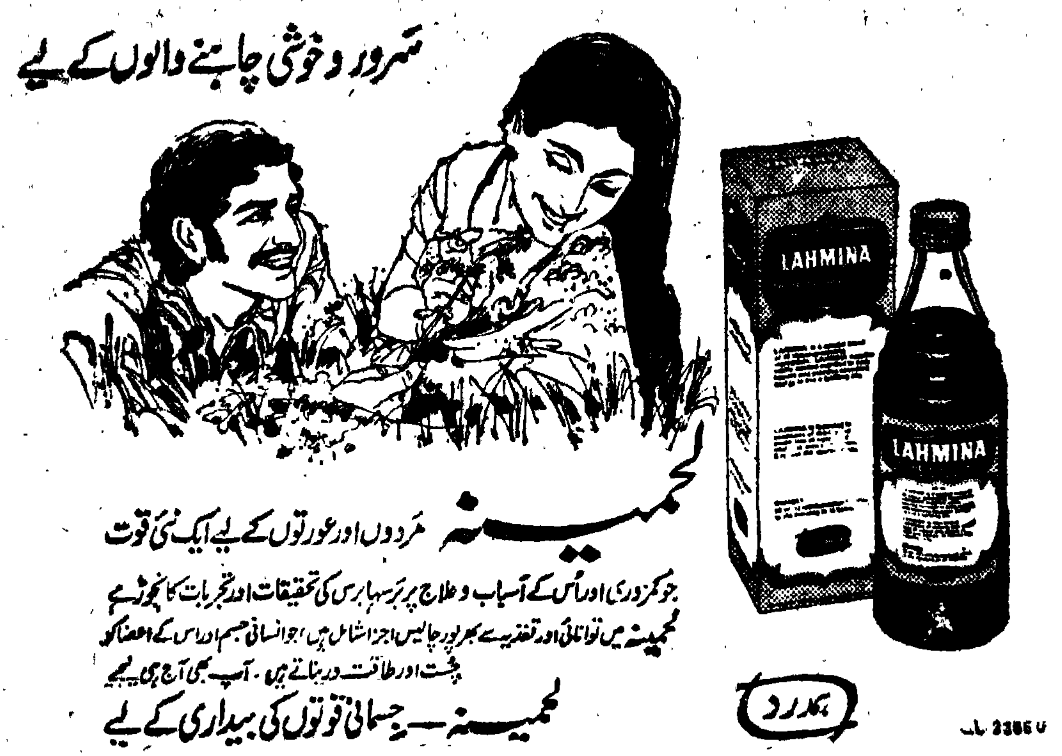
ہماری ریاست میں کوئی اُردو رسالہ نہیں ہے۔ کوئی تو ہمارا ORGAN ہونا چاہئے۔ بہت سے اچھے اچھے فنکار صرف اس لئے اپنے فن کو اپنے سینہ میں دفن کئے رہتے ہیں کہ کوئی باہر کا ایڈیٹر اُنھیں نہیں چھاپتا۔

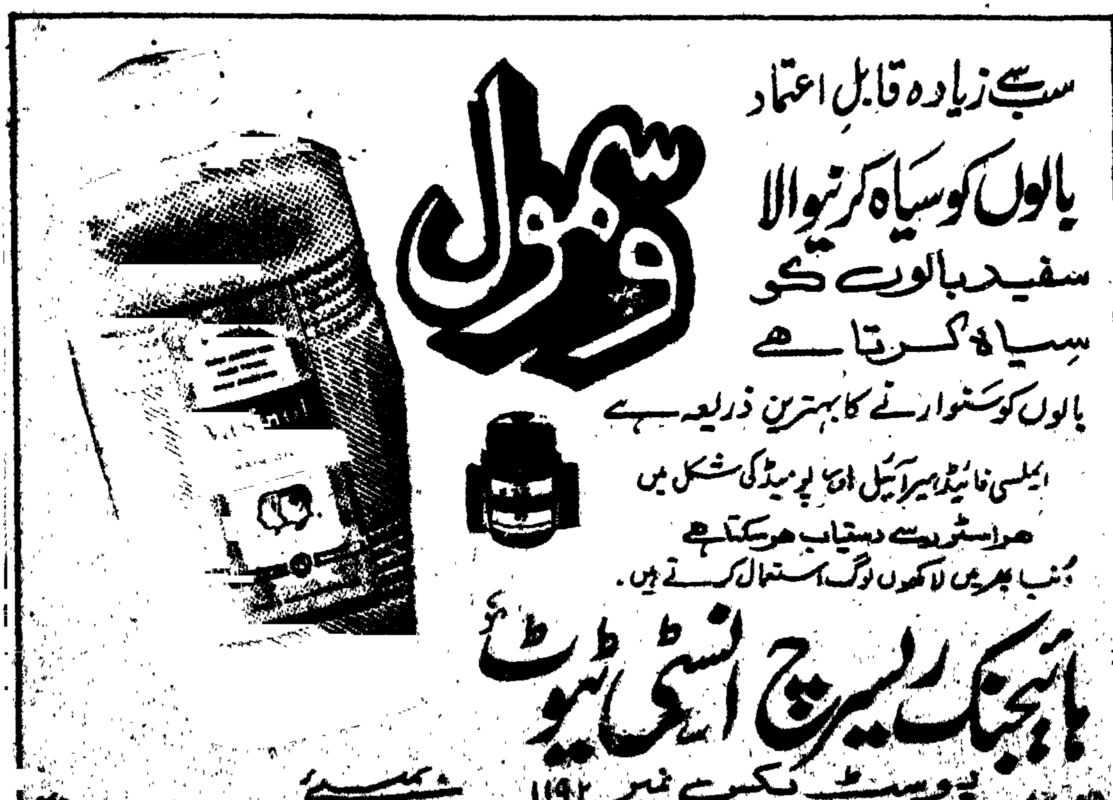
زینتھ اسٹور۔ بازار اسٹریٹ۔ بنگلور — شبیر مرزا

○ نومبر اور دسمبر کا مشترک شمارہ سامنے ہے۔ "ترجیحات" کے ذریعہ آپ اُردو کے CAUSE کو جس انداز سے لیکر بڑھ رہے ہیں وہ کچھ آپ ہی کا حصہ ہے۔ اس بار آپ نے پاکستان کی کتابوں کی فروخت کے جائزے سے ہندوستان میں اُردو سے متعلق انجمنوں اور مکتبوں اور اداروں کو سخت امتحان میں ڈال دیا ہے۔

مجروح سلطان پوری کی تازہ غزل بہت پسند آئی۔ جون ایلیا کی غزل بھی کافی جاندار ہے۔ سبھی مقالات کارآمد ہیں۔ جدید اُردو کہانی اور عنوان احمد کی کہانیوں سے متعلق مناظر عاشق ہرگانوی کا مقالہ تشنہ ہے۔ کرشن چندر کے انشائیہ کی دوسری قسط زندگی سے بھرپور ہے۔ اُن کی تحریروں میں ایک خاص قسم کی دلکشی اور رعنائی ہوتی ہے۔ اس بار کہانیوں کا حصہ کافی جاندار ہے۔ علی محمود کی کشمیری کہانی کا ترجمہ "تم سب میرے ہو" بہت پسند آیا۔ دیگر کہانیوں میں "خواب" اور "اچھا آدمی" بھی پسند آئیں۔ ابو اللیث جاوید کی کہانی "ہمارا بوڑھا درخت" میں صدیوں کی پھیلی ہوئی بے ربط اور مسلسل آزمائشوں کی تلخیوں سے پریشان

(باقی صفحہ ۷۷ پر دیکھئے)


سرور و خوشی چاہنے والوں کے لیے
LAHMINA
LAHMINA
لحمینہ مردوں اور عورتوں کے لیے ایک نئی قوت
جو کمزوری اور اس کے اسباب و علاج پر برسہا برس کی تحقیقات اور تجربات کا نچوڑ ہے
لحمینہ میں توانائی اور تغذیہ سے بھرپور چالیس اجزا شامل ہیں، جو انسانی جسم اور اس کے اعضا کو
چست اور طاقت ور بناتے ہیں۔ آپ بھی آج ہی لیجیے
لحمینہ — جسمانی قوتوں کی بیداری کے لیے
ہمدرد


سب سے زیادہ قابلِ اعتماد
وسمول
بالوں کو سیاہ کرنے والا
سفید بالوں کو
سیاہ کرتا ہے
بالوں کو سنوارنے کا بہترین ذریعہ ہے
ایملسی فائیڈ ہیر آئیل اور پومیڈ کی شکل میں
ہر اسٹور سے دستیاب ہو سکتا ہے
دنیا بھر میں لاکھوں لوگ استعمال کرتے ہیں۔
ہائیجنک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ
مربیۂ پوسٹ بکس نمبر ۱۱۹۲ بمبئی

نقد و نظر

تبصرے کے لئے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں

- تنقید سے تحقیق تک
- مصنف : ڈاکٹر عنوان چشتی
- صفحات : ۱۸۰ ۔ قیمت پندرہ روپے
- ملنے کا پتا: بک پبلی کیشنز، دریا گنج، دہلی ۶

بیسویں صدی کی ساتویں دہائی میں تیزی سے اُبھرنے والے اور موجودہ دہائی میں اپنی نقادانہ شخصیت کو ہم عصر تقاضوں سے ہم آہنگ کرکے اپنے آپ کو منوا لینے والے تنقید نگاروں میں ڈاکٹر عنوان چشتی خاصے نمایاں ہیں۔ اُن کی تیسری تنقیدی تصنیف "تنقید سے تحقیق تک" اِس وقت زیر نظر ہے۔ پچھلی کتابوں کی طرح اِس کتاب کو بھی خالص تنقیدی تصنیف کہنا تعریف سے مشکل ہے۔ اسلئے بیشتر مضامین شعری تکنیک، آہنگ اور اسلوب سے متعلق ہیں۔ "اسلوب اور اسلوبیات" انگریزی سے ترجمہ ہے لیکن دیگر سارے مضامین عنوان چشتی کی تلاش و تحقیق کا نتیجہ ہیں۔ مصنف نے ساری بحثیں توضیحی انداز میں پیش کی ہیں اور اندازِ بیان اطناب کا اچھا نمونہ ہے۔

ڈاکٹر عنوان چشتی کے مضامین پڑھ کر جس خصوصیت کا شدّت سے احساس ہوتا ہے وہ ہے ان کی جذباتیت سے عاری تجزیاتی کیفیت۔ اِس نوعیت کے مضامین میں وجد آفرینی کی گنجائش تو خیر ہوتی ہی نہیں کیف آوری بھی مشکل پیدا ہوتی ہے۔ اس کے باوجود ان تحریروں کو خشک تکنیکی بحثیں بھی نہیں کہا جاسکتا۔ مصنف نے جگہ جگہ موثر اور عام فہم مثالیں دے کر خود کو اِس الزام سے بچا لیا ہے۔

تیرہ مضامین پر مشتمل اِس مجموعے میں "عظمت اللہ خاں کا نظریۂ فن" "بعد غالب اور چند فنی مسائل" مخصوص شخصیتوں کے نظریات کا محاسبہ کرتے ہیں۔ بقیہ مضامین براہ راست ادب و فن سے متعلق ہیں، جن میں انگریزی اور اُردو کے شہ پاروں کے فنی پہلوؤں کا یکساں جائزہ لیا گیا ہے۔ ڈاکٹر عنوان چشتی نے انگریزی ادب کا بہ نظر غائر مطالعہ کیا ہے نیز اُردو شاعری کے فنی لوازم سے بھی بخوبی واقف ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے مضامین میں ادھورے پن اور الجھاؤ نظر نہیں آتا۔ خصوصاً "اسلوب کے نظریے" "شاعری کی زبان" اور "شعری تکنیک کا مفہوم" اچھے مضامین ہیں۔

اُردو میں گزشتہ چند برسوں سے ادب و شعر کے بنیادی مسائل پر غور و فکر کا رجحان بڑھتا جا رہا ہے۔ اب محض فن پاروں اور فن کاروں کا تنقیدی جائزہ اور تجزیہ پیش کرنے کی فرسودہ روایت کو زیادہ کار آمد نہیں سمجھا جاتا ہے۔ ڈاکٹر عنوان چشتی نے اپنی بیدار ذہنی کے سہارے تنقید کے بدلتے ہوئے تیوروں کو پہچان کر اُس کے مزاج سے ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ کوشش ہر طرح مستحسن ہے۔ اُردو میں اِس قسم کے مضامین کی کمی تھی، کتاب کے آخری آٹھ صفحات کتابیات اور اشاریہ کے لئے وقف کئے گئے ہیں طباعت و کتابت مع غلطیوں کے غنیمت ہے۔ — یونس اگاسکر

- لکھنؤ کی لسانی خدمات
- مصنف: ڈاکٹر حامد اللہ ندوی
- ۲۰۷ صفحات قیمت ۱۲ روپے
- ملنے کا پتا: مہاتما گاندھی میموریل ریسرچ سینٹر، بمبئی

"تحقیق ایک ایسا سمندر ہے جس کی تھاہ کو کوئی پا نہ سکا۔ بڑے بڑے دانشوران کے کنارے بیٹھ کر کنکر پتھر چُنتے اور ٹامک ٹوئیے مارتے رہے ہیں۔ . . . مجھے ہرگز یہ دعویٰ نہیں ہے کہ میں نے جو کام کیا ہے ہر اعتبار سے مکمل ہے البتہ یہ خوشی ضرور ہے کہ میں نے اس سلسلے میں پہل کی ہے۔"

ڈاکٹر حامد اللہ ندوی کا مذکورہ بالا بیان اُن کی تحقیقی تصنیف "لکھنؤ کی لسانی خدمات" پر بجائے خود ایک تبصرہ ہے۔ لیکن کتاب کے عنوان اور اس اقتباس سے جو تجسّس جاگتا ہے اُس کی تسکین کے لئے ضروری ہے کہ اس لسانی و ادبی خدمت کا قدرے تشفّی بخش جائزہ لیا جائے۔

لکھنؤ کی ادبی و لسانی خدمات سے کسی کو مجالِ انکار نہیں۔ لکھنؤ کی پروردہ زبان عام طور پر ہندوستان بھر میں مستعمل ہوئی۔ اگرچہ اس میں لکھنؤ کا لوچ اور نزاکت باقی نہیں رہی لیکن آدابِ گفتگو، روزمرّہ و محاورہ اور مخصوص اظہارات کے اعتبار سے یہ لکھنؤ کی ایک بڑی دین ہے۔ لکھنؤ کی لسانی اہمیت کے باوجود یہاں کے لسانی لٹریچر اور زبان کو حسن و خوبی سے آراستہ کرنے کی مساعی پر کوئی سیر حاصل کتاب نہ تھی۔ ڈاکٹر حامد اللہ ندوی نے اِس کام کو توجہ، محنت اور دیدہ ریزی سے انجام دیا ہے۔

کتاب کو تین حصّوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ "تمہید" میں اُردو کے آغاز و ارتقا اور مراکز کا ذکر مختلف اَدوار کے تحت کیا گیا ہے۔ یہ محض تاریخی جائزہ نہیں ہے، اس میں لسانیات کی روشنی میں زبان کی تشکیل پر بحث کی گئی ہے اور شمال و جنوب کی یکساں اہمیت کو واضح کیا گیا ہے۔ اَدوار کی تقسیم مصنف کی اپنی ہے جس کی بنیاد اُردو کی فطری نشو و نما کے سوا کچھ نہیں ہے۔ یہ حصّہ

اُردو کے تدریجی و تہذیبی پس منظر کو روشن کرتا ہے۔

* تعارف کے تحت لکھنؤ کے ماہرینِ زبان اور اُن کی لسانی خدمات پر سرسری نظر ڈالی گئی ہے اور تبصرہ کے باب میں اُن ساری کتابوں اور تحریروں کا تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے جن کا ذکر تعارف میں آیا ہے۔ ان دونوں حصّوں میں انشاء اللہ خاں سے مسعود حسین خاں تک سارے ہی اہم مصنّفین اور اُن کی تصنیفات کا ذکر پایا جاتا ہے۔ لکھنؤ کے باب میں مسعود حسین خاں کا ذکر البتہ سہواً آگیا ہے جس کا مصنّف کو احساس ہے لیکن اس سے کتاب کی افادیت بڑھ گئی ہے۔ مصنّفین کے حالات اور اُن سے متعلق سنین و واقعات کی تحقیق نے اس تصنیف کو حوالے کی کتاب بنا دیا ہے۔

لکھنؤ کی لسانی خدمات کا جائزہ جن عنوانات کے تحت لیا گیا ہے وہ حسب ذیل ہیں۔

لسانیات (LINGUISTIES) صوتیات (PHONOLOGY)
رسم خط اور حروفِ تہجی (ORTHOGRAPHY & ALPHABET)
قواعد (GRAMMER) معانی و بیان (PHETORICS)
عروض (PROSODY) لغت (DICTIONARY) اور امثال (PROVERBS)

ڈاکٹر حامد اللہ ندوی جدید لسانیات اور قدیم انشا و قواعد دونوں سے واقف ہیں، اس لئے اُن کی تصنیف میں دونوں کا اچھا تال میل نظر آتا ہے۔ "لکھنؤ کی لسانی خدمات" کو جدید لسانیات کی روشنی میں پرکھنے کی بھی یہ غالباً پہلی کوشش ہے۔ لیکن یہ محض کام کا آغاز ہے۔ ڈاکٹر حامد اللہ ندوی نے راہ دکھائی ہے۔ اس پر اور آگے جانے کی گنجائش باقی ہے۔ ویسے اوّلیت کا شرف ڈاکٹر حامد اللہ ندوی ہی کو حاصل رہے گا۔ تحقیق کے خواہش مند طلبہ کے لئے بھی یہ کتاب موضوع کی تلاش میں معاون ثابت ہو سکتی ہے۔ پانچ صفحات پر مشتمل کتابیات اور چھ صفحات تک پھیلے ہوئے اشاریے سے اندازہ ہوتا ہے کہ مصنّف نے دادِ تحقیق دیتے وقت اپنے پیش رَوؤں کو سامنے رکھا ہے۔ اس کتاب کی اشاعت کے سلسلے میں مہاتما گاندھی میموریل ریسرچ سینٹر بمبئی بھی مبارک باد کا مستحق ہے۔ (یونس اگاسکر)

بقیہ مکتوبات صلا

[illegible] کی کوشش کی گئی ہے۔

[illegible] اعجاز احمد

[illegible]

کی غزل بھی پڑھی۔ مجروح صاحب نے بہت دنوں کے بعد شعر کہے ہیں اور حق یہ ہے کہ حق ادا کر دیا ہے۔

خنجر کی طرح بوئے سمن تیز بہت ہے — موسم کی ہوا اب کے جنوں خیز بہت ہے
مصلوب ہوا کوئی سرِ راہِ تمنّا — آوازِ جرس پچھلے پہر تیز بہت ہے

اُردو غزل میں یہ آواز کتنی منفرد کیسی جاندار اور کس درجہ تابندہ ہے!

اندرون اتوارہ۔ بھوپال — اختر سعید خاں

"شاعر" کا آئندہ شمارہ
گوشۂ عصمت چغتائی

عصمت چغتائی کارٹونسٹ کی نظر میں	
عصمت چغتائی ۔ ایک جادوگرنی (خاکہ)	سلمیٰ صدیقی
عصمت چغتائی سے ایک ملاقات	پروفیسر نور العین علی
	پروفیسر محمود دہلوی
	پروفیسر یونس اگاسکر
عصمت چغتائی کا ناولٹ "عجیب آدمی"	ڈاکٹر ندیمہ ثاقی
ننھی دلہن (کہانی)	عصمت چغتائی

مقالات

اُردو نثر ۔ ایک مختصر جائزہ	رحمٰن حمیدی
کوثر چاندپوری کے ریوتاژ	ممتاز حسنی
ذات کا سفر ۔ ایک تجزیہ	رکنور سین

کہانیاں

پہلا پتھر	رفیعہ منظور الامین
ٹوٹنے کے آگے پیچھے	رجنی پوردار
	ترجمہ: خالد شفائی
عورت	شہاب دانش روی
جنگ (ملالوی)	نوشیری پانڈو
	ترجمہ: حیدر راحت

منظومات

ناوک حمزہ پوری، حرمت الاکرام، عزیز قریشی، میر تقی علی خاں ثاقب، ڈاکٹر احسن رضوی، گلشن بغدادی، مظہر امام، رحمٰن جامی، ثاقب عرفان، مجیب راہی، علی احمد جلیلی، شاہد میر، ماہ جبیں، ساحل سلطان پوری، رئیس الدین، شاہد کبیر، اختر کاظمی، قرب میرٹھی

مکتوبات — نقد و نظر — ریختہ

رفتار

علمی ادبی اور تہذیبی خبریں

سیماب کا شعری سرمایہ ملک کا قیمتی ورثہ ہے "ڈاکٹر رفیق زکریا"

تاریخ ارتقائے ادب میں سیماب کا بڑا مقام ہے۔ "آنند نرائن ملا"

سیماب کی شاعری وطنیت کے جذبات سے بھرپور ہے۔ "کرشن چندر"

سیماب اکاڈمی کی باوقار افتتاحی تقریب اور یومِ سیماب

بمبئی ۱۵ مارچ کو شام کے ۵ بجے الاسلامی ہال میں سیماب اکاڈمی کی افتتاحی تقریب کو مخاطب کرتے ہوئے ڈاکٹر رفیق زکریا وزیر حکومت مہاراشٹرا نے فرمایا کہ سیماب اکاڈمی نے سیماب صاحب کی تصنیفات و تالیفات کی جو فہرست شائع کی ہے اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اُن کا تخلیقی عمل بے پناہ تھا۔ آپ نے نظمیں بھی کہیں، اور غزلیں بھی قطعات اور رباعیات بھی۔ یہی نہیں آپ نے مثنوی مولانا روم کے چھ دفتر اور قرآنِ مجید کا اردو میں مکمل منظوم ترجمہ کرنے کا بے مثال کارنامہ انجام دیا۔ اُنھوں نے نہ صرف زبان و ادب کو مالا مال کیا بلکہ شعر و ادب سے دلچسپی رکھنے والے بہت سے تعلیم یافتہ نوجوانوں کی اس طرح تربیت کی کہ وہ پورے ملک میں مشہور و مقبول ہوئے۔

سیماب اپنی ذات سے خود ایک ادارہ تھے۔ چراغ سے چراغ جلنے کی ایسی مثال اور کہیں نہیں ملتی۔

ڈاکٹر رفیق زکریا نے کہا کہ اُردو کی نظمیہ شاعری کا ذکر سیماب کی قومی وطنی اور سیاسی نظموں کے بغیر مکمل نہیں ہو سکے گا۔ تقسیم ہند سے قبل کرشن گیتا کے نام سے سیماب صاحب کی نظموں کا ایک خوبصورت مجموعہ شائع ہوا تھا۔ اس مجموعے میں سیماب نے لکھا ہے کہ اپنی نظموں سے میں متحدہ قومیت کیلئے رواداری اور بے تعصبی کی بنیاد رکھ رہا ہوں۔

آخر میں ڈاکٹر زکریا نے فرمایا کہ میں سیماب کو ایک بڑا قومی شاعر سمجھتا ہوں اُن کا شعری سرمایہ ہندوستان کا قیمتی ورثہ ہے۔ قومی شاعر کی حیثیت سے جب سیماب پر کام ہو تو اُن کی قومی اور وطنی نظموں کو ہندی میں بھی شائع کیا جائے۔

شاعر بمبئی

ابتدا میں سیماب مرحوم سے متعلق تصاویر، مخطوطات اور مطبوعات کی نمائش ہوئی۔ اس کے بعد سیماب اکیڈیمی کے صدر کرشن چندر نے بھر پور تقریر میں کہا کہ سیماب میں مذہبی تعصب نام کو نہیں تھا۔ اُنھوں نے نہ صرف نعتیں کہیں بلکہ شری کرشن، مہاتما بدھ اور گورو نانک پر بھی نظمیں کہیں۔ وہ ایک سیکولر ذہن رکھتے تھے۔ ان کی شاعری وطنیت کے جذبات سے بھرپور ہے۔ آپ نے بتایا کہ سیماب صاحب کے دو ہزار سے زیادہ شاگرد ہوئے۔ اور انھوں نے اپنے دبستان کو ملک بھر میں پھیلایا لیکن اپنی زندگی میں وہ مقام حاصل نہیں کر سکے جس کے مستحق تھے۔ اس ناانصافی کو ختم کرنے کے لئے سیماب اکاڈمی قائم کی گئی ہے۔ آپ نے کہا کہ جو قوم اپنے ادیبوں اور شاعروں کو یاد نہیں رکھتی اُس کی تہذیب پژمردہ ہو جاتی ہے۔

کُل ہند انجمن ترقی اُردو کے صدر پنڈت آنند نرائن مُلّا نے اپنی صدارتی تقریر میں فرمایا کہ سیماب صاحب کو اُن کے عہد میں صحیح مقام کیوں نہیں ملا اِسکی کئی وجوہات ہیں ایک تو یہ کہ اُنھوں نے شاعری کو مشن بنا لیا تھا اور مشن کو عام طور پر پسند نہیں کیا جاتا۔ سیماب اصلاحِ ادب کی کوشش کرتے تھے۔ معاصرین کو ٹوکتے تھے اور اُن کے معاصرین اُن سے متفق نہیں تھے۔ وہ اُردو کو ہندی کے قریب لانا چاہتے تھے۔ معاصرین اس کے لئے تیار نہیں تھے۔ دہلی اور لکھنؤ اسکول کے مقابلے میں اُنھوں نے آگرہ اسکول قائم کیا۔ یہ بھی ایک وجہ ہے کہ اُن کے خلاف ماحول بنتا گیا۔ یہ تمام پس منظر ہیں جن کی وجہ سے اپنے عہد میں اُنھیں صحیح مقام نہیں مل سکا۔ لیکن یہ بات جھٹلائی نہیں جا سکتی کہ تاریخ ارتقائے ادب میں اُن کا بڑا مقام ہے — آج ہم تعصب سے دُور ہو کر متوازن انداز میں سوچ سکتے ہیں، ایسے دَور میں سیماب جیسے دانشوروں، شاعروں اور ادیبوں کو اُن کا صحیح مقام دیا جانا آسان ہو گیا ہے۔

پروفیسر یونس اگاسکر، سید محمد زیدی، ڈاکٹر رفیعہ شانی، رناگورو، ڈاکٹر ظ۔ انصاری، مولانا پرواز اصلاحی اور ڈاکٹر افتخار احمد قمر نے مضامین اور مقالے پیش کئے۔ افتخار امام صدیقی نے علامہ سیماب اکبرآبادی کی نظم "ہم ہیں" سنائی۔ سید محمد زیدی نے نظامت کی ذمہ داری ادا کی۔

سیماب اکاڈمی کے اس بامقصد جلسے میں علم و ادب سے دلچسپی رکھنے والے نمایاں اور ممتاز اصحاب نے شرکت کی۔ اعجاز صدیقی صاحب نے شکریہ کی رسم ادا کی۔

۱۷ مارچ ۷۹ء کو شب کے ۹ بجے یوم سیماب منایا گیا۔ اس کے لئے ایک شاندار شبِ غزل پروگرام مرتب کیا گیا تھا۔ شبِ غزل کی صدارت موسیقارِ اعظم جناب نوشاد علی نے فرمائی اور افتتاح عالمگیر شہرت یافتہ گلوکار جناب محمد رفیع نے علامہ سیماب کی دو غزلیں سازوں کے ساتھ گا کر کیا۔ ان کے علاوہ راجندر مہتہ

نشاط بھی۔ میوزک ڈائرکٹر رویندر جین، نیلم ساہنی، اختر آزاد، گووند پرشاد سلامت، ابو اشرف اور انیس صابری جیسے ممتاز گلوکاروں نے بھی سیماب کی غزلیں پیش کیں۔ شب کے ایک بجے ساز و آواز کا یہ پروگرام ختم ہوا۔ اس موقع پر ایک خوبصورت سوینیر بھی "سیماب اکادمی" کی طرف سے چھاپا گیا تھا۔

ناگپور میں بزم سیماب دہلی کی خصوصی نشست

مشہور شاعر جناب ضیا فتح آبادی، صدر بزم سیماب دہلی کی ناگپور میں آمد اور چند روزہ قیام کے دوران جہاں چند مشاعرے ان کے اعزاز میں ہوئے وہیں بزم سیماب دہلی کی ایک خصوصی نشست یکم فروری کو چھیدولک بلڈنگ میں مسٹر پرتیش کمار کی قیام گاہ پر منعقد ہوئی جس کی صدارت ناگپور کے کہنہ مشق شاعر شاکر حکیمی صاحب نے کی۔ اس میں ۱۲ شعرا نے اپنا کلام سنایا۔ مقامی اور غیر مقامی شعرا کا تعارف جناب جلیل ساز نے کرایا۔ نشست کے آغاز میں حضرات جوش ملسیانی، مولانا محوی صدیقی، مسعود حسن رضوی ادیب، ن۔ م راشد، طالب دہلوی، شورش کاشمیری، پروفیسر محمود بیگ اور حاتی ناگپوری کی وفات پر شعرا اور حاضرین نے اپنے دلی رنج و غم کا اظہار کیا اور ایک منٹ خاموش کھڑے ہو کر ان مرحومین کو خراج عقیدت پیش کیا۔ ضیا فتح آبادی اور شارق جمال نے حضرت جوش ملسیانی سے متعلق دو تعزیتی قطعات پڑھے۔ یہ نشست بیحد کامیاب ہوئی۔ آر۔ کے بھگی، ایڈیشنل سکریٹری بزم سیماب دہلی

وفیات

۲۷ جنوری ۱۹۷۶ء کو اردو کے مشہور و ممتاز بزرگ شاعر پنڈت لبھو رام جوش ملسیانی کا ۹۲ سال کی عمر میں ان کے وطن نکودر میں انتقال ہو گیا۔ وہ مرزا داغ دہلوی کے تلامذہ کی آخری یادگار تھے۔ خود جوش ملسیانی نے اپنی یادگار سے ایک کثیر تعداد اپنے تلامذہ کی چھوڑی ہے۔ مرحوم نے اردو زبان اور فن شعر کی کافی خدمات انجام دیں۔

حضرت جوش ملسیانی کے ۸ شعری اور تین نثری مجموعے شائع ہوئے۔ ان کا جشن منایا گیا تھا۔ حکومت نے پدم شری کا اعزاز بھی دیا تھا۔ ادارہ "شاعر" ان کے صاحبزادے جناب عرش ملسیانی سے اپنی دلی ہمدردی کا اظہار کرتا ہے۔

۱۰ فروری ۱۹۷۶ء کو ولنگڈن ہاسپٹل دہلی میں سہ پہر کے وقت ڈاکٹر عابد علیم کا اچانک انتقال ہو گیا۔ انھیں دل کا دورہ پڑا تھا۔ ڈاکٹر علیم ۷۱ سال کے تھے۔ وہ اردو اور عربی ادب کے عالم تھے۔ ان کا شمار ممتاز ماہرین تعلیم میں ہوتا تھا۔ سابق اسال مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں عربی کے پروفیسر رہے۔ ۱۹۶۸ء میں انھیں اسی یونیورسٹی کا وائس چانسلر بنایا گیا۔ وہاں سے سبکدوش ہوئے تو حکومت ہند کے قائم کردہ ترقی اردو بورڈ کے چیئرمین بنائے گئے۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ اور مختلف علمی و ادبی اداروں سے بھی مرحوم کا تعلق تھا۔ افسوس کہ ایک بڑی شخصیت ہم میں سے اٹھ گئی۔ اسلامی علوم اور اردو زبان کا وہ ایک بڑا سہارا تھے۔ ان کے پسماندگان میں بیگم علیم کے علاوہ چار صاحبزادیاں اور ایک صاحبزادے ڈاکٹر عبدالعلیم، لیکچرر مسلم یونیورسٹی علیگڑھ ہیں۔ ادارہ "شاعر" کو ان سے دلی ہمدردی ہے۔ ڈاکٹر علیم کی موت قوم و ملک اور زبان و ادب اور دین کا بہت بڑا نقصان ہے۔

۵ فروری ۱۹۷۶ء کی شب میں یکایک مولانا مہر محمد خاں شہاب مالیر کوٹلوی ایک مختصر سی علالت کے بعد ۸۵ سال کی عمر میں انتقال فرما گئے گویا بمبئی کا ایک آفتاب علم و ادب غروب ہو گیا۔ بمبئی میں پچاس سال تک مرحوم کا فیضان علم جاری رہا۔ وہ ایک جید عالم تھے۔ ان کا قرآن و حدیث اور اسلامیات کا مطالعہ بیحد وسیع تھا۔ شعر و ادب پر بھی گہری نظر رکھتے تھے تمام عمر لکھتے اور پڑھتے رہے۔ مرحوم بمبئی کی علمی، ادبی اور دینی محفلوں کی جان تھے اور اخلاق و شرافت و محبت اور خلوص کا بے مثال نمونہ۔

ادارۂ "شاعر" بیگم شہاب اور ان کے فرزندوں حبیب احمد خاں اور احمد مصطفیٰ خاں سے اپنی دلی ہمدردی کا اظہار کرتا ہے۔ مولانا شہاب مرحوم کی بکھری ہوئی تحریروں اور یادداشتوں کو جمع کر کے شائع کرنا ضروری ہے۔

۱۱ فروری ۱۹۷۶ء کو شب کے ۹ بجے لاہور (پاکستان) کے ایک اسپتال میں اردو کے مشہور شاعر شفیق کوٹی کا انتقال ہو گیا۔ شفیق اللہ خاں شفیق کوٹی کوٹ ضلع فتحپور (ہندستان) کے رہنے والے تھے۔ تقسیم سے پہلے ہندستان میں ایکسائز انسپکٹر تھے۔ کچھ دنوں بمبئی میں قیام رہا۔ پھر پاکستان چلے گئے۔ وہاں سپرنٹنڈنٹ کے عہدے تک پہنچے۔ علامہ سیماب اکبر آبادی کے محبوب و ممتاز تلامذہ میں سے تھے۔ بڑے خوش فکر اور کہنہ مشق شاعر۔ پاکستان میں بھی غزلوں میں خوب نام پیدا کیا۔ ۱۹۶۹ء میں ان کی غزلوں کا ایک خوبصورت مجموعہ "دیار غزل" لاہور سے شائع ہوا تھا جس پر رئیس احمد جعفری نے ایک طویل دیباچہ لکھا تھا۔ دوسرا مجموعہ شائع ہونے والا تھا۔ مرحوم کو اپنے بھائی اعجاز صدیقی مدیر "شاعر" سے گہرا لگاؤ تھا۔ ۲۰ جنوری کو انھوں نے آخری خط لکھا تھا، ہندستان آنا چاہتے تھے مگر اس کے بجائے موت آ گئی۔ ان کے پسماندگان میں ان کی بیوہ کے علاوہ تین صاحبزادے اور تین صاحبزادیاں ہیں۔ ایک صاحبزادے "جنگ" کراچی میں ہیں۔ ادارۂ "شاعر" سب کے غم میں برابر کا شریک ہے۔

شاعر بمبئی


قوم ترقی کی راہ پر
زیادہ سے زیادہ
لوگوں کے لئے مزید خوراک
اس سال اناج کی پیداوار ١١ کروڑ ٤٥ لاکھ ٹن تک
پہنچ جانے کا امکان ہے جو کہ ایک ریکارڈ
پیداوار ہوگی۔
بھارت میں عوام میں ضروری چیزوں کی
تقسیم کے سسٹم میں بہت سدھار ہوا ہے
اور اسے اب دنیا میں بہترین سسٹم مانا جاتا ہے۔
مضبوط ارادہ اور کڑی محنت ہمارے ساتھی ہیں
davp 75/450



جاری شدہ سنہ ۱۹۳۰ء

بانی: علامہ سیماب اکبرآبادی مرحوم

سینتالیس سالہ علمی ادبی اور تہذیبی

ماہنامہ

بمبئی

شاعر

جلد ۴۷ — شمارہ ۳

۱۹۷۶ء

مُدیرِ اعلیٰ

اعجاز صدیقی

مُدیرِ معاون

یونس اگاسکر

ادارۂ تحریر و مشاورت

کرشن چندر

ڈاکٹر محمد حسن

ڈاکٹر ظ۔ انصاری

آغا رشید مرزا

مہتمم: ناظر نعمان صدیقی

بدلِ اشتراک

فی کاپی — ایک روپیہ ۲۰ پیسے

زرِ سالانہ ۱۲ روپے

معاونین سے ۵۰ روپے

تاحیات خریداری ۲۵۰ روپے

ممالک غیر سے ۳۰ شلنگ

ترتیب

تصویرِ سرِ ورق: عصمت چغتائی

ترسیلِ زر کا پتہ: ماہنامہ شاعر — قصر الادب — بمبئی ۴۰۰۰۰۸

خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ شاعر — مکتبہ قصر الادب — پوسٹ بکس نمبر ۴۵۲۶ — بمبئی ۴۰۰۰۰۸

"اگر کنبہ چھوٹا ہو تو والدین ہر بچے پر زیادہ توجہ دے سکتے ہیں اور اسے زندگی کی زیادہ سہولتیں مہیا کر سکتے ہیں۔ اس سے ملک کو بھی بحیثیت مجموعی اپنے وسائل کے بہتر استعمال کا موقع ملتا ہے۔

فیملی پلاننگ ہماری قومی ترقی کے پروگرام کا ایک لازمی جزو ہے اور ہم نے اسے عملی جامہ پہنانے کے لئے اپنے تمام ذرائع کو بروئے کار لانے کا تہیہ کر رکھا ہے۔"



اندرا گاندھی

شاعر۔ بمبئی

ایک براہِ راست گفتگو

گزشتہ ۲۷ سال میں "شاعر" کا ہر اداریہ اُردو تحریک اور اُس کے اُبلتے بڑھتے حالات و مسائل ہی پر لکھا گیا ہے۔ یہ اداریے تاریخ بھی ہیں، تنقید و محاسبہ، تنظیم و تجدید اور تلقینِ عزم و عمل کا ایک ناقابلِ فراموش دفتر بھی۔ یہ سیکڑوں صفحات پر پھیلے ہوئے ہیں۔ اِن اداریوں نے اُردو کے مقصد اور اُس کی تحریک کو کتنا آگے بڑھایا، کتنا فائدہ پہنچایا، اُردو کو فنا کے گھاٹ اُتار دینے والوں پر اِن میں کیسی کیسی کڑی، بے لاگ اور دو ٹوک باتیں کہی گئیں، اُردو کے مُوقف کو کہیں کس کس انداز سے پیش کیا گیا، اُردو دنیا اِس سے بخوبی واقف ہے۔ اِن اداریوں کی گونج سیاست دانوں، سرکاری کمیٹیوں اور سیاسی مذاکروں میں رہی ہے۔ اِن میں سے بعض خاموش کارروائی ACTION کی زد میں بھی آئے اور اِن پر باز پُرس بھی ہوئی۔ بلاشبہ تقسیم کے بعد یہ اداریے اُردو کی ایک مکمل کہانی ہیں۔ اِس طویل کہانی میں بے شمار کردار، اُن کے اقوال و بیانات، تناظر اور وہ محل و مقامات (SITUATIONS) ہیں جو ستائیس سال میں سامنے آتے رہے ہیں۔ شاید ہی کوئی موقع و محل نظر انداز ہُوا ہو۔ اِن میں تدبیرِ منزل، زادِ راہ اور جرأت مندانہ اقدامات کے اشاریے بھی پیش کئے گئے۔ اُردو کی ترقی و بقا اور تحریک کو گرم جوش رکھنے کیلئے مصلحتوں سے ماورا ایک غیر جانبدارانہ رویہ اپنایا گیا۔ جہاں تک کہ اُردو اداروں اور اُردو تحریک کی متحرک و غیر متحرک ممتاز شخصیتوں کو بھی وقتی پس منظر میں نشانہ بنانے سے گریز نہیں کیا گیا۔ اِن اداریوں کے ذریعہ جو سب سے بڑی خدمت انجام ہوئی، وہ ہے اُردو والوں کے دل و دماغ سے مایوسی، ناامیدی اور ناراضی و بے بسی کے احساس کو جھٹک کر پھینک دینا۔ اپنے مطالبات سے پیچھے نہ ہٹئے، کسی جبر اور سیاسی دباؤ کو قبول نہ کرنے اور علاقائی لسانی پیچیدگیوں سے نہ گھبرانے کی فضا اِن اداریوں نے پیدا کی۔ یہ اعزاز بھی "شاعر" اور اُس کے اداریوں ہی کو پہنچتا ہے کہ اُردو کا رسم الخط بدل دینے کی آندھیوں اور سیلابوں کی آوازوں اور کوششوں کو سختی کے ساتھ ناکام بنا دیا گیا۔ ذہنوں پر برسوں کے تنے ہوئے جالوں کو مُنہدم کرنا آسان کام نہ تھا۔

میں نے "شاعر" کے اداریوں میں اُردو والوں سے کبھی براہِ راست گفتگو نہیں کی۔ اِس اداریہ میں ذاتی طور پر مخاطبت کی وجہ یہ ہے کہ اب اکثر مجھ سے پوچھا جاتا ہے کہ اُردو کے مستقبل کے بارے میں میرا کیا خیال ہے؟ شاید اِس لئے کہ میں ماضی کی لسانی جنگ میں ایک ادنیٰ سپاہی، مُبصر اور فریق رہا ہوں۔ ہر محاذ پر میں نے نہ صرف مُقابلہ کیا ہے بلکہ اپنے ساتھیوں کی ہمت بندھائی ہے۔ جب ہر طرف کالے کالے بادل منڈلا رہے تھے، اضمحلال و شکستگی کا احساس اپنی انتہا کو پہنچ چکا تھا، میں اُس وقت بھی پُر اُمید تھا اور اُردو والوں کو یقین دلاتا تھا کہ یہ بادل ضرور چھٹیں گے، روشنی کی کِرنیں پھوٹیں گی، اُردو کو اُس کا جائز مقام مل کر رہے گا اور پھر بلند ہوگی۔ میں نے قنوطیت کے اُس گھُپ اندھیرے میں رجائیت کی جو شمع جلائی تھی، شُکر ہے کہ اُس کی لَو تیز ہوتی چلی گئی۔ آج دنیا کا سب سے بڑا اُردو مرکز ملک ہندوستان ہی ہے۔

رہا سوال اُردو کے مُستقبل کا تو میں کسی نجومی کی طرح قطعیت کے ساتھ کوئی حکم لگانے سے تو قاصر ہوں۔ البتہ تجزیہ و حالات کے نتیجہ میں اِتنا ضرور عرض کرسکتا ہوں کہ اُردو کا مستقبل، ہندوستان کے مستقبل سے جڑا ہوا ہے اور چونکہ میری چشمِ تصور ہندوستان کے تابناک مُستقبل کو دیکھ رہی ہے، اِس لئے مجھے اُردو کا مُستقبل بھی روشن معلوم ہوتا ہے۔ آئندہ نسلیں ہی میرے اِس قیاس کے صحیح ہونے یا نہ ہونے کا اندازہ لگا سکیں گی۔ مگر میری اِس خوش فہمی کے ہرگز ہرگز یہ معنی نہیں ہو سکتے کہ موجودہ اور آئندہ نسلوں کو اب کچھ کرنا نہیں ہے۔ ابھی تو بہت کچھ کرنا ہے اور مُسلسل کرتے رہنا ہے۔ ۲۷ سال میں ہم نے صرف اپنا حق منوانے کی حق طلبیوں کی نشاندہی کی ہے۔ اُردو زبان کی اہمیت، ضرورت اور افادیت کا جمہوری احساس پیدا کرایا ہے اور سیاسی و سماجی حلقوں کی اُن غلط فہمیوں کا ایک حد تک ازالہ کیا ہے جو اُردو کو کسی صورت قبول کرنے کے لئے تیار نہ تھے۔ جو اُردو کو ہندی زبان کا حریف، اُس کی سوتیلی یا پڑوسی ملک پاکستان کی زبان قرار دیتے تھے۔ بالفاظِ دیگر مُلک میں اُردو دوستی کی ایک لہر آئی اور مخالفت کم ہوئی۔ ویسے اندرونی سیاست کا خطرہ تو مُلک کو ہمیشہ رہے گا اور اِس اعتبار سے اُردو کو بھی۔ اُردو زبان کے فروغ اور اُس کے مستقبل کا انحصار موجودہ اور آئندہ نسلوں کے حسنِ عمل پر ہے۔ مُلک کی عصری ترقی یا دُنیا زبانوں کے ساتھ اخلاق و یگانگت کے برتاؤ پر ہے۔ کچھ اپنی زبان میں لینے اور کچھ دوسری زبانوں کو دینے پر ہے۔ اُردو زبان کے ایک ہمہ گیر مستحکم نظام اور معاشی ضرورتوں کی کفالت میں اُس کے عمل دخل پر ہے۔ ممکن ہے اب سے پچاس سال بعد کی اُردو آج کی

اُردو سے مختلف ہو۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اُردو ہندی دونوں زبانیں اتنی قریب آجائیں کہ ان دونوں کا جھگڑا مٹ جائے۔ یہ سب کچھ تاریخی عوامل پر منحصر ہے۔ مگر تاریخی عوامل کچھ زیادہ دور تک ساتھ نہیں دیتے۔ تاریخ تو بنتی اور بگڑتی رہتی ہے۔ زبانوں کا عروج و زوال تو اُن کے بولنے، لکھنے، پڑھنے اور محبت کرنے والوں پر ہوتا ہے جس زبان میں جتنی زیادہ عصری توانائی، جاذبیت، اظہار و ابلاغ کی قوت اور جدید علوم کو خود میں سمو لینے کی صلاحیت ہوگی، وہ اتنی ہی زیادہ پھلے پھولے گی۔ ہندوستان تو کیا پوری دنیا میں اُردو کو پھیلایا جاسکتا ہے۔ اس کے لئے ایک زبردست منصوبہ بند تنظیم کی ضرورت ہے۔ کروڑوں روپے کا سرمایہ چاہئے اور مجھ جیسے سر پھرے خادموں کا ایک قافلہ۔

میں تو اب بہت تھک چکا ہوں۔ میری صحت میرا ساتھ چھوڑ چکی ہے۔ عمر کی اُس منزل میں ہوں جس میں قویٰ مضمحل ہوجاتے ہیں۔ نہیں کہہ سکتا کہ اب میں اُردو کے مسائل پر اظہارِ خیال کر بھی سکوں گا یا نہیں۔ میری پوری زندگی بے سکونی، بے آرامی اور پریشانی میں گزری ہے۔ اب تو مجھ سے "شاعر" کا بوجھ بھی نہیں اُٹھ رہا ہے۔ ۴۲ سال کی اس مسلسل جہاد نے مادی، جسمانی اور میری تخلیقی صلاحیتوں کو سخت نقصان پہنچایا ہے۔ میرے بے شمار اذیت ناک ذاتی مسائل میں ایک بہت بڑا مسئلہ "شاعر" کا بھی ہے۔ عجیب بات ہے کہ میں اُردو کے مستقبل سے تو مایوس نہیں ہوں؛ لیکن "شاعر" کے مستقبل سے قدرے مایوس ہوں۔ خدا جانے موجودہ اور آئندہ نسلیں اس وراثت کو سنبھال سکیں گی یا نہیں۔ یہی بات اور یہی سوال اُردو زبان کے مستقبل کے سلسلے میں بھی ہے۔ آزادی کے بعد ہماری ۲۸ سال کی مسلسل تگ و دو اُردو تحریک کو ایسے موڑ پر لے آئی ہے، جہاں سے اب راستہ پہلے سے کہیں زیادہ صاف اور ہموار ہے — اور ۴۹ سال کی مسلسل کاوش نے "شاعر" کو وہاں پہنچادیا ہے، جہاں روایت ایک روشن حقیقت بن جاتی ہے مگر سوال کسی عظیم روایت کو قائم رکھنے کا ہے۔ چاہے وہ "شاعر" کی ہو یا اُردو زبان کی!!

صدیقی

"شاعر" کا آئندہ شمارہ

اپریل۔ مئی ۱۹۷۶ء

گوشۂ سیماب اکبرآبادی مرحوم

(بسلسلۂ افتتاح سیماب اکاڈمی اور یوم سیماب)

سیماب کا ایک سفر (اسکیچ)
سیماب اکبرآبادی (مختصر سوانح)
خلائیں چھوڑ دی دنیا میں۔۔۔ (رپورتاژ) کرشن چندر
استقبالیہ تقریر — ڈاکٹر رفیق زکریا
خطبۂ افتتاحیہ — آنند نرائن ملا
خطبۂ صدارت — ڈاکٹر زرینہ ثانی
سیماب کی نظمیہ شاعری — سیماب اکبرآبادی
چند نظمیں — ڈاکٹر افتخار احمد
سیماب کی غزلیہ شاعری میں سیاسی رنگ و آہنگ — سیماب اکبرآبادی
سازو آواز (چند غزلیں) — سید محمد زیدی
سیماب اور اُن کی شاعری — مولانا پرواز اصلاحی
وحی منظوم کا ادبی اور لسانی مرتبہ — سیماب اکبرآبادی
وحی منظوم کا ایک صفحہ — یونس اگاسکر
سیماب معاصرین کی نظر میں — سیماب اکبرآبادی
الہامِ منظوم (مثنوی مولانا روم) کا ایک صفحہ
چند رباعیات — سیماب اکبرآبادی

مطبوعات و مخطوطاتِ سیماب — سکریٹری نشر و اشاعت سیماب اکاڈمی

تعارف
سیماب اکبرآبادی — ڈاکٹر رفیق زکریا
پنڈت آنند نرائن ملا — کرشن چندر
سید محمد زیدی — نوشاد علی
محمد رفیع

مقالات

اُردو مرثیے کی تشکیلِ جدید اور سراپا — پروفیسر الیاس احمد صدیقی
اُردو شاعری میں ہیئت کے تجربے — پروفیسر انور صدیقی

افسانے
سیلاب — نعیم کوثر
عورتوں کا تاجر (پنجابی) — رام سروپ انکھی
مترجمہ: مناظر عاشق ہرگانوی

طنز و مزاح

زردہ افسانہ کہ آشفتہ بیانی مانگے — یوسف ناظم

منظومات

محسن زیدی — صلاح الدین نیّر — مغیث الدین فریدی — نوبہار صابر
رؤف خیر — شباب للت — نصرت قریشی — سخاوت نظیر
رشید عبدالسمیع جلیل — انجم جمالی

مکتوبات

نقد و نظر

نادر شہ پرتاب گڑھی

اپنی دھرتی اپنی بات

(پندرہ سال پہلے ایک غیر مطبوعہ نظم)

مجھ کو ان چاند ستاروں سے بھلا کیا لینا
جو نہ جلتے ہیں، نہ بجھتے ہیں مری مرضی پر
درد سے جن کو غرض ہے نہ غمِ دل کی خبر
جو کچھ اس طور سے بے حس ہیں کہ جیسے پتھر
جن پہ ہوتا ہی نہیں تند ہواؤں کا اثر
جھلملاتی بھی نہیں جن کی لَویں آندھی میں

میرے کس کام کی یہ ساکت و جامد شمعیں
جو نہ منزل، نہ کسی در کا پتہ دیتی ہیں
جو نہ میرا، نہ مرے گھر کا پتہ دیتی ہیں
صرف احساسِ غمِ زیست بڑھا دیتی ہیں
شعلۂ درد کو رہ رہ کے ہوا دیتی ہیں

مری خاطر تو بڑی شے ہے وہ مٹی کا چراغ
جس کا تیل اشکوں کی مانند زمیں پہ بہہ جائے
جس کی لَو سختیِ حالات سے گھٹ کر رہ جائے
میری آہوں کی طرح، میری کراہوں کی طرح
کپکپاتی بھی رہے اور لرزتی بھی رہے
میرے ہونٹوں کی طرح اور مری باہوں کی طرح
وقت پڑنے پہ جو رنگ اپنا بدل سکتا ہو -!
میرے احباب کی بے رحم نگاہوں کی طرح

میری خاطر تو بڑی شے ہے وہ مٹی کا چراغ
دے سکے جو مری دھرتی [illegible] مرے غم کا سراغ

○ مجھ کو ان چاند ستاروں سے بھلا کیا لینا ○ بیگم نادرہ - [illegible]
شاعر بمبئی

ظہیر غازی پوری

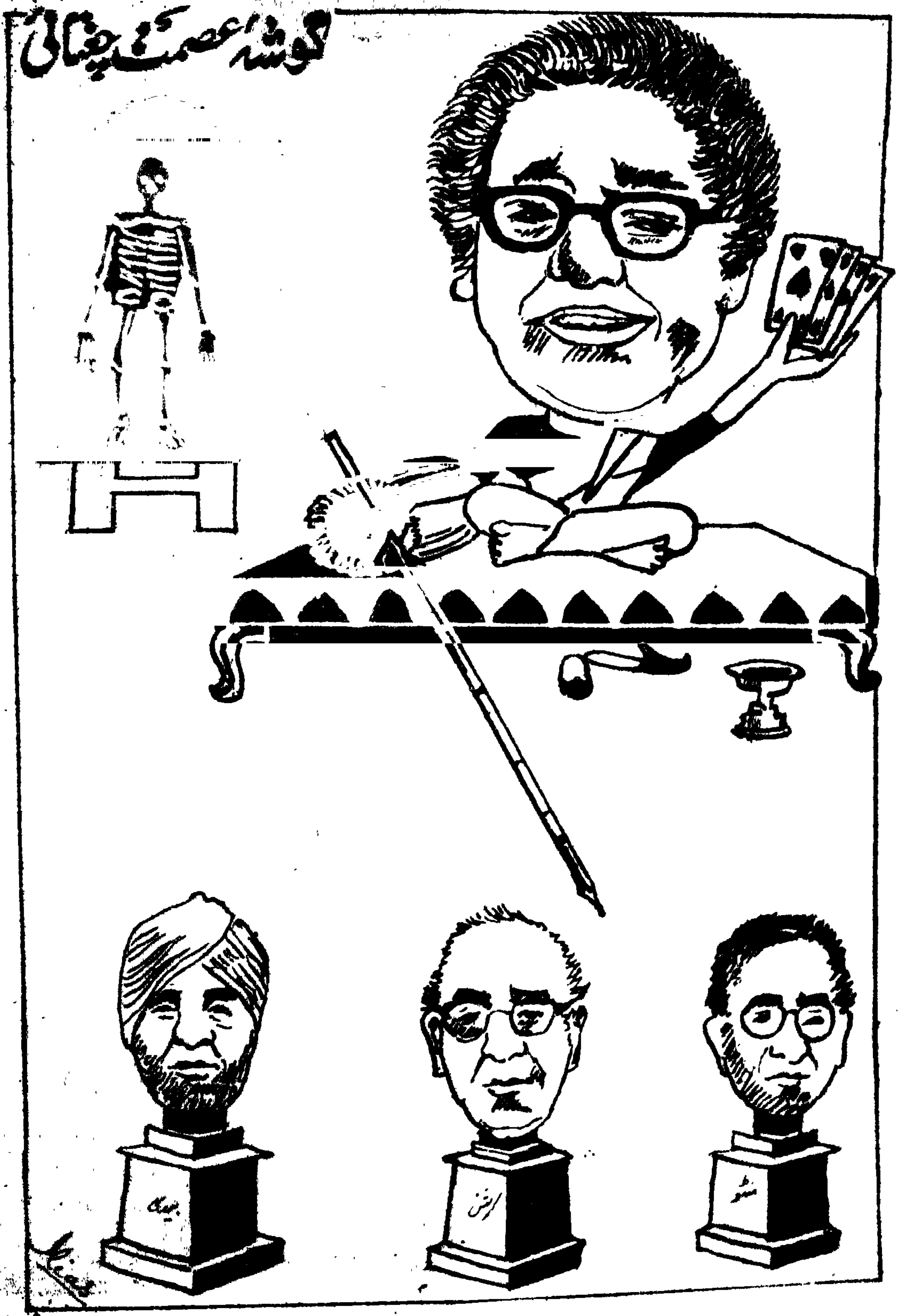
تغیرات

یہ میری میز پہ گلدان کب سے رکھا ہے
مری طرف جو بڑی حسرتوں سے تکتا ہے
کہ جیسے اس کی طرف پہلے خود میں تکتا تھا
ذرا سی گرد بھی پڑنی محال تھی اس پر
شگفتہ پھولوں سے ہر دم مہکتا رہتا تھا
یہ آج پھولوں سے محروم ہے مگر ہے وہی
سجا دوں پھر، تو وہی مسکراہٹ ابھرے گی
مگر یہ بات کچھ ایسی ہے سجاتا کیا
میں اس کے سامنے دو پل ٹھہر نہیں سکتا
بکھر چکا ہے مری زندگی کا شیرازہ
کہ عمر کھو چکی اب رنگِ رُخ ہم تازہ!

تلاش

نہ لفظوں کا صحرا نہ فکروں کا جنگل
ابھی میں جہاں سے گزرنے لگا ہوں
یہ رستہ نیا ہے، مگر خواب کتنے
سجائے ہیں خود اپنی پلکوں پہ ایسے
کہ کربِ سفر کا کوئی شائبہ بھی سا
نہ نقاش چہرے پہ آئے نظر اب
(کہ پھر کوئی یہ کہنے والا نہ ہوگا)
کہ بے سمتیاں بھی ہیں میری حدوں کی

○ ریلوے آؤٹ ایجنسی [illegible]


گوشۂ عصمت چغتائی
منٹو
کرشن
بیدی

عصمت چغتائی ــــ ایک جادوگرنی

سلمیٰ صدیقی
دی پنچ - ۲ حسن آباد مین - سینٹ فرانسس ایونیو - سانتا کروز بمبئی - ۵۴

عصمت چغتائی سے میں کب ملی؟ یہ بتانے کے لئے مجھے بمبئی سے ایک ہزار میل دور جانا پڑے گا..... آپ جغرافیہ سے تو واقف ہیں نا؟ تو سنئے اس بڑے کاروباری شہر سے نکلئے اور چلئے دہلی کی طرف کہ جو اس دیش کی راجدھانی ہے، جہاں بڑے سے بڑے منسٹر، وزیر، تاجر، بیوپاری اور بھکاری اپنے اپنے اہل و عیال اور اپنے اعمال کے ساتھ اس شہر میں بستے ہیں۔ ایک طرف جمنا بہتی ہے، دوسری طرف بلکہ تین طرف عمارتوں، مقبروں، سمادھیوں اور انسانوں کی ریل پیل ہے۔ اسی جمنا کے پل پر ایک پل کے لئے ٹھہرئیے اور شاہدرہ کی راہ پکڑئیے..... وہاں سے چل نکلئے علی گڑھ!! درمیانی فاصلہ بہت مختصر ہے۔ چاہے ریل سے جائیے چاہے موٹر سے، چاہے رکشا یا بیل گاڑی سے اور جی چاہے تو پیدل ہی چلئے۔ اگر آپ کی ناک سیدھی ہے تو سیدھی راہ پکڑئیے، اگر ناک ٹیڑھی ہے تو ٹیڑھی راہ پکڑئیے اور اگر آپ کی ناک اونچی ہے تو بھی کوئی مضائقہ نہیں، اس لئے کہ علیگڑھ کی تعلیمی بستی میں صرف اونچی ناک والے ہی بستے ہیں۔ یہاں قفل یعنی تالوں اور علم یعنی تعلیم کا کاروبار بڑے پیمانے پر ہوتا ہے۔ پہلے یہاں کے قفل دراز دل، الماریوں، صندوقوں اور خزانوں کو مقفل رکھتے تھے۔ میرے بچپن میں گرد یہ تالے لڑکیوں کے ذہن پر لگائے جاتے تھے، اب تو نہیں یہی تالے مردوں کے ذہن پر لگاتی ہیں۔ کچھ تو مکل ہے۔ میزان برابر ہے۔ انتقام اپنی تکمیل کو پہنچا!!

علی گڑھ میں سردی، گرمی، خزاں و بہار کے علاوہ بھی ایک موسم ہوتا ہے، جسے امتحان کا موسم کہتے ہیں۔ جب کھیتوں میں سرسوں پھولتی ہے۔ آم کے درختوں پر بور لگتی ہے، آسمان پر بے رنگ بدلیاں حرکت میں اور باغوں میں بے نام چڑیاں چہکتی ہیں ــــ کالج کی کیاریوں میں سویٹ پی کی رنگ برنگی بکھری بیل بوٹوں ... سے شعروں کی کلیوں میں روشنیاں جگمگاتی ہیں ... کی طرح گرنے لگتی خاموشی۔

یہاں تو سمجھ لیجئے کہ نئی ظلموں کے رنگ اور کچے عشق کی آگ پر امتحان کے آسیب نے اپنے پر پھیلائے ہیں۔

ایک ایسی ہی آسیبی دوپہر میں مسلم گرلز اسکول کی چھٹی جماعت کی بدشوق طالبات کلاس میں جمی بیٹھی بے چینی سے پانچویں گھنٹے کی منتظر تھیں۔ تھوڑی دیر پہلے حساب کے گھنٹے میں ٹیچر نے یہ خوشخبری سنائی تھی کہ پانچویں گھنٹے میں سب لڑکیاں اسمبلی ہال میں جمع ہو جائیں، جہاں ایک جادوگر جادو دکھانے آنے والا ہے۔ خوشی اور اشتیاق کے مارے ہم سب کی گھگھی بندھی ہوئی تھی۔ اور وقت تھا کہ رتی بھر بڑھتا ہی نہ تھا۔ بارے خدا خدا کرکے چوتھا گھنٹہ ختم ہوا اور چھٹی کی لمبی گھنٹی بجی...... عجیب سی ہڑبونگ مچنے لگی۔ ڈیسک کھٹ پٹ بند ہونے لگے، کرسیاں گھسیٹی جانے لگیں۔ دواتیں الٹنے لگیں، لڑکیاں ایک دوسرے سے ٹکرانے لگیں...... کہ اسی وقت کرنا خدا کا کیا ہوا کہ ایک نوجوان خاتون سفید ساڑھی پہنے، کنارہ جس کا نیلا، سفید بلاؤز کہ آستین جس کی نصف، کالی چپلیں کہ ایڑی جس کی سپاٹ، کھلتی گندمی رنگت کہ سرخی جس میں مفقود، کالے بے حد گھنگھریالے اور گھنے بال، بے نیاز، عینک میں سے جھانکتی ہوئی فہیم و ذہین آنکھیں، سرخ ... اور چپ چاپ ہونٹ، سنجیدگی سے جنہیں پر تھا...... ہاتھوں میں چند رجسٹر لئے کلاس میں داخل ہوئیں ــــ اس طلسمی ماحول میں جب ہاتھ سے جادو کا تیر چلا ہوا، ایسی طلسمی شکلوں کی آمد نے سارے جوش و خروش پر اوس ڈال دی۔ سارے چہرے اتر گئے...... وہ خاتون بڑی بے تکلفی سے مسکرا کر ٹیچر کی کرسی گھسیٹ کے میز کے پیچھے کھڑی ہو گئیں اور بولیں۔

"کہاں بھاگی جا رہی ہو ......"

"جی ہاں چھٹی ہو گئی ہے..." مہرالنساء بڑے وقار سے بولی۔

"چھٹی کہاں، ابھی تو پانچواں گھنٹہ شروع ہوا ہے!"

"پانچواں گھنٹہ نہیں ہوگا..... جادو دکھایا جائے گا....."
طاہرہ سلیم آگے بڑھ کے کچھ گھبری گھبرتی ہوئی بولی.....
"جادو؟..... کیا جادو؟"
"جی ہاں جادو..... وہ جو جادو ہوتا ہے نا جیسے جادوگر دکھاتے ہیں۔"
شمیمہ نے اپنے طور پر وضاحت کی!
"کہاں دیکھوگی جادو؟"
"اسمبلی ہال میں" خورشیدہ نے جلدی سے کہا اور بستہ لپیٹنے لگی۔
وہ خاتون بڑی تیکھی مسکراہٹ کے درمیان بولیں
اگر میں تم کو اسی کلاس روم میں جادو دکھا دوں تو؟"
"کلاس میں جادو؟" کئی لڑکیاں ایک ساتھ چیخ پڑیں.....
"ارے شور کیوں مچاتی ہو؟ بات تو سنو"
"وہ دیکھو جادوگر آگیا" زہرہ نسیم نے اسمبلی ہال کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بڑے جوش و خروش سے کہا.....
جادوگر واقعی آگیا تھا ــــ وہ کالا چغہ پہنے ہوئے تھا جس کی ڈھیلی ڈھالی لمبی لمبی آستینیں زمین تک لٹک رہی تھیں۔ مونچھیں بڑی بڑی ٹھوڑی سے نیچے لہرا رہی تھیں اور اُس نے ایک لمبی سی سرکس کے جوکروں جیسی ٹوپی پہن رکھی تھی۔ بڑا ہی مستند اور روایتی سا جادوگر تھا ہم سب اُس کے حلیہ پر تقریباً عاشق ہوئے جا رہے تھے.....
نووارد خاتون نے جادوگر پہ عجیب سی استہزائیہ نظر ڈالی اور بڑے طنزیہ لہجے میں بولیں.....
"دیکھو بچی۔ میرا نام عصمت چغتائی ہے..... میں B.T کر رہی ہوں اور آج میرا آخری سبق ہے..... پھر امتحان شروع ہو جائیں گے اور میرا سبق رہ جائے گا!"
"بھاڑ میں جائے آپ کا سبق....." میں نے بڑبڑاتے ہوئے سوچا.....
اُسی وقت شیر دائزہ بھی کلاس میں داخل ہوگئی اور طالبات بہت منہ بسورتے ہوئے تقریباً روہانسی ہو کے اپنی اپنی جگہ بیٹھنے لگیں۔
عصمت چغتائی نے ایک بڑا سا نقشہ جو وہ اپنے ساتھ لائی تھیں میز پہ پھیلانا شروع کر دیا..... ہو نہ ہو یہ دنیا کا نقشہ ہوگا۔ بھلا دنیا سے ہمیں کیا لینا دینا۔ بر اعظم اور بحر اعظم کی گردان شروع ہوگی اور اس طرح اس دنیا کے چکر میں ہمارا جادو کا کھیل دھرے کا دھرا رہ جائے گا ــــ وہ نقشہ بلیک بورڈ پہ پھیلا دیا گیا اور ہماری حیرت کی انتہا نہ رہی جب ہم نے دیکھا کہ نقشے میں دنیا شامل نہیں

نہیں ایک بے ڈھنگا انسانی پیکر کو دکھایا گیا ہے جو کپڑوں ہی سے نہیں کھال سے بھی بے نیاز تھا۔ سارا جسم عجیب گورکھ دھندا سا معلوم ہو رہا تھا۔ چہرہ دیکھئے تو بھوت جیسا اور گردن سے نیچے دیکھئے تو عجیب سی بے تکی سرخ اور نیلی لکیروں کا جال پھیلا ہوا تھا۔ کہیں کہیں کچھ نلکیاں، گڈھے، ٹھوسے، ڈبیہ، لٹو، پھرکیاں، اور بیچوں بیچ جیسے اُلجھا ہوا اُون..... عجیب و غریب ماری کا تھیلا تھا وہ تو
"یہ کیا ہے؟" بلقیس نے پوچھ ہی لیا.....
عصمت چغتائی مسکرا کر بولیں۔
"یہی تو ہے جادو کا پٹارہ.....!"
"جی نہیں یہ جادو کا پٹارہ نہیں ہے" امتیاز فاطمہ بڑے سنجیدہ لہجے میں بولیں، وہ ہماری کلاس کی بڑی سنجیدہ ہستی گردانی جاتی تھیں۔
"یہ تو انسان کا جسم ہے..... ہمیں جادو دکھائیے نا؟"
عصمت چغتائی ہنس کے بولیں۔
"تم ٹھیک کہتی ہو ــــ یہ انسان کا جسم ہی ہے ــــ لیکن اس سے بڑا جادو اِس دنیا میں کوئی ہے بھی نہیں....."
سودہ جھنجھلا کے بولی "ہوں، اِس میں ہے کیا؟"
عصمت آپا مسکرا کے بولیں.....
"یہی تو تمہیں بتانا چاہتی ہوں کہ اِس میں کیا نہیں ہے....."
اور پھر اُنھوں نے ایک پنسل کی نوک نقشے کے سرے پہ رکھ کے پوچھا
"یہ کیا ہے؟"
"کھوپڑی" بہت ساری آوازیں ایک ساتھ چلائیں.....
"اِس میں کیا ہوتا ہے.....؟"
ہم سب سوچنے لگے تو خود ہی بولیں۔
"تم سب کی کھوپڑی میں تو بھوسہ بھرا ہے..... ارے پگلی اِس میں دماغ رہتا ہے....."
"کوکھ دماغ رہتا ہے..... جیسے دماغ بھی کوئی کرائے دار ہے....." بلقیس سرگوشی میں بولی..... (بلقیس کے ابا جان اور ان کے کرایہ داروں کے درمیان ہمیشہ کوئی نہ کوئی جھگڑا چلتا رہتا تھا)
"سُن رہی ہو نا؟" عصمت آپا نے پوچھا
"دماغ کا کیا کام ہوتا ہے؟"
"دماغ کا کام؟" ہم سب سوچنے لگے.....

عصمت آپا نے بتایا کہ جو ہم سوچ رہے ہیں نا تو یہ ہم نہیں سوچ رہے ہیں۔

دراصل دماغ سوچ رہا ہے۔۔۔۔۔۔

"بھئی واہ کتنے مزے کی بات ہے" مسعودہ نے چپکے سے کہا جو بہت کاہل تھیں اور اس بات سے بہت مسرور تھیں کہ سوچنا بھی انسان کا نہیں دماغ کا کام ہے۔

اور پھر تو ہم نے عصمت آپا کے ساتھ ساتھ سر کی بلندی سے انسانی اعضا کی سیڑھیوں پہ سے آہستہ آہستہ زینہ بہ زینہ اور سینہ بہ سینہ اُترنا شروع کیا۔۔ ۔۔۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے انتہائی دلچسپ بھول بھلیاں میں گھوم رہے ہیں ـــ ہر موڑ ایک نیا منظر ایک نیا تعرف بنا تا تھا۔۔۔ کیا ہی پُراسرار پُرپیچ سفر تھا وہ۔۔۔۔ اور ہم سب بے سُدھ اور مسحور اس کائنات کی سیر کر رہے تھے جسے اِنسانی جسم کہا جاتا ہے۔

ٹن ـ ٹن ـ ٹن۔۔۔۔ گھنٹی کا گھنٹہ بج رہا تھا۔ عصمت چغتا اپنا نقشہ سمیٹ رہی تھیں۔۔۔۔ جادوگر اپنا تھیلا بیٹ کر جا رہا تھا ـــــــ اور چھٹی جماعت کی طالبات ایک دوسرے کو ایسی حیرت اور دلچسپی سے دیکھ رہی تھیں جیسے وہ انسانی پیکر نہیں جادو کے پٹارے تھیں۔۔۔۔

عصمت آپا B.T کے بعد علی گڑھ سے چلی گئیں اور پھر اُن سے ملاقات اُن کی کہانیوں کے ذریعے ہونے لگی۔ کتنا عجیب زمانہ تھا وہ بھی جب ترقی پسند مصنفین کی پوری کھیپ کی کھیپ کیل کانٹے سے لیس ہو کے ادب کے میدان میں اُتری تھی۔ گزشتہ تیس پینتیس سال کی مدت میں ایسا خوبصورت، شاندار اور باوقار کارواں ادب دیکھنے کو نہیں ملا۔ نوجوان طلبا و طالبات کی ذہنی تعلیم و تشکیل میں ترقی پسند تحریک کا جو نمایاں حصہ رہا ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔ میں جس نسل سے تعلق رکھتی ہوں اُس نے ترقی پسند تحریک کا عروج دیکھا ہے اور آج کے پُر آشوب دور میں سیاسی، سماجی اور علمی بازار میں بھاؤ تاؤ بھی دیکھ رہی ہوں اور اتنا کچھ دیکھنے کے بعد مجھے یہ حق پہنچتا ہے کہ اپنے طور پر یہ کہہ سکوں کہ ترقی پسند تحریک نے اپنی بساط بھر انسانی غم والم کو سمیٹنے اور رنگ و نور بانٹنے میں جو بے مثل خدمات انجام دی ہیں اُن کی عظمت اور اہمیت کا اعتراف اپنے اور بیگانے دونوں ہی کرتے ہیں۔ اوّل الذکر مدح کر کے اور موخر الذکر دشنام طرازی کا سہارا لے کے ـــــ

عصمت چغتائی کے ذکر کے ساتھ ترقی پسند تحریک کا ذکر لازمی ہو جاتا ہے۔ اس لئے خواہش نہ ہونے پر بھی اِس مضمون میں اِس بات کا تذکرہ شامل ہو گئی

آہی گیا۔ سارے فسانے میں جس کا ذکر نہ تھا۔

عصمت چغتائی کی ہر کہانی مجھے ایسی متحرک نظر آتی ہے جیسے کردار پڑھ نہ رہی ہوں دیکھ رہی ہوں۔ معلوم نہیں عصمت آپا کو اپنے کردار یاد ہیں یا نہیں، مجھے تو اُن کا ہر کردار نظر آتا رہتا ہے۔ ننھی کی نانی کہانی کو آپ نے کسی رسالے میں پڑھا ہوگا۔ میں نے تو اُسے علی گڑھ میں بار بار دیکھا ہے۔ کیسی معصوم، بے وقوف چڑچڑی، چور اُچکی سی بڑھیا تھی وہ ـــــ پھر بھی کتنی دلکش۔ ممکن ہے میں نے جو ننھی کی نانی دیکھی ہو وہ، وہی ننھی کی نانی نہ ہو جس نے عصمت چغتائی سے کہانی لکھوائی ہو ـــــ لیکن اِس سے کیا فرق پڑتا ہے، میری ننھی کی نانی کسی طرح عصمت چغتائی کی ننھی کی نانی سے کمتر نہیں ہے اور بھلا بحث مباحثے سے کیا حاصل۔ ننھی کی نانی ننھی کی نانی بن کے امر ہو گئی ـــــ وہ چاہے ہماری آپ کی ننھی کی نانی ہو چاہے عصمت آپا کی ننھی کی نانی ـــــ چوکھی سا جوڑا ـــ بھلا کس نے رِستا نہیں دیکھا ـــــ؟

سُنسان ویران دوپہر کی اُداس اور گھٹی ہوئی فضا میں نوجوان لڑکیاں شانے جھکائے سر نیوڑائے دالانوں میں چھلنگی چارپائیوں پہ بیٹھی سُوئی دھاگے سے ارمانوں کی اوڑھنی پہ کشیدہ کاری کرتے کس نے نہیں دیکھیں ٹھیک ہے آج کل کی لڑکیوں نے ایسی لڑکیاں نہیں دیکھیں ـــ لیکن وہ جو یہ دیکھنے سے محفوظ رہیں تو پتہ ہے کس کی وجہ سے ـــــ؟ چھوڑئیے نام لینے سے کیا فائدہ، جانے کس کا کریڈٹ کون لیجائے ـــ!

آپ نے کبھی عصمت چغتائی سے بات کی ہے؟ نہیں کی، تو بھی کوئی بات نہیں۔ دراصل اُن کی کہانیاں اُنھیں کی طرح بات چیت کرتی ہیں بُرا بھلا کہتی ہیں۔ ہنستی بولتی ہیں، تیکھے، کھٹے میٹھے فقرے کہتی ہیں۔ لیکن کہانی کی اپنی ایک حد ہوتی ہے۔ اُسے صفحات کے حصار میں رہنا پڑتا ہے۔ عصمت چغتائی تو اپنے عہد پہ محیط ہیں ـــــــ

آج کل کی نوجوان نسل نے جو ایک بہت معرکۃ الآرا لفظ ایجاد کیا ہے جنریشن گیپ GENERATION GAP اس کی گت بنتے دیکھنی ہو تو ذرا عصمت چغتائی کے پاس جا کے دیکھئے۔ ایسا ہنس ہنس کے رُلائیں گی اور ایسا رُلا رُلا کے ہنسائیں گی کہ لڑکے لڑکیاں کھسیا کے کسی ڈسکو تھیک میں گھس جائیں گے اور وہاں بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے؟

عصمت چغتائی سے جب بھی ملئے کوئی نہ کوئی ایسا دلچسپ فقرہ سُننے کو ملتا ہے کہ مدتوں یاد رہتا ہے۔

چند ماہ پہلے کی بات ہے' ٹیلیویژن پہ ایک مباحثہ ہو رہا تھا عصمت آپا کے ساتھ دو خواتین اور بھی تھیں۔ ایک جوان تھیں دوسری نوجوان ——۔ گفتگو کا آغاز ہوا تو یہ تو معلوم نہ ہو سکا کہ بحث کا موضوع کیا تھا (ہم عورتوں کو گفتگو کرنے کے لئے کسی موضوع کی ضرورت ہوتی بھی نہیں ہے) لیکن اتنا ضرور اندازہ ہو رہا تھا کہ خیال اور زاویۂ نظر کے اعتبار سے سب سے کم سن اور UPTO DATE عصمت چغتائی تھیں۔

ایک بار ایک ادبی نشست میں کرشن چندر اور خواجہ احمد عباس دونوں برابر کرسیوں پہ بیٹھے ہوئے تھے۔ عصمت آپا آہستہ آہستہ ٹہلتی ہوئی اُن تک پہنچیں' اُن دونوں کے پیچھے جا کے کھڑی ہو گئیں' مجھے بُلایا' اور مجھ سے بولیں۔

"کون کہتا ہے کرشن گنجا ہے ....؟
میں نے سہم کے کہا۔ "میں تو نہیں کہتی!"
دونوں کے سر پہ ہاتھ رکھ کر بولیں۔

عباس کے مقابلے میں کرشن کے بال' صرف بال نہیں زُلفیں ہیں' گیسو ہیں۔ پھر ہنس کے بولیں۔ "گیسو ہائے گرانمایہ" یہی تو ہے بھئی!۔ سُنا ہے۔ ایک بار ایک دُکھیا طوائف کی شامت آ گئی۔ جو عصمت چغتائی سے اپنا دُکھڑا رونے بیٹھ گئی —— سب کچھ بتا سُنا چکی تو اُس نے اپنے اس نیک ارادے سے عصمت آپا کو مطلع کیا کہ وہ اپنی گناہ کی زندگی سے عاجز آ گئی ہے اور اپنی باقی ماندہ زندگی شریفانہ اور صوفیانہ طور پر گزارنے کا فیصلہ کر چکی ہے .....

عصمت آپا بے حد بھڑک کے بولیں۔
"ہئے ہئے کمبخت کیا بھوکوں مرنے کا ارادہ ہے ....؟ کتنے عیش کر رہی ہو' شریفوں کے کیا سُرخاب کے پَر لگے ہوتے ہیں' جو شریف بننے کیلئے مَری جا رہی ہو —— کبھی پیشہ چھوڑنے کی غلطی بھی مت کرنا .....
اور چھوڑ دو تو میرے پاس مت آنا روتی بلکتی .... شریف بیویوں کی طرح شریف مَردوں کے جوتے ڈنڈے سہتی ہوئی ....

اور اس طرح عصمت چغتائی نے اُس طوائف کو طوائفیت کے ایسے ایسے فائدے بتائے کہ وہ لالہ رُخ اپنے کاشانے میں واپس چلی گئی ——
ایک ٹریننگ کالج میں عصمت آپا کو مدعو کیا گیا۔ عصمت آپا نے اپنے بے جھجک شلوار بھی

بے میں نیت کچھ یکہ ڈالا .... لڑکیوں کو بہت عمدہ پڑھنے کے بعد سے باہر آنے کی دعوت بھی دے ڈالی۔

ایک مُتشرّع قسم کے بزرگ کو اس تقریر پہ اعتراض ہوا۔ اٹھ کھڑے ہوئے اور عصمت آپا کو مخاطب کر کے ذرا تُرش لہجے میں بولے: "محترمہ کیا آپ چاہتی ہیں کہ لڑکیاں اپنے عُریاں جسم کی نمائش کریں؟"

عصمت آپا نے اطمینان سے فرمایا۔
"جی ہاں اگر اُن کے جسم پہ کوڑھ نہ ہو تو کوئی ہرج نہیں ہے۔" بظاہر یہ فقرہ بیت چُھبتا ہوا ہے' لیکن غور کیجئے تو بڑا بلیغ فقرہ ہے' عصمت چغتائی تو محض یہ کہنا چاہتی ہیں کہ کوئی کام کرنے میں کوئی ہرج نہیں ہے اگر اُس عمل یا فعل پہ اعتقاد یا ایقان کے جسم پہ ....

ایک دفعہ میں نے عصمت چغتائی کے ذہن میں کہانی بنتے دیکھی۔ اُن کے چہرے کے اُتار چڑھاؤ کی سیڑھیوں پہ میں نے ایک کہانی کو لرزتے دیکھا۔ بس کہانی پہ وہ عالم طاری تھا جو جوہر بوتل میں بند ہوتے وقت طاری ہوتا ہوگا۔

علی گڑھ میں سخت سردیوں کا زمانہ تھا۔ جنوری کی چھاؤں پڑ رہی تھیں عصمت آپا اپنی بھاوج اختر چغتائی کے گھر کے دالان میں' تخت پہ بیٹھی تھیں اور اُجلا اُجلا چاندی کا پاندان اُن کے سامنے کھلا ہوا تھا۔ ملاقاتیوں میں طلباء طالبات' دوست احباب وغیرہ کے علاوہ ایک ستر خاتون بھی وہاں بیٹھی تھیں۔ بے حد صاف شفاف' بے داغ' شہاب ایسی رنگت' بے حد نرم و نازک خدوخال' بے حد دھان پان' نگھا نگھا عورت جیسے چنبیلی کی کلی پلنگڑی پہ پڑی ہے۔

کسی نے چپکے سے سرگوشی میں کہا: "کیسی خوبصورت ہیں بڑی بی —— اپنے دنوں میں کیا ستم ڈھاتی ہوں گی۔"
عصمت نے بھی اُسی سرگوشی میں جواب دیا۔
"بالکل کنواری لگتی ہیں۔"

اور اس طرح عصمت چغتائی کی نہایت خوبصورت کہانی "گھونگھٹ" کا جنم ہوا۔

عصمت آپا کو میں نے بے تحاشہ قہقہہ لگاتے یا کھلکھلا کے ہنستے کبھی نہیں دیکھا۔ لیکن اُن کی آنکھوں میں ہمیشہ ایک عجیب سی طنز آمیز شوخی اور لبوں پہ ایک پھیکی سی مُسکراہٹ تیرتی رہتی ہے۔ غم سے کیسے نجات ہے۔ اور عصمت آپا کو بھی رنج و الم نے کیوں بخشا ہوگا' لیکن جانے وہ کس جگہ کی کاٹ ہیں اور کبھی روتے' بسورتے' سرد آہیں بھرتے اُن کو کسی نے نہیں دیکھا۔ اُن کے گھر میں تو کوئی ایسا SAFE DEPOSIT VAULT بھی نہیں

(بقیہ صفحہ ۱۴۹ پر پڑھیئے)

عصمت چغتائی سے ایک ملاقات

یونس اگاسکر
مہاراشٹر کالج آف آرٹس۔ بلاسس روڈ۔ بمبئی۔۸

شرکائے گفتگو: عصمت چغتائی ○ پروفیسر ظہیر الدین علی ○ پروفیسر محمود ندوی ○ پروفیسر یونس اگاسکر

یونس اگاسکر: آپا آپ کے خاندان میں بڑے بڑے ذی علم لوگ ہوئے ہیں۔ سب سے پہلے کچھ اپنے خاندان کے تعلق سے بتائیے۔ کیا آپ کی افسانہ نگاری کا عمل دخل کا آپ کے خاندانی پس منظر سے کوئی گہرا رشتہ ہے؟

عصمت چغتائی: میرے جد امجد چنگیز خاں کے دو بیٹے تھے ایک ہلاکو خاں ایک چغتائی خاں۔ میرے خاندان والے خاص کر ننھیال والوں کا کہنا تھا کہ ہلاکو خاں تو تلوار کا دھنی تھا اور چغتائی خاں قلم کا۔ چنانچہ چغتائی لوگ لکھنے کے شوق زیادہ پائے جاتے ہیں۔ میرے نانا نے ایک ناول لکھی تھی "رزم بزم"۔ میرے بڑے بھائی عظیم بیگ تو بڑے مشہور لکھنے والے تھے، میرے چھوٹے بھائی کو بھی لکھنے کا شوق تھا۔ انھوں نے دو ایک مضمون لکھے تو اُن کے پاس تعریفوں بھرے بہت سے خط آنے لگے تب انھوں نے اپنا نام مضمون ہٹا لیا۔ کہنے لگے "ہم نہیں لکھیں گے" پیچھے پڑ گئے لوگ ... میری بہنیں جو خط لکھتی ہیں وہ پڑھنے کے قابل ہوتے تھے۔ سب سے بڑی بہن جو اب پاکستان میں ہیں اتنے خوبصورت خط لکھتی ہیں کہ کیا کہنا۔ یوں تو لکھنے کی صلاحیت ہم میں عام طور سے پائی جاتی ہے۔ لیکن میرے اور عظیم بھائی کے سوا کسی نے افسانے نہیں لکھے۔

خاندانی نام :	عصمت خانم چغتائی
والد کا نام :	مرزا قسیم بیگ چغتائی
والدہ کا نام :	نصرت خانم
جائے پیدائش :	بدایوں
تاریخ پیدائش :	۲۱ اگست ۱۹۱۵ء
تعلیم :	بی اے، بی ایڈ
پہلی مطبوعہ تحریر :	ڈراما "فسادی" مطبوعہ ساقی ۱۹۳۹ء
پہلی کہانی :	"بیرا یا گیندا" - ۔ ۱۹۳۹ء
پہلا ناول :	"ضدی" ۱۹۴۱ء - (سو روپے)
پہلی فلم :	"چھیڑ چھاڑ" - بمبئی ٹاکیز ۱۹۴۲ء
پہلی ملازمت :	ہیڈ مسٹریس ۱۹۳۶ء اسلامیہ گرلز ہائی اسکول [illegible]

کتابیں

ناول : ضدی - ٹیڑھی لکیر - معصومہ - سودائی (فلمی ناول) - جنگلی کبوتر
دل کی دنیا - عجیب آدمی - باندی (ناولٹ)
تین اناڑی - ننھی کا نانی - ایک بات (ناولٹ)
ایک قطرۂ خون (واقعۂ کربلا پر مشتمل ناول)
افسانوی مجموعے : کلیاں - چوٹیں - ایک بات - چھوئی موئی - دو ہاتھ - شیطان کا گلا ...

یونس اگاسکر: کیا اپنے بڑے بھائی عظیم بیگ کو دیکھ کر آپ کو لکھنے کی اکساہٹ محسوس ہوئی؟ یا یہ تھا کہ آپ کے خاندان میں کچھ ایسے کردار اور ایسی باتیں تھیں جن کو آپ بیان کرنا چاہتی تھیں اس لئے آپ نے افسانہ نگاری اختیار کی؟

عصمت چغتائی: کیا بتاؤں میں خود نہیں جانتی میں نے چودہ پندرہ برس کی عمر ہی سے لکھنا شروع کر دیا تھا۔ اوٹ پٹانگ اور رومانٹک کہانیاں لکھا کرتی تھی جن میں عشق و محبت اور مر جانے کی باتیں ہوا کرتی تھیں۔ میں نے ان کو نہیں شائع کرایا۔ بہرحال لکھنے پڑھنے کا شوق مجھ کو پہلے سے تھا۔

یونس اگاسکر: کیا آپ کی تعلیم و تربیت کسی خاص ماحول میں ... ہونے لگے ... کہیں انگریزی ناول کے ترجمے ... شروع میرے بھائی اور ... پڑھنے کے شوق کو تیز کر دیا۔؟

عصمت چغتائی: میں جس ماحول میں پلی بڑھی وہ نسبتاً آزاد تھا۔ لڑکے لڑکیوں پر زیادہ پابندیاں نہیں تھیں۔ مجھ سے بڑی بہنوں کی اور میری عمر میں کافی فرق تھا۔ اس لئے میری تربیت زیادہ تر بھائیوں کے ساتھ ہوئی' پھر میری اماں کچھ زیادہ دخل نہیں دیتی تھیں' اس لئے مجھے آزادی سے سوچنے کی عادت پڑ گئی اور ہمارے خاندان میں ہر بات بڑے چھوٹے سب کھٹ سے کہہ دیتے ہیں۔ میں نے اپنے افسانوں میں جو دیکھا اور سُنا وہ قلم بند کر دیا' مثلاً "کچھو پھوپھی' میری سگی پھوپھی کے حالات ہیں۔" جاں بڑے" میرے چچا کے حالات زندگی ہیں۔ میں نے دونوں کی اسٹڈی کرکے یہ افسانے لکھے ہیں۔ اگر کہیں الفاظ میں بے ہودگی آجاتی ہے تو اُس کی ذمہ دار میں نہیں ہوں۔ میں لکھتے وقت یہ نہیں سوچتی کہ یہ جملہ جو فلاں شخص کے مُنہ سے نکلا ہے وہ عام انسان کے سننے کے لائق ہے کہ نہیں ہے۔ میں اُس کو ویسے کا ویسا اپنے قلم سے لکھ دیتی ہوں کیونکہ میں مصور نہیں ہوں فوٹو گرافر ہوں۔

یمونہ دلوی: آپ مغربی یا ہندوستانی مصنفین میں سے کسی سے زیادہ متاثر ہوئی ہیں؟

عصمت چغتائی (روتے ہوئے) میں نے روسی ناول اور افسانے پڑھے ہیں اور اُن سے بے انتہا متاثر ہوئی ہوں۔ خاص طور سے چیخوف کو تو اتنا مانتی ہوں کہ (مسکرا کر) سال چیخوف کو میں صرف برکت کے لئے پڑھتی ہوں۔ (دوسروں کی ہنسی) کسی زمانے میں برنارڈ شا کے ڈرامے پڑھنے سے میرے دل میں ڈرامے پڑھنے کا شوق پیدا ہو گیا تھا اور علی گڑھ میں جب میں بی۔ اے کر رہی تھی تو چھوٹے چھوٹے ڈرامے لکھ کر اپنی کلاس کی لڑکیوں سے کرایا کرتی تھی۔ اُس وقت میں برنارڈ شا سے اتنی متاثر تھی کہ کلاس کی لڑکیاں مجھے برنارڈ شا کہہ کر چڑاتی تھیں۔ افسانہ سے زیادہ ڈرامے لکھنے میں دلچسپی تھی۔ مجھے افسانہ لکھنے میں بڑی مشکل ہوتی تھی۔ میرا سب سے پہلا مضمون جو چھپا وہ "فسادی" میرا ڈراما ہے۔ کہانی لکھنا نہیں آتی تھی۔ ڈراما لکھنا آسان لگتا تھا کیونکہ میں نے لکھنا ایسے شروع کیا اپنے خاندان میں جب سب جمع ہو جاتے تھے تو میں ایک کونے میں چپ چاپ ان کی باتیں سُنا کرتی تھی اور اپنی رف بک میں جو ڈائیلاگ جو شخص بولتا تھا اُسے لکھ لیتی تھی۔ مجھے ڈائیلاگ لکھنے کا بڑا شوق تھا۔ اور جب پانچ سات صفحے بھر لیتے تو میں ان سے کہتی تھی "سنئے آپ لوگ کیا باتیں کر رہے تھے۔" اور پھر میں انھیں پڑھ کر سنایا کرتی تھی۔ (ہنستے ہوئے) گھر والے بڑے خوش ہو کر کہتے "توبہ میں نے تو یہ بات نہیں کہی تھی۔ خبردار جو تو نے میرے بارے میں..." (سب کی ہنسی) میں کہتی "جو آپ نے کہا ہے وہ میں نے لکھا ہے"

نورالعین علی: اُردو ادب میں آپ پہلی خاتون ہیں جس نے اتنی بے باکی سے جنسی موضوعات کو اپنے افسانوں میں پیش کیا۔ آپ ان موضوعات کی طرف کیسے مائل ہوئیں؟

عصمت چغتائی: میری ابتدائی کہانیاں گھر کی چار دیواری میں بیٹھ کر لکھی گئی ہیں۔ عام طور سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ مرد ہی بڑی گندی باتیں کرتے ہیں۔ نہیں عورتیں بھی کرتی ہیں۔ عورتوں کے پاس زیادہ وقت ہوتا ہے' دوپہر کو محلے بھر کی عورتیں جمع ہو کر بیٹھ جاتی تھیں اور ہم لڑکیوں سے کہا جاتا تھا "چلو بھاگو تم لوگ۔" میں چھپ کے (ہنستے ہوئے) پلنگ کے نیچے گھس کے' کہیں سے اُن کی باتیں سُنا کرتی تھی۔ جنس کا موضوع گھٹے ہوئے ماحول اور پردے میں رہنے والی بی بیوں کے لئے بہت اہم ہے' وہ اس پر بہت بات چیت کیا کرتی ہیں۔ میری افسانہ نگاری اُس گھٹے ہوئے ماحول کی عکاسی ہے' فوٹو گرافی ہے۔

یونس اگاسکر: لیکن آپ نے جو اتنا کھل کر لکھا وہ کہیں بزرگوں کی ضد میں تو نہیں تھا؟

عصمت چغتائی: جی ہاں! ضد تو بہت تھی۔ جب میں نے یہ سب لکھنا شروع کیا تو دنیا نے تو "واہی" میرے گھر میں بھی مجھ پر بہت ڈانٹ پڑی۔ اماں کہنے لگیں "یہ کیا لکھ رہی ہے تو؟" میرے بھائی عظیم بیگ بھی SHOKED ہو گئے تھے۔ وہ مجھ سے کہنے لگے "یہ کیا لکھ رہی ہو؟ لوگ انگلیاں اُٹھا رہے ہیں۔" میں نے کہا "آپ کو اس سے کیا؟ آپ پر بھی تو اعتراض ہوتے ہیں' آپ بھی تو لکھتے ہیں' بس میں بھی لکھتی ہوں۔ دراصل شاک کرنے میں مجھے مزا آنے لگا تھا۔

میمونہ دلوی: باجی جنسی مسائل کے سلسلے میں ابتدا میں آپ کے ہاں جو کنائیت پائی جاتی تھی اُسے بعد میں آپ نے ترک کیوں کیا؟

عصمت: ایسا میرے ماحول کے فرق سے ہوا۔ پہلے میں گھٹے ہوئے ماحول کے بارے میں اور چھوٹے قصبوں میں بیٹھ کر لکھا کرتی تھی اور اب میں بمبئی میں ہوں جہاں زبان پر اتنی پابندیاں نہیں ہیں اور اب زمانہ بدل گیا ہے' اب تو چھوٹے چھوٹے بچے وہ باتیں جانتے ہیں جو میں لکھتی ہوں' بلکہ اس سے زیادہ جانتے ہیں۔ بمبئی جیسے شہر میں بیٹھ کے کنائے اور اشارے سے کام نہیں چلتا' یہاں صفائی سے بات ہوتی ہے۔

یونس اگاسکر: لیکن کیا وجہ ہے کہ آپ نے یوپی کے متوسط گھرانوں کی جنسی زندگی کو تو بہ خوبی پیش کیا مگر بمبئی کی جنسی زندگی اور جنسی مسائل کو زیادہ اہمیت نہیں دی؟

عصمت: بمبئی میں ان مسائل کو کوئی زیادہ اہمیت بھی حاصل نہیں ہے۔ ویسے یہاں آنے کے بعد کمیونسٹ پارٹی سے میرا واسطہ پڑا اور مجھے سیاست اور اکنامکس کا بھی تجربہ ہوا' پتہ چلا کہ سیکس اور اُسکی گھٹن ہی اتنا اہم موضوع نہیں ہے بلکہ (زور دے کر) بہت سے اور موضوع ہیں اور پھر میں نے اُن موضوعات کو چھونے کی کوشش کی۔ بمبئی کے ماحول کو پیش کیا۔

ذکیہ الگاسکر: کون کون سے ناولوں اور افسانوں میں آپ نے بمبئی کی زندگی کو پیش کیا ہے؟

عصمت: میرا ایک ناول "معصومہ" بمبئی کے ماحول پر لکھی گئی ہے۔ دوسری "عجیب آدمی" ایک فلم ڈائریکٹر کی زندگی کی اُلجھنوں اور پریشانیوں کے بارے میں ہے۔ کہانیوں میں "بچھڑیں" اُن آیاؤں کی درد بھری کہانی ہے جو دولت مند گھرانوں میں ملازمت کرتی ہیں "مٹھی مالش" اسپتال میں آیا کا کام کرنے اور اسقاط کرانے والی عورتوں پر ہے۔ "نوالا" ایک ایسی لڑکی کی کہانی ہے جو ملازمت کرتی ہے اُسے فرصت ہی نہیں ہے کہ کسی لڑکے سے دوستی پیدا کرے، اُس کی زندگی میں کیا ہوتا ہے؟ یہ سب کہانیاں بمبئی کے ماحول میں لکھی گئی ہیں۔ ویسے میں قصداً محض جنسی موضوع اُٹھا کر نہیں لکھتی۔ اُس کے پیچھے میرا کوئی اور مقصد ہوتا ہے۔ انسان کی آزادی، عورت کی آزادی کا سوال ہوتا ہے، جس کو میں حل کرنے کی کوشش کرتی ہوں۔

میمنو دلوی: آپ کے افسانوں میں عشق کا جو دندناتا ہوا انداز پایا جاتا ہے اور جسے منٹو نے جارحانہ قسم کی منفی محبت کہا ہے، اُس انداز کو آپ نے جان بوجھ کر برتا ہے یا بے اختیار اُس رُخ پر آپ کا قلم چلتا ہے؟

عصمت: یہ میرے خاندان کا اثر ہے۔ میرے خاندان کا یقین تھا کہ عشق مقوّیِ دل و دماغ ہے، اس میں گھٹن نہیں ہونی چاہیئے، اِس میں رونا پیٹنا نہیں ہونا چاہیئے۔ میرے بھائیوں کو جب کسی سے عشق ہو جاتا تھا تو وہ اُلوائی کھٹوائی لینے کے بجائے کھانا دُگنا کر دیتے تھے، بڑی اُودھم مچانے لگتے تھے، بہت شرارت کرتے تھے۔ تب میرے ابا کہتے "بیگم لگتا ہے اِسے کوئی لڑکی پسند آگئی ہے (ہنس کر) یہ بہت دولتیاں جھاڑ رہا ہے" (قہقہے)

میمنو دلوی: باجی پھر "ضدی" ناولٹ کے ہیرو کو آپ نے کہاں سے دریافت کیا؟

یُونس اگاسکر: اس میں تو یہ دندناتا عشق بڑا مریضانہ انداز اختیار کر لیتا ہے، میری مراد ناول کے آخری حصّے سے ہے۔

عصمت: نہیں وہ اپنی پُوری کوشش کرتا ہے لیکن وہ کم عمر لڑکا ہے جسے خاندان والے چاروں طرف سے گھیر لیتے ہیں مگر وہ اپنی جنگ نہیں چھوڑتا۔ اس کی شادی کر دی جاتی ہے لیکن وہ اپنی بیوی سے بات تک نہیں کرتا۔ ہم گھوڑے کو پکڑ کر پانی تک تو لا سکتے ہیں، لیکن زبردستی اُسے پانی نہیں پلا سکتے۔ "ضدی" میں یُورن کی بغاوت کا وہ انداز ہے جو گھر میں سب سے چھوٹے لڑکے کا ہوتا ہے، بڑا ہوتا تو کچھ فیصلہ کرتا، لیکن وہ ستیاگرہ کرتا ہے۔ گاندھی جی کی پالیسی اختیار کرتا ہے اور وہ بڑی ہی خطرناک ثابت ہوتی ہے۔

یُونس اگاسکر: یہ ناول لکھنے کا خیال آپ کے ذہن میں کیسے آیا؟

عصمت: اُس ناول کی کہانی بڑی دلچسپ ہے، وہ ناول میں نے چار، پانچ لڑکیوں کے ساتھ مل کے لکھا۔ پہلے نوٹس لکھے، اُنھیں ڈسکس کیا۔ ہم اُس

شاعر۔ بمبئی

زمانے میں "اکرینیا" "دیوداس" اور ایک اور کتاب سے متاثر ہوئے تھے سوچا لاؤ فلم کے لئے ایک کہانی لکھیں اور پیسا کمائیں۔ چنانچہ ہم پانچ لڑکیوں نے جس میں میری کزن اور دوست شامل تھیں، وہ کہانی بنائی اور محسن عبداللہ کو جو اُس زمانے میں بمبئی ٹاکیز میں نوکر تھے، روانہ کر دی۔ اُنھیں کہانی ناپسند ہوئی تب ہم نے شاہد احمد دہلوی کو لکھا۔ اُنھوں نے کہانی کو ناول کی شکل میں لکھنے کا مشورہ دیا۔ چنانچہ میں نے تین چار دن کے اندر اُسے ناول کی شکل میں لکھ دیا، جس کے جملہ حقوق کے عوض مجھے سو روپے ملے جو ہم پانچ لڑکیوں نے آپس میں بانٹ لئے۔ بیس بیس روپے ہاتھ آئے جو اُس زمانے میں بہت تھے ہم بہت خوش تھے کہ ہم نے سو روپے میں اپنی کتاب بیچی۔

یُونس اگاسکر: "ٹیڑھی لکیر" آپ نے کیسے لکھا؟

عصمت: مجھ پر جو بیتتی ہے میں اُس میں سے بہت سی باتیں اپنی دلچسپی کے لئے نوٹ ڈاؤن (درج) کر لیتی ہوں، پھر اُنھیں پھاڑ کر پھینک دیتی ہوں۔ یہ ناول جب میں نے لکھا تو بہت بیمار تھی اور گھر میں پڑی رہا کرتی تھی۔ اِس لئے اِس ناول میں میرا جی بہت لگا۔ میں لیٹے لیٹے لکھتی یا لکھواتی تھی۔ اس ناول کی ہیروئن "شمن" قریب قریب میں ہوں۔ بہت سی باتیں اس میں میری بہن جیسے آٹھ دس لڑکیوں کو میں نے اس کردار میں جمع کیا ہے اور ایک لڑکی کو گھڑ ڈال دیا ہے، جو میں ہوں، اس ناول کے حصّوں کے بارے میں صرف میں ہی بتا سکتی ہوں کہ کون سے حصّے میرے ہیں اور کون سے دوسروں کے۔

نور الحسن علی: اچھا آپ نے جو بچّوں کا ناولٹ "تین اناڑی" لکھا ہے اُسے تحریر کرتے وقت انگریزی کارٹونوں کے DENIS THE MENACE اور WILLAM THE BAB جیسے بچّوں کے مشہور کردار آپ کے سامنے تھے کہ گھر ہی کے بچّوں کو آپ نے ماڈل بنایا ہے؟

عصمت: جی یہ بالکل میرے بھانجے ہیں میں نے اُن کے نام بھی لکھ دیئے ہیں اور حرکتیں بھی۔ جس پر یہ بچے بہت خفا ہوئے۔ جب وہ چھوٹے چھوٹے تھے تو میں نے تینوں کو "تین اناڑی" کی ایک ایک کاپی بھجوائی تھی اُن کی امّاں نے کہا بھئی تم شکریہ تو ادا کرو۔ تو بچے بہت بگڑے، کہنے لگے "اس میں ہماری اتنی تو رتڑ ماری ہے۔ ہم اُنھیں خط قطعی نہیں لکھیں گے"

میمنو دلوی: باجی آپ نے "دوزخی" جیسا قلمی خاکہ کوئی اور بھی لکھا؟

عصمت: مجاز پر لکھا ہے، منٹو پر لکھا ہے، ان کے علاوہ یوسف ناظم عباس اور جان نثار اختر پر میں نے خاکے لکھے ہیں۔ سنّے بھائی پر بھی ایک خاکہ لکھا تھا "خوابوں کا شہزادہ" افسانوں میں "بچھو پھوپھی اور چار پڑے" ایسی کہانیاں

میں جیسے کردار زندہ تھے۔

یونس اگاسکر: لیکن ایسا لگتا ہے کہ "دوزخی" جیسی بات آپ کے دوسرے خاکوں میں نہیں ہے، سوائے "بچھو پھوپھی" اور "جابڑے" کے جو عام قاری کے لئے افسانے ہیں، قلمی خاکے نہیں۔

عصمت: شاید میں اپنے رشتہ داروں کے ساتھ میں پارشل Partial تھی۔ یادہ زیادہ میرے دماغ میں واضح ہیں اور میں اپنے خاندان کے بارے میں زیادہ گہرائی میں جاکر زیادہ محسوس کر کے لکھ سکتی ہوں۔

میٹھو دلوی: باجی جب آپ نے دوزخی لکھا تو لوگوں کے کیا تاثرات تھے، خاص کر کے گھر کے لوگوں کے؟

عصمت: میں نے عظیم بھائی کی پہلی برسی پر یہ مضمون لکھا تھا۔ شاید "ساقی" کے لئے۔ اس کو پڑھ کر ان کے بچے اور میرے رشتہ دار مجھ سے خفا ہو گئے کہ یہ باتیں لکھنے کی نہیں ہوتیں، یہ باتیں کہنے کی ہوتی ہیں؟ میں نے کہا ہم ایسی باتیں کیوں کریں جو لکھی نہ جاسکیں۔ اگر آپ لکھنا برا سمجھتے ہیں تو ان کا کہنا بھی برا سمجھئے۔ عظیم بھائی کے بچے بھی مجھ سے بہت خفا تھے لیکن بڑے ہونے پر انھوں نے اس خاکے کو پھر پڑھا اور دیکھا کہ بہن کی محبت اس مضمون میں بہت اجاگر ہے تو وہ قائل ہو گئے۔

نورالعین علی: عصمت آپا آپ نے افسانہ، ناول، ڈراما، رپورتاژ وغیرہ مختلف اصناف میں طبع آزمائی کی ہے۔ ان میں سے کس صنف کو آپ اظہار و بیان کے اعتبار سے اپنے مزاج کے عین موافق پاتی ہیں؟

عصمت: مجھے ہر چیز لکھنے میں مزا آتا ہے۔ بعض وقت لوگ ضرورتاً لکھتے ہیں۔ میں بھی بعض اوقات ضرورتاً لکھتی ہوں، لیکن بہت سی چیزیں میں نے اپنی دلچسپی کے لئے لکھی ہیں۔ اپنا جی خوش کرنے کے لئے لکھی ہیں۔ ویسے جیسا موڈ ہوتا ہے ویسا فارم اپناتی ہوں۔

نورالعین علی: کیا کبھی ایسا ہوا ہے کہ کسی خاص واقعے سے متاثر ہو کر آپ نے فوری طور پر کوئی افسانہ لکھا ہو یا کسی افسانے یا ڈرامے کا براہ راست اثر آپ کی کسی تخلیق پر پڑا ہے؟

عصمت: متاثر ہو کر تو ہر انسان لکھتا ہے لیکن جہاں تک فوری اثر کا تعلق ہے۔ اگر کوئی ایسا واقعہ گزرے تو میں نوٹ ڈاؤن Note down کر لیتی ہوں۔ اور بعد میں اسے لکھتی ہوں۔ ایسا بھی ہوا ہے کہ دن میں مجھے کسی چیز نے متاثر کیا اور میں نے رات میں بیٹھ کر افسانہ لکھ لیا ایسے اکثر ہوا ہے۔

نورالعین علی: آپ کو کسی ایسے واقعے کی مثال یاد ہے جس نے آپ کو شاید بمبئی متاثر کیا ہے اور آپ نے افسانہ لکھا ہے۔

عصمت: ویسے تو زندگی میں مجھے ہر چیز نے متاثر کیا ہے۔ مثلاً ایک دفعہ مجھ پر سخت اعتراضات کئے گئے، مضامین لکھے گئے کہ میں صرف جنس پر لکھتی ہوں۔ صرف جنس ہے ــــــ اور بیہودہ باتیں لکھتی ہوں تو میں نے ایک کہانی "ننھی سی جان" لکھی، "تھوڑی سی دیر" چند گھنٹے میں بیٹھ کر لکھ ڈالی۔ اس میں شروع میں ایک مُردہ بچے کا ذکر ہے، جسے گھر کی نوکرانی کی لڑکی نے خون بھرے چیتھڑوں میں لپیٹ کر باغ میں دفن کر دیا تھا۔ وہ ڈراما چلتا رہتا ہے اور مجھے معلوم ہوتا ہے کہ گھر کا ایک نوکر لڑکا اس بچے کے لئے ذمہ دار تھا۔ جو اپنی ذمہ داری کو جھٹک کر الگ ہو گیا۔ بعد میں معلوم ہوتا ہے کہ وہ مرغی کا بچہ تھا جو لڑکی دروازہ بند کر رہی تھی تو کچل کر مر گیا تھا (دوسروں کی ہنسی) میری اماں نے وہ کہانی پڑھی تو آدھی پڑھ کر کہنے لگیں کہ "توبہ! توبہ! تو تو غضب کرتی ہے۔ تو ایسی باتیں کہاں سے لکھتی ہے؟" میں نے کہا "اماں پوری کہانی پڑھ لو"، تو انھوں نے کہانی پڑھی، پھر ایک دفعہ میں ریڈیو اسٹیشن گئی وہاں سے اسے براڈ کاسٹ بھی کیا تھا۔ جب میں نے کہانی پڑھی تو وہ اسے کٹ کرنے لگے، کہا کہ نہیں ایسی کہانی نہیں چاہئے۔ میں نے کہا "آپ اسے انجام تک سنئے اور پھر آپ کو پسند نہ آئے تو کٹ کیجئے۔" پھر میں نے انھیں بتایا کہ اس کا انجام یہ ہوتا ہے اور یہ، یہ چیز ہے۔ دراصل آپ کے ذہن گندے ہیں، میرا قلم گندہ نہیں ہے۔

نورالعین علی: صلاح الدین احمد نے ایک جگہ لکھا ہے کہ آپ کو اردو ادب میں وہی مرتبہ حاصل ہے جو انگریزی میں جارج ایلیٹ کو حاصل تھا۔ آپ کا اس سلسلے میں کیا خیال ہے؟

عصمت: مجھے یاد نہیں پڑتا کہ میں نے جارج ایلیٹ کو پڑھا ہے اور مجھے نہیں معلوم کہ . . . . .

یونس اگاسکر: جارج ایلیٹ کا رتبہ کیا ہے (سب کی ہنسی)

عصمت: جی ہاں، صلاح الدین مرحوم مجھ سے بہتر جانتے ہوں گے انھوں نے کہا ہے تو ٹھیک ہی ہوگا۔ میں خود اپنے آپ کو اتنا نہیں پہچانتی جتنا دوسرے مجھے پہچان سکتے ہیں۔ ویسے اکثروں کی رائے سے نہ مجھے اتفاق ہوتا ہے نہ اختلاف۔

یونس اگاسکر: خیر انگریزی ادب سے ذرا اردو کی طرف آیئے۔ آپ نے اپنے ایک مضمون "پوم پوم ڈارلنگ" میں قرۃ العین حیدر کی افسانہ نگاری کو "میری گو راؤنڈ" سے تشبیہ دی ہے، ہمیں تو لگتا ہے کہ اس دور کے آپ کے

افسانوں میں بھی موضوعات اور ٹریٹمنٹ کی حد تک یکسانیت پائی جاتی ہے ایسے میں آپ خرۃ العین حیدر کو الزام کیسے دے سکتی ہیں؟

عصمت: قرۃ العین چاہیں تو مجھے الزام دے لیں دیکھئے ویسے میرا یہ خیال تھا کہ اس زمانے کی ان کی کہانیاں بے معنی سی ہو جاتی تھیں، ان میں کوئی سمت نہیں نظر آتی تھی۔ لیکن عینی نے اپنے رویے کو بدلا ہے۔ اب ان کی کہانی میں ایک کلائمکس ہوتا ہے، ایک ہیئت ہوتی ہے، ایک مقصد ہوتا ہے۔ اس وقت تو وہ محض چکر لگاتی تھیں، میری کہانیوں میں یکسانیت بے شک تھی، کیونکہ وہ ایک ہی ماحول میں بیٹھ کر لکھی گئی تھیں لیکن بعد میں اگر میرا رنگ بدلا اور جوں جوں میری عمر بڑھتی گئی میری کہانیوں کے مسئلے بڑھتے گئے۔

یونس اگاسکر: آپا یہ آپ نے بہت اچھی بات کہی کہ آپ کو ان کے اس دور کے افسانوں میں سمت نہیں نظر آتی تھی غالباً اسی لئے آپ نے وہ "میری گو راؤنڈ" والی تشبیہ دی تھی۔

عصمت: جی ہاں اور اگر کوئی یہ کہتا ہے کہ میرے افسانوں میں بھی کوئی سمت نہیں تھی تو ٹھیک ہے۔

نورالحسن علی: ترقی پسندوں نے جب ابتدا میں لکھنا شروع کیا تو ان کے پاس ایک باقاعدہ پروگرام تھا اور انھوں نے پوری نسل کو متاثر کیا، اسکی رہنمائی کی لیکن آج کل بہت سے لوگوں خصوصیت جدیدیت کے پرستاروں کا خیال ہے کہ اب ترقی پسندوں کے پاس کوئی تعمیری یا انقلابی پروگرام نہیں رہا۔ اب معاشرے کو ان کی ضرورت نہیں رہی۔ اس سلسلے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

عصمت: یہ جملہ اسیہ باتیں میں پچیس (۲۵) برس سے سُن رہی ہوں اور اب تک مجھے ادیب مانا جاتا ہے اور مجھ سے مضامین منگوائے جاتے ہیں اور کہانیاں لکھوائی جاتی ہیں اور میں نے بیس (۲۰) برس کے عرصے میں تین چار ناول لکھے ہیں اور ان گنت کہانیاں لکھی ہیں۔ پروگرام بنا کے نہ کبھی لکھنا شروع کیا تھا اور نہ اب پروگرام بنا کے لکھتی ہوں۔ میں لکھتی جاؤں گی، سب کہتے رہتے ہیں کہ میں نے لکھنا چھوڑ دیا اور میں برابر لکھ رہی ہوں۔ ہر سال میری چار پانچ کہانیاں چھپتی ہیں اس سے زیادہ میں نے کبھی نہیں لکھا اور ایک آدھ ناول لکھ جاتا ہے اور اس کے علاوہ میرے بہت سے کام جو جاری ہیں کرتی ہوں۔

یونس اگاسکر: نہیں انفرادی طور پر تو آپ ترقی پسندوں نے جو اپنے مقام بنائے ہیں اس سے تو کسی کو انکار نہیں۔ ان کو تو کوئی بگاڑ نہیں سکتا۔ لیکن یہ ماننا پڑے گا کہ ترقی پسند تحریک جو تھی وہ اب بکھر گئی ہے۔

عصمت: بےشک وہ بکھر گئی ہے۔ اب ہمارا وہ پروگرام ہے جو ملک کا

شاعر ممبئی

پروگرام ہے۔ اگر ملک سیکولرزم کے راستے پر چلتے ہیں تو ہم ان کے پیچھے ہیں اگر وہ غلط راستے پر چلتے ہیں تو ہم ان سے علیحدہ ہیں۔ چاہے ہمارے قلم توڑ دئے جائیں، چاہے ہمارے قلم کو آزادی دی جائے لیکن پروگرام تو اب بھی وہی ہے کہ ہندوستان میں جو کرپشن ہے جو عورتیں کچلی جاتی ہیں اس کا کچھ ازالہ ہو سکے۔ بمبئی کی عورت اور بمبئی کا مرد زیادہ آزاد ہے لیکن اب بھی قصبے اور گاؤں ایسے پڑے ہیں جہاں عورت پیسی کچلی جاتی ہے اور اس کی بڑی ذلت کی زندگی ہے، بڑے دکھ بھری ہے۔ میرا تو اب بھی یہی پروگرام ہے۔ بےشک پروگریسو رائٹرس ایسوسی ایشن بکھر گئی ہے لیکن اس کے ممبر اب بھی ملتے جلتے ہیں اور اب بھی ایک دوسرے سے بھائی بہنوں سے زیادہ محبت کرتے ہیں۔ خون کے رشتے سے زیادہ مضبوط رشتہ ہے۔ کوئی بلا لیتا ہے تو ہم پھر سب جمع ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح رشتے ہوتے ہیں اسی طرح رشتہ داری محسوس کرتے ہیں۔ ابھی جاں نثار نے اپنے گھر بلایا تھا چھوٹا سا گھر تھا، اس میں ہم سب جمع ہوئے تھے اور اتنا اچھا معلوم ہوا اپنی کتاب کے افتتاح پر انھوں نے بلایا تھا، ایسے معلوم ہوا تھا جیسے کوئی شادی بیاہ یا منگنی ہو رہی ہے۔ ہم سب میں ایسا رشتہ قائم ہو گیا ہے جو اب کبھی ختم نہیں ہوگا۔

یونس اگاسکر: آپا شاید آپ کو یاد ہو کہ بھیونڈی کے ایک ادبی جلسے میں آپ نے بھیونڈی کی ترقی پسند کانفرنس کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ اس کانفرنس کے موقع پر آپ کو زیادہ دلچسپی اس میں رہی کہ کون سا لڑکا کس لڑکی کے لئے آنکھوں میں دل لئے پھرتا ہے۔ گویا آپ تحریک کے سلسلے میں زیادہ سنجیدہ نہ تھیں پھر آپ اس تحریک میں کیوں شامل ہوئیں؟

عصمت: کیا انسان ہر وقت سنجیدہ رہتا ہے؟ کبھی تو ہنستا ہے، بولتا ہے کبھی مزے کی بات کرتا ہے۔ کبھی تو چھیڑتا ہے!

یونس اگاسکر: لیکن ترقی پسند کانفرنس میں آپ کا [illegible]

تھا اس سے اندازہ ہوتا ہے . . . . .

عصمت: اس میں کیا میں نے کوئی سائنس پینا چھوڑ دیا تھا کہ کھانا پینا چھوڑا تھا کہ چلنا پھرنا چھوڑا تھا۔ میں نے تو مذاق کرنا بھی نہیں چھوڑا تھا۔ ویسے بہت سنجیدگی سے مجھے اس پروگرام سے زیادہ دلچسپی نہ تھی کیونکہ وہ سارا پروگرام غلط تھا۔ ہم نے کانفرنس میں بہت سے فیصلے غلط کئے تھے مثلاً یہ کہ عجیب لگتا ہے کہ ادیب مزدور کے ساتھ کھڑے ہوں تو میں تو اس وقت خفا ہو گئی تھی۔ میں نے ان سے کہا تھا کہ کیا میں ادیب نہیں ہوں؟ انھوں نے کہا

کہ آپ ادیب ہی نہیں ہیں! میں نے کہا نہ مجھے دُو نہیں ہوا، اور یہ تو کیا؟ میں نے کوئی ادیب بننے کے لئے تو لکھنا شروع نہیں کیا تھا۔

یونس اگاسکر: (ہنستے ہوئے) کہیں ایسا تو نہیں کہ اُس تجویز کے پاس ہونے کے بعد آپ نے لڑکے لڑکیوں میں زیادہ دلچسپی لینا شروع کیا؟

عصمت: ہاں مزا آتا تھا کہ دیکھتے جاؤ کس کا کس سے عشق چل رہا ہے۔ کون کس کو دیکھ رہا ہے۔ کون کس کے پیچھے چل رہا ہے۔ اُس زمانے میں اختر جمال جو پاکستان میں ہیں اور ان کے شوہر کا رُومانس وہیں چلا تھا۔ اور بہت سی نظر بازیاں ہوتی تھیں۔ یہ زندگی کی نشانی ہے۔ محبت بڑا خوبصورت جذبہ ہے، جسے پُوا ین' اور شما بھی زندہ رہنے کا حق حاصل ہے تو پھر ترقی پسندوں کی کانفرنس کیا حیثیت رکھتی ہے — (قہقہے)

یونس اگاسکر: کیا آپ محبت کے بارے میں بھی کچھ اظہارِ خیال کریں گی؟ اس کے بارے میں آپ کے کیا تاثرات ہیں؟

عصمت: یہ جو کچھ میں نے کہا ہے وہی میرے تاثرات ہیں۔ میں محبت کو بڑی ضروری اور بہت اہم شے سمجھتی ہوں۔ محبت بڑی مقوّی دل و دماغ شے ہے لیکن اس میں لیچڑ نہیں بن جانا چاہیئے، لڑائی کھنڈائی نہیں لینا چاہیئے، خودکشی نہیں کرنا چاہیئے، زہر نہیں کھانا چاہیئے، یہ میرا نظریہ ہے اور محبت کا جنس سے جو تعلق ہے وہ فطری ہے۔ وہ زمانہ گیا جب پاک محبت ہوا کرتی تھی۔ اب تو محبت کا ناپاک ہونا ہی زیادہ خوبصورت مانا جاتا ہے۔ (زوردار قہقہے)

یونس اگاسکر: ترقی پسند تحریک کا ذکر آ گیا ہے تو ایک بات پوچھوں (وقفہ) یہ اکثر کہا جاتا ہے کہ اس تحریک سے جہاں بہت سے لوگوں کو فائدہ پہنچا، وہیں کچھ لوگ اس کی وجہ سے سخت گھاٹے میں بھی رہے، مثلاً یوسف ملّان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انھیں ترقی پسند تحریک اور ترقی پسندوں نے ڈبو دیا۔ آپ کا کیا خیال ہے؟

عصمت: اچھا اُنھوں نے کتنی کہانیاں لکھیں اور ادیب بن گئے؟ ایک کہانی لکھی وہ ادیب بن گئے۔ کون کہتا ہے، یوسف ملّان ادیب تھے؟ میں تو اپنے آپ کو اب بھی ادیب نہیں سمجھتی ہوں۔ میں اب بھی ایسا کہتے ہوئے ڈرتی ہوں۔ اُنھوں نے ایک کہانی لکھی اور ادیب ہو گئے، ہم نے اُن کی کہانی کی تعریف کر دی اور کچھ بھی نہیں کیا۔ اُن کا دماغ خراب ہو گیا، وہ شراب بے انتہا پینے لگے۔ اُنھوں نے اپنی نوکری چھوڑ دی اور یہ کہنے لگے کہ میں تو ادیب ہوں اور سارے ادیبوں کا فرض ہے کہ وہ مجھے پالیں۔ صرف ایک کہانی لکھی تھی۔ میرے اب تک اُن کی صرف ایک کہانی پڑھی ہے۔ شاعر بھی؟

یونس اگاسکر: اُن میں صلاحیتیں تو تھیں......

عصمت: صلاحیتیں ہر ایک میں ہوتی ہیں، ایک کہانی کون نہیں لکھ سکتا؟ کیا آپ نہیں لکھ سکتے؟ لیکن اُنھوں نے اس کو جاری نہیں رکھا۔ ایک کہانی لکھ کر وہ سمجھے کہ ترقی پسند ادیبوں نے تعریف کر دی اس لئے وہ بڑے ادیب ہو گئے۔ یہ بڑی مصیبت کی بات ہے، اگر ترقی پسند ادیب تعریف نہیں کرتے تو لوگ روتے ہیں، اور اگر تعریف کرتے ہیں تو روتے ہیں، بگڑ جاتے ہیں۔ کسی کی موت کا کوئی ذمہ دار نہیں ہوتا، منٹو کی موت کے ہم ذمہ دار نہیں، زمانہ ذمہ دار ہے؟ بیشک زمانے نے یوسف ملّان کے ساتھ زیادتیاں کیں اور ہزاروں کے ساتھ کرتا ہے۔ آپ کو نہیں معلوم کسی زمانے میں سردار جعفری کیفی اعظمی، مجروح سلطان پوری اور ساحر لدھیانوی پر کیسی بیتی ہے۔ وہ کس طرح زندہ سلامت رہے ہیں اور کس طرح اُنھوں نے SURVIVE کیا ہے۔ ہم ترقی پسند ادیب کوئی "آیا" لوگ نہیں ہیں کہ بچوں کو پالیں جس میں GUDDS ہوتے ہیں وہ بغیر مدد کے نکل آتا ہے۔ آپ واجدہ تبسم کو دیکھئے، جیلانی بانو کو دیکھئے، کس نے سہارا دیا ان کو؟ نہ ہمیں کسی نے سہارا دیا تھا، نہ ہم کسی کو سہارا دینے میں یقین رکھتے ہیں۔

یونس اگاسکر: اچھا یہ دونوں خواتین جن کا آپ نے ابھی ذکر کیا کبھی ترقی پسند تحریک سے منسلک نہیں رہیں؟

عصمت: نہیں، تحریک ختم ہو گئی تھی جب وہ اُبھریں، لیکن ہم اُن کو اپنے ساتھ گنتے ہیں اور ان کو اپنے ساتھ لیکے چلتے ہیں۔ وہ بھلے شاید انکار کریں۔

میمونہ دلوی: باجی فلموں کے لئے آپ نے کیا لکھا اور کون سی خدمات انجام دیں؟

عصمت: میں نے چودہ پندرہ کہانیاں، ڈائلاگ اور سیناریو لکھے ہیں، کوئی زیادہ خدمت ودمت نہیں کی، بلکہ اپنی خدمت کی، ——— زیادہ تر اپنے گذارے کے لئے میں نے لکھا، صرف افسانے لکھ کر تو میں اپنا گذارہ نہیں کر سکتی، میگزینوں میں اور اخباروں میں لکھ کر تو میرا گذارہ نہیں ہو سکتا۔ میرے لئے فلم ایک ذریعۂ آمدنی ہے۔ میں نے کوئی خاص خدمت انجام نہیں دی، صرف دو ایک اچھی کہانیاں لکھیں جیسے "بزدل" "سونے کی چڑیا" "ضدی" اور "دروازہ" لیکن ہماری فلمیں نہیں چلیں اس لئے ہم ختم ہو گئے۔

یونس اگاسکر: فلموں میں آپ کے ڈائیلاگ بھی ہوتے تھے، جب آپ مکالمے لکھتی تھیں تو اپنی مخصوص زبان کو برتنے کی کوشش نہیں کرتی تھیں؟

عصمت: نہیں وہ سہل اُردو جس میں فارسی عربی کے بڑے بڑے الفاظ نہیں ہوتے وہی میری زبان ہے۔ میری کہانیوں کی زبان بھی وہی ہے جس میں

مزید ـــ منیادہ ہیں لیکن عربی یا فارسی کے مشکل الفاظ نہیں ہیں۔ میں نے بغیر کوشش کئے ان کے اُوپر قابو پالیا۔

میکش دہلوی: باجی میں نے آپ کی کئی فلمیں دیکھی ہیں لیکن اُن کے ڈائلاگ میں اور آپ کی کہانیوں کے ڈائلاگ میں کافی فرق ہے۔ چونکہ میڈیم مختلف ہے اس لئے یہ فرق ہونا بھی لازمی ہے۔ پھر بھی آپ اپنے کچھ خیالات بتائیے؟

عصمت: جیسا ڈائرکٹر یا پروڈیوسر کہتا ہے میں ویسے ڈائلاگ لکھتی ہوں۔ میں فلم کیلئے فلم کی ضرورت کے مطابق ڈائلاگ لکھتی ہوں۔ میں اُس میں اپنا رنگ بھرنے کی کوشش نہیں کرتی۔

یونس اگاسکر: کیفی اعظمی اور آپ کے درمیان "گرم ہوا" کی کہانی کے سلسلے میں ہونے والے اختلاف سے متعلق اخبارات میں کچھ دو طرفہ رائیں آئیں۔ اس سلسلے میں آپ کوئی بیان دینا پسند کریں گی؟

عصمت: میرے دس بھائی بہن تھے۔ صبح سے شام تک پچاسوں مرتبہ لڑائی ہوتی تھی اور ملاپ ہو جاتا تھا۔ کیفی سے میری لڑائی ہوئی اور ملاپ ہو گیا۔ میں اور کیفی بالکل بھول گئے ہیں اور کیا ہوا تھا اُس کا نہ کیفی کے دل میں خیال ہے نہ میرے دل میں۔ مجھے کیفی اتنا ہی عزیز ہے جتنا ہمیشہ تھا۔ جھگڑے کی میں عادی ہوں اور ملاپ کر لینے میں بہت ڈھیٹ ہوں۔ میرا عباس سے بھی جھگڑا ہو گیا تھا، لیکن میں نے فوراً ملاپ کر لیا۔ میں سوچ ہی نہیں سکتی کہ اپنے ان قلمی دوستوں سے ہمیشہ کیلئے لڑائی کر کے میں زندہ رہ سکوں گی۔ میں اُن سے ایک چھوٹی سی بات پر ساری عمر کے لئے جھگڑا نہیں کر سکتی اور وہ لوگ بھی جھگڑا پالنے والوں میں سے نہیں ہیں۔

یونس اگاسکر: بہرحال یہ بات تو طے ہے کہ وہ کہانی آپ ہی کی تھی؟

عصمت: ہاں! کہانی میری تھی البتہ ڈائلاگ اور سیناریو کیفی اعظمی کے تھے جو کہ ایک بہت بڑی کامیابی ہے۔ کہانی کے ساتھ ڈائلاگ کو بھی ایوارڈ ملتا تو بڑی اچھی بات ہوتی۔ کیفی نے بڑے اچھے ڈائلاگ لکھے تھے اور اُن کے لکھنے میں شمع کا بھی ہاتھ تھا۔

نورالعین علی۔ باجی بڑے شہروں کے نوجوانوں میں جو بے راہ روی پھیلی ہوئی ہے اُس کے بارے میں لوگ شکایت کرتے ہیں، مضامین لکھتے ہیں۔ لیکن نوجوانوں کی رہنمائی کرنے کے لئے کوئی تعمیری قدم نہیں اُٹھاتا۔ کیا یہ ادیبوں اور اہلِ قلم کا فرض نہیں ہے کہ اُن کی رہنمائی کریں؟

عصمت: کس ذریعے سے کریں؟ فلموں کے ذریعے؟ فلموں کے ذریعے بچوں کو کیا بتلایا جاتا ہے؟ اور جو ادب آ رہا ہے وہ ایسا ہی ادب ہے۔ وہ کیا سکھاتا ہے؟ ہم زندگی کے ہر شعبے میں مغرب کی نقل کرتے ہیں جب وہاں شاعر تھے

[illegible] یہاں تو شینیں، وہاں [illegible] بڑھ جاتے [illegible]

ملک کی تعمیر میں حصہ دار ہے تو ہم اُن کو بے راہ روی سے اپنے آپ کو کیسے بچا سکتے ہیں؟ اور ایک ادیب کیا کر سکتا ہے؟ ادیب کی کیا حیثیت ہے ملک میں؟ پھر جو لوگ نیچے بے راہ روی کا شکار ہیں وہ اُونچے طبقے کے لوگ ہیں، اُن کے گھروں میں آپ جا کر دیکھیں وہاں اُردو یا ہندی کے رسالے نہیں ملیں گے، وہاں آپ کو انگریزی کے رسالے ملیں گے۔

یونس اگاسکر: گویا جس جنسی بے راہ روی کا ذکر ہوا ہے وہ اُونچے طبقے میں زیادہ پائی جاتی ہے اور وہ اُونچا طبقہ اُردو طبقہ نہیں ہے نہ ہندی طبقہ ہے اور اردو طبقہ میں جو بے راہ روی ہے وہ تو پچھلے چالیس پچاس برسوں سے ہے؟

عصمت: وہ تو ہزاروں برس سے آ رہی ہے۔ وہ تو ضرورت پوری کرنے کا ایک طریقہ ہے۔ بمبئی میں لاکھوں آدمی اپنی بیویاں اپنے وطن میں چھوڑ کر آ جاتے ہیں، وہ کس پر بھروسا کرتے ہیں؟ اُن کی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے وہ جو کونسا طبقہ ترقی پذیر ہے؟ طوائفوں کا طبقہ۔ آپ کو ہر محلے میں ہر درجے کی طوائف ملتی ہے، اتنی رنگا رنگ طوائفیں شاید پورے ملک میں نہ ہوں گی۔ جو لوگ سالوں میں اپنے گھر نہیں جاتے اُن کی ضرورت کو پورا کرنے لاچار اور مجبور عورتیں جو گاؤں سے یہاں کام ڈھونڈنے کے لئے آتی ہیں، کام نہ ملنے کی وجہ سے طوائفیں بن جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ خرید کے اور پکڑ پکڑ کر لوگ بیچیاں لاتے ہیں اور اس دھندے میں لگاتے ہیں۔ بمبئی میں جو دھندا سب سے عروج پر ہے وہ طوائفوں کا دھندا ہے، اور ہزاروں لوگ لڑکیاں بیچ کر اور لڑکیوں کے جسم بیچ کر اپنی روزی کماتے ہیں۔ پکڑ دھکڑ ہوتی ہے، کتنی پکڑ دھکڑ ہوتی ہے؟ کھلے بندوں بیٹھی ہوئی نظر آتی ہیں اور کوئی اُن سے پوچھ گچھ نہیں کرتا۔ اُن کو دھندا چلانے کے لئے سرٹیفکیٹ ملتے ہیں۔ ہماری سرکار کی blessing حاصل ہے اس دھندے کو۔

یونس اگاسکر: ظاہر ہے کہ یہ باتیں شاید اخباروں میں مضامین لکھ کر بدلی نہیں جا سکتیں؟

عصمت: کون پڑھتا ہے ان مضامین کو؟ اور کیا سکھائیں گے آپ اُس مزدور کو جو اپنا وطن اور اپنے بیوی بچوں کو چھوڑ کر یہاں آیا ہے؟

نورالعین علی: مزدوروں کا سوال نہیں، نوجوانوں اور طالب علموں کا سوال ہے؟

عصمت: نوجوان اور طالب علم تو مغرب کی نقل کرتے ہیں۔ ہمارے پورے معاشرے پر مغربی کلچر چھایا ہوا ہے، ہمارا رہن سہن، ہمارا فرنیچر، ہمارے لباس، ہماری بول چال مغربی ہے۔ آجکل بہت سے بچے صرف انگریزی میں بات کرتے ہیں۔ وہ اُردو یا ہندی میں بات نہیں کر پاتے۔

انگریزی کا میں کونک پڑھتے ہیں۔ انگلش کی ہزاروں کتابیں یہاں dump کی جاتی ہیں، اُن کو رد کرنے کی نہ جانے گورنمنٹ کیا کوشش کرتی ہے۔ ہم خود گورنمنٹ پہ بھروسا کرتے ہیں، ہم میں کتنے لوگوں نے ان بچوں کو نصیحت کرنے کے لئے کتنی انجمنیں قائم کی ہیں؟ کتنی ایسی انجمنیں ہیں، کتنے ایسے لوگ ہیں، جو ان بچوں میں دلچسپی لیتے ہیں؟ لوگوں کو اپنے بچوں سے کوئی شکایت نہیں ہے۔ ہم اپنے بچوں کو بچپن سے کامک لاکر دیتے ہیں اور انہیں کاؤ بوائے "cow boy" کا ڈریس پہناتے ہیں، پستول دیتے ہیں اور وہ بڑے ہو کر وہی حرکتیں کرتے ہیں۔

مینو دلوی: آپ اُردو رسم خط کو دیوناگری سے بدلنے کے حق میں ہیں لیکن ہندی کو جہاں زبردستی ذریعۂ تعلیم بنایا گیا ہے وہاں پچھلے پچیس سالوں میں جو نسل اسکولوں اور کالجوں سے نکلی ہے اُن کا شین، قاف تک درست نہیں۔ ایسے میں رسم خط بدلنے سے اُردو کا وجود خطرے میں نہیں پڑ جائیگا؟

عصمت: میں اُردو کا رسم خط بدلنے کے حق میں نہیں ہوں۔ میں تو صرف یہ کہتی ہوں کہ اُردو کے وہ حروف جنھیں بچے بھولتے جارہے ہیں، اُنھیں زندہ رکھنے کے لئے ہمیں دیوناگری میں، ق، خ وغیرہ بنانا پڑیں گے۔ یہ حروف حلق سے نکلنے والے ہیں اور عربی و فارسی ہیں، ان آوازوں کو زندہ رکھنے اور اپنے بچوں تک پہنچانے کا صرف ایک طریقہ ہے کہ ان کو دیوناگری اسکرپٹ میں لکھا جائے اور پڑھایا جائے اور اس پر زور دیا جائے کہ اُردو جیسی ہے وہ "انوواد" یا translation کئے بغیر بچوں تک پہنچائی جائے اور اس کا بہترین طریقہ یہی ہے کہ ہم دیوناگری اسکرپٹ بھی استعمال کریں۔ میں نہیں کہتی کہ اُردو اسکرپٹ کا گلا گھونٹ دیجئے، وہ تو اپنی موت آپ مر رہا ہے۔ اُس کو مارنے سے کیا فائدہ۔ ہماری نئی پود اُردو پڑھ نہیں رہی ہے۔ اور ہندی اسکرپٹ اُس کے پاس موجود ہے، جسے وہ جانتے ہیں۔ اگر ہمیں اُن تک پہنچنا ہے تو ہمیں اپنی تحریروں کو دیوناگری اسکرپٹ میں لکھنا پڑے گا۔ یہ میرے لئے کوئی سوال نہیں ہے۔ یہ میری پریشانی نہیں ہے کیونکہ میری تقریباً ہر تحریر ہندی اسکرپٹ میں چھپ جاتی ہے۔ یہ میں نے اپنے لئے نہیں مانگا ہے، میں نے اُن لوگوں کے لئے مانگا ہے جو ابھی نیا نیا لکھ رہے ہیں اور اُردو میں لکھ رہے ہیں، ہزار یا پانچسو چھپتے ہیں، اتنی بڑی آبادی میں ہزار یا پانچسو کا بکنا بھی مشکل ہو جاتا ہے۔ اُردو جاننے والے خریدار نہیں ہیں۔ زیادہ تر لوگ رسالے اور کتابیں فری وصول کرتے ہیں۔ اُردو کتابیں کوئی نہیں خریدتا۔ کم از کم اُردو میں لکھے گئے خیالات شلوک بھی اور ان کو محفوظ کرنے کے لئے ہمارے پاس اُردو کو بنا دینا چاہئے۔ دو ہوتے ہوں تو کوئی حرج نہیں ہے، ایک عربی اسکرپٹ کا اور ایک دیوناگری اسکرپٹ کا۔ میں چاہتی ہوں کہ ہم دونوں اسکرپٹ استعمال کریں اور اُن کو رائج کریں۔

یونس اگاسکر: اس جوڑنے کو جو اُردو کا ہے، آپ شاید بوسیدہ بھی سمجھ رہی ہیں؟

عصمت: وہ تو out of fashion ہو گیا ہے۔ نئے بچے اُردو پڑھ ہی نہیں رہے ہیں۔ کوئی اُردو کا ادیب اپنے بچوں کو اُردو نہیں پڑھاتا۔ جن اسکولوں میں بچے جاتے ہیں وہاں اُردو نہیں ہے، اُردو کے طالب علم نہیں ہیں۔ اُردو کی ایک اسکرپٹ بالکل جدا ہو جاتی ہے۔ بچوں کو تین اسکرپٹ سیکھنا پڑتی ہیں، انگریزی، ہندی، اُردو اور اگر بمبئی میں ہے تو مراٹھی اور گجراتی۔ غرض بڑا اختلاف ہے، بڑا confusion ہے۔ اگر پورے ملک کی اسکرپٹ ایک ہو جائے، بنگالی کی، گجراتی کی، تامل کی، تیلگو کی تو دوسری زبانیں سیکھنے میں بچوں کو بہت آسانیاں ہوں گی۔ دوسری زبانیں سیکھنے کے لئے انہیں نیا اسکرپٹ نہیں سیکھنا پڑیگا وہ آسانی سے اُردو پڑھ سکیں گے۔ بغیر کسی کوشش کے ہمارا ادب اُن تک پہنچ جائے گا اور جو یہ اسکیم بنائی جارہی ہے کہ لوگوں کو اُردو پڑھائی جائے، اُردو فری پڑھائی جائے تو کوئی اُردو پڑھنے کے لئے تیار نہیں ہے۔ خاص کر بمبئی جیسے شہر میں کسی کو فرصت نہیں ہے کہ ایک زائد مضمون پڑھے۔

یونس اگاسکر: اُردو ادیبوں اور شاعروں کے بچے بھی اُردو نہیں پڑھ رہے ہیں گویا اُردو اُن کے لئے اُتر ن ہو گئی ہے۔

عصمت: بالکل بیکار ہو گئی ہے۔ اُردو سے اُنھیں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ اُن کا شین، قاف بھی درست نہیں ہے کیونکہ ہندی اسکرپٹ میں ہم نے شین، ق رکھا نہیں ہے۔ ہمیں چاہئے تھا کہ ہم سرکار سے یہ درخواست کرتے کہ اُردو کے جو حلق سے نکلنے والے حروف ہیں ان کے لئے نئے حروف بنائے جائیں۔ क پر نقطہ لگا کر ق نہ بنایا جائے وہ نقطے بھول جاتے ہیں اور غلط بولتے ہیں، کیا ہم تین چار حروف الگ سے بنا نہیں سکتے؟ وہ ہمیں بنا کر ہندی میں شامل کرنے چاہئیں اور ڈکشنری اور ایسے چاہئیں ایک ہندی کا اور ایک اُردو کا دونوں ایک ہی لپی میں۔ جو بچے اُردو لینا چاہیں، اُردو لیں اور جو بچے ہندی لینا چاہیں

ہندی میں حقوق کا برابر representation ہونا چاہیے
آج کل ہندی زبان کے کورس میں اُردو کے ادیبوں کا دخل بھی نہیں، اگر
کوئی کہانی رکھی بھی جاتی ہے تو اس کا ہندی میں ترجمہ کیا جاتا ہے۔
ترجمہ نہ کیا جائے، دیوناگری اسکرپٹ میں حرف بحرف وہی لکھا جائے
جو کہ اُردو میں لکھا ہوا ہے۔

نوالیس علی، مگر اسکرپٹ سے زبان کا بڑا گہرا تعلق ہے، اُسکو آپ
کس طرح ختم کر سکتی ہیں۔

عصمت: اگر ان حروف کو زندہ رکھنا ہے، اُنھیں دوسروں تک
پہنچانا ہے تو اُنہیں ایک ایسے لباس میں پیش کرنا پڑے گا جس کو سرکار
نے اسٹیٹ لنگویج بنا دیا ہے۔ خوش نہیں ہیں اس بات سے کہ
صرف ہندی کو یہ مرتبہ دیا گیا، لیکن ہمیں یہ کوشش کرنی چاہیئے کہ جب
بچّے ہندی سیکھ جائیں تو اپنی زبان اُن تک پہنچانے کے۔ یہ ہندی اسکرپٹ
میں آسانی ہو۔ اپنا اسکرپٹ قائم رکھیں۔ اگر دو لباس ہو جائیں گے تو کوئی
ہرج نہیں۔ ایک زبان جس کے ساتھ زیادتی ہوئی ہے اگر اس کے دو لباس ہو جائیں
—— ایک دیوناگری اسکرپٹ کا اور ایک فارسی اسکرپٹ کا تو کوئی نقصان
نہیں پہنچے گا۔ اتنے بڑے ملک میں، اتنے بڑے وسیع ایریا میں ایک
زبان رائج کرنا بڑا مشکل سا ہے، لیکن ہندی بہت کچھ ہو گئی ہے، اب ہو گئی
ہے تو ہمیں اُس کے ساتھ سمجھوتہ کرنا چاہیئے۔ اُس کے سہارے سے اپنے
الفاظ کو زندہ رکھنا چاہیئے۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ اُردو اسکرپٹ کو ختم کر دیجئے
اُس کا رکھنا جُرم بنا دیجئے۔ نہیں اُس کو قائم رکھئے جتنا قائم رکھ سکتے ہیں۔
اُردو ادب جیسا ہے، ویسا ہندی میں پہنچے، اس کا ترجمہ نہ ہو، اُس کے
الفاظ نہ بدلے جائیں، اُسکی ترکیبیں نہ توڑی موڑی جائیں ورنہ اتنا سارا
ہمارے ادب کا سرمایہ ہے وہ کس طرح اگلی نسلوں تک پہنچے گا۔ غزل تو
نظر میں تو وہ کچھ بدل نہیں سکتے۔ وہ بجنسہ ہندی اسکرپٹ میں پہنچ جاتی
ہیں لیکن نثر کی بڑی مصیبت ہے۔ اُس کو وہ بدل دیتے ہیں۔ اس میں اُردو
کی جگہ ہندی کے الفاظ آتے ہیں۔ یہ بڑی زیادتی ہے۔

یُولس لگاسکی: لیکن اُردو والوں کو جو خطرہ محسوس ہوتا ہے وہ ہندی والوں
کے اس رجحان سے کہ وہ تمام اطراف کی زبانوں کو اپنی شیلی (اسٹائل) یا
بولی قرار دیتے ہیں، مثلاً قدیم اُردو یا دکنی کو وہ دکنی ہندی کہتے ہیں تو ایسی صورت
میں ہندی اسکرپٹ اختیار کرنے پر اُردو کا انفرادی وجود خطرے میں
پڑ جائے گا۔

شاعر سیتی

عصمت: اگر ہم اُسے قائم رکھیں تو وہ قائم رہے گا۔ اب جو ہم کوشش کر
رہے ہیں وہ کرتے رہیں، وہ جاری رہیں، جو اکاڈمیاں بنی ہیں یا جو گورنمنٹ
مدد دے رہی ہے وہ جاری رہے گی لیکن ہندی میں بھی ہمارا سارا ادب
پہنچ جائے۔ یعنی دو لباس ہو جائیں تو کیا ہرج ہے؟

یُولس لگاسکی: عام طور پر اسکرپٹ بدلنے کے حق میں وہ لوگ زیادہ ہوتے ہیں
جن کا اسکرپٹ بدلنے میں کچھ فائدہ ہوتا ہے اور اسکرپٹ نہ بدلنے کے حق
میں وہ لوگ زیادہ ہوتے ہیں جو اسکرپٹ کے بدل جانے پر نقصان میں
رہتے ہیں۔ اسی وجہ سے اختلافات زیادہ بڑھ گئے ہیں اور سنجیدگی سے اس
مسئلے پر غور نہیں ہو رہا ہے۔

عصمت: میں یہ کہتی ہوں کہ ہمیں اپنا اسکرپٹ چھوڑنا نہیں چاہیئے بلکہ ہندی
کا بھی سمجھ لینا چاہیئے۔ ہندی اسکرپٹ کو بھی بدل ڈالیں اگر فرصت ہو اور
ہم چاہیں۔

میموتہ دلوی: ابھی آپ نے کہا کہ اُردو اور ہندی دونوں رسم خط برقرار رہیں،
ایک ہی تحریر دونوں لپیوں میں لکھی جائے، ترجمہ نہ کیا جائے۔ اس طرح تو
آپ گاندھی جی کے ہندوستانی کے نظریئے سے بہت قریب آگئیں۔

عصمت: گاندھی جی نے ہندوستان ہی کو آزاد نہیں کرایا، بلکہ ہندوستانیوں کو
بھی آزاد کرانے کی کوشش کی۔ وہ جانتے تھے کہ آگے چل کر اُردو ہندی کا
جھگڑا شدید ہوگا۔ دونوں میں ٹکراؤ ہوگا۔ اسی لئے اُنھوں نے ایک مشترکہ
زبان کو رائج کرنے کی کوشش کی۔ وہ چاہتے تھے کہ سارے ملک کی ایک
زبان ہو۔ آج ستائیس برس ہو گئے مگر انگلش کے بغیر ہمارا کام نہیں چلتا۔
بہت کوشش کی جا رہی ہے لیکن ہندی مشترکہ زبان نہیں بن پا رہی ہے۔ اگر
گاندھی جی کی ہندوستانی کو اسٹیٹ لنگویج بنا دیا جاتا تو شاید اب تک ہمیں
انگریزی سے چھٹکارا مل گیا ہوتا۔

یُولس لگاسکی: ابھی آپ نے فرمایا کہ اُردو والوں کے بچے اُردو نہیں پڑھتے
اور ہندی والوں میں بھی شاید یہ رجحان پایا جاتا ہے کہ انگریزی اسکولوں
میں پڑھتے ہیں، اس کی کیا وجوہ ہو سکتی ہیں؟

عصمت: ہندی یا اُردو پڑھ کر روزی نہیں ملتی، انڈر ڈیولپمنٹ ہے، جو کچھ پڑھایا جاتا
ہے، انگلش میں پڑھایا جاتا ہے۔ جن کی انگلش اچھی ہوتی ہے اُنہیں اچھی
نوکریاں ملتی ہیں۔ انگلش کی تعلیم اتنی اہم نہیں تھی جتنی آج ہو گئی ہے۔

یُولس لگاسکی: میرا خیال ہے کہ بہت سے لوگوں کو اردو یا ہندی پڑھنے کی
وجہ سے بھی نوکریاں ملتی ہیں۔

عصمت: کتنوں کو؟ گنتی کے چند لوگوں کو مل جاتی ہیں۔ لیکن عام نوکری، عام زندگی کی نوکری میں اُردو اور ہندی کام نہیں آتیں۔ ہندی کے شعبوں میں مل جائے، اُردو کے شعبے میں مل جائے، لیکن کتنے کھپتے ہیں اُردو کے شعبے میں اور ہندی کے شعبے میں؟ پروفیسری مل جائے گی لیکن کوئی انجینئر بننا چاہے، کوئی ڈاکٹر بننا چاہتا ہو، کوئی چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ بننا چاہے تو اُسے صرف انگریزی سے کام چلانا پڑتا ہے۔ اُردو یا ہندی اُس کے کسی کام کی نہیں ہوتی۔

یونس اگاسکر: جدید افسانے میں جو علامتی رجحان آیا ہے اُس کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟ ماہنامہ "کتاب" میں آپ نے ایک انشائیہ نما مضمون لکھا تھا "سانپ کے تلوے" جس میں علامت نگاری وغیرہ کا کافی مذاق اڑایا گیا تھا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ کا رویہ اس سلسلے میں ہمدردانہ نہیں ہے۔

عصمت: نہ دشمنانہ ہے! ٹھیک ہے میں نے مذاق اُڑایا، لیکن میں خود اپنا مذاق اُڑا رہی تھی۔ شاید آپ نے میری وہ کہانی پڑھی ہو جو "کتاب" ہی میں چھپی تھی۔ "میری دشمن میری دوست" جس میں مَیں نے بتایا تھا کہ میں خود ہی اپنی دشمن اور اپنی دوست ہوں۔ تو میں کسی کو بخشتی نہیں ہوں۔ میں نے خود کو نہیں بخشا، اپنے بھائی کو نہیں بخشا۔ "سانپ کے تلوے" میں میں نے کچھ نئی نظموں، کچھ آزاد نظموں کے سلسلے میں جو اُلجھن محسوس کی، وہ کہدی، لیکن میں نے کچھ تائید بھی کی ہے، کچھ نئے طرز کی تعریف بھی کی ہے، بُرائی بھی کی ہے۔ اُلجھن کا اظہار بھی کیا ہے۔ نئے انداز کی نظموں کے سلسلے میں وہ ایک ردِ عمل سا ہے۔

یونس اگاسکر: کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک مخصوص تیکنیک کو برتتے برتتے لوگ اُکتا جاتے ہیں، اُسے بدلنا چاہتے ہیں۔

عصمت: ہاں تو بدلو اُسے، مجھے اس سے شکایت نہیں ہے۔ نئے جدید لکھنے والوں سے مجھے شکایت نہیں ہے، وہ کھو رہے ہیں، سمت پا لیں گے، ہمارے ماحول میں بھی ہماری سیاسی زندگی میں بھی سمت صاف نہیں ہے۔ ابھی کچھ کچھ صاف ہو رہا ہے، کہتے کہ ابھی چند مہینوں سے جب سے مسز گاندھی نے جرأت مندانہ قدم اُٹھائے ہیں۔ ویسے گزشتہ دس سال میں بہت تبدیلیاں ہوئی ہیں، سوچنے کے انداز بدلے ہیں، شاید ہمارے بچوں کو اب کوئی راہ نظر آجائے گی اور انھیں معلوم ہو جائے گا کہ انھیں کیا کہنا ہے اور کیوں کہنا ہے۔ آج بعض کہانیاں اور بعض نظمیں ایسی ہیں جن میں سوائے الفاظوں کے اور تشبیہوں کے کوئی معنی نہیں، آگے معنی پیدا ہو جائیں گے، انسان راستہ بھٹکتا ہے اور راستہ پا لیتا ہے اور اگر وہ اب بھی ان تحریروں کو ٹھیک سمجھتے ہیں، اُن پر قانع شاعر بھی

تو ہمیں کیا شکایت ہو سکتی ہے؟ ہر ایک کو حق حاصل ہے کہ جس انداز میں چاہے لکھے۔ ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔ لیکن نئے لکھنے والے پُرانے لکھنے والوں پر برابر اعتراض کرتے ہیں۔ مگر ہم نے کسی نئے لکھنے والے پر کُھل کر زبردست کُشتا ہوا اعتراض نہیں کیا۔ ہم چاہیں تو اُن کے چیتھڑے بکھیر سکتے ہیں۔ ٹھیک ہے بچے ہیں، خود ہی سیکھیں گے۔ میں تو اس بات کی قائل ہوں کہ کسی کو سکھانا نہیں چاہیے کیونکہ میں نے اپنے تنقید نگاروں سے کچھ نہیں سیکھا، کبھی نہیں مانا۔ جو اُنھوں نے کہا میں نے اُس کے خلاف لکھا۔ میں نے زندگی میں جو کچھ بھی ہوئی، بُرائی، بنی ہوئی لکیریں تھیں اُن کو مٹا کے، اُن سے بغاوت کر کے لکھا ہے۔ میں یہ سمجھتی ہوں کہ نئے لکھنے والوں کو بھی یہ چاہیے کہ بجائے ترقی پسندوں کو گالیاں دینے کے اور اُن کے مرنے کی دعائیں مانگنے کے، اپنی تحریروں پر بھروسا کرنا سیکھیں اور اُن میں جان پیدا کریں، دلچسپی پیدا کریں۔ خاص طور سے اُردو میں لکھنے والوں کا میدان بہت محدود ہو گیا ہے اور جو باتیں ہمیں حاصل تھیں وہ اُنھیں حاصل نہیں ہیں۔

یونس اگاسکر: آپا! ہمیں بتائیے کہ آجکل آپ کیا لکھ رہی ہیں؟ اور آئندہ آپ کا کیا لکھنے کا ارادہ ہے؟ کیا آپ اپنے پُرانے موضوعات ہی کو برتتی رہیں گی۔ یا نئی جہتیں بھی تلاش کریں گی؟

عصمت: میں نے ابتدا میں گھریلو اُلجھنوں پر، لڑکیوں پر، بال بچوں پر بہت کچھ لکھا۔ جب میں بمبئی آئی تو مجھ پر کمیونسٹ پارٹی کا اثر ہوا اور میں نے لال جھنڈے کی طاقت سے مرعوب ہو کر بہت سی ایسی کہانیاں لکھیں جن کا رنگ میری پُرانی کہانیوں سے مختلف تھا۔ پھر میں فلم میں غرق ہو گئی اور میں نے فلمی ماحول پر کہانیاں اور ناول لکھیں۔ آہستہ آہستہ میرا جی ان سب موضوعات سے اُکتا گیا۔ جب لکھنے کو کچھ نہ رہا تو میں نے انیس کے مرثیے پڑھنے شروع کیے۔ پانچ جلدیں پڑھ ڈالیں۔ مجھے امام حسینؑ کی بڑی دل کو چھو لینے والی کہانی نظر آئی۔ بچپن میں محرم کی مجلسوں میں شریک ہوتی۔ بہت سے ماتم دیکھے، جلوس دیکھے۔ میں نے سوچا کہ وہ کیا چیز تھی جس نے لوگوں کو اتنا متاثر کیا۔ وہ موومنٹ کیا تھی۔ اس کو ذہن میں رکھ کر میں نے ایک ناول لکھی "ایک قطرۂ خون" جس میں بتایا کہ ایک شخص نے چودہ سو برس پہلے سامراجی طاقتوں کا کن ہتھیاروں سے مقابلہ کیا، گردن کٹا دی لیکن سر نہیں جھکایا، پورے خاندان کو مٹا دیا۔ اگرچہ اور بھی بڑے بڑے سانحے گزرے ہیں لیکن اُن کو بُھلا دیا گیا۔ چنگیز خاں، تیمور لنگ اور نادر شاہ پر ہندوستان میں کوئی کتاب یا ناول نہیں لکھی گئی لیکن امام حسینؑ پر سیکڑوں مرثیے، مضامین اور کتابیں لکھی گئی ہیں۔ مجھ کو جتنی کتابیں ملیں میں نے پڑھیں [illegible]

کہ اس واقعے کو مذہب کا حصہ بنا لینے سے اتنی اہمیت حاصل ہوگئی اور اس کی وجہ سے یہ واقعہ آج تک اتنا اہم ہے کہ معلوم ہوتا ہے کل ہوا ہے۔ میں نے اس واقعہ کو ناول کی شکل دی ہے۔

نورالعین علی: آپا مجھے یہ پوچھنا ہے کہ آپ کا جو مخصوص انداز بیان ہے اسی کو آپ نے اس ناول میں برتا ہے یا ایک سنجیدہ موضوع اور مذہبی ہستی کے لئے آپ نے اس میں کچھ تبدیلی کی ہے؟

عصمت: میں نے انیس کا اندازِ بیان درک کر کے چرانے کی کوشش کی ہے اور اپنا انداز بیان بالکل بدل دیا ہے۔ کوشش کی ہے کہ میرا ایک جملہ نہ آنے پائے۔ اپنے دل سے کچھ نہیں لکھا سب کچھ کتابوں سے لیا ہے۔

نورالعین علی: اچھا کیا (مسکرا کر) ورنہ مولوی نذیر احمد نے "امہات الامۃ" میں اپنا مخصوص طرزِ تحریر برقرار رکھا تھا اور محاورہ دار زبان لکھنے کے شوق میں ایک قیامت کھڑی کر دی تھی۔

عصمت: (ہنستے ہوئے) نہیں میں نے اپنے طرز تحریر کو بدلنے کی کوشش کی ہے اور نئی راہ پر چلنے میں مجھے بڑا لطف آیا اور یہ ناول اس قدر gripping اور پر اثر ہو گیا ہے کہ کیا بتاؤں۔ لیکن آپ کو یہ سن کر تعجب ہوگا کہ کوئی پبلشر "ایک قطرۂ خون" چھاپنے پر راضی نہیں ہوا۔ کہنے لگے اس میں مذہب کا ذکر آجاتا ہے۔ ہاں کوئی پھڑکتی ہوئی ناول لکھ دیں تو آپ کو فوراً پیشگی رائلٹی مل جائے گی۔ سنجیدہ کتابوں کو چھاپنے کیلئے ہمارے ناشر تیار نہیں ہوتے۔ رسالے بھی آج کل سنجیدہ تحریروں سے کتراتے ہیں کیونکہ عموماً ایسی میگزین جس میں سنجیدہ اور معیاری مواد ہو لوگ نہیں خریدتے۔ "شاعر" کو چلانے کے لئے کیا پاپڑ بیل رہے ہیں اور کتنی مشکل سے یہ پرچہ زندہ ہے۔ یہ اعجاز صاحب ہی بتا سکتے ہیں۔ اللہ ان کو سلامت رکھے۔ بڑی حیرت ہوتی ہے جب "شاعر" کا کوئی نمبر نکل آتا ہے۔ آج اردو کا اخبار یا رسالہ کوئی چلا لیتا ہے تو میرا سر عقیدت سے جھکنے لگتا ہے۔

میمونہ دلوی: آج کل آپ کیا لکھ رہی ہیں؟

عصمت: اب میں اپنے خاندان کے بارے میں ایک ناول لکھ رہی ہوں جس میں ہمارے بہن بھائیوں، چچاؤں، پھوپھیوں، نانیوں اور دادیوں کا ذکر کروں گی۔ اسے بڑی بے رحمی سے میں لکھنے کی کوشش کر رہی ہوں۔ اس کا ایک ایک لفظ، بخدا ایک ایک لفظ صحیح ہوگا۔ جھوٹ کہیں نہیں بولوں گی۔ میں نے اس ناول کا ایک باب لکھ لیا ہے۔

میمونہ دلوی: اس کا نام ہے آپ کے ذہن میں؟

عصمت: ابھی نہیں۔ پتا نہیں اس کے لکھنے میں کامیابی ہوگی کہ نہیں ہوگی لیکن مجھے مزا بہت آرہا ہے۔ میں اپنے خاندان کے بارے میں زیادہ جانتی ہوں اور زیادہ اچھا لکھ سکتی ہوں۔

مقالہ

عصمت چغتائی کا ناول ـــ عجیب آدمی

ڈاکٹر زرینہ ثانی
۳۶۱۔ شنکر نگر، ناگپور

ناول کی تعریف مختلف طریقوں سے کی گئی ہے۔ کبھی ناول کو "نثر میں طربیہ کہانی" کہا گیا تو کبھی عصری زندگی اور معاشرت کی سچی تصویر۔ کبھی نیکی اور اخلاق کا مبلغ سمجھا گیا تو کبھی تفریح و تفنن کا آلہ۔ کسی نے ناول کو انسانی خیالات کا تجزیہ اور اس کے اظہار کا ریکارڈ جانا، تو کسی نے ناول کو زندگی کا مطالعہ اور اس کا فنکارانہ اظہار سمجھا۔ کسی نے ناول کو انسانی زندگی کی ترجمانی سے موسوم کیا تو کسی نے زندگی کا آئینہ کہا۔ لیکن ان تمام تعریفوں میں جو ایک مشترک قدر ہے، وہ ہے زندگی۔ گویا ناول کسی نہ کسی طرح زندگی سے تعلق رکھتا ہے اور زندگی کے مختلف واقعات کے تانے بانے سے ناول نگار ناول کا پلاٹ تعمیر کرتا ہے۔ ناول کی دلچسپی کا انحصار بہت کچھ پلاٹ پر ہوتا ہے۔ ناول چونکہ زندگی کا کسی نہ کسی طرح عکاس ہوتا ہے اس لئے پلاٹ کو اجنبی اور مافوق الفطرت قسم کے عناصر سے پاک ہونا چاہیئے۔ عصر حاضر کے رجحانات اور میلانات ناول کی کامیابی کے ضامن ہو سکتے ہیں۔ ناول چونکہ مختلف واقعات کے سہارے آگے بڑھتا ہے اس لئے ان کو پیش کرنے میں تسلسل اور ربط کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ قاری خلا محسوس نہ کرے اور نہ ہی پلاٹ میں بے ربطی اور بے آہنگی معلوم ہو۔ اس لئے ناول نگار کو ایک خاص شعور اور سلیقے کی ضرورت ہوتی ہے جس کی مدد سے وہ واقعات کو یوں پیش کر سکے کہ نہ ہی آورد کا شائبہ ہو اور نہ بوریت محسوس ہو بلکہ ایک ربط اور تسلسل کا احساس ہو۔

ان باتوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے جب ہم عصمت چغتائی کا ناول ـــ "عجیب آدمی" پڑھتے ہیں تو ظاہر ہوتا ہے کہ ناول نگار نے فلم انڈسٹری کے مختلف واقعات سے پلاٹ کی تعمیر کی ہے، اور اس سلیقے اور فنکاری سے کہ تمام واقعات ایک دوسرے سے مربوط نظر آتے ہیں۔ اور دھرم دیو کی زندگی کو ہر گوشے سے جانتے ہیں۔ اس ناول میں ایک فرد کے توسط سے پوری فلمی دنیا کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ اس میں ہماری فلمی انڈسٹری پر بھرپور طنز بھی ہے۔

عصمت آپا بزرگ ادیبوں میں شامل کی جا سکتی ہیں۔ انھوں نے اپنی ادبی زندگی کی ابتدا چونکا دینے والے انداز میں کی اور شروع میں انھیں خاتون ادیب سمجھنے کی بجائے کہا گیا ـــ کوئی معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں۔ ان کے تحریری بلوغ کا زمانہ ترقی پسند تحریک کے عروج کا زمانہ تھا۔ اس تحریک سے وابستہ لوگوں نے عام موضوعات سے بغاوت کی اور حقیقت پسندانہ روش کو اختیار کیا۔ عصمت آپا نے بھی نئے انداز کے افسانے لکھے۔ ان کی کہانیاں گھریلو نفسیاتی اور جنسی مسائل پر مبنی ہوتی تھیں۔ اپنی ضدی طبیعت کی بنا پر بغیر دلیل اور بحث کے وہ کسی بات سے مطمئن نہ ہوتیں۔ لکھنے سے پہلے وہ اپنے موضوع کو خود اچھی طرح سمجھتیں اور اطمینان کر لیتیں۔ اسی لئے ان کے بیان میں گہرائی، گیرائی اور ایک فنی نکھار ہے۔ جس طرح صیاد اپنے شکار پر جھپٹ کر اسے پوری طرح اپنی گرفت میں لے لیتا ہے، اسی طرح وہ بھی موضوع پر اپنی گرفت سخت کر لیتی ہیں اور پھر وہ موضوع کسی طرح بھی ان کی گرفت سے نہیں نکل سکتا۔ "عجیب آدمی" میں بھی انھوں نے موضوع کو بے حد استحکامیت سے گرفت میں لیا ہے۔ اس عجیب آدمی کے ماحول اور اس کی آس پاس کی دنیا سے انھیں پوری واقفیت ہے۔ اس دنیا کے مسائل اور اس کی الجھنوں کا انھوں نے قریب سے مطالعہ اور مشاہدہ کیا ہے، انھیں فنکارانہ اور ساحرانہ انداز میں ناول میں پیش کیا ہے۔ لگتا ہے فلمی دنیا ان کی جانی پہچانی دنیا ہے اور وہ اس کے چپے چپے سے واقف ہیں۔

ناول کی ابتدا ہی ہماری توجہ اپنی طرف مبذول کر لیتی ہے۔ ہم ناول کے ہیرو دھرم دیو سے دلچسپی لینے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ [illegible] کچھ اس طرح کرا دیا جاتا ہے۔ "دھرم دیو ... ایک [illegible]

شاعر۔ بمبئی

...... اتفاقاً بہت سی باتوں کے شروع ہونے کے بعد بھی شروع ہو جاتی ہیں۔
دھرم دیو کے متعلق عصمت چغتائی نے لکھا ہے۔ "اگر وہ لڑکی ہوتا...
تو یقیناً وہ قوم اُس کے سامنے تصویر کھینچوا تا، قوم اور ملک کی خدمت سمجھتے"
آج کے معاشرے پر کتنا گہرا اور بھرپور وار ہے یہ صحیح معنوں میں موثر طنز
وہی ہے جو اپنا کام کر جائے اور قاری کے لبوں پر تبسم آ جائے ......
فلمی دنیا کی نفسیات کو اس ناول میں بڑی خوبصورتی سے پیش کیا گیا ہے
اور اُس کے بعض اہم گوشوں اور رجحانوں کو اُجاگر کیا گیا ہے۔ یہاں کی
بھیڑ چال مشہور ہے۔ اگر ایک خاص قسم کی فلم ہٹ ہو جائے تو سارے
پروڈیوسر اور فائنانسر اُسی ٹائپ کی فلم بنا کر دولت سمیٹنے کے جنون میں مبتلا
نظر آئیں گے اور زور و شور سے اُس کی تیاریاں شروع ہو جائیں گی۔ کیبرے
ڈانس کو لیجئے۔ ایک فلم میں پیش ہوا اور دوسرے فلم سازوں نے سمجھ لیا کہ
یہ فلم کی کامیابی کا جزوِ لاینفک ہے۔ بلا سے اُس فلم میں اس رقص کی
گنجائش ہو یا نہ ہو۔
۱۹۱۶ء کی بات کرتے ہوئے مصنفہ وضاحت کرتی ہیں کہ اس زمانے
میں فلمی دنیا سے منسلک افراد اپنے بچوں کو اس دنیا سے دُور رکھنا چاہتے
تھے جبکہ معاملہ آج برعکس ہے۔ ببیں تفاوتِ رہ از کجاست تا بکجا۔
ناول کا ایک جملہ "بابو یہ فلم لائن ہے یہاں سب چلتا ہے"
اس دنیا کا ایک آئینہ ہے جس میں مختلف عکس نظر آتے ہیں۔ ایک ڈیپر
دھرم دیو اپنے ساتھی کو دھتکارتا ہے۔ مگر دوسرے لمحہ اُس کی خوشامد کرنی
پڑتی ہے اور ایک جرنلسٹ کو بلوا کر اس کی شہرت اور پبلسٹی کے لئے اُسکے
کئی پوز لئے جاتے ہیں تب وہ شانت ہوتا ہے۔ سچ پوچھئے تو یہ نگری عجیب
نگری ہے اور یہاں کے باسی بھی عجیب!
دھرم دیو کی زندگی کو دیکھ کر اُس کی فطرت کے پیشِ نظر ناول کا عنوان
"عجیب آدمی" مناسب اور موزوں ترین ہے ــــــ دھرم دیو کی فلم
ہٹ ہو جانے پر اُس کے نام کا ڈنکا بجتا ہے اور پھر منگلا کے گھر کے
لوگ اس سے مرعوب ہو جاتے ہیں اور اسی طرح دنیا کے اسٹار بنتے ہیں اُسکے
خاندان والوں کے دلوں میں اُس کی محبت کے سوتے نہیں بلکہ سمندر اُبل
پڑتے ہیں اور بے دریغ دیتا ہے اپنی خوش قسمتی سمجھ کر سارے خاندان
والوں کو تحفے دیتا ہے۔
ناول میں عجیب آدمی کا کردار دھرم دیو کا کردار ہے۔ واقعی وہ عجیب
ہے۔ ایک وقت دیتا اور دوسرے وقت پیار جتاتا ہے۔ منگلا اس کو حاصل
شادی کی ہیں

کسی کی حسرت میں خنجر پالتی ہے مگر بوقت ضرورت مدد سے وہ بچتا
ہے اور دونوں کا بیاہ ہو جاتا ہے۔ بیاہتا ہونے پر بھی ریہرسل کے وقت
زرینہ سے ٹکراتا ہے اور جب وہ اُسکے سینے پر سر ٹیک دیتی ہے تو اُسے
جھٹک دیتا ہے ...... یہ بھی اُس کی عجیب و غریب فطرت کا اظہار
ہے۔ انسانی نفسیات کی عمدہ عکاسی کی گئی ہے۔ انسان اس بات کی
کوشش ضرور کرتا ہے کہ وہ بُرائی سے بچ سکے۔ غلط جذبے کو غالب
نہ آنے دے کیونکہ انسان صرف بُرائیوں یا اچھائیوں کا مرکب نہیں بلکہ
اُس کی فطرت میں دونوں کی آمیزش پائی جاتی ہے۔ دھرم دیو اس وقت
غلط جذبوں سے نجات پانے کے لئے گیسٹ روم میں جاتا ہے اور اپنی
بیوی کو آنے کے لئے فون کرتا ہے تاکہ محفوظ رہ سکے۔ لیکن جیں یہ راز
رکھتا ہے کہ انسانی جذبوں کے تلاطم میں پہاڑ جیسے اٹل ارادے بھی بہہ
جاتے ہیں اور جذبوں پر قابو پانا ناممکن ہو جاتا ہے۔ ایسی چیز کو عصمت نے
فنکارانہ انداز سے پیش کیا ہے۔ اگر اس حقیقت کو پیش نہ کیا جاتا تو
دھرم کا کردار تخیلی بن جاتا، حقیقت سے دُور ــــــ!
زرینہ کو سین سمجھاتے ہوئے اُسے چومتا ہے اور وہ بھی اُسکے سینے سے لگی کھڑی
ہنسی ہنستی ہے۔ بعد میں وہ پریشان سا ہو کر اپنے ساتھی رندھیر سے کہتا
"جی چاہتا ہے اس لائن کو چھوڑ کر کہیں اور چلا جاؤں" یہاں بھی خیر و شر
کی کشمکش کا اظہار عمدگی سے کیا گیا ہے ..... آگے چل کر رندھیر
اس کی حالت کو دیکھ کر ترس کھاتا ہے اور ہوٹل میں شراب و شاہد کی
آراستہ کر دیتا ہے، تب بھی وہ "اُف" کہتا ہے مگر ایسی رنگین و حسین
میں قحبہ کے ٹوٹے ہوئے پیالے نہ نظر آئیں تو کیا نظر آئے۔ رندھیر کی دعوت پر
وہ کہتا ہے۔ "میں بہت کمینہ ہوں" یہاں بھی اُس کی دبی ہوئی انسانیت
چیخ سنائی دیتی ہے۔ اس طرح یہ کردار اپنی تمام فطری کمزوریوں اور
کے ساتھ آگے بڑھتا ہے۔
خواہش کی تکمیل کے بعد وہ سوچتا ہے زرینہ نے سیٹ پر فائدہ
دکھانے کا سرٹیفکیٹ حاصل کر لیا ہے۔ مگر اُس کے تعجب کی انتہا
نہیں رہتی جب زرینہ حسبِ معمول کام کرتی ہے۔ یہ انسانی فطرت ہے۔
وہ کبھی کچھ چاہتا ہے اور کبھی کچھ۔ حالانکہ دھرم کو شاید بغیر گزشتہ
سوچے کام شروع کرنا تھا مگر اُس کی عجیب و غریب فطرت گزشتہ
لمحات کا عکس زرینہ کی آنکھوں میں نہ پا کر بے چین ہو اُٹھتی ہے۔
ہے۔ وہ صرف ڈائریکٹر کو چاہتی ہے مجھے نہیں" اور اس پر اُداسی

ہو جاتی ہے۔

دھرم کی بیوی منگلا پہلے زرینہ کو دوست سمجھتی ہے مگر رفتہ رفتہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے۔ انتقامی جذبے کے تحت وہ اپنے شوہر کی فلموں میں کام نہ دینا بند کر دیتی ہے اور دوسروں کو بھی عدم تعاون کے لئے تیار کر لیتی ہے۔ دھرم پریشان ہو کر نیند کی گولیاں کھا کر زندگی سے نجات پانے کی ناکام کوشش کرتا ہے' اس کے بعد پھر شوٹنگ کرتے ہوئے تنہائی اور ویرانی کا احساس جاگ اٹھتا ہے۔ اس سے نجات دلانے کے لئے اس کے ساتھی اُسے پدما کے یہاں لے جاتے ہیں۔ یہاں وہ رقص و سرود اور کیف و مستی میں ڈوبا رہتا ہے۔ چرس' شراب' افیون' خواب آور گولیوں کا استعمال بڑھ جاتا ہے۔ وہ عجیب کشمکش کے دور سے گذرتا ہے۔ زرینہ منگلا اور پدما تینوں اُس کی زندگی کا مثلث بن جاتی ہیں' دل زرینہ کے قدموں میں' دماغ اپنے مقدس گھر میں اور ناپاک بدن پدما کی باہوں میں" اُس کی زندگی کا انتہائی تاریک اور المناک دور ہے۔ یہ وہ فلمساز اور اداکار ہے جس نے معمولی اداکارہ کو فلمی دنیا کا چاند بنا دیا۔ جس کی کئی فلمیں ہٹ ہوئیں۔ جس نے اپنے بچوں کی محبت کو پانا چاہا' مگر نہ پا سکا۔ جس نے اپنی بیوی کی شہرت میں حصہ لیا مگر خود اُس کی زندگی غموں کا مجموعہ بن گئی۔ بیوی بیگانہ ہو کر فرید کی آغوش میں تسکین ڈھونڈھنے لگی اور اُسے محسوس ہوا کہ اُس کا سب کچھ لٹ گیا۔ آخر شب بارہا اُس نے اپنے دوست سے رفاقت کے لئے التجا کی مگر اُس کا دوست اپنے گھر چلا گیا۔ اُس کے بعد اُس نے بیوی کو فون کیا۔ بچوں کو بلانا چاہا تاکہ اُس کی تنہائی کا احساس ختم ہو مگر ناکام رہا۔ آخری سہارا نیند کی گولیاں اور شراب تھیں۔ مسلسل خواب آور گولیوں کو شراب میں ڈال کر پیتا رہا" ——— اور غم حیات سے نجات مل گئی۔" قاری کو دھرم کی خامیوں اور بے راہ رویوں کے باوجود اُس سے ہمدردی ہو جاتی ہے اور اُس کی المیہ موت ہماری انڈسٹری کے ذہین اور مشہور فلمساز و اداکار گرو دت کی یاد تازہ کر دیتی ہے۔

اس ناول میں مصنفہ نے مختلف کرداروں کا تجزیہ بھی خوبصورتی سے کیا ہے۔ دھرم دیو' منگلا اور زرینہ کو مرکزی حیثیت حاصل ہے جبکہ رندھیر' ریتا' رمی' کیشو' فرید' آمنہ وغیرہ ضمنی کردار ہیں اور یہ سب حسن و خوبی سے پیش کئے گئے ہیں۔ جیسے جیسے ناول آگے بڑھتا ہے' یہ کردار فلمی موضوع سے متعلق مختلف گوشوں کو اُجاگر کرتے ہیں۔ مصنفہ نے فلم سے متعلق دوسرے فنون کا بھی تفصیلی جائزہ پیش کیا ہے۔ جیسے شوٹنگ' ریہرسل' میک اپ' کیمرہ وغیرہ اور ان کے مسائل بھی پیش کئے ہیں۔

عصمت آپا کی گرفت میں جس قدر واقعات تھے اُن میں سے کچھ کا انتخاب بڑی خوبی سے کرتے ہوئے خلوص سے اُن کا احاطہ کیا ہے۔ وہ حقائق کے سلسلے میں خود کو فریب دہی سے بچاتی رہی ہیں۔ سچ پوچھئے تو وہ ہمارے عصر کی ایک حقیقت نگار خاتون ہیں۔

بسا اوقات ناول نگار اپنے بلند آدرشوں کے لئے غلط بیانی سے کام لیتا ہے جس سے ناول حقیقی نہیں تخئیلی بن جاتا ہے۔ مگر "عجیب آدمی" میں ایسی خامی نہیں بلکہ مذکورہ ناول میں حقیقتوں کو بے باکی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ عصمت آپا نے دوسرے اخلاقی ناول نگاروں کی طرح کبھی نام نہاد اخلاقی اقدار کا ڈھنڈورا نہیں پیٹا بلکہ اُن کے اکثر کردار جنسی گھٹن اور اس سے پیدا ہونے والے مسائل کو پیش کر کے قاری کے لئے غور و فکر کا سامان فراہم کرتے ہیں۔

ناول کی زبان کے متعلق صرف یہی کہنا کافی ہوگا کہ یہ عصمت آپا کی زبان ہے۔

○○

بقیہ: عصمت چغتائی ایک جادوگرنی صفحہ ۱۲

ہے جہاں وہ اپنے سب دکھ درد اور رنج و غم چھپا کے رکھ دیتی ہوں۔ کتنا جی چاہتا ہے کبھی تو وہ اپنی کوئی پریشانی اپنے کسی ہم عصر عزیز و اقارب دوست یا دشمن کو بتائیں' سنائیں ——— !! بہت پریشان ہوں گی تو زیادہ رمی کھیلیں گی' زیادہ پان کھائیں گی' زیادہ گپ کریں گی لیکن ——— ہم آپ لاکھ اس ارمان میں تڑپیں کہ عصمت چغتائی کے مقرب خاص بن کے اُن کی پریشانیوں میں حصہ بانٹیں ——— یہ ممکن نہیں ہے ——— کبھی ایسا مت سوچئے گا! "ہمدردی" کے لفظ سے لفظ سے تو وہ ایسا چڑتی ہیں' ایسا بدکتی ہیں کہ خود ہمدردی کا لفظ ان سے پناہ مانگتا ہے ——— عصمت آپا کو ان بعض لفظوں سے نفرت ہے اُس میں ایک لفظ "شوہر پرست بیوی" یعنی پتی ورتا استری" کا بھی اضافہ کر لیجئے۔ عورتوں کی اس صنف سے عصمت چغتائی کو ایسا بیر ہے کہ محض عصمت چغتائی کی تحریر کے آسرے پہ عورتوں نے آج کل "پتی ورتائیت" کی قید سے رسیاں تڑا کے مرد کے شانہ بہ شانہ چلنا شروع کر دیا ہے۔ اب یہ دوسری بات ہے کہ شانہ تو وہ مرد کے برابر رکھتی ہے' لیکن قدم مرد سے آگے بڑھاتی ہے۔ لیکن یہ تو عورت کا پہلا قدم ہے۔ اس کی تمنا کا آخری قدم کیا ہوگا؟ ○○

نئی دُلہن

عصمت چغتائی
۳- منڈسن کورٹ ، اے روڈ ، چرچ گیٹ - بمبئی - ۱

تانگہ بے طرح اُولر رہا تھا۔ پائیدان سڑک پر گھسٹ رہا تھا زمین ڈھسی اور سوکھا مارا تانگے والا اگلی سیٹ پر بیلنس کرنے سے قاصر تھے۔ تانگہ والا اُچک کر بم پر جا بیٹھا۔ مگر کچھ فرق نہ پڑا۔

تانگہ برآمدے کی چاندنی کے پاس رُک گیا۔ بیویاں اور نوکر چاکر اُس عجوبہ شے کو دیکھنے لگے جو تانگے کی پچھلی سیٹ پر لبالب بھری ہوئی تھی۔ گوشت پوست کے انبار نے کسمسا کر اُترنے کی کوشش کی۔ تانگہ چرّا اُٹھا گھوڑے کے پاؤں اُچک گئے۔ بڑے جتنوں سے نوکروں اور گھر کے مردوں کی مدد سے لیڈی ڈاکٹر مس نیوز تانگے میں سے سمٹ کر اُتاری گئی۔ کراہتی کانپتی وہ برآمدے کی سیڑھیوں پر چڑھی۔ جب یہ مہم سر کرنے کے بعد اُسکی سانس قابو میں آئی تو وہ بچوں کی ڈانٹ سُنانے لگی۔ یہ ہندوستانی عورتیں آدھی رات کو کیوں بچہ جننے بیٹھ جاتی ہیں۔ اور اُدیا کر اُسی کو بلاتی ہیں۔ حالانکہ وہ جانتی تھی دُور دُور تک اُس کے سوا کوئی ولایتی ڈاکٹرنی دستیاب نہیں ہو سکتی تھی۔ اُس کا بھاؤ بہت اُونچا تھا۔ صرف شیروانیوں میں بلائی جاتی تھی۔ اُسے گُدڑے کپڑے سے دلچسپی نہیں تھی۔

مگر مجھلی بھابی جان نے اپنے میکے سے میم سے جزائی کے روپے منگائے تھے۔ اور سرِ شام ہی سے دہشت زدہ تھیں کہ کہیں میم کے آنے سے پہلے ہی بچہ نہ نکل پڑے کر سارے کئے دھرے پر پانی پھر جائے۔ مستانی دائی تو حسبِ دستور آکر بیٹھ ہی گئی تھی۔ خاندان کے سارے بچے اُسی کے ہاتھ کے تھے۔

کوئی کرسی مس نیوز کے قابل دم دار نہ تھی۔ اس لئے وہ چوکی پر ڈھے گئی۔ زچہ کو ایک نظر دیکھ کر وہ پھٹ پڑی۔ بچہ ہونے میں ابھی گھنٹوں تھے کیسے اسے بیکار کو گھسیٹ لیا۔ جو [illegible] پینے میں سارے ملازموں [illegible] خدمات کے [illegible] کا حکم دیا۔ چاء انڈے [illegible] آدھا [illegible] کے ٹکڑے کا ایک [illegible] کر گئی۔

اُس کے چاروں طرف اُدھ سوئے بچے اور نوکروں کی بھیڑ جمع تھی۔

یہ وہ زمانہ تھا جب ہندوستان پر انگریزوں کا راج تھا۔ ہر انگریز ایک عجوبہ لگتا تھا۔ اُنھیں دیکھ کر لوگ ہق دق رہ جاتے تھے۔ جب آسمان پر ہوائی جہاز اُڑتا تو لوگ کام کاج چھوڑ کر اُسے دیکھتے گھروں سے نکل پڑتے کوئی انگریز بنگلے سے نکلتا تو سڑک کے لوگ منہ پھاڑ پھاڑ کے اُسے دیکھنے لگتے۔

مس نیوز جی بھر کے بدصورت تھی۔ وہ ہندوستان ایک کلکٹر صاحب کے عشق کے دَور میں ہندوستان چلی آئی تھی۔ مگر وہ کلکٹر صاحب اُسے دغا دے گیا۔ مس نیوز علیگڑھ ہی میں بس گئی۔ جب آئی تھی تو کہتے ہیں دُبلی پتلی آدمی کا بچہ تھی کلکٹر صاحب کے بعد دو چار صاحب کے ساتھ اُٹھی بیٹھی مگر شادی کے معاملہ میں پیچھے رہی۔ اُسے شادی کا شوق تھا۔ انگریزوں کی طرف سے نا اُمید ہو کر اُس نے چند وجیہہ ہندوستانیوں سے بھی دلچسپی لی۔ سُنا ہے کسی زمانہ میں ڈاکٹر [illegible] پر فریفتہ تھی۔ وہ شادی شدہ تھے مگر رومانس چلتا رہا۔ اس عرصہ میں اُس نے بہت دولت کمائی۔ آس پاس کے تمام انگریزوں اور نوابوں میں اُس کا اثر تھا۔ اُن دنوں فیملی پلاننگ کا چکر نہیں چلا تھا۔ اِس لئے بے تحاشا بچے ہوتے تھے۔ مس نیوز نے تمام ارد گرد کی زمین خرید ڈالی تھی۔ ایک بڑی سی کوٹھی بنا کر [illegible] تھی۔ عموماً عاشق کو زمین کا ایک ٹکڑا دے دیتی۔ کچھ دنوں بعد [illegible] کوٹھی کی [illegible] بنوا دیتی۔ مگر پھر وہ عاشق کہیں سے چاند سی دلہن بیاہ لاتا اور مس نیوز [illegible] کھودنے پر جُٹ جاتی۔

اس کمینے برتاؤ نے اُسے بھی بے انتہا کمینہ بنا دیا تھا۔ عاشقوں سے [illegible] تھے کہ وہ اب کسی پر بھروسہ نہیں کرتی تھی۔ اُسے بس ایک چیز سے عشق باقی رہ گیا تھا اور وہ تھا روپیہ۔ ہاں اُس کا [illegible] کی زبان کے بارے میں تھا۔ وہ ہندوستان کے [illegible] کرنا پسند کرتی تھی۔ چاہے کہیں [illegible] کا [illegible] سے [illegible] بعد اس کے [illegible]

تم تھے اُس کے کانوں سے بہرے۔

تنہائی اور دُکھوں نے اُسے اڑیل ٹٹو اور بے رحم بنا دیا تھا۔ اگر دھوبی بھنگی کی بہو مرتی ہوتی تو وہ پلٹ کر نہ دیکھتی۔ اُس نے اِس نابنجار ملک میں آکر بڑے بڑے غم سہے تھے۔ اِس تنہائی کی گھٹن نے اُسے پتھر بنا دیا تھا۔

منجھلی بھابی چلّا رہی تھی اور وہ میٹھی انڈوں کی زردی کا گھونٹ پی رہی تھی۔ کام پر لگنے سے پہلے اُس نے دو اُدھ اُبلے انڈے سہارے کے لئے نگلے' ایک گولی مکھن کی توس میں لپیٹ کر حلق سے اُتاری۔ اُسے کھاتے دیکھ کر ایسا لگتا تھا' کھا نہیں رہی ہے بس اندر ڈھکیل رہی ہے۔ اُس نے شاید دو بار زچہ کے پیٹ پر ہاتھ رکھا۔ بچہ ہو گیا تو ڈلسی اپنی نرس سے نال بندھوایا اور قینچی چلادی۔ بس اتنے کام کے لئے وہ پورے تین سو روپیہ لے گئی۔ تانگہ اس کا اپنا تھا مگر اُترتے ہی اُسے کرایہ دلواتی تھی جو کوچوان کی تنخواہ میں سے کاٹ لیا کرتی تھی۔

منجھلی بھابی برسوں مس نیوز کے آنے اور بچہ پیدا کرانے کی ڈینگیں اپنی ملنے جلنے والیوں کے سامنے مارتی رہیں کہ کس طرح اُنھوں نے جاہلوں لوگیاں بلوانے کے بجائے انگریز میم بلا کر بچہ جنا۔ لوگوں کا خیال تھا مس نیوز کے ہاتھ میں جادو ہے' اُس کے ہاتھوں ہمیشہ لڑکا نکلتا ہے اور سیتا دائی کے ہاتھوں اللہ مارا جب دیکھو جب لڑکی۔

مگر دُنیا کے اتنے لڑکوں میں سے ایک بھی مس نیوز کے نصیب کا نہ نکلا۔ گورے گورے کُنجت کالے تک پھسل گئے۔ عاجز آکر اُس نے ایک غریب خاندان کے اپنے سے دس برس چھوٹے لڑکے کو پڑھایا لکھایا' ولایت بھیجا' وہاں سے وہ میم اور دو بچے لے کر لوٹ آیا۔

عورت کے دل میں صدیوں سے کوٹ کوٹ کر بھرا گیا ہے کہ وہ کسی کی دُلھن بننے کے لئے پیدا ہوئی ہے۔ مس نیوز بھی عورت تھی۔ سفید مُلک کی تھی تو کیا ہوا' تھی تو عورت اور دُلھن بننے کے ارمان دل میں لئے بیٹھی تھی۔

آخر کو وہ ڈسپرٹ ہو گئی۔ علیگڑھ کی باتونی بیویوں کا قول ہے کہ اُس نے بندوق دکھا کر زمرد حسین کی عصمت دری کر دی۔ زمرد حسین مس نیوز کی شہرت سُن کر اپنی بیوی کا علاج کرانے مراد آباد سے آئے تھے۔ چھ سات سال شادی کو ہو گئے تھے' اب تک بیوی کی گود نہیں بھری تھی۔ مس نیوز نے آپریشن کیا مگر کچھ فرق نہ پڑا پھر اُس نے زمرد حسین سے صاف کہہ دیا کہ بچہ تو تمہارے ہو سکتا ہے' مگر راستہ بدلنا پڑے گا۔

یہ تو کچھ علیگڑھ کی بیویوں کی زبان کا جادو ہے کہ مس نیوز نے بندوق دکھائی اور کمرہ میں تالا ڈال دیا۔ زمرد حسین تیس بتیس سال کے خوبرو نوجوان تھے۔ بیوی کے ساتھ ہفتوں سے علاج کے سلسلے میں کوٹھی کے احاطے میں ہی رہتے تھے۔ شاید بیچ

شام کو مس نیوز کے برآمدے میں جا بیٹھتے جہاں کچھ پینے پلانے کا شغل چلتا رہتا اور مس نیوز کے قہقہے گونجا کرتے جس کی وہ بھیانک حد تک بھدی تھی' آواز بھی بھرّائی ہوئی تھی مگر قہقہے بڑے اُونچے سُر میں نکالتی تھی۔ عدیم بھی تھی۔

میم خواہ کیسی ہی اُونچی پُونچی ہو میم ہوتی ہے۔

مس نیوز کا حمل شروع ہوا تو اُس کے گوشت کے انبار میں تبدیلی بھی نہ چلا۔ وہ بے ہنگم ڈھیلا ڈھالا سا فراک پہنا کرتی تھی۔ پیروں میں بڑے بڑے بوٹ نیچے سے مُڑ گئے تو بھی کچھ زیادہ فرق نہ پڑا۔ بڑی مُستعدی سے ڈیوٹی پر آتی جاتی رہی۔ جب وقت آگیا تو اُس نے زمرد حسین کو بُلایا۔

"دیکھو ڈارلنگ یہ بچہ تمہارا ہے' صرف میں نے اپنے پیٹ میں قرض کے طور پر رکھا ہے۔ مگر فکر نہ کرو اسے تمہاری بیوی جنے گی۔"

"وہ کیسے؟" زمرد حسین ہنہنائے۔

"سب ہو جائے گا تم فکر نہ کرو۔"

پھر اُس نے مسز زمرد حسین کو اپنے کلینک میں میز پر لٹا دیا' اینیما دیا اور کوٹھی درد زہ کی چیخوں سے گونج اُٹھی۔

علیگڑھ کی بیویاں کہتی ہیں' وہ اپنے ہاتھ میں ایک سُوا لے کر بیٹھ گئی تھی جب درد اُٹھتے مسز زمرد کے کچوک دیتی اور وہ چیخ مار دیتیں۔ کچھ سنجیدہ قسم کی بیویوں کا کہنا سُوا لے کر بیٹھی تو تھی مگر مسز زمرد بغیر کچھ کے ہی چیخنے پر تیار ہو گئیں۔ بیچاری مس نیوز پر لوگ تہمت لگاتے ہیں۔

خیر چیخوں کو ڈالئے چولہے میں۔ بچہ پیدا ہو گیا۔ لوگوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ مس نیوز نے اُس کا نال کاٹا اور اُسے ماں کے پہلو میں لٹا دیا۔ اُس وقت نرس ڈلسی بھی نہیں تھی۔

لوگوں کا کہنا تھا ہر دم ساتھ رہنے کی وجہ سے بچہ ڈاکٹرنی کی شکل پر پڑ گیا تھا ویسا ہی پھولا ہوا کچوری جیسا۔ باپ سے ورثہ میں کچھ نہ لیا۔

مسز زمرد نے کبھی مس نیوز کے قول و فعل کی تردید نہ کی۔ وہ اس کے بعد بانجھ نہ رہیں۔ یہ الزام سر سے ہٹ جانے کے بعد خود کو وہ عورت محسوس کرنے لگیں۔

عورت کو دلھن بننا چاہئے۔

عورت کو بچہ پیدا کرنا چاہئے۔

یہ اور بات ہے کہ بچے کی پیدائش کے بعد پوری ذمہ داری اُس کی مہربان ڈاکٹرنی نے اپنے ذمہ لے لی۔ وہی اُسے اپنے کمرے میں سُلاتی اپنے ہاتھ سے نہلا دھلا کے پلاتی۔ اور بے پناہ محبت کرتی تھی۔ اس میں کیا ایسے تعجب کی بات ہے۔ یہ سفید قوم جو دنیا میں پھیلی ہوئی ہے۔ ہر خطۂ زمین پر کسی نہ کسی

صورت میں تو ہم جیسے ہوتے ہیں کسی کے پیٹ سے کسی کے بچے شکل پاتے ہیں جنہیں وہ شوق سے پال لیتے ہیں۔ پر وہ جوان ہو جاتے ہیں جہاں سے وہ بظاہر رخصت ہو گئے ہیں، اپنی زبان اور کچھ چھوڑ گئے ہیں۔ نیا خیال، نیا جذبہ مسلسل بھیجتے رہتے ہیں۔ ذہنوں کی کوکھ میں نئے نرالے بچے جنم لیتے رہتے ہیں۔

جب بچہ آٹھ دس مہینے کا ہو گیا تو مسز زمردشین نے چاہا اپنے وطن جائیں تو مس نیوز بیکل ہو گئی۔ وہ بچہ زمردشین کا تھا مگر سارا شہر جانتا تھا اس کی ماں مسز زمردشین نہیں ہیں۔

اس نے سمجھایا کہ زمردشین کی جائداد اسکی اپنی دولت کے آگے خاک بھی نہیں اگر وہ بچے کو گود دے دے تو وہ اس تمام دولت کا مالک بنے گا جو مس نیوز نے جوڑ رکھی تھی۔ اگر زمردشیو نے انکار کیا تو وہ کورٹ میں ثابت کر دے گی کہ بچہ اسکا ہے، اسکا بڑا رسوخ ہے وہ بڑے سے بڑے عہدے دار کی گواہی دلوا سکتی ہے کہ بچہ اسی کا ہے۔

زمردشین سمجھ گئے کہ وہ اس سے نہیں جیت سکیں گے۔ انہوں نے بچہ دیدیا۔ مس نیوز نے تحفے تحائف دیکر انہیں رخصت کیا اور بچہ کو پالنے لگی۔ وہ شوہر تو نہ بن سکی مگر ماں بیشک بن گئی۔

نہ جانے بچے کا نام کیا تھا وہ اسے بابا کہتی تھی۔ لوگ اسی نام سے اسے پکارتے تھے۔ سات آٹھ برس کا تھا تب ہی اسے ولایت بھیج دیا کہ جنگلی نیٹو لوگوں کی صحبت سے بچے۔ مگر بابا کی بنیاد ہی تخریبی تھی وہ وہاں جا کر بھی اپنی ماں کی طرح کم ظرف نکلا۔ اسکی والدہ خالہ بے اولاد تھی اور اس پر جان چھڑکتی تھی مگر وہ انتہائی سفید ہونے پر بھی انسانیت کے نام پر سیاہ داغ تھا۔

جب پارٹیشن ہوا اور حالات راج کا خاتمہ ہوا تو وہ بھی اپنی جائداد بیچ کر چلی گئی۔ تقسیم کے چکر میں کسی نے نہ سوچا کہ وہ کہاں اور کیسے گئی۔

ابھی پچھلے دنوں دہلی جاتے ہوئے ٹرین میں ایک انگریز کا ساتھ ہو گیا [illegible] کالا برقعہ پہنے کھڑکی سے لگی بیٹھی تھی۔ اس نے برقعہ ہم [illegible] پر وہ نقاب ہٹالی تھی۔ ایک دھیمہ نوجوان ہر اسٹیشن پر خیریت پوچھتا تھا۔ دھندے [illegible] پشتو میں دھیمے دھیمے باتیں کرتے۔ عورت کے بال سیاہ [illegible] شلوار قمیض کے کام [illegible] رنگ کے [illegible] کی [illegible] گئی تھی۔ ہاتھ [illegible] کا [illegible] کی [illegible] لمبی [illegible] بیچ بیچ میں [illegible] وہ بے طرح کچھ نہ کچھ کھائے جا رہی تھی۔

[illegible]

مجھے [illegible] نہیں ہوا۔

"آپ کہاں جا رہی ہیں" میں نے عام مسافروں والا سوال کیا

"ہم انگریز تھا۔ اتنے برس وہ ہندوستان میں رہی مگر زبان نہ سیکھ پائی۔"

"تم کہاں جاتا؟"

"دہلی، پھر دہلی سے علیگڑھ۔"

"علی گڑھ! تم ہم کو پہچانا۔"

"ہاں، معاف کیجئے آپ مس نیوز ہیں نا؟"

اور وہ ہنس پڑی۔ اسکی ہنسی بہت قیمتی تھی۔

باتوں باتوں میں اس نے بتایا۔ ولایت میں اس کا جی نہیں لگا اور وہ پاکستان چلی گئی۔

"دیکھو ہم مسلمان ہو گیا۔ تم مسلمان ہے نا؟"

"ہاں"

"السلام علیکم" وہ قہقہہ مار کر بولی۔

"وعلیکم السلام" میں کھسیانی ہو گئی تھی۔

"ہم شادی کیا۔"

"اچھا...... مبارک ہو۔"

"ہمارا ہسبینڈ ہم کو بہت چاہتا۔"

پھر اس نے بتایا وہ پچیس چھبیس برس کا گلفام اس کا شوہر نور محمد ہے جو ہر اسٹیشن پر اس کا دیدار کرنے آتا ہے۔ ململ کی شلوار اور کرتا پہنے سر پر طرہ دار پگڑی باندھے وہ بالکل قصہ کہانیوں کا شہزادہ لگ رہا تھا۔

"آپ کے شوہر کیا کرتے ہیں؟" میں نے اپنی حیرت چھپانے کے لئے جلدی سے پوچھ لیا۔

"ہمارا شوہر کچھ کام نہیں کرتا۔ ہمارا پشاور میں قالینوں کا اسٹور ہے مال [illegible] کرتا ہے اور ہمارا [illegible] ہے۔ ہمارا بڑا [illegible] بزنس چلتا۔ ہم [illegible] کو کام نہیں کرنے دیتا ہم اس سے بہت پیار کرتا کاہے کو کام کرے جب ہم اس کو اتنا چاہتا۔"

اس [illegible] [illegible] [illegible] کیا [illegible]

[illegible]

تھا شوہر [illegible] گیا۔ مس نیوز [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] کی طرح شروع ہو گیا۔ مس نیوز کا رنگ [illegible]

چند دنوں تک تو خیر بیچتا رہا تھا۔ وہ اکرم بھول کر چل دیا۔ بس بیٹھ کر کی میں سے جھانک کر چلنا دیکھتیں پھر سسکیاں بھر کے رونے لگیں۔ میں کچھ گھبرائی سی بیٹھی رہی۔ پھر وہ انگلش میں بلبلانے لگیں کہ وہ اُسے بہت چاہتی ہیں، وہ بھی اُنہیں چاہتا ہے مگر پردہ پر ہی شدت سے مُصر ہے کہ ذرا بھی نقاب ہٹ جائے تو جھینکنے لگتا ہے، بڑا جیلس ہے، بہت چاہتا ہے۔

مجھے وہم تھا مردی اپنی دولت کے صندوق پر تھی سی دلھن بیاہ لاتے ہیں۔ مجھے نہیں پتہ تھا۔ دولت مند عورتیں بھی چاہیں تو جورو سے بیاہ لاتی ہیں۔

اگلے اسٹیشن پر وہ نہیں آیا اور مس بیوز ایسے تڑپتی رہیں جیسے کوئی دم میں بڑان دے دیں گی۔ وہ انگریزی میں ساری مرد جاتی کو گالیاں دیتی رہیں۔ خاص کر ہیلگاڈمی کے نوجوانوں کو جنھوں نے زندگی بھر اُنھیں چھل دیا اور تڑپایا۔

دو اسٹیشنوں بعد وہ آگیا۔

اُس کے ہاتھ میں ٹکڑا تھا... بہت پھلوں اور مٹھائی کا ... منہ پھیرے بیٹھا انتظار کر رہا تھا جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

دلھن اُن کے جانے کے بعد پھول کی طرح کھل گئی۔ اُس کی عمر ستر سے کیا کم ہوگی، مگر نظر بھر کر دیکھا تو وہ دلھن رہی تھی۔

اُف یہ سفید قوم کے لوگ کتنے جاندار ہیں۔ دنیا کے کونے کونے میں انھیں کل ملک حاصل ہے۔ یہ چاہیں تو قبر میں بھی جاکر بھی ٹک کے چپک جائیں اور خون چوس لیں۔

"لوریا کہاں ہے؟" اکرم سے مجھے یاد آیا۔

"بیمار ہو گیا۔ ہم اُس کو انگلینڈ بھیجا۔ یہ وہ جنگلی بن گیا۔" اُس کا چہرہ اُدا پڑ گیا۔

"ہمارا اب دنیا میں جو کچھ ہے وہ ہمارا ڈارلنگ ہے۔ اگر ڈارلنگ نے ہم کو دھوکا دیا تو ہم اپنا سارا روپیہ چیریٹی میں دے دے گا۔"

دوسرا اسٹیشن آگیا اور اُس نے جلدی سے منہ پر نقاب کھینچ لی۔ ○○

جس مہینے میں آپ کا زرِ سالانہ ختم ہو، اُسی مہینے میں بھیج دیجئے تاکہ شاعر کی اشاعت بروقت ہو سکے۔

غزلیں

حرمت الاکرام

رہ گئے سبھی ترجمانی میں
جان کیا ڈالتے کہانی میں

رات محوِ سفر ہے موجوں پر
جل رہے ہیں چراغ پانی میں

اپنی ہی رہگذر کو لے ڈوبے
ہم بھی تھے کس قدر روانی میں

دل کی پہچان بن گئی آخر
وہ حلاوت بھی بدگمانی میں

راکھ میں ہم جئے شرر کی طرح
برف سا گھل رہے ہیں پانی میں

تعزیوں کا جلوس ساتھ لئے
محو ہے وقت نوحہ خوانی میں

راہ میں کون سا پہاڑ آیا
فرق کیوں آ گیا روانی میں

اس قدر شعلہ زن ہے خاکستر
کون سی آگ تھی جوانی میں

گم ہے کس ناز سے زمیں حرمت
آسمانوں کی بیکرانی میں

○ سلم پلنا۔ مرزاپور (یوپی)

ظفر قریشی

رُخِ صبح پہ زُلفوں کو چھوڑتے کیوں ہو
تجلیوں سے اندھیرے نچوڑتے کیوں ہو

نگو لو! چمن کو جھنجھوڑتے کیوں ہو
کلائی موجِ صبا کی مروڑتے کیوں ہو

کریں گے کل یہ معطر فضائے گلشن کو
تم ان شگوفوں کو شاخوں سے توڑتے کیوں ہو

مرا وجود ہے دُنیا میں ایک نقشِ دوام
مرے وجود سے مُنہ اپنا موڑتے کیوں ہو

گریز اچھا ہے نام و نمود سے لیکن!
جو مُفت ملتی ہو شہرت تو چھوڑتے کیوں ہو

یہ سنگ پارے کہیں کا تمہیں نہ رکھیں گے
تم ان نگوں کو انگوٹھی میں جوڑتے کیوں ہو

میں اپنی فکر سے اک انقلاب لاؤں گا
مرے خیال کے دھارے کو موڑتے کیوں ہو

جہاں جھکتی نہیں دوستو! جبینِ مُراد
اُس آستانے پہ سر اپنا پھوڑتے کیوں ہو

رہے گی ظرف کی انفرادیت باقی
تم اپنی سمت زمانے کو موڑتے کیوں ہو

○ ایڈیٹر - تیرتھ - محمد علی روڈ - مومن پورہ - ناگپور ۱۸

مَقالہ

اُردو نثر ـــ ایک مختصر جائزہ

رحمٰن حمیدی
آفس سپرنٹنڈنٹ، پنجاب روڈ ہائی اسکول ۔ گومیہ (دھنباد)

اُردو نثر کی تاسیس خواجہ سید اشرف جہانگیر سمنانی نے رکھی۔ جنہوں نے ۱۳۰۸ء میں اخلاق و تصوف پر رسالہ تحریر کیا۔ دوسرا نام صوفی منش عالم دین شیخ عین الدین کا آتا ہے، جن کا انتقال ۱۳۹۲ء میں ہوا۔ شیخ عین الدین نے اسلامی عقائد اور اسلامی مسائل پر مختصر رسائل تحریر کئے جو حادثات زمانہ کے باعث ضائع ہو چکے ہیں۔ خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کا "معراج العاشقین" دستیاب ہے۔ چند محققین نے اسے بھی اُردو نثر کی اوّلین تصنیف ثابت کرنے کی کوشش کی ہے لیکن کسی بھی اعتبار سے درست نہیں۔ شاہ میران جی شمس العشاق کی شرح مرغوب القلوب" ایک اہم تصنیف ہے جو اُردو نثر کی تاریخ میں تاسیسی کردار ادا کرتی ہے۔

سترہویں صدی میں مُلّا وجہی نے اپنی شہرۂ آفاق تصنیف "سب رس" تحریر کی جو ۱۶۳۵ء میں منظر عام پر آئی۔ ۱۷۳۲ء میں فضلی کی "دہ مجلس" لکھی گئی۔ دراصل یہ فارسی کتاب "روضۃ الشہدا" کا اُردو ترجمہ ہے۔ دوسری کتاب "نو طرز مرصع" ہے جو میر عطا حسین تحسین اٹاوی نے تحریر کی تھی۔ یہ بھی امیر خسرو کی فارسی کتاب "چہار درویش" کا اُردو ترجمہ ہے۔ یہ طبع زاد یا فنِ نثر کی جداگانہ اور منفرد تخلیق نہیں ہے۔

اٹھارہویں صدی حضرت شاہ عبد القادرؒ نے قرآن شریف کا ترجمہ اُردو زبان میں کیا۔ اُسی زمانے میں مرزا سوداؔ نے میرؔ کی مثنوی "شعلۂ عشق" نثر میں پیش کی اور اپنے کلیات کا مقدمہ اُردو میں لکھا۔

اُردو نثر کا اوّلین دور سترہویں صدی سے شروع ہو کر اٹھارہویں صدی کی اس منزل پر آکر ختم ہو جاتا ہے۔ لیکن بیشتر ناقدین اور مبصرین نے قارئین کی سہولت کے لئے اس کی مدت اُنیسویں صدی کے نصفِ اوّل تک قائم کی ہے۔ اسی دور میں اُردو نثر کی باقاعدہ ترقی کا آغاز ہوا۔ اس دور کے مصنفین دو گروپ میں منقسم تھے۔ ایک گروپ نے فورٹ ولیم کالج کلکتہ سے وابستگی اختیار کی اور شاعر بھی

ڈاکٹر جان گلکرائسٹ کی معیت میں فارسی اور عربی کی شہرۂ آفاق تصانیف کا سلیس اُردو میں ترجمہ کیا۔ اس نوعیت کے مصنفین میں سرِ فہرست میر امن دہلوی کا نام آتا ہے۔ میر امّن نے قصۂ چہار درویش" کا ترجمہ" نو طرز مرصع" کو سامنے رکھ کر صاف اور سلیس اُردو میں کیا اور اسی کا نام" باغ و بہار" رکھا۔ میر امّن کے اسلوبِ بیان کا کمال یہ ہے کہ پونے دو سو سال گذرنے پر بھی اُس کی شگفتگی و رعنائی اور مقبولیت میں کمی نہیں آئی ہے۔ دوسرا نام مرزا علی لطف کا ہے جنہوں نے "گلشنِ ہند" کے عنوان سے اردو زبان میں پہلا تذکرہ قلمبند کیا۔ سید حیدر بخش حیدری نے "قصۂ حاتم طائی" "طوطا مینا کہانی" اور "گل مغفرت" [illegible] اور "گلزار دانش" تحریر کی۔ میر شیر علی افسوسؔ نے آرائشِ محفل لکھی اور گلستانِ سعدی" کا ترجمہ کیا۔ بہادر علی حسینی نے مثنوی میر حسن کو "بے نظیر" کے عنوان سے نثر میں پیش کیا۔ اس کے علاوہ دیگر اہل قلم نے بھی فارسی اور عربی کی مشہور و معروف کتابوں کے ترجمے کئے۔

دوسرا گروپ ان مصنفین کا ہے جنہوں نے فورٹ ولیم کالج سے ہٹ کر اپنی انفرادی کوششوں سے گلستانِ نثر کو سجایا۔ ان تصانیف میں مولوی اسماعیل شہید کی کتاب تقویۃ الایمان" انشاءاللہ خاں انشا کی" رانی کیتکی کی کہانی" اور فقیر محمد گویا کی" بوستانِ حکمت" اور رجب علی بیگ سرور کی" فسانۂ عجائب" نے عوام و خواص میں کافی مقبولیت حاصل کی۔ موخرالذکر کتاب سب سے زیادہ مشہور و مقبول ہوئی۔ یہ کتاب میر امن دہلوی کی" باغ و بہار" کے جواب میں لکھی گئی تھی۔

میر امّن دہلوی سے پہلے کے نثری نمونے ڈاکٹر محی الدین قادری زور کی کتاب "اُردو شہ پارے" کے علاوہ اور بھی کتابوں میں ملتے ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ میر امّن سے قبل اُردو نثر بیشتر ثقیل اور غیر سلیس تھی۔ میر امّن کا تعلق دہلی اور سرور کا تعلق لکھنؤ سے تھا۔ اُردو زبان و ادب کے معاملے میں دلّی

اور لکھنؤ کے درمیان ہمیشہ سے چشمک رہی ہے۔ علاوہ تصنیفات دیکھنے کے باوجود اِن دونوں کتابوں کے طرزِ بیان میں فرق ہے جو بالعموم شعر و ادب کے اِن دو مختلف دبستانوں میں پایا جاتا ہے۔ ایک طرف سادگی، سلاست، بے تکلفی روانی اور تسلسل ہے۔ دوسری جانب آورد، تکلف، تصنع اور مقفیٰ عبارت کی مینا کاری ہے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ یہ دوسرا طرزِ تحریر ہی اُس زمانے میں مقبول اور پسندیدہ تھا۔ لیکن زمانے کا فیصلہ میرامن کے حق میں ہوا۔ میرامن کی نثر نگاری دیکھ کر انہیں موجودہ نثر نگاری دیکھ کر انہیں موجودہ نثر کا بانی کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

اُردو نثر کے دوسرے دَور کا آغاز سرسیّد اور اُن کے رُفقا سے ہوتا ہے۔ سرسیّد کی سرکردگی میں مفلوج قومی زندگی میں نئی رُوح پیدا کرنے اور اُس کے تمام پہلوؤں میں اصلاح و ترقی کی پیہم کوششوں کا آغاز ہوا۔ سرسیّد نے ۱۸۶۲ء میں سائنٹیفک سوسائٹی قائم کی اور ۱۸۷۰ء میں رسالہ "تہذیب الاخلاق" جاری کیا جس نے قدیم اسکول کی شدید مخالفت کے باوجود سادہ اور سلیس نثر لکھنے کی بُنیاد ڈالی۔ سرسیّد کا طرزِ تحریر تصنّع سے پاک، سادہ، واضح اور پُرزور ہے۔ وہ اپنے ما فی الضمیر کو دوسروں تک پہنچانے کی حیرت انگیز قدرت رکھتے ہیں۔ جو چیز سرسیّد کو دوسرے اصحابِ قلم سے ممتاز کرتی ہے، وہ اُن کی قوتِ بیان ہے۔ بہ صحیح معنوں میں سرسیّد اُردو نثر کے محسنِ اعلیٰ ہیں۔ بر سبیلِ تذکرہ غالب کے خطوط کا ذکر بھی ضروری ہے۔ غالب کا یہ کارنامہ نہایت عظیم الشان ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ جدید اُردو نثر کی بنیاد غالب کے خطوط نے رکھی۔

سرسیّد کے ادبی رفقاء میں ڈاکٹر ذکاءُاللہ، مولوی چراغ علی، وقار الملک، محسن الملک، مولانا شبلی اور خواجہ الطاف حسین حالی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ اِس دور میں ویسے تو اور بھی مشہور نام ملتے ہیں، لیکن ایسے اصحابِ قلم جنہوں نے مختلف اصنافِ ادب پر اپنے گہرے نقوش قائم کیے اور مختلف نثری اسالیب سے اپنی انفرادیت ثابت کی، اُن میں آزاد، حالی، شبلی اور نذیر احمد ہیں اور انہیں اُردو نثر کے عناصرِ اربعہ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اردو کے تمام اسالیبِ بیان پر اِن فنکاروں کی گہری چھاپ ہے۔

محمد حسین آزاد خوش فکر، خوش گو اور لطیفہ سنج تھے۔ اُن کے تذکرہ "آبِ حیات" اور "دربارِ اکبری" میں بہت سی تاریخی غلطیاں ہیں لیکن حکایتی نثر کا جو شگفتہ اور دل نشیں انداز آزاد نے اختیار کیا وہ اب بھی لائقِ تحسین مانا جاتا ہے۔ آزاد اُردو میں تمثیل نگاری کے موجد ہیں جس کا سب سے کامیاب نمونہ اُن کی کتاب "نیرنگِ خیال" ہے۔

شاعری

حالی:۔ مولانا حالی اُردو کے پہلے نثر نگار ہیں جنہوں نے تنقید کی بُنیاد ڈالی اور مقدمۂ شعر و شاعری لکھ کر پہلی بار اُردو شاعری کا ایک مکمل اصلاحی نظریہ پیش کیا۔ اُنھوں نے سوانح نگاری کو بھی فن کی حیثیت بخشی۔ حالی کی نثر نے کام کی باتیں عام فہم زبان میں لکھنا سکھایا اور دورِ حاضر میں بیشتر نثر نگار اُنھیں کی نثر کا پیرو ہوا۔

شبلی:۔ ایک جیّد عالم، مورخ، فلسفی، نقاد اور عظیم انشا پرداز تھے۔ اُن کی نثر کا ایک اپنا معیار اور رکھ رکھاؤ ہے۔ اندازِ بیان میں علمیت اور ادبیت کے ساتھ ساتھ زور اور رنگینی ہے۔ اُن کی تحریروں کا معیار عام سطح سے بلند ہوتا ہے اور عام قاری اُسے آسانی سے سمجھ نہیں پاتا۔ لیکن جو تحریر سادہ اور سلیس ہے اُس میں افادیت اور دلکشی ہے۔

مولوی نذیر احمد:۔ مولوی نذیر احمد ایک جیّد عالم اور مصلحِ قوم تھے۔ اُن کا اصل موضوع تعلیمِ نسواں اور اصلاحِ اخلاق و معاشرت تھا۔ اُن کی تصانیف میں اُس کلچر کے تصادم کی جھلک صاف ملتی ہے جو ہندوستان میں انگریزی تہذیب کی آمد سے پیدا ہوا۔ دراصل یہ تصانیف اُردو ناول نگاری کے ارتقائی زینے ہیں۔

اسی دَور کے تین مشہور اہلِ قلم پنڈت رتن ناتھ سرشار، عبدالحلیم شرر اور منشی سجاد حسین لکھنؤ سے وابستہ ہیں۔ علامہ نذیر احمد کی طرح سرشار کا شمار ناول نگاری کے بانیوں میں ہوتا ہے۔ اُن کے ناول لکھنؤ کی قدیم تہذیب کی جیتی جاگتی تصویریں ہیں۔ لکھنؤ کی زبان اور محاورات پر اُن کو بڑی قدرت تھی۔ "فسانۂ آزاد" اُن کی سب سے اعلا اور عمدہ تصنیف ہے جس نے انھیں لازوال بنا دیا۔

مولانا عبدالحلیم شرر ایک انشا پرداز اور ناول نگار تھے۔ ہر چند کہ اُن کے ناولوں میں فنی اعتبار سے جھول ہیں پھر بھی اُردو ناول بالخصوص تاریخی ناولوں کے ارتقا میں اُن کی خاص اہمیت ہے۔

آخری نام منشی سجاد حسین کا ہے۔ اِن نام کے آتے ہی رسالہ "اودھ پنچ" کی یاد آجاتی ہے جو ۱۸۷۷ء میں جاری کیا گیا تھا۔ اُردو میں طنز و ظرافت اور مضحکہ خیزی کی شروعات اسی رسالے سے ہوئی۔ منشی صاحب کا مزاحیہ ناول "حاجی بغلول" اب بھی قارئین کے درمیان مقبول ہے۔

اُردو نثر کا یہ دور بیسویں صدی کی پہلی دہائی تک محیط ہے۔ اِس دور میں نثر کے جملہ اصناف کی خاصی ترقی ہوئی۔ اِسے ہم اُردو نثر کا زرّیں دَور کہہ سکتے ہیں۔

بیسویں صدی کے آغاز میں اُردو نثر کو بے پایاں فروغ حاصل ہوا۔ اور ایک نئے دَور کا آغاز ہوا۔ مغربی ادبیات کی اشاعت اور مطالعے نے اصناف نثر کا معیار بلند کیا اور اُس میں تنوع اور نئے اسالیب پیدا ہوئے۔ اِس دَور میں خاص طور پر مختصر افسانہ، ناول، مقالہ نگاری، تنقید و تبصرہ، خاکہ، مزاح اور طنز نگاری کو بہت فروغ ہوا۔ اُردو ادب کی اشاعت روز افزوں ترقی پذیر ہوئی۔ اور یہ محدود ادبی و علمی حلقوں سے نکل کر عام لوگوں تک پہنچنے لگا چنانچہ اِس دَور کے بیشتر ادیب وہی ہیں جو کامیاب افسانہ نگار ہیں یا مقالہ نگار، یا مزاح نگار۔

راشدالخیری، خواجہ حسن نظامی، پریم چند، نیاز فتحپوری، سجاد حیدر یلدرم، ل۔ احمد، قاضی عبدالغفار اور مجنوں گورکھپوری وغیرہ کی نثری نگارشات کو ادبیاتِ اُردو میں ایک خاص درجہ حاصل ہے۔

راشدالخیری کو مصورِ غم کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ اُنھیں غم و الم کی دلگداز تصویریں کھینچنے میں کمال حاصل تھا۔ راشدالخیری مولانا نذیر احمد کے صحیح جانشین تھے۔ اُن کا مقصد بھی اصلاحِ معاشرت و تعلیم نسواں تھا، اُن کا اسلوبِ بیان نذیر احمد کے اسلوب کی ایک پاکیزہ شکل ہے۔ وہی لال قلعہ کی ٹکسالی زبان، وہی مستورات کے الفاظ و محاورات جس کے ساتھ سادگی، درد، اثر اور جوش بدرجۂ اُتم پایا جاتا ہے۔

حسن نظامی یوں تو کثیر التصنیف ہیں لیکن اُن کی شہرت دراصل غدرِ دہلی کے افسانوں کی بدولت ہوئی۔ اِس کے علاوہ اِنھیں روزمرہ کی چھوٹی چھوٹی باتوں پر لکھنے کا بھی خاص ملکہ تھا۔ جس کے پردے میں وہ صوفیانہ نکات بڑے دل نشین انداز میں بیان کرتے ہیں۔ اُن کی زبان دلّی کی ٹکسالی زبان ہے۔

پریم چند اُردو کے عظیم مختصر افسانہ نگار اور ناول نگار ہیں۔ اِن کے اکثر افسانے مختصر افسانہ نگاری کے شاہکار ہیں۔ پریم چند نے ناول کو بھی فنّی حیثیت سے سنوارا۔ اُن کے بعد آنے والے دَور پر پریم چند کا گہرا اثر ہے۔

مقالہ نگاروں میں مولانا ابوالکلام آزاد کا نام بہت نمایاں ہے۔ مولانا آزاد اُردو فارسی کے ساتھ ساتھ اسلامی علوم پر مکمل عبور رکھتے تھے۔ آزاد نے "الہلال" اور "البلاغ" نامی دو گرانقدر اخبارات جاری کئے تھے، جن کی بدولت اُردو میں ایک نئے طرزِ نگارش کا آغاز ہوا۔ جسے ادبِ لطیف کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔
مقالہ نگاروں میں دوسرا نام سر عبدالقادر کا ہے جو رسالہ "مخزن" کے ایڈیٹر تھے۔ انھوں نے "مخزن" کے ذریعہ بہت سے نثر نگار اور شعرا کو اُردو ادب کی خدمت کے لئے تیار کیا۔ سر عبدالقادر نے کثیر تعداد میں مضامین اور مقالے لکھے جو اُردو شاعری بھی

نثر کا بہترین سرمایہ ہیں۔

علامہ سید سلیمان ندوی بھی بلند پایہ مقالہ نگار تھے۔ یہ علامہ شبلی کے شاگرد اور جانشین تھے۔ عرصہ تک دارالمصنفین اعظم گڑھ کے نگراں رہے۔ اُن کا اسلوبِ نگارش صاف اور سلیس، بے ساختہ اور رنگین، شگفتہ اور لطیف ہے۔ ان کی تحریروں میں عالمانہ اور خطیبانہ شان جھلکتی ہے۔ ان کا میدانِ تحریر مذہب و تاریخ ہے اُن کی مقبول تصانیف "سیرت عائشہ" "ارض القرآن" "عرب و ہند کے تعلقات" ہیں۔ مولانا عبدالماجد دریابادی بھی انشا پرداز اور عالم و مفکر ہیں۔ اِسی وجہ سے ان کی تحریروں میں سلاست، روانی اور شگفتگی کے ساتھ ساتھ ایک خاص قسم کا وقار پایا جاتا ہے۔ اخبار "صدق" ان کی ادارت میں نکلا۔ مولانا عبدالحق اُردو کے عظیم محسن ہیں۔ انجمن ترقی اردو کے ناظم کی حیثیت سے اُنھوں نے متعدد تصانیف شائع کیں۔ اُن کے مقدمات بہت مشہور ہیں۔ صاف، سادہ، سلیس اور سلجھا ہوا اُسلوبِ بیان اور بے لاگ رائیں اُن کی خصوصیت ہے۔ لیکن اندازِ بیان میں حالی کا عکس ہے۔ مذکورہ اہلِ قلم کے علاوہ پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی، سیماب اکبرآبادی، حبیب الرحمان خاں شیروانی، مولوی عبدالسلام ندوی، پنڈت دیا نرائن نگم، مسعود حسن ادیب وغیرہم کے نام بھی قابلِ ذکر ہیں۔ اُن کی ادبی خدمات لائقِ تحسین ہیں۔ سیماب اکبرآبادی کی نثری تحریروں اور چھوٹی بڑی تصانیف کا ابھی تک جائزہ نہیں لیا گیا ہے۔ سیماب نے سوانحی، اصلاحی علمی اور ادبی نثر کا بڑا ذخیرہ اپنی یادگار سے چھوڑا ہے۔ نیاز فتح پوری کا مشہور رسالہ "نگار" کے ایڈیٹر تھے۔ اُن کے افسانوں اور مقالات کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ افسانوں میں رومانیت اور شعریت زیادہ اور افسانویت کم ہے۔ شروع میں اُن کے طرزِ نگارش میں رنگینی زیادہ تھی، لیکن آخر دَور میں متانت اور سنجیدگی کے ساتھ علمی وقار پیدا ہوا۔ سجاد حیدر یلدرم نے انگریزی اور ترکی ادب سے استفادہ کرکے اپنے افسانوں میں ایک نیا بانکپن اور سحر آفرینی پیدا کی۔ "خیالستان" اُن کے افسانوں کا بہت مشہور مجموعہ ہے۔ قاضی عبدالغفار بھی اِسی سلسلے کی ایک کڑی ہیں۔ "لیلیٰ کے خطوط" اور "مجنوں کی ڈائری" میں اُنھوں نے جذباتِ حسن و عشق کی بے مثل نقاشی کی اور نفسیاتی تجزیہ کیا ہے۔ "نقشِ فرنگ" میں سیاحت یورپ کے تاثرات بہت دل نشین انداز میں بیان کئے ہیں سفرنامہ کی حیثیت سے اِس کتاب کی خاص اہمیت ہے۔ اِسی ضمن میں مجنوں گورکھپوری کا ذکر کرنا بے محل نہ ہوگا۔ یہ بھی مشہور نقّاد اور افسانہ نگار ہیں۔ مجنوں نے انگریزی کے مشہور افسانہ نگار ٹامس ہارڈی کے افسانوں کا ترجمہ اُتارا۔ دوسرے افسانوں میں بھی مغرب کے اساتذۂ فن کی بہت کامیاب تقلید کی۔ ان کے

افسانوں کا موضوع تمام تر حسن و عشق کی کرشمہ سازیاں اور سحر آفرینیاں ہیں۔ اندازِ بیان بھی رنگین اور پُرکیف ہے۔

بڑی ناانصافی ہوگی اگر مہدی حسن افادی اور سجاد انصاری مرحوم کا ذکر نہ کیا جائے۔ یہ جواں مرگ ادیب آسمانِ ادب کے درخشندہ ستارے تھے۔ اور ان سے اُردو ادب کی بہت سی توقعات وابستہ تھیں۔ آل احمد سرور نے سجاد انصاری کو "شعلۂ مستعجل" کہا ہے۔ ان ادیبوں کے طرزِ نگارش اور طرزِ فکر دونوں میں ایک خاص طرح کی رعنائی، بانکپن، شوکت اور توانائی پائی جاتی ہے ان کی تحریروں میں انشائے عالیہ اور تنقید عالیہ کی نمود ہے۔ مہدی حسن افادی کے قلم سے "افاداتِ مہدی" اور "مکاتیبِ مہدی" یادگار ہیں۔ سجاد انصاری کی تحریریں اور ایک نامکمل ادبی شاہکار "روزِ جزا" (ڈراما) "محشرِ خیال" کے عنوان سے شائع ہو چکا ہے۔ میری بات نامکمل ہوگی اگر میں مرزا فرحت اللہ بیگ، رشید احمد صدیقی اور احمد شاہ پطرس بخاری کا نام نہ لوں۔

مزاح نگاری کی ابتدا تو منشی سجاد حسین نے اُنیسویں صدی میں اودھ پنچ کے ذریعہ کردی تھی، لیکن اس کی فنی ترقی اسی دور میں ہوئی۔ فرحت اللہ بیگ مشہور انشا پرداز اور مزاح نگار ہیں۔ الفاظ سے تصویر کشی اُن کا خاص حصہ ہے، خواہ دہلی کے یادگار مشاعرہ کا نقشہ کھینچنا ہو یا پھول والوں کی سیر دکھانی مقصود ہو یا نذیر احمد کا حلیہ لکھنا ہو۔ اُن کی تحریر میں شوخی اور ظرافت بھری ہوئی ہے۔ اُن کی تحریر میں دہلی کی ٹکسالی زبان کا لطف آتا ہے۔

پطرس اُردو کے کامیاب مزاح نگار ہیں۔ اپنے چند مضامین ہی سے پطرس نے اُردو ادب میں کافی اہمیت حاصل کرلی۔ دراصل ان مضامین میں مزاح کی وہ تمام فنی خوبیاں پائی جاتی ہیں جو انگریزی ادب میں ملتی ہیں۔

رشید احمد صدیقی کے یہاں ظرافت کم اور طنز زیادہ ہوتا ہے۔ اُن کی ظرافت کا ایک خاص ادبی معیار ہے۔ وہ فطرتِ انسانی کے بڑے نبّاض اور سماج کے نقّاد ہیں۔ اُن کے طنز میں تلخی پورے طور پر نمایاں نہیں ہوتی لیکن اُسے شیریں بھی کہنا مناسب نہیں۔ قدیم و جدید اور مشرق و مغرب کے تصادم سے جو مضحکہ خیز پہلو پیدا ہوتے ہیں، رشید احمد ان پر زبردست نکتہ آفرینی سے کام لیتے ہیں۔ دیگر مشہور و معروف مزاح نگاروں میں مُلّا رموزی، عظیم بیگ چغتائی، اور شوکت تھانوی ہیں۔ عظیم بیگ چغتائی کے افسانے اور شوکت تھانوی کے مزاحیہ ناول پہلے بھی مقبول تھے اور اب بھی شوق سے پڑھے جاتے ہیں۔

دیگر نثر نگاروں میں نقاد، مورخ، افسانہ نگار سبھی ہیں۔ ڈاکٹر ذاکر حسین، ڈاکٹر سید عابد حسین، پروفیسر محمد مجیب، قاضی عبدالودود، ڈاکٹر سید اعجاز حسین، آل احمد سرور شامل ہیں۔

عبدالقادر سروری، کنھیا لال کپور، مالک رام، امتیاز علی عرشی، احتشام حسین اور خواجہ غلام السیدین ممتاز حیثیت کے حامل ہیں۔

اس دور کے افسانہ نگاروں اور ناول نگاروں کی فہرست خاصی طویل ہے اور زیرِ نظر مختصر مقالے میں اس امر کی گنجائش نہیں کہ فنکاروں کی پوری فہرست دی جائے اور اُن کی نگارشات کا مکمل جائزہ لیا جائے۔ ان میں اکثریت ایسے ترقی پسند ادیبوں کی ہے جن کا نظریۂ ادب اشتراکی ہے۔ اس دور کے فنکاروں نے خام و پختہ، اچھے اور بُرے ہر طرح کے ادبی نمونے پیش کئے ہیں۔ ان لکھنے والوں میں سعادت حسن منٹو، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، خواجہ احمد عباس، اوپندر ناتھ اشک، صالحہ عابد حسین، عصمت چغتائی، حیات اللہ انصاری، شفیق الرحمان، علی عباس حسینی، کوثر چاند پوری، قرۃ العین حیدر، نسیم انہونوی، نسیم حجازی، مہندر ناتھ، عادل رشید اور زبیدہ خاتون مشہور افسانہ نگار اور ناول نگار ہیں۔

سنجیدہ لکھنے والوں میں کلیم الدین احمد، عندلیب شادانی، خواجہ احمد فاروقی، ڈاکٹر گیان چند، نور الحسن ہاشمی، اختر اورینوی، ڈاکٹر محمود الٰہی، یوسف حسین خاں، ڈاکٹر خورشید الاسلام، ڈاکٹر سلامت اللہ، ڈاکٹر محمد حسن، ڈاکٹر سید محمد عقیل، ڈاکٹر مسعود حسین خاں، ڈاکٹر ظ انصاری کافی مشہور ہیں۔ ان میں کئی اعلیٰ درجے کے نقاد ہیں اور مغربی تنقید کے اُصولوں سے پوری طرح آگاہ ہیں۔

میری نگاہ میں اُردو نثر کا تیسرا دور اس منزل پر ختم ہوجاتا ہے اور چوتھے دور کا آغاز بیسویں صدی کے نصف آخر سے ہوتا ہے۔ اس دور کے نثر نگار ڈاکٹر قمر رئیس، ڈاکٹر شارب ردولوی، ڈاکٹر تنویر احمد علوی، قاضی عبدالستار، فکر تونسوی، رضیہ سجاد ظہیر، زینت ساجدہ، جیلانی بانو، رشید حسن خاں، رام لعل، شکیل الرحمٰن، عفت موہانی، ڈاکٹر عنوان چشتی، ڈاکٹر سیدہ جعفر، واجدہ تبسم، ڈاکٹر سلام سندیلوی، جوگندر پال، اطہر پرویز، شمس الرحمٰن فاروقی کی نثری تحریریں خاصی باوقار ہیں اور نثری ادب میں اضافہ کر رہی ہیں۔ مجھے جو بات بطورِ خاص عرض کرنا ہے وہ یہ ہے کہ گزشتہ پندرہ سال میں اُردو نثر نے اُردو شاعری ہی کی طرح بے پناہ ترقی کی ہے۔ نثر کے نئے اسالیب ہمارے سامنے آئے ہیں۔ جدید نقادوں نے تنقید کے پُرانے رُخ کو بدلا ہے۔ سماجی، عمرانی اور سیاسی موضوعات پر بھی قلم اٹھایا گیا ہے۔ پہلے ہماری نثر کا زیادہ حصہ ادبی اور شعری موضوعات سے متعلق ہوتا تھا۔ اُردو کے چند مشہور شعرا، سردار جعفری، عرش ملسیانی، اعجاز صدیقی، جگن ناتھ آزاد وغیرہ نے بھی نثر میں قابلِ ذکر تحریریں پیش کی ہیں۔

(باقی صفحہ ۴۴ پر دیکھئے)

رحمٰن جامی

آبرو نشانے کی

ہدف ہدف ہے گریزاں کہ تیر بے ہنراں
چلے اگر نہ زمانہ لہو لہو ٹھہرے
قتیلِ وقت ہے حیراں، کماں سے چھوٹا ہوا
کوئی بھی تیر نشانے پہ کیوں نہیں پہنچا!

مگر ہم اہلِ ہنر کا رہا یہی دعویٰ -!
ہمارے ہاتھ سے جب جب کھنچے ہیں تیر و کماں
نشانہ خود ہوا اپنے نصیب پر خنداں
نقیبِ شہر بھی بل کھا کے رہ گیا تنہا،

ہے محتسب جو کوئی، آئے روبرو ٹھہرے
کوئی ہو بات، کوئی اُس سے گفتگو ٹھہرے
دلائے ساقی تو پاکی رہے، وضو ٹھہرے،
تلاش حق کی رہے، حق کی جستجو ٹھہرے
وہ اپنا دوست رہے یا کوئی عدو ٹھہرے
ہمارے ہاتھ میں تیرِ ہنر ہے بے ساماں!
کماں ملے تو نشانے کی آبرو ٹھہرے
ہدف ہدف کی زمانے سے آرزو ٹھہرے

فتح

یہ دشت و دریا
یہ کوہ و صحرا
یہ بحر و بر
اور ——— ان میں جو کچھ ہے
فتح کرنے کے بعد میں نے
فلک کی جانب کمند پھینکی
تو میرے قبضے میں
چاند سورج، خلا، ستارے،
تمام سیارے آگئے ہیں
یہ سب کے سب آج میری فتح ہیں
مگر مرا گھر جہاں میں رہتا ہوں
میری فتح میں نہیں ہے شامل
یہیں پہ آکر شکست کھایا ہے یہ مرا دل

○ ۱/۳/۸۳۰-۲-۱۲ بل کالونی۔ مراد نگر۔ حیدرآباد ۲۸

شاعر۔ بمبئی۔

پہلا پتھر

رفیعہ منظور الامین
اے-۳۰، دلکشا کالونی۔ لکھنؤ

گوا میں Dona Paula کی پتھریلی بلندیوں پر فادر موہن لارنس کا ہیولا تنہا نہیں تھا۔ پاک مریم کا سفید بُراق مجسمہ اُسے اپنے دامن میں لئے فضا کو تقدیس بخش رہا تھا۔ فادر لارنس کی بائیں جانب ZUARI ندی کے آبِ ادبار کے پرے مارماگوا کی بندرگاہ کی آغوش میں اب بھی چھوٹے بڑے جہاز اور بادبانی کشتیاں ہلکورے لے رہی تھیں اور دائیں طرف مانڈوی ندی کے اُس پار AGUADA قلعہ تھا۔

فادر لارنس نے ہاتھ کا چھجہ سا بناکر قلعہ پر نظریں جمادیں۔ قلعہ کی سفید دیواریں پاکیزہ اور کنگرے مغرور تھے۔ ان مضبوط دیواروں میں کہیں کوئی رخنہ، کوئی دراڑ، نہیں تھی۔ لیکن بظاہر کسی دامن میں کوئی چاک نظر نہ آئے تو اس کا مطلب یہ تو نہیں ہوتا کہ اس دامن میں چھپا کوئی ناسور کبھی نہ ہو۔ کوئی گھاؤ نہ ہو جو اپنا ہی خون پی پی کر پل رہا ہو۔ اِن جالی دار مُوتا دیواروں نے پتہ نہیں کتنی خونی داستانوں کی حاشیہ آرائی کی ہوگی۔ اس سر بکف حصار کی سیڑھیوں پر کتنی سازشیں پروان چڑھی ہونگی، کون جانے ــــ! انسان قلعہ کیوں بناتا ہے؟ اس لئے نہیں کہ ان میں بیٹھ کر خود کو محفوظ محسوس کرے، بلکہ اس لئے کہ گڑھ کی مضبوط چہار دیواری میں خود کو زیادہ طاقتور، زیادہ زبردست بناسکے اور پھر کمزور تر پر اپنی برتری کا سکہ جمائے۔

سمندری ہوا کے نمکین جھونکے فادر لارنس کے دل و دماغ کو ٹٹولتے رہے۔ اس نے تھرتھراتے ہوئے ہاتھوں سے مقدس مریم کے پتھریلے دامن کو تھام لیا۔ گوشت پوست کے ہاتھ میں پہنچ کر پتھر ایک ہتھیار بن جاتا ہے، ہمت اور قوت دیتا ہے۔ لیکن فادر لارنس نے اس پتھر کو پتھر سمجھ کر نہیں تھاما تھا۔ دامن سمجھ کر تھاما تھا۔ کسی اَدی سہارے کے لئے نہیں، بلکہ ڈھارس کمک کے لئے تھاما تھا۔ وہ لڑکھڑایا اور اس کے پیروں کے نیچے

شاعر بنی

سے ایک پتھر لڑھک کر زوال کی طرف چل پڑا۔ وہ ایک پتھر تو کیا آج اُسے وہی زمین ڈولتی سی محسوس ہو رہی تھی جس پر وہ کھڑا تھا۔ تیز ہوا کے باوجود اس کے جوان اور وجیہہ چہرے پر پسینے کے قطرے اُبھر آئے تھے۔ اس کے قلعہ کی دیوار میں یہ رخنہ ایک دن پہلے اُبھرا تھا، جب کہ وہ نہایت ہی سکون کے ساتھ، چھوٹے تابوت نما کمرے میں کھڑا یکے بعد دیگرے لوگوں کا اقبالِ جرم ــــ سن رہا تھا۔ مختصر سے کھڑکی نما سوراخ سے، ڈسک پر رکھے صرف ان کے ہاتھ نظر آتے تھے۔ گنہگار کی شرمسار آنکھیں پارسا کے آمرزگار چہرے کو نہیں دیکھ پاتی تھیں اور نہ پارسا گنہگار کو دیکھ پاتا ــــ اقبالِ گنہ سے گنہ کی قطعیت پر تو اثر نہیں پڑتا لیکن احساسِ گناہ کی نیش زنی میں ضرور فرق آجاتا ہے۔ اور انسان ان ہی چھوٹے چھوٹے دھوکوں پر تو زندہ ہے!

شاید گنہگاروں کی قطار ختم ہوگئی تھی۔ کلیسا میں سکوت تھا۔ فادر لارنس نے کچھ دیر انتظار کیا ــــ وہ کھڑکی بند کرنے ہی کو تھا کہ اُسے ایک سسکی سنائی دی، وہ رُک گیا۔ کاؤنٹر پر یہ سسکیاں اُسکے لئے کوئی نئی بات نہیں تھیں۔ اس کاؤنٹر پر سسکیوں اور عرق ریز جبینوں ہی کے سودے ہوتے تھے۔ وہ انتظار کرتا رہا۔ دوسری طرف سے کوئی آواز نہیں آئی۔ البتہ دو سرد ہاتھ بڑھے اور انہوں نے اس کے دونوں ہاتھ کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ اس کے رُوئیں رُوئیں میں جھنا کا سا ہوا ــــ جیسے گرجا کی چھت میں لگے stained glass میں بال آگیا ہو۔ وہ اُن ہاتھوں کو جانتا تھا۔ انگوٹھے اور انگلی کے درمیان اُس سیاہ تِل کو پہچانتا تھا۔ اچانک وہ تِل اس کی آنکھوں میں سیاہی بن کر پھیلنے لگا۔ اُس نے اپنے ہاتھ چھڑائے اور کھڑکی بند کردی۔ جانے کتنی دیر وہ کھڑکی سے پشت لگائے آنکھیں بند کئے سوچتا رہا۔

اب وہ دہاں نہیں آئی تھی۔ اس کی نفسیاتی الجھن بننے کے لئے! اب جبکہ اُس نے اپنی باغی نفس کو کوڑے مار مار کر ادھ مُوا کر دیا تھا۔ اب جبکہ اس نے محبت اور نفرت کے ہر احساس کو مٹا دیا تھا۔ وہ کیوں آئی تھی۔ اُس نے بیشک سونیا سے محبت کی تھی۔ لیکن کوئی ہمیشہ ہی تو محبت نہیں کرتا۔ کتنی محبتیں انسان کے جیتے جی مر بھی تو جاتی ہیں! کون کہتا ہے کہ محبت ادی چیز نہیں ہے؟ جو ایسا کہتے ہیں وہ خود کو دھوکہ دیتے ہیں۔ اگر یہ غیر مادی ہوتی تو انسان کا نظریہ اُسکے بارے میں زندگی کے ہر دور میں بدلتا کیوں رہتا؟ کیوں، ہم جسے جی جان سے پیار کرتے ہیں، کبھی کبھی اس کی صورت دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتے؟ اس نے یہ سوچ کر اپنی ناؤ کو کنارے لگا لیا تھا، اور اپنے اصولوں اور نظریوں کی بدولت اتنی کم عمری میں ایک وقعت اور تعظیم کا حقدار بن گیا تھا۔

مُقدس اں کا دامن اب بھی اُسکے ہاتھ میں تھا۔ اُس نے سینے پر کراس بنایا اور واپس چلنے لگا۔ dona paula ساحل پر خوش باش ٹولیاں جمع ہونے لگی تھیں۔ گٹاروں کی جھنکار کے ساتھ ساتھ ہتھیلیاں چٹخنے اور پاؤں تھرکنے لگے تھے۔

"once a mama met a papa under a man-
-go tree ..."

مضبوط قدم اٹھاتا ہوا وہ اُن خرافات کو پیچھے چھوڑ کر آگے بڑھ گیا۔

جب وہ اپنے گھر کے چھوٹے سے احاطے میں پہونچا تو اندھیرا تیزی سے پھیلنے لگا تھا۔ لیکن اُس کے پسندیدہ گلابوں نے ابھی اپنی رنگت اندھیرے کو نہیں سونپی تھی۔ وہ کچھ دیر ان کیاریوں سے خس و خاشاک صاف کرتا رہا۔ حتیٰ کہ وہ سارا کا سارا فلاور بیڈ نکھر آیا۔ جیسے خود اُس کی صاف ستھری اور غیر پیچیدہ زندگی تھی۔ کیا ہوا جو احساس کے چند کانٹے وہاں بھی تھے۔ کانٹوں سے تو بچا بھی جا سکتا ہے۔ وہ اندر جانے کے لئے پلٹا، لیکن ٹھٹک گیا۔ عین اس کے پیچھے سونیا کھڑی تھی۔ بوکھلاہٹ میں ایک کانٹا اُس کی انگلی میں چُبھ گیا، جس سے خون کے ایک قطرے نے ٹپک کر اسکے اُجلے لبادے کو داغدار کر دیا۔ غیر شعوری طور پر سونیا نے ہاتھ بڑھا کر اس کی انگلی تھام لی۔ اور فادر لارنس کو ایسا لگا جیسے حُسن کے اُس آتشکدے میں اُس کی انگلیاں جھلس کر رہ گئی ہیں۔ اُس نے خود کو سنبھالا اور ہاتھ کھینچ لیا۔ سونیا اُسے دیکھتے رہ گئی۔

"اب تمھیں اتنا بھی گوارا نہیں؟" وہ چپ رہا۔

فادر نیکی

"تم جانتے ہو میں کیوں آئی ہوں؟"

"ایک پادری کے دروازے ہر وقت کھُلے رہتے ہیں۔"

"جانتے ہو، میں کیا کہنا چاہتی ہوں؟"

"میں پادری ہوں، عالم الغیب نہیں۔"

"یہ تم بار بار کیوں یاد دلا رہے ہو کہ تم ایک پادری ہو؟"

"اس لئے کہ میں پادری ہوں۔ اور اب یہی ایک حقیقت ہے۔"

"تو پھر تمھیں ضرور سُننا ہوگا، جو میں کہوں" سونیا نے اچانک اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالدیں۔

"اس چہرے کو کیا ہوا جو کبھی صفحۂ انجیل کی طرح پاک و معصوم تھا۔ وہ اس سے کیا کہنا چاہتی تھی؟" اُسنے سوچا۔

"یہاں نہیں اندر بتاؤں گی۔"

فادر لارنس نے کچھ تگ و دو کے بعد دروازہ کھولا اور سونیا اسکے پیچھے ہولی۔

"موہن! کیا تم مجھے اپنا سکتے ہو؟"

فادر لارنس بری طرح چونکا۔ سونیا بند دروازے سے پیٹھ لگائے کھڑی تھی۔

"سونیا!" اسنے پہلی بار اس کا نام لیا "یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟"

وہ آگے بڑھی "کل ہی تم نے معبد میں منبر پر کھڑے ہوکر انہیں کہا تھا کہ میری میگڈیلین کو بدچلنی کے الزام میں رواج کے مطابق سر بازار سنگسار کرنے کا وقت آیا تو یسوع مسیح نے کیا کہا تھا"! وہ رُک گئی۔

"تم سب میں سے وہ، جسنے زندگی میں کبھی کوئی گناہ نہ کیا ہو، آگے بڑھے اور اس خطاکار کو پہلا پتھر مارے ..." لارنس نے آنکھیں بند کرکے انجیل کے الفاظ دہرالئے۔

سونیا تن کر کھڑی ہوگئی "اگر میں کہوں کہ تم بھی وہ پہلے انسان نہیں ہوسکتے جو میرا سر پتھر سے کچل دے تو تم کیا کروگے؟ — گناہ اور ثواب کے نظریئے بدلتے رہتے ہیں موہن، لیکن انسانیت کی قدریں نہیں بدلتیں۔ دُنیا میں انسان سب کچھ خوشی کے لئے کرتا ہے۔ لیکن یہ عمل بڑا صبر آزما ہوتا ہے۔ زندگی میں مَیں منفی قدروں کی قائل نہیں رہی — مجھے خوشی اور آسودگی چاہیئے تھی۔ ڈی سلوا نے مجھے یہ سب کچھ فراہم کیا تھا۔ لیکن وہ خوشی ایسا خنجر نکلی جس کی تیز دھار رگِ جان کے بالکل ہی قریب دھری ہو۔ وہ مجھے تمہارے بچّے سے جُدا

کرناچاہتا تھا۔

سونیا: وہ کانپ اٹھا۔ زندگی کی وہ لغزش جسے اسنے تپسیا کے منوں بوجھ تلے دبادیا تھا لاوے کی طرح اُبل آئی۔

وہ اور سونیا شادی کرنے والے تھے۔ وہ اس طوفان سے بھی واقف تھا جو شادی سے پہلے ہی ایک رات دونوں کو بہالے گیا تھا۔ لیکن اس خمیازہ طوفان سے قطعی ناواقف کہ سونیا اُس کے بچّے کی ماں بننے والی تھی۔ کیونکہ سونیا نے اس کا موقع ہی نہیں دیا تھا۔ اور ڈی سلوا کی دولت اور رسوخ کا شکار ہو گئی تھی۔ جس نے اُسے اب دھتکار دیا تھا۔

"مجھے تم سہارا دے سکتے ہو۔ مجھے صرف سہارا چاہیئے۔ اپنے معصوم بچّے کی خاطر۔ میں تم سے محبّت نہیں مانگ سکتی کیونکہ وہ تمہارے دل میں مر چکی ہے۔ تم مجھ سے نفرت نہیں کر سکتے، کیونکہ ایک پادری کسی سے نفرت نہیں کرتا۔ مجھے تم دنیا کی ہوس کا شکار ہونے سے بچا سکتے ہو موہن ـــ رام گڑھ بستی والی تجھ مجھے اپنا سہارا بنانے پر تلی ہوئی ہے۔ اس سے پہلے کہ میں دوسری بار کوئی غلط قدم اٹھانے پر مجبور ہو جاؤں تم مجھے بچالو۔"

"تم جھوٹ کہتی ہو" وہ طیش میں آکر کھڑا ہو گیا۔ "تم مجھ پر اپنا دام پھینکنا چاہتی ہو۔ تاکہ تمہاری مُسلسل قربت پھر میرے دل میں سوئے ہوئے شیطان کو جگائے اور میری زندگی کی تاراج کشتی قیامت تک کسی بدروح کی طرح بھٹکتی رہے۔ میں تمھیں سہارا دوں تاکہ لوگ مجھ پر اُنگلیاں اٹھائیں۔ تم نے جس صنم خانے کو ڈھایا ہے اُس میں اب کوئی بت نہیں جاگے گا سونیا ـــ تم جا سکتی ہو" ـــ

"موہن!"

"موہن نہیں ـــ فادر لارنس ـــ اب مجھے اور کچھ نہیں سننا ہے۔"

اور سونیا سیّال آنکھیں لئے چلی گئی۔

"کاش وہ اُسے پہلا پتھر مار سکتا۔ کاش ـــ لیکن سونیا کا آنسو بھرا چہرہ اُس کی آنکھوں میں ڈولتا رہا ـــ سونیا نے اس سے صرف سہارا مانگا تھا۔ اُسے دنیا کے بھیڑیوں سے افضل سمجھ کر۔ اس کی ریاضت اور عقیدت کی مضبوط دیوار تلے سایہ ڈھونڈنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن اس نے بزدلی سے اُسے دھتکار دیا تھا۔ اُسے اپنی بدنامی کا ڈر تھا۔ اُسے ڈر تھا کہ کہیں اُس کے پاؤں متزلزل نہ ہو جائیں۔ کہیں وہ تیاگ کے راستے میں ڈگمگا نہ جائے۔ وہ دیر تک سوچتا رہا۔ وہ چاہتا تو اس کا گناہ گمنام رہ سکتا تھا۔ ڈی سلوا اپنے مقصد کی خاطر اس کے بچّے کو اپنا سمجھتے خاطر بیچی۔

ہوئے ہمیشہ کے لئے ٹھکانے لگا سکتا تھا۔ لیکن صبح ہوتے ہی اس نے رام گڑھ کا رخ کیا۔ اور جب پتہ چلا کہ سونیا گھنٹہ بھر پہلے ہی اپنے دوستوں کے ہمراہ ارماگو اجا چکی ہے تو وہ اُلٹے قدموں لوٹا۔ چھوٹتی ہوئی بس کو اس نے دوڑ کر پکڑا اور مارگو اچل پڑا۔ راستہ بھر ہرے گھنیرے سایوں کے منظر آج اس کے لئے اپنی اہمیّت کھو چکے تھے۔

جب وہ بس سے اُترا تو دیوانہ وار اس کی نظریں سونیا کو ڈھونڈتی رہیں۔ بندرگاہ کی گہما گہمی اور ہنگامے میں کسی ایک فرد کا پتہ چلانا بھی مشکل ہوتا ہے۔ ہر کوئی تنگ لمحوں میں سب کچھ کر جانا چاہتا ہے۔ جہاز نے وارننگ دے دی تھی۔ ہپّی بے تحاشہ جہاز کی طرف دوڑے جارہے تھے۔ کچھ ننگ دھڑنگ۔ جسموں سے بدبو پھوٹتی ہوئی۔ سکون کی تلاش میں سکون سے مُنہ موڑے ہوئے یہ مورکھ۔ نوجوان چہرے، جنہیں بے راہ روی اور زندگی کی آزمائشی قدروں سے گریز نے وقت سے پہلے پیری بخش دی تھی۔ اُن کا ریلا فادر لارنس کو بھی جیٹی پر بہالے گیا۔ اور وہیں اس نے جہاز کے ڈیک پر ان ہی نیم وحشی ہپیّوں کے درمیان سونیا کو بھی دیکھا جو سینے سے اپنا بچّہ چپٹائے ہوئے ٹکٹکی باندھے اُسے تکے جارہی تھی۔ اس نے بھی تہیّا کر لیا تھا کہ اب وہ فادر لارنس کے دامن کا داغ نہیں بنے گی۔ اُس نے دوسرے ہی لمحہ سمندر میں چھلانگ لگادی۔

فادر لارنس جانتا تھا کہ سونیا تیرنا نہیں جانتی۔ وہ بھی پانی میں کود پڑا۔ ساحل سے کچھ دور وہ ابھی سونیا تک پہنچ بھی نہیں پایا تھا کہ وہ پاگلوں کی طرح چلّائی "بچہ" میرا بچّہ۔ اسے بچالو ـــ اور سمندر کی لہروں نے اُسے خاموش کر دیا۔ اور وہ ہمیشہ کے لئے سمندر کی آغوش میں کھو گئی۔

فادر لارنس جب نڈھال تھرا بور کنارے پر پہونچا تو اس کے سینے سے چپٹا ہوا اس خطاکار عورت کا بچّہ بھی تھا جس پر وہ پہلا پتھر نہ مار سکا۔

قوم ترقی کی راہ پر

کھیتوں کے لئے مزید پانی



اب ہمارے ملک میں 2.18 کروڑ ہیکٹر رقبہ زمین کے لئے آبپاشی کی سہولتیں میسر ہیں ـــــ 25 سال پہلے کی نسبت دوگنا سے بھی زیادہ۔

مزید 50 لاکھ ہیکٹر رقبہ زمین کے لئے جلد ہی آبپاشی کی سہولتیں میسر آجائیں گی۔

مضبوط ارادہ اور کڑی محنت ہمارے ساتھی ہیں

davp 75/452

شاعر۔ بمبئی

غزلیں

یوسف علی خان ثاقب

کبھی تو نغمۂ آتش بجاں کی بارش ہو
یقیں کی فصل تو مہکے گماں کی بارش ہو

سکوتِ بربطِ ہستی ہے تشنۂ مضراب
غزل شناؤں کو دلِ خستگاں کی بارش ہو

کوئی نہیں جو سنائے ہجومِ دوراں میں
کبھی یہ دل سے غمِ رفتگاں کی بارش ہو

خلوصِ حسن سے نکھرا گئی ہے چشمِ غزل
زمینِ فکر پہ سنگِ گراں کی بارش ہو

سکوت کتنا خموشی میں اک ذرا گونجے
طلوعِ ماہ سے حسنِ بیاں کی بارش ہو

○ ۸-۲-۶۲۸/۱/۸ ... نمبر ۸ ... حیدرآباد دکن
شاعر ...

ڈاکٹر احسن رضوی

دھوپ پھیلی تو رگ و پے میں حرارت جاگی
سہمے سہمے ہوئے جسموں میں بھی راحت جاگی

پنکھ پھیلا دیئے سورج نے حسیں دھرتی پر
ذرّے ذرّے میں طرب خیز تمازت جاگی

پھر ہر اک رگ میں احساسِ نمائش ابھرا
پھر خوابیدہ جسموں میں معصوم شرارت جاگی

پیلے پیڑوں کی ہر اک شاخ نے انگڑائی لی
گلعذاروں کے شگوفوں میں صباحت جاگی

آنکھوں آنکھوں میں کئی دور چلے مستی کے
شاہراہوں پہ بہکنے کی جسارت جاگی

○ ۲۴۶-ایل-ماڈل ٹاؤن۔
جالندھر

خلش بڑودوی

یوں تو باہر سے سلامت ہوں بہت اچھا ہوں
غور سے دیکھئے اندر سے کہیں ٹوٹا ہوں

کرفیو ہی کے فسادوں میں نظر آتا ہوں
کسی صحرا سا نہیں شہر کا سناٹا ہوں

سر کہیں، چہرہ کہیں، ہاتھ کہیں پاؤں کہیں
زندگی گر اسے کہتے ہیں تو میں زندہ ہوں

چند دن پہلے وہاں سب مرے گرویدہ تھے
آج جس شہر میں گم گشتہ و آوارہ ہوں

یاد آتا نہیں کچھ یاد بھی کرتا ہوں اگر
خود کو کیا جانے کہاں آج میں بھول آیا ہوں

دیکھنا یہ مرا کھویا ہوا ماضی تو نہیں
میں اندھیرے میں کسی چیز سے ٹکرایا ہوں

اس اندھیرے کو سمجھ کے اجالا سمجھو
جو بھی ہوں اپنی حقیقت کو لئے بیٹھا ہوں

نیند کی لاش اٹھائے ہوئے کاندھوں پہ خلش
جانے کیوں رات کو سڑکوں پہ پھرا کرتا ہوں

○ یاقوت پورہ، بڑودہ، گجرات

مقالہ

کوثر چاند پوری کے رپورتاژ

ضیا حسنی
رٹائرڈ ہیڈ ڈرافٹر، بجٹ سیکشن آفس آف دی کمشنر سیلز ٹیکس، لکھنؤ

کوثر چاند پوری اُردو کے بزرگ و مشّاق قلم کار ہیں اور ادب کی گوناگوں تبدیلیوں پر بھی گہری نظر رکھتے ہیں۔ ادب کی ہر خوش گوار تبدیلی کو وہ بڑھ کر نہ صرف گلے لگاتے ہیں بلکہ اُس میں قوت بخشنے اور زندگی کی ہر دوڑانے میں بھی نوجوان قلم کاروں کے دوش بدوش دکھائی دیتے ہیں۔ افسانہ، ناول، طنز و مزاح، نقد و تبصرہ اور انشائیہ سبھی اصناف میں وہ رنگ بھرتے رہے ہیں اور اب "کاروان ہمارا" کے عنوان سے اُن کے دو رپورتاژ منظرِ عام پر آئے ہیں۔

تقریباً نصف صدی سے کوثر صاحب اُردو دنیا کے رواں دواں نظر آتے ہیں لیکن اُن کی کسی تحریر میں زوال و انحطاط کے آثار نہیں ملتے۔ ہارنا اور تھک کر بیٹھ جانا جیسے اُنھوں نے سیکھا ہی نہیں۔ "کاروان ہمارا" میں دو رپورتاژ "کارواں ہمارا" اور "سفر ارضِ منزل کا" شامل ہیں۔ اسے حلقۂ فکر و شعور دہلی نے کافی اہتمام سے شائع کیا ہے۔

رپورتاژ کے بارے میں اُردو میں ابھی تک تفصیلی طور پر اظہارِ خیال نہیں کیا گیا ہے۔ البتہ ڈاکٹر اعجاز حسین مرحوم نے "اُردو ادب آزادی کے بعد" میں رپورتاژ کے بارے میں اپنی رائے ظاہر کی ہے جس میں اس صنف کے خدوخال اُبھر کر سامنے آئے۔ لیکن شمیم احمد نے اپنے تحقیقی مقالہ "صنفِ رپورتاژ۔ ایک تعارف" میں کافی وضاحت سے اس صنف پر بحث کی ہے۔ شمیم صاحب نے سبھی نثری اصناف کا تذکرہ کرتے ہوئے یہ لکھا ہے کہ رپورتاژ میں ان کی خصوصیات شامل کی جاسکتی ہیں لیکن واقعات کا تسلسل برقرار رہنا چاہیئے۔ وہی قلم کار کامیابی سے رپورتاژ لکھ سکتا ہے جس کی قوتِ مشاہدہ تیز ہو، جس کا ذہن واقعات کے تسلسل کو محفوظ رکھنے کی پوری صلاحیت رکھتا ہو، جو دلکش اسلوبِ نگارش کا مالک ہو، اور جس کا قلم افسانوی رنگینی و رعنائی کا شوقین ہو لیکن ایسا باخبر بھی ہو کہ افسانوی رنگ میں ڈوبی ہوئی عبارت کو صاف بچائے جاسکے۔ دراصل رپورتاژ کا پودا حقائق کے بیچ سے اُبھرتا ہے۔ واقعات کی فضا میں پروان چڑھتا ہے، شاعرت بھی

اور ایسی فضا میں زبان و بیان کے رنگین و معطر پھول کھلتے ہیں۔ قلم کار کو صرف اتنا اختیار ہے کہ وہ رپورتاژ کو دلچسپ بنانے میں واقعات کو افسانوی انداز میں پیش کرے، جاندار مکالمات سے عبارت میں زور پیدا کرے، کہیں طنز کا تیکھا پن لے آئے اور پھر اس ماحول کو مشّاقی سے مزاح کی چاشنی بھی دے دے لیکن غیر ضروری باتوں سے دامن بچاتا جائے۔ جو کردار پیش کئے جائیں وہ سچی تصویر بن کر قاری کی نگاہوں کے سامنے اُبھریں۔ اس میں شبہ نہیں کہ قلم کار اپنے داخلی احساسات سے قارئین کو واقف کراسکتا ہے لیکن اس مہارت سے کہ قاری کی توجہ واقعات سے ہٹ نہ جائے۔ غرض رپورتاژ کو رپورتاژ رہنا چاہیئے۔ وہ افسانہ، ڈراما اور ناول نہ بنے اور نہ خشک صحافتی رپورٹ۔

کسی رپورتاژ کو سپردِ قلم اس طرح کیا جاتا ہے کہ واقعات کو صحیح طور پر ذہن میں رکھا جائے پھر اُنھیں تسلسل کے ساتھ قلم بند کر لیا جائے اور اس کے بعد واقعات کی کڑیوں کو اس طرح ملایا جائے جیسے کوئی فلم سامنے آرہی ہو۔ حسّاس قلم کار کے اِردگرد پھیلے ہوئے واقعات اُسے رپورتاژ لکھنے پر اُکساتے ہیں اور وہ جب ان واقعات کو کاغذ پر پھیلانے لگتا ہے تو اُس کے داخلی احساسات غیر ارادی طور پر نوکِ قلم پر آکر تحریر کے رُوپ میں ڈھلنے لگتے ہیں۔ ایسے موقع پر اُس کی بچی تُلی بڑائے فن کارانہ انداز میں شامل ہوکر تخلیق کو چار چاند لگادیتی ہے۔ اس لئے یہ کہنا بالکل بجا ہے کہ خارجی اور داخلی اثرات کے اتصال سے ایک کامیاب رپورتاژ منظرِ عام پر آتا ہے۔ "کارواں ہمارا" میں شامل دونوں رپورتاژ کافی مفصل لیکن دلچسپ ہیں۔

کوثر صاحب نے دہلی اور حیدرآباد کے سفر کی روئیداد جس دلکش انداز میں بیان کی ہے وہ صرف انھیں کا حصّہ ہے۔ قاری انھیں پڑھتے ہوئے کافی دلچسپی محسوس کرتا ہے اور آخر تک اُس کی دلچسپی باقی رہتی ہے۔ قاری ان دونوں

تخلیقات کے مطالعہ کے بعد کوثر صاحب کی لائقِ اعتماد یادداشت، دلکش اُسلوب نگارش، رنگین افسانویت اور ان کی نکتہ آفرینیوں میں کھو سا جاتا ہے کوثر صاحب دونوں رپورتاژوں میں اپنے قاری کو بھٹکا کر کسی دوسری سمت نہیں لے جاتے۔ جن مناظر کو پیش کرتے ہیں قاری انھیں پڑھتے ہوئے ایسا محسوس کرتا ہے جیسے وہ اُس کی نگاہوں کے سامنے آگئے ہوں۔

"اب شام ہوگئی ہے۔ آسمان پر سُرمئی دھندلکے اُبھرنے لگے ہیں جنھیں دیکھ کر ڈھاک کے پھولوں کی چنگاریاں دہکتی جارہی ہیں۔ مالوے کی سرزمین پر جھکا ہوا سُورج اپنا حسین چہرہ لئے نگاہیں جھکائے پچھم کی سمت جارہا ہے مغرب کے ماتھے پر شفق کا سیندور ملا جاچکا ہے اور اُس پر ایک بندی بھی جھلملا رہا ہے۔ شام کے دامن میں تاریکیاں پھیلنے لگی ہیں۔ آسمان پر ستارے جھلملا رہے ہیں اور پٹھان کوٹ ایکسپریس مُنہ سے دھوئیں کے سیاہ بادل اور چنگاریاں اُگلتا اور اندھیرے کو چیرتا آگے کو دوڑ رہا ہے۔"

کوثر صاحب جزئیات کو بخوبی اپنے ذہن میں محفوظ رکھتے ہیں۔ منظر نگاری کے معاملہ میں بھی اُن کا قلم خوب جوہر دکھاتا ہے۔ پٹھان کوٹ ایکسپریس جن خوشگوار مناظر کے دوش بدوش چل رہا تھا اُسے بخوبی بیان کرنے میں کوثر صاحب کامراں گذر گئے ہیں۔

ان دونوں رپورتاژوں میں جگہ جگہ ایسے لوگ سامنے آتے ہیں جنھیں ہم دیکھ چکے ہیں یا پڑھ چکے ہیں اور اُن کے بارے میں کافی واقفیت رکھتے ہیں اور دورانِ مطالعہ ایسے چہرے بھی اُبھرتے ہیں جنھیں ہم نے کبھی نہیں دیکھا کوثر صاحب ان سبھی سے اس طرح ملواتے ہیں کہ اُن کی شخصیت اُبھر کے سامنے آجاتی ہے پنڈت نہرو اور مولانا آزاد مرحوم کا تذکرہ ملاحظہ فرمائیے۔

"پنڈت جی کے آتے ہی پنڈال میں روشنی تھرک سی اُٹھی ہے جیسے سورج نکل آیا ہو۔ اُن کے شاداب چہرے پر مسکراہٹ ناچ رہی ہے۔ سفید ٹوپی کے نیچے سے سفید بال جھانک رہے ہیں شیروانی میں گلاب کا پھول لگا ہوا ہے جس سے امن اور محبت کی مہک نکل رہی ہے۔"

"ذرا دیر بعد مولانا ابوالکلام آزاد تشریف لائے ہیں اُنکے چہرے پر وہی متانت سنجیدگی اور مردانہ عزم کی گرمی مچل رہی ہے جو اُن کے ادب سے خطابت تک ہمیشہ کارفرما رہا ہے

مولانا کی خطابت کا انداز ذرا نہیں بدلا ہے سانس پر قابو نہیں ہے لیکن ایک منطقی ترتیب، تسلسل اور ربط کے ساتھ نہایت پُرزور الفاظ میں پُورے وقار اور سنجیدگی سے بول رہے ہیں"

سابق وزیرِ اعظم پنڈت نہرو اور مولانا آزاد مرحوم کی شخصیات محتاج تعارف نہیں لیکن درجِ بالا عبارت سے دونوں اُبھر کے سامنے آگئے ہیں۔ اب کوثر صاحب اور لوگوں سے بھی ملوا رہے ہیں اِن کے چہرے بھی جانبِ نظر ہیں؟

"انھیں میں ایم۔ عرفان بھی ہیں جو شعلہ بن کر لپکتے ہیں اور دم کی طرح پھٹ پڑتے ہیں۔

"یہ حضرت دعاؔ ڈبائیوی کے صاحبزادے ہیں اور سلام کے بعد کبھی مجھ سے کوئی بات نہیں کرتے۔ خاموشی جتنی اچھی ہوتی ہے اُن سے زیادہ ... ... ہیں"

"مقبول صاحب شاخِ گوالیار کے نوجوان اور سرگرم کارکن ہیں؟ ان سے صرف مسکراہٹوں کا تبادلہ ہوا ہے جو الفاظ سے زیادہ حسین اور گویا ہوتی ہیں"۔

خاموشی اور مسکراہٹوں کی وضاحت لائقِ غور ہے۔

کوثر صاحب پیکرِ خلوص و محبت ہیں۔ اُن کا یہ جذبہ قابلِ قدر ہے کہ کسی شخصیت کو انھوں نے حتی الوسع جو دورانِ سفر اُن کی نگاہوں سے گذری ہے چھوڑا نہیں ہے کہیں کہیں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ بات خواہ مخواہ بڑھ رہی ہے، لیکن یہ سبھی کردار دلچسپی کا سبب بنتے ہیں۔ اور قاری ان سے جیسے ہی ملتا ہے اس کے ہونٹوں پر ہلکا سا تبسم آہی جاتا ہے۔

"جوہر صاحب میرے ہم قافیہ ہیں مگر شاعر ہیں اور یو۔پی کانفرنس کو یہی حضرت مردمی کتاب بنائے دے رہے ہیں ایسی کتاب جو جگہ جگہ سے غلط چھپی ہو۔ جوہر صاحب نے مجھے اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا ہے وہ سگریٹ پی رہے ہیں انھیں مجھ سے زیادہ کش لگانے سے دلچسپی ہے۔

بیگم قدوائی کی دعوت چل رہی ہے۔ درمیان میں کوثر صاحب نے ایک دلچسپ بات سنادی ہے۔

"میز پر ایک ڈش ایسی بھی ہے جس پر "فرسلاد" اور ٹماٹر کا غلاف چڑھا ہوا ہے۔ روشن صاحب نے احتیاط سے کچھ چھیلا ہے اور تھوڑا سا سلاد وغیرہ لے لیا ہے۔ بیگم صاحبہ فرما رہی ہیں۔

"کچھ ذرا گہرا مار دیجئے"

انھوں نے ایسا ہی کیا "اندر سے گوشت نکلا ہے" روشن صاحب نے

شاعر بمبئی

برجستہ کہا ہے۔

"ہے دلی پوشیدہ اور کافر کھلا"

روشن صاحب کی کوتاہ قامتی پر مجاز صاحب بھی لطیفہ چست کر چکے ہیں اب کوثر صاحب کی کمتاو گفتگو بھی سنتے چلئے،

"حضرت روشن صدیقی بھی تشریف لے آئے ہیں۔ اُن کے ہونٹوں پر ایک مستقل سی مسکراہٹ ناچ رہی ہے اور میں سمجھتا ہوں عظمت کے لحاظ سے یہ مسکراہٹ قد میں اُن سے بہت بڑی ہے۔"

عبارات میں جگہ جگہ طنزیہ فقرے خوب کام کرتے ہیں۔

"آپ کہتے ہیں کہ غذائی چیزوں کی کمی ہے لیکن ان میزوں کو دیکھ کر ایسا نہیں معلوم ہوتا۔"

اُردو کے سلسلے میں کیسی دل میں چبھنے والی بات کہہ ڈالی ہے۔

"بھارت جہاں پیپل کے درخت کی شاخیں بھی نہیں کاٹی جاتیں وہاں ایسے سایہ دار درخت کی جڑیں کیونکر کاٹی جا سکتی ہیں۔"

کوثر صاحب نے دونوں رپورتاژوں کو کافی سلیقے سے شروع کیا ہے اور واقعات کو فن کے سانچے میں ڈھالتے ہوئے ایسے ساحرانہ انداز میں پیش کیا ہے کہ اختتام تک کہیں بھی بے لطفی محسوس نہیں ہوتی۔ فاضل قلم کار نے کہیں کہیں ایسی تفصیلات بیان کی ہیں کہ ایک عام قاری دوران مطالعہ اُلجھن سی محسوس کرے گا جیسے طبیہ کالج کی تفصیلات لیکن اُنہیں نشانۂ تنقید نہیں بنایا جا سکتا اس لئے کہ ان تفصیلات کا تعلق موضوع سے ہے۔

کوثر صاحب نے واقعات کے رَدّوں کو جماتے ہوئے اس پر گہری نگاہ رکھی ہے کہ دیوار میں کوئی کجی نہ آئے۔ موقع بموقع اُنھوں نے اپنے ادبی نظریات و عقائد بھی بیان کئے ہیں۔ کسی بھی صنف کی بات آ گئی ہے تو اس کے بارے میں اپنی جچی تلی رائے بھی دی ہے۔

واقعات کی کڑیوں کو ملاتے ہوئے ایک جگہ افسانہ کی بات چل پڑتی ہے، اس موقع پر اُنھوں نے اس صنف کے بارے میں جو رائے دی ہے وہ درج ذیل ہے۔

"افسانہ نگار کہانی تخلیق کرنے سے پہلے زچہ سے مشابہت رکھتا ہے۔ وہ اپنے آس پاس پھیلی ہوئی زندگی سے خام مواد لیتا ہے اور اُس کو داخلی بھٹی پر پکاتا ہے۔ یہ مواد کسی موضوع سے منسوب ہو کر اُس کے ذہن و شعور میں دوڑتا رہتا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے بچہ ماں کی کوکھ میں نشو و نما پاتا ہے، پھر فن کار کو ایک خاص قسم کا کرب محسوس ہوتا ہے جو دردِ زہ سے زیادہ شدید

خلوص بھی

ہوتا ہے۔ یہی کرب مجبور کرتا ہے کہ افسانہ نگار کہانی کو اپنی سوچی سمجھی تکنیک کے ساتھ کاغذ پر منتقل کر دے"

کوثر صاحب طبیب ہیں لہٰذا بچہ اور ماں کی تمثیل پڑھتے ہوئے اُن کی وہ حیثیت سامنے آ جاتی ہے لیکن کہانی کیسے عالم وجود میں آتی ہے، افسانہ نگار کسی خیال کو (کن اذیتوں کا مقابل ہو کر) کہانی کا روپ دیتا ہے اس کی تشریح اُنھوں نے خوب کی ہے۔

غرض ان رپورتاژوں کے مطالعہ کے دوران کوثر صاحب کی رنگا رنگ ادبی شخصیت اُبھر کر سامنے آتی ہے۔ اُن کے وسیع مطالعہ کی جھلکیاں بھی نظر آتی ہیں۔ جہاں اُن کے زورِ قلم، رواں دواں عبارت، دلکش اسلوب اور معتبر حافظہ نے توجہ کیا ہے، وہاں اُن کی انسان دوستی، دردمندی، دیانت داری اور انصاف پسندی بھی سامنے آئی ہے۔ کوثر صاحب کہنہ مشق ادیب، بزرگ افسانہ نگار اور معتبر ناقد ہیں۔ اُن کے ان تمام محاسن کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ وہ رپورتاژ لکھنے کے نہ صرف پوری طرح اہل ہیں بلکہ اُن کے زیر نظر رپورتاژ ہر پہلو سے کامیاب ہیں اور اس کے متقاضی بھی ہیں کہ وہ اس سلسلہ میں قلم کے اسے جوہر دکھائیں۔

OO

بقیہ: اُردو نثر۔ ایک مختصر جائزہ - صفحہ ۳۵،

اس مضمون میں پاکستان کے کئی ممتاز نثر نگاروں کا تذکرہ ہونے سے رہ گیا ہے۔ پاکستان کے مشہور نقادوں اور محققوں میں حامد حسن قادری، ڈاکٹر محمد عبداللہ، وقار عظیم، ڈاکٹر عبادت بریلوی۔ محمد اکرام، غلام رسول مہر، عزیز احمد، ممتاز حسین، ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر وزیر آغا۔ ڈاکٹر سہیل بخاری، کہانی اور ناول نگاروں میں غلام عباس، شوکت صدیقی، سید امتیاز علی تاج، حجاب امتیاز علی، جمیلہ ہاشمی، ہاجرہ مسرور، مرزا ادیب، انتظار حسین، احمد ندیم قاسمی، ممتاز شیریں وغیرہ نے اردو ادب میں گرانقدر اضافے کئے ہیں۔ ان کی تصانیف کا اُردو کے معیاری ادب میں شمار ہوتا ہے۔ اگر اردو نثر کی تمام چھوٹی بڑی تصانیف کا جائزہ لیا جائے تو اِن کی تعداد ہزاروں تک پہنچے گی۔ افسوس کہ ہمارے یہاں شعراء کے تذکرے کی طرح، نثر نگاروں کا کوئی تذکرہ نہیں ہے اور نہ اصناف ادب پر الگ الگ کتابوں کا جائزہ کسی ایک کتاب میں ملتا ہے۔ نثری ادب کی اہمیت پہلے بھی تھی، آج بھی ہے اور آئندہ آج سے کہیں زیادہ ہوگی۔ نثری ادب پر منظم بند طریقے سے کئی جلدوں میں کام ہونا چاہئے۔ اس چھوٹے مضمون میں نہ تنقید کی گنجائش ہو سکتی ہے اور نہ نثر نگاروں کے اسالیب کی طرف اشارے، نہ اُن کے موضوعات کی وضاحت۔

OO

غالب عرفان

جنگ ابھی جاری ہے

آدابِ مروّت کے بدلتے ہوئے یہ ڈھنگ
ہر شیشۂ حرمت پہ برستے ہوئے یہ سنگ
انسان کی تقدیر کا اُڑتا ہُوا یہ رنگ
تعمیر کی تخریب سے جاری ہے ابھی جنگ

ہر قلبِ محبت کی یہ بکھری ہوئی قاشیں
چہرے پہ حقیقت کے تصنّع کی خراشیں
تہذیب و تمدّن کی تعفّن زدہ لاشیں
انسان خود انسان کے بہروپ پہ ہے دنگ

اغراض کے سانچوں میں یہ ڈھلتا ہُوا انسان
یہ حرص کے شعلوں میں پگھلتا ہوا انسان
یہ گرتا ہوا گر کے سنبھلتا ہوا انسان
بیداریٔ احساس کا خوابیدہ سا آہنگ

یہ گرتی ہوئی کہنہ روایات کی دیوار!
ٹوٹی ہوئی زنجیرِ قدامت کی یہ دیوار
ملتا کہ ہیں اب صبح کی تنویر کے آثار!
اوہام میں غلطاں ہیں مگر دانش و فرہنگ

یہ حادثۂ وقت کا انعامِ جفا خیز
مشرق کو دبوچے ہوئے یہ پنجۂ خونریز
پیراہنِ جمہور میں پروردۂ چنگیز
پیراہنِ جمہور شفق تاب، لہو رنگ

یہ عشوۂ تخئیل کے بہکائے ہوئے لوگ!
خود کردہ گناہوں کی سزا پائے ہوئے لوگ!
اور بھول پہ خود اپنی ہی شرمائے ہوئے لوگ!
بڑھتے ہیں سجاتے ہوئے اب عزم کا مردنگ

یہ جنگ، جو ہر سمت ہر اک موڑ کھڑی ہے
یہ جنگ، جو ہر دور کے انساں نے لڑی ہے
زنجیرِ تمدّن کی اک انمول کڑی ہے
اِس حلقۂ زنجیر میں اب تک ہے وہی زنگ

اِس جنگ میں گذرے ہوئے ادوار کی بو ہے
اِس جنگ میں بے باکیٔ کردار کی خو ہے
یہ جنگ کہاں! چاکِ تمنّا کا رفو ہے
ہر معرکۂ زیست سے اِس کا ہے جُدا رنگ

تعمیر کی تخریب سے جاری ہے ابھی جنگ

○ ۱۱-۳-۲۲۵ منظم پورہ - جدید ملے پلی - حیدرآباد ۵

کہانی

ٹوٹنے کے آگے پیچھے

رجنی پودار

ترجمہ: خالد شفائی
گورنمنٹ اُردو اسکول۔ مقام اور پوسٹ آفس بسر (دھولیہ)

جب وہ نہا کر نکلی تو بارش تھم چکی تھی، مگر بادل گھرے تھے۔ گیلے بالوں کا پانی ٹپک ٹپک کر اُس کی کمر کا کچھ حصہ نم کر رہا تھا۔ اُس نے تولئے میں بالوں کو کس کر نچوڑ دیا۔ ہاتھ اور انگلیوں میں درد کی ایک لہر سی دوڑ گئی۔ یہ اُسے کیا ہو جاتا ہے ؟ جو کچھ وہ قطعی نہیں کرنا چاہتی وہی بالکل آسانی سے کر ڈالتی ہے۔ آج تو نہانے کی بھی خواہش نہیں تھی، مگر بالوں تک کو اُس نے دھولیا ! چاروں بچے اسکول اور کالج جا چکے تھے۔ باورچی خانے سے فرصت پاکر مہاراجن کے گنگنانے کی آواز مدھم آرہی تھی۔ اُس کی آواز میں مٹھاس تھی۔ میرا اور سُورداس کے مصرعے تو اُس کے گلے میں بس گئے تھے۔ صبح جب وہ "پربھاتی" (نغمۂ سحر) گاتی تو اُسے ایسا محسوس ہوتا جیسے اُس کے سارے درد کو کسی نے کھینچ کر باہر کر دیا ہے۔ تولئے سے بالوں کو لپیٹتے پونچھتے وہ برآمدے میں آگئی۔ بارش پھر ہونے لگی تھی۔ آنگن میں تھوڑے سے تازہ ہارسنگھار کے پھول جھڑے پڑے تھے۔ جو پانی کی بوندوں کی بوچھار سے مٹی کیچڑ کے ساتھ مل کر بہنے لگے تھے۔ گرے ہوئے کو کوئی بھی تو روند سکتا ہے۔ اور گر جانے کی بھی تو اپنی فطرت ہوتی ہے۔ کوئی چاہ کر بھی شاخ سے لگا نہیں رہ سکتا ۔۔۔ بائیس برسوں کی ازدواجی زندگی اُسے کس کس طرح گزارنی پڑی ہے ؟

معمولی حیثیت سے اُوپر اُٹھ کر شوہر نے ملک کی سیاست میں ایک اہم مقام حاصل کیا اور اس کے لئے وہ سب کچھ مہیا کر دیا جن کے جانے انجانے وہ کبھی خواب دیکھا کرتی تھی ۔۔۔ ایک سُندر سے راجا رانی، سُندر سُندر محل، باغات، سُندر سُندر راج کمار اور راج کماری ....

اور جب وہ سچ مچ ہی رانی بنی تو راجہ کہیں کھو گیا تھا۔ کسی جادوگرنی نے اپنے جادو کے زور پر اُسے اپنے قابو میں کر لیا تھا۔ وہ اُس جادوگرنی کا کالا پہاڑ بھی جانتی ہے جہاں راجہ قید ہے مگر اُس کے پاس جادو توڑنے والا عصا نہیں ہے۔ اِس لئے وہ اپنے راجہ کو نہیں پا سکتی ہے۔

بیچ بیچ میں اُس کا شوہر آتا۔ گھنٹے دو گھنٹے مردانے میں بیٹھ کر واپس لوٹ جاتا۔ وہیں اُس سے گفتگو کرتا۔ وہیں بچوں سے اور وہیں دوسرے ملاقاتیوں سے ملتا۔ ایک دن جب دیپو مشکل سے دو ماہ کا تھا، وہ چار پانچ ہفتے بعد آنے والا تھا۔ وہ خوش تھی اور بچے بھی مسرور تھے۔ نہ ٹیلیفون کو چین تھا نہ گھر کے ملازموں کو۔ سب بالکل مصروف تھے۔ وہ آیا۔ ساتھ میں دیگر کارکن تھے۔ دِلّی والی بہن جی بھی تھیں۔ وہ اُن کا ذکر ہمیشہ کیا کرتا تھا۔ اُس نے ان کی خوب خاطر مدارات کی۔ بہت سی عورتیں اس کے شوہر کے ساتھ کام کرتی تھیں۔ گھر میں اُن کی آمد و رفت بھی رہتی تھی اور کبھی کبھی قیام بھی رہتا تھا۔

اُس دن بارہ بجے رات تک ملاقاتیوں کی آمد و رفت رہی۔ وہ بہن جی کے سونے کا انتظام کرا کے اپنے کمرے میں آگئی۔ یکایک اُسکی نگاہ آئینے پر پڑی۔ خود کو لمحہ بھر تک دیکھنا اُسے بڑا خوشگوار معلوم ہوا۔ وہ بھی تھکے ماندے ہیں' یہ سوچ کر اُس نے شوہر کے بستر کو کچھ اور بھی درست کیا۔ اُسی وقت ملازم نے آکر کہا "مالکن ! مالک نے اپنا بستر دِلّی والی بہن جی کے کمرے میں منگوایا ہے۔" اور اُسے نہیں معلوم کہ ملازم کب تک کھڑا رہا اور کب بستر لیکر کمرے سے باہر نکل گیا۔ وہ نجانے کب تک کھڑی رہی اور کب بیٹھ گئی اور نجانے کب بیٹھے بیٹھے سو گئی۔ کچھ ہوش سا آیا تو اُسے باہر اندھیرا ہی اندھیرا نظر آیا۔ اپنے کمرے سے باہر آکر اُس نے شوہر کے کمرے کے دروازے کو دھکا دیا۔ ....

دروازہ اندر سے بند تھا۔ اُس کا جی چاہا کہ دروازے سے اپنا سر اِس زور سے ٹکرائے کہ دونوں پٹ ٹوٹ کر ٹکڑے ٹکڑے

ہو جائیں، مگر رات کی تاریکی اور خاموشی نے اُسے دروازہ آہستہ آہستہ کھٹکھٹانے پر مجبور کر دیا۔ دوسرے لمحہ دروازہ بہن جی نے ہی کھولا۔ اُسے دیکھ کر وہ کچھ سہم سی گئیں۔ آنکھیں نیچی کر کے ایک طرف کو ہٹ گئیں۔ اُسے محسوس ہوا جیسے وہ بھی سو نہ سکی تھیں۔ اُسی وقت اس کا شوہر سامنے آگیا۔

"کیا ہے پربھا! رات میں کیا ہو رہا ہے ؟"

"میں پوچھتی ہوں، آپ کو کیا ہو گیا ہے ؟" وہ نہ جانے کیسے پوچھ بیٹھی۔

"جاؤ! ابھی سو جاؤ۔ صبح گفتگو کریں گے۔" شوہر کے لہجے میں غصّے کی جھلک اور حاکمانہ انداز تھا۔ دروازہ پھر بند ہو گیا۔ باہر کھڑے کھڑے اُسے ایسا محسوس ہوا تھا جیسے دونوں کواڑوں کے درمیان وہ پوری کی پوری بھنچ کر پس گئی ہو۔ اُس کی سانس ڈوبنے لگی تھی، اور دوڑ کر وہ اپنے کمرے میں آگئی تھی۔ تھوڑی دیر بعد چوکنّی نگاہوں سے اُس نے چاروں طرف دیکھا تھا .... اُف! سب سو رہے ہیں. .... کسی کو کچھ معلوم نہ ہوگا ـــــ نہ جانے کب تھوڑا تھوڑا اُجالا ہونے لگا۔ وہ کھڑکی سے لگی بیٹھی رہی۔ شوہر نے ملازم کو جگا کر ناشتہ منگایا اور تیار ہو کر بہن جی کے ساتھ جیپ لیکر چلا گیا۔ اُس کا جی چاہا کہ وہ پوچھے، ضد کرے لیکن وہ اُٹھ تک نہ سکی۔ جی چاہا جاتی ہوئی جیپ کو دیکھے مگر آنکھوں میں دُھند سی بھر گئی۔ چہل پہل سے دونوں بڑے بچے جاگ گئے تھے۔ ارچنا اور راجیو کچھ واقف سے کچھ ناواقف سے ڈرائنگ روم کے صوفوں پر خاموش بیٹھے تھے۔ پیروں کو تقریباً گھسیٹتے ہوئے وہ بھی راجیو کے پاس آکر بیٹھ گئی۔ کچھ دیر بعد گوپو اور دیپو بھی آگئے۔ پاپا کو چاروں طرف ڈھونڈا اور نہ پاکر ماں سے پوچھا۔ "ماں! پاپا چلے گئے ؟" ـــــ اُسے ایسا لگا گویا اُس کے کانوں میں تیزاب کی بوندیں پڑ گئی ہوں۔ نہ جانے کیسے گلے سے ہچکی اور آنکھوں سے دھار بہہ نکلی۔ ماں کو روتے دیکھ کر گوپو اور دیپو بھی رونے لگے۔ راجیو اور ارچنا نے ماں کو گھر گرہستی کے سُکھ دُکھ سدا مُسکرا کر ہی سہتے دیکھا تھا مگر آج اُس کی بے قراری نے دونوں کو گُم سُم کر دیا۔ اُسی لمحہ مہاراجن کمرے میں داخل ہوئی۔ "بھگوان پر بھروسہ رکھو بہو جی! دیوتا جیسے بھیّا جی پر بنگالے کا جادو کر دیا ہے چڑیل نے۔ تم جیسی ساوتری صفت اور لکشمی سمان استری کا جی جلا کر بھلا تھوڑے ہی ہوگا۔" اور قدموں کے پاس بیٹھتے ہوئے وہ بھی رو دی۔ "صبر کرو بہو جی! بچوں کی طرف شاید کبھی

کبھی دیکھو گی کہ بس اپنے ہی جی کو روؤ گی۔ ہم کو تو وہ دِلّی والی کبھی اچھی نہیں لگی۔"

اُس نے نگاہ اُٹھا کر مہاراجن کی طرف دیکھا۔ سُونی مانگ اور سُونا ماتھا اُس کے چہرے کی ویرانی کو اور بڑھا رہا تھا۔ پچیس[25] کی عمر میں بیٹے اور خاوند کو کھو کر وہ اس گھر میں آئی تھی۔ اُن دنوں اُس کا روٹی کپڑا بھی بوجھ تھا۔ لیکن اُس بوجھ کو اُس کے شوہر نے برداشت کیا اور اس احسان اور مہربانی کو مہاراجن نے حرزِ جاں بنا لیا۔ گھر کا ہر فرد اُسے اپنی جان سے زیادہ پیارا تھا۔ بچوں کی بیماری میں وہ رات رات بھر سرہانے بیٹھی رہتی۔ اُس کا شوہر ایک بار دِلّی میں بیمار پڑا تو منع کرنے کے باوجود مہاراجن ضد کر کے وہاں گئی اور پندرہ دنوں تک رہی۔ بہن جی کے گھر کا اُس نے پانی تک نہ پیا، کیوں کہ وہاں بھیّا جی کی نہیں بہن جی کی حکومت تھی۔ اسپتال میں جو ملا کھا کر دن بسر کئے۔ اور واپس لوٹ آئی۔ اپنے شوہر کی علالت کے دَوران اُس نے موت جیسی سزا پائی اور قیدی جیسا دُکھ جھیلا تھا۔ ایک ہی اطمینان تھا کہ مہاراجن دیکھ بھال کر رہی ہے۔

راجیو کی پیدائش کے بعد سے ہی اُس کے شوہر کی مصروفیت بہت بڑھ گئی تھی۔ پیار دینے یا پیار لینے کی فرصت اُسے کبھی نہیں ملی۔ بس رات کمرے میں آکر سو جاتا! پہلے ایک ہلکا سا پردہ دونوں کے درمیان باقی تھا جس کے آر پار دیکھا جا سکتا تھا۔ کبھی کبھی جسم کی بھوک اُس پردے کو اٹھا بھی دیتی تھی۔ آہستہ آہستہ وہ پردہ دیوار میں بدلتا گیا۔

مہاراجن شاید ساری باتیں سمجھ رہی تھی۔ بار بار کہتی ـــــ "بہو جی! تم گھر کا جھمیلا چھوڑو۔ بھیّا جی کے ساتھ دورے وغیرہ پر جایا کرو۔ کب تک گوشہ نشیں بنی رہو گی" ۔ اُس وقت وہ مہاراجن کی بات سمجھ نہ پائی تھی۔ سمجھی تو دیوار بہت اُونچی اُٹھ چکی تھی۔

کھڑے کھڑے سوچتے سوچتے وہ بُری طرح تھک گئی اور پاس پڑی کرسی پر نڈھال سی گر گئی۔ مہاراجن وہاں نجانے کب سے آکر کھڑی تھی۔ اُسے یوں پڑا دیکھ کر بولی: "بہو جی! ایک بج رہا ہے۔ کھانا نہیں کھاؤ گی! .... اب کیا کہیں ہم بہو جی! تم کیوں اِس قدر ترستی ہو ؟ بھگوان نے تمہاری کوکھ سے ہیرے پیدا کئے ہیں۔ انہیں نہیں سنبھالو گی۔"

وہ اُٹھ کر کچن کیطرف چل پڑی۔ مہاراجن نے خاموشی سے کھانا نکالا اور خلا میں دیکھتے ہوئے وہ لقمہ اُٹھانے لگی۔ پہلا ہی لقمہ رُنگی جیسا معلوم ہوا، اور گولی کیطرح مُنھ میں اِدھر اُدھر سرکتا رہا، لیکن حلق سے نیچا نہ اُتر سکا۔ پانی کے ساتھ دو چار نوالے اُس نے زہر مار کئے۔ مزید کھانا اس کے لئے مشکل ہوگیا تو مہاراجن کیطرف نگاہ کئے بغیر وہ کچن سے باہر آگئی۔

مہاراجن روہانسی ہوکر بڑبڑانے لگی "بھیّا جی کیا آتے ہیں کہ بہو جی کا دم حلق میں آجاتا ہے۔ ہم بھی کب تک یہ سب اِن بھوڑی آنکھوں سے دیکھیں۔ ہے پربھو! ہمارے لئے ہی تمہارے یہاں جگہ نہیں بچی۔"

"مہاراجن! تم ہو تو میں جی رہی ہوں۔ کیوں ایسا کہتی ہو؟" وہ بڑے کرب سے بولی اور پلنگ پر آکر گرگئی۔ اُس کی ہر سانس شوہر سے نفرت کرنے لگی تھی۔ اُس کے روم روم میں اِنتقام کے کانٹے اُگ آئے تھے۔ پھر بھی وہ کیا ہے جو اُسکے اپنے ہی اندر اُسے پانے کے لئے اِس قدر بے تاب رہتا ہے۔ چالیس کی اِس ڈھال عمر میں شوہر سے تَن تو کیا کچھ مانگے گا، من بھی مانگ مانگ کر تھک گیا ہے۔ پھر بھی وہ کیا ہے جو ساری بے عزّتی، ساری نفرت اور سارا انتقام فراموش کرکے اُسے پانے کو بے قرار ہے؟ وہ کیا ہے آخر؟ اُس کی نسوانیت؟ ازدواجیت؟ یا ممتا؟ لیکن یہ تینوں کیا اُسی دن نہ مٹ گئے تھے جس دِن اُس کے شوہر نے اُس کی قانون کی اور سماج کی پرواہ نہ کرتے ہوئے ایک پرائی عورت کو اپنے ساتھ لگا لیا تھا؟

اُس کے شوہر کی آمدنی اخراجات کے مقابلے میں کچھ زیادہ ہی تھی۔ خود اُس کے نام پر اُس نے پچاس ہزار روپے جمع کرادیئے تھے۔ بچّوں کے لئے الگ سے کافی رقم جمع تھی۔ گھر کے اِخراجات میں کوئی کمی نہ تھی۔ قانون گواہوں کے موجودگی میں اُنہیں سزا نہیں دے سکتا۔ سماج کو اُس کی دولت نے ڈرا رکھا تھا۔ لیکن خود اُس نے بھی تو کبھی اُس کی کھُلی مخالفت نہیں کی۔ کیوں؟ کیوں گھر کے تمام لوگ اُس کا دکھ اُسی کی طرح جھیل کر جی رہے ہیں؟ ارچنا یا راجیو کبھی اپنے پاپا کی شکایت نہیں کرتے۔ خاموش خاموش سے رہتے ہیں۔ کیا اُنہیں بھی اس کا علم ہے کہ ماں، پاپا کے بغیر اپنا مقام کبھی قبول نہیں کرسکے گی۔۔۔!

شاعر بمبئی

گھڑی میں تین بج رہے تھے۔ پانچ بجے وہ آنے والے ہیں۔ گیسٹ ہاؤس میں ٹھہریں گے۔ گھر شاید آئیں۔ اُسے کچھ جھرجھری سی محسوس ہوئی۔ رضائی پیروں پر ڈالی۔ جھرجھری میں اضافہ سا معلوم ہوا۔ رضائی اچھّی طرح لپیٹنے سے بھی گرمی نہیں آئی۔ آواز دیکر مہاراجن کو بُلایا۔ ایک بعد دوسری اور دوسری کے بعد تیسری رضائی ڈالی گئی، مگر کپکپی میں کوئی کمی نہیں آئی۔ ڈاکٹر آیا تو بخار ایک سو پانچ ڈگری ہوگیا تھا۔ راجیو، ارچنا، گوپو، دیپو، مہاراجن سب بے چین ہوگئے۔

اُسی وقت جیپ کے رُکنے کی آواز آئی مگر اُسے تنہا چھوڑکر کوئی کمرے سے باہر نہ نکلا۔ ملازم سے استفسار کرکے وہ واپس جیپ میں بیٹھ گئے۔ بیٹھتے بیٹھتے کُرتے کی جیب سے دستخط کیا ہوا ایک سادہ چیک ملازم کو دیکر بولے "راجیو کو دیدینا۔"

جیپ کے جانے کی آواز سُن کر وہ چونکی "تمہارے پاپا جارہے ہیں راجیو؟"

"پتہ نہیں جارہے ہوں گے۔ تم آرام سے پڑی رہو" راجیو نے حاکمانہ لہجے میں کہا۔

سب اُسے گھیرے کھڑے تھے۔ اُس سے الگ ہٹنے کی جیسے کسی میں ہمّت نہ تھی۔ بخار کم ہونے پر سب کا دھیان کچھ دوسری باتوں پر گیا۔ مہاراجن نے چائے لاکر سب کو دی اور سرہانے بیٹھ کر چمچے سے اُسے بھی پلانے لگی۔ اُس کی آنکھ میں شاید کچھ پڑگیا تھا۔ بار بار پلّو سے وہ اپنی آنکھوں کو رگڑ رہی تھی۔ رات وہ آرام سے سوئی لیکن نہ ارچنا سوئی اور نہ راجیو۔ مہاراجن تو پلنگ سے ٹیک ہوئی بیٹھی رہی۔

صحت یاب ہونے کے بعد اُسے پتہ چلا کہ راجیو کئی دِنوں سے کالج چھوڑ چکا ہے۔ اور کاشتکاری کے کام اور انتظامات نئے سِرے سے کررہا ہے۔

"یہ کیا کرڈالا تو نے راجیو!" اُس نے پوچھا

راجیو نے جواب میں وہی سادہ چیک نکالا۔ اور پھر اسکی طرف اشارہ کرتے ہوئے اُسے پھاڑ کر پھینکدیا۔ یکایک اُسے محسوس ہوا کہ وہ کینچُل کی مانند ہلکی ہوگئی ہے۔ اسکے اندر کی وہ چیز گویا ایک ہی جھٹکے میں شکستہ ہوکر گر پڑی تھی۔ جس پر اب تک شوہر کا پیار حاوی تھا۔ وہ کتنی بزدل تھی۔ راجیو جو کر رہا ہے، وہ بھی کرسکتی تھی، لیکن وہ عورت تھی!.... کمزور تھی!.... کہاں تھی؟ کچھ تو تھی جو بزدل بنی رہی، مگر اب وہ ٹوٹنے سے پہلے کی خوفناکی اور ٹوٹنے کے بعد کی ویرانی سے نجات پاچکی تھی۔

غزلیں

ساحلؔ سلطانپوری

(فیض احمد فیضؔ اور مجروح سلطانپوری کی زمین میں)

مقتل کی ہواؤں تو نم آمیز بہت ہے
رگ رگ میں مگر گردشِ خوں تیز بہت ہے

دامن میں سمیٹے ہوئے گزرو مہ و انجم
دشتِ شبِ ہجراں کی ہوا تیز بہت ہے

کیا چاک ہوئیں پھر گُل و لالہ کی قبائیں
دیوارِ چمن آج شفق ریز بہت ہے

باہوں میں پگھل جا کہ اِس رات کا جادو
چڑھتے ہوئے نشّے کی طرح تیز بہت ہے

ہاتھ آئے تو اک جرعۂ رطلِ گراں ہے
مائل ہو تو اک چشمِ کرم آمیز بہت ہے

یا دل کا لہو ہے یہ کفِ دستِ نگاریں
یا موسمِ گُل اب کے حنا بیز بہت ہے

یہ کون شرر ڈال گیا کاسۂ گُل میں
اتنا نہیں سوچا کہ ہوا تیز بہت ہے

روکے ہے قدم سایۂ دیوارِ عزیزاں
حالاں کہ رہِ شوق سفر خیز بہت ہے

دامن کشِ صد دل ہے سمندر کی خموشی
ساحلؔ کی ہوا بھی کشش انگیز بہت ہے

○ ۹-۵-۲۰۹، نام [illegible] سلطانپور
[illegible] (یو پی)

علی احمد جلیلیؔ

زخم کا رشتہ تبسّم سے ملا لیتے ہیں لوگ
بارِ غم کچھ اِس سلیقے سے اُٹھا لیتے ہیں لوگ

آج تیرے شہر میں قاتل کی ہے وہ آبرو!
دامنوں پر خون کے دھبّے لگا لیتے ہیں لوگ

لُطفِ گُل چینی سے کم پتھراؤ کی لذّت نہیں
پھول جب ملتے نہیں پتھر اُٹھا لیتے ہیں لوگ

ریزہ ریزہ ہو کے قدموں میں پڑی ہے زندگی
پھر بھی اِس کی خاک جھک جھک کر اُٹھا لیتے ہیں لوگ

آگ سے جو کھیلتے ہیں بات اُن کی چھوڑیئے
شبنم و گُل سے بھی ہاتھ اپنے جلا لیتے ہیں لوگ

کون کس کا درد بانٹے ہے علیؔ اِس دور میں
اپنی لاشیں اپنے ہی کاندھوں پہ اُٹھا لیتے ہیں لوگ

○ جبونا ؤن محبوب نگر (اے پی)

محبوب راہی

ہر لمحہ بدلتے چہروں کو کس طرح یہاں پہچانو گے
کتنوں کی نقابیں اُلٹو گے، کس کس کی حقیقت جانو گے

آنکھوں کے طلسمی آئینے ہر چیز اُجاگر کر دیں گے
وہ راز جو سینے میں ہوگا، وہ بات جو دل میں ٹھانو گے

ہر شخص لہو کا پیاسا ہے، ہر شخص لگے ہے فریادی
مظلوم کسے ٹھہراؤ گے، تم کس کو قاتل گردانو گے

تم عشق و وفا کے دیوانے تم ہوش و خرد سے بیگانے
دلبر کو ستمگر سمجھو گے، قاتل کو مسیحا مانو گے

حالات کی وُسعت تو تو گو ملبوس تنگ لگے ہے
رسموں کی پُرانی چادر کو اب اور کہاں تک تانو گے

اس اجنبیوں کی بستی میں کیوں اس اُس کا مُنہ تکتے ہو
تم اپنے آپ سے بیگانہ کیا اوروں کو پہچانو گے

بے ذوقِ نظر کیا پاؤ گے بے مول خزف ریزوں کے سوا
صحرا میں اُدھر کیلئے راہیؔ یوں خاک کہاں تک چھانو گے

○ نزد گھوڑا مسجد، بارسی ٹاکلی، ضلع آکولہ (ایم ایس)

کہانی

عورت

شہاب دائروی
دائرہ۔ بہار شریف (نالندہ)

ان ویلڈ ٹرونگ چیئر کو اپنے ہاتھوں کے اشارے پر گھماتی، ڈھلکتی ہوئی جب وہ کالج کے مغربی کنارے کے بنگلے کے احاطے سے گذر رہی تھی تو مشکِ عنبر کی خوشبوؤں سے رچی بسی اُس کی زلفوں کی لٹیں اُس کے چہرے کو چومنے کو جوں ہی جھکیں، اُس نے اپنے سر کو ہلکا سا جھٹکا دیا اور زلفوں کی شوخ لٹوں کے ساتھ جیسے ایک زمانہ سا اُلٹ گیا ——

کہرے میں ڈھکی، برف کی چوٹ سے کراہتی سسکتی ہوئی وہ بڑی سرد رات تھی، پام اسٹریٹ جہاں بھیگتی راتوں تک زندگیاں تھرکتی اور گاتی تھیں، برفیلی ہواؤں کے جان لیوا جھونکوں سے ویران پڑی تھیں، انسان بقائے حیات کی خاطر جسم کی رگوں کے خون کو منجمد نہ ہونے دینے کے عمل میں سرگرداں تھا —— ان ہی اذیت ناک لمحات میں ایڈنا کے گیسٹ ہاؤس کے ایک کمرے کی گھنٹی بج اُٹھی تھی ——

لحاف کے اندر وہ جھلا گئی تھیں، ایڈنا کافی کی چسکیاں لیتے ہوئے اُس کے کمرے میں آ کر گھنٹوں اُس سے باتیں کرتی تھی کبھی ہندوستان میں بڑھتے ہوئے ہنگامے اور لاقانونیت کی باتیں اور کبھی اُس دور کی باتیں جب برٹش سرکار کا ہندوستان پر تسلط تھا اور اُس کا باپ یہاں کے ایک صوبے کا اعلیٰ حاکم تھا۔ کیا بات تھی اُس وقت کے ہندوستان کی وہ بڑی شان سے کہتی تھی ——

سعدیہ نے دروازہ کھولتے ہوئے کہا تھا ——

"عجیب ہو تم، کیا تمہیں سردی کا احساس نہیں —؟"

"میں ایڈنا نہیں شہباز ہوں —" وہ سر جھکائے کھڑا تھا "اگر آپ کے پاس ماچس کی چند تیلیاں ہوں تو عنایت کیجئے، اس موسم میں باہر نکلنا محال ہے اور ایڈنا کے کمرے کی گھنٹی بجا بجا کر میں تھک گیا ہوں —"

وہ دبے پاؤں واپس ہوئی تھی، ریک سے ماچس اُٹھا کر اُس نے شہباز کو جا کر دے دیا تھا اور پھر دروازہ بند کر کے آ کر لحاف میں دبک گئی تھی، پچھلے ہی ہفتے شہباز اس گیسٹ ہاؤس میں آیا تھا۔ تین کمروں پر ایڈنا کا یہ گیسٹ ہاؤس شاید بھی مشتمل تھا —— درمیان میں ایک کشادہ ہال تھا اور اُس کے تین سمت تین کمرے، تینوں کمروں کا دروازہ ہال میں کھلتا تھا، اس لئے یہ ممکن نہ تھا کہ تینوں کمروں کے مکین ایک دوسرے سے واقف نہ ہوں۔ شہباز سر جھکا کر چلنے کا عادی تھا، اُس کی نگاہیں کبھی تصادم پر آمادہ نہ ہوئی تھیں، ورنہ عورت تو برف کی ایسی ڈلی ہوتی ہے جس کو مرد نگاہوں سے بھی چوس لیتا ہے۔

دروازے کی گھنٹی پھر بج اُٹھی تھی ——

اور اُس نے انتہائی کوفت کے احساس کے ساتھ جب دروازہ کھولا تھا تو شہباز چائے کی پیالی ہاتھ میں لئے کھڑا تھا ——

"میں احسان کا قرض اُتارنے کا قائل ہوں —— چائے کے یہ چند گھونٹ کڑی سردی میں سکون اور گرمی کا باعث ہوں گے —"

"خدا کے احسان کا بھی کیا آپ نے کبھی قرض اُتارا ہے —؟" وہ مسکرائی تھی۔

"ہزار جتن سے لگا ہوں، پتہ نہیں کہاں تک اپنے مقصد میں کامیاب ہو پایا ہوں۔ اگر آپ کے اپنے کچھ ذرائع ہوں تو معلوم کیجئے نا، عنایت ہوگی —"

اُس رات بات کی حد وہیں تک رہی تھی، لاجواب سی ہو کر اُس نے کواڑ بند کر لئے تھے۔ پھر کئی دنوں کے بعد جب ایڈنا نے ایک رات خاص ڈشوں کا اہتمام کیا تھا تو وہ تینوں ایک ٹیبل کے تین طرف جمع ہوئے تھے، ہوا کا دباؤ قدرے کم تھا اور سردی بھی ظالمانہ رُخ لئے ہوئے نہ تھی۔ ایڈنا چہکی تھی۔

"اس گیسٹ ہاؤس میں کبھی امریکن، کبھی جاپانی، کبھی فرانسیسی اور کبھی ڈچ رہے ہیں، کرایہ گرچہ مجھے زیادہ ملتا رہا لیکن میں اُن کی ننگی حرکتوں سے کبھی خوش نہیں رہی، تم دونوں سے پہلے دو ڈچ لڑکیاں تھیں، اُن کے جسموں میں پارہ بھرا ہوا تھا یا بجلی کی لہر دوڑتی تھی، یہ تو میں نہیں جانتی، لیکن وہ دونوں ان سرد راتوں میں بھی صرف نیکر اور انڈرویئر پہن کر رات گئے تک اسی ہال میں بیٹھ کر شراب پیتی تھیں اور اتنی تیز سیٹیاں بجاتی تھیں کہ توبہ —— میری آنکھوں میں آئی ہوئی نیند اُڑ جاتی تھی

اور اُن دونوں کے جاتے ہی میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اب میرے گیسٹ ہاؤس میں کوئی رہے گا تو وہ صرف ہندوستانی ہوگا۔"

"ہندوستانیوں کے متعلق اتنے اُونچے خیال کی کوئی وجہ تو ضرور ہوگی ایڈنا ___؟" شہباز نے پوچھا تھا ___

"یقیناً، میں ہندوستان میں پیدا ہوئی، وہیں پلی، وہیں جوان ہوئی اور وہیں بیوہ ہوئی۔ میرے ماں باپ میرے شوہر وہیں کی مٹی میں دفن ہیں۔ جب میں جوانی میں بیوہ ہو کر تنِ تنہا رہ گئی تھی، اُس وقت مجھے ہندوستانی تہذیب اور اس کی پاکیزگی کا احساس ہوا تھا۔ ہر پڑوسی نے مجھے بھائی اور باپ کے سے پیار کا سہارا دیا تھا۔ ہر عورت نے ماں اور بہن بن کر میرے درد کو بانٹا تھا، کیا یہ حقیقت بھلائی جاسکتی ہے شہباز ___؟"

"یہ تو ظرف کی بات ہے ایڈنا، دنیا میں ایسے لوگ بھی ہیں جن کی تجوریاں ہمارے سکوں سے بھری ہیں اور وہی آج یہ تصنیع کر رہے ہیں کہ کنگال ہو رہے ہیں ___"

"بڑی سیدھی اور دل میں اُتر جانے والی چوٹ کرتے ہو شہباز، لیکن میں سچائی کا بُرا نہیں مانتی، ہر ملک کے لیڈر اپنے اقتدار کی خاطر عقل دنگ رہ جانے والی گل فشانیاں کرتے ہیں اور وہی لیڈر عوام میں مقبول بھی ہوتے ہیں کیونکہ آج کا انسان دنیا کی تلخ حقیقتوں میں رہ کر بے کل کراہ رہا ہے ___ چاہتا ہے کہ اُس کی بے چین زندگی میں چند ایسے بھی دن آجائیں جن میں سکون اور آسودگی ہو اور ایسے دنوں کا سُنہرا خواب دکھا کر ہر ملک کا لیڈر اپنی کرسی پر چپک جانے کے جتن میں مصروف ہے۔"

"تم تو سیاست کی گندگی اُچھال کر بور کرنے لگی ہو ایڈنا۔" وہ بولی تھی اور اُسی وقت اُس کی نگاہوں نے بڑی رازداری سے پہلی بار شہباز کا بھرپور جائزہ لیا تھا ___ چھریرا دُبلا پتلا جسم، گول سا چہرہ جس پر قندیلوں کی طرح دو چمکتی ہوئی آنکھیں دماغ میں چھپی ذہانت کی غمازی کر رہی تھیں ___

"خیر چھوڑو اِن باتوں کو، یہ تو بتاؤ کہ تم دونوں ایک دوسرے سے پوری طرح واقف بھی ہو پائے ہو یا نہیں ___؟" ایڈنا نے ہنستے ہوئے کہا تھا۔ بڑی معنی خیز تھی اُس کی ہنسی، جیسے اُس کو حقیقت کا پورا پورا علم ہو اور جواب میں جب وہ دونوں خاموش رہے تھے تو ایڈنا پھر بولی تھی ___

"تم دونوں کی جگہ اگر کوئی یوروپین ہوتے تو اب تک ایک دوسرے کی باہوں میں نہ جانے کتنی بار جھول چکے ہوتے۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ اب تک تم دونوں ایک دوسرے کو شاید ٹھیک سے جانتے بھی نہ ہو گے۔ میں نے آج اِسی لئے تمہیں یکجا جمع کیا ہے تاکہ تم دونوں کو ایک دوسرے سے شناسا کر... متعارف کرادوں۔"

اُسی رات وہ جان پائی تھی کہ شہباز اِس بھری دنیا میں تن تنہا ہے۔ حکومت کے وظیفے پر وہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے لندن آیا ہوا ہے اور چند مہینے بعد وہ جرمنی جانے والا ہے۔

وہ چند مہینے اُس کی زندگی کے سب سے ہنگامہ خیز تھے، اِن مہینوں میں وہ اپنی ڈگر سے ہٹ کر شہباز کے قریب ہوئی تھی، کچھ سوچا تھا، کچھ فیصلہ کیا تھا اور اُس فیصلے پر عمل کرنے کے لئے راہیں ہموار کی تھیں، ایک ڈر تھا کہ کہیں والدین کا حکم اُس کے فیصلے کے درمیان حائل نہ ہو جائے، لیکن اُس کی بھابی نے ایک خط سے اُس کے والدین کی رضامندی کی مہر لگا کر اِس ڈر کو بھی اُس کے دل سے نکال دیا تھا ___

اور جس دن جب شہباز جرمنی گیا تھا تو پہلی بار اُس نے اپنی زندگی میں سُونا سُونا پن سا محسوس کیا تھا، وہ تصورات کے دھاگوں تانے بانے میں رات گئے تک اُلجھی رہی تھی، پھر وقت بھاگتا رہا تھا ___ وہ لندن میں رہ کر بھی شہباز کو اپنے خیالوں میں بسائے ہوئے تھی کہ ایک دن اُس کو جرمنی سے کیبل ملا تھا ___ وہ پاگل سی ہو گئی تھی ___ شہباز کار کے حادثے میں بُری طرح زخمی ہو کر ہسپتال میں تھا۔ رات کے پلین سے اُڑ کر جب وہ جرمنی پہنچی تھی تو شہباز ہسپتال میں موت اور حیات کے درمیان بے ہوش پڑا تھا ___ اور وہ رات بڑی کرب میں ڈوبی ہوئی رات تھی کیونکہ اُسی رات شہباز کی زندگی کی بقا کی خاطر ڈاکٹروں نے اُس سے اجازت لے کر اُس کا بایاں پاؤں ٹخنے سے نیچے کاٹ ڈالا تھا۔ وہ رات بھر سسکیاں لیتی اور روتی رہی تھی ___

موونگ چیئر کے پہیئے کے نیچے یکایک پتھر کا کوئی ٹکڑا آ گیا ___ ہلکا سا دھچکا لگا اور اُس نے چونک کر موونگ چیئر کو روک دیا۔ جُھک کر پتھر کا ٹکڑا ہٹایا اور پھر جب وہ اپنے ہاتھوں کے اشاروں پر موونگ چیئر کو گھماتی ہوئی آگے بڑھنے لگی تو اُس کے گالوں پر ڈھلکتے ہوئے آنسوؤں کے قطروں میں جیسے دو مرتبانہ سا بہنے لگا ___

ایک دن زخمی کے ہسپتال کے ایک کیبن میں اُس نے شہباز سے پوچھا تھا۔ "اب تو تمہارے پاؤں کا زخم بہت حد تک بھر چکا ہے پھر بھی تم اِس قدر بے چین سے کیوں رہتے ہو ___ اپاہج ہونے کے احساس کا گھاؤ جو دل میں لگا ہے وہ اتنا گہرا ہے سفینہ کہ میں ساری عمر اِس کی گہرائیوں سے نکل نہ پاؤں گا بار بار یہی سوچتا ہوں کہ میری زندگی میں جب عرفانہ میرے بچے ہوں گے تو میں

ان اندھیروں میں پہلے ہی ڈوب کر کیوں نہ گیا تھا ——"

"میرے متعلق تم کچھ نہیں سوچتے اب —؟" اُس نے پُوچھا تھا۔

"میں بہت کچھ سوچتا ہوں' سیتا اور مریم کی کہانی بچپن میں پڑھی تھی' تم اس جُگ کی نئی سیتا اور نئی مریم ہو' اگر تم نہ ہوتیں تو شاید آج میں اس غیر ملک کی مٹی میں کہیں دفن ہوتا ——"

"بہت خرافات تم بکنے لگے ہو' میں تمہاری بے چینی کا راز جانتی ہوں' تم سوچتے ہو کہ میرے دل میں تمہارا وہ مقام اب باقی نہ ہوگا جو اپاہج ہونے سے پہلے تھا —— اور یہی تمہاری بُھول ہے شہباز' تمہاری جگہ اگر میں اپاہج ہو جاتی تو کیا تم مجھے بُھلا دیتے —' اپنا فیصلہ بدل دیتے —؟ بولو جواب دو ——"

"یہ میں نہیں جانتا کہ تب کیا کرتا' پر یہ ضرور جانتا ہوں کہ اب مجھے کیا کرنا ہے۔ یہ سچ ہے کہ میں نے تمہیں اپنے دل کی تمام گہرائیوں سے چاہا تھا —' اب بھی چاہتا ہوں —' یہ بھی سچ ہے کہ تمہارے بغیر ساری عمر اپنی زندگی میں خلا محسوس کرتا رہوں گا' لیکن سونیہ محبت کے بھی کچھ اُصول ہوتے ہیں ——' خود غرضی کو محبت کا نام تو نہیں دیا جا سکتا اور اپاہج ہو کر تمہیں پانے کا خیال کرنا سراسر میری خود غرضی ہوگی۔"

"میں عورت ہوں شہباز' عورت کی زندگی میں جب کوئی مرد اُس کے خیالوں کے جھروکے سے داخل ہو کر دل کے آنگن میں اُتر آتا ہے' تو عورت پرستش کی حد تک اُس کو چاہنے لگتی ہے —— میں تمہیں اسی طرح چاہتی ہوں —' تم لاکھ چاہو کہ مجھ سے اپنا دامن چھڑا لو تو یہ میرے جیتے جی کبھی نہ ہو سکے گا شہباز ——'

اور اُس کی مستقل مزاجی کے آگے شہباز نے خود کو اُس کی رضا پر چھوڑ دیا تھا —— جرمنی کے قیام کے دوران وہ انتہائی لگن سے شہباز کی دیکھ بھال کرتی رہی تھی —' ہر وقت وہ اُس کے ہونٹوں پر خوشیوں کا طوفان لا کر اُس کے زخم خوردہ احساسات کے صحن میں نئے چراغ روشن کرتی رہتی تھی۔ رفتہ رفتہ شہباز بُھول گیا تھا کہ وہ اپاہج ہے —— جینے کی آرزو اُس کے مُردہ دل میں پھر انگڑائیاں لینے لگی تھی اور جب وہ شہباز کے ساتھ نئی اُمنگوں اور مستقل ارادہ کے ساتھ ہندوستان واپس ہوئی تھی تو جیسے طوفان سا اُمڈ پڑا تھا —— خاندان کا ہر فرد اُس کے فیصلے کے خلاف تھا —— ایک مُنہ اور ہزار باتیں تھیں —— کچھ طنز بھری باتیں —؛ کچھ زہر میں بُجھی باتیں —؛ پر کوئی بھی بات اُس کے دل کے تار کو چھُو کر اُس کے ارادوں کو بدل نہ سکی تھی۔ ایک رات تنہائی میں جب اُس کی ماں نے اُس کے سامنے زندگی کے اندھیروں کی طرف اُس کا خیال موڑا تھا تو اُس نے انتہائی سادگی سے کہا تھا ——

"ایک اپاہج انسان کا مر جانا کوئی تعجب کی بات نہیں —— تعجب کی بات تو یہ ہوگی کہ اُس کو زندگی کی تابناکیوں کے ساتھ زندہ رکھا جائے۔ اور اس عظیم کام میں اگر میں اپنی زندگی کے اندھیروں میں ڈوب بھی گئی تو بھی لوگ میرے نام کے ساتھ آپ کا نام بھی عقیدت اور احترام سے لیں گے۔ اگر میں نے شہباز کے دل میں جینے کی تڑپ پیدا کر کے اُس کا ساتھ چھوڑ دیا تو یقیناً وہ زیادہ دن تک جی نہ سکے گا' اُس کا خون میری گردن پر ہوگا —' میں اس جرم کے احساس کو زیادہ دن برداشت نہ کر پاؤں گی ماں ——"

اور اُس کی ماں خاموش ہو گئی تھی —' ارادہ مستحکم ہو تو انسان سمندر کی تہہ میں اُتر کر موتی پا لیتا ہے —' یہ تو بھی زندگی کی ایک بات تھی ——

"سونیہ ایک بات کہوں —" مُونگ پھر چلتے چلتے رُک گئی' وہ ماضی سے بھاگ کر حال میں پہنچ گئی ——

"کیا —— ؟ —"

"تمہارا رُوپ عورت کا صحیح رُوپ ہے سونیہ' اگر تم جیسی کچھ اور حیالی عورتیں اس دنیا میں جنم لیں تو مجھ جیسے کتنے ہی اپاہج انسان جینے کا سہارا پا کر زندگی کی رفعتوں کو چھُو لیں ——"

"گھبراؤ نہیں —' وقت ایک نہ ایک دن ایسی نئی دنیا کو جنم دے گا جہاں انسان انسان کا دُکھ بانٹنے لگا —' اپنے دردوں کو پہچاننے لگا —— ہم اُسی دنیا کے لیے راہیں ہموار کر رہے ہیں ——"

مُونگ پھر پھر چلنے لگی' پھولوں کی کیاریوں سے بھینی بھینی خوشبو اُڑ کر فضا میں خُمار اُنڈیلتی رہی اور سونیہ اور شہباز اپنے اپنے خیالوں کو اُن سے بساتے رہے۔

OO

زرِ سالانہ ختم ہونے کی اطلاع

اس حلقے میں سُرخ نشان کے معنے یہ ہیں کہ آپ کا سالِ خریداری مارچ ۱۹۸۰ء میں ختم ہو چکا ہے۔ از راہِ کرم سالِ رواں کے لئے مبلغ ۲۴ روپے جلد بھیج دیجئے۔ اُمید کہ آپ تجدیدِ خریداری سے ضرور نوازیں گے۔

اگر منی آرڈر نہ بھیج سکیں تو دفتر کو وی پی بھیج دینے کی ہدایت کریں۔ زرِ سالانہ وصول نہ ہونے کی صورت میں شاعر کی روانگی روک دی جائے گی۔

غزلیں

عابد مناوری

بخشے گئے ہیں جو تجھے کرب و عذاب لکھ
اپنا فسانہ اے دلِ پُر اضطراب لکھ

تیغِ جفا کو چوم کے کر خود کو سُرخ رو
اپنے لہو سے اپنی وفا کی کتاب لکھ

مغرب میں ڈوبتے ہوئے سورج پہ غور کر
دن کی شکست اور شفق کا عذاب لکھ

وہ شہر کا رئیس ہے کچھ تو ہو امتیاز
سب کو جناب اور اُسے عالی جناب لکھ

کیا جانے کب کہاں سے اُٹھے کوئی سر فروش
ہر سنگِ رہ گذار پہ تو انقلاب لکھ

عابد نہ کہہ سکے گا تو ہر بات روبرو
اُس کے سبھی سوالوں کا خط میں جواب لکھ

○ ۸/۱۶۱ گاندھی نگر - جموں

شاہد میر

خوف سے اب یوں نہ اپنے گھر کا دروازہ لگا
تیز ہیں کتنی ہوائیں یہ بھی اندازہ لگا

خشک تھا موسم مگر برسی گھٹا جب یاد کی
دل کا مرجھایا ہوا غنچہ تر و تازہ لگا

یہ سیاہی ورنہ بے نام و نشاں کر جائے گی
اپنے چہرے پر سنہری دھوپ کا غازہ لگا

جب مری جانب سے اُس نے اپنی نظریں پھیر لیں
ریزہ ریزہ منتشر خوابوں کا شیرازہ لگا

ان اندھیروں میں بھی اپنا مل ہی جائیگا کوئی
رات کے تنہا مسافر کوئی آوازہ لگا

○ لیکچرر شعبۂ اردو، گورنمنٹ کالج، بانسواڑہ (راجستھان)

وقار واثق

ہم خیال اپنا کوئی ڈھونڈ رہا ہے وہ تو
شہر میں رہ کے بھی تنہا ہی کھڑا ہے وہ تو

کر رہا ہے ابھی وہ تجزیۂ لفظ "انا"!
اپنی دانست میں خود اپنا خدا ہے وہ تو

اُسے آئینۂ مستقبلِ عالم نہ دکھاؤ،
قبر پہ ماضی کی سر گرمِ عزا ہے وہ تو

شعلے لپٹے ہوئے خود اس کے بدن سے ہیں بہت
آگ ہی آگ مگر مانگ رہا ہے وہ تو

بڑھ سکو گر تو بڑھو اُٹھتے دھوئیں کی حد تک
جل کے جو بجھ گیا ایک ایسا دیا ہے وہ تو

اُس کو مت ڈھونڈو، وہ اب ہاتھ نہیں آئیگا
دل کی گہرائیوں میں ڈوب گیا ہے وہ تو

اُس کی مجبوریاں پہلے کبھی ایسی تو نہ تھیں
دل کے ٹکڑوں کو بھی اب بھول گیا ہے وہ تو

دیکھنے کی نظر ایسے سہی، پھر بھی وقار
اپنے کاسے کو لیے ہی کھڑا ہے وہ تو

○ ۱۰۲۴ - رسول آباد سرساتی - خانعالم ۱۲۱۱

مقالہ

ذات کا سفر — ایک تجزیہ

اکنور سین
۴ ۷ ۱۰ ای ویسٹ پٹیل نگر۔ نئی دہلی

بالآخر وہ عرفانِ ذات اور کشفِ موجودات کی زہرناک منزل پر پہنچ گیا اور سچے شاعر نے اپنے خون کی نمکین چاشنی میں ڈوب کر اپنے ہونے کا مرثیہ "تنہا تنہا" گنگنایا اور نظم کردیا۔ اُسے دُہراتے ہوئے وہ اُن وجودات، تصورات، جذبات اور محسوسات کا سوچنے لگا جو صورت کا پیرہن اوڑھ کر اُس ہی کی طرح اپنے آپ کو منکشف کرنے کے لئے تڑپ رہے ہیں۔ وہ بھی کبھی عدمیت کی کوکھ سے باہر آئے، گرفتارِ جسم و جاں ہونے، جسدِ خاکی میں ڈھل کر ایک نام اختیار کرنے کے لئے کسمساتا تھا۔

مرا وجود بھی مبہم سا اک تصور تھا
میں کرچکا مگر الفاظ میں عیاں خود کو
یہ واقعہ بھی مری زندگی کا ضامن ہے
کہ دیکھتا ہوں گرفتارِ جسم و جاں خود کو

اُسے کیا معلوم تھا کہ نیستی سے ہستی میں آکر بے بنیاد سے بابنیاد، بے سمت سے باسمت، بے مقام سے بامقام، بے صورت سے باصورت اور بے نام سے بانام ہوکر وہ اپنی بے حقیقی کے المیہ کا شکار ہوجائے گا۔ قطرے کے کائنات جُزو کے کُل سے کٹتے اور اکائی سے ناطہ توڑتے ہی قطرے کے اندر پنہاں سمندر چیخنے چنگھاڑنے لگے گا، لمحے کے بطن میں سوئے ہوئے لامکاں کا اژدہا جبڑے کھول دے گا، اعداد کا آتش فشاں کھولتے لاوے کو اُگلتے ہوئے پروں اور درُّوں کی ہمکناری، ہم آہنگی اور ہم بستگی کو متزلزل کرکے رکھ دے گا اور وہ اُس کی آگہی اپنی تلملاہٹ کے اظہار کے لئے تیز گام ہوجائے گی۔

بیتی صدیاں گزرے موسم
میرے اندر شور مچاتے ہیں
جبتک میں اسیرِ حال نہ تھا
وہ دن مجھے اب یاد آتے ہیں

وہ دن جب وجودِ مطلق میں سمائے رہنے سے بیزار ہوکر ذات اظہار کے بدن، جمالِ معنی صورت کے لباس اور مہک رنگ کے ملبوس کی خواہش و جستجو میں تڑپا کرتے تھے اور اب — نفرت و محبت، نشاط و غم، سلبیت اور ایجابیت، سمت و بے سمتی، حد و بے حد، نیک و بد کے اختلاط بے وضاحت کی سفاکیت سے خون خون ہوئے اپنے مجموعی تاثر کی گم شدگی کا ماتم کررہے ہیں۔ یہ تجربہ ہے خود کو پہچاننے اور اپنے افہام و تفہیم و تخیل کو الفاظ و اسم کے وسیلے سے دوسروں پر آشکار کرنے کی تمنا کا:

بس ایک ارادہ اک خواہش
خواہش کہ میں ظاہر ہوجاؤں
کچھ کہہ کے پکارے کوئی مجھے
اک اسم بنوں، کچھ کہلاؤں

اظہار کی تڑپ کا گناہِ بے کراں سے جلاوطنی، لامحدود سے دلیش نکالے کا ناقابلِ تنسیخ حکم اور ذات و صفات اور احساسات کا آہنی طوق و سلاسل پہننے کا فرمان ہے:

اظہار کی خواہش نے مجھ کو
محدودِ صفات و ذات کیا
جذبات کی بیڑی پہنا کی
پابستۂ احساسات کیا

کہاں وہ وقت کہ وہ ارفع و اعلیٰ اور بلند و بالا تھا اور کہاں یہ حالت کہ فرشِ زمیں پہ گرا بے دست و پا ہوا، افلاک اور دھرتی کا نشانۂ جور و ستم بن گیا ہے، خلق کی نگاہوں میں اُس کے لئے سوائے نفرت اور حقارت کے کچھ نہیں۔ اب وہ جینے اور زندگی بھوگنے کی اذیت سہتا ہوا کراہتا ہے:

میں عرش نشیں تھا لیکن
خود فرشِ زمیں پر آن گرا

شاعر۔ مبلی

اُفتادِ بیت بڑی سخت تھی یہ
ہو کر بے حد پاسان گرا

قدرت کی آنکھوں میں سمائی اپنائیت کو سرد مہری اور غیض و غضب میں تبدیل ہوتا دیکھ کر وہ بلبلاتا ہے:

فطرت کی ستمگر آنکھوں میں
کچھ بھی تو نہ تھا نفرت کے سوا
اور میرے لئے کوئی کام نہیں
جینے کی کڑی محنت کے سوا

ابدیت سے کٹ کر ایک ذات میں سمٹ جانے کے بعد خود کو اُسی کا جزو بنانا سائنگانی یا حادثاتی عمل نہیں ہے۔ یہ الحمد سے لے کر یے تک کا سفر لا اختتام ہے۔ اُس کی اپنی روش اور رفتار ہے۔ یہ لاعلمی سے آگہی کے بیچ کا لا متناہی راستہ ہے۔ ان گنت ذشتوں والی یہ سیڑھی نہ فرش پر ٹکی کھڑی ہے نہ عرش سے لگی دکھائی دیتی ہے۔ پاتال سے نکلنے کی حرص ازلی اور ابدی قبر کی مانند اُسے محیط کر لیتی ہے وہ اُس میں پڑا کروٹ پر کروٹ بدلتا ہوا اپنے آپ کو ٹٹولتا ہوا گھٹتا رہتا ہے۔ اس کے وجود پر لپٹی کینچلی اُسے آنکھ نہیں کھولنے دیتی۔ وہ اُس نورِ لافانی کی جھلک دیکھنے کے لئے چلاتا ہے جس کی ایک کرن وہ خود بھی تھا۔ صدا صدا کان لگائے منتظر منتظر آنکھیں بچھائے منزل منزل قدم بڑھاتا ہوا وہ زمین کے ظلمت کدے سے انجم و مہتاب تک آتا جاتا ہے:

رہِ سفر میں جو بے رنگ مرحلے آئے
تو میں نے رنگ بھرے خواب دیکھنا سیکھا
نظر زمیں کے ظلمت کدے سے اُکتائی
تو سوئے انجم و مہتاب دیکھنا سیکھا

یہی خواہش اک شعور کے سے فرازِ فلک اور ستاروں سے بھی آگے جانے اور خلا تا خلا ان گنت عالم سر کرنے کے جذبہ و جنوں سے معمور کرتا رہتا ہے:

ازل سے تا بہ ابد ایسے ان گنت عالم
جو بے کراں ہیں، کہیں جن کا اَنت ہوتا ہی نہیں
خلا سے تا بہ خلا ایسی لاکھ دنیائیں
کہ جو حدودِ یقیں میں اب تک آ نہ سکیں

مگر اُس کی تشنگی نہیں جاتی۔ انجام المناک اور مُردہ فرما ہوتا ہے۔ حدود کو پھر سے لا محدود کرنے کی کوشش بار آور نہیں ہو پاتی:

کبھی کبھی مگر ایسا گمان گزرتا ہے
شاید یہی کوئی خلش ہے کہ جو مل کو ڈستی رہتی ہے

وہ اک صدا جو کبھی دور سے بلاتی تھی
قریب آ کے وہ اب جیسے مجھ سے کہتی ہے

تمہاری ذات کہ اب تک تمہارا زندان ہے حصارِ ذات سے باہر تمہارا کچھ بھی نہیں
عبث ہے دیدہ و دل کی یہ ہرزہ جولانی
یہ ذوقِ جیب، یہ شوقِ نظارہ کچھ بھی نہیں

قریب آ سا عقل و آگہی اور علم و تعقل اُس کے اندر سا گیا تھا کہ وہ گھٹتی ہوئی کرچیں جیسے محسوس کرتا ہوا وہ حبس و زنداں کی فضا میں اپنی شکست کی آواز کو سنتا ہے:

جو ذات مری پہچان بنی
وہ ذات مری زنجیر بھی تھی
تدبیر جو میں نے خود کی تھی
گویا وہ مری تقدیر بھی تھی

لیکن جس کُل سے وہ جُدا ہوا ہے اُس کا بے پناہ تحرک اُسے چین نہیں لینے دیتا۔ بار بار اُسے محدود میں بانٹ کر اپنی اوقات سے واقف کراتا ہے۔ وہ بار بار زعم ہو جاتا ہے کہ چاند، سورج، تارے اُس کی تخلیق کی دین ہیں۔ پھول کلیاں کانٹے اور دشت، دریا، ساحل اس کی تحریر و تصویر ہیں۔ انا، خود فہم اور خود تخلیقی کے چکر میں پڑا وہ خود فریبی میں مبتلا ہو جاتا ہے:

ہر آن میں بنجر دھرتی پر
اک فصل نئی بو دیتا ہوں
موسم کا رنگ بدلنے کو
ہنستا ہوں کبھی رو دیتا ہوں

تاریخ مری رودادِ سفر
ادوار مرے نقشِ کفِ پا
سالار ہوں یعنی صدیوں سے
میں قافلۂ روز و شب کا

مگر دوسرے ہی لمحے اُس کے پاپ کا ناگ اُسے ڈس لیتا ہے۔ اُس کا جُرم احساس اُسے بے سکت اور بے جان کر دیتا ہے۔ اپنے آپ میں خود تلاش کرنے کی جستجو تشنہ کامی اور نامرادی میں ختم ہوتی ہے۔ وہ اُس ارتقا سفر سے جو ذات کے حصار سے باہر نکلنے اور نجات حاصل کرنے کا وسیلہ سمجھتا تھا متنفر ہونے لگتا ہے۔ ذات کو ڈھونڈنے کی خواہش نے اُ

ذات کو اُتار پھینکنے کی استطاعت بخشنے کا یقین نہیں دلایا تھا۔ سفر کی شروعات کا مطلب سفر کا اختتام نہیں تھا۔ اس لئے صدیوں کا اجتہاد تالاب کے پانی کی اُن ترنگوں جیسا ہے جو چلتے ہوئے بھی ساکن رہتی ہیں۔ اُسے معلوم ہو جاتا ہے کہ کائنات اور لازمانیت کے سیاق و سباق میں سب کچھ ہوتے ہوئے بھی کچھ نہیں ہو رہا اور ہر عمل بے عمل حرکت ہے اور ہر حرکت جز کی ساکنیت سے زیادہ کچھ بھی نہیں۔ اب وہ یہ اُمید کیسے کرے کہ وہ جو سمے اور ستھان سے پرے کی وستو ہے جو اپنے آپ میں رمتا رہتا ہے، دہرتا رہتا ہے، بنتا اور مٹتا رہتا ہے، گھلتا اور منجمد ہوتا رہتا ہے، جو وراٹ ہے برہم ہے، سرو ویاپک، سو شکتی مان، سروگیہ ہے، اس سے ایک بار جدا ہو کر اس میں جا ملے گا۔ اننت اور اسیم، اب اُس کے بس کی بات نہیں ہے — شاید والی بات تو ہمیشہ رہے گی۔

اُترا تھا کبھی سمندروں میں
اب تاروں پہ پاؤں دھر رہا ہوں
اپنے سے نجات کی کوئی راہ
شاید میں تلاش کر رہا ہوں

محمود سعیدی کی یہ لمبی نظم بلاشبہ اُس کی شاعری کا معراج اور معیار ہے۔

اتنے وسیع کینوس کو اتنی سادگی اور معصومیت سے شعر کے احاطے میں سمانا محمود ہی کا کام ہے۔ ترسیل و ابلاغ کے مسئلے سے آزاد کم سے کم الفاظ میں رقم کی ہوئی ذات و کائنات کی یہ داستان اپنے تاثر میں بے مثال ہے۔ احساس، جذبات اور وجدان و اظہار کو گرفت میں لینے کے لئے شاعر نے دو الگ بحروں کا انتخاب کر کے ذات کے المیے کی سست روی اور ہیجانی کیفیت کو نظم میں دماغ کی سوچ اور دل کی دھڑکن کی طرح سمو دیا ہے۔ کہانی کو درمیان میں سے شروع کر کے اُس کے گرد آغاز اور انجام کا تانا بانا بُننا اتنا آسان کام نہیں۔ لیکن محمود سعیدی نے پوری فنی چابکدستی سے یہ مشکل مرحلہ آسانی سے طے کیا ہے۔ نظم کا اختتام قاری کو ایسی حالت میں چھوڑ دیتا ہے کہ وہ سب کچھ سمجھتے ہوئے بھی قوت قول و فعل، تفہیم و افہام، نقد و نظر سے منقطع ہوا نظر آتا ہے۔ نظم کا بند بہ بند بڑھنا پھیلنا اور ارتقائی منازل طے کرنا اُس کی فنی قدر و قیمت کا غماز ہے۔

○○

نوٹ:۔ ہندی اور سنسکرت کے الفاظ جان بوجھ کر استعمال کئے ہیں۔ اُن کے بغیر گمبھیرتا اور وشالتا کا آنا ممکن نہیں تھا۔

غزلیں

اختر آفاق

بھر دے گا کسی طور انہیں وقت کا مرہم
زخموں کی یہ سوزش یہ جلن کل نہ رہے گی

چھٹ جائے گی اک روز یہ اذہان کی گرمی
آنکھوں کی یہ سرخی یہ چبھن کل نہ رہے گی

پڑ جائیں گے خود سرد یہ تکرار کے شعلے
یہ گرمیِ گفتار و سخن کل نہ رہے گی

حالات کے ڈھلتے ہوئے سورج کی تپش سے
چہروں پہ ہے جو آج تھکن کل نہ رہے گی

مٹ جائے گی یہ کشمکشِ شیخ و برہمن
ساغر میں یہ صہبائے کہن کل نہ رہے گی

ابھرے گی نئی صبح نئی تازگی لے کر
یہ شب، یہ سیاہی، یہ گھٹن کل نہ رہے گی

چھا جائے ہر اک سمت نئے دور کا اختر
یہ رسم یہ رفتارِ کہن کل نہ رہے گی

○ [illegible]

طرب میرٹھی

ذہن میں تلخیٔ حالات بھری ہے یارو
میرے لہجے میں حلاوت کی کمی ہے یارو

ساتھ چلتے ہیں سمندر بھی ہمارے لیکن
تشنگی اپنی بجھے گی، نہ بجھی ہے یارو

کتنے بادل تھے کہ جو سایہ فگن ہوتے رہے
آج تک پھیلی ہوئی دھوپ وہی ہے یارو

کون پہچان میں آئے گا کہ ہر چہرے پر
اجنبیت کی یہاں گرد جمی ہے یارو

یوں تو ہنگامے جنم لیتے ہیں شہروں شہروں
زندگی آج بھی تنہا ہی کھڑی ہے یارو

دلِ حساس غم و درد اٹھا لیتا ہے
یہی نعمت ہے مگر قہر بھی یہی ہے یارو

حال کے ہیں نئے پہچان شبیہ محل
میرے ماضی کی وہی لاش پڑی ہے یارو

○ [illegible]

شاہ کوکب القادری

کون و مکاں ہمارے ہی زیرِ نگیں رہے
صدیوں سے برگزیدۂ عالم ہمیں رہے

برسوں رہے ہیں صاحبِ سیف و قلم ہمیں
کس دن ہمارے ہاتھ میں پرچم نہیں رہے

یہ گردشِ زمانہ مٹائے گی کیا ہمیں
ہم تو ہر ایک دور میں عہد آفریں رہے

نظارہ و نظر کا تعلق ہے دل کے ساتھ
دل ہو اگر جوان تو ہر شے حسیں رہے

تہذیبِ حسن و عشق کی قدریں بدل گئیں
اہلِ نظر رہے نہ وہ محمل نشیں رہے

معراجِ بندگی ہے یہ ذوقِ سجود کی
گر نقشِ پا کے ساتھ نشانِ جبیں رہے

کوکب ہیں کہکشاں پہ بھی ارضِ قمر پہ بھی
میرے نقوشِ پا کہیں مبہم نہیں رہے

○ [illegible]

جنگ

(اطالوی)

لوئیجی پیرانڈیلو

ترجمہ: حمید راحت

معرفت - سائبانارا۔ لیسٹو پُر مارکیٹ جمشید پور - ۱

رات کی ایکسپریس گاڑی سے جو مسافر رُدم سے آئے تھے اُنہیں صبح ہونے تک فیبریانو کے چھوٹے سے اسٹیشن پر رُکنا پڑا۔ کیونکہ وہاں سے اُنہیں پُرانی قسم کی چھوٹی سی لوکل ٹرین پکڑ کر سُلمونا جانا تھا۔

صبح ہونے پر دُھوئیں اور مسافروں سے بھرے ہوئے دوسرے درجے کے ایک ڈبے میں جس میں مسافروں نے ساری رات کاٹی تھی، ایک بھاری بھرکم سی بے حد اُداس عورت کو کسی نے دھکے دے کر اندر داخل کیا۔ جیسے بڑی سی گٹھری اندر پھینکی گئی ہو۔ اُس کے پیچھے سے مُنہ سے دُھواں چھوڑتا اور کراہتا ہوا ایک آدمی داخل ہوا۔ وہ اس عورت کا شوہر تھا۔ چھوٹے سے قد کا دُبلا پتلا سا کمزور آدمی، جس کے چہرے پر موت کی سفیدی چھائی ہوئی تھی، اُسکی آنکھیں چھوٹی چھوٹی اور چمکیلی تھیں، جس میں اُداسی اور بے چینی نظر آتی تھی آخر ایک جگہ بیٹھ جانے پر اُس نے ان مسافروں کا نہایت خندہ پیشانی سے شکریہ ادا کیا جنھوں نے اُس کی بیوی کو بیٹھنے کے لئے جگہ دی تھی۔ تب وہ اپنی بیوی کی جانب مُڑا اور اُس سے اُس کے کوٹ کا کالر نیچے کرتے ہوئے پُوچھا۔

ٹھیک سے ہو نا!

جواب دینے کی بجائے اُس کی بیوی نے، اپنے کوٹ کے کالر کو آنکھوں تک اُوپر اُٹھایا۔ جیسے وہ اپنا چہرہ چھُپانا چاہتی ہو۔

کیا مصیبت ہے۔ ؟ اُس کا شوہر اُداسی کے عالم میں مُسکراتے ہوئے بول پڑا۔ تب اُس نے اپنا یہ فرض سمجھا کہ مسافروں کو بتائے کہ اُسکی بیوی درحقیقت قابلِ رحم ہے کیونکہ جنگ نے اُس کا اکلوتا بیٹا چھین لیا ہے۔ اپنے اس بیس برس کے بیٹے کے لئے ان دونوں نے اپنی زندگی قربان کر دی تھی یہاں تک کہ اُنھوں نے اپنا گھر چھوڑ دیا تھا۔ اور اب اُس کے پیچھے رُدم جا رہے تھے، جہاں اُسے ایک طالب علم کی شکل میں رہنا تھا۔ اور پھر جنگ میں جانا تھا۔ اُسے یقین دلایا گیا تھا کہ کم سے کم چھ مہینے تک اُسے مورچے پر نہیں بھیجا جائے گا۔ لیکن اب اُسے اچانک تار ملا تھا جس میں اُسے تین دنوں میں ہی تیار ہو کر چلنے کے لئے لکھا گیا تھا اور اُن سے کہا گیا تھا کہ وہ اپنے بیٹے سے آ کر مل لیں۔

اسکی بیوی بے حد فکر مند تھی۔ اور کبھی کبھی فکر کے عالم میں کسی جنگلی جانور کی طرح کراہنے لگتی تھی۔ وہ یہ اچھی طرح جانتی تھی کہ اُس کے شوہر کی باتوں نے آس پاس بیٹھے مسافروں میں سے کسی کے دل میں بھی ہمدردی پیدا نہیں کی تھی۔ کیونکہ اُن میں سے زیادہ تر لوگوں کی ویسی ہی حالت تھی جیسی کہ خود اُن کی تھی۔ اُن میں سے ایک شخص جو بڑے غور سے اُس کے شوہر کی باتیں سُن رہا تھا، بولا تمہیں خدا کا شکریہ ادا کرنا چاہیئے کہ تمہارا بیٹا مورچے پر اب جا رہا ہے۔ میرا بیٹا لڑائی شروع ہونے کے دن ہی مورچے پر بھیج دیا گیا تھا۔ وہ دو بار زخمی ہو کر آ بھی چکا ہے اور اب پھر مورچے پر بھیج دیا گیا ہے۔"

"میرے دو بیٹے اور تین بھتیجے مورچے پر گئے ہوئے ہیں" ایک اور مسافر نے بتایا۔

'لیکن ہمارا تو اکلوتا بیٹا ہے۔ اُس عورت کے شوہر نے کہا۔

'اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ اکلوتا بیٹا زیادہ لاڈ پیار سے خراب بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن اگر تمہارے ایک سے زیادہ بیٹے ہوتے تو کیا تم اُنھیں پیار نہیں کرتے۔ یا پھر کم پیار کرتے۔ پیار روٹی کی طرح نہیں۔ جسکہ اُس کے ٹکڑے کر کے برابر برابر اپنی اولاد کے بیچ بانٹ دیا جائے۔ کوئی بھی باپ بغیر کسی بھید بھاؤ کے اپنا سارا پیار اپنے ہر ایک بچے کو دیتا ہے، چاہے اُسکے ایک بچہ ہو یا دس ہوں۔ اگر اس وقت مجھے اپنے دو بیٹوں کا دُکھ ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ میرا دُکھ تمہارے دُکھ سے آدھا ہے۔ بلکہ سچ پوچھو تو میرا دُکھ تمہارے دُکھ سے دوگنا ہے۔'

'ہاں ..... سچ کہتے ہو . . . .' اُس عورت کے شوہر نے آہ بھرتے ہوئے کہا۔

'لیکن مان لو کہ ایک باپ کے دو بیٹے ہیں جو مورچے پر گئے ہوئے ہیں اگر

ان میں سے ایک مارا جاتا ہے تب بھی ایک بچ جاتا ہے جسے دیکھ کر باپ کو کسی حد تک تسلی ہو سکتی ہے۔ جبکہ . . . . '

'ہاں' دوسرے نے کچھ خفگی سے کہا۔ ایک بیٹا اسے تسلی دینے کے لئے بچ جاتا ہے۔ لیکن ساتھ ہی اُس بیٹے کے لئے باپ کو زندہ بھی رہنا پڑے گا۔ اگر کسی باپ کا اکلوتا بیٹا مارا جائے تو بعد میں باپ بھی مر سکتا ہے اور اپنے غموں سے چھٹکارا پا سکتا ہے۔ دونوں میں سے کس باپ کی حالت بُری ہوگی، اِس کا تم اندازہ لگا سکتے ہو کہ میری حالت تم سے کتنی خراب ہے۔

'کیا بے وقوفی ہے،' ایک مسافر نے کہا جو بہت موٹا تھا۔ اُسکا چہرہ سُرخ تھا اور باہر نکلی ہوئی دُھندلی سی نیلی آنکھیں تھیں۔ وہ ہانپ رہا تھا۔ اُس کی پھولی ہوئی آنکھوں میں سے جیسے اُس کے دل کی کیفیت ظاہر ہو رہی تھی۔ شاید اُس کا کمزور جسم اُسے اپنے اندر سمو نہیں سکتا تھا۔ 'کیا بے وقوفی ہے' اُس نے پھر کہا۔ وہ ہاتھ سے اپنے مُنہ کو ڈھانکنے کی کوشش کر رہا تھا تاکہ اپنے دو ٹوٹے ہوئے دانتوں کو چھُپا سکے۔ اُس نے پھر کہا۔ کیا بے وقوفی ہے کیا ہم اپنے مطلب کے لئے ہی بچوں کو زندگی دیتے ہیں۔

دوسرے مسافروں نے ٹکٹکی بھری نظروں سے اُسے دیکھا۔ وہ مسافر جس کا بیٹا جنگ کے شروع ہوتے ہی مورچے پر بھیج دیا گیا تھا۔ آہ بھر کر بولا تم ٹھیک کہتے ہو۔ ہمارے بچے ہمارے بچے نہیں ہیں۔ وہ تو ہمارے ملک کے بچے ہیں۔ ملک کی امانت ہیں . . . . '

کیا بے وقوفی ہے۔ اپنے بچوں کی پیدائش کے وقت کیا ہم اپنے ملک کے بارے میں سوچتے ہیں۔ ہمارے بچے جنم لیتے ہیں کیونکہ ..... ہاں اس لئے کہ انہیں جنم لینا ہے اور جب وہ جنم لیتے ہیں تو ہماری زندگی اپنے ساتھ لے جاتے ہیں۔ اصلیت یہ ہے کہ ہم تو اپنے بچوں کے ہوتے ہیں، لیکن وہ ہمارے نہیں ہوتے اور جب وہ بیس سال کی عمر کے ہو جاتے ہیں تو بالکل ویسے لگتے ہیں جیسے ہم بیس سال کی عمر کے تھے۔ ہمارے بھی والدین تھے، لیکن ساتھ ہی اور بھی بہت سی چیزیں تھیں۔ لڑکیاں۔ سگریٹ۔ دلچسپیوں کے دوسرے بہت سے سامان۔ نئے نئے معاشقے اور ہمارا ملک۔ جس کے بلانے پر ہم کبھی چپ نہیں بیٹھ سکتے۔ ہاں اُس عمر میں جب ہم بیس سال کے تھے اگر ہمارے والدین ہمیں روکتے بھی تو ہم چپ نہیں بیٹھ سکتے تھے۔ اب اپنی اس عمر میں بھی ہمارا ملک سے پیار اُتنا ہی زیادہ ہے، اور وہ اُس پیار سے کہیں زیادہ گہرا ہے جو ہم اپنے بچوں سے کرتے ہیں۔ کیا ہم میں سے کوئی ایسا ہوگا جو مورچے پر خوشی سے اپنے بیٹے کی جگہ نہ لینا چاہے گا، بشرطیکہ وہ ایسا کر سکے۔ چاروں طرف خاموشی چھا گئی۔ ہر مسافر سر ہلاتا ہوا اُسکی باتوں کی تائید کر رہا تھا

اُس موٹے آدمی نے پھر کہنا شروع کیا، جب ہمارے بچے بیس سال کی عمر کے ہو جاتے ہیں تو ہم اُن کے خیالات کے بارے میں کیوں نہ سوچیں۔ کیا یہ قدرتی امر نہیں ہے کہ اپنی اس عمر میں وہ اپنے ملک کے بارے میں سوچیں، میں اچھے بچوں کی بات کر رہا ہوں۔ ہر کسی کو رونا بند کر دینا چاہیئے، ہر کسی کو خوش رہنا چاہیئے۔ یا کم از کم خدا کا شکر ادا کرنا چاہیئے، جیسے کہ میں کر رہا ہوں کیونکہ مجھ سے پہلے میرے بیٹے نے مجھے پیغام بھیجا تھا کہ وہ پورے اطمینان کے ساتھ مر رہا ہے۔ جیسا کہ اُس نے چاہا تھا۔ اِس لئے جیسا کہ آپ دیکھ رہے ہیں میرے چہرے پر اُداسی نہیں ہے۔'

'بالکل ٹھیک۔ بالکل ٹھیک' سبھوں نے اتفاق رائے کرتے ہوئے کہا۔ [illegible] وہ عورت جو ایک کونے میں گٹھری بنی بیٹھی تھی اور چپ چاپ ساری باتیں سُن رہی تھی وہ اپنے شوہر اور دوسرے لوگوں کی باتوں میں اپنے لئے [illegible] تلاش کر رہی تھی جس سے اُس کے غم کا بوجھ کچھ ہلکا ہو جاتا۔ یہ دیکھ کر کہ کوئی بھی اُس کے غم میں حصّہ نہیں بٹا رہا ہے، اُسکے غم نے اور شدت اختیار کر لی۔ لیکن اُس مسافر کی باتیں سُن کر اُسے تعجب ہوا اور وہ حیرت زدہ [illegible] اُسے اچانک محسوس ہوا کہ دراصل ان لوگوں کی کوئی غلطی نہیں ہے۔ حقیقت غلطی خود اُس کی اپنی ہے، کیونکہ وہ خود اُس کیفیت تک نہیں پہنچ سکی، جس کیفیت پر پہنچ کر دوسرے والدین بغیر روئے دھوئے اپنے بیٹوں کو جنگ ہی میں نہیں، موت کے مُنہ میں بھیج دیا کرتے ہیں۔

اُس نے اپنا سر اُوپر اُٹھایا۔ پھر وہ کچھ مُڑی اور بڑے غور سے موٹے آدمی کی باتیں سُننے لگی۔ جو بتا رہا تھا کہ اُس کا بیٹا کس طرح بہادری کی موت [illegible] اور کس طرح وہ اپنے بادشاہ اور اپنے ملک کے لئے شہید ہو گیا۔ اُس عورت کو یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ ہر مسافر اِس بہادر باپ کو مبارکباد دے رہا ہے۔ بڑے جوش و خروش سے اپنے بیٹے کی موت کے بارے میں بتا رہا تھا۔ تب اچانک اُس عورت نے بُوڑھے آدمی سے پوچھا۔ 'تو کیا تمہارا بیٹا واقعی مارا گیا ہے' ہر آدمی نے اُسکی جانب دیکھا۔ بُوڑھے آدمی نے بھی مُڑ کر اُسکی طرف دیکھا [illegible] وہ بڑی بڑی باہر نکلی ہوئی دُھندلی سی آنکھیں ایک ٹک اُسے دیکھنے لگیں۔ [illegible] جواب میں اُس نے کچھ کہنا چاہا لیکن اُس کے الفاظ جواب دے گئے۔ جیسے اس سوال کے بارے میں سوچتے ہوئے اچانک اُسے احساس ہوا اُس کا بیٹا سچ مچ مارا جا چکا ہے۔ یکایک اُس کا چہرہ سکڑ کر اور [illegible] شکل اختیار کر گیا۔ تب اُس نے جلدی سے اپنی جیب سے رومال نکالا اور [illegible] کر رونے لگا۔ اب مسافروں کے [illegible] رو رہا تھا۔

شاعر۔ بمبئی

مکتوبات

○ اُمید ہے کہ طالبِ خیریت کی طرح آپ بھی بخیر ہوں گے۔ دفتر کی بے تکی مصروفیات میں اس قدر مبتلا ہوں کہ آئینہ دیکھنے کی فرصت بھی نہیں مل رہی ہے۔ یہ نہ سمجھئے گا کہ ناشکرا ہوں۔ "شاعر" میں "گوشۂ عمیق" شائع کر کے آپ نے اُن محبّتوں اور شفقتوں کے سرمایہ دار ہونے کی یاد دلادی ہے جو آج سے بیس اکیس برس پہلے بمبئی میں آپ سے پہلی ملاقات نے پیدا کی تھیں اور جن کا ذکر "مسافر سفر میں ہے" میں آگیا تھا۔ گوشہ بڑے سلیقے سے شائع ہوا ہے۔ نہ جانے کہاں کہاں سے کرمفرماؤں کے محبّت نامے آرہے ہیں اور میں اِترایا اِترایا پھر رہا ہوں۔

میں سمجھتا ہوں کہ پروف بھی بہت غور سے دیکھے گئے ہیں کہ گوشے میں کتابت کی غلطیاں بہت کم ہیں لیکن جو ایک دو رہ گئی ہیں اُن کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے۔ پہلی تو شمیم حنفی صاحب کے مضمون کے عنوان کے رومن ہجّے کی غلطی ہے۔ ظاہر ہے کہ اُن کی نہیں کاتب کی غلطی ہے۔ NARCISSUS

صفحہ ۱۵ کے دوسرے کالم میں دوسرے سوال کے جواب کی تیسری سطر میں "بیج" (बीज) کا "رنج" ہوگیا ہے۔ ظاہر ہے کہ بات "نجی تجربے" کی چل رہی ہے۔ صفحہ ۱۷ کے دوسرے کالم کی آٹھویں سطر کا پہلا لفظ "تفریدی" ہے (ت ف ر ی د ی)

مجتبیٰ حسین کے خاکے کی بہت تعریف ہو چکی ہے اور پھر ہو رہی ہے۔ اُنھوں نے اِس بے بضاعت گوشہ نشین کو رُسوائے زمانہ کرنے میں جس محبّت، دوستی اور خلوص کے ساتھ ایمانداری کا ثبوت دیا ہے، اُس کی میں دل سے قدر کرتا ہوں اور اپنے آپ پر ہنسنے کا جو ایک موقع ملا ہے اُسے غنیمت جانتا ہوں۔ اُنھیں میں نے بتایا تھا کہ حیدرآباد سے واپسی میں سوٹ کیس کی چوری میں مسجد ترتیب والا مقالہ بھی چوری چلا گیا تھا۔ میں نے حیدرآباد سے لوٹتے ہی گھر پر رکھے ہوئے NOTES اور یادداشت کی مدد سے پورا مقالہ ازسرِ نو لکھا۔ خدا کا شکر ہے کہ کوئی نہ جان سکا کہ یہ وہ مقالہ نہیں جو سیمینار میں پڑھا گیا تھا۔ میں واقعی بہت خوش ہوں کہ میری ہنسی و تابندگی نے اتنے اچھے خاکے کے لکھنے پر مجتبیٰ حسین کو اُکسایا۔ وہ بہت خوب لکھتے ہیں اور اُن کی نگاہ سرجن کے نشتر کا کام کرتی ہے۔ اُن کی آنکھیں ایکس رے مشین ہیں۔ ایک بار پھر آپ کا بہت بہت شکریہ

عمیق حنفی

اُردو سروس۔ آل انڈیا ریڈیو۔ نئی دہلی ۱۰

○ "شاعر" کے تازہ شمارے میں "گوشۂ عمیق حنفی" دیکھ کر بے اختیار جی چاہا کہ آپ کو خط لکھا جائے۔ آپ جانتے ہیں کہ مجھے پڑھنے سے زیادہ لکھنے کا شوق ہے۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ اگر میں ایسی بیٹھی پڑھتا رہوں تو جو کچھ میں لکھتا ہوں وہ کس مُنہ سے لکھ پاؤں گا لیکن اِس عمیق کی کثرت رُکنیں کے مضمون نے تو جیسے بَجل کیا۔ بہت کوشش کی کہ نہ پڑھوں لیکن یہ مضمون تو بہت طاقتور مضمون نکلا۔ لیکن میرا خیال ہے کہ عمیق حنفی کی شاعری پر یہ چمکیلی قبائیں اپنی کشادگی کے باوجود تنگ نظر آئیں گی۔ اور یہ بھی کہ اُن کے تخیّل کو اتنا سیراب اور احساسِ جمال کو شاداب کیا ہے کہ ہے آپ نئی نئی سرزمینوں میں بھٹک کر بھی وہ شاعری کے پھول کھلانے کی قدرت رکھتے ہیں: — یہ چند جملے اور ایسے اور چند چاہے جملے میرے قول کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اِس تحریر کو میں شعر پارہ کہوں یا نثر پارہ — اِس پر مُستزاد مجتبیٰ حسین کا مزاحیہ۔ اِس مضمون کی تعریف میں ایسے لوگوں سے سُن چکا تھا جو ظرافت کو اجنبی نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ اِس مضمون میں مجتبیٰ نے حقِ ظرافت ادا کیا ہے۔ "شاعر" کے چار صفحوں پر پھیلا ہوا یہ مضمون مجتبیٰ حسین کی باریک بینی اور فنکاری کا بہترین نمونہ ہے۔ ایک غیر مزاحیہ شخصیت پر ایسا مزاحیہ لکھنا "الاؤ" پر ننگے پاؤں چلنے کے برابر ہے۔ انٹرویو اور شمیم حنفی کے مضمون نے بھی عمیق حنفی کو سمجھنے میں مدد کی۔ عمیق حنفی مشکل شاعر ہیں۔ لیکن گوشۂ عمیق حنفی نے اُنھیں آسان کر دیا۔ کاش کہ اِس گوشے میں آپ ایک معمولی مضمون بھی چھاپتے۔ مجھے آپ صرف فون کر دیتے تو میں ایسا مضمون آپ کو بھیج دیتا۔ آئندہ خیال رکھئے گا۔

"فرقہ واریت کے متضاد پہلو" پر حسین شاہین صاحب کا مضمون بہت اچھا ہے، لیکن اِس موضوع پر تو کتاب لکھی جا سکتی ہے۔ اتنے مختصر مضمون سے کیا ہوگا۔ اور پرنسپل لوگوں کو مختصر مضامین ہی لکھنے چاہئیں۔ آپ نے "جڑواں شماروں" کی رسم شروع کر دی ہے لیکن خیال رہے کہ یہ وقت واحد میں تین سے زیادہ نہ ہوں۔

یوسف ناظم

واک ۳۲ پی ۔ ڈبلیو ڈی کالونی (ویسٹ) بمبئی ۵۰

○ جنوری، فروری کا مشترک شمارہ خوب نکلا ہے۔ "گوشۂ عمیق حنفی" بہت پسند آیا۔ اِس سلسلے میں آپ نے جو کچھ بھی پیش کیا ہے انتہائی

ؔ شمیم حنفی نے اُسی طرح لکھا تھا جس طرح "شاعر" میں شائع ہوا ہے۔

شاعر ؔ

معلومات افزا اور وقیع ہے۔ لیکن اگر پورے شمارے (کم از کم جنوری کے شمارہ) کو تمیق حنفی کے لئے وقف کر دیا گیا ہوتا تو اس کی قدر و قیمت میں مزید اضافہ ہو جاتا۔ یعنی طرح ان کی شخصیت اور فن کی مزید عکاسی ہو جاتی۔ ہمارے یہاں یہ ایک روایت ہے کہ فنکار کی خوبیوں کو اُس کی موت کے بعد سراہا جاتا ہے۔ آپ نے اس روایت سے ایک مبارک بغاوت کا آغاز کیا ہے۔ خدا کرے کہ یہ رسم نہ صرف ہمیشہ جاری رہے بلکہ دیگر معاصرین بھی اسے اپنائیں۔

مقالات کا حصہ کافی معلومات افزا ہے۔ کہانیاں اچھی ہیں۔ آغا رشید مرزا کا افسانہ "آدم خود لسند آیا"۔ "وقت کا گھاٹا" میں نریندر سنگھ چابہ نے وقت کے خانوں میں بٹے ہوئے انسانوں کا بڑا تلخ تجربہ پیش کیا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اسے افسانہ کہا جائے یا نفسیاتی تجزیہ۔ شارق ادیب نے "چاندی کے تار" میں سماج کے رستے ہوئے ناسور پر بڑی چابکدستی سے نشتر زنی کی ہے۔ اگرچہ فی زمانہ اس ناسور کی ماہیت اور اسباب (Pathology و Aetiology) کافی بار آ چکی ہے، تاہم اس کی خوبیاں اپنی جگہ پھر بھی مسلم ہیں۔

پرویز یداللہ مہدی کا طنزیہ مضمون "بے لبی لبس کے انتظار میں" کافی دلچسپ ہے جس میں حقائق کی عکاسی بڑی خوبصورتی سے کی گئی ہے۔

نظموں اور غزلوں کا انتخاب بھی اچھا ہے۔ حسب ذیل فنکاروں نے خاص طور سے متاثر کیا:

حصہ غزل: ماہر القادری، ڈاکٹر عنوان چشتی، اقبال ماہر، محمود سعیدی، شفاعت ترنم، آنند بارہ بنکوی اور سلیم مالیگانوی۔

حصہ نظم: آمد سحر از مہدی پرتاب گڈھی۔ نئی روشنی از رفعت سروش — آدرشوں کے کھنڈر از اعجاز اعظمی۔ دستاویز از سید محمود نقوی۔

خدا کرے خاص نمبر جلد منصۂ شہود پر آئے۔ "شاعر" کے خاص نمبر اپنا جواب آپ ہوتے ہیں۔ خدا آپ کو عزم و حوصلہ کے ساتھ عمر دراز عطا فرمائے تاکہ زبان اور فن کی خدمت کا یہ پُر خلوص سلسلہ تا دیر جاری رہے۔ آج جس پُر آشوب دور سے "شاعر" گذر رہا ہے، اُس کے لئے واقعی زبانی ہمدردی سے زیادہ عملی ثبوت کی ضرورت ہے۔

شفقت اعظمی
اجمل خاں طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی علیگڈھ

○ "شاعر" کا جنوری فروری ۱۹۷۶ء کا مشترکہ شمارہ موصول ہوا۔ گوشۂ تمیق حنفی میں مجتبیٰ حسین کا خاکہ بے مثل ہے۔ مجتبیٰ حسین کا طرز نگارش مرزا فرحت اللہ بیگ مرحوم کی یاد دلاتا ہے۔ اُن کے فقرے بڑے لطیف شگفتہ اور جاندار ہوتے ہیں اور اُن کی نفسیاتی دُوربینی شخصیت کے بچھے نازک گوشوں کو بڑی بے ساختگی سے بے نقاب کر دیتی ہے۔ اس شمارے میں دوسرا قابل ذکر مقالہ "اقبال اور دانتے" ہے۔ رستوگی صاحب نے دانتے کے فکری عوامل کی نشاندہی بڑی خوبی سے کی ہے، تاہم اقبال اور دانتے کے مشترکہ فکری عناصر کی توضیح ہنوز تشنہ ہے۔ اس کے علاوہ موصوف کا یہ خیال بھی میرے نزدیک حقیقت سے دور ہے کہ اقبال کا رُومی کو اپنا مُرشد قرار دینا حافظ کے افکار کو مسترد کر دینے کے ردّ عمل کے طور پر تھا۔ یہ تو ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ افکار و خیالات کی ہم آہنگی کی بنا پر اُنھوں نے رُومی کو اپنا مُرشد منتخب کیا تھا۔ شمارہ نمبر ۲ میں عصمت جاوید کے مقالے میں اُسلوب کے تمام پہلوؤں پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے، انھوں نے جس محنت اور دقیقہ سنجی سے اس موضوع پر بحث کی ہے وہ قابل توصیف ہے۔

نامی انصاری
۹۶/۱ بریڈ۔ کانپور (یو۔پی)

○ "شاعر" کے گرانقدر شمارے موصول ہوئے۔ گوشۂ ابراہیم یوسف اور گوشۂ تمیق حنفی خوب ہیں۔ موخرالذکر میں شامل تحریریں جاندار ہیں۔ دو مختلف الخیال ناقدین (قمر رئیس اور شمیم حنفی) نے تمیق حنفی کی ادبی شخصیت کو اپنے اپنے انداز نظر سے پرکھا۔ یہ اور عجیب بات ہے کہ تمیق حنفی کی انفرادیت مجروح نہیں ہونے پائی ہے۔

سیماب اکاڈمی کی رپورٹ میں اخبارات میں پڑھ چکا تھا۔ اب "شاعر" کے ذریعہ تفصیلات معلوم ہوئیں۔

مختار شمیم
گورنمنٹ گرلس کالج۔ موتی تبیلا۔ اندور۔

○ "شاعر" کا تازہ شمارہ ملا۔ بے حد شکریہ

آپ "شاعر" کو خوب سے خوب تر بنانے کی جو حد درجہ کامیاب کوشش کر رہے ہیں، اُس کے لئے ہر لحاظ سے قابل مبارکباد ہیں۔ سوائے سرکاری رسالوں کے صرف "شاعر" ایسا رسالہ ہے جو بڑی پابندی کے ساتھ نکل رہا ہے۔ یہ بات بذات خود لائق تحسین ہے۔ آپ اُردو زبان اور ادب کی خدمت جس طرح انجام دے رہے ہیں اُس کی داد آنے والا زمانہ دے گا۔

"سیماب اکاڈمی" کے قیام اور "یوم سیماب" کی کامیابی پر مبارکباد قبول فرمائیے

(ڈاکٹر) یوسف سرمست
۷/۳ حیدرآباد۔ چندولال بیلا کالونی۔ F. S. B. 3

○ "شاعر" کا تازہ شمارہ (یعنی شمارہ نمبر ۱، ۲، ۱۹۷۶ء) نظر نواز ہوا۔

موجودہ دور کی اہم ادبی شخصیتوں کے جو مخصوص "گوشے" آپ "شاعر" میں شائع کر رہے ہیں وہ اس لحاظ سے بہت ہی مفید ثابت ہو رہے ہیں کہ مستقبل کے محققینِ ادب ان سے روشنی حاصل کریں گے کوئی کچھ بھی کہے حقیقت تو یہی ہے کہ اردو شخصیات سے متعلق تحریریں بہت ہی کم ہیں اور اس طرح "شاعر" کے یہ "گوشے" ایک بڑی کمی کو پورا کر رہے ہیں۔

زیرِ نظر شمارہ میں عمیق حنفی کے بارے میں جو مضامین شائع ہوئے ہیں وہ ہر اعتبار سے بھرپور ہیں۔ عمیق صاحب کی غیر مطبوعہ نظمیں بھی عمدہ ہیں۔ ان کے علاوہ دیگر نثری و شعری تخلیقات بھی معیاری ہیں۔ آغا رشید مرزا کی کہانی آدم خور اور ڈاکٹر تارا چرن رستوگی کا مقالہ اقبال اور دانتے خصوصیت کے ساتھ قابلِ تعریف ہیں۔ لیکن اختر سعید کی غزل "شاعر" میں دیکھ کر حیرت ہوئی کیونکہ یہ غزل تو کمیونسٹ پارٹی کے ہفتہ وار اخبار "حیات" میں شائع ہو چکی ہے۔ "شاعر" کا ہمیشہ سے یہ اصول رہا ہے کہ اس میں صرف غیر مطبوعہ تخلیقات ہی جگہ پاتی ہیں اور اس اصول کو توڑنے کا حق بڑے سے بڑے آدمی کو بھی نہیں ملنا چاہیئے۔

روشن محل۔ گاندھی نگر۔ بستی (یو۔ پی) — اختر بستوی

○ "شاعر" کا ۱۹۷۶ء کا شمارہ ایک اور دو پیشِ نظر ہے۔ اس وقت تک "گوشۂ عمیق حنفی" پڑھ کر ہوں۔ اس کے پڑھنے کے بعد کچھ تشنگی اور کمی کا احساس ہوا۔ عمیق حنفی کے ساتھ پورا انصاف نہ ہو سکا۔ ناصر الدین خاں کے مضمون "عمیق حنفی سے ایک ملاقات" کے علاوہ کوئی مضمون ایسا نہیں ہے جو عمیق کے فن اور ادبی فتوحات پر بھرپور روشنی ڈال سکے۔ ان کی کچھ نظموں کا انتخاب ضرور ہے لیکن ان کے تنقیدی مضامین کا نہ کوئی طویل اقتباس ہے اور نہ کوئی انتخاب۔ حالانکہ متعدد رسائل میں عمیق حنفی نے کئی اہم تنقیدی مقالات سپردِ قلم کئے ہیں۔ ان کا انتخاب ضروری تھا۔

آپ کے "نقد و نظر" کے کالم کے متعلق بھی مجھے کچھ کہنا ہے۔ ... پر تبصروں کی رفتار بہت سست ہے۔ اگر اس رفتار کا یہی عالم رہا تو مجھے ڈر ہے کہ مصنفین اپنی کتابیں تبصرے کے لئے "شاعر" میں بھیجنا بند کر دیں گے۔ بہرحال اس مسئلہ پر آپ کو غور کرنا ہے۔ تبصرہ کے لئے کتب موصولہ کی فہرست ہر ماہ کے شمارے میں باقاعدہ شائع ہونا چاہیئے۔ "رفتار" میں سیماب اکاڈمی کے افتتاح کا حال پڑھا۔ اس کی کمی ایک عرصہ سے محسوس کی جا رہی تھی۔ اب کہیں جا کر یہ کام ہو سکا ہے۔ "سیماب کی درسی کتابیں" ـــــ اس عنوان پر ایک مضمون لکھ رہا ہوں۔ "شاعر" کے لئے نہیں بلکہ ایک دوسرے رسالے کے لئے۔ ان کی ایک کتاب "ادبی موتی" آگرہ سے چار حصوں میں شائع ہوئی تھی جو کئی سال تک درجہ ۵ سے درجہ ۸ تک کے اردو نصاب میں شامل رہی۔ کتاب اس وقت میرے پاس نہیں ہے لیکن اس کے کئی مضامین اب بھی زبانی یاد ہیں کیونکہ میں نے کئی سال تک طلبہ کو یہ کتاب پڑھائی تھی۔

گلی وحید بخش محلہ سوتھہ۔ بدایوں۔ — مبشر علی صدیقی

○ "شاعر" کے "گوشۂ عمیق حنفی" میں مجتبیٰ حسین کا خاکہ "آدمی در آدمی" پڑھ کر ایک ایک جملہ پر بے ساختہ داد دی اور اسے بار بار پڑھا۔ اس خاکہ کے ذریعہ عمیق حنفی کی شاعری اور شخصیت کے بارے میں تو معلوم ہوتا ہی ہے بلکہ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مجتبیٰ حسین کا فن کس بلندی پر پہنچ گیا ہے۔ آپ نے یہ خاکہ شائع کر کے قارئین پر احسان کیا ہے۔ ویسے اس خاکہ میں ایک بات قابلِ غور ہے وہ یہ کہ پورے خاکہ میں عمیق حنفی کی مالی پریشانیوں اور قرض دار ہونے کا ذکر بار بار کیا گیا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاید عمیق صاحب نے مجتبیٰ حسین سے سب سے زیادہ قرض لیا ہے۔

ڈاکٹر عنوان چشتی کی غزل کچھ دن پہلے ہی "نیا دور" کے تازہ ترین شمارے میں دیکھ چکا ہوں اور مجھے یاد پڑتا ہے کہ اس سے پہلے بھی اسی غزل کو کسی اور رسالے میں دیکھا تھا۔ بہرحال جب یہ غزل پہلی بار دیکھی تھی تو اچھی لگی تھی۔

۱۷۶۸ حوض سوئیوالان۔ دہلی ۶ — اعظم عباس شکیل

○ بہت بیتابیوں کے بعد "شاعر" کا شمارہ ۱-۲ منظرِ عام پر آیا۔ عمیق حنفی سے متعلق تمام مضامین اچھے ہیں۔ خاص کر ناصر الدین خاں کا "عمیق حنفی سے انٹرویو" بہت ہی پُر مغز ہے۔ اس لئے کہ یہ پڑھنے والے کو عمیق حنفی کے بارے میں بہت ساری معلومات فراہم کرتا ہے۔ کہانیوں میں آغا رشید مرزا، زیندر سنگھ بھاٹیا، شارق ادیب کی کہانیاں قابلِ ذکر ہیں۔ آغا رشید مرزا کی کہانی موجودہ دور پر کڑی چوٹ ہے۔ سرمایہ دارانہ طبقہ پر کاری ضرب لگاتا ہے۔ اس کو پڑھ کر آدمی تلملا اٹھتا ہے۔ اس کہانی کو موجودہ عہد کا آئینہ کہنا بیجا نہ ہوگا۔ ٹھیک اسی طرح کہانی "وقت کا گانا" ہے۔ اس میں بھی موجودہ دور کے کرب کا احساس ہوتا ہے۔ کہانی "دو بیوائیں" بہت ...

(بقیہ صفحہ ۴۶ پر دیکھئے)

نقد و نظر

تبصرے کے لئے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں!

○ طنزیہ ڈرامے
○ ابراہیم یوسف
○ صفحات: ۲۲۸ ـــــ آٹھ روپے
○ ملنے کا پتا: نسیم بک ڈپو، لاٹوش روڈ، لکھنؤ

اُردو میں ڈراما نگار کی حیثیت سے ابراہیم یوسف کا نام ایک مستقل حوالے کی سی اہمیت اختیار کر چکا ہے۔ جہاں یک بابی ڈرامے کا ذکر آئے گا، ابراہیم یوسف کا نام بھی ضرور لیا جائے گا۔ ابراہیم یوسف تقریباً تیس سال سے ڈرامے لکھ رہے ہیں۔ یہ مدت اتنی طویل ہے کہ اِس دوران ایک نسل جوان ہو کر قدیم روایات کی تاریخ بننے لگ جاتی ہے۔ چونکہ اُردو میں ڈراما مقبول نہیں رہا ہے، نہ تو پڑھنے والوں میں اور نہ لکھنے والوں میں، اِس لئے اِس کے تیور بھی کچھ زیادہ نہیں بدل سکے ہیں۔ لیکن جو کچھ تبدیلی اِس میں آئی ہے اُس کے لانے میں ابراہیم یوسف کا بھی ہات رہا ہے، اِس کے باوجود وہ روایتی انداز سے اپنا دامن نہیں چھڑا سکے ہیں۔ اب یہی دیکھئے کہ "طنزیہ ڈرامے" کے اکثر ڈراموں میں طنز کا نشانہ اُس جنسی بے راہ روی کو بنایا گیا ہے جو اُونچے طبقے کے سفید پوشوں، افسروں اور ڈاکٹروں میں پائی جاتی ہے۔ کبھی ترقی پسندوں کا اندازِ فکر تھا کہ وہ مزدوروں کی جنسی بے راہ روی کو ضرورت اور دوسرے طبقوں کی جنسی بے راہ روی کو آوارگی و عیاشی کہتے تھے۔ ابراہیم کے ہاں بھی اِسی اندازِ فکر کا اثر ملتا ہے۔

ابراہیم یوسف کا خیال ہے کہ ڈرامے کے لئے "موضوع ایسا ہونا چاہیئے جس میں شدید کشمکش اور تصادم کے زیادہ سے زیادہ مواقع ہوں۔" اور جنسی تعلقات میں بے وفائی و بے راہ روی اور محبت میں ناکامی سے زیادہ کون سا موضوع یہ کشمکش پیدا کر سکتا ہے؟ غالباً یہی وجہ ہے کہ "طنزیہ ڈرامے" کے اکثر ڈراموں میں یہی دو پہلو نمایاں ملتے ہیں۔ حیوان۔ شاہدہ، وہ ایک نرس تھی، جمہوریت کے ابلیس، مقابلے اور فیصلے، چھے سال بعد۔ اِن ڈراموں میں جنس اور محبت ہی کا سنگم نظر آتا ہے۔ کہیں ایک کا پلّہ بھاری ہے تو کہیں دوسرے کا۔ اور ایسا ہونا تعجب خیز بھی نہیں، آخر دونوں ایک ہی سکّے کے دو رُخ ہیں۔

"طنزیہ ڈرامے" میں تکنیک کی جدت طرازیاں تو نہیں ہیں، لیکن کوئی تمثیل ڈراما کی تاثر کے اعتبار سے کم نہیں ہے۔ البتہ اگر کسی کو موضوع اور تکنیک پیش کش سے اتفاق نہ ہو تو بعض تمثیلیں اپنا بھرپور تاثر نہیں چھوڑ پائیں گی۔ طباعت غنیمت ہے لیکن ہارڈ بورڈ کی بے توجہی پر طبیعت کڑھتی ہے۔

(یونس اگاسکر)

○ صفر (افسانے)
○ کلام حیدری
○ ضخامت: ۱۷۶ صفحات۔ قیمت: دس روپے
○ ملنے کا پتا: کلچرل اکیڈمی، رینا ہاؤس، جگ جیون روڈ، گیا

پیشِ لفظ یا دیباچے سے عاری کتاب دیکھ کر خوشی ہوتی ہے کہ مصنف نے پڑھنے والوں پر اور اپنی ذات پر اعتماد کا ثبوت دیا ہے۔ ہمارے ہاں ایسی تحریریں "شکریوں" سے اِس قدر گراں بار ہوتی ہیں کہ خیال گزرتا ہے، لگے ہاتھوں قارئین کا بھی شکریہ ادا کر دیا جاتا تو اچھا تھا، جو کتاب کو پڑھنے کی زحمت اُٹھانے والے ہیں۔

کلام حیدری کے افسانوں کا مجموعہ "صفر" اِس اعتبار سے تو الگ ہے ہی کہ اِس میں صرف افسانوں کا انتخاب ہے اور بس ـــــ ساتھ ہی اِس لحاظ سے بھی جداگانہ ہے کہ اِن افسانوں میں آورد کی وہ کیفیت کہیں نہیں ہے، جس کا عام طور پر جدید افسانہ شکار ہوتا ہے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ کلام حیدری کے ہاں مواد اور تکنیک کے نت نئے تجربے نہیں ملتے۔ اُنھوں نے انسانی تجربات کی دنیا سے کچھ حادثات و سانحات چُن کر اپنے تخیّل کی رنگ آمیزی سے اُنھیں افسانوں میں ڈھال دیا ہے۔ زندگی کا ہر حادثہ کسی نہ کسی جذبے کو جگاتا اور یاد کے دیپ جلاتا گزر جاتا ہے۔ کلام حیدری کے افسانے ایسے ہی جذبات اور ایسی ہی یادوں کے افسانے ہیں جنھیں ہم اپنے مصروف لمحات میں بھی پڑھ سکتے ہیں۔ کیوں کہ ان کی غارت گری ہر وقت اور ہر دور میں یکساں رہتی ہے۔ "صفر" کے افسانوں میں عنایا، تاریخ کا ٹکڑا، کس کی کہانی، زندانی، اسیر اور حادثہ ایسی کہانیاں ہیں جو ہمارے دور کے المیوں پر مبنی ہیں۔ یہ المیے انفرادی بھی ہیں اور اجتماعی بھی، قومی بھی ہیں اور بین الاقوامی بھی۔ اِن سے انسان کو مفر نہیں کیوں کہ المیہ انسان کا مقدر ہے اور "صفر" اِس کی تفسیروں کا ایک چھوٹا سا مجموعہ جس کا ہر افسانہ تیر کے نشتروں کی سی نشتریت لئے ہوئے ہے۔

کتاب کا ظاہری حُسن اور سرورق دلکش ہے۔

(یونس اگاسکر)

- ادب میں ابہام اور اس کے مسائل
- ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید
- صفحات: ۳۲۲ ۔ قیمت: ۱۲ روپے
- ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے جن میں

سے ایک مضمون کے عنوان کو کتاب کا عنوان بنا لیا گیا ہے۔ زیادہ تر مضامین شخصیات اور فن پر ہیں۔ مثلاً سردار جعفری کی شاعری' خورشید احمد جامی اور عصری آگہی' مصحفی کا عصری شعور' انیس اور عصرِ حاضر' احتشام حسین کا تنقیدی رویہ وغیرہ۔ ابتدائی تین مضامین ایسے ہیں جن میں فن کے نظریاتی پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے پہلا مضمون "ہیئت" اس اعتبار سے دلچسپ ہے کہ اس میں مغربی و مشرقی ادب کے حوالوں سے ہیئت کی اہمیت اور دلکشی کو واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے خصوصاً ہیئت کی قسموں کی تقسیم جو کینتھ بروک سے مستعار ہے غالباً اردو میں پہلی مرتبہ پیش کی گئی ہے۔ کاش یہ مضمون طویل اور مفصل ہوتا۔

ادب میں ابہام کے بغیر حسن کاری نامکمل ہوتی ہے، ابہام کے بغیر محض الفاظ کے شکوہ اور زبان و بیان کی چمک دمک سے فن پارہ اس عورت کی طرح ہے جس نے بڑے بھونڈے پن سے میک اپ کر رکھا ہو۔ ابہام نثر سے زیادہ شعر میں موزوں ہوتا ہے لیکن ہر مبہم شعر بہ جائے خود حسین و معنی خیز نہیں ہوتا۔ مثلاً ناسخ کا یہ شعر

ٹوٹی دریا کی کلائی زلف الجھی بام میں
مورچہ مخمل میں دیکھا' آدمی بادام میں

ظاہر ہے کہ یہ شعر مہمل ہے اور مہمل ہی کہا گیا ہے۔ ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید نے اس شعر کو زیرِ بحث لا کر اس کا سلسلہ حلقۂ اربابِ ذوق کی شاعری سے جوڑا ہے۔ اور "جدیدیت پسندوں" کو بھی اس میں لپیٹ لیا ہے۔ ہمیں یہ پیوند کاری کچھ مناسب نہیں معلوم ہوتی۔ ویسے دل کو خوش رکھنے کو یہ بات کافی ہے کہ ڈاکٹر صاحب ــ "کہہ گئے تم کنایے میں کیا کیا" کے قائل ہیں

انگریزی مطالعے کو اردو ادب پر منطبق کرنا آسان نہیں ہوتا۔ مصنف اس فن سے بھی واقف ہے۔ "امیجزم ایک تحریک" اسی کوشش کا خوشگوار نتیجہ ہے۔ اردو میں مزاح نگاروں سے متعلق تنقیدی و تاریخی مواد الیابِ نظر نہیں ہے اس لحاظ سے "ساتویں دہائی کا طنز و مزاح" مطالعے کی چیز ہے

ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید کی وسعت علمی کا ثبوت ان کے دو مضامین "بشیر النساء بیگم بشیر کی شاعری" اور میر محبوب علی خاں آصف" ہیں جو صنف سے بہت نے والے محقق کو کھوج کو پہنچاتا ہے۔ غرض سترہ مضامین پر مشتمل اس مجموعے کے مضامین ایک باشعور محقق اور فراخ دل نقاد کی کاوشوں کے متوازن نمونے ہیں۔ ان مضامین میں پیش کردہ خیالات و نظریات اور نثری اسلوب کہیں کہیں اختلاف کی گنجائش کے باوجود ان کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا

کتابت و طباعت اچھی ہے۔

(یونس اگاسکر)

- ایک معلم کی خود گزشت
- مصنف: مبشر علی صدیقی
- قیمت چھ روپے۔ صفحات ۱۴۳
- ملنے کا پتہ: مصنف' گلی وحید بخش۔ محلہ سوتھ۔ بدایوں

پروفیسر مبشر علی صدیقی بنیادی طور پر ادیب ہیں اور پیشہ کے اعتبار سے ۴۰ سال معلم رہے ہیں۔ ڈبل ایم۔ اے اور بی ایڈ ہونے کے علاوہ انھوں نے وہ تمام تعلیمی تجربات حاصل کیے جو ان کے دور میں ضروری تھے۔ ان کی زندگی کا بڑا حصہ گورنمنٹ ٹریننگ اسکولوں اور کالجوں میں گذرا' جہاں انھوں نے درس و تدریس کے سلسلے میں ذاتی تجربے بھی کئے۔ آخری دور میں کئی گورنمنٹ کالجوں کے وائس پرنسپل اور پرنسپل بنائے گئے۔ یو۔پی کے متعدد شہروں جھانسی' آگرہ' مرادآباد' بیسلپور (پیلی بھیت) لکھیم پوری' للت پور' نجیب آباد اور بریلی میں بسلسلۂ ملازمت رہے۔ ایک طرف گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا' تو دوسری طرف مختلف مزاجوں کے طلباء اور استادوں سے سابقہ پڑا اور تاریخ پڑھانے پر ید طولیٰ حاصل کیا کہ خود ادیب تھے۔ اردو ادب اور شاعری کے رسیا' اپنا ایک الگ مزاج۔ "ایک معلم کی سرگذشت" میں ان کے اپنے مزاج' تجربات' تدریس کے اصولوں اور معلمی کے خلوص کی نمایاں تصویریں ملتی ہیں۔

اردو کے کسی معلم نے اپنی خود گذشت نہیں لکھی۔ شاید اس لئے کہ ان کے یہاں معلم کی زندگی کا وہ پھیلاؤ نہیں رہا جو مبشر علی صدیقی کی زندگی میں رہا ہے۔ انھوں نے ہر تعلیمی ادارہ کے مشاغل میں گہری دلچسپی لی۔ ہیڈ ماسٹر کلاس کی ٹیمیں باہر لے کر گئے۔ شاندار سالانہ مشاعرے اور منطقائی مباحثے کرائے کالج میگزین کے اردو حصے کے نگراں رہے۔ پرنسپل ہونے کے بعد ضلع بریلی' ڈسٹرکٹ ریلی اور ریجنل ریلی کے سکریٹری رہے۔ فرسٹ ایڈ اور ہوم گارڈ کلاس کے مقابلے کرائے۔ میک اپ کوشش کا حصہ لیا اور جو مختلف

(باقی صفحہ ۱۰۲ پر دیکھئے)

رفتار

(علمی ادبی اور تہذیبی خبریں)

مہاراشٹر کے اُردو اسکولوں کی رپورٹ پیش کر دی گئی

بمبئی ۔ ۹ ؍مئی ۷۶ء کو سردار جعفری چیئرمین اُردو اسکول تحقیقاتی کمیٹی اور ڈپٹی اسپیکر جناب فاروق پاشا نے اپنی عبوری رپورٹ وزیر اعلیٰ شری ایس. بی چوان کو سیکریٹریٹ میں پیش کر دی۔ اس موقع پر وزیر تعلیم شریمتی پربھا راؤ اور وزیر محصول و شہری ترقیات جناب ڈاکٹر رفیق زکریا بھی موجود تھے۔

آندھرا میں سرکاری بورڈوں پر تلگو کے ساتھ اُردو بھی

حیدرآباد ۔ ۱۱ ؍مئی : حکومت آندھرا پردیش نے آج احکامات جاری کئے ہیں جن میں تمام سرکاری محکموں کو ہدایت دی گئی ہے کہ وہ سائن بورڈس (ناموں کی تختیاں) تیلگو کے ساتھ اُردو میں بھی لگائیں۔ انجمن ترقی اُردو کے آرگنائزنگ سکریٹری سری نیواس لاہوٹی نے بتایا کہ انجمن کی جانب سے نمائندگی کے بعد حکومت آندھرا پردیش نے یہ احکامات جاری کئے ہیں۔

تعلیم و تربیت قومی کمیٹی کی طرف سے گیارہ کتابوں کو انعامات

نئی دہلی ۔ ۱۵ ؍مئی : یہاں ایک سرکاری اخباری بیان میں بتایا گیا ہے کہ تعلیمی تحقیقی و تربیت کی قومی کونسل نے اس سال قومی ایوارڈ کے لئے گیارہ کتابوں کو منتخب کیا گیا ہے۔ ان میں آسامی، بنگالی، انگریزی، ہندی، مراٹھی، تلگو، سندھی اور اُردو زبان کی کتابیں شامل ہیں۔

اُردو کی جس کتاب پر انعام دیا گیا ہے وہ "پودوں اور جانوروں کی ریت" نامی کتاب ہے۔ جس کے مصنف اطہر پرویز ہیں۔

اتر پردیش اُردو اکاڈمی کی طرف سے ایک لاکھ کے انعامات

پروفیسر آل احمد سرور اور اختر انصاری کو خصوصی انعامات

لکھنؤ : اتر پردیش اُردو اکاڈمی نے ۱۹۷۵ء کی مطبوعہ کتابوں اور ممتاز مصنفین کو ایک لاکھ روپے کے انعامات دیئے ہیں۔ پانچ پانچ ہزار روپے کے خصوصی انعامات پروفیسر آل احمد سرور اور اختر انصاری کو اُردو زبان کے لئے اُن کی مجموعی ادبی خدمات کے اعتراف کے طور دیئے جانے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ چھ کتابوں پر تین تین ہزار روپے سات کتابوں پر دو دو ہزار روپے۔ تیرہ کتابوں پر ڈیڑھ ڈیڑھ ہزار روپے۔ انیس کتابوں پر ایک ایک ہزار روپیہ اور ۱۳ کتابوں پر پانچ پانچ سو روپے کے انعامات دیئے گئے ہیں۔

ماہنامہ "کتاب نما" دہلی کا مولانا شہاب مالیرکوٹلوی نمبر

مکتبہ جامعہ سے مولانا ہر محمد خاں شہاب مالیرکوٹلوی کے دیرینہ تعلقات کی بنا پر اُن کی علمی ادبی اور سماجی خدمات کے اعتراف میں ہم چاہتے ہیں کہ "کتاب نما" کا ایک نمبر مرحوم سے مختص کر کے اُنھیں خراجِ عقیدت پیش کریں۔

اس سلسلے میں مولانا مرحوم کے احباب اور واقف کار حضرات سے درخواست ہے کہ مرحوم کے علمی ادبی اور اخلاقی اوصاف پر اپنے تاثرات جلد ایڈیٹر کتاب نما۔ جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵ کو ارسال کر کے ہمیں اپنے ادارے کی علمی تکمیل کا موقع دیں۔ (ادارہ "کتاب نما" دہلی)

بقیہ : مکتوبات صفحہ ۶۳

۱۲ ۔۔۔ انداز میں پیش کی گئی ہے جسے پڑھ کر خوشی محسوس ہوتی ہے۔

شعری حصّہ بھی اچھا ہے۔ ماہر القادری کا یہ شعر بہت ہی اچھا ہے

حسن کو خود بھی محبت کی طلب ہے ماہرؔ
ہر تماشے کو ضرورت ہے تماشائی کی

۱۱ کوٹو ٹولہ اسٹریٹ۔ کلکتہ   رشید پردیسی (ایم۔ اے)

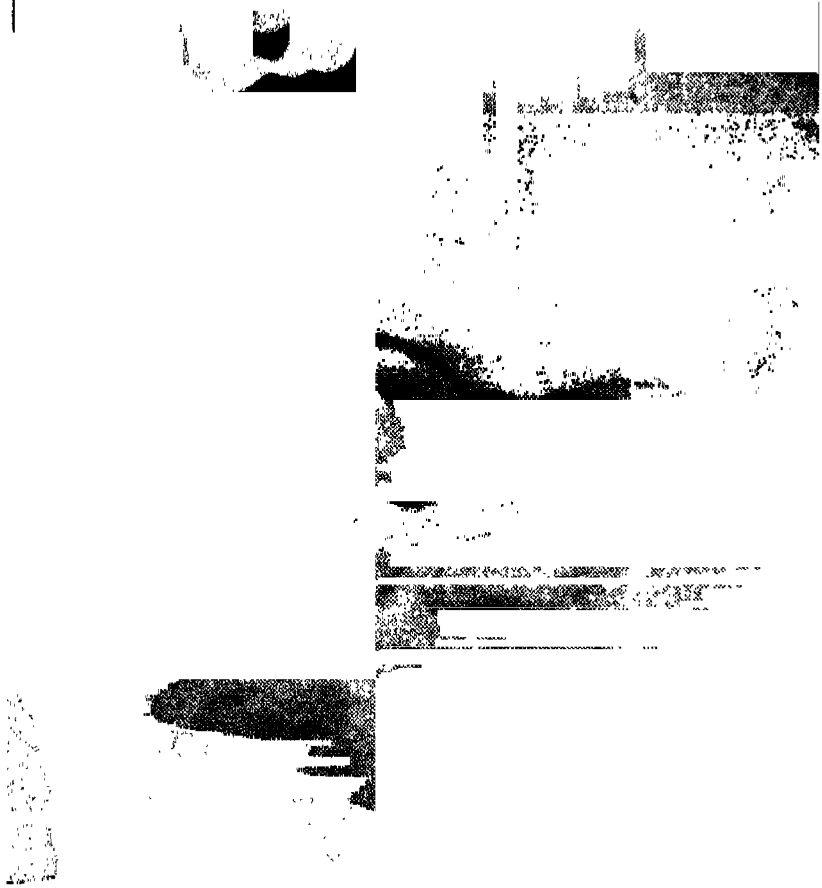
بقیہ : نقد و نظر صفحہ ۶۵

تعلیمی منصوبے بنے اُن میں بھرپور حصّہ لیا۔ طریقۂ تعلیم کے متعلق سیمینار منعقد کرائے۔ غرض اپنی تدریسی سرگرمیوں سے محکمۂ تعلیم، دیگر اساتذہ اور اہلِ علم کو کافی متاثر کیا۔

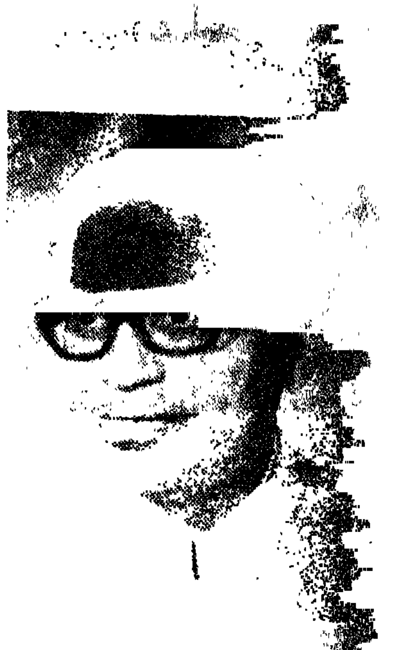
جہاں اس کتاب میں تعلیم کے بنیادی اُصولوں کی جھلکیاں جا بجا نظر آتی ہیں، وہیں بے حد دلچسپ واقعات سے بھی قاری کو گذرنا پڑتا ہے۔ اس میں ادب اور شاعری، مشاعروں اور شاعروں کے تعلق سے بھی بڑی دلچسپ باتیں قلم بند کی گئی ہیں۔ انٹرمیڈیٹ کالج جھانسی کا ۳۱ جنوری ۴۶ء کا مشاعرہ۔ مبشر علی صدیقی کا آگرہ کے گورنمنٹ ٹریننگ کالج میں آنا۔ قصر الادب، "شاعر" اور مدیر شاعر سے قربت۔ قصر الادب آگرہ میں روزانہ کی نشست۔ ۱۹۵۹ء میں مراد آباد کالج کا کوی سمیلن اور مشاعرہ۔ تدریس کے دوران شعر و ادب کے مباحث وغیرہ وغیرہ مصنف کی سرگذشت کے یادگار حصّے ہیں۔

مبشر علی صدیقی جس طرح ہلکے پھلکے مگر کام کے مضامین لکھتے ہیں اسی طرح اُن کی یہ کتاب "ایک معلّم کی سرگذشت" بھی ہے۔ ان کا پیرایۂ بیان کافی دلچسپ اور سادہ ہے۔ یہ ایک معلّم ہی کی نہیں بلکہ ایک ادیب کی سرگذشت ہے۔ ایسا ادیب جو عام قاری اور طالب علم کی نفسیات سے واقف ہے اور اس سے پہلے آٹھ کتابیں اُردو کو دے چکا ہے۔ (ا۔ م۔)

نشر و پبلشر مالک: احمد اصدیقی نے یونیورسل فائن آرٹ لیتھو پریس - ۲۳ ۔ نور و ستمی اسٹریٹ ٹھاکر دوار بمبئی ۲ میں چھپوا کر دفتر سے شائع کیا۔

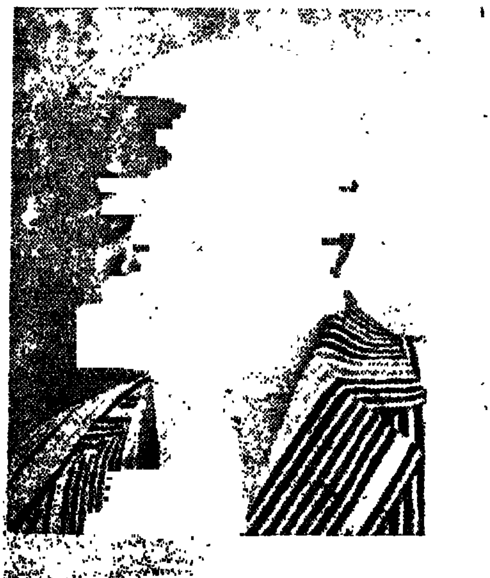






آنند نرائن ملاؔ

عزّت مآب ڈاکٹر رفیق زکریا





نوشاد علی

جاری شدہ

بانی علامہ سیماب اکبرآبادی (مرحوم)

اردو کا سینتالیس سالہ علمی ادبی اور تہذیبی ماہنامہ

شاعر
بمبئی

مدیر اعلیٰ
اعجاز صدیقی

مدیر معاون
یونس اگاسکر

ادارۂ مشاورت
کرشن چندر
ڈاکٹر محمد حسن
ڈاکٹر ظ۔ انصاری
آغا رشید مرزا

جلد ۴۷
شمارہ ۴-۵
۱۹۷۶ء

فی پرچہ
دو روپے پچیس پیسے

فون نمبر
۳۵۹۹۰۴

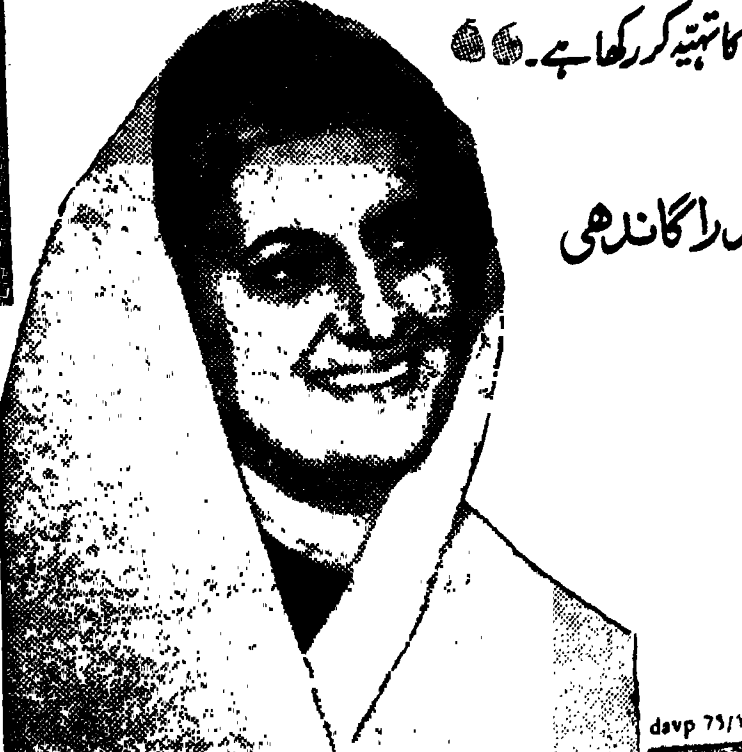
منتظم
ناظر نعمان صدیقی

ترسیل زر کا پتہ
ماہنامہ "شاعر" قصر الادب ۔ بمبئی ۴۰۰۰۰۸
خط و کتابت کا پتہ
ماہنامہ شاعر، مکتبہ قصر الادب
پوسٹ بکس نمبر ۲۵۲۶ بمبئی ۴۰۰۰۰۸

بدل اشتراک
زر سالانہ ــــ ۱۲ ــــ روپے
معاونین سے ــــ ۵۰ ــــ روپے
تاحیات خریداری ــــ ۲۵۰ ــــ روپے
ممالک غیر سے ــــ ۳۰ ــــ شلنگ

اگر کنبہ چھوٹا ہو تو والدین ہر بچّے پر زیادہ توجّہ دے سکتے ہیں اور اسے زندگی کی زیادہ سہولتیں مہیا کر سکتے ہیں۔ اس سے ملک کو بھی بحیثیت مجموعی اپنے وسائل کے بہتر استعمال کا موقع ملتا ہے۔

فیملی پلاننگ ہماری قومی ترقی کے پروگرام کا ایک لازمی جزو ہے اور ہم نے اسے عملی جامہ پہنانے کے لئے اپنے تمام ذرائع کو بروئے کار لانے کا تہیّہ کر رکھا ہے۔



اندرا گاندھی

davp 73/196

ترتیب

بیادِ علامہ سیماب اکبرآبادی

مقالات

کہانیاں

نظمیں

غزلیں

نقوش

سرپرست: علامہ سیماب اکبرآبادی

سرورق دوم صفحہ: ڈاکٹر رفیق زکریا ۔ آنند نرائن مُلّا

نوشاد علی ۔ محمد رفیع

اندرونی صفحات: افتتاح سیماب اکاڈمی

(۱) صدر و مقررین ڈائس پر ایک منظر

(۲) نمائشِ مخطوطات و مطبوعاتِ سیماب

(۳) سامعین افتتاحی جلسہ

یومِ سیماب (شبِ غزل)

(۱) اعجاز صدیقی ۔ محمد رفیع ۔ نوشاد علی ۔ احمد سعید ملیح آبادی

(۲) سامعین شبِ غزل

(۳) گلوکار شبِ غزل ۔ محمد رفیع ۔ راجندر مہتا ۔ نینا مہتا ۔ بیگم

پسِ ورق تیسرا صفحہ: عہدیدارانِ سیماب اکاڈمی

(۱) کرشن چندر ۔ سید محمد زیدی ۔ داؤد غلطہ

مقررین: مولانا اعجاز صدیقی ۔ ڈاکٹر اشفاق احمد فخر ۔ آنند نرائن مُلّا

ڈاکٹر ظ ۔ انصاری

شاعر

جُرعات

اُردو کی عہد ساز اور جلیل القدر شخصیتوں میں ایک شخصیت علامہ سیماب اکبر آبادی کی بھی ہے۔ خوشی کی بات ہے کہ سیماب کے علمی، ادبی اور شعری کارناموں کو از سرِ نو منظرِ عام پر لانے، اُن کی درجہ بندی کرنے اور تنقید و تحقیق کے ذریعہ نظم و نثرِ سیماب کے محاسن کو اُجاگر کرنے کا رجحان پیدا ہوا ہے۔ بمبئی میں سیماب اکاڈمی کا قیام اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ اکاڈمی، سیماب کے بکھرے ہوئے بے اندازہ علمی، ادبی اور شعری کارناموں کی تنظیم و ترتیب کیلئے کوشش کرے گی۔ لیکن بڑی ذمہ داری ہندوستان اور پاکستان کے اہلِ علم کی ہے۔ اُن جامعات کی ہے جن میں اُردو کی اعلیٰ تعلیم ہوتی ہے اور اُن اربابِ قلم کی بھی، جن کی فکر و نظر اُردو ادب کے دامن کو تنقید و تحقیق کے شہ پاروں سے بھرتی رہتی ہے۔ سیماب پر کام کرنے اور اُن کی ہمہ گیر شخصیت پر سے پردے اُٹھانے کی بڑی گنجائش ہے اور ضرورت بھی۔ وہ تنقید و تحقیق کا مستقل موضوع بن سکتے ہیں۔

"شاعر" کے اس شمارہ میں سیماب اکاڈمی کی افتتاحی تقریب اور یومِ سیماب کے سلسلے کا وہ تمام مواد پیش کیا جا رہا ہے جو بہ کوشش فراہم کیا جا سکا۔ اُمید کہ ادارہ "شاعر" کی اس کوشش کو سراہا جائے گا اور سیماب اکاڈمی بمبئی سے درمے، درمے اور قلمے تعاون کیا جائیگا۔

شاعر کا آئندہ شمارہ ایک اور مشترک شمارہ ہوگا۔ تاکہ جولائی تک کا حساب بیباق ہو جائے۔ اگست سے ہر ماہ مقررہ حجم کا شمارہ قارئین کو ملا کرے گا، جس پر مہینہ بھی درج ہوگا۔ اور اِن مشترک شماروں میں بھی زیادہ حجم کے ہیں، پھر بھی رہی سہی کمی اُس خاص نمبر سے پوری کر دی جائیگی جس کیلئے ادارہ "شاعر" آٹھ ماہ سے کوشاں ہے۔ یہ خاص نمبر "ہم عصر اُردو ادب نمبر" ہوگا۔ اس اہم نمبر کے آٹھوں ابواب کیلئے تازہ مضامین بطورِ خاص لکھوائے گئے ہیں۔ جلد ہی خاص نمبر کی کتابت کا کام شروع ہو جائے گا۔

"شاعر" کے اقتصادی بحران میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی ہے۔ ہر طرح کی کوششیں اور درخواستیں کر لی گئیں۔ برسوں سے ادبی ماہناموں کے سلسلے میں یہ بے توجہی افسوسناک رہی ہے اور اب تو ماتم کرنے کی حد تک بڑھ گئی ہے۔

اِس شمارے میں بیادِ سیماب کے باب نے اتنے زیادہ صفحات لے لئے ہیں کہ اعلان کردہ نظم و نثر تخلیقات میں یوسف ناظم کے طنزیئے، رشید عبدالسمیع جلیل اور انجم جمالی کی نظموں کو روکنا پڑا ہے۔ "قصہ نظر" اور دوسرے کتابت شدہ مستقل ابواب بھی شامل نہ ہو سکے۔ "مکتوبات" کے لئے آئے ہوئے کئی ضروری خطوط بھی رہ گئے ہیں۔ ہم اسکے لئے قارئین و قلمکار دونوں سے معذرت خواہ ہیں۔

پچھلے شمارے کے "مکتوبات" صفحہ ۹ پر حقی حنفی نے اپنے خط میں شمیم حنفی صاحب کے مضمون کی سُرخی NARCISSUS کے رومن ہجوں کی جس غلطی کی نشان دہی کی تھی اُس کا تعلق شمیم حنفی صاحب سے نہیں ہے بلکہ وہ کاتب کی غلطی ہے۔

صفحہ ۴۰ پر رحمٰن جامی کی نظم کی سُرخی "آبرو لُٹانے کی" بجائے کچھ سے کچھ کر دی گئی۔ صفحہ ۷۵ پر ایک نظم کی سرگزشت کے تیسرے سطر دسّ بر اعتبار تاریخ پڑھانے میں ید طولیٰ حاصل کیا۔ "میں" کی جگہ "تیر" کتابت کی غلطی ہے۔ یہ غلطیاں درست کر لی جائیں۔ (ادارہ)

شاعر کا آئندہ شمارہ

جون - جولائی ۷۶ (دو گنے حجم کا)

گوشۂ صالحہ عابد حسین

صالحہ عابد حسین کا رٹونسٹ کی نظریں	اسمٰعیل چلاّئی
صالحہ عابد حسین (خاکہ)	صُغرا مہدی
صالحہ عابد حسین سے ایک ملاقات	ڈاکٹر عنوان چشتی
صالحہ عابد حسین کی ادبی کاوشیں	ڈاکٹر کبیر احمد جائسی
عذرا سے اُلجھی ڈور تک	ڈاکٹر زرینہ ثانی
یہ جو تھا...... تھا (کہانی)	صالحہ عابد حسین
جاگے پتّیاں پرتیں (کہانی)	صالحہ عابد حسین

مقالات

کرشن چندر اور نسوانی کردار	پروفیسر غیاث اقبال
"ڈیوائن کمیڈی" - ماخذ اور موضوع	اُمّ ہانی اشرف (علیگ)
شاعر کا تخلیقی عمل	عزت محمد خاں

کہانیاں

برگِ آوارہ	م - ق - خاں
نجات دہندہ - (ایچ ایچ منرو)	ترجمہ: بدر الحسن
ماڈل (پی - بی شُبّا راما)	ترجمہ: محمد خلیل الدین
ایک دھنک - (شُو ریج بالا)	ترجمہ: جاوید اقبال

طنز و مزاح

زردہ افسانہ کہ آشفتہ بیانی مانگے	یوسف ناظم

رپورتاژ

"وہ شخص کیا ہوا جو تری داستاں کا تھا"	آذر بارہ بنکوی

تاریخ

پُرانے سکّے	غلام ربانی

منظومات

رفعت دکنی - سیم آر بیرتی - راحت قاضی - ظہیر غازی پوری - نثار پرویز - مختار شمیم - خالد شفائی - فکری بدایونی - ذکی نگار - دانش گوہر - احتشام شام - روحی گیاوی - تنہا تماپوری - ڈاکٹر بزاز بی - منّا ظلّ عاشقی - رشید عبدالسمیع جلیل - انجم جمالی

سیماب اکاڈمی

بیادِ

علامہ سیماب اکبرآبادی

اِفتتاحی تقریب سیماب اکاڈمی

یومِ سیماب



مُحبّت میں اک ایسا وقت بھی آتا ہے اِنساں پر
سِتاروں کی چمک سے چوٹ لگتی ہے رگِ جاں پر
سیماب

مختصر سوانح

سیماب اکبرآبادی

علامہ سیماب اکبرآبادی ۱۸۸۰ء میں اکبرآباد (آگرہ) میں پیدا ہوئے۔ اُن کے والد مولانا محمد حسین عربی اور فارسی کے فاضل تھے، انھیں مذہب اور دینیات سے گہرا لگاؤ تھا۔ وہ چار مذہبی کتابوں کے مصنف بھی تھے۔ اجمیر ہی میں سیماب نے عربی اور فارسی کی اعلیٰ تعلیم جید عالموں سے حاصل کی۔ گورنمنٹ کالج اجمیر میں انگریزی کی تعلیم پائی۔ ایف اے تک پہنچے تھے کہ ۲۵ سال کی عمر میں اُن کے والد کا انتقال ہوگیا اور خانگی ذمہ داریوں سے مجبور ہوکر سیماب کو کانپور کی ایک فیکٹری میں ملازمت اختیار کرنا پڑی۔ آخری ملازمت ریلوے کی تھی، مگر ۱۹۲۲ء میں اُسے بھی ترک کرکے مستقلاً اپنے وطن آگرہ میں سکونت پذیر ہوگئے۔ یہاں قصرالادب کی بنیاد ڈالی۔ ۱۹۲۳ء میں ایک ترقی پسند ماہانہ رسالہ "پیمانہ" نکالا۔ ۱۹۲۹ء میں ہفتہ وار اخبار "تاج" اور ۱۹۳۰ء میں رسالہ "شاعر" جاری کیا۔ آخری عمر تک اُن کا شغل شعر و ادب ہی رہا۔ ۳۱ جنوری ۱۹۵۱ء کو ۷۱ سال کی عمر میں وفات پائی۔

گورا چٹّا رنگ، بھرا بھرا جسم، میانہ قد، نہایت پرکشش غلافی آنکھیں، چوڑی پیشانی، چال میں وقار۔ گفتگو میں ٹھہراؤ۔ عالمانہ لہجہ، نہایت شفیق، خدا ترس اور رقیق القلب، کم سخن، چہرہ پُررعب دار، بے حد خوش عقیدہ۔ اپنے مذہب میں راسخ العقیدہ ہونے کے باوجود دوسرے مذاہب کا پورا پورا احترام کرتے تھے۔ جہاں "یوم النبیؐ" اور "یوم حسینؓ" شاندار پیمانے پر مناتے تھے، وہیں ہولی، دیوالی اور بسنت کے پروگراموں میں بھی نہایت جوش دلی سے حصہ لیتے تھے۔ جہاں انھوں نے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر متعدد نظمیں اور نعتیں لکھیں، وہیں شری کرشن جی، مہاتما بدھ اور گرو نانک پر بھی نظمیں لکھیں۔ وہ گہرا سیاسی شعور رکھتے تھے، مگر عملی سیاست میں کبھی حصہ نہیں لیا۔ اپنی نظموں، رباعیات اور قطعات میں انھوں نے سیاسی جماعتوں پر بے لاگ تنقیدیں کیں۔ اُن کا مطالعہ بے حد وسیع تھا۔ تقریر کرنے کے عادی نہ تھے مگر تحریر کا یہ عالم تھا کہ نظم ہو یا نثر، ایسا محسوس ہوتا تھا کہ کوئی بول رہا ہے اور وہ لکھ رہے ہیں۔ وہ نظم اور نثر دونوں پر قدرت کاملہ رکھتے تھے۔ اُن کی ذات مجمع الصفات تھی۔ پچاس سال میں جتنا کام انھوں نے کیا۔ وہ ایک صدی میں بھی ممکن نہ تھا۔

سیماب ۱۸۹۸ء میں مرزا داغ دہلوی کے شاگرد ہوئے۔ ابتدائی زمانہ میں غزل گوئی کے ساتھ ساتھ مذہبی اور اسلامی موضوعات پر نظمیں لکھ کر زبردست شہرت حاصل کی۔ ۱۹۲۵ء میں اُن کی اسلامی نظموں کا مجموعہ "نیستاں" کے نام سے شائع ہوا تھا۔ ۱۹۳۰ء سے اُن کی شہرت اور عظمت کے نقوش گہرے ہوتے چلے گئے اور اُن کے دور نے اُن کو ایک عہد آفریں شخصیت کا درجہ دیا۔ ادبی دنیا میں جہاں اُن کی زبردست قدر و منزلت ہوئی، وہیں کچھ معاصر بھی بن گئے۔ اُن کے اختراعات پر اُردو دنیا میں ہنگامے برپا ہوئے۔ مگر انھوں نے اپنے معتقداتِ شعری، اختراعات اور اجتہادات سے منہ نہیں موڑا۔ ایک وقت ایسا آیا کہ ان کی تحریکوں کے آگے اُن کے مخالفین کو جھکنا پڑا۔ انھیں ہر وقت زبان و ادب میں اضافوں کا خیال رہتا تھا۔ وہ آنے والی نسلوں کو قدامت پسندی سے ہٹانا چاہتے تھے۔ انھوں نے مشاعروں میں غزل سرائی کے ساتھ ساتھ نظم خوانی کی طرف بھی توجہ دلائی۔ نظموں کے عنوانات دے کر مناظمے منعقد کرائے۔ مشاعروں میں خطبہ خوانی کا رواج ڈالا۔ عروضی سختیوں میں نرمی پیدا کی۔ نظم کی ہیئت میں نئے نئے تجربے کیے اور اپنے شاگردوں سے کرائے۔ غرض ادب و شعر کی جدید قدروں کو عام کرنے میں وہ پیش پیش رہے۔ یہی سبب تھا کہ نئی نسل اُن کی طرف متوجہ ہوگئی۔ دو ہزار سے زیادہ اُن کے شاگرد ہوئے۔ اُردو کے کسی شاعر کے دامنِ فیض سے کبھی اتنا بڑا حلقہ وابستہ نہیں ہوا تھا۔ یہ کرامات ہے کہ اُن کے شاگردوں میں دو چار نہیں بلکہ دو ڈھائی سو ایسے شاگرد ملیں گے جنھوں نے شعر و ادب میں ایک بلند اور نمایاں مقام حاصل کیا۔ ان میں ہندو، مسلم، سکھ، اور عیسائی سبھی شامل ہیں۔

سیماب کا شمار جہاں ایک طرف چند گنے چنے اور ممتاز غزل گو شعرا میں ہوتا ہے، تو دوسری طرف وہ اپنے دور کے بڑے نظم نگار بھی مانے جاتے ہیں۔ نظموں اور غزلوں کے مجموعوں کے علاوہ اُن کی بے شمار نثری تصانیف ہیں۔ سیماب کی نثر و نظم تصانیف کی صحیح تعداد کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔

شاعر بمبئی۔

"خلائیں چھوڑ دی ہیں میں نے کچھ اپنے فسانے میں"

یونس اگاسکر

شعبۂ اردو مہاراشٹر کالج۔ بلاسس روڈ۔ بمبئی ۸

آج ۱۹ مارچ ۱۹۸۲ ہے۔ جمعہ کا دن۔ صبح ۱۱ بجے محترم اعجاز صدیقی اور سید محمد زیدی، محترم آنند نرائن مُلّا کو ایرپورٹ لینے گئے ہیں۔ پورا دن بڑی ہما ہمی رہی ہے۔ اب شام کے پانچ بج رہے ہیں۔

صابو صدیق پالی ٹکنیک کے وسیع احاطے میں ایک لانبے قد، گورے چٹے، دُبلے پتلے نوجوان نے دھڑکتے دل کے ساتھ قدم رکھا ہے! احاطہ کے مغربی گیٹ سے اندر داخل ہوتے ہی، اُس کی نظریں سر کے ساتھ اُوپر اُٹھتی ہیں اور اُس کے جسم سے پینتالیس درجے کا زاویہ بناتی ہوئی پالی ٹکنیک کے شمال مغربی کونے پر بنے ہوئے، ماہیشوری والے منزلے پر مرکوز ہو جاتی ہیں۔ قدم آگے بڑھ رہے ہیں اور اوپر گیلری میں جمع صورتیں واضح ہوتی جا رہی ہیں۔ یہ سفید براق نوجوان افتخار امام صدیقی کے سوا اور کون ہو سکتا ہے؟ سر ہلا ہلا کر سامنے کھڑے کسی سے باتیں کر رہے ہیں۔ فوکس تبدیل ہوا ہے، امیر الدین انکولکر، اُن کی رنگین ٹائی اور اُس کا پن دمک رہا ہے۔ اچانک ایک دروازے سے محترم اعجاز صدیقی برآمد ہوئے ہیں۔ خاکستری شیروانی ہاتھ میں چھڑی۔ افتخار کو آہستہ آہستہ کچھ ہدایت دے رہے ہیں۔ افتخار نے غڑاپ سے ایک دروازے میں غوطہ لگایا ہے اور غائب ہو گئے ہیں۔ احاطے میں داخل ہونے والا نوجوان ہاتھ ہلا کر اُوپر والوں کو اپنی آمد کا احساس دلا رہا ہے۔ اُوپر والوں نے صرف مُسکرا کر خوش آمدید کہا ہے۔ تھک گئے ہوں گے بیچارے! کتنوں کو ہاتھ ہلا ہلا کر بلائیں۔!

سیڑھیاں طے کر کے برآمدے میں قدم رکھتے ہی سید محمد زیدی نے حسبِ معمول نعرہ لگانے والے انداز میں نام پکار کر "استقبال" کیا ہے اور ہڈی توڑ انداز میں بڑھ کر معانقہ بھی۔ برآمدے میں اعجاز صاحب آگے بڑھ کر قدرے ڈانٹنے والے انداز میں (جس میں ڈانٹ کم، شفقت زیادہ ہے) کہہ رہے ہیں — "اب سٹھیا رہے ہیں"

"کیا بتاؤں۔ مضمون مکمل نہیں ہوا تھا۔ اُسی میں اُلجھا ہوا تھا۔" شاعر بمبئی

"یہ صاحبزادے ہر کام آخر وقت میں کرتے ہیں۔" اعجاز صاحب کی یہ بات کسی نے نہیں سُنی ہے۔ "اُس صاحبزادے" نے بھی نہیں۔ ذہن میں گونجنے والی باتیں سُنی نہیں محسوس کی جاتی ہیں۔

سیماب اکاڈمی کے ایک سکریٹری امیر الدین انکولکر نے آگے بڑھ کر اپنے ساتھی کے سینے پر نارنجی رنگ کا بیج ٹانک دیا ہے۔

"یہ رنگ اکاڈمی کے عہدیداروں کے لئے مخصوص ہے۔ آپ جا کر مُلّا صاحب کے سُرخ رنگ کا خصوصی مہمانوں والا بیج لگا آئیے۔" اعجاز صاحب ہدایت دیتے ہوئے داؤد خلیفے صاحب، خازن سیماب اکاڈمی سے مخاطب ہو گئے ہیں۔ داؤد خلیفے بڑے حساس اور فعال لوگوں میں سے ہیں۔ وہ اس وقت بھی بڑے انہماک سے بعض اُمور میں حصّہ لے رہے ہیں۔ نوجوان اِدھر اُدھر دیکھنے لگا ہے۔ افتخار نظر آ گئے ہیں۔ اُن کے پاس بیجوں کا "پُڑا" ہے۔ اُس نے آگے بڑھ کر افتخار کے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیا ہے اور دوسرے ہاتھ سے چند سُرخ بیج اُٹھا لئے ہیں۔ افتخار کے اَن سُنے جملے پر سر ہلاتے ہوئے وہ بڑی رسان سے آگے بڑھنے لگا ہے۔

وہ پہلی صف میں صوفوں پر فرد کش مہمانانِ خصوصی کے رُوبرو جا کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ کرشن جی آداب عرض، محترم ڈاکٹر رفیق زکریا آداب عرض، جناب مُلّا صاحب آداب عرض۔ آپ کو تھوڑی سی زحمت دینا چاہتا ہوں۔" اُس نے بیج بتاتے ہوئے کہا ہے۔

مُلّا صاحب۔ "بسم اللہ"

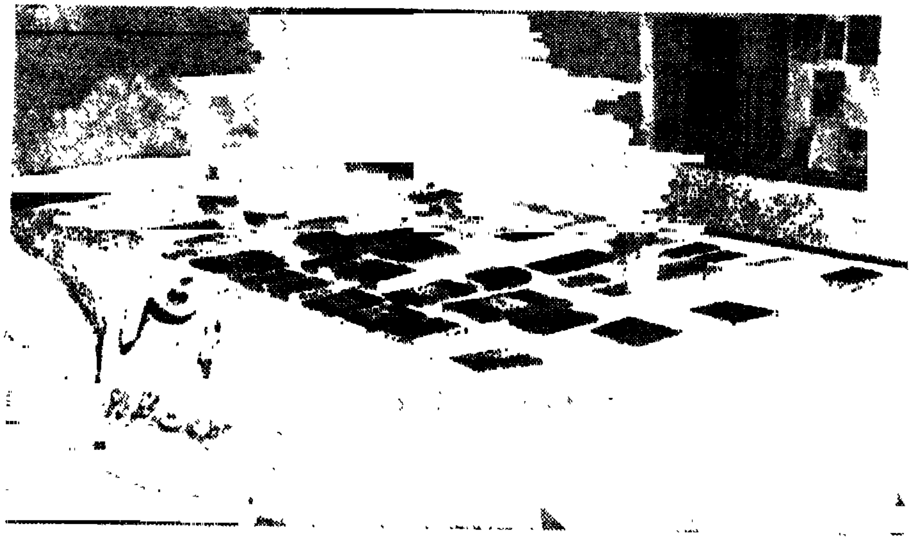
مُلّا صاحب اور دیگر خصوصی مہمانوں کے سینے پر رنگین بیج لگا کر اُس نے ہال پر ایک طائرانہ نظر ڈالنا شروع کر دی ہے۔ بے شمار شناسا و غیر شناسا چہرے مشتاق نگاہوں سے اسٹیج کی جانب دیکھ رہے ہیں اُسے لگا کہ سب اُسی کو دیکھ رہے ہیں۔ دوسری صف میں بیٹھنے کے بعد ایسا ہی لگتا ہے۔ اُس نے چند چہروں کو تلاش کر کے اطمینان کا سانس لیا۔ گیان متلی، عزیز سلطان پوری، سید شہاب الدین عثمانی



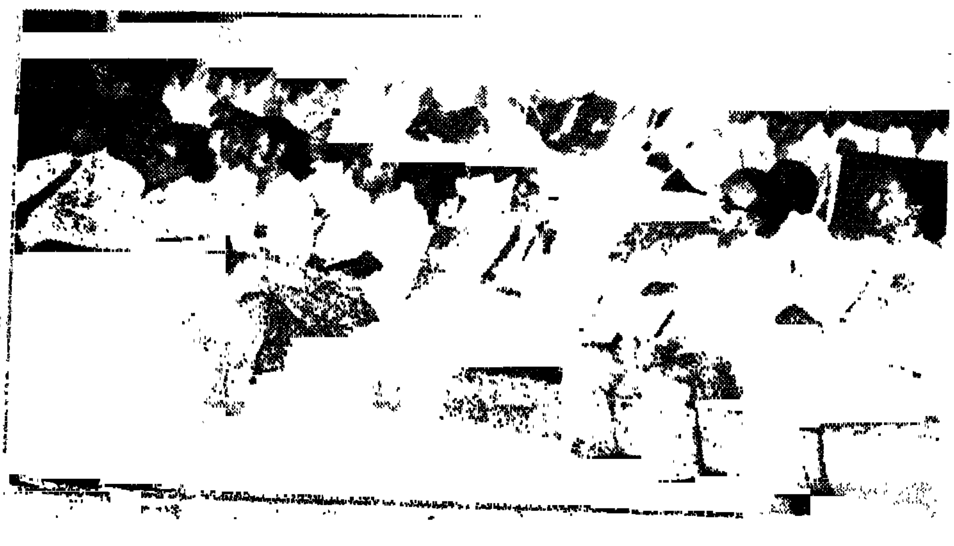
زرینہ ثانی

پڑھ رہی ہیں)

ید محمد زیدی اعجاز صدیقی کرشن چندر ڈاکٹر رفیق زکریا آنند نرائن ملا سید شہاب الدین دسنوی
مولانا پرواز اصلاحی ڈاکٹر افتخار احمد فخر



نمائش
مطبوعات و مخطوطات سیماب



سامعین

تقریب افتتاح

سیماب اکاڈمی



افتتاح شب غزل :
اعجاز صدیقی
محمد رفیع
نوشاد علی
سید محمد زیدی (مائک پر)



سامعین شب غزل



محمد رفیع
رویندر جین
راجندر مہتا
نینا مہتا
نیلم ساہنی
(غزلیں پیش
کرتے ہوئے)

سین غلام احمد نہ فیصر سید محمد رضا علی میاں کا ٹھکے ڈاکٹر جلد کسانسز کا علی امام سنی یعقوب راہی ناصر حسین جلسانی یوسف ناظم حنیف ترمدانی پروفیسر حامد اللہ ہدی دسانس پھول رہا ہے) پروفیسروں ادیبوں شاعروں اور علم دوستوں کی تعداد بڑھتی جارہی ہے۔ کچھ نشستیں پُر ہورہی ہیں۔ کچھ لوگ اب بھی ادھر ادھر کھڑے ہیں۔

لوگوں کے سروں کی فصل سے پرے الاطیفی ہال کے آخری سرے کے قدرے اونچے اور بڑے چبوترے کو مطبوعات و مخطوطات سیماب اصنایب تصاویر کی نمائش کے لئے ڈھانپا گیا ہے۔ درمیان میں ایک چھوٹا پردہ ٹنگا ہے جو "باب الداخلہ" ہے۔ اُسے کاٹتا ہوا ایک فیتہ اُفقی بندھا ہے جسے کاٹ کر صدر جلسہ نمائش کا افتتاح کرنے والے ہیں۔

"خواتین و حضرات ــــ" مائک پر سید محمد زیدی جنرل سکریٹری سیماب اکاڈمی اپنی منجھی ہوئی گرجدار آواز میں حاضرین سے مخاطب ہیں۔

"سیماب اکاڈمی کی طرف سے میں آپکا استقبال کرتا ہوں۔ سب سے پہلے صدر جلسہ محترم آنند نرائن مُلّا نمائش کا افتتاح فرمائیں گے۔ میں مُلّا صاحب محترم ڈاکٹر رفیق زکریا اور آپ سب سے درخواست کرتا ہوں کہ ہال کی پچھلی جانب تشریف لے چلیں"

مُلّا صاحب، ڈاکٹر رفیق زکریا، صدر اکاڈمی کرشن چندر، اعجاز صدّیقی، دیگر مہمانانِ خصوصی، اکاڈمی کے اراکین اور سامعین آگے بڑھنا شروع ہو گئے ہیں۔ کسی نے اُس نوجوان کا نام لے کر پکارا ہے اور اُس نے اپنی اہمیت کا احساس دلانے کے لئے بھیڑ میں گھسنے کی کوشش شروع کر دی ہے۔ لیکن آگے بڑھنے کی گنجائش ہی نہیں ہے۔ وہ دُور ہی سے پردے کے پاس ہونے والی حرکات و سکنات کا جائزہ لے رہا ہے۔ سید محمد زیدی ایک پلیٹ میں رکھ کر صدر جلسہ کو قینچی پیش کر رہے ہیں۔ مُلّا صاحب کا دست مبارک بڑھا ہے اور فیتہ دو ٹکڑوں میں تقسیم ہو کر جھولنے لگا ہے۔ فوٹو گرافر کے فلیش نے سب کے چہروں کو لمحہ بھر کے لئے اُجال دیا ہے۔ محترم اعجاز صدّیقی بھی پیچھے بھیڑ میں پھنسے رہ گئے ہیں۔ تالیوں کی گونج میں مُلّا صاحب، ڈاکٹر رفیق زکریا، کرشن چندر، سید محمد زیدی اور دیگر بہت سے لوگ نمائش میں داخل ہو رہے ہیں۔ درمیان میں ایک بہت لمبی چوڑی میز ہے۔ در حقیقت یا کئی میزوں کا مجموعہ ہے۔ علامہ سیماب کی مطبوعہ و غیر مطبوعہ تصانیف اس طرح ترتیب دی گئی ہیں کہ ایک نظر ڈالتے ہی جی چاہے کہ اسے بھی اٹھا لو اور اُسے بھی۔ ڈاکٹر رفیق زکریا نے آگے بڑھ کر سری کرشن متعلق سیماب کی شاعری بھگی

نظموں کا مجموعہ جواردو رسم الخط میں چھپا مجموعہ کرشن گیتا اُٹھایا ہے۔ مُلّا صاحب وحی منظوم کے مطالعہ میں غرق ہو گئے ہیں۔ کوئی الہام منظوم ترجمہ منظوم مثنوی مولانا روم کے دفتروں کی طرف لپک رہا ہے۔ کسی کے ہاتھ میں کلیم عجم ہے تو کسی کے کارِ امروز، شعرِ انقلاب، خطباتِ شاعر نے ریستان، گوتم بدھ، دوشیزۂ فرانس، غیر مطبوعہ مضامین سیماب، رباعیاتِ سیماب
۴۹ مطبوعات و مخطوطات بیتاب نگاہیں، مشتاق ہاتھ، میز کے چاروں طرف لوگوں کا ہجوم! ع

ہر نقش کے پردے میں نقاش نظر آیا

نوجوانوں کو ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ جیسے سیماب کی روح اپنی باطنی آنکھوں سے یہ سب کچھ دیکھ رہی ہے اور یہیں ہمارے ساتھ ہے۔ ایک عظیم انسان کی عظیم روح جو یہاں مختلف بڑی بڑی دستیوں پر پیکرِ تصویر کی صورت نظر آرہی ہے۔ کچھ لوگوں نے اُن پرانی یادگار تصویروں کو اپنی دلچسپی کا مرکز بنا لیا ہے جو سامنے کی بڑی دیوار پر آویزاں ہیں۔ چند گروپ فوٹو دیکھنے والوں کو تحیر آمیز مسرت سے دوچار کر رہے ہیں۔ ایک بہت پرانے فوٹو گروپ میں مُلّا صاحب، ڈاکٹر رفیق زکریا وغیرہ کھوئے ہوئے ہیں۔ اس میں کوئی چالیس پچاس شاعر اور ادیب ہیں۔ پہلی صف میں درمیان میں ثاقب لکھنوی کو کھڑا کیا گیا ہے۔ اُن کے دائیں بائیں سیماب اور حسرت کو۔ پھر دوسرے شعرا اور اُدبا جیسے مولوی عبدالحق وغیرہ۔ ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم صدر جمہوریہ ہند چوتھی صف میں ہیں۔ آج کے کئی مشہور بزرگ شاعر جو اس وقت جوان تھے اور بھی پیچھے کی صفوں میں کھڑے ہوئے ہیں۔ مُلّا صاحب اپنی جوانی کی تصویر بڑے اشتیاق سے دیکھ رہے ہیں ــــــ!

یہ نمائش محترم اعجاز صدّیقی کی بے پایاں کاوش، رہنمائی اور اُن کے عزیزوں یعقوب راہی اور اختر راہی کی مساعی کا نتیجہ ہے۔

وہ نوجوان ایک طرف کھڑا، گذشتہ تین چار ہفتوں کے ایک ایک دن کو یاد کر رہا ہے جو اس تقریب اور نمائش کی تیاری میں گذرے۔ تصاویر کے فریم بنوانے، پوسٹرز تیار کروانے، دعوتی کارڈ چھپوانے، اخبارات میں مضامین دینے، سووینیر کے لئے اشتہارات حاصل کرنے، سیکڑوں تحریوں کے ٹائپ ہونے اور جانے دوسرے کتنے ضروری کاموں کی مصروفیات انتہائی عروج پر رہی تھیں۔ خانوادۂ سیماب کا ایک ایک فرد بطورِ خاص اور سیماب اکاڈمی کے اراکین میں سے کچھ اراکین، جس تن دہی سے اس دو روزہ پروگرام کو ترتیب دینے اور اسے کامیاب بنانے میں کوشاں رہے ہیں، اُس کا تصور کرتے
!!

اُس کا سینہ تحسین آمیز سانسوں سے پھولا جا رہا ہے۔ وہ تاجدار احتشام صدیقی کو ہال میں داخل ہوتے دیکھ رہا ہے۔ یقیناً غریب پریس سے آیا ہوگا!

آدھا گھنٹہ نمائش گاہ میں گذارنے کے بعد سارے مہمان نشستوں کی سمت واپس آ رہے ہیں۔ ڈائس پر محترم ڈاکٹر رفیق زکریا (وزیر حکومت مہاراشٹر) صدرِ جلسہ جناب آنند نرائن مُلّا، صدرِ اکاڈمی جناب کرشن چندر، جناب سیّد شہاب الدین دسنوی، جناب اعجاز صدیقی، مولانا پرواز اصلاحی، ڈاکٹر نذیر ثانی، ڈاکٹر افتخار احمد فخر اور اکاڈمی کے جنرل سکریٹری سیّد محمد زیدی کرسیوں پر فروکش ہوگئے ہیں۔ اچانک زیدی صاحب نے اُس نوجوان کا نام پکارنا شروع کر دیا ہے۔ وہ اُسے ڈائس پر بُلا رہے ہیں۔ وہ عادت کا مارا کچھ جھجکتا، ہچکچاتا، ڈائس کی طرف بڑھ رہا ہے۔ ڈاکٹر افتخار احمد فخر کی بغل میں ایک کرسی خالی ہے وہ اُس پر اس طرح سنبھل کر بیٹھتا ہے، جیسے تین پایوں کی کرسی پر بیٹھ رہا ہو۔

زیدی صاحب اعلان کر رہے ہیں۔" جلسہ کا آغاز افتخار امام صدیقی اپنے دادا علامہ سیماب کی ایک نظم سے کریں گے، جس کا عنوان ہے "ہم ہندوستانی ہیں"۔ افتخار امام اپنے مخصوص متوجہ کن انداز میں ڈائس کی سیڑھیاں چڑھ رہے ہیں۔ ڈائس کے بائیں جانب آل انڈیا ریڈیو کے نمائندوں نے ٹیپ ریکارڈ چیک کرنا شروع کر دیا ہے۔ زیدی صاحب بصیر صاحب کو کچھ ہدایت دے رہے ہیں۔ افتخار امام نے کچھ گنگنانا شروع کر دیا ہے۔ سامعین کی نظریں اُن کے سفید بالوں اور سُرخ و سفید چہرے پر مرکوز ہوگئی ہیں ــــــ مُلّا صاحب بڑے شفقت آمیز انداز میں مُسکرا رہے ہیں۔ اعجاز صاحب کے چہرے پر سنجیدگی کی تہہ اور گہری ہوگئی ہے۔ افتخار نے نظم پڑھنا شروع کر دی ہے۔ سُر بہت اونچا ہے، گلے میں کلاسیکی تھرتھراہٹ ہے۔ نظم کی مناسبت سے ٹیپ کے مصرعے کو بار بار دُہرا رہے ہیں۔

افتخار سماں باندھ کر اُتر آئے ہیں اور زیدی صاحب، کرشن چندر، صدر سیماب اکاڈمی سے استقبالیہ تقریر کی درخواست کر رہے ہیں۔ کرشن جی کی آنکھیں اس وقت عینک کے شیشوں میں کچھ زیادہ ہی چمک اور مُسکرا اُٹھی ہیں۔ سیماب اکاڈمی کے قیام میں اُن کی دلچسپیوں کا بڑا دخل ہے۔ وہ آہستہ آہستہ مائک تک آئے ہیں اور نہایت باوقار انداز میں اپنی خیر مقدمی تقریر پڑھنا شروع کر دی ہے۔ سیماب کی جامع صفات شخصیت، اُن کی بے پناہ قوم پرستی، اور غیر معمولی شہرت و عظمت پر اختصار سے روشنی ڈال کر کرشن چندر واپس جا رہے ہیں۔ سامعین پُر زور تالیوں سے کرشن چندر کی تائید کر رہے ہیں۔

جنرل سکریٹری، اب "جگر تھام کے بیٹھو" والے انداز میں محترم ڈاکٹر رفیق زکریا کو

شاعت بھجی

دعوتِ خطبہ کا اعلان کر رہے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے افتتاحی تقریب کے لئے خوبصورت مطبوعہ خطبۂ افتتاحیہ اپنی بھاری متین آواز اور پُرکشش لہجے میں پڑھنا شروع کر دیا ہے۔ وہ سیماب کے تخلیقی عمل، اُن کی وسیع المشربی، قومی شاعری میں بلند مقامی اور انفرادیت کے تعلق سے بڑی پُرمغز باتیں فرما رہے ہیں۔ خطبہ کے مندرجات کئی باتیں یاد دلا رہے ہیں۔ محترم ڈاکٹر رفیق زکریا کے مائک سے ہٹتے ہی تالیوں کی گونج کا سلسلہ ٹوٹتا ہے۔ خطبۂ افتتاحیہ کی خوبصورت مطبوعہ کاپیاں لوگوں میں تقسیم ہو رہی ہیں اور سامعین سُنی ہوئی تقریر کو پڑھنے میں مشغول ہونا ہی چاہتے ہیں کہ اچانک سیّد محمد زیدی ڈرامائی انداز میں اپنا مضمون سُنانے کے لئے مائک پر آ گئے ہیں۔ سیّد محمد زیدی کی آواز، اُن کی من موہک شخصیت، قابلِ رشک جوانی اور ذہانت۔ مضمون کا آغاز ہی سامعین کی دلچسپیوں کا باعث بن گیا ہے، جس میں انھوں نے سیماب کے چند رُومانی اشعار کو بڑی خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔ وہ "ابھی تو میں جوان ہوں" کی یقین دہانی کر رہے ہیں۔ سیماب کی قومی نظموں پر بھی زیدی نے اچھا تبصرہ کیا ہے۔[1]

اپنے بالکل غیر متوقع طور پر سیّد محمد زیدی کی زبان سے یونس اگاسکر نکلتے ہی اُس تماشائی نوجوان کے خیالات کا طلسم ٹوٹ گیا ہے، جیسے تماشا بننے کی دعوت دی گئی ہے۔ وہ اپنے لمبے ڈگوں کو قدرے مختصر کرتا ہوا مائک تک پہنچا ہے اور معاصرین کی نظروں سے سیماب کا جائزہ لینا شروع کر دیا ہے۔ اِس احساس کے ساتھ کہ اِس بھرے ہوئے ہال کی سب نظریں خود اُس کا بھی جائزہ لے رہی ہوں گی۔ جیسے ہی اُس نے اپنا مضمون ختم کیا، ڈاکٹر رفیق زکریا کی خواہش پر درمیان ہی میں صدرِ جلسہ محترم آنند نرائن مُلّا کو زیدی صاحب نے صدارتی تقریر کے لئے زحمت دہی کا اعلان کیا ہے اور پورے ہال میں زوردار تالیاں بجنے لگی ہیں۔ سب لوگ سنبھل کر بیٹھ گئے ہیں۔ مُلّا صاحب ڈرگس کی مدد سے تیس چالیس سال پُرانا فلیش بیک پیش کر رہے ہیں۔ سیماب کے ساتھ ہونے والی ناانصافیوں کا معروضی طور پر تجزیہ کر رہے ہیں اور اُن بُنیادی اسباب و علل پر سے نہایت مفکرانہ اور عالمانہ انداز سے پردے اُٹھا رہے ہیں، جن کی بنا پر سیماب جیسی عظیم شخصیت کو وہ مقام نہیں مل سکا جو ملنا چاہئے تھا۔ مُلّا صاحب کی بے لاگ اور بیباک تقریر پر نہ صرف ڈائس پر بیٹھے لوگ بلکہ پورے ہال کے سامعین تحسین و آفرین کی آوازیں بلند کر رہے ہیں۔ اُن کی باتیں بُنیادی حقائق پر مبنی، دلوں کو لگنے اور ذہنوں

---

[1] افسوس کہ اُن کا مکمل مضمون ایک مقامی اخبار کے دفتر میں گم ہوگیا۔ مضمون کا نصف حصّہ "شاعر" میں شائع ہو رہا ہے۔

(باقی صفحہ ۹۶ پر ملاحظہ کیجئے)

استقبالیہ تقریر

کرشن چندر
ڈیلکس۔ فرانسس ایونیو، سانتا کروز ویسٹ، بمبئی ۵۴

علامہ سیماب جامع صفات تھے۔ غزل اور نظم دونوں پر قدرت رکھتے تھے۔ اور دونوں اصنافِ سخن میں اُنہوں نے اپنے عہد میں غیر معمولی شہرت پائی۔ سیماب کا زمانہ زبردست سیاسی تحریکوں کا زمانہ تھا۔ سیماب نے بڑے جوش انداز میں اپنی قوم کو جگایا۔ وہ ایک راسخ العقیدہ مسلمان تھے۔ اُنہوں نے قرآن کریم کا منظوم ترجمہ کیا۔ جسے آج بھی ہمارے ادب میں ایک شاہکار کی حیثیت حاصل ہے۔ اس کے علاوہ اُنہوں نے اپنی شاعری کے پہلے دَور میں بے شمار نعتیہ نظمیں بھی کہیں۔ اور اس صنف میں بڑے بڑے نقاد لوگوں سے اپنا لوہا منوالیا۔

سیماب میں مذہبی تعصب نام کو نہ تھا۔ کسی مذہب کا پیروکار ہونا کوئی عیب نہیں۔ عیب ہے تعصب، تنگ نظری اور مذہبی منافرت۔ اور ان عیوب سے علامہ سیماب کی شخصیت اور شاعری دونوں بالاتر ہیں۔ جہاں اُنہوں نے رسولِ اکرمؐ پر نظمیں اور نعتیں لکھی ہیں، وہیں شری کرشن، مہاتما بدھ اور گرونانک جی کو بھی اپنی نظموں میں خراجِ عقیدت ادا کیا ہے۔ اُن کا مزاج سیکولر ہے۔ اور شاعری وطنیت سے بھرپور۔ جن مسائل کو لیکر اُنہوں نے شاعری کی ہے۔ وہ آج بھی زندہ ہیں۔ اس لئے اُن کا کلام بھی زندہ ہے۔ اور ہمارے عہد کے لئے درسِ ہدایت ہے۔

علامہ سیماب تنگ نظر نہیں تھے۔ تنگ نظر شاعر کسی کو اپنا شاگرد نہیں بناتے کسی کو اپنی شاعرانہ صلاحیتوں سے استفادہ نہیں کرنے دیتے۔ لیکن سیماب بے حد وسیع القلب تھے۔ اُنہوں نے اپنی زندگی میں دو ہزار سے زیادہ شاگرد بنائے۔ اور اپنے دبستان کو سارے ہندوستان میں پھیلا دیا۔ اُن کے شاگردوں میں آج درجنوں شاعر ہندوستان گیر شہرت کے مالک ہیں۔ یقیناً اُن کی عظمت اور شہرت میں خود اپنی صلاحیتوں کے علاوہ اُن کے اُستاد کی شعری تدریس، محاکمے، تنقید، نکتہ دانی اور نکتہ سنجی کو بھی دخل ہے۔ اس اعتبار سے سیماب مرحوم کی کشادہ دلی کی جتنی بھی داد دی جائے کم ہے۔

شاعر بھی

میں سمجھتا ہوں کہ اپنی تمام تر عظمت اور شہرت کے باوجود علامہ سیماب کو اُن کی زندگی میں وہ مقام نہیں مل سکا جسکے وہ مستحق تھے۔ سیماب اکاڈمی کی بنیاد اِسی ادبی پہلو ہی کو مدِ نظر رکھنے کے لئے رکھی گئی ہے۔ اور بمبئی میں رکھی گئی ہے۔ کیونکہ اعجاز صدیقی صاحب کے آگرے سے بمبئی آنے کے بعد گویا دبستانِ سیماب بھی بمبئی منتقل ہو چکا ہے۔ بمبئی روشنیوں اور اُمیدوں کا شہر ہے اور سیماب نے بھی اپنی غزلوں اور نظموں میں اپنے وطن کے نوجوانوں کو روشنی اور اُمید اور رجائیت کا پیغام دیا ہے۔ میں اُمید کرتا ہوں کہ زبان اور کلچر سے دلچسپی رکھنے والے طبقے اِس اکادمی کے قیام کا خیر مقدم کرینگے۔ اور مہاراشٹر کی حکومت اپنی روایتی رواداری اور ہمدردی سے کام لے کر اِس اکادمی کے پروگرام اور استحکام میں مدد فرمائے گی۔

ہمارے سامنے بہت سے مسائل ہیں۔ جن کی تفصیل میں جانا اِسوقت ممکن نہیں۔ پھر بھی آخیر میں اتنا عرض کر دوں کہ ہماری اکادمی کو سب سے پہلے زمین کی ضرورت ہے جہاں سیماب اکادمی کا دفتر تعمیر کیا جاسکے۔ فنڈز کی ضرورت ہے تاکہ علامہ سیماب کی غیر مطبوعہ تصانیف کو منظرِ عام پر لایا جاسکے۔ اور اُن تصانیف کو بھی جو ہیں تو مطبوعہ لیکن جن کے ایڈیشن اب ختم ہو چکے ہیں۔ کلامِ سیماب کا معیاری انتخاب اور اس کی دیدہ زیب اشاعت بھی ہمارے پروگرام میں شامل ہے۔ لیکن یہ سب کچھ اُسی وقت ہوسکتا ہے جب ہماری حکومت اِس نیک کام میں ہمارا ہاتھ بٹائے اور بمبئی کے زندہ دل عوام اور اُردو ادب کے شائقین دامے، درمے، قدمے، سخنے ہماری مدد کریں۔ جو قوم اپنے ادیبوں اور شاعروں کو یاد نہیں رکھتی اُس کی تہذیب بہت جلد کرم خوردہ ہو جاتی ہے۔ مجھے اُمید ہے کہ ہماری تہذیب، کلچر اور تمدن کے تحفظ کی خاطر آپ لوگ سیماب اکادمی کو علامہ سیماب مرحوم کی ایک عظیم یادگار بنانے میں ہماری ہر ممکن مدد کریں گے۔ شکریہ!

خطبۂ افتتاحیہ

ڈاکٹر رفیق زکریا
وزیرِ حکومتِ مہاراشٹر، "رائل اسٹون"، کارمائیکل روڈ، بمبئی ۲۶

صدرِ جلسہ جناب ... صاحب،
سیماب اکادمی کے ارکان،
خواتین و حضرات!

آپ نے مجھے مہمانِ خصوصی بنا کر جو عزت بخشی ہے، میں اس کے لئے شکر گزار ہوں۔ علامہ سیماب اکبرآبادی کے بارے میں عام طور سے یہ بات کہی گئی ہے اور مجھے اس سے اتفاق ہے کہ وہ غیر معمولی تخلیقی قوتوں کے مالک تھے۔ شاعری ہو یا نثر، اُن کا قلم بے تکان چلتا تھا، الفاظ اور خیالات ان کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑے رہتے تھے۔ اکادمی نے سیماب کی تصنیفات و تالیفات کی جو فہرست شائع کی ہے، اُسے دیکھ کر یہ بات ماننی پڑتی ہے کہ سیماب کا تخلیقی عمل واقعی بے پناہ تھا۔ اُن کی مطبوعہ اور غیر مطبوعہ تصانیف کی فہرست سے پتہ چلتا ہے کہ ان کی نظموں اور غزلوں کے کئی مجموعے شائع ہوئے اور کئی شائع ہونے ہیں۔ اُنہوں نے رباعیاں بھی کہیں اور قطعات بھی۔ مثنوی مولانا روم کے چھ دفتروں اور قرآن مجید کا مکمل منظوم ترجمہ اُردو میں کیا۔ انکی شاعرانہ اور عالمانہ شخصیت کا اعتراف ان کی زندگی میں بھی ہوا اور انکی وفات کے بعد بھی۔ سیماب کی ہمہ گیری دو حیثیتوں سے دور رس ہے۔ ایک تو یہ ہے کہ اُنہوں نے خود اپنے تخلیقی عمل سے زبان و ادب کو مالا مال کیا، دوسرے یہ کہ اُنہوں نے شعر و ادب سے دلچسپی رکھنے والے بہت سے تعلیم یافتہ نوجوانوں کو اپنے دامنِ فیض میں لیکر اُن کی اس طرح تربیت کی کہ وہ اپنے اپنے علاقوں میں اور بعض پورے ملک میں مشہور و مقبول ہوئے۔ اکادمی کے کتابچے میں چند نام دیئے گئے ہیں۔ ساغر نظامی، سے کون واقف نہیں۔ وہ میرے اچھے دوستوں میں تھے۔ جو اپنی قومی شاعری کی وجہ سے نمایاں حیثیت کے مالک تھے۔ ہمارے دوست اعجاز صدیقی ۲۵ سال سے بمبئی میں زبان و ادب کی خدمت میں مصروف تھے۔ اُنہوں نے بھی کیا کام کیا ہے، شاعر بمبئی اور کتنا کیا ہے، یہ بھی آپ لوگ جانتے ہیں۔ نازش پرتاب گڑھی سے آپ واقف ہیں۔ مہاراشٹر میں بھی سیماب کے بہت سے شاگرد ہوئے اور ہیں، جن میں انسر احمد نگری، طرفہ قریشی کے نام مشہور ہیں۔ شفا گوالیاری کو آپ نے بمبئی کے مشاعرے لوٹتے دیکھا ہی ہوگا۔ شفا، طرفہ اور سیماب کے کئی دوسرے شاگردوں کے بھی بہت سے شاگرد ہوئے۔ چراغ سے چراغ جلنے کی جتنی روشن مثال سیماب کے سلسلے میں ملتی ہے کسی دوسرے سلسلے میں مشکل سے ملے گی۔ سیماب نے اپنی یادگار ادب و شعر کا بہت بڑا سرمایہ چھوڑا ہے۔ ایک طرف اُنہوں نے اتنا زیادہ لکھا اور دوسری طرف اتنی کثیر تعداد میں شاگردوں کی تربیت کی۔ اسی لئے یہ بات بجا طور پر کہی جاتی ہے کہ سیماب اپنی ذات سے ایک انجمن تھے۔ بابائے اُردو مولوی عبدالحق نے سیماب کی وفات پر اپنے تاثرات کا اظہار جن الفاظ میں کیا تھا وہ یہ ہیں:

"وہ (سیماب) اپنی ذات سے ایک ادارہ تھے۔ وہ بہت پُرگو اور خوش گو اور پُرمغز شاعر تھے۔ اُنہوں نے ہر صنفِ کلام میں طبع آزمائی کی اور جو کچھ لکھا، خوب لکھا۔ ایسے قادر الکلام شاعر اور جدت طراز ہر زبان میں بہت کم ہوتے ہیں۔"

سیماب کی دوسری حیثیت جو بہت اہم ہے، اُن کا نظم نگار ہونا ہے۔ جو لوگ سیماب کو غزل کا بڑا شاعر مانتے ہیں اُن سے اختلاف نہ کرتے ہوئے اُن کو خود سیماب کے الفاظ یاد دلانا چاہتا ہوں جو وہ فرماتے ہیں:

"میں نظم کو غزل پر ترجیح دیتا ہوں۔ غزل اپنی قدامت اور کہنگی کی وجہ سے اب زیادہ کارآمد نہیں رہی۔ غزل میں اجتہاد اور ایجاد کی گنجائش بہت کم ہے۔ مگر نظم کا میدان بہت وسیع ہے۔"

نظمیہ شاعری کی وسعتوں اور اس کی افادیت کا شعور جب خود سیماب کا تخلیقی عمل بنتا ہے تو اُس کے نتیجے میں "کارِ امروز"، "ساز و آہنگ" اور

انقلاب" جیسے نظموں کے مجموعے ہمیں ملتے ہیں۔ ان تینوں مجموعوں پر قومی، سیاسی اور اصلاحی رجحان غالب ہے۔ پروفیسر عبدالقادر سروری اپنی کتاب "جدید شاعری" میں لکھتا ہے:

"ان کی شاعری ایک طرف تو ہندوستانی قوم پرست گروہ اور کانگریس علمبردار ہے اور دوسری طرف ایک حیثیت سے اقبال کی قومی اور وطنی شاعری تکملہ"

اقبال بڑے وطن پرست شاعر تھے۔ اُن کی نظمیں سوامی رام تیرتھ، نانک، رام، ترانۂ ہندی، گوتم بدھ، نیا شوالہ، وغیرہ مشہور ہیں۔ اقبال شعر ہے:

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا
ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا

سیاؔ

مسلم و ہندو ایک ہیں دونوں — یعنی دونوں ہی ایشیائی ہیں
ہم وطن، ہم زبان و ہم قسمت — کیوں نہ کہدوں کہ بھائی بھائی ہیں

سچ تو یہ ہے کہ اردو کی نظمیہ شاعری کا ذکر سیماب کی قومی، وطنی اور سیاسی نظموں کے ذکر کے بغیر نامکمل رہے گا۔ ہر دور میں سیماب کی نظمیہ شاعری قدر کی نگاہ سے دیکھی گئی ہے اور آئندہ بھی دیکھی جائے گی۔ مقدار اور معیار کے معیار سے اگر انکی قومی، وطنی اور سیاسی شاعری کا جائزہ لیا جائے تو میں سمجھتا ہوں کہ صرف عنوانات ہی کے لئے کئی صفحے درکار ہوں گے۔ امیر حسن نورانی نے اپنی کتاب "اردو کے چاند تارے" میں لکھا ہے:

"ہندستان کی تحریکِ آزادی کے لئے جن شعراء کی قلمی خدمات تاریخ میں سنہرے حرفوں میں لکھنے جانے کے قابل ہیں اُن میں سیماب کا نام کافی اہمیت رکھتا ہے۔"

ملک کی تقسیم سے پہلے انڈین پریس، الہ آباد سے "کرشن گیتا" کے نام سے سیماب کی نظموں کا ایک خوبصورت مجموعہ شائع ہوا تھا۔ اس میں سری کرشن مہاراج پر گیارہ نظمیں ہیں، اس کی تمہید میں سیماب لکھتے ہیں:

"مجھے ہندو مذہب کے قدیم اوتاروں میں سری کرشن سے بڑی عقیدت و محبت ہے۔" اس کے بعد وہ اپنی عقیدت کے کئی اسباب بتاتے ہیں، ان میں پانچواں سبب قابلِ غور اور بطورِ خاص قابلِ ذکر ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"ایسی نظموں سے میں متحدہ قومیت کے لئے رواداری اور بے تعصبی کی بنیاد میں بنیاد رکھ رہا ہوں۔"

سیماب نے گیتا کا باقاعدہ [illegible] حضرت مرزا مظہر جان جاناں مولانا حسرت موہانی کی طرح انہوں نے بھی سری کرشن کی ذات میں ایک نبی کی صفت تلاش کی۔

نظر آتی۔ سری کرشن پر اُن کے یہ چار شعر ملاحظہ ہوں ؎

پیمبروں کی کبھی رسم کی ادا اُس نے
گوالا بن کے کبھی سبزہ زار سے کھیلا
بہادیئے کبھی ٹھوکر سے پریم کے چشمے
کبھی جمن، کبھی گنگا کی دھار سے کھیلا
کرو تلاش وہی بانسری، نوا جس کی
ہزار فتنے فنا کر کے بھی فنا نہ ہوئی
کرو تلاش وہی بانسری جو متھرا میں
بنی رہی دمِ عیسیٰ، کفِ کنہیا میں

بھاگوت گیتا کے ادھیائے ۴ کو سیماب نے اس طرح نظم کیا ہے ؎

جب مذہب پر زد آتی ہے — اور دہریت بڑھ جاتی ہے
جب روح پہ غفلت چھاتی ہے — اور مادیت اِتراتی ہے
اُس وقت میں پیدا ہوتا ہوں
جب ظلم کا ہوتا ہے چرچا — مٹتی ہے جہاں سے رسمِ وفا
جب مذہب اور صداقت کا — احساس نہیں کرتی دُنیا
اُس وقت میں پیدا ہوتا ہوں

سیماب کے مجموعۂ نظم "کارِ امروز" میں پہلا فارسی قطعہ خدا کی شان میں ہے، دوسرا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں، پھر پانچ نظمیں ہیں۔ اسکے بعد جو نظم ہے وہ سری کرشن ہی پر ہے۔ اسی مجموعے میں مہاتما بدھ پر بھی ایک بڑی خوبصورت اور فکر انگیز نظم ہے، اس کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

علم و عرفانِ الٰہی کی شہادت تُو نے دی
غور کرنے کی دلِ انساں کو دعوت تو نے دی
بند آنکھیں کر کے اِس دنیا کے گرد و پیش سے
تو نے حاصل کی ضیا کے دل تجلیات سے
دے کے تعلیمِ الوہیت زبانِ کفر میں
تو نے مذہب کی بنا ڈالی جہانِ کفر میں
روشنی جس کی نہ ہوگی ماند وہ مشعل ہے تو
سرزمینِ ہند کا "عرفانِ اوّل" ہے تو

"کارِ امروز" کی ایک طویل نظم "بیا بیاسیّ" ہے۔ اس میں جہاں سکندر، تیمور، رستم، خالد بن ولیدؓ، صلاح الدین ایوبیؒ، نپولین بونا

مفاشاہ پہلوی، ڈی ویلرا وغیرہ کے سیاسی سرگرمیوں کے تابناک آثار چڑھاؤ کا تجزیہ کیا ہے۔ دہیں ہندوستانی سیاق وسباق میں تلک، سی۔ آر۔ داس، مہاتما گاندھی، مولانا محمد علی، حسرت موہانی، اجمل خاں، سروجنی نائیڈو، ابوالکلام آزاد وغیرہ پر بھی نظمیں ہیں۔ ان بزرگ سیاسی شخصیتوں کی سرگرمیوں کا گہری نظر سے جائزہ لیا گیا ہے۔ اس نظم کا تکملہ پنڈت جواہر لعل نہرو پر ہوتا ہے۔ نظم ۴۲ء کی ہے۔ جواہر لعل نہرو پر نظم کے چار شعر سنیئے ؎

تھک گیا راہِ طلب میں چلتے چلتے کارواں
وقت بولا، ہے ابھی تحریکِ آزادی جواں
شمعِ منزل تھی بہ قدرِ سوزِ پروانہ طلب
تھا ابھی دشتِ جنوں از بہرِ دیوانہ طلب
کارواں واماندگی سے جب نظر آیا خموش
آگیا بیباک کہہ کر اک جوانِ سرفروش
روحِ آزادی جوانانِ وطن میں پھونک دی
آگ اس کے سوز نے صحنِ چمن میں پھونک دی

سیاب، جواہر لال نہرو کو "نویدِ منتظر" کہہ کر اس طرح خطاب کرتے ہیں

اے نویدِ منتظر ویرانیٔ محفل میں آ
شمعِ منزل بن کے ظلمت خانۂ منزل میں آ

آزادی کی تحریک اور ہندوستان کی تعمیر میں پنڈت جواہر لال نہرو کا جو زبردست حصہ رہا ہے، اس سے سب واقف ہیں۔ یہ سیاب کا گہرا سیاسی شعور تھا کہ ان کی نگاہیں جواہر لال پر آکر مرکوز ہوگئیں۔ سیاب کے پنڈت موتی لال نہرو سے بڑے گہرے مراسم تھے۔ وہ سیاب کی بڑی قدر کرتے تھے۔ آنند بھون میں سیاب اور ساغر اکثر مدعو ہوتے تھے۔ سیاب کے اسی مجموعے میں "ہولی بسنت" اور "جودھا بائی کے مندر پر" بھی مختصر نظمیں ملتی ہیں۔

سیاب کے دوسرے مجموعے "سازِ آہنگ" میں قومی، وطنی، اور سیاسی نظموں کا نہایت عمدہ انتخاب ہے۔ ان میں ہندوستانیت اور قومی یکجہتی کے بڑے دلکش نمونے ملتے ہیں۔ گرونانک، ہولی، دیوالی، بسنت، عید پر نظمیں ہیں۔ ایک نظم کا عنوان "کانگریس سے خطاب" ہے۔ ان سب میں قومیت، وطنیت، اور سیاست کے گہرے جذبات جھلکتے ہیں۔ یہ نظمیں سیاب کی آزادیٔ فکر کا اعلیٰ نمونہ ہیں۔ ان میں اصلاحِ حال کی کوشش بھی ہے اور تڑپ بھی۔ زیادہ تر نظمیں ۱۹۳۶ء تک کی ہیں جو زبردست سیاسی خلفشار کا زمانہ تھا۔ سیاب نے اپنے اس دور کی نظموں میں غیر معمولی عزم و استقلال اور حوصلہ مندی
شاعر بھی

کا پیغام دیا ہے۔

سیاب کا تیسرا اور آخری مجموعہ "شعرِ انقلاب" تو واقعی انقلاب آفریں ہے۔ اس میں غالباً ۱۹۳۶ء سے ۱۹۴۴ء تک کی نظمیں شامل ہیں۔ اگر ان ۹۴ نظموں کا تجزیہ کیا جائے تو اس دور کے لرزتے ہوئے ہندوستان، دوسری جنگِ عظیم، تحریکِ آزادی کا ہنگامہ اور ان سب سے پیدا شدہ اضطرابی کیفیات کی واضح تصویریں ہمارے سامنے ابھر جاتی ہیں۔

میں سیاب کو ایک بڑا قومی شاعر سمجھتا ہوں۔ ان کا شعری سرمایہ ہندوستان کا قیمتی ورثہ ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ قومی شاعر کی حیثیت سے سیاب پر کام ہو۔ ان کی قومی اور وطنی نظموں کا انتخاب ہندی میں بھی شائع ہو۔ میں اپنی بات نسیم قریشی کی اس رائے پر ختم کرتا ہوں ؎

"سیاب ایک سچے وطن پرست اور عظمتِ مشرق کے دلدادہ ہیں۔ ان کے شعری ترانوں میں وطن پرستی کے جذبات اعلیٰ انسانی تصور میں ڈوب کر ظاہر ہوتے ہیں۔ سیاب وطنیت اور انسانیت کو ایک رشتۂ وحدت میں پرو دیتے ہیں۔"

میں سیاب اکاڈمی کے اس جلسے کا افتتاح کرتے ہوئے دلی مسرت محسوس کرتا ہوں اور اس کے ساتھ بمبئی کے تمام اردو دوستوں اور ادب نوازوں سے میری درخواست ہے کہ وہ اس اکاڈمی کی امداد و اعانت میں دل کھول کر حصہ لیں۔ میں اپنی طرف سے ارکانِ اکاڈمی کو اپنے پورے پورے تعاون کا یقین دلاتا ہوں۔

شکریہ!

خطبۂ صدارت

آنند نرائن مُلّا
۲۹- فیروز شاہ روڈ نئی دہلی - ۱

برادرم کرشن چندر جی، میرے احباب، خواتین و حضرات ـــ

عام طور پر صدرِ جلسہ کی تقریر اپنی بے بضاعتی کے اعتراف، عزّت افزائی کے شکریے اور وقت نہ ہونے کی شکایت جیسی رسمی باتوں سے شروع ہوتی ہے۔ میں ایسی باتوں سے آپ کا وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا۔ ہاں یہ ٹھیک ہے وقت نہ ہونے کی وجہ سے خطبہ لکھ نہیں سکا اسی لئے چند باتیں زبانی عرض کر رہا ہوں۔

سیماب صاحب کی وفات کے پچیس سال بعد آج ایک ایسا جلسہ منعقد ہو رہا ہے جس میں اُن کی ادبی خدمات کا اعتراف کیا جا رہا ہے۔ بعض مقررین نے اس طرف ہماری توجہ دلائی ہے کہ اُردو میں سیماب صاحب کا جو مقام تھا اُس کا خاطر خواہ اعتراف نہیں کیا گیا۔ میرا خیال ہے کہ یہ بات بالکل صحیح ہے۔ لیکن ایسا صرف سیماب کے ساتھ ہی نہیں، بہت سے فنکاروں کے ساتھ ہوا ہے۔ بیشتر ناقدین اپنے جذبات اور ذاتی تعصبات سے بلند ہو کر کسی فن کار کی ادبی حیثیت اور فنی شخصیت جائزہ نہیں لے پاتے۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اگر فن کار میں صلاحیت ہے اور اس کے فن میں زندہ رہنے کی طاقت ہے تو آئندہ نسلیں اُسے نظر انداز نہیں کر سکتیں۔

یُوں تو کچھ سال پہلے بھی یوم سیماب منایا جا چکا ہے لیکن سیماب اکیڈمی کا قیام ایک اہم اقدام ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اگر ہم سے پہلی نسل سیماب کی ادبی خدمات کا جائز اعتراف نہیں کر سکی تو ہماری نسل اس کی کو پُورا کر رہی ہے۔ اور وہ وقت دُور نہیں جب سیماب صاحب کو وہ مقام حاصل ہو جائے گا جس کے وہ مستحق تھے۔

مولانا سیماب کو شاعر کا جائز مقام کیوں نہیں ملا، میرے خیال سے اس کی دو تین وجوہ ہیں۔ ایک وجہ تو یہ ہے کہ اُنھوں نے شاعری کو ایک مشن بنا لیا تھا۔ اُنھیں قوم اور ملک سے محبت تھی۔ وہ ہندوستانیوں کے اخلاق کو درست کرنا چاہتے تھے۔ اُن کی زندگی کا بیشتر حصّہ دوسرے لوگوں کی ذہنی تربیت میں گزرا۔ عام طور پر ایسے فن کاروں کو پسند نہیں کیا جاتا کیوں کہ لوگ تو چاہتے ہیں کہ صرف تفننِ طبع کے لئے شاعری کی جائے۔ شاعر کے کلام میں حُسن و محبت کے قصّے ہوں، مشاعرے ہوں اور وہ کبھی کسی کی غلطی کی گرفت نہ کرے اور کبھی کسی کی اصلاح کی کوشش نہ کرے۔ مولانا سیماب زبان و ادب کے معاملے میں مخصوص نظریات رکھتے تھے۔ معاصرین کو اُن کی غلطیوں پر ٹوکتے تھے۔ اُن کے ذہن میں ایک قطعی اور واضح تصویر تھی کہ اُردو زبان و ادب کا کیا مزاج ہونا چاہیئے۔ مولانا چاہتے تھے کہ اُردو ہندی سے قریب آ جائے۔ اُن کا عقیدہ تھا کہ عاشقانہ شاعری کی جگہ اگر فکر و فلسفہ ہو تو شاعری زیادہ سُود مند ہوتی ہے۔ یہی خیالات و نظریات تھے جو اُن کے معاصرین کو پسند نہیں تھے۔ دوسری وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ اِس مشن کے تحت اُنھوں نے ایک "آگرہ اسکول" قائم کیا۔ دہلی اور لکھنؤ کے لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے کہ سیماب صاحب اُن کے مدِّمقابل ہونا چاہتے ہیں۔ اِس آگرہ اسکول کے قائم کرنے سے مرحوم کے خلاف ایک فضا بن گئی۔ تیسری وجہ خود اُن کے شاگردوں کا وسیع حلقہ تھا جنھوں نے مولانا کو صرف ایک عظیم فن کار بنا کر پیش نہیں کیا بلکہ اُن کی ہمہ دانی کے اس طرح دعوے کئے کہ معاصرین اُن کے خلاف ہو گئے۔ معاصرین کو یہ لگا کہ سیماب کے شاگرد اُس عہد کے ہر بڑے فن کار کی نفی کر کے صرف سیماب کو آگے بڑھانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس کا اثر علامہ اقبال تک پر پڑا۔ بعض شاگردانِ سیماب نے اقبال کو سیماب کے مقابلے میں کم تر درجے کا شاعر ثابت کرنے کی کوشش کی۔ یہ باتیں کہاں تک صحیح ہیں کہاں تک غلط، یہ کہنا تو مشکل ہے، لیکن یہ باتیں ہمیشہ سے میرے ذہن میں اسی طرح سے محفوظ ہیں اور میرا خیال ہے کہ یہ چند وجوہ ہیں جن کی بنا پر سیماب کو وہ ادبی مقام نہیں ملا جس کے وہ مستحق تھے۔

ہر بڑے فن کار کی طرح سیماب کے فن اور شخصیت کے بھی اتنے پہلو ہیں کہ ہر ایک پر مفصّل بحث نہیں کی جا سکتی۔ اِس جلسے میں مقررین نے مرحوم کے فن اور شخصیت

کے بہت سے پہلوؤں کا احاطہ کیا ہے۔ میں صرف دو کا ذکر کروں گا۔ تاریخِ ادبِ اُردو میں سیماب کا کیا مقام ہے؟ بعض لوگ بڑے شاعر ہوتے ہیں لیکن ارتقائے ادب کی تاریخ میں اُنھیں کوئی مقام نہیں ملتا۔ رُومانٹک روایتوں میں شیلے اور کیٹس جیسے بڑے بڑے شاعر تھے لیکن کالرج کو ارتقائے ادب میں جو ادبی مقام حاصل ہوا یہ دونوں اس سے محروم رہے ہیں۔ سیماب کے بارے میں بھی میرا یہی خیال ہے۔ وہ جتنے بڑے فن کار ہیں تاریخِ ارتقائے ادب میں اُتنا ہی بڑا اُن کا مقام ہے۔ سیماب کے بارے میں اُن کے معاصرین کی جو رائے تھی وہ یہاں مختلف مفکرین نے پیش کر دی ہے۔

میں جوش کو سیماب کے دَور کا شاعر نہیں مانتا کیوں کہ جوش عمر میں سیماب سے دس بارہ سال چھوٹے تھے۔ اگر دس بارہ سال کا فرق ہو تو ایک شاعر دوسرے شاعر کا ہم عصر تو ہو سکتا ہے لیکن "ہم دَور" نہیں کیوں کہ ادبی دَور بہت جلد بدلتا ہے۔ مولانا کے دَور کے جو شاعر تھے اُن میں ایک تو اقبال ہیں جو اُن سے شاید چار یا پانچ سال بڑے تھے۔ دوسرے چکبست جو تقریباً ہم عمر تھے، تیسرے ثاقب لکھنوی اور چوتھے صفی، یگانہ، حسرت، اصغر گونڈوی اور فانی کا شمار بعد کے دَور کے شعرا میں ہوتا ہے۔ سیماب کے دَور میں سب سے زیادہ نمایاں نام اقبال کا ہے۔ جب سیماب کا مجموعۂ کلام "کارِ امروز" کے نام سے شائع ہوا تو علامہ اقبال کے ایک ہم عصر اور ہم نام پروفیسر ڈاکٹر محمد اقبال (یہ علامہ اقبال کے زبردست مدّاح بھی تھے) نے "کارِ امروز" کی نظموں پر جو رائے دی تھی اُس کے کچھ اقتباسات آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔

"حضرت سیماب سے پہلی مرتبہ مجھے ۱۹۲۸ء میں ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ اُس سال اورینٹل کانفرنس کا اجلاس لاہور میں منعقد ہوا تھا اور اُسی کی تقریب میں ایک مشاعرہ بھی کیا گیا تھا جس میں پنجاب اور بیرونِ پنجاب کے اساتذۂ سخن موجود تھے۔ اس مشاعرے میں حضرت سیماب نے اپنی طرحی غزل سنائی اور اپنے دلفریب اندازِ شعر خوانی اور بلند پایہ افکار سے محفل میں جن لوگوں کو اُنھوں نے اپنا گرویدہ کیا، اُن میں ایک میں بھی تھا۔ اُس وقت سے مجھے ہمیشہ اِس بات کا اشتیاق رہا کہ سیماب کو پھر کسی مجلس میں سُننے کا موقع ملے۔ خوش قسمتی سے گذشتہ سال مجھے بڑودہ میں اورینٹل کانفرنس کے اجلاس میں شرکت کا اتفاق ہوا۔ معلوم ہوا کہ کانفرنس کے اجلاس میں مشاعرہ بھی ہے اور حضرت سیماب بھی غزل سُنائیں گے، تو مجھے بے انتہا خوشی ہوئی۔ اُن کی دونوں غزلیں مشاعرے میں بالاتفاق بہترین تسلیم کی گئیں اور میں نے دیکھ رہا تھا کہ محفل میں ہر شخص اُن کی طرزِ ادا سے مسحور ہو رہا ہے۔ مشاعرے میں سیماب کا کلام سُن کر میں صرف اُن کی غزل گوئی ہی کا قائل ہوا تھا لیکن "کارِ امروز" کو پڑھا تو مجھے اُن کی شاعری کی ہمہ گیری کا بھی معترف ہونا پڑا۔ "کارِ امروز" پڑھ کر میری انتہائی حوصلہ افزائی ہوئی ہے اور میں اِس امر کا یقین دلانے کے قابل ہوا ہوں کہ یہ اُردو شاعری کے اُن شاہکاروں میں سے ہے جن کے ہوتے ہوئے حامیانِ اُردو کو اُس کے مستقبل کے متعلق ہراساں ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔"

پروفیسر ڈاکٹر محمد اقبال کے کہنے کا مقصد یہ تھا کہ اگر اُردو میں علمی اعتبار سے عوام کے جذبات کی عکاسی کی صلاحیت پیدا ہو جائے گی تو پھر کوئی اُردو کو نہیں مٹا سکتا۔ آگے چل کر پروفیسر ڈاکٹر محمد اقبال کہتے ہیں۔

"سیماب جہاں اپنے اُسلوبِ بیان اور انتخابِ الفاظ میں غالب کے انداز پر چلے ہیں، وہاں مضمون آفرینیوں میں اُنھوں نے اکثر اقبال کی ہمنوائی کی ہے۔ اور یہ اشتراکِ تخیّل اِس وجہ سے ہے کہ دونوں کی طبیعت فلسفہ کی طرف مائل ہے اور دونوں غالب کی شاعری سے متاثر ہیں۔ "کارِ امروز" کی متعدد نظموں کے مضامین میں صاف اقبال جھلک رہا ہے۔ غور و فکر کے نتائج اُنھوں نے جابجا اپنی نظموں میں پیش کئے ہیں۔ جن میں سے ہر ایک علم و حکمت کا ایک درس ہے۔ سیاسی اور معاشرتی مسائل پر بھی اُن کی بعض نظمیں لاجواب ہیں۔ "کارِ امروز" کی اکثر نظموں کے متعلق میرا خیال ہے کہ اگر وہ اسکولوں اور کالجوں کے نصابِ تعلیم میں داخل کی جائیں تو وہ زبان اور خیالات کے لحاظ سے بہت مفید مطالعہ ثابت ہوں۔ اِن میں "نوجوانِ ہندوستان سے"، "تاروں کا گیت"، "ہندوستانی ماں کا پیغام"، "رقصِ برگ"، "میرا وطن" وغیرہ قابلِ قدر نظمیں ہیں۔ اِس معیار کی بعض اور نظمیں ایسی ہیں کہ گو وہ آج کل کی فرقہ وار سیاسی فضا میں صوابدید سے زیادہ ثابت نہ ہوں گی، تاہم وہ سچّے ہمدردانِ وطن کے دلوں میں عزّت کی جگہ پائیں گی۔"

اور آخر میں کہتے ہیں ۔۔ "سیماب کے تصوّر میں شاعر کا نصب العین بہت بلند ہے: شاعر کیا کچھ کر سکتا ہے۔ اُس کو کیا کرنا چاہیے اس کا جواب اُنھوں نے ایک دلکش نظم میں دیا ہے جس کا نام "شاعر کا نصب العین" ہے۔ خود اُنھوں نے عملی طور پر اپنی شاعری کو اِس نصب العین تک پہنچانے کی کوشش کی ہے اور میں اُن کو یقیناً اِس کوشش میں بہت کامیاب سمجھتا ہوں۔"

شاعر۔ بمبئی

علی لکھنوی نے "الارث" ... کے سیماب [redacted] جانب لی
ابھیل فرمایا تھا۔
"میری نظر میں جناب سیماب اکبرآبادی کی ایک خاص وقعت ہے
اُردو ادب کے لئے اُن کا کام بہت غنیمت ہے۔ وہ صاحبِ طرزِ خاص
ہیں اور جملہ اصنافِ سخن پر قادر۔"
ملیح آبادی "کلیم" شائع کرتے تھے اُسی میں اُنھوں نے اپنی رائے بھی
فرماتے ہیں۔
"راہرو" کے سرسری مطالعہ سے صاف ... آرہا ہے کہ جوں جوں
عمر رسیدہ ہوتا جاتا ہے، اُس کی بلندیٔ فکر میں بھی اضافہ
ہوتا جاتا ہے اور اُستادانہ پختگی ہر شعر میں جلوہ فرما نظر آتی ہے۔
بعض شعر تو ایسے ہیں کہ ناظر جھوم جاتا ہے، کبھی دل پکڑ کر رہ جاتا ہے
اور کبھی محوِ کاوش ہو جاتا ہے۔ زبانِ سیماب کا کیا کہنا، اُردو کے معلّی
کے مالک ہیں۔"
بانیاز فتحپوری صاحب زدہ تھے جنھوں نے سیماب کے اشعار پر اعتراضات کئے
ان کی رائے غلط ہے تو اور بات ہے ورنہ میرے علم کے مطابق نیاز فتحپوری
خلاف تھے اور اُن پر بےجا اور بےجا تنقیدیں کرتے تھے۔
میرا ذاتی خیال ہے کہ کسی فن کار کے ادبی قامت کو جانچنے کیلئے معاصرین
کی رائے کچھ زیادہ اہم نہیں ہوتی۔ میں خود معاصرین کی رائے کا بہت زیادہ قائل نہیں
میرے نزدیک ادب ہو یا زندگی دونوں چیزیں قدم بہ قدم بڑھتی ہیں، اِن میں
RANGE ہوتا ہے۔ کوئی بھی فن کار کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو اُس کی EVEN
SPAN ہوتا ہے۔ کسی کا SPAN بڑا ہوتا ہے کسی کا بہت بڑا لیکن
SPA کے قانون سے کسی بھی فن کار کو مفر نہیں ہے۔ ارتقا
اُصول ایسا ہے جیسے ریلے ریس ہوتی ہے۔ ایک گروپ ایک
لے کر آگے بڑھتا ہے جہاں تک وہ دوڑ کر جاتا ہے اور کسی دوسرے
کو یہ شمع سپرد کرتا ہے یہ اُس کا SPAN ہوتا ہے۔ اسی طرح دوسرا
اس کے بعد تیسرا اور پھر چوتھا اپنے اپنے SPAN تک دوڑتے ہیں۔
اور زندگی دونوں اسی طرح ارتقا پاتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ فن کاروں کو
گروہوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ ایک گروہ تو وہ کہ جب شمع اُس کے ہاتھ
آئی تو وہ دوسرے کنارے تک نہیں پہنچ سکتا اور اُس کی عرصے میں خنا ہو جاتا
دوسرا گروہ وہ ہوتا ہے جو شمع کو لے کر اُس کی روشنی میں اضافہ کئے بغیر بالکل
اُسی صورت میں اگلے گروہ کو پہنچا دیتا ہے یعنی اُسے شمع جس حالت میں ملتی ہے
اسی حالت [redacted] گروہ کے سپرد کر دیتا ہے۔ گروہ ایسا ہوتا ہے اور سے
[redacted] ماحول

چوتھا ایک اور گروہ ہوتا ہے کہ جب شمع اُس کے ہاتھ میں آتی ہے تو اُس میں اپنے
نُور کا اضافہ کرتا ہے۔ اور پھر اگلے گروہ کے سپرد کرتا ہے۔ چوتھا اور آخری
گروہ وہ ہوتا ہے جو پچھلے گروہ کی لی ہوئی شمعوں کو پھینک دیتا ہے اور
اپنے لئے نئی شمع بناتا ہے اور نئی سمتوں اور نئے راستوں پر چلتا ہے۔ پہلے
دو گروہ وہ ہیں جن کا تاریخِ ارتقائے ادب میں کوئی مقام نہیں ہوتا، لیکن
ادب کو نئی روشنی نئی سمتیں اور نئی جہتیں دینے والے تیسرے اور چوتھے گروہ
ہوتے ہیں۔ یہاں ایک بات کا ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ میں ادب میں تسلسل
کا قائل ہوں۔ اپنے ماضی سے انکار کرکے کوئی بھی فن ترقی نہیں کرسکتا۔ آپ
ماضی کو نیا رنگ دے سکتے ہیں، ادب کو نئے خیالات اور نئے نادر موڑ
دے سکتے ہیں، لیکن صرف اُس وقت جب آپ اپنے ورثے کو مانتے ہوں۔
اگر آپ میری اِس تقسیم سے متفق ہیں تو داغ کے شاگردوں کو لیجئے۔ اگر
آپ چاہیں تو میں ہر گروہ کے ایک نمائندہ شاعر کی مثال دوں گا۔ اقبال
مولانا سیماب۔ نوح ناروی اور سائل دہلوی۔ سائل وہ تھے جو راستے ہی میں
رہ گئے وہ دوسرے کنارے تک بھی نہ پہنچ پائے۔ نوح ناروی ان شاعروں
میں تھے جنھوں نے کوئی تبدیلی نہیں کی۔ اُنھیں جس جس حالت میں ملی تھی اُسی
حالت میں دوسروں تک پہنچا دی۔ علامہ سیماب نے اُس شمع میں نئے نُور اور
نئی روشنی کا اضافہ کیا۔ اور پھر زیادہ منور اور زیادہ دُرخشاں حالت میں یہ شمع
نئی نسل کے سپرد کر دی۔ علامہ اقبال کچھ دیر تو یہ شمع لے کر چلے لیکن جلد ہی
اُس سے الگ ہو گئے۔ اُنھوں نے شاعری میں نئے اُفق اور نئی قدروں اور نئی
جہتوں کی تلاش کی۔ کہنے کو تو اقبال داغ کے شاگرد تھے لیکن میں اِسے
تسلیم نہیں کرتا۔ ممکن ہے اِس کی وجہ یہ ہو کہ داغ کی جو عظمت میری نظر میں
ہونی چاہئے وہ نہیں ہے۔ اُنیسویں صدی کا آخری دور ادبی انحطاط کا شکار
تھا۔ اُس عہد کے بہترین فن کار داغ اور امیر قرار دئے جاتے ہیں۔ تاریخِ ادب
کا کوئی طالب علم اِن دونوں فن کاروں کو نظر انداز نہیں کرسکتا۔ لیکن آج کے
بدلے ہوئے ذوق میں کیا ہم داغ اور امیر کو اہمیت دے سکتے ہیں۔ بیسویں صدی
کے آغاز میں ادبی انحطاط ختم ہوتا ہے۔ ادب اور زندگی دونوں کو نئے راستے
اور نئی منزلیں ملتی ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ اقبال اور سیماب داغ کے نہیں
بلکہ غالب کے شاگرد تھے۔ داغ تو اتفاق سے بیچ میں آگئے جیسے
THROUGH BACK ہوتا ہے لڑکا باپ سے نہیں دادا سے مشابہ
ہوتا ہے۔ اقبال اور سیماب نے جن ادبی قدروں کو اپنایا ہے وہ داغ
کی نہیں غالب کی ہیں۔ چونکہ [redacted] شاگرد ہو گئے تھے تو

انھوں نے داغ کی تعریف میں نظمیں بھی لکھیں۔ اگر میرے نزدیک سیماب واقعی داغ ہی کے شاگرد تھے (معنوی نہیں فکری طور پر) تو میں ان کو اتنا اونچا مقام نہ دیتا جو آج دیتا ہوں۔

اب اس بات پر غور کیجئے جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں کہ سیماب کا ایک مشن تھا۔ انھوں نے مشاعروں میں خطبات کی رسم جاری کی۔ خود خطبات پڑھنے شروع کئے۔ میں نے آپ سے عرض کیا تھا کہ وہ خطبات میں کس طریقے سے مصلح ہیں۔ کس طریقہ سے وہ اردو اور ہندی کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔ پہلے تو غزل کے بارے میں سن لیجئے کہ ان کا کیا خیال تھا تو وہ کیسے داغ کے اتنے مداح تھے میں حیران ہوں۔ فرماتے ہیں۔

"میں غزل میں پاکیزہ تغزل کا مخالف نہیں۔ لیکن شاعری کو تغزل محض تک محدود رکھنا بھی نہیں چاہتا۔ اردو شاعری میں غزل اس وقت ایک مدقوق مریضہ کی حیثیت رکھتی ہے اور اندیشہ ہے کہ اگر اسے صحیح صورت میں رکھنے کی کوشش نہ کی گئی تو ہمیشہ کے لئے فنا ہو جائے گی۔"

میں ذرا ان کی اس بات سے متفق نہیں ہوں جو انھوں نے کہا تھا کہ غزل فنا ہو جائے گی۔ غزل میں اتنی جان ہے۔ اتنی صلاحیت ہے کہ بدلتے ہوئے دور کے ساتھ، عوام کے ساتھ رشتہ رکھ کر غزل میرے نزدیک کبھی مٹ نہیں سکتی۔ غزل ہماری خاص صنف سخن ہے جو ہمارے ادب میں ہمیشہ رہے گی اور غزل میں ہمیشہ گنجائش رہے گی کہ اگر کوئی واقعی باکمال فنکار ہے تو غزل ایک نیا پیام پیش کر سکے گا۔

اچھا اب اس کو دیکھئے جو میں اردو ہندی کے بارے میں کہہ رہا تھا۔ مولانا سیماب نے اپنے ایک خطبہ میں کہا تھا۔

بدقسمتی سے اردو اس وقت پیدا ہوئی جب کہ دوسری زبانیں اپنے شباب کی منزلیں طے کر چکی تھیں۔ اس وقت قدرۃً یہ ہوا کہ واضعان زبان نے اسے فارسی کا تقلیدی رنگ دینے اور فارسی اسلوب پر ڈھالنے میں بہت جلدی کی۔ اسلامی سلطنت اور مسلمان جس معاشرت اور تمدن سے متاثر تھے اس سے اردو شاعری بھی متاثر ہوئی۔ حالانکہ مقامی اور فطری اعتبار سے اسے ہندی شاعری سے متاثر ہونا چاہئے تھا۔ بے شک عربی اور فارسی مسلمانوں کی قدیم قومی زبانیں ہیں، جو مسلمانوں کے ساتھ ساتھ ہندوستان میں آئیں۔ اس لئے حقیقت کی طرف سے یہ تعبیر کی جا سکتی ہے کہ مسلمان ہونے کی حیثیت سے ان ہی زبانوں کی تقلید ہمارے لئے منتہائے سعادت مندی ہے۔ لیکن یہاں عقیدت کا سوال نہیں۔ علم و فن کا سوال ہے۔ ہم عقیدتاً اور مذہباً عربی اور حجازی مراسم کی تقلید کو اپنا ایمان سمجھتے ہیں۔ لیکن جب وطنیت کے اعتبار سے لسانی سوال پیدا ہوتا ہے تو ہمیں ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ ہم فنی نقطۂ نگاہ سے اردو شاعری کے قواعد بھی اپنے ہی بنائیں تاکہ ہماری زبان اور ہماری شاعری کسی دوسری زبان کے قواعد و ضوابط کی محتاج اور پابند نہ رہے۔

پھر ہندوستان میں اردو شاعری صرف مسلمانوں تک محدود نہیں بلکہ دوسری قومیں بھی شعر کہتی ہیں اور بہت اچھے شعر کہتی ہیں۔ تو کیا ضرورت ہے کہ وہ بھی آپ کی عقیدت اور روایت کا اتباع کر کے عربی اور فارسی قواعد کی پابندی پر مجبور ہوں۔"

اور آخر میں وہ کہتے ہیں کہ INDIAN عنصر نہیں ہے ہماری شاعری میں "لیکن میں پوچھتا ہوں کہ آخر تقلید ہی ہمارا نصب العین کیوں ہو؟ ہم اپنے ذہنوں کو دوسروں کے دل و دماغ سے نکلی ہوئی پیداوار کی غلامی کے لئے مجبور کیوں کئے ہوئے ہیں اور ہم پیش روؤں کے نقش قدم پر چلنے کو مدبر منزل کیوں سمجھتے ہیں؟ کیا ہمارے وطن کا ماحول ہماری شاعرانہ تخیلی تشنگی کو بجھا نہیں سکتا۔ کیا ہندوستان کا سواد شعریت آفریں اور شعر نگار نہیں ہے۔ کیا گنگا اور جمنا کی موجوں میں شمس، نیل اور نہر کی آباد کا پُرکیف تموج نہیں پایا جاتا۔ کیا ہمارے ملک کے جنت فریب باغوں میں بلبل سے بہتر خوش الحان طائر موجود نہیں؟ کیا ہم کوئل اور پپیہے کو محض اس تعصب کی وجہ سے اپنی شاعری میں دوست شرکت دینا نہیں چاہتے کہ ہندی یا بھاشا شاعری میں ان کے نغمے گونج چکے ہیں۔ کیا ہمارا لسانی ذوق کی خوشنما تکمیل اور شعر صحیح کے لئے معیار نظر پر صحیح اترنے والا جمال اس سرزمین حسن و محبت میں موجود نہیں۔؟ کیا ایران کے فرہاد و شیریں اور نجد کے قیس و لیلیٰ، مصر کے یوسف و زلیخا اور عراق کے وامق و عذرا سے بہتر یہاں کنگ اور تارا، نل اور دمن، ہیر اور رانجھا کے وطنی افسانوں میں نہیں ملتے[illegible]

بمو ۲۹

شاعر بمبئی

مذاکرات تخلیق کے لئے بہترین ذریعہ اور بطورِ خاص مخصوص ہیں؟ اسپ و عہد یا رقص اور ایسے ہی معصیت زدہ یافتہ انسانوں کا ذکر کرنا محبوبِ کلام کی کوئی شانِ شغف ہے۔ اور کیا دلِ درس کی روایات تازہ کرنے کے لئے ایسی شعر حقائق کے علاوہ کوئی علمی مثال کسی عہد میں نہیں ملتی۔؟

وہ اپنے مشن میں کتنے سخت تھے، اس کا اندازہ ان کے ایک خطبے کے اس اقتباس سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ خطباتِ شاعری صفحہ ۵۰ پر مولانا سیماب نے لکھا ہے۔

"میرا جذبۂ اصلاح یہاں تک صاف صاف اور گستاخ ہے کہ اگر اس سلسلے میں علماء دین کا فتویٰ بھی کسی کی طرف سے مل جائے تو میں خود تشویش کے کرتا ہوں۔ لیکن اپنی سالہا سال کی ادبی خدمات کا حاصل یہ ضرور دیکھنا چاہتا ہوں کہ موجودہ شاعری اور مشاعروں میں ایک ایسا خوشگوار انقلاب پیدا ہو جائے جو اردو شاعری اور مشاعروں کو ملک اور قوم کے لئے زیادہ سے زیادہ مفید اور کارآمد بنا سکے۔"

آخر میں مولانا سیماب کے جذبۂ اصلاح پسندی کے سلسلے میں چند موٹی موٹی باتیں اور بھی عرض کروں کہ جن کی وجہ سے لوگ ان کے خلاف ہو گئے تھے۔

۱۔ سیماب صاحب نے "موحدِ اعظم" کے عنوان سے ابلیس پر ایک طویل نظم فکر و فلسفہ سے بھرپور لکھی تھی۔ رامپور کے مفتیٔ اعظم نے ان پر کفر کا فتویٰ صادر کر دیا۔ مدتوں اخبار "مدینہ" بجنور میں مخالف اور موافق علماء کے درمیان بحثیں چلتی رہیں۔

۲۔ اپنی عوامی شاعری میں انہوں نے زبردست عقیدت و ارادت کے اظہار کے ساتھ ساتھ ایک دو نظموں میں جذبۂ اصلاح پسندی سے بھی کام لیا اور اس کے نتیجہ میں ان کے عہد کے دوہرا معیار رکھنے والے نقادوں نے ان کے ادبی کارناموں پر قلم اٹھانے سے گریز کیا۔ ان کے مقابلہ میں معاصر سے ہم عصر شعرا اور ادیبوں کو بڑھایا۔

۳۔ نئے نئے الفاظ اور تراکیب کو وضع کر کے بجائے کر ہر قسم کے علمی حلقوں کو چونکانے کے ساتھ ساتھ انہوں نے اپنا مخالف بنا لیا۔ مثلاً ROMANCE سے لفظ "رومان" بنایا اور آگے چل کر لطف و ثقافت کے ساتھ لکھنے لگے روحانی تحریروں میں [illegible] "رومان" کو ہندی میں ڈھالنے کی کوشش کی۔ ایسا [illegible] اٹھا لیا۔

شاعر، بمبئی

۴۔ شاعری میں شراب کے اس طرح کے ذکر کے خلاف سخت آواز بلند کی جس سے شراب نوشی کی تحریص پیدا ہو اور نئی نسل کے شعرا شاعری اور شراب کو لازم و ملزوم سمجھ لیں۔ اس وقت ہندوستان میں سیاسی طور پر بھی ترکِ شراب کی تحریک چل رہی تھی۔ چنانچہ "مجلسِ امل (دخان نوشی)" کے مشاعرہ میں ترکِ شراب کے تعلق سے انہوں نے ایک پورا خطبہ پڑھا۔ نتیجہ میں مدتوں جوش اور سیماب کے مابین رسالہ "کلیم" دہلی اور "شاعر" میں جوابی بیانات چھپتی رہیں۔

۵۔ اس زمانہ میں عام رواج یہ تھا کہ بڑے سے بڑا شاعر اپنے شعر کی داد ملنے پر جھک کر یا کھڑے ہو کر ہاتھ سے سلام کرتا تھا اور زبان سے بھی "آداب آداب عرض ہے" کہتا تھا۔ مولانا سیماب کو ان کے اشعار پر چاہے کتنی ہی داد کیوں نہ ملتی، وہ سلام نہیں کرتے تھے۔ بس پسندیدہ شعر کو دوبارہ یا سہ بارہ پڑھ دیا کرتے تھے اور اگر کوئی ایسا استاد ہوتا جو ان سے عمر میں بڑا ہو یا ان کا ہم عمر جیسے مولانا صفی وغیرہ تو آہستہ سے صرف "شکریہ" کہہ دیا کرتے تھے۔ اچھے سے اچھے شعر پر وہ خود کسی کو داد نہیں دیتے تھے۔ شعر پسند آتا تھا تو شاعر کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھ کر مسکرا دیا کرتے تھے اور یہ اشارہ ہوتا تھا کہ وہ شعر دوبارہ پڑھا جائے۔ ان کی اس ادا اور عادت پر ان کے ہم عصر انہیں مغرور سمجھتے تھے۔

(۶) انہوں نے مشاعروں میں "ہزل سرائی" کی سخت مخالفت کی اور مشاعروں سے واک آؤٹ تک کیا۔

(۷) اپنے رسالہ "شاعر" میں سیماب صاحب نے اصلاحِ سخن کا ایک مستقل باب کھول رکھا تھا۔ اور اس عہد کے اساتذہ کی اصلاحیں جو ان کے شاگرد اپنے کلام پر شائع کرتے تھے تو جو اصلاح وہ خود کیا کرتے تھے اور جہاں انہیں استاد کی اصلاح میں خامی یا کمزوری نظر آتی، اس کی طرف کھلا ہوا اشارہ کر دیا کرتے تھے۔ یہ بات اس عہد کے اساتذہ کو سخت ناگوار گزرتی تھی۔ پھر انہوں نے "دستورالاصلاح" کے نام سے فنِ اصلاح پر ایک مستقل کتاب لکھ کر کئی اساتذۂ سخن کو بہت ناراض کر دیا تھا۔

۸۔ سیماب صاحب کے شاگردوں کو ان کی جدت پسند نظموں اور عام غزل سے ہٹی ہوئی غزلوں پر مشاعروں میں کافی داد ملتی تھی۔ دوسرے استادوں اور ان کے شاگردوں کو یہ بات بھی ناگوار گزرتی تھی۔ خود سیماب کے وطن میں شعرا کا ایک بڑا گروہ ان کے خلاف ہو گیا اور طرح طرح سے ان پر کیچڑ اچھالی جاتی تھی۔

۹۔ "جلا پیام" کے عنوان سے وہ اپنے اخبار "تاج" [illegible] "شاعر" میں صرف [illegible] کے نام منظوم پیامات دیا کرتے تھے جن میں بے لاگ

(باقی صفحہ ۲۴ پر دیکھئے)

سیمابؔ کی نظمیہ شاعری

ڈاکٹر زرینہ ثانی
۳۶۱ ۔ [illegible] ناگپور (انڈیا)

وقت گذرتا ہے نقش اُبھرتے ہیں اور پھر مٹ جاتے ہیں۔ مگر بعض نقوش ایسے بھی ہوتے ہیں، جو زمانے کی دسترس سے بالاتر ہو کر لوحِ وقت پر پتھر کی لکیر بن جاتے ہیں۔ جُوں جُوں وقت گذرتا ہے یہ نقوش زیادہ عمیق اور واضح ہوتے جاتے ہیں۔ ایسے ہی نقوش میں ایک نقش علامہ سیمابؔ اکبرآبادی کی ذاتِ گرامی ہے جنھوں نے اپنی زندگی کو عروسِ سخن کے گیسوؤں کی آراستگی کے لئے وقف کر دیا تھا انھیں اس بات کا عرفان ہو چکا تھا کہ ان کی تخلیق خدمتِ ادب کے لئے ہوئی ہے

علامہ سیمابؔ نے زمانے کے دستور کے مطابق سخن کی ابتدا غزلوں ہی سے کی۔ اُن کی غزلوں میں وہ تمام خصوصیات ملتی ہیں، جو کامیاب غزل گوئی کی ضامن ہیں۔ صالح انداز، شاعرانہ صداقت، سادگی و اصلیت، متانت و سنجیدگی، دلکشی و رعنائی، انسانیت کی جھلک، مسائلِ حیات کی توضیح اور عارفانہ خیالات ان کی غزلوں کی نمایاں خصوصیات ہیں۔

اُن کے زمانے میں غزل کی شکست و ریخت کیلئے ایک محاذ تیار ہو چکا تھا اور اکثریت نظم کی طرف راغب ہو رہی تھی۔ سیمابؔ نے شاعری کو محض فن سمجھ کر اختیار نہیں کیا بلکہ شعور کی بالیدگی اور فہم و ادراک کی پختگی نے اُن پر منکشف کر دیا تھا کہ شاعری سے ایسا کام لینا چاہیے جو قوم کے تابناک مستقبل کا ضامن بن سکے۔ اس لئے انھوں نے نظمیہ پیرایہ اختیار کیا، وہ خود کہتے ہیں۔ کہ "نظم غزل گوئی سے زیادہ ضروری اور بہترین صنفِ کلام ہے"۔ اور حقیقت یہ ہے کہ غزل اپنی فطری ساخت کی وجہ سے اُس انقلابی اور رجزیہ لہجے کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی جس کی ہمیں ضرورت تھی۔

سیمابؔ نے ابتدا میں اپنے زمانے کے اہم واقعات، سیاسی رجحانات اور سماجی مسائل کو اپنی نظموں میں پیش کیا ہے۔ سیمابؔ کی نظمیہ شاعری میں ہمیں جلوہ ہائے صد رنگ نظر آتے ہیں۔ انھوں نے تاریخی، مذہبی، ادبی، قومی، سیاسی، اصلاحی اور عزائیہ نظمیں لکھیں۔ سیمابؔ کی شاعری کا ابتدائی دور اقبالؔ کے دورِ سوم سے مشابہت رکھتا ہے۔ اسی دور میں انھوں نے ایسی نظمیں لکھیں جو خیالاتِ اسلامی اور کیفیاتِ بلی، عشقِ خداوندی اور عقیدتِ محمدی کے جذبات سے لبریز ہیں۔ "نیستاں" کی تمام نظمیں اسی قبیل کی ہیں۔ سیمابؔ نے اُسی دور میں علامہ شبلیؔ کی طرح تاریخی واقعات پر مشتمل چھوٹی چھوٹی مؤثر نظمیں لکھیں۔ جن سے اُن کا مقصد ہمارے اسلاف کی عظمت و جلالت اور اُن کے اعمال و عقائد کا اظہار کر کے ہمیں اصلاح کی طرف مائل کرنا تھا۔ اُن کا تاریخی شعور بڑا بالغ اور پختہ تھا۔ وہ عالمی تاریخ سے بھی واقف تھے "لب دریائے ستلج"؟ "انقلابِ روس" اسی قبیل کی نظمیں ہیں۔ انھوں نے تاریخی عمارات پر جس قدر جوشیلی محاکاتی اور مؤثر نظمیں لکھی ہیں، ایسی نظمیں اُردو کی نظمیہ شاعری میں کم ہی نظر آتی ہیں۔ اُن کی رباعیات کا مجموعہ "عالم آشوب" تاریخی حیثیت رکھتا ہے۔ اس مجموعہ میں انھوں نے اواخر مئی سنہ ۱۹۴۰ء سے اواخر دسمبر سنہ ۱۹۴۳ء تک کے حالات بالترتیب درج کئے ہیں۔ سیمابؔ کی تاریخی نظموں میں ہم کہیں تاریخی شخصیات کو نمایاں دیکھتے ہیں۔ تو ہمیں کہیں تاریخی حالات پر تبصرہ ملتا ہے کہیں تاریخی مقامات کی عظمت کا نقشہ سامنے آتا ہے تو کہیں عالمی سیاست کا شعور جھلکتا ہے لیکن یہاں بھی وہ اپنا خاص مقصد یعنی اصلاحِ معاشرت و سماج نہیں بھولتے۔

اُردو شاعری میں اصلاح کا آوازہ سرسیدؔ، حالیؔ و شبلیؔ کے زمانے میں اُٹھایا گیا اور سیمابؔ نے اس روایت کو آگے بڑھایا لیکن یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ انھوں نے جہاں معاشرت، سماج سیاست اور مذہب کی اصلاح کیلئے نظمیں لکھیں، وہیں ادب کی لسانی اور ادبی گرہوں کو ختم کرنے کیلئے اپنے شاگردوں کی نظموں اور معاصرین کی شاعری پر حملہ کر بھی کیا۔ ان کی اصلاحی نظموں میں یہ جدّت ہے کہ جہاں انھوں نے ... لوگوں کے حالات بتا کر قوم کو درسِ عبرت دیا ہے۔ وہیں انسانی نفسیات اور مناظرِ قدرت کو پس منظر

بنا کر اتفاق و اتحاد کا درس بھی دیا ہے۔ ان کی اصلاحی نظموں میں "عشرتِ جہنم سرائے"، "تاروں کا گیت"، "رقصِ اجل"، "معتبروں کے غلط کہنے" اور "رُوحوں کے اعمال نامے" اہم ہیں۔ ان میں سے موخر الذکر نظم خاص ندرت و جدت کی حامل ہے۔ اس میں فطرتِ انسانی کی کج بینی کو ظاہر کیا گیا ہے۔ اور شاعر نے بتایا ہے کہ اس دنیا میں بد اعمال انسان بھی مرنے کے بعد نیک نامی سے یاد کئے جاتے ہیں۔ جو سراسر فریب کاری ہے۔ موت نہ تو بُرے اعمال کو دھو سکتی ہے اور نہ ہی نیکیوں کو مٹا سکتی ہے۔ اس نظم میں ندرتِ تخیل سے کام لیتے ہوئے سماج کے مختلف کرداروں کے اعمال اور سزا کا احتساب کیا گیا ہے ... سیماب کے اس اصلاحی رُجحان کو وطن کی محبت کی دین کہا جا سکتا ہے۔ اُنھوں نے وطن کی عظمت کے گیت گائے اور اس کی زبوں حالی پر آنسو بہائے ہیں۔ اُن کے تخیل کی بازگشت وطن ہی سے مواد حاصل کرتی ہے۔ وطن کو غلام دیکھ کر اُن کا دل کُڑھتا تھا۔ وہ ہر دل میں آزادی کی شمع روشن کرنے کے خواہاں تھے۔ نظم "ہندوستان" میں ان کی وطن عقیدت انتہا کو پہونچی ہوئی ہے۔ سرزمینِ ہند کو اُنھوں نے "پرستش گاہِ فطرت" اور "سجدہ گاہِ آفتاب" کے نام سے موسوم کیا ہے۔ انھیں عشق کی پروردگاری اور حسن کی عنبر ٹپک کے جلوے ریاضِ ہندہی میں نظر آتے ہیں۔ یہی سرزمین مختلف مذاہب کا سنگم ہے۔ اس نظم کے آخر میں اُنھوں نے غیرت مندانہ لہجہ اختیار کیا ہے اور ان کی آواز

کاش مستقبل ترا ماضی کو پھر آواز دے

میں ضم ہو جاتی ہے اور ہمارے دل پر ایک گہرا لافانی نقش چھوڑ جاتی ہے۔ یہ نظم اُردو شاعری میں ممتاز مقام حاصل کر چکی ہے۔ بقول ڈاکٹر عزیزہ جوہر فیضی یہ نظم اقبال کے "ترانۂ ہندی" پر فوقیت رکھتی ہے۔

ہمیں سیماب کی سیاسی نظموں میں ایک گھن گرج سنائی دیتی ہے جو جوش کی آواز سے مشابہ تو ہے مگر یہ آواز جوش سے بہت پہلے کی ہے۔ سیماب کی نظموں کا وطنی تصور بھی اقبال کا ہم رنگ ہے مگر اس رنگ میں نہیں کی ہو

محسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا

بلکہ اس رنگ کی ہو

میں انساں ہوں یہ انسانی کرہ ہے آج تک میرا

گویا سیماب کے یہاں افضلیت اور اولیت انسانیت کو حاصل ہے۔ اس کے باوجود جب وہ جغرافیائی حدود میں آتے ہیں تو فوقیت اور برتری ہندوستان ہی کو دیتے ہیں۔ وہ ایک سچے محبِ وطن کی طرح قوم کو اعلیٰ خصائل سے مزین دیکھنے کے متمنی ہیں اور فرقہ پرستی و جماعت بندی شاعر بھی

کے سخت مخالف۔ ہندومت اور اسلام کے معتقدین کو ایک مرکز پر لانے کے آرزومند ہیں اور ہندی نوجوانوں میں قومی جذبہ اور انسانی اوصاف پیدا کرنے کے متمنی۔

جہاں علامہ اقبال نے ایک ایسے مردِ مومن کا تصور پیش کیا ہے جو خدائی رنگ میں رنگا ہوا ہو، وہیں علامہ سیماب نے وطن دوستی سے سرشار ہو کر ایسے انسانِ کامل کا تخیل پیش کیا ہے جس کا چشم وطن انتظار کر رہی ہے جو توہم اور تعصب سے بَری ہو اور اعلیٰ نظریات کا حامل ہو جس کے دل کا گوشہ گوشہ آزادی و محبت کے جذبے سے سرشار ہو۔ جو وطن کے عروج بہبودی کی فکر کرے اور فرقہ سازی کے بُتوں کو پاش پاش کر دے۔ اس تصور و تخیل سے سیماب کی وطن دوستی زیادہ ابھر کر سامنے آتی ہے۔ بقول نسیم قریشی "سیماب وطنیت اور انسانیت کو ایک رشتہ وحدت میں پرو دیتے ہیں۔"

سیماب کا سیاسی شعور بڑا نکھرا ہوا تھا۔ اُن کی اُٹھان کا زمانہ وہ زمانہ تھا جب ملک سیاسی بحران سے گزر رہا تھا۔ حصولِ آزادی کے نعرے، قید و بند کی سختیاں، ملک کو بہتر بنانے کا احساس، مزدوروں کی حالت زار پر تاسف اور اُن کی اصلاح، مختلف سیاسی تحریکوں کا ارتقاء۔ قوم کو سنوارنے کی تمنا اور اپنے حقوق کے مطالبے وقت کے اہم تقاضے تھے۔ سیماب اپنے ماحول سے بے خبر نہ تھے اور سماج کے ایک ذمہ دار فرد ہونے کی حیثیت سے اپنی ذمہ داری سے بھی بخوبی واقف تھے۔ اُنھوں نے اپنی شاعری میں سیاسی معاملات کو بڑی خوبی سے سمویا ہے۔ اُن کی نظموں میں دعوتِ انقلاب، نغمۂ وطن، اے اسیرانِ وطن، ہندوستان کا پیغام خسروِ برطانیہ کے نام، مجلسِ اقوام، طوفان کی گرج، جاگ اے ہندوستان اور اعلانِ حریت وغیرہ بڑی اہم ہیں۔

آہنگ کے اعتبار سے سیماب کی مشہور نظم "بساطِ سیاست" اور جوش کی نظم "ملکوں کا رجز" یکساں ہیں۔ سیماب اور جوش کی بعض نظموں کا تقابل کئی حیثیتوں سے کیا جا سکتا ہے۔ لیکن ایک نمایاں بات جسے ناقدینِ ادب بھی تسلیم کرتے ہیں، یہ ہے کہ جوش کے یہاں الفاظ کا ایک سیلِ رواں ہوتا ہے اور جذبات کی ایک اوپری سطح، الفاظ کا در و بست بھاری بھرکم ترکیبیں بہت خوبصورت سہی، لیکن اکثر ان میں فکری گہرائی نہیں ہوتی۔ جوش ایک ہی خیال کو مختلف انداز سے کہتے چلے جاتے ہیں۔ اُن کے یہاں تخریب کا عمل جتنا تیز ہوتا ہے اتنا تعمیر کا نہیں ہوتا۔ لیکن سیماب کی نظمیں خیالات و معانی کا تنوع لیکر آگے بڑھتی ہیں اور یہ معلوم نہیں ہوتا کہ وہ اوپر سے بول رہے

ہیں۔ ان کے یہاں ہر جگہ ایک تعمیری نقطۂ نظر ملتا ہے۔ گو سیماب بہت بڑے سیاست داں یا سیاسی مفکر نہ تھے، تاہم ان کے سیاسی نظریات کی اہمیت اور اُن کے شعور و ادراک کی گہرائیوں سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ وہ اُن کے دور کی عالمی سیاست ہو یا مُلکی، دونوں کے سلسلے میں اُن کے نظریات اور افکار متوازن، تعمیری، اصلاحی اور مفکرانہ ہیں۔ اِس نوع کی شاعری کا خلوص بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اُن کے مجموعۂ کلام میں شاید ہی کوئی نظم ایسی ہو جو ردّ ابتی انداز کی ہو۔ چاہے آپ "کارِ امروز" کی نظمیں پڑھیں یا "ساز و آہنگ" کی یا "شعرِ انقلاب" کی۔

سیماب کے متعلق عبدالقادر سروری صاحب رقمطراز ہیں کہ "اُن کی شاعری ایک طرف تو قوم پرست گروہ اور کانگریس کی علم بردار ہے اور دوسری طرف ایک حیثیت سے اقبال کی قومی و وطنی شاعری کا تکملہ"۔ ہمیں اِس بات کے ماننے میں قطعی پس و پیش نہ کرنا چاہئے کہ اقبال قومی اور وطنی شاعری کی تکمیل سے قبل ہی ملّی شاعری کی طرف متوجہ ہو گئے تھے اور آنے والی نسل کے جن شعراء نے قومی اور وطنی شاعری کو اپنایا، اُن میں سیماب کا مقام بیحد بلند ہے۔

فنکارانہ تراش و خراش اور اعلیٰ فکر و احساسات کی آمیزش سے ادب کا لافانی شاہکار تخلیق ہوتا ہے۔ سیماب نے اپنے اعلیٰ و ارفع خیالات کو فنکارانہ کمال کے ساتھ بڑی خوبی سے شعر کے پیکر میں ڈھالا اور ادبی اور فنّی تقاضوں کو بھی ملحوظ رکھا ہے۔ یہ خصوصیت اُس نقطۂ نظر کی دین ہے جو صحیح علم و وجدان اور انسانیت کے مطالعہ سے حاصل ہوتا ہے۔ اُن کے یہاں متانت و سنجیدگی، تہذیب و شائستگی نظر آتی ہے۔ ابتذال اور رکاکت نام کو نہیں۔ اُنھوں نے کسی بھی قسم کی لسانی، شعری اور ادبی گمرہی کو جائز قرار نہیں دیا۔ معمولی باتوں سے دُور رس نتائج مرتب کر کے ادب اور زندگی کے صحیح رشتے کی نمائندگی کی ہے۔ اُن کی ادبی نظمیں کم سِن راہبہ، صبحِ بہار، شگفتِ نظر اور تاج بڑی اہمیت کی حامل ہیں۔ وہی فن پارے قابلِ قدر ہوتے ہیں جن میں فنکار نے اپنے خیالات کا اظہار فنّی اور ادبی اقدار کو مدِّنظر رکھ کر کیا ہو۔ اور جس میں ادب کے معیار کو افراط و تفریط کے جادہ سے ہٹ کر توازن اور اعتدال سے برتا ہو۔ ایسا ہی ادب انسان کے جمالیاتی ذوق کی تسکین کرتا ہے۔ سیماب کے ادبی رجحانات کا بغور مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ اُن کے نظریات بلند اور اعلیٰ ادبی اقدار و معیار کے حامل ہیں۔ اِسی لئے اِن کی نظموں میں پیش کیا ہوا مفہوم ہمارے ذہن کو بوجھل نہیں کرتا بلکہ ہمارے جمالیاتی ذوق کی تسکین کرتے ہوئے ہمیں غور و فکر کی دعوت دیتا ہے۔

شاعر۔ بمبئی

سیماب نے بچوں کے لئے جہاں تعلیمی، اخلاقی اور دعائیہ نظمیں لکھی ہیں، وہیں ہمیں اُن کی ایسی نظمیں بھی ملتی ہیں، جو بچوں میں جوش اور ولولہ پیدا کرتی ہیں۔ ان میں حبّ الوطنی کے جذبات کو بیدار کرتی ہیں اور ان کے دلوں میں قوم کی محبت کے شعلوں کو تیز تر بناتی ہیں۔ "وطن کی لگن" اور "میں لکھ پڑھ کے بڑا نام کروں گا" اِسی قبیل کی ہیں۔

سیماب کی ایک اور اہم خصوصیت جس پر ہم نے اب تک توجہ نہیں کی ہے، اُن کی نظموں کے ہیئتی تجربے ہیں۔ یہ تجربے سیماب کی پختگیٔ فن اور جدتِ طبع کی شہادت دیتے ہیں، لیکن تعجب کا مقام ہے کہ جب ہم "نظم جدید کی کروٹیں" دیکھتے ہیں۔ یا اُردو نظم میں ہیئتی تجربوں کی تاریخ لکھتے ہیں تو سیماب کا نام ذہن میں نہیں آتا۔ جن ہیئتی تبدیلیوں اور تجربوں کو ہم جدید سمجھتے ہیں، سیماب نے بہت پہلے اُن کی طرف پیش قدمی کی تھی۔ اُنھوں نے بے شمار ہیئتی تجربے کئے اور اِس ضمن میں اپنے شاگردوں کو نئی راہیں دکھائیں۔ جدید اُردو شاعری میں بلینک ورس اور فری ورس کی عمر کچھ زیادہ نہیں ہے۔ سردار جعفری، فیض احمد فیض، مخدوم محی الدین اور دوسرے شعراء نے ہیئتی تبدیلیوں کو اپنی نظموں میں بڑی کامیابی سے برتا لیکن واقعہ یہ ہے کہ تقریباً ۱۹۲۲ء میں جبکہ اُردو کے کسی دوسرے شاعر کا ذہن اِس طرف گیا بھی نہ تھا اور مغرب کے اسالیبِ نظم کو کسی نے چھوا تک نہیں تھا، سیماب نے بلا جھجک مغربی اسلوبِ نظم کو اپنی نظم "عیدِ قرباں" میں منتقل کر دیا۔ اُن کی یہ نظم خاصی طویل ہے۔ اِس کا فنّی تجزیہ کریں تو حیرت ہوتی ہے کہ اتنی کامیاب کتابِ نظم اُردو کے ایک شاعر نے اب سے ساٹھ برس پہلے کہی تھی۔ مجھے یقین ہے کہ سیماب کی اِس اختراع نے آنے والی نسلوں کو مزید روشنی بخشی ہوگی۔ سیماب کے مجموعوں میں ہمیں کئی ایسی نظمیں ملتی ہیں جن میں سیماب کے ہیئتی تجربے بے حد کامیاب ہیں۔ اُنھوں نے انگریزی بحروں کو لیکر اُن پر طبع آزمائی کی، کچھ ردیفوں کی کمی بیشی سے نیا آہنگ پیدا کیا اور اِس رجحان کو آگے بڑھا کر نئی نسلوں اور صاحب پر بڑا احسان کیا۔ اُن کی اِس جدتِ طبع کو دیکھ کر پروفیسر عبدالقادر سروری کی اِس رائے سے اتفاق کرنا ہی پڑے گا کہ اسالیب کے اختراع اور تنوع کی مثالیں جو جدید دور کا حصہ ہیں۔ جیسی سیماب کے ہاں نظر آتی ہیں دوسرے شعراء کے یہاں کم نظر آئیں گی۔"

سعدی اور حافظ سے سیماب نے بھی استفادہ کیا لیکن اتنا نہیں جتنا اقبال نے۔ سیماب نے مغربی ادب کا مطالعہ بھی ضرور کیا تھا مگر اس سے زیادہ اثرات قبول نہیں کئے۔ سیماب میں زبردست مشرقی حمیت تھی۔

(زمانہ صفحہ ۲۷ جدید ...)

میرا وطن

جہانِ نور بنا ہے، مرے وطن کے اُفق سے — طلوعِ رنگ و ضیا ہے، مرے وطن کے اُفق سے
ہے آفتاب کا مولد، سواد میرے وطن کا — فروغِ جلوہ نما ہے، مرے وطن کے اُفق سے
نظر اُفق پہ جو پہنچی تو میں نے رات کو دیکھا، — کہ چاند جھانک رہا ہے، مرے وطن کے اُفق سے
گھٹائیں جھوم کے آتی ہیں صرف میرے وطن میں — نزولِ آبِ بقا ہے، مرے وطن کے اُفق سے
ہے اک احاطۂ فطرت، فصیل میرے وطن کی — فسانہ ریزِ فضا ہے، مرے وطن کے اُفق سے

یہیں نمودِ سحر ہے وجودِ شام یہیں ہے
غرض فرائضِ فطرت کا اہتمام یہیں ہے

دمِ سفر مگر اک شعبدہ نیا نظر آیا — نہ آفتاب نہ مہتاب دوسرا نظر آیا
جہاں گیا، وہیں فطرت کو ایک رنگ میں دیکھا — وہی سحر، وہی انداز شام کا نظر آیا
تجلیاں وہی مشرق میں نورِ مہر کی دیکھیں — وہی اُفق میں مجھے چاند ڈوبتا نظر آیا
وہی ستارے نظر آئے آسماں پہ فروزاں — وہی گھٹاؤں میں شعلہ سا کوندتا نظر آیا
بڑھا میں جتنا، بڑھی اتنی ہی یہ محفلِ فطرت — جدھر گیا میں، اُدھر ہی یہ ماجرا نظر آیا

جو اہتمام کسی اپنی رہگذار میں دیکھا
وہی نظام ہر اک شہر ہر دیار میں دیکھا

کھلا یہ راز، ہیں باطل قیود میرے وطن کی — ہیں بے نیازِ تعین حدود میرے وطن کی
جہانِ فکر سے باہر مرے وطن کی حدیں ہیں — نہیں اسیرِ نظر ہست و بود میرے وطن کی
سمک سے تا بہ سما ہے مرے وطن کی تجلی! — ثریٰ سے تا بہ ثریا نمود میرے وطن کی
یہ شش جہات ہیں میرے وطن کا تکیۂ پہلو — زمیں سے ہے عرش پہ صرفِ سجود میرے وطن کی
مشاہدے کے لئے چاہیئے نگاہ میں وسعت — بہت وسیع ہے بزمِ شہود میرے وطن کی

زمیں میرا وطن، آسماں میرا وطن ہے
یہ فیصلہ ہے کہ "سارا جہان میرا وطن ہے"

سیماب اکبر آبادی

بچمن درآ

دیکھ وقتِ صبح گلہائے شگفتہ کی شفق!
آئینہ ہے بزمِ فطرت کا ہر اک رنگیں ورق
دیکھ کلیوں کی صبوحی میں شرابِ لالہ فام
صبح کے رنگوں سے اُس کے ڈھالنے کا اہتمام
دیکھ پھولوں کی رگوں میں زندگی چڑھتی ہوئی
قوتِ بالیدگی سے تازگی بڑھتی ہوئی!
دیکھ اِس رنگینی و نزہت سے رس بہتا ہوا
نورِ فطرت آشیاں سے تا قفس بہتا ہوا
دیکھ اِس صد رنگ خاموشی میں جوشِ گفتگو
نغمۂ شبنم سے پیدا گرمیِ آوازِ ہو
دیکھ شاخوں میں خمِ محرابِ طاعت کی ادا
جھوم کر ہر بار جھکنے میں محبت کی ادا
دیکھ بزمِ رنگ و بو کو غور کی نظروں سے دیکھ
کیا عیاں ہوتا ہے اِن مہکے ہوئے جلووں سے دیکھ
اکتسابِ فیض کر کے اِس تکیّف زار سے
سرخوشی دل کی بڑھا لے بادۂ اسرار سے

شاعر۔ بمبئی

رنگین تیتری

راتیں بسانے والی، دِن جگمگانے والی
تکلیف سہنے والی اور مسکرانے والی
محکوم ایک گُل پر قربان ہونے والی
اپنے ہی رنگ و بُو سے حیران ہونے والی
عصمت کے گلکدے میں پابندیٔ حرم
اُڑنے لگے تو نکہت، گرنے لگے تو شبنم
دامانِ گل سے، مستی بن کر اُلجھنے والی
اوراقِ گل کو اپنی دنیا سمجھنے والی
نازک سی موجِ رقصاں، رنگیں سی ایک بجلی
بہکا ہوا سا شعلہ، دہکی ہوئی سی مستی
لرزاں سا اک ستارہ، رخشاں سا ایک جگنو
پر بستہ ایک کویل، محترم رم اک آہو
جذبات کی فضا میں اک ذرۂ پریدہ!
رنگوں کے اِرتقا میں اک نقشِ برگزیدہ
کاہیدہ سا ترنم، خوابیدہ سا ترانہ
پُرجوش کیفِ بادہ، خاموش اک فسانہ

صد رنگ پھول جس میں مردوں کی زندگی ہے
عورت اُسی چمن کی رنگین تیتری ہے

سیمابؔ کی غزلیہ شاعری میں سیاسی رنگ و آہنگ

ڈاکٹر افتخار احمد
صدر شعبۂ اُردو و فارسی - ایم - جے - کالج - جمشید پور (بہار شریف)

عام شعرا کی طرح سیماب اکبرآبادی کی شاعری کی ابتدا بھی غزل ہی سے ہوئی۔ ولی سے لیکر میرؔ و غالبؔ اور داغؔ و امیرؔ تک، غزل نے کئی چولے بدلے۔ مگر داغ کے بعد جب قدیم تہذیب و تمدن کے ڈھانچے میں تبدیلی ہونے لگی تو سماجی انقلاب اور نظریات نے شاعری پر بھی اپنا اثر ڈالنا شروع کر دیا۔ نئی بیداری کی لہر نے ہمارے شعرا کو اپنی شاعری کا جائزہ لینے پر مجبور کیا۔ حالیؔ، آزادؔ، شبلیؔ اور نذیر احمد نے وقت کے مطالبات کے پیشِ نظر اس میں تبدیلیاں کرنے کا بیڑا اُٹھایا۔ ان کی آواز پر لبیک کہنے والوں میں بعد کے آنے والے شعرا اکبرؔ، اسمٰعیل میرٹھی اور چکبست وغیرہ نے جب اصلاحی قدم اُٹھایا تو تلامذۂ داغ میں سے بجز اقبالؔ اور سیمابؔ کوئی ایسی شخصیت نہیں اُبھری جس نے اپنے معاصر اساتذہ سے علاحدہ اپنی شاعری کی عمارت کھڑی کی ہو۔ یہ دونوں جانتے تھے کہ وقت کے تقاضے کیا ہیں اور ہماری غزل کو اگر زندہ رہنا ہے تو اُسے نئے نئے موضوعات، عنوانات کے ساتھ ترقی پسند عناصر کو بھی اپنے اندر سمونا ہوگا۔ غزل کی تنگنائے میں وسعت پیدا کرنے کے لئے اُسے ہر قسم کے علمی و ادبی مسائل کے علاوہ اصلاحی، سماجی، سیاسی اور انقلابی عناصر کو بھی اپنانا ہوگا۔ چنانچہ جہاں اُنھوں نے نظم نگاری کے ذریعہ قومی اصلاح اور وطنیت کے گیت گائے، وہیں اُردو غزل کو بھی نئے نئے اُفق عطا کئے۔ نئی نئی پیدا ہونے والی تحریکات اور نئے رجحانات سے غزل کے دامن کو بھر دیا۔ غزل کی نوک پلک کو درست کر کے اُسے اس قابل بنایا کہ وہ وقت اور ماحول سے مطابقت کرتے ہوئے زندگی کے ٹھوس حقائق سے رُوگردانی نہ کر سکے۔ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ غزل کے پرستار اور نظم کے شیدائی ایک دوسرے کو حریف سمجھ کر باہم اُلجھ پڑے۔ ان ہی میں جدید ذہن رکھنے والے بعض ایسے حضرات بھی تھے جو قدیم روایات سے اپنا رشتہ نہ توڑ کر غزلیہ شاعری میں کسی تبدیلی کے خواہاں تھے۔ مگر وہ کوئی نمایاں تبدیلی لا نہ سکے۔ اُن کے ماحول اور قدامت پسندی کے دباؤ نے اُنھیں آگے نہ بڑھنے دیا۔

سیمابؔ اکبرآبادی کے خطباتِ شاعری اور اُن کی غزلوں کے دونوں مجموعوں کلیم عجم اور سدرۃ المنتہیٰ کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ وہ میانہ روی، اعتدال اور سنجیدگی کے نظم و غزل دونوں اصنافِ سخن میں حامی تھے۔ غزل میں فلسفہ اور تفکر، علوئے تخیل اور معنی آفرینی و بداعتِ بیان، تراکیب کی چستی اور فکر و فن کے حسین امتزاج سے اُنھوں نے ایک نیا رنگ و آہنگ پیدا کیا۔ جس میں میرؔ کا سوز و درد بھی ہے اور غالبؔ کا فلسفہ اور شکوہِ الفاظ بھی، اس کے ساتھ زبانِ داغ کی سلاست و روانی بھی ہے۔ سیمابؔ کے کسی سخت سے سخت نقاد کو اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ سیمابؔ نے غزل کے ارتقا اور اُس کے تحفظ میں ایک اہم رول ادا کیا۔

سیمابؔ نے غزل گوئی کو گردن زدنی تو قرار نہیں دیا لیکن اپنے دَور کی غزل کے رنگ و آہنگ سے وہ سخت نا مطمئن تھے۔ وہ محسوس کر رہے تھے کہ غزل وقت کا ساتھ نہیں دے رہی ہے، اسی لئے وہ نظم گوئی پر زیادہ زور دیتے ہیں۔ دوسری طرف غزل کی اصلاح کی طرف بھی متوجہ رہے۔ اپنے خطبات میں غزل پر سخت تنقیدیں کی۔ بعض شعروں میں بھی لے دے کی اور خود غزل میں جدید افکار و خیالات کو سمونا شروع کیا۔ اُنھوں نے قدیم رنگِ سخن کو بے فصل کا نغمہ قرار دیا ؎

سیمابؔ غزل گوئی اب اِس کے سوا کیا ہے
بے فصل کا اک نغمہ بے وقت کی شہنائی

ایک شعر میں یوں تشویش ظاہر کی ؎

عجب کیا، دَور اگر سیمابؔ اِس کا ختم ہو جائے
غزل اب آخری شب کی فغاں معلوم ہوتی ہے

غزل کو عصری رُجحان دینے کے لئے اُنھوں نے غزل میں سیاسی اور سماجی مسائل کو داخل کیا۔ مگر غزل کی زبان اور اُس کے تغزل کو پوری طرح برتتے

شاعر بھی

ہوئے اس نوع کے اشعار کہے ؎

ظلم سے بڑھتا ہے سوزِ زندگی مظلوم میں
رفتہ رفتہ صید کو صیّاد ہونا چاہیئے

سیمابؔ سے پہلے غزل میں کسی نے یہ رنگ نہیں بھرا تھا ؎

جب کوئی تعمیر بے تخریب ہو سکتی نہیں
خود مجھے اپنے لئے برباد ہونا چاہیئے

اس میں شک نہیں کہ سیمابؔ کی غزلیہ شاعری میں داخلیت اور خارجیت پہلو بہ پہلو نظر آتی ہے اور دونوں کا ایک حسین امتزاج ملتا ہے۔ انھوں نے غزل میں سیاسی اور سماجی موضوعات کو سمونے کے علاوہ انسانیت کے نغمے بھی سنائے۔ ندرتِ خیال اور اپنی شگفتہ بیانی سے غزل کے مرتبے کو بڑھایا۔ وہ خود کہتے ہیں ؎

فکر کو سیمابؔ آزادی کی دے کر وسعتیں
مرتبے ہم نے غزل کے بے نہایت کر دیئے

یہ آزادی لقیدِ فن خیالات کی نئے موضوعات کی نئے علامتوں استعاروں اور تراکیب کے نئے پن کی ہے۔ غزل کے بندھے ٹکے روایتی تصوّر سے انحراف کی ہے۔ اُن کے یہاں شکوہِ الفاظ سے ایک ایسی فضا تیار ہوتی ہے، جو اُنھیں اُن کے دَور کے دوسرے شعرا سے مُتمائز کرتی ہے۔

بقول ماہرالقادری:

"سیمابؔ اکبر آبادی کی سب سے بڑی خصوصیت اُن کا غیر معمولی شکوہ GRANDEER ہے۔ وہ سامنے کی بات کو بھی فکر کے ہمالیہ پر چڑھ کر کہتے ہیں۔ اس لئے اُن کے طوفانی نغموں سے سامع فوراً مانوس نہیں ہوتا۔"

چند مثالوں سے یہ بات واضح ہو جائے گی ؎

مرے مشرب کی ہوتی کس طرح تبلیغ گلشن میں
اگر بنتی نہ پیغمبر صدا زنجیرِ زنداں کی

حجابِ رنگ و بُو میں حسنِ فطرت جلوہ فرما ہے
چمن کی رُوح نکلے گی جو پھولوں کی رگیں چیریں

گرفتگی ہے کمالِ شگفتگی کا مآل
ہر ایک پھول ہے رنگین انتباہ مجھے

حریمِ حسن، فردوسِ محبت، کعبۂ فطرت
خدا جانے وہ کیا کیا ہے جسے میں دل سمجھتا ہوں

شاعرِ بمبئی

مگر جب وہ عشق و محبت کی باتیں کرتے ہیں یا وحشت و جنون کی تو سادگی و پُرکاری کے ساتھ ساتھ فراوانیِ جذبات سے تاثرات کا طوفان اُٹھتا ہوا محسوس ہوتا ہے، جس سے کوئی صاحبِ دل اثر گرفتہ ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ایسے بے شمار اشعار مثال کے طور پر پیش کئے جا سکتے ہیں، میں یہاں صرف وہ دو شعر پیش کر رہا ہوں جو زبان زدِ خاص و عام ہیں۔ ؎

محبت میں اک ایسا وقت بھی آتا ہے انساں پر
ستاروں کی چمک سے چوٹ لگتی ہے رگِ جاں پر

کہانی میری رُوداد جہاں معلوم ہوتی ہے
جو سُنتا ہے، اُسی کی داستاں معلوم ہوتی ہے

سیمابؔ کی غزلوں میں تصوّف کی چاشنی بھی ملتی ہے۔ اُن کے متصوّفانہ اشعار پڑھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اقبالؔ ہی کی طرح رومیؔ سے متاثر ہیں، متصوّفانہ اشعار کی تعداد بھی اُن کے کلام میں کافی ہے۔ محض نمونے کے لئے چند شعر پیش کرتا ہوں۔

اگر عرفانِ ذرّہ ہو تو ہر ذرّہ ہے اک دنیا
بیاباں ہی تو۔ ہے اپنی جگہ ملتی بیاباں کی

اسی خیال کو دوسرے انداز میں یوں بیان کیا ہے ؎

یہاں ہر جُزو میں بھر دی گئی ہیں قوتیں کُل کی
وہ ذرّہ ہی نہیں ہے جو بیاباں ہو نہیں سکتا

جُزو کا کُل میں سمانا ہی تو ہے کُل ہونا
آہ وہ قطرہ جو گھبرا کے سمندر سے چلا!

قطرہ دریا ہے اگر شاملِ دریا ہو جائے
ذرّہ اس بھید کو پا جائے تو صحرا ہو جائے

بیدا کُن جلوہ بھی پردہ ہے نظر کا
ہر وقت اسی پردۂ حائل کی طرف دیکھ

حریمِ عرش، محرابِ حرم، طاقِ صنم خانہ
اگر تم ہو نگاہوں میں، تو سب کچھ ہے نگاہوں میں

مری کیا انتہا ہو، جب نہیں ہے ابتدا کوئی
میں تھا موجود ارادوں میں کسی کے جب نہ تھا کوئی

قناعت، غرور، استغنا اور خودداری کے تعلق سے بھی سیمابؔ کے یہاں اشعار کی بہتات ہے۔ اُن کا عشق بڑا خوددار ہے۔ سیمابؔ کی عشقیہ شاعری کی سب

[illegible] ہے

دعا جائز نہ ہوتی مگر مانگو تو کیا مانگوں؟
سمجھتا ہوں کہ میں دنیا بداماں ہو نہیں سکتا

رکھئے مری نزاکتِ احساس کا خیال
پھولوں کا ہوں مزاج طبیعت بہار کی

سیماب ہیں یہ راہ قناعت کی ٹھوکریں
پہچانتا ہوں خوب تاج و کلاہ کو

یہ فرض کیوں نہ قدم پر ترے ادا کرتے
نمازِ عشق تھی سجدے زمیں پہ کیا کرتے

سیماب کس نے عرش سے آواز دی مجھے
کہدو کہ انتظار کرے آ رہا ہوں میں

یہ تو سیماب کی غزلیہ شاعری کے مختلف رنگوں کا ایک ہلکا سا عکس ہے۔ میں دراصل اُن کے سیاسی غزلیہ اشعار کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں جس اعتبار سے وہ اپنے دور میں مجھے منفرد نظر آتے ہیں۔ سیاسی اشعار مولانا حسرت موہانی کی غزلوں میں بھی ملتے ہیں لیکن اتنی کثرت سے نہیں جتنی کثرت سے سیماب کی غزلوں میں پائے جاتے ہیں۔ سیماب نے سیاست کو اپنی غزلیہ شاعری کا جزو لاینفک اور ایک مستقل موضوع بنا لیا تھا۔ سیماب کا ہر جنتی سیاسی شعور عصری مسائل کا تجزیہ اور آزادی کامل کی تڑپ حسرت سے بہت مختلف ہے۔ انھوں نے جس طرح اپنی نظموں میں ملک کے حالات و مسائل کا نقشہ کھینچا اور قوم کو دعوتِ عمل دی اُسے نغماتِ آزادی سے سرشار کیا اُسی طرح غزلوں کے متفرق اشعار میں سیاسی حالات پر گہرے تبصرے کئے ہیں۔ اس نوع کے اشعار میں کہیں انھوں نے گہری اشاریت سے کام لیا ہے اور کہیں کھل کر اپنے جذبات و خیالات کا اظہار کیا ہے۔ غزلیہ شاعری میں یہ سیماب کا ایسا کارنامہ ہے جسے بھلایا نہیں جا سکتا۔ ان کے سیاسی اشعار میں احساس کی گرمی ہے جذبات کا شور ہے۔ وہ نہ صرف آزادی کے متوالے اور وطن کے سچے پرستار ہیں بلکہ پامردِ آزادی بھی ہیں

جلتے وہ پامردِ آزادی اگر ملتی رہائی بھی
تو میں زنجیرِ زنداں کو سر آنکھوں سے لگا رکھتا

ہے پاؤں زنجیر میں تو کیا ہے
مرا ہاتھ ہے انقلاب جنوں تک

ان کے احساسِ آزادی کی وسعت گہرائی اور گیرائی ملاحظہ کیجئے۔

فقط احساس ہو زنداں سے آزادی کی بابت
[illegible] گر کا ہے وہ [illegible]

شاعر [illegible]

وہ دیکھ رہے تھے اور محسوس کر رہے تھے کہ قوم کے قدم منزلِ آزادی کی طرف تیزی کے ساتھ بڑھ رہے ہیں، بس افرادِ قوم کو مسلسل پکارتے رہنے کی ضرورت ہے۔

انگڑائیاں لینے ہی کو ہیں تاننے والے
آواز دیئے جائے حُدی خواں کوئی دن اور

اُن دنوں زندان و سلاسل شاعری کی بڑی اہم علامتیں تھیں۔ سیاسی رہنماؤں اور جنگِ آزادی میں حصّہ لینے والے پُرجوش عوام کو جیلوں میں ٹھونسا جا رہا تھا مگر سیاسی رہنما جیلوں سے بھی پیامِ آزادی دیتے رہتے تھے اور اُن کے جانشین پرچمِ آزادی لئے آزادی کی جدوجہد میں آگے بڑھتے ہی جاتے تھے۔ گرفتاریوں سے آزادی کی آگ دبائی نہیں جا سکتی تھی۔ اس نے تو شاعر کو اور گرم نوا بنا دیا۔

صیّاد دے رہا ہے سبق صبر و ضبط کا
قیدِ قفس ہے سلسلۂ آگہی مجھے

اے انقلاب گرم نوا تو نے کر دیا
کل تک تو آہ کی بھی اجازت نہ تھی مجھے

سیماب کو اپنی ذات اور جدوجہد پر بڑا اعتماد تھا۔ ملک کے منقلب سیاسی حالات میں ایک وقت ایسا بھی آیا کہ رہنمایانِ قوم مصلحت پسندیوں کا شکار ہو گئے اور سیاسی جماعتوں کے اختلاف نے اُس عوامی تحریک کو کمزور کرنا شروع کر دیا۔ اُس وقت سیماب نے بڑے اعتماد سے کہا۔

راہ بر ہٹ جائیں میرے جادۂ دشوار سے
اپنی ہر ٹھوکر میں اک منزل نثار رکھتا ہوں میں

ذیل کے دو شعروں میں جذبۂ آزادی کا جو تیز آہنگ ہے اور عزم و ارادہ کا جو بانکپن وہ بیحد قابلِ داد ہے۔ سیماب کے آزادیٔ کامل کے تصوّر کی گہرائی دیکھئے۔

بلا سے خونِ جگر کتنا پڑے بیچنا اپنا
مگر شگفتِ نظرِ صبحِ لالہ زار رہے

یہ اب کے جوشِ جنوں کا نیا تقاضا ہے
کہ باغباں نہ رہے باغ میں بہار رہے

اسی کا نام ہے دراصل کامل آزادی
کہ تیرے دل پہ کسی کا نہ اختیار رہے

قفس اور آشیاں کی علامتوں سے بھی سیماب نے اپنی سیاسی شاعری میں بڑا کام لیا ہے۔ [illegible] کی غزلوں میں تو قفس اور آشیاں کی اصطلاحوں میں بے شمار اشعار مل جاتے ہیں۔ یہاں صرف تین شعر پیش کرتا ہوں۔

قفس اصلی وہی ہے اصطلاحِ اہلِ باطن میں
تجھے جو چیز اپنا آشیاں معلوم ہوتی ہے

قفس میں کھینچ لے جائے مقدر یا نشیمن میں
ہیں پروانے سے مطلب ہے جلتی ہو ہوا کوئی

وسعتِ خاطر سلامت ذوقِ آزادی بخیر!
جب قفس کو میں نے پھیلایا گلستاں ہو گیا

آزادی کے بعد وہ وقت بھی آیا جب اہلِ وطن نے خود کو خانوں میں بند اور تقسیم کر لیا۔ سیماب اس محدودیت سے گھبرا کر کہتے ہیں۔

چھین لیں فکرِ نشیمن نے مری آزادیاں
جذبۂ پرواز محدودِ گلستاں ہو گیا

مگر پھر ایک عزم بالجزم سے تہیہ کرتے ہیں۔

اک نئی دنیا بنانی ہے بتہِ چرخِ کہن
قسمت توڑ کے آیا ہوں بہ تقدیرِ چمن

۱۹۳۱ء میں یہ جذبہ زیادہ شدت اختیار کر جاتا ہے اور ان کی غزلوں میں کئی کئی شعر آزادی کے تعلق سے مختلف تاثرات و خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔ ذیل کے چند اشعار بڑی اہمیت اور رمزیت کے حامل ہیں۔

ہم اک کارسِ محبت تھے ہم اک پیغامِ آزادی
بھلا دیتے ہیں اہلِ چمن تو یاد کیا کرتے؟

خدا دُشمن ہے شیخ و برہمن سرِ بتاؤ ہیں
شوالے کیا بسانے مسجدیں آباد کیا کرتے؟

ہمارے دم سے جاری کاروبارِ دام و دانہ ہے
گلستاں میں نہ ہوتے ہم تو یہ صیاد کیا کرتے؟

قفس کیا ہم نے بُنیادِ قفس کو بھی ہلا ڈالا
تکلف بر بنائے فطرتِ آزاد کیا کرتے؟

اس کے بعد کی غزل بھی پوری کی پوری سیاسی اشاریت لئے ہوئے ہے۔ اس کا ایک شعر دیکھئے۔

کیا تم کو یہ معلوم ہے اے قافلے والو
خود قافلہ سالار ہے بیگانۂ منزل

حصولِ آزادی کے لئے وطن والوں کی خاطر شاعر نے کیا کردار ادا کیا، اس کا اظہار یوں کرتے ہیں۔

غلامی کی فضاؤں میں نیا پھونکا فسوں میں نے
کیا اعلانِ آزادی بہ اندازِ جنوں میں نے

شاعرِ بےبسی

جو لوگ آزادی کے بعد بہت مایوس ہو رہے تھے اُن سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں۔

ناز بیجا ہے ترا کوششِ آزادی پر
یہ تو انساں کی فطرت ہے کہ آزاد رہے

آزادی کے فوراً بعد جب فرقہ وارانہ فسادات نے ملک کو تہ و بالا کر دیا لاکھوں گھر اور خاندان اُجڑ گئے۔ اس صورتِ حال سے سیماب بہت متاثر ہوئے۔ اُن کا ایک دردناک شعر سُنئے۔

اُجڑا اور ایسی شان سے اُجڑا مرا چمن
یہ بھی پتہ نہیں کہ بنایا تھا گھر کہاں

ایک دوسرے شعر میں اس سے بھی زیادہ دردناک بات اُنھوں نے کہی۔

ہر شاخ پر ہیں میرے گریباں کی دھجیاں
پھولوں سے پوچھ لو کہ لُٹا ہوں بہار میں

اس شعر کا تو کوئی جواب ہی نہیں ہے ؎

ہے غارتِ چمن میں یقیناً کسی کا ہاتھ
شاخوں پہ انگلیوں کے نشاں دیکھتا ہوں میں

مگر جب اُنھیں حالات کچھ اُستوار ہوتے نظر آتے ہیں اور انقلابِ نو کی آمد کا اک شور سنائی دینے لگتا ہے تو وہ اپنی فکر کا رُخ بھی بدلتے ہیں۔ ذیل میں جس غزل کے اشعار میں پیش کر رہا ہوں اُس کے تمام اشعار سیاسی اشاریت کی وجہ سے ایک مسلسل نظم کی صورت اختیار کر گئے ہیں۔

بیاں کر رہا ہوں بھری انجمن میں — حدیثِ وطن اصطلاحِ چمن میں
ودیعت ہوئی تھی جو خاکِ وطن کو — وہ عظمت ہے محفوظ خاکِ وطن میں
نظامِ کہن ٹوٹتا جا رہا ہے — شباب آ رہا ہے نئے پیرہن میں
نشیمن اُجڑ کر قفس بن رہے ہیں — قفس اب نشیمن بنیں گے چمن میں

تبدیلیوں کا اتنا گہرا ادراک و اظہار کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ یہ غیر معمولی فکر و شعور رکھنے والا شاعر ہی کر سکتا تھا۔

دنیا کے انقلابات سے درس دیتے ہوئے، وطن کے لوگوں کو آمادۂ انقلاب کرنے اور ہمت کوش بنانے کے لئے وہ یوں حوصلہ دیتے ہیں۔

ایسے بھی ہم نے دیکھے ہیں دنیا پر انقلاب — پہلے جہاں قفس تھا وہیں آشیاں بنا
بہ شہ لوطن میں ہے تو غبارِ چمن نہ بن — ممکن بقدرِ حوصلۂ باغباں بنا

وہ صنم پرستی کے مضمون پر یوں طنز فرماتے ہیں۔

سارے چمن کو میں تو سمجھتا ہوں اپنا گھر — تو آشیاں پرست ہے جا آشیاں بنا

ملک میں زبان و خیال پر پابندیوں کے خلاف خود اپنے آپ سے یوں شکایت

ے ہیں۔

زادگیٔ زباں ہے نہ آزادیٔ خیال سیماب کیوں میں شاعرِ ہندوستاں بنا؟

میدانِ وطن کے خون کو صبحِ بہار کی رنگینی قرار دیتے ہوئے اُنھوں نے

خیانہ انداز میں کیا خوب شعر کہا ہے۔

میدانِ وطن کی خاک تھی اصلِ گلِ لالہ خزاں کے خون میں لتھڑی ہوئی صبحِ بہار آئی

میں یقین تھا کہ ہماری کوششیں رائگاں نہ جائیں گی اور آزادی کا سورج طلوع ہو گا

مسلسل کا اثر دیکھ رہے ہیں ظلمت میں ہم آثارِ سحر دیکھ رہے ہیں

ن کو پنجۂ محکومی سے چھڑا لینے اور تباہی سے بچا لینے کے بعد ایک بڑی

یت مندانہ بات فرماتے ہیں۔

پہلے تو نشیمن کی تباہی پہ نظر تھی اب حوصلۂ برق و شرر دیکھ رہے ہیں

ی سال کے مسلسل ہیجان و انتشار، بدامنی، بےچینی اور آزادی کے بعد کے تحریک

ے سیماب نے یہ منطقی نتیجہ نکالا کہ ہندوستانیوں کے دلوں میں ایک نہفتہ سوز ہے۔

چمن کے سوزِ نہفتہ کا مسے ہی ہے پتہ یہ ایک جنبشِ پیہم جو برگ و بار میں ہے

وہ ابنائے وطن کو متنبہ کرتے ہوئے یہ بھی یاد دلاتے ہیں۔

مطمئن حال سے دنیا کے نہ ہو دیوانے نہیں معلوم گھڑی بھر میں یہاں کیا ہو جائے

اسی غزل اور اسی زمین میں اُن کا درج ذیل شعر اُن کے ذاتی کرب، اُن کی اپنی

بےچینی اور مایوسی کا پُرسوز اظہار ہے۔

ہمیں خود راس نہیں آب و ہوائے گلشن چار دن اور کسی ڈھب سے گزارا ہو جائے

"چار دن" اور "کسی ڈھب" کی معنویت پر غور کیجئے۔ یہ بےکسی اور بےبسی کی انتہا ہے۔!

درسِ عمل اور تجزیۂ حالات جو سیماب کی سیاسی شاعری کا خاصہ ہیں، اُس

دور کی اُن کی تمام غزلوں میں اُس کا بھرپور عکس ملتا ہے۔

بجائے ہاتھ اٹھانے کے اپنے پاؤں اٹھا دعا تو رسمِ اثر کے سوا کچھ اور نہیں

کہاں تک اُس میں پیدا ہمتِ منزل رسی ہو گی قدم اٹھتے ہی جو سوچے کہ منزل آ گئی ہو گی

سیماب کا خیال تھا کہ جو یہاں ثبوتِ زندگی دے گا اُسی کو منزل ملے گی۔ بربادیوں سے

ڈرنا درماندگی کی نشانی ہے۔ دراصل تخریب ہی میں تعمیر کا راز مضمر ہے۔ ضرورت

بلند ہمتی اور عالی حوصلگی کی ہے۔

ڈر کیا بربادیوں سے ظلم کے آثار چمکیں گے لگی آگ آشیاں میں تو قفس تک روشنی ہو گی

اُس وقت جب ہندوستان "انقلاب" کی آماجگاہ بنا ہوا تھا اُنھوں نے ببانگِ دہل

کہا تھا

نہیں ہے انقلاب آباد میں فرصت کی گنجائش جئے گا وہ جسے حالِ جمالِ زندگی ہو گی

"پردۂ انقلاب" میں جو جو منظر تھے سیماب دیکھ رہے تھے، ملک میں جو کچھ

شاعر بھی

بجلی تھی جتنا بھی چاہا تھا وہ اُسے انقلاب کا پیش خیمہ سمجھتے تھے

مُفلسی کی فرقت کی شبِ سیہ ظلمت مآب ہی ہے

دیکھنے کے قابل ہو پردۂ انقلاب میں ہے

پھر قوم کے احساس و شعور پر فخر کرتے ہیں۔

یہ احساسِ شاعر ہی کا شعور ہے تمام اس کا

یہ حال سمجھ کر مرے وطن کا، دیا گیا ہے نہ خواب میں ہے

اور اس عالمِ سُکر کو وہ شدت سے محسوس کرتے ہوئے فرماتے ہیں

ترا سکوت وہ مجموعۂ پیغامِ مرگ انجام کار لایا

میں کب سے چلا رہا تھا غافل کہ زندگی انقلاب میں ہے

پھر مژدہ دیتے ہیں۔

چمن کی تبدیلیوں سے پہلے تو اپنے حالات بھی بدل دے

ابھی تو تمہید ہی پڑی ہے، ابھی تو دیرِ انقلاب میں ہے

اس کے بعد اس دور کے حالات کے پیشِ نظر، جن سے ساری دنیا لرز رہی

تھی، فرماتے ہیں۔

تجھے ہے فکر اپنے ایک گھر کی یہاں جہان انقلاب میں ہے

چمن پہ جب عمرِ ہمیں خطر میں تو آشیاں کس حساب میں ہے؟

۱۲ اشعار کی اس غزل میں ۷ شعر تصورِ انقلاب پر مبنی ہیں اور سیماب نے

اُن میں کیسا انقلابی جذبہ بھر دیا ہے، اہلِ نظر ہی اس کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔

میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی رائے پر اس مضمون کو ختم کرتا ہوں اور نقادانِ فن

سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ سیماب کی غزلیہ شاعری کے سیاسی رنگ و آہنگ

پر بھرپور توجہ دیں۔

"سیماب کی غزلوں میں جگر و حسرت کی غزلوں کا سا لوچ اور

چلبلا پن نہ ملے گا کیونکہ وہ صرف حسن و عشق کی چھیڑ چھاڑ

اور مسائلِ تصوف کی چھان بین کے خیال سے غزل نہیں

کہتے تھے، بلکہ زندگی کے رُخ سے اُس اضمحلال، کسالت

اور انفعالیت کو دُور کرنا چاہتے تھے جو پوری قوم کو

موت کے قریب لا رہی تھی۔"

سیماب اکبر آبادی مرحوم

غزلیں

پیش کردہ: ڈاکٹر محمد رفیع

سبو پر، جام پر، شیشے پہ، پیمانہ پہ کیا گذری
نہ جانے میں نے توبہ کی تو میخانے پہ کیا گذری

تو اپنے ہی مآلِ سوزِ غم پر غور کر پہلے
تجھے اِس سے نہیں کچھ بحث، پروانے پہ کیا گذری

کسی حکمت سے کر دے کوئی گویا مرنے والوں کو
یہ راز اب تک ہے سر بستہ کہ مر جانے پہ کیا گذری

کسی کو میرے کاشانے سے دلچسپی نہیں شاید
ہر اک یہ پوچھتا ہے میرے کاشانے پہ کیا گذری

نہ ہو جو زندگی انجام، وہ وجدان ناقص ہے
حضورِ شمع، بعدِ وجد پروانے پہ کیا گذری

وہ کہتا تھا خدا جانے بہار آئے تو کیا گذرے
خدا جانے بہار آئی تو دیوانے پہ کیا گذری

یہ ہے سیماب اک ناگفتہ بہ افسانہ کیا کہیے
وطن سے کُنجِ غربت میں چلے آنے پہ کیا گذری

(سنہ ۱۹۴۹ء)

شام - بمبئی

کہانی میری رودادِ جہاں معلوم ہوتی ہے
جو سنتا ہے اُسی کی داستاں معلوم ہوتی ہے

چمک جگنو کی برقِ بے اماں معلوم ہوتی ہے
قفس میں رہ کے قدرِ آشیاں معلوم ہوتی ہے

سحر تک سعیِ نالہ رائیگاں معلوم ہوتی ہے
یہ دُنیا تو بقدرِ یک فغاں معلوم ہوتی ہے

ترقی پر ہے روز افزوں خلش دردِ محبت کی
جہاں محسوس ہوتی تھی وہاں معلوم ہوتی ہے

ہوائے شوق کی قوت وہاں لے آئی ہے مجھ کو
جہاں منزل بھی گردِ کارواں معلوم ہوتی ہے

قفس کی تیلیوں میں جانے کیا ترکیب رکھی ہے؟
کہ ہر بجلی قریبِ آشیاں معلوم ہوتی ہے

نہ کیوں سیماب مجھ کو قدرِ ہو ویرانیِ دل کی
یہ بنیادِ نشاطِ دو جہاں معلوم ہوتی ہے

(سنہ ۱۹۲۸ء)

(پیش کردہ: گفتگو کار: رویندر جین)

○

محبت میں اک ایسا وقت بھی آتا ہے انساں پر
ستاروں کی چمک سے چوٹ لگتی ہے رگِ جاں پر

اسی سے روشنی پھیلی بساطِ بزمِ امکاں پر
محبت اک بڑا احسان ہے تاریخِ انساں پر

جنوں ہوتا تو اُڑتیں دھجیاں دامانِ ہستی کی
کمالِ ہوش ہے یہ ہاتھ کا رُکنا گریباں پر

نظامِ جزر و مد میں ہر نفس کی آمد و شُد سے
نئے ساحل کئے ہیں میں نے قائم موجِ طوفاں پر

نہ دنیا ہے نہ عقبیٰ ہے، نہ ہستی ہے، نہ مستی ہے
یہ سب ہنگامہ ہے میری نواہائے پریشاں پر

نہ رہ جائے یہیں نقشِ غلامی بعدِ آزادی
مری تصویر کس نے کھینچ دی دیوارِ زنداں پر

جب اے سیماب اُٹھتے ہیں کبھی الہام کے بادل
برس جاتے ہیں کچھ نغمے مرے قلبِ غزلخواں پر

(سنہ ۱۹۳۳ء)

(پیش کردہ: گفتگو کار: نیلم ساہنی)

○

دلِ آفت زدہ کا مُدعا کیا
شکستہ ساز کیا، اُس کی صدا کیا

میں اپنے حال سے خود بے خبر ہوں
تمہاری کم نگاہی کا گِلا کیا

دُعا دل سے جو نکلے کارگر ہو
یہاں دل ہی نہیں، دل سے دُعا کیا

قفس کی زندگی پھر زندگی ہے
غمِ ہنگامۂ رنگ و نوا کیا

ڈبوئی تھی جہاں طوفاں نے کشتی
وہاں سب تھے خدا کیا ناخدا کیا

نہ اِس پر اختیار اپنا نہ اُس پر
سرِ آغاز و فکرِ انتہا کیا

سلامت دامنِ اُمیدِ سیماب
محبت میں کسی کا آسرا کیا

(سنہ ۱۹۳۵ء)

(پیش کردہ، گلوکار: اختر آزاد)

○

ملولِ رہِ حیات سے گھبرا رہا ہوں میں
گھبرا رہا ہوں اور چلا جا رہا ہوں میں

کچھ یوں بھی ہے کہ فطرتِ غم ہے سکوں پسند
کچھ یہ بھی ہے کہ ضبط کیے جا رہا ہوں میں

چھوتی نہیں مجھے پرِ جبریلؑ کی ہوا
یہ کن بلندیوں پہ اُڑا جا رہا ہوں میں؟

مرکز پہ اپنے دھوپ سمٹتی ہے جس طرح
یوں رفتہ رفتہ تیرے قریب آ رہا ہوں میں

ہے حسن اک جھلک مرے عشقِ تمام کی
اپنی ہی اک ادا پہ مٹا جا رہا ہوں میں

وستم بخیر ہاتھ میں ہے زورِ انقلاب
ذرّوں کو آفتاب سے ٹکرا رہا ہوں میں

سیمابؔ کس نے عرش سے آواز دی مجھے
کہہ دو کہ انتظار کرے، آ رہا ہوں میں

(سنہ ۱۹۳۸ء)

(پیش کردہ، گلوکار: پنڈت گووند پرساد)

○

سرگشتہ و خرابِ بہار و خزاں رہے
برسوں ہم آشیاں میں بھی بے آشیاں رہے

سب چاہتے ہیں بزمِ جہاں میں نشاں رہے
یہ ہو، تو بے نشانیٔ عالم کہاں رہے؟

کچھ وقت کٹ گیا تھا تری یاد کے بغیر
ہم پر تمام عمر وہ لمحے گراں رہے

اندازۂ خموشیٔ صبحِ بہار کر
جب روحِ آشیاں نہ رہے، آشیاں رہے

واماندگی نے نقصِ طلب کو چھپا لیا
اچھے رہے جو گردِ پسِ کارواں رہے

یارب مری طرف ہے کچھ ان ہوا کا رخ
جب آشیاں جلے تو قفس تک دھواں رہے

سیمابؔ ہے خرابۂ عالم جنوں اثر
رہنا ہو جس کو خاک بسر وہ یہاں رہے

(سنہ ۱۹۳۳ء)

شاعر۔ بمبئی

سیمابؔ اور اُن کی شاعری

سید محمد زیدی

۸۲ - ابراہیم رحمت اللہ روڈ۔ بمبئی ۳

سیماب اکبرآبادی کے کلام کو باقاعدہ پڑھنے کا کبھی اطمینان سے موقع نہیں ملا تھا لیکن اُن کے بہت سے اشعار زبانی یاد تھے۔ تقریروں اور گفتگو میں اکثر اُن کے اشعار سنائے جاتے تھے جو بڑے سے بڑے مسئلے اور اُلجھاؤ کی باتوں کو ایک ہی شعر میں ادا کر دینے کی قوت رکھتے تھے۔ اپنی جوانی میں مجھے یاد ہے یہ شعر بہت پسند تھا۔

یہ کس نے شاخِ گُل لاکر قریبِ آشیاں رکھ دی
کہ میں نے شوقِ گُل بوسی میں کانٹوں پر زباں رکھ دی

اور یہ شعر تو اکثر گنگنایا کرتا تھا ؎

محبت میں اک ایسا وقت بھی آتا ہے انساں پر
ستاروں کی چمک سے چوٹ لگتی ہے رگِ جاں پر

اور یہ شعر تو آپ حضرات کو بھی یاد ہوگا ؎

دل کی بساط کیا تھی نگاہِ جمال میں
اک آئینہ تھا ٹوٹ گیا دیکھ بھال میں

نزاکتِ خیال کے لحاظ سے یہ شعر بھی بہت پسند تھا ؎

واقف نہ ہو کوئی مرے حالِ تباہ سے
چھپنا پڑا ہے خود مجھے اپنی نگاہ سے

اور یہ دو اشعار تو آج بھی میرے لئے حسبِ حال ہیں۔

شاید جگہ نصیب ہو اس گُل کے ہار میں
میں پھول بن کے آؤں گا اب کی بہار میں
عمرِ دراز مانگ کے لائی تھی چار دن
دو آرزو میں کٹ گئے دو انتظار میں

لیکن آج کے اس جلسے کے سلسلے میں باقاعدگی کے ساتھ سیماب اکبرآبادی کے کلام کو پڑھنا پڑا۔ اُن کی تصنیف شدہ کتابیں حاصل کرنے کے لئے کتب فروشوں کا دروازہ کھٹکھٹانا پڑا لیکن [illegible] جبکہ اب [illegible] سیماب صاحب کا مجموعۂ شعری بھی دو کتابیں "کارِ امروز" اور "شعرِ انقلاب" حاصل کر سکا۔

سیماب اکبرآبادی جیسا شاعر و ادیب اس طرح زمانہ کی تیز رفتاری کا شکار ہو جائے کہ اُن کی کوئی کتاب بازار میں نہ مل سکے حقیقتاً ایک افسوسناک امر ہے۔ حالانکہ اُن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اُنھوں نے ۱۹۵۱ء تک یعنی اپنی عمر کے ۷۰ برس تک ۳۰۰ کتابیں تصنیف کی تھیں۔ سب ملا کے اُنھوں نے تین سو سے زیادہ کتابیں لکھی ہیں۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ہندوستان بھر میں اُن کے سیکڑوں شاگرد پائے جاتے ہیں۔

کہتے ہیں کہ داغؔ دہلوی کے بعد سب سے زیادہ شاگرد سیماب صاحب کے ہی تھے۔ تین ہزار سے زیادہ شاگرد اُن کی فہرست میں موجود ہیں اور ساتھ ہی ساتھ اس بات کا برملا اعتراف بھی کیا جاتا ہے کہ سیماب صاحب نے اردو زبان و ادب کی ترویج و اشاعت کے سلسلے میں بے انتہا وقت و زر سے کام لیا۔

سیماب اکبرآبادی کے کلام کا جب باقاعدگی کے ساتھ مطالعہ کیا اور اُن کے حالاتِ زندگی پر نظر ڈالی تو اُن کی تصویر تصور کی آنکھوں کے سامنے کچھ اس طرح اُبھری کہ ایک سنجیدہ، منکسر المزاج، حسین، خوش اخلاق، باوضع، بامروّت، سادہ مزاج، پاکیزہ سیرت، نیک، عالم و فاضل، لیکن پیشانی پر علم کے غرور کی کوئی شکن نہیں جیسے دل میں اپنے شاگردوں سے پیار اور ذہن میں اُن کی اصلاح، بہتری اور بہبودی کا ہی خیال، شعر و ادب کی خدمت اور زبان کے لئے ہر وقت تیار، جس کی ساری زندگی اپنی زبان، اپنے سماج، اپنے تمدن اور اپنی تہذیب کی خدمت اور حفاظت میں گزری ہو، جس نے اپنے خونِ جگر سے اپنے وطن کی آبیاری کی ہو، جس نے اپنے کلام اور اپنے خلاق تنقید کو بکھیر کر نذر کر دیا ہو۔ کتنی خوبصورت ہے یہ تصویر، کتنی دلکش ہے یہ تصویر۔ آخر موت کی کمینگی کے بے رحم ہاتھوں نے ۳۱ جنوری ۱۹۵۱ء کو ہماری نگاہوں کی اس محبوب تصویر کو پردۂ خاک میں چھپا دیا اور بقول سیماب اکبرآبادی ؎

دیکھتے ہی دیکھتے دنیا سے میں اُٹھ جاؤں گا
دیکھتی کی دیکھتی رہ جائے گی دنیا مجھے

شہر دہلی اگر ہندوستان کا دل ہے تو آگرہ ہندوستان کا دماغ۔ جس نے نظیر اکبرآبادی کو اپنی خاک سے اٹھایا۔ ۱۸۸۰ء میں آگرہ کے ایک مشہور، معزز اور علم دوست گھرانے میں سیماب پیدا ہوئے۔ ان کا اصلی نام عاشق حسین تھا لیکن اس کشتۂ زبانِ اردو نے اپنا تخلص سیماب تجویز کیا جس نے بساطِ شاعری پر شعلۂ آفتاب روشنی پھیلائی جنھوں نے اردو شعر و ادب کو نئے نئے موضوعات سے رنگا رنگی بخشی۔ فکر و فلسفہ کی آمیزش اتنے خوبصورت اور دلفریب انداز سے کی کہ جس سے شعریت مجروح نہیں ہونے پائی۔

سیماب صاحب کے معاصرین میں جوش، فانی، حسرت موہانی، آرزو، یگانہ تھے۔ ان میں کا ہر شاعر اپنے رنگ و آہنگ کی مناسبت سے ممتاز و یگانہ ہے اور اردو شاعری میں انفرادی مقام کا مالک۔ سیماب صاحب بھی اردو شاعری میں نمایاں اور ممتاز مقام رکھتے ہیں، وہ اچھے اور بلند پایہ شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک باعمل اور جد و جہد کرنے والے شخص بھی تھے۔ ایک عرصے تک دہلی اسکول اور لکھنؤ اسکول کی صدا اردو شاعری کی دنیا میں گونجتی رہی۔ سیماب نے اپنی خدمت، محنت اور سلیقے سے اس میں آگرہ اسکول کا اضافہ کر دیا۔ ان کے شاگردوں کی فہرست طویل ہے جن میں سے بہت سے صاحبِ دیوان شاعر بھی ہیں مثلاً طرفہ قریشی، نثار اٹاوی، ساغر نظامی، سراج الدین ظفر، مختار صدیقی، الطاف مشہدی، ضیا فتح آبادی، شفا گوالیاری، تابش پرتاب گڈھی وغیرہ۔

سیماب نے شاعری کا آغاز غزل گوئی سے کیا۔ ان کا زمانۂ شاعری کم و بیش پچاس سال کے عرصہ پر پھیلا ہوا ہے۔ شروع میں انھوں نے لاتعداد غزلیں کہیں جو زیادہ تر مختلف مشاعروں کے طرحی مصرعوں پر کہی گئی ہیں۔ لیکن وہ غزلیں بھی زبان و تخیل کا بہت ہی خوبصورت نمونہ ہیں۔ ابتدائی دور کا ایک شعر ملاحظہ ہو:

خدا کے سامنے بھی چل گئے ہم چال محشر میں
بجائے نامۂ اعمال دل کی داستاں رکھ دی

اس شعر میں جو حسین شوخی ہے اس کا لطف محسوس کرنے ہی سے حاصل ہو سکتا ہے۔ بجائے نامۂ اعمال دل کی داستاں پیش کر دینا۔ اللہ اللہ کیا اندازِ بیان اور کیا والہانہ پن ہے۔ سچ پوچھئے تو ایک مکمل عاشقِ صادق کے پاس اس کے نامۂ اعمال میں اس کی داستانِ دل کے سوا اور کیا ہوتا ہے جو وہ پیش کرے۔ معاملاتِ عشق کے بیان میں سیماب انتہائی محتاط اور سنجیدہ ہیں۔ ان کے کلام میں بھولے سے بھی رکیک، عریاں اور خلافِ تہذیب جذبات کا اظہار نہیں ملتا۔ ان کے یہاں بھی عشق و محبت کی داستانیں ہیں، مگر محبت ان کے کلام میں ایک ایسا پاکیزہ اور بے لوث تصور ہے جس میں خلافِ [illegible] تصورات کی قطعی گنجائش نہیں۔ شاعر [illegible]

ہے عشق ان کے نقطۂ نظر سے انسانی کردار کو لطافت، بلندی اور پاکیزگی عطا کرتا ہے نہ کہ اس کے کردار میں چھچھوراپن اور بے راہ روی کے عناصر کی پرورش کرتا ہے۔ یہ احتیاط اور یہ تہذیب سیماب کی اپنی زندگی تھی جو ان کے ایک ایک شعر سے، ایک ایک لفظ سے ظاہر ہوتی ہے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں۔

کہانی میری رودادِ جہاں معلوم ہوتی ہے
جو سنتا ہے اسی کی داستاں معلوم ہوتی ہے

وہ خود لئے بیٹھے تھے آغوشِ توجہ میں
بیہوشی ہی اچھا تھا، ناحق مجھے ہوش آیا

ہستی و نیستی کی حدیں گم ہو رہ گئیں
یہ آ گیا کہاں میں تجھے ڈھونڈتا ہوا؟

ان کی شاعری کا زمانہ اگرچہ آج سے پچاس ساٹھ برس پہلے کا زمانہ ہے، لیکن ان کا تصور اتنا ہی جدید، تعمیری اور ترقی پسندانہ ہے جو آج کے کسی بھی بڑے سے بڑے شاعر کا ہو سکتا ہے۔ شعر ملاحظہ ہو

ہمیں عزیز نہیں اپنے خون کی بوندیں
نظامِ عشق اگر ان سے استوار ہے!

یہاں نظامِ عشق سے مراد دراصل اس سماجی نظام کی تعمیر ہے جسے غریب اور محنت کش طبقہ اپنی محنت اور خونِ جگر سے کرتا رہتا ہے۔ چند اشعار اور ملاحظہ ہوں

بلا سے خون چھڑکنا پڑے ہمیں اپنا
مگر شگفتِ نظرِ صبحِ لالہ زار رہے

دوائے درد میں نے درد سے کی ہے مصیبت میں
کہ جب کانٹا چبھا ہے نوکِ خنجر سے نکالا ہے

سیماب اکبرآبادی کا درجہ بحیثیت نظم نگار بھی بہت بلند ہے۔ انھوں نے بے شمار قومی، وطنی اور سیاسی نظمیں کہیں۔ سیماب کی ہر نظم سادہ اور معصوم ہے لیکن ایک ایک لفظ سے محبت اور عقیدت کے نغمے پھوٹ رہے ہیں۔ محسوس ہوتا ہے کہ شاعر نے اپنے پیارے وطن کی مٹی کے ذرے ذرے میں اپنے شعور و ادراک کو بسا دیا ہے۔ سیماب صاحب کا وطن آگرہ ہے اور اس کے ناطے انھیں تاج محل سے بے پناہ محبت اور عقیدت ہے۔ تاج محل ان کا محبوب موضوع ہے۔ جمنا کے کنارے ممتاز محل کی اس حسین آرام گاہ میں انھوں نے نہ معلوم کتنے دن، کتنی راتیں، کتنی صبحیں اور کتنی شامیں گزاری ہوں گی نہ جانے کتنے زاویوں سے اس خوبصورت پری کو دیکھا ہے اور اس کے حسن کی ادا [illegible]

ادا کیے ہیں۔ اُن کے مجموعۂ کلام میں تاج محل پر متعدد نظمیں ملتی ہیں۔ اُنھوں نے اس موضوع پر مختلف پہلوؤں سے طبع آزمائی کی ہے۔

تاج محل سے یہ شدید محبت اور عقیدت اس بات کا ثبوت ہے کہ اُنھیں اس اعلیٰ آرٹ سے کتنا لگاؤ تھا اور محبت کے وہ جذبات جنھوں نے اس عمارت کو جنم دیا ہے وہ سیماب کی نظروں میں کتنے قابلِ قدر و احترام ہیں۔ سیماب صاحب کا یہ کمالِ شاعری تھا کہ وہ کسی خاص صنفِ سخن میں محدود نہیں تھے، اُنھوں نے کم و بیش ہر صنف میں طبع آزمائی کی ہے۔ غزل۔ نظم۔ رباعی۔ قطعہ مثنوی غرضیکہ کوئی پہلو اُنھوں نے تشنہ نہیں چھوڑا۔ اسی طرح موضوعات کی بھی اُن کے یہاں کمی نہیں تھی۔ اُن کی شاعری کثیر الجہات تھی وہ خود بھی کہتے ہیں۔

میری فطرت میں ہے اے سیماب دردِ اضطراب
ہر فضا میں کوندنے کا حوصلہ رکھتا ہوں میں

اسی خیال کا ایک اور شعر ملاحظہ ہو۔

مے خانۂ سخن کا گدائے قدیم ہوں
ہر رنگ کی شراب پیالے میں ہے مرے

ان کی شاعری اور فکر و فن پر بحث سے بچنے اور لکھنے والے موجود ہیں میں تو اتنا جانتا ہوں کہ ہماری زبان اُردو کو آج ایک شاعر سے زیادہ مجاہد کی ضرورت ہے اور اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ سیماب صاحب اُردو زبان کے ایک ایسے مجاہد تھے جن کی خدماتِ ادب کبھی فراموش نہیں کی جا سکیں گی۔ آج ہم سب کا فرض ہے کہ سیماب اکبرآبادی کے پیغام کو، اُن کے نیک اور قیمتی خیالات کو اُن کے فن کی روشنی کو ہندوستان کے گوشے گوشے میں پھیلا دیں۔ سیماب اکبرآبادی کا کلام ہمارا قیمتی ورثہ ہے اور کوئی بھی زندہ قوم اپنے اسلاف کے قیمتی ورثہ کو ضائع نہیں کرنا چاہتی ہے۔

OO

بقیہ: خطبۂ صدارت صفحہ ۲۱

بقیہ: خطبۂ صدارت صفحہ ۲۱

تنقید ہوتی تھی۔ اکثر سیاست داں اور سیاسی لوگ تک اُن کے بیانات سے برہم ہو جایا کرتے تھے۔ دوسری جنگِ عظیم میں ہٹلر کے خلاف سیماب صاحب نے چند بیانات شائع کیے۔ تو جرمنی کے ریڈیو کے اُردو نشریے میں کہنے والے نے کہا۔ "سیماب کو معلوم ہو کہ ہم ہندوستان پر بھی دھاوا بولیں گے اور سیماب کی خبر لیں گے۔"

تو ان سب باتوں کو دیکھیے، ہر چند سیماب کی اصلاحی کوششیں نیک نیتی پر مبنی تھیں، لیکن اُن کے اس مستقل عمل نے اُن کے شاعرانہ مرتبہ کی طرف لوگوں کو متوجہ نہ ہونے دیا۔ اور سیماب کو وہ مقام نہیں ملا جو ملنا چاہیے تھا۔ آج جبکہ ہم ان تعصبات سے دور ہو چکے ہیں اور ایک متوازن انداز سے سوچ سکتے ہیں، ہم یہ ضرورت محسوس کر رہے ہیں کہ سیماب کو ان کا جائز مقام دیا جائے۔

OO

بقیہ: سیماب کی نظمیہ شاعری صفحہ ۲۴

بقیہ: سیماب کی نظمیہ شاعری صفحہ ۲۴

ان کے سینے میں ایک مردِ مومن کا دل تھا اور نظروں میں ہندوستان کی جنت تھی۔ یہاں کی ملی جلی تہذیب اور قدیم سنسکرتی کے ساتھ ان کے عہد کی جدید ہندوستانی شاعری نے انھیں متاثر کیا تھا۔ اُنھوں نے ایک سچے اور پکے مسلمان ہونے کے ساتھ ساتھ بدھ اور کرشن کی تعلیمات کا گہرا مطالعہ کیا۔ اور ویدانت کے فلسفے کو سمجھا۔ ان تمام باتوں نے مل جل کر اُن کی اس جمالیاتی فکر کو جو اُن کے سب سے پہلے مجموعۂ نظم "نیستاں" میں ملتی ہے۔ خالص ہندوستانی بنا دیا۔ اسلامی فکر و فلسفہ سیماب کی گھٹی میں پڑا تھا۔ انھوں نے مذہبی ادب بھی پیدا کیا، لیکن عظیم اور جاوداں شاعری کے لیے سیماب نے ایک غیر مذہبی اور وسیع فضا پیدا کی۔ بلکہ مذہب کی فکر انسان اور انسانیت پر آ کر ٹھہر گئی جو آفاقی شاعری کے لیے بے حد ضروری تھا۔ اور بقول علامہ اقبالؔ یہ اُسی وقت ممکن ہوتا ہے جب کوئی خودی میں آفاق کو گم کر لے۔

OO

رُباعیات

(مجموعۂ رُباعیاتِ سیماب (غیر مطبوعہ) سے چند رُباعیاں)

تخریب کا کوئی وار چھوٹا نہ گیا!
پھٹ کے بھی، مگر دام سے چھوٹا نہ گیا
جتنا دُنیا نے ہم کو لوٹا سیماب
اُتنا دُنیا کو ہم سے لوٹا نہ گیا

○

فانوس سے شمعِ انجمن چھپتی ہے؟
کب گرد میں سورج کی کرن چھپتی ہے
سیماب ہنر پوشیِ حاسد معلوم
کانٹوں میں کہیں بوئے چمن چھپتی ہے!

○

یا خواب میں ہمکنارِ غفلت ہو لے
یا واقفِ اسرار ہو، آنکھیں کھولے
کچھ دیر میں ہے نمودِ صبحِ پیری کی
اک رات ہے، اِس میں جاگ لے یا سو لے

○

یک روزہ نمو کو زندگانی کہہ لو!
باقی کہہ لو اِسے کہ فانی کہہ لو!
بچپن ہے سحر، شام ہے پیری سیماب
باقی جو بچے اُسے جوانی کہہ لو!

○

عشرت کو گناہِ زندگی سمجھا ہے
جذبات کی تسکین کو بدی سمجھا ہے
ہو جائے گا چھوٹی چھوٹی باتوں پہ خفا
کیا تو نے خدا کو آدمی سمجھا ہے

بدبیں کی نگاہ دیکھ لیتا ہوں میں
قلبِ بدخواہ دیکھ لیتا ہوں میں
پڑتی نہیں اپنے عیب پر میری نظر!
اوروں کے گناہ دیکھ لیتا ہوں میں!!

○

ظاہر داریِ زیرِ داماں دیکھو!
تصویرِ حیاں کا رُخِ پنہاں دیکھو
محفل میں لباس سے ہو جن کے مرعوب
تنہائی میں اُن کا رقصِ عریاں دیکھو

○

تخئیل ہی کی شگوفہ کاری ہے یہاں
نیکی و بدی سب اختیاری ہے یہاں
جیسا جسے سمجھے گا، وہ ہے ویسا ہی
یعنی ہر چیز اعتباری ہے یہاں

○

از بسکہ نہیں ہے یہ زمانہ بہتر
"معمولی سے ہے" کہانہ کہلانا بہتر
اچھا ہے فنا ہونے سے باقی رہنا!
مٹنے سے ہے شورش کا مٹانا بہتر

○

شیروں کی طرح بلند آہنگ کرو
بپھرے ہوئے اہرمن کو چورنگ کرو
دُنیا میں اگر ہے تم کو جینا منظور
حق اور حیات کے لیے جنگ کرو

"وحیٔ منظوم" کا ادبی و لسانی مرتبہ

عبد الرحمن پرواز اصلاحی
ٹیچر - احمد سیلر ہائی اسکول - ۲۵ ڈونگری روڈ، بمبئی ۹

قرآن کریم وہ مقدس کتاب ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر اپنے پاک فرشتے حضرت جبریل امین کے ذریعہ نازل فرمائی۔ تاکہ لوگوں کو کفر و جہالت کی تاریکیوں سے نکال کر علم و ہدایت کی روشنی کی طرف لایا جائے۔ یہ کتاب نہ صرف عقائد و اعمال کا مجموعہ ہے بلکہ گنجینۂ حکمت بھی ہے۔ اور ضابطۂ حیات بھی، صحیفۂ عبودیت بھی ہے اور نامۂ ذکر و فکر بھی۔ یہ کتاب زندگی کے ٹھوس حقائق و معاملات سے بحث بھی کرتی ہے مگر انتہائی مؤثر اور دل نشیں انداز سے۔ یہ دُنیا کی ایک ایسی کتاب ہے جس کا اسلوب نرالا اور طرزِ اظہار بالکل جُدا گانہ ہے۔ اس کے پُرشکوہ اور باعظمت جلال، پاکیزہ اور دلکش جمال، اور ادبی و لسانی کمال کو دیکھ کر ہر حق پرست یہ کہنے پر مجبور ہے کہ یہ انسانی ادب نہیں بلکہ آسمانی ادب ہے۔ ذہنی تخلیق نہیں بلکہ فرمودۂ ربانی اور سراسر وحی و الہام ہے۔ کلام کرنے والا خدا ہے اور حرف بحرف اُسی کی طرف سے صادر ہوا ہے مگر اندازِ کلام وہ ہے جو انسانی ذوق، انسانی حسیات اور انسانی معیارِ لطافت کے لحاظ سے ایسی بلندیوں کو چھو رہا ہے جس کی کوئی دوسری مثال نہیں۔ الفاظ و اصطلاحات روایت کے دائرے سے لے گئے ہیں، تشبیہ اور استعارے جانے پہچانے ماحول سے اُٹھائے گئے ہیں۔ انسانی لٹریچر میں بلاغت و فصاحت کا جو اعلیٰ سے اعلیٰ معیار ہو سکتا ہے اس کو رکھا گیا ہے۔ لیکن بحیثیتِ مجموعی جو ادب پارہ تیار ہوا ہے وہ منفرد اور یکتا ہے۔ ایک ایک لفظ موتیوں کی طرح جڑا ہوا ہے ایک ایک سطر شاخِ گل اور ایک ایک سورۃ خیابانِ بہار ہے۔ اس کتاب کے اسلوب میں نثر و نظم کے تمام ممکن کمالات سمٹ کر اکٹھا ہو گئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسے پڑھتے ہوئے آدمی پر سوز و گداز اور رقت کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ طرفہ تماشہ تو یہ ہے کہ جو لوگ اس کے معانی کو سمجھے بغیر پڑھتے ہیں وہ بھی اس کی عبارت کی موزونیت، الفاظ کی نشست، اور صوتی نغمگی میں ڈوب کر رہ جاتے ہیں۔ وزن شعری نہ ہونے کے باوجود آیات کے اختتام پر قافیہ اور آہنگ کا ایک عجیب پُرلطف احساس ہوتا ہے۔ معانی و مطالب کے ساتھ مرتب الفاظ و اصوات کا ایسا معجزانہ امتزاج ہے جس کی نظیر کہیں اور نہیں مل سکتی۔

اس کتاب کا ہم پر کم سے کم حق یہ ہے کہ اس کی عظمت کا پورا پورا اعتراف کریں، اسے کثرت سے پڑھیں، اس میں غور و تدبر کریں، اور اسی جذبہ کے ساتھ اس کا مطالعہ کریں کہ اس کی روشنی میں ہمیں اپنی زندگی سنوارنی ہے۔ دنیاوی کامیابی ہو یا آخرت کی فلاح دونوں کا انحصار اس کی تعلیمات کی بجا آوری میں ہے۔ اس کتاب کے بتائے ہوئے طریقوں سے ہٹ کر اور اس سے روگردانی کر کے مومن کی زندگی صراطِ مستقیم پر قائم نہیں رہ سکتی۔ اس کی اسی اہمیت کے پیشِ نظر کروڑوں بندگانِ خدا نے اسے آنکھوں سے لگایا، اور لاکھوں نفوس نے اس کے معانی و مطالب کے غور و خوض میں اپنی زندگیاں وقف کر دیں، سیکڑوں آئمہ فقہ، آئمہ حدیث، علمائے بلاغت و معانی اور متکلمین اسلام نے اس پر کتابیں لکھیں اور اس کی تفسیر و تشریح میں اپنے آرام و آسائش کو تج دیا۔ جب تک اسلام عرب کے خطے میں محدود رہا اُس وقت تک قرآن سے متعلق جو کچھ بھی لکھا گیا عربی زبان میں لکھا گیا۔ لیکن اسلام جب عرب کے حدود سے نکل کر دُنیا کے دوسرے خطّوں تک پہنچا تو ضرورت محسوس ہوئی کہ اسے دُنیا کی دوسری زبانوں میں بھی منتقل کیا جائے۔ اس لئے کہ اس کا روئے خطاب پوری انسانیت سے ہے اور اس کی تعلیمات تمام دنیا والوں کے لئے ہیں۔ عربی نہ جاننے والے ملکوں میں جب قرآن کی اشاعت کی نوبت آئی تو اسی وقت علم نحو و صرف، بلاغت و معانی، تجوید و قرأت، اعراب و لغات بھی مدوّن ہوگئے۔ اور پھر قرآن کے تراجم بھی دوسری زبانوں میں کئے گئے۔

شاعر، بمبئی

علمائے اسلام نے قرآن کے سلسلہ میں جو خدمت کی ہے وہ ہماری تاریخ کا ناقابلِ فراموش کارنامہ ہے۔ انہوں نے عربی، فارسی اور اُردو زبانوں میں جو تفسیریں اور تراجم لکھے ہیں اُنکی تعداد سے متعلق تفسیر خلیلی کے مقدمہ میں نواب صدیق حسن خان نے لکھا ہے کہ تیرہ سو سے زیادہ تفاسیر و تراجم منصۂ شہود پر آچکے ہیں۔ اور اب ایک صدی کے بعد تو اِنکی تعداد خدا جانے کہاں تک پہونچی ہوگی۔ ڈاکٹر حمید اللہ حیدر آبادی ثم فرانسوی لکھتے ہیں "چودھویں صدی کے رُبع آخر میں قرآن مجید کا ایک سو سے زیادہ زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ کثیر التراجم السنہ میں اُردو کا نام سرِ فہرست ہے۔ اُردو میں کوئی بانوے تراجم کا پتہ چلتا ہے"۔

یہ تراجم مسلمانوں کے مختلف مکتبۂ فکر سے تعلق رکھنے والے علماء اور با صلاحیت افراد کی جانب سے کئے گئے۔ اُردو کے نثری تراجم میں حکیم الامّت حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے نامور فرزندوں میں حضرت شاہ عبدالقادرؒ اور حضرت شاہ رفیع الدینؒ کے ترجموں کو اوّلیت کا شرف حاصل ہے۔ جن ترجموں نے کافی مقبولیت حاصل کی اُن میں شاہ رؤف مجددی، نواب قطب الدین خان، سر سیّد احمد خان، مولانا عبدالحق حقانی، مولانا فتح محمد تائب لکھنوی، مولانا سید امیر علی ملیح آبادی، ڈپٹی نذیر احمد، مولانا عاشق علی میرٹھی، مولانا وحید الدین الزماں؛ مولوی فتح محمد جالندھری، سیّد فران علی، مولوی انشا ء اللہ خان، مرزا حیرت دہلوی، حکیم محمد حسن امروہوی، ڈاکٹر عبدالحکیم، مولانا ثناء اللہ امرتسری، مولانا احمد رضا خاں بریلوی، مولانا اشرف علی تھانوی، محمد علی لاہوری، مولانا محمد جونا گڑھی، شیخ الہند مولانا محمود الحسن دیوبندی، خواجہ حسن نظامی، خواجہ عبدالحی فاروقی، مولانا فیروز الدین رُوحی، مولانا احمد حسن ندوی، احسان اللہ عبّاسی، مولانا آغا رفیق بلندشہری، حکیم نور الدین قادیانی، مرزا بشیر الدین، مولانا غلام وارث، سیّد عابد علی پانی پتی، ابو محمد مصلح حیدری آبادی، مولانا ابو الکلام آزاد، مولانا عبدالماجد دریابادی اور مولانا سیّد ابو الاعلیٰ مودودی کے ترجمے خاص طور سے لائقِ ذکر ہیں۔

نثر کے علاوہ قرآن کے مطالب و معانی کو نظم کے پیرائے میں بیان کرنے کے لئے ہماری زبان کے بہت سے قادر الکلام شعراء نے کبھی ہمّت کی اور اس میں سے بہتوں نے اچھی خاصی کامیابی حاصل کی۔ ابتداء میں، بحث رہی اور یہ سوال اُٹھایا گیا کہ بحور و قوافی کی پابندی کے ساتھ کلامِ الٰہی کسی نظم میں اپنی تمام خصوصیات کے ساتھ اپنی افادی حیثیت کو بھی برقرار رکھ سکتا ہے؟ اور کیا قرآن کی کسی مختصر سی سورہ کا بھی صحیح اور جامع ترجمہ نظم میں ممکن ہے؟ شروع شروع میں مذہبی طبقہ کی جانب سے اس کی بھی اسی طرح مخالفت کی گئی جس طرح منثور ترجموں کی ہوئی تھی۔ مگر جب تراجم کے عمدہ نمونے سامنے آئے تو بے اختیار ان کے لبوں سے کلمۂ تحسین نکلا۔ اور علماء نے اپنی رائے تبدیل کرلی۔

یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ اُردو زبان کی جب تشکیل ہو رہی تھی۔ گوجری، دکنی، زبانوں کے اختلاط سے اس کی ہیئت بن رہی تھی تو منظوم تراجم قرآن کی روایت بھی شروع ہو چکی تھی۔ موجودہ تحقیق کے مطابق سب سے پہلے منظوم ترجمہ کرنے والے حضرت شیخ بہاء الدین شاہ باجنؒ ہیں جن کا شمار گجرات و دکن کے اکابر علماء اور صوفیاء میں ہوتا ہے۔ حضرت شاہ باجنؒ سے لیکر موجودہ دور تک تقریباً ساڑھے چار سو سال کی طویل مدّت میں بیسیوں جزوی اور کم از کم چودہ مکمل منظوم تراجم قرآن کا سُراغ لگا ہے۔ ان میں بعض تو چند سورتوں اور چند پاروں پر مشتمل ہیں۔ لیکن چند ایسے بھی ہیں جن میں پوری تعلیماتِ قرآنی کو نظم کا جامہ پہنایا گیا ہے۔ بعض ترجمہ ہی تک محدود نہیں ہیں بلکہ ان میں سورتوں کی شانِ نزول، فضائل اور جمع قرآن کی تاریخ بھی بیان کردی گئی ہے۔

قرآن کے منظوم تراجم میں غلام مرتضیٰ جنوں الٰہ آبادی کی تفسیر مرتضوی، شاہ غلام محی الدین سرہندی کی تفسیر اویسی، عبدالسلام بدایونی کی زاد الآخرۃ، شمس الدین شائق ایدی کی نظم البیان فی مطالب القرآن، ابراہیم پانی پتی کی تفسیر منظوم، آغا عبدالرحیم عرشی گوالیاری کی تفسیر عرشی، سید غضنفر علی سونی پتی کی تفسیر غضنفر، آغا شاعر قزلباش کا ترجمہ افصح الکلام، مطیع الرحمان خادم کا نظم المعانی، اثر زبیری کا سحر البیان، کیف بھوپالی کا مفہوم القرآن، سید تسنیم اختر کا آبِ رواں، خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہیں۔

علامہ سیماب اکبرآبادی اپنی خداداد شعری صلاحیتوں اور اپنی گوناگوں ادبی خدمات کی بنا پر اُردو زبان و ادب میں جو اُونچا مقام رکھتے ہیں وہ اہلِ نظر سے پوشیدہ نہیں۔ انہوں نے جہاں مختلف اصنافِ سخن میں اپنی قادر الکلامی کے جوہر دکھائے ہیں۔ وہاں ان کا ایک بڑا اہم کارنامہ قرآنِ پاک کا منظوم ترجمہ بھی ہے۔ شائع ہونے کی نوبت تو صرف ایک پارہ یعنی عم پارہ کے ترجمہ کی آئی۔ لیکن انہوں نے اپنی قیمتی زندگی کا بڑا حصہ کلامِ الٰہی کے ترجمہ میں صرف کیا اور اسے پایۂ تکمیل تک پہونچایا۔ بقیہ حصہ مخطوطہ کی شکل میں محفوظ ہے۔

علامہ سیماب کے اس ترجمہ کا نام ہے "وحیِ منظوم"۔ اس خوبی، خوش سلیقگی، شگفتگی، متانت، سلاست، فصاحت و بلاغت کے ساتھ وحیِ الٰہی

شاعر بمبئی

والہام ربّانی کو نظم کے قالب میں ڈھالنے کی جرأت ہوتی ہے۔ صحتِ زبان کے ساتھ صحتِ مفہوم کو مرقوم کرنے کی کوشش پہلی بار اُردو زبان میں سیماب صاحب نے کی۔ اس کی اہمیت ادبی لحاظ سے تو ہے ہی، مذہبی اور تبلیغی نقطۂ نظر سے بھی بہت زیادہ ہے۔ کیونکہ بہت سے لوگ اس منظوم ترجمہ کو پڑھنے والے بہت جلد یاد کرلیں گے۔

اُردو کے تمام منظوم تراجم میں ادبی محاسن کے لحاظ سے جسقدر یہ ترجمہ اہم ہے اُتنا کوئی نہیں کیونکہ اس میں جس قدر لغوی معنی کی رعایت کی گئی ہے اتنی کسی منظوم ترجمے میں نہیں ملتی۔ اس کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ عربی الفاظ کے لئے اُردو کے ایسے برمحل الفاظ کا انتخاب کیا گیا ہے کہ ان سے بہتر ملنا دشوار ہے۔ ترجمہ باوجودیکہ خاصا تحت اللفظ ہے مگر اغلاق سے قطعاً پاک ہے۔ قرآن کی مراد کو واضح کرنے کے لئے جابجا قوسین میں اپنی جانب سے الفاظ بڑھائے گئے ہیں، مگر بہت قلیل مقدار میں۔ حالانکہ نظم تو نظم نثر میں بھی مترجمین بالعموم یہی طریقہ اختیار کرتے ہیں۔ بہت سے مترجم ترجمہ کو بامحاورہ کرنے کے لئے آخری الفاظ کا ترجمہ شروع میں اور پہلے حصّہ کا ترجمہ آخر میں کرتے ہیں۔ لیکن سیماب صاحب کے ترجمہ کی بڑی خوبی یہ ہے کہ ہر لفظ کا ترجمہ اس کے بالکل مقابل میں دیا گیا ہے۔ اور پھر بامحاورہ اور عام فہم کرنے کی انتہائی کوشش کی گئی ہے۔ اس ترجمہ کو پڑھیے تو اس میں مقدس نغمگی بھی ملتی ہے اور پاکیزہ آہنگ بھی ملتا ہے جو نہ صرف شریفانہ جذبات کو حرکت میں لاتا ہے، بلکہ وجد آفریں کیفیت بھی پیدا کرتا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ قرآنِ کریم ایسی کتاب ہے جس کا ترجمہ بڑی ذمّہ داری کا کام ہے۔ اس کے لئے نہ صرف عربی زبان سے واقفیت شرط ہے۔ بلکہ ذوقِ عربیت بھی درکار ہے۔ حضرت امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ "مترجم میں کسی عربی عبارت کو عربی ہی کے اندازِ فہم تعبیر کے مطابق سمجھنے کی صلاحیت نہیں ہوگی تو وہ قرآنِ مجید کے بلیغ اسلوب اور اس کے مخصوص طریقۂ تعبیر سے عہدہ برآ نہ ہوسکے گا۔ اور اس بناء پر قرآنی مفہوم و مطلب کے بہت سے گوشے اور پہلو ایسے ہوں گے جو اُس کی عقل و فہم کی گرفت میں نہ آسکیں گے۔"

مترجم کے لئے جہاں عربی کے محاورات، اور اسلوبِ بیان میں مہارت تامہ کی ضرورت ہے، وہاں اس کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ ذوقِ سلیم اور فہمِ مستقیم بھی رکھتا ہو۔ اس معیار پر جانچیے، تو قرآن کے منظوم تراجم بہت کم اُترتے ہیں۔ یہ خصوصیت صرف سیماب صاحب کے ترجمہ کو حاصل ہے کہ اس میں قرآن کی زبان، طریقۂ تعبیر اور اس کے طرزِ ادا کا پورا پورا لحاظ کیا گیا ہے۔

سیماب مرحوم نے جب اس عظیم الشان ترجمے کا ارادہ کیا تو انہوں نے اُردو کے سب سے اہم اور مستند ترجمہ کو پیشِ نظر رکھا۔ یعنی حضرت شاہ عبدالقادر دہلویؒ کے ترجمہ کو بنیاد اور شمعِ راہ بنایا۔ درجۂ صحت اور درجۂ اسناد کے لحاظ سے اس کے مقابل میں اُردو کا کوئی دوسرا ترجمہ نہیں۔ کلماتِ قرآنی کی نظم و ترتیب کی جس قدر رعایت اس ترجمہ میں کی گئی ہے کسی اور میں نہیں ملے گی۔ معانیٔ لغویہ کی جس قدر احتیاط اس میں برتی گئی ہے کہ تصوّر نہیں کیا جاسکتا ہے۔ بامحاورہ ہوتے ہوئے اس میں توضیح اور اختصار کی نہ صرف بقدر مناسب رعایت ہے بلکہ کمال درجہ خوبی پائی جاتی ہے۔

حضرت شاہ عبدالقادرؒ کے ترجمہ میں ایک صدی کے بعد بعض اُردو کے محاورات متروک ہوگئے تو حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن دیوبندیؒ نے توجہ فرمائی اور نئے مروجہ محاورات اُس کی جگہ فراہم کرکے مناسب تبدیلی کردی۔ جس کی وجہ سے اس کی عظمت میں چار چاند لگ گئے۔ سیماب صاحب کے محتاط ذوق نے یہی بہتر سمجھا کہ اُردو میں بامحاورہ ترجمہ کے بانی اور امام کی پوری پوری پیروی کریں۔ اسی لحاظ سے اُن کا منظوم ترجمہ کامیاب ترین اور مستند ترجمہ ہے اور اُردو کے تمام منظوم ترجموں پر فوقیت بھی رکھتا ہے۔

قرآن کی سب سے پہلی سورۃ فاتحہ ہے جو دیباچۂ کتابِ الٰہی ہے۔ اس کا ترجمہ ملاحظہ ہو:۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم	نام سے اللہ کے کرتا ہوں آغازِ بیاں	جو بڑا ہی رحم والا ہے، نہایت مہرباں
الحمد للہ رب العالمین ۝ الرحمٰن الرحیم ۝	ہیں سزاوارِ خدائے (پاک) ساری خوبیاں	(جو ہے) رب سارے جہانوں کا، رحیم و مہرباں
مٰلک یوم الدین ۝	ہے وہی انصاف کے دن کا بھی مالک (بےگماں)	
ایاک نعبد و ایاک نستعین ۝	(یا الٰہی) ہم فقط کرتے ہیں تیری بندگی	اور ہوتے ہیں تجھی سے طالبِ امداد بھی
اھدنا الصراط المستقیم ۝ صراط الذین انعمت علیہم ۝	(یا الٰہی) ہم کو سیدھے راستے پر تو چلا	اُن کا رستہ جن پر انعام و کرم تیرا ہوا

غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ۝ راستہ اُن کا نہیں جن پر غضب کی ہے نگاہ اور نہ اُن کا راستہ جو ہو گئے گُم کردہ راہ

اس ترجمہ میں رحمٰن اور رحیم جو مبالغہ کے صیغے ہیں ان کے مبالغہ کو بھی ظاہر کیا گیا ہے اور لطیف اشارہ دونوں کے فرق مراتب کی طرف بھی کر دیا ہے۔
"یوم الدّین" کا ترجمہ زیادہ تر روزِ جزا یا جزا کا دن کیا جاتا ہے مگر اس ترجمہ میں عوام کے زبان کی رعایت کی گئی ہے۔ عوام کی زبان میں جزا کا لفظ مستعمل نہیں۔ دوسرے یہ کہ اہلِ لغت نے دین کے معنی جزا اور حساب دونوں لکھے ہیں۔ ان وجوہ سے جزا کے بدلے "انصاف" کا لفظ اختیار کیا جس میں دونوں کا مفہوم آ گیا۔
"اِھدنا" کے ترجمہ میں عام طور سے مترجمین ہدایت کا ترجمہ لفظ ہدایت ہی سے کرتے ہیں۔ اسلئے کہ لفظ ہدایت اُردو اور فارسی دونوں میں مستعمل ہے۔ اور کبھی ہدایت کا ترجمہ راستہ دکھانے اور رہنمائی کے ساتھ کرتے ہیں۔ لیکن اس ترجمہ میں ہر موقع پر اس بات کا لحاظ رکھا گیا ہے کہ ہدایت کے کون سے معنی اس موقع کے لئے مناسب اور موزوں ہیں کیونکہ ہدایت کے عربی لغات میں دو معنی ہیں۔ ایک صرف راستہ دکھانا۔ دوسرے مقصود تک پہونچا دینا۔ اسلئے اوروں نے "اِھدنا" کا ترجمہ "دکھا ہم کو" کیا۔ اور اس ترجمہ میں "چلا ہم کو" کیا گیا ہے۔

سیماب صاحب سے پہلے قرآن کے جو منظوم ترجمے کئے گئے اُن کو پڑھیے اور پھر اُن سے تقابل کیجئے تو "وحیِ منظوم" کی ادبی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ مثال
مثال کے طور پر بسم اللہ الرحمٰن کا ترجمہ غضنفر علی صاحب یوں کرتے ہیں ؎ ابتدا ہے مری بنام خدا مہربان و رحیم ہے جو بڑا
شاہ شمس الدین شائق ایزدی یوں کرتے ہیں ؎ ابتدا ہے نامِ اللہ سے بیاں ہے جو بخشش کرنے والا مہرباں
لیکن سیماب صاحب اس کا ترجمہ اس طرح کرتے ہیں ؎ نام سے اللہ کے کرتا ہوں آغازِ بیاں جو بڑا ہی رحم والا ہے، نہایت مہرباں
اوّل الذکر دونوں ترجمے شاعرانہ خوبیوں سے محروم ہیں اور سیماب صاحب کے یہاں شاعرانہ لطافت پورے طور سے موجود ہے۔
"الحمد للہ رب العالمین، الرحمٰن الرحیم، مالکِ یوم الدّین" کا ترجمہ غضنفر علی صاحب یوں کرتے ہیں ؎

ہے خدا کے لئے ثنا ساری سب جہانوں کا ہے وہی والی
مہربان و رحیم ہے جو بڑا مالکِ روزِ حشر و روزِ جزا

شائق ایزدی لکھتے ہیں ؎
سب ستائش ہے سزاوارِ خُدا جو کہ رب ہے جملہ مخلوقات کا
وہ ہے بخشش کرنے والا مہرباں مالکِ روزِ جزائے انس و جاں

فیضی لکھتے ہیں ؎
اُسی کے واسطے ہیں حمد و تعریف و ثنا سب کچھ وہی ہے مالک و پروردگارِ دو جہاں سب کچھ
وہ بیحد مہرباں ہے اور بیحد رحم والا ہے وہ یوم الدین کا مالک ہے، مختارِ یگانہ ہے

عبد السّلام سلّام لکھتے ہیں ؎
جملہ خوبی خدا کو ہے شایاں کہ ہے پروردگارِ عالمیاں
کہ بہت رحم و مہر والا ہے جس کی رحمت بیاں سے بالا ہے

لیکن سیماب صاحب لکھتے ہیں ؎
ہیں سزاوارِ خدا کے (پاک) ساری خوبیاں (جو ہے) رب سارے جہانوں کا رحیم و مہرباں
ہے وہی انصاف کے دن کا بھی مالک بے گماں

غضنفر علی، شائق ایزدی، سلّام اور فیضی کے ترجمے میں "رب"۔ "عالمین"۔ "یوم الدین" وغیرہ کا ترجمہ محلِ نظر ہے۔ رب کا ترجمہ "والی"۔ مالکِ یوم الدّین کا مالکِ روزِ حشر و روزِ جزا۔ "مالکِ روزِ جزائے انس و جاں"۔ عالمین کا "مخلوقات" کیا گیا ہے۔ جو ان عربی الفاظ کا صحیح اُردو ترجمہ نہیں ہے۔ اس کے علاوہ تین چھوٹی چھوٹی آیتوں کا ترجمہ چار چار مصرعوں میں کیا گیا ہے۔ جبکہ سیماب کا ترجمہ آیت بہ آیت اور صرف تین مصرعوں کا ہے۔ اور الحمد للہ رب العالمین۔ الرحمٰن الرحیم کا ترجمہ دو مصرعوں میں کیا ہے ؎

ہیں سزاوارِ خدا کے (پاک)، ساری خوبیاں (جو ہے)، رب سارے جہانوں کا رحیم و مہرباں

ان دونوں مصرعوں میں "پاک" اور "جو ہے" قوسین میں ہیں۔ یہ نہ صرف مصرعوں کو پورا کرنے والے ہیں بلکہ ترجمہ کو زیادہ بامعنی اور عام فہم و بامحاورہ بنا دیتے ہیں۔ مالکِ یوم الدّین کا ترجمہ ملاحظہ کیجئے ؎ "ہے وہی انصاف کے دن کا (بھی) مالک (بے گماں)" شاعر بھی

اگر توسین میں بھی "اور بے گماں" کو نکال دیا جائے تو سیدھا ترجمہ ہے "وہی انصاف کے دن کا مالک" ہوگا۔ ارباب نظر سیماب صاحب کے ترجمے کی صحت و سلاست کو اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں۔ سیماب صاحب کے ترجمہ کے کمالات اور خوبیوں کے چند نمونے اور ملاحظہ ہوں۔ سورۂ اخلاص جس میں خالص توحید کی تعلیم دی گئی ہے۔ اس کا ترجمہ یوں فرماتے ہیں۔

قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۝ اَللّٰهُ الصَّمَدُ ۝ لَمْ يَلِدْ ۙ وَلَمْ يُوْلَدْ ۝ — کہہ دے (مرا) خدا ایک ہے اور خدا بے نیاز ہے — ہے نہ زائندہ نہ زائیدہ (جہاں کا کارساز)

وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ۝ — اور نہیں ہے کوئی اس کے جوڑ کا بے امتیاز

اس میں صرف (مرا) اور (جہاں کا کارساز) توسین میں توضیحی الفاظ ہیں۔ اور پورا ترجمہ لفظی اور حشو و زوائد سے پاک ہے۔ سورۂ والعصر کا ترجمہ یوں کیا گیا ہے

وَالْعَصْرِ ۝ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِيْ خُسْرٍ ۝ — (اے پیمبر) ہم قسم کھاتے ہیں تیرے عصر کی — بالیقیں ٹوٹے میں ہیں سارے جہاں کے آدمی

اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ — ہاں مگر جو لائے ایمان اور عمل اچھے کئے — اور وصیت (دین) حق کی باہم کرتے رہے

وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ ۙ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ۝ — اور جو کرتے رہے تاکید باہم صبر کی — (وہ نہیں ٹوٹے میں بے شک فائدے میں ہیں وہی)

صرف آخری مصرع توضیحی طور پر ترجمہ میں زائد ہے لیکن اس سے پورے سورہ کے مضمون کا مقصود حاصل ہو جاتا ہے۔ سورہ زلزال جس میں قیامت کی ہولناکی کا ذکر ہے۔ اُس کا ترجمہ یوں فرماتے ہیں ؎

اِذَا زُلْزِلَتِ الْاَرْضُ زِلْزَالَهَا ۝ وَاَخْرَجَتِ الْاَرْضُ اَثْقَالَهَا — جب ہلا دی جائے اپنے زلزلے سے یہ زمیں — اور زمیں باہر نکالے بار پنہاں (بالیقیں)

۝ وَقَالَ الْاِنْسَانُ مَا لَهَا ۝ يَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ اَخْبَارَهَا — اور کہے انسان (دہشت سے) یہ اسے کیا ہو گیا — اپنی باتیں سب یہ کہہ دے گی اُس دن برملا

بِاَنَّ رَبَّكَ اَوْحٰى لَهَا ۝ يَوْمَئِذٍ يَّصْدُرُ النَّاسُ اَشْتَاتًا ۙ — اس لئے کہ حکم اُسے اس بات کا دیگا خدا — مختلف حالوں میں اُس دن سب کو ہوگا لوٹنا

لِّيُرَوْا اَعْمَالَهُمْ ۝ — تا عمل اُن کے دکھائے جائیں اُن کو (برملا)

فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ۝ — جس نے ذرہ بھر بھلائی کی ہے دیکھے گا اُسے

وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ ۝ — جس نے ذرہ بھر بُرائی کی ہے دیکھے گا اُسے

اس ترجمہ میں زائد الفاظ نہیں اور اثقال کا ترجمہ بار پنہاں بڑا خوبصورت اور اپنے مفہوم کے لحاظ سے نہایت مناسب ہے۔ صرف (دہشت سے) توسین میں بڑھایا گیا ہے لیکن اس سے کیفیت پوری طرح کھل کر سامنے آجاتی ہے۔ سورۂ شمس کی ابتدائی آیات کا ترجمہ کرتے ہوئے کتنے عمدہ ڈھنگ سے مدعا بیان کر دیا ہے ؎

وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا ۝ — اُس تناسب کی قسم جو نفس (انساں) کو دیا

فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا ۝ — پھر شعور اُسکو بدی و اتّقا کا دے دیا

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا ۝ — بالیقیں وہ بامراد اور فائز مقصد ہوا — جس نے اپنے نفس کو پاک و منزہ کر لیا

سورۂ غاشیہ کی آیات میں جہاں جنت کا منظر پیش کیا گیا ہے، اُس کا ترجمہ ملاحظہ ہو ؎

وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاعِمَةٌ ۙ — اور کتنے چہروں پہ اُس روز ہوگی تازگی

لِّسَعْيِهَا رَاضِيَةٌ ۙ — (یعنی اپنی کوششوں سے (خوب) راضی اور خوشی)

فِيْ جَنَّةٍ عَالِيَةٍ ۙ — ہوں گے فردوس بریں میں عیش اور آرام سے

لَّا تَسْمَعُ فِيْهَا لَاغِيَةً ۝ — (اور) وہاں باتیں نہ ہوں گی لغو سننے کے لئے

فِيْهَا عَيْنٌ جَارِيَةٌ ۘ — اس میں چشمے بہہ رہے ہوں گے (نہایت شان سے)

فِيْهَا سُرُرٌ مَّرْفُوْعَةٌ ۙ — اس میں ہوں گے اونچے اونچے تخت (زرّیں بچھے)

وَّاَكْوَابٌ مَّوْضُوْعَةٌ ۙ — آبخورے سامنے ہوں گے (قرینے سے) بچھے

[illegible] ۔ [1] اس سے مراد عصر یا زمانہ ۔ [2] یعنی مال و زر کے دفینے ۔ [3] یعنی اپنی کوششوں سے جو نیک عمل کرنے کی تھیں

وَنَمَارِقُ مَصْفُوفَةٌ ۙ — اور برابر لگے ہوئے گاؤ تکیے ہوں گے

وَزَرَابِيُّ مَبْثُوثَةٌ ۗ — اور مخمل کے بچھونے ہر طرف بچھے ہوئے

سیماب صاحب کے منظوم ترجمے کے یہ چند نمونے دیئے گئے ہیں، انہیں دیکھنے کے بعد آپ خود اندازہ کر سکتے ہیں کہ کتنے عمدہ طریقے سے کلامِ الٰہی کے مفہوم و مدعا کو نظم کیا گیا ہے۔ اور کس قدر احتیاط برتی گئی ہے اور کس قدر سلف کے طریقہ کا اتباع کیا گیا ہے۔ لیکن ایک پاکستانی محقق ضمیر نیازی نے "کلام پاک کا اولین ترجمہ منظوم اور تفسیر" کے عنوان سے ایک مقالہ لکھا ہے جو اتفاق سے "نوائے ادب" بمبئی کے اکتوبر ۱۹۸۲ء کے شمارہ میں چھپا ہے۔ اس میں تحریر فرماتے ہیں کہ

"بیسویں صدی کے نصف اول میں جب سیماب اکبرآبادی نے اپنے ترجمے کے متعلق علمائے کرام سے رجوع فرمایا تو ان میں اکثر معتبر اور مستند عالموں نے اسے تحریف سمجھ کر سخت ناپسند فرمایا تھا۔"

خدا جانے یہ بات انہوں نے کس بے خبری کے عالم میں لکھ دی۔ نہ تو انہوں نے اس ترجمے کے پڑھنے کی زحمت گوارا کی اور نہ انہیں علماء کی گرانقدر رایوں کا علم ہو سکا۔ حالانکہ مطبوعہ ترجمہ کے آغاز میں موجودہ صدی کے مشہور اور مستند علمائے کرام اور جید فضلا کی رائیں بھی نقل کر دی گئی ہیں۔ جب سیماب صاحب باحیات تھے تو انہوں نے اشاعت سے پہلے مسودہ کو دینی شخصیتوں کے سامنے پیش کیا تھا۔ اس وقت علمائے کرام نے اس ترجمہ کو دیکھ کر جن گرانقدر خیالات کا اظہار کیا ہے ان میں سے ہم یہاں چند رایوں کو بقدرِ اختصار پیش کرتے ہیں۔ شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ فرماتے ہیں:

"میں نے یہ ترجمہ منظوم حضرت سیماب صاحب کا بعض بعض مقامات سے دیکھا۔ انشاء اللہ نہایت مفید اور کارآمد معلوم ہوتا ہے۔ حضرت ناظم صاحب موصوف نے اکابر اسلاف رحمہم اللہ تعالیٰ کے تراجم کی مطابقت کا التزام کیا ہے۔ اس بنا پر یہ ہر طرح قابلِ اعتماد ہے۔ میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ اس سے عام انسانوں کو فیضیاب کرے اور موصوف کی مساعی جمیلہ کو مشکور اور باعثِ اجرِ جزیل فرمائے۔"

مولانا حفظ الرحمٰن صاحب سیوہاروی مرحوم نے فرمایا۔

"میں نے بھی متعدد سورتوں کا ترجمہ تنقیدی نظر سے دیکھا ہے۔ اور آیت آیت کا مقابلہ کر کے اس کے صحت و سُقم پر غور کیا ہے۔ موصوف نے قدرتِ کلام سے فائدہ اٹھا کر حضرت شاہ عبدالقادر نور اللہ مرقدہٗ اور حضرت شیخ الہند نور اللہ مرقدہٗ کے ترجمہ کا حتی الوسع پورا تتبع کیا ہے۔ اور اصلاحی نظر سے جس مقام پر بھی موصوف کو توجہ دلائی گئی ہے وسعتِ قلب کے ساتھ اس کو قبول فرمایا۔ تاکہ ترجمہ میں اتباعِ سلف کا دامن نہ چھوٹنے پائے۔ سیماب صاحب کی قدرتِ کلام، حسنِ نظم و انسجام، لطافت و سلاستِ زبان، اداءِ مفہوم میں لفظی ترجمہ کی رعایت کا التزام، ایسے امور ہیں جن کے پیشِ نظر اس کو مستند اور لائقِ اعتماد کہا جا سکتا ہے اور موصوف کی محنت و کاوش قابلِ تبریک و تحسین ہے۔"

مولانا سعید احمد اکبرآبادی مدیر "برہان" دہلی لکھتے ہیں:

"خاکسار نے قرآن مجید کا منظوم ترجمہ مولانا سیماب صاحب اکبرآبادی تقریباً از اول تا آخر تمام کا تمام دیکھا ہے۔ اور اب میں بوثوق یہ کہہ سکتا ہوں کہ فاضل مترجم نے یہ ترجمہ بڑی احتیاط اور کمال احساسِ ذمہ داری کے ساتھ کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ میں اس سے پہلے یہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ کتابِ الٰہی کا منظوم ترجمہ اتنا کامیاب ہو سکتا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مولانا نے ایک بلند پایہ استادِ سخن اور قادر الکلام شاعر ہونے کے باعث حضرت شیخ الہند اور حضرت شاہ عبدالقادر دہلویؒ کے ترجمہ کو نظم کا پیرایہ پہنا دیا ہے۔ جا بجا توسین میں جو مختصر اور جو عبارتیں ہیں وہ سب توضیحی اور تشریحی ہیں۔ جن سے ترجمہ کے سمجھنے میں مدد مل سکتی ہے کہ مفہومِ قرآنی میں کسی قسم کا رد و بدل واقع ہوا ہو۔ ترجمہ پر نظر کرنے کے بعد بعض مقامات پر کوئی لفظ کھٹکا تو میں نے بے تکلف مولانا سے عرض کر دیا۔ اور مولانا نے اسے تسلیم کر کے وہیں ترمیم و تنسیخ کر دی۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ منظوم ترجمۂ قرآن اردو میں اپنی نوعیت کا پہلا اور واحد

...ہے اور مجھے امید ہے کہ اسے مقبولیتِ عامہ کا شرف حاصل ہوگا۔"

مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی ناظم ندوۃ المصنفین دہلی لکھتے ہیں:

"مولانا سیماب اکبرآبادی ہمارے ملک کے مشہور نغز گو اور قادر الکلام شاعر ہیں۔ فنی اعتبار سے بھی موصوف کا شمار مسلّم الثبوت اساتذہ میں ہے۔ مقام مسرت ہے کہ ایسے باکمال استاذِ سخن کا کمال، شاعری کے حدود اربعہ تک ہی محدود نہیں رہا، بلکہ ان کے قلم سے کلام الٰہی کی بے مثل خدمت معرضِ وجود میں آگئی۔

آپ نے شب و روز کی عرق ریزی کے بعد کلام مجید کا منظوم ترجمہ تیار کیا اور حق یہ ہے کہ اس خدمت کا حق ادا کر دیا۔ اس بابرکت ترجمے کے بڑے حصہ کو دیکھنے اور مختلف تراجم قرآن سے مقابلہ کرنے کی سعادت میرے لئے بھی مقدر ہو چکی تھی۔ انتہائی عدیم الفرصتی کے باوجود بحمداللہ متعدد پاروں کا ترجمہ غور اور دلچسپی سے دیکھا۔ میرے خیال میں فاضل مترجم نے اس اہم ذمہ داری کے کام کو زیادہ سے زیادہ احتیاط اور قابلیت سے انجام دیا۔ ترجمہ کی زمین حضرت شاہ عبدالقادر اور حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ کا منثور ترجمہ ہے۔ مترجم کا یہی حسنِ انتخاب ہے جس کی وجہ سے ترجمہ کا پایۂ اعتبار نہایت بلند ہو گیا ہے۔ اور اس مرحلے پر پورے وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ بحالتِ موجودہ اس سے بہتر اور باحتیاط اور معتبر منظوم ترجمہ نہیں ہو سکتا تھا۔"

مولانا عبدالنعیم الصدیقی فرماتے ہیں:

"الحمدللہ کہ قرآنِ کریم کے تراجم دنیا میں بسنے والے متمدن انسانوں کی بول چال میں کئے گئے اور برابر ہو رہے ہیں۔ حجۃ الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ اور انکی اولادِ کرام کی مساعیِ جمیلہ کی برکت سے فارسی اور اردو میں نہایت مستند ترجمے موجود ہیں اور انکی بنیاد پر سینکڑوں تراجم لکھے گئے۔ لیکن یہ تمام ترجمے نثر تک محدود ہے۔ ضرورت محسوس ہو رہی تھی کہ کوئی واقفِ دین، صحیح الخیال اور قادر الکلام نغز گو اس جانب توجہ فرمائیں جو فنِ شاعری کے ماہر اور سخن سنجی سے آگاہ ہونے کے ساتھ ہی ساتھ کلامِ الٰہی کے ترجمہ کی نزاکت کا پورا پورا احساس رکھتے ہوں۔ مجھ کو ایک خادم القرآن کی حیثیت سے بے انتہا مسرت ہوئی کہ ہمارے مایۂ ناز شاعر بلکہ استاد الشعراء جناب مولانا سیماب اکبرآبادی کی عنانِ توجہ توفیقِ خداوندی نے اس جانب پھیری اور موصوف نے محض خدا کے فضل سے سات سال کی مسلسل جد و جہد کے بعد قرآنِ کریم کا توضیحی ترجمہ نہایت شگفتہ بحر اور دل آویز پیرایۂ بیان میں مکمل فرمایا۔ میں جناب سیماب مدظلہٗ کی خدمت میں مخلصانہ ہدیۂ تبریک پیش کرتا ہوں اور حق تعالے کی بارگاہ میں ملتجی ہوں کہ وہ اس سعیِ جمیل کو سیماب صاحب کے لئے ذخیرۂ آخرت قرار دے اور جس طرح ترجمہ کی تکمیل میں دستگیری فرمائی ہے، انسان کی تشنہ روحوں کو عموماً اور نوجوانانِ اسلام کو خصوصاً اس ترجمے سے بہرہ مند فرمائے۔ اور معارفِ قرآنیہ کو اپنی مادری زبان میں یاد رکھنے اور اس کے مطابق عملی زندگی سنوارنے کا ذریعہ قرار دے۔

میں نے بعض مقامات کا ترجمہ خود دیکھا۔ اور میں مطمئن ہوں کہ حتی الامکان ارجح اور اصح اقوال کو اختیار کیا گیا ہے۔ اگر حضرت سیماب اکبرآبادی کے علاوہ (جن کا پایۂ فنِ شاعری ہمارے دور میں نہایت بلند اور جو صحیح خیالات و عقائدِ اہلِ سنت والجماعت کے معتقد ہیں) کوئی اور نغز گو منظوم ترجمہ پیش کرتے تو جتنے کہ پہلے تجربہ کیا تھا اس پہ ہرگز اظہارِ رائے نہ کرتا۔ کیونکہ ایک تفسیر سورۂ یوسف منظوم آئینۂ عبرت کی شکل میں ہمارے سامنے موجود ہے۔"

مولانا محمد میاں صاحب مرحوم نے لکھا ہے:

"قرآنِ حکیم کلام اللہ ہے اس کے عجائبات قیامت تک ختم نہیں ہونگے۔ ایک عجیب و غریب خدمت یہ سمجھ کر پورے قرآنِ حکیم

شاعر۔ بمبئی

کی تفسیر ایسے الفاظ سے کی گئی ہے جن پر کوئی نقطہ نہیں، یہ خدمت ہندوستان کے ایک مشہور فرزند کے حصہ میں آئی جو علامہ فیضی کے نام سے مشہور ہے۔ دوسری قابل قدر خدمت یہ تھی کہ نظم میں ترجمہ اور تفسیر ہو جو طبائع کے لئے خاص طور پر جاذب ہوتی ہے۔ الحمد للہ یہ گرانقدر خدمت کار پردازانِ قضا و قدر نے حضرت سیماب کے حصہ کیلئے مخصوص فرمائی۔ حضرت سیماب اس خدمت پر جس قدر خدا کا شکر ادا کریں، کم ہے۔ دعا ہے خداوند عالم اس منظوم مبارک کو اُمت اسلامیہ کے لئے مفید اور حضرت سیماب کیلئے ذخیرۂ عقبیٰ بنائے"۔

یہ ہیں اپنے وقت کے چند مشاہیر علماء کی رائیں، ان کے علاوہ مشہور مفسر قرآن مولانا احمد علی لاہوری مرحوم، مولانا محمد ادریس صاحب صدر مدرس حسین بخش دہلی۔ مولانا محمد صادق مہتمم مظہر العلوم، کراچی، خواجہ حسن نظامی اور مؤقر جرائد و رسائل کے مدیران نے اس کے متعلق اپنے اطمینان کا اظہار کیا۔ اور سیماب صاحب کے اس کارنامے کو اچھے الفاظ میں سراہا ہے۔

بخوفِ طوالت ہم انہیں نقل نہیں کرتے۔ اِن حضرات نے اِس ترجمۂ قرآن کے متعلق جو کچھ تحریر فرمایا ہے اُس سے نہ صرف اِس کے ادبی و لسانی مرتبہ کا اندازہ ہوتا ہے بلکہ اِس کی بھی تصدیق ہوتی ہے کہ یہ ترجمہ حد درجہ معتبر اور مستند ہے۔ ○○

جس مہینے میں آپ کا زرِ سالانہ ختم ہو، اُسی مہینے میں بھیج دیجیے تاکہ شاعر کی اشاعت بروقت ہو سکے

وَحیِ منظوم ترجمۂ قرآنِ مرقوم مع معانی و مفہوم

منظومۂ علامہ سیماب اکبر آبادی مرحوم

سُوْرَةُ قُرَيْشٍ
مَكِّيَّةٌ وَّهِيَ اَرْبَعُ اٰيَاتٍ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝
لِاِيْلٰفِ قُرَيْشٍ ۝ اٖلٰفِهِمْ رِحْلَةَ الشِّتَآءِ
وَالصَّيْفِ ۝ فَلْيَعْبُدُوْا رَبَّ هٰذَا الْبَيْتِ ۝
الَّذِيْٓ اَطْعَمَهُمْ مِّنْ جُوْعٍ ۙ وَّاٰمَنَهُمْ مِّنْ خَوْفٍ ۝

سُوْرَةُ الْفِيْلِ
مَكِّيَّةٌ وَّهِيَ خَمْسُ اٰيَاتٍ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝
اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِاَصْحٰبِ الْفِيْلِ ۝
اَلَمْ يَجْعَلْ كَيْدَهُمْ فِيْ تَضْلِيْلٍ ۝ وَّاَرْسَلَ عَلَيْهِمْ
طَيْرًا اَبَابِيْلَ ۝ تَرْمِيْهِمْ بِحِجَارَةٍ مِّنْ سِجِّيْلٍ ۝
فَجَعَلَهُمْ كَعَصْفٍ مَّاْكُوْلٍ ۝

سُوْرَةُ الْهُمَزَةِ
مَكِّيَّةٌ وَّهِيَ تِسْعُ اٰيَاتٍ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝
وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةِ ۝ نِ الَّذِيْ جَمَعَ مَالًا وَّ
عَدَّدَهٗ ۝ يَحْسَبُ اَنَّ مَالَهٗٓ اَخْلَدَهٗ ۝ كَلَّا
لَيُنْۢبَذَنَّ فِي الْحُطَمَةِ ۝ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْحُطَمَةُ ۝
نَارُ اللّٰهِ الْمُوْقَدَةُ ۝ الَّتِيْ تَطَّلِعُ عَلَى الْاَفْـِٕدَةِ ۝
اِنَّهَا عَلَيْهِمْ مُّؤْصَدَةٌ ۝ فِيْ عَمَدٍ مُّمَدَّدَةٍ ۝

سُوْرَةُ الْعَصْرِ
مَكِّيَّةٌ وَّهِيَ ثَلٰثُ اٰيَاتٍ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝
وَالْعَصْرِ ۝ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِيْ خُسْرٍ ۝
اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ
وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ ۙ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ۝

(۱۰) سورۂ قریش
یہ سورۃ مکۂ معظمہ میں نازل ہوئی اس میں چار آیتیں ہیں

نام سے اللہ کے کرتا ہوں آغاز بیاں — جو بڑا ہی رحم والا ہے نہایت مہرباں
چونکہ ہیں اہلِ قریش اس بات کے خوگر شنا — جاڑے گرمی کے سفر سے اُنس ہو ہے بڑا
چاہئے انکو کریں اس گھر کے رب کی بندگی — جس نے اُن کو بھوک میں کھانا کھلایا (بہ کمی)
خوف سے تھا زندگی کم پھر اماں بھی اُن کو دی

(۱۱) سورۂ فیل
یہ سورۃ مکۂ معظمہ میں نازل ہوئی اس میں پانچ آیتیں ہیں

نام سے اللہ کے کرتا ہوں آغاز (بیاں) — جو بڑا ہی رحم والا ہے نہایت مہرباں
(اے پیمبر) کیا نہ دیکھا تم نے (غور و فکر سے) — ہاتھی والوں سے کیا دیتا (؟) کیا اللہ نے؟
کیا نہیں اُس نے غلط سب داؤ اُنکے کر دیئے — اور پرندے جھنڈ کے جھنڈ انپہ بھیجے (بے حساب)
پھینکتے تھے اُن پہ جو کنکر کی (چھوٹی پتھریاں)
کر دیا کھائے ہوئے بھُس کی طرح (؟) (ویراں)

(۱۲) سورۂ ہمزہ
یہ سورۃ مکۂ معظمہ میں نازل ہوئی اس میں نو آیتیں ہیں

نام سے اللہ کے کرتا ہوں آغاز (بیاں) — جو بڑا ہی رحم والا ہے نہایت مہرباں
ہے خرابی طعن و ہر عیب جُو کی (ہر زماں) — جس نے مال و زر سمیٹا اور گن گن کر رکھا
وہ سمجھتا ہے کہ دیگا مال سا تھا اس کا سو — کچھ نہیں وہ پھینکا جائیگا
اور تم سمجھے ہو کیا یہ روندنے والی ہے کیا — آگ سلگائی ہوئی اللہ کی روشن تھا
وہ جو دلوں تک جا پہنچے گی تو، دلوں کے لئے تیار — بند اس میں کر دیئے جائیں گے وہ (ہر طرف سے)
(شعلوں کے) لمبے ستونوں میں وہ ہر سو گھیر کر

(۱۳) سورۂ عصر
یہ سورۃ مکۂ معظمہ میں نازل ہوئی اس میں تین آیتیں ہیں

نام سے اللہ کے کرتا ہوں آغاز بیاں — جو بڑا ہی رحم والا ہے نہایت مہرباں
(اے پیمبر) ہم قسم کھاتے ہیں تم سے عصر کی — بالیقیں تو نے یہیں انسان نقصان میں
ہاں مگر جو لائے ایمان اور عمل اچھے کئے — اور وصیت دوسروں کو حق کی کرتے رہے
اور جو کرتے رہے تاکید باہم صبر کی — اور ثابت قدمی میں بھی (؟)

سیماب — معاصرین کی نظر میں

یُونس اگاسکر
لیکچرر، مہاراشٹر کالج آف آرٹس اینڈ سائنس، بیلاسس روڈ بمبئی

دُنیا سے علم و فن کی عظیم اور قد آور شخصیتوں کا جائزہ لینے کے لئے دُرست تناظر کی موجودگی بہت ضروری ہے۔ اِس کی اہمیت کو جنہوں نے نظر انداز کیا، غلط راہوں پر جا پڑے اور افراط و تفریط کا شکار ہو گئے۔ کبھی تو شخصیت کی بے جا تعریف و تحسین سے پہلو بچانا مشکل ہو گیا اور کبھی اُن کے ساتھ انصاف ہی نہ ہو سکا۔ ایسے ناقابلِ قبول تجزیے سے محفوظ رہنے کا بہترین طریقہ یہی ہو سکتا ہے کہ علمی و ادبی شخصیتوں کے معاصرین کے مدن و وقار کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے اُن کی انصاف پسندانہ آرا کو رہنما بنایا جائے۔ البتہ اِس قسم کی کوشش اُسی وقت صالح ثابت ہو سکتی ہے جبکہ معاصرین میں اُنہیں کی رائے کا جائزہ لیا جائے جنہوں نے بے لاگ انداز میں اظہار خیال کیا ہو اور جن کے تجزیوں میں جذباتی قُربت یا عقیدت کی جھلک نہ پائی جاتی ہو اور نہ ہی معاندانہ تنقید کی بُو آتی ہو۔

مولانا سیماب سے متعلق اُن کے معاصرین کی تنقیدی آراء کا جائزہ لیتے ہوئے جس دشواری کا سامنا کرنا پڑا، وہ تھی اُن کے دور کے ادبی ہنگاموں کی زد سے بچی ہوئی شخصیتوں کی آرا کی تلاش۔ سیماب چونکہ ہمہ گیر شخصیت کے مالک تھے، اِس لئے اُن سے متعلق رایوں میں رنگا رنگی اور تنوّع کے ساتھ ساتھ تضادات بھی ملتے ہیں۔ اِس مضمون میں صرف انہیں آراء کو شامل کیا گیا ہے، جن کی رنگا رنگی سیماب کی پہلودار شخصیت کے خد و خال کو بیش از بیش روشن کرنے میں ممد و معاون ثابت ہو سکتی ہے۔

نواب سراج الدین احمد خاں سائل دہلوی، مرزا داغ کے داماد و جانشین تھے، تمام شاگردانِ داغ ان کا بے حد احترام کرتے تھے۔ حضرت سائل نے علامہ سیماب کی متنوع اور پہلودار شخصیت کا جائزہ بڑے مختصر لیکن جامع الفاظ میں لیا ہے۔ بڑے محبت آمیز لہجے میں فرماتے ہیں:

"اُن (سیماب) کی جامعیتِ شاعری ایسی انوکھی ہے جس سے بعض اوقات ایک حیرت سی طاری ہو جاتی ہے۔ اور دعائے سلامتی دل سے نکلتی ہے۔ اِس عزیز میں یہ خاص صفت دیکھی گئی کہ جس صنف پر قلم اُٹھایا اُس میں ثابت کر دیا کہ جادۂ سخن یوں طے کیا کرتے ہیں۔" (کارواں)

دبستانِ لکھنؤ کے ایک اور قد آور معاصر مولانا صفی لکھنوی، اُردو غزل گو شعراء میں ایک خاص مقام کے مالک ہیں۔ اُنہوں نے سیماب کی قدرتِ کلام اور انفرادیتِ سخن دونوں کا اعتراف ان الفاظ میں کیا ہے:

"میری نظر میں جناب سیماب اکبرآبادی کی ایک خاص وقعت ہے۔ اُردو ادب کے لئے اُن کا دم غنیمت ہے۔ وہ صاحبِ طرزِ خاص ہیں اور جملہ اصنافِ سخن پر قادر"

(الوارث سیماب نمبر)

یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ مشق و مزاولت سے کوئی بھی فطری فنکار اپنے اندر قدرتِ سخن اور جامعیت پیدا کر سکتا ہے، اگرچہ اس کے لئے بھی عبقری ذہانت کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن صاحبِ طرز وہی بن سکتا ہے جس کے اندر خصوصی مادۂ اختراعی اور فنکارانہ اُپج ہو۔ سیماب کی عظمت کا یہ بیّن ثبوت ہے کہ اُنہوں نے معیار کی بلندی اور طرز کی انفرادیت دونوں کا سکہ اپنے معاصرین کے اذہان پر بٹھا دیا۔

علامہ رضا علی وحشت کلکتوی غالب کے متبع اور بنگال کے بڑے نامور شاعر تھے۔ اُنہوں نے سیماب کی خدمات کا جن واضح الفاظ میں اعتراف کیا ہے، وہ اُن کی عقیدت و محبت کے علاوہ سیماب کے فن کی تاثیر کا نتیجہ ہے۔

"علامہ سیماب کا احترام جہاں ہندوستان کے ارباب ادب

کی ایک کثیر تعداد کرتی ہے۔ وہاں پیچ بیدان مشت
بھی علامہ کی ادبی خدمات کا اعتراف کرتا ہے۔ علامہ
موصوف سے مجھے خاص طور سے عقیدت رہی ہے۔ آپ کا
چشمۂ فیض ہندوستان کے گوشے گوشے میں پہنچا ہے۔"

(الوارث سیماب نمبر)

علامہ سیماب کی اختراعی ذہانت اور فطری اُپج کا ذکر ہو چکا ہے۔ اِس پہلو کی انوکھا احساس "جدید اُردو شاعری" کے مولف پروفیسر عبدالقادر سروری کے ہاں بھی پایا جاتا ہے۔ اُن کا ایک مختصر سا اقتباس ملاحظہ ہو :

"اسالیب کے اختراع اور تنوع کی مثالیں جو جدید دور کا حصہ ہیں، جیسی سیماب کے پاس نظر آتی ہیں، دوسرے شعرا کے پاس کم نظر آئیں گی۔"

آگے چل کر لکھتے ہیں۔

"اِس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ الفاظ کا شکوہ اور دروبست، فقروں کی چستی اور برجستگی اور ترکیبوں کی تراش خراش میں وہ اپنے معاصرین میں سب سے ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔"

(جدید اُردو شاعری)

سیماب نے اپنے فنی اختراعات اور غیر معمولی تخلیقی صلاحیتوں سے نظم و غزل کی دُنیا میں نئی نئی تبدیلیاں کیں۔ روایتی غزل گوئی میں سیماب اور اُن کے معاصر شعرا نے جو انقلابات پیدا کئے، اُن کا اعتراف ہر اہلِ اُردو پر لازم ہے۔ لیکن افسوس کہ اس میدان میں سیماب کے معاصرین کو تو کچھ نہ کچھ دادِ تحسین ملی، مگر سیماب کی خدمات کو بُھلا دیا گیا۔ حالانکہ سیماب کے چند انصاف پسند ہم عصروں نے اُنکی جدت پسندی اور تازگیِ مضمون کی داد دی ہے۔ کلیم الدین احمد اُردو کے سب سے سخت گیر نقاد گردانے جاتے ہیں۔ اُنہوں نے سیماب کی غزل گوئی کو جن الفاظ میں خراجِ تحسین پیش کیا ہے، وہ تعجب خیز حد تک دلچسپ اور اہم ہے۔ :

"سیماب اکبر آبادی کی اہمیت تاریخی ہے۔ سیماب اُن شاعروں میں ہیں جو صرف غزلیں نہیں کہتے بلکہ اپنے فن اور اُس کے مختلف پہلوؤں پر غور و فکر بھی کرتے ہیں۔ اُنہوں نے محسوس کیا کہ موجودہ زمانے میں غزل گوئی کی کشتی کے منجدھار میں گھر گئی ہے۔ پُرانے خیالات کی ۔۔۔ تکرار شاعری سمجھی جانے لگی ہے۔ اس لئے اُنہوں نے غزل میں انقلاب پیدا کرنے کی کوشش کی۔ مضامین کی دُنیا محدود تھی، اُسے وسیع کیا۔ طرزِ ادا میں ابتذال اور فرسودگی سے بچ کر متانت، سنجیدگی، شوکت اور ادبی شان پیدا کی۔ اس لئے موجودہ تغزل کا مورخ جدید رنگِ تغزل کی داغ بیل ڈالنے والوں میں اُنہیں شمار کرے گا۔"

(الوارث سیماب نمبر)

پروفیسر کلیم الدین احمد کی اِس حقیقت پسندانہ رائے کو سامنے رکھتے ہوئے میں آج کے اُردو ادیبوں اور نقادوں سے گزارش کروں گا کہ سیماب پر دی گئی معاصر آرا کی روشنی میں سیماب کی شاعری کا توجہ سے مطالعہ فرمائیں اور سیماب کے ساتھ انصاف کریں۔

سیماب کی غزل گوئی کا یہ مختصر سا جائزہ ادھورا ہی رہ جائے گا اگر اس میں علامہ تاجور نجیب آبادی کی کچھ تعدادِ تائید نہ شامل کی جائے۔ علامہ تاجور یوپی کے تھے مگر پنجاب کے جدید مضمون کی تعمیر و اصلاح میں اُن کا زبردست حصہ ہے۔ اُس دور کا "ادبی دنیا" اور "شاہکار" اُن کے کارنامے ہیں۔ شاہکار ہی میں اُنہوں نے لکھا تھا :

"علامہ سیماب ملک کے چند منتخب شعرا میں شمار ہوتے ہیں۔ اُنکی شاعری بلند خیالات، پاکیزہ جذبات اور دلنشیں تغزل کی سرمایہ دار ہے۔ اُنکی غزلیات شاداب زمینوں، اُبلتے ہوئے قافیوں اور فلسفیانہ نکتہ آرائیوں سے غزل سرا معاصرین میں وجہ امتیاز رکھتی ہیں۔ اُنکی بعض نظموں اور غزلوں کے متعدد اشعار پڑھ کر یہ خیال ہوتا ہے کہ کوئی پیغام دینا چاہتے ہیں۔ آگرہ کی بجائے لاہور کے باشندہ ہوتے تو پیغمبر بنا دیئے جاتے۔"

(شاہکار اپریل ۱۹۳۰ء)

غزل کے ساتھ نظم میں بھی سیماب نے اپنی جدت طرازی اور انفرادی سرجوش کے سہارے ہیئت اور مواد کی نئی جہتیں تلاش کیں۔ سیماب نے جس دور میں اپنی کاوشات پیش کیں وہ اقبال کی شاعری کے غلغلے کا دور تھا۔ جوش کی انقلابی اور ہنگامی نظمیہ شاعری کا آغاز ہو چکا

ا۔ نئی نسل بغاوت اور انقلاب کے نعرے لگانے لگی تھی۔ مگر سیاب کی
بھی اور متین آواز کی اہمیت کا احساس بھی آہستہ آہستہ بڑھتا
ا۔ سیاب کی نظموں میں انقلابی آہنگ کی تلاش کے سلسلے میں پروفیسر
القادری سروری سے مزید اکتساب کرنا مناسب ہوگا۔ لکھتے ہیں :

"جوش کی مانند سیاب بھی بعد میں نوجوانوں کی تحریک
میں شامل ہو گئے لیکن جوش کی طرح محض "بڑھے جاؤ"
نہیں کہتے بلکہ بار بار اُنہیں "کھڑے ہو جاؤ اور سوچو"
کی تلقین کرتے ہیں۔ انقلاب میں وہ جوش کی طرح
انتہا پسند نہ ہوں، لیکن انقلاب کے خواہاں ضرور ہیں۔"

ڈاکٹر اعجاز حسین نے اپنی معروف تالیف "مختصر تاریخ ادب
اردو" میں مختلف اساتذۂ فن کا بڑا مختصر لیکن جامع تعارف پیش کیا
ہے۔ سیاب کی شاعری پر اُن کے تبصرے کا یہ اقتباس ہمارے اس جلیل
القدر شاعر کی خدمات ہی کیطرح متین اور سنبھلا ہوا ہے :

سیماب کے یہاں جذبات سے زیادہ خیالات اور
فلسفے کے مضامین آپ کو ملیں گے۔ وہ انگریزی
شاعری کے پوپ، ڈرائڈن اور جانسن کے کلاسکی
اسکول سے زیادہ ملتے ہیں۔ آپ کا کلام علاوہ اور
خوبیوں کے زبان کی لطافت اور فن کی تکمیل کی پوری
تصویر ہے۔

آپکی متانت اور سنجیدگی کیوجہ سے نظموں میں
جوش و خروش زیادہ پیدا نہیں ہو سکا مگر پھر بھی اس
کا پتہ چلتا ہے کہ ہر طبقے اور ہر مسئلے پر آپکی نظریں
ناقدانہ انداز سے پڑ رہی ہیں۔" ص۲۱۱

اور اس کی بڑی وجہ خود ڈاکٹر اعجاز حسین ہی کے الفاظ میں یہ معلوم ہوتی ہے
کہ "سیماب کا سیاسی جذبہ یا سیاست سے دلچسپی شعوری۔
شعوری یا تقلیدی نہیں بلکہ وسیع النظری اور عمیق
مطالعے کا نتیجہ ہے۔"

(الوارث سیاب نمبر)

سیاب کی نظموں میں انقلابی آہنگ کے ساتھ ساتھ شاعرانہ حسن
بھی اس خوبی کے ساتھ سمویا ہوا ہے کہ نیاز فتحپوری جیسا فنی گرفت
رکھنے والا اور لکھنؤ اسکول کا طرفدار جمالیاتی نقاد بھی اپنے مخصوص
شاعرانہ... بھی

تاثراتی انداز میں بے اختیار کہہ اٹھتا ہے :

"کبھی ایسا نہیں ہوا کہ میں نے کسی نظم کو دیکھا ہو
اور کاروبار کی الجھنوں اور علائق دنیا کے مخصوص
سے علاحدہ ہو کر تھوڑی دیر کے لئے اُس فضا
میں نہ پہنچ گیا ہوں جسے بجز ایک حقیقی شاعر کے
کوئی دوسرا نہیں پیدا کر سکتا۔ لیکن یہ ضرور ہے
کہ جب اُن کی کوئی خالص ادبی نظم سامنے آگئی تو
یہ کیفیت زیادہ شدید محسوس ہوئی۔"

(انتقادیات ص۲۱۱)

مذکورہ بالا معتبر و مستند ارباب نقد و نظر اور اہل فن کے علاوہ
متعدد مشہور معاصرین نے بھی سیماب کے فن پر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔
اُن میں سے دو تین حضرات کی مختصر رائیں سیاب کی شعری خدمات پر جامع
تبصروں کی حیثیت رکھتی ہیں۔

حضرت دل شاہجہانپوری جو خود اس دور کے مشہور اساتذۂ غزل میں
سے تھے، فرماتے ہیں :

"میں علامہ موصوف کو بہ اعتبار فن و بہ اعتبار جذبات ...
جذبات و بلندیٔ خیال، قابل قدر مستند و ممتاز
شاعر سمجھتا ہوں۔"

(الوارث سیاب نمبر)

مولانا احسن مارہروی جو مرزا داغ کے شاگردوں میں بے حد ممتاز
تھے، خود اپنی جگہ اُستاد اور صاحب فن تھے۔ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ
اردو کے صدر رہے۔ علامہ سیماب کے اُستاد بھائی تھے۔ اُنہوں نے
ان الفاظ میں سیاب کی خدمات کو سراہا ہے :

"جناب سیماب سے زیادہ نظم خدمت شعر و ادب
کرنے والا دوسرا شاعر نظر نہیں آتا۔ اور وہ خدمات
بھی ہنگامی اور سرسری نہیں بلکہ ٹھوس اور مستقل۔"

(شاعر آگرہ۔ سالنامہ ۱۹۴۲ء)

دورِ حاضر میں پروفیسر فرمان فتح پوری کی رائے مولانا احسن مارہروی
کی مجمل رائے کی تفصیل معلوم ہوتی ہے، اس لئے اسے یہاں درج کئے
بغیر نہیں رہ سکتے۔ "نگار" شمارہ اپریل ۱۹۵۵ء میں رقمطراز ہیں :

"سیماب کی شخصیت اُردو ادب میں غیر معمولی اہمیت

رکھنو ... اُردو شاعری میں نئے اقدارِ حیات کو داخل کرنے، جدید محلاتِ شعری کو اصل منزل کی طرف موڑنے کی شعوری جدوجہد میں سیماب کی کوششیں ہمیشہ مشکور رہیں گی اور جب جدید شاعری کے اجزائے ترکیبی اُس کے اساسی پہلوؤں محرکات و معتقدات، عوامل و اثرات اور تدریجی ارتقا کی تاریخ مرتب کی جائے گی تو سیماب کا نام کوئی عدل پسند مصنّف یا ناقد نظر انداز نہیں کر سکتا۔"

سیماب کی شاعری اور شخصیت پر دی گئی آراء کو اگر جمع کیا جائے تو میں سمجھتا ہوں کہ ایک مکمل کتاب بن سکتی ہے۔ اس تقریب میں مزید معاصر آراء کو پیش کرنے کا موقع نہیں ہے۔ مگر ایک نثری اقتباس ہفت روزہ "آئینہ" دہلی کا دینا ضروری سمجھتا ہوں۔ آئینہ کے مدیر ڈاکٹر ظ۔ انصاری تھے۔ اور اس میں مشہور و ممتاز ادبا و شعرا کی بڑی بڑی تصویروں کے ساتھ اُن پر اظہارِ خیال بھی ہوتا تھا۔ یہ ٹکڑا ۲۰ر جنوری ۱۹۵۶ء کی اشاعت سے لیا گیا ہے جو سیماب کی چوتھی برسی کے موقع پر شائع کیا گیا تھا:

"تاریخِ ادبِ اُردو کی عظیم شخصیت جن کے متعلق اب تک یہ تحقیق نہ ہو سکا کہ وہ بڑے ادیب تھے یا بڑے غزل گو یا بڑے نظم نگار۔ اُن کی حیثیتیں اتنی گتھی ہوئی اور اس درجہ گہری ہیں کہ بغیر تحقیقاً محنت اور غور و فکر کے سیماب کو سمجھنا مشکل ہے، وہ ایک یونیورسٹی تھے۔

نظم و نثر کی تین سو سے زیادہ کتابوں کے خالق۔ مسلسل پچاس سال تک اُردو زبان و ادب کی خدمت انجام دیتے رہے۔ اُس دور میں جب کہ ہر طرف قدیم اساتذہ کا طوطی بول رہا تھا۔ انہوں نے قدامتوں کی تہوں سے جدّتوں اور ندرتوں کو اُبھارا۔ ادب و شعر میں اضافے کئے۔ اصلاحات کیں اور قدیم رنگِ سخن کو نیا رنگ و آہنگ دیا۔"

مشہور مورّخ اور ادیب و نقّاد پروفیسر مولانا حامد حسن قادری تاریخی قطعات لکھنے اور مادہ ہائے تاریخ نکالنے میں یدِ طولیٰ رکھتے تھے۔ اُنہوں نے سیماب کے کتبۂ مزار کے لئے جو تاریخی قطعہ لکھا تھا اور جو سیماب کے مزار پر کندہ کیا گیا اُسی قطعے پر میں اپنی بات ختم کرتا ہوں:

کتبۂ مزارِ اقدس حضرت سیماب اکبرآبادی

دے گیا داغِ جدائی آخر ... وہ معظم، وہ مکرم سیماب
فخرِ علم و ادب اُستادِ زماں ... فن کے اَسرار کا محرم سیماب
قادری لکھ دو یہ تاریخِ وفات
"نہ رہا شاعرِ اعظم سیماب"

○○ ۱۹ ۶ ۵۱

الہامِ منظوم ترجمۂ اُردو مثنوی مولانائے رُومؒ کے دفترِ اوّل کا ایک صفحہ

بشنو از نَے چوں حکایت میکُند — از جُدائی ہا شکایت میکُند
سُن تو کیا کرتی ہے باتیں بانسری — بس شکایت کر رہی ہے ہجر کی

کز نیستاں تا مرا ببریدہ اند — از نفیرم مَرد و زَن نالیدہ اند
جب سے کاٹا ہے نیستاں[1] سے مجھے — مَرد و زَن روتے ہیں میرے شور سے

سینہ خواہم شرحہ شرحہ از فراق — تا بگویم شرحِ دردِ اشتیاق
پارہ پارہ کر دے سینہ جب فراق — تب کہیں ہو شرحِ دردِ اشتیاق

ہر کسے کو دُور ماند از اصلِ خویش — باز جوید روزگارِ وصلِ خویش
جا رہا ہو اصل سے جو اپنی دُور — اپنا عہدِ وصل ڈھونڈے گا ضرور

مَن بہر جمعیتے نالاں شُدم — جُفتِ خوشحالان و بدحالاں شُدم
میں ہر اک مجلس میں فریادی ہوئی — غم زدوں اور خوش دلوں کے مُنہ لگی

ہر کسے از ظنِ خود شُد یارِ من — وز دُرونِ من نہ جُست اسرارِ من
سب نے یاری مجھ سے کی حسبِ گماں — پر نہ ڈھونڈے مجھ میں اسرارِ نہاں

سِرِّ من از نالۂ من دُور نیست — لیک چشم و گوش را آں نُور نیست
دُور نالے سے نہیں رازِ نہاں — نورِ چشم و گوش میں لیکن کہاں

تن ز جان و جاں ز تن مستور نیست — لیک کس را دیدِ جاں دستور نیست
جاں سے تن اور تن سے جاں کب ہے نہاں — پر نہیں کرتا کوئی دیدارِ جاں

آتش ست ایں بانگ نائے و نیست باد — ہر کہ ایں آتش ندارد نیست باد
آگ ہے آوازِ نَے۔ کب ہے ہَوا — آگ یہ جس میں نہ ہو، وہ ہو فنا

آتشِ عشق ست کاندر نَے فتاد — جوششِ عشق ست کاندر مے فتاد
عشق ہی کی آگ ہے۔ جو نَے میں ہے — عشق ہی کا جوش ہے۔ جو مے میں ہے

نَے حریفِ ہر کہ از یارے بُرید — پردہ ہایش پردہ ہائے ما درید
نَے حریف اُس کی جو دلبر سے کٹا — اُس کے پردوں نے دیئے پردے اُٹھا

ہمچو نے زہرے و تریاقے کہ دید — ہمچو نے دمساز و مُشتاقے کہ دید
کس میں ہے زہر اور امرت مثلِ نَے — نَے عجب دمساز اور مشتاق ہے

نَے حدیثِ راہِ پُرخوں می کُند — قصہ ہائے عشقِ مجنوں می کُند
نَے سے ہے اظہارِ راہِ خونچکاں — عشقِ مجنوں کا یہ کرتی ہے بیاں

دو دہاں داریم گویا ہمچو نے — یک دہاں پنہاں ست در لبہائے وے
ہیں ہمارے پاس دو مُنہ[2] مثلِ نَے — ایک مُنہ اس کے لبوں میں جذب ہے

۱؎ سرکنڈے اور بانس پیدا ہونے کی جگہ۔ ۲؎ مُنہ لبوں میں اُس کے اک، پوشیدہ ہے

مطبوعات و مخطوطاتِ سیمابؔ

وہ اہم کتابیں جن کے ایڈیشن ختم ہو چکے ہیں

۱۔ کلیمِ عجم (غزلوں کا پہلا مجموعہ) دو ایڈیشن
۲۔ سدرۃ المنتہیٰ (غزلوں کا دوسرا مجموعہ) ایک ایڈیشن
۳۔ کارِ امروز (نظموں کا پہلا مجموعہ) دو ایڈیشن
۴۔ سازو آہنگ (نظموں کا دوسرا مجموعہ) ایک ایڈیشن
۵۔ شعرِ انقلاب (نظموں کا تیسرا مجموعہ) 〃
۶۔ عالمِ آشوب (جنگ کے تعلق سے رباعیات کا ضخیم مجموعہ) 〃
۷۔ نفیرِ غم (عزائی نظمیں اور سلام) تین ایڈیشن
۸۔ سرودِ غم (〃 〃 〃) 〃
۹۔ رازِ عروض (عروض پر عام فہم مختصر کتاب) چھ ایڈیشن
۱۰۔ دستور الاصلاح (فنِ اصلاح پر اولین کتاب) تین ایڈیشن
۱۱۔ کرشن گیتا (سری کرشن جی پر نظمیں) ایک ایڈیشن
۱۲۔ سیرۃ النبیؐ (ضخیم سیرتِ سرورِ کائناتؐ) مطبوعہ تاج کمپنی کراچی

وہ اہم مسودات و مخطوطات جنہیں کتابی شکل میں شائع ہونا ہے

۱۳۔ لوحِ محفوظ (آخری دور تک کی غزلوں کا مجموعہ) نظم
۱۴۔ تجلیات (نعتیہ کلام کا مجموعہ) 〃
۱۵۔ خطباتِ شاعری (۱۴ خطبے۔ حصۂ اول) نثر
۱۶۔ 〃 〃 (۱۴ خطبے۔ حصۂ دوم) 〃
۱۷۔ آیاتِ سخن (دو سو سے زیادہ رباعیات) نظم
۱۸۔ منہاج الادب (ادبی و تنقیدی مضامین) نثر
۱۹۔ مضامینِ سیماب (تاریخی، علمی، اصلاحی) 〃
۲۰۔ نو رتن (۹-۹ شعر کی مختصر نظمیں) نظم
۲۱۔ نظمِ باقی (متفرق نظموں کا مجموعہ) 〃
۲۲۔ جدید شرحِ دیوانِ غالب ("شاعر" میں بالاقساط شائع شدہ) نثر
۲۳۔ شاعر کی داستان (شاعر و ملک کے دلچسپ واقعات "شاعر" میں بالاقساط شائع شدہ)
۲۴۔ شاہراہ (عربی عروض کا ہندی روپ) "شاعر" میں بالاقساط شائع شدہ) نثر
۲۵۔ نکاتِ فن (عروض و قواعد و فن کے مباحث ("شاعر" میں شائع شدہ) نثر
۲۶۔ ہمارا پیام (سیاسی و واقعاتی پیغامات اخبار "تاج" اور "شاعر" میں شائع شدہ)
۲۷۔ سیماب کے افسانے (مختلف اخبارات و رسائل میں شائع شدہ) نثر
۲۸۔ شعری کتبے (کئی سو تاریخی قطعات) نظم
۲۹۔ تاج اللغات (مصادر پر نامکمل لغت مع شعری امثال) نثر
۳۰۔ کتاب السلف (چند قدیم شعرا کا تذکرہ۔ رسالہ "ادیب" قسطوار میں شائع شدہ)
۳۱۔ علیہ ما علیہ (مولانا نیاز فتحپوری کے مالہٗ و علیہ کا جواب) 〃
۳۲۔ ناظمینِ اردو (چند ہم عصر شعرا کا تذکرہ "شاعر" میں شائع شدہ) 〃
۳۳۔ قصائدِ سیماب (۸ قصیدے نایاب) نظم
۳۴۔ سیماب کے مختصر ڈرامے (رسالہ "پیمانہ" اور اخبار "تاج" میں شائع شدہ) نثر
۳۵۔ ادب پارے (مختصر تاثراتی اور فکری تحریریں) 〃
۳۶۔ اصلاحاتِ سیماب (تلامذہ کے کلام پر چند اصلاحی نمونے) نظم
۳۷۔ مکاتیبِ سیماب (بڑی تعداد میں خطوط دستیاب کئے جا سکتے ہیں) نثر
۳۸۔ شذراتِ سیماب (اخبار "تاج" کے سیاسی اداریے) 〃
۳۹۔ وحیٔ منظوم (مکمل منظوم ترجمۂ قرآن مجید مع متن۔)

یہ پہلا مکمل ترجمۂ منظوم ہے جس پر بیشتر علماء نے اتفاق کیا، مہرِ تصدیق و تحسین ثبت کی۔ اس کا صرف ایک پارہ ۱۹۵۳ء میں شائع ہوا تھا جس میں علماء کی رائیں بھی شامل ہیں۔

سیماب کے غیر مطبوعہ ڈرامے

۴۰۔ گوتم بدھ
۴۱۔ دوشیزۂ فرانس (جون آف آرک) (مس کجن نے بیانہ معاوضہ لکھوایا تھا)
۴۲۔ انگریس کی محبت 〃 〃 〃 〃
۴۳۔ کالج
۴۴۔ گیت کی جیت (تمام ڈراموں میں گانے بھی شامل ہیں)

شاعر۔ بمبئی

قدیم نایاب کتابیں

(سنہ ۱۹۲۳ء سے سنہ ۱۹۳۰ء تک)

۴۵۔ نغمستان (اسلامی نظمیں)
۴۶۔ مشاہدات (لوہرو اوقاف کا ترجمہ)
۴۷۔ تحفۂ دربارِ ولایت (نثر)
۴۸۔ آفتابِ اردو (نصاب میں شامل کتاب)
۴۹۔ ادبی موتی (" " " ")
حصہ اول، حصہ دوم
حصہ سوم، حصہ چہارم
۵۰۔ بن بنسی (دیہات سدھار گیت)
۵۱۔ الہامِ منظوم
(منظوم ترجمہ مثنوی مولانا روم مع متن)
دفتر اول، ۴۹۱ صفحات
دفتر دوم، ۴۱۴ "
دفتر سوم، ۵۱۵ "
دفتر چہارم، ۴۱۲ "
دفتر پنجم، ۴۶۲ "
دفتر ششم، ۵۳۲ "
پہلا ایڈیشن فیروز سنز لاہور نے اور دوسرا ایڈیشن ملک دین محمد اینڈ سنز لاہور نے شائع کیا تھا۔ ہندوستان میں نایاب ہے۔
(سنہ ۱۹۰۱ء سے سنہ ۱۹۲۳ء تک کی تصانیف)
مطبوعہ عزیزی پریس آگرہ۔
۵۲۔ بنت الرسولؐ نثر
۵۳۔ معلمہ "
۵۴۔ تذکرۃ الرسولؐ "
۵۵۔ انمول موتی "
۵۶۔ ۱۶ کہانیاں (الگ الگ) "
۵۷۔ جڑاؤ چندن ہار "
۵۸۔ سگھڑ سہیلی "
۵۹۔ سترہ کہانیاں (الگ الگ) "
شاعر۔ بمبئی

۶۰۔ زنانہ آداب نثر
۶۱۔ فریبِ وفا (ڈرامہ) "
مطبوعہ ابوالعلائی پریس آگرہ
۶۲۔ سوانح خواجہ غریب نوازؒ نثر
۶۳۔ سوانح نور جہاں بیگم "
۶۴۔ اللہ والوں کی محفل "
۶۵۔ زنانہ خط و کتابت "
۶۶۔ سرچار ماں باپ کے دو سرا بیٹے "
۶۷۔ آئمۃ الہدیٰ "
۶۸۔ حیاتِ صابرؒ "
۶۹۔ انوار العلا (سوانح شاہ ابوالعلاؒ) "
۷۰۔ رومن کیریکٹر (رومن رسم الخط سکھانے کیلئے)
۷۱۔ نیا باورچی خانہ نثر
۷۲۔ وفا کی دیوی "
۷۳۔ صبرِ ایوبؑ "
۷۴۔ غوث الاعظمؒ "
۷۵۔ لوری نامہ نظم
۷۶۔ چڑے چڑیا کی کہانی نثر
۷۷۔ گلدستۂ عطار (میلاد نامہ)
(پانچ حصوں میں۔ اس کے آٹھ ایڈیشن شائع ہوئے تھے)
۷۸۔ مضمون نویسی نثر
۷۹۔ لاڈلا بیٹا "
۸۰۔ بہشتِ شداد "
۸۱۔ زنانہ میلاد (نظم و نثر)
۸۲۔ شکیلہ بیگم نثر
۸۳۔ زیورِ ایمان "
قدیم مطبوعہ ڈرامے:
۸۴۔ ہریش چندر

۸۵۔ داؤ پیچ یا خوبصورت بلا نثر
۸۶۔ ناکامِ تمنا "
۸۷۔ پیچ در پیچ "
سیماب کے وہ ڈرامے جو تھیٹریکل کمپنیوں نے خریدے:
۸۸۔ سرفروش
(الفریڈ تھیٹریکل کمپنی بمبئی نے خریدا)
۸۹۔ جوہرِ شمشیر
(جوبلی تھیٹریکل کمپنی دہلی نے خریدا)
۹۰۔ غیبی تلوار
(پارسی تھیٹریکل کمپنی بمبئی نے خریدا)
۹۱۔ مرثیے (تعداد بارہ۔ نایاب)
مطبوعہ صوفی پبلشنگ ہاؤس۔ منڈی بہاء الدین۔ پنجاب
۹۲۔ سیرۃ الحسینؓ نثر
۹۳۔ سیرۃ الکبریٰؓ "
(اس کتاب کا گجراتی زبان میں ترجمہ ہوا تھا)
۹۴۔ حالاتِ حالی نثر
۹۵۔ چراغِ داغ "
مطبوعہ کے، حاجی محی الدین بکسیلر بنگلور میسور
۹۶۔ جامع الخطب } عربی خطبات کا منظوم ترجمہ
۹۷۔ عزیز الخطب }
۹۸۔ ریاض الاظہر
(احادیث نبویؐ کا منظوم ترجمہ)
مطبوعہ حکیم محمد یعقوب خاں۔ دہلی
۹۹۔ آفتابِ زندگی (اصلاحی ناول)
۱۰۰۔ شبابِ زندگی (" ")
۱۰۱۔ خطوطِ جنت (منظوم خطوط)
۱۰۲۔ فریاد نظم
۱۰۳۔ زنانہ بستہ نثر
(یہ بستہ ۱۲ کتابچوں پر مشتمل ہے۔ بسم اللہ سے لیکر خانہ داری اور ازدواجی زندگی تک کے اس میں اسباق ہیں۔ زنانہ بستہ لڑکیوں کو جہیز میں دیا جاتا تھا۔ بیشمار ایڈیشن عصمت بکڈپو نے شائع کئے تھے۔

وہ کتابیں جو سیمابؔ پر لکھی جا چکی ہیں اور شائع ہوئی ہیں

۱۔ سیماب کی نظمیہ شاعری
از ڈاکٹر زرینہ ثانی۔ ناگپور
(پی۔ ایچ۔ ڈی کا تحقیقی مقالہ)
۲۔ سیماب اور دبستانِ سیماب
از۔ ڈاکٹر افتخار احمد فخر۔ جلگاؤں
(پی۔ ایچ۔ ڈی کا تحقیقی مقالہ)
۳۔ کارِ امروز کا تنقیدی جائزہ
از۔ ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی مرحوم
۴۔ سیماب۔ حیات اور کارنامے۔
از۔ ضیا فتح آبادی۔ صدر بزمِ سیماب۔ دہلی
۵۔ سوادِ اعظم اور سیماب
(متصوفانہ مقالہ)
از۔ ڈاکٹر انور راشد
۶۔ حیاتِ سیماب
(کئی لوگوں کا تحریر کردہ مواد موجود ہے جو تحقیق طلب اور از سر نو لکھا جانا ہے۔)
۷۔ سیماب پر وقتاً فوقتاً لکھے گئے مضامین
از۔ مختلف ادبا اور شعراء
(ان مضامین کی تعداد بہت کافی ہے۔)

○○

مجلسِ انتظامیہ

سیماب اکادمی، بمبئی

صدر :

جناب کرشن چندر

نائب صدور :

جناب خواجہ احمد عباس،
جناب سید شہاب الدین دسنوی
جناب اعجاز صدیقی
ڈاکٹر ظ۔ انصاری
ڈاکٹر ایس۔ ایس۔ نشاط
جناب شیام کشن نگم
جناب غلام احمد

جنرل سکریٹری :

جناب سید محمد زیدی

سکریٹریز :

ڈاکٹر سید محی رضا
پروفیسر یونس اگاسکر
جناب علی ایم شمسی
جناب امیر الدین انگولکر
جناب علی میاں سمنگے
ڈاکٹر آدم شیخ
جناب تاجدار احتشام
جناب پرویز یداللہ مہدی

خازن :

جناب داؤد شیخ علی غفی
شاعر۔ بمبئی

اراکین :

جناب سکندر علی وجد
جناب راجندر سنگھ بیدی
جناب علی سردار جعفری
جناب خواجہ عبدالغفور
جناب حفیظ نورانی
جناب نوشاد علی
ڈاکٹر اسحاق جمخانہ والا
جناب نیپال کے جین
ڈاکٹر عبدالستار دلوی
جناب یوسف ناظم
جناب حسن کمال
جناب کالیداس گپتا رضا
جناب سی۔ ایل۔ کاوش
جناب برج نارائن
جناب قیصر عثمانی
جناب ناصر حسین بلساری
جناب امانت علی برق
جناب یعقوب راہی
جناب محمود احمد خان
جناب عبدالرزاق سعید
جناب ساغر مدراسی
جناب زاہد اقبال
جناب اعجاز مدنی
جناب افتخار امام صدیقی

سیلاب

نعیم کوثر
نزد بدھوارہ پوسٹ آفس ـ بھوپال ۱

بہرام خاں جوانی کے دنوں میں جیل کے بھاری بھرکم دروازہ کی موٹی اور کڑیل زنجیر یوں موڑ دیا کرتے تھے جیسے دھوبی بھیگے ہوئے کپڑے
آج بھی سنٹرل جیل کے اُس سیاہ دروازہ کی وہ مُڑی ہوئی فولادی زنجیر اُنکی بے پناہ طاقت کی گواہی دیا کرتی ہے اور کچھ لوگوں کا تو یہ کہنا تھا کہ جب بھی کوئی قیدی حوالات آتا تو گیٹ کی اُس زنجیر کو کن انکھیوں سے دیکھتا ہوا اندر جاتا' جیسے اُس گھناؤنی چیز کے درشن اندر کے ماحول میں اُن کے لئے مُہلک ہوں۔ وہیں سامنے سنگِ مرمر پر اُن دلیش بھگتوں کے نام کندہ تھے جنھوں نے اپنی جوانی کا پُربہار زمانہ آزادی کی خاطر سال کوٹھری کے اندھیرے میں اُجاڑ دیا تھا۔ اندر داخل ہونے والوں کی نظریں جہاں دلیش بھگتوں کے دمکتے ناموں پر جا گڑتیں' وہیں بہرام خاں کی مضبوط اور انخافی کلائیوں کے اُس نمونے پر بھی اچنبھے سے ضرور اُٹھتیں ——

بہرام خاں شروع میں سپاہی بھرتی ہوا تھا۔ اور تھوڑے ہی دنوں میں اُس نے طاقتور جسم اور بے رحم دل کی بدولت تنِ تنہا سیکڑوں سر پھرے بدمعاشوں اور خونخوار مُجرموں کی ہڈیاں چٹخا دی تھیں۔ ویسے بھی نہ اُس کے آگے کوئی تھا اور نہ پیچھے۔ یتیم خانہ سے پندرہ سال کی عُمر میں نکل کر اُس نے آسمان کی وسعتوں سے ہی رشتہ جوڑا تھا۔ نوکری کے بعد بے فکری سے کھاتا اور مست رہتا۔ یہی وجہ تھی کہ بڑے افسر اُس کے ذمہ ایسے کام سونپتے تھے جسے انجام دینے کے لئے دوسروں کے پاس ہمت' دلیری اور دل گردہ نام کو نہ ہوتا۔

جب صوبہ میں پہلا پاگل خانہ قائم ہوا تو وہاں کے ملازمین کو تربیت دینے کے لئے بہرام خاں کی خدمات وارڈن نے مانگی تھیں۔ اور اُس نے نئے پاگل خانہ میں بے لگام دیوانوں کو سدھانے اور ملازمین کے ذریعہ اُنہیں قابو میں کرنے کے ایسے ڈھنگ اختیار کئے کہ حاکم بھی حیران رہ گئے۔ یہاں بہرام خاں نے کرختگی اور بے رحمی کا رویّہ نہیں اپنایا بلکہ پیار اور نرمی سے کھوئے ہوئے دماغوں میں تال میل پیدا کیا کرتا تھا۔ اُس کا کہنا تھا کہ پاگل انسان بھی شاعر بھی

ایک طرح کا قیمہ ہوتا ہے جس کی بکھری ہوئی دماغی زندگی کو ریشم کے دھاگوں سے بیٹھنا چاہئے' لوہے کی بیڑیوں سے نہیں۔

ایک دن پاگل خانہ میں خوبصورت اور معصوم سے جوان لڑکے کو اُس کے گھر والے داخل کرنے آئے۔ لڑکا کسرتی جسم کا تھا۔ اُس کے بے داغ اور ملائم چہرہ کو دیکھ کر بہرام خاں کے دل میں ہمدردی کی انجان سی گدگدی دوڑ گئی۔ اُسے ایک طرف کونہ میں لیجا کر بہرام خاں نے پیار سے پُوچھا۔

"کیوں منّا تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ یہاں کیسے لائے گئے؟"

"کیا بتائیں پہلوان صاحب۔ میں نے ایک لڑکی کو دل و جان سے چاہا۔ لیکن اُس نے مجھ سے فراڈ کیا۔ انگریزی آتی ہے تمہیں؟ ـ فراڈ یعنی دھوکہ کر گئی۔ اور میرے دل کے تاج محل کو ٹھوکر مار کر ایک لکھ پتی سیٹھ کے لڑکے سے شادی رچالی۔ اور اب زیادہ نہ پُوچھنا۔
میں پاگل ہوں ——"

بہرام خاں ٹھنڈی آہ بھر کر پسلیوں سے نکل آیا۔ زندگی میں پہلی بار اُسے پتہ چلا کہ دنیا میں محبت نام کی کوئی چیز ہوتی ہے جو اتنی بھیانک ہوتی ہے کہ جس کی آنچ سے پھول جیسی زندگی جل کر کوئلہ بن جاتی ہے۔ اُسے جھرجھری سی آگئی۔ اور وہ لکڑی کے موٹے رول کو بغل میں سے نکال کر دونوں ہاتھوں سے دبانے لگا۔ تبھی سامنے والی کوٹھری سے کوئی زور سے ہنسا۔ بہرام خاں نے غصہ سے اُدھر دیکھا۔ ایک جوان پاگل ہنستا ہوا اُنگلی سے اُس خوبصورت لڑکے کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔

"کیوں بے لڑکے ـ یہ پاگلوں کی طرح کیوں ہنس رہا ہے —— کیا وہ ترا رشتہ دار ہے جو خوش ہو رہا ہے؟"

"کچھ نہیں حوالدار صاحب۔ اصل میں جس لڑکی کی محبت میں وہ بانکا جوان پاگل ہوا ہے۔ اُس سے میں نے ہی شادی کی تھی ——" وہ مسلسل ہنسے گیا

مُنہ سے چبانے کے انداز میں دبلتے ہوئے خوفناک قہقہے لگاتا رہا۔ بہرام خان کانپ کر رہ گیا۔ اُسے محسوس ہوا کہ اگر کچھ دن اور اس سنگلاخ چہار دیواری میں رہ گیا تو جیسے وہ خود پاگل ہوجائے گا۔ دوسرے دن ہی اُس نے اپنی عارضی خدمات واپس کرنے کی درخواست دے دی۔ اور قسم کھائی کہ زندگی بھر کنوارہ رہے گا اور شادی کا نام زبان پر نہیں لائے گا۔

چنانچہ آج ۵۲ سال کی عمر ہوجانے کے بعد بھی بہرام خان تن تنہا تھا۔ اپنی بے داغ خدمات کے صلہ میں ترقی کرتے ہوئے وہ اب نائب جیلر تھا۔ ایک ہاتھ لمبی داڑھی رکھی تھی، جس کے لگ بھگ آدھے بال سفید ہو چکے تھے، لیکن اُس کا سینہ پہلے جیسا ہی چوڑا تھا — اور سلاخ جیسی موٹی اُنگلیوں پر ایک بھی جھُرّی اُبھر نہ پائی تھی — اب بھی اچھے اچھے شُہدا مجرم جیل میں قدم رکھتے تو اُس کا نام سنتے ہی اُن کی ٹانگیں لرزنے لگتیں۔ اور بہرام خان کا چہرہ دیکھ کر وہ بھیگی بلّی بن جاتے۔ کسی کی مجال نہ تھی کہ جیل میں کوئی ہنگامہ، لڑائی جھگڑا یا دھینگا مُشتی کرے۔ لوگوں کا کہنا تھا کہ خطرناک مجرم سزا کاٹنے یا رہائی پانے کے بعد شہر ہی چھوڑ جاتے، کیونکہ دوسری بار بہرام خان کی جیل میں آنے کے خیال سے اُن کا پِتّہ پانی ہوتا تھا۔ اِس قسم کے مجرم جیل میں آنے کے بعد اپنے محلہ کی طرح سپاہیوں اور کمزور قیدیوں پر حاکموں جیسا حکم چلانے کی سوچا کرتے تھے۔

سنٹرل جیل شہر کے قریب ہی اُونچی پہاڑی پر تھی۔ اُس رات شہر میں ہولی جلائی جا رہی تھی۔ سارا آسمان سُرخ ہو رہا تھا۔ ڈھول اور تاشوں کی آوازیں پتھر کی سیاہ دیواروں کا سینہ توڑ کر جیل کی کوٹھریوں میں گونج رہی تھیں۔ چہار سُو سرد سنّاٹا چھایا ہوا تھا۔ شہر کے لوگوں کی مستی سے بھرپور چیخ پکار اُن کوٹھریوں میں کمبل میں لپٹے قیدیوں کے دلوں پر ہولے ہولے دستک دے رہی تھیں۔ کئی قیدی ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھے تھے اور مُردہ قدموں سے چلتے ہوئے سلاخوں کے پاس آ کھڑے ہوئے تھے۔ بے چینی سے اُن کے ہاتھ پاؤں اور جسم کی بوٹی بوٹی یوں تھرک رہی تھی جیسے وہ اپنے گھر اور محلہ والوں کے ساتھ مل کر ہولیاروں کی ٹولی بن گئے ہوں اور ڈھولوں کی گرجدار گونج اُن کے دلوں کو رقص کرا رہی ہو۔ بہرام خان کے بھاری جوتوں کی آواز ایسی آہستگی سے گیلری میں اُبھر رہی تھی جس طرح ویران جھاڑیوں میں خشک پتوں پر خیرا اپنے شکار کی طرف خاموشی سے آنکھیں لگائے بڑھتا ہے۔ وہ بغل میں ڈنڈا دبائے معنی خیز انداز میں نظروں سے قیدیوں کے جذبات پڑھ رہا تھا۔ بہرام خان جیسے ہی اُلٹے ہاتھ کی پہلی کوٹھری کے شاعر بیکی

پاس پہنچا اُن کے قدم ٹھٹھک گئے۔ رمیش گھٹنوں میں سر دیئے پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا۔

"کیوں بے کیا بات ہے؟ — یہ عورتوں کی طرح ٹیں ٹیں کیوں کر رہا ہے؟" بہرام خان نے داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھا۔

رمیش قریب کے گاؤں کا نوجوان کاشتکار تھا جسے اُس کے زمیندار کے بھائی کو قتل کرنے کے الزام میں گرفتار کیا گیا تھا۔ وہ بھاگ کر سلاخوں سے آ چپٹا۔ اور بچوں کی طرح بلک بلک کر کہنے لگا

"جیلر صاحب۔ مجھے کسی تنگ کوٹھری میں بند کردو۔ زمین کے نیچے۔ جہاں ڈھولوں کی آواز میرے کانوں تک نہ پہنچ سکے۔ میرا کلیجہ پھٹا جا رہا ہے!"

"ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔ یہ سب باتیں کسی کی زندگی کا چراغ گل کرتے وقت سوچنا چاہئے تھیں —!"

"میں نے قتل ضرور کیا ہے حضور — لیکن اگر میں ایسا نہ کرتا تو میری معصوم جوان بہن کی عزت لُٹ جاتی۔ وہ آتم ہتیا کر لیتی اور اس قتل پر کسی کو سزا نہ ہوتی — مجھے اپنے خونی ہونے پر ذرا بھی شرم نہیں، افسوس نہیں — اور نہ میں پھانسی کے ڈر سے رو رہا ہوں — بلکہ جیلر صاحب۔ مجھے اِس سمے اپنے بچے اور گاؤں کی ایک ایک پگڈنڈی یاد آ رہی ہے۔ تہوار بڑے ظالم ہوتے ہیں —!"

"بھول جا — سب بھول جا!! کچھ یاد نہ کر —" بہرام خان نے جھڑک کر کہا۔ جیل قبر کی طرح ہوتی ہے، جہاں مُردہ انسان سوچتے نہیں، بس بھگوان کو یاد کر وہی تیرا حساب بے باق کرے گا —!

"نہیں سرکار — میں کچھ نہیں بھلا سکتا۔ یہاں آنے کے بعد میرا پہلا تہوار ہے کل — گاؤں کی ایک ایک بالشت زمین رنگوں کی بوچھار سہے گی۔ گلال سے سارا آکاش لال ہو جائے گا۔ چوپال پر گاؤں والے مستی میں چھا جائیں گے، لیکن میرے گھر کا تنکا تنکا میری جدائی میں سُلگ اُٹھے گا۔ ہولی پر تو میں ہنگامہ کرتا تھا کہ مُرجھائے چہروں پر گلال سی لالی بکھر جاتی تھی۔"

"چل۔ چل خاموشی سے سو جا۔" بہرام خان نے پُچکارتے ہوئے کہا۔

"میں مان لیتا ہوں۔ مگر جیلر صاحب۔ ایک بات کہوں؟"

"تیرا ایک اچھا ہے۔ بول کیا کہو گے —!"

"ہاں ہاں — ضرور — کہو!"

"میں کل ہولی کھیلنا چاہتا ہوں۔ اجازت دیں گے —"

"اچھا تو سو جا۔ کل دیکھوں گا —" بہرام خان اپنا ڈنڈا فرش پر مارتے ہوئے

آگے بڑھ گیا اُس کے ... [illegible] ... بچے کی

سسکیوں کو دیکھ کر باپ کے ... [illegible] ... آگیا ہے۔

: نریت سنگھ ۔ اُس نے باہر ... [illegible] ... آواز دی ... [illegible]

: لیس سر۔ ایک سپاہی آگے بڑھا۔

• جمعدار ۔ کل صبح بہرام خاں کو ... [illegible] ... نکال دینا ۔

بہرام خاں نے جیب سے ... [illegible] ... سپاہی کو دے دئے۔ "ہمارے قیدی

کل بھوکے نہیں رہیں گے ۔۔۔ !

• صاحب ۔ مگر ۔۔۔ !

• اگر مگر کچھ نہیں ۔ اور ہاں دیکھو رنجن کو کل بیڑیاں کھول کر بیمار

میں ... [illegible] ... ۔

: کیا کہہ رہے ہیں صاحب ۔ وہ قاتل ہے ۔ کچھ گڑبڑ ہوگئی تو ۔۔۔

• تم پاگل ہو نریت سنگھ ؟ ۔ یہ میری ذمہ داری ہے ۔ ہمیں مجرم سے

نفرت کرنا چاہئے جرم سے نہیں ۔ اور ... [illegible] ... قیدی کو اس جیل میں

اولاد کی طرح دیکھا اور پالا ہے۔

• وہ تو ٹھیک ہے صاحب ۔ لیکن اوپر شکایت پہنچی تو ۔۔۔

: شکایت بہرام خاں کی ہوگی ۔ نریت سنگھ کی نہیں ۔ یہاں کا حاکم ... [illegible] ۔

میرا اُصول رہا ہے کہ قیدیوں کو کسی وجہ کی امانت سمجھ کر رکھنا چاہئے ۔

مُرا اور سڑا پھل اچھا نہیں ۔ ہماری محبت اور اچھے برتاؤ سے جرم کی کلیاں

بدن کا پھول بننے سے پہلے ہی مُرجھا سکتی ہیں ۔ جاؤ جیسا کہا ہے ویسا

ہی کرو ۔۔۔"

ہولی کی اُس رنگ برنگی صبح سورج کی سُنہری کرنیں جیل کی دیواروں

کے سیاہ دھبے سمیٹتی تاریک کوٹھڑیوں میں انجانی سی خوشیاں اُنڈیلتی

آئیں ۔ چھوٹے اور بڑے مجرموں کے ساتھ خونی اور خطرناک قاتل بھی ہاتھوں

میں پچکاریاں اور گلال سے سانولے چہرے تھوپے ، چیختے چلاتے

خالی تھالیں بجاتے گلال کو کوٹھڑیوں سے باہر نکل پڑے ۔ کان پڑی آواز سنائی

نہ دیتی تھی ۔ جیل کے سپاہی بھی اس رنگ میں شامل ہوگئے ۔ اور سامنے

اُونچی دیوار کے سائے میں بہرام خاں اپنی داڑھی کا بڑا ... [illegible] ... آج

اُس کے ... [illegible] ... جیسے کسی سرکس کا

رنگ ماسٹر ... [illegible] ... اور جیسے ایک ہاتھیوں کو بڑے الجھاؤ

اپنے اخلاص پر ... [illegible] ... بالکل

میں ... [illegible] ... آہستہ آہستہ قدم

شامل ہوگئے

نکلتے بہرام خاں کی طرف بڑھے گئے ۔ بہرام خاں نے دیا ... [illegible]

... [illegible] ... ہاتھوں اُٹھا لیا اور بچوں کو دیر ہلانے لگا ۔ ... [illegible]

اور پھر گُلال ... [illegible] ... ۔

: شیر جوان ... [illegible] ...

• شیر کا کام ہے ۔ تو آگے بڑھو ۔۔۔

: کیا ہو رہا ہے نامعقول ۔ بہرام خاں کا گرجدار آواز ... [illegible]

سے پچکاریاں چھوٹ گئیں ۔

• اُٹھاؤ ۔ وہ جیتا ۔ کیا بات ہے ۔ کچھ اور کہا ہے ؟ ۔۔۔

• جیلر صاحب ۔ رنجن ہاتھوں میں گُلال لئے آگے بڑھا ۔ ذرا سی ... !

• ہاں ۔ ہاں ۔ ضرور ۔ آؤ ۔ لگاؤ نا ۔ سب قیدی خوشی سے

چیخنے لگے ۔ ہولی ماتا کی جے ۔۔۔ ہولی ماتا کی جے "

رنجن نے گُلال بہرام خاں کی پیشانی پر لگا دیا ۔ اُس پیشانی پر سیندور کی

رگڑ نے جو سیاہ نشان بنا دیا تھا وہ چمک اُٹھا ... [illegible] ...

کے عکس پر قوسِ قزح بکھر گئی ہو ۔ اور فوراً ہی طرح طرح کے رنگوں نے

بہرام خاں کی داڑھی کے سیاہ و سفید بالوں کو جھڑیوں سی بچی کی طرح

تابناک بنا دیا ۔ وہ کسی پتھر کے بُت کی طرح ... [illegible] ... اُس کی آنکھوں

سے آنسوؤں کی دو پتلی بوند بوند ٹپکتے پانی میں گھل کر گالوں کو ... [illegible]

جیل کے خوف ناک ماحول کو سیلاب کی طرح بہا کر لے گئیں ○○

بقیہ: اُردو مرثیے کی تشکیلِ جدید ... [illegible] ... صفحہ ۲۹

سے تو یہ چیز نامحسوس ہونے لگتا ہے ۔ اور جیسا کہ اوپر ذکر ہوا سراپا ایک

آزاد موضوعی شاعری ہے جو مرثیے میں واقعات کی کڑیوں سے غیر مربوط ہے ۔

لیکن ... [illegible] ... سماج میں مذہبی اور ادبی ذوق کے امتزاج کی خاطر مرثیے میں شامل

کر دیا گیا تھا ۔ یہی وجہ ہے کہ مرثیہ نگاروں نے بھی حالات و واقعات اور موضوع

کی قیود اور شخصیتوں کا لحاظ کئے بغیر ایک آزاد موضوع کے طور پر اس کو برتا

ہے ورنہ کربلا کے میدان میں امام حسین کا سراپا لکھتے وقت یہ نہ کہتے

ابرو کا رُخِ صاف میں پرتو نظر آیا

ہوا قطب کا گل سے تحیر میں ہے مجبور

... [illegible] ... نہیں ۔ اسرار کر گار میں جائے سخن نہیں

انیس کا شعر اس بات کی دلیل ہے کہ تشکیلِ جدید کے بعد ... [illegible]

موضوع کو بھی مرثیے میں شائستگی حاصل ہوگئی تھی اور مرثیے ... [illegible]

مطالعہ جدت اسی پس منظر میں کرنا چاہئے ۔ ○○

غزلیں

محسن زیدی

ہم سے مانگے تھا کبھی دامنِ صحرا پانی
بند ہے آج انھیں پر لبِ دریا پانی

آج آنکھوں سے برستے ہوئے آنسو دیکھے
شجرِ دل کو ملا فصل کا پہلا پانی

غیر تو غیر ہیں، اپنے تو ہیں اپنے پھر بھی!
کہیں دنیا میں ہوا خون سے گاڑھا پانی

یہی انداز تو بارش کا ہمیشہ سے رہا
کسی خطے پہ نہ برسا، کہیں برسا پانی

ابھی پایاب ہے پانی تو نکل سکتے ہو
کہیں پھر سر سے بھی ہو جائے نہ اونچا پانی

ہم کہ جلتے ہی رہے دل سے دھواں تک نہ اٹھا
بادل اٹھتے جو امڈ کر تو برستا پانی

ٹوٹتے دیکھے ہیں سب عہدِ وفا مثلِ حباب
ہر تعلق کو یہاں جانیے بہتا پانی

راہ میں آئیں گے پربت بھی تو بہہ جائیں گے
سنگ ریزوں سے رکے گا کہیں بڑھتا پانی

اتنی گہرائی میں باطن کی نہ جا اے محسنؔ
اس کنوئیں میں ہے سمندر سے بھی گہرا پانی

○ ۸۹۸ نیا محلہ پُل بنگش، دہلی ۶

صلاح الدین نیرؔ

کیا شہر تھا کس طرح سے برباد ہوا ہے
قاتل کے سوا شہر میں اب کون بچا ہے

آسودگیٔ تشنہ لبی کس کو میسر!
صدیوں سے جو پیاسا ہے وہ پیاسا ہی رہا ہے

کچھ لوگ ابھی قتل کی سازش میں ہیں مصروف
حالانکہ صلیبوں پہ مرا نام لکھا ہے

کچھ دن کے لئے جس کو مسیحائی ملی تھی
وہ بھی مرے جینے کا سبب پوچھ رہا ہے

کوئی بھی یہاں اب نہیں جز مرگِ تمنا
یہ تم نے کہاں لا کے مجھے چھوڑ دیا ہے

جب دل کی رگیں آخرِ شب ٹوٹ رہی تھیں
اس وقت مرے دوست کو احساس ہوا ہے

ہم اس کو وطن دوست سمجھتے رہے نیرؔ
جلتی ہوئی لاشوں میں اکیلا جو کھڑا ہے

○ ۲۰-۶-۴۴ اندر دبیلالی حیدرآباد ۲

مغیث الدین فریدی

(فیض احمد فیض اور محمد آقا سلطان چودھری کی زمین میں)

اندازِ سخن مصلحت آمیز بہت ہے
پھر بھی یہ ادا تیری دل آویز بہت ہے

اب دیکھئے کس رنگ میں برسات ڈھلے گی
کچھ گردشِ حالات کی لے تیز بہت ہے

وہ ہم سے ملا ہے تو کھلے دل سے ملا ہے
دنیا کو شکایت ہے کم آمیز بہت ہے

ہم اس سے جدا ہو کے بھی یوں گم سے ہوئے ہیں
جیسے کہ یہ لمحہ بھی طرب خیز بہت ہے

اک بار بھی تھرائی نہ لو شمعِ وفا کی!
سنتے تھے زمانے کی ہوا تیز بہت ہے

تم ابرِ کرم بن کے ذرا آ کے تو دیکھو
خاکِ دلِ برباد بھی زرخیز بہت ہے

گلہ اور شکایت تو نہیں تیری نظر سے
یہ بات الگ ہے کہ ذرا تیز بہت ہے

آشفتہ مزاجی پہ مری طنز نہ کیجے
اندازِ جہاں بھی تو جنوں خیز بہت ہے

⊕ سی-۱۱۲، ماڈل ٹاؤن دہلی ۹

اُردو مرثیے کی تشکیلِ جدید اور سراپا

پروفیسر ایس۔ اے۔ صدیقی
ایم۔ آئی۔ ایل۔ سی۔ پٹیالہ (پنجاب)

مرثیہ اُردو کی اہم ترین صنفِ شاعری ہے۔ لکھنؤ میں تشکیلِ جدید کے موقع پر جب اِس کی اجزا بندی ہو گئی تو اس میں شاعری کے ایسے اعلیٰ نمونے نظر آنے لگے جن کو اُردو شاعری کا سرمایہ کہہ سکتے ہیں۔ اگرچہ مرثیے پر ایسا وقت بھی گذرا ہے جب مرثیہ نگار کو بگڑا ہوا شاعر کہا جاتا تھا۔ لیکن میر و سودا کے زمانے میں مرثیے نے ادبیت کا رنگ اختیار کرنا شروع کیا۔ اس کے بعد ضمیر و خلیق اور دلگیر کے زمانے میں تو اس کی ادبیت کو ایک طرح سے دستوری حیثیت حاصل ہو گئی اور مرثیہ گوئی بھی دیگر اصنافِ شاعری کی طرح مرصع سازی میں شامل ہو گئی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب لکھنؤ کے سماجی بلکہ مذہبی شعور میں بھی ادبی مذاق کا رچاؤ ہو گیا تھا اور مرثیہ جسے محض اُمت کو متاثر کرنے کی چیز سمجھا جاتا تھا اب سنجیدہ اور باوقار لوگوں کو اپنے شاعرانہ اسلوب سے متاثر کر رہا تھا۔ لہٰذا ایک طرف لکھنؤ کے مذہبی ماحول میں بڑھتی ہوئی عزاداری، دوسری طرف مخصوص ثقافتی اور ادبی رجحانات نے مجبور کیا کہ مرثیے کے تنگنائے کو وسیع کیا جائے۔ چنانچہ مسدس اُس کی مخصوص ہیئت ٹھہری اور چہرہ، رخصت، آمد، سراپا، رجز، جنگ، شہادت اور بین اُس کے مستقل اجزا قرار دئیے گئے۔ مرثیے کی اس تشکیلِ جدید کو میر ضمیر سے منسوب کیا جاتا ہے جنھوں نے ۱۲۳۰ھ میں پہلا جدید مرثیہ کہہ کر مرثیے کی نئی ہیئت کا اعلان کیا۔

لیکن یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا اجزائے مرثیہ کی ایجاد اور تشکیلِ جدید ایک ہی چیز ہے یا دو مختلف چیزیں ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ دو مختلف موضوعات ہیں۔ اس کے بعد یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا تشکیلِ جدید کی طرح اجزائے مرثیہ کی ایجاد بھی ضمیر ہی کا کارنامہ ہے۔ اس سوال کا جواب دینے کے لئے اجزائے مرثیہ کی تاریخ پر ایک اجمالی بحث مناسب رہے گی۔ جہاں تک رزم کا تعلق ہے دکنی مرثیے شمالی ہند کی مرثیہ گوئی سے قبل ہی کافی ترقی یافتہ تھے۔ ان میں نہ صرف یہ کہ مسلسل واقعات بیان ہوتے تھے، بلکہ ایک ترتیب کے ساتھ ان میں گھوڑا علم شاعر بھیج

مرثیے لکھے جانے لگے تھے اور رخصت، رجز، جنگ وغیرہ کے موضوعات نہایت تفصیل سے بیان ہونے لگے تھے۔ مرثیے کی یہ خصوصیت اورنگ زیب کے حملوں سے قبل ہی قائم ہو چکی تھی۔ یوں تو دکنی ادب کی تاریخ میں متعدد نامور مرثیہ گو گذرے ہیں لیکن اجزائے مرثیہ کی نسبت سے مرزا اور ہاشم کے نام زیادہ قابلِ ذکر ہیں۔ ان میں مرزا جس کا تعلق علی عادل شاہ ثانی کے دور سے ہے زیادہ خصوصیت رکھتا ہے۔ ہاشم کا تعلق مغلیہ دور سے ہے۔ رخصت کے سلسلے میں پروفیسر مسعود حسن نے "نگار" کے اصنافِ سخن نمبر (جنوری فروری ۱۹۵۷ء) میں راسخ عظیم آبادی متوفی ۱۲۳۸ھ کے ایک مرثیے کا ذکر کیا ہے۔ اس کے علاوہ فصیح لکھنوی کے ایک مرثیے پر بحث کی ہے۔ جو "ٹکڑے نور فاطمہ کے لختِ جگر تھے حسنین" یہ مرثیہ میر ضمیر کی تشکیلِ جدید سے تیرہ چودہ سال پہلے لکھا گیا تھا اور اس میں چہرہ، رخصت، رزم اور شہادت سبھی اجزا موجود ہیں، البتہ سراپا کی کمی ہے۔ تو کیا یہ سمجھ لیا جائے کہ سراپا ضمیر کی ایجاد ہے۔ جہاں تک مرثیے کے دیگر اجزا کا تعلق ہے تو اوپر کی بحث سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ یہ تشکیلِ جدید سے قبل موجود تھے۔ اب سوال صرف سراپا سے متعلق رہ جاتا ہے کہ آیا یہ ضمیر کی ایجاد ہے یا یہ بھی اُن سے قبل موجود تھا۔ اس بحث میں مرزا دبیر کے کچھ ایسے مرثیوں کا ذکر ضروری ہے جو دبیر ہی کے قول ۱۲۴۰ھ تک کے ہیں۔

۱. خیمۂ چرخ سے خورشید جو باہر نکلا
۲. خورشید کا طلوع ہے برجِ خیام سے

یہ دونوں مرثیے مرزا دبیر کے مجموعۂ کلام "دفترِ ماتم" کی پہلی جلد میں شامل ہیں۔ ان دونوں مرثیوں میں چہرہ، آمد، سراپا اور رزم وغیرہ اجزائے مرثیہ پائے جاتے ہیں البتہ یہاں ان اجزا کا بیان اتنا تفصیلی اور التزامی نہیں ہے جیسا کہ میر ضمیر کے یہاں ہے۔ اس کے علاوہ پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب (مرحوم) کے ذاتی کتب خانے میں مرزا دبیر کے مطبوعہ و غیر مطبوعہ مرثیوں کی چھے قلمی بیاضیں ہیں۔

[illegible] ترتیب (رباعی وغیرہ) کے حوالے میں ہے۔
ان ترتیب کے پہلو کو اگر لے لیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ مرثیہ دفتر ماتم کی دسویں جلد میں [illegible] ہے۔ ایک قلمی بیاض میں اس مرثیے پر تاریخ کتابت سنہ ۱۲۳۹ھ [illegible] ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ مرثیہ تشکیلِ جدید سے چار سال قبل لکھا گیا تھا۔ اس مرثیے میں [illegible] سراپا ملاحظہ ہو۔

شادی جوانی سے ہے نہیں عہد جوانی — ہے آمد خط نقش جوانی کی نشانی
ثانی ہیں سبھی شکل میں حیدر کے یہ جانی — اک بھائی مگر دوسرے بھائی کا ہے ثانی
افلاک پہ یہ جلوہ فگن شام و سحر ہیں
تصویریں انھیں کی یہ دو خورشید و قمر ہیں
[illegible] کی صورت میں یہ خم ہو گیا پیدا — قدرت کے قلم کا ہے اک یہ بھی معما
[illegible] یہ دونوں رُخِ زیبا — نقاش بھی خود ہو گیا معروفِ تماشا
خامہ تھا ادھر دیدۂ نقاش اُدھر تھے
یہ نقش کھنچے جبکہ یہ رُخ مدِّ نظر تھے

یہ بند اس بات کا ثبوت ہیں کہ "سراپا" ۱۲۴۹ھ میں ضمیر کی ایجاد نہیں۔ البتہ اگر دبیر کے مذکورہ بالا تینوں مرثیوں کا مطالعہ ضمیر کے مرثیے کے مقابل کیا جائے تو محسوس ہوتا ہے کہ اس نئے موضوع کا جتنا شعور اور تفصیل ضمیر کے یہاں ہے دبیر کے یہاں نہیں ہے جس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ مرثیے کے جملہ اجزا تو ۱۲۴۹ھ سے قبل موجود تھے لیکن ان اجزا کی شیرازہ بندی اور ان مرثیہ کے طور پر ان کا شعوری التزام سب سے پہلے ضمیر کے یہاں ملتا ہے۔ تاہم یہ غلط ہے کہ تشکیلِ جدید کسی ایجاد کا نام ہے یہ تو پہلے سے موجود مواد کی ترتیب اور نئی صورت گری کا وہ نقشہ ہے جو ضمیر نے شائع کیا ہے۔
مرثیے کی اس نئی شیرازہ بندی کے وقت ہو سکتا ہے کہ قصیدے کے اجزا پیشِ نظر رہے ہوں اور اس اجزا بندی نے مرثیے کی قصیدے سے جو [illegible] مماثلت پیدا کی ہے وہ محض اتفاقی نہ ہو بلکہ معنوی مماثلت (زندوں کی [illegible] کو قصیدہ بولتے ہیں اور مُردوں کی تعریف کو مرثیہ کہتے ہیں) نے ظاہری [illegible] کا شعور پیدا کیا ہو تو ممکنات میں سے ہے۔ تاہم اتنا فرق ضرور ہے کہ [illegible] اپنے کسی ایک جز کے بغیر بھی ممکن نہیں ہوتا جبکہ مرثیے میں اس کے [illegible] اجزا لازمی نہیں ہوتے صرف ایک جز "بین" ضروری ہے۔
مرثیہ کی تشکیلِ جدید پر اس تاریخی بحث کے بعد اس کے سماجی اور پس منظر کا بھی مختصر سا جائزہ لے لیں تو مناسب رہے گا۔ [illegible] سعادت خاں برہان الملک کو ریاست اور مرشد آباد شجاع الدولہ کا اقتدار [illegible]

[illegible] تہذیبی دور کا نقطۂ آغاز تھا اسی سلسلے میں حیدر اور نصیر الدین حیدر کا زمانہ اُس کا نقطۂ عروج ہے جو واجد علی شاہ پر ختم ہو جاتا ہے۔ یہ پورا زمانہ لکھنؤ کے اپنے تہذیبی و ثقافتی اور ادبی رجحانات کا نمائندہ دور ہے جس کی تعریف ادب کے تاریخ نگار ان الفاظ میں کرتے ہیں۔ "تاریخ ابالی، فضول خرچی، عیش و عشرت، تکلف و تصنع، بے حجابی و جنسی بے راہ روی (آزاد قدروں کے اس مقدر میں کسی زمانے کی جنسی بے راہ روی کا ذکر کرتے ہوئے قلم رکتا ہے) محافل، تفریحات، مشاعرے اور میلے ٹھیلے۔" لکھنؤی سماج کے یہ وہ ظاہری امتیازات تھے جنھوں نے براہِ راست ادب کو متوجہ کیا۔ سیاسی سطح پر لکھنؤ کی ریاست دلی سے آزاد ہو گئی تھی۔ ادبی میدان میں بھی یہ لوگ پیچھے نہ رہے۔ نئے حالات نے بیان کا شاعرانہ رنگ بدلا۔ عشقیہ مثنویوں میں بے باک جذبات بیان ہوئے، ہزل گوئی کا راستہ ہموار ہوا اور واسوخت کے نام سے اُس کو ادبی درجہ حاصل ہو گیا۔ شاعری پیشہ وروں کے ہاتھ میں آئی۔ نتیجے میں مبتذل اور عامیانہ جذبات کا اظہار ہونے لگا۔ حُسن کے ظاہری لوازم لب و دنداں، زلف و رُخ، پنجۂ مرمریں، دستِ حنائی کے مضامین نظم ہوئے۔ نسواں مزاجی نے ریختی کو فروغ دیا۔ اس کے علاوہ صنعت آفرینی شاعری کا طرۂ امتیاز ٹھہری۔ مختصر یہ کہ ان تمام خصوصیات کو اس ادبی اصطلاح کے پس منظر میں سمجھا جا سکتا ہے جسے دلی کی داخلیت کے مقابل خارجیت کا نام دیا جاتا ہے۔ ہو سکتا ہے داخلیت اور خارجیت کی یہ بحث کچھ لوگوں کو ناپسندیدہ ہو، یوں بھی اب یہ موضوع اپنی جگہ کافی فرسودہ ہو چکا ہے لیکن ہوا تو یہ ہے کہ اُردو ادب کی تاریخ میں اُس دور کا لکھنؤ شاعرانہ زبان و بیان کے تعلق سے اپنا ثانی نہیں رکھتا اور جب شاعری اظہارِ زبان و بیان کا وسیلہ بنتی ہے تو فکر اور جذبے سے اُس کا علاقہ کٹ جاتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ لکھنوی شاعری کا یہ انداز دلی میں مع اپنے سماجی پس منظر کے موجود تھا اس لئے خارجیت تنہا لکھنؤ کی خصوصیت نہیں ہے لیکن دلی میں اُس کے متوازی صوفیانہ اور عارفانہ شاعری کا بھی عمل دخل تھا۔ یہاں یہیں جملۂ معترضہ کے طور پر یہ بھی نہ بھولنا چاہئے کہ اُردو شاعری کے ہر دور میں عوام میں سب سے زیادہ مقبول غزل ہی رہی ہے لہٰذا دلی میں غزل اگر ایک طرف عامیانہ خیالات، مبتذل جذبات، ظاہری حُسن پرستی اور رعایتِ لفظی کے اظہار کا وسیلہ تھی تو دوسری طرف دلی کے خانقاہی نظام سے بھی اُس کا گہرا رشتہ تھا (اس سلسلے میں تنہا میر درد کی مثال کافی ہے) لیکن لکھنؤ کا سماج دلی کے سماج سے مختلف تھا اگرچہ دلی کے متصوفانہ میلانات کی طرح یہاں بھی ایک مذہبی رَو (عزاداری) موجود تھی لیکن یہ متوازی رَو تصنیف کی طرح

غزل میں نہیں سما سکتی تھی اِس لئے مرثیے کے دامن میں وسعت پیدا ہوگئی۔

مرثیہ کی اِس وسعت پر ایک دوسرے نقطۂ نظر سے بھی روشنی ڈالی جا سکتی ہے۔ دہلی میں مسلمانوں کے سیاسی اقتدار تے جیسے جیسے زمانے کی منزلیں طے کیں، اُن کی اصل رُوح کا دائرہ تاریخ کے صفحات پر سمٹتا ہوتا چلا گیا اور معاشرہ چند ایسے عقائد و رسومات کی پابند ہو کر رہ گئی جو اُس کے زوال کو تو نہیں روک سکے لیکن اخلاقی تائید ضرور بن گئے یہ وہ عقائد و رسومات ہیں جو تصوّف کے واسطے سے مذہب میں راہ پا گئے تھے قومی زوال کو تو سہارا نہ دے سکے لیکن شاعری کو ابتذال کی راہوں پر چلنے سے ضرور روک لیا اور تصوّف کی عارفانہ اور اخلاقی مضامین شاعری کا تزکیہ کرنے کے کام آ گئے اِسی طرح اودھ کی بساطِ سیاست پر جب تعیش کا رنگ جما، ماحول کی بے راہ روی نے ایک سیلاب کی صورت اختیار کی اور شاعری مخصوص خارجی آہنگ کے علاوہ بازاری اور عامیانہ خیالات کے اظہار کا وسیلہ بنی تو ان خفیف الاعالیوں کو اخلاقی سہارا دینے کے لئے مرثیے سے کام لیا گیا اور تزکیۂ نفس کے لئے مجالسِ عزا منعقد کی جانے لگیں اور یہ حقیقت ہے کہ لکھنؤ میں اگر مرثیہ نہ ہوتا تو دلّی کی عارفانہ شاعری کے بعد اُس کو اخلاقی تائید ہی ملنی دشوار ہو جاتی۔ لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ لکھنؤ کے مذاق نے شاعری میں جن چیزوں کو راہ دی مثلاً "سراپا" مرثیے نے اپنے دامن میں سمیٹ کر اُن کا تزکیہ کر دیا۔ لکھنؤ میں معشوق کا سراپا لکھنے کا عام رواج ہو گیا تھا اُس کے قد و قامت، لباس، سج دھج چال ڈھال کی تعریف عام بات ہو گئی تھی۔ غزل کے اِس خارجی آہنگ کو مرثیے نے نئی جان بھی دے دیا اور یہاں اُس کے حسن میں کمی نہیں آئی بلکہ اضافہ ہی ہوا اور شاعر کے توسنِ خیال نے وہ جولانیاں دکھائیں کہ حدِ ادراک سے بھی آگے نکل گیا۔

لکھنؤ اسکول نے زبان و بیان اور نزاکتِ خیال کی جو صورت اختیار کی تھی غزل اور مثنوی اُس کی متحمل نہ ہو سکی لیکن تشکیلِ جدید کے بعد لکھنؤ اسکول کی بھدی خصوصیات کو مرثیے نے اپنے دامن میں سمیٹ لیا تھا اور اسی طرح مرثیہ غزل کے بھی قریب آ گیا نیز فنائی موضوعات کو نظم کرنے کی گنجائش پیدا ہوئی چہرہ اور رزم کے داخل ہو جانے سے مرثیہ نگار کو خارجی اشیا کے بیان کے بہت سے مواقع مل سکے تھے لیکن مرثیے کو چوں کہ پورے لکھنوی سماج کا ترجمان بننا تھا اور حُسن پرستی اس سماج کا خمیر اور اس ذوق کی تسکین نہ چہرے سے ہوتی تھی نہ رزم سے۔ ادبی نقطۂ نظر سے ان کا میں اگر اظہار فن کے مواقع ہوں لیکن لذّت کام و دہن کا وہ سامان نہ تھا جو غزل کے سراپا میں ہے۔ اِس مقصد کے پیشِ نظر مرثیے میں سراپا داخل کیا گیا اور یہاں اُس نے دوہرا حق ادا کیا یعنی ایک طرف غنائیت کی طلب دیکھی، دوسری طرف مذہبی ذوق کی تسکین اور نا قریب ہے کہ

مرثیہ نگاروں نے اسے مذہب کے لباس میں جس نفاست سے پیش کیا ہے اُس سے غزل کا سراپا ماند ہو کر رہ گیا ہے۔ سراپا کے اِس موڑ کو اگر لکھنؤ کے ذوقِ غزل کی تطہیر کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

مرثیہ نگاروں نے اِس موضوع کے تحت اپنی شاعرانہ قوّتوں کا بڑی کامیابی سے اظہار کیا ہے اور لطافتِ تخیل، نزاکتِ بیان، مضمون آفرینی اور صنائع بدائع کی اعلیٰ ترین مثالیں پیش کی ہیں — چونکہ سراپا مرثیے میں ایک مدح کا مضمون ہے لہٰذا یہاں مرثیہ نگاروں کی خیال آفرینی کے خوب جوہر کھلے ہیں اور ہیرو کے حُسن و جمال کی ہر اُس طریقے سے تعریف کی ہے جو اُن کے تخیّل کو سوجھا ہے۔ لکھنؤ کے مرثیوں میں تقریباً ہر فرد کے حال میں سراپا مل جائے گا۔ جنابِ عون و محمدؑ، اکبرؑ، قاسمؑ، عباسؑ، امام حسینؑ حتیٰ کہ حُر اور جیب ابن مظاہر کے حال میں بھی سراپا مل جاتا ہے۔ یوں تو سراپا کسی کا بھی زور کا لکھا جا سکتا ہے لیکن اس کا موضوع چونکہ حسن و جمال کا تذکرہ ہے اس لئے موضوع کی رعایت ایک خاص عمر کا تقاضا کرتی ہے۔ سب سے پہلے جب میر ضمیر نے بالتفصیل سراپا نظم کیا تو یہ جناب علی اکبر کے حال میں تھا اور روایت یوں کہ یہ ہے کہ جنابِ علی اکبر اہلبیت میں نہایت حسین و جمیل تھے اور معرکۂ کربلا کے وقت اُن کی عمر اٹھارہ سال تھی۔ اِس لحاظ سے یہ سراپا نہایت موزوں تھا لیکن جب یہ روایت چل نکلی تو شخصیت اور عمر کے تقاضوں کا خیال نہیں کیا گیا۔ اِس کے علاوہ مرثیہ نگاروں کے یہاں سراپا ایک ایسا موضوعِ شاعری رہا ہے جس کو اُنھوں نے اپنی خیال آرائیوں کے لئے برتا ہے ورنہ کوئی حقیقی تصویر کشی اُن کا مقصد نہیں رہا۔ لہٰذا آگے کچھ اِس طرح کی مثالیں دی جا رہی ہیں جن سے یہ واضح ہو جائے گا کہ مرثیہ نگاروں کے یہاں موضوعِ سراپا کی کیا نوعیت رہی ہے۔ میر ضمیر کے یہاں اس کی مثال ملاحظہ ہو:

(جنابِ علی اکبر)

خطِ جلوہ نما عارضِ گُل گوں پہ ہوا ہے — مُصحف کو کسی نے ورقِ گُل پہ لکھا ہے
یہ چشم یہ قد حُسن میں اعجاز نما ہے — ہاں اہلِ نظر سرو میں بادام لگا ہے
تیروں سے سوا ترکشِ مژگاں کا اثر ہے
دشمن کے لئے ریزۂ الماس جگر ہے

کانوں کا تہِ زُلفِ مُسلسل ہے اشارہ — دو پھول ہیں سُنبل میں نہاں وقتِ نظارہ
کس کو صفتِ حسنِ بنا گوش کا یارا — خورشید سے دیکھو تو چمکتا ہے ستارا
ہے چہرہ عرق آلود دمِ صف شکنی ہے
خورشید بہ ہر قطرۂ سہیلِ یمنی ہے

سراپا کے ان بندوں میں جو تعریف کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ ممدوح کا خطِ جوانی آگیا ہے قد سرو قامت ہے اور آنکھیں بادام سے مشابہ۔ سراپا کا یہ بیان بہت غنیمت ہے ۔ عام طور سے مرثیوں کے سراپا میں اِس طرح کا بیان جس میں ممدوح کی کوئی حقیقی تعریف پائی جائے ایک دو بند سے زیادہ نہیں ملتا اس کے بعد شاعر پھر اپنی خیال آرائیوں میں گم ہو جاتا ہے یا ایک ہی بات کو مختلف انداز سے دہراتا رہتا ہے ۔ چنانچہ اُوپر کی مثال میں دوسرے بند سے یہ بات واضح ہو جائے گی جہاں شاعر نے کوئی صوری نقشہ کھینچنے کے بجائے تشبیہات کے واسطے سے اپنی خیال آرائیوں کا طلسم باندھا ہے ۔ تاہم مرثیہ نگاروں نے اگر "سراپا" کو صرف اپنی خیال آرائیوں کے لئے برتا ہوتا تو بھی غنیمت تھا لیکن اُنھوں نے فنی تقاضوں کا خیال کئے بغیر جابجا اُس میں رثائیت کا عُنصر بھی داخل کر دیا ہے جو اِس حقیقت کی طرف اشارا ہے کہ تشکیلِ جدید کے بعد مرثیے کے دامن میں وُسعت تو ضرور پیدا ہوگئی تاکہ اس میں مختلف قسم کے موضوعات نظم کئے جاسکیں اس طرح مرثیے میں بڑی حد تک رزمیہ بن جانے کی صلاحیت بھی پیدا ہوگئی تھی لیکن ۔ مرثیہ نگاروں نے ایک تو فن کے جملہ تقاضوں کو ملحوظ نہیں رکھا دُوسرے زبان و بیان کے جوہر دکھانے میں زیادہ مصروف رہے ہیں ۔ اُن کے یہاں اگر ذرا بھی ایپک کا شعور ہوتا تو مرثیے کی اِس بدلی ہوئی ہیئت سے فائدہ اُٹھا کر ایپک شاعری کی کامیاب مثالیں پیش کر سکتے تھے ۔ اِس سلسلے میں ضمیر کے زیرِ بحث مرثیے سے اگلے دو بند ملاحظہ ہوں ۔

برگشتہ مژہ اس کی یہ کرتی ہے اشارے — برگشتگیِ عمر کے سامان ہیں سارے
مژگاں کے یہ نیزے جو خمیدہ ہیں بارے — دھڑکا ہے کہ نیزہ کوئی اکبر کو نہ مارے
اک چشم زدن میں جو فلک اس سے پھرے گا
اس چشم کی مانند یہ نیزوں سے گھرے گا

لب ہیں کہ ہے دریائے لطافت لبِ اوج — اس اوج میں پیدا یم قدرت کی ہوئی موج
یاں فردِ نزاکت میں مگر دیکھنے میں زوج — دو ہونٹ ہیں اور پیاس کی ہے چاروں طرف فوج
بند آنکھیں ہیں لب خشک ہیں اور عالم غش ہے
اور مُنہ میں زباں ماہیِ دریائے عطش ہے

میر ضمیر کے یہاں سے یہ بند اِس واسطے لئے گئے ہیں کہ طرزِ جدید میں یہ پہلا مرثیہ ہے ورنہ اس طرح کی مثالیں تقریباً ہر مرثیہ نگار کے یہاں مل جاتی ہیں ۔ جہاں موقع و محل کا خیال کئے بغیر وہ جگہ جگہ رثائیت کا عُنصر شامل کر دیتے ہیں ۔ چنانچہ اس مرثیے میں جہاں شاعر اپنے ہیرو کے حُسن و جمال کا تذکرہ کر رہا ہے وہاں اِس طرح کا بیان ۔

برگشتگیِ عمر کے سامان ہیں سارے

شاعر بھیجی

دھڑکا ہے کہ نیزہ کوئی اکبر کو نہ مارے

یا ٹیپ کے دونوں مصرعے موقع و محل کی نفسیات سے ہم آہنگ نہیں ہیں ۔ اِسی طرح دوسرے بند میں ایک طرف تو شاعر کہتا ہے ۔

"لب ہیں کہ ہے دریائے لطافت لبِ اوج" دوسری طرف کہتا ہے

بند آنکھیں ہیں لب خشک ہیں اور عالم غش ہے
اور مُنہ میں زباں ماہیِ دریائے عطش ہے

ٹیپ کے یہ دونوں مصرعے اس بند میں صرف رثائیت کی غرض سے داخل کئے گئے ہیں ورنہ واقعہ کی مناسبت سے تو یہ سراپا کا عیب ہیں ۔ اِس طرح کی مثالیں جیسا کہ اُوپر ذکر ہوا ہر مرثیہ نگار کے یہاں مل جاتی ہیں جس کی وجہ سے کہا جاسکتا ہے کہ لکھنؤ میں مرثیے کا ادبی مرتبہ تو ضرور بلند ہوا ہے لیکن بہ حیثیت ایک بیانیہ صنفِ شاعری کے اِس کے تمام فنی تقاضوں کی طرف مرثیہ نگاروں نے کوئی توجہ نہیں دی ہے ۔

اِس موقع پر ایک اور گمان کو تقویت ملتی ہے ۔ جیسا کہ سودا کے زمانے تک مرثیہ صرف رونے رُلانے کی چیز سمجھا جاتا تھا اور شاعر کو اُس کی ادبیت سے کوئی سروکار نہ تھا ۔ وہ سُننے والوں کی مذہبی عقیدت سے ناجائز فائدہ اُٹھا کر ہر فنی غلطی کو روا رکھتا تھا جس کے سبب خود سودا کو بھی مرثیے پر سخت تنقید کرنی پڑی تھی ۔ لہٰذا اُوپر کی مثالوں کے پیشِ نظر سوچنا پڑتا ہے کہ یہ مثالیں کہیں مرثیے کی اُسی روایت کا تسلسل تو نہیں ہیں جہاں سننے والوں کی مذہبی عقیدت سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی جاتی تھی ۔ اس میں شک نہیں کہ تشکیلِ جدید کے بعد ادبی حیثیت سے مرثیہ بہت بلند ہو گیا اور جذبات نگاری اور واقعہ نگاری کی اچھی مثالوں کے علاوہ مرثیے پر آتش کے اِس معیارِ شاعری کا اطلاق ہوتا ہے کہ "بندشِ الفاظ جُڑنے سے نگوں کے کم نہیں" ۔ یہ مصرعہ آتش کے کسی ذاتی نقطۂ نظر کو ظاہر کرنے سے زیادہ لکھنؤ کے مذاقِ شعر کی ترجمانی کرتا ہے جہاں حسنِ بیان، لطافتِ زبان، نزاکتِ خیال اور صنائع بدائع کی داد دی جاتی تھی ۔ شاعری زبان و بیان کے اِنھیں جوہروں سے آراستہ تھی لیکن اِس سے قطعِ نظر ہر صنفِ شاعری کے اپنے مخصوص فنی تقاضے بھی ہوتے ہیں جن کا لحاظ کمالِ فن کے لئے ضروری ہے ۔ لیکن کہنا پڑتا ہے کہ مرثیہ نگاروں کے یہاں اس طرح کا لحاظ شاذ ہی نظر آتا ہے ۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ تشکیلِ جدید کے بعد بھی مرثیہ نگار مذہبی عقیدت سے فائدہ اُٹھاتے رہے ہیں ۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو سراپا جیسے غنائی موضوع میں وہ رثائیت کا عُنصر نہ داخل کر دیتے ۔ اگرچہ مرثیہ نگاروں نے فن کے بہترین نمونے بھی پیش کئے ہیں لیکن زیادہ تر سیاق و سباق سے الگ کر کے ہی اُن کی داد دی جاسکتی ہے ۔

حالات وواقعات کے پڑھنے سے پس منظر میں فنی کمزوریاں بغیر رکے نظر آتی ہیں۔

اِس کے بعد مرزا دبیر کے بیانِ "سراپا" کی کچھ مثالیں ملاحظہ ہوں۔ جن سے پتہ چلتا ہے کہ یہاں شاعر کا مقصد کوئی حقیقی تصویر پیش کرنا نہیں ہے بلکہ اُس کا مقصد اپنی قوتِ بیان کے جوہر دکھانا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ یہ بند اِس بات کی بھی دلیل ہیں کہ جملہ اجزائے مرثیہ لکھنؤ کی شاعرانہ زبان و بیان کے اظہار کا وسیلہ بنے ہیں ورنہ موضوع کا حقیقی رنگ یہاں کم ہی جھلکتا ہے۔

ہر چہرے میں دو دو گُلِ عارض جو کھلے ہیں   دو صورتوں میں چار کتبِ حق کے ملے ہیں
جن بندوں کے لب اُن کی تلاوت میں ہلے ہیں   دُونے ہیں شرف آٹھ بہشت اُن کے صلے ہیں
کیا لوحِ جبیں نورِ الٰہی سے بھری ہے
دیکھو یدِ بیضا پہ یہ توریت دھری ہے

(عباس)
گردِ رخسارہ روشن خطِ زیبا کی ہے دُھوم   شمعِ خورشید پہ پروانوں کا کیا ہے ہجوم
دیکھو حلقے میں لئے ہیں مہِ کامل کو نجوم   سورۂ تازہ خطِ عارض کی کرے آب رقوم
رُخ نے قرآں کا سبق پہلے دیا عالم کو
بے سخن حاشیہ داں خط نے کیا عالم کو

کیا غُلغُلۂ ابروئے پیوستہ اُٹھے ہیں   تعریف کو مدّاح کمر بستہ اُٹھے ہیں
ہاتھوں پہ لئے نظم کا گلدستہ اُٹھے ہیں   میزاں کی طرح مصرعۂ برجستہ اُٹھے ہیں
ابرو کا رُخِ صاف میں پرتو نظر آیا
خورشید کے پہلو میں مہِ نو نظر آیا

سراپا کی تعریف یہ ہے کہ ممدوح کے حسن و جمال اور شخصیت کے جملہ پہلوؤں کی اِس طرح توصیف کی جائے کہ سُننے یا پڑھنے والے کے ذہن میں اُس کی شخصیت کا ایک نقشہ قائم ہو جائے۔ لیکن مرثیوں کے سراپا میں ہیرو کا کوئی نقشہ اُبھر کر سامنے نہیں آتا۔ البتہ مختلف اعضائے جسمانی کی مدح ضرور ملتی ہے اور اِس مدح کو کسی بھی ممدوح کے حال میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ لہٰذا اگر امام حسینؑ کے حال میں مرثیہ ہو تو جناب اکبر کے مرثیے سے "سراپا" لے کر اس میں شامل کیا جا سکتا ہے۔ اِس لئے کہ مرثیہ نگار کا مقصد شخصیتوں کے خاکے پیش کرنا نہیں رہا۔ اِس سراپا کا دوسرا بڑا عیب یہ ہے کہ اِس کا محل مرثیے میں اُس وقت آتا ہے جب مرثیے کا ہیرو احباب سے رخصت ہو کر میدانِ جنگ میں وارد ہوتا ہے۔ گویا رخصت کے موقع پر ایک دردناک منظر گزر چکا ہوتا ہے اور سامنے میدانِ جنگ میں موت و حیات کا منظر ہوتا ہے۔ اِس پس منظر میں ہیرو کی سنجیدہ شخصیت، اُس کی شجاعت و بہادری، اعصاب کی مضبوطی اور رُعب و دبدبہ کا ذکر کیا جانا زیادہ مناسب ہے لیکن اِس کے برعکس ہیرو کے لب و رخسار، چشم و ابرو، دُرِ دنداں کی تعریف زیادہ نظر آتی ہے، جو اِس بات کا ثبوت ہے کہ مرثیے کا سراپا غزل ہی کا سراپا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ یہاں جذبۂ عاشق کے بجائے جذبۂ مذہبی کام کر رہا ہے۔

انیس کے یہاں سراپا کا انداز ملاحظہ ہو۔ ذیل میں جو دو بند نقل کئے جا رہے ہیں اُن میں پہلا جناب عباس کے سراپا میں ہے اور دوسرا جناب علی اکبر کے سراپا میں۔ لیکن دونوں بندوں کو کسی کے بھی سراپا میں شامل کیا جا سکتا ہے۔

یاقوتِ لبِ سُرخ میں دُندانِ دُرِ مکنوں   دیکھے سے عقیقِ جگری کا بھی ہے دل خوں
کس چیز سے نسبت دہنِ تنگ کو دیں دُوں   نایاب ہے عنقا کی طرح طائرِ مضموں
حال ان کا نزاکت سے کھُلے گا نہ کھُلا ہے
یاں بابِ سخن بند ہی رکھئے تو بجا ہے

خورشیدِ رُخ اِن موتیوں کی آب میں دیکھے   ہیرے کی چمک اِس دُرِ نایاب میں دیکھے
ایسے نہ کواکب شبِ مہتاب میں دیکھے   گردوں نے یہ تارے نہ کبھی خواب میں دیکھے
ٹھہرے جو نہ وہ لائقِ تشبیہ نظر میں
سوراخ اِسی غم سے ہے موتی کے جگر میں

اِن مثالوں کو دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ مرثیہ نگاروں نے "سراپا" لکھنے میں بڑا زورِ طبیعت صرف کیا ہے اور ایسے ایسے مضامین ایجاد کئے ہیں کہ خود سراپا ایک واہمہ بن کر رہ گیا ہے اور جو چیز قاری کو متاثر کرتی ہے وہ شاعر کی اپنی قوتِ ایجاد ہے۔ اِس کے علاوہ مرثیوں میں سراپا کا مطالعہ کرتے وقت یہ بھی نہ بھولنا چاہئے کہ مرثیے کا یہ موضوع غیر فطری اور موقع و محل کی نفسیات کے خلاف ہے۔ اِس لئے کہ تاریخی اعتبار سے قطع نظر خود مرثیوں میں نظم کردہ روایات کے مطابق افرادِ مرثیہ ہفتوں کا سفر کرتے ہوئے شدید گرمی کے موسم میں وارد کربلا ہوئے تھے اور جب مرثیے میں سراپا کا مقام آتا ہے اُس وقت تک ہیرو پر تین دن کی بھوک پیاس کا عرصہ گزر چکا ہوتا ہے اُس وقت رخسار کی آب و تاب اور لبِ لعلیں کا تذکرہ نہ صرف یہ کہ برمحل نہیں ہے بلکہ خلافِ واقعہ ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ سراپا مرثیے میں ایک پیوند کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ شاعری کا جادو اِس پیوند کو محسوس نہ ہونے دے لیکن جب یہ جادو ٹوٹتا ہے اور حقیقت نگاری کے میزان پر آتے تو لیجانا



پیڑ پودوں کی حفاظت کیجئے

پیڑ زمینی کٹاؤ روکتے ہیں اور سیلاب سے حفاظت کرتے ہیں،
بارش کراتے اور خشک سالی کو روکتے ہیں،
فصل کی حفاظت کرتے ہیں،
جنگلی جانوروں کو پناہ دیتے ہیں،
آکسیجن اور تازی ہوا مہیا کرتے ہیں اور ہوا کو صاف رکھتے ہیں،
سیر و تفریح کا ذریعہ ہیں،
لکڑی کی صنعت کے لئے کچا مال دیتے ہیں اور
ایندھن، چارہ اور غذا مہیا کرتے ہیں۔

آج آپ بھی ایک پیڑ لگائیے



davp 79/745

شاعر، بمبئی

نصر قریشی

روشنی کی آواز

کس کی یہ آواز، خنجر بنکے تاریکی کے سینے میں اُترتی جارہی ہے؟
کون ہے جس نے زرِ گُل سوکھے پتوں پر لُٹایا؟
اُجڑی دھرتی کو بسایا؟
برق کی یورش سے طفلِ نو کو مرنے سے بچایا؟
حرف و لفظ و صوت کا پیکر معانی سے سجایا؟
رات کے خونیں مناظر میں یہ کیسی روشنی ہے؟
زہر آلودہ فضاؤں کو کیا ہے پاک کس نے؟
کون تھا خونیں فسادوں کا محرّک؟
روز و شب، ہنگاموں، ہڑتالوں کا خالق؟
سازشوں کے بل پہ طاقت، حکمرانی اور اطاعت
کون تھا شب کے پرستاروں کا مرکز؟
اور نگارِ صبح کی آنکھوں میں کتنی کرچیاں تھیں
وقت کی میلی سی چادر پھٹ چلی تھی؟
بے حسی کا اک سمندر موجزن تھا
پت جھڑوں کی زد میں خوشبو کا چمن تھا
خون میں ڈوبا ہوا ہر پیرہن تھا
کون شبخونِ حوادث مارتا تھا؟
کون ہے جو روشنی کا ہالہ بنکر ظلمتوں کو چاٹتا ہے؟
کون ہے جو زندگی کا ساز لیکر موت کو للکارتا ہے؟
کون ہے جو روشنی اور زندگی کو ساتھ لیکر
وقت کے تاریک غاروں کی دراڑیں بھر رہا ہے؟
روز و شب کے دائروں میں بے گھروں کا پاسباں ہے؟
بے زباں کا ہمزباں ہے؟
بے نوا کا ہمنوا ہے؟
ہم سخن ہے مہرباں ہے
کون کیا تھا؟
کون کیا ہے؟
کون کیا ہوگا؟
یہی تو فیصلہ کرنا ہے تم کو۔!!

○ ۳۴۴ — اشیا بھساور گنج — الہ آباد)
شاعر - بھئی

سعادت نظیر

ایک مرحلہ اور

(مفاجاتی حالات کی روشنی میں)

فقط فریب نظر تھی سحر کی انگڑائی
کہ ایک رات گئی اور ایک رات آئی
گھٹی گھٹی سی فضا تھی دیارِ امکاں کی
ہر اک زباں پہ کہانی تھی یاس و حرماں کی
نظر کے سامنے حسرت بھرا اندھیرا تھا
طرح طرح کی بلاؤں نے ہم کو گھیرا تھا
کہیں تھی کشمکشِ شیخ و برہمن اے دوست!
کہیں تھی سازشِ صیاد و راہزن اے دوست!
کہیں پہ گردشِ دوراں، کہیں پہ فتنۂ زر
کہیں پہ قحط کا کھٹکا، کہیں پہ جنگ کا ڈر
مگر تمام مراحل سے ہم گذر آئے
نشانِ منزلِ مقصود کے نظر آئے
زہے کہ راہِ طلب میں وہ موڑ آیا ہے
جہانِ شعور کا چھایا ہوا اُجالا ہے
پتا چلا کہ وفا کا ہے کون دیوانہ
یگانہ کون ہے محفل میں کون بیگانہ
اسی مقام پہ جاگ اُٹھا ولولہ دل کا
دلیلِ جادۂ منزل ہے حوصلہ دل کا
کچھ اور آج سے اندازِ زندگی ہوگا
نہ خوف و یاس، نہ احساسِ کمتری ہوگا

نظر سے دور یقیں ہے کہ تیرگی ہوگی
طلوعِ صبح سے ہر سمت روشنی ہوگی

○ بلاک ۱، فلیٹ ۵
چندر لال بیلا کالونی - حیدرآباد ۵۰۰۰۰۳ (اے-پی)

عورتوں کا تاجر

رام سروپ
(پنجابی)
مترجم: مناظر عاشق ہرگانوی
موضع ہرگانواں - پوسٹ بوچہہ ضلع مونگیر (بہار)

رام سروپ انکھی کی پیدائش ۲۸ اگست ۱۹۳۲ء کو پنجاب کے ضلع سنگرور کے دھولا گاؤں میں ہوئی۔ ـــــــ وہ ایم اے بی ٹی ہیں، اور درس و تدریس اُن کا مشغلہ ہے۔ پنجابی کے بلند قامت افسانہ نگاروں میں شمار ہوتا ہے۔ اب تک اُن کی کہانیوں کے چھ مجموعے اور دو ناول شائع ہو چکے ہیں۔ بڑی رنگا رنگ شخصیت کے مالک ہیں اور میرے بڑے پیارے دوست ہیں۔ انہیں اُردو عوام کے سامنے پہلے پہل پیش کرنے کا فخر مجھے ہی حاصل ہے۔ ویسے انکھی کی کہانیاں کئی ملکی زبانوں میں ترجمہ ہو کر شائع ہوتی رہتی ہیں ـــــــ م ع ہ

لال سنگھ اُسے شاید ہی کسی نے کہا ہو کبھی۔ سب لالہ ہی کہتے۔ وہ پانچ بھائی تھے۔ سب سے بڑے کی کسی نہ کسی طرح شادی ہو گئی تھی۔ اُس سے چھوٹا لالہ تھا۔ زمین اُن کے پاس سات آٹھ ایکڑ ہی تھی جس سے پانچوں بھائیوں کا گذر ہونا بڑا مشکل تھا۔ تنگ آ کر لالہ سے چھوٹے دو بھائی ملایا چلے گئے سب سے چھوٹا بڑے کے گھر ہی روٹی کھاتا تھا۔ بڑے بھائی نے اُسے بھیڑیں لے دی تھیں۔ لالہ کی بڑے بھائی سے بہت کم بنتی تھی۔

لالہ جب جوانی کی دہلیز پر پہنچا تو وہ رات میں گھر سے غائب رہنے لگا۔ اُسے ایسے دوستوں کی صحبت مل گئی تھی جو گھر میں تنکا بھی نہیں توڑتے تھے، سارا دن چوپال میں کھنڈروں پر بیٹھے رہتے یا تاش کھیلتے یا آتی جاتی عورتوں کی طرف دیکھ کر مونچھوں کو اینٹھتے رہتے۔ اور شام کو گھر میں تیار کی ہوئی شراب پیتے۔ یہ لوگ سفید پوش بنے رہنے کی ہمیشہ کوشش کرتے، شاید یہی وجہ ہے کہ اپنے لباس کی صفائی کا خاص طور پر خیال رکھتے، چادر اور پگڑی کو نیل دے کر دُودھیا سفید کرتے۔ تیل کا کہیں دھبّہ تک نہ لگنے دیتے۔

پاس کے گاؤں والا دھیچر بدمعاش ایک دن اُن کے پاس ایک عورت لیکر آیا۔ دھیچر نے اُس عورت سمیت لالہ اور اُس کے ساتھیوں کے پاس تین راتیں کاٹیں۔ تینوں دن گوشت اور شراب کا دَور چلتا رہا۔ دھیچر اُس عورت کو سو میل دُور کہیں سے بھگا کر لایا تھا۔ چوتھے دن دھیچر نے لالہ کے توسط سے پنشن پانے والے ایک فوجی کے ہاتھ سو روپے میں اُس عورت کو بیچ دیا۔

کہتے ہیں کہ کُنڈے کو ٹھنڈا استو کوس کا پھرا ڈال کر بھی مل جاتا ہے۔ لالہ بھی دھیچر کا ساتھی بن گیا۔ دھیچر تو ادھیڑ ہو چکا تھا مگر لالہ ابھی کڑیل جوان تھا۔ اب وہ دونوں جہاں جاتے اکٹھے جاتے۔

ایک بار دونوں چھپار کے میلے میں گئے۔ لوٹتے ہوئے راستے میں رات کو ایک گاؤں میں ٹھہرے جہاں اُن کی جان پہچان تھی۔ جن کے گھر رات میں ٹھہرے اُن کے پڑوس میں ایک دُھنیئے کا گھر تھا۔ دُھنیا بوڑھا ہو چکا تھا اور دمے کا مریض تھا۔ لیکن اُس کی بیوی ابھی جوان تھی۔ صبح سویرے اُنھیں دیکھ کر وہ ہنسی تھی۔ دھیچر نے لالہ کو اشارہ کیا تھا پھر بولا تھا "مجھ میں تو دم نہیں، تو چھیڑ کر دیکھ۔ آج ہم یہیں رہیں گے۔"

اور لالہ نے اپنی کڑیل جوانی کا وہ داؤ پیچ دکھلایا کہ دن بھر میں ہی وہ عورت رام ہو گئی۔ اور آدھی رات ہونے پر وہ اُسے لیکر چلا پڑے۔ صبح ہونے تک وہ اپنے گاؤں پہنچ گئے تھے۔ دو ایک روز وہ اُن کے ساتھ رہی، پھر تیرہ نہیں کس ٹھکانے پر اُسے پہنچا دیا۔

دھیچر نے لالہ کو پُورا ہاتھ دے دیا۔ لالہ کو بھی اُس کی عادت پڑ گئی تھی اب وہ سو سو کوس دُور نکل جاتے۔ اِکّا دُکّا آدمی دیکھتے۔ ساتھ میں عورت ہوتی تو چھین لیتے۔ مرد کو مار پیٹ کر چھوڑ جاتے عورت کو اپنے

شاء - کرہ

ساتھ گاؤں لے آتے۔ پانچ سات دن رکھتے اور بیچ دیتے۔ یہ اُن کا پیشہ بن گیا تھا۔ اب وہ یو۔پی، بیکانیر اور انبالہ کی طرف کے بدمعاشوں سے عورتیں خریدنے لگے تھے اور منافع پر بیچتے تھے۔ پانچ چھ سال وہ دونوں اِسی طرح ہیر پھیر کرتے رہے۔ ایک دن دھیچر کو ایسا ٹائیفائڈ ہوا کہ وہ پھر بستر سے نہ اُٹھ سکا۔

لالہ اب خود دھیچر کا ساتھ نہیں چاہتا تھا۔ اُسے سارے اُونچ نیچ سے واقفیت تھی۔ اُس نے اپنے ساتھ نزدیک کے گاؤں کے ایک نوجوان کو رکھ لیا۔ اُنھوں نے کتنی ہی عورتیں اِدھر اُدھر کیں، بہتوں کے گھر اُجاڑے اور کتنوں کے گھر بسائے۔ ریٹائرڈ فوجی، شادی کی اُمید کھو بیٹھنے والے بڑی عمر کے کنوارے اور دولت مند لوگ لالہ کے مستقل گاہک تھے۔ پولیس سے وہ مل کر رہتا۔ پولیس والوں کو خوش کرنے اور اُنھیں دھوکہ دینے کے سارے گُر وہ جانتا تھا۔ تبھی تو گاؤں کے لوگ کہا کرتے تھے کہ لالہ تھانے دار کا بھی باپ ہے، اُسے کون ہاتھ لگائے گا۔

لالہ اور اُس کے ساتھی اِس بار کالکا کے میلے میں گئے۔ وہاں ایک پچاس پچپن سال کا امیر تجوری رکھتا تھا۔ وہ برما سے اچھے پیسے کما کر لایا تھا۔ گاؤں میں آکر اُس نے زمین خرید لی تھی اور پختہ مکان بنا لیا تھا۔ اُس کی شادی ہو چکی تھی، اُسکی بیوی مشکل سے بائیس تئیس سال کی تھی۔ لالہ اُن کے گھر پہلے بھی دو چار بار آچکا تھا۔ وہ بہت مہمان نواز شخص تھا۔ ہمیشہ مہمانوں کی خاطر شراب سے کرتا تھا۔ لالہ یہاں جب بھی آتا، اُس کی بیوی کی تاک میں رہتا۔ اُسے کسی طرح یہ پتہ چل گیا تھا کہ یہ عورت اپنے شوہر سے خوش نہیں ہے۔

کی کراں پرانڈے نوں، جوبن روڑھدے جاندے نوں

لالہ کو اپنی لٹھ جیسی جوانی پر ناز تھا۔ اور یہ ناز بے جا نہیں تھا کیونکہ اِس بار اُس عورت نے آخر اُس سے کہہ ہی دیا " تو مجھے اِس دوزخ سے نکال لے۔"

" میں نے تجھے کب انکار کیا ہے۔" لالہ کے دل کی بات تھی۔

" چل پھر بھاگ کے نکل چلیں۔" عورت تیار ہو گئی۔

" گھوڑی بھی ساتھ لے چلیں۔۔۔ ہوا سے باتیں کرتے چلیں گے۔"

لالہ اِس گھر کا جیسے سب کچھ لُوٹ لے جانا چاہتا تھا۔

" لیکن پہلے مجھ سے ایک وعدہ کر کہ تو مجھے اپنے گھر بسائے گا۔ دیکھنا مجھے دھوکہ نہ دینا۔" بھمبرو نے اپنے ہاتھ سے سونے کی انگوٹھی اُتار کر لالہ کی اُنگلی میں پہنا دی۔ لالہ نے اپنا کڑا اُتار کر بھمبرو کی کلائی میں ڈال دیا۔

صبح ہوئی تو سارے گاؤں میں کہرام مچ گیا۔

شاعر۔ بمبئی

دو ماہ تک لالہ اُسے پتہ نہیں کہاں کہاں لئے پھرتا رہا۔ ایک دن بھٹنڈا سے دور ایک گاؤں میں وہ ٹھہرے۔ چار دن وہ وہیں رہے۔ بھمبرو نے پانچویں دن صبح سویرے اُٹھ کر دیکھا کہ اُس کے ساتھ والی چارپائی خالی پڑی تھی۔ دوپہر تک وہ اُسے تکتی رہی۔ شام ہوئی اور پھر رات۔ دوسرا دن چڑھا۔ اِسی طرح دو دن اور نکل گئے۔ گھر کے مالک نے بھمبرو کو بتایا کہ لالہ دس دن بعد آئے گا۔ پندرہ بیس دن اور گزر گئے۔ گھر والے نے آخرکار ایک دن بھمبرو سے کہہ ہی دیا " تُو تو اب اِسی گھر کی رانی ہے۔ لالہ اب یہاں کبھی نہیں آئے گا۔"

لالہ کی عمر جب ساٹھ سال کی ہو گئی تو اُس نے یہ دھندا بند کر دیا۔ اب اُس کے گھٹنے میں درد رہنے لگا تھا۔ نظر کمزور ہو گئی تھی، اور پیٹ میں بھی رہ رہ کر درد اُٹھتا تھا۔ اب وہ گاؤں سے باہر نہیں جاتا تھا۔ اُس کے بڑے بھائی نے گھر میں ہی ایک کوٹھری اُسے دے دی تھی۔ وہ کھانا کھا کر چوپال میں بیٹھا رہتا اور نوجوانوں کو عورتوں کی باتیں سنایا کرتا۔ ایک ایک عورت کے بارے میں اُسے یاد تھا کہ کون کہاں سے کتنے میں لائی گئی تھی، کہاں رکھی گئی تھی۔ اُسے یہ بھی پتا تھا کہ کون سی عورت کس کے ہاتھ بیچی گئی۔

" بابا، کتنی عورتوں کا ہیر پھیر کیا پھر؟" لڑکے سوال کرتے۔

" سبھی تو یاد نہیں پڑتیں۔ گِن سکتے ہو تو گِن لو۔" لالہ اُنگلیوں کے پوروں پکڑنا شروع کرتا۔ بیس ایک عورتیں گِن کر وہ کہتا " ایک کالکے والی۔" اور وہ چپ ہو جاتا۔

" اور؟" لڑکے پوچھتے۔

" بس اتنی ہی اور ہوں گی۔" لالہ کا دھیان جیسے اُکھڑ جاتا۔

کئی دن سے لالہ چوپال میں نہیں دیکھا گیا تھا۔ لڑکے ہنستے کہ بوڑھا پتہ نہیں کہاں رہتا ہے۔

ایک دن صبح سویرے لالہ کے بھتیجے کی بیوی چائے دینے آئی تو دیکھا کہ بوڑھا چارپائی سے نیچے گرا پڑا تھا۔ گچھے، گھڑے اور کنڈے وغیرہ چیزیں چارپائی کے پاس پڑی رہتی تھیں، اُن پر گرنے سے اُس کا چہرہ زخمی ہو گیا تھا۔ اُس کے بائیں ہاتھ کی مٹھی بند تھی۔ لیکن اُسے کچھ کچھ ہوش تھا۔

" بابا" بہو نے آواز دی

وہ بولا نہیں۔ چائے کا پیالہ بہو نے دہلیز پر رکھ دیا۔ گردن کو سہارا دیکر اُسے بٹھایا اور چارپائی پر لٹا دیا۔ لالہ کو بہو نے ہونٹوں میں کہتے سُنا: بھمبرو۔۔۔ بدو۔۔۔

(باقی صفحہ ۸۲ پر ملاحظہ کیجئے)

غزلیں

نو بہار صابر

نقشِ قدم نہ بانگِ درا چاہیے اُسے
ذوقِ سفر کا قبلہ نما چاہیے اُسے

شبنم سے کیا بجھے گی بیاباں کی تشنگی
برسے جو ٹوٹ کے وہ گھٹا چاہیے اُسے

سچ بے لباس ہو تو نظر کو بُرا لگے
دیبائے مصلحت کی قبا چاہیے اُسے

شہروں کے حبسوں میں تو مرجھا گئی حیات
پھر جنگلوں کی آب و ہوا چاہیے اُسے

بھرنے لگے ہیں زخم اُنھیں پھر کرید یئے
بجھنے لگی ہے آگ ہوا چاہیے اُسے

تب زخمِ نیشِ غم کے لیے بے قرار تھا
اب زخمِ نیشِ غم کی دوا چاہیے اُسے

صابر غموں کی سرد و سیہ راکھ کے تلے
بجھتا ہوا شرر ہے، ہوا چاہیے اُسے

○ اریا آشرم - رگھو ماجرا ایڈیاد
(پنجاب)
بیری بھیٹی راکھو

رؤف خیر

چراغ جیسے ہیں لمحے کئی بھنور تے ہوئے
جواحتجاج نہیں کرتے گھاٹ اُترتے ہوئے
رمٹے کہاں ہیں دھنک بن کے اور اُبھرے ہیں
کہ ہم نے رنگ بکھیرے بہت بکھرتے ہوئے
ہر ایک پیڑ کا سایہ گھنا نہیں ہوتا!
سفر طویل تھا ٹھہرے نہ ہم گذرتے ہوئے
میں سو رہا تھا کہ اب جاگنا دو بھر تھا بس میں
یہ نیند اُچٹتی ہوئی اور خواب مرتے ہوئے
بجائے خود ہے اذیت یہ ٹوٹتا نشہ
سمندروں کو نہ دیکھو کبھی اُترتے ہوئے
ہمارے قامتِ زیبا پہ حرف رکھتے ہیں
وہ جن کی عمر کٹی آئینے سے ڈرتے ہوئے
ہمیں یہ رات ہے بھاری ہمیں یہ دن ہے کٹھن
حیات کٹتی ہے اپنی جہاد کرتے ہوئے
بلا سے چیخ بنو۔ حرفِ زیرِ لب نہ بنو!
کوئی نشان تو چھوڑو کہیں گذرتے ہوئے
ہمیں بھی حسبِ ہنر خود کو آزمانا تھا
غمِ حیات کے مضموں تھے خیر برتے ہوئے

○ ۶۲۵ - اللہ داعیخ بھائی بکارو الا، حیدر آباد ۔

شباب للت

وہ ٹوٹ کر بھی نور بھر گیا خلاؤں میں
کرن کرن بکھر گیا سبھی دشاؤں میں
ہوس نواز شہر کی وہ سرپھری ہوا
کئی دنوں سے خیمہ زن ہوئی ہے گاؤں میں
وہ پیڑ ہی ہوا نے آج ڈھیر کر دیا
تمام گاؤں بیٹھتا تھا جس کی چھاؤں میں
مخالفوں کی صف کا سربراہ تھا وہی
جسے میں گن رہا تھا اپنے ہم نواؤں میں
وہ کون تھے بلا کی دھوپ میں جو سو گئے؟
ہمیں نہ نیند آئی گیسوؤں کی چھاؤں میں
تری صدا سُنی تو ٹوٹ کر بکھر گئیں
جو بیڑیاں پڑی ہوئی تھیں میرے پاؤں میں
چٹان کو چھُوا تو آدمی بنا دیا
وہ معجزے لیے پھرے ہے اپنے پاؤں میں
شباب اُس کے ہم شریک درد کیوں ہوئے
اسی پہ تہلکہ مچا ہوا ہے گاؤں میں

○ نیلڈ پبلسٹی آفیسر گورنمنٹ آف انڈیا
دھرم سالہ (ہماچل پردیش)

مقالہ

اُردو شاعری میں ہیئت کے تجربے

انور صدیقی
صدر شعبۂ انگریزی۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ۔ نئی دہلی ۲۵

اُردو میں اِدھر برسوں سے تحقیق کا کاروبار بڑے پُررونق انداز سے چل رہا ہے۔ کاروبار کا لفظ میں نے جان بوجھ کر استعمال کیا ہے۔ اُردو کی بساط الم ناک طور پر سمٹ رہی ہے۔ اِسی نے روزگار کے مواقع کم کر دیئے ہیں۔ اب تو ہر تحقیقی مقالے کی کلید سے ملازمت کا دروازہ کھلتا ہے۔ چنانچہ ہر وہ شخص جو اُردو میں ایم اے کر لیتا ہے اُس وقت تک چین سے نہیں بیٹھتا، جب تک کہ تحقیقی مقالہ لکھ کر پی ایچ ڈی نہ کر لے۔ تحقیقی کام کرانے والے طالب علم کا ذوق و ذہن نہیں دیکھتے۔ ممتحن معیار کی پروا نہیں کرتے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جس نے بھی دو ڈھائی سو صفحے سیاہ کر لیے، ڈگری کا مستحق ہو گیا۔ کوئی یہ نہیں دیکھتا کہ حقیقی کام کس درجے کا ہے، نیز یہ کہ مقالہ نگار نے کچھ اہم اور معنی خیز نتائج نکالے ہیں یا نہیں۔ کم معیاروں کے ذریعہ معیار بندی جسے چیسٹرٹن نے تہذیب کا زوال کہا تھا، ہماری تحقیق کا بھی زوال بن گئی ہے۔ اس ذہنی اور علمی فضا میں اگر کوئی اچھا تحقیقی مقالہ منظرِ عام پر آتا ہے تو فطری طور پر بڑی خوشی ہوتی ہے۔ اور ایسا لگتا ہے حبس کے عالم میں تازہ ہوا کا جھونکا آگیا ہو۔ عنوان چشتی صاحب کا تحقیقی مقالہ "اُردو شاعری میں ہیئت کے تجربے" ایک ایسا ہی مقالہ ہے۔ جو تحقیق و تنقید کے اعلیٰ معیار کا ضامن ہے۔

مواد اور ہیئت کی ایک زمانے سے بحث چل رہی ہے۔ یہ بحث ہمارے ادب تک ہی محدود نہیں ہے مغربی ادب اور فلسفے میں بھی ایک عرصے تک یہ تصورات ایک دوسرے کی کبھی تائید کرتے رہے ہیں اور کبھی تردید۔ انیسویں صدی میں کولرج نے اِس مسئلہ کو مواد اور ہیئت کی نامیاتی وحدت کا تصور پیش کر کے حل کیا۔ بعد میں نفسیات، جمالیات اور لسانیات کے مختلف دبستانوں نے انتہائی استدلالی انداز سے کولرج کے تصور کی تائید کی۔ بعد میں مارکسی تنقید نے پھر مواد اور ہیئت کی دوئی کا مسئلہ چھیڑا۔ اور روس میں کچھ ادیبوں کو صرف ہیئت پرست یعنی Formalist کہہ کر ہدفِ ملامت بنایا۔ مغرب کی شاعری بھی

نئی تنقید اس دوئی کو تسلیم نہیں کرتی۔ مشہور انگریزی شاعر W. B. Yeats کا سہارا لے کر کہا جا سکتا ہے کہ جس طرح ایک اچھے رقص کی کامیابی یہ ہے کہ اس میں رقاص اور رقص میں کوئی فرق نہ رہے۔ اِسی طرح ایک اچھے ادب پارے کے بارے میں بھی آپ یہ نہیں بتا سکتے کہ ہیئت کہاں سے شروع ہوئی اور کس مرحلہ پر مواد در آیا۔ عنوان چشتی صاحب نے ہیئت اور مواد کی وحدت کے اسی تصور کو اپنی تحقیق کا مرکزی نقطہ بنایا ہے۔ چنانچہ اُنھوں نے اپنی کتاب کے پہلے باب (ہیئت کا مفہوم) میں ہیئت کے مفہوم کا تعین کرنے کی کوشش کی ہے۔ منطق اور فلسفے میں ہیئت اور مواد کے تصورات کا سہارا لے اُنھوں نے ادبی تصورِ ہیئت کا تعین کیا ہے۔ اِس سلسلے میں اُنھوں نے بڑی جرأت سے میکانکی تصورِ ہیئت کی تردید کی ہے۔ اور نامیاتی تصورِ ہیئت کو پیش کیا ہے۔ میکس میولر نے لفظ کو خیال اور خیال کو لفظ قرار دیا ہے۔ سوسین لینگر کا خیال ہے کہ لفظ اور تصور ابتدائی دور میں مل جل کر پرورش پاتے ہیں۔ یہاں تک کہ انھیں ایک دوسرے سے جدا کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ عنوان چشتی صاحب نے نامیاتی تصورِ ہیئت کو بنیاد بنا کر اپنے تحقیقی کام کا آغاز کیا ہے۔ وہ اس سلسلے میں بہت سی کم اندیشیوں سے دامن بچا کر چلے ہیں اور ایک انتہائی مثبت تصور کو اپنے کام کا نقطۂ آغاز بنایا ہے۔ ورنہ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ ہیئت کے میکانکی تصور کو بنیاد بناتے اور غلط نتیجے اخذ کرتے، اور اس طرح وہ ادبی قدر شناسی کے غلط معیاروں کو اپنا کر نہ تو تحقیق کا حق ادا کرتے اور نہ ہی تنقید کا۔

دراصل عنوان چشتی صاحب نے تحقیق کے میدان میں قدم رکھنے سے پہلے تنقید اور تخلیق کے کام پوری سنجیدگی اور خلوص کے ساتھ انجام دے چکے تھے۔ ان کی گزشتہ تخلیقی کاوشوں نے اُنھیں تخلیقی عمل کے سارے پیچ و خم سے آشنا کر دیا تھا۔ وہ اِس کی جان کاہیوں اور سرشاریوں سے اچھی طرح واقف تھے۔ تخلیقی تجربوں کے حق و باطل یا اُس کے خیر و شر سے وہ پوری طرح آگاہ تھے۔

اس آگہی کو شعور، بال و پر، اُن کی تنقیدی نگاہ نے بخشے۔ تخلیقی حس اور تنقیدی شعور کے ساتھ تحقیق کا کام ہمیشہ وزن و وقار کا حامل ہوتا ہے۔ یہ واضح بات ہے کہ بیک وقت کسی ایک شخص کی ذات میں ان خوبیوں کا موجود ہونا مشکل ہوتا ہے۔ پیشہ ورانہ تنقید و تحقیق کے دور میں ایسے لوگ کم ملتے ہیں، جن کی ذات میں تخلیقی خلوص، تنقیدی نظر اور تحقیقی معروضیت کے جوہر اس طور پر موجود ہوں جیسے کہ عنوان چشتی صاحب کی ذات میں موجود ہیں۔ وجدان و شعور کی تربیت کے بعد انھوں نے تحقیقی کام کا آغاز کیا۔

زیرِ نظر کتاب کے دوسرے باب میں انھوں نے شعری تجربے کی صداقت کو ہیئت کے تجربوں کی پرکھ کا معیار قرار دیا۔ ہیئت میں تبدیلی اور تجربے کو وہ صرف اس وجہ سے نہیں سراہتے کہ وہ نئے ہیں۔ حقیقی جدت اور مصنوعی جدت کے درمیان جو فرق ہے اس سے وہ بخوبی واقف ہیں۔ انھوں نے لکھا ہے۔

"کسی تخلیق میں تجربے اور تبدیلی کا ظہور محض ایک سطح پر نہیں ہوتا
شعری زبان، تکنیک، اسلوب اور ہیئت کی ہر سطح پر ہوتا ہے۔
تبدیلیوں کے بہت سے اسباب ہیں، مگر ہیئت کا ہر تجربہ شعری
تجربوں کے بطن سے نمودار ہوتا ہے۔ اگر اس عمل سے نہیں
گزرتا تو وہ اصلی شعری تجربہ نہیں ہوگا۔"

اُردو شاعری کی ہیئتوں میں ۱۸۵۷ء کے بعد سے آج تک جو تجربے ہوئے ہیں اُن کی اہمیت کے تعین میں وہ شعری تجربے کی صداقت کو معیار بنا کر ایک ایسا تنقیدی رویہ اپناتے ہیں، جس کی صحت اور توازن پر شبہ نہیں کیا جا سکتا۔ ان کے ادبی نقطۂ نظر کے اس توازن کی داد ہر وہ شخص دے گا جو اس کتاب کو توجہ سے پڑھے گا۔

اس کتاب کے دو باب نظری نوعیت کے ہیں۔ ان میں انھوں نے اپنی تحقیقی پرکھ کے بنیادی اُصولوں کو انتہائی وضاحت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ہیئت و مواد کے سلسلے میں مشرق و مغرب میں جو معروف مواد موجود ہے اُس کے حوالے سے انھوں نے اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت کی ہے۔ یہ دونوں ابواب بڑی محنت و توجہ سے لکھے گئے ہیں اور ان کے مطالعہ کی وسعت کے آئینہ دار ہیں۔

۱۸۵۷ء کے بعد سے اُردو شاعری میں بے شمار تجربے کئے گئے ہیں۔ روایت اور تجربے کی کشمکش کی رفتار کبھی تیز رہی ہے اور کبھی سست۔ شمالی ہند پر انگریزوں کے غلبے کے بعد ہمارے یہاں جو ذہنی بیداری آئی۔ اُس نے ہمیں اپنی ادبی روایات پر نظرِ ثانی کرنے کی اہمیت سے آگاہ کیا۔ شاید اس سے پہلے اس طور پر اور اس پیمانے پر ہمارے ادیبوں نے اپنی روایات اور رویوں کا محاسبہ نہیں کیا تھا۔ اِس شاعر۔ نبشی

محاسبے کے لئے سرسید، حالی اور آزاد کی نسل علمی طور پر کتنی باخبر تھی یا اُس کی باخبری کی کیا سطح تھی، یہ الگ موضوع ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اِس نسل کی انگریزی زبان و ادب سے واقفیت بہت محدود تھی اور آگہی محدود تر۔ مگر اِس محدود واقفیت کے باوجود اُسے مبہم طور پر کچھ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے انگریزی زبان و ادب، اُردو زبان سے بہت بلند ہے۔ اور یہ کہ اُن کے ذریعے ہی فکر و احساس کا اُفق وسیع ہو سکتا ہے۔ اِس کم علم ذہنی مرعوبیت کے عالم میں اُس نے اپنی ادبی روایت کا جائزہ لیا اور نتیجے کے طور پر شدید بے اطمینانی سے دوچار ہوئی۔

ادبی اعتبار سے ۱۸۵۷ء کے بعد کا ادب اپنی روایات اور رویّوں سے بے اطمینانی کا ادب ہے۔ انجمنِ پنجاب کے مشاعرے ہوں یا اس دور کے دوسرے ادبی مظاہر سب پر ایک طرح کی گہری بے اطمینانی چھائی ہوئی ہے۔ اپنے ادبی ماضی پر فخر کا جذبہ اس دور میں کم کم نظر آتا ہے۔ روایت سے انحراف کی خواہش ضرور ہے۔ مگر نئی ادبی روایتوں کی تشکیل کے سلسلے میں کوئی واضح شعور نہیں ملتا۔ مغربی تہذیب کا جو تجزیہ تھا، وہ اُس نسل کے لئے نیم عقلی تجزیہ تھا۔ اُس نے ہماری حسیّت کو معنی خیز طور پر متاثر نہیں کیا تھا۔ ادبی تاریخ کا یہ ایک مسلّمہ اُصول ہے کہ شعری ہیئتوں میں حقیقی تبدیلی اُسی وقت رونما ہوتی ہے، جب حسیّت بدلتی ہے اور جب تک حسیّت نہ بدلے یا اُس کے داخلی نظام میں کوئی اہم تغیر رونما نہ ہو، ہیئتوں کی تبدیلی کوئی معنی نہیں رکھتی۔ اُس دور کی تاریخی اہمیت یہ ہے کہ اُس نے ہمیں اپنی ادبی روایتوں کے محاسبے کی طرف عقلی طور پر آمادہ کیا اور چونکہ یہ آمادگی زیادہ تر عقلی تھی اِس وجہ سے اُس دور کا مزاج بنیادی طور پر شعری نہیں نثری ہے۔ یہی وہ دور ہے جو عنوان چشتی صاحب کی اصل تحقیق کا نقطۂ آغاز ہے۔ اِس دور میں کچھ ایسی تبدیلیاں رونما ہوئیں، جن کے زیرِ اثر ہماری روایتی شعری روایتوں میں تغیر کے آثار نمایاں ہوئے۔ مغربی ادب کے اثرات کے دورِ اوّل میں ہیئت میں تبدیلی سے زیادہ شعری موضوعات کو وسعت دینے کا خیال نمایاں ہے۔ عنوان چشتی صاحب نے آزاد کے بارے میں جو رائے دی ہے وہ حقیقت پر مبنی ہے۔ "آزاد کے یہاں ہیئت کی کوئی اہم تبدیلی نہیں ملتی۔ لیکن اُن کے یہاں شعور ضرور ملتا ہے۔"

محمد حسین آزاد نے ہیئت کے سلسلے میں ایک معمولی سی تبدیلی کی۔ انھوں نے مثنوی کو خیال کے اعتبار سے بندوں میں تقسیم کیا۔ حالی نے صوتی قوافی استعمال کئے جسے انگریزی شاعری کا نہیں بلکہ عربی شاعری کا اثر کہنا چاہئے۔ اس نسل کے بارے میں عنوان چشتی کی رائے بڑی حقیقت پسندانہ ہے۔

"جدید شاعری کے اوّلین علمبرداروں کے یہاں کسی بڑی تبدیلی کا پتہ نہیں چلتا۔ ایک تو آزاد اور حالی انگریزی زبان و ادب سے

پوری طرح واقف نہیں تھے۔ دوسرے صدیوں کے منجمد ذہنوں
اور ہیئتوں کو ایک دم بدلا بھی نہیں جا سکتا۔ نئے حالات
نئے موضوعات ضرور پیدا کر رہے تھے اور نئے موضوعات نئی فنی و
شعری معلومات سے آمیز ہو کر ہیئت، اسلوب اور تکنیک کی سطح
پر گل بھی کھلا رہے تھے۔ مگر یہ نئے گل شاعری کی داخلی سطح پر
جلوہ افروزی کر رہے تھے، خارجی سطح پر اُن کا اثر بہت کم تھا"

عنوان چشتی صاحب نے اِس دَور میں فن کی خارجی سطح پر ہونے والی تبدیلیوں کا عروضی تجزیہ کیا ہے اور اِس بات کو انتہائی وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے کہ انگریزی ادب کے اثر کی وجہ سے جہاں ایک طرف ہمارے روایتی شعری موضوعات میں تبدیلی آئی، وہیں دوسری طرف نئے اسالیبِ اظہار کی تلاش و تکمیل کا کام بھی شروع ہوا۔ نظمِ معرّا کو وسیلۂ اظہار بنایا گیا اور قدیم ہیئتوں میں اوزان و بحور و قوافی کے اختراع کی طرف توجہ کی جانے لگی۔ یہی نہیں کہ اوزان و بحور میں تبدیلی کی کوشش کی گئی ہے، بلکہ ایک نظم میں دو یا دو سے زیادہ اوزان کو برتنے کا تجربہ بھی کیا گیا۔ آج ہم ان تبدیلیوں کو جس آسانی سے بغیر استعجاب اور مزاحمت قبول کر لیتے ہیں، اُس وقت صورتِ حال ایسی نہ تھی۔ اُس دَور میں روایت بستہ ذہنوں کی بھاری اکثریت تھی اور وہ لوگ جو ادب و شعر میں نئے تجربوں کیلئے ہمت اور حوصلہ رکھتے تھے، تعداد میں انتہائی کم تھے۔ نظمِ معرّا کو اختیار کرنے کے سلسلے میں جیسے مجادلے یا مناظرے "شرر" کے "دلگداز" کے صفحات پر ہوئے تھے، اُن کا عنوان چشتی صاحب نے تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ اور اس سلسلے کا جو مواد پرانے رسالوں میں دفن تھا، اُس کی نشان دہی کی ہے۔ اُردو شاعری میں ہیئتوں کی تبدیلی کی تاریخ میں ہونے والے مباحثے کے تمام اہم خد و خال نمایاں کر دئیے ہیں۔ یہ کام بھی تحقیق کے اہم مطالبوں میں سے ایک تھا۔ اور یہ کام عنوان چشتی صاحب نے بڑی خوبی سے انجام دیا ہے۔ اس کے علاوہ اِس دَور میں شعر کی تعمیریات (
) کے سلسلے میں بھی اُنھوں نے مصرع کے نئے تصوّر کی غالباً پہلی مرتبہ نشاندہی کی ہے۔ اور یہ تصوّر آج بھی نئی نظم میں جس طرح جلوہ گر ہے، اُس کا بھرپور تجزیہ کیا ہے اور ثابت کیا ہے کہ آج کی شاعری میں مصرع کا جو تصوّر ہے اُس کی بھی ایک روایت ہے۔ اِس طرح اُنھوں نے روایت اور انحراف کے باہمی رشتے کو بڑی خوبی سے واضح کیا ہے۔

عنوان چشتی صاحب نے بڑی محنت اور توجہ سے انگریزی اور ہندی عروض کا مطالعہ کیا اور اس مطالعے کا ثبوت اُس وقت ملتا ہے جب وہ تقابلی مطالعے

شاعر بھی

کے طور پر ان دو زبانوں کے عروض اور ان کی شعریات کا موازنہ اُردو عروض و شعریات سے کرتے ہیں۔ مغرب میں اوزان اور بحور کے جو تجربے ہوئے ہیں، اُن سے گہری آگہی کی وجہ سے وہ اُردو کی ہیئتی تبدیلیوں کا تجزیہ کرتے ہیں۔ اِس طرح اُنھوں نے عظمت اللہ خاں کے ہیئتی تجربوں پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے ہندی کے پنگل سے اپنی وسیع معلومات کا ثبوت دیا ہے۔ یہ بات ہمارے اکثر ناقدین کے یہاں نہیں ملتی۔ اِس ضمن میں اُنھوں نے جیسی کچھ محنت کی ہے اُس کا اندازہ کرنا دشوار نہیں ہے۔ عظمت اللہ خاں نے اپنے تجربوں کے ذریعہ جس طرح ہندی شاعری سے اُردو کی شاعری کو قریب کرنے کی کوشش کی تھی، اُس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج ہماری شاعری میں گیت، دوہے اور دوسرے ہندی چھند پروان چڑھ رہے ہیں۔ عظمت اللہ کے شعری تجربے اگرچہ بذاتِ خود ناکام تھے مگر وہ اپنے اندر آئندہ کامرانیوں کے امکانات رکھتے تھے۔ اس امکان کی تجزیاتی نشاندہی عنوان چشتی صاحب نے بڑی خوش اسلوبی سے کی ہے۔

۱۹۱۴ء کے بعد کا دَور شعری ہیئتوں میں تبدیلی کے اعتبار سے اہم دَور ہے اِس دَور میں ہماری حسیّت اور شعور کے نظام میں کئی اہم تبدیلیاں رُونما ہوئی ہیں۔ سب سے بڑی بات یہ ہوئی کہ مغربی ادب کے اثر کا جو تجربہ اب تک عقلی تھا، حسّی تجربے کے دَور میں داخل ہوا۔ ترجمے اور ترجمانی کا دَور ختم ہوا۔ اور اُس کے ساتھ ہی دَورِ اوّل کے ترجموں میں جو نثری آلودگی تھی کم ہوئی۔ تجربوں اور ترجموں کے دَور نے حقیقی تخلیق کے حُسن اور اُس کی اہمیت کا عرفان عام کیا۔ اور ہمارے بہت سے خلّاق ذہنوں کو تشکیل سے زیادہ تکمیل کی طرف متوجہ کیا۔ ۱۹۱۴ء کے بعد کے دَور کی اہمیت اِس بات میں بھی ہے کہ اُس نے ہمیں مغرب کے نئے نظریات اور ادبی دبستانوں سے تخلیقی سطح پر روشناس کرایا۔ فرائڈ اور مارکس کے نظریات نے جہاں ایک طرف ہمارے ذہن و احساس کو نئے افق فراہم کئے، وہیں دوسری طرف مغرب کی نئی ادبی تحریکوں سے آگہی کے رُجحان کو بھی فروغ دیا۔ پیٹر اور آسکر وائلڈ نے ادب کے افادی تصوّر کی جس طرح تردید کی تھی، اُس کا اثر بھی اُس دَور کے ادب پر دیکھا جا سکتا ہے۔ اُسی دَور میں اشاریت اور پیکریت کی تحریکوں کے زیرِ اثر اُردو شاعری میں نئے دشت و دَر کا اضافہ ہوا۔ عنوان چشتی صاحب نے اِن تحریکوں اور رُجحانوں کا تذکرہ تو ضرور کیا ہے، مگر اِن پر توجہ غالباً اِس وجہ سے نہیں کی کہ ان کی حیثیت ایک میلان کی تھی اور نئی ہیئتوں کے فروغ سے اُن کا براہِ راست تعلق نہیں تھا۔ مگر اِن تحریکوں نے ہمارے شعری اظہار کے رویّوں کو جس طرح متاثر کیا، اُس کا تقاضا تھا کہ اُن کا ذکر زیادہ وضاحت سے کیا جاتا۔ اِس لئے کہ شعری تجربے

کو برتنے اور اختیار کرنے میں معاون ثابت ہوئی۔ نامیاتی ہیئت کے جس تصور پر عنوان چشتی صاحب کے تحقیقی مقالے کی اساس ہے۔ اُس کا بھی یہی تقاضا تھا۔ اس کے علاوہ آج ہمارے جدید ادب میں جو ادبی رویے ہیں اُن کی ذایت کی نشاندہی غالباً اسی طرح ہو سکتی ہے۔

۱۹۱۴ء کے بعد اُردو میں جن نئی ہیئتوں کو فروغ ہوا اُس کا تاریخی اور تجزیاتی تذکرہ اُنھوں نے الگ ایک باب میں کیا ہے۔ جس کا عنوان ہے "نیا شعور اور نئی ہیئتیں"۔ اس باب میں اُنھوں نے سانیٹ، آزاد نظم، ترائیلے اور مختصر نظم کا عروضی، لسانی اور تاریخی مطالعہ کیا ہے۔ اور یہاں بھی اُنھوں نے تشریح و تعبیر کا اپنا مخصوص انداز اختیار کیا ہے یعنی اُنھوں نے پہلے ہر ہیئت کی تعریف، مغرب میں اُس کی تاریخ اور پھر اُردو میں اُس کے ارتقا کی شکلیں پیش کی ہیں۔ اُردو کے شعرا مغربی ہیئتوں کو اپناتے ہوئے ردّ و قبول کے عمل سے دوچار ہوئے ہیں۔ عنوان چشتی صاحب نے انحراف کی صورتیں بھی پیش کی ہیں۔ مثلاً انگریزی میں معرّا نظم کے لئے ایک مخصوص بحر آئمبک پنٹا میٹر رائج ہے مگر اُردو والوں نے اُس کے لئے کسی بحر کو مخصوص نہیں کیا۔ اسی طرح انگریزی میں فری ورس نے عروضی ارکان کو ترک کر کے موسیقیت کی بنیاد بول چال کے آہنگ اور لہجے کی تاکیدوں پر رکھی۔ اس کے برعکس اُردو کی آزاد نظم نے مساوی الوزن مصرعوں کے اُصول کو خیرباد کہا مگر عروضی آہنگ کو نہ چھوڑ سکی۔ عنوان چشتی صاحب اس حقیقت سے واقف ہیں کہ اگر کوئی شعری ہیئت ہماری قومی موسیقی میں مزاج سے ہم آہنگ نہیں ہے تو وہ کامیاب نہیں ہو سکتی۔ عنوان چشتی صاحب نے غالباً پہلی مرتبہ بڑی تفصیل کے ساتھ اُردو کی اُن چند شعری ہیئتوں کا ذکر کیا ہے جو جاپانی ادب سے مُستعار لی گئی ہیں۔ ان ہیئتوں کا جاپان میں جو عروضی اور معنوی تصور ہے اس کا پہلی مرتبہ اتنا بھرپور تجزیہ کیا گیا ہے۔ ہمارے نقاد ان ہیئتوں کا سرسری ذکر کرتے ہیں مگر اُنھوں نے اُن کے کامیاب اور ناکام یاب تجربوں کو پرکھنے اور اُن پر کوئی حکم صادر کرنے کی کوشش نہیں کی۔ عنوان چشتی صاحب قابلِ مبارکباد ہیں کہ اُنھوں نے یہ کام بڑی توجہ اور دیدہ ریزی سے کیا ہے۔

عنوان چشتی صاحب کے کام کی بنیادی خوبی یہ ہے کہ اس میں لسانی، عروضی، اسلوبیاتی اور تجزیاتی تنقید و تحقیق کا امتزاج ملتا ہے۔ اسی ضمن میں اُنھوں نے ہیئتوں میں تبدیلیوں کے سماجی عوامل کا بھی ذکر کیا ہے۔ اور اس طرح اُن کے یہاں سماجی تنقید کے اُصولوں کی کارفرمائی بھی ملتی ہے مگر اس نقطۂ نظر کو اُنھوں نے وہ اہمیت نہیں دی، جو دوسرے محقق اور نقاد اسے دیتے رہے ہیں۔ ہماری ادبی تحقیق کی بدنصیبی یہ رہی ہے کہ وہ خبر تو دیتی ہے مگر نظر سے محروم ہے۔ معلومات کو اہمیت دیتی ہے۔ مگر عرفان کی نگاہوں سے ادب اور زندگی کے مظاہر کو نہیں دیکھتی۔ اس وجہ سے وہ پرکھ اور تنقیدی محاکمے سے محروم ہے۔ عنوان چشتی صاحب نے تنقید و تحقیق دونوں کا حق ادا کیا ہے۔ تحقیق کے آداب اور مطالبات کو ملحوظ رکھتے ہوئے اُنھوں نے ایک متوازن تنقیدی بصیرت کا ثبوت دیا ہے۔ یہی وہ خوبی ہے جو اُن کے موجودہ کام کو معتبر بنانے کے لئے کافی ہے۔ اس موضوع پر اب تک جو کچھ کام ہوا تھا۔ وہ انتہائی غیر تسلی بخش تھا۔ عنوان چشتی صاحب نے جس محنت توجہ اور ادبی دیدہ ریزی کے ساتھ اُس سے انصاف کیا ہے، وہ اُن کے تحقیقی کام کو عرصے تک ایک ناقابلِ تردید تحقیقی و تنقیدی دستاویز کی حیثیت سے باقی و برقرار رکھے گا۔


درجہ حرارت ناپنے کے لئے
سیلسیس اسکیل استعمال کریں
بھارت میں اب یہی اسکیل قانونی طور پر تسلیم کیا جاتا ہے
(فارن ہائٹ کا استعمال متروک ہو چکا ہے)
جسم کا عام درجہ حرارت : 37° سی
بہت تیز بخار : 40° سی

مکتوبات

○ کل شاعر کا گوشۂ عصمت چغتائی والا شمارہ ملا۔ عصمت آپا کی میں بھی ایک قدر دان ہوں۔ اپنی ادبی زندگی کے آغاز میں اُن سے کافی روشنی حاصل کی تھی۔ اب بھی اُن کی تحریر کی پرستار ہوں۔ اُن کا اپنا ایک عہد ہے ایک تاریخ ہے۔ درحقیقت ادبی انداز میں بیباکی اور جسارتِ اظہار کا آغاز اُنہی نے کیا ہے۔ بعد میں جن خواتین نے اُن کی پیروی کی وہ نہایت بھونڈی نقالی بن کر رہ گئی۔ بقول صلاح الدین احمد "عصمت چغتائی ایک ماہر سرجن کی طرح جسمِ ادب کی وہی رگیں کاٹتی ہیں جو سڑ چکی ہیں۔" لیکن اُن کے مقلدین نے سوچے سمجھے بغیر صحت مند رگیں بھی کاٹ کر پھینک دیں اور دلہن ادب کو بیوہ کر کے رکھ دیا۔

اُن پر جتنا لکھا جائے کم ہے۔ بہرکیف آپ نے جتنی بھی کوشش کی ہے وہ بہت اچھی ہے۔ اُن کے انٹرویو میں اُن کی ادبی، نجی اور بیرونی زندگی اور معروفیات کا سارا خاکہ اچھی طرح قاری کے سامنے آجاتا ہے۔

"جرعات" میں آپ کی اپنی باتیں پڑھیں اور دل پر دھکّا لگا۔ کیسی بے بسی ہے کہ انسان ہنگامی تفریح پر بے دریغ سرمایہ برباد کرتا ہے، فلموں پر مرتا ہے، کیبرے ڈانس پر محنت کی کمائی لٹاتا ہے۔ لیکن اُس چیز کے حصول پر اُس کی جیب سے ایک پائی بھی نہیں نکلتی جو چیز اُس کے دل و دماغ، تہذیب و اخلاق کو صیقل کر سکتی ہے! . . . . آپ نے اب تک شاعر کے ذریعے بہت کچھ کیا ہے۔ نہایت وقیع اور موقر نمبر اُردو پڑھنے والوں کو دیئے ہیں، وہ ایسے نہیں کہ فراموش کئے جاسکیں! کاش حکومت آپ کے لئے کچھ کر سکے۔ میں تو بہرحال آپ کے اور آپ کی معنوی اولاد "شاعر" کے لئے دعاگو ہوں۔

۵۲۵-۱-۱۴ اسیتارام پیٹ حیدرآباد ۱۲ — عفت موہانی

○ "شاعر" کا مارچ ۷۶ء کا شمارہ پیشِ نظر ہے۔ "جرعات" کے آخری پیراگراف میں دردمندی اور جاں سوزی کی ایک داستانِ عظیم سموئی ہوئی ہے۔ نصف صدی کے اس طویل عرصے میں آندھیوں میں چراغ جلائے رکھنے کی یہ داستان مستقبل کا مورخ نظرانداز نہ کرسکے گا، اُس کا مجھے یقین ہے

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

شاعر، بمبئی

گوشۂ عصمت چغتائی کا اہم حصہ "عصمت چغتائی سے ایک ملاقات" ہے عصمت چغتائی نے پروفیسر یونس اگاسکر وغیرہ سے گفتگو میں جہاں اپنی افسانہ نگاری کے پس منظر کو اُبھارنے، اسباب و علل کا تجزیہ کرنے اور اپنے افکار و نظریات کی وضاحت کی کوشش کی ہے وہیں لگے ہاتھوں اُنھوں نے اُردو زبان اور رسم الخط کے مسائل پر بھی اظہارِ خیال کیا ہے اُن کے اقوال حسبِ ذیل ہیں۔

(۱) اُردو جاننے والے (اخباروں رسالوں اور کتابوں کے) خریدار نہیں ہیں۔

(۲) زیادہ تر لوگ رسالے اور کتابیں فری وصول کرتے ہیں۔

(۳) اُردو کتابیں کوئی نہیں خریدتا۔

(۴) میں نہیں کہتی کہ اُردو اسکرپٹ کا گلا گھونٹ دیجئے۔ وہ تو اپنے آپ ہی مر رہا ہے اُس کو مارنے سے کیا فائدہ۔

(۵) اگر ہمیں اُن تک (نئی پود تک) پہونچنا ہے تو ہمیں اپنی تحریروں کو دیوناگری اسکرپٹ میں لکھنا پڑے گا۔

(۶) اُردو کے لئے (لباس کے) دو جوڑے ہوں تو کوئی حرج نہیں۔ ایک عربی اسکرپٹ کا (کذا) ایک دیوناگری اسکرپٹ کا۔

(۷) وہ تو (اُردو اسکرپٹ) آؤٹ آف فیشن ہو گیا ہے۔

محترمہ عصمت چغتائی نے اور بھی بہت سی باتیں کہی ہیں جو "شاعر" کے صفحات پر ریکارڈ ہیں۔

میں سمجھتا ہوں کہ محترمہ عصمت چغتائی عمر بھر شدید جذباتیت اور انانیت پسندی کا شکار رہی ہیں جس کے ردِّ عمل نے اُن کے افسانوں اور ناولوں میں تیکھاپن پیدا کیا اور اُن سے مروّجہ اقدار سے بغاوت کا اعلان کروایا یہی شدید جذباتیت اور انانیت پسندی اب پختہ عمر میں زبان کے مسئلے پر اُن کو ایک ٹیڑھی راہ اختیار کرنے پر مجبور کر رہی ہے اور اُن سے ایسی باتیں کہلوا رہی ہے جس سے اُن کی مجروح انانیت تسکین پا سکے اور اُن کا باغیانہ طرزِ فکر برقرار رہ سکے۔ پھر یہ بھی ہے کہ ساٹھ برس کے بعض لوگ خود کو بڑا تجربے کار اور دانا سمجھنے لگتے ہیں اور ہر اُس مسئلے پر رائے زنی اپنا حق سمجھتے ہیں جس سے اُن کا دُور و نزدیک کا مبہم سا تعلق بھی ہوتا ہے تاکہ نئی نسل پر اُن کی دانائی اور بینائی کا رعب پڑ سکے۔

محترمہ عصمت چغتائی تقریباً پندرہ کتابوں کی مصنفہ ہیں جن کی مجموعی تعداد پندرہ ہزار تو ہوگی ہی۔ کیا ان کی یہ کتابیں خریدی نہیں گئیں اور اب تک صندوقوں میں بند پڑی سڑ رہی ہیں؟

آج کل اُردو کی جتنی قیمتی کتابیں جس کثرت سے شائع ہو رہی ہیں، شاید پچھلے پچاس برسوں میں کبھی نہ شائع ہوئی ہوں گی (مکتبہ جامعہ اور انجمن ترقی اُردو سے تصدیق کر لی جائے) کیا ناشروں اور مصنفوں کا دماغ خراب ہو گیا ہے جو وہ اُردو کی مطبوعات پر زرِ کثیر صرف کر رہے ہیں، یہ جانتے ہوئے بھی کہ ان کتابوں کا خریدنے والا کوئی نہیں ہے، اور زیادہ تر لوگ "کتابیں فری وصول کرتے ہیں"

"اُردو اسکرپٹ اپنی موت آپ مر رہا ہے" یہ صرف محترمہ عصمت چغتائی کی دوربین نگاہیں دیکھ رہی ہیں۔ ورنہ یہ ہزاروں اخبارات اور رسائل جو ملک کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے ہیں، ایک دوسری ہی کہانی سُنا رہے ہیں۔ شاعر، کتاب اور شب خون سے قطع نظر، شمع اور بیسویں صدی جو اُردو رسم الخط میں لاکھوں کی تعداد میں چھپتے ہیں، کیا فری بانٹ دیئے جاتے ہیں؟ کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا۔؟!

زبان اور رسم الخط کا رشتہ جسم و جان کا رشتہ ہے۔ رسم الخط کوئی لباس نہیں ہے کہ جب میلا ہو گیا، اُتار کر نیا زیب تن کر لیا۔ دنیا میں کتنی بڑی زبانیں ایسی ہیں جنھوں نے اپنا رسم الخط از خود ترک کر کے، دوسرا رسم الخط اختیار کر لیا ہو؟ مثالیں اکثر گمراہ کُن ہوتی ہیں۔ رسم الخط کو لباس سے تشبیہ دینا قارئین کو جَل پھیریاں دینا ہے۔

روس میں پانچ سو سے اُوپر زبانیں اور بولیاں ہیں۔ سوویت گورنمنٹ نے اکتوبر انقلاب کے بعد بہت سی زبانوں کو، جو رسم الخط سے محروم تھیں، حروف تہجی اور رسم الخط عطا کیا ہے مگر یہ کہیں سُننے میں نہیں آیا کہ ایک اچھے خاصے رسم الخط کو بدل کر، دوسرا رسم الخط اختیار کرنے پر مجبور کیا گیا ہو۔ خود اپنے ملک میں بنگالی، آسامی، تامل، تیلگو، کناڈی، اُڑیا، سندھی وغیرہ زبانیں اپنے الگ الگ رسم الخط رکھتی ہیں۔ مگر کوئی یہ کہہ کر تو دیکھے کہ "اپنا بوسیدہ لباس اُتار کر پھینک دو اور دیوناگری رسم الخط اختیار کر لو" ناظرین کو یاد ہو گا کہ ابھی کچھ دن پہلے، سندھی زبان کے عربی رسم الخط کو بدل کر اُسے دیوناگری کر دینے کی تجویز پر خود سندھی زبان کے حلقوں میں، اتنا شدید ردِ عمل ہوا تھا کہ آخر محرکین کو پسپائی اختیار کرنی پڑی۔ اُردو غریب کا تو معاملہ ہی دوسرا ہے۔ یہاں ہر ایرے غیرے، اپنے بیگانے کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ جب چاہے برسرِ عام اس کے مُنہ پر طمانچے جڑ دے۔ محترمہ عصمت چغتائی نے اگر اپنا یہ حق استعمال کیا تو کیا بُرا کیا ؎

شالاط۔ بمبئی

خرد کا نام جُنوں پڑ گیا، جنُوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حُسنِ کرشمہ ساز کرے

شاعر کے انھیں صفحات پر ایک طرف تو بیالیس سالہ سرفروشی جاں سپاری کی وہ داستان ہے جس سے رگوں کو حرارت اور دلوں کو توانائی ملتی ہے۔ اور دوسری طرف بیالیس سال تک اُردو زبان و ادب سے روابط کے نتائج اس صورت میں برآمد ہوتے ہیں کہ اُردو رسم الخط از کار رفتہ ہو چکا ہے اور اس سے جتنی جلد نجات حاصل کر لی جائے اتنا ہی اچھا ؎

ببیں تفاوتِ رہ از کجاست تا بہ کجا

۹۷/۱۷ پریڈ۔ کانپور   **نامی انصاری**

○ "شاعر" باقاعدگی سے مل رہا ہے۔ شکریہ۔ اس بار "براہِ راست گفتگو" میں آپ کے لہجے کی دھار بہت تیز ہے۔ اور کیوں نہ ہو، جبکہ اردو زبان و ادب کے لئے آپ کے قلم نے کیا کیا حسین پھول کھلائے ہیں۔ مگر صلے میں کانٹوں کے سوا کچھ نہیں ملا۔

آپ کچھ لوگوں کو گوشوں سے خوش کر رہے ہیں اور ہم ادھر "بگو گوشوں" سے دل بہلا رہے ہیں۔ یہ بھی اللہ کی شان ہے۔ جی ہاں "بگو گوشہ" ناشپاتی کے کُنبے کا ایک لذیذ پھل ہوتا ہے۔ کیا آپ نے کبھی چکھا ہے؟ اس بار گوشۂ عصمت چغتائی بھی بہت لذیذ ہے۔ بگو گوشے ہی کی طرح!

۱۷۹ سیکٹر ۸۔ سی، چنڈی گڑھ (پنجاب)   **پریم وار بر ٹنی**

○ تازہ شمارہ ۳ میں قبلہ اعجاز صاحب کا اداریہ پڑھ کر آبدیدہ ہو گیا اور وہ تمام پچھلے اداریے نظروں کے سامنے آ گئے جو تقسیم کے بعد آں محترم نے تحریر فرمائے۔ اُن کی تاریخی حیثیت مُسلّم ہے۔ ان اداریوں نے اُردو کے مقصد اور اُردو تحریک کو آگے بڑھایا ہے۔ اُردو والوں کے حوصلے بلند کئے ہیں۔ اگر ان اداریوں کو کتابی صورت میں مرتب کیا جائے تو یہ اُردو کا بیش قیمت سرمایہ ہوں گے۔ قبلہ اعجاز صاحب کی بے لوث خدمات ناقابلِ فراموش ہیں۔

"شاعر" میں فن کاروں کے لئے گوشے مخصوص کرنا اور "شاعر" کے خاص نمبر نیز اُس کی اپنی انفرادیت، "شاعر" کا طرۂ امتیاز ہے۔

"شاعر" کے تازہ شمارہ میں محترمہ عصمت چغتائی پر مقالات، اُن کے فن اور شخصیت کو منور کرتے ہیں۔ عصمت چغتائی اور رفیعہ منظور الامین کی کہانیاں عمدہ ہیں۔ منظومات میں محترم ظرفہ قریشی، حُرمت الاکرام، نازش پرتاب گڈھی، مخلص بڑودوی، مجیب راہی اور عابد مناوری پسند آئے۔

غرض تازہ شمارہ صوری اور معنوی لحاظ سے دیگر رسائل سے بلند و برتر ہے

قاضی پورہ۔ کھنڈوہ (ایم۔پی) حسن رضا

○ "شاعر" مارچ کا شمارہ ہاتھ میں ہے اور شاعر کے آئندہ شمارے کی خبر پڑھ کر دل باغ باغ ہوگیا ہے۔ آپ نے شاعر کے شمارے کو خوب خوب سجایا ہے۔ خاصکر گوشۂ عصمت چغتائی میں سلمیٰ صدیقی کا مضمون "عصمت چغتائی ایک جادوگرنی" اور پروفیسر یونس اگاسکر کا مضمون "عصمت چغتائی سے ایک ملاقات" قابلِ ذکر ہے۔ مقالوں میں "اُردو نثر اک جائزہ" اور کوثر چاند پوری کے رپورتاژ بہت خوب ہیں۔ جناب نازش پرتاپ گڈھی کی نظم "اپنی دھرتی اپنی بات" اور غالب عرفان کی نظم "جنگ جاری ہے" قابلِ تعریف ہے۔

مندرجۂ ذیل شعراء کی غزلیں بہت پسند آئیں

محبوب راہی، علی احمد جلیلی، غلش بڑودوی، ظرفہ قریشی، عابد مناروی، اختر آفاقی اور وقار روانقی۔

ذرا اک چیز کھٹکی کہ اگر شاعر کے شمارے وقت پر منظرِ عام پر آجائیں تو بہت خوب ہوگا۔ لوگوں کو شکایت کا موقع بھی نہ ملے گا۔ آپ جس طرح اردو ادب کی خدمت کر رہے ہیں وہ اپنی مثال آپ ہے۔ ہر چند آپ کے اعضاء جواب دے چکے ہیں، قویٰ مضمحل ہو چکے ہیں۔ اس پر بھی اتنا بڑا بوجھ اپنے شانوں پر لئے ہوئے ہیں، یہ آپ ہی کا حصّہ ہے۔

بلڈنگ نمبر ۹، روم نمبر ۱۵/۲۔ مرواڈی نگر، ڈاڈا بھئی نمبر ۲ عبد الوحید سحر

○ میرے ایک افسانے کے ساتھ آپ کا لکھا ہوا اخلاقی خط پاکر میں کتنا خوش ہوا ہوں اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ زندگی میں پہلی بار ایک مُدیر کا خط، وہ بھی واپس آئے ہوئے افسانے کے ساتھ دیکھ کر میری خوشی کی انتہا نہیں رہی۔ آپ کے الفاظ کہ کوئی بھی تخلیق پڑھے بغیر واپس نہیں کرتے، چاہے وہ قابلِ اشاعت ہو یا نہ ہو۔ میرا افسانہ ناقابلِ اشاعت تھا، اس کے باوجود آپ نے چھوٹی موٹی غلطیوں کو دُرست فرماکر اُسے واپس کیا ہے۔ مجھے آپ پر فخر ہے۔ آپ واحد مُدیر ہیں، جو اپنے دل میں چھوٹے بڑے قلمکاروں کے لئے اتنی محبت رکھتے ہیں۔

میری پُرانی عادت ہے کہ "شاعر" ملتے ہی پہلے "اداریہ" پڑھتا ہوں۔ اس بار کا اداریہ پڑھ کر میرے جسم کا رُواں رُواں کھڑا ہوگیا۔ آنکھوں میں آنسو چھلک آئے۔ آپ اُردو کے جہاد کے سپہ سالار ہیں۔ آپنے ہمیشہ اپنے ساتھیوں کی ہمت بندھائی۔ گھپ اندھیرے میں رجائیت کی شمع جلاتے

رہے۔ یہ بھی سچ ہے کہ اب آپ بہت تھک چکے ہیں۔ افسوس کہ آپ کی پوری زندگی بے سکونی میں گذری۔ اُردو کے لئے آپ نے اپنا سب کچھ قربان کردیا۔ میں اکثر سوچتا ہوں کہ آپ کے بعد اُردو کا اسقدر چاہنے والا کون ہوگا؟۔

تازہ شمارہ میں عصمت آپا کا گوشہ ہے۔ میں اِس شمارہ کا منتظر تھا جب بھی بیدی، کرشن اور منٹو کی بات چھڑتی ہے یا خیال آجاتا ہے تو عصمت چغتائی جھٹ سے یاد آجاتی ہیں کہ یہ اُن ہی کی صف کی ہیں۔

زینتھ اسٹوڈیو۔ بنور (کرناٹک) شبیر مرزا

○ تازہ شمارہ میں گوشۂ عصمت چغتائی کے علاوہ نازش پرتاپ گڈھی کی نظم "اپنی دھرتی، اپنی بات" ظرفہ قریشی اور ساحل سلطانپوری کی غزلیں پُرکشش اور خوبصورت ہیں۔ رجنی پودار کی (ترجمہ خالد شفائی) کہانی "ٹوٹنے کے آگے پیچھے" پڑھ کر دل کے تار جھنجھنا اُٹھے۔ رحمٰن حمیدی کا مقالہ "اُردو نثر — ایک مختصر جائزہ" میں کوئی خاص بات نظر نہیں آئی۔ ہاں پردۂ ذہن پر یادداشت کی جو پرچھائیاں دُھندلی ہوگئی تھیں وہ واضح ہوگئیں۔ "گوشوں" کا بیڑہ اٹھاکر جہاں آپنے خود اپنے لئے مصیبت مول لے لی ہے وہیں قارئین کی دلچسپی اور راحت کا سامان مہیا کردیا ہے۔

دل سگھوارڈ۔ سیونی (ایم۔پی) خلیق الزماں سحر

○ ہر ماہ "شاعر" یہاں کے ایجنٹ سے خرید لیتا ہوں۔ پچھلے شمارے میں گوشۂ عتیق حنفی "فکر و احساس اور جدیدیت" کے تعلق سے بے حد پسند اِس لئے آیا کہ اِس سے جدیدیت کی سمت کی صحیح نشاندہی ہوتی ہے۔ تازہ ماہنامہ "شبخون" میں جدید افسانے کے تعلق سے قمر احسن نے جو مقالہ سپردِ قلم کیا ہے۔ اس مقالے کی فکری، تجرباتی اور تجزیاتی اساس کا اطلاق جدید نظموں پر بھی ہوتا ہے۔ قمر احسن نے بڑی متانت اور بُردباری سے جدید افسانوی فضا کا جائزہ لیا ہے۔ آپ نے گوشوں کے لئے جن فن کاروں کا انتخاب کیا ہے وہ بہر اعتبار فکر و فن کے آفاق کو چھونے والے فن کار ہیں۔ اور اس سے ہٹ کر بھی "شاعر" میں شائع ہونے والی تمام تخلیقات آلودگی، بے راہ روی اور سطحی خودنمائی کی شکار نہیں ہوتیں۔ یہ آپ کی وسیع النظری اور دوررس نگاہی کا ثبوت ہے۔

۲۵۰ خطیب اسٹریٹ۔ پاریاپیٹ۔ وانمباڑی دانش فرازی

بقیہ: "خلائیں چھوڑ دی ہیں میں نے کچھ اپنے فسانے میں" صفحہ ۱۳

کو چھونے والی ہیں۔ الفاظ اور جملوں کے اعادے کے باوجود سب اُن کی لذتِ تقریر میں کھوئے ہوئے ہیں۔ وہ نوجوان دل ہی دل میں سوچ رہا ہے۔
"اِسے کہتے ہیں آگہی کا کمال ـــ!!"

مُلّا صاحب کی تقریر کے دوران ہی میں ڈاکٹر ظ۔ انصاری سُوٹ میں ملبوس جلسہ گاہ میں داخل ہوئے ہیں۔ ڈائس پر کوئی کُرسی خالی نہیں ہے۔ وہ نوجوان یہ موقع غنیمت جان کر اپنی کُرسی ظ۔ صاحب کو پیش کرتا ہے اور تیر کی طرح ڈائس سے اُتر کر سامعین کی پہلی صف میں آکر بیٹھ جاتا ہے۔ مُلّا صاحب نیس جسٹس حسٹ کی تقریر کے بعد تالیوں کی گونج میں کُرسیٔ صدارت پر واپس جا رہے ہیں۔ اُن کے بعد زیدی صاحب نے مولانا عبدالرحمٰن پرواز اصلاحی کو آواز دی ہے۔ اُن کا موضوع اہم بھی ہے اور مشکل بھی۔ یعنی سیماب کے منظوم ترجمۂ قرآن مجید "وحیِ منظوم کا ادبی و لسانی مرتبہ"۔ مولانا پرواز اصلاحی نے پُوری چھان بین اور غور و فکر سے قرآنِ حکیم کے دیگر منظوم تراجم اور سیماب کے ترجمہ کی خصوصیات کا عالمانہ موازنہ کیا ہے۔

شام گہری ہوتی جا رہی ہے۔ زیدی صاحب نے ڈاکٹر زرینہ ثانی کو مقالہ پڑھنے کی زحمت دینے کے ساتھ ہی اُس نوجوان کو بھی پُکار لیا ہے جو ڈاکٹر ظ۔ انصاری کے لئے اپنی کُرسی خالی کر کے چلا گیا تھا۔ وہ ڈائس پر پہنچا تو حکم ملا ـــ "یہاں بیٹھو (جنرل سکریٹری کی کُرسی پر) زرینہ ثانی صاحبہ کے بعد ظ۔ صاحب کو آواز دینا۔ جنرل سکریٹری اتنا کہہ کر ڈائس سے اُتر گئے ہیں اور اُسے دوبارہ سامعین کا مقابلہ کرنا پڑ رہا ہے۔ ڈاکٹر زرینہ ثانی ناگپور سے آئی ہیں۔ بُوٹا سا قد، بھرا بھرا معصوم چہرہ، علمی فوقیت اور سنجیدگی دونوں سے روشن۔ اُن کی فراست کہ وقت کی کمی کے پیشِ نظر تقریروں کے دوران ہی انھوں نے اپنے مقالے کے کچھ حصّے حذف کر لئے تھے۔ "سیماب کی نظریۂ شاعری" پر نہایت سنبھلے ہوئے لہجے میں اُنھوں نے مقالہ سُنانا شروع کیا ہے، اور سامعین کو اپنی طرف متوجہ کر لیا ہے۔ اِسی موضوع پر کئی سال پہلے زرینہ ثانی ڈاکٹریٹ کی ڈگری لے چکی ہیں۔ عورت کی زبان سے علم و فن اور نقد و نظر کی باتیں کچھ اور ہی لُطف دیتی ہیں! ـــ وہ واپس اپنی کُرسی پر آئی ہیں تو مُلّا صاحب، ڈاکٹر زکریا اور کرشن چندر نے بھی اُن سے تعریفی کلمات کہے ہیں ـــ ایک آواز بھی سنائی دی ہے۔ "اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ"!

زورِ قلم کی بات چلی تو بالکل اتفاقی طور پر زورِ تقریر کے لئے ڈاکٹر ظ۔ انصاری کے پاس یُوسف ناظم کا بھیجا ہوا ایک پُرزہ پہنچا ہے۔ جس پر لکھا ہے ـــ "داغ اور امیر کی عزت بچائیے" (مُلّا صاحب نے داغ اور ۴۹

امیر کے تعلق سے کچھ کہا تھا) ظ۔ انصاری جیسے ذہین اور شعلہ نوا مقرر کو "اک ذرا چھیڑیئے، پھر دیکھئے کیا ہوتا ہے" کا موقع مل گیا ہے۔ وہ ناظم کی درخواست پر وہ اپنے خاص اِسٹائل میں مائک پر تشریف لائے ہیں۔ سیماب سے متعلق چند اُوپری باتیں بتا کر وہ داغ اور امیر کو defend کرنے لگے ہیں۔ زندگی کے حُسن اور صحت مندی کا حوالہ دے رہے ہیں۔ مُلّا صاحب کی بعض باتوں کا جواب دیتے ہوئے

"کرتے چڑھائے ہوئے، پائینچے اُٹھائے ہوئے"

جیسی "عامیانہ" شاعری کی لسانی خوبیوں پر بار بار زور دے رہے ہیں۔ سیماب کو اِس طرح کی شاعری سخت ناپسند تھی۔ ظ۔ صاحب کی بکھری بکھری باتوں میں بھی ایک طرح کا لُطف ہے۔

ڈاکٹر ظ۔ انصاری کے بعد آخری مُقرر ڈاکٹر افتخار احمد فخر ہیں۔ وہ سیماب کی غزلوں میں سیاسی عناصر کا جائزہ لے رہے ہیں۔ وقت کافی گذر چکا ہے! سامعین کے چہروں سے تھکن آشکار ہے۔ زیدی صاحب ڈائس پر واپس آ چکے ہیں۔ ڈاکٹر فخر کا مقالہ انتخابِ اشعار سے گراں بار ہے۔ وہ جگہ جگہ سے اُس کے حصّے چھوڑتے جا رہے ہیں۔ اِسی دوران کوئی صاحب ڈائس کے پاس آکر بس کا ایک ٹکٹ اُس نوجوان کو تھما گئے ہیں، جس کی پُشت پر لکھا ہے: "براہِ کرم" سلطان مجروح پوری "سے شعر سُنوایئے"۔ وہ مُسکرا کر ٹکٹ زیدی صاحب کو دے رہا ہے۔ وہ ٹکٹ ڈائس کے سارے افراد میں گردش کرتا ہے اور سب کے چہروں پر مُسکراہٹ بکھر جاتی ہے۔ سامعین نہ جانے کیا سمجھ کر مُسکرا رہے ہیں۔ فخر صاحب کا مقالہ ختم ہونے پر زوردار اختتامیہ تالیاں بج رہی ہیں اور مطبوعہ پروگرام کے مطابق زیدی صاحب نے محترم اعجاز صدیقی کو شکریہ کی رسم ادا کرنے کے لئے آواز دی ہے۔ اعجاز صاحب فرطِ جذبات اور مسرتوں کی ارزانی سے بے حال ہو رہے ہیں پھر بھی اُنھوں نے چند جملے اپنے والدِ ماجد کی شخصیت اور خدمات کے تعلق سے کہے ہیں۔ اُنھوں نے بڑے خلوص اور دل کی تمام تر گہرائیوں کے ساتھ تمام مہمانانِ گرامی، اراکینِ سیماب اکاڈمی اور سامعین کا شکریہ ادا کیا ہے۔

بھرے گی اِن کو میرے بعد لاکھوں رنگ سے دنیا
خلائیں چھوڑ دی ہیں میں نے کچھ اپنے فسانے میں

سیماب نے جو خلائیں چھوڑی ہیں، ستائیس سال کے بعد آج اُن میں کچھ ہلکے گہرے رنگ بھرتے دیکھ کر نوجوان کا دل کئی گھنٹے سے مسلسل اُچھلتا رہا ہے۔ بمبئی نے کبھی کسی اختتامی تقریب یا ادبی جلسے میں اِس کثرت سے لوگوں کو شریک ہوتے

اور تقریروں کی خشکیوں کو اتنی دلچسپیوں کے ساتھ گوارا کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔ سامعین اپنی اپنی کرسیوں پر اب بھی جمے ہوئے ہیں۔ مجروح "کیفی" اور دوسرے شعرا کی موجودگی انھیں اُٹھنے نہیں دے رہی ہے اور وہ جو سیماب نے کہا تھا ؎

اِن خشکیوں میں بارشِ پیمانہ چاہیئے

تو بالآخر شکریے کی رسم کے بعد محفلِ شعر و سخن منعقد ہو سکی ہے۔ شعروں اور ترنم کی بارش نے سامعین کے ذہنوں سے نثر کی خشکیوں کو دُور کر دیا ہے۔ رات کے ساڑھے آٹھ بج رہے ہیں۔ مہمانانِ خصوصی اور سامعین آہستہ آہستہ اپنی جگہوں سے روشن سایوں کی طرح حرکت کرتے نظر آ رہے ہیں۔ تھوڑی دیر میں یہاں خاموشی چھا جائے گی۔ یہ لوگ، یہ آوازیں، یہ تصویریں کل نہ رہیں گی۔ مگر سیماب اکاڈمی کی یہ افتتاحی تقریب کافی دن تک یاد آتی رہے گی۔ جو حضرات دیر سے تشریف لائے تھے، وہ اور اُن کے ساتھی دوسرے لوگ بھی پھر مطبوعات و مخطوطاتِ سیماب کی نمائش دیکھنے میں مصروف ہو گئے ہیں۔ کچھ ڈائس کے پاس مُلّا صاحب، ڈاکٹر زکریا اور دوسرے مہمانوں اور اراکین سے باتیں کر رہے ہیں، کچھ کرسیوں کے درمیانی راستوں پر محوِ گفتگو ہیں اور کچھ گیلری میں کھڑے آپس میں ہنس بول رہے ہیں۔ کیسی چہل پہل ہے۔ مصافحے ہو رہے ہیں، شکوے، شکایتیں، قہقہے، طنز کے نشتر چل رہے ہیں۔ عزّت مآب ڈاکٹر رفیق زکریا چلتے چلتے مُلّا صاحب، دسنوی صاحب، اعجاز صاحب اور زیدی صاحب کو اپنے یہاں اسی وقت کھانے پر آنے کے لئے مدعو کر کے تشریف لے جا چکے ہیں۔ ہال سے لوگوں کے خراماں خراماں نکلتے نکلتے اور روشن بتّیوں کو بجھتے بجھتے نصف گھنٹہ مزید لگ گیا ہے۔ نوجوان سوچ رہا ہے، کل رات کو صابو صدّیق گراؤنڈ پھر بُقعۂ نُور بنے گی اور یومِ سیماب کے "شبِ غزل" پروگرام میں پھر شعر و نغمہ کی بارش ہو گی۔ اُس کے قدم بھی اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ اُٹھنے لگے ہیں۔ کچھ دیر کے بعد پھر وہی اُس کے ہوسٹل کا کمرہ ہو گا اور عالمِ تنہائی ــــ!

آج ۲۰ مارچ ۷۶ء اور سنیچر کا دن ہے، رات کے ۹ بجنے والے ہیں۔ صابو صدّیق پالی ٹکنک گراؤنڈ میں لگ بھگ چار ہزار کرسیاں لگی ہیں۔ آگے صوفے بچھے ہیں۔ الگ الگ مسجے بنائے گئے ہیں۔ پُوری گراؤنڈ روشنیوں سے جگمگا رہی ہے۔ کمیٹی کے اراکین اور والنٹیرز صوفوں اور کلاسوں تک مہمانانِ خصوصی اور سامعین کو لے جا رہے ہیں۔ اِن کے سینوں پر رنگین بیج لگے ہوئے ہیں۔ کل کے روشن سائے آج پھر متحرک ہیں۔ چند لڑکیاں تھو نیرکی کاپیاں اور قلم کے گول ڈبّے لئے تتلیوں کی طرح اِدھر اُدھر اُڑتی پھر رہی ہیں۔ اسٹیج

شاعر۔ بمبئی

کے پاس ٹیلی ویژن سینٹر کے لوگ اپنا ساز و سامان پھیلا رہے ہیں، کیمرے ٹھیک کر رہے ہیں۔ آرٹسٹ بھی آنا شروع ہو گئے ہیں۔ "باب الداخلہ" پر ہنگامہ بڑھ رہا ہے۔ یہ موسیقارِ اعظم نوشاد علی کی گاڑی اندر آئی ہے۔ تھوڑی ہی دیر میں آج کے مشہور میوزک ڈائرکٹر اور گلوکار رویندر جین کی گاڑی بھی اندر آ گئی ہے۔ افتخار امام صدّیقی جو جَین صاحب سے بہت قُربت رکھتے ہیں، دوسرے اراکین کے ساتھ انھیں لینے کے لئے دوڑ پڑے ہیں۔ (روشنیوں کے زاوئے بدلے جا رہے ہیں) ـــــ اسی دَوران گیٹ پر محمد رفیع صاحب کی گاڑی کو بھیڑ نے گھیر لیا ہے۔ بمشکل اُن کی گاڑی کو اندر لایا جا سکا ہے۔

صابو صدّیق گراؤنڈ کے مُستقل اسٹیج کو آگے بڑھایا گیا ہے۔ اسٹیج کی وسیع و عریض محراب کو ۱۰×۲۰ فٹ کے پُرکشش BACKDROP نے ڈھانپ لیا ہے۔ ہر شخص کی نظر اُس بہت بڑے پردۂ پُشت پر جمی جا رہی ہے۔ یہ آرٹسٹ کے کمالِ فن اور رنگوں کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ اُوپر میر تقی میرؔ، میاں نظیرؔ اکبر آبادی اور مرزا غالبؔ کی تصویریں بیضوی حلقوں میں ہیں۔ سیدھے ہاتھ کے پُورے حصّے پر علّامہ سیمابؔ کا پُرکشش وجیہہ چہرہ ہے، اور اُلٹے ہاتھ کی طرف تاج محل کا خوابناک منظر۔ درمیان میں انگریزی اور اُردو میں "سیماب اکاڈمی"، "یومِ سیماب" اور "شبِ غزل" لکھا ہوا ہے۔

سیّد محمد زیدی، مشتاق اور بیتاب مجمع کو "شبِ غزل" کے آغاز کا مُژدہ سُناتے ہوئے موسیقارِ اعظم نوشاد علی، عظیم گلوکار محمد رفیع، محترم اعجاز صدّیقی اور مجروح سلطان پُوری صاحب کو اسٹیج پر تشریف لانے کی زحمت دے رہے ہیں۔ نوشاد صاحب، اعجاز صاحب اور رفیع صاحب اسٹیج پر ابھی ابھی لگائے ہوئے صوفے پر بیٹھ گئے ہیں۔ محمد رفیع کا آرکسٹرا اپنی تیاریاں کر رہا ہے۔ نوشاد علی صاحب "شبِ غزل" کے صدر ہیں۔ زیدی صاحب کی درخواست پر وہ مختصر سی صدارتی تقریر میں سیماب اکاڈمی اور علّامہ سیماب سے متعلق اپنے جذبات و خیالات کا اظہار کر رہے ہیں۔ اُنھوں نے سیماب کے کچھ اشعار بھی سُنائے ہیں۔ اور پھر محمد رفیع صاحب سے "شبِ غزل" پروگرام کے افتتاح کی درخواست کی ہے۔ محمد رفیع اُس میز کے پاس کھڑے ہو گئے ہیں، جس پر اُن کا ہارمونیم رکھا ہے اور مائک لگے ہوئے ہیں۔ وہ گانے کی تیاری میں کھوئے ہوئے ہیں۔ سیّد محمد زیدی اُن سے دریافت کر رہے ہیں۔ آپ "سیماب کی کون سی غزل سنائیں گے"؟

"شبنم بہ جامِ بر شیشے پہ، پیمانے پہ کیا گذری"

"اس کی دُھن آپ ہی نے بنائی ہے۔؟"
"جی نہیں نوشاد صاحب نے بنائی ہے۔"

رفیع صاحب اپنی مخصوص گائیکی کی اعلا روایات کے ساتھ غزل گا رہے ہیں۔ یہ غزل سیماب نے پاکستان میں کہی تھی۔ غزل کا پس منظر اور رفیع صاحب کی باٹ دار مگر پُرسوز آواز! سامعین تڑپ تڑپ اُٹھے ہیں۔

اِس غزل کے بعد سیّد محمد زیدی اور رفیع صاحب کے درمیان پھر وہی مکالمہ ہو رہا ہے۔ اب وہ اپنی ہی دُھن میں بنائی ہوئی سیماب کی دوسری غزل — "کہانی میری رُودادِ جہاں معلوم ہوتی ہے" سنا رہے ہیں۔

محمد رفیع کے بعد اسٹیج کا منظر تبدیل کر دیا گیا ہے۔ اب فرشی نشست ہے۔ نوشاد صاحب، رفیع صاحب اور اعجاز صاحب نیچے صوفے پر آ گئے ہیں۔ سیّد محمد زیدی بھی اسٹیج سے اُتر آئے ہیں اور خواہش ظاہر کی ہے کہ کوئی اور صاحب شبِ غزل کو کنڈکٹ کریں۔ قُرعۂ فال اُسی نوجوان کے نام پڑتا ہے جو آج سُوٹ بُوٹ میں ذرا زیادہ بن ٹھن کر آیا ہے۔ لیکن اِس سے جھجک دُور ہوتی ہے، بلکہ کچھ اور شدید ہو گئی ہے۔ وہ بڑی مشکل سے خود کو آمادہ کر کے اسٹیج پر پہنچتا ہے اور "شبِ غزل" کے دوسرے حصّے کے آغاز کا اعلان کرتا ہے۔ سب سے پہلے کس فنکار دعوتِ غزل سرائی دی جائے؟ اِس کے لئے وہ راجندر مہتہ اور افتخار امام سے مشورہ کر رہا ہے۔ مشہور گلوکار اور قوّال اختر آزاد کو کسی دوسرے پروگرام میں جانا ہے۔ اُن کے اصرار پر وہ اُن ہی کے نام کا اعلان کر دیتا ہے۔ اختر آزاد نے سیماب کی مشہور غزل

طولِ رہِ حیات سے گھبرا رہا ہوں میں
گھبرا رہا ہوں اور چلا جا رہا ہوں میں

گانا شروع کی ہے۔ مگر مائک رنگ میں بھنگ ڈال رہا ہے۔ ایک فنکار کے احساسات مجروح ہو رہے ہیں اور سامعین بدمزہ۔ کچھ دیر بعد جب مائک قابو میں آیا ہے تو دھیمے دھیمے سُروں میں اُن کی آواز کا رس کانوں میں گھلنے لگا ہے۔ سیماب کی غزل کے بعد اختر آزاد نے شاہد کبیر کی غزل چھیڑ دی ہے۔ محفل میں گرمی آتی جا رہی ہے۔ طبلے کی گمک کے ساتھ نغمے کی لہریں دیواروں سے ٹکرا کر ہواؤں میں تحلیل ہو رہی ہیں۔

اختر آزاد کے بعد اُس نوجوان نے نیلم ساہنی کا نام پُکارا ہے۔ سامعین نیلم اور اُس کی خوبصورت غزل سرائی سے واقف ہیں۔ اس لئے مجمع میں ایک ہلچل سی پیدا ہو گئی ہے۔ تیکھے نقوش والی حسین نیلم ساہنی کھنکتی ہوئی آواز میں عمرِ رفتہ کو آواز دینے پر مجبور کر رہی ہے۔

دلِ آفت زدہ کا مُدعا کیا   شکستہ ساز کیا اُس کی صدا کیا

سیماب کی غزل، نیلم ساہنی کی لہراتی ہوئی آواز اور اُس کی تانوں سے صاف و شفاف پانی ٹکنیک کا احاطہ گُونج رہا ہے۔ فضاؤں میں جیسے رنگ، رس اور نغمہ گھُل گیا ہو۔

اُس غیرتِ ناہید کی ہر تان ہے دیپک
شعلہ سا لپک جائے ہے، آواز تو دیکھو

نیلم ساہنی نے دوسری غزل شمیم جے پوری کی سُنائی ہے۔ جیسے ہی نیلم کی آواز کا جادو تھما ہے، بائیں جانب کے نیم اندھیرے، نیم اُجالے سے اناؤنسر مسحور سا آگے بڑھ کر جے پور والے گووند پرساد جی کو آواز دیتا ہے۔ گووند پرساد نے سیماب کی قدرے مشکل غزل

سرگشتہ و خرابِ بہار و خزاں رہے
برسوں ہم آشیاں میں بھی بے آشیاں رہے

سُنانا شروع کی ہے۔ اُن کے منجھے ہوئے گلے اور الفاظ کی خوبصورت ادائیگی نے غزل کے اثر کو دوبالا کر دیا ہے۔ خوب جمے ہیں گووند پرساد جی۔ اُن کے بعد اناؤنسر نے راجندر مہتہ اور نینا مہتہ (میاں بیوی کا جوڑا)، جیسے مشہور گلوکاروں کو پُکارا ہے۔ اِن دونوں نے مل کر دوگانے کی طرز پر غزلیں گانے کی ایک طرح ڈالی ہے۔ شبِ غزل پروگرام کو کامیاب بنانے میں راجندر مہتہ کا بڑا حصّہ ہے۔ وہ بڑے ہنس مکھ، اعلیٰ تعلیم یافتہ مہذب انسان ہیں۔ میاں بیوی کا یہ جوڑا تالیوں کی گُونج میں اسٹیج پر آیا ہے۔ راجندر مہتہ کو سیماب کے ابتدائی دَور کی ایک غزل بہت پسند ہے ؎

یہ کس نے شاخِ گُل لاکر قریبِ آشیاں رکھ دی
کہ میں نے شوقِ گُل بوسی میں کانٹوں پہ زباں رکھ دی

اُنھوں نے یہی غزل چھیڑ دی ہے۔ نینا مہتہ نے آواز میں آواز ملانا شروع کر دی ہے۔ دونوں مدھم سُروں میں گا رہے ہیں، لیکن سماں بندھ رہا ہے — سیماب کی غزل کے بعد دونوں نے کیفی اعظمی کی نظم پیش کی ہے۔ کیفی صاحب موجود ہیں۔ اِن گلوکاروں نے جھولیاں بھر کر داد لی ہے۔

اب نوجوان اناؤنسر بڑے اہتمام سے موسیقار رویندر جین کا نام پُکار رہا ہے۔ نابینا رویندر جین، افتخار امام اور دوسروں کی مدد سے اسٹیج پر آئے ہیں اور ہارمونیم سنبھال کر بیٹھ گئے ہیں۔ افتخار امام کو اپنے پاس بٹھا لیا ہے۔ اُنھیں دیکھ کر بنگال کے مشہور نابینا گلوکار کے۔ سی۔ ڈے کی یاد آ رہی ہے۔ باطن کی آنکھیں تو فن کو اور بھی جِلا بخش دیتی ہیں! مجمع نے پہلو بدلا ہے۔ لوگ سنبھل کر بیٹھ گئے ہیں اور جین سیماب کی وہ غزل چھیڑ رہے ہیں

جس کا سطحِ آبِ زر سے نکھرنے کے قابل ہے عمر

محبت میں اک ایسا وقت بھی آتا ہے انساں پر
ستاروں کی چمک سے چوٹ لگتی ہے رگِ جاں پر

رویندر سہین کی آواز میں بڑی جھنکار ہے اور آلاپ میں دل کو کھینچ لینے والی قوت۔ بہت پسند کئے گئے ہیں وہ ــــ

اب نوجوان نے انیسہ صابری کو آواز دی ہے۔ یہ بھی اچھا گاتی ہیں۔ مگر انھوں نے سیماب کا کلام پیش نہیں کیا ہے۔ غالباً یہ پروگرام میں شامل نہ تھیں۔ شبِ غزل کا آخری فن کار سعادت بن اشرف ہے۔ ایک دبلا پتلا نازک سا نوجوان آنچل لہراتے بے پروائی سے آکر اسٹیج پر بیٹھ گیا ہے اور دھیرے دھیرے سیماب کی غزل

خود اُٹھ کے تیرے ہاتھ گریباں میں آگئے
شاید قدم جنوں کے گلستاں میں آگئے

شروع کردی ہے۔ اُس کے گانے میں سلیقہ ہے۔ آواز میں سُریلا پن۔ اُس نے اپنے فن کی مناسب داد حاصل کی ہے۔

اناؤنسر "شبِ غزل" کے اختتام کا اعلان کر رہا ہے، ساتھ ہی سب کا شکریہ بھی ادا کر رہا ہے۔ لیکن اُس کی آواز سے اب کسے دلچسپی ہے؟ سب کُرسیاں چھوڑ کر اُٹھ رہے ہیں۔ رات کا ایک بج چکا ہے۔ نہ رات ڈھل رہی ہے اور نہ شبِ غزل میں شریک ہونے والے لوگ۔ جن لوگوں نے غزلیں ٹیپ کی ہیں وہ جاتے جاتے اپنے ٹیپ ریکارڈ بجا رہے ہیں۔ سارے احاطے میں مختلف فنکاروں کی آوازیں اب بھی گونج رہی ہیں۔ لوگ آہستہ آہستہ منتشر ہوتے جا رہے ہیں۔

اب روشنیوں، کرسیوں اور پردوں کے بیچ صرف منتظمین اور اُن کے ساتھ ہفتوں کی تھکن اور دو دن کی بوڑھی مسرت رہ گئی ہے!!

○○

بقیہ: عورتوں کا تاجر صفحہ ۶۹

دوسرے دن لالہ مر گیا۔ جب اُسے نہلایا جانے لگا تو لوگوں نے دیکھا کہ اُس کے بائیں ہاتھ کی مُٹھی بھینچی ہوئی ہے۔

"اچھی طرح نہلا چاچا کو" ایک آدمی نے لالہ کے بھتیجے سے کہا۔ وہ اچھی طرح ہاتھ پھیرنے لگا۔ بائیں ہاتھ کی مُٹھی کھولنے پر کھلتی نہیں تھی۔ آخر بڑی دِقت سے مُٹھی کھلی تو اُس میں سے سونے کی چمکتی انگوٹھی نیچے گر پڑی۔

○○

پرنٹر پبلشر مالک اعجاز صدیقی نے یونیورسل فائن آرٹس لیتھو پریس ۲۳، فیمعذ جی اسٹریٹ ٹھاکر دوار بمبئی ۲ میں چھپوا کر دفتر سے شائع کیا

[illegible]
بانی: علامہ سیماب اکبرآبادی
اردو کا سینتالیس سالہ علمی ادبی اور تہذیبی ماہنامہ

شاعر
بمبئی

مدیر اعلیٰ
اعجاز صدیقی

مدیر معاون
یونس اگاسکر

ادارۂ تحریر و مشاورت
کرشن چندر
ڈاکٹر محمد حسن
ڈاکٹر ظ انصاری
آغا رشید مرزا

جلد ۴۷
شمارہ ۶-۷
سنہ ۱۹۷۶ء

مہتمم
...ان صدیقی

فون نمبر
۳۵۹۹۰۴

فی پرچہ
دو روپے پچیس پیسے

بدل اشتراک
[illegible]

ترسیل زر کا پتا
ماہنامہ شاعر قصر الادب بمبئی ۸
خط و کتابت کا پتا
ماہنامہ شاعر مکتبہ قصر الادب نمبر [illegible]
[illegible]

قوم پھر ہمت سے
آگے بڑھنے لگی ہے - 76-1975ء

بجلی کی پیداوار میں اضافہ

- 7,97,640 لاکھ یونٹ بجلی پیدا کی گئی۔ پہلے کبھی اِتنی بجلی تیار نہیں ہوئی۔ ایک دن میں 2,600 لاکھ بجلی تیار کرنے کا نیا ریکارڈ۔
- 25 نئے بجلی گھروں میں 1,800 میگا واٹ بجلی تیار کی گئی۔ اِن میں سے 20 بجلی گھروں میں ستمبر 1975ء اور مارچ 1976ء کے درمیانی عرصے میں بجلی تیار ہوئی۔
- اِس سال مزید 20,50,000 ایکڑ رقبۂ زمین کے لیے سینچائی کی سہولتیں میسّر آنے کی توقع ہے۔
- 6,356 دیہات میں بجلی مہیا کی گئی جس سے بجلی والے دیہات کی گنتی 1,74,079 ہو گئی - 1,40,000 پمپ سیٹ چالو کیے گئے۔

WATAN/DSJU/1267-D
بزنس پبلشر مالک اجارہ

ترتیب

گوشۂ صالحہ عابد حسین

مقالات

نظمیں

طنز و مزاح

کہانیاں

رپورتاژ

غزلیں

تاریخ

تصویر سرورق
صالحہ عابد حسین

ضمیمہ

ریاستی اُردو اکاڈمیوں سے

اُردو کے علمی و ادبی ماہناموں کی اجتماعی درخواست!

ادب اور شاعری کی ترسیل و ترویج میں ادبی ماہناموں کی جتنی اہمیت ہے، وہ کسی سے ڈھکی چھپی نہیں ہے۔ "نقوش" "نیا دور" "نگار" "ہمایوں" "ادبی دنیا" "شاہکار" "عالمگیر" [illegible] "ساقی" "ادب لطیف" وغیرہ نے اپنے دور میں جو تازہ بہ تازہ شہکار نظم و نثر تخلیقات پیش کیں، جتنی بڑی تعداد میں قابل ذکر ادیب، نقاد، محقق اور شاعر پیدا کیے، علمی و ادبی مباحث کو اپنے صفحات میں جگہ دے کر علم و فن کو جتنا آگے بڑھایا اور شعر و ادب کی نئی تحریکات، نئے نئے رجحانات کے فروغ میں جو خدمات کیں اُس سے کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا۔ سطور بالا میں صرف چند پرانے ادبی ماہناموں کے نام لئے گئے ہیں۔ گزشتہ پچاس ساٹھ سال میں اُردو کے سیکڑوں ادبی ماہنامے نکلے اور آج بھی بہت سے قابل قدر ماہنامے ہندوستان اور پاکستان سے نکل رہے ہیں۔

ادبی ماہنامے قلم کاروں کو اکساتے اور انہیں دعوت فکر دیتے ہیں، نئے نئے موضوعات پر سوچنے اور لکھنے پر ابھارتے ہیں، اپنے صفحات میں متنوع نظم و نثر تخلیقات پیش کر کے قارئین کے ذوقِ مطالعۂ ادب کو تازہ اور بیدار رکھنے کے علاوہ قلم کاروں میں بھی خوب سے خوب تر لکھنے کا جذبہ پیدا کرتے ہیں۔ اگر ادبی ماہنامے نہ ہوتے تو نہ شعر و ادب کو اتنا فروغ حاصل ہوتا اور نہ ادیبوں اور شاعروں کی اتنی تشہیر ہوتی۔ نہ ادیبوں اور شاعروں میں لکھنے کی اتنی تحریک پیدا ہوتی اور نہ اُردو کے اتنے بہت سے مشہور و معروف قلم کار پیدا ہوتے۔ یہ اُردو زبان و ادب پر ادبی ماہناموں کا احسانِ عظیم ہے۔

جس دور میں ادبی ماہنامے نہ تھے اُس دور کا قیاس کیجئے۔ برسوں میں کسی ادیب یا شاعر کی کوئی کتاب شائع ہوتی تھی تو اُس سے گنے چنے لوگ مستفید ہو پاتے تھے۔ ادبی ماہنامے تو ہر ماہ اِس کا موقع فراہم کرتے ہیں۔ چونکہ تعداد میں بھی زیادہ چھپتے ہیں اس لئے کسی بھی کتاب سے زیادہ پڑھے جاتے ہیں۔ ایک رسالہ دس بیس لوگوں کی نظروں سے گزرتا ہے۔ اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کے طلباء کتابوں سے زیادہ ادبی رسائل سے فائدہ اُٹھاتے ہیں۔

تقسیم کے بعد ہندوستان میں تو معیاری ادبی ماہناموں کی تعداد گھٹتے گھٹتے حد درجہ کم رہ گئی ہے۔ جو نکل رہے ہیں وہ (سرکاری ماہناموں کو چھوڑ کر) وہ بھی سخت مالی مشکلات میں مبتلا ہیں۔ نہ یہ پابندی سے نکل رہے ہیں اور نہ اپنے دور کے مطابق ان کا انداز پرکشش ہے۔ مختلف وجوہ کی بنا پر ادبی ماہناموں کو [illegible] کاغذ بھی مہنگا ہوتا جا رہا ہے۔ ان کی خارجی کوششیں اور پیہم درخواستیں بھی بے اثر ثابت ہو رہی ہیں (پاکستان کے ادبی ماہناموں کی حالت کافی اچھی ہے)

سوال یہ ہے کہ اگر ہندوستان میں چند معیاری ادبی و علمی ماہناموں نے بھی دم توڑ دیا تو نتیجہ کیا ہوگا؟؟ اُردو کے دیگر اہم مسائل سے کہیں زیادہ اہم مسئلہ ان ادبی ماہناموں کا ہے۔ روزنامے اور ہفت روزہ اخبارات تو اپنے اخراجات اشتہارات اور فروخت سے پورے کر لیتے ہیں لیکن ماہنامے اپنے روز بروز بڑھتے اخراجات کس طرح پورے کریں؟ کتابت و طباعت اور کاغذ کے اخراجات سے ہٹ کر ماہناموں کے بالائی اور ان کے پوسٹیج کے اخراجات بھی اخباروں سے کہیں زیادہ ہوتے ہیں لیکن اپنی افادیت کے اعتبار سے اُردو کے تمام اشاعتی کاموں میں ادبی ماہناموں کی اہمیت بہت ہی زیادہ ہے۔

ملک کی چار ریاستوں اُتر پردیش، بہار، مہاراشٹر اور آندھرا پردیش میں مستحکم بنیادوں پر اُردو اکاڈمیاں قائم ہیں جن کے فرائض و مقاصد میں اُردو تعلیم کے فروغ، ادیبوں کی اعانت، اُن کے مسودات کی طباعت کے لئے جزوی مدد، تازہ مطبوعات پر انعامات اور ریاستی انجمنوں کی مالی امداد کو خصوصی اہمیت حاصل ہے لیکن معیاری ادبی ماہناموں کی امداد و اعانت کے لئے جو اُردو کی ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتے ہیں، اُردو اکاڈمیوں کے لائحۂ عمل میں کچھ بھی نہیں ہے۔

<u>اُردو کے چند گنے چنے معیاری ادبی ماہناموں کی ریاستی اکاڈمیوں سے اجتماعی درخواست ہے کہ:—</u>

وہ مختصر طور پر معیاری ادبی ماہناموں کو زندہ رکھنے اور انہیں فروغ دینے کے لئے ہر سال اپنے بجٹ میں گنجائش نکالیں [illegible] پر غور کریں۔ بجٹ ۱۹۸۶ء سے اُن کی بھی مالی امداد و اعانت کی جائے۔ ان اکاڈمیوں کی مجلسِ انتظامیہ میں [illegible] ہی شامل ہیں۔ یہ اُردو کے معیاری ادبی ماہناموں کی ضرورت و اہمیت اور ان کی مشکلات سے بخوبی واقف ہیں [illegible] بجٹ میں ادبی ماہناموں کی سالانہ امداد و اعانت کے لئے کچھ رقم منظور کرا سکتے ہیں۔ اُردو کے نہایت معیاری، معتبر اور اچھے ماہنامے چند ہی ہیں [illegible]

[illegible]

شاعر۔ بمبئی

تخزانہ

غزل

(۱-۷) کا دامن

سفر رات ہوا، شفق کا سفینہ، ہُوا شام کی آنکھ سے دُور سُورج
مگر دل کی تاریکیوں میں سما کر، مجھے کر گیا اور بے نُور سُورج

مجھے وقت کا کوئی اندھا نجومی، لکیریں مرے ہاتھ کی دیکھ کر کہہ گیا
کہ میرے مقدر میں لکھا نہیں تھا، تری بادشاہت کا مغرور سُورج

دیارِ حرم سے حریمِ سحر تک، کوئی بھید سمجھا نہ شہرِ ہوس کا
گناہوں کے تاریک پردے میں ہر شب برہنہ ہوئے کتنے مجبور سُورج

سُلگتی ہوئی دھوپ کی وادیوں میں چلو ہم بھی دیکھیں طلسمی تماشے
کہ تلوار کی دھار پر چل رہا ہے بڑی بے نیازی سے مغرور سُورج

ہزاروں ستاروں کی سوغات لے کر جو نکلا تھا صدیوں کے لمبے سفر سے
تو دیکھا کہ سویا پڑا ہے اکیلا مرے سرد بستر پہ بے نُور سُورج

تماشا اگر جھوٹ نکلا اچانک اندھیروں کے مکروہ زنداں سے لیکن
حسینوں کی عدالت میں جا کر کہاں منہ چھپائے گا مغرور سُورج

یہ کیسا پُراسرار اندھا کنواں ہے، زمانہ ہے چُپ، زندگی بے صدا ہے
وہیں چاندنی آبرو کھو رہی ہے، جہاں گھر سے رخصت ہے پُر نُور سُورج

غزل ہو گئی اور بھی خوبصورت، تخیل کے [illegible]
[illegible] شام [illegible] سُورج

[illegible] نے [illegible]
[illegible]

شاعر: [illegible]



محترمہ صالحہ عابد حسین

صالحہ عابد حسین

صغرا مہدی
جامعہ نگر۔ نئی دہلی - ۲۵

موزوں قد، کھلتا ہوا گندمی رنگ، خوبصورت ناک اور دہن، ذہین آنکھیں، کھچڑی بال، آنکھوں پر عینک، کبھی ساڑی، کبھی غرارے میں ملبوس، پلنگ پر آڑی ترچھی لیٹی کھانستی ہوئی، کبھی لان میں ٹہلتی ہوئی، کبھی ہاتھ میں جھاڑن لئے صفائی کرتی اور کراتی ہوئی، کبھی پلنگ پر دھوپ میں بیٹھی لکھتی ہوئی، کبھی باورچی خانے میں کھانا پکاتی ——— یہ ہیں صالحہ عابد حسین۔

ان کی زندگی دکھ اور سکھ کی دھوپ اور چھاؤں میں گزری ہے۔ لیکن دکھوں کی کڑی دھوپ میں کبھی انہوں نے ہمت نہیں ہاری، ہراساں نہیں ہوئیں، اس کی تمازت کو خاموشی اور صبر سے جھیلا، دل میں سکھ کی امید رکھی۔ وہ اپنی محرومیوں کا ذکر دوسروں کے سامنے کبھی نہیں کرتیں، اس محرومی کا بھی نہیں جس کو وہ اپنی زندگی کی سب سے بڑی محرومی سمجھتی ہیں جس سے لوگوں کو خیال ہوتا ہے کہ انہیں اس کا کوئی خاص احساس نہیں۔ لیکن صالحہ یہ سمجھتی ہیں کہ غم اپنی ذاتی ملکیت ہے، اسے دوسروں میں کیوں بانٹا جائے۔ زندگی اور حالات سے سمجھوتہ کرنے کی ان میں زبردست صلاحیت ہے۔ جیون کی راہ میں جو کٹھنائیاں آئیں ان کو خاموشی سے برداشت کرنے کی قائل ہیں لیکن کھٹمل والا پلنگ، مچھر والا کمرہ، چھپکلی اور چمگادڑ کو وہ ایک لمحے کو برداشت نہیں کر سکتیں۔ اور اس پر ہائے واویلا مچانے میں انہیں کوئی پس و پیش نہیں ہوتا ہے۔

نوعمری سے لے کر اب تک صالحہ عابد حسین کو طرح طرح کی بیماریوں سے سابقہ رہا ہے لیکن یہ انہیں خاطر میں کم ہی لاتی ہیں، جب بھی موقع ملتا ہے بیماری کو قطعاً نظر انداز کر کے زندگی کے کاروبار میں لگ جاتی ہیں اس وقت تک جب تک کہ کوئی سخت بیماری انہیں بالکل ہی بے بس نہ کر دے۔ اس سلسلے میں یہ بات بڑی عجیب ہے کہ بیماری کی حالت میں ان کی تیز مزاجی شاعرانہ بے چینی غائب ہو جاتی ہے۔ یہ جتنی زیادہ بیمار ہوتی ہیں اتنی ہی خوش مزاج بھی۔ بیماری کے زمانہ میں وہ خاص طور سے گھر والوں کے کھانے پینے، آرام اور کام کا خیال و فکر رکھتی ہیں، ان سے بار بار ہمدردی کرتی ہیں کہ وہ کیسی مصیبت میں مبتلا ہیں، تحفے تحائف منگا کر، کبھی اپنی چیزوں میں سے نکال کر دیتی ہیں، غرض بیماری میں وہ اپنے بجائے ہمدردی اور دلداری کا مستحق تیمارداروں کو سمجھتی ہیں۔ راتوں کو جاگنا۔ اور صبح کو دوسروں کی نیند پر کبھی رشک کرنا کبھی اس کی شکایت کرنا ان کی عادت ہے، اس کی بہت سی وجوہات ہیں، ان میں ایک چوروں کا ڈر بھی ہے۔ یہاں آٹھ دفعہ چوری ہو چکی ہے، اس کا اثر ان کے شوہر ڈاکٹر عابد حسین پر تو یہ ہوا ہے کہ اب چوری کا کوئی کھٹکا ہی نہیں رہا ہے۔ مگر صالحہ عابد حسین اپنے دل سے چوروں کا ڈر کسی طرح نہیں نکال سکی ہیں۔ دوسرے تیسرے ہفتے چوروں کی چاپ سننا اور سائے دیواروں پر دیکھنا ان کا معمول ہے۔

انہیں مالی فراغت زندگی میں کم ہی نصیب ہوئی ہے مگر رکھ رکھاؤ ایسا ہے کہ باہر کے لوگ تو خیر ——— خود کے عزیز اور دوست بھی یہ سمجھتے ہیں کہ اچھے مالدار لوگ ہیں۔ ارے آپ کو پیسے کی کیا کمی ہے، کیونکہ صالحہ عابد حسین کو "غربت" کا رونا بالکل پسند نہیں ہے۔ ضرورت کے وقت وہ لوگوں کے لئے کہیں نہ کہیں سے روپے فراہم کر دیتی ہیں، قرض بھی دیتی ہیں ——— ہم انہیں بہت سمجھاتے ہیں کہ مدد کی یہ عادتیں چھوڑ دیں، کسی اور خیال سے نہیں تو یہی سمجھ کر کہ خود ان کو کتنی پریشانی، تنگدستی و تہی دستی کی ذلت اٹھانی پڑتی ہے۔ ان میں یہ بھی ایک ادیبانہ شان ہے۔ لیکن تو یہ کہئے وہ تو اپنی عادتیں کیا چھوڑتیں ہمیں تو یہ ہوا ہے کہ ان کی صحبت کی وجہ سے ہم جیسے مفلس اور

تھی وہ ست[illegible] لوگوں کو یہ خیال ہو گیا ہے کہ ہمیں پیسے کی کیا کمی ہے۔

وہ قرض لینے کے خلاف ہیں، دینے کے نہیں۔ لیکن جو لوگ قرض لیتے ہیں اکثر لوٹاتے نہیں ہیں۔ پہلے شرمندہ ہو کر نظریں بچاتے ہیں، ملنا کم کر دیتے ہیں اور پھر خفا ہو جاتے ہیں اور یہ اُن کے ان رویوں کی شرمندہ ہو کر توجیہیں کرتی ہیں اور ان کی بے چارگی پر رحم کھاتی ہیں۔

صالحہ عابد حسین ضرورت مندوں کی مدد اپنے ضمیر کو مطمئن کرنے، لوگوں کو مرعوب کرنے یا صرف خدا کے حکم کی تعمیل کرنے کیلئے نہیں کرتی ہیں۔ بلکہ وہ یہ سمجھتی ہیں کہ اُن کے پاس جو کچھ ہے ان پر ان ضرورتمندوں کا برابر کا حق ہے، جو اُنہیں ملنا ہی چاہیئے۔ جن لوگوں کی وہ مدد کرتی ہیں، اُن نوجوان لڑکے لڑکیوں کی تعداد بہت زیادہ ہوتی ہے۔ انہیں نوجوانوں سے بہت دلچسپی ہے۔ ان سے ان کی تعلیم اور کیریئر کے متعلق مشورے دیتی ہیں۔ اور اس میں جس طرح کی مدد کی ضرورت ہوتی ہے، کرتی ہیں۔ اس میں اس قسم کے ضرورت مند بھی شامل ہو جاتے ہیں، جیسے ایک معقول مرد اپنی بیوی کے ساتھ ٹیکسی سے اترے، اور سفر میں کچھ ناگہانی مصیبتوں کا حال بیان کر کے ڈاکٹر عابد حسین سے کچھ رقم قرض کے طور پر مانگی۔ ڈاکٹر صاحب نے فوراً دیدی، اس یقین کے ساتھ کہ آدمی شریف اور مصیبت زدہ ہیں، قرض ضرور واپس کر دیں گے۔ بیگم صاحب بالکل اس سے متفق نہیں تھیں۔ آپس میں دونوں میں خاصی بحث بھی ہوئی۔ ہفتہ بھر بعد پھر ان کا ایک خط آیا کہ اور کچھ پیسے چاہیں۔ اتفاق سے ڈاکٹر عابد حسین صاحب گھر پر موجود نہیں تھے۔ ہم نے مشورہ دیا کہ اس خط کو گول کر دیا جائے۔ مگر تھوڑی دیر بعد دیکھا کہ صالحہ عابد حسین جلدی جلدی ایک منی آرڈر لکھ رہی ہیں اور کہتی جاتی ہیں "نہ جانے بے چارہ کس مصیبت میں ہوگا۔ تم لوگ تو ہر شخص سے بدگمان ہو جاتی ہو۔ ایسا کسی کو شوق نہیں ہوتا ہے، دوسروں کے سامنے ہاتھ پھیلانے کا"۔ سالوں گزر گئے ہیں مگر وہ قرض ادا نہیں ہوا ہے۔ جب اس کا ذکر ہوتا ہے تو یہ دونوں حضرات ایک دوسرے سے کہتے "آپ نے دھوکا کھایا" ۔ وہ کہتی ہیں پہلے تو آپ نے دھوکا کھایا تھا ۔ ہم کہتے ہیں دونوں نے دھوکا کھایا اور آئندہ بھی کھاتے رہیں گے۔

صاف گوئی، راست گوئی اور انصاف پسندی صالحہ عابد حسین کی شخصیت کی نمایاں خصوصیات ہیں۔ صاف گوئی اتنی کہ جیسے مجھ دار شاعر بھی [illegible] باتیں کہنے [illegible] منہ پر کہہ سکتے ہیں، راست گوئی میں [illegible] مصلحت [illegible] کی کچھ قائل نہیں۔ انصاف پسندی اتنی کہ کبھی کبھی بعض ریاکار لوگوں کے دھوکے میں آ کر دوسروں سے ناانصافی بھی کر جاتی ہیں۔ مگر احساس ہونے [illegible] کبھی کبھی ہوتی ہیں اور پشیماں بھی، مگر اس کے ذکر سے بہت گھبراتی اور چڑتی ہیں۔

وہ بنیادی طور پر ایک مذہبی انسان ہیں۔ مذہب کا مطالعہ انہوں نے بہت گہرائی سے کیا ہے۔ مولانا آزاد کے ترجمہ اور تفسیر کا برابر مطالعہ کرتی رہتی ہیں۔ قرآن پاک کی آیتوں کے حوالے کے لئے آپ اُن سے رجوع کر سکتے ہیں۔ لیکن خوشی کی بات یہ ہے کہ ان میں تنگ نظری اور تعصب نہیں ہے۔ نہ وہ ہر وقت اپنے مذہبی ہونے کا رعب جماتی ہیں۔ عام مذہبی لوگوں کی طرح وہ ظاہری عبادت میں ہر وقت مشغول نہیں رہتی ہیں اور نہ لوگوں پر بے دینی اور کفر کے فتوے بات بات پر صادر کرتی ہیں۔ ہاں جن لوگوں کے بارے میں یہ خیال ہو کہ یہ مذہب کو نہیں مانتے اُن کے منہ سے مذہب کے خلاف ایک لفظ بھی نہیں سن سکتی ہیں۔ مگر وہ لوگ جو مذہب کو مانتے ہیں اُن کی شوخیٔ بیان کو نہ صرف معاف کر دیتی ہیں۔ بلکہ اس سے محظوظ بھی ہوتی ہیں۔ جس سے گھر کے بزرگ بلکہ کٹر مذہبی فرد خفا بھی رہتے ہیں اور حیران بھی۔

گھر کے کاموں میں اُنہیں گھر کی صفائی سے شدید دلچسپی ہے۔ باوجود ان کی اور سب کی انتہائی کوشش کے ان کے معیار کے مطابق صفائی نہیں ہو سکتی ہے۔ اور اس پر وہ اکثر و بیشتر خفا بھی رہتی ہیں [illegible]

صالحہ عابد حسین اور اُن کے شوہر اپنی [illegible] زندگی میں [illegible] مشکل کے کن کن راستوں سے گزرے ہیں، [illegible] مشکلات اور خاندانی ذمہ داریوں کو ان دونوں نے کیسی ہمت، جرأت، خوش مزاجی اور خوشدلی سے اٹھایا ہے۔ یہ ایک لمبی کہانی ہے۔ [illegible] بیان نہیں کر سکتی ہوں۔ شاید پوری طرح جانتی بھی نہیں لیکن یہ اندازہ ضرور کر سکتی ہوں کہ اس راہ میں ان دونوں نے بہت کچھ کھویا تو پایا بھی لیا۔ جو کھویا اُس کا اُنہیں افسوس نہیں ہے۔ جو پایا اُس پر خوش اور مطمئن ہیں۔

یہ اپنے شوہر ڈاکٹر عابد حسین سے بہت مرعوب ہیں۔ اُنہیں آئیڈیلائز کرتی ہیں۔ زندگی میں گھر [illegible]

صالحہ عابد حسین سے ایک ملاقات

ڈاکٹر عنوان چشتی
شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ۔ نئی دہلی - ۲۵

صالحہ عابد حسین اُردو دنیا کی ممتاز قلم کار ہیں۔ اُنہوں نے اپنے تخلیقی سفر کا آغاز افسانوی ادب سے کیا۔ لیکن علمی تنقیدی اور تحقیقی میدان میں بھی امتیاز حاصل کیا۔ وہ اُردو کی بے لوث انتھک ادیبہ ہیں۔ صلہ و ستائش سے بے نیاز ہو کر تقریباً نصف صدی سے اُردو زبان و ادب کی مشاغل میں مصروف ہیں۔ جو سادگی، خلوص اور درد مندی اُن کی شخصیت کا جوہر ہے، وہی اُن کے تخلیقی اور تنقیدی شہ پاروں کا طرۂ امتیاز ہے۔ اُن کی تحریروں میں اسلامی افکار کا حسن، مشترکہ تہذیبی اقدار کی طاقت، سماجی بصیرت اور ذاتی تجربوں کا رنگ شامل ہے۔ یہ وہ خصوصیات ہیں جن سے صالحہ عابد حسین کے فن کا تار و پود تیار ہوا ہے۔ صالحہ باجی کا سادہ و پُرکار ڈرائنگ روم ہے، جس میں جنوب مغرب کی شیشے کی دیواروں سے روشنی چھن چھن کر آ رہی ہے۔ سامنے صوفے پر صالحہ باجی پُروقار انداز میں بیٹھی ہیں۔ اور میں اُن کی شخصیت اور فن کے بعض اہم گوشوں تک رسائی کے لئے پہلا سوال کرتا ہوں۔

خاندانی نام	مصداق فاطمہ
والد کا نام	خواجہ غلام الثقلین
والدہ کا نام	مشتاق فاطمہ
شوہر کا نام	ڈاکٹر سید عابد حسین
مقام پیدائش	پانی پت
تاریخ پیدائش (اصل)	۱۸ اگست ۱۹۱۳ء
(سرٹیفکیٹ میں)	۱۵ ستمبر ۱۹۱۳ء
پہلی مطبوعہ تحریر	یاد نہیں۔
پہلی کہانی (مطبوعہ)	لمبی داڑھی والا بڈھا چپ
پہلا ناول (مطبوعہ)	عذرا
پہلی کتاب (غیر مطبوعہ)	حکومت اتفاق (سنہ ۲۹ء)

س۔ صالحہ باجی آپ کے ذہن و فنکار کو بنانے کے لئے سب سے پہلے یہ جاننا چاہتا ہوں کہ آپ نے کن فنکاروں اور کتابوں کا سب سے زیادہ اثر قبول کیا ہے؟

ج۔ بچپن اور نو عمری میں جو کتابیں میں نے پڑھیں [illegible] کا تھوڑا بہت اثر قبول کیا [illegible] قرآن پاک اور اسلامی تعلیمات کا [illegible] قرآن پاک کو ترجمے کے ساتھ پڑھا [illegible] ہے۔ خاص طور پر مولانا ابوالکلام آزاد کا ترجمان القرآن اور تفسیر سورۂ فاتحہ کا مطالعہ کیا ہے۔ اور بار بار آنحضرت صلعم کی سیرت پاک اور آئمہ معصومین کے سوانح حیات کو پڑھا۔ لیکن میں نے اسلام کا مطالعہ کرنے کے ساتھ ساتھ دوسرے مذاہب سے بھی واقفیت پیدا کرنے کی کوشش کی اور تصوف پر بھی معلومات حاصل کیں جس سے مجھے مختلف مذاہب کی رُوح کو سمجھنے میں مدد ملی۔ اس کا یہ اثر ضرور ہوا کہ میں تعصب، کٹر پن اور تنگ نظری سے دور ہو گئی اور میرے دل میں ہر مذہب کی بنیادی اقدار اور ان کے بانیوں کا احترام پیدا ہو گیا۔ شاید اس کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ میرے خاندان میں بے تعصبی کی مضبوط روایات رہی ہیں۔

س:۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ آپ کے خاندان میں شیعہ سُنی کا کوئی تفرقہ نہیں ہے اور خاندان میں دونوں عقیدوں کو ماننے والے افراد موجود ہیں۔

ج۔ عنوان صاحب، یہ تو آپ کو معلوم ہے کہ مولانا الطاف حسین حالی میرے پر نانا تھے اور وہ سُنی تھے۔ میرے نانا خواجہ اخلاق حسین صاحب بھی سُنی تھے مگر ان دونوں کی بیویاں شیعہ تھیں۔ خاندان میں عام طور پر یہ سمجھوتہ تھا کہ لڑکے باپ کے مذہب پر اور لڑکیاں ماں کے مذہب پر ہوں۔ چنانچہ گھر میں سب لوگ اپنے اپنے عقیدوں پر رہ کر مطمئن اور خوشگوار زندگی گزارتے تھے اور اب بھی گزارتے ہیں۔

س: مذہبی کتابوں کے علاوہ آپ نے کن خاص ادبی کتابوں اور مصنفوں کا مطالعہ کیا اور اثرات قبول کئے؟

ج: یہ تو آپ جانتے ہیں کہ میرا خاندان علمی و ادبی دنیا میں خاص امتیاز رکھتا ہے۔ آنکھ کھولتے ہی گھر میں اچھی لائبریری دیکھی۔ خواتین کے ناولوں سے لے کر نذیر احمد کے ناولوں تک اور شرر اور سرشار سے لے کر پریم چند تک سبھی کو پڑھا۔ مگر شاید گہرا اثر پریم چند ہی کا قبول کیا۔ مولانا ابوالکلام آزاد، نذیر احمد، حالی اور شبلی کو بطورِ خاص پڑھا۔ شاعروں میں انیس، غالب، حالی اور اقبال میرے محبوب شاعر ہیں۔ انیس اور حالی پر تو میری مستقل تصانیف ہیں۔ اردو کے مصنفین کے علاوہ ٹیگور اور سرت چندر کے جتنے ناول اردو یا انگریزی کے ترجموں کے ذریعے پڑھ سکتی تھی، پڑھے ہیں ان سے بہت متاثر ہوں۔ میرا خیال ہے کہ بنگالیوں کو کہانی کہنے کا جیسا سلیقہ ہے شاید اور کسی کو نہیں۔ میں نے اردو کے کلاسیکی ادب کے علاوہ انگریزی کے کلاسیکی ناول بھی پڑھے ہیں۔ ترجمہ کے ذریعے گورکی اور ٹالسٹائی کو بھی پڑھا۔ فرانسیسی ناول بھی پڑھے۔ ابسن، برنارڈشا اور دوسرے انگلش ڈراما نگاروں کے ڈرامے بھی شوق سے پڑھتی ہوں۔ مگر میں یہاں یہ بات واضح طور پر کہنا چاہتی ہوں کہ میں نے یوں تو اردو کے بیشتر مشہور شعرا کو بغور مطالعہ کیا ہے اور جیسا کہ میں نے کہا بعض کا گہری نظر سے مطالعہ کیا ہے۔ مگر میں نے شعوری طور پر کسی ادیب کی تقلید نہیں کی۔ میرا مطالعہ میری شخصیت کا جزو بنتا رہا۔ اس کا اثر کہاں تک میری تحریروں میں جھلکتا ہے اس کی تلاش اور نشاندہی میرے نقاد کا کام ہے۔

س: آپ کی ذاتی یعنی غیر ادبی دلچسپیاں کیا ہیں؟ آپ لکھنے پڑھنے کے علاوہ اپنا وقت کس طرح گذارتی ہیں؟

ج: ابھی کیا کہیں کہتے تو مناسب تھا کہ عمر اور صحت کی اس منزل میں جب رختِ سفر تقریباً ہر وقت بندھا رہتا ہے، دلچسپیاں کبھی محدود ہو گئی ہیں یعنی گھر کی ذمہ داریاں، اپنے بچوں کی تعلیم یا نوکری یا شادی کی فکر یا اپنے شوہر (ڈاکٹر سید عابد حسین) کی خدمت و رفاقت کے علاوہ اب تو بس لکھنے پڑھنے کا شوق ہی رہ گیا ہے، یا مذہبی مطالعے یا عبادت کا شوق۔ جو بالکل فطری چیز ہے۔ ہاں چند سال پہلے تک بہت سی چیزوں سے دلچسپی رہتی تھی۔ میں نے سینے پرونے، کاڑھنے، بُننے اور مختلف قسم کی دستکاریاں سیکھی تھیں۔ مجھے باغبانی کا بھی شوق رہا ہے۔ اگرچہ دل کی بیماری اور صحت کی خرابی کی وجہ سے اس شوق کو پورا کرنے کے موقعے کم ملے ہیں۔ آپ کو

مطبوعہ کتابوں کی فہرست

ناول

(۱) عذرا
(۲) آتشِ خاموش
(۳) قطرے سے گہر ہونے تک
(۴) راہِ عمل
(۵) یادوں کے چراغ
(۶) اپنی اپنی صلیب
(۷) الجھی ڈور

افسانوں کے مجموعے

(۸) نقشِ اول
(۹) سازِ ہستی
(۱۰) نراس میں آس
(۱۱) توسنگے
(۱۲) درد و درماں (زیرِ اشاعت)

ادبی و تنقیدی کتب

(۱۳) یادگارِ حالی
(۱۴) ذکرِ جمیل
(۱۵) خواتینِ کربلا
(۱۶) ادبی جھلکیاں
(۱۷) انیس سے تعارف
(۱۸) انتخابِ مراثیِ انیس
(۱۹) بات چیت

ڈرامے

(۲۰) زندگی کا کھیل
(۲۱) امتحان
(۲۲) عفت

بچوں اور نوسیکھئے بالغوں کیلئے

(۲۳) سنہری بالوں والے بچوں کا دیس
(۲۴) بہادر سندر (کہانی)
(۲۵) بھولی نند (کہانی)
(۲۶) جادو کا ہرن (کہانی)
(۲۷) سندر چنار (کہانی)
(۲۸) لطائفِ حسین حالی

ترجمے

(۲۹) کثرت میں وحدت (گاندھی جی)
(۳۰) بالچہ
(۳۱) بٹا بانی
(۳۲) ہیم کماری (بچوں کا ناول)
(۳۳) ایک دیس ایک خون

دیگر

(۳۴) پریم اور سیوا کی جیت
(۳۵) ہندی انتخاب مراثیِ انیس معہ فرہنگ
(۳۶) جلنے والوں کی یاد آتی ہے
(۳۷) سلکِ گہر
(۳۸) جہاں کو انیس
(۳۹) بچوں کے انیس
(اپنے سی آرٹی کرکے)

ٹوٹ کے گئے تو جہاں ان کی جھلک آ جاتی ہے۔ میں نے چند [illegible]
ہی سے معصوموں کا درد دیکھا اور محسوس کیا ہے۔ میرے ناول
اور افسانوں میں بہت سی ممتا کی ماری ماؤں کا دکھ آپ کو ملے گا
اکثر میرے معصوم قاری یہ سمجھ لیتے ہیں کہ یہ میری آپ بیتیاں ہیں
[illegible] صاحب، وہ زیادہ تر میری ہی بہنوں کی مجروح حق
کی پکار ہے جو اس منزل سے گزر [illegible] اور فن میں احساسات
وجذبات کا رنگ فنکار کا احساس دل بھرتا ہے جس پر بیتے
ہو کیسے تجھے وہ کیا کر سکتا ہے اس درد عظیم کو۔
بس اس بارے میں اور کچھ نہ کہہ سکوں گی۔

س: میں نے موقع کی نزاکت کو دیکھ کر سوال کا رُخ پھیرتے ہوئے پوچھا
مجھے یہ جاننے کا شوق ہے کہ آپ نے کب لکھنا شروع کیا
ذرا اپنی ابتدائی ادبی زندگی کے بارے میں کچھ بتایئے۔

ج: میں نے بہت کم سنی سے لکھنا شروع کر دیا تھا۔ غالباً ۹ برس کی
ہوں گی جب باقاعدہ لکھنا شروع کر دیا تھا۔ میرے ابتدائی مضامین
"تہذیبِ نسواں" اور "پھول" میں شائع ہوتے تھے مگر میں نے
اپنا پہلا ناول سولہ سال کی عمر میں یعنی ۱۹۳۹ء میں لکھا تھا جس
کا نام "حسنِ اتفاق" تھا مگر وہ ناول ظاہر ہے کہ بہت بچکانہ تھا اس
لئے میں نے کبھی اسے شائع کرانے کا خیال نہیں کیا۔ اس کے
بعد سے مسلسل لکھ رہی ہوں۔ میرا پہلا افسانہ ۱۹۲۸ء میں
"[illegible]" میں شائع ہوا تھا اور پہلا ناول "[illegible]" [illegible]
[illegible] ریڈیو پر ۱۹۳۶ء سے بولنا شروع کر دیا تھا اور تب سے
اب تک سیکڑوں تقریریں، افسانے اور [illegible]
ابتدائی [illegible] تقریری بات چیت کے نام سے شائع ہو گئی ہیں۔

س: آپ نے کن کن موضوعات پر کام کیا ہے اور افسانوی ادب
کے علاوہ کیا لکھا ہے؟

ج: [illegible] صاحب [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible] تصویریں
لی ہیں، مصوری سے مجھے ہمیشہ سے شوق ہے۔ [illegible] نے
[illegible] آٹھ سال تک [illegible] تصویریں
[illegible]
[illegible] کو بہت سی تصویریں
لی ہیں مگر شوق [illegible] بہت محدود۔ اور پھر
آپ جانتی ہیں کہ [illegible] چھپوانا اور پھر لوگوں کی خدمت
میں تحفہ پیش کرنا [illegible] تصویروں کا بھی تھا۔ اس لئے اس
شوق کو چھوڑ دیا [illegible] آٹھ سال تک [illegible]
دعاؤں سے غریب بچوں اور عورتوں وغیرہ کا علاج کرنے کا مرض بھی
لاحق ہو گیا تھا مگر [illegible] اس سے بھی شفا ہو گئی [illegible] ایک
شوق [illegible] اب تک [illegible]
اور [illegible] اپنے ذوق کے مطابق گھر کو سجایا سنوارا
[illegible] اور اب [illegible] اور ہاں
[illegible] مجھے [illegible] کا بہت شوق ہے۔ [illegible]
فلم [illegible] شوق اب تک باقی ہے۔ میرے شوہر [illegible]
[illegible]

س: میں آپ سے ایک نہایت حساس سوال [illegible]
[illegible] کس طرح محسوس کیا ہے اور
[illegible] ہے۔ کیا اس کا کوئی اثر
آپ کے [illegible] پر [illegible] ہے؟

ج: [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

مقبول ہوئی اور کئی یونیورسٹیوں میں اسے پڑھایا جانے لگا۔ اب تک اس کے چار ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ اس کے کئی سال بعد میرے چند مضامین کا مجموعہ "ادبی جھلکیاں" کے نام سے شائع ہوا تھا۔ انہیں بھی آپ ادبی کہیں گے علمی نہیں۔ تین سال پہلے میں نے سیّدین صاحب کی نامکمل خود نوشت "مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زباں میں" کا دوسرا حصہ ذکرِ جمیل کے نام سے لکھا ہے۔ یہ ایک طرح سے سیّدین صاحب کی مختصر سوانح حیات ہے۔ ایک ضخیم کتاب "خواتینِ کربلا کلامِ انیس کے آئینے میں" میری دس بارہ سال کی محنت کا ثمرہ ہے۔ آپ چاہیں اسے علمی کام کہیں یا تنقیدی۔ انیسؔ پر ہی ایک دوسری کتاب "انیسؔ سے تعارف" (تنقیدی مضامین کا مجموعہ) شائع ہوا ہے۔ "جانے والوں کی یاد آتی ہے" میرے اُن مقالوں اور خاکوں کا مجموعہ ہے جو میں نے اپنے بزرگوں، دوستوں اور عزیزوں کی یاد میں لکھے ہیں۔ ہاں ایک کام کئی سال کی محنت سے میں نے ایسا کیا ہے جسے علمی کہہ سکتے ہیں۔ یعنی انیسؔ کے مرثیوں کا انتخاب، معہ حواشی، حوالوں، دیباچے اور مقدمے کے۔ اس کی پہلی جلد مکمل ہے جو زیرِ اشاعت ہے۔ دوسری زیرِ تکمیل ہے۔ ان دونوں جلدوں میں انیسؔ کے ۵۴ بہترین مرثیوں کا انتخاب شامل ہے۔ انیسؔ پر ایک اور کتاب بچوں کے لئے لکھ رہی ہوں اور ہاں یاد آیا مولانا حالیؔ پر بھی نو عمر بچوں اور بچیوں کے لئے نیشنل بک ٹرسٹ کی ایما پر ایک کتاب لکھی ہے۔ ویسے میں نے چھوٹی چھوٹی کتابوں کے انگریزی سے اردو میں ترجمے بھی کئے ہیں۔ ایک کتاب حال ہی میں "مہا کوی انیسؔ" کے نام سے ہندی میں شائع ہوئی ہے۔ اس میں سچ پوچھئے میں نے بہت محنت کی ہے۔ اس کتاب میں وضاحتی نوٹ اور مفصل مقدمہ بھی شامل ہے۔ اس کتاب میں اس بات کا خاص اہتمام کیا گیا ہے کہ ہندی پڑھنے والے بھی انیسؔ کے محاسنِ کلام اور عظمت سے واقف ہو جائیں۔

س: مختصراً آپ نے اپنے علمی تنقیدی اور تحقیقی کاموں کے بارے میں بتا دیا ہے، اب اتنا اور بتا دیجئے کہ آپ کے افسانوی ادب کا کینوس کیا ہے۔؟

ج: عنوان صاحب، میں نے لکھا تو اس سے کہیں زیادہ ہے جو چھپا ہے۔ مگر آپ سے شائع شدہ چیزوں کا ہی ذکر کروں گی۔ اب

شائع بھی

تک میرے سات ناول اور دو افسانوں کے مجموعے (پانچواں زیرِ اشاعت ہے) شائع ہو چکے ہیں۔ تین چار کتابیں کم پڑھے لکھے لوگوں کے لئے شائع ہو چکی ہیں۔ بچوں کے لئے ڈرامے اور کہانیاں بھی لکھی ہیں۔ ان میں دو ناول پانچ کہانیاں اور دو ادبی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ ناولوں میں کوئی ایسا ناول نہیں جو تین چار سال کی مدت سے کم میں لکھا گیا ہو۔ سوائے "اُلجھی ڈور" کے جو مختصر ہے اور دو ماہ کی کاوش کا نتیجہ ہے۔

س: آپ نے اتنا علمی و تخلیقی کام طبیعت کی ناسازی، خانگی و سماجی ذمہ داریوں کے باوجود کس طرح انجام دیا؟

ج: عنوان صاحب یہ سوال تو میں اکثر خود اپنے آپ سے بھی اکثر کرتی ہوں۔ اس کی ایک صاف وجہ تو یہ ہے کہ سارے کام محض چند سال کی محنت کا نتیجہ نہیں بلکہ ۴۰ سال قلم گھسنے کا نتیجہ ہیں۔ آپ ۳۸ سال کہہ لیجئے کہ میرا پہلا افسانوی مجموعہ "نقشِ اوّل" ۱۹۳۹ء میں شائع ہوا تھا۔ پھر اس کی دوسری وجہ یہ ہے کہ میں مسلسل لکھتی رہی ہوں۔ بیماریاں، ذمہ داریاں، پریشانیاں اور غیر ادبی مصروفیتیں ان میں سے کوئی بھی میرے لکھنے پڑھنے کے ذوق کو ختم تو کیا کم کرنے میں بھی کامیاب نہ ہو سکیں۔ وقتی طور پر لکھنے اور پڑھنے کی رفتار سست ضرور ہوئی ہے۔ کبھی کبھی چند دن یا چند ماہ ایسے ضرور آئے ہیں کہ کچھ نہیں لکھ پاتی۔ یہ بہت کرب ناک وقت ہوتا ہے۔ مگر اس وقت کے گزر جانے پر زیادہ جوش کے ساتھ لکھتی ہوں ___ ایک وجہ اور بھی ہے۔ وہ یہ کہ میں بہت تیز لکھتی ہوں۔ اتنا تیز کہ ٹائپ کرنے والے بھی پیچھے رہ سکتے ہیں۔ جو کچھ سوچنے، پلاٹ مرتب کرنے اور کرداروں کے تشکیل کرنے کا عمل ہوتا ہے وہ مہینوں ملکہ مہینوں تک کرتا رہتا ہے جب نہیں لکھتی تو اس عرصے میں یہ تخلیقی یا ذہنی عمل اور زیادہ ہوتا ہے۔ لیکن جب لکھتی ہوں تو الفاظ و خیالات دونوں میرے قلم کے زیرِ نگیں ہوتے ہیں۔ ایک بار میرے شوہر نے (جو بہت سست لکھتے ہیں) میرے نانا خواجہ سجاد حسین (صاحب زادہ خواجہ حالیؔ) سے کچھ شکایت کی [illegible] بہت تیز لکھتی ہیں۔ وہ مسکرائے اور [illegible] اس کا مطلب یہ [illegible]

ہوں۔ اس طرح لکھنے پر میرے شوہر اور [illegible] خواجہ غلام السیدین صاحب
نے اتنا ٹوکا ہے کہ اب میں خود بھی [illegible] ہوں۔
لکھنے کے بعد میں اپنی تحریر کو مختصر کرتی ہوں۔ زبان کی نوک پلک درست
کرتی ہوں۔ تیز لکھنا میری خاندانی خصوصیت بھی ہے۔ میرے والد،
میرے بھائی، میرے کزن عباس ہم سب زود نویسی کے لئے مشہور ہیں۔
اور اگر میں آپ کو یہ بتاؤں کہ مجھے اتنی ساری چیزیں خود ہی نقل
کرنی ہوتی ہیں اور اگر یہ نہ ہوتا تو شاید میں اس سے دُگنا لکھتی۔ تو
آپ کیا کہیں گے؟ شاید شکر کریں۔ میں بھی شکر کرتی ہوں۔ بسیار نویسی
کوئی خوبی تو نہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ کیا لکھا ہے اور اس کا معیار
کیا ہے۔ مجھے مسرت ہے کہ میرے پڑھنے والوں نے ہمیشہ اور نقادوں
اور بزعم خود بہترین ادیبوں کا ذکر نہیں، میری تخلیقات کو سراہا اور
پسند کیا ہے ____ اس کی آخری اور بڑی وجہ یہ ہے کہ لکھنا میری زندگی
ہے، میری روح کی پکار ہے۔ میرے دل کا سکون اور راحت اسی
میں پوشیدہ ہے۔

س: چونکہ آپ نے اپنے تخلیقی عمل کے بارے میں بعض اشارے کر دیئے ہیں
اس لئے کیوں نہ میں اُن خاص کیفیات کے بارے میں پوچھ لوں جن
سے آپ لکھتے وقت دوچار ہوتی ہیں۔

ج: عنوان صاحب، آپ کا سوال بیحد پیچیدہ اور تفصیل طلب ہے۔
تخلیقی عمل سے اگر آپ کی یہ مراد ہے کہ شاعروں کی طرح مجھے "الہام"
کیسے ہوتا ہے، تو جناب "الہام" مجھے نہیں ہوتا۔ زندگی کی حقیقتوں
کو دیکھنے اور بیان کرنے والا اس کا دعویٰ کر بھی نہیں سکتا۔ ہاں یہ ضرور
کہوں گی کہ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی خاص واقعہ نے مجھ پر اثر
ڈالا اور میں نے اس کو فوراً لکھ دیا۔ مگر اکثر یہ ہوتا ہے کہ میرے افسانے
خصوصاً ناول صفحۂ قرطاس پر آنے سے قبل مہینوں یا برسوں میرے
ذہن میں پکتے رہتے ہیں۔ ابتداء میں اس کا ہیولیٰ میرے ذہن میں مبہم
ہوتا ہے پھر آہستہ آہستہ واضح ہوتا جاتا ہے۔ یعنی ابتداء میں میں کسی
چیز کو کچھ شعوری اور کچھ نیم شعوری طور پر محسوس کرتی ہوں۔ اس دوران
سوچنے کا عمل جاری رہتا ہے اور [illegible]
ہیں [illegible] خاص قسم کی تخلیقی [illegible] ہوتی ہے۔ مجھے ناول
لکھتے [illegible]
کو [illegible]

ناول۔ بمبئی

جاتا ہے۔ ناول کا معاملہ ذرا فرصت طلب ہے۔ بہرحال لکھتے وقت
میرے یہاں اس قدر آمد اور روانی ہوتی ہے کہ سوچنے کی ضرورت کم ہی
پڑتی ہے بلکہ گھریلو جھگڑے، قصے، آنے جانے والے یا کوئی اور رکاوٹ
پڑے تو مجھے لگتا ہے کہ کسی نے سامنے پتھر لڑھکا دیا۔

س: کیا آپ اپنے پہلے ڈرافٹ پر نظرِ ثانی کرتی ہیں اور اس میں تبدیلیاں کرتی
ہیں؟ کیا نظرِ ثانی کے وقت مختصر زبان کی تبدیلی ہوتی ہے یا قصے، پلاٹ
اور نقطۂ نظر کی کوئی بنیادی تبدیلی ہو جاتی ہے؟

ج: جی ہاں میں اپنے پہلے ڈرافٹ پر نظرِ ثانی کرتی ہوں۔ میرا کوئی پہلا ڈرافٹ
آخری اور فائنل نہیں ہوتا۔ بعض اوقات ایک ہی چیز کو کئی بار لکھتی
ہوں۔ جب تک مطمئن نہیں ہو جاتی، اُس کو شائع نہیں کراتی۔ ریڈیو
تقریر تک دو تین بار لکھتی ہوں۔ ایک بات بتاؤں۔ دراصل مجھے
طویل مضامین وغیرہ لکھنے کی عادت ہے اور ریڈیو کی تقریریں وقت
کی پابندی کراتی ہیں۔ بہرصورت ریڈیو کے لئے لکھنے سے مجھے اتنا فائدہ
ضرور ہوا کہ مختصر تقریریں لکھنے کی بھی عادت ہو گئی۔ یہاں یہ بات
بتا دینا بھی ضروری خیال کرتی ہوں کہ میری ابتدائی تحریروں پر ڈاکٹر
سید عابد حسین صاحب اور میرے بھائی خواجہ غلام السیدین صاحب
نے کافی اصلاحیں دی ہیں۔ میرے بھائی تو بچپن سے میرے استاد
رہے ہیں۔ شادی کے بعد میرے شوہر ڈاکٹر سید عابد حسین سے مشورے
کئے ہیں اور انہوں نے اصلاح بھی دی ہے۔ لیکن بنیادی طور پر
میرے اور ان دونوں ادیبوں کے اسٹائل میں زبردست فرق ہے۔
جسے ارباب فکر و فن محسوس کرتے ہیں۔

س: کیا آپ اپنی بعض کہانیوں اور افسانوں کے محرکات پر روشنی ڈالنا
پسند کریں گی؟

ج: عنوان صاحب۔ یہ تو آپ بھی مانتے ہیں کہ ادب اور زندگی کا چولی
دامن کا رشتہ ہے۔ ادب محض تخیل کی رنگین وادیوں میں بھٹکنے
کا نام نہیں۔ اس کی بنیاد ٹھوس زمین پر ہوتی ہے۔ مگر ادب تخیل کی
گذرگاہ سے ضرور گذرتا ہے جو اس کو تاریخ سے ممتاز کرتا ہے اور
اس کو نئی معنویت کا حامل بنا دیتا ہے۔ میری اکثر کہانیاں اور ناول
زندگی سے بہت قریب ہیں اور اسی کی وجہ سے بعض لوگ یہ تہمت
لگاتے ہیں کہ فلاں کا قصہ یا کردار پیش کیا گیا ہے۔ [illegible] تہمت یا
الزام تو دنیا کے بڑے بڑے ادیبوں پر بھی لگایا گیا ہے۔ [illegible]

یہ ہے کہ اگر میرے کردار زندہ انسانوں سے مشابہت رکھتے ہیں تو میں اپنی کوشش میں کامیاب ہوں۔ مثلاً میری ایک کہانی ہے "پلا" کہ جھگتا ہے۔ ایک لڑکی جو بہت خوبصورت اور ہنرمند تھی محض اس لیے بھٹکا دی گئی کہ لڑکا غیر خوشحال تھا۔ میرے ناولوں کے کردار بھی ایسے ہی لوگوں کے گرد گھومتے ہیں جنہیں میں اچھی طرح جانتی ہوں۔ "یادوں کے چراغ" میرا ناول بہت پسند کیا گیا۔ اس میں زندگی کے سچے حقائق کو تخیل اور تخلیق کے عمل سے گزرنا پڑا تب جاکر ناول بنا۔ "آتش خاموش" جامعہ اور جامعہ کی زندگی کے پس منظر میں اُبھرتا ہے۔ میرے کرداروں پر اکثر پڑھنے والوں کو جو سچے کردار ہونے کا گمان ہوتا ہے اُس کی وجہ یہ ہے کہ میں اپنے افسانوی ادب میں وہی زندگی پیش کرتی ہوں، جس سے مجھے گہری واقفیت ہوتی ہے۔ ہَوا میں محل نہیں بناتی۔"

س ۔ میں نے آپ کے افسانوں اور ناولوں کو پڑھ کر اکثر ایسا تاثر قبول کیا ہے کہ آپ کی تخلیقات میں اخلاقی قدروں کا غلبہ ہے اور آپ خیر وشر کی جنگ میں "خیر" کی ہم نوا ہیں۔

ج ۔ یہ تو آپ نے خوب پوچھا۔ میں کہتی ہوں ہر انسان خاص طور پر ہر فن کار کو خیر کا ہم نوا ہونا ہی چاہیے۔ میں بھی اعلا اخلاقی اقدار کو عزیز رکھتی ہوں۔ میرا یقین ہے کہ ہر انسان میں نیکی اور شرافت ہوتی ہے۔ میرے بعض کرداروں کو اخلاقی صفات کا پیکر دیکھ کر بعض لوگوں کو یہ اعتراض ہوتا ہے کہ میرے کردار مثالی ہوتے ہیں۔ اب میں کس کس کو سمجھاتی پھروں کہ میں نے ایسے اشخاص زندگی میں دیکھے ہیں، برتے ہیں ان کا اثر قبول کیا ہے اور یہ سب جیتے جاگتے اسی دنیا کے انسان ہیں۔ اگر میرے کرداروں میں مثال پسندی کی جھلک ہے تو وہ انہیں مثالی شخصیتوں کا اثر ہے۔ ویسے میرے یہاں بہت سے ایسے کردار بھی ملیں گے جن میں انسانی کمزوریاں اور خامیاں ہیں اور آپ کو ایک مزے کی بات بتاؤں۔ میرے بہت سے پڑھنے والے انہیں کرداروں کو پسند کرتے ہیں اور حقیقت سے بہت قریب بتاتے ہیں۔

س: کیا آپ خواتین ادیب اور مرد ادیبوں کی تحریروں میں اسلوب، مواد، طرز پیشکش یا کسی اور نقطۂ نظر سے کوئی فرق محسوس کرتی ہیں۔

ج ۔ جی ہاں ادیب جب کوئی ناول یا افسانہ لکھتا ہے تو ظاہر ہے کہ شناخت بھی۔

—— مرد میں اس کے ماحول، تجربے اور اُلجھنوں کے عکس نظر آتے جاتے ہیں۔ اب اگر آپ غور سے ان دونوں کی تخلیقات کو پڑھیں تو آپ کو نمایاں فرق یہ محسوس ہوگا کہ مرد ادیب کے یہاں کینوس عام طور پر وسیع ہوتا ہے اور عورت ادیب کا مختصر۔ وہ اپنے تجربے اور دلچسپی نیز ماحول کے مطابق پلاٹ چنتی ہیں۔ آئندہ میں اگر آپ گنتی کی مختصر حقیقتوں کو نکال دیں تو دیکھیں گے کہ عورت کی کہانیوں کا محور معاشرتی زندگی اور خاندانی زندگی ہوتا ہے اور اس کے مسائل ہوتے ہیں۔

دوسرے جذبات اور سیرت نگاری میں بھی فرق ہوتا ہے۔ مثلاً ہوسکتا ہے کہ وہ کسی طوائف کی زندگی پر بھی خامہ فرسائی کرے لیکن اس میں بھی اس کا اپنا نقطۂ نظر ہوتا ہے۔ مرد ادیب کی طرح وہ اس کے جسم کے حسن یا ناز و ادا یا گھناؤنی زندگی کی عکاسی نہ کرے گی، بلکہ اس کے دل کے اندر بھڑکنے والے شعلوں کو دیکھے گی۔ اُس کے اندر بیوی اور ماں بننے کی جو قدرتی لگن ہوتی ہے اُس کو محسوس کرے گی۔ بات یہ ہے کہ ادیب مرد ہو یا عورت اگر ذاتی تجربے اور گہرے مشاہدے کے بغیر کوئی پلاٹ مرتب کریں گے تو ان میں اور سب خوبیاں ممکن ہو سکتی ہیں مگر حقیقت اور صداقت کی کمی محسوس ہوگی۔

تیسرا فرق مرد ادیب اور عورت ادیب کی تخلیقات میں مجھے یہ محسوس ہوتا ہے کہ عورت اگرچہ محدود زندگی دکھاتی ہے۔ مگر اُس کا مشاہدہ گہرا ہوتا ہے۔ ماحول کا بھی اور کردار کا بھی۔ اسلئے جیتے جاگتے کردار آپ کو عورت ادیب کے یہاں زیادہ ملیں گے۔ یہی حال جذبات نگاری اور سیرت کشی میں نظر آئے گا۔ جذباتی شدت پسندی عورت ادیب کے ناولوں کی کمزوری بھی ہے اور قوت بھی۔ آپ میرا مطلب سمجھ رہے ہیں نا؟ —— یعنی اگر ضبط اور توازن کے ساتھ جذبات کشی کی جائے تو وہ بہت بڑی خوبی بن جاتی ہے ورنہ بہت بڑی خامی۔ ایک اور فرق آپ یہ محسوس کرسکتے ہیں کہ عورت ادیب جس طرح عورت کے گہرے احساسات اور سیرت کی باریکیوں کو دکھا سکتی ہے ویسے مرد کی نہیں دکھا سکتی۔ اور یہی حال مرد کا ہے کہ وہ مرد کے خیالات و جذبات کو زیادہ خوبی سے دکھاتا ہے مگر عورت کے

معاملے میں شعوری کی جاتی ہے۔ وہ اس کے جذبات اور احساسات کو بھی اپنے رنگ میں پیش کرتا ہے۔ ایک بڑا فرق زبان کا ہے آپ مانتے ہیں کہ زبان جو کسان کی ہوتی ہے وہ مادری ہوتی ہے۔ عورت اگر زبان کو اچھی طرح سیکھے اور اس پر قدرت حاصل کر لے تو اس کی زبان زیادہ سلیس اور فطری ہوگی۔

س۔ اس نقطۂ نظر سے آپ کے افسانوی ادب کی امتیازی خصوصیات کیا ہیں۔ اگر ان پر روشنی ڈال سکیں تو اچھا ہے۔

ج۔ یہ آپ نے بڑا مشکل سوال کر دیا۔ ایک بات آپ کو بتاؤں؟ میرا خیال ہے کہ ہر سچا ادیب جب تخلیق کرتا ہے تو وہ ان ساری خصوصیات کو جو نقاد یا قاری اس کے یہاں تلاش کرتے ہیں پیشِ نظر نہیں رکھتا۔ ایک ہلکا سا خاکہ پلاٹ کا ذہن میں ضرور گزرتا ہے۔ چند کردار بھی دماغ میں موجود ہوتے ہیں۔ ماحول وغیرہ کے بارے میں بھی وہ سوچتا ہے۔ مگر اس طرح نہیں جیسے دوسرے سوچتے ہیں۔ میں تفصیل میں نہ جا کر آپ کے سوال کا مختصر جواب دوں گی۔ میرے ناول اور کہانیاں سُنی سنائی یا پڑھی پڑھائی باتوں پر مبنی نہیں ہوتے۔ مثلاً میں روس، امریکہ یا کناڈا کی زندگی اپنے ناولوں اور افسانوں میں پیش نہیں کروں گی۔ یا ان سیاسی نظریات اور جد و جہد کا ذکر نہیں کروں گی جن کا مجھے ذاتی اور گہرا تجربہ نہیں ہے۔ میں سمجھتی ہوں کہ ایسی تخلیقات شاید وقتی شہرت پا لیں مگر ان کی دائمی یا پائدار بنیاد نہیں ہوتی۔ جس آگ سے میں خود نہیں گزری اس کی لپیٹ دوسروں کو کیسے محسوس ہوگی۔ میرا یہ خیال بھی ہے کہ میرے کردار جیتے جاگتے ہوتے ہیں۔ اس سلسلے میں میں آپ کے پہلے سوالوں کے جوابات میں کافی بتا چکی ہوں۔

س: باجی! میں نے آپ کی کتاب "جلنے والوں کی یاد آتی ہے" پڑھی تو کئی جگہ دل بھر آیا۔ آپ کی تحریروں میں اتنا درد کیوں ہے؟

ج: ہر فنکار کے فن پر اس کے ذاتی رنج و غم کا اثر ضرور پڑتا ہے۔ عنوان صاحب کیا کہوں اور کیا نہ کہوں۔ یہ بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ میں دو سال کی تھی کہ ۲۲ سال کی عمر تک مسلسل غموں کی بھٹی میں جلتی رہی ہوں۔ [illegible] والد کا انتقال ہوا۔ [illegible] سال کی تھی کہ والدہ جنت کو سدھاریں۔ [illegible] عنفوانِ شباب میں انتقال ہوگیا۔ [illegible]

[illegible] اور یہ غم رنگ تو پھر میں سرایت کر گیا۔ اب جب [illegible] پڑتی ہے تو سارے شعوری اور غیر شعوری غم جاگ اٹھتے ہیں۔ مگر جہاں تک ناول اور افسانے کا تعلق ہے میں نے غمِ جاناں کو غمِ دوراں بنانے کی کوشش کی ہے۔ ہر دھڑکتے دل کا درد محسوس کیا ہے۔ اسی لئے میرے پڑھنے والوں نے میرے ان ناولوں اور افسانوں کو زیادہ سراہا ہے جو ٹریجڈی ہیں۔

س: باجی آپ سے ایک آخری سوال اور پوچھنا چاہتا ہوں۔ آپ نے کیفیت و کمیت کے لحاظ سے بہت لکھا اور خوب لکھا مگر نقادوں نے آپ کی طرف سے چشم پوشی کی ہے۔ اس کے اسباب کیا ہیں؟

ج: یہ سوال آپ مجھ سے کر رہے ہیں! ارے بھئی نقادانِ فن سے کیجئے۔ میرا کام لکھنا ہے اپنا قصیدہ پڑھنا نہیں۔ جو ادبی فیشن بن گیا ہے۔ اس کی اصل وجہ کیا ہے یہ تو شاید وہ حضرات ہی بتا سکیں جو ایک ہلدی کی گرہ والے پنساری کا دس صفحوں میں ذکر کر کے بھی مطمئن نہ ہوں۔ شاید اسی لئے کہ وہ ان کا دوست ہے یا اس سے کوئی مفاد وابستہ ہے۔ اور جو لوگ ان کے ازم یا ان کے خیالات پر پورے نہ اتریں یا جن سے ان کو کوئی خاص فائدہ نہ پہنچے یا جو ان کی خوشامد نہ کریں یا اپنے لئے کوشش کرنا برا سمجھیں وہ اکثر ان کے وجود ہی سے یکسر منکر ہو جاتے ہیں۔ شاید مجھے نظر انداز کرنے کی یہی وجہ ہو کہ میں نے اہمیت کام کو دی ہے۔ اردو کی خدمت اپنا مقصدِ زندگی بنا لیا ہے۔ عنوان صاحب، مجھے اس کا یقین ہے کہ ان بیشتر حضرات نے جو چند ادیبوں کا نام لے کر بار بار انہیں دُہراتے ہیں۔ یا جو یہ سمجھتے ہیں کہ صرف مستند ہے میرا فرمایا ہوا یا میرے گروہ یا احباب کا فرمایا ہوا۔ ان میں سے اکثر نے میری کوئی کتاب نہیں پڑھی ہے۔ شاید نام بھی سب کتابوں کے نہ سنے ہوں۔ یا اگر پڑھی ہیں تو تعصب کی عینک لگا کر۔ ویسے میں ایسے نقادوں سے واقف ہوں جو زبانی یا نجی محفلوں میں میرے ادبی و تخلیقی کام کی تعریف کرتے ہیں۔ مگر اپنے مضامین میں میرا نام نہیں لیتے۔ ویسے ایسے تبصرہ نگار بھی ہیں جنہوں نے میرے کام کو سراہا ہے اور میرے ادبی و علمی کاموں کی قدر کی ہے۔ [illegible]

(باقی صفحہ ۲۲ پر دیکھئے)

شاعرہ بمبئی

مقالہ

صالحہ عابد حسین کی ادبی کاوشیں

ڈاکٹر کبیر احمد جائسی
۱۶۷ - اے - ۱۰ ، او کھلا ۔ نئی دہلی ۲۵ -

مختلف الجہات شخصیات کے ساتھ اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ ان کی شخصیت کا صرف کوئی ایک پہلو اس طرح سے مشہور ہو جاتا ہے کہ وہ دوسرے پہلوؤں کو نہ صرف پس پشت ڈال دیتا ہے بلکہ کبھی کبھی لوگوں کے ذہن سے فراموش بھی کرا دیتا ہے۔ صالحہ عابد حسین کی ادبی شخصیت بھی مختلف الجہات شخصیت ہے اور ان کی ناول نگاری و افسانہ نویسی نے بام شہرت پر پہنچ کر ان کی ادبی کاوشوں کی طرف سے لوگوں کی نگاہوں کو پھیر رکھا ہے۔ صالحہ عابد حسین کی جو ادبی کاوشیں اب تک منظر عام پر آ چکی ہیں وہ کسی بھی دوسری ادبی شخصیت کے لئے نہ صرف سرمایۂ افتخار ہو سکتی ہیں بلکہ اس کی بقائے دوام کی ضامن بھی۔

جس ادبی شخصیت کے قلم سے (۱) ادبی جھلکیاں (۲) حالی کی ایک جھلک (۳) یادگار حالی (۴) جانے والوں کی یاد آتی ہے (۵) ذکر جمیل (۶) خواتین کربلا کلام انیس کے آئینہ میں (۷) میر انیس سے تعارف جیسی کتابیں نکل چکی ہوں اس کی کاوشوں کے تعارف کی تو چنداں ضرورت محسوس نہیں ہوتی، لیکن جی یہ ضرور چاہتا ہے کہ ان تمام ادبی کارناموں کا ایک سرسری جائزہ لے کر ان موضوعات کے متعدد خال کو واضح کیا جائے۔

سنا ہے کہ انتخاب سے دل کا معاملہ لوگوں پر کھلتا ہے۔ خدا ہی جانے یہ بات کہاں تک صحیح ہے لیکن موضوعات کے انتخاب سے ضرور انتخاب کرنے والے کی شخصیت کے جلوۂ صد رنگ کو دیکھا جا سکتا ہے۔ جب ہم اس نقطۂ نظر سے صالحہ عابد حسین کے موضوعات کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں نظر آتا ہے کہ ان کے طائر خیال نے اپنی جولانگاہ کے لئے حالی اور انیس کے ادبی کارناموں کا انتخاب کر لیا ہے۔ حالی جو جدید تنقید کے معمار اول ہیں اور اسی کے ساتھ جدید اردو شاعری کے مقتدی و پیشوا بھی۔ سب سے بڑھ کر اس زمانے کی صنف نازک کے حقوق کے پاسدار بھی، جب سرسید جیسے بیدار مغز نے بھی اس زمانے کی عورتوں کی زبوں حالی، کسمپرسی، بیچارگی اور جہالت کو محسوس نہیں کیا تھا اور اگر محسوس بھی کیا تھا تو خارجی حالات کے دباؤ کے تحت اس کا کھلا اظہار نہیں کر سکے تھے۔ انیس جو اہل بیت کی مستورات کی بلند نظری، اسیر چشم پاکبازی، جد و جہد، عزم و حوصلہ اور بظاہر ہار کر بھی فاتح کی حیثیت سے زندہ رہنے کی تصویر کشی کے بادشاہ ہیں، جن کی شاعری فنی ترتیب پا کر بلند انسانی جذبات و احساسات کا فرض کفایہ ہے۔ اردو ادب کے ان دو ستونوں کے ادبی کارناموں کا جائزہ بھی ان کی ادبی کاوشوں کا ماحصل ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے کچھ بزرگوں، پیاروں اور عزیزوں کی یادوں کو ادبی روپ میں زندہ رکھا ہے جن کا ذکر آگے چل کر آئے گا۔

ان کے ادبی کارناموں کا جائزہ لیتے ہوئے سب سے پہلے ہماری نظر 'یادگار حالی' پر جا کر ٹھہرتی ہے۔ جدید اردو ادب میں حالی کی اولیت مسلم، مگر حالی اپنی شخصیت کے لحاظ سے کچھ ایسے واقع ہوئے تھے کہ دوسروں کے بارے میں تو وہ دفتر کے دفتر لکھ سکتے تھے مگر خود اپنے سلسلے میں لکھنا تو درکنار گفتگو کرنے کے بھی روادار نہ تھے۔ کچھ یہ حقیقت اور کچھ حالی و شبلی کے شاگردوں کے آپسی مناقشے جس کی وجہ سے ایک عرصے تک حالی کا شہرہ ہونے کے باوجود نہ تو ان کی سوانح ہی لکھی گئی نہ ان کے افکار و خیالات کا کوئی خاص تنقیدی جائزہ لیا گیا۔ صالحہ عابد حسین نے جس وقت یادگار حالی لکھنے کا بیڑا اٹھایا اس وقت حالی کو دیکھنے والے ایک ایک کر کے رخصت ہو چکے تھے۔ کتابیں تو تھیں ہی نہیں کہ ان سے مدد لی جاتی۔ چار و ناچار جو کچھ اور جتنی کچھ معلومات ان کو فراہم ہو سکیں ان کی مدد سے انھوں نے اس شریف ترین انسان کی شخصیت کا مرقع کر کے دنیائے ادب کے سامنے پیش کر دیا جو اپنی انسانی صفات میں بے نظیر و بے مثال ہے جس زمانے میں یادگار حالی لکھی گئی اس زمانے میں حالی کا سیاسی شعور دھندلا، حالی کا ذہنی ارتقا

(غلام مصطفیٰ خاں)، اور حالی بحیثیت شاعر (شجاعت علی سندیلوی) عالمِ وجود میں نہ آئی تھیں۔

سوانحی حصّے سے قطعِ نظر یادگارِ حالی میں حالی کی ادبی خدمات کا بھرپور جائزہ لیا گیا ہے، اُن کی قدیم طرز کی غزل گوئی سے لے کر جدید نظم نگاری تک اور اُن کے تمام نثری کارناموں پر جس شرح و بسط اور ربط و تسلسل کے ساتھ نظر ڈالی گئی ہے، وہ حالی کی ادبی خدمات کی بھرپور عکاسی کرتی ہے۔ حالی کے کارناموں کو پیش کرتے وقت اُنھوں نے کسی اِدّعا سے کام نہیں لیا ہے بلکہ اپنے آپ کو صرف حقیقتِ حال کی عکاسی تک محدود رکھا ہے۔ اس طرح اس کتاب کی تنقیدی قدر و قیمت بھی اپنی جگہ مُسلّم ہو جاتی ہے جو اُسی شریفانہ تنقید کی ایک مثال پیش کرتی ہے جس کے نقیب حالی اور صرف حالی ہیں۔ اِس طرزِ تنقید کا ایک نمونہ حسبِ ذیل ہے۔

"مسدسِ حالی صرف اخلاقی اور اصلاحی نقطۂ نظر ہی سے ایک بالکل جدید طرز کی چیز نہ تھی، بلکہ حقیقت میں یہ ترقی پسند ادب اور نئی شاعری کا سنگِ بنیاد تھی۔ جس تحریک کو ہم ترقی پسند تحریک کہتے ہیں دراصل آج سے ستر سال پہلے حالی نے اس کی ابتدا کی تھی۔ اگر آج ترقی پسند تحریک اشتراکیت کے رنگ میں رنگی ہوئی ہے تو اِس کے یہ معنی نہیں کہ پون صدی پہلے بھی اس صورت میں یہ تحریک اُٹھائی جا سکتی تھی۔ حالی نے صرف ترقی کا راستہ نہیں دکھایا، بلکہ دراصل ایک انقلاب کی بنا ڈالی۔ اُنھوں نے صرف شعر کی دنیا میں انقلاب پیدا نہیں کیا، بلکہ شعر کے ذریعے انسانوں کے دماغوں اور ذہنوں میں بھی انقلاب کا بیج بویا۔ ہاں حالی تخریب کے ساتھ ساتھ تعمیر کا کام بھی کرنا چاہتے تھے، وہ فرسودہ عمارت کے پُرانے مسالے سے ایک نئی اور پائدار عمارت بنانا چاہتے تھے" (یادگارِ حالی، طبع سوم ص ۱۷۴-۱۷۵)

صالحہ عابد حسین کی دوسری کتاب جو حالی ہی سے متعلق ہے "حالی کی ایک جھلک" کے نام سے موسوم ہے جس میں حالی کے سوانح کو مختصر ترین انداز سے ڈرامے کے رُوپ میں پیش کیا گیا ہے اور ڈرامے کے پردے ہی پردے میں حالی کی پوری زندگی اور اُن کے افکار و خیالات کو احاطہ کر لیا گیا ہے۔ اِس ڈرامے کا اختتام جس مؤثر انداز سے ہوتا ہے وہ بھی قابلِ داد ہے۔ مولانا حالی، نگم صاحب کو سودیشی تحریک کے بل پر اپنے خیالات سے آگاہ کر رہے ہیں، جیسے ہی وہ خاموش ہوتے ہیں پس منظر سے مہاتما گاندھی کی آواز اُبھرتی ہے جو سودیشی تحریک کے بارے میں کچھ فرما رہے ہیں اور پردہ گر جاتا ہے۔ حالی کی ایک جھلک اور یادگارِ حالی دونوں ہی کا موضوع ایک ہے، مگر دونوں کو

شاعر ملی

جن دو الگ الگ فنکارانہ انداز سے لکھا گیا ہے۔ اُس نے اِن دونوں کتابوں کو ایک دوسرے سے بالکل الگ کر دیا ہے۔

حالی کے بعد صالحہ عابد حسین جس ادبی شخصیت سے سب سے زیادہ متاثر ہیں وہ میر انیس ہیں۔ اُنھوں نے انیس کے کلام کی مناسب تعبیر، تشریح اور توضیح کرنے کے ساتھ ساتھ اُن کے کلام کے اُن گوشوں کو اُجاگر کیا ہے جو عام طور سے لوگوں کی نگاہوں سے پوشیدہ تھے۔ اِس سلسلے میں سب سے پہلے اُن کی کتاب "خواتینِ کربلا کلامِ انیس کے آئینہ میں" پر نظر ڈالی جاتی ہے۔

کلامِ انیس کی عظمت کا احساس دلانے والے سب سے پہلے ناقد و ادیب علامہ شبلی نعمانی ہیں۔ اُنھوں نے اپنے زمانے کے معیارِ تنقید کو سامنے رکھتے ہوئے کلامِ انیس کی عظمت کا وہ نقشہ کھینچا ہے جس کو آج تک چیلنج نہیں کیا جا سکا۔ موازنۂ انیس و دبیر، انیس کی شاعرانہ عظمت کا اوّلین اعتراف ہوتے ہوئے بھی انیس و انیسیات کے موضوع پر نہ تو حرفِ آخر ہے، نہ ہو سکتا تھا اور نہ ہی اُس کو ہونا چاہیئے تھا۔ کلامِ انیس کے بہت سے ایسے گوشے تھے جن پر اب سے ستر بہتر سال قبل روشنی ڈالنا اس لئے ممکن نہ تھا کہ اس وقت ہمارے سماجی علوم اتنے ترقی یافتہ نہ تھے کہ اُن کی روشنی میں شعر و ادب کو پرکھا جا سکے۔ سماجیات، نفسیات اور علم الانسان کے علوم ہمارے دور میں اتنے ترقی یافتہ ضرور ہو گئے ہیں کہ اب اُن سے ادب کی تفہیم، توضیح اور تجزیہ کا کام لیا جا سکتا ہے۔ "خواتینِ کربلا کلامِ انیس کے آئینہ میں" اِسی طرح کی ایک کامیاب کوشش ہے جس میں جدید سماجیات کے تقاضوں کو سامنے رکھ کر کلامِ انیس کے اوصاف کو اُجاگر کیا گیا ہے۔

انیس کی شاعری پر سب سے بڑا اعتراض کیا جاتا ہے کہ اُنھوں نے اپنے کرداروں بالخصوص نسوانی کرداروں کی اس طرح عکاسی کی ہے کہ عرب کی مستورات اور خانوادۂ نبوی کی شاہزادیاں نہیں، اودھ کی بیگمات معلوم ہوتی ہیں۔ اِس اعتراض کا جواب دیتے ہوئے بیگم صاحبہ نے بڑے ہی پتے کی بات کہی ہے کہ انیس کا مقصود و نظریہ تھا کہ اُن کرداروں سے اپنائیت کی بُو آئے، اِسی لئے انیس نے قصداً اُن مستورات کی زبانوں سے اُن جذبات، کلمات، فقرات، تمناؤں اور دعاؤں کا اظہار کرایا ہے جو اُس زمانے کے معاشرہ میں عام تھیں اور جن کے اظہار کے بغیر اِن کرداروں سے اپنائیت کی بُو نہیں آ سکتی جو موجودہ شکل میں ہم کو محسوس ہوتی ہے۔ اُن کے الفاظ حسبِ ذیل ہیں۔

"ایک اور بات قابلِ غور ہے کہ انیس کے یہاں کربلا کے
کرداروں میں ہندوستانی رنگ ہلکا اور خواتین میں زیادہ شوخ
ہے۔ اس سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ وہ اس حقیقت
سے بھی واقف تھے کہ بہادری عالی حوصلہ عرب مرد ہر ملک
ہر قوم اور ہر زمانے کے لوگوں کو یکساں متاثر کرسکتے ہیں،
مگر عورتوں کی سیرت نگاری میں مقامی رنگ روپ اور
انداز نہ پیدا ہوا تو وہ عورتوں کے دلوں کے تاروں کو
نہیں چھیڑ سکتے۔

"وہ یہ بھی جانتے تھے کہ بنیادی اخلاقی قدریں ہر ملک، ہر دور، ہر زمانے کی ایک ہوتی ہیں، نسوانی کرداروں کے لب و لہجہ اور رسم و رواج میں تھوڑی سی ترمیم کردینے سے اُن میں ذرا سی ہندوستانیت ضرور پیدا ہوجائے گی، جو لوگوں پر زیادہ اثر کرے گی، لیکن باقی جو صفات ان عرب خواتین میں ہیں وہ آفاقی اور عالمگیر ہیں اور ہر دور، ہر مقام کی اونچے اخلاق اور بلند سیر عورتیں ان سے مزین ہوتی ہیں۔ سیتا ہو یا مریم، خدیجہ ہو یا فاطمہ، زینب [illegible] شہر بانو ہو یا ہندہ۔" (ص ۲۷ - ۲۸)

اس کتاب میں مرثیۂ انیس کے صرف ایک وصف یعنی کلامِ انیس میں خواتینِ کربلا کے کرداروں کی عکاسی سے بحث کی گئی ہے اور بڑے ہی مدلل اور موثر انداز سے اس بات کو اُجاگر کیا گیا ہے کہ انیس نے عورت کے مختلف روپوں یعنی بیٹی، بہن، بیوی، اور کنیز کے روپوں کی عکاسی کی ہے لیکن اُن کا کمالِ فن یہ ہے کہ بیٹی کی زبان سے کنیز جیسے اور کنیز کی زبان سے بیٹی جیسے جذبات، کلمات و فقرات کا اظہار اپنے اشعار میں نہیں ہونے دیا ہے بلکہ انتہائی حکیمانہ و نفسیاتی انداز سے ہر کردار کے منصب کے لحاظ سے جذبات، کلمات و فقرات کا انتخاب کرتے ہیں۔ یہ وہ فن ہے جس میں مرثیہ نگاری کے میدان میں انیس کا کوئی شریک و سہیم نہیں ہے۔

صالحہ عابد حسین کو اوائلِ عمری ہی سے کلامِ انیس سے جو شغف رہا ہے اُس کا تقاضا تھا کہ وہ کلامِ انیس کا صرف ایک پہلو ہی سے جائزہ نہ لیں، بلکہ مجموعی طور پر اُنھوں نے انیس کے کلام کے مطالعے سے جو تاثر قبول کیا وہ بھی قلم بند ہو۔ چنانچہ وہ وقتاً فوقتاً کلامِ انیس کے کسی نہ کسی پہلو کو اُجاگر کرتی رہیں۔ ان پھولوں کا ایک خوش رنگ گلدستہ "میر انیس" سے ایک "تعارف" کے نام سے شائع ہو کر ہمارے سامنے آیا ہے۔ اس کتاب میں اُن کے چھ مضامین شامل ہیں۔ ان میں ایک مقالہ ایسے موضوع پر بھی ہے جس پر وہ "خواتینِ کربلا کلامِ انیس کے آئینہ میں" روشنی ڈال چکی ہے لیکن موضوع کی کشش اور اہمیت نے اُن سے پھر ایک نیا مقالہ لکھوا لیا۔ میری مُراد اس مقالے سے ہے جس کا عنوان "کلامِ انیس میں ہندوستانی تہذیب" ہے یوں تو اس کتاب کے سب ہی مضامین اپنی جگہ وقیع اور خیال انگیز ہیں، لیکن "مراثیِ انیس میں خاندانی زندگی کی جھلکیاں" بیت الغزل کی سی اہمیت رکھتا ہے۔ انیس پر اب تک نہ جانے کتنا کام ہوچکا ہے اور اب بھی بہت کچھ لکھا جارہا ہے، لیکن صالحہ عابد حسین نے کلامِ انیس کے اس مستور گوشے کو جس طرح اُجاگر کیا ہے وہ تنقید کی فضا سے نکل کر تخلیق کی سرحدوں میں داخل ہوجاتا ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ اُنھوں نے اس مقالے کے آخر میں جو کچھ تحریر فرمایا ہے وہ اہلِ نظر کی نگاہوں کا سُرمہ بننے کا ہر طرح سے مستحق ہے۔ تحریر فرماتی ہیں۔

آج جو خاندانی انتشار اور خود غرضی کی آیا دھاپی مچی ہوئی ہے، اُس کو دُور کرنے میں انیس کا کلام بھی اپنا حصّہ ادا کرسکتا ہے، مگر جو لوگ اس بے بہا خزانے کی طرف سے آنکھیں بند کیے ہیں، وہ اُس کے حُسن، اُس کی خوبیوں، اُس کے اثر سے واقف ہی کیسے ہوں گے؟ انیس کے کلام کو سمجھنے اور اثر لینے کے لئے اُسے غور اور تفصیل سے پڑھنے کی ضرورت ہے۔ صرف ذہانت اور قابلیت ہی کافی نہیں، اُس خلوص کی بھی ضرورت ہے جو اُسکے کلام کی گہرائی اور گیرائی کو پا سکے۔ اس لئے کہ یہ تمام مرثیہ گویوں کے مرثیے جیسے نہیں، اس میں بہت کچھ چھپا ہوا ہے اُس کو پانا ہمارا قومی فریضہ بھی ہے اور بہت بڑی دولت بھی۔" (ص ۷۶)

حالی اور انیس کے بعد اُنھوں نے جس شخصیت کی عکاسی کی ہے وہ حالی اور انیس کے اوصاف کا ایک ایسا مجموعہ ہے کہ جس کی شخصیت میں یہ دونوں رنگ جذب ہوکر ایک اکائی بن گئے تھے۔ میری مراد خواجہ غلام السیدین سے ہے۔ سیدین صاحب کی ذات ایک عجیب طلسمی ذات تھی۔ تعلیم اور افکار و خیالات کے لحاظ سے انتہائی جدید لیکن اپنے اندر رکھ رکھاؤ، دردمندی، دلسوزی، پاسداریٔ عہد اور تہذیب میں قدیم بزرگوں کی یادگار، انتہائی مذہبی لیکن مذہبی تعصب سے ناآشنا، انتہائی تعلیم یافتہ لیکن نخوتِ علم سے کوسوں دور۔ دُنیا کو حاصل کرلینے کے بعد بھی فقیر منش و درویش صفت تھے۔ تعلیمِ نسواں کے نہ صرف حامی

بلکہ ہر ہر قدم پر اُس کے معاون و مددگار بھی۔ غرضکہ ایک عجیب طلسمی شخصیت تھی سیدین صاحب کی۔ صالحہ عابد حسین کی تعلیم و تربیت سیدین صاحب ہی کی زیرِ نگرانی ہوئی تھی۔ اُنھوں نے آنکھیں کھولنے کے بعد ہی سے سیدین صاحب کی شخصیت سے جو تاثرات قبول کرنے شروع کر دیئے تھے اُن سب کا مجموعہ "ذکرِ جمیل" میں دیکھا جا سکتا ہے۔ یہ ایک بہن کے قلم سے بھائی کی مدح و ستائش نہیں ہے بلکہ کچھ اقدار پر یقین و ایمان رکھنے والی ایک ادیبہ کا خراجِ عقیدت اُس انسان کی بارگاہ میں ہے جو خود بھی اُنہی اقدار کا جیتا جاگتا نمونہ تھا۔ اِس لئے یہ کتاب ذاتی بندھنوں سے آزاد ہو کر آفاقی دنیا میں داخل ہو جاتی ہے۔ سیدین صاحب کے انتقال کے بعد اپنے سارے جذباتی تعلقات کو پسِ پشت ڈالتے ہوئے "ذکرِ جمیل" کی تصنیف ایک ایسا کارنامہ ہے جس کو انجام دیتے ہوئے بڑے بڑے مَردوں کے پتّے پانی ہو جاتے، لیکن انیس کے مرثیوں کے مطالعے نے اُن کو صبر و رضا کا جو درس بچپن ہی سے دیا تھا وہ کام آیا اور آنسوؤں سے بھیگی ہوئی لیکن جذباتی اندازِ بیان سے الگ یہ کتاب منظرِ عام پر آئی جو ہمارے عہد کے ایک شریف انسان کا انتہائی سادہ اور ستھرے انداز سے ایک دلکش، جاذبِ نظر اور قابلِ توجہ نقشہ ہمارے سامنے پیش کرتی ہے۔ اِس موقع پر میں صرف ایک اقتباس پیش کرنے پر اکتفا کروں گا۔

"میں نے بہت سے دل کے مریضوں کو دیکھا ہے، جو زندگی سے، دنیا سے، لوگوں سے، اپنی ذات سے بیزار ہو جاتے ہیں۔ صحت سے مایوس ہو کر ہر وقت جیسے ہاتھ پر ہاتھ دھرے موت کا انتظار کرتے رہتے ہیں۔ یا تو بد پرہیزیاں کرتے ہیں کہ جو ہونا ہے وہ تو ہو کر رہے گا یا حد سے زیادہ پرہیز اور احتیاط کرتے ہیں جو اور زیادہ مضر چیز ہے۔ ہر کام سے ہاتھ اُٹھا لیتے ہیں اور ہر دم اپنی بیماری کا رونا روتے رہتے ہیں۔ بہت کم ــــ بہت ہی کم ان میں ایسے ہوتے ہیں جو نارمل یا قریب قریب نارمل زندگی بسر کرنے کا حوصلہ رکھتے ہوں۔ لیکن سیدین صاحب نہ کبھی بیماری میں مایوس ہوئے، نہ اُن کی قوّتِ عمل میں کوئی فرق آیا۔ سنہ ۱۹۵۰ء کے بعد بائیس سال اُنھوں نے زندگی کے ہر لمحہ کو خدا کی بخشی نعمت سمجھا جو اُنھیں اِس دنیا کو بہتر بنانے کی کوشش اور اُس کے بندوں کی خدمت کرنے کے لئے عطا کی گئی ہے۔ اور یہ فرض وہ آخری دم تک صحت مند اولوالعزم جوانوں کی سی ہمّت سے ادا کرتے رہے۔ مزاج میں کبھی تلخی نہیں آئی۔ موت کا خوف تو جیسے اُنھیں تھا ہی نہیں۔ اِس بائیس سال میں سیدین صاحب نے ادبی، علمی، تعلیمی دنیا میں جو عظیم کام انجام دیئے ہیں اُس کو ابھی ہماری ہندوستانی قوم پہچان نہیں پائی ہے (ص ۴۳-۲۳)

آخر میں چند جملے اُس کتاب کے بارے میں کہنا چاہوں گا جس کا نام ہے "جانے والوں کی یاد آتی ہے"۔ ۳۴۰ صفحات کی اِس کتاب میں صالحہ عابد حسین نے اُن سترہ شخصیتوں کے بارے میں اپنے تاثرات کا اظہار کیا ہے جو اِس دارِ فانی کو خیرباد کہہ چکے ہیں۔ اِس کتاب کو پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ ہر گھر سے دھواں اُٹھ رہا ہے، ہر دل زخمی ہے، ہر وجود نارسائی کا نوحہ گر ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ زندگی کا فریبِ پیہم اِس دنیا سے لوگوں کا دل اُچاٹ نہیں ہونے دیتا۔ اِس کتاب میں اُنھوں نے اپنے بزرگوں، دوستوں اور پیاروں کی شخصیتوں کو الفاظ کے جامہ میں پیش کرنے کی ایک کامیاب کوشش کی ہے۔ یوں تو یہ کتاب از اوّل تا آخر جذبات و تاثرات سے لبریز ہے، لیکن راقم سطور کو "چراغِ تہِ داماں"، "عمرِ گذشتہ کی کتاب" اور "بھابھی جان" (؟) نے خاص طور سے متاثر کیا اور ان شخصیتوں سے ذاتی طور پر واقف نہ ہونے کے باوجود بھی اُن کی ذات سے کسی غیریت، کسی بیگانگی یا اجنبیت کا قطعی کوئی احساس نہیں ہوتا۔ اس کتاب میں ان کا اندازِ نگارش اپنی انتہائی بلندیوں کو پہنچ جاتا ہے۔ اِس مقام پر یہ کہے بغیر چارہ نہیں کہ ان کو آنسوؤں کو الفاظ کا جامہ پہنانے کے فن پر جو دسترس حاصل ہے۔ ان مضامین میں دل سے بے ساختہ ایک آہ نکلتی محسوس ہوتی ہے۔ وہ بے ساختہ آہ جو انسانی زندگی کے المیّہ کی خاموش تفسیر ہے۔ مختار چھدی ہوں یا خواجہ اظہر عباس، مولانا اسلم جیراج پوری ہوں یا ڈاکٹر ذاکر حسین، اُن کی یاد میں جو تاثرات زیبِ قرطاس ہوئے ہیں وہ سب کے سب اسی بے ساختہ آہ کی مکمل تفسیریں ہیں۔ بے جا نہ ہوگا اگر اس موقع پر دو اقتباسات بھی نقل کر دیئے جائیں۔

"میں تمہیں خواب میں بھی نہیں دیکھتی۔ کیوں؟ نہیں جانتی۔ جب کہ اِس دس مہینے میں تمہارا تصور، تمہارا خیال، تمہارا محبوب چہرہ ذرا دیر کو بھی نہیں بھولا۔ کتنی بار یہ محسوس ہوا ہے کہ تم ابھی تو میرے پاس کھڑے تھے، مسکرا رہے تھے، مجھے چھیڑ رہے تھے، مگر پل بھر میں یہ طلسم ٹوٹ جاتا ہے۔ آہ!

طلسم بھی ہمیشہ ٹوٹتے رہے ہیں اور دیوار پر تمہاری تصویر اُسی پیار بھری نظروں سے مجھے دیکھتی رہتی ہے۔"

(عمر گذشتہ کی کتاب میں ۲۲۲ - ۲۳)

"تم کتنے اچھے تیراک تھے پھر بھی میں ہمیشہ کتنا ڈرتی تھی جب تم جمنا پر جایا کرتے تھے۔

پر تم کیا جانتے تھے کہ وہ تو موت کا فرشتہ ان چڑیوں کی شکل میں چھپا بیٹھا تھا۔

تم آگے بڑھے۔ لڑکا چیخا۔ بھیا۔ بھنور.... مگر پل بھر کے اندر وہ خوفناک بھنور تمہیں نگل گیا۔

قطرہ سمندر میں جذب ہو گیا

امین نے اپنی امانت واپس لے لی!! کون کس سے شکوہ کرے؟ فریاد کرے؟ بس ہی کیا ہے؟

آج تمہیں بچھڑے ہوئے چھ ماہ ہو گئے مگر...... مگر ایسا لگتا ہے کہ تم ابھی کسی طرف سے ہنستے ہوئے چلے آؤ گے۔

ہر لمبے تڑنگے تندرست جوان کو دور سے دیکھ کر اُس پر تمہارا دھوکا ہوتا ہے اور پھر دل پر ایک پتھر سا گرتا ہے۔ تم سدھار چکے ہو! ...

مگر۔ یہ دل۔ یہ مجروح دل ـــ یہ تو کسی طرح ماننے پر تیار نہیں ہوتا کہ تم ہمیشہ کے لئے سدھار گئے۔

اِسے کون سمجھائے؟"

ابتک صالحہ عابد حسین کے قلم سے جو ادبی کتابیں نکل چکی ہیں اُن کا یہ ایک سرسری سا نامکمل خاکہ ہے جس سے کم از کم اس بات کا اندازہ تو لگایا ہی جا سکتا ہے کہ ادب کے خاموش خدمت گذار ہر وادے سے متعلق ہو کر کس طرح مصروف کار رہتے ہیں اور بزرگوں سے ملے ہوئے ورثے کو کس طرح پوری دنیا کو بانٹتے رہتے ہیں۔ اب یہ اپنے اپنے ظرف پر منحصر ہے کہ اِس لُٹتی ہوئی دولت سے کوئی فائدہ اٹھایا جائے یا نہ اٹھایا جائے۔ ○○

بقیہ: صالحہ عابد حسین صفحہ ۱

کاموں میں معاون و مددگار رہی ہیں لیکن بنیادی طور پر وہ ان کے ساتھی اور دوست ہیں۔ جن سے وہ لڑتی ہیں۔ بحثتی ہیں۔ خفا ہوتی ہیں۔ ہم بچوں سے اُکی محبت آمیز شکایتیں بھی کرتی ہیں۔ لیکن کوئی اور ان پر ذرا سی بھی شاعرہ بیٹی تنقید کرے تو یہ خفا ہوتی ہیں۔ کتنے لوگوں سے وہ اِس لئے محبت کرتی ہیں کہ وہ عابد صاحب کو چاہتے ہیں۔ اُنکی قدر کرتے ہیں علاوہ کچھ لوگوں سے اس لئے خفا ہو جاتی ہیں کہ وہ عابد صاحب کو دکھ دیتے ہیں

صالحہ عابد حسین کی شخصیت کا سب سے بڑا حسن ان کے خلوص کی گرمی ہے محبت کی نرمی ہے۔ اور خدا کا شکر ہے۔ ان میں کوئی بھی ملکوتی صفت نہیں ہے۔ وہ انسان ہیں۔ ○○

بقیہ:- صالحہ عابد حسین سے ایک ملاقات صفحہ ۲۲

زیادہ میرے قدر دان میرے پڑھنے والے ہیں۔ ان کی قدردانی اُن کی ہمت افزائی، اُن کی محبت اور خلوص اور دل سے نکلی تعریف میرے کام کا انعام ہے۔ دراصل لکھتی میں اُنہیں کے لئے ہوں۔

آخر میں ممتاز ادیب اور دانش ور ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب کے اِن الفاظ پر اس انٹرویو کو ختم کرتا ہوں جو موصوف نے کسی موقع پر صالحہ عابد حسین صاحبہ کے فن اور اسلوب کے بارے میں لکھے تھے:

"صالحہ عابد حسین کی تحریر کی چار نمایاں خصوصیات ہیں۔

(۱)- زبان و بیان کی سلاست، روانی اور پاکیزگی جو خود اُن کی طبع سلیم اور ذوقِ صحیح کی پیداوار ہے۔

(۲)- قدیم اور جدید تہذیبی اقدار کی کشمکش کا شعور جو زمانے کے موجودہ بحرانی دَور کی دین ہے۔

(۳)- گہرے سماجی اور اخلاقی شعور کی مدد سے نئی اور پُرانی قدروں کو سمونے کی کوشش جو اُن کی خاندانی روایات کا عطیہ ہے۔

(۴)- اخلاقی اور اصلاحی نقطۂ نظر کے باوجود فن کے تقاضوں کا پورا خیال رکھنا اور قصے اور مضمون کی دلچسپی کو قائم رکھنا جو سچے فن کار کی پہچان ہے۔

یہ خصوصیات ان کے نئے ناول "یادوں کے چراغ" میں واضح طور پر نظر آتی ہیں..... اُن کی طبیعت کی جولانی اور خیال کی ندرت اور تازگی کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اُن کے رشحاتِ قلم کا جو سلسلہ چالیس برس پہلے شروع ہوا تھا ابھی اور بہت دن تک جاری رہے گا۔" ○○

عَذرا سے اُلجھی ڈور تک

ڈاکٹر زرینہ ثانی
۳۶۱۔ شنکر نگر۔ ناگپور۔

عصرِ حاضر میں اُردو ناول اور افسانہ نگاری میں قرۃ العین حیدر، عصمت چغتائی، حمیدہ سلطان، رضیہ سجاد ظہیر، صالحہ عابد حسین، آمنہ ابوالحسن، ہاجرہ نازلی، جیلانی بانو نے ناموری حاصل کی اور اُردو شاعری میں زاہدہ زیدی، شفیق فاطمہ شعریٰ، ممتاز مرزا، ساجدہ زیدی وغیرہ شہرت یافتہ ہیں۔ اُردو تنقید میں ممتاز شیریں، ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ، صالحہ عابد حسین، ڈاکٹر سیدہ جعفر وغیرہ نے کمال حاصل کیا۔ مزاحیہ فیچر اور طنز کے سلسلے میں شفیقہ فرحت اور سلمیٰ صدیقی کا نام زبان پر آتا ہے، لیکن جو ہمہ جہتی ہمیں صالحہ عابد حسین کے یہاں نظر آتی ہے، دوسری خواتین قلمکاروں کے یہاں بہت کم ہے۔

بیگم صالحہ عابد حسین نے اُردو ادب کی کئی اصناف پر قلم اُٹھایا اور ہر ہر میدان سے یوں گذریں جیسے وہ اُن ہی کے لئے مخصوص ہے اور وہ اس صنف کے ہر گوشے، ہر باریکی اور ہر ہر رمز سے آشنا ہیں۔ اُنھوں نے ناول، افسانے، سوانح، خاکے، تنقید، ڈرامے، مذہبی مضامین، ریڈیائی فیچرز وغیرہ مہارتِ تامہ کے ساتھ لکھے۔ اتنی گوناگوں اصناف پر لکھنے والی شاید ہی کوئی دوسری خاتون ہو۔ اِس حیثیت سے وہ منفرد کہلائی جاسکتی ہیں۔

ڈاکٹر محمد احسن فاروقی اپنی مایۂ ناز تصنیف "اُردو ناول کی تنقیدی تاریخ" میں رقمطراز ہیں۔ "صالحہ عابد حسین کی ناول نگاری کو بھی کوئی خاص اہمیت دینا نامناسب ہی نظر آتا ہے۔" یہاں لفظ "کوئی خاص" غور طلب ہے۔ کوئی خاص اہمیت دینا نامناسب ہے، گویا اہمیت دی جاسکتی ہے۔ اِس طرح کے تنقیدی جملے قاری کو شک و شبہہ میں ڈال دیتے ہیں اور تنقید جس سنجیدگی اور خلوص کا مطالبہ کرتی ہے، وہ اس قسم کے ژولیدہ جملوں سے ممکن نہیں۔ ایسے تنقید نگاری کی سہل پسندی کا کوئی اچھا نمونہ نہیں کہا جاسکتا۔ مرد تنقید نگار عموماً خواتین قلم کاروں کے ساتھ انصاف نہیں کرتے۔ اُن کا دل نہیں بڑھاتے، اُن کی تحریروں کو وہ اہمیت نہیں

شاعر بھی

دیتے جو اپنی صنف کی تحریروں کو دیتے ہیں۔

میں ڈاکٹر محمد احسن فاروقی کے اِس جملے کے پیشِ نظر صالحہ عابد حسین کی ناول نگاری کا جائزہ لینا چاہتی ہوں اور فیصلہ سنجیدہ قارئین اور اہلِ نقد پر چھوڑتی ہوں کہ اُنھیں اُردو ناول نگاری میں کوئی خاص اہمیت دینا نامناسب ہے یا مناسب!

صالحہ عابد حسین کے پہلے ناول "عذرا" کی اشاعت ۱۹۴۳ء میں ہوئی اور اُن کا حالیہ ناول "اُلجھی ڈور" ہے۔ اس طرح اُن کی ناول نگاری تقریباً تیس بتیس سال کے زمانے کو احاطہ کئے ہوئے ہے۔ اِس مدت میں "عذرا" کے بعد آتشِ خاموش، قطرے سے گہر ہونے تک، راہِ عمل، یادوں کے چراغ، اپنی اپنی صلیب اور اُلجھی ڈور منظرِ عام پر آچکے ہیں۔ صالحہ عابد حسین کے فن ناول نگاری کی قدر و قیمت متعین کرنے کے لئے اِن ناولوں کے سماجی، سیاسی اور معاشرتی رُجحانات، اُن کے پلاٹ، کردار، موضوع، مقصد اور زبان کو مدِ نظر رکھنا ضروری ہے، اِن ناولوں کا قاری بآسانی اِس بات سے متفق ہوجاتا ہے کہ اِن میں سماجی زندگی کی مصوری کی گئی ہے۔ اور فنکارانہ حُسن کی ترجمانی بھی۔ ان ناولوں میں زندگی کا تنوع اور رنگارنگی، وُسعت اور پھیلاؤ، حرکت اور ہلچل ملتی ہے۔ مصنفہ نے اپنے زمانے کے رُجحانات، سماج کے میلانات، اور معاشرے کے رسم و رواج کی فنکارانہ عکاسی کی ہے۔ اِن سات ناولوں کی مدتِ تصنیف تیس سال سے زائد ہے اور انسانی خیالات و جذبات، احساسات و نظریات، زمانے کے رُجحانات و میلانات کی تبدیلی کے لئے بھی یہ مدت کافی اور خاصی ہے۔ اُن کے پہلے ناول سے آخر ناول تک یہ تمام تبدیلیاں ہمیں نظر آتی ہیں۔ سیاسی، سماجی، معاشرتی نظریات کی ترجمانی اُنھوں نے خوبصورتی سے کی ہے۔ ویسے وہ بذاتِ خود نہ ماہرِ سیاست ہیں اور نہ ہی اُن کا نشا بہت

بڑے سماجی کارکنوں میں ہوتا ہے۔ تاہم اس سلسلے میں اُن کا شعور عام شہری سے زیادہ بالغ اور نکھرا ہوا ہے۔ وہ اُن ہی رجحانات کو اہم اور قابلِ توجہ سمجھتی ہیں جن سے مُلک کی فلاح و بہبود وابستہ ہو۔ سماج اور معاشرے کی ایسی رسمیں جن سے تلخیاں پیدا ہوں، اُنھیں نامسعود خیال کر کے اُن کی بیخ کنی کرتی ہیں۔

صالحہ عابد حسین کے یہاں قرۃ العین حیدر کی طرح نہ فن کا نیا میلان نظر آتا ہے اور نہ حجاب امتیاز علی تاج کی طرح طلسماتی تخیئلی اور شاعرانہ فضا اور نہ ہی مسز عبدالقادر کی طرح مافوق الفطرت عناصر کی شمولیت۔ اُن کے ناولوں کی فضا مانوس لگتی ہے۔ وہ زندگی کے مطالبات اور تقاضوں کی حامل اور ترجمان ہیں اور زندگی کی اعلا اقدار کی علمبردار اور نقیب بھی۔ ناول کے لیے پہلے وہ موضوع سے پُوری طرح واقفیت حاصل کرتی ہیں، پھر کرداروں کا مشاہدہ اور مطالعہ بڑے غور و خوض سے کرتی ہیں۔ اُن کے پس منظر، اُن کے مسائل اور اُن کے جذبات کو پُوری طرح اپنی گرفت میں لینے کے بعد اُنھیں صفحۂ قرطاس پر اُتارتی ہیں۔ اُن کی ناولوں کے کردار ہمارے آس پاس کے کردار لگتے ہیں۔ کرداروں کا نفسیاتی تجزیہ کرتے وقت وہ اُن کے دُرون میں باربار جھانکتی ہیں۔ اُن کے دلوں کی کسک اور جذبوں کو خود محسوس کرتی ہیں۔ اور پھر اُن تمام باتوں کو زبان و بیان کی لطافت کے ساتھ پیش کرتی ہیں۔ اُن کے بعض ناولوں کے موضوع میں بڑی وسعت ہے۔ اُن کے کردار زندگی کی پیچیدگیوں سے گزرتے ہیں۔ زندگی کی اُلجھنوں کا حل تلاش کرنے میں کبھی کامیاب ہوتے ہیں اور کبھی ناکام۔ کیونکہ اُن میں بشریت پُوری طرح موجود ہے۔

ناول "عذرا" کا زمانہ وہ تھا جب ہمارا ہندوستان بیرونی طاقت کے شکنجے میں جکڑا ہوا تھا، اُس وقت مُلک مختلف مسائل سے دوچار تھا۔ مغربی اثرات اپنا کام کر رہے تھے۔ ہمارے قوم کے رہنماؤں نے مغرب سے اچھائیوں کو اخذ کرنے کی تبلیغ کی مگر بعض قدامت پرستوں نے اُس کی کُھلے طور پر مخالفت کی۔ اس طرح ہمارے معاشرے میں ایک ہی چھت کے نیچے دو متضاد خیالات کے افراد جمع ہو گئے۔ نتیجۃً تصادم ہوا۔ اس طرح کے تصادم ہمیں صالحہ عابد حسین کے ناولوں میں بھی ملتے ہیں۔ کچھ کردار ایسے ہیں جو پُرانی قدروں کے دلدادہ ہیں۔ کچھ ایسے ہیں جو نئی روشنی کے عاشقِ زار۔ مگر کچھ ایسے بھی صالح ذہن ہیں جو افراط و تفریط سے بچکر اعتدال پسند ہیں۔ ایسے افراد کی نمائندگی "عذرا" میں ریاض اور "راہِ عمل" میں شاعر بھی

میں جیسے بیان کرتے ہیں۔ صالحہ عابد حسین نے صالح عناصر کے فروغ کی طرف توجہ دی ہے اور رجعت پرستی کا استحصال کیا ہے۔ مشرقی تہذیب اور دینی اقدار کے ساتھ مغرب کے صالح عناصر اور وقتی تقاضوں کو ہم آہنگ کر کے پیش کیا ہے، اُس دَور کی ناول نگار خواتین کا یہی وطیرہ تھا۔ اس کی جھلکیاں طیبہ بیگم، سرگزشتِ ہاجرہ، فرخندہ، بیاضِ سحر، روشنک بیگم، اور نجمہ میں مل جاتی ہیں، لیکن دوسری خواتین کی طرح ہیں اُن کے یہاں مقصدیت کا غلبہ نظر نہیں آتا۔ وہ صرف گھریلو فضا ہی کو پیش نہیں کرتیں، بلکہ معاشرے اور زندگی کے پیچیدہ مسائل اور سیاسی اثرات، جماعت اور افراد کے تعلقات کو بھی اپنے ناولوں کی گرفت میں لیتی ہیں۔

عذرا میں مغرب و مشرق، قدامت اور جدت کے تصادم کی ہلکی ہلکی جھلکیاں ملتی ہیں۔ یہی مسائل اور اثرات "راہِ عمل" میں زیادہ اُبھر کر سامنے آتے ہیں۔ عذرا گھر کی چہار دیواری میں پرورش پانے کے باوجود زمانے کی رفتار سے بے خبر ہے اور نہ الگ تھلگ، اپنے شوہر کے جیل جانے پر فخر سے سر اُونچا کر لیتی ہے اور اُس کی غیر موجودگی میں اُس کے اخبار کی ادارت کا کام بحُسن و خوبی انجام دیتی ہے۔ صالحہ عابد حسین نے جن سیاسی نظریات کو پیش کیا ہے، اُن کے پس منظر اور جزئیات کا بھی احاطہ کیا ہے اور اُنھیں دلچسپ انداز میں اپنے کرداروں میں سمویا ہے۔ اُن کے سیاسی نظریے "راہِ عمل" میں زیادہ واضح نظر آتے ہیں۔ اُنھوں نے سیاسی جدوجہد کرنے والوں کو اپنے آس پاس دیکھا، ان کے نظریات و معتقدات کی تشکیل میں اُن کا ہاتھ رہا۔ آزادی کی جدوجہد میں تمام ذمہ داریاں صرف مَردوں ہی کے کاندھوں پر نہ تھیں، بلکہ صنفِ نازک نے بھی اپنے حریمِ ناز کو خیرباد کہہ کر اپنے دوشِ نازک پر ذمہ داریوں کا بار سنبھالا۔ "راہِ عمل" میں صفیہ بیگم ناز و نعمت کی پروردہ ہونے کے باوجود شوہر کے ساتھ کاندھے سے کاندھا ملا کر اجتماعی فلاح و بہبود کے کام میں منہمک ہو گئیں۔

عذرا مصنفہ کا پہلا ناول ہونے کی وجہ سے اہمیت اختیار کر لیتا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ اس ناول میں کہیں کہیں نذیر احمد کا سا واعظانہ انداز نمایاں ہو جاتا ہے اور روایت پسندی کی جھلکیاں بھی مل جاتی ہیں۔ مگر ہماری تہذیب کے دوسرے عناصر بھی پُوری تابناکی کے ساتھ نظر آتے ہیں۔ رفتارِ زمانہ کی تبدیلیاں بھی صالحہ کے ناولوں میں ملتی ہیں، پہلے پردے کی پابندی کتنی سختی سے کی جاتی تھی، مثلاً میرٹھ سے دیکھا

جاسکتا ہے۔ پھر تعلیم کے نئے پردے کو خیرباد کہا گیا۔ علم کے حصول کے لئے فضا سازگار ہوتی گئی۔ تعلیم کے سلسلے میں قدیم اور جدید کی آویزش شروع ہو رہی۔ عذرا میں انصار ایک جلسے میں انگریزی تعلیم کی خوبیاں بیان کرتا ہے تو نعیم اس کی تردید میں اس کے خطرناک نتائج پیش کرتا ہے۔ مرد اور عورت کے مساوی حقوق کے سلسلے میں بھی تصادم ملتا ہے۔ عذرا میں اس زمانے کی سماجی اور سیاسی تحریکوں کے بیانات ملتے ہیں۔ آزادی کے حصول کے لئے مختلف تحریکوں کا ذکر۔ خلافت، کانگریس، چرخہ، کھدر، جامعہ کے قیام سے قبل علی گڑھ میں ہلچل وغیرہ کا ذکر عذرا میں خوبی سے کیا گیا ہے، وقار عظیم نے صالحہ عابد حسین کے فن کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"ایک بدلتے ہوئے اور کسی حد تک بدلے ہوئے ماحول میں
زندگی بسر کرنے والوں کو قدم قدم پر اس رہنمائی کی ضرورت
ہے جس کی پیش کش ناول نگار کے سنجیدہ فکر نے کی ہے۔
ماحول کا صحیح مشاہدہ، اس مشاہدے کا منطقی تجزیہ اور
پھر ان دونوں کے ساتھ غور و فکر کی جان گیری کے بغیر اچھے
ناول کا ڈھانچہ تیار نہیں ہوتا۔ عذرا میں ناول نگار نے فن کی
ابھری بحث پر چل کر اس سے کچھ نہ فائدہ اٹھایا ہے۔"

بعض لوگوں کو ناول میں آویزش اور تصادم کا فقدان نظر آئے گا۔ مگر جس زمانے میں یہ ناول لکھا گیا تھا، اسے پیش نظر رکھتے ہوئے تنقید کرنی چاہئے۔ اس میں اجتماعی کشمکش اور آویزش نہ سہی، فرد کی آویزش شدت سے ملتی ہے۔ عذرا اور انصار کے مابین غلط فہمی کی وجہ سے آویزش شدید ہو جاتی ہے۔ یہ کچھ عرصے ہی کے لئے سہی، مگر عذرا کی جان کے لالے پڑ جاتے ہیں۔ اسی طرح ریاض کا مستقبل کی دلخستگی اور عزیزوں کی ناراضگی کی پرواہ کئے بغیر علی گڑھ چھوڑ کر جامعہ منتقل ہونا بھی کشمکش کا سبب بنتا ہے۔

اعلیٰ تعلیم کے لئے عذرا کو اپنی خواہش کو پس پشت ڈالنا پڑتا ہے، وہ علی گڑھ میں نہیں جاسکتی، مگر زمانے کے ساتھ ساتھ تبدیلیاں ہوتی ہیں اور ان کے بعد کے ناول "آتش خاموش" کی ہیروئن انجم انگلینڈ سے تعلیم مکمل کرکے آتی ہے اور بچوں کے اسکول کی رونق بن جاتی ہے ویسے عذرا کو ہر طرح کی زندگی میں حاصل ہو جاتی ہے۔ انجم محبت کی آتش خاموش میں جلتی رہتی ہے۔ لیکن عذرا کی طرح وہ اپنی محبت کے شاعر۔ بیچ

محبت خلق میں لگانے کی کوشش کرتی ہے۔ محبت کی یہ آگ انجم کے کردار کو تپا کر کندن بنا دیتی ہے۔ اس طرح صالحہ عابد حسین کے ناولوں کے کردار میں خاصہ تنوع پیدا ہو جاتا ہے، ان کے کرداروں میں عذرا، انصار، انجم، جامعہ، کول، انیس، اقبال، جیب، میاں، مکشا علی، نیرہ، حرا، آسیہ، احسن وغیرہ ہیں۔ یہ تمام کردار زندگی کے نشیب و فراز سے گذرتے ہوئے کشمکش سے دوچار ہوتے ہیں، جس سے حرکت و ارتقا کا پتہ چلتا ہے۔ اس تصادم میں ان کے جوہر کھلتے ہیں۔ وہ مصنفہ کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بن کر رقص نہیں کرتے، بلکہ سب کے سب زندگی سے بھرپور ہیں۔

"اپنی اپنی صلیب" میں فن اور زندگی کا استوار رشتہ پایا جاتا ہے۔ زندگی کی محرومیوں، ناکامیوں اور الجھنوں کو فنکارانہ انداز کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ ہر شخص اپنے دکھوں اور اپنے غموں کو سہارتا ہے اور اپنی اپنی صلیب لئے زندگی کی راہ پر رواں دواں ہے۔ اس میں "[illegible]" کی بڑی اہمیت ہے، جبکہ عذرا میں زندگی کے بیرونی واقعات اور خارجی مظاہر پر زور دیا گیا ہے۔ "راہ عمل" میں یہ بتایا گیا ہے کہ افراد کے چھوٹے چھوٹے اعمال و افعال سے ملک اور قوم کس طرح قائم ہوتے ہیں۔ "الجھی ڈور" میں عورت کے المیہ کو پیش کیا گیا ہے۔ ان تمام ناولوں کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ ان کے کردار شروع سے آخر تک ارتقا پذیر ہیں۔ عذرا کی مسز نعیم، ہمیں ان کے موجودہ ناول "الجھی ڈور" کی بی بی بیگم کے روپ میں نظر آتی ہیں، جہاں مسز نعیم اپنی بچی رضیہ کو انصار سے گھلنے ملنے کا موقع دینے کی متمنی ہیں، وہاں الجھی ڈور میں بی بی بیگم اپنی بچی کو دوسروں کے ساتھ گھومنے پھرنے کے لئے خود بھجوا دیتی ہیں۔ جس کے نتائج بھی وہ بھگتتی ہیں، لیکن بعض کردار جیسے بی بی بیگم، اختر، ستارہ وغیرہ کچھ غیر فطری لگتے ہیں۔ اسی طرح ان کے کچھ کردار مثالی بھی ہو گئے ہیں جس کی وجہ سے انھیں آئیڈیلسٹ IDEALIST کہا جاتا ہے۔ مگر مصنفہ نے اس کی وضاحت کرتے ہوئے معترضین کو یوں جواب دیا ہے۔

"انھیں وہ ماحول اور شخصیتیں نہیں ملیں یا انھوں نے
ان کو اچھی طرح پہچانا نہیں، جو مجھے خوش نصیبی سے
ملی تھیں اور میں نے ان میں سے وہ بنیادی خوبیاں، اعلیٰ اقدار
مشرق و مغرب کے امتزاج کے ساتھ سموئی ہوئی پائی تھیں، جن کی

(باقی صفحہ ۲۸ پر دیکھئے)

یہ جو تھا... تھا

صالحہ عابد حسین
جامعہ نگر۔ نئی دہلی۔ ۲۵

ہر طرف افراتفری تھی مگر وہ سب سے بے نیاز تھیں!

"یہ جو تھا تھا..."

آواز گھٹ کر ایک سسکی بن گئی۔ مگر اُن کی سننے والا کون تھا؟ سب کو اپنی اپنی پڑی تھی۔ کوئی ٹوٹے پھوٹے برتن بوریوں میں بھر رہا تھا، کوئی ٹین کے زنگ خوردہ بکسوں میں نئے پرانے کپڑے ٹھونس رہا تھا۔ کوئی خالی شیشیاں، ٹوٹے ڈبے۔ ردّی کاغذ پرانے جوتے اور نہ جانے کیا کیا الا بلا کھانچیوں میں بھر رہا تھا۔ کوئی پھونس سمیٹ رہا تھا اور کوئی بستروں کا گودڑ رسّی سے باندھ رہا تھا۔ انہیں اپنے گھروں کی ہر چیز پیاری تھی!

"ہائے..... میرے مولا ... یہ بھی چھین لیا — ارے جو تھا تھا"

سیاہ اینوں کے کھٹولے پر جس کا ایک پایہ کسی مہربان کی بے دردی سے جرکر دو ہو چکا تھا، وہ سر پکڑے بیٹھی تھیں..... آس پاس کی دُنیا سے بے خبر! کپکپاتی باہیں..... جھریوں سے چُنے ہوئے سوکھے ہاتھ، عمر اور مصائب کے بوجھ سے ہلتی گردن میں کتنے ہی بل پڑے تھے۔ پتلی سی نوکدار ٹھوڑی پر دو پھڑکتے ہوئے سوکھے لب، جھکی ہوئی ناک جس میں ایک ننھی سی چھوٹے نگ کی لونگ کبھی کبھی سورج کی کرن سے دمک اُٹھتی تھی۔ اور ناک کے اوپر شمع کی طرح جلتی ہوئی دو بڑی بڑی آنکھیں.... لگتا آنسو ان میں منجمد ہو گئے ہیں۔ سر پر نردی مائل چاندی کے باریک تاروں کا ایک اُلجھا ہوا جھنڈ جو ایک تاج کی طرح اٹھا ہوا مصائب کے مارے اس بوڑھے چہرے کو عجب وقار، عجب کشش بخش رہا تھا۔

"ہائے — یہ — جو تھا تھا"

جب تیسری بار اُس نے یہ جملہ سُنا تو وہ ٹھٹھک کر کھڑا ہو گیا۔ بچاری بڑھیا کا شاید دماغ کچھ چل گیا ہے۔ بھلا اس عمر میں "جو تھا" کہنا شاعر بھی ہوگا؟

آیا تو وہ اپنا فرض ادا کرنے کے لئے تھا مگر انسانیت کے ناتے اِدھر سے اُدھر گھوم پھر کر لوگوں کو تسلی دِلاسے دے رہا تھا۔ اُنہیں سمجھا رہا تھا کہ گھبراؤ نہیں۔ آنے والے زمانے کی خوشحالیوں اور آسائش کا نقشہ کھینچ کر ان کی پریشانی اور وحشت کو کم کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ انسانی فطرت کی اس کمزوری کو سمجھتا تھا کہ اُسے اپنے پرانے مسکن سے، خواہ وہاں کتنی ہی تکلیفیں ہوں، بہت لگاؤ ہوتا ہے۔ اس نے سوشل ورک کو اپنایا ہی اسلئے تھا کہ اس کا دل انسانوں کی محبت سے لبریز تھا اور اسمیں ان کے لئے کچھ کرنے کی لگن تھی۔

وہ کئی منٹ تک ان کے پاس کھڑا رہا تھا۔ شاید یہ ویران نظریں اس کی طرف پلٹیں..... شاید وہ اپنا دُکھ درد اس سے کہیں...... شاید وہ اُنہیں سمجھا سکے — مگر نظریں تو سامنے جھونپڑی پر جمی ہوئی تھیں، وہ پہلی تاج دار سو دھیرے دھیرے چل رہا تھا اور جنٹ پڑی باہیں فضا میں یوں حرکت کر رہی تھیں جیسے کسی بھاگتی شے کو تھامنا چاہتی ہوں:

"آہ — یہ — جو تھا تھا"

"بڑی بی — بڑی بی" وہ اُن پر جھکا۔

"ارے بھیا! اس بڑھیا کا تو دماغ پھر گیا ہے۔ اس سے کیا پوچھتے ہو"— پاس سے گزرتے ایک نوجوان نے بے دردی سے ہنستے ہوئے کہا۔ "جو تھا تھا — جو تھا تھا' تھا تو تھا — جانے والی چیز چلی جاوے ہے — پھر کون روک سکے ہے — جو تھا ہو یاد ہوں — یا پہلا — " اور وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا آگے بڑھ گیا۔

غریب عورت۔ سچ مچ صدمے سے دماغ چل گیا ہے—

اس کا مرد چھوڑ کر چلا گیا۔ اب وہ اکیلی کیا کرے۔ دوسرے لوگ اپنا اپنا گھر سمیٹ رہے ہیں۔ اپنے فائدے کی باتیں سوچ رہے ہیں اور یہ ماضی کی یادوں میں کھوئی ہوئی ہے۔

"بڑی بی! تم نے اپنا سامان سمیٹ لیا؟" اس نے بڑا و پاست سوال کیا۔ بڑھیا نے نظریں اٹھائیں، اسے دیکھا اور منہ پھیر لیا۔ وہ مایوس ہو کر دوسری طرف چلا گیا۔ اپنے ساتھیوں سے کچھ احکام دیئے۔ ایک پیالی چائے پی اور پھر گھوم پھر کر بڑھیا کے کھنڈر کے پاس آ کھڑا ہوا۔ وہ کھنڈر پر گٹھڑی بنی پڑی تھی۔ مگر کسی کو اسکی فکر نہ تھی۔ نفسا نفسی کا عالم تھا!

"بڑی بی"..... مگر یہ لفظ جیسے گلے میں پھنس گیا..... اندر سے ایک آواز نکلی "ماں جی ــــ ماں جی" اور فوراً ہی بہرے کانوں نے محبت کی یہ پکار سن لی۔ اُنہوں نے سر اٹھایا، آنکھوں میں شعور کی ایک لہر سی دوڑ گئی! "ماں ــ ماں ــ کون ماں ــ کس کی ماں؟" انکے لب ہلے۔

"ماں جی!" اُس نے ذرا سہارا دیکر بڑھیا کو اٹھایا اور چائے کا وہ گلاس جو ابھی ایک آدمی اسکے ہاتھ میں تھما گیا تھا، بڑھیا کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ اُن آنکھوں میں اب حیرانی تھی، وحشت نہ تھی۔ آنسو تھے، نفرت نہ تھی۔ ممتا تھی، بے گانگی نہ تھی۔ اور ایک ہی سانس میں وہ سارا گلاس پی گئیں، جیسے جنم جنم کی پیاسی ہوں۔

"ہاں بیٹا ــــ یہ جو تھا تھا ــ پھر وہی جملہ۔ اُس کا دل ڈوب گیا! کیسے وہ اس کے ذہن کے دریچوں کو کھولے۔

"ماں جی ــــ تم ایسا کرو..... مجھے بتا دو، میں تمہارا سب سامان سمیٹ کر باندھ لوں گا، تم فکر نہ کرو ــ" وہ اُن کا دھیان اُس چوٹ کی طرف سے ہٹانا چاہتا تھا..... اب فکر کرنے کو رہا کیا ہے؟

"فکر ــ کس کی فکر بیٹا ــــ پہلا چھوٹا تھا تو وہ رو کر جان پر بنا لی تھی۔ اسے کیا یاد تھا۔ ماں باپ کی محبت و شفقت۔ بھائی بہنوں کی پیار بھری جھڑپیں، سکھی سہیلیوں کی سنگت۔ جھولوں کی بہار۔ میلوں کی سیریں، وہ بے فکری، وہ الھڑ پن..... وہ میرا پہلا تھا۔ سونگ تھا سونگ..." بات کرتے کرتے ایسا لگا وہ وہاں سے بہت دور کسی اور دنیا میں..... کھو گئی ہیں..... وہ بت بنا انہیں دیکھتا رہا ــــ حال کی دنیا سے بے خبر گم ماضی کی یادوں سے بھرپور ــــ

پھر وہ جیسے واپس آ گئیں اور اس کی اور یوں تکنے لگیں جیسے

کھویا بیٹا مل گیا ہو ـــ "بیٹھ جا بیٹا۔ کب تک کھڑا رہے گا ــ" اور وہ ان کے برابر ٹی پر ٹک گیا۔

"پھر دوسرا..... دوسرا ملا....." ایسا لگ رہا تھا جیسے کوئی اُنکے سامنے کھڑا پیار بھری نظروں سے اُنھیں دیکھ رہا ہے۔ آنکھوں میں غیر انسانی سی چمک، ہونٹوں پر شرمیلی سی ہنسی، آواز میں جوانی کی کھنک آ گئی تھی..... "دوسرا ــــ دوسرا ــــ کیا نہ تھا اُس میں۔ ماں کی محبت۔ باپ کے پیار سے بڑھ کر راحت۔ بھائی بہنوں، سہیلیوں کی سنگت سے زیادہ اُس کا ساتھ اچھا لگتا تھا۔ اس کو سنوارنے، نکھارنے، اسکی سیوا میں جو لطف آتا، جو سکون ملتا..... ہائے، وہ جیون کا سنہرا سپنا، وہ دنیا ہی میں جنت تھا۔ اُسے تو آج تک نہ بھول سکی۔ کوئی عورت کبھی نہیں بھول سکتی بیٹا......." وہ ان کی طرف درد بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ سچ ہے جوانی کی محبت میں ایسا ہی نشہ، ایسا ہی سکھ ہوتا ہے۔

"پھر کیا ہوا ماں؟"

"پھر ــــ پھر ــــ وہ بھی چھوٹ گیا۔ وہ کیا چھوٹا دنیا لٹ گئی۔ دوست چھوٹے، ہمسائے چھوٹے۔ دیش چھوٹا۔ یہ زخم تو کبھی نہیں بھرے گا ــــ کبھی نہیں ــ مگر انسان ــ عورت ــ اس کے بنا رہ بھی تو نہیں سکتی نا ــــ وہ تو اس کی زندگی ہوتا ہے ــــ سہارا ہوتا ہے ــــ عیش و عشرت نہ سہی، راحت و آرام نہ سہی۔ پھر بھی سر چھپانے کو ٹھکانا تو چاہیئے نا؟"

وہ حیرت سے اُنہیں دیکھ رہا تھا۔ جیسے بے ہوشی یا بے خودی ختم ہو چکی تھی! اب وہ ایک باشعور عورت کی طرح باتیں کر رہی تھیں۔ جس نے اچھے دن دیکھے ہوں۔ اچھی صحبت، اچھے گھر ــ اچھے خاندان والی!

"اور وہ بھی چھوٹ گیا"

وہ سوچ رہا تھا ــــ ہر بار وہ ایک چھوڑ کر دوسرا کر لیتیں اور ہر ایک سے ویسا ہی پیار ویسا ہی گہرا تعلق پیدا ہو جاتا ــ عجیب عورت ہے یہ بھی! یہ تو مرد کی عادت ہے، فطرت ہے ــ عورت ــــ ہندوستانی عورت کی تو نہیں!

"تم مجھے یوں کیوں دیکھ رہے ہو ــــ پاگل سمجھتے ہو ــــ ہاں پاگل تو ہوں ہی ــــ جس کا ایک کے بعد ایک چھوٹتا جائے وہ پاگل

نہ ہوگی ....." اُن کے لہجہ میں دُکھ تھا، شکایت تھی۔ وہ شرمندہ ہوگیا۔
"نہیں ماں! تمہیں کون پاگل سمجھے گا — تم تو بڑی ہوش مند ہو۔" مگر وہ اس چھپے طنز کو نہ سمجھ سکیں!

"ہوش مند؟ بدنصیب کہو۔ بدبخت کہو۔ ہائے کس طرح میں نے تنکا تنکا چُنا، ٹکڑوں کو سمیٹا، کرچی کرچی دل کو جوڑا ..... جو تھا بسایا۔ دن رات اس کی سیوا کی۔ جان کو جان نہ سمجھا۔ آنکھیں پھوڑ پھوڑ کر سلائیاں کیں، دوسرے کے جھوٹے برتن دھوئے، روٹیاں تھوپیں۔ جو کبھی نہ کیا تھا وہ اس کے لئے کیا۔ دس سال پورے، پورے دس سال اس کی سیوا کی ..... اور اب — اور اب —" ان کی آواز سسکیوں میں ڈوب گئی!

اس نے چاروں طرف دیکھا — وہ "جو تھا" آخر گیا کہاں؟ شاید وہ کبھی اسے چھوڑ کر بھاگ گیا ..... تبھی یہ اپنی ذات تک سے بیگانہ ہوکر اول فول بک رہی ہے!

"ماں جی! آپ کے میاں گئے کہاں آخر؟"

اُنہوں نے حیران نظروں سے اس کی طرف دیکھا — "میاں؟ کہاں گئے؟" — "ہاں آخر وہاں جاکر بھی کچھ کرنا دھرنا ہوگا یا یونہی نیا گھر بس جائے گا؟" ذرا تلخی سے اُس نے کہا۔

"میاں؟" وہ ہنسی! اُف کس قدر کھوکھلی ہنسی تھی۔ جیسے خالی برتن میں ٹھیکرے بج رہے ہوں۔ "میاں! اُس نے تو دس برس سے لوٹ کر خبر نہ لی۔ جانے کہاں گیا — کوئی اور عورت کرلی یا مر کھپ گیا۔ ..... وہی ہوتا تو یہ بلڑا کیوں ہوتا —" وہ جھلنگا چارپائی پر یوں گری جیسے کسی درخت کی سوکھی شاخ ڈال سے الگ ہوکر گر پڑتی ہے۔

اب کے حیران ہونے کی اسکی باری تھی — جب وہ دس سال پہلے ہی چھوڑ چکا تھا تو پھر — یہ یاد — یہ بے قراری؟ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا!

پھر ایک نعرہ بلند ہوا "ہائے — یہ جو تھا — تھا۔"

"ماں آخر تم کسے جو تھا جو تھا کہہ رہی ہو — کہاں ہے وہ جو تھا؟"

بڑھیا نے اس کی سمت ایسی نظروں سے دیکھا جس میں ہزاروں اَن کہی شکایتیں تھیں ..... اور اپنا سوکھا ہاتھ سامنے کی جھونپڑی کی طرف اٹھایا .....

اللہ رے پھر میاں سب کچھ اُس پر روشن ہوگیا ..... آہ تو اپنا گھر اجڑنے کا غم اُسے کھائے جارہا ہے ..... حیرانی، پشیمانی، شاعر بھی

غلط فہمی اور ہمدردی کے جذبات کو پس پشت ڈال کر وہ سمجھانے پر تل گیا — وہاں تمہیں اچھا گھر ملے گا۔ صاف ستھری جگہ ہوگی۔ — میٹھا پانی — نہ مکھی، نہ مچھر، نہ گندگی — نہ کیچڑ — نہ بدبو.. اور وہ خود ان کے لئے بس کام کریگا۔ وہ اکیلی ہیں تو کیا اب تو وہ اُن کا بیٹا بن چکا ہے .....

"ارے بیٹا — کل کس نے دیکھی ہے —" آواز تھی کہ ٹوٹی بانسری کے سُر!

"ہاں جی! اب اُٹھو — میں بس کرلوں گا —"

"ہائے — یہ ..... جو ..... تھا"

ٹکڑے ٹکڑے ہوکر یہ بول اُن کے مُنہ سے جیسے لڑھک پڑے ... اور پھر لب ساکت ہوگئے ..... گردن ڈھلک گئی۔ سفید بالوں نے چہرے کو یوں ہالہ کرلیا تھا جیسے گرہن لگے چاند کے گرد بادلوں کا ہالہ ہوتا ہے ..... اور مرجھائی ڈنڈی کی طرح داہنا ہاتھ پلنگ سے نیچے لٹک گیا تھا!

وہ موعودہ آرام دہ گھر بسانے کی جگہ — ایک مستقل گھر کی تلاش میں کہیں دُور — بہت دور — جا چکی تھیں ○○

بقیہ: عذرا سے اُلجھی ڈور تک صفحہ ۲۵

ناقص سی جھلک میرے کرداروں میں نظر آتی ہے"۔

صالحہ عابد حسین نے حصولِ تعلیم پر زور دیا ہے، اسی طرح مغربی تہذیب کے صالح عناصر، آزادی کی جد و جہد، تقسیم کے نتائج، ملک کی فلاح و بہبود کی کوشش اور انفرادی زندگی کی کشمکش وغیرہ کو اپنے ناولوں میں فنی بصارت و بصیرت کے ساتھ پیش کیا ہے، عذرا کے زمانے میں جو مسائل دبیز تہوں میں پوشیدہ تھے، وہ اُلجھی ڈور تک کھُل کر سامنے آجاتے ہیں۔

اچھے فن پارے موضوع اور بیان کی ہم آہنگی سے وجود میں آتے ہیں۔ اُن میں مصنف کی شخصیت کا اظہار ہوتا ہے۔ کیونکہ اُن کی فکر و نظر کی گہرائی سے فن میں نکھار پیدا ہوتا ہے۔ صالحہ عابد حسین نے کہا ہے۔

"ادب محض تفریح یا دماغی عیاشی کے لئے نہیں بلکہ اُس کا مقصد بہت بلند ہے اُسے حقیقی بولتی چالتی زندگی کا آئینہ ہونا چاہئے"

اور یہ بات مصنفہ کے فن پر پوری طرح صادق آتی ہے ○○

پھاہے، پٹّیاں، پرتیں

صالحہ عابد حسین
جامعہ نگر - نئی دہلی ۲۵

ایک ذرا سی بات ...... اور ساری کوششوں پر پانی پھر گیا۔ پٹیاں اُکھڑ گئیں ...... پرتیں گر گئیں، پھاہے الگ ہو گئے۔ ساری رنگ برنگی پٹیاں دھجیوں کی طرح اِدھر اُدھر بکھری پڑی تھیں۔ چودہ ہزار چار سو دن اور راتیں فضا میں تحلیل ہو گئے۔ اتھاہ گہرائیوں سے اُچھل کر ننگی حقیقت آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اُسے دیکھ رہی تھی ...... سوال پوچھ رہی تھی ......

یہ پرتیں، یہ پٹّیاں یہ پھاہے؟ کس لئے؟ کیا تم کامیاب ہوئیں؟ زخم کا انگور بندھا؟ گھاؤ مندمل ہو سکا؟ لہو تھما؟ ناسور کا منھ بند ہوا؟

اوہ یہ پھاہے، یہ پٹّیاں، یہ پرتیں!

کتنے بوجھ تلے تم نے مجھے کچل کر رکھا ہے؟ مگر تم کامیاب نہیں ہوئیں نا؟ فطرت سے بغاوت؟ ہُنہ! دنیا سے چھپانے کے یہ ڈھونگ! تم بھول تو نہ سکیں؟ آگ۔ یہ آگ کہیں ان چھینٹوں سے بجھتی ہے؟ ناسور مرہم کے پھاہوں سے بھرا ہے؟

پرتوں پہ پرتیں! پٹیاں جمتی چلی گئیں۔ گہرائیوں میں ڈھکیلتی رہیں ...... مگر کیا تم کامیاب ہوئیں؟ میں تمہارے دل میں سوئی کی نوک بن کر نہیں ٹوٹ چکی ہوں۔ تمہارے من میں کانٹا بن کر نہیں کھٹکتی رہی ہوں؟ — تم ادھوری ہو — ادھوری تھیں — ادھوری رہو گی۔ تمہارا دامن خالی تھا، ہے اور رہے گا — تمہاری پیاس نہ کبھی بجھی تھی نہ بجھے گی۔

جانے دل کی کن اتھاہ گہرائیوں سے یہ مُورتی زخم کو چیر کر نکل آئی تھی اور آنکھوں میں آنکھیں ڈالے اُسے چنوتی دے رہی تھی ...... سوال پر سوال کر رہی تھی۔

نہیں — نہیں — نہیں!

شاعر بھی

یہ غلط ہے۔ یہ جھوٹ ہے! بالکل جھوٹ!

وہ ادھوری نہیں پوری ہے۔

وہ دکھی نہیں سکھی ہے۔ وہ پیاسی نہیں سیراب ہے۔

کیا ہوا اگر اس نے محبت کھو دی ...... کتنی محبتیں پائی بھی تو ہیں۔ ایک گھاؤ پر کتنوں نے مرہم رکھا ہے! ایک گوہر بے بہا گم ہوا ہے تو کتنے لولوئے شہوار اُس کی گردن میں جگمگائے ہیں۔ آبِ حیات کا چھلکتا جام ہونٹوں تک آ کر چکنا چور ہوا تو کیا۔ ٹھنڈے میٹھے پانی کے کتنے پیالوں نے اُس کے خشک ہونٹوں کو تر کیا ہے! جگر کا ایک ہی تو ٹکڑا ٹوٹ کر گرا ہے۔ ایک ہی نام — تو خاک میں ملا ہے، مگر ...... مگر ......

مگر اُسکے دل و دماغ کی کوکھ سے کتنے جگر گوشوں نے اس کے دل کو سہارا دیا ہے۔ اُس کو زندہ اور باقی رکھنے کا عہد کیا ہے۔

اُس کا فن — یہ — جان سے زیادہ پیارے معنوی بچے ...... ان کو کون اُس سے چھین سکتا ہے۔ شاید قدرت بھی اس پر قادر نہیں۔ یہی میرے زخم کا مرہم ہیں۔ میرے دل کا سکون، روح کا چین میری پیاس بجھانے والے!

ایک قہقہہ گہرے گھاؤ کے سوکھے ہونٹوں سے اُبھرا ...... اور پھر وہ ہنستا ہی چلا گیا ...... ہونٹوں سے لہو رسنے لگا ...... جیتا جیتا خون اُبلتا ہی چلا گیا ...... یہ طویل قہقہہ ...... وہ اس کا مذاق اڑا رہا تھا۔ تضحیک کر رہا تھا۔

اس نے ایک ہاتھ سے سر تھام رکھا تھا، دوسرے سے دل۔ مگر آوازیں ...... ان کو کیسے روکے؟ باہر کی آواز کو بند کیا جا سکتا ہے، دبایا جا سکتا ہے۔ کان بند کئے جا سکتے ہیں۔ مگر یہ آوازیں؟ یہ ہنسی! اُف خدایا!

اس غار کا منھ چھپانے کے لئے اس نے کیا کیا جتن نہ کئے؟ اس گہرے گھاؤ کو کتنی پرتوں کے نیچے، شعور اور لاشعور کی کوششوں نے

دفن نہیں کیا........

زندگی کی خوشیوں میں حصّہ لیکر...... جان سے زیادہ پیاروں کی محبت اور دوستی میں ڈوب کر..... چاہنے والوں کی خاموش ہمدردی کا پھاہا سینے پر رکھ کر...... دوسروں کی ماتا میں حصّہ بٹا کر..... اوروں کے چراغوں سے اپنے سیاہ خانے کو منوّر کرنے کی ان تھک جدوجہد میں.......

دوسروں کے جگمگاتے جواہرات سے اپنا گھر سجا کر..... دوسرے کے باغوں کی خوشبو سے دل ودماغ کو معطّر کر کے: غیروں کو اپنانے کی دلدوز، دل شکن، دلکش اور دلفریب کوششوں میں اپنے کو کھو کر......

تن من دھن..... دوسروں کے لئے وقف کر کے۔ بدگمانیوں، بے دردیوں، بے رخیوں کو نظر انداز کر کے.......

اپنوں کی رُکھائی، بےحسی اور بے پروائیوں کو بھلانے کی اور من ملے معنی پہنانے کی سعی میں؛ غیروں کو اپنا لینے کا دل کو فریب دیکر، اُن کے محبّت وخلوص کی چھاؤں میں بیٹھ کر...... محبت اور اپنائیت کی داد پانے کی توقع کو دم توڑتے دیکھ کر صبر کی سِل دل پر، اور بے پروائی کی نقاب چہرے پر ڈال کر...... محلّے، پڑوس، اپنوں اور غیروں کی خوشی اور غموں میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیکر...... خدمت اور سیوا کے جھمیلوں میں پڑ کر!

بیماروں کی تیمارداری، مریضوں کا مداوا علاج مصیبت زدوں کی غم خواری کی ناکام کوششوں میں..... مفلسوں اور ضرورت مندوں کی مصیبت میں ذرا سی کمی کرنے کی سعی میں..... کتنے ٹھنڈے پھاہے ہیں یہ...... کتنا سکون اور راحت دیتے ہیں! اور پھر..... یہی کیا۔ دوسروں کو اپنے دکھ میں دکھی ہوتے دیکھنا، بیماریوں میں محبّت کرنے والوں کی خدمت اور دل داری حاصل کرنا؛ جان لیوا غموں میں غم بٹانے والوں کی دردمندی اور دل سوزی کی راحت! ان چاہنے والوں کے پیار سے مغلوب ہو کر جو اس کی زندگی، اس کا پیار، اس کا اعتماد چاہتے ہیں۔

جو اس کی کمزوریوں، خامیوں اور غلطیوں کو نظر انداز کر کے چاہتے رہتے ہیں۔ دنیا کی نظر میں وہ اُس کا خون نہیں۔ مگر اسکے دل کا خون، تمدّح کی پیاس، درد کا درماں تو ہیں۔

شاعر بیگی

اپنے رفیق ودوست کی محبت ورفاقت، اتھاہ پیار، گہرے اعتماد، اُن کہی ہمدردی میں...... زندگی کی صلیب کے بھاری بوجھ کو اُٹھانے میں اِس کے خاموش سہارے میں..... اُس نے کیا نہیں پایا؟ راحت، سکون، مسرّت، ہاں ہاں۔ یہ مرہم، یہ پھاہے، یہ پرتیں..... یہ تو اُس کے جیون کا سہارا ہیں۔ اور یقین وایمان کا اٹوٹ ستون؛ سب سے مضبوط سہارا، سب سے بڑی دولت، سچّا سکون!

تم! تم کون ہوتے ہو ان پر ہنسنے والے۔ ان کی تضحیک کرنے والے؛ کیا کیا نہیں پایا اس نے؟؟

زندگی کے چھلکتے جام نے اُس کی پیاس ہمیشہ بجھائی ہے! زندگی کی راحتوں اور مسرّتوں نے اُس کی جھولی ہمیشہ بھری ہے!

کیا ہر چیز سے اُس نے لطف نہیں اٹھایا؟ باغ کی رنگینیوں سے! پھولوں کے رنگ وبُو سے، سبزے کی لہلہاہٹ سے، کچّے پھولوں کی بھینی مہک سے؛ چڑیوں کے چہچہوں سے!

آسمان پر بکھرے شفق کے رنگوں! چاند کی ٹھنڈی دلکش چاندنی! سورج کی ڈوبتی سنہری تھالی، سمندر کی پُرشور لہروں! دریا کی ہلکورے لیتی موجوں، پہاڑوں کی فلک بوس چوٹیوں اور جھیلوں کی نیلگوں گہرائیوں نے اُسکے دل اور روح کو مسرّت بخشی ہے! اِس زندگی میں صرف ایک ہی سکھ تو نہیں، ہزاروں سکھ ہیں! ہزاروں راحتیں ہیں!

کون سی چیز سے اُس نے زندگی کو نہیں سجایا؟ حسین ونفیس چیزوں سے! مکان میں رچی بسی عافیت کے احساس سے، گھر کی ہلکی پھلکی سجاوٹ سے۔ راگ کے سُر! تصویروں کی لکیریں اور رنگ! گھر کی دل خوش کن احساسِ ذمّہ داری! کیا یہ سب جھوٹ ہے؟ کیا ان میں زندگی کا سکھ اور راحت نہیں؟

اُس نے کیا نہیں پایا! دُنیا کی سیر وسیاحت کے مواقع! مقدّس مقامات پر عقیدے اور ایمان کو دل کی گہرائیوں سے اُبھرتے دیکھ کر اور مقاماتِ مقدسہ پر سرِ نیاز خم کرنے کی سعادت! حسین تاریخی عمارتوں کی عظمت اور دلکشی کو آنکھوں کی راہ دل میں اُتار کر..... اور.......

اور— مطالعے کی بے بہا دولت سے، کتابوں کی رفاقت میں، کردار کی تخلیق کی لذّت میں..... کتنی راحتیں، کتنی نعمتیں، کتنی مسرّتیں! اُس کی جھولی میں کیا کچھ نہیں تھا! کیا کچھ نہیں ہے؟

مگر یہ قہقہے، یہ ظالم قہقہے کیوں— یہ دل سے اُبلتا لہو....

آنکھوں سے بہتے چشمے کیوں؟

کیا زمانے میں محبت کے سوا اور غم نہیں ہیں؟ کیا اس گھاؤ کے بعد اس سے پہلے اور زخم نہیں کھائے؟ ہُنہہ! یہ ننھا سا گھاؤ! یہ ننھا سا داغ ـــ یہ چھوٹا سا ناسور! ہُنہہ!

غم کے اُن پہاڑوں کے سامنے اس کی حقیقت ہی کیا' جلنے والوں نے اس کے سارے وجود کو کچل دیا ہے!

ان جدائیوں کے گھاؤ کتنے گہرے' ان پیاروں کی یادیں کتنی جان لیوا' ان دوستوں کی محرومی کتنی ناقابلِ برداشت ہے کہ زندگی اجیرن' سُنسان اور بے معنی ہو کر رہ گئی ہے! مگر ـــ یہ چٹان ـــ دل کی یہ چٹان تو ان کو بھی سہار گئی!

یہ ہنسی بند کیوں نہیں ہوتی؟ یہ آوازیں کہاں سے چلی آ رہی ہیں! خوشیاں؟ سکونِ قلب؟ رُوح کی سیرابی؟ دل کا چین؟ راحتیں! پھر..... یہ ذرا سی بات دل میں چُبھ کیوں جاتی ہے؟

پتھر کی یہ بھاری چٹان' ایک جملے' ایک منظر' ایک نظر سے ہل کیوں جاتی ہے!

یہ پل بھر میں سارے پربت' سارے پہاڑ' ساری چٹانیں غائب کہاں ہو جاتی ہیں۔ یہ گھاؤ رِسنے کیوں لگتا ہے' زخم سے لہو کیوں اُبلتا ہے؟ آنکھوں کے سوتے کیوں پھوٹ بہتے ہیں! روح میں یہ کانٹا کیوں چُبھتا ہے؟

ہُنہہ! بودے۔ بے کار' فضول ہیں یہ چیتھڑے ـــ یہ پٹیاں! یہ پرتیں! مان کیوں نہیں لیتی کہ یہ سب دھوکے ہیں۔ فریب ہیں! تم فریب خوردہ ہو! خود اپنے آپ کو فریب دیتی رہتی ہو!

تمہاری روح کی پیاس کبھی نہیں بجھتی!

یہ گھاؤ سب سے گہرا ہے۔ یہ جدائی سب سے رُوح فرسا ہے یہ ناسور ـــ کبھی نہ بھرنے والا ناسور!

آہ! یہ آوازیں..... یہ آوازیں..... یہ قہقہے درد میں کیوں ڈوبے جا رہے ہیں۔ یہ ہنسی گریہ میں کیوں سموئی ہوئی ہے؟ یہ شور ـــ یہ شور بدل کر سرگوشی کیوں بن گیا..... کہ..... کہ گھاؤ کوئی نہیں بھرتا..... داغ کوئی نہیں مٹتا..... ناسور مندمل نہیں ہوا کرتا۔

غم کا ساگر کبھی پایاب نہیں ہوتا!.....

کتنی تلخ ـــ مگر کتنی سچی حقیقت!

شاکر بھٹی

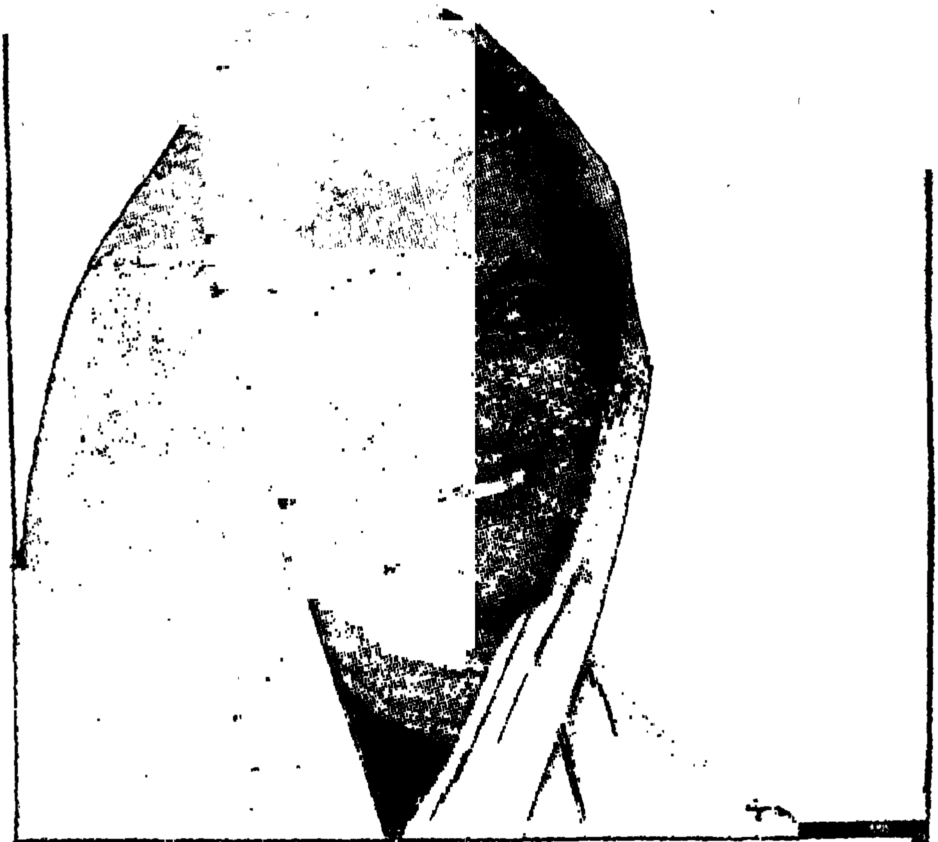
اس سچائی کو کیسے کوئی جھٹلائے کہ جو محبت سیراب ہو جائے' جس پیار کی چھاؤں زندگی کو مل جائے۔ جس پیارے کی باہیں گلے کا ہار بن چکی ہوں' جس عزیز کی دوستی اور چاہت کا آبِ حیات روح کو سیراب کر گیا ہو' اس کی جدائی کے زخم میں یہ ٹیس' یہ جلن نہیں ہوتی۔ یادیں ـــ پیاری یادیں۔ دلکش یادیں جینے کا سہارا بن جاتی ہیں۔ اسی لئے اس میں وہ تڑپ' وہ بے قراری نہیں ہوتی' وہ آگ سینے میں نہیں بھڑکتی۔ جو زخم کو بھرنے ہی نہ دے۔ یہ تڑپ کسک بن جاتی ہے۔ میٹھی پُر لذت کسک! اور یہ کسک ہی درد کا درماں بن جاتی ہے۔ مگر..... مگر جو کانٹا گوشت کے اندر ٹوٹ کر پیوست ہو جائے؟ جو محبت پھلنے پھولنے سے پہلے مٹی میں مل جائے؟ جو پھل ڈالی پر پکنے سے پہلے ہی توڑ کر اچھال دیا جائے۔ جو کلی کھلنے سے پہلے مرجھا جائے! ممتا کا جو چاند طلوع ہونے سے پہلے ڈوب جائے؟ یہ داغ' آسمان کے چاند کی طرح ہمیشہ چمکتا رہتا ہے۔ اسی گھاؤ میں بھٹی کی سی آگ دہکتی رہتی ہے.....

یہ پیاس ـــ روح اور دل کی یہ پیاس ہمیشہ پپیہے کی طرح پانی کی تلاش میں بھٹکتی رہتی ہے..... یہ پپیہا ـــ ہمیشہ پی کہاں' پی کہاں کی رٹ لگائے رہتا ہے..... یہ اَن کہے' ان سُنے بول..... جسم و رُوح کے رشتے میں جڑے ہوئے یہ بول۔ رگِ جاں میں دوڑنے والے یہ بول۔ ہمیشہ کھٹکتے رہتے ہیں! اسی لئے کبھی کبھی بہانے بہانے اس زخم کا منہ کھل جاتا ہے۔ پرتیں اُکھڑ جاتی ہیں..... آنکھوں کے چشمے اُبل پڑتے ہیں۔

مگر..... یہ محرومی کے داغ تو نہیں!

یہ ناکامی کے گھاؤ کہاں ہیں؟ ان میں نفرت کی جلن نہیں! دوسروں کی محبت سے جلنے اور حسد کرنے کی چھوت کی بیماری نہیں! یہ خود رحمی کی لعنت نہیں! یہ گھاؤ نہیں' محبت کا دمکتا ہوا چاند ہے! یہ زخم نہیں' ممتا کا نکھرا ہوا پھول ہے! یہ آنسو نہیں' پیار کے موتی ہیں! یہ روح کی پیاس نہیں' فن کو مہمیز کرنے والے تازیانے ہیں! یہ دل کی آگ نہیں' فن کا شعلۂ طور ہے۔ یہ نارِ نمرود نہیں' گلستانِ ابراہیم ہے۔ اسی سے تو زندگی میں معنی' پیار میں گہرائی اور فن کو جلا ملتی ہے۔ یہ تو انسان کو جی جی کر مرنے اور مر مر کر جینے کا گُر سکھاتا ہے..... نہیں نہیں یہ محرومی نہیں' ناکامی نہیں' مصیبت نہیں' عذاب نہیں..... یہ راحت ہے۔ مسرت ہے۔

(بقیہ صفحہ [illegible] پر دیکھئے)



"غریب اور کمزور طبقوں کی بھلائی

کے پروگراموں کی تلاش جاری رہنی چاہیئے اور ان پروگراموں کو ٹھیک طریقے سے لاگو کرنے کی مسلسل کوشش بھی کی جانی چاہیئے"

—— اندرا گاندھی

آیئے! قومی تعمیر کے کام میں جُٹ جائیں

دانش فرازی

منزلِ بے سکوں

یہ دیوار اس بات کی ہے علامت
کہ منزل ایک کمرہ قریب آرہی ہے۔
مگر کارواں میں خدا جانے کتنے مسافر ہیں ایسے
کہ منزل کی قربت کے احساسِ جانکاہ سے دل گرفتہ
خوں چکیدہ
کسی بیشِ افتادہ کربِ دروں سے پریشان و مغموم ہیں۔
اور مجبور ہیں۔
تو اس سے یہ معلوم ہوتا ہے منزل بھی راحت گہِ گُشتۂ غم نہیں ہے
کہ زخمِ دروں کا یہ مرہم نہیں ہے۔
چلو اُس طرف دو برہنہ بدن اختلاطِ مسلسل کے تپتے ہوئے
ریگ زاروں میں تھک سے گئے ہیں۔
انھیں سے یہ پوچھیں۔
کہ ڈھلتی ہوئی رات کے نیم خوابیدہ لمحوں نے کتنا سکوں تم کو بخشا
تمہارے لہو میں تپش کس قدر ہے سُلگتے ہوئے لمس کی لذتوں کی
جو تم ریت سے بھاگ کر اک سمندر میں ڈوبے ہو۔
جذبات کی پیاس کتنی بجھی ہے۔
کہ سچ سچ بتاؤ تمہیں دل کی آسودگی کچھ ملی ہے؟۔

○ ۵-۲-۵ خطیب اسٹریٹ - بارہ پیٹ - وانمباڑی
(تامل ناڈو)

تنہا تماپوری

خون اور خون

زندگی!
بے حسی سے کیا حاصل!؟
جبکہ تُو نے بھی خون دیکھا ہے
گندی گلیوں میں، اُونچے محلوں میں!
اور تاریخ کے فسانوں میں......!!
بس وہی خون جو ٹپکتا ہے۔
صرف وہ خون جو کہ بہتا ہے۔
اور فقط وہ جو سُرخ ہوتا ہے!!

میرے "مَیں" کا ہوا ہے مجھ میں خون!!
اور یہ خون ہے اُصولوں کا،
نظریوں، فلسفوں، عقیدوں کا
میرے خوابوں کا خواہشوں کا خون......"
جو ٹپکتا ہے اور نہ بہتا ہے
جس کا کچھ رنگ ہے نہ نام کوئی
صرف احساس دیکھتا ہے جسے
اور وہ احساس میری قسمت ہے!!

زندگی!
مجھ سے لے مرا احساس
اور دو پل ہی جی کے دیکھ ذرا

○ پوسٹ رنگم پیٹ - ضلع گلبرگہ (کرناٹک)

کرشن چندر اور نسوانی کردار

حیات اقبال
صدر شعبۂ اردو، گورنمنٹ ٹی ایم کالج۔ گڈیاتم-۲

دنیا کے وجود کی تکمیل عورت سے ہے۔ مرد کی شخصیت کی تکمیل بھی عورت کی مرہونِ منّت ہے۔ عورت ازل سے جاذبیت اور دلکشی کا مرکز رہی ہے اور ابد تک رہے گی۔ اس کے مقدّس وجود کے بغیر دنیا سُونی ہوکر رہ جاتی ہے۔ عورت مختلف رُوپ دھارتی رہی اور مَرد کی ذات سے وابستہ ہوکر زندگی کے ہر گوشہ پر اثر انداز ہوتی رہی ہے۔ یہ کبھی ملکہ بنی، کبھی اس نے باندی اور لونڈی کا کردار ادا کیا۔ کبھی سیتا بنی، کبھی ساوتری۔ کبھی مقدّس مریم اور کہیں قلوپطرہ۔ کبھی اسے تقدّس کی رفعتوں پر جگہ ملی اور کبھی یہ پستیوں میں جھونکی گئی۔ کبھی متاعِ کوچہ و بازار بنی اور کبھی کائنات کے رنگ و بُو کی ضامن۔ لیکن اتنا تو ہے کہ اس کی رفعتوں سے تہذیب کی رفعتیں باقی رہ سکیں اور جب اس کا دامن داغ دار ہوا تو نوعِ انسانی کا دامن بھی داغدار ہوگیا۔ نشیب و فراز سے گزرتی ہوئی زبان و ادب کی الماریاں اسی سے سجیں۔ اسے مرکزِ تصوّر و تمنّا، اور مُحرکِ کائنات، کا درجہ ملا۔ داستانوں کو اسی کے ذکر سے دل کش بنایا گیا۔ لیلےٰ اور مجنوں، شیریں اور فرہاد، ہیر اور رانجھا کی الف لیلہ کا مرکزی کردار یہی رہی ہے۔ عشقِ حقیقی و مجازی کا سہرا بھی اسی کے سَر رہا ہے۔ یہی غزل کی آبرو اور جان بنی۔ دربار اور حرم کی روحِ رواں رہی۔ بالفاظ دیگر گوشہ ہائے زیست اسی کے رُخِ تاباں سے روشن ہیں۔

زندگی کی قدروں میں عورت ایک اہم ترین قدر ہے۔ اقدار کی تبدیلی کے ساتھ عورت کی اہمیت کبھی کم کبھی زیادہ رہی ہے۔ عمل اور ردِ عمل کا یہ سلسلہ باقی ہے اور ہمیشہ باقی رہے گا۔ بُنیادی طور پر عورت کی فطرت کے بارے میں مختلف عقیدے اور نظریے تراشے گئے۔ غزل میں بھی عورت مجسّم علامت رہی۔ مثنویوں اور شاعری بھی مُسدّسوں کی تخلیق کے دوران اسے نظر انداز کرنے کی کوشش کی گئی۔ لیکن ابتدائی مثنویوں کے نمونوں میں بھی عشق کے واقعات اسی مرکز کے اطراف گھومتے رہے ہیں۔ جب افسانہ اور ناول کی ابتداء ہوئی تو اسی جزو لانیفک کو اہمیت کا شرف بخشا گیا۔ اس کا کردار مرکزی نوعیت کا حامل رہا۔ اُردو کے ناول نویس اور افسانہ نگار عورت کے روپ کو مختلف طریقوں سے پیش کرتے آرہے ہیں۔ انگریزی ادب میں شیکسپیئر کے نسوانی کردار بہت مشہور ہیں اور آج انہیں عالمی اشاریوں (SYMBOLS) کی طرح استعمال کیا جاتا ہے۔ شیکسپیئر نے عورت کو کہیں کمزور بتایا ہے اور کہا ہے۔ "کمزوری تیرا نام عورت ہے"۔ اور کہیں اسے سب سے بڑی قوت متصوّر کیا ہے۔ کنگ لیئر (KING LEAR)، انٹونی قلوپطرہ (ANTONY & CLEO-PATRA) جیسے ڈرامے عورت کے کردار کی نشاندہی کرتے ہیں۔

کرشن چندر کی اکثر و بیشتر تخلیقات میں بھی عورت ایک منفرد و مخصوص مقام رکھتی ہے۔ ان کے ابتدائی ناول ہوں یا بعد کے ناول، ان سب میں نسوانی کردار کافی اہم، روشن و اُجاگر ہیں۔ ان کے بغور مطالعہ سے کرشن چندر کے مخصوص رجحان کا اندازہ بآسانی ہوجاتا ہے۔ شعوری کاوش کے بغیر اتنے اعلیٰ نسوانی کردار کی تخلیق ناممکن ہے۔ یہ انسانی فطرت ہے کہ جس سے محبّت بہت زیادہ ہوتی ہے، اس پر ہر وقت نظرِ کرم اور نگاہِ خاص کی فراوانی رہتی ہے۔ عورت کی فطری کمزوری پر سب متفق ہیں۔ لیکن یہ اتفاق، اتفاقِ محض نہیں۔ اس کی پُشت پر کچھ احساسات، جذبات اور عقائد کارفرما ہیں۔ ورنہ "بالاتفاق الرّائے" یہ

ہی اُلجھی ہوئی ذہنی کیفیت ہے ۔ انسان اتنا آزاد طبع واقع ہوا ہے کہ خدا کے وجود کا منکر نہ سہی مگر اُس کی قدرت کا اعتراف آسانی سے نہیں کرتا ۔ اُس کے ذہن میں کسی صورت "مقتدر" کا صحیح مفہوم گھُس نہیں پاتا ۔ خود کے بڑے ہونے کا احساس انسانی سرشت کا ایک جزوِ لاینفک ہے ، جیسے ہر عورت کا یقین کہ وہ خوبصورت ہے ۔ وہ اپنے آپ کو بدصورت تصوّر کرنے سے گھبراتی ہے ۔ کالی کلوٹی لڑکی کو چہرہ پر غازہ ملتے ہوئے ، مصنوعی ابرو بنائے ہوئے عام طور پر دیکھا جا سکتا ہے ۔ یہ احساسِ کمتری ہے یا برتری ۔ مگر عورت کی یہ عادت کچھ نہ کچھ اُس کی فطرت کی نشاندہی ضرور کرتی ہے ۔

جانوروں پر رحم ، بچوں پر شفقت اور عورتوں سے حُسنِ سلوک ایسی عادتیں ہیں جن کی پشت پر احساسِ برتری کارفرما ہے ۔ قتل و خون ، عصمت دری اور سماجی برائیوں کی بڑی وجہ احساسِ کمتری ہی ہے ۔ اس نقطۂ نظر سے کرشن چندر کے نسوانی کردار کو پیش کرنے کے اسلوب کا تجزیہ کیا جائے تو ہمیں کرشن چندر سے عقیدت سی ہو جاتی ہے ۔ کرشن چندر کے مرد ہونے کے باوصف ، عورت سے اُن کا برتاؤ قابلِ ستائش ہے ۔ نسوانی کرداروں کی کمزوری ، بے وفائی ، کم ہمتی اور مادّیت مشہورِ زمانہ ہے ۔ اِن کے نسوانی کردار کمزوری کی ضد ہیں ۔ باوفا ہیں ، باہمّت ہیں ، روحانیت ذہنی آسودگی کے قائل ہیں ۔ بایں ہمہ اِس کے لئے وہ کافی بڑی قیمت ادا کرتے ہیں ۔ جسے ہم "حسنِ ظن" کہہ سکتے ہیں ۔ اِس کے مقابلہ میں اُن کے ناولوں میں مردوں کا کردار دھندلا دھندلا ہو جاتا ہے یا ابن الوقتی اور مطلب پرستی کا روپ دھار لیتا ہے ۔

عورت صنفِ نازک ہونے کے ناطے چند تسلیم شدہ اقدار کی پوجاری ہے ۔ جیسے شرم و حیا ، عصمت و عفّت ، پیار اور محبت ، مستقل مزاجی وغیرہ وغیرہ ۔ مذکورہ بالا اوصاف کا احساس ہر لمحہ اس کے ذہن نشین رہتا ہے ۔ ان کا مظاہرہ بہرصورت اُسے کرنا ہی پڑتا ہے ۔ وہ "ماں" کے انداز سے کرے یا "بیوی" کے روپ میں ، دوشیزہ کی طرح نبھائے یا بیوہ کی طرح بروئے کار لائے ۔ اِس میں اُس کی انفرادیت کے پہلو ضرور برقرار رہتے ہیں ۔

مرد مردانگی ، ہمّت اور طاقت کا مظہر ہے ۔ لیکن اُسے ہر وقت اِن اوصاف کا احساس نہیں رہ سکتا ۔ "باپ" کے مقدس روپ میں اپنی اولاد کو وہ پیار اور لاڈ بخش سکتا ہے ۔ مگر ذہنی خلفشار کا شکار باپ [illegible] بھی اپنے لاڈ پیار کے اوصاف کو بھی بالائے طاق رکھ دیتا ہے اور اُس پر بربریت ، اکھڑپن اور بدمزاجی مسلّط ہو جاتی ہے ۔ شوہر کے روپ میں وہ عصبیت ، غصّہ اور تیکھے پن کا بسا اوقات مریض بن جاتا ہے ۔ لیکن عورت ہر حالت میں ، آزمائش ہو کہ آسائش ، پُرخطر ماحول ہو یا بے خطر ، خلوت ہو کہ جلوت ، اپنے اوصاف کو فراموش نہیں کرتی ۔ مستثنیات کی بات اور ہے ۔

انہی خد و خال کی روشنی میں کرشن چندر نے نسوانی کرداروں کو مخصوص و منفرد مقام دینے کی کاوش کی ہے ۔ عورت کی برتری کا یہ عظیم اعتراف ہے ۔ اور اعتراف کرنا بجائے خود بڑے دل گردے کی بات ہے ۔

کرشن چندر کے نسوانی کردار پھوہڑ قسم کے نہیں ، بلکہ اعلیٰ قسم کے ہیں ۔ گو اِن میں سے اکثر کا تعلق سماج کے نچلے طبقے سے ہے ۔ جیسے بوریوں کے مزدور "قلیوں کی کالونی" "فلمی ایکسٹراز" (EXTRAS) کا طبقہ ، قبائلیوں کی سوسائٹی ۔ لیکن انہیں کرشن چندر کے ہاں "کنول" کا درجہ ملتا ہے "کیچڑ" کا نہیں ۔ دوسرے ادیبوں کے ہاں یہ کردار اپنی بنیادی نوعیت میں تبدیلی کی کچھ کوشش نہیں کرتا ۔ لٹّو کی طرح تیز گھومنے کے بعد بھی اپنی جگہ سے ہٹنے کا نام نہیں لیتا ۔ یہ کردار گوبر کے کیڑے کی طرح گوبر ہی میں جنم لیتے ہیں ، گوبر ہی کو اپنی غذا بناتے ہیں ۔ اسی میں ان کی افزائشِ نسل ہوتی ہے اور اسی میں دم توڑ دیتے ہیں ۔ اُن کی حرکت تیز رفتار ہونے کے باوجود محض خارجی طور پر ہی برقرار رہتی ہے ۔ داخلی طور پر ان پر تبدیلی عنقا ہے ۔ کرشن چندر کے کردار ، علی الخصوص نسوانی کردار ، اپنی بنیادی نوعیت میں تبدیلی کرنے کی ہر وقت سعی و کاوش میں منہمک رہتے ہیں ۔ ماحول ان کی اس تبدیلی کی سختی سے مخالفت کرتا ہے ۔ مگر وہ ماحول سے اتنی زبردست ٹکر لیتے ہیں کہ ماحول اُن کی مخالفت سے یا تو ہاتھ اٹھا لیتا ہے یا چالاکی سے کترا جاتا ہے اور یہ سبقت لے جاتے ہیں ۔ یہ فن کار کا کمال ہے اور فن کی پختگی کا ثبوت ۔ کمال اور پختگیٔ فن کے لئے ارادہ اور پختہ عقیدہ شدید حد تک ضروری ہے ۔ اس کی غیر موجودگی میں اسلوب کی میانہ روی مجروح ہو جاتی ہے ۔ جب تک ادیب کرداروں کے بنیادی مزاج اور افتادِ طبع سے آشنا نہیں ہوتا اور اس پر اُسے عقیدہ کی حد تک یقین نہیں ہوتا ، وہ کرداروں کے باب میں ایمانداری نہیں برت سکتا ۔

کرشن چندر کے ابتدائی ناولوں میں شکست کو بہت اہم مقام

مقام حاصل ہے۔ ناول کا عنوان خودکشی "شکست" کی جانب ہماری توجہ مبذول کراتا ہے۔ ناول کو ختم کرنے کے بعد اگر پلاٹ کا تجزیہ کریں یا کردار کی تحلیل کی جائے تو ہماری ملاقات ایک "شکست" خوردہ شخصیت سے ہوتی ہے۔ وہ ہے شیام۔ وہ ناول میں ہر جگہ بکھرتا نظر آتا ہے اور اسی کے ذہن کی تصویر ہمارے ذہن میں ثبت ہے۔ چھایا، چندرا، سیداں اور ونتی کے ارادوں کی شکست نہیں ملتی۔ چندرا کا نسوانی کردار "شکست" کے مفہوم کی بنیاد ہے۔ چندرا، موہن سنگھ کی محبوبہ ہے۔ نیچ ذات کی لڑکی ہے۔ لیکن اس کا حسن اعلیٰ ذات کے نوجوانوں کو بے ایمان کر سکتا ہے۔ اور مذہب کے ٹھیکہ دار اُسے مذہبی نقطۂ نظر سے مہا پاپ تصور کرتے ہیں۔ شیام، چندرا کے استقلال کی فتح چاہتا ہے۔ مسلمان ڈاکٹر جو موہن سنگھ کا علاج کرتا ہے، چندرا کے معصوم و بے باک چہرہ سے متاثر ہو کر موہن سنگھ کے علاج میں کافی دلچسپی لیتا ہے۔ چندرا کو نیچا دکھانے کے لئے سارا گاؤں ایڑی چوٹی کا زور لگا دیتا ہے۔ لیکن چندرا حالات کا مقابلہ کرتی ہے اور آخر تک ہار نہیں مانتی اور نہ سماج سے خوف کھاتی ہے۔ شیام مرد ہے، نوجوان ہے، چندرا ہی کی عمر کا ہے۔ لیکن اس کے کردار میں ارادہ کی پختگی نہیں ہے۔ چندرا یعنی ایک "عورت" کا "ضدی" عنصر نہیں ہے۔ ونتی سے محبت کرتا ہے لیکن ہمت کے ساتھ مردانہ وار حالات کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اس کے آگے اپنے باپ کا رعب دار چہرہ ہے، ماں کے آنسو ہیں۔ خود اسے اپنے تعلیم یافتہ ہونے کا اندرونی طور پر احساس ہے۔ مگر اس کے کردار کی منافقت اتنی کھلی ہوئی ہے کہ وہ اپنی تمام کمزوریوں کے ساتھ ونتی کو اپنا بنانا چاہتا ہے۔ وہ ماحول کے آگے اناڑی ہے۔ چندرا غریب، مفلس، اچھوت، تنہا، بے سہارا ہونے کے باوجود اعلیٰ راجپوت جوان موہن سنگھ کی محبت کو آخری سانس تک نبھانے کی کوشش میں لگی رہتی ہے۔ "شکست" کا ماحول عورتوں کی مستقل مزاجی کے آگے ہتھیار ڈال دیتا ہے۔ گو بظاہر چندرا اور شیام شکست خوردہ ہو جاتے ہیں لیکن اُنکے ارادوں کو اس شکست سے دھکا نہیں پہنچتا۔ وہ متاثر نہیں ہوتے اور نہ اپنا مذاق بدلتے ہیں۔

"ایک عورت ہزار دیوانے" اعلیٰ کردار نگاری کے میدان میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس ناول کی پُشت پر کیسے عناصر کارفرما تھے۔ اُن کی نوعیت کیا تھی، کتنی مدت سے ناول نگار کا شاعر، کبھی ذہن اس شاہکار کی تلاش میں حقائق ٹٹولتا رہا، اس آمیزش کی ترتیب کے لئے کہاں کہاں سے اُس نے تنکے چُنے، اس کا پتہ ناول کو بغور پڑھنے ہی سے چل سکتا ہے۔ ناول کا عنوان خود ہمارے ذہن میں ابتدا ہی سے چند دھندلے خاکے بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ ہم یقین کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ ناول میں کوئی ایسا کردار ہے جو نسوانی ہے۔ اور جس کے اطراف ہزاروں دیوانے بھنوروں کی طرح بھنبھناتے نظر آئیں گے۔ اور یہ عورت ہو نہ ہو کئی فتنوں کو برپا کرنے والی ہوگی۔ ہزاروں دیوانوں سے یہ مطلب بھی اخذ کیا جا سکتا ہے کہ ان کا جُدا جُدا کردار ناول کو مختلف پہلوؤں میں بانٹ دیگا۔ مگر ناول کو پڑھتے جائیے، یہاں دیوانوں کے پہلوؤں پر روشنی نہیں پڑیگی۔ عورت کے کردار کے مختلف پہلوؤں پر بلیغ و بسیط تبصرہ ملے گا، جائزہ ملے گا، حقائق ملیں گے، تجربات ملیں گے۔ جو تلخ بھی ہوں گے اور رسیلے بھی۔ جنھیں ہم حلق سے اتارنے پر مجبور ہوں گے۔

لاچی خانہ بدوش قبیلہ کی معمولی کوئلہ چرانے والی، بھیک مانگنے والی شوخ و طرار لڑکی ہے۔ جس کا نہ کوئی ماضی ہے نہ حال۔ جس کے پاس مستقبل کے لئے نہ کوئی عنوان ہے اور نہ منصوبہ۔ اس کی کوئی اُمنگ نہیں، کوئی مچلتی ہوئی آرزو نہیں۔ یہ مختلف حالات میں مختلف رُوپ دھار کر زندگی بسر کرتی ہے۔ کبھی پلیٹ فارم پر پڑی رہے گی، کبھی گڈس یارڈ میں ملے گی۔ کبھی کسی اسٹاپ پر بھیک مانگتی نظر آئے گی، کبھی پھلوں کی دکان پر امرود چُراتے نظر آئیگی، کبھی اسٹیشن ماسٹر سے جھگڑتی ہوگی۔ بالفاظ دیگر جینے کی کوشش میں معروف رہے گی۔ مقصد یہ کہ زندگی کی تکمیل میں منہمک رہے گی۔ اس کے لئے جیسے کوئی مخصوص قیام گاہ نہیں۔ اسی طرح اُس کا کوئی نصب العین نہیں۔ اس کا نہ کوئی خدا ہے نہ کوئی ایشور اس لئے کہ یہ غریب ہے اور غریبوں کا کوئی خدا نہیں ہوتا۔ کئی خدا ہوتے ہیں۔ کام دینے والا ایک خدا، کام لینے والا دوسرا خدا، مزدوری ملنے والا تیسرا خدا، بھیک دینے والا چوتھا خدا۔ اس طرح ہر ہر قدم پر معمولی احسان کرنے والا اپنے آپ کو خدا تصور کریگا۔ نہ وہ کسی مذہب کی ہے اور نہ کوئی مذہب اس کا ہے۔ اُس کے خون میں سب کا خون ہے، اور اس کی زبان میں سب کی زبان ہے۔ وہ ہر جگہ اکیلی ہے، لیکن سب کے درمیان ہے۔ بقول کرشن چندر "وہ ہر کھیت کے کنارے اجنبی ہے اور ہر گاؤں کی حد میں انجانی" مگر گاؤں کے حدود میں وہ سب کے دل

کی ملکہ ہے۔ کیا جوان کیا بوڑھے، کیا بابو کیا قُلی، کیا افسر۔ لاچی کے لئے ساری کائنات "حمام" ہے جس میں سب ننگے ہیں۔ مگر لاچی اُن کے ننگے پن کو نہیں دیکھتی ہے، بلکہ اپنے ننگے پن کو ڈھانپنے میں غرق ہے۔ اپنی برہنہ زندگی کو ڈھانکنے کا غم پی رہی ہے۔ اُس کی نگاہوں میں سب ننگے ہیں۔ اُس کے چاروں طرف ضمیر کُش لوگ ہیں۔ جو اپنے آنگن میں روشنی دیکھنے کے لئے ہمسایہ کی چھت جلا دیتے ہیں۔ وہ مردوں کا کپڑا چھین کر اپنے آپ کے 'ڈھکے ہوئے' کا تصور کر داتے ہیں۔ بالفاظِ دیگر اپنی آنکھوں پر پٹّی باندھ کر دُنیا کو اندھا سمجھتے ہیں۔ اُن لوگوں کے متعلق لاچی کرشن کے ان الفاظ میں سوچتی ہے "ہائے! اپنے پژمردہ جھکے ہوئے اُداس اور جھنجھلاتے ہوئے چہروں کے باوجود یہ لوگ اندر سے کیسے خوش نظر آتے ہیں، جیسے تاریک بادلوں میں بجلی کوندتی ہے۔ جیسے میلے کچیلے خیمے کے روزن میں سے بہار کی خوشبو آتی ہے۔ میں بھیک مانگتی مانگتی شرمندہ سی ہو جاتی ہوں، اور میرے سینے میں ہوک سی اُٹھتی ہے۔ کاش میرے لئے بھی کوئی جھک جائے، مجبور ہو جائے، اس قدر مجبور ہو جائے کہ اگر اس کی جیب میں ایک پیسہ بھی نہ ہو تو چلتے چلتے کسی جھاڑی سے ایک پھول ہی توڑ کر میرے لئے لے آئے۔" یہ تمنّا ہر عورت کے دل میں جنم لیتی ہے، لیکن تمنائیں پوری نہیں ہو سکتیں۔ وہ بھیک مانگتی ہے، لیکن اس فعل سے شرمندہ ہو جاتی ہے۔ اس لئے کہ وہ محنت سے دل نہیں چراتی، خدمت سے دل نہیں چراتی۔ وہ اپنے حقیقی باپ رنگی کو چار آنے روز دیتے ہوئے سوچتی ہے کیوں نہ اپنے باپ کے چہرہ پر طمانچہ رسید کرے۔ مگر وہ کسی جذبے کی گرفت میں آکر ایسا نہیں کر سکتی اور سوچتی ہے کہ اس دُنیا میں ہر جذبہ کا تاوان کیوں وصول کر لیتا ہے؟ اس کا بلند ذہن، پست اور حقیر دل کا کنول ہے۔ وہ سوچتی ہے کہ کیوں صرف اُس کا کوئی نہیں ہو پاتا؛ ارادہ پیٹ پالنے کے لئے نہیں ہے۔ تکلّم پسندی جسم بیچ کر اعلیٰ طبقہ پر بھی کی جا سکتی ہے۔ مگر وہ عورت ہے۔ اور کرشن چندر کے ذہن سے نکلی ہوئی عورت۔ اُسے شوہر کی محبت اور اس کا خلوص پسند ہے۔ کچھ نہ ہو تو کسی جھاڑی سے ایک پھول ہی توڑ کر لگا دے۔ اور وہ بیلی اور موگرے یا گلاب کا مطالبہ نہیں کرتی۔ پھول۔ کسی جنگلی جھاڑی کا، جسے دیکھ کر پھول کہہ سکتے ہیں، کانٹے کی طرح کوئی پھول تو ہو، مگر پھول سے بیچ دیکھ کر اسے دوسروں کے لمحوں اور گھڑیوں

عز بلبی

یا گھنڈوں کو مسحور کرنے کا خیال نہیں ہے۔ کسی کو اپنا سمجھ کر اُس کی بانہوں میں اپنے آپ کو جسمانی طور پر صنفِ نازک ہونے کے ناطے جھونک دینے کی تمنا ہوتی ہے۔ بس پورے ناول میں اسی ایک جذبہ کی کارفرمائی ہے۔ اُسے ایک ایسے مرد کی ضرورت ہے جو اُس کے باپ سے مختلف، اُس کے چچا سے مختلف ہو! اس کے قبیلے کے مردوں سے مختلف الطبع مرد! جو صرف اُس کا ہے، اُس کا ہو جائے!! اس کا جسم "عینک" یا "چھلّے" کی طرح اُسے محسوس نہیں ہوتا۔ بلکہ اسے اسکی اپنی روح کا ایک حصّہ معلوم ہوتا ہے۔ جس کی بے حرمتی وہ برداشت نہیں کر سکتی۔ وہ پیڑ کی طرح ایک جگہ گڑ جانا چاہتی ہے۔ ایک ہی جگہ اس کا سایہ پڑے، ایک ہی جگہ اس کے پھول کی خوشبو پھیلے۔ اس کی خواہش ہے کہ بہار بھی وہیں آئے اور خزاں بھی وہیں۔ اور اسی جگہ کی سردی گرمی کھا کر اس کی موت آئے۔ اسے چلتے ہوئے خیمے، بدلتے ہوئے مرد، گزرتے ہوئے مناظر جہنّم معلوم ہوتے ہیں۔

ناول کی ابتدا بھی لاچی اور انتہا بھی لاچی۔ لاچی ہی وہ عورت ہے جس کے لئے ہزاروں دیوانے ہو جاتے ہیں۔ صرف ایک جذبہ کے تحت سِفلی جذبہ، حیوانی جذبہ!! محسوس تو ایسا ہوتا ہے کہ لاچی کا ماحول اسی ایک جذبہ کا تاوان وصول کرنے کے قابل ہے۔ اس کے علاوہ کوئی بلند و بالا انسانی جذبہ اس ماحول میں ممکن ہے، کھوکھلا ہے ناقابلِ اعتنا ہے۔ لاچی کو ٹیک لگا کر اس کا سارا خاندان جیتا ہے۔ لاچی عورت کم پیسہ بنانے کی مشین زیادہ نظر آتی ہے۔ اس کا باپ اس کے عوض اپنی زندگی چاہتا ہے۔ اس کی ماں کی قیمت ستّر روپئے تھی اور لاچی کی قیمت ساڑھے تین سو روپیہ! عورت بالفاظِ دیگر لاچی، خرید و فروخت کی جنس ہے۔ پہلی صدی کی جنس بیسویں صدی میں فروخت ہوتی ہے۔

لاچی کے مقابل میں گل کا کردار پیش کیا گیا ہے، جو دیگر مرد کرداروں کے مقابلہ میں سنجیدہ، متین اور متوازن ذہن کا نوجوان ہے۔ ابتدا میں یہ دوسرے مرد کرداروں کا مخالف عمل دکھائی دیتا ہے۔ پل پر آدھی رات گئے منتظر رہتا ہے لیکن یہاں لاچی کا حسن اُسے یہاں لے آتا ہے اور کوئی جذبہ نہیں۔ یہ حقیقت اُس وقت عیاں ہوتی ہے، جب لاچی اُس مریض کتیا کی طرح ہو جاتی ہے جس کو دیکھ کر دوسرے کتّے بھی دُم دبا کر بھاگ جاتے ہیں۔ لاچی

اسٹیشن پر مجنونوں کی طرح سنگسار کی جاتی ہے تو زخمی لاچی کو گل اٹھا کر ڈاکٹر کے پاس لے جاتا ہے، جب کہ دوسرے ایک اندھی بھیانک و بدشکل عورت کو زخمی کر سکتے ہیں، وہاں جذبۂ ہمدردی کے تحت گل کے زخمی لاچی کو سنبھالے ہوئے ہاتھ چوم لینے کے قابل ہیں۔ مگر یہ جذبہ گل ہی کی میراث نہیں۔ ہر ایک میں یہ جذبہ پیدا ہونا ممکن ہے۔ مگر جب گل کو معلوم ہوتا ہے کہ یہی اندھی عورت لاچی ہے تو وہ بھی کترانے لگتا ہے اور لاچی کو گل ہمیشہ کے لئے فراموش کر سکتا ہے۔ جب لاچی کا حسن بھیانک پن میں تبدیل ہو جاتا ہے، جب اس کے چہرے پر دلکشی نہیں رہتی، چیچک کے داغ رہ جاتے ہیں۔ تو گل کی محبت کا چراغ ہمیشہ کے لئے بے نور ہو جاتا ہے۔ مرد کا کردار جو اب تک عروج کی جانب گامزن تھا، دھڑام سے نیچے گر جاتا ہے اور لاچی کا نسوانی کردار بلند و ارفع ہو جاتا ہے۔ اس ماحول کی فہرست کا آخری مرد گل بھی انہیں دیوانوں کی فہرست میں شامل ہو جاتا ہے جو اب تک ہر عورت کو تسکین کا سامان سمجھتے تھے۔ لہٰذا اس کی بے بسی سنگساری کرتے تھے۔

لاچی کا کردار اُردو ادب کے لئے ایک حادثہ ہے۔ حادثے روز واقع نہیں ہوتے۔ لاچی کے کردار میں کرشن چندر کا فن آسمان کی طرح بلند ہو جاتا ہے۔ فن سے میرا مطلب ناول کا اسلوب نہیں ہے۔ نثر کا اسلوب نہیں ہے، حیرت افروز کلمات کی فراوانی نہیں ہے، ماحول اور دُنیا کی بدنمائی پر لکچر نہیں ہے بلکہ نسوانی کردار کے ذریعے وہ جس رویّہ سے عورت کی بلند اور صحیح و حقیقی فطرت کو اُجاگر کرنا چاہتا ہے، یہی اسکو بلندیوں کا ضامن ہے۔

"چاندی کے گھاؤ" میں کرشن چندر نے بُلبل کا نسوانی کردار پیش کیا ہے۔ بلبل چونکہ ایک تعلیم یافتہ لڑکی ہے۔ اس لئے اُس کا معیار بالکل جُداگانہ ہے۔ اس کے دل میں اونچی سوسائٹی کا خیال ضرور تھا، وہ اپنے منگیتر پرکاش رانڈھوا سے قطع تعلق کر لیتی ہے۔ محض ذہنی ضد کی بُنیادوں پر۔ ضد سے قطع نظر، اُس کے دل میں بھی یہی یقین ہوتا ہے کہ عورت اگر چاہے تو اپنی عزت کا سودا نہیں کر سکتی۔ اس کا ارادہ بہت بلند اور مستقل ہوتا ہے۔ اُسے یہ بات اچنبھے میں ڈالتی ہے کہ پرکاش کیوں اُس کے پختہ ارادے پر اعتبار نہیں کرتا ہے اور اُسے فلمی زندگی سے روکتا ہے۔ پورے ناول میں وہ اپنے اِس جذبے کو نبھانے کی پوری کوشش کرتی ہے۔ مگر بلبل کا کردار "چاندی کے گھاؤ" میں مختلف شاعر، کبھی

المیہ ہے۔ اسے مٹی کے روپ میں دکھایا گیا ہے۔ اُسے تنہائیوں کے درمیان شکار کی طرح پھنسایا گیا ہے۔ چیتے کی گرج پر اُسے سراسیمہ ہوتے بتایا گیا ہے اور اس سراسیمگی کی وجہ سے اُس کی عزت شیو آنند کے حیوانی جذبہ کے سامنے سرنگوں ہو جاتی ہے اور مرد اس کی نسوانی کمزوری کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے اپنی جبلّی کمزوری کا کھلا ثبوت پیش کرتا ہے۔ وہ کسی کی بیوی بن کر اپنا کردار سنبھالتی ہے اور حاملہ لڑکی کی طرح اپنے مستقبل کے نورِ نظر اور جگر بند کی سہانی یاد میں کھو جاتی ہے۔ اور اسقاطِ حمل کی بھی لعنت کرتی ہے۔ اس لئے اُسے شکست کا منہ دیکھنا پڑتا ہے۔ مگر اس کا اثر اس کے ذہن پر اسقدر بُرا پڑتا ہے کہ وہ ایسے شوہر کو قاتل کہہ سکتی ہے۔ اور کسی ایسے شوہر کی تلاش کرتی ہے جو عورت کے جذبات کی قدر نہ کرے تو نہ سہی، مگر احترام تو کرے۔ اُسے پریم راہی میں اُس کا اپنا آئیڈیل شوہر مل جاتا ہے۔ مگر اس سے بھی اُس کے بنیادی جذبوں کی تسکین نہیں ہوتی تو بھاکڑہ ننگل بند کی تعمیر میں کام کرنے والے مزدوروں میں مزدور عورت کی طرح شامل ہو جاتی ہے۔ جہاں اُسے اس کا سابق منگیتر پرکاش ملتا ہے۔ مگر اسکے ساتھ زندگی گزارنے پر بھی وہ رضامند نہیں ہوتی، اس لئے کہ اُس نے سابق منگیتر کی حیثیت سے عورت کے بنیادی جذبے "جذبۂ مقدس" اور "خودداری" کو ٹھیس پہونچانے کی کوشش کی تھی۔ اور وہ اُس کی نظروں سے گر چکا تھا۔

اس کے برعکس لاچی کے دل میں سوسائٹی کی کوئی وقعت نہیں ہے۔ وہ تو ایک گھر چاہتی ہے، خیمہ نہیں چاہتی۔ وہ اتنی بلند کردار ہے کہ گل کے علاوہ کسی سے مصالحت کی کوشش نہیں کرتی۔ وہ خود اپنی ڈھارس بندھاتی ہے۔ وہ اپنے دل کی تسکین کے لئے سہارے نہیں ڈھونڈتی۔ اپنے ایک ہی مقصد "گھر بنانے" کی کوشش میں منہمک اور غرقاب ملتی ہے۔ ناول کی پوری زندگی میں وہ اپنے مقصد کو ایک لمحہ بھی فراموش نہیں کرتی۔ خوابیدہ حالت میں ہو یا اضطرابی حالت میں اُمیدوں اور جھوٹے دلاسوں پر اُسے سہلایا یا بہکایا نہیں جا سکتا۔ ہر وعدہ کا ٹھوس نتیجہ چاہتی ہے اور نتیجہ کی اُمید پر خوش فہمی میں مبتلا نہیں ہو سکتی۔

وہ اپنے ماحول کے دوسرے کرداروں سے کوئی بیر نہیں رکھتی۔ وہ مادھو پر بھروسہ کرتی ہے اور اُمید کرتی ہے کہ مادھو کے اندر کا انسان جاگے گا۔ جو ہمدردی اور خلوص بانٹنے لگا۔ ٹیکسی میں بیٹھنے کے بعد اُسے

پر سچلتا ہے کہ وہ کبھی سنبھلا ہے۔ گل کی محبت امتحان لیتی ہے۔ اُسے انتظار کی عادت بھی ہے' اپنے وعدہ کا پاس بھی ہے' احساس بھی ہے۔ وہ سنگی ٹہنیوں کو دیکھتی ہے' مگر اسے اپنا وعدہ یاد آجاتا ہے۔ وہ ہمیشہ بیدار جذبہ کے تحت زندہ رہتی ہے۔ اُس کا یہ جذبہ اُلجھنے کی رتی برابر کوشش نہیں کرتا۔

ہر زاویۂ نظر سے لاجی کا کردار اُردو ادب کا ایک شاہکار ہے۔ کرشن چندر کے دوسرے نسوانی کردار مثلاً" اندو ایک گھڑے کی بوتل ، لاجی کا روشن روپ ہے۔ مگر لاجی کی طرح اندو مستقل مزاج نہیں ہے۔ وہ جذباتی ہے اور اکثر جذبات کے تحت فاش غلطیاں کر بیٹھتی ہے۔ اور پھر ان غلطیوں کا اعتراف کر لیتی ہے۔ غلطی کرنا انسان سرشت میں داخل ہے۔ غلطی ایک مرتبہ ہو تو قابلِ معافی ہے' مگر بار بار غلطی کرنا عقلمندی کی کم' اور غیر مستقل مزاجی کی زیادہ نشاندہی کرتی ہے۔ لاجی غلطی ہی نہیں کرتی' بلکہ ماحول اُس کے بلند کردار کا غلط اندازہ لگاتا ہے۔ وہ جنسی خرید و فروخت کے ماحول میں زندہ رہکر بھی "جنسِ ممنوعہ" رہتی ہے۔

لاجی میں کرشن چندر کے دوسرے نسوانی کردار کی طرح رقابت کا جذبہ بالکل نہیں ہے۔ اندو ، ملیں' چندرا میں یہ جذبہ بدرجہ اتم پایا جاتا ہے۔ لاجی کے ذہن میں یہ ہیجانی کیفیت عنقا ہے۔ وہ ماحول سے بدلہ لینا اپنی توہین سمجھتی ہے۔ وہ ظلم سہتی ہے' اندو اور ملیں کی طرح نہیں' خاموش دھرتی کی طرح ! دھرتی جس پہ لاکھوں تیز رفتار گاڑیاں روزانہ دوڑتی پھرتی ہیں' مگر دھرتی ہے کہ اُف تک نہیں کرتی' اُنہیں فضا میں اُچھال نہیں دیتی' خود گھس جاتی ہے۔ اسی طرح لاجی ساری ستم ظریفیاں خودداری کے ساتھ سہتی ہے۔ اور جب اندھی ہو جاتی ہے' کھیا تک وجود سے مِل جاتی ہے' حُسن کھو بیٹھتی ہے تو بھی اُف تک نہیں کرتی ! وہی اپنے سابق ہاتھ پھیلا دیتی ہے ، جو اس سے پہلے بس اسٹاپ پر پھیل جاتے تھے ! اور وہ وقت اس کی جوانی کا تھا' بھرپور غضب ڈھانے والی جوانی کا۔ مگر جب یہ ہاتھ پھیلاتی ہے تو اُسے اپنی جوانی کے بل بوتے پر بھیک مِل جانے کا گمان تو کیا تصور بھی نہیں تھا۔ اگر چاہتی تو جسم بیچ کر عیش کرتی۔ اور جب وہ گل کا منی آرڈر ٹھکرا کر بھیک مانگنے نکل جاتی ہے تو اُسے اپنے ہاتھوں پر وہی اعتبار ہوتا ہے جو اس سے پہلے تھا۔ سب سے بڑی بات ہے کہ وہ خودکشی نہیں کرتی۔ کیونکہ خودکشی احساسِ شکست کی علامت ہے۔ اُسے زندگی پیاری ہے۔

وہ شیکسپیر کی ڈیسڈ مونا (DESDEMONA) کی طرح شاعر بھی

مجہول (PASSIVE) ہے۔ لاجی اُردو نثر کی ڈیسڈ مونا ہے' قلوپطرہ نہیں۔ وہ ایسی کشتی ہے جس کے بادبان پھٹ جاتے ہیں۔ جو سمندر میں ڈوب جاتی ہے مگر کنارے لگنے کی کوشش نہیں کرتی۔

کرشن چندر کے ناول پڑھتے ہوئے بار بار ذہن میں ایک ہی سوال اُبھرتا ہے " ایسا کیوں ہے کہ کرشن چندر کے پیش کردہ نسوانی کردار بلند و بالا ہیں۔ اور مرد کردار بجھے بجھے سے ہیں ؟" یہ سوال جتنی آسانی سے اُبھرتا ہے' اُسی قدر اِس کا جواب تلاش کرنا مشکل ہے۔ اِس کے لئے ہم مصنف کے نفسیاتی جائزہ سے کوئی نتیجہ نکال سکتے ہیں۔ مگر نفسیاتی جائزہ آسان کام نہیں ہے۔ اس لئے کہ نفسیات کا میدان بالکل جُدا ہے۔ اس میں شعور اور لاشعور' تحت الشعور وغیرہ کی خاردار خُنک جھاڑیوں سے پرندے کا شکار کرنا ہے۔ نفسیات کا عمل بایں ہمہ قیاس آرائیوں پر بھی مبنی ہے۔ بات ذہن کی ہے' احساس کی نہیں۔

کردار کے دو رُخ ہوتے ہیں۔ ایک خارجی دوسرا داخلی ! مثلاً" مرد کا کردار لیجئے۔ خارجی طور پہ وہ مرد کے رُوپ میں مونچھ داڑھی رکھتا ہے۔ شکیل ہے۔ بازار میں گھومتا ہے۔ مشکل سے مشکل کام کے لئے موزوں نظر آتا ہے۔ عورت خارجی طور پہ حسین و جمیل ہوتی ہے۔ کولھے مٹکا مٹکا کر چلتی ہے' اس کی چال میں موسیقی کا انداز پیدا ہو جاتا ہے۔ وہ خارجی طور پہ نازک ہے۔ اِسی لئے اُسے صنفِ نازک کا درجہ دیا گیا ہے۔ مگر جب زندگی کی کسوٹی پر ان کرداروں کو کسنے کا وقت آتا ہے تو اُن کے اندرونی پہلو اُجاگر ہوتے ہیں۔ کرشن چندر کے کردار بھی اس سے مختلف نہیں ہیں۔ مگر اس حقیقت کے اعادہ کا مقصد اس جگہ بالکل مختلف ہے۔ کرشن چندر کے مرد کردار خارجی طور پہ ہیرو کا کام دیتے ہیں۔ مگر ان کو زندگی کی کسوٹی پہ کسا جائے اور اُن کا جائزہ لیا جائے تو یہ اندرونی طور پہ خالی نظر آئیں گے اور اُنہیں ہیروئن کے مددگار " ہیرو" کہنے کی بجائے "ولین" کہہ سکتے ہیں۔ یہ ہیرو کسی صورت میں کہلانے کے مستحق نہیں ہیں۔ چند ہیرو تو اس کسوٹی کے معیار پہ پُورے نہیں اتر سکتے۔ اُنہیں محض "امدادی" کردار کہہ کر بالائے طاق رکھا جا سکتا ہے۔ ان کا اندرون اتنا کھوکھلا ہوتا ہے جیسے کھیتوں میں پرندوں کو فصل سے دُور رکھنے کے لئے SCARE CROW رکھے جاتے ہیں۔ ان کرداروں کی جگہ دوسرے کرداروں کو استعمال کر سکتے ہیں۔ بالفاظِ دیگر کوئی

انفرادیت اُن مرد کرداروں میں نہیں ہوتی۔ لیکن نسوانی کردار مخصوص، منفرد اور لاکھوں کے ہجوم میں پہچانے جا سکتے ہیں۔ ان میں داخلی اور خارجی اعتبار سے بلندی اور ارادہ کی پختگی ہوتی ہے۔ جس پر ہمیں ناول کے مطالعہ کے دوران چونک جانا پڑتا ہے۔ ہیرو یا تو ہیروئن کا ضمنی مددگار ہو جاتا ہے، جو ہیروئن کے ارادوں میں اندرونی طور سے بے دخل ہو جاتا ہے۔ مگر بیرونی طور پر اس کے ارادوں کو آگے بڑھانے میں مدد کرتا ہے۔ اس کے لئے یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ چلتی ریل میں گارڈ (GUARD) کی دیکھا دیکھی بچے اپنے ہاتھوں میں کوئی کپڑے کا ٹکڑا تھامے بار بار ہلاتے رہتے ہیں اور اس خوش فہمی میں مبتلا رہتے ہیں کہ ریل کی رفتار بس اُن کے کپڑے کے ہلنے پر مبنی ہے، ورنہ بذاتِ خود ریل حرکت پر قادر نہیں۔ چنانچہ ہم اس فعل کو بچکانہ حرکت کہہ کر نظر انداز کر سکتے ہیں، لیکن کرشن چندر کے ناول کے مرد کردار اکثر ناولوں میں بچکانہ حرکت نہ کریں نہ سہی، ذہن تو اُن کا بالکل طفلانہ معلوم ہوتا ہے۔ یہ کرشن چندر کی خامی نہیں ہے اور نہ اُن کے گراں قدر فن کے بارے میں "چھوٹا منھ بڑی بات والا" معاملہ ہے۔ اُن کے نسوانی کردار ہی اتنے بلند معیار ہوتے ہیں کہ اگر ان کے ظرف سے مرد کرداروں کے ظرف کا موازنہ کیا جائے تو حساس قاری کے ذہن میں مذکورہ بالا احساس کا پیدا ہونا فطری ہے۔ اگر مرد کردار ضمنی حیثیت اختیار نہ کریں۔ اور ہیروئن کی مدد نہ کریں تو انہیں ولین (VILLAIN) کا روپ دھارنا پڑتا ہے۔ یا بصورت دیگر اپنی بقا کے لئے ماحول کے سمندر میں آبِ جُو کی طرح شامل ہو جانا پڑتا ہے اور ان کے اکثر ناول اس حقیقت کا آئینہ ہیں۔

لاجّی ناول کی ہیروئن ہے۔ ابتدا سے انتہا تک کہانی لاجّی کے اطراف گھومتی ہے۔ کہانی ہی نہیں بلکہ سارا ماحول گھومتا ہے، پورا سماج گھومتا ہے۔ جس میں اعلیٰ سوسائٹی کے لوگ ہوتے ہیں، بابو ہوتے ہیں، "تیسری طاقت" ہوتا ہے۔ سنتری ہوتا ہے، امرود بیچنے والا ہوتا ہے۔ ان کا چکّر لگانا پروانوں کی طرح ہوتا ہے۔ جو گھوم گھوم کر قندیل کی لَو سے جل کر مر جاتے ہیں، مگر لَو کو بجھا نہیں سکتے۔ البتّہ اتنا تو ہوتا ہے کہ ایک پروانہ سُرعت سے چکّر لگاتا ہے اور ایک دھیمے دھیمے! لاجّی کا ہیرو گل محمد ہے، مگر اس میں خامی ہے، وہ اپنی خامیوں کو بروئے کار نہیں لاتا۔ اور جب لاجّی ظاہری طور پر اپنی خوبصورتی کھو بیٹھتی ہے تو گل کی خامی "جسم کا متوالا" بن کر عیاں ہو جاتی ہے۔ اور وہ جتنا شاعر بھی

لاجّی کے قریب ہونا چاہتا تھا، اب اتنا ہی سرعت سے رسّی تڑا کر بھاگنے کی کوشش کرتا ہے اور اس میں کامیاب بھی ہو جاتا ہے لیکن یہ اُس کے کردار کی شکست ہے! اگر وہ نہ بھاگتا اور لاجّی کے "جسم کے جمال" سے آگے "روح کے جمال" پر نظر رکھتا تو ہم بلا تامّل کہہ سکتے کہ کرشن چندر کا ایک "ہیرو" ہے، جس کی بصیرت "روح کے جمال" کو نہ صرف دیکھ سکتی ہے، بلکہ اس کی قدر بھی کر سکتی ہے۔ وہ 'ہیرو' سے گذر کر لاجّی کے مخالف ماحول کے دھارے میں گم ہو گیا ہے۔ اور لاجّی کا ماحول ہی اس ناول میں "ولین" (VILLAIN) کا رول ادا کرتا ہے۔ لاجّی ایک آئینہ ہے، جسے کرشن چندر نے بڑی کاریگری سے ڈھالا ہے۔ اس آئینہ میں سب لوگ اپنے چہرے دیکھتے ہیں۔ انہیں اپنے چہرے کا عیب جب نظر آتا ہے تو بوکھلا کر آئینہ میں عیب ڈھونڈنے لگتے ہیں۔ کرشن چندر نے اس آئینہ کو شکستہ کر دیا ہے بقول اقبال ؎

تو بچا بچا کے نہ رکھ اسے ترا آئینہ ہے وہ آئینہ
جو شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہِ آئینہ ساز میں

اقبال نے "مومن" کو آواز دی تھی کہ اپنے آئینہ کو چور چور کر دے مگر کرشن چندر نے آئینہ بنایا اور خود اُسے توڑ دیا ہے تاکہ سماج کے تمام خد و خال تین سو ساٹھ ڈگری پر عیاں ہو جائیں۔ آئینہ سب بناتے ہیں، آئینہ سب دیکھتے ہیں لیکن آئینہ کو بہت کم لوگ توڑتے ہیں۔ کرشن چندر کا فن آئینہ بنانا بھی ہے اور آئینہ توڑنا بھی۔ آئینہ بنانے کا مقصد سماج کو تنقیدی روش پر پرکھنا ہے۔ اور توڑنے کا مقصد اس کا جائزہ لینا ہے۔

"ایک کھدڑ کی بوتل" کی ہیروئن اندومتی ہے جو "حیاتی سفر" کرتی ہے۔ مرد کی طرح "ذہنی سفر" نہیں کرتی۔۔۔ ایک دھوبی کی لڑکی ہے۔ جھونپڑی میں رہنے والی اور سات جماعتیں پڑھ چکی ہے۔ رنجیت ایک گیرج (GARAGE) کے مالک کا لڑکا۔ یہاں ہیرو کی طرح پیش کیا گیا ہے۔ بوس جی ابتدا میں ناول کا مرکزی کردار ہے۔ مگر رفتہ رفتہ اندومتی اپنے مقصد پہ چھا جاتی ہے اور ناول کی انتہا پر ہمارے ذہن میں وہی بات آتی ہے جو ہم نے لاجّی کے کردار پر ثبت کرنے کی کوشش کی ہے۔ "ایک کھدڑ کی بوتل" جب سمندر میں تیرتی ہوئی اُن کے سامنے آتی ہے تو اندو، رنجیت کو بوتل پکڑنے کی ترغیب

دیتی ہے اور پھر پوہن جی تک اس کی رسائی بھی ہوتی ہے۔ پوہن جی اندو کو اپنی لڑکی بنالیتا ہے۔ بجائے اندو کا سہارا بننے کے، اسے زمانے کے نشیب و فراز سمجھانے میں زبردستی سے کام لیتا ہے۔ رنجیت کے خلاف زہر اُگلتا ہے۔ اندو کسمساتی ہوئی اُس کے بیان کی تصدیق کرتی ہے۔ اپنے رنجیت سے ملنے کے لئے ہمت اور ڈھٹائی سے گھر سے نکل پڑتی ہے۔ پوہن جی غصہ میں آجاتا ہے۔ پھر سے اندو کو جھونپڑی میں ایک رات گزارنی پڑتی ہے۔ اُسے عالیشان کوٹھی میں واپس آجانا پڑتا ہے۔ اُس کا کردار لاجی کے کردار سے ملتا جلتا تو ضرور ہے، مگر اُسکے کردار میں لاجی کے کردار کی سی پختگی نہیں ہے۔ ماحول اکثر ناولوں میں ہیرو کے خلاف ہوتا ہے۔ یہاں اندو کے خلاف ہوجاتا ہے۔

پوہن جی، منہ بولا باپ۔ بھاسکر، رنجیت کا باپ۔ کمی بائی۔ اندو کی ماں، رانی جھونپڑی کی ایک لڑکی، جو پیشہ میں آسکتی ہے، یا لائی جاسکتی ہے۔ ان کرداروں کے درمیان وہ اُبھرتی ہے۔ داخلی اعتبار سے وہ کہیں طفلانہ ہے، کبھی جذبات کے بہاؤ میں فیصلہ کردیتی ہے۔ کرسٹ جی، رانی اور رنجیت کی شادی رد کرنے میں کامیاب ہوجاتا ہے تو اندو اُس سے شادی کرلیتی ہے۔

شروع سے آخر تک اندو سب پر چھائی رہتی ہے۔ ابتدا میں کمی بائی اپنی ماں پر جو اُسے پانچ ہزار میں فروخت کرنا چاہتی ہے۔ رنجیت کو ذہنی طور پر تیار کرتی ہے کہ وہ اسے اپنی بیوی بنالے۔ پوہن جی پر کہ وہ اندو پر اعتبار کرلیں۔ کرسٹ جی پر تاکہ وہ اندو کا کام بخوبی انجام دے سکے۔ رنجیت جو اس کہانی کا مرد کردار ہے، کچھ فیصلہ نہیں کرسکتا۔ اُسے اپنے باپ کا ڈر ہے، وہ ہمت نہیں رکھتا اور آخر اندو سب کو چھوڑ کر احساساتی نامرادیہ کے خدوخال سے ہوتی ہوئی رنجیت کی ننگی بانہوں کا ہار پہن لیتی ہے۔ اگر کرشن چندر رنجیت کو اس قابل بنادیتے کہ وہ خود فیصلہ کرے، باپ سے نہ ڈرے، تو نہ انہیں ایک کروڑ کی دولت ملتی اور نہ اندو کا بلند کردار واضح ہوتا ۔ اور نہ کرشن چندر کے ذہن کی "آئیڈیل عورت" جو ایک کروڑ کی جائیداد کو اپنی محبت کے سامنے حقیر سمجھتی ہے، ڈھل کر اُردو ادب کی تاریخ میں محفوظ ہوجاتی۔
کرشن کے مختلف ناولوں میں یہی ملتا ہے کہ مرد، عورت کے بغیر کچھ نہیں کرپاتا۔ مگر عورت مرد کے بغیر سب کچھ کرسکتی ہے۔ "گلشن گلشن ڈھونڈا تجھکو" میں اشتیاق، گلشن ــــ اپنی فرار شدہ بیوی کے غم میں ختم ہوجاتا ہے۔ ڈاآنی افسانہ کا وہ بلند کردار جو اپنی منہ بولی بیوی کی لاش کے ذمہ دار ٹرک (TRUCK) کو دیکھ کر اُس سے اپنا سر ٹکرا سکتا ہے۔

کرشن کے تمام نسوانی کردار پہلے سے بنے بنائے ہوتے ہیں اور مردوں کے کردار عورتوں کے کردار کے تحت بننا شروع ہوتے ہیں۔ کرشن کے نسوانی کردار ہرجائی نہیں ہوتے، انہیں زمانہ ہرجائی بنادیتا ہے۔ مرد ہرجائی ہوتا ہے، زمانہ نہیں بناتا، وہ خود بن جاتا ہے۔ مرد کردار ارادہ کو بالائے طاق رکھ دیتا ہے۔ نسوانی کردار اپنے ارادے کے ساتھ گھومتے ہیں۔ کرشن نے اپنے شاہکاروں میں عورت کو جو روپ بخشا ہے اور جس نظریہ کے تحت نسوانی کرداروں کی تخلیق کی ہے۔ اُردو ادب کے لئے یہ ایک خوش آئند موڑ ہے جو جدید بھی ہے اور سلسلہ وار بھی۔ اس کی روشنی میں ہم بلا تامل کہہ سکتے ہیں کہ کرشن چندر کا کوئی بھی ہیرو نہیں ہے! اس کے یہاں صرف ہیروئن ہیں۔ جن کا کردار بہت بلند ہے۔ کوئی ایسا مرد کردار نہیں جسے ہیرو کہہ سکیں۔ کرشن جی نے ولن پیدا کئے، ضمنی کرداروں کی تخلیق کی لیکن کوئی ایسا مرد کردار پیدا نہیں ہوسکا جسے کردار نگاری کی رفعتوں پر جگہ دی جاسکے۔

اور عورت کے آئینہ میں سارا سماج ننگا ہے اور سماج کے تمام مرد!

○○

بقیہ: بچا ہے۔ پٹیاں۔ پریمی صفحہ ۳۱

سکون ہے۔ طمانیت ہے!

ہنسی دم توڑ چکی تھی۔ طنز کے تیر و نشتر کند ہو گئے تھے۔ آوازیں اب بند تھیں۔ ناسور اب رس نہیں رہا تھا۔ زخم لہو نہیں اُگل رہا تھا۔ گھاؤ کے لب سُوکھ گئے تھے ــــ اب وہ پھر گہری گھاٹی میں جا چھپا تھا!

فن کے بچا ہے لے!
بچا ہے.....
پَرتیں.....
پھر سے جمادی تھیں!
آنسوؤں میں ڈوبی مسکراہٹ میں اب پھر اُس کا جادو ڈوب چکا تھا۔

○○

غزلیں

رونق دکنی سیمابی

براہِ شامِ غزل، صبحِ فکر و فن میں ملو
ہو رنگ و بُو کے مقفّل چمن چمن میں ملو

اُلجھ گیا ہے فریبِ کرم میں تارِ نفس،
اُمید و بیم کے گیسوئے پُر شکن میں ملو

میں تیرہ بخت سہی روشنی میں ہوں تحلیل
شعاعِ مہر میں ڈھونڈو کرن کرن میں ملو

نظر کی جُنبشِ پیہم جو ناگوار لگے
یہ اقتضائے محبت ہے مَن ہی مَن میں ملو

کتابِ فن ہی کا اک گمشدہ ورق ہوں میں
میری تلاش میں موضوعِ ہر سُخن میں ملو

ہے دُھوپ چھاؤں میں رقصاں تماشا
اگر نہ شہر میں ملنا ہے ہم سے، بَن میں ملو

بکھر نہ جاؤ بگولوں میں گرد کی صُورت
سمیٹو خود کو اک انگڑائی تو بدن میں ملو

یہ صبح و شب کے نظارے سلام کہتے ہیں
نہ اجنبی کی طرح اپنے ہی وطن میں ملو

لبادہ تلخ حقائق کا اوڑھ لو رونق
جو سر پھرے کسی ناقد سے انجمن میں ملو

راہی قریشی

پھر کوئی خواب سُہانا دیکھو
بند آنکھوں سے زمانا دیکھو

صرف سانسوں کے گنہگار ہیں ہم
کچھ نہ کھونا ہے نہ پانا دیکھو

ہے تمنّاؤں پہ تعمیرِ حیات
ریت کے قصر بنانا دیکھو

اُن کو سونپی گئی ناموسِ جہاں
جن سے رُسوا ہے زمانا، دیکھو

رنگ انداز ہوئے آخرِ کار
زینتِ آئینہ خانا دیکھو

ہے ابھی اہلِ زمیں سے اُمید
نقش پانی پہ بنانا دیکھو

اپنے حالات پہ ہنستا ہوں ابھی
آگ میں پھول کھلانا دیکھو

راہ میں ہم سے اُجالا ہے، مگر
راہ سے ہم کو ہٹانا دیکھو

آنے والا نہیں کوئی، لیکن
یہ دل و دیدہ بچھانا دیکھو

نا اُمیدی کے سیہ طوفاں میں
آس کا دیپ جلانا دیکھو

کتنی آنکھوں کو ملی گویائی
ہے خموشی بھی فسانا دیکھو

اپنے پیکر کو سنبھالو راہی
ہر حقیقت ہے فسانا دیکھو

○ [illegible]
ساحر - بمبئی۔

○ ۸۱ - وِدّیا نگر کالونی - بلز روڈ - گلبرگہ (کرناٹک)

برگِ آوارہ

م ۔ ق ۔ خان
معرفت شیخ ۔ مسجد لین، گیا، بہار

جنک اولاد کے لئے منت مان کر ہر روز مندر میں صبح کے وقت پھول چڑھانے جایا کرتا تھا۔ ایک صبح مندر کے دروازے پر الگ بھگ دو سال کی ایک بچی اُسے روتے ہوئے نظر آئی۔ پہلے تو اُسے خیال ہوا ضرور یہ شنکر بھگوان کا بردان ہے، لیکن دوسرے ہی لمحے وہ ایک انجانا سا خوف محسوس کرنے لگا۔ اس نے چاروں طرف نظر دوڑائی لیکن وہاں کوئی نہ تھا۔

وہ عجیب کشمکش میں تھا۔ اُسے ساتھ لے جائے یا نہیں، یہ سوال دیر تک اُس کی الجھن کا باعث بنا رہا۔ آخر دل پر جبر کر کے وہ وہاں سے واپس لوٹنے لگا۔ بچی اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگی۔ وہ دل کے ہاتھوں مجبور ہو گیا۔ اس نے بچی کو گود میں اٹھا لیا۔ بچی اُس کی آغوش میں آ کر یوں مطمئن ہو گئی جیسے اُسے اُسی آغوش کی ضرورت تھی۔

گاؤں کے لوگوں نے طرح طرح کے الزامات لگائے، لیکن جنک کی بیوی نے کسی کی پروا نہیں کی اور اُسے اپنے آنچل کا سایہ دیا۔ وہ اُس سے اس طرح پیار کرنے لگی جیسے وہ اُسی کی کوکھ سے پیدا ہوئی ہو۔ اُس نے بچی کا نام گنگا رکھا، جسے لوگوں نے اپنی زبان میں گنگیا بنا دیا تھا۔ کچھ دنوں کے بعد لوگ ساری باتیں بھول گئے اور گنگا اس گاؤں کے بچوں میں شمار ہونے لگی۔

ابھی وہ دس سال کی ہوئی تھی کہ اُس کی خوبصورتی، صحت اور سلیقہ مندی کا چرچا ہونے لگا۔ اب یہ صرف جنک اور اس کی بیوی کی ہی آنکھوں کا تارا نہیں تھی، بلکہ پورا گاؤں اُسے پیار کرنے لگا تھا۔

وہ گاؤں کی لڑکیوں کے ساتھ پہاڑ کے دامن میں پھیلے جنگل میں لکڑیاں چُننے جاتی۔ وہ دوسری لڑکیوں سے کہیں زیادہ جفاکش تھی۔ اسی طرح دن گزر رہے تھے کہ ایک دن وہ غائب ہو گئی۔ لوگوں کو تشویش سے زیادہ خوشی ہوئی۔ جنک کی بیوی پر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ وہ مدتوں شاعر بھی

کر نڈھال ہو رہی تھی اور لوگ طعنوں سے جلے پر نمک پاشی کر کے محظوظ ہو رہے تھے۔ جنک نے اس کی تلاش میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ لیکن ساری کوشش رائیگاں گئی۔ آخر دونوں میاں بیوی رو پیٹ کر بیٹھ رہے۔

ایک مہینے کے بعد، جب شام کا سرمئی آنچل گاؤں کو اپنے حلقے میں لپیٹ رہا تھا اور دھوئیں اور کہرے سے فضا میں دھند سی چھائی ہوئی تھی، گنگا گاؤں کی جانب آتی ہوئی نظر آئی۔ لوگوں نے اُسے دیکھا تو متحیر ہو گئے۔ جب وہ جنک کے گھر پہنچی تو جنک کی بیوی نے اپنا دروازہ بند کر لیا۔ اُس نے لاکھ منتیں کیں، لیکن جنک کی بیوی کی ممتا کے سارے سوتے جیسے خشک ہو چکے تھے۔ گنگا نے اپنی گٹھڑی گاؤں کے قریب ہی پیپل کے پاس رکھ دی اور وہیں بیٹھ گئی۔ وہ اب بھی جنک کے گھر کی جانب دیکھ رہی تھی۔ اُسے شاید اُمید تھی کہ آٹھ سال کی رفاقت نفرت کے نقش مٹا دے گی، لیکن ایسا نہ ہو سکا۔

اُسے اپنے گھر لے جانے کی کسی میں ہمت نہ تھی۔ لوگ اُس کے گرد جمع ہو گئے تھے اور اُس سے طرح طرح کے سوال کر رہے تھے۔ گنگا کی باتیں عجیب و غریب تھیں۔

"مجھے دیوتا، دیولوک میں لے گئے تھے۔"

لوگ اس کی باتیں سُن کر ہنس رہے تھے۔ کچھ دیر بعد اُس نے کہا: "میں لکڑیاں چُن رہی تھی کہ میرے نیچے کی دھرتی پھٹ گئی۔ میں ڈر کر بھاگنا چاہتی تھی کہ مجھے ایک سیاہ راج کمار نے اپنے رتھ پر بٹھا لیا اور پاتال لوک لے گیا۔"

"پھر تم واپس کیوں آ گئیں؟" کئی طرف سے سوال اُبھرے۔

"پہلے اپنی ماں کی خدمت کرنا میرا فرض ہے۔ بغیر ماں کی خدمت

گئے میں اس جیون سے انکار نہیں ہو سکتی۔ میں پاتال لوک اور دیو لوک والوں کو آنے والے جنموں میں آنے کا وعدہ کر کے واپس چلی آئی۔"

اس کے اس طرح کے جوابات سے لوگ اس سے خوفزدہ سے رہنے لگے۔ لوگوں نے کوشش کی کہ اسے بھگا دیں، لیکن گنگا اسی گاؤں کے آس پاس منڈلاتی رہی ــــــ کسی قسم کی دھمکی کا اس پر کچھ بھی اثر نہ ہوا۔

کئی ہفتے تک لوگ ڈرے سہمے رہے کہ ضرور کوئی آفتِ ناگہانی آنے والی ہے۔ لیکن جب نہ کوئی کالی آندھی آئی اور نہ برف باری ہوئی بلکہ ہوا یہ کہ کئی سال کی خشک سالی کے بعد بھرپور بارش ہوئی۔ اجڑے کھیتوں میں دھان لہلہا اٹھے، پہاڑ سرسبز و شاداب جنگل سے ڈھک گیا اور چراگاہوں میں گھاس اگ گئی۔

لوگوں میں اب بھی چہ میگوئیاں ہوتیں کہ ضرور کوئی ایسی ویسی بات ہے۔ گنگا کا کوئی عمل ایسا نہیں ہوتا تھا جس سے کسی کو شکایت کا موقع ملتا۔ وہ اب بھی لکڑیاں چن کر جنک کے دروازے کے سامنے رکھ دیتی۔ لوگ خوف سے یا ازراہِ ترحم اسے کھانے کو کچھ دیدیتے تو کھا لیتی ورنہ وہ کسی سے کچھ مانگتی نہیں تھی۔

گاؤں کے پاس سے گزرنے والے نالے کو کون خاطر میں لاتا ہے؟ جب کبھی برسات کے پانی سے یہی خطِ تختی طغیانی سے ہم کنار ہو کر قرب و جوار کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا تو لوگوں کی توجہ کا مرکز بن جاتا ــــــ لوگوں کی زبان پر بس اسی کا چرچا ہوتا۔

گنگا چاند کی طرح دھیرے دھیرے جوان ہوتی گئی۔ حسنِ فطرت کی آغوش میں پل پل بڑھتی وہ لوگوں کی نگاہوں کا مرکز بنتی گئی۔ جوان ہو کر وہ مجسم رتی بن گئی۔ بالکل سوم! اب گاؤں کے کام دیو کو رات میں سوتے سوتے گنگا کے خواب آنے لگے تھے۔ مگر اس پر ہاتھ ڈالنے کی کسی میں جرأت نہ تھی۔ لوگوں نے دیکھا تھا کہ وہ نہایت تیز ڈھال اور اونچی چوٹیوں پر اتنی تیزی سے چڑھ جاتی کہ انہیں گمان ہوتا ضرور یہ کوئی مافوق الفطرت ہستی ہے۔ تناور درختوں کو وہ اس طرح ہلا دیتی کہ جیسے اس کے ہاتھوں میں طوفان سے بھی زیادہ زور ہو۔ وہ چٹانوں کو اوپر سے لڑھکا کر ان کے ساتھ ساتھ دوڑتی ہوئی وادی میں آجاتی اور پھر اس کے قہقہے طغیانی والی ندی کے جھاگ کی طرح فضا میں ابھر کر بازگشت کرتے۔ ان ہی سب باتوں کو دیکھ کر کوئی اسے چھیڑنے کی ہمت نہ کرتا۔

شاعر، بمبئی

وہ خود کبھی کبھی لوگوں سے چہلیں کرتی، لیکن جہاں کوئی رکیک کلمہ منہ سے نکالتا تو وہ بھوانی بن جاتی۔ اس کی آنکھوں سے جیسے خون ٹپکنے لگتا۔ لوگ سہم جاتے۔ انہیں محسوس ہوتا کہ وہ ہنسیا جس سے وہ لکڑیاں کاٹا کرتی ہے ترشول بن گیا ہے۔ کہیں غصہ میں آگئی تو سارے گاؤں کا صفایا کر دے گی۔ خوف کا یہ عالم تھا کہ انہیں اس کے ہونٹوں سے خون کے فوارے اڑتے نظر آتے، گلے میں بھیروں کے بے شمار سروں کی مالا ہوتی۔

لیکن........ جیون کی اماوس میں جب پونم کا چاند سنہری چاندنی بکھیر رہا ہو اور نیل گگن سے خاموش اشارے کر رہا ہو تو چکور خاموش کیسے بیٹھ سکتا ہے؟

شباب کی کمان سے چھٹنے ہوئے تیر جوانوں کو گھائل کر رہے تھے، بس ایک عجیب سے خوف کا احساس تھا اور کسی میں پہل کرنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔

ایک دن گنگا لکڑیاں چن رہی تھی کہ زوروں کی آندھی آئی۔ وہ دوڑ پڑی کہ گاؤں لوٹ جائے لیکن راستے ہی میں ژالہ باری اور بارش نے اسے رکنے پر مجبور کر دیا۔ اسے دور سے ایک جھونپڑی نظر آئی۔ وہ بھیگتی درختوں کی اوٹ لیتی اس جھونپڑی تک پہنچ گئی۔ کٹیا خالی تھی۔ گنگا نے اپنے بھیگے کپڑے نچوڑے۔ اس کی نگاہ اپنے برہنہ جسم پر گئی تو وہ شرما سی گئی ــــــ وہ ڈر گئی ــــــ کہیں کوئی وشوامتر مینکا کے حسن پر فریفتہ نہ ہو جائے۔ اس نے جلدی سے کپڑے پہن لئے۔ گیلے کپڑوں کے لمس سے اسے ایک عجیب سی لذت محسوس ہوئی۔ کپڑے بھیگ کر تنگ ہو گئے تھے، اس کا جوان جسم کپڑوں کے درپن سے جھانک رہا تھا۔ اس کا بلاؤز چبھتا جا رہا تھا۔ اس نے باہر جھانکا۔ گھنگھور گھٹا ہر طرف سے سمٹ کر جنگل پر ڈٹی جا رہی تھی۔ ہوا اب بھی تیز تھی جس کے تھپیڑوں سے شاخیں جھوم رہی تھیں، جیسے فطرت کے دیوسوم رس پی کر بدمستی میں جھوم رہے ہوں۔ وہ سہم گئی، اندھیرا گہرا ہوتا جا رہا تھا۔ اس نے لکڑیوں کا گٹھر اٹھا کر باہر قدم نکالا تھا کہ پاس کے درخت کے نیچے سے آنے والی آواز نے اسے چونکا دیا "گنگا" "کیوں خطرہ مول لیتی ہے۔ ذرا اور رک، پانی تھمنے دے۔"

اسے کچھ نہیں دکھائی دیا تو اس نے پوچھا ــــــ "ارے تو

کون ہے مجھے روکنے والا ؟"

"میں ــــ ؟ میں مدن ہوں"

"مدن ...... ؟" وہ سوچنے لگی یہ شاید وہی مدن تو نہیں۔ ــــ گاؤں کا سجیلا نوجوان جسے دیکھ کر خود اُس پر بھی نشہ چڑھ جایا کرتا تھا۔ گنگا کو اُس پر ترس آگیا ــــ اس نے کہا "وہاں درخت کے نیچے کیوں بھیگ رہا ہے ؟

بھیگوں یا سُلگوں..... ؟ میں نے تمہیں بھیگے کپڑے نچوڑتے دیکھا......"

"دو شاشن ! میں کپڑے نچوڑ رہی تھی اور تُو مجھے نہار رہا تھا ؟"

"نہیں نہیں' اندو ..... بھگوان ساکھی ہے۔ میں تمہیں دیکھ کر ہی یہاں رُک گیا اور درخت کے نیچے بھیگتا رہا لیکن ......"

اچھا' اچھا ــــ آ یہاں چلا آ "

"مدن ایک کونے میں آکر کھڑا ہو گیا۔ پانی پھونس کی چھپر سے رِس رِس کر نیچے آ رہا تھا

"یہاں تو چھپر ٹپکتا ہے"

"تو دوسرے کونے میں چلا آ ــــ یہاں تو پانی نہیں ٹپکتا"

بارش کبھی تیز ہو جاتی ــ کبھی دھیمی' لیکن ہوا اُسی زنّاٹے سے چل رہی تھی۔ بادل اور شام کے بڑھتے سایوں نے مکمل تاریکی پھیلا دی تھی۔

"اِس کٹیا میں آگ جلانے کو کچھ نہیں ہے ؟"

"کون جانے ؟ دوسرے کی چیز بغیر اُس کی اجازت کے لینا پاپ ہے نِلنے گھور پاپ !"

"میں ادھیکار جتانا تھوڑا ہی چاہتا ہوں' بس آگ ہوتی تو.... آگ کی چوری کوئی چوری ہوتی ہے ؟" مدن نے اپنے ہاتھ بغل میں ڈال لئے تاکہ کچھ گرمی محسوس ہو۔

دونوں نے پھر ایک بار باہر دیکھا۔ گنگا نے قدم نکالے ہی تھے کڑکڑ پٹ پٹ کی آواز کے ساتھ برف باری اور تیز ہو گئی۔ وہ عجیب کشمکش میں تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے اِس برف باری میں بھی اُس کا ارادہ جانے ہی کا ہے۔ یہ دیکھ کر مدن نے کہا "برف باری تو رکنے دو۔ اب ایک لمحہ بھی ہم یہاں نہیں رُکیں گے"

لیکن برف باری تھمی نہیں ۔ آندھی تیز تر ہوتی گئی' رات شاعر بھئی

گہری اور ڈراؤنی ہو چکی تھی۔ ہاتھ تک سجھائی نہیں دیتا تھا۔

"بھگوان کو کیا منظور ہے ؟ کیا سنسار کو ختم کر کے ہی دم لیں گے ؟"

سردی سے گنگا کے ہونٹ کپکپا رہے تھے۔ بولتے وقت آواز سے کپکپی ظاہر ہو رہی تھی۔ وہ گٹھڑ کے قریب دونوں ٹخنوں کے گرد باہنوں کا حلقہ کئے بیٹھی تھی۔ دونوں کے دل میں ایک ہی خیال اُٹھ رہا تھا۔ آگ کی ایک چنگاری بھی ہوتی تو اُسے ہوا دے کر لکڑیوں کی مدد سے شعلہ بنایا جا سکتا تھا۔

مدن نے ٹٹول کر ماچس تلاش کر لی اور اس نے ایک تیلی جلائی کہ دیا تلاش کر سکے۔ تیلی کی لَو ہوا کے جھونکے سے کپکپانے لگی۔ سائے لمبے چوڑے ہونے اور گھٹنے بڑھنے لگے۔ طاق پر اُسے ایک چراغ نظر آیا۔ مدن نے چراغ جلایا۔ تھوڑی سی چڑچڑاہٹ کے بعد دیا جلنے لگا۔

روشنی ہوتے ہی غیرت کا عفریت دونوں کے درمیان آن کھڑا ہوا۔ گنگا نے تشویش بھری نظروں سے مدن کی جانب دیکھا ــــ وہ اپنے خیال میں کہیں کی کہیں بھٹک نکلی تھی۔ مدن اُسے راکششوں کی طرح کبھی خونخوار لگتا اور کبھی بچے کی طرح معصوم ــــ اس کا گٹھا جسم مردانہ حسن کا نمونہ تھا۔ اُس کے کندھے سے کلہاڑی لٹک رہی تھی ــــ یہ کلہاڑی گنگا کو سدرشن چکر لگی۔

مدن بھی خاموش اپنے تصوّر میں بھٹک رہا تھا۔ وہ چراغ کی مدّھم روشنی میں عقب سے گنگا کا ہیولیٰ دیکھ رہا تھا۔ اُس کے بال بکھر کر چہرے پر آگئے تھے۔ کپڑے جسم سے چمٹ گئے تھے۔ وہ اب بھی اپنا ہنیا ہاتھ میں لئے تھی۔ وہ مجسّم چنڈی لگ رہی تھی، لیکن پھر دوسرے ہی لمحہ اس کے چہرے کی شگفتہ سادگی، اس کی شفّاف آنکھوں سے اُمڈتا پیار اُسے گوری بنا دیتا یا یشودھا جس کی گود میں مدن کا ننھا سا دل' نندلال ہر آفت سے محفوظ کھیلنے لگتا۔

مدن کھڑا تھا اور سردی سے اس کی ٹانگیں خود بہ خود ایک دوسرے سے جڑی جا رہی تھیں۔ گنگا کے اندر کی خفتہ انسانیت سے یہ دیکھا نہ گیا۔ اس نے اپنی گٹھڑی سے چند لکڑیاں نکالیں اور جلا دیں۔ پہلے تو کمرے میں دُھواں بھر گیا' لیکن دھیرے دھیرے لکڑیاں سُلگنے لگیں ــــ مدن دُور ہی سے کھڑا کھڑا ہاتھ سینکنے لگا۔ باہر اب بھی برف باری ہو رہی تھی اور ہوا کے جھکّڑ درختوں کی

نرم و نازک شاخوں سے اُبھر رہے تھے۔ ہر طرف پانی ہی پانی نظر آ رہا تھا۔ بس یہی ایک کٹیا تھی جو نوحؑ کی کشتی کی طرح محفوظ تھی۔ کبھی کبھی بجلی چمکتی یا بادل گرجتے تو دونوں لرز اُٹھتے۔ دونوں ایک دوسرے کی جانب دیکھتے۔ دونوں کے چہروں پر فطرت کی چیرہ دستیوں کے خلاف خاموش احتجاج تھا۔

آگ بجھنے لگتی تو گنگا دوسری لکڑی ڈال دیتی۔ اب دونوں آگ کے الاؤ کے دو طرف بیٹھے بارش کے رکنے کا انتظام کر رہے تھے۔ آگ کے پاس بیٹھے بیٹھے جانے کس وقت اُن پر نیند کا غلبہ ہوا اور دونوں سو گئے۔ گنگا کی نیند ٹوٹی تو اُس نے دیکھا کہ چاند کی روشنی چوری چوری چھپر سے ہو کر اندر آ رہی ہے۔ آگ بجھ چکی تھی اور دیا بھی خاموش تھا۔ اُس نے چاروں طرف نظر ڈالی۔ مدن نظر نہیں آیا۔ اُسے محسوس ہوا جیسے وہ خواب دیکھ رہی ہے۔ اُسے خیال ہوا کہ وہ جنک کے کمرے میں ہے۔ اس نے لاکھ ذہن پر زور دیا لیکن حالات کو نہ سمجھ پائی۔ گھوم پھر کر اس کا دماغ مدن پر مرکوز ہو جاتا ــــ۔ وہ متجسس نگاہوں سے اُسے دیکھنے لگی۔ لیکن کمرے کی سرمئی فضا میں اُسے ایک دھبّہ بھی نظر نہیں آیا۔

اُس کا سر چکرانے لگا۔ جسم کے جوڑ جوڑ میں ایک ٹیس سی محسوس ہوئی۔ اس نے ذہن پر اور زور دیا تو یادداشت پر چھایا کُہرا صاف ہونے لگا۔ کچھ عجیب واقعات اس کی یادداشت کے دریچوں سے جھانکنے لگے۔ مُبہم مُبہم سی یادوں کی ڈور کبھی الجھتی اور کبھی سُلجھنے لگتی۔ اِس اُدھیڑ بُن میں صبح کی سپیدی کٹیا میں در آئی۔ اب کمرے میں ہلکی سی روشنی ہو گئی تھی۔ کمرے میں راکھ بکھری ہوئی تھی۔ خود اُسکے کپڑے راکھ سے اٹے ہوئے تھے اور جسم پر جیسے بھبھوت سی لگی ہوئی تھی۔ وہ گھبرا کر اُٹھنے لگی۔ اس کوشش میں اُس کا خواب ٹوٹ گیا۔ ساری گتھی سلجھ گئی۔ اس کا جی چاہا کہ وہ تنہا رہے۔

وہ کئی دن تک غائب رہی۔ گاؤں آئی تو اُسے پتہ چلا کہ مدن اُس رات کی برف باری سے غائب ہے۔ کسی کو ابھی تک اس کا کوئی پتہ نہیں ہے۔

"جو کچھ ہونا تھا ہو چکا" گنگا نے دل کو سمجھایا۔ جب بھی گھٹائیں گھر آتیں یا رِم جھم کا سرگم بج اٹھتا تو گنگا کے دل میں ایک ہُوک سی اُٹھ جاتی۔ مدن کی قربت کے لئے دل تڑپ اُٹھتا۔ وہ یہی سوچتی رہتی کہ آخر مدن کو کیا ہوا؟ وہ کہاں چلا گیا؟

ایک رات مدن سر نیچا کئے اس کے پاس آیا۔ وہ گھٹنے ٹیک کر اُس سے معافی مانگنے لگا۔ گنگا نے اُسے معاف کر دیا۔ وہ بڑھی کہ اسے سینے سے لگا لے، لیکن مدن اُلٹے پاؤں لوٹ گیا۔ وہ بھی اُس کے پیچھے چل پڑی۔ مدن دوڑتا ہوا پہاڑ کی چوٹی پر چڑھ گیا۔ اِس سے پہلے کہ گنگا اُسے پکڑتی اُس نے نیچے چھلانگ لگا دی۔ ایک دلخراش چیخ گنگا کے حلق سے نکلی اور اس کی نیند ٹوٹ گئی۔ خواب بکھر گئی۔

ایک دن لکڑیاں چُنتے چُنتے گنگا کو اُبکائی آئی۔ ایسا لگا جیسے آنتیں اور کلیجہ نکل کر باہر آ جائیں گے۔ بدلتے ہوئے حالات کا احساس سے گنگا کے دل میں نشتر سے چبھنے لگے۔ وہ جھاڑی کے بیچ کھڑے ہو کر جب اپنے جسم کی گولائیوں کو دیکھتی تو ڈر جاتی۔ وہ محسوس کرتی جسم کے انگ انگ اس کے اندر بیٹھے چور کی چغلی کھا رہے ہیں اور ہر شخص کی نظر اُسے ہی گھور رہی ہے۔ وہ جب کسی کو اپنی جانب گھورتے دیکھتی تو کانپ اٹھتی ـــ سہم جاتی۔

اُس نے بہت کچھ سوچا، لیکن اُسے کوئی راستہ نظر نہ آیا۔ آخر اُس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ خودکشی کر لے گی۔ ایک اندھیری رات میں جب گاؤں کے سارے لوگ نیند کے غلاف میں بند تھے وہ اُٹھی اور پہاڑ کی جانب چل پڑی۔ وہ ایک بلند چوٹی کی طرف چڑھنے لگی۔ اُس وقت اُس کے پیٹ کے اندر سے آواز آنے لگی "ماں مجھے کس دوش کی سزا دے رہی ہو؟ میں نے کیا پاپ کیا ہے؟"

گنگا دم بخود رہ گئی۔ اس کے سینے میں اُبال سا اُٹھا جیسے کسی برتن کے پیندے کے نیچے بہت تیز آنچ جل اٹھی ہو۔ اُسے محسوس ہوا کہ اس کے سینے سے دودھ کی دھار بہنے لگی ہے۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھوں سے اپنا سینہ پکڑ لیا۔ اُس نے ارادہ کیا کہ دودھ سے بھرے کٹوروں کو بہہ کر خالی نہیں ہونے دے گی۔ اُسے قریب سے پھر سرگوشی سُنائی دی "تمہارا جسم، تمہاری سانس کسی دوسری طاقت کی امانت ہے۔ تمہیں اُسے من مانی سے استعمال کرنے کا کوئی حق نہیں۔" اس کے قدموں میں پہاڑ کی چٹانیں زنجیر بن گئیں۔

وہ واپس لوٹ گئی اور دوسرے دن مدن کی تلاش میں نکل پڑی۔ مدن کی ضرورت کا احساس بڑھ گیا تھا ــــ دیئے کی بتی جل کر بھی روشنی قائم نہیں رکھ سکتی۔ اسے ہر حال میں تیل کی ضرورت ہوتی ہے۔ روشنی جو تاریکی کو دُور بھگاتی ہے، خود اپنی حفاظت نہیں کر سکتی۔ اسے فانوس کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن اس کی قسمت میں یہ شہر پناہ نہیں تھی۔ وہ نام نگر میں پہونچی تو لوگوں کے بوجھ سے بے بس ہو چکی تھی۔ ایک رات ریلوے کے پُل کے نیچے گنگا کو بِن بلائے مہمان کو خوش آمدید کہنا پڑا۔ وہاں نہ گانے والی عورتیں تھیں، نہ سائنس کی نو ایجاد دوائیں

نہ کوئی دائی ـــــ قانونِ فطرت کسی کا محتاج نہیں ہوتا۔

اس بچے کو دیکھ کر نہ کسی کے لب پر مسکراہٹ کی کلیاں چٹکیں، نہ کسی کے دل کے کنول کھلے۔ ایک بے بس ماں کے چند آنسوؤں کے بے قیمت قطرے تھے یا اُس پُل کے نیچے رہنے والی بھوتی جیسی عورتوں کی ہمدردی کے چند کلمات جو خود غم اور خوشی سے بے نیاز زندگی کی دار پر سر جھکا کے کھڑی تھیں۔ سڑک سڑک، گلی گلی، گھر گھر سے مانگے کا اُجالا گنگا کی زندگی میں شبِ مہتاب بن کر چمکنے لگا ـــــ وہ بچے کو لیکر شہر جاتی اور روٹی کے چند ٹکڑوں کے عوض طعنے سنتی اور اُنہیں سالن سمجھ کر روٹی کے ساتھ حلق کے نیچے اتار لیتی۔ کوئی کہتا "کام کیوں نہیں کرتی؟" "آخر اس قدر مجبور تھی تو بچہ جننے کی کیا ضرورت تھی؟"

کوئی منچلا دو چار گندے فقرے کس کر اپنی جنسی خواہش کی تسکین کر لیتا۔ دھیرے دھیرے گنگا کو یہ ساری باتیں اچھی لگنے لگیں۔ وہ کام کرنا چاہتی تھی، لیکن بچے کو کوئی دیکھنے والا نہ تھا۔ اِسی طرح تین مہینے گزر گئے۔

وہ دیوالی کی رات تھی۔ سارا شہر بقعۂ نور بنا ہوا تھا۔ اس پُل کے نیچے بھی تیل کے چند دیئے سرِ شام روشن ہوئے اور غریب کے ارمان کی طرح جلد ہی بجھ گئے۔ پھر کبھی کافی رات تک اُس ویران نگری میں چہل پہل رہی۔ وہاں رہنے والے مرد الگ الگ ٹولیوں میں بیٹھے جوا کھیل رہے تھے، یا شراب پی رہے تھے۔ رات کا پچھلا پہر تھا۔ اور نیند کا جادو پورے شباب پر تھا۔ گنگا نے اپنے سینے پر اپنے بچے کے بجائے کسی کے سخت ہاتھوں کی گرفت محسوس کی۔ اُس کی نیند ٹوٹ گئی۔ اُسے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ کوئی مرد اس پر جھکا ہوا ہے اور اُس کے مُنھ پر شراب کی بُو آرہی ہے۔ گنگا نے اس کا ہاتھ جھٹک کر اُٹھنا چاہا مگر اُس نے ایک ہاتھ اس کے منھ پر رکھ کر اُسے اپنی طاقت سے بے بس کر دیا۔ گنگا تلملا گئی۔ پہاڑوں کی بلندیوں کو زیر کرنے والی گنگا نے اپنی پوری طاقت لگا کر اُسے پرے ہٹانا چاہا۔ وہ شاید ایسی سخت مزاحمت کے لئے تیار نہ تھا اور پُل کی دیوار سے جا ٹکرایا۔ اُس کے سر میں اتنی شدید چوٹ آئی کہ وہ بے ہوش ہو کر گرا اور پھر اٹھ نہ سکا۔ اس کی چیخ سے سارے لوگ اُٹھ کھڑے ہوئے اور گنگا پر طوفان کی طرح جھپٹ پڑے۔ سنگلو کی موت سارے پُل والوں کی عزت کا سوال تھی۔ لوگوں نے اُسے پیٹنا شروع کیا۔ ادھر سنگلو کی بیوی نے اُس کا بچہ اُس سے چھین کر لائن پر پھینک دیا۔ بچہ دوسرے ہی لمحہ سرد گوشت کا ایک لوتھڑا تھا۔ گنگا رات کی تاریکی اور ان لوگوں کے نشے کی وجہ سے پُل سے زندہ بچ نکلی ـــــ اب تاریکی ہی اس کی زندگی کی محافظ تھی۔ صبح ہوتے ہوتے وہ اس شہر سے باہر ہو چکی تھی۔

وہ سڑک کے کنارے کنارے چلتی رہی۔ اُسے پتہ نہیں تھا کہ کہاں جا رہی ہے؟ اسی طرح دوپہر ہو گئی۔ اب وہ تھک کر چُور ہو چکی تھی۔ بھوک سے بالکل نڈھال تھی اور حلق میں کانٹے چبھ رہے تھے۔ سڑک کے کنارے ایک درخت دیکھا تو اس کی جڑ کے پاس بیٹھ گئی۔ گرد و نواح میں کسی گاؤں کا نام و نشان نہ تھا۔ یہ جگہ ویران تھی۔ وہ ابھی اسی ادھیڑ بن میں تھی کہ کیا کرے کہ اس کی آنکھ لگ گئی۔ اس کی نیند اُس وقت ٹوٹی جب ایک شخص نے اُسے اٹھایا۔ وہ شخص خاکی وردی میں تھا۔ اُسے دیکھتے ہی گنگا کے اوسان خطا ہو گئے۔ وہ چیخ اٹھی "میں..... میں نے نہیں..... اُس نے ..... میرے بچے کو....." اس کا گلا رُندھ گیا اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ وردی پوش شخص کچھ نہ سمجھ پایا اور گھبرایا ہوا موٹر کے پاس گیا، جس میں ایک عورت بیٹھی تھی۔ عورت فوراً موٹر سے اتر کر گنگا کے پاس آئی اور اُسے تسلی دینے لگی۔ اس نے گنگا کو اس کی منزل تک پہونچانے کی پیشکش کی۔ گنگا منزل کا پتہ کیا بتاتی؟ جب کہ اُس کی کوئی منزل ہی نہ تھی۔ اس عورت کی ہمدردی نے گنگا کا دل جیت لیا اور وہ اس کے ہمراہ جانے پر راضی ہو گئی۔

وہ ایک عالی شان مکان میں لائی گئی۔ اُسے نئے کپڑے پہنائے گئے۔ نہایت لذیذ کھانا ملا جس کا گنگا نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔ رات میں سونے کو نہایت نرم بستر ملا۔ اس بدلی ہوئی حالت پر گنگا غور کرتی تو اُسے خیال ہوتا ضرور وہ کوئی خواب دیکھ رہی ہے۔ یا پھر کسی طلسمی دنیا میں ہے۔ وہ اس طرح زندگی گزارنے لگی جیسے ندی اب میدانی حصہ میں تھک خرام ہو۔ آرام و آسائش کے سارے سامان مہیا تھے۔ کسی نے کبھی اسے کوئی کام کرنے کے لئے نہیں کہا۔ وہ دن رات کمرے میں بیٹھی رہتی۔ دھیرے دھیرے اُس کی نقاہت دور ہوتی گئی۔ مردہ اعضا میں توانائی دوڑنے لگی۔ وہ چاہتی کہ کچھ کہے، لیکن اس کی جرأت نہ کر پاتی۔ وہ اسی چین جبیں پر وہ عورت مادرانہ شفقت سے تشویش کا اظہار کرتی۔ اس کی نگہداشت پر پانی کی طرح روپیہ صرف کرتی۔ گنگا کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا کہ آخر اس طرح اُس کی آؤ بھگت

تا عمر بھٹکتی

کی وجہ کیا ہو سکتی ہے؟

ایک شام اُس کی مالکن آئی اور اس نے نئے کپڑے اور زیورات پہننے کو دیئے۔ ایک عورت نے اُس کے چہرے پر پاؤڈر ملا۔ عطر کی ایک پوری شیشی اس پر اُنڈیل دی گئی۔ اُس نے غور سے دیکھا تو پوری عمارت بقعۂ نور بنی ہوئی تھی۔ خود اس کے کمرے میں جھاڑ فانوس لٹک رہے تھے۔ گنگا متحیر تھی۔ پورے ماحول پر عجیب کیف و نشاط کا رنگ تھا۔ اسی طرح رات کے بارہ بج گئے۔ اس کی مالکن نے ایک امیرانہ ٹھاٹھ والے نوجوان کو خوش آمدید کہا۔ گنگا کو حسن بانو کہہ کر اُس سے تعارف کرایا گیا۔ جب گنگا نے سہمی ہوئی کبوتری کی طرح اپنی مالکن کی جانب دیکھا تو اُس نے نہایت مشفقانہ جملوں سے اُسے تسلی دی اور بہانہ بنا کر کمرے سے نکل آئی۔

وہ گم سم بیٹھی رہی۔ کبھی مدن، کبھی وہ وحشی بھکاری جو نستے میں دُھت اُس پر جھپٹ پڑا تھا، اس کی نظروں میں ناچنے لگا۔ کبھی اس کو اُس کا بچہ ریلوے لائن پر دم توڑتا نظر آتا —— ٹیوب لائٹ کی سیمابی روشنی میں بھی اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا تھا۔ —— وہ حالیہ حالات کی گتھی سلجھانا چاہتی تھی —— آخر اس شخص کی موجودگی کس بات کی علامت ہے؟

اُس شخص نے روشنی گُل کر دی۔ اس کے ساتھ ہی گنگا کی جگر خراش چیخ سے پورا کمرہ جھنجھنا اُٹھا "میرا بچہ! میرے بچے کو نہ مارو، میرے بچے" —— اس شخص نے لپک کر گنگا کو اپنی گرفت میں لے لیا اور اس کے منھ پر ہاتھ رکھ دیا۔

"گھبراؤ نہیں!"

"نہیں...... تم میرے بچے کو لائن پر تو نہیں پٹکو گے؟"

"نہیں!"

"سچ مچ!"

وہ شخص اُسے تسلی دیتا رہا۔ گنگا کو پُرسکون پا کر وہ اس کے جذبات سے کھیلنے لگا۔ گنگا دھیرے دھیرے خواب کی دُنیا میں اُترتی جا رہی تھی۔ اُس کے شعور پر سیاہ پردے لٹکتے جا رہے تھے۔

گنگا کو اس طرح خاموش پا کر اس نے سمجھا کہ اس نے اس کا دل جیت لیا ہے۔ اس نے چاہا کہ گنگا کو بستر پر لٹا دے۔ ساتھ ہی اُس نے اُس کے سینے پر ہاتھ رکھ دیا۔ گنگا کو محسوس ہوا کسی نے اسکے شاعر بھی

ننھے بچے کو ریل کی پٹری پر پٹک دیا ہو۔ وہ زور سے اُس کا ہاتھ جھٹک کر اپنے بچے کو بچانے کے لئے جھپٹی اور چیخی "میرے بچے کو نہ مارو۔"

اُس شخص نے طاقت سے اُسے زیر کرنا چاہا، لیکن پہاڑوں اور جنگل میں پلی اور وادیوں میں کھیل کود کر جوان ہونے والی گنگا پر اس طرح دست درازی اُس دھان پان امیر زادے کے بس کی بات نہ تھی۔ وہ لڑھک گیا اور گنگا کمرے سے باہر نکل چکی تھی۔ اس سے پہلے کہ کسی کو خبر ہو وہ سڑک پر بے تحاشہ بھاگتی ہوئی ایک تاریک گلی میں داخل ہو گئی۔ وہ اندھیری گلی میں بھاگتی رہی۔ ایک جگہ رکی تھی کہ اب کس طرف رخ کرے کہ ٹارچ کی روشنی نے اُس کی آنکھوں کو چکا چوند کر دیا۔ اس کی زبان سے اب بھی "نہیں، نہیں، نہیں" کی آواز نکل رہی تھی۔ بال یوں بکھرے تھے کہ ٹارچ والے نے کہا "سالی کوئی پگلی ہے۔" اور رات کی ڈیوٹی پر گشت لگانے والے سپاہی نے ٹارچ بجھا دی۔ اس کے ساتھ والے دوسرے سپاہی نے اپنی ٹارچ روشن کرتے ہوئے کہا "تم کون ہو؟" اور پھر سرگوشی میں اپنے ساتھ والے سپاہی سے کہا "جو بھی ہو —— دیکھتے ہو کیا گٹھا جسم ہے؟"

گنگا کو خاموش دیکھ کر اُس نے ڈانٹتے ہوئے کہا "چل تھانے چل۔" گنگا خوف سے تھر تھر کانپ رہی تھی، لیکن جب سپاہی نے بازو پکڑ کر دھکا دیا تو ساتھ ساتھ چلنے لگی۔ کئی گلیاں پار کر کے سپاہی نے ایک مکان کے عقبی حصے پر تین بار اپنا ڈنڈا مارا۔ بالکل کھل جا سم سم کے سے انداز میں ایک دروازہ کھلا اور ایک عورت نے دروازے پر آتے آتے کرخت لہجے میں نمائش کی "ایسے بے وقت آتے ہو۔"

"تیرے یہاں اور کون سا وقت آنے کا ہے؟" کہتے ہوئے سپاہیوں نے گنگا کو دھکے دے کر اندر داخل کیا۔ ابھی یہ بیٹھے ہی تھے کہ اُس عورت نے دیسی شراب کی بوتلیں اُن کے سامنے رکھ دیں۔ دونوں سپاہیوں نے ایک ایک اپنے قبضے میں کی اور تیسری گنگا کی جانب لڑھکا دی۔ گنگا نے احتجاج کرنا چاہا تو زبردستی آدھی بوتل اُس کے حلق میں اُنڈیل دی۔ گنگا کا حلق جل اُٹھا —— لیکن خون میں گرم رَو سی دوڑنے لگی۔ آنکھیں جلنے لگیں۔ —— صبح ہوتے ہوتے گنگا اور وہ عورت ایک دوسرے کی رازدار بن چکی تھیں۔ ساری حقیقت روشن ہو چکی تھی اور خواب ٹوٹ چکا تھا۔

عقلمند کاشتکار دریا کا رُخ اپنی کھیتی کی طرف نہیں موڑتے،

بلکہ اس سے نہریں نکال کر کھیتی سیراب کرتے ہیں۔ آس شراب فروش عورت کے آنگن میں لوگوں نے یہ نیا چاند دیکھا تو آسمان پر جلوہ افروز کرنے کی فکر میں سرگرداں نظر آنے لگے۔ ادھر اُدھر گنگا نے بھی دیکھا کہ جب برسنا ہی ہے تو کسی آنگن میں کیوں ——؟ کھلے میدانوں اور سرسبز کھیتوں ہی میں کھل کر برسے —— نتیجہ یہ ہوا کہ گنگا کی جوانی گھنگھور گھٹا بن کر اُمڈی اور ایسی موسلادھار بارش ہوئی کہ سیلاب آگیا۔ پہلے نازک بیل کی طرح کچھ لوگوں کا سہارا لے کر ایک کمرے میں آئی —— کمرے سے زینے کی طرف قدم بڑھایا اور بہت جلد ایسی بلندی پر چڑھ گئی کہ سہارا دینے والوں میں سے بہتوں نے خود کو بونا محسوس کرنا شروع کر دیا۔ اب پورے شہر میں اسی کا چرچا تھا۔ لوگ ایک رات کی قیمت دکھانے میں اپنی پوری دولت گنوا بیٹھتے۔ اچھے اچھے دولت مند سیٹھ اور رئیس اسے اپنانے کے لئے اس کی دہلیز پر ناک رگڑتے، لیکن یہ بھلا کسی کو کیوں خاطر میں لانے والی تھی ——؟ غرض اُس نے حُسن و شباب کو دونوں ہاتھوں سے لُٹایا۔ اور دوسروں کی دولت لوٹی۔ کتنے عاشق دیوالیہ ہوئے، کتنوں نے بیراگ لیا، کسی نے خودکشی کی، کوئی پاگل ہو گیا۔

اُس نے اپنے عروج کے زمانے میں کئی اسکول، اسپتال، دھرم شالے اور سافر خانے بنوائے۔ یتیم اور بیواؤں کے لئے ٹرسٹ قائم کئے۔ —— شباب کی دوپہر ڈھلتی دیکھ کر گنگا ایک رات چپکے سے شہر سے غائب ہو گئی۔ کچھ دنوں تک لوگوں نے تلاش کیا، انتظار کیا، لیکن جلد ہی یہ نام حرفِ غلط کی طرح مٹ گیا۔ اس خالی جگہ کو پُر کرنے بہت سی حسن بانو موجود تھیں —— یہ اور بات تھی کہ اُس درخشندہ ستارے کی موجودگی میں یہ جگنو معلوم ہوتی تھیں۔

گنگا تیرتھ یاترا پر نکل گئی۔ شمالی ہند کی ساری تیرتھ گاہوں میں دن گزارے۔ غربا، فقرا اور معذوروں کو دل کھول کر خیرات دی۔ اس کے بعد گنگا ساگر پہونچی —— اب کہیں کی بےچین روح کو سکون کا احساس ہو رہا تھا۔

گنگا ساگر میں میلا تھا۔ سمندر کے بیچ کا یہ مقام چٹیل میدان تھا اور زائرین جوق در جوق درشن کو چلے جا رہے تھے۔ گنگا بھی ایک قافلے کے ساتھ ہولی۔ وہاں جاکر جیسے اسے ابدی سکون مل گیا۔ اعلان ہوا کہ کچھ ہی دیر میں سمندر کا پانی یہاں آجائے گا۔ زائرین جلد ہی

جلدی واپس لوٹنے لگے۔ گنگا بھی اُن کے ساتھ لوٹنے لگی۔ پانی کا ریلا اُن کی جانب بڑھ رہا تھا۔ اُس نے پلٹ کر دیکھا۔ اسے لگا پانی کے بیچ سے سیتا اُسے اپنی جانب آنے کا اشارہ کر رہی ہے۔ اس کے قدم رک گئے۔ چند ساعتوں کے بعد پانی بڑھتا ہوا آیا اور گنگا کے سر سے اوپر ہو کر گزر گیا —— پانی میں گھل ملی گئی اور پھر ایک لاش تیرتی ہوئی خلیجِ بنگال کی آغوش میں بڑھتی چلی گئی —— گنگا ساگر کی اس مقدس سرزمین سے دور جانا شاید اُس کے جسدِ خاکی کو گوارا نہ تھا۔

OO

غزلیں

ظہیر غازی پوری

خوب نا خوب ہو گئے ہو میاں
ماہ کی ڈوب ہو گئے ہو میاں

زندانِ حرف و لفظ میں قید
تم بھی مکتوب ہو گئے ہو میاں

آئینہ دیکھتے ہی خود اپنے
"میں" سے مرعوب ہو گئے ہو میاں

کھو کھلے جسم کی یہ آرائش
کتنے محبوب ہو گئے ہو میاں

پڑھ کے چہرہ سمجھنا مشکل ہے
مشکل اسلوب ہو گئے ہو میاں

جلتا سورج بھی ساتھ ساتھ چلا
اتنے معتوب ہو گئے ہو میاں

سلسلہ ہے کہ ٹوٹتا ہی نہیں
شور مجذوب ہو گئے ہو میاں

مجھے تو کل تک خدا لے دار و رسن
کب سے مصلوب ہو گئے ہو میاں

جسم میں کون چیختا ہے ظہیر
کس سے مغلوب ہو گئے ہو میاں

○ ریڈیو سے آرٹ ایجنسی - ہزاری باغ (بہار) شاعر بمبئی۔

نثار پرویز

ہر رہ گذر پہ صبح تجھے ڈھونڈتی رہی
ہر رات تیری یاد لئے گھومتی رہی

پنچھی تو صبح ہوتے ہی اُڑ کر چلا گیا
مجبور شاخ اپنی جگہ جھولتی رہی

کمرے میں صرف اک تری تصویر کے سوا
ہر چیز وجہِ خلوتِ غم پوچھتی رہی

ہر رنگ کی جھلک تھی تمہارے وجود میں
کچھ روز میرے گھر میں دھنک پھولتی رہی

نیلا لباس جیسے سمندر کی وسعتیں
قلب و نظر کو سرد ہوا چومتی رہی

تیری نگاہ سے جو صدا آئی تھی کبھی
وہ دل کی دھڑکنوں کی طرح گونجتی رہی

مہتاب، رات، راگنی، گلشن، ہوا
جو شے ملی وہ تیرا پتہ پوچھتی رہی

یہ دیر کل کی بات ہے ہر موج مضطرب
ساحل کے بدلے اُس کا بدن چومتی رہی

○ کیمپ - عید گاہ - گوالیار

مختار شمیم

نامۂ گُل میں کسی شوخ کی تحریر کا رنگ
دلِ پُر خوں کی اُبھرتی ہوئی تصویر کا رنگ

وہ بھی مایۂ پشیمانِ وفا ہیں ہم لوگ
اپنی تقریر میں جادو ہے نہ تحریر کا رنگ

قتل ہوتا ہے سرِ شام تمنا ہر روز
روز لاتا ہے نئی صبح کی تنویر کا رنگ

سبز در سبز درختوں میں چلا آگ کا پھاگ
اُجلا اُجلا ہے مرے خواب کی تعبیر کا رنگ

زنگ دیتا ہے کہیں آئینۂ نام و نمود
خوب کھلتا ہے کہیں جوہرِ توقیر کا رنگ

پیکرِ لفظ و معانی بھی تراشے ہم نے
اپنے شعروں میں نمایاں رہا کشمیر کا رنگ

○ گورنمنٹ گرلز پوسٹ گریجویٹ کالج - اننت ناگ

رشید عبدالسمیع جلیل

لہجوں کی بازگشت

سُنا ہے لہجوں کے سیلِ تیزاب کی مدد سے
خمیر ذہنوں میں پک رہا ہے
زباں مکدّر ہے ذائقہ پر
تمام الفاظ تلخیوں کا لباس اوڑھے
بدلتے موسم کی تیز گامی سے گرد آلود ہو چکے ہیں
شکستہ آوازیں گونجتی ہیں فضا میں لیکن ۔
وفورِ نغمہ تو جاں بہ لب ہے ۔
رَوِش سے ہٹ کر
صراطِ احساس پر جو چلتی ہیں صوت و آہنگ کی لکیریں
گداز لہجوں کی سیج پامال کر نہ جائیں ۔
کرخت لہجوں کی گرم رَو سے
ہر ایک ذی حس پگھل نہ جائے ۔

غریبی

دستِ سوال دھنس گیا آنکھوں کی برف میں
کشکول کی چبھن سے نظر چیختی رہی
ہر موڑ سنگِ میل سسکتے وجود کا
نسلوں کی چیخ صورِ سرافیل تا بہ حشر
صدیوں کا کرب ہے کہ اندھیرے کا آبشار
سیلاب حاجتوں کا ہے رکتا نہیں کبھی
خاکے جو ڈوبتے ہیں پکاریں گے بار بار
اُٹھے قدم تو ڈسنے لگے راستے کا سانپ
غربت کا زہر تیز ہے تریاق سوچ لو ۔

شاعر بمبئی ○ ۳-۴-۷۶۰/۲ ۔ ۵ نامپلی حیدرآباد ۱

انجم جمالی

میرے خواب

(شاعر کے دسویں شمارے ۱۹۷۵ء کے نوٹ صفحہ ۴ سے متاثر ہو کر)

لوگ خوابوں کو زباں دیتے ہوئے ڈرتے ہیں
کہیں اعجازِ مسیحا پہ نہ حرف آجائے
کوئی خواب اُن کی حقیقت سے نہ ٹکرا جائے
ٹوٹ جائیں نہ کہیں فرقِ مراتب کے قیود
خاک کو ہمسرِ افلاک نہ سمجھا جائے

غیر طلبیدہ جو ہو منتخبِ شوق نہ ہو!
ایسی تخلیق کہیں بار نہیں پا سکتی
کوئی درجہ کوئی معیار نہیں پا سکتی
خاص اذہان کے سانچوں میں نہ ڈھل پائے اگر
فکر پیراہنِ اظہار نہیں پا سکتی

اک یہی شعلۂ سیماب اثر ایسا ہے
جس کی قسمت میں شبستاں نہیں قندیل نہیں
جس کی ہیئت کبھی شرمندۂ تشکیل نہیں
حدِ ابلاغ سے گذرے تو خلاء میں بھٹکے
اس کی راہوں میں کہیں جادۂ ترسیل نہیں
کئی غالب کئی تلسی کئی فردوسی و گیٹس،
اپنی توقیر و پذیرائی فن کو ترسے
بات کہنے کے لئے نطق و دہن کو ترسے
اپنے ذہنوں میں چھپائے ہوئے زخمی افکار
کتنے الفاظ معانی کے کفن کو ترسے

پھر اُن افکار سے اک روز مرے خواب سجے
لیکن ایسے جو کسی غم کا مداوا بھی نہیں ۔۔۔!
خوابِ یوسف بھی نہیں خوابِ زلیخا بھی نہیں
اپنے پیمانوں میں اپنا ہی لہو بھرتے ہیں!
اب تو شاید مرے احساس میں زندہ بھی نہیں
لوگ پھر بھی مرے خوابوں سے حذر کرتے ہیں
اُن کو کاغذ کی زباں دیتے ہوئے ڈرتے ہیں

○ ۲۲۳ بیرن نگر بازار میرٹھ ۲

زر وہ افسانہ کہ آشفتہ بیانی مانگے

یوسف ناظم

عالی - ۳/۴ - پی - ڈبلیو - ڈی کالونی - باندرہ (ایسٹ) - بمبئی - ۵۱

روپے کے معاملے میں درجہ بندی پہلے نہیں تھی کیونکہ پہلے روپیہ تھا ہی ایک قسم کا۔ (کہا جاتا ہے شروع شروع میں آدمی بھی ایک ہی قسم کا تھا) اب روپیہ کی بھی قسمیں ہو گئی ہیں۔

ایک نمبر کا روپیہ تو وہ ہے جسے کمانے کے مواقع دنیا میں کم سے کم تر ہوتے جا رہے ہیں۔ لوگ حسرت سے اس روپے کی طرف دیکھتے ہیں اور دیکھتے ہی رہ جاتے ہیں۔ اوّل تو یہ مشکل سے ہاتھ آتا ہے اور آتا ہے تو پہلی تاریخ کے چاند کی طرح غروب ہو جاتا ہے۔ آدمی کوئی پیشہ اختیار کر لیتا تو اس بات کی ضمانت تھی کہ اُسے گندم کی روٹی نہ سہی نانِ جویں تو مل ہی جائے گی۔ لیکن اب ہر پیشے میں خصوصیت داخل ہو گئی ہے۔ آپ ڈاکٹر ہیں تو ڈاکٹر رہ سکتے ہیں لیکن اگر آپ ناک، کان اور حلق کے اسپیشلسٹ نہیں ہیں تو مرض کے اس معاملے میں دخل نہیں دے سکتے کیونکہ اب مریض صرف ڈاکٹر کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ اس کی تکلیف بڑھانے کے لئے اسپیشلسٹ ضروری ہے۔ آپ وکیل ہیں تو شوق سے وکیل رہئے لیکن کسی قاتل کا مقدمہ ہاتھ میں نہ لیجئے کیونکہ آپ فوجداری کے وکیل نہیں اور آپ کی یہ کوتاہی قاتل کو لے ڈوبے گی۔ وہ خواہ مخواہ مارا جائے گا۔

آپ عمارتیں اور سرائیں وغیرہ بنواتے ہیں تو ضرور بنواتے رہئے لیکن کسی پرانی عمارت کی مرمّت کا کام ہاتھ میں نہ لیجئے۔ آپ نے ہاتھ لگایا اور عمارت بیٹھی۔ صرف نئے کام ہی اپنے ذمّے لیجئے ان کا نقص برسوں بعد ظاہر ہوگا۔ پہلے نمبر کا پیسہ حاصل کرنا ہو تو یہ سب احتیاطیں کرنی ہی ہوں گی۔ اب تو سوسائٹی میں اُٹھنے بیٹھنے والے لوگ اپنی حجامت بھی اُسی شخص سے کرواتے ہیں جس کے پاس اچھی حجامت کرنے کا سرٹیفکیٹ ہو۔ اچھے اور بڑے ہوٹلوں میں باورچی خانے کا نگراں بھی وہی شخص ہو سکتا ہے جسے یہ علم ہو کہ خراب پکے ہوئے کھانے کو کس طرح خوبصورت بنا کے گاہک کے سامنے پیش کیا جائے اور اُس کی اتنی قیمت وصول کی جائے کہ اُس کا سر فخر سے اونچا ہو جائے۔

روپے میں معلوم نہیں یہ خوبی کہاں سے آگئی ہے کہ اس کی مقدار چاہے کتنی ہی ہو یہ کم نظر آتا ہے۔ دنیا کی ایک تہائی آبادی اپنے کمائے ہوئے روپے کو مہینے کے حساب سے خرچ کرتی ہے۔ ان لوگوں میں چند ہی ایسے تنگ دل ہوتے ہیں جن کے پاس مہینہ ختم ہو جانے کے باوجود کچھ روپیہ بچ جاتا ہے۔ ورنہ تعداد میں وہی شریف لوگ زیادہ ہوتے ہیں جن کے پاس روپیہ ختم ہو جاتا ہے اور کچھ مہینہ بچ جاتا ہے۔ (آخر مہینہ بھی تو پس انداز کیا جا سکتا ہے) اگر ایسا نہ ہو تو دنیا سے کئی اور نعمتوں کی طرح قرض کی نعمت بھی رخصت ہو جائے دنیا کا ہر مہذب آدمی جب بھی دنیا سے رخصت ہوتا ہے اپنے فرض کے علاوہ کچھ قرض چھوڑ کر جاتا ہے کیونکہ کہا گیا ہے دنیا میں کچھ نہ کچھ قرض چھوڑ کر ہی جانا چاہئے حتیٰ کہ جو لوگ قرض نہیں لیتے وہ بھی رخصت ہوتے وقت احتیاطاً قرض معاف کروا کے ہی رخصت ہوتے ہیں یہی رسم دنیا ہے — دنیا میں جب نیا دور آیا ہے (دنیا میں تو نئے دور ہمیشہ آتے ہی رہیں گے) زندگی قسطیں ادا کرتے گزرتی ہے۔ بیمے کی قسط۔ کو آپریٹیو سوسائٹی کی قسط۔ ہاؤسنگ بورڈ کی قسط بینک کے قرضے کی قسط سلائی مشین کی قسط اس دور میں پتہ نہیں آدمی قسطوں میں جی رہا ہے یا بالاقساط مر رہا ہے۔

روپے کی ایک اور خوبی یہ ہے کہ اس کی عدم موجودگی ہی نہیں اس کا موجود ہونا تشویش کا باعث ہوتا ہے۔ اس روپے میں وہ صلاحیت ہے کہ دولت مند سے دولت مند شخص بھی اپنی ثروت سے پریشان رہتا ہے کیونکہ اب تک اکنامکس کے کسی ماہر نے یہ طے نہیں کیا ہے کہ دولت کتنی کمانی چاہئے۔ اسی لئے دولت کمانے میں وہ لوگ بھی مصروف رہتے ہیں جن کے پاس کمائی ہوئی دولت خرچ کرنے کا وقت نہیں ہوتا۔ بے حساب دولت ہی وہ منزل ہے جہاں دوسرے نمبر کے روپے کی پیدائش عمل میں آتی ہے۔ (اس میں آدمی کی مجبوری کو دخل ہے)۔

۲ نمبر کے روپیے کے بارے میں مشہور یہ ہے کہ یہ زیادہ تیزی سے گھومتا ہے

شاعر - بمبئی۔

لو کسی نہ کسی ذریعے سے ہر آدمی کے ہاتھ میں پہنچتا ہے۔ اس روپے کا رنگ و روغن بھی ویسا ہی ہوتا ہے جیسا کہ پہلے نمبر کے روپے کا ہوتا ہے لیکن چند شرارت پسند لوگوں نے اسے کالے روپے کا نام دے رکھا ہے۔ یہ بھی کوئی بات ہوئی۔ رنگ آدمیوں کا ہوا کرتا ہے نہ کہ روپے کا۔ کچھ لوگ سفید ہوتے ہیں تو کچھ کالے۔ کچھ براؤن ہوتے ہیں تو کچھ زرد۔ رنگ بھی آدمی ہی بدلا کرتے ہیں یہ ان ہی کے چہرے ہوتے ہیں جن پر ایک رنگ آتا ہے ایک جاتا ہے۔ وہ آدمی ہی ہے جو غصے سے لال پیلا ہو جاتا ہے۔ یہی آدمی سفید بھی پڑ جاتا ہے حالانکہ بذاتِ خود ہوتا کالا ہی ہے۔ ان خرابیوں کی وجہ سے اب آدمیوں کی نسل بندی کروا دی جائے گی اور صرف کمپیوٹر پیدا کئے جائیں گے۔ آدمیوں کے رنگوں کی بات کی جائے تو کچھ غلط نہیں لیکن روپیہ کیسے رنگ برنگا ہو سکتا ہے۔ اس کا رنگ کالا ہو ہی نہیں سکتا لیکن کیا کیا جائے شہرت بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ کالے روپے پر سفیدی چڑھوانا ذرا مشکل کام ہے۔ اس میں بھی اپنی نسلی امتیاز کی بات آگئی۔ اسے دوسرے نمبر کا روپیہ کہنا بھی ٹھیک نہیں۔ روپیہ نہ ہوا مزاحیہ ادب ہو گیا۔ کچھ لوگ مزاحیہ ادب کو بھی دوسرے درجے کا ادب کہتے ہیں۔ ممکن ہے اسے دوسرے درجے کا ادب کہنے کی وجہ یہ ہو کہ مزاحیہ ادب اتنا نقصان نہیں پہنچا سکا جتنا اوّل درجے کے ادب نے پہنچایا ہے۔

جب روپے پر نمبر پڑ گئے تو تیسرے نمبر کا روپیہ بھی وجود میں آسکتا ہے لیکن تیسرے نمبر کا روپیہ سب کی قسمت میں نہیں ہوا کرتا۔ یہ ملتا بھی زندگی میں ایک ہی مرتبہ ہے۔ اس کے ملنے کا وقت بھی مقرر ہے (لیکن یہ کوئی کلیہ نہیں۔ یہ دو چار مرتبہ بھی مل سکتا ہے اور وقت مقررہ گذرنے پر بھی اس کا دیدار ہو سکتا ہے) لیکن اس کا ایک اُصول جو بدلتا نہیں یہ ہے کہ یہ روپیہ صرف مردوں کی قسمت میں ہوا کرتا ہے۔ جو شخص بھی نوشاہ بننے کی تھوڑی بہت صلاحیت رکھتا ہے یہ روپیہ حاصل کر سکتا ہے۔ اس روپے کو جہیز کہا جاتا ہے۔ اس کی بھی دو قسمیں ہوتی ہیں۔ ایک جہیز معجّل اور ایک جہیز مسلسل۔ جہیز معجّل سے نوشاہ کے والدین وغیرہ مستفید ہو سکتے ہیں۔ جہیز مسلسل سے نوشاہ اور اس کی پیداوار کو استفادے کا حق ہوتا ہے ——— ہر نوشاہ کا پیدائشی حق ہے کہ وہ تیسرے نمبر کا روپیہ حاصل کرے لیکن ہمارے ہاں تعلیم دلانے کا نتیجہ کچھ اچھا بر آمد نہیں ہوا اور اکثر نوشاہ تعلیم حاصل کر کے اتنے کند ذہن ہو گئے ہیں کہ انھیں یہ روپیہ حاصل کرنا بُرا معلوم ہونے لگا ہے۔ ہم پہلے ہی کہتے تھے کہ لڑکوں کو اتنا نہ پڑھاؤ۔ بعض صورتوں میں البتہ معاملہ الٹا ہے۔ جن لڑکیوں نے تعلیم حاصل کر لی وہ دہشت پسند ہو گئیں۔ شاعر، بمبئی۔

اور چند موقعوں پر نوشاہوں کے ساتھ ناروا سلوک کیا گیا یعنی عین اُس موقع پر جب مناکحت کی تکمیل کا وقت آیا کسی سرپھری لڑکی نے صرف اس لئے عقد سے انکار کر دیا کہ نوشاہ اور نوشاہ کے والد نے ضرورت سے زیادہ جہیز مانگا تھا (جہیز بھی کہیں ضرورت سے زیادہ ہوتا ہے) اور اس انکار کی وجہ سے نوشاہ کو صرف سر پر بندھے ہوئے سہرے اور دوستوں کے بھیجے ہوئے سہروں کے ساتھ گھر واپس ہونا پڑا۔ لیکن ایسے چند ناخوش گوار واقعات کی بناء پر کسی کو ہراساں یا نا اُمید ہونے کی ضرورت نہیں۔ بغاوت کے دو چار واقعات تو ہوتے ہی رہتے ہیں۔ باہمت اور جہیز ساز لوگوں کو ان کی بالکل پروا نہیں کرنی چاہئے۔ ہاں احتیاط میں کوئی حرج نہیں۔ محتاط اور سمجھ دار لوگ اب اپنی شادی میں شریک ہی نہیں ہوتے۔ ٹیلیفون پر اپنی شادی پڑھوا لیتے ہیں۔ یہ طریقہ اب دور دراز کی شادیوں ہی میں نہیں، نزدیک کے مقامات کی شادیوں میں بھی شروع ہوگا۔ دولہا دلہن ایک ہی شہر کے ایک ہی محلے کے ہوں گے تب بھی شادی فون ہی پر ہوگی۔ (وجہ یہ ہے اگر دلہن نے انکار کیا بھی تو دولہا کسی اور نمبر پر فون کر سکے گا اور بلا سے ایک کال کے پیسے اور خرچ ہوں گے)

سُنا ہے بعض دلیر لوگ، اپنی عمر کے دس پندرہ سال اسی روپے کو جمع کرنے میں خرچ کر دیتے ہیں۔ وہ جگہ جگہ جاتے ہیں۔ کچھ دن وہاں ٹھہرتے ہیں۔ نوشاہ بن جاتے ہیں اور اُس مقام کو چھوڑتے وقت صرف تیسرے نمبر کا روپیہ ساتھ لے جاتے ہیں۔ دوسرے مقام پر پہنچ کر چند دنوں بعد نوشاہ بننے کی عادت پھر انھیں ورغلاتی ہے۔ انھیں اخباری اشتہاروں کی مدد سے تلاش کرنا ممکن نہیں ہوتا اور اخباری اشتہارات سے کون سا گم شدہ شوہر ملا ہے جو یہ ملیں گے۔ گم شدہ آدمی ملتا ضرور ہے لیکن اُس وقت وہ اخبار نہیں ملتا جس میں اُس کی تصویر چھپی ہوتی ہے۔ اور پھر یہ بھی سوچنے کی بات ہے کہ سب والدین گم شدہ لوگوں کی تصویروں کا البم بنا کر نہیں رکھا کرتے کہ جب بھی کوئی آئے اُسے سامنے بٹھا کر البم کی تصویروں سے اُس کا مقابلہ کر لیں۔ بیشتر نقلِ مقام کرتے رہنے والے نوشاہ اس نکتے سے بخوبی واقف ہوتے ہیں۔

اب تو سہولت اس بات کی بھی ہے کہ جہیز ہنڈی اور چیک کی صورت میں بھی ادا کیا جا سکتا ہے۔ یہ آسائش پہلے کہاں تھی۔

کچھ لوگ کہتے ہیں کہ جس طرح دنیا سے شاہی کا رواج ختم ہو رہا ہے اُسی طرح "با جہیز نوشاہی" بھی خطرے میں ہے ——— اب یوں دیکھا جائے تو خود دنیا ہی کب سے خطرے میں ہے۔ لیکن کیا وہ ختم ہوگئی۔

○○

غزلیں

ڈی کے کماسرا

کیا سوچ کی تپش تھی کہ سب کچھ ہی جل گیا
پتھر سا ایک دل تھا، سو وہ بھی پگھل گیا

وہ پوچھتے ہی رہ گئے کچھ حالِ زندگاں!
میں کل کی سوچ میں بہت آگے نکل گیا

غم ہائے روزگار کا مارا ہوا یہ ذہن
اپنے سے کمتروں میں بھی اکثر بہل گیا

دنیا کے داؤ پیچ کسے راس آسکے!
جب بھی ذرا سا پاؤں جمایا پھسل گیا

میں سوچ ہی رہا تھا نہ آئے گا کوئی اب
دروازہ دستکوں کی صداؤں میں ڈھل گیا

پہلے کمان موڑ کے بیٹھو جہاں سے منہ ہوا
پھر تیر یک بیک ہاتھ سے مر نکل گیا

○ ۶ ہماچل بھون۔ شملہ - ۱۷۱۰۰۲

احسان شام

اپنے ہی خون میں ڈوبے ہیں شناور کتنے
موم کی آنچ نے پگھلا دیئے پتھر کتنے

دل میں پیوست ہیں آلام کے خنجر کتنے
سر بہ سجدہ ہیں مرے غم میں ستمگر کتنے

دیکھنے والو سرابوں کو نہ پیاسا سمجھو
جذب ہیں ریت کے سینے میں سمندر کتنے

کس طرح سنگ تراشے نگہِ سنگ تراش
دل میں بے چین ہیں تعمیر کے آذر کتنے

آؤ ظلمات کے ساحل پہ اگائیں سورج
صبحِ صادق کو ترستے ہیں پیمبر کتنے

جسمِ الفاظ میں خود ڈال کے روحِ افکار
ان کھلونوں سے بہلتے ہیں سخنور کتنے

مجھ میں اُترو مجھے محور سمجھنے والو!
توڑ ڈالے ہیں مرے صبر نے پیکر کتنے

شمعِ میخانہ بجھائی گئی اکثر سرِ شام
پا کبا زوں پہ اُچھالے گئے ساغر کتنے

○ محلہ سید واڑہ جہانگیری جشین آباد - مہاراشٹر

فکری بدایونی

نہ جانے کون مرے دل کی اس چبھن میں رہا
تمام رات میں شعلوں کی انجمن میں رہا

اُسے یقین تھا وہ خود کو ڈھونڈلائے گا
وہ صبح و شام مسلسل اسی لگن میں رہا

ہر ایک ریت کے ذرّے سے میں نکل آیا
مرے وجود کا صحرا بھی میرے فن میں رہا

عجیب شخص تھا لوگوں سے گالیاں سن کر
قلم کی نوک سے باہر بھی پیرہن میں رہا

انا کے غار میں روشن تھیں فن کی قندیلیں
میں اپنے آپ کو پاکر بھی کوہکن میں رہا

رگوں میں دوڑتا پھرتا تو کوئی بات بھی تھی
وہ اس کی یاد کا شعلہ تو تن بدن میں رہا

جلا ہی دیتی مجھے فن کی یہ تپش فکری
جھلس گیا تو میں بچ کے کسی گھٹن میں رہا

○ زاویۂ قادریہ ۲۳-۴-۲۲ اسپیلی
حیدرآباد ۱۲

نجات دھندہ

ایچ۔ ایچ۔ منرو

ترجمہ : سید ابوالحسنات

۴۳-اے، مفیدالاسلام لین۔ کلکتہ-۱۴

کارپیتھین پہاڑ کے مشرقی حصے میں جہاں ملے جلے درختوں کا گھنا جنگل ہے۔ ایک سرما کی شب کو ایک شخص اس حالت میں نظر آیا گویا منتظر ہو کہ کوئی شکار اُس کی نگاہ میں آنے کے بعد اُس کی رائفل کی زد میں آجائے۔ لیکن جس شکار کی اُسے تلاش تھی اس کا تعاقب کرنا شکاریوں کی کتاب میں ناجائز اور غیر قانونی تھا۔ اُلرچ در اصل اس سیاہ جنگل میں ایک آدم زاد دشمن کا پیچھا کر رہا تھا۔

گرافٹز کے دُور تک پھیلے ہوئے جنگل میں بے شمار شکاری جانور تھے۔ اسی جنگل کے ارد گرد درختوں کی جو تنگ ڈھلوانی پٹی ہے۔ وہ نہ تو جانوروں کے لئے مشہور تھی اور نہ شکار کی وجہ سے، مگر اس جنگل کا مالک انہی تمام ملکیتوں کے مقابلے میں اُس کی حفاظت اور نگرانی سب سے زیادہ کیا کرتا تھا۔ اس علاقے میں پڑوس کے چھوٹے زمینداروں کے ایک خاندان نے ناجائز قبضہ کر لیا تھا اور اُلرچ کے دادا کے زمانے میں ایک طویل مقدمہ کے بعد اُسے دوبارہ حاصل کیا گیا تھا۔ تاہم عدالتی فیصلے کو شکست خوردہ زمینداروں نے کبھی مانا نہیں اور تین نسل تک جانوروں کے ناجائز شکار اور اسی قسم کی دوسری بدعنوانیوں نے دونوں خاندانوں کے تعلقات کو کشیدہ رکھا۔ اُلرچ کے سرپرستی میں یہ خاندانی جھگڑا، ذاتی جھگڑے میں بدل گیا۔ اُلرچ اس دُنیا میں کسی آدمی سے بے انتہا نفرت کرتا تھا اور ہمیشہ اس کے حق میں بُرا چاہتا تھا تو وہ جارج تھا۔ جسے یہ جھگڑا مخالف خاندان کے سربراہ کی حیثیت سے ورثہ میں ملا تھا اور جو مسلسل اس متنازعہ جنگل علاقہ پر حملہ کر کے شکار مارنے جایا کرتا تھا۔ اگر ان دو افراد کی ذاتی چپقلش راہ میں نہ آتی تو یہ جھگڑا کب کا ختم ہو چکا ہوتا یا کوئی صلح ہو چکی ہوتی۔ کم عمری میں یہ دونوں ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے۔ بڑے ہو کر دونوں ایک دوسرے کو مصیبت میں دیکھنے کی دعائیں مانگتے تھے، بھی

لگے اور آج موسم سرما کی اس طوفانی رات میں اُلرچ نے اپنے لوگوں کو اس تاریک جنگل کی نگرانی پر مامور کر دیا تھا، کسی چوپائے شکار کی تلاش میں نہیں بلکہ اُن چوروں کی تلاش میں جن کے متعلق اُن کو شبہ تھا کہ وہ چوری چھپے اُس کے علاقے سے شکار اٹھا لے جاتے ہیں۔ وہ ہرن جو عام طور سے اس سرد موسم میں گڑھوں میں دُبکے رہتے تھے، چاروں طرف چوکڑیاں بھرتے پھر رہے تھے اور وہ جانور جو رات کے سناٹے میں زمین پہ خراٹے لیتے تھے، بے قرار اور مضطرب نظر آرہے تھے۔ ان حیوانوں کے آرام میں مخل ہونے والے عناصر کس سمت سے آتے تھے اُلرچ کو اس کا کچھ علم تھا۔

ایک پہاڑی اُٹھان کے قریب اپنے آدمیوں کو جھاڑیوں کی آڑ میں بٹھا کر اُلرچ ان سے کافی دور ڈھلوانی علاقے میں نکل آیا تھا اور درختوں کے تنوں کے پیچھے سے سرد ہواؤں کی سنسناہٹ اور شاخوں کے ٹکرانے کی آواز پر کان لگائے حملہ آوروں کی آہٹ سننے یا انہیں دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اُس کے دل میں ایک ہی خواہش تھی۔ کاش اس وحشی رات میں اس تنہا مقام پر اس کا سامنا جارج سے ہو جائے، رُو بہ رُو، ایک کے مقابل ایک، اس طرح کہ انہیں کوئی دیکھ نہ پائے۔ اور جب وہ ایک بھاری بھرکم تنے کی آڑ سے نمودار ہوا تو اس کے مقابل وہی آدمی کھڑا تھا، جس کی اُسے تلاش تھی۔

ایک طویل خاموش لمحے تک دو دشمن ایک دوسرے کو نظریں گاڑے دیکھتے رہے۔ دونوں کے ہاتھ میں رائفل، دل میں نفرت اور ذہن میں قتل کا منصوبہ تھا۔ زندگی بھر کے بغض و عناد کو پوری طرح کام میں لانے کا موقع آ گیا تھا لیکن جب ایک آدمی تہذیب و تمدن کی پابندیوں کے ساتھ پروان چڑھا ہو تو وہ اپنے اعصاب پر قابو پا کر بے [illegible]

اپنے پڑوسی کو بے دردی سے گولی نہیں مار سکتا۔ ہاں ایسا صرف اُسی وقت ممکن ہے، جب اُس کی عزت یا روزی خطرے میں ہو۔ قبل اسکے کہ اُن کا استعجاب کوئی جارحانہ شکل اختیار کرتا، قدرت کے ایک متشدد عمل نے اُنہیں زیر کر دیا۔ طوفان کی ایک خوفناک چیخ کے جواب میں اُن کے سروں پر کئی درختوں کے ایک ساتھ ٹوٹ کر گرنے کی آواز آئی۔ اُلرچ زمین پر اوندھے منہ پڑا تھا۔ اُس کا ایک ہاتھ بے کار ہو چکا۔ جارج بھی ٹوٹی ہوئی نوکیلی شاخوں میں بے بس پڑا تھا اور اُس کے دونوں پاؤں اس طرح دب گئے تھے کہ وہ حرکت نہ کر پا رہا تھا۔ اگر وہ شکاری جوتے نہ پہنے ہوتا اُس کے پاؤں چُور چُور ہو جاتے۔ لیکن چوٹ شدید نہ ہونے کے باوجود وہ اُس وقت تک حرکت کرنے سے معذور تھا جب تک اُسے کوئی آکر نکال نہ لے۔ گرنے والی شاخوں سے اس کے چہرے پر جگہ جگہ خراشیں آگئی تھیں اور تباہی کا جائزہ لینے کے لئے اُسے بدقت تمام ہونٹوں کو جنبش دیکر اپنی پلکوں پر سے جمے ہوئے خون کے قطرے گرانا پڑے تھے۔ اُلرچ بھی اس کے قریب ہی پڑا تھا، اتنا قریب کہ معمولی حالات میں وہ اپنے جسم کو ذرا سی حرکت سے اُسے ہاتھ بڑھا کر چھو لیتا۔ جارج زندہ تھا اور ہاتھ پاؤں مار رہا تھا، مگر وہ بھی اتنا ہی بے بس تھا جتنا کہ اُلرچ۔ اُن کے آس پاس ٹوٹی شاخوں اور ڈالیوں کا انبار لگا تھا۔

اپنے آپ کو زندہ پا کر اور اپنی مجبوریوں سے گھبرا کر تشکر اور نفرین کے عجیب ملے جلے الفاظ اُلرچ کی زبان پر آنے لگے۔ جارج کے چہرے پر اس قدر خون جم گیا تھا کہ اُس کی آنکھیں تقریباً بند ہو گئی تھیں۔ وہ ایک لمحے کے لئے ہاتھ پاؤں مارنا بند کر کے الرچ کی بڑبڑاہٹ سُننے لگا اور پھر ایک مختصر سی گُرگُراہٹ والی ہنسی اُس کے لبوں سے پھوٹ نکلی۔

"ہاں تم مرے تو نہیں لیکن پکڑے ضرور گئے ہو، ہا ہا، یہ بھی عجیب مذاق ہے۔ آج اُلرچ اپنے مسروقہ جنگل میں خود ہی پھنس گیا ہے۔ تمہارے ساتھ واقعی یہی انصاف ہونا تھا۔" اور یہ کہکر جارج پھر ایک مضحکہ خیز، وحشیانہ ہنسی ہنسنے لگا۔

"یہ تو میرا اپنا جنگل ہے جہاں میں پھنسا ہوں" اُلرچ جواباً کہنے لگا "جب میرے آدمی آکر ہم دونوں کو نجات دلائیں گے تو شاید تمہاری خواہش ہوگی کہ کاش تم ایک پڑوسی کے علاقے میں چوری چھپے شکار کرتے پکڑے نہ جاتے۔ شرم کرو جارج، شرم!"

جارج ایک ثانیہ کے لئے خاموش رہا، پھر آہستگی سے جواب دینے لگا۔ "کیا تمہیں یقین ہے کہ اس وقت تک اتنا کچھ بچ رہے گا جسے وہ رہائی دلا سکیں گے؟ آج رات اس جنگل میں میرے بھی آدمی موجود ہیں۔ وہی یہاں پہلے پہونچیں گے اور رہائی کا کام انجام دینگے۔ جب وہ ان شاخوں کی قید سے مجھے نجات دلائیں گے تو اس بھاری بھرکم تنے کو تمہارے اُوپر لڑھکانے میں کوئی قباحت محسوس نہ کریں گے۔ اور تمہارے آدمی تمہیں ایک درخت کے نیچے دبا ہوا مردہ پائیں گے۔ ہاں رسم ہمسائگی کے مطابق میں تمہارے خاندان والوں کو تعزیتی پیغام ضرور بھیج دونگا۔"

اُلرچ نے خشمگیں ہو کر کہا۔ "اچھا ہوا تم نے مجھے بتا دیا۔ میں نے تو اپنے آدمیوں سے کہہ رکھا تھا کہ وہ دس منٹ کے اندر مجھ سے آملیں۔ اُن میں سے سات تو آ ہی رہے ہوں گے اور جب وہ مجھے اس مصیبت سے نکال لیں گے تو میں تمہاری بات بھولوں گا نہیں۔ چونکہ تم میری زمین پر ناجائز شکار کرتے ہوئے مارے گئے ہوگے، اس لئے میں تمہارے خاندان والوں کو کوئی اچھا سا تعزیتی پیغام بھی نہ بھیجوں گا۔"

"خوب، بہت خوب۔" جارج غرایا "تو آؤ ہم لوگ اُسوقت تک لڑیں جب تک ہم مر جائیں۔ تم، میں اور ہمارے ساتھی۔ اور ہاں ہمارے درمیان مخل ہونے والا کوئی نہ ہو۔ تمہارے لئے موت اور لعنت ہے اُلرچ۔"

"تمہاری قسمت میں بھی وہی لکھا ہے جارج، جنگل کے چور، حرام شکار خور!"

دونوں دشمن ممکنہ شکست کی تلخی کے ساتھ باتیں کر رہے تھے۔ کیوں کہ دونوں جانتے تھے کہ اُن کے آدمیوں کے آنے میں کافی دیر لگے گی۔ کون سی پارٹی مقام واردات پر پہلے پہونچے گی، اس کا انحصار صرف اتفاق پر تھا۔

دونوں نے درختوں کی قید سے رہائی حاصل کرنے کی کوشش ترک کر دی۔ اُلرچ کی کوشش اب صرف یہ تھی کہ وہ اپنا دوسرا ہاتھ جو قدرے آزاد تھا اپنے کوٹ کی جیب تک لائے اور شراب کی بوتل نکال لے۔ یہ کام انجام دے لینے کے بعد بھی کارک نکال کر اپنے حلق سے نیچے شراب اُتارنے میں اُسے کافی وقت لگ گیا۔ مگر شراب پیتے

ہی اُسے یوں لگا جیسے اُسے قدرت کا عطیہ مل گیا ہو۔ کھلے جاڑے کا موسم تھا۔ ابھی تک کہیں برف باری نہیں ہوئی تھی۔ اِس لئے دونوں کو موسم سرما کی اس سخت تکلیف کا سامنا نہ کرنا پڑا تھا جو سال کے ان دنوں معمولاً کرنا پڑتا ہے۔ تاہم زخم خوردہ اُلرچ کے لئے یہ گرم شراب جاں بخش ثابت ثابت ہوئی اُس نے ترحم آمیز نظروں سے اُدھر دیکھا جہاں اس کا دشمن دانتوں کو دبائے درد اور تھکاوٹ کو چھپانے کی کوشش میں مصروف تھا۔

"اگر میں یہ بوتل تمہاری طرف اُچھالوں تو کیا تم اسے پکڑ پاؤ گے؟" اُلرچ نے اچانک اُس سے پوچھا "اِس میں بڑی اچھی شراب ہے۔ اِسے پی کر بڑا سکون ملے گا تمہیں۔ اِس حقیقت سے قطع نظر کہ آج کی رات ہم میں سے ایک کو مرنا ہے، آؤ ہم دونوں مل کر شراب پئیں۔"

"میری آنکھوں کے اوپر اور اِرد گرد اِس قدر خون جم گیا ہے کہ مجھے کچھ سُجھائی نہیں دیتا۔ دوسرے یہ کہ میں دشمن کے ساتھ کبھی شراب نہیں پیتا۔" جارج نے جواباً کہا

اُلرچ کچھ دیر کی خاموشی کے بعد ہواؤں کی تھکی ہوئی سنسناہٹ سُننے لگا۔ اُس کے دماغ میں ایک عجیب خیال جنم لے کر پروان چڑھنے لگا۔ جب کبھی وہ جارج کی طرف دیکھتا جو درد اور تھکن کے خلاف متواتر جنگ کئے جا رہا تھا تو اس خیال کو اور تقویت ملتی۔ جس تکلیف اور کمزوری کا شکار خود اُلرچ تھا، اسے محسوس کر کے پُرانی عداوت رفتہ رفتہ ختم ہو رہی تھی۔

اُلرچ سے آخر کہے بغیر نہ رہا گیا "میرے پڑوسی! جب تمہارے آدمی آجائیں تو جو جی میں آئے کرنا۔ تمہارا خیال درست ہے۔ لیکن جہاں تک میرا تعلق ہے میں نے اپنا خیال بدل دیا ہے۔ اگر میرے آدمی یہاں پہلے پہنچے تو میں چاہوں گا کہ وہ تمہاری مدد پہلے کریں، یوں، جیسے کہ تم میرے مہمان ہو۔ ہم دونوں نے اِس چھوٹے سے بے کار قطعۂ اراضی کے لئے زندگی بھر لڑائیاں لڑی ہیں۔ یہاں تو ہوا کے ایک جھونکے سے درخت کے درخت گر پڑتے ہیں۔ آج رات یہاں پڑے پڑے تمام باتوں پر غور کرنے کے بعد میں اِس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ہم لوگ بڑے بے وقوف ہیں۔ ایک سرحدی تنازعہ میں کامیابی سے بڑھ کر اس دُنیا میں اور بھی تو کام ہیں، میرے پڑوسی! اگر تم اس جھگڑے کو ختم کرنے میں میری مدد کرو تو میں تم سے کہوں گا کہ تم میرے دوست بن جاؤ۔"

جارج اتنی دیر تک چُپ سادھے رہا کہ اُلرچ نے سمجھا اُس پر غشی شاید، بے ہوشی طاری ہو گئی ہے، مگر جارج نے ٹھیک اُسی لمحہ بڑی آہستگی اور خستگی کے ساتھ کہنا شروع کیا "لوگ اگر ہم دونوں کو ایک ساتھ چوک میں داخل ہوتے دیکھ لیں تو سب کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ جائیں۔ کسی متنفس نے ہمارے خاندان کے کسی دو افراد کو دوستانہ ماحول میں کبھی گفتگو کرتے نہ دیکھا ہوگا۔ اگر آج کی رات ہم دونوں نے اپنے خاندانی جھگڑے کو ختم کر دیا تو سوچو ہمارے لوگ کتنا سکون محسوس کریں گے! اور اگر ہم نے صلح کرنے کی ٹھان لی تو باہر سے کوئی دخل در معقولات کی جسارت بھی نہیں کر سکتا...... تم میری چھت کے نیچے رات گزارنے آؤ گے۔ اور خوشی کے موقعوں پر میں تمہارے محل میں دعوتیں اُڑانے جاؤں گا۔ میں تمہاری شکارگاہ میں اُسی وقت گولی چلاؤں گا جب تم مجھے بحیثیت مہمان مدعو کرو گے ...... اور تم میرے علاقے میں جہاں جنگلی بطخیں، مرغابیاں وغیرہ ہیں، آؤ گے اور شکار کا لطف اُٹھاؤ گے ...... اس علاقے میں کون ہے جو ہمیں صلح کرنے سے روک سکے؟ بلاشبہ میں نے تو قسم کھائی تھی کہ زندگی بھر تم سے نفرت کروں گا، مگر پچھلے آدھ گھنٹے کے اندر میں نے اپنا ارادہ بدل دیا ہے..... تم نے مجھے شراب کی بوتل پیش کی تھی..... ہے نا اُلرچ ..... میں بھی تمہاری طرف دوستی کا ہاتھ بڑھاتا ہوں۔"

کچھ دیر کے لئے دونوں خاموش رہے اور ان حیرت انگیز تبدیلیوں کے متعلق سوچتے رہے جو اس ڈرامائی صلح کے بعد رُونما ہو سکتی تھیں۔ اس سرد و سیاہ جنگل میں جب ہوائیں ننگی شاخوں کو توڑ رہی تھیں اور تنوں کے گرد سیٹیاں بجا رہی تھیں، وہ دونوں لیٹے لیٹے اُس مدد کا انتظار کر رہے تھے جو اُن کے لئے رہائی اور خوراک کا پیغام لے کر آنے والی تھی۔ ہر ایک دل ہی دل میں دعائیں مانگ رہا تھا کہ اُس کے آدمی وہاں پہلے پہنچیں تاکہ اُسے اپنے نئے دوست کی ضیافت کا اعزاز حاصل ہو سکے۔

ٹھیک اسی وقت یکایک طوفان میں ٹھہراؤ پیدا ہو گیا۔

اُلرچ نے مہرِ سکوت توڑتے ہوئے کہا "آؤ ہم دونوں چلا چلا کر مدد طلب کریں۔ اِس ٹھہراؤ میں ہماری آواز زیادہ دُور جائے گی"

جارج نے کہا "درختوں اور جھاڑیوں کی وجہ سے ہماری آواز زیادہ دُور نہ جا سکے گی۔ پھر بھی کوشش کرنے میں کیا حرج ہے۔ ہاں تو چلو ایک ساتھ مل کر چلائیں۔"

دونوں نے شکاریوں کی سی اُونچی آواز میں صدا لگائی۔ کہیں سے کوئی جواب نہ پاکر اُلریچ نے چند منٹوں کے بعد کہا "آؤ ایکبار پھر صدا لگائیں۔"

کچھ توقف کے بعد اُلریچ نے کہا "ایسا لگتا ہے کہ مجھے کچھ سنائی دیا تھا" جارج نے پھنسی پھنسی آواز میں کہا "سائیں سائیں کرتی ہواؤں کے سوا میں تو کچھ بھی نہ سن سکا۔" پھر کچھ دیر تک خاموشی رہی۔ اس کے بعد خوشی کے مارے اُلریچ کے منھ سے ایک ہلکی سی چیخ اُبھری۔

"مجھے تو کچھ سائے اُدھر آتے دِکھائی دے رہے ہیں۔ وہ سب اِسی راستے سے آرہے ہیں جدھر سے میں آیا تھا۔" اپنی تمام قوتوں کو مجتمع کر کے دونوں نے ایک ساتھ زوردار آواز لگائی۔

"اُن لوگوں نے ہماری آواز سن لی ہے۔ وہ ٹھٹھک گئے ہیں۔ وہ اب ہماری طرف دیکھ رہے ہیں۔ لو وہ ہماری طرف تیزی سے دوڑنے لگے ہیں۔" اُلریچ والہانہ انداز میں کہہ رہا تھا۔

"وہ تعداد میں کتنے ہیں؟" جارج نے سوال کیا۔

"صاف طور سے تو کچھ دِکھائی نہیں دیتا۔ نو یا دس ہوں گے۔" اُلریچ نے جواب دیا۔

"تب تو وہ تمہارے ہی آدمی ہوں گے۔ میرے ساتھ تو صرف سات آدمی تھے۔" جارج نے مایوس ہو کر کہا۔

"دیکھو میرے بہادر نوجوان کتنی سُرعت سے اِدھر بھاگے آرہے ہیں۔" اُلریچ کا چہرہ کھِل اُٹھا۔

"کیا وہ تمہارے آدمی ہیں؟" جارج نے پوچھا۔ اُلریچ کی طرف سے جواب نہ پاکر اس نے بڑی بے صبری سے پھر سوال کیا "بولو نا! کیا وہ تمہارے آدمی ہیں؟ بولتے کیوں نہیں؟"

"نہیں!" اُلریچ نے ایک احمقانہ ہنسی ہنستے ہوئے کہا۔ کسی انجانے خوف سے اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا تھا۔

"کون ہیں وہ؟" جارج نے کھسیا کر پوچھا اور اپنی آنکھوں پر زور دیکر اُس چیز کو دیکھنے کی کوشش کرنے لگا جسے اُلریچ بادلِ ناخواستہ بھی نہ دیکھتا۔

"کون ہیں وہ؟" جارج نے گھبرا کر پھر سوال کیا۔

"بھیڑیے!" جواب مِلا۔

OO

غزلیں

رونق گیاوی

ادب کو لفظ و معانی کا ریگزار کہو
جہانِ فکر کا مجھکو امیدوار کہو

بلا سے میری ہتھیلی پہ شام رقص کرے
نظر کی دھوپ پہ تم کو ہے اعتبار کہو

بچا رہا تھا بہت شور فن کی وادی میں
کہاں ہے گم مرے لہجے کا آبشار کہو

ہوا کی شہ پہ سفینے بھنور میں ڈوب گئے
ہے قطرہ قطرہ سمندر کا سوگوار کہو

وہ چلچلاتی ہوئی دھوپ کی جوانی ہے
قبائے بادِ صبا کیوں ہے تار تار کہو

کتابِ زیست کا ہوں خونچکاں ورق رونق
مجھے لہو کے سمندر کا اشتہار کہو

○ بہار کولڈ فیلڈ ٹرانسپورٹ۔ جھریا۔ شاعر بلڈنگ۔

مناظر عاشق ہرگانوی

جانے کیسا ساز چھڑا تھا
رین بھی اور پروائی بھی

کورے کورے میں اُن کو دیکھا
میں تھا اور تنہائی بھی

غم کا پیڑ اکیلا تنہا
پتھریلی انگنائی بھی

باغ کے اک تنہا گوشے میں
بادِ صبا شرمائی بھی

مکڑی سی جالا بننے آئی
ہجر کی بدلی چھائی بھی

جلتی دھرتی کی چھاتی پر
اک پیاسی انگڑائی بھی

آوارہ آکاش پہ کس نے
چادر سی پھیلائی بھی

خود ہی خون کیا تھا عاشق
خود ہی آگ جلائی تھی

○ موضع [illegible] ضلع مونگیر (بہار)

ناز قادری

زندگی کتنی جواں ہے مجھ میں
غم دل زمزمہ خواں ہے مجھ میں

روزِ محشر کا سماں ہے مجھ میں
کوئی تو ہے جو نہاں ہے مجھ میں

دل لئے جاتا ہے صحرا کی طرف
جانے کیا رقصِ گماں ہے مجھ میں

سوچتا رہتا ہوں تنہائی میں
کچھ قریبِ رگِ جاں ہے مجھ میں

کون تخ بستہ بنائے مجھ کو
موجزن سیلِ تپاں ہے مجھ میں

دل کا عالم بھی عجب عالم ہے
کوئی نغمہ نہ فغاں ہے مجھ میں

جو کبھی محوِ طرب رہتا تھا
آج وہ ناز کہاں ہے مجھ میں

○ جیل روڈ مظفرپور

وہ شخص کیا ہُوا جو تری داستاں کا تھا؟

آذر بارہ بنکوی
کٹرہ امام باڑہ۔ بارہ بنکی - (یوپی)

یکم فروری [illegible]۔ پُر نور سویرا آہستہ آہستہ سردی کی باہوں سے نکلنے کی کوشش کر رہا ہے۔ سُنہری کرنیں پھیلتی جا رہی تھیں۔ دھوپ دبے پاؤں دیواروں سے نیچے اُترنے کی کوشش کر رہی ہے۔ یہ عجیب موسم ہے رات میں کافی سردی۔ دن اچھا خاصا گرم۔ ابھی چائے میری کمزوری ہے۔ عصمت (میری اہلیہ) نے مجھے چائے کا کپ دیا ہے۔ وہ بھی چائے پینے لگی ہیں۔ کال بیل نے ہم دونوں کو چونکا دیا ہے۔

"کون ؟" عصمت نے سوال کیا ہے۔

"میں ہوں صبا" میں چائے کا کپ لئے ہوئے باہر کمرے میں صبا کے پاس آگیا ہوں۔ صبا امروہوی خوبصورت بھی ہیں خوب سیرت بھی۔ صبا بارہ بنکی میں صبا امروہوی کی حیثیت سے متعارف اور مقبول ہیں۔ لیکن خود ان کے وطن میں صبا امروہوی کا ذکر لوگوں کے چہروں پر ایک سوالیہ نشان بن کر اُبھرتا ہے۔ "اچھا سلطان رضوی" ـــــ اور اس طرح ایک ہی شخصیت دو حصوں میں تقسیم ہے ـــ صبا سے مزاج پُرسی کے بعد میں نے سویرے سویرے آنے کا سبب پوچھا ہے۔ صبا مجھ سے مخاطب ہیں۔

"بھئی یہاں جون ایلیا آئے ہوئے ہیں" ـــــ "جون ایلیا ؟" میں نے برجستہ دوہرا دیا ہے اور چند لمحوں کے لئے خاموشی اختیار کرلی ہے۔ اب میں ہوں اور میرے خیالات کی دنیا ـــ جون ایلیا ـــ بارہ بنکی ـــ کراچی ؟ میں نے برق رفتاری کے ساتھ خیالات کے سہارے پرواز کر کے کراچی تک کا سفر طے کرلیا ہے۔ "یہ کیسے ہو سکتا ہے بارہ بنکی اور جون ایلیا" ـــ میں نے مسئلہ خود حل کرلیا ہے۔ عصمت نے چائے صبا کو پیش کر دی ہے۔

"اچھا" زیرِ لب تبسّم کے ساتھ اب میں نے صبا کو جواب دیا ہے۔ شاعر- بمبئی۔

میرے زیرِ لب تبسّم پر صبا بھی مسکرائے ہیں۔ غالباً یہ سمجھ کر کہ ان کی لائی ہوئی خبر کا میں نے خیر مقدم کیا ہے۔ حالانکہ دراصل میں ان کی "غلط فہمی" یا "لاعلمی" پر مُسکرایا ہوں۔ جون بارہ بنکی کیسے آسکتے ہیں؟ میں اپنے اس یقین کو بدلنے پر تیار نہیں ہوں لیکن اخلاقاً اس کا اظہار بھی صبا سے نہیں کر رہا ہوں اور اس بات کو بعید از امکان سمجھ کر وضاحت بھی نہیں کر رہا ہوں۔

مجھے یہ علم نہیں ہے کہ صبا اور جون ہم وطن ہیں اور یہ کہ جون شفاعت نقوی صاحب (ڈسٹرکٹ۔ لائیو اسٹاک آفیسر) کے عزیز خاص ہیں۔

شام کے پانچ بجے ہیں۔ وکالت کا جامہ اُتار کر میں مطمئن ہو چکا ہوں۔ عصمت حسبِ معمول چائے کا کپ اپنے ہونٹوں سے لگائے ہیں، میں بھی چائے پی رہا ہوں، کال بیل پر ہم دونوں چونک گئے ہیں، میں کچھ دیر آرام کرنا چاہتا ہوں اس لئے اُلجھے ہوئے ذہن کے ساتھ باہر نکلا ہوں۔ صبا امروہوی سامنے موجود ہیں۔

"رام لعل صاحب آئے ہوئے ہیں" رام لعل کا نام سُن کر مجھے بہت خوشی ہوئی ہے۔ میں دن بھر کی تھکن بھول گیا ہوں۔ رام لعل صرف ممتاز افسانہ نگار اور اُردو کے مُحسن ہی نہیں بلکہ وضعداری اور شرافت کا مجسّمہ بھی ہیں۔ محبت اُن کا شیوہ ہے۔ خلوص اُن کا مذہب ہے۔ وہ کبھی کبھی غریب خانے کو رونق بخشتے رہتے ہیں۔

"کہاں ہیں؟"

"ڈاکٹر رضوی کی گاڑی میں ـــ آپ چلئے جون سے ملنے چلنا ہے"

جون سے ملنے ـــ؟ جون میرے لئے پھر ایک مسئلہ بن گئے ہیں۔ کپڑے بدل کر میں بھی گاڑی میں آگیا ہوں۔

گاڑی میں ڈاکٹر رضوی کے علاوہ رام لعل صاحب اور حضرت خمار

بارہ بنکوی بھی موجود ہیں۔ گاڑی نقوی صاحب کے دولت کدے پر رک گئی ہے ہم سب کمرے میں داخل ہو رہے ہیں۔ نقوی صاحب اور ہربندر سنگھ وقت وہاں پہلے سے موجود ہیں۔ مجھے ابھی تک جون سے شخصی ملاقات کا شرف حاصل نہیں ہے۔ میری مشتاق نگاہیں جون ایلیا کو تلاش کر رہی ہیں۔ رام لعل، تعارف کرا رہے ہیں۔

"آپ ہیں خمار بارہ بنکوی۔"

"آپ ہیں آذر بارہ بنکوی۔"

"اور یہ ———" اس کے بعد ایک شخص مجھ سے بغلگیر ہو گیا ہے۔ میانہ قد، دبلا پتلا، کھلتا ہوا گندمی رنگ، بڑے بڑے بال، کشادہ پیشانی، آنکھیں غیر معمولی ذہانت کی آئینہ دار، متبسّم لب، تھکن کے باوجود چہرہ شگفتہ اور پُرکشش ——— مجھے جون کی سادگی میں بھی عجیب سی آراستگی نظر آ رہی ہے۔ اُن سے انتہائی غیر متوقع طور پر مل کر میں اب بھی متحیّر ہوں۔ اسی عالم میں میری نظر صبا کی طرف اٹھ گئی ہے۔ مجھے اُن کی مسکراتی ہوئی آنکھوں میں فتحمندی کی چمک نظر آ رہی ہے۔ فضا سرشار ہے خمار صاحب نے آنکھوں ہی آنکھوں میں جون کا استقبال کرتے ہوئے پوچھا ہے۔

"آپ کب تشریف لائے؟"

"کل رات حاضر ہوا ہوں۔" پھر گفتگو کا ایک سلسلہ چل پڑا ہے گھر کا ماحول شادمانی میں ڈوبا ہوا ہے۔ بات چیت کا سلسلہ جاری ہے کبھی معاشیات کبھی سماج اور کبھی اُردو ادب زیرِ بحث ہے۔ ابھی جون کی شخصیت پر تکلّف کی نقاب پڑی ہے۔ چند لمحوں میں کوئی سنجیدہ آدمی بے تکلّف بھی کیسے ہو سکتا ہے۔ گفتگو آگے بڑھ رہی ہے اور تکلّف ختم ہوتا جا رہا ہے۔ تمام تر لطافتوں کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے بے تکلّفی کا ماحول پھیلتا جا رہا ہے۔ تبسّم ہنسی میں اور ہنسی زوردار قہقہوں میں ڈھلتی جا رہی ہے۔ ہم لوگوں کی پشت پر نقوی صاحب میزبانی کے اہتمام میں مصروف ہیں۔ اب ہم لوگ چائے کی میز پر پہونچ چکے ہیں۔ خوبصورت پلیٹیں کئی قسم کے بسکٹوں سے بھری ہیں۔ رام لعل چائے بنا رہے ہیں اُن کے بال قبل از وقت بالکل سفید ہو گئے ہیں۔ جون اس خوشگوار ماحول کو لطیف تر بنانے کے لئے رام لعل کو چھیڑ رہے ہیں۔

"یار رام لعل تیرا چہرہ تو معشوق کی طرح حسین ہے مگر تیرے بال بالکل تیرے باپ کی طرح ہیں۔" محفل میں قہقہہ پڑا ہے۔ جون نے بڑا خوبصورت جملہ کہا ہے۔ چائے بنا کر رام لعل نے سب سے پہلے جون کی طرف کپ بڑھایا ہے۔ "پیو۔" لیکن احترام کے پیشِ نظر جون نے کپ خمار کی طرف بڑھانا چاہا ہے۔

"پہلے تم پیو۔" رام لعل نے کہا ہے۔

"پہلے میں کیوں؟"

"اس لئے کہ تم پاکستانی مہمان ہو۔" رام لعل نے بھی جون کو انتقاماً چھیڑا ہے۔

"رام لعل پاکستانی تو تم بھی ہو۔"

"کیسے ؟"

"اس طرح کہ صرف تمہارا جسم ہندوستان میں ہے تمہاری رُوح دراصل پاکستانی ہے۔" رام لعل ایک لمحے کے لئے خاموش ہو گئے، جیسے اُنہیں اُن کا بھُولا ہوا وطن یاد آ گیا ہو۔ ڈاکٹر رضوی ادب نواز بھی ہیں اور ادیب نواز بھی، اس لئے چائے کے بعد انہیں کی فرمائش پر اب شعر و سخن کا دَور شروع ہوا ہے۔ ہربندر سنگھ وقت اور میں اپنی اپنی غزلیں پڑھ چکے ہیں۔ اب جون سے گذارش کی گئی ہے۔ جون نے اپنی غزل کا آغاز بڑے خوبصورت مطلع سے کیا ہے۔ سبھی جھوم رہے ہیں۔ جون کی غزل کے تقریباً سب اشعار آبدار موتی کی طرح ہیں اور اب حضرت خمار بارہ بنکوی غزل سرا ہیں۔ اُردو شاعری میں عصرِ حاضر میں کیسے کیسے انقلاب آئے ہیں۔ کیسی کیسی تحریکوں نے زور پکڑا ہے۔ مگر خمار نے غزل کا دامن نہیں چھوڑا۔ اُنہوں نے اپنے مخصوص اور منفرد انداز میں مطلع پڑھا ہے، داد و تحسین کی فضا میں خمار صاحب نے غزل ختم کی ہے۔ اس کے بعد سب لوگ منتشر ہو رہے ہیں۔ رام لعل اور ہربندر سنگھ وقت ڈاکٹر رضوی کے ساتھ لکھنؤ واپس جا رہے ہیں۔ میں اور خمار بھائی بھی واپس ہو رہے ہیں اور اس طرح یہ خوبصورت نشست ختم ہو رہی ہے۔

۲ فروری تا ۷ فروری: جون ایلیا کی شخصیت اتنی ہمہ گیر اور پُرکشش ہے کہ بار بار ملنے کو جی چاہتا ہے۔ بارہ بنکی اور لکھنؤ کے درمیان صرف ۱۷ میل کا فاصلہ ہے جو صرف ۳۰ منٹ میں طے ہو جاتا ہے۔ اس قربت کی وجہ سے بارہ بنکی شہر لکھنؤ کا ایک محلّہ معلوم ہوتا ہے اس لئے بارہ بنکی کی طرح لکھنؤ میں بھی جون ایلیا کے آنے کی خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل چکی ہے۔ میں فیصلہ کر چکا ہوں کہ جون جیسی عظیم ادبی شخصیت کا شایانِ شان استقبال کرنا ہے۔ اب میری اور جون کی

کی ملاقات روزانہ دو دو یا تین تین بار ہو رہی ہے۔ یہ نشستیں بہت دلچسپ اور معلوماتی ہوتی ہیں۔ جوگن صرف مایۂ ناز شاعر ہی نہیں بلکہ ایک صحافی ایک مفکر اور ایک محقق بھی ہیں۔ دوسری زبانوں کے ادب پر بھی ان کی گہری نظر ہے۔ مطالعہ نہایت وسیع اور عمیق ہے وہ کسی بھی موضوع پر ہر وقت بات کر سکتے ہیں۔

۸ فروری۔ میں لکھنؤ میں رام لعل کے گھر پر بیٹھا ہوا ہوں میرے ساتھ رام لعل اور ہر بندر سنگھ وقت بھی جوگن کے اعزاز میں ہونے والے ادبی سیمینار اور مشاعرے کے دعوت نامے تیار کر رہے ہیں۔ اس سیمینار اور مشاعرے میں ادیبوں اور شاعروں کو مدعو کرنے کے لئے ہم لوگ رام لعل کے گھر سے روانہ ہو رہے ہیں۔ سب سے پہلے ہم لوگوں نے شمس الرحمٰن فاروقی کے دولت کدے پر حاضری دی ہے۔ فاروقی کئی کتابوں کے مصنّف ہیں، فن تنقید بھی اُن کا میدان ہے اور شاعری بھی۔ باتیں دلچسپ کرتے ہیں لیکن بولتے بہت زیادہ ہیں۔ یہ سوچے بغیر کہ اُن کا مخاطب کون ہے۔ میری اور رام لعل کی گزارش پر وہ ادبی سیمینار اور مشاعرے میں شرکت کرنے کے لئے بڑی خوشی سے تیار ہو گئے ہیں۔ باتیں کرتے کرتے وہ چونکے ہیں۔ "جوگن کہاں ہیں؟"

"بارہ بنکی میں۔"

"چلو ابھی اسی وقت بارہ بنکی چلیں۔"

"مجھے دوسرے ادیبوں اور شاعروں کو بھی مدعو کرنا ہے۔"

"یہ سب کل ہو جائے گا۔"

رام لعل اور ہر بندر سنگھ وقت نے بھی اس کی تائید کرتے ہوئے ساری ذمّے داری اپنے سر لے لی ہے۔ تقریباً پچیس منٹ کے سفر کے بعد فاروقی کی گاڑی جوگن کے دروازے پر کھڑی ہو گئی ہے۔ جوگن جوش مسرت میں فاروقی سے گلے ملے ہیں۔ چائے کے بعد دلچسپ گفتگو ہو رہی ہے۔ ذاتی گفتگو بڑھتے بڑھتے شعر و ادب کے موضوع تک پہنچ چکی ہے۔ فاروقی حسب معمول زیادہ بول رہے ہیں۔ اُن کی گفتگو میں موڈ ہوتا ہے۔ اس وقت ڈاکٹر اقبال زیر بحث ہیں، ٹھنڈک چھپی ہوئی ہے، کمرے کے دروازے بند ہیں، سگریٹ کا دھواں پھیلا ہوا ہے۔ فاروقی ڈاکٹر اقبال کی شاعرانہ عظمت ثابت کرنے میں مصروف ہیں دلیلیں بھی پیش کر رہے ہیں۔ اس وقت تک باقی لوگ فاروقی کو سن رہے ہیں۔ اب جوگن گفتگو کا رُخ موڑ رہے ہیں

شاعر بھی۔

"اقبال نے متضاد کرداروں کی مدح سرائی کی ہے۔"

"مثلاً ۔۔۔؟" فاروقی نے وضاحت چاہی ہے۔

"مثلاً اقبال کا ہیرو بیک وقت اورنگ زیب بھی ہے اور سرمد بھی ۔۔۔ ایک ہی شاعر قاتل اور مقتول دونوں کو بلند کردار کیسے کیسے ہو سکتا ہے۔" فاروقی اقبال کو ڈیفنڈ (Defend) کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ بات آگے بڑھ رہی ہے۔ کچھ دیر کے بعد جوگن پھر لب کُشا ہیں۔

"مسولینی میں عظیم انسان کی کون سی خوبیاں ہیں ۔۔۔؟ وہ اقبال کا ہیرو کیسے ہو گیا ۔۔۔ برٹش امپائر کے شہنشاہ کے سامنے اقبال نے سرِ تسلیم کیسے خم کر دیا ۔۔۔؟ کیا عظیم شاعر کا کردار ایسا ہی ہوتا ہے کہ وہ ہر طبقے کے لوگوں کو خوش کرنے کی کوشش کرے ۔۔۔؟ اس کے علاوہ شاہین ایک ایسا خونخوار طائر ہے جس میں رحم کا جذبہ ہرگز نہیں ہوتا ۔۔۔ اقبال نے شاہین کا تصوّر پیش کر کے اور اسے علامت بنا کر انسان کو خونخوار بننے کی تعلیم کیوں دی ۔۔۔؟"

اس گرماگرم بحث کے بعد محفل میں کچھ دیر کے لئے خاموشی ہو گئی ہے۔ اس خاموشی کو ہر بندر سنگھ وقت نے پھر توڑا ہے۔

"فاروقی صاحب! فراق کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟"

"آپ کا سوال غیر واضح ہے!"

"میرا مطلب ہے فراق کی شاعرانہ عظمت کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟"

"فراق شاعر ہیں، لیکن عظیم شاعر ہرگز نہیں۔" فاروقی سنجیدہ ہیں۔

"کیوں؟" ۔۔۔ وقت فاروقی کی اس برجستگی اور بے باکی پر تڑپ کر بولے۔

"اس لئے کہ دیگر باتوں کے علاوہ فراق کے اچھے اشعار میں بھی ایسے غیر ضروری الفاظ ملتے ہیں جن کے بغیر شعر کا مطلب پوری طرح ادا ہو جاتا ہے۔" فاروقی مثالیں بھی پیش کر رہے ہیں جو صحیح ہوتی ہیں لیکن اس بنا پر کسی شاعر کا پورا کلام کیسے رد کیا جا سکتا ہے۔ یہ سمجھنے سے کم از کم میں قاصر ہوں۔ فاروقی گفتگو سے بہت زیادہ اینٹی فراق معلوم ہوتے ہیں۔

وقت اپنے محدود مطالعے کی وجہ سے فراق کو ڈیفنڈ کرنے میں بُری طرح ناکام ہو رہے ہیں۔ فاروقی سخت لہجے میں تنقید کر رہے

ہیں۔ رام لعل کے چہرے کا اُتار چڑھاؤ بتا رہا ہے کہ اُنہیں فاروقی کی تنقید پسند نہیں آ رہی ہے۔ مگر وہ رواداری برت رہے ہیں۔

یہ رواداری مجھے بُری لگ رہی ہے۔

"کلام اگر چاندی ہے تو خاموشی سونا ہے"۔ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اِس ارشاد کی تعمیل میں چپ ہوں۔ اب رات کے بارہ بجے ہیں۔ فاروقی، رام لعل اور ہربند سنگھ وقت لکھنؤ واپس جا رہے ہیں۔

۱۱ رفروری۔ آج بارہ بنکی کے ادیبوں اور شاعروں کی طرف سے جوّن ایلیا کے اعزاز میں بارہ بنکی کے خوبصورت اور وسیع ٹاؤن ہال میں ایک ادبی سیمنار اور مشاعرہ ہونے جا رہا ہے۔ ڈائس کافی کشادہ اور سجا ہوا ہے جس پر تقریباً سو آدمی بیک وقت بیٹھ سکتے ہیں۔ ڈائس کے بالکل سامنے سامعین کی نشست کے لیے خوبصورت صوفے اور پیچھے دُور تک کرسیاں لگی ہوئی ہیں۔ داہنی طرف نشستیں اخبار نویسوں کے لئے اور بائیں طرف کی نشستیں خواتین کے لئے مخصوص ہیں۔ باذوق سامعین جن میں معزز شہری ڈاکٹر، وکلا، پروفیسرز اور ذمہ دار اعلیٰ افسران شامل ہیں وقت مقررہ پر پہونچ کر اپنی اپنی نشستیں لے رہے ہیں۔ خوش پوشاک، خوش مذاق خواتین بھی بڑی تعداد میں موجود ہیں جن کے نُقرئی قہقہے ہال کی مہکی ہوئی فضا میں اور بھی سرمستیاں بکھیر رہے ہیں۔ لکھنؤ سے رام لعل، شمس الرحمٰن فاروقی، محترمہ دارا ب بانو وفا، محترمہ زیبا علوی اور ہربند سنگھ وقت بھی پہونچ چکے ہیں۔ قریب قریب سبھی نامور شعرا شعرا آ چکے ہیں جن میں خمار بارہ بنکوی، رضوان بارہ بنکوی، نگار بارہ بنکوی، شمیم قدوائی، مُراد بارہ بنکوی، اختر موہانی، قدیر تابانی وغیرہ شامل ہیں۔ ہال بھر چکا ہے۔ سامعین کی بے چینی بڑھ رہی ہے۔ اچانک ہال میں داہنی طرف سے ایک شخص پُروقار انداز میں چند آدمیوں کے ساتھ داخل ہوا اور خواتین کی صفوں سے گذرتا ہوا ڈائس کی طرف بڑھا۔ سب کی زبان سے بے ساختہ نکل گیا ہے "جوّن ایلیا"۔

اب جوّن ایلیا ڈائس پر تشریف لا چکے ہیں۔ ڈائس بھر چکا ہے۔ اس ادبی جلسے کی صدارت خمار بارہ بنکوی کر رہے ہیں۔ نظامت کے فرائض رضوان بارہ بنکوی انجام دے رہے ہیں۔ حضرت خمار بارہ بنکوی، رام لعل اور میں نے جوّن کی گلپوشی کی ہے۔ محبت کے مضبوط دھاگے میں پروئے ہوئے اور عقیدت کی خوشبو سے مہکتے ہوئے رنگا رنگ پھول جوّن کے گلے کا ہار بنے ہوئے ہیں۔ شیلی ویژن یونٹ بھی مصروف شاعر ہیں۔

کا رہے ہیں۔ فلیش ویونٹ ہال میں دوڑ رہی ہے۔ جوّن کا استقبال کرتے ہوئے میں عرض کر رہا ہوں۔

"اودھ کی دھرتی بالعموم اور بارہ بنکی کی زمین بالخصوص خوش نصیب ہے کہ سرحد پار کے ایک ایسے دانشور کا استقبال کرنے کے قابل ہو سکی ہے جس نے اپنی شاعری اور صحافت دونوں کے ذریعے محبت اور انسان دوستی کا درس دیا ہے"۔

اِن الفاظ کا استقبال تالیوں کی گونج میں ہو رہا ہے۔ اب سیمنار شروع ہو رہا ہے جس کا موضوع ہے "ہمارا ادب اِس پار اُس پار"۔ سب سے پہلے ملک کے ممتاز افسانہ نگار رام لعل اپنی فشاں ہیں اور تقسیم وطن کے اثرات اُردو افسانے پر" کے عنوان کے تحت ایک پُرمغز تقریر کر رہے ہیں۔ ٹیلی ویژن یونٹ میں اور تیزی آگئی ہے۔ فلیش لائٹ رام لعل کے چہرے پر مرکوز ہے۔ کیمرہ مین بھی مشغول ہے اور روشنی سب کے سروں سے گذرتی ہوئی اب اگلی صف میں بیٹھے ہوئے سامعین کے چہروں پر جمی ہے۔ رام لعل نے اپنا مقالہ ختم کیا جو بہت زیادہ پسند کیا گیا۔ اس کے بعد شمس الرحمٰن فاروقی کا نام پکارا گیا ہے۔ وہ مائک کے سامنے آ گئے ہیں اور تقسیم وطن کے بعد اُردو شاعری اور اُردو زبان کا جائزہ بڑے حقیقت پسندانہ اور موثر انداز میں لے رہے ہیں۔ اُن کی پُرمغز تقریر کو اُن کی ذاتی وجاہت اور زیادہ موثر کر رہی ہے۔ ٹیلی ویژن والے ایک لمحے کے لئے بھی رُکے نہیں ہیں۔ لیجیے اب آج کے مہمانِ خصوصی جوّن ایلیا مائک کے روبرو ہیں۔ ہال سامعین سے بھرا ہوا ہے مگر ایسی مثالی خاموشی ہے کہ سانسوں کی آواز بھی سنی جا سکتی ہے۔ ٹیلی ویژن یونٹ اب ہال میں تقریباً دوڑ رہا ہے۔ فلیش لائٹ میں جوّن ایلیا کا چہرہ اور بھی دمک گیا ہے۔ جوّن کے چہرے پر ہزاروں نگاہیں جمی ہوئی ہیں۔ سامعین ہمہ تن گوش ہیں۔ جوّن گہر بار ہیں۔

"پاکستان کے لوگ محبت کے لوگ ہیں۔ محبت سے رہنا چاہتے ہیں۔ ادیب اور شاعر بھی عوام کے ساتھ ساتھ محبت کے پیاسی ہیں۔ امن و آشتی اُن کا نصب العین ہے"۔

اور اس طرح دونوں ملکوں کے درمیان دوستی کی عام فضا کا جائزہ لیکر اُنھوں نے اپنی تقریر ختم کی ہے۔ سامعین بے حد محظوظ ہو رہے ہیں۔ خواتین کی تعداد اتنی بڑھتی جا رہی ہے کہ وسیع ہال کو بھی تنگ دامانی کا احساس ہو رہا ہے۔ خوش رنگ اور بیش قیمت لباس کا

محو گفتار ہو رہے ہیں۔

۲۳ فروری تا ۱۳ اپریل — جون ایلیا امروہہ اور دہلی ہوتے ہوئے بمبئی جا چکے ہیں۔ ہر جگہ ان کا شایانِ شان خیر مقدم کیا جا رہا ہے۔ جون کے آنے سے ہندوستان کے کم سے کم تین صوبوں یوپی، دہلی اور بمبئی میں ادبی سرگرمی اپنے عروج پر آ گئی ہے۔ جگہ جگہ ادبی نشستیں ہو رہی ہیں۔

۱۴ اپریل — جون ایلیا بمبئی سے پھر بارہ بنکی آ گئے ہیں۔ جون کے جانے کے بعد بھی ان کا ذکر یہاں ہر ادبی محفل میں ہوتا رہا تھا۔ ان کے واپس آنے پر پھر ایک خوشی کی لہر دوڑ گئی ہے۔ ہندوستان کے مختلف مقامات سے لوگ جون سے ملنے بارہ بنکی آ رہے ہیں۔ اب میری اور جون کی روزانہ نشست رہتی ہے۔ جب فرصت ملتی ہے، دونوں مل بیٹھتے ہیں، دن گزر رہے ہیں، جون کے دل کا سکون لٹتا جا رہا ہے۔ خوش گفتاری اضطراب میں ڈھلتی جا رہی ہے۔ دل بجھتا جا رہا ہے، ہونٹوں پر ہنسی آتی ہے مگر مضمحل سی۔ ۲۷ اپریل کو فلائٹ مل رہی ہے، یہی احساسِ کرب تھا کہ جون کو کھائے جا رہا ہے۔ وطن کی محبت جزوِ ایمان ہے۔ ترکِ وطن کے باوجود جون اب بھی امروہوی ہیں۔ امروہہ پہونچ کر ایک روز جون سرِ بازار زمین پر لیٹ گئے تھے، اٹھنے پر رئیس بھائی نے ان کے کپڑوں کی مٹی جھاڑی تھی۔ جون نے عجیب کرب کے ساتھ کہا تھا۔

"رئیس اسے نہ جھاڑو، یہ میرے وطن کی خاک ہے"

۲۲ اپریل — دہلی سے شریف صاحب بھی آ چکے ہیں۔ ہوائی جہاز کا ٹکٹ ٹھیک ہو چکا ہے۔ جون کو الوداع کہنے کے لئے آج پھر غریب خانے پر ایک ادبی نشست منعقد ہونے جا رہی ہے۔ دن کے نور پر رات کی تاریکی غالب آ چکی ہے۔ برقی قمقموں سے فضا پُر نور ہے مگر ماحول کی اداسی نہیں جاتی۔ سامعین کافی تعداد میں جمع ہو چکے ہیں۔ نامور مقامی شعراء کے علاوہ جواں فکر شاعر ساغر مہدی اور ماہنامہ 'زیور' پٹنہ اور 'عظیم آباد ایکسپریس' کے مدیر رضوان احمد بھی آ چکے ہیں۔ مقامی و غیر مقامی شعراء جون کے ساتھ کھانے کی میز پر ہیں۔ بڑی پیاری گفتگو ہو رہی ہے۔ کھانے کے بعد مشاعرے کا آغاز ہو رہا ہے۔ صدارت شہر کی آخری جناب مرزا صاحب فرما رہے ہیں۔ جون بھی صدرِ محفل کے پاس ہی نشست پر آ چکے ہیں۔ جون کا ہو کیا جا رہا ہے گویا یہ کوئی ادبی جلسہ نہیں بلکہ جیسے شو ہے۔

اب مشاعرہ شروع ہو چکا ہے۔ اختر سروانی، مزاحیات شکوی، تاب امروہوی، قمر ابو الخیر، تمنا ملک، رضوان بارہ بنکوی، ناظر بارہ بنکوی، مولانا بالوی، نکہت بستوی، قمر عرفی اور میں اپنا کلام پیش کر چکے ہیں۔ شعری دور میں پھر شمعِ محفل جون ایلیا کے سامنے ہے۔ جون غزل سرا ہیں ؎

ہم تو جیسے یہاں کے تھے ہی نہیں
دھوپ تھے سائباں کے تھے ہی نہیں

مطلع پر سامعین جھوم رہے ہیں۔ جون غزل پڑھ رہے ہیں۔ داد و تحسین کی فضا میں 'مکرر ارشاد' کی صدائیں بلند ہو رہی ہیں۔

جون نے جب یہ شعر پڑھا ؎

اس گلی نے یہ سن کے صبر کیا
جانے والے یہاں کے تھے ہی نہیں

سامعین کو جون کے کرب کا احساس ہو چکا ہے۔ اس شعر پر تقریباً ہر شخص تڑپ گیا ہے۔ خواتین کے مجمع میں بھی عجیب سی لہر ہے۔ ٹیلی ویژن والوں نے بھی موقعہ سے فائدہ اٹھا کر اپنا رخ اسی طرف موڑ دیا ہے۔ برقع پوش خواتین کے کھلے ہوئے چہروں پر ان کی نقابیں تیزی سے واپس آ گئی ہیں۔ اس کے بعد صدرِ محفل حضرت خمار بارہ بنکوی کا نام ابھی پکارا گیا ہے۔ خمار سامعین کا دل بہت پہلے جیت چکے ہیں۔ مشاعروں میں ان کی غیر معمولی مقبولیت اس حقیقت کی دلیل ہے۔ وہ جھوم جھوم کر اپنی غزل کا مطلع مرحمت فرما رہے ہیں ؎

موجوں سے نہ طوفانوں سے اللہ بچائے
کشتی کے نگہبانوں سے اللہ بچائے

مطلع پر بے حد داد مل رہی ہے۔ اس کے بعد خمار اگلا شعر پڑھ رہے ہیں۔ مشاعرہ اپنے نقطۂ عروج پر ہے۔ ٹیلی ویژن یونٹ بھی سمت بدل بدل کر تصویر کشی کر رہا ہے مگر اس طرح کہ جون کیمرے کی 'زد' میں ضرور رہیں۔ خمار کے کلام سے سامعین مسحور ہو رہے ہیں۔ خمار کی غزل کے ساتھ اس یادگار ادبی جلسے کا اختتام ہو گیا ہے۔ جون خواتین اور مردوں کے ہجوم میں گھرے ہوئے ہیں، کوئی ہاتھ ملا رہا ہے کوئی آٹوگراف حاصل کر رہا ہے۔ تقریباً آدھے گھنٹے کے بعد جون 'اہلِ خلوص' کے نرغے سے رہا ہوئے ہیں۔ اب سبھی مہمان شعراء، ادیب اور مقامی شعراء غریب خانے کو رونق بخشنے کے لئے گاڑیوں

کی جدائی کا احساس سب کو ہے۔ اکثر شعراء حالات سے مطابقت رکھنے والے اشعار جوش کو مخاطب کر کے پیش کر رہے ہیں۔ ہر بار جون کی آنکھیں نم ہو رہی ہیں اور اب خود جون کے سامنے شمع محفل ہے۔ وہ کچھ کہنا چاہ رہے ہیں مگر بھرا ہوا دل اور رُندھا ہوا گلا اُن کا ساتھ نہیں دے رہا ہے۔ سامعین کی فرمائش پر کئی قطعات اور غزلیں سنانے کے بعد وہ ایک غزل اپنے انتخاب سے پیش کر رہے ہیں ؎

دل کر تپاک سے نہ ہمیں کیجئے اُداس
خاطر نہ کیجیے کبھی ہم بھی یہاں کے تھے

جون کی آنکھوں کے آنسو چھلک کر رخسار تک آ گئے ہیں۔ سامعین اپنا دل تھام کر رہ گئے ہیں۔ سب کی آنکھیں نم ہیں، ماحول سوگوار ہے۔ جون پھر دردناک لہجے میں شعر پیش کرتے ہیں ؎

کیا پوچھتے ہو نام و نشانِ مسافراں
ہندوستاں میں آئے ہیں ہندوستان کے تھے

یہ شعر جون کے کربناک احساس کی جیتی جاگتی تصویر ہے۔ سامعین بھی جون کے ساتھ کراہ اُٹھے ہیں۔

۲۴ اپریل۔ دن ویزا پر روانگی کا اندراج کرانے اور سامان وغیرہ باندھنے میں گذر گیا ہے۔ اب شام کے پانچ بجے ہیں۔ جون پا بہ رکاب ہیں۔ مختصر سا سامان گھر سے باہر لایا جا چکا ہے، در و دیوار سے حسرت ٹپک رہی ہے۔ ہوائیں سسکیاں بھر رہی ہیں۔ بہن نجفی (جون کی حقیقی بہن) اور بھانجیوں ہما، نغمہ اور حنا وغیرہ کی دبی دبی سسکیاں اب گریہ بن کر بلند ہو رہی ہیں۔ بہن نجفی جون کے گلے میں بانہیں ڈالے رو رہی ہیں جیسے کہ وہ جون سے لپٹی ہوئی ہیں۔ مفارقت کی جان لیوا گھڑیاں ہیں۔ مدت کے بعد بہن بھائی کی ملاقات ہوئی تھی۔ وہ ملاقات چند لمحوں بعد اب پھر خواب بننے والی ہے۔ بہن بھائی سے چھوٹ رہی ہے۔ بھائی اور ایسا پیارا بھائی۔ جون خود بھی پھوٹ پھوٹ کر رو رہے ہیں مگر بہن نجفی کو تسلی دے رہے ہیں "بہن رو مت، میں پھر بہت جلد آؤں گا" مگر یہ تسلی حقیقتاً جھوٹی تسلی آگ پر تیل کا کام کر رہی ہے۔ جون کو لکھنؤ تک ٹیکسی سے جانا ہے۔ میں اور جون ایک رکشے پر اور نقوی صاحب، منیر شریف صاحب دوسرے رکشے پر بیٹھ گئے ہیں۔ بہن نجفی اور ہما، نغمہ اور حنا وغیرہ کمرے میں سامنے وہیں بیٹھی رو رہی ہیں جہاں جون بیٹھا کرتے تھے۔ اب ہم لوگ ٹیکسی اسٹینڈ کا راستہ طے کر رہے ہیں۔ بہن نجفی کی طرح میرا بھی حقیقی بھائی جدا ہو رہا ہے۔ فرطِ غم سے میری سانس رک رہی ہے۔ میرے اور جون دونوں کے آنسو بہہ رہے ہیں۔ ٹیکسی اسٹینڈ پر پہنچ کر نقوی صاحب نے جون کے ہاتھوں کو آنکھوں سے لگایا ہے اور پیار سے بوسہ دیا ہے۔ جون گلے مل کر ٹیکسی میں بیٹھ گئے ہیں۔ میں نے اور جون نے ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں کے ساتھ ایک دوسرے کو خدا حافظ کہا ہے۔ بڑی صبر آزما ساعتیں ہیں۔ ٹیکسی کے انجن کی گھرگھراہٹ کے ساتھ پہیوں میں حرکت پیدا ہوئی ہے۔ ٹیکسی چل پڑی ہے اور اب ٹیکسی سڑک پر تیز بھاگتے بھاگتے نظروں سے اوجھل ہو گئی ہے۔ میں شفاعت نقوی صاحب کے ساتھ اسی جگہ خاموش کھڑا ہوں جہاں سے ابھی ابھی چند لمحے پہلے جون کو رخصت کیا ہے۔ میرا احساس سسک رہا ہے۔ ماحول کی اُداسی مجھ سے سوال کر رہی ہے ؎

وہ شخص کیا ہوا جو تری داستاں کا تھا؟

OO

بقیہ :- جرعات صفحہ

بوجھ نہیں پڑے گا۔ اس سلسلے میں دو نہایت آسان تجویزیں ذیل میں پیش ہیں۔

ا۔ مشترکہ طور پر چاروں ریاستی اُردو اکاڈمیاں ہندوستان بھر سے فی الحال پانچ معتبر و معیاری ادبی ماہناموں کو منتخب کر لیں۔ ہر اکاڈمی صرف پانچ ہزار روپے اپنے سالانہ بجٹ میں ادبی ماہناموں کے لئے مخصوص کر دے اور ایک ایک ہزار سالانہ اُن پانچوں منتخب رسالوں کو بطور امداد بھیج دے۔ اس طرح پانچ ادبی ماہناموں کو پانچ ہزار روپے سالانہ کی امداد ملتی رہے گی۔

۲۔ اپنی ریاست کی جن لائبریریوں کو اُردو اکاڈمیاں مالی امداد دیتی ہیں اُس مالی امداد میں سے اُن پانچ منتخب ادبی ماہناموں کے سالانہ چندوں کی رقم منہا کر کے بقیہ رقم لائبریریوں کو بھیجی جائے اور وہ سالانہ چندوں کی رقم متعلقہ لائبریریوں کے پتوں کے ادبی ماہناموں کو بھیج دی جائے۔ اس طرح ایک طرف تو ادبی ماہناموں کے سالانہ خریداروں میں اضافہ ہو جائے گا دوسری طرف لازمی طور پر لائبریریوں کو معیاری ادبی ماہنامے ملنے لگیں گے۔ اُردو اکاڈمیوں سے مالی امداد پانے والی لائبریریاں عام طور پر روزی اخبارات و رسائل و کتب اور دیگر امور پر رقم صرف کرتی ہیں۔

مندرجہ بالا دونوں تجاویز پر چاروں اکاڈمیوں مرکزی ترقی اُردو بورڈ دہلی سے بھی بھرپور توجہ کی درخواست ہے۔ (ادارہ)

شاعر۔ بمبئی

قوم پھر ہمت سے
آگے بڑھنے لگی ہے 76-1975ء

دیہات میں نئی زندگی

- مکان تعمیر کرنے کی 65 لاکھ سے زیادہ جگہیں الاٹ کی گئیں جن میں سے 3,68,000 تعمیر کے لئے بالکل تیار کرکے دی گئی ہیں۔ 2,46,000 مکانوں کی تعمیر کا کام پورا ہوگیا۔
- تقریباً 47,000 افراد جن سے جبری مزدوری لی جارہی تھی آزاد کرائے گئے ہیں۔
- زمین کی ملکیت کی حد مقرر کرنے کے قوانین پر عمل درآمد سے 16,67,000 ایکڑ زمین فاضل قرار دی گئی جس میں سے ابتک 4,24,000 ایکڑ زمین الاٹ کی جا چکی ہے۔ اِس سے تقریباً 1,80,000 افراد کو فائدہ پہنچا ہے۔
- 19 دیہی بنک قائم کئے جا چکے ہیں۔ 77-1976ء میں مزید ایسے 50 بنک قائم کرنے کی تجویز ہے۔ قرضہ دینے والے کوآپریٹیو اداروں کو مضبوط بنانے کے اقدامات کئے گئے ہیں۔

davp 76/88

ماڈل

(تلگو)

پی۔ وی۔ سُبّا راما

ترجمہ:- محمد جلال الدین

بی/۹۱-۲-۴، پرکاشم واڑی۔ محبوب نگر۔ (اے۔پی)

اُس کی زندگی ہر طرح آسودہ تھی۔

وہ ایک مشہور مصوّر تھا اور زمانے سے اُس کو ناقدری کی شکایت بھی نہیں تھی۔ جہاں کہیں اور جب کبھی اس کی تصویروں کی نمائش ہوتی لوگ ٹوٹ پڑتے۔ اس کی ایک ایک تصویر ہزاروں روپیوں میں بکتی۔ برش اور رنگوں کی مدد سے اس نے فن کی انتہائی بلندیوں کو چھولیا تھا ـــــ اب تک اس نے سیکڑوں تصویریں بنا ڈالی تھیں اور ہر تصویر اپنی جگہ ایک شاہکار کا درجہ رکھتی تھی۔ وہ زندگی کے تقریباً ہر پہلو کو اپنے کینوس پر ظاہر کر چکا تھا ـــــ لیکن ـــــ لیکن کچھ دن سے داراب کے ذہن میں ایک نئی کسک انگڑائیاں لے رہی تھی ... اور پھر وقت کے ساتھ یہ کسک شدید تڑپ میں بدل گئی۔ کینوس سامنے رکھے، برش ہاتھ میں لئے اس کا ذہن فن کے نئے امکانات پر غور کر رہا تھا ـــــ وہ خدا اور شیطان کی شبیہیں اپنے کینوس پر پیش کرنا چاہتا تھا ـــــ! "لیکن خدا اور شیطان کہاں مل سکیں گے"۔ وہ سوچتا رہا اور اس کاوش نے اُسے دیوانہ کر دیا ـــــ وہ ہر چیز اور ہر شکل پر غور کرنے لگتا۔ لیکن پھر جلد ہی غیر مطمئن ہو جاتا۔ احباب نے اُسے اِس ارادے سے باز آنے کا مشورہ دیا۔ لیکن اُس کی یہ خواہش احباب کے آگے ضد بن جاتی۔

"دیکھو داراب تمہارا یہ خیال بچکانہ ہے ـــــ اور لوگ بھی تم سے دوسری طرح کی تصویریں مانگتے ہیں"۔

"تم سے مطلب!" وہ دوستوں سے اُلجھ جاتا۔ "کیا تم کوئی فنکار ہو تم نے اب تک کتنی تصویریں بنائی ہیں؟ ـــــ کتنے بُت تراشے ہیں؟ کتنے شعر کہے ہیں تم نے؟" وہ جھک کر احباب کی آنکھوں میں جھانکتا۔ پھر مایوسی سے دوسری طرف دیکھتے ہوئے کہتا۔

"مجھے تمہارے مشوروں کی کوئی ضرورت نہیں"۔

لیکن ایک سوال اب بھی اس کے سامنے تھا۔

خدا اور شیطان کی شبیہیں اُسے کہاں مل سکیں گی۔

ایک عرصے تک وہ اِسی تلاش میں سرگرداں رہا۔ لیکن بالآخر اُسے تھک ہار کر خاموش ہو جانا پڑا۔ کتنے ہی دن تک وہ خاموش رہا۔ اُس نے کوئی تصویر بھی نہیں بنائی۔

ایک دن وہ کچھ شاپنگ کر کے ایک دوکان سے باہر آ رہا تھا کہ اس کی نظر ایک چھوٹے سے بچّے پر پڑی ـــــ بڑا خوبصورت بچّہ تھا ـــــ صاف ستھرا ـــــ معصوم ـــــ بچّے کو دیکھ کر داراب کا دل بڑے زور سے دھڑکنے لگا ـــــ اس کے ذہن میں خیالات کا طوفان سا مچ گیا ـــــ خدا کے تصوّر اور اس بچے کی شباہت میں کتنی یکسانیت ہے۔ خدا کی ذات پاک اور بے عیب ہے۔ شفیق اور مہربان ہے ـــــ خدا حُسن ہے، روشنی کا نام ہے ـــــ اور یہ بچّہ ـــــ یہ بچّہ بھی کیسا حسین، شفیق، مہربان، معصوم اور خلیق ہے ـــــ اِس سے زیادہ خدا کی صفات کسی ایک وجود میں کہاں نظر آئیں گی۔ یہ بچّہ میرے کام کی چیز ہے ـــــ میں اسے سامنے بٹھا کر خدا کی تصویر بناؤں گا ـــــ یہ تصویر میرے فن کا کمال ہوگی ـــــ ایک عظیم شاہکار!

جب یہ طوفان ذرا تھا تو اُس نے بچّے کے قریب جا کر دھیرے سے پوچھا۔

"بیٹا! تمہارا نام کیا ہے؟"

"مظہر" بچّے نے بتایا۔

"چاکلیٹ کھاؤ گے؟"

"ہاں" بچّہ دکان میں رکھے چاکلیٹوں سے بھرے مرتبان کی طرف دیکھنے لگا۔

داراب نے چاکلیٹوں سے اس کی جیب بھرنے کے بعد کہا۔

"میرے گھر چلو گے؟"

"کیوں؟" بچّے نے قدرے جھجکتے ہوئے کہا۔

"ہاں — ہاں —" داراب ہکلانے لگا پھر جلد ہی سنبھل کر بولا۔
"میرے گھر میں بہت سے چاکلیٹ اور ڈھیر سارے کھلونے ہیں، وہ سب میں تمہیں دے دوں گا۔"
"سچ!" بچے کی آنکھیں پھیل گئیں۔
"ہاں ہاں سب تمہیں دے دوں گا — چلو گے میرے گھر؟"
"ہاں چلیں گے۔" بچہ تیار ہو گیا۔
داراب اس کو سیدھا اپنے اسٹوڈیو لے آیا۔
"کہاں ہیں کھلونے؟" بچے نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا۔ وہاں رنگوں کے ڈبے اور برشوں کے ڈھیر کے علاوہ اور کچھ نہ تھا۔
"ابھی آ جائیں گے — تم اس کرسی پر بیٹھ جاؤ — ہاں — ایسے بس تھوڑی دیر یوں ہی بیٹھے رہنا۔"

پھر داراب نے جلدی جلدی ایک کینوس پر خطوط کھینچنے شروع کر دیئے۔ بچہ اس دوران میں مچلتا رہا۔ لیکن داراب جوں توں اس کو بہلاتے ہوئے تیزی کے ساتھ تصویر مکمل کرنے لگا۔ جب بچے کی خوبصورت شبیہ کینوس پر منتقل ہو گئی تو داراب اس کو لیکر پھر بازار گیا۔ اس کے لئے کچھ کھلونے اور چاکلیٹ خریدے اور اس کا ماتھا چوم کر اس کے گھر کے قریب چھوڑ آیا۔ اب وہ بہت مگن تھا۔ تصویر میں ابھی کچھ کام باقی تھا لیکن وہ بچے کی مدد کے بغیر بھی پورا کر سکتا تھا اور پھر ایک ہفتہ کی لگاتار محنت کے بعد اس نے اس تصویر کو مکمل کیا — تصویر واقعی شاہکار تھی۔ اس نے اس میں خدا کی زیادہ سے زیادہ صفات کو پیش کرنے کی کامیاب کوشش کی تھی۔۔۔ دوسرے لوگوں کے مقابلے میں خود داراب زیادہ مطمئن تھا کہ اس نے خدا کی تصویر بنائی ہے — کمالِ فن کے احساس نے اس پر ایک نشہ سا طاری کر دیا۔ وہ پہروں اپنی اس تخلیق کے سامنے بیٹھا محظوظ ہوتا رہتا — اور پھر یہ نشہ اسی وقت ٹوٹا جب اس کو اس بات کا احساس ہونے لگا کہ ابھی تو اس کا کام ادھورا ہے۔ ابھی تو اسے شیطان کی تصویر بنانی ہے۔

"کہاں ملے گا شیطان؟"
یہ سوال پھر اس کا منہ چڑانے لگا۔
"میں تلاش کر لوں گا۔" اس نے خود اعتمادی سے کہا۔ لیکن ہفتے مہینے پھر سال گذر گئے مگر کہیں بھی اس کو شیطان نہ ملا۔ داراب شیطان کی تلاش میں بوڑھا ہو گیا، لیکن یہ سودا اس کے سر سے نہ گیا — وہ

شاعر بمبئی

تجسس بھری آنکھوں سے ہر طرف شیطان کو ڈھونڈتا رہا تھا لیکن کوئی بھی شبیہ شیطان کا بھرپور عکس نہیں تھی۔
پھر ایک روز اُسے شیطان مل گیا۔۔۔ وہ ایک شام سڑک پار کر رہا تھا کہ ایک درندہ صفت آدمی اس سے ٹکرا گیا۔ ٹکرانے والا چونکہ کافی لحیم شحیم تھا، بوڑھا داراب قلابازیاں کھا گیا۔ وہ ابھی کپڑے جھاڑ کر کھڑا ہی ہوا تھا کہ وہ شخص چنگھاڑنے لگا۔
"کیوں بے بڈھے! — موت آئی ہے کیا — اگر ہاتھ پاؤں میں دم نہیں تو گھر میں پڑا رہ۔"
"کیا کہا؟" داراب نے اسے گھورتے ہوئے کہا "تم خود مجھ سے آ ٹکرائے اور —"

لیکن داراب کا جملہ ختم ہونے سے قبل ہی اُس شخص کا مضبوط، موٹا اور بھدا ہاتھ داراب کے گریبان پر پڑا اور اس نے داراب کو ایک جھٹکے کے ساتھ اپنی طرف کھینچا۔ وہ داراب کو دھمکیوں کے ساتھ گالیوں سے بھی نواز رہا تھا۔ لیکن داراب کو کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔ اس کی بجھی ہوئی آنکھوں میں ایک نئی چمک آ گئی تھی۔ وہ کوئی مزاحمت بھی نہیں کر رہا تھا بلکہ غور سے اُس شخص کا کریہہ چہرہ دیکھ رہا تھا — سیاہ رنگت، سخت اور بے ترتیب بال، سرخ سرخ آنکھوں سے درندگی ٹپک رہی تھی۔ بڑی بڑی مونچھیں چہرے کو مزید خوفناک بنا رہی تھیں — داراب سوچ رہا تھا — خود اس شخص کے اعمال اور اس کے کردار نے بھی اُس کے چہرے کو مسخ کر دیا ہے۔ اُس کی شخصیت میں کرختگی، وحشت، ایذا رسانی، درندگی، گھمنڈ اور تخریب کاری گھل گئی ہے — داراب کی دیرینہ آرزو پوری ہو رہی تھی — شیطان اس کے سامنے تھا — برسوں جس کو تلاش کیا تھا آج خود وہ اس کی گرفت میں تھا — اُس کی مسکراہٹ آنکھوں سے بڑھ کر چہرے پر پھیل گئی۔
"اپنی تصویر بنواؤ گے؟"
"تصویر؟ تم میری تصویر بناؤ گے؟" اس شخص نے حقارت سے کہا۔
"ہاں! بس بس سڑک کے اُس کنارے میرا اسٹوڈیو ہے" داراب نے سڑک کی دوسری سمت اشارہ کرتے ہوئے نہایت عاجزی سے کہا "بس تھوڑی دیر کے لئے وہاں چل کر بیٹھ جاؤ — بڑی مہربانی ہو گی۔"
وہ شخص مشکوک نگاہوں سے داراب کو گھورنے لگا۔ پھر خود ہی بولا

(باقی صفحہ ۷۴ پر دیکھئے)

پُرانے سکّے

غلام ثقافی
١١-٣/٨٤٩ معظم پورہ - حیدرآباد

پُرانی چیزیں جمع کرنا اچھا شوق ہے۔ لوگ پُرانی کتابیں، تصویریں، ٹکٹ، سکّے وغیرہ جمع کرتے ہیں۔ ان میں سکّوں کو جو اہمیت حاصل ہے وہ کسی اور چیز کو نہیں بلکہ کہا جا سکتا ہے کہ سکّے جمع کرنا ملک کی خدمت ہے۔ کیونکہ ہندوستان کے پُرانے زمانہ کی تاریخ سکّوں اور کتبوں ہی کی مدد سے پوری ہوئی ہے۔

سکّوں کا رواج حضرت عیسیٰ کی پیدائش سے سات سو برس پہلے ہوا۔ شروع میں سکّوں کی شکل گول یا چوکور نہیں تھی بلکہ سونے چاندی کے پتّروں پر مہر لگادی جاتی تھی۔ دنیا میں سب سے پہلے "لیڈیا" کی حکومت نے سکّے جاری کئے۔ یہ حکومت اُس علاقہ میں تھی جہاں اب ترکی ہے۔ لیڈیا کے بعد یونان، اٹلی اور ایران میں سکّوں کا رواج ہوا۔ اس سے چیزوں کے خریدنے اور بیچنے میں آسانی ہوگئی اور ایک ملک سے دوسرے ملک میں بیوپار ہونے لگے۔

ہندوستان کے سب سے پُرانے سکّے پنچ مارک (Punch mark) ہیں۔ یہ سکّے حضرت عیسیٰ سے پانسو برس (٥٠٠) پہلے سارے ملک میں رائج تھے۔ ان کی شکلیں ایک سی نہیں ہیں، کوئی گول ہے کوئی چوکور، کوئی مستطیل ہے۔ ان پر کسی راجہ کا نام یا سن وغیرہ نہیں ہے۔ البتہ علامتیں بہت ہیں۔ ان سکّوں پر انسانی شکلیں بیل، ہرن، سانپ، مچھلی، مور، درخت، پہاڑ وغیرہ کی بے شمار شکلیں ہیں۔

جس زمانہ میں یونانیوں نے ہندوستان پر حملے کئے، اس وقت کے سکّوں پر یونانی اور پراکرت الفاظ پائے جاتے ہیں۔ کچھ عرصہ بعد جب یونانی اثر کم ہوگیا تو سکّوں پر یونانی دیوتاؤں کی جگہ ہندوستانی دیوی دیوتاؤں نے لے لی اور سارے ملک میں ہندوستانی سکّے رائج ہوگئے۔

دو ہزار برس پہلے دکن میں آندھرا خاندان کا راج تھا۔ اُس کی حکومت دُور دُور تک پھیلی ہوئی تھی۔ اُس زمانہ کے آندھرا سکّے زیادہ تر سیسے کے ہیں، جن پر راجہ کا نام اور مختلف شکلیں بنی ہیں۔ ان پر ہاتھی، بدھ مت کے نشان اور کشتیاں بنی ہوئی ہیں۔

آندھرا کے بعد دکن میں جو دوسری حکومتیں قائم ہوئیں انہوں نے زیادہ تر سکّے سونے کے جاری کئے جن پر خاندان کا شاہی نشان ہوتا تھا۔ مثلاً مالابار کے چیرو (Chero) اپنے سکّوں پر ہاتھی بناتے تھے۔ چالوکیہ سکّوں پر سوّر ہوتا تھا۔ پانڈیوں کے سکّوں پر مچھلی اور کدمبہ کا نشان کنول تھا۔

اسلامی سکّے بہت بعد کی ایجاد ہیں۔ آٹھویں صدی میں جب عربوں کی حکومت بہت دور تک پھیل گئی تو بنی اُمیّہ کے زمانے میں باقاعدہ سکّے ڈھالنے کا رواج ہوا۔ یہ سکّے سونے چاندی اور تانبے کے تھے۔ اسلام میں انسان یا جانور کی شکل بنانا منع ہے چنانچہ مسلمانوں کے سکّوں پر ایک طرف کلام مجید کی آیت اور دوسری طرف بادشاہ کا نام اور سن ہوتا تھا۔

ہندوستان میں مسلمانوں کے ابتدائی سکّوں پر ایک طرف بادشاہ کا نام اور دوسرے رخ پر کلمہ طیّبہ ہوتا تھا اور ساتھ ہی کلمے کا سنسکرت ترجمہ نقش ہوتا تھا۔ مسلمانوں سے پہلے ہندوستان کے اکثر سکّے خالص دھات کے نہیں ہوتے تھے۔ ان میں کھوٹ ہوتا تھا۔ شیر شاہ ہندوستان کے اُن بادشاہوں میں سے ہے جو سلطنت کے انتظام کے لئے مشہور ہے۔ اس کے چاندی کے سکّوں پر سواستکا نشان ہے اور دیوناگری میں بعض سکّوں پر شری سیر ساہ (اسم [illegible]) لکھا ہوا تھا۔

شاعر بمبئی

[illegible] اپنے سکوں میں ایک نئی بات پیدا کی، انہوں نے اپنی اشرفیوں پر [illegible] اشعار نقش کرائے۔ اکبر نے جب الہ آباد میں قلعہ بنوایا تو وہاں سے ایک اشرفی جاری کیا۔ اس پر یہ شعر ہے ؎

ہمیشہ چوں زر خورشید و ماہ روشن باد
بہ شرق و غرب جہاں سکۂ الہ آباد

جہانگیر کی ایک اشرفی پر یہ شعر تھا ؎

۲۸۹ ۲۸۹
حروفِ جہاں گیر و اللہ اکبر
ز روز ازل در عدد شد برابر

شاہجہاں کی ایک اشرفی دو سو تولے خالص سونے کی تھی۔ اتنی قیمت کا سکہ دنیا میں شاید ہی کسی فرماں روا نے جاری کیا ہو۔ دنیا میں بہت سی بڑی بڑی حکومتیں قائم ہوئیں جن کا رقبہ ہندوستان میں مغل شہنشاہوں کی سلطنت سے بہت زیادہ تھا مگر یہاں کے مغل فرماں رواؤں کے دار الضرب بہت تھے۔ کوئی ڈیڑھ ہزار مغلی دار الضرب اب تک معلوم ہو چکے ہیں۔ اور مزید تحقیق سے ان میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔

پُرانے زمانے میں بینک نہیں تھے۔ اور تجوریاں بھی نہیں تھیں۔ اُس وقت روپے کی حفاظت کا آسان طریقہ یہ تھا کہ اُس کو زمین میں گاڑ دیتے تھے۔ چنانچہ دنیا میں بہت جگہ پُرانے خزانے دفن ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ بعض لوگوں کو ہل جوتتے وقت خزانہ مل جاتا ہے۔ کبھی مکانوں کی بنیاد کھدوانے میں روپئے نکل آتے ہیں۔ سونے چاندی کے سکے مدتوں زمین میں دبے رہیں تو برباد نہیں ہوتے۔ جن مقامات پر سکے ملے، اُن سے نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ اُن سکوں کا رواج کہاں کہاں تھا اور اُن فرماں رواؤں کی حکومت کہاں تک پھیلی ہوئی تھی، لیکن اس طرح نتیجہ نکالنے میں بڑی ہوشیاری کی ضرورت ہے کیونکہ تجارتی کاروبار میں بھی سکے کہیں سے کہیں پہنچ جاتے ہیں۔

قدیم آندھرا حکومت صنعت میں بہت ترقی کر گئی تھی اور یورپ کی منڈیوں میں دکن کی مصنوعات کی بہت مانگ تھی چنانچہ اس زمانے کے رومن مصنفوں نے لکھا ہے :

"افسوس ہے کہ اٹلی سے بے شمار دولت ہندوستان کو چلی جا رہی ہے"

اس کا ثبوت ان کھدائیوں سے ملتا ہے جو کونڈاپور آندھرا علاقے میں ہوئی ہیں۔ ان کھدائیوں میں رومن سکے بھی ملے ہیں نلگنڈہ اور کریم نگر سے جو دفینے برآمد ہوئے ہیں، وہ سب رومن سکے ہیں۔ یہ سکے حیدرآباد کے ریاستی عجائب خانہ میں محفوظ ہیں۔

قدیم راجاؤں اور دوسرے حکمرانوں کی تصویریں جو تاریخ کی کتابوں میں چھپی ہیں، یہ بھی سکوں ہی سے لی گئی ہیں۔ پرانے سکوں سے قدیم زمانے کے آرٹ کا بھی پتا چلتا ہے اور مختلف زمانوں کی تصویروں کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس فن نے رفتہ رفتہ کس طرح ترقی ہوئی۔

سکوں کے مطالعہ کے لئے ایک مجلس مسکوکات (Newsmatic Society) قائم ہے۔ اُس کے شمارے رسالے میں ہر زبان اور زمانے کے سکے تصویروں کے ساتھ چھپتے ہیں۔ اچھے مضامین پر سوسائٹی میڈل بھی دیتی ہے۔ بعض سکوں پر ایسے حکمرانوں کے نام نقش ہیں جن کا ذکر کسی تاریخ میں نہیں ہے۔

پُرانے سکے کی قیمت اُسکی دھات پر منحصر نہیں بلکہ اسکی کم یابی یا نایابی پر ہے۔ بعض تانبے کے سکے سونے کے سکوں سے زیادہ قیمت کے ہوتے ہیں۔ اگر کسی کو کوئی زنگ کھایا ہوا پُرانا سکہ مل جائے تو اُسے بڑی احتیاط سے رکھنا چاہیئے اور کسی ماہر سے اُسے پڑھوایا جائے ممکن ہے کہ یہی پرانا سکہ تاریخ میں کسی نئی بات کا اضافہ کر دے۔

○○

نقد و نظر

(تبصرے کے لئے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

○ آواز کا رنگ
○ غیاث صدّیقی
○ مکتبۂ شعر و حکمت ۔ حیدرآباد
○ قیمت پندرہ روپے ۔ ضخامت ۱۳۶ صفحات

کتاب کی ضخامت کا، کتاب کی وقعت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ ۱۳۶ صفحوں کا یہ مختصر اور خوبصورت مجموعۂ کلام اس لحاظ سے کافی ضخیم ہے کہ اس کے کئی اشعار قاری کے دل و دماغ کو چھو لیتے ہیں (جو شعر دل و دماغ کو چھو لے اُسے اچھا شعر کہا جاتا ہے اور ایسے شعر کہنے کے لئے شاعر کا معقول اور با صلاحیت ہونا ضروری ہوتا ہے) غیاث صدّیقی نے شاعری کو آبِ زلال کی طرح برتا ہے وہ اپنی بات ہر پیرائے میں کہہ سکنے کی صلاحیت اور سلیقہ رکھتے ہیں۔ اُن کی آزاد نظموں میں بھی وہی گرفت اور قوت ہے جو اُن کی مقفّیٰ اور مسجّع نظموں میں ہے۔ ساتھ ہی ساتھ رسیلی اور نرم و نازک غزلیں بھی ہیں۔ حمد اور سلام میں عقیدت اور ارادت ہے تو چھوٹی چھوٹی نظموں میں فکر و فہم اور بلاغت۔

—— غزل کے بارے میں میں نے کبھی کہیں پڑھا تھا (کیوں کیا میں پڑھتا نہیں) کہ یہ سب سے زیادہ مشکل صنفِ شاعری ہے اور غزل کہنے کیلئے پانچ سات کڑی شرطوں کی پابندی ضروری ہے۔ مثلاً یہ کہ غزل کی زبان' نرم، شیریں اور سلیس ہونی چاہیئے اور یہ کہ جذبات و خیالات کی رکاکت اور اندازِ بیان کے ابتذال سے پرہیز کرنا چاہیئے اور یہ کہ غزل میں سپردگی اور خود گذاشتگی کا احساس نمایاں ہونا چاہیئے۔ وغیرہ وغیرہ۔ غزل کو شاید شاعری کی سب سے زیادہ بے ساختہ اور مہذب صنف بھی کہا گیا ہے۔ اسی لئے حکمائے شاعری نے سب سے زیادہ احتیاط' غزل کے معاملے میں تشخیص کی ہے۔ غیاث صدّیقی نے غیر محسوس طریقے پر غزل گوئی کی کڑی شرطوں کی سختی سے پابندی کی ہے (وہ خود بھی تو ڈاکٹر ہیں) اس لئے انھوں نے غزلوں کی صحت کا خاص خیال رکھا ہے۔

خیال آیا نہیں چھاؤں میں ٹھہرنے کا
اگرچہ راہ میں کتنے گھنے درخت ملے

ناخن اعتدہ کشا کیا کرو زخم دل کی
شاعر بھی کیسے الماس کے ٹکڑوں کا مقدر تم ہو

پیالۂ زہر کا پی کر زبانِ حق کھولو
جو مصلحت ہے خاموش وہ بھی مجرم ہے

کم سے کم لفظوں میں زیادہ سے زیادہ کہنا فن کاری ہے۔ 'آواز کا رنگ' کے خالق غیاث صدّیقی کو اپنے اور قاری دونوں کے وقت کی قدر و قیمت کا اندازہ ہے۔ وہ تضییعِ اوقات کا فن نہیں جانتے۔

'ہم سفر' مختصر سی نظم ہے ؎ تجھ کو خدا سے مانگ کے میں نے
جیسے سب کچھ مانگ لیا ہے

' بظاہر نہایت بے ضرر اور سادہ مصرعے ہیں۔ غالباً یہ بات شیکسپیر نے کہی ہے کہ "ہر منٹ میں کئی دن ہیں"۔ اتنی وزنی تو خیر نہیں لیکن ایسی ہی کوئی بات اس نظم کے بارے میں کہی جا سکتی ہے۔ اس معصومیت میں سلیقۂ عشق، اپنا حسنِ طلب اور دینے والے کی داد و دہش کی کتنی ہی اَن کہی باتیں بند ہیں۔ (لیکن یہ سب باتیں میں کیوں کہہ رہا ہوں۔ آپ نظم پڑھیں گے تو خود ہی محسوس کریں گے) اسی طرح 'معجزے' بے حد مختصر لیکن پُرشکوہ نظم ہے۔

غار میں
سانپ کا زہر بھی
آبِ کوثر بنا

یہ لعابِ دہن
فتحِ خیبر بنا

'آواز کا رنگ' رواروی میں نہیں' ٹھہر ٹھہر کر پڑھنے کی چیز ہے (بعض لوگ شاعر کے کلام کو بھی اخبار کی طرح مطالعہ کرتے ہیں)

غیاث صدّیقی' بذاتِ خود شائستہ' ہنس مکھ اور بھاری بھرکم آدمی ہیں اور یہی ڈھب اُن کے کلام کا بھی ہے۔ شاعر اور ادیب میں یہ خوبی ہونی چاہیئے کہ وہ اپنے فن سے پہچانا جائے ورنہ کتنے ہی ادیب اور شاعر اپنے اطراف' تعلقات اور رسائل و وسائل' کے ذریعے جانے جاتے ہیں۔ غیاث صدّیقی نے اپنے آپ کو ان بدعتوں سے محفوظ رکھا ہے۔

'آواز کا رنگ' ۔ آواز اور رنگ کا حسین امتزاج ہے۔ اس کا گیٹ اپ عمدہ اور خوبصورت ہے کہ اس پہ ایک اور گرد پوش کی ضرورت ہے۔ پندرہ روپے قیمت زیادہ معلوم ہوتی ہے لیکن وہ دن کب آئے گا جب شعر کی صحیح قیمت ادا کی جائے گی۔ اس مجموعۂ کلام کا تعارف وحید اختر نے لکھا ہے۔ اس تعارف میں ایک جملہ ہے "میں یہ چاہوں گا کہ قاری اس پیش لفظ کو اپنے اور شاعر کے درمیان حائل نہ سمجھے" یہی مشورہ اس تبصرے کے بارے میں بھی دیا جا سکتا ہے۔

یوسف ناظم

○ شورجگ کے تماشائی
○ مرتب: ابراہیم انجم
○ قیمت: دس روپے۔ صفحات ۹۶
○ ناشر: بزم توفیق۔ طائی اسٹریٹ۔ محمود واڑی، بڑودہ (گجرات)

گجرات میں احمد آباد کے بعد بڑودہ کو اُردو کے چلن میں اہمیت حاصل ہے۔ یہاں شاعری کا ذوق ہر دور میں رہا ہے۔ غالب اور ذوق کے دور میں محمد احسان احسان، غلام قادر بلیغ، خواجہ سید رشید، میر ابراہیم علی خاں وفا اور حکیم احمد حسن فدا وغیرہ کافی مشہور رہے۔ وفا اور فدا غالب کے شاگرد تھے۔ وفا کے صاحبزادے میر احتشام علی خاں سجاد، استاد ظہیر دہلوی کے شاگرد رہے۔ شاعری کا یہ سلسلہ افسر بڑودوی تک آیا۔ افسر خوش فکر شاعر تھے۔ آخری دور کے استاد شاعر مدد بڑودوی ہوئے مگر خلش بڑودوی نے اُردو شاعری میں جتنا نام پایا، بڑودہ کے کسی شاعر نے نہیں پایا۔ نسیم القادری، شرر القادری، عزیز قادری اور جمال جہدوی بھی بڑودہ کے شاعرانہ ماحول کے اعتبار سے اچھے شاعر ہیں۔

"شورجگ کے تماشائی" مدد، نسیم، خلش، شرر، عزیز اور جمال چھ شعرا کے حالاتِ زندگی اور اُن کے کلام کے انتخاب پر مشتمل مجموعہ ہے۔ علاقائی شعرا کے کلام کی پیشکش کا یہ سلسلہ اب عام ہے اور مفید بھی کہ ہر شاعر اپنا مجموعۂ کلام طبع نہیں کرا سکتا۔ ابتدا میں بزم توفیق کے صدر ابراہیم انجم کا "حرفِ معتبر" ہے۔ پھر "کھری کھری" کے عنوان سے محمود سعیدی کا ایک جائزہ جس میں اُنھوں نے خلش بڑودوی کی شاعری کو سراہا ہے اور نسیم القادری جمال جہدوی، شرر القادری اور عزیز قادری کے کلام میں نئے میلانات رجحانات کے فاسٹ کو محسوس کیا ہے۔ ساتھ ہی زبان و بیان اصطلاحے کی کمزوریوں کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔ محمود سعیدی کا تبصرہ یقیناً غیر جانبدارانہ ہے اور لائقِ توجہ۔ اُنھوں نے چند اچھے اشعار بھی بطور نمونہ پیش کئے ہیں۔ مثلاً

وقت کے تقاضے کو جانتے ہیں سب، لیکن
وقت کے اشاروں کو کون ہے جو پہچانے — مدد

اَن گنت تیرہ خاک دانوں میں
ایک شعلہ نفس سے کیا ہوگا — نسیم

دھوپ غم کی نہ چڑھی تھی جب تک
سر چھپانے کے تقاضے تھے بہت — خلش

فرد پہنچے گا کہ وہ غزل خواں نعیم تک
صبا چلی ہے اگر غزدۂ بہار لئے — جمال جہدوی

صبح تک اخبار کچھ بھی کے تو رہ سکے نہیں
رات تو ہو نے دو کوئی حادثہ ہو جائے گا — عزیز قادری

شعرا کے حالاتِ زندگی کے علاوہ انتخاب میں دس دس غزلیں لی گئی ہیں۔ خلش بڑودوی کی ۱۲ غزلیں ہیں۔ غزلوں کے اشعار کے انتخاب میں سختی کی ضرورت تھی۔ "گفتگو" کے عنوان سے منصور الحق قریشی، پروفیسر و ایگزیکٹیو صبا جی راؤ یونیورسٹی نے گجرات میں اُردو شاعری کا تاریخی اور علمی جائزہ لیا ہے۔ کتاب نہایت خوبصورت طبع ہوئی ہے۔

(ادارہ)

○ پروازِ غبار
○ مصنف: غبار بھٹی
○ ضخامت: ۲۵۶ صفحات۔ قیمت: دس روپے
○ ملنے کا پتا: زیبا پبلیکیشنز۔ باقر گنج۔ پٹنہ ۴

غبار بھٹی اُس خاندان سے تعلق رکھتے ہیں جس میں پشتوں سے طبابت، خطابت اور شعر و سخن کا ذوق رہا ہے۔ اُن کے والدِ مرحوم مولانا نثار احمد خاں نثار بھٹی ایک عالم و فاضل بزرگ اور اُردو فارسی، ہندی زبانوں کے اچھے شاعر تھے۔ غبار بھٹی کے صاحبزادے رضوان احمد، ایڈیٹر "عظیم آباد ایکسپریس" نوجوان نسل کے بیباک صحافی اور اچھے افسانہ نگار ہیں۔

ایک زمانہ میں حکیم غبار بھٹی کے نام سے رسائل و اخبارات میں غبار صاحب کا کلام کافی چھپتا تھا۔ وقت بدلتا ہے تو شعر و ادب کے رجحانات بھی بدل جاتے ہیں اور بعض اہلِ قلم جو اُن رجحانات کے ساتھ نہیں چل سکتے، اپنے فکر و فن کی تشہیر سے منہ موڑ لیتے ہیں، مگر حسرت کی طرح دوسری مشغولیتوں کے ساتھ فکرِ سخن کی مشقت جاری رہتی ہے۔ غبار بھٹی نے شاعری میں مولانا حسرت موہانی ہی سے استفادہ کیا اور نظموں، غزلوں کی تخلیق جاری رکھی۔ کبھی کبھی مشاعروں میں بھی شریک ہوتے رہے اور تقریباً پچیس تیس سال کے اپنے سرمایۂ سخن کو "بہار اُردو اکاڈمی" کے مالی تعاون سے شائع کر دیا۔ سکندر علی وجد کے مجموعۂ کلام "بیاضِ مریم" ہی کی طرح کسی کاتب سے کتابت نہ کراتے ہوئے غبار صاحب نے پورا مجموعہ خود اپنے قلم سے لکھا ہے۔ اُن کی پختہ تحریر اور اسرار کریمی پریس کی طباعت نے مجموعہ کو خاصے کی چیز بنا دیا ہے۔ اُن کے کلام سے بھی پختہ مشقی کا اظہار ہوتا ہے۔ کسی مقدمہ یا دیباچہ کے بغیر صرف ایک صفحہ کے مختصر سے اپنے تعارف کے ساتھ اُنھوں نے

اپنا مجموعہ پیش کر دیا ہے۔

"بہارِ غبار" میں ۲۲ نظمیں اور ۸۰ غزلیں ہیں۔ غبار بھٹی کی نظموں اور غزلوں کے حتی پیکر نرم اور شگفتہ ہیں ایسی فکر احساسِ حسن سے پیدا ہوتی ہے۔ اُن کی نظموں میں "فرازِ شب" "فطرت کا ایک دیوانہ" "کیفیتِ شب" "بیتے دنوں کی یاد" وغیرہ دل دماغ کو جمالیاتی کیف سے سرشار کرتی ہیں اور نرم شگفتہ اور رسیلے الفاظ کی حامل ہیں۔

غزلوں میں احساس تغزل کی پاسداری ملتی ہے جو غزلیہ شاعری کی پچھلی روایتوں اور خاص طور سے حسرت سے انہیں ورثہ میں ملی ہے۔ ذیل کے چند اشعار سے اُن کے رنگِ غزل کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ اپنی لفظیات اور فکر دونوں اعتبار سے اُن کی غزلیں کافی ہلکی پھلکی ہیں۔

دل میں آگ لگی ہے، لیکن دل کی آگ بجھاؤں کیسے
پانی کی اک بوند نہیں ہے، دیدۂ تر کو دیکھ لیا ہے

تاریکی بھی اک پردہ تھی، روشنی بھی اک پردہ ہے
حیرتیانِ شام و سحر نے شام و سحر کو دیکھ لیا ہے

تیری نشیلی آنکھ کا کھلنا، پَو پھٹنے کی علامت ہے
جھانک کے ان پلکوں کے پیچھے نورِ سحر کو دیکھ لیا ہے

اُلفت کے سنہرے افسانے، کچھ یاد رہے کچھ بھول گئے
وہ بزم وہ رنگیں افسانے کچھ یاد رہے کچھ بھول گئے

زنداں سے تو وحشی نکلے ہیں، پر سوچ رہے ہیں جائیں کدھر
وہ عہدِ جنوں کے ویرانے کچھ یاد رہے کچھ بھول گئے

مجموعہ میں کتابت کی اغلاط اور فنی تسامحات خال خال ہی ہیں۔ مجموعہ کی تزئین تبصرہ درست ہے۔ (ادارہ)

شاعر کا آئندہ شمارہ

اگست ۱۹۷۶ء

گوشۂ حسن الدین احمد

حسن الدین احمد کارٹونسٹ کی نظر میں — مجتبیٰ حسین
حسن الدین احمد۔ لفظوں کا آدمی (خاکہ) — محمود سعید...
حسن الدین احمد سے ایک ملاقات — برق موسوی
حسن الدین احمد — نثار احمد ف...
اُردو الفاظ شماری — حسین الدین ا...
بنیادی اُردو (مقالہ)

مقالات

اُردو کے پہلی ریڈیائی ڈرامے — ڈاکٹر ...
شاعر کا تخلیقی عمل — فوشہ ...
جگر بریلوی خطوط کے آئینے میں — مبشر ...

کہانیاں

خاکِ درِ دل — عفت ...
آگہی کے اندھیرے — بیگ احـ...
مسافر ترا کارواں لُٹ گیا — علی تقی ...
دھنک (شورج بالا) — ترجمہ ...

فن افکار

غزل گائیکی — شاہد ...

طنز و مزاح

جگا (ہندی) — بشیر ...
ترجمہ: ...

منظومات

تاج ترشن پرتاپ گڈھی — مظفر حنفی — رشی ...
شاد رحیم — یعقوب راہی — دانش ...
رشید انصاری — صابر ابوہری — اعجاز ...
خالد شفائی — نرگس صدیقی — ساحل ...
... — حسن عزیز — مصطفےٰ مومن — ...
سید ضیاء الدین ضیا — نثار الماس — شاہ حمید — ...

مکتوبات

"شاعر" کے گذشتہ شمارہ میں ۹۰ صفحات پر مشتمل "بیادِ علامہ سیماب" کے باب پر بہت سے خطوط میں جہاں اظہارِ پسندیدگی کیا گیا ہے، وہیں بعض اُمور اور کتابت کی اغلاط کی طرف بھی ادارۂ "شاعر" کو توجہ دلائی گئی ہے۔ اِس شمارہ میں چند ہی خطوط شامل ہو سکے ہیں۔

بعض مخلصین نے لکھا ہے کہ نہ یہ علامہ سیماب کے ساتھ انصاف ہے اور نہ اُن کے شایانِ شان۔ بعض نے تحریر کیا ہے کہ "شاعر" کا ایک ضخیم سیماب نمبر نکلنا چاہئے تھا اور بعض نے اُس گوشہ ہی کو "سیماب نمبر" سمجھ لیا ہے۔ اربابِ فکر و نظر اور عقیدت مندانِ سیماب کی یہ رائیں، نیک نیتی، خلوص اور عقیدت پر مبنی ہیں۔

اِن مختلف النوع اُمور کے سلسلے میں ہماری گذارش و صراحت یہ ہے کہ "بیادِ علامہ سیماب" کے باب کو صرف سیماب اکاڈمی کی افتتاحی تقریب اور یومِ سیماب تک محدود رکھا گیا تھا اور اُس میں وہی مواد شائع کیا گیا ہے جو اِن تقاریب میں پیش کیا گیا تھا۔ جُرعات میں اس بات کی صراحت بھی کر دی گئی تھی۔ سیماب اکاڈمی ہی کے ایماء پر وہ باب مرتب کیا گیا تھا تاکہ اُردو دوستوں اور علمی و ادبی حلقوں کو اکاڈمی کی کارگذاریوں کا علم ہو جائے۔ اگر "شاعر" کی کوئی اشاعت علامہ سیماب سے منسوب کی جاتی تو ظاہر ہے اُس کے لئے ہند و پاک کے اربابِ قلم کو دعوتِ نگارش ضرور دی جاتی۔

رہا کسی ضخیم "سیماب نمبر" کا مطالبہ تو عرض ہے کہ جب تک علامہ سیماب کی غزلوں کا تیسرا دیوان، غیر مطبوعہ خطبات، رباعیات و قطعات، علمی، ادبی اور تحقیقی و فنی مضامین اور دیگر اہم کتابیں شائع نہ ہو جائیں، اُس وقت تک سیماب کی شخصیت و عظمت کا صحیح تصور اور اُن کے فکر و فن پر بھرپور اظہارِ خیال ممکن نہیں ہے۔ ماضی میں کئی رسالوں نے "سیماب نمبر" نکالے۔ سیماب کی زندگی اور اُن کی وفات کے بعد اُن پر بے شمار چھوٹے بڑے مضامین لکھے گئے۔ اب اُن پر اضافے کی ضرورت ہے۔ اُن پرانی تحریروں سے ہٹ کر ازسرِ نو جائزے اور تنقید و تحقیق کے لئے سیماب کی تمام اہم نظم و نثر تصانیف کا اہلِ قلم کے سامنے ہونا بےحد ضروری ہے۔ سیماب اکاڈمی کے قیام کا مقصد یہی ہے کہ پہلے مطبوعات و مخطوطاتِ سیماب کو منظرِ عام پر لایا جائے۔

سیماب اکاڈمی کے مقاصد کی تکمیل اور اُس کے استحکام کے لئے اکاڈمی کی سرپرستی، دوامی رکنیت اور معطی رکنیت کی طرف عقیدت مندانِ سیماب، باحیثیت اُردو دوستوں، بمبئی اور دوسرے شہروں میں قائم شدہ تعلیمی اوقاف کی توجہ کی ضرورت ہے۔ (ادارہ)

○ "شاعر" کا سیماب نمبر برسوں ملا اور اِس لئے کہ اِسکی اطلاع پہلے سے نہ تھی، میں اِسے ایک نعمتِ غیر مترقبہ یاد کرتا ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اُردو کے تنقیدی و تحقیقی ادب میں اِس شمارہ کو برترین جگہ ملے گی۔

سب سے پہلے میں اہلِ بمبئی، بالخصوص سیماب اکاڈمی کے صدر جناب کرشن چندر ط۔ انصاری صاحب و دیگر معاونین و اراکینِ اکادمی کو مرحبا و جزاک اللہ کہتا ہوں کہ اِن حضرات نے سیماب اکادمی قائم کر کے اُردو دنیا کی آبرو رکھ لی۔ اراکینِ اکادمی کی تعداد دیکھ کر بمبئی کو ایک اُردو مرکز کہنا بالکل حق بجانب ہوگا۔

ہر مضمون معیاری ہے۔ مُلّا صاحب کے خطبے کو پڑھ کر اُن کے علم و فضل کا جو نقش میرے دل پر تھا وہ اور گہرا ہو گیا ہے اور اُس کی کما حقہٗ داد و تحسین کے لئے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں۔

زرینہ ثانی کو میری طرف سے ثنا و مرحبا پہنچا دیجئے۔ اُن کی زبان دانی اور زورِ بیان اکثر اساتذۂ اُردو ادب کے لئے بھی قابلِ رشک ہے۔ نشستِ الفاظ اور فقروں کا تسلسل بے پناہ تحسین ہے کہ کوئی لفظ اپنی جگہ سے نہیں ہٹایا جا سکتا۔ ایسی عبارت کو اِس صدی کے آغاز تک "کہا جاتا تھا کہ "جادو یہ بھی ہوتی ہیں"۔

اللّٰہم زد فزد۔ یونس اگاسکر صاحب کا آنکھوں دیکھا حال بھی بہت دلچسپ ہے۔

منٹولہ۔ آگرہ چھاؤنی (یو۔ پی) — ل۔ احمد اکبرآبادی

○ "شاعر" کے تازہ شمارے سے سیماب اکاڈمی کی رُوداد معلوم ہوئی۔ جزاک اللہ۔ بے اختیار دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ اُمید کہ یہ سفر جاری رہے گا۔ ابتدا بہت کامیاب ہے۔

میوہ کٹرہ۔ آگرہ ۳ (یو۔ پی) — میکش اکبرآبادی

○ "شاعر" کا "سیماب نامہ" موصول ہوا۔ علامہ سیماب اکبرآبادی نہ صرف ایک عظیم شاعر، عظیم مترجم اور ایک عظیم فنکار تھے، بلکہ ایک عظیم ڈرامانگار بھی تھے۔ میں نے اُن کا شاہکار ڈراما "غیبی تلوار" (آسمانی تلوار) بمبئی پارسی تھیٹریکل کمپنی کی جانب سے حیدرآباد کے اسٹیج پر پیش ہوتا ہوا دیکھا تھا۔ رستم جی نے اُسے پیش کر کے حیدرآباد میں ایک تہلکہ مچا دیا تھا۔ ایسے عظیم ڈرامانگار کی یاد میں سیماب اکاڈمی بمبئی کے اراکین نے جس اعلیٰ پیمانہ پر "یومِ سیماب" منا کر حقیقی خراجِ تحسین حاصل کیا؟ اُن کی خدمت میں میری دلی مبارکباد کا پیغام پہنچا دیجیے۔

ڈراما بھی اصنافِ ادب کے مجموعے کا نام ہے جسے ترقی یافتہ ممالک کی جامعات اوّلیت دیتی ہیں۔ لیکن ہندوستان میں اس کا آٹھواں پرچہ ہوتا ہے۔ تو ظاہر ہے کہ ہندوستان میں ڈراما کی کوئی اہمیت نہیں۔ یوں بھی اُردو تھیٹر یہاں مُتقا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ معزز مقرّرین نے "یادِ سیماب" میں علامہ سیماب جیسے عظیم ڈراما نگار کے کسی ایک ڈرامے کا بھی ذکر نہیں کیا' حالانکہ اُسی فنکار کا یاد دِنا کو جاری تھی جس نے آٹھ ڈرامے لکھے ہیں۔ جس نے آصف نظامی کی "دُر کی تلوار" کو "قینچی تلوار" سے کاٹا تھا۔ اُس کی کاٹ کو بھلا دینا ادبی غلطی ہے۔ اِس کی ذمّہ داری میرے نزدیک جناب تاجدار احتشام پر ہے کہ انہوں نے اپنے ذخیرے سے علامہ کا کوئی ڈراما کسی آتش نوا کو نہیں دکھایا۔

ڈاکٹر زرینہ ثانی' افتخار احمد فخر' جناب سیّد محمد زیدی اور جناب عبدالرحمٰن پرواز اصلاحی کے مضامین بیحد پسند آئے۔

۷۷۔۴۔۴ ۱۔ ملتانی پونڈ بیگم بازار حیدرآباد ۱۲ — **منجو قمر**

○ تازہ شاعر موصول ہوا۔ حضرت علامہ سیماب مرحوم سے متعلق مضامین نظروں سے گذرے۔ سبھی مضامین بہت خوب ہیں۔ خاص طور پر مُلّا صاحب کا خطبۂ صدارت بہت پسند آیا۔ "وحیِ منظوم" سے متعلق مولانا عبدالرحمٰن پرواز اصلاحی کا مقالہ کافی معلومات آفریں ہے۔ علامہ مرحوم نے کلامِ پاک کا منظوم ترجمہ کر کے دنیائے اسلام کے لئے ایک عجیب تحفہ پیش کیا ہے۔ کاش یہ ترجمہ مکمل طور سے شائع ہوسکے۔ جناب ڈاکٹر رفیق زکریا کا خطبۂ افتتاحیہ بھی خاصے کی چیز ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی یہ رائے

"میں سیماب کو ایک بڑا قومی شاعر سمجھتا ہوں اُن کا شعری سرمایہ ہندوستان کا قیمتی حصّہ ہے۔"

حقیقت پر مبنی ہے۔ حضرت سیماب کی عظیم شخصیت پر جتنا بھی لکھا جائے کم ہے مثنوی مولانا روم کا منظوم ترجمہ "الہامِ منظوم" کتنا برجستہ' برمحل اور شگفتہ ہے۔ تعریف مستغنی ہے۔

صفحہ ۱۰۵ پر — قادری لکھ دو یہ تاریخِ وفات

"نہ رہا شاعرِ اعظم سیماب"

۱۹۵۱

مندرجۂ بالا مصرعۂ تاریخ کے اعداد ۱۹۵۷ء ہوتے ہیں۔ سوائے اس کے کہ ہائے ہوّز کو حذف کر کے "نہ رہا" کو "نرہا" لکھا جائے۔ اور کوئی صورت صحیح اعداد برآمد کرنے کی نہیں ہے۔ غالباً قادری صاحب نے "نرہا" ہی لکھا ہوگا۔ علامہ مرحوم کی تاریخِ وفات پر سطور ہذا لکھتے وقت میں نے فکر کی تو مندرجۂ

۱؎ یہاں یہ کتابت کی افسوسناک غلطی ہی ہے۔ ادارہ

قطعہ تاریخ پر آنکر کے قطعہ تاریخ ارسال خدمت ہے۔

قطعۂ تاریخِ وفاتِ علامہ سیماب اکبرآبادی مرحوم

دریغا حضرتِ سیماب کوکب
ازیں دارِ فنا شد سوئے جنت
بجو زاتش بحرِ زخارِ سخن بود
بگفتم رحلتش "غرقابِ رحمت"

۱۹۵۱ء

منظومات میں صلاح الدین نیّر' غیاث الدین فریدی' محسن زیدی' نوبہار صابر اور یوسف نیّر کی غزلیں پسند آئیں۔ گوشۂ عصمت چغتائی سے متعلق جناب تابش انصاری کا طویل خط بڑا دلچسپ اور حقیقت افروز ہے۔ اُردو کے سلسلے میں آپکی مساعی ناقابلِ فراموش ہیں اور اُردو والوں کی سرد مہری ایک تلخ حقیقت!۔

صدر ضلع اُردو کمیٹی اور انجمن اسلامیہ۔ کرنج (ضلع جالون) — **شاہ کوکب القادری**

○ شاعر کا مشترکہ شمارہ "بیادِ علامہ سیماب اکبرآبادی" کی صورت میں نظرنواز ہوا یہ نمبر اپنے دامن میں علامہ مرحوم کی عظیم المرتبت اور ہمہ گیر شخصیت سے متعلق بہت کچھ مواد لئے ہوئے ہے پھر بھی بہت کچھ کہنے اور لکھنے کی گنجائش باقی ہے جو ایک معیاری اور اسیاد گار ضخیم "سیماب نمبر" کی شکل میں ہو جسے مرحوم کی شان کے شایان قرار دیا جاسکے۔ "سیماب اکاڈمی" کے قیام پر مبارکباد قبول کیجئے۔ خدا کرے جس مقصد کے لئے یہ قدم اُٹھایا گیا ہے وہ پایۂ تکمیل تک پہنچے۔ میرا تعاون آپ کے شاملِ حال رہے گا۔

کوٹھی نمبر ۱۱۵۔ سیکٹر ۷۔ ۱۵' چنڈی گڑھ — **رشی پٹیالوی**

○ "شاعر" کا تازہ شمارہ نظرنواز ہوا۔ حضرت سیماب مرحوم کی کچھ غزلیں اور اُن پر مضامین پڑھ کر جی خوش ہوا۔ جزاک اللہ۔

میری نظم "ایک مرحلہ" صفحہ ۲۰ کے تیسویں مصرعے میں ایک لفظ غلط چھپ گیا ہے۔ اصل مصرع یہ ہے۔ "یگانہ کون ہے محفل میں' کون بیگانہ۔؟"

بلاک نمبر ۵۔ چندولال بیلا کالونی حیدرآباد ۲ — **سعادت نظیر**

○ تازہ شاعر میں سیماب اکاڈمی کے اجلاس کی دلچسپ رپورٹ پڑھی۔ بے انتہا خوشی ہوئی خدا کرے یہی جوش و خروش ہمیشہ رہے۔ علامہ سیماب مرحوم کی ساری کتابیں یکے بعد دیگرے منظرِ عام پر آجائیں۔ کیا اچھا ہو کہ دوسروں کی منظوم کتابوں میں "سیماب کے نو رتن" کا بھی اضافہ ہو جائے۔ "سیماب کے نو رتن" کا کام بالکل نیا ہوگا جسے اپنی نوعیت کا ہونا ہوگا۔

معرفت عظیم' نکراشہ۔ مومن پورہ۔ ناگپور ۱۸ — **طرفہ قریشی**

○ سیماب اکاڈمی کے قیام نے دلی مسرت بخشی۔ اس عظیم الشان کارنامہ پر میری دلی مبارکباد قبول فرمایئے میرا خیال ہے کہ حضرت سیماب کی غزلیات کا ایک انتخاب شائع ہو سکے تو بہتر۔

علام باغ۔ مرزا پور (یو۔ پی) — **حسرت الاکرام**

دفتر

اعجاز صدیقی کو اُن کی خدمات پر مہاراشٹر اُردو اکاڈمی کا خصوصی ایوارڈ

بمبئی۔ ۵ اگست ۱۹۷۶ء کو مہاراشٹر اسٹیٹ اُردو اکاڈمی کی پہلی سالگرہ کی تقریب سچیوالیہ کے کانفرنس ہال میں شاندار پیمانہ پر منعقد ہوئی۔ اکاڈمی کے نائب صدر اور بورڈ کے چیئرمین عالیجناب ڈاکٹر رفیق زکریا وزیر حکومت مہاراشٹر نے صدارت فرمائی۔ اس تقریب میں مہاراشٹر لیجسلیٹو اسمبلی کے ڈپٹی اسپیکر جناب سید فاروق پاشا اور ریاستی کابینہ کے چند وزراء کے علاوہ بڑی تعداد میں ادیبوں، شاعروں، صحافیوں، کالجوں کے پرنسپلوں، استادوں اور اُردو دوستوں نے شرکت کی۔

اکاڈمی کے ممبر سکریٹری جناب خواجہ عبدالغفور نے اختصار کے ساتھ اکاڈمی کی کارگزاریوں پر روشنی ڈالی۔ اس موقع پر مہاراشٹر اسٹیٹ اُردو اکاڈمی کا ایک سالہ [illegible] خوبصورت کتابچہ تقسیم کیا گیا۔ جناب ڈاکٹر رفیق زکریا نے اپنا مطبوعہ خطبۂ صدارت نہ پڑھتے ہوئے زبانی چند اہم امور کی وضاحت فرمائی اور اکاڈمی کی مجلس انتظامیہ کے تین حالیہ فیصلوں کا اعلان فرمایا۔ ایک یہ کہ حکومت مہاراشٹر نے اپنے سرکاری پریس کا اُردو حصہ مع مشینوں اور ٹائپ کے اُردو اکاڈمی کو دینے کا ارادہ ظاہر کیا ہے تاکہ اُردو کُتب و رسائل اور نصابی کتابوں کی طباعت معیاری اور دیدہ زیب ہو سکے۔ دوسرا یہ کہ اُردو ڈراما کو زندہ کرنے کے لئے، ایک بہترین تازہ اُردو ڈرامے کو ہر سال پانچ ہزار روپے کا انعام دیا جائے گا۔ موصوف نے نہایت مسرت کے ساتھ تیسرا اعلان یہ فرمایا کہ مہاراشٹر اُردو اکاڈمی نے اعجاز صدیقی (مدیر شاعر بمبئی) کو اُن کی ۴۵ سالہ طویل ادبی و صحافتی خدمات کے اعتراف میں پانچ ہزار روپے کا ایک خصوصی انعام دینا منظور کیا ہے۔ اس اعلان کا پُر زور تالیوں سے خیر مقدم کیا گیا۔

تقریب کے اختتام پر تمام شرکاء کو اکاڈمی کی طرف سے عصرانہ دیا گیا۔ — زاہد ملک

غالب انسٹی ٹیوٹ دہلی کی جانب سے ایوارڈ کا اعلان

نئی دہلی ۱۲ جولائی (سماچار) غالب انسٹی ٹیوٹ کی انعامی کمیٹی نے ۱۹۷۵ء کے لئے مندرجۂ ذیل ادیبوں کو انعام دینے کا اعلان کیا ہے۔

قاضی عبدالودود (پٹنہ) فخرالدین علی احمد غالب ایوارڈ برائے تحقیق، معین احسن جذبی (علیگڑھ) [illegible] غالب ایوارڈ برائے شاعری، کرشن چندر (بمبئی) [illegible] غالب ایوارڈ برائے نثر، ڈاکٹر محمد حسن (دہلی) ہم سب غالب ایوارڈ برائے ڈراما۔

سکریٹریٹ کے امتحانات میں اُردو

اُتر پردیش سرکار نے [illegible] سطح پر پبلک سروس کمیشن کے ذریعہ منعقد ہونے والے سکریٹریٹ کے [illegible] اسسٹنٹ اور [illegible] اسسٹنٹ کے امتحانات میں دوسرے مضامین کے ساتھ اُردو کو بھی ایک اختیاری مضمون کی حیثیت سے لینے کا اختیار دیا ہے۔ آزادی سے پہلے اور آزادی کے بعد یہاں سکریٹریٹ کے امتحانات میں دوسرے اختیاری مضامین کی فہرست میں اُردو کبھی شامل نہیں کی گئی تھی۔

شاعر، بمبئی

کرشن چندر پر دل کا تیسرا شدید دورہ

بمبئی۔ ۲۰ جولائی کو کرشن چندر پر دل کا انتہائی سخت دورہ پڑا اور انھیں فوری طور پر بامبے ہاسپٹل کے امراض قلب کے خصوصی وارڈ میں داخل کیا گیا جہاں سات دن تک اُن کی زندگی خطرہ میں رہی۔ اب بھی مشینوں کے ذریعہ اُن کے دل کی حرکت کو قائم رکھا جا رہا ہے۔ ہندوستان کے اس عظیم ادیب کی زندگی کو بچانے کے لئے بمبئی کے دو مشہور و ممتاز ماہر امراض قلب ڈاکٹر واتے اور ڈاکٹر گوکھلے بہت توجہ دے رہے ہیں۔ اُن کے لئے امریکہ سے آلۂ قلب منگایا گیا ہے جو آپریشن کر کے دل کے قریب لگایا جائے گا۔

وفیات

گزشتہ چند مہینوں میں اُردو کی کئی نامور اور جلیل القدر شخصیتیں ہم سے جدا ہو گئیں۔ افسوس کہ اُردو کے ایک اور بزرگ شاعر شیام موہن لال جگر بریلوی کا ۸۶ سال کی عمر میں ۳ مارچ کو بوقت ۱۱ بجے شب بریلی میں انتقال ہو گیا۔ جگر بریلوی کی شخصیت علم و فن کا اعلیٰ نمونہ تھی۔ وہ مشرقی و مغربی علوم سے آشنا تھے اور تنقیدی شعور بھی رکھتے تھے۔ قدیم ہوتے ہوئے بھی وہ جدید تھے۔ انھوں نے کئی قابل ذکر کتابیں اپنی یادگار سے چھوڑی ہیں۔ [illegible] زندگی بھر شعر و ادب کی خدمات انجام دیتے رہے۔

عربی اور فارسی زبانوں کے ماہر ڈاکٹر محمد زبیر صدیقی کا بھی ۱۰ مارچ کو ۷۰ سال کی عمر میں انتقال ہو گیا۔ ڈاکٹر زبیر بین الاقوامی شہرت کے مالک تھے۔ وہ ۳۵ سال تک کلکتہ یونیورسٹی میں شعبۂ عربی و فارسی کے سربراہ رہے۔ انھوں نے علم حدیث پر ہندوستانی علماء کی تصانیف پر زبردست کام کیا۔ انھوں نے متعدد مقالے، مضامین اور کتابیں لکھیں۔ ممالک غیر کے کئی اسلامی اجتماعات میں ہندوستان کی نمائندگی کی۔ اُن کی علمی خدمات کے اعتراف میں انھیں صدارتی ایوارڈ ملا تھا۔

[illegible] ۱۹۷۶ء کو اُردو کے مشہور ادیب سید ریاض الدین رفعت نے ساٹھ سال کی عمر میں داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ مرحوم کئی سال سے فالج کی وجہ سے زیر علاج تھے۔ [illegible] حیثیت سے نام پایا۔ وہ تقریباً ۲۰ کتابوں کے مصنف و مرتب تھے۔ [illegible] کے [illegible] تھے لیکن کئی سال تک وہ [illegible] بنگلور کے کالجوں میں [illegible] پرنسپل [illegible] بہت پڑھے لکھے، شریف النفس، خلیق اور ملنسار انسان تھے۔

اگر کنبہ چھوٹا ہو تو والدین ہر بچے پر زیادہ توجہ دے سکتے ہیں اور اسے زندگی کی زیادہ سہولتیں مہیا کر سکتے ہیں۔ اس سے ملک کو بھی بحیثیت مجموعی اپنے وسائل کے بہتر استعمال کا موقع ملتا ہے۔

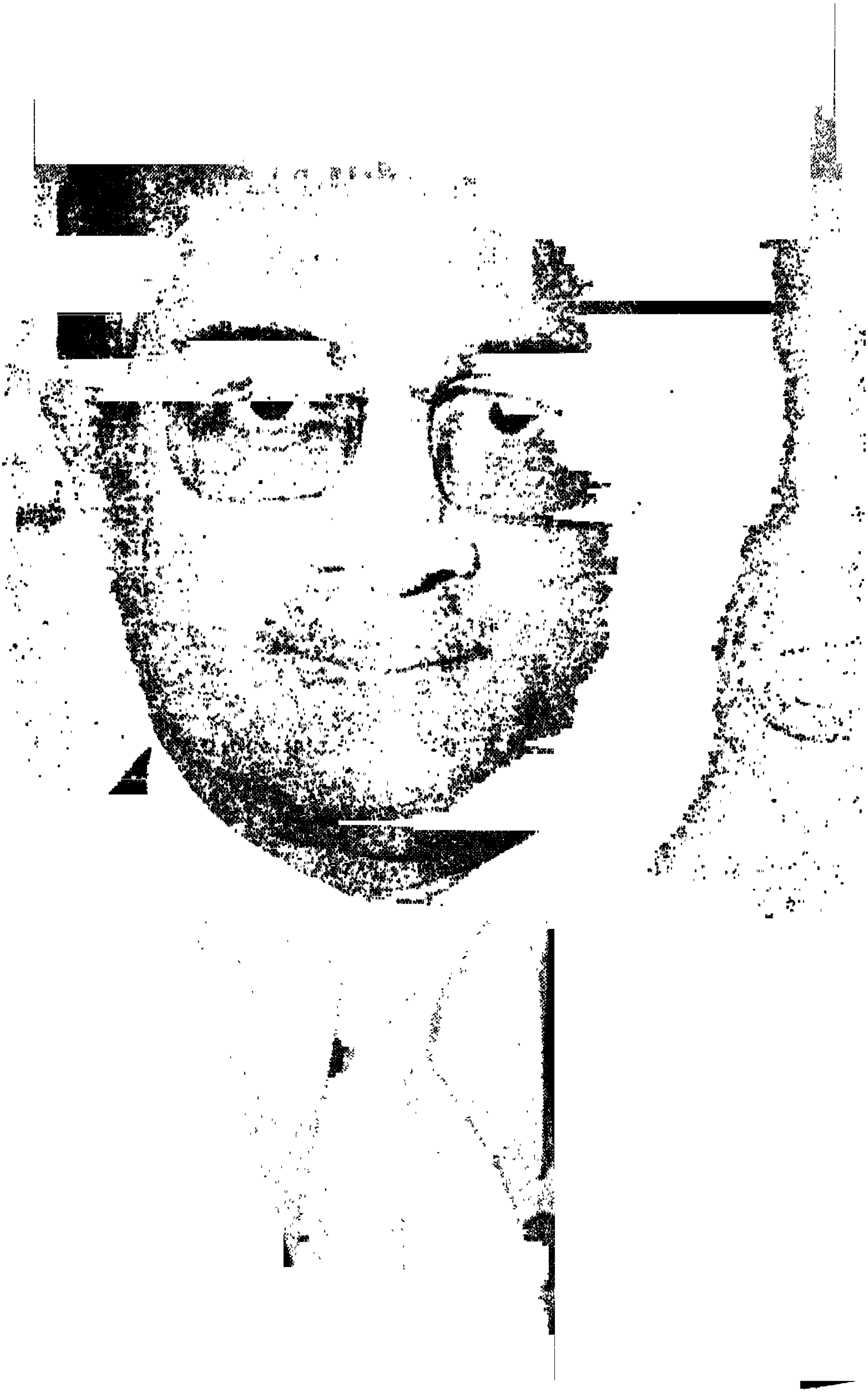
فیملی پلاننگ ہماری قومی ترقی کے پروگرام کا ایک لازمی جزو ہے اور ہم نے اسے عملی جامہ پہنانے کے لئے اپنے تمام ذرائع کو بروئے کار لانے کا تہیہ کر رکھا ہے۔

اندرا گاندھی



davp 75/596

پرنٹر پبلشر مالک اعجاز صدیقی نے یونیورسل فائن آرٹس ایجوکیشن پریس ۱۹۰ محمد علی اسٹریٹ ٹھاکر دوار بمبئی ۲ میں چھپوا کر دفتر سے شائع کیا۔
شاعر بمبئی



جاری شدہ سنہ ۱۹۳۰ء

بانی علامہ سیماب اکبرآبادی (مرحوم)

اردو کا سینتالیس سالہ علمی ادبی اور تہذیبی ماہنامہ

شاعر بمبئی

مدیرِ اعلیٰ

اعجاز صدیقی

مدیرِ معاون -

یونس اگاسکر

جلد - ۴۷

شمارہ ۹،۸

۱۹۷۶ء

ادارۂ تحریر و مشاورت

کرشن چندر

ڈاکٹر محمد حسن

ڈاکٹر ظ۔ انصاری

آغا رشید مرزا

فون:- ۳۵۹۹۰۴

مہتمم:

ناظر نعمان صدیقی

بدلِ اشتراک

زرِ سالانہ ——— ۱۶ ——— روپے

معاونین سے ——— ۵۰ ——— روپے

تاحیات خریداری ——— ۲۵۰ ——— روپے

ممالکِ غیر سے ——— ۳۰ ——— شلنگ

ترسیلِ زر کا پتہ:

ماہنامہ شاعر قصر الادب - بمبئی ۴۰۰۰۰۸

خط و کتابت کا پتہ:

ماہنامہ شاعر مکتبہ قصر الادب

پوسٹ بکس نمبر ۲۵۲۶ بمبئی ۴۰۰۰۰۸

"SHAIR", BOMBAY.

[illegible] محنت سے آگے بڑھنے لگے ہیں

1975-76

نوجوانوں کی بہبود کے نئے اقدامات

- کنٹرول نرخوں پر ضروری اشیاء 90 ہزار 15 ہوسٹلوں میں بہم پہونچائی جا رہی ہیں جس سے 9,56,000 سے زیادہ طلباء مستفید ہو رہے ہیں۔

- چھپائی کے سفید کاغذ کی رعایتی داموں پر فراہمی کے سبب نصابی کتابوں اور کاپیوں کے نرخوں میں کمی ہوئی ہے۔ اسکولوں اور کالجوں میں کتابوں کے 88,600 بنک کام کر رہے ہیں۔

- 216 صنعتوں اور 103 ٹریڈوں کو اپرنٹس شپ اسکیم کے دائرۂ کار میں لایا جا چکا ہے۔

- اپرنٹس بھرتی کرنے کی اسکیموں کے تحت 18,800 سیٹوں کا اضافہ کیا گیا جس سے ان کی کل تعداد 1,33,900 ہوگی۔
  21,900 سیٹیں پُر کی گئی ہیں جن میں سے [illegible],000 سیٹیں (20 فیصد سے زیادہ) شیڈولڈ کاسٹ، شیڈولڈ قبیلوں اور دیگر پسماندہ طبقوں کے افراد کو دی گئی ہیں۔

davp. 76/81

ترتیب

اگست ۷۶

تصویر بشکریہ: حسن الدین احمد

شمارہ نمبر ۹ ستمبر ۷۶ کی فہرست صفحہ ۵۰ کے بعد دیکھئے

ریاستی اُردو اکادمیوں کے سربراہ ایک جگہ جمع ہو رہے ہیں

اُتر پردیش اُردو اکادمی کے ترجمان نے ماہِ ستمبر میں یہ اطلاع شائع ہوئی ہے کہ آئندہ ماہِ اکتوبر ۷۶ء کے اوائل میں مُلک کی دیگر ریاستوں میں قائم شدہ اُردو اکادمیوں کی ایک مشترکہ مُشاورتی کانفرنس اُتر پردیش اُردو اکادمی کے زیرِ اہتمام لکھنؤ میں منعقد ہوگی اِس کانفرنس میں مرکزی ترقی اُردو بورڈ کے ذمہ داروں کو بھی مدعو کیا گیا ہے۔

اِس کُل ہند کانفرنس میں ریاستی اُردو اکادمیاں اپنے لائحۂ عمل کے تعلق سے جو بھی اُمور زیرِ بحث لائیں، اُن میں اُردو کے خالص علمی و ادبی (معیاری) ماہناموں کی مستقل سالانہ مالی امداد کی بات قطعی طور پر طے اور منظور ہو جانی چاہیے۔

اِس مقصد کے لئے چند ادبی ماہناموں کی طرف سے چار ریاستی اُردو اکادمیوں کو خطوط کے ساتھ وہ تراشے بھیج دئے گئے ہیں جو حال ہی میں اِن رسائل میں لکھے جا چکے ہیں اور جن میں علمی و ادبی ماہناموں کی اہمیت اور اُن کی مشکلات کو واضح کیا گیا ہے۔ لکھنؤ میں جمع ہونے والے ریاستی اُردو اکادمیوں کے سربراہوں سے درخواست ہے کہ وہ اِس اہم مسئلہ پر بھرپور توجہ دیں اور پوری پوری حمایت فرمائیں۔

ایجنڈے میں اُردو کے خالص علمی و ادبی ماہناموں کے مسئلہ کو سرِ فہرست رکھا جائے

اُردو کے سب چھوٹے بڑے ادیب اور شاعر خط لکھیں

اُردو کے تمام چھوٹے بڑے، نئے پُرانے ادیب اور شاعر ملک کی چاروں بڑی ریاستی اُردو اکادمیوں کو فوراً ایک ایک خط لکھ دیں اور پُر زور درخواست کریں کہ اُردو کے خالص علمی و ادبی ماہناموں کی مستقل سالانہ امداد و اعانت فرمائی جائے۔ ہم ادیبوں اور شاعروں کی زندگیاں اُردو کے اعلیٰ معیاری رسائل سے وابستہ ہیں۔ یہ رسائل نہ رہے تو اعلیٰ ادب اور شاعری کی تخلیق و ترسیل ختم ہو جائے گی۔

پتے: ــــ جن پر خط لکھے جائیں۔

۱۔ صدر، اتر پردیش اُردو اکادمی۔ ۱۴/۲ آر۔ کے ٹنڈن روڈ۔ لکھنؤ
۲۔ صدر، بہار اُردو اکادمی۔ پٹنہ ۴
۳۔ صدر، مہاراشٹر اُردو اکادمی۔ جی اے ڈی۔ سیکریٹریٹ بمبئی ۳۲
۴۔ صدر، آندھرا پردیش اُردو اکادمی ۱/۱۲-۹-۵۔ سیف آباد۔ حیدرآباد ۴
۵۔ چیرمین، ترقی اُردو بورڈ۔ ویسٹ بلاک نمبر ۸۔ آر۔ کے پورم۔ دہلی ۲۲

چاروں اکادمیوں اور ترقی اُردو بورڈ کے دفتر میں سیکڑوں خطوط کا انبار لگ جانا چاہیے۔ یہ وقت تمام ادیبوں اور شاعروں کے احتجاج اور توجہ کا ہے۔

اعجاز صدیقی

صابر ابوہری

میرا وطن

(ماخوذ از ٹیگور)

جہاں سر اُٹھا کر چلیں آدمی
نہ آقا ہو کوئی نہ بندہ کوئی،
جہاں خوف سے ذہن آزاد ہوں
جہاں لوگ خوشحال ہوں شاد ہوں
جہاں علم و دانش کے دریا بہیں،
جہاں لوگ آپس میں مل کر رہیں
جہاں دل صداقت سے معمور ہوں
چراغِ محبت سے پُر نور ہوں
جہاں بول بالا ہو انصاف کا
نہ چھوٹا ہو کوئی، نہ کوئی بڑا
رہے پرچمِ حق ہمیشہ بلند،
نہ پہونچے کسی کو کسی سے گزند
خودی کا ہو جوہر ہر اک فرد میں
شہادت کا جذبہ ہو ہر مرد میں
جہاں لوگ عالم ہوں فنکار ہوں
شرابِ اخوت سے سرشار ہوں
جہاں زمیں کی سب کو پہچان ہو
وطن دوستی سب کا ایمان ہو
جنوں ہو خرد کا جہاں رہنما
مجھے بخش وہ سرزمیں اے خدا
جہاں حق پرستی ہو سب کا چلن،
جہاں نام کو بھی نہ ہو مکر و فن
جہاں تیری رحمت ہو سایہ فگن
وہ میرا وطن ہو، وہ میرا وطن

○ سینئر سپرنٹنڈنٹ۔ ٹیلیگراف۔ بے پور روڈ شاعو بمبئی۔

مصطفےٰ مومن

جمہور کی تلوار

رات رخصت ہوئی، پھیلا ہے اُجالا ہر سو
زندگی بخش شعاعوں کی پرستار ہے آج
خوابِ غفلت سے ملی دیس کی دھرتی کو نجات
ہند بیدار ہے، بیدار ہے بیدار ہے آج
خس و خشاک کے انبار ہوئے خاکستر
شعلہ زن چار طرف عظمتِ کردار ہے آج
ہراں وقت ہے آمادۂ شفقت کیا کیا
شوخ لمحات کی بانہوں میں بڑا پیار ہے آج
فن کے چہرے پہ ہے اک اور دمک اور چمک
فکر کے ساز میں اک اور ہی جھنکار ہے آج
بیکسی ڈالتی ہے اوجِ ہمالہ پہ کمند،
بے زری ماہ و ثریا کی خریدار ہے آج
اب یہ ممکن نہیں ڈالے کوئی ترچھی نظریں
دستِ جمہور میں اک اور ہی تلوار ہے آج
جس طرف [illegible] پرچم ہے صداقت کا بلند
جس طرف جائیے گونجی ہوئی للکار ہے آج
اور ہی رنگ [illegible]بہار کا ترنگے کی قسم!
اِک نئی صبح اُبھرتی ہے اُجالے کی قسم

○ مورٹ ریڈینس ہومیو کلینک ماسب پورہ جبل روڈ۔ مصنہاد۔

گوشۂ حسن الدین احمد



حسن الدین احمد — لفظوں کا آدمی

مجتبیٰ حسین
۸۰/۲۹ مالویہ نگر۔ نئی دہلی ۱۷

نومبر ۱۹۷۲ء میں جب میں ملازمت کے سلسلے میں دہلی آیا تو ایک دن ایک دوست نے آکر اطلاع دی کہ حسن الدین احمد صاحب حکومتِ ہند کے اسپیشل آفیسر (وقف) بن کر حیدرآباد سے دہلی آگئے ہیں اور مجھ سے ملنا چاہتے ہیں۔ میں نے سوچا کہ حیدرآباد کے اپنے بیس سالہ قیام کے دوران میں کبھی ان سے ملاقات نہیں ہوئی اب آخر انہیں اس دیارِ غیر میں مجھ سے ملنے کی ضرورت کیونکر پیش آگئی۔ بہت غور کیا تو ایک ہی وجہ سمجھ میں آئی کہ ایک حیدرآبادی جب دہلی یا شمال کے کسی شہر میں پہنچتا ہے تو اندر ہی اندر بڑا بے چین سا رہتا ہے کیونکہ وہ پوری بے تکلفی کے ساتھ لوگوں کے سامنے نہ تو "جی ہو" "جو ہو" کہہ سکتا ہے اور نہ ہی "میں آتوں" "میں جاتوں" اور "میں بولتوں" کہہ سکتا ہے۔ اپنی مجبوری کی وجہ سے حیدرآبادیوں کی رگوں میں بڑا تناؤ سا چھایا رہتا ہے۔ طبیعت بڑی منغض اور بوجھل سی رہتی ہے۔ دنیا بڑی فضول سی شے نظر آنے لگتی ہے۔ مجھے دہلی پہنچے ہوئے آٹھ دن ہوئے تھے اور میری ذات میں بہت سے "جی ہو" جمع ہو گئے تھے اور حسن الدین احمد صاحب کی ذات میں تو مجھ سے بھی زیادہ "جی ہو" جمع ہو گئے تھے کیونکہ وہ مجھ سے دو دن پہلے دہلی آئے تھے۔ تبھی تو انہوں نے مجھ سے ملنے میں پہل کی تھی۔ میں نے اپنے دوست سے کہا "جب وہ مجھ سے ملنا ہی چاہتے ہیں تو ان سے مل لیتے ہیں مگر یار دہلی بڑے فاصلوں کا شہر ہے۔ یہاں آدمی کا ایک دوسرے سے ملنا تو درکنار حیدرآبادیوں کا ایک دوسرے سے ملنا دشوار ہے۔"

وہ بولا "تم نہ گھبراؤ۔ وہ تم سے بہت قریب ہیں۔ تم ابھی یہاں سے فون ملاؤ۔ وہ تم سے بات کریں گے۔ اس کے بعد تم فون کا ریسیور نیچے رکھ دو اور دل لگا کر آواز میں بات کا سلسلہ جاری رکھو۔ تم یقین کرو کہ اس کے بعد ٹیلیفون کی مدد کے بغیر ان کی بات سن سکو گے۔" بعد میں یہ بات درست ثابت ہوئی کیونکہ ہم دونوں کے دفتر ایک ہی بلڈنگ میں واقع تھے۔ میں ان سے ملنے گیا تو بڑی گرمجوشی اور تپاک سے ملے۔ یوں لگا جیسے ان کے چہرے پر جگہ جگہ "خوش آمدید" کے بینر لگ گئے ہیں۔ اپنی کرسی سے فوراً اٹھ کھڑے ہوئے۔ بڑا طاقتور مصافحہ کیا اور بڑی گرمجوشی کے ساتھ بیٹھ گئے۔ میں دل ہی دل میں ان کے اس گرمجوشانہ ردِ عمل سے خوش ہوتا رہا۔ مگر بعد میں پتہ چلا کہ وہ تو ہر کس و ناکس کا خیر مقدم اسی طرح کرتے ہیں۔ چنانچہ تھوڑی ہی دیر بعد وزارتِ قانون کا ایک چپراسی ان کے کمرہ میں داخل ہوا اور وہ اس کے لئے بھی "خوش آمدید" کا بینر بن گئے۔

حیدرآباد میں انہیں چیدہ چیدہ طور پر دیکھا تھا۔ کبھی یہاں کبھی وہاں۔ انہیں تفصیل سے دیکھنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ اب جو میں نے تفصیل سے انہیں دیکھنے کی کوشش کی تو ان کی آنکھوں کے اوپر پھیلی ہوئی تفصیلی بھنوؤں پر ہی نظر جم کر رہ گئی۔ ایسی تفصیلی بھنویں میں نے بہت کم دیکھی ہیں۔ ایسی گھنی اور گنجان بھنویں کہ لگتا ہے بھنویں نہیں مونچھیں ہیں۔ پھر لطف کی بات یہ کہ حسن الدین احمد صاحب مونچھوں کے معاملے میں تفصیل کے قائل نہیں ہیں کیونکہ انہوں نے مختصر سی مونچھیں رکھی ہیں جو ہٹلر کی مونچھوں سے بس ذرا سی بڑی ہوں گی۔ بہت گورا چٹا رنگ۔ عینک کے شیشوں کے پیچھے سے جھانکتی چھوٹی چھوٹی آنکھیں [illegible] عینک کا فریم [illegible] ناک [illegible] عینک کا فریم رکھنے کے لئے بہت [illegible] ہو سکتا ہے کہ وہ بینائی کی کمزوری کی بنا پر عینک لگاتے ہوں مگر قدرت نے انہیں ایسی ناک بھی فراہم کی ہے جس پر عینک کا فریم بڑا بھلا لگتا ہے۔

ان سے میری یہ پہلی ملاقات تھی۔ انہوں نے بڑی دیر تک رسمی باتیں کیں۔ پھر جب میں جانے لگا تو وہ یک لخت سنجیدہ ہو گئے اور کہنے لگے "کل سے دوپہر کا کھانا آپ میرے ہی ساتھ کھایا کریں گے۔"

میں نے کہا" میں دوپہر کے کھانے میں یقین نہیں رکھتا اسلئے دوپہر کا کھانا عموماً رات کو کھاتا ہوں"۔ بولے" کھانے میں تو میں بھی یقین نہیں رکھتا البتہ اس بات میں یقین رکھتا ہوں کہ اسی بہانے دو حیدرآبادیوں کی روزانہ ملاقات ہو سکتی ہے"۔

اس کے بعد یہ معمول سا بن گیا کہ دوپہر کو میں ہمیشہ دیر سے اُن کے پاس پہنچتا۔ ان کا چپراسی میز پر کھانا سجا دینے کے بعد میرا انتظار کرنے لگتا۔ اور حسن الدین احمد صاحب اپنے کام میں مصروف رہتے۔ سردی کے دن تھے اس لئے ہر روز یہ معمول بھی بن گیا تھا کہ کھانا دوبار گرم ہوتا تھا۔ ایک میرے آنے سے پہلے دوسرے میرے آنے کے بعد۔ اُن دنوں حسن الدین احمد صاحب اکیلے ہی دہلی آئے تھے اور اوکھلا میں اپنے کسی دوست کے یہاں عارضی طور پر مقیم تھے۔ اسی لئے دوپہر کا کھانا وہ دفتر کی کینٹین سے منگوایا کرتے تھے۔ یہ کھانا جس قسم کا ہوتا تھا اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ کھانا شروع ہوتے ہی ہم ایک دوسرے کی پلیٹوں میں زیادہ سے زیادہ ٹکڑے اور بوٹیاں ڈالنے کی کوشش کرتے تھے اور اس عمل کو حیدرآبادی تہذیب و شائستگی پر محمول کرکے مطمئن ہو جایا کرتے تھے۔ حسن الدین احمد صاحب کے گھرانے کے کھانے حیدرآباد میں یوں بھی بڑی شہرت رکھتے ہیں مگر یہاں انہیں ایسے ٹکڑے اور بوٹیاں کھاتے دیکھ کر نہ صرف ان پر ترس آتا تھا بلکہ کبھی کبھار اپنے آپ پر بھی ترس آتا تھا۔ وہ کھانا کھاتے تو یوں لگتا جیسے فرائض منصبی سے عہدہ برآ ہو رہے ہیں۔ اس کھانے سے اپنے آپ کو حتی الامکان دور رکھنے کا واحد طریقہ یہ تھا کہ ہم حیدرآبادی تہذیب کی آڑ لیکر ایک دوسرے کی پلیٹوں میں کھانے کی اشیاء ڈالتے جائیں۔ آخر زمانہ میں یہ مسابقت اس حد تک بڑھ گئی تھی کہ ایک دن میں نے سارے ٹکڑے اور سارے بوٹیاں انکی پلیٹ میں ڈالدیئے۔

اُنہوں نے حیرت سے میری طرف دیکھ کر پوچھا" آپ کچھ نہیں کھائینگے؟"

میں نے کہا" بھوک نہیں ہے۔ کل ہی دوپہر میں تو آپ کے ساتھ کھانا کھایا تھا۔ بات در اصل یہ ہے کہ کل کینٹین سے کچھ ایسے ٹکڑے آئے تھے کہ لگتا ہے کہ یہ اگلے آٹھ دس دنوں تک ہضم نہیں ہوں گے۔ آج سے آپ کھاتے جایئے میں صرف آپکو دیکھتا رہوں گا"۔

وہ میری بات کو تاڑ گئے زور سے ہنس کر بولے" سچ تو یہ ہے کہ آپکو دوپہر میں اپنے ساتھ کھانا کھانے کی دعوت دے کر میں خود پریشان ہو گیا ہوں۔ کئی دنوں سے عجیب کشمکش میں مبتلا ہوں۔ نہ یہ کھانا مجھ سے

شاعر بھی

کھایا جاتا ہے اور نہ ہی آپ سے۔ مگر شرافت بھی تو کوئی چیز ہے۔ یہ تو نہیں ہو سکتا تھا کہ میں آپکو کھانے کیلئے منع کرتا۔ مسلمان جب ایک بات کہہ دیتا ہے تو اس پر عمل بھی کرتا ہے چاہے اس کے لئے اُسے کتنی ہی بھاری قیمت کیوں نہ ادا کرنی پڑے"۔

میں نے کہا" یہ اچھا ہوا کہ آج کھانے کے مسئلہ پر آپ سے کھل کر بات ہو گئی۔ میں جانتا ہوں کہ ہر روز دوپہر کے کھانے کی قیمت آپ ہی ادا کرتے ہیں لیکن میں آپکو یہ بتلانا چاہتا ہوں کہ میں بھی اس کھانے کی قیمت ادا کرتا ہوں۔ یہ اور بات ہے کہ میں یہ قیمت ڈاکٹر کو ادا کر رہا ہوں"۔

ہنس کر بولے" آپ تو پھر بھی نفع میں ہیں کیونکہ میں تو اس کھانے کی قیمت دو دفعہ ادا کرتا ہوں۔ پہلی بار کینٹین کو اور دوسری بار ڈاکٹر کو"۔ یہ کہکر اُنہوں نے ٹکڑوں سے بھری ہوئی پلیٹ میز پر رکھدی اور بولے" یہ اچھا ہوا کہ آج آپ سے پوری بے تکلفی کے ساتھ کھانے کے مسئلہ پر بحث کرلی ورنہ میں حیدرآبادی شرافت کے تحت چپ چاپ ہی کھانا کھاتا رہتا اور ایک سچے مسلمان کی طرح ڈاکٹر کو بل ادا کرتا رہتا"۔

اس کے بعد ہر روز دوپہر میں ایکساتھ چائے پیتے اور چائے پیتے پیتے دُنیا بھر کی باتیں کرلیتے۔ اُن دنوں انکی مشہور و معروف کتاب "اُردو الفاظ شماری" طباعت کے آخری مراحل سے گزر رہی تھی۔ شاید ہی کوئی دن ایسا گزرا ہو جب اُنہوں نے "الفاظ شماری" کی بات نہ کی ہو۔ "الفاظ شماری" جیسے دقت طلب اور خشک کام میں بھلا کیں کس شمار میں آتا تھا لیکن وہ سر تھوڑی دیر بعد موضوع کو الفاظ شماری کی طرف موڑ کر لے آتے تھے۔ کہتے ہیں کہ اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے یہ کوئی بتلا نہیں سکتا لیکن ان دنوں حسن الدین صاحب کی بات چیت کا اونٹ ہمیشہ ہی الفاظ شماری کی کروٹ میں بیٹھتا تھا۔ یہ بات انکی فطرت کے اس پہلو کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ جب وہ ایک کام میں لگ جاتے ہیں تو مسلسل اسی کی دھن میں لگے رہتے ہیں اور جب تک اُسے پایۂ تکمیل کو نہیں پہونچا لیتے تب تک اُنہیں قرار نہیں آتا۔ اپنے کام میں اس بری طرح غرق ہونے والے انسان میں نے بہت کم دیکھے ہیں۔ میں اُن سے اُس وقت ملا تھا جب ان پر الفاظ شماری کا بخار چڑھا ہوا تھا۔ بعد میں یہ بخار قابو میں آیا تو وہ "امیر خسرو" میں مبتلا ہو گئے۔ "امیر خسرو" میں مبتلا ہونے کی اطلاع مجھے ایک دن اس طرح ملی کہ ایک دن پہلے میں ان سے ملا تھا تو وہ بدستور "الفاظ شماری" کی بات کئے جا رہے تھے۔ دوسرے

دن میں اُن سے ملنا گیا اور باتوں باتوں میں کسی معروف ادیب کی رائے کا حوالہ میں نے دیا تو فوراً میری بات کو کاٹ کر بولے "یہی بات امیر خسرو نے بھی کہی ہے"۔

میں نے کہا "کہی ہوگی اس سے کیا فرق پڑتا ہے"۔ کہنے لگے "جی ہو! مگر امیر خسرو کی کہی ہوئی بات مستند ہے۔ امیر خسرو کی تو بات ہی نرالی ہے۔ اُن سے بڑا عالم، اُن سے بڑا شاعر، اُن سے بڑا صوفی کوئی ہو تو مجھے بتایئے۔ آپ کو شاید پتا نہیں کہ دنیاداری کے معاملے میں بھی امیر خسرو اتنے ہی کامیاب تھے۔ ایسے متوازن آدمی جن کی ذات میں دنیا اور عقبیٰ دونوں ہم آہنگ ہوں، بہت کم پیدا ہوتے ہیں"۔ یہ کہکر انہوں نے امیر خسرو کے دوہے سنانے شروع کر دیئے۔ پھر ان کی شاعری کی نزاکتوں اور پہلوداری سے مجھے واقف کرانے لگے۔ کوئی ڈیڑھ دو گھنٹے تک وہ امیر خسرو کے بارے ہی میں بات کرتے رہے۔ بعد میں جب میں اپنے ایک دوست کے ہمراہ اُن کے گھر سے باہر نکلا تو میں نے اُس سے پوچھا "بھئی آج حسن الدین احمد صاحب کو یہ کیا ہوگیا ـــــ ؟ کل تک اچھے بھلے "الفاظ شماری" پر اظہارِ خیال کر رہے تھے، آج یہ امیر خسرو کے پیچھے کیوں پڑ گئے ؟"

میرے دوست نے کہا "یار تم بھی بڑے غافل آدمی ہو۔ کیا تمہیں پتا نہیں کہ وہ امیر خسرو کی سات سو سالہ قومی تقاریب کی مرکزی کمیٹی کے جنرل سکریٹری بنا دیئے گئے ہیں۔ اب یہ تو ہونا ہی تھا"۔

میں نے اُن سے اپنی ملاقات کو دو ادوار میں تقسیم کر رکھا ہے۔ ایک "دورِ خسروی" اور دوسرا "دورِ الفاظ شماری"۔ موخر الذکر دور میں جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں، وہ الفاظ شماری کے مختلف اسرار و رموز سے مجھے واقف کرواتے تھے۔ مجھ پر ہی کیا موقوف ہے، وہ ہر ایک کو الفاظ شماری کے دام میں گرفتار کرنا چاہتے تھے۔ جب کبھی ملاقات ہوتی الفاظ شماری کے فوائد بیان کرنے لگ جاتے (حالانکہ ہم لوگ الفاظ شماری کے نقصانات سے بھی واقف تھے)۔ کہتے کہ جب تک کسی زبان کی سائنسی ڈھنگ سے الفاظ شماری نہ کی جائے وہ پروان نہیں چڑھ سکتی۔ الفاظ شماری کے سارے سسٹم سے ایک دن مجھے تفصیلی طور پر واقف کر دیا تو میں نے کہا "حسن الدین صاحب! ایک اعتبار سے "الفاظ شماری" اصل میں لفظوں کی مردم شماری ہے۔ یعنی ایک ایک لفظ کو تسبیح گنتے چلے جایئے"۔

میری بات سن کر انہوں نے مجھے یوں گھور کر دیکھا جیسے کہنا چاہتے ہوں کہ کس احمق سے پالا پڑا ہے کہ اتنے اہم کام کو مردم شماری سے تشبیہ دے رہا ہے۔ شاعر بھی

ملا رہا ہے"۔

میں اور میرے دوست قمر احسن کے دماغوں پر "الفاظ شماری" کچھ اس طرح چھائی ہوئی تھی کہ لگتا تھا ہم بھی ایک دن صرف لفظ ہی لفظ بن کر رہ جائیں گے۔ اُن ہی دنوں میرے مزاحیہ مضامین کا تیسرا مجموعہ "قصہ مختصر" چھپ کر آیا تو میں نے اس کا نسخہ حسن الدین صاحب کو دیا۔ سوچا تھا کہ دوسرے دن وہ ملیں گے تو میری مزاح نگاری کے بارے میں ضرور اظہار خیال کریں گے۔ مگر دوسرے دن ملے تو چھوٹتے ہی کہنے لگے "میں نے آپکی کتاب کل رات پڑھی۔ یہ کیا بات ہے کہ آپ اپنی تحریر میں "تو" اور "البتہ" کا زیادہ استعمال کرتے ہیں"۔ یہ جملہ سن کر تو مجھ پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ البتہ میں نے سنبھل کر کہا "یہ بتایئے کہ آپ میری کتاب پڑھتے رہے یا صرف الفاظ شماری کرتے رہے ؟"

کہنے لگے "دونوں کام کرتا رہا"۔

میں نے کہا "البتہ میں اسلئے استعمال کرتا ہوں کہ البتہ کا لفظ مجھے بہت پسند ہے۔ البتہ میں "البتہ" کو اتنا زیادہ بھی استعمال نہیں کرتا۔ البتہ جہاں "البتہ" کی ضرورت ہوتی ہے وہیں "البتہ" کو مضمون میں شامل رکھتا ہوں۔ البتہ میں آپ سے یہ جاننا چاہتا ہوں کہ باوجود ان "البتوں" کے آپ کو میرے مضامین کیسے لگے ؟"

کہنے لگے "آپ کے مضامین بے حد پسند آئے۔ البتہ اُن میں کم "البتے" ہوں تو اچھا ہے"۔

اسی دورِ الفاظ شماری کا ذکر ہے کہ ایک دن میں اور قمر احسن بڑی دیر تک حسن الدین احمد صاحب سے الفاظ شماری کے بارے میں باتیں کر کے باہر نکلے۔ ذہن پر بوجھ تو تھا ہی، کسی بات پر قمر احسن اور مجھ میں اختلاف پیدا ہو گیا، بات آگے بڑھی اور قمر نے کوئی سخت بات مجھے کہی تو میں نے چھوٹتے ہی کہا "قمر اب چپ رہو ورنہ میں تمہاری شان میں الفاظ شماری شروع کر دوں گا"۔ یہ سنتے ہی قمر پیٹ پکڑ پکڑ کر ہنسنے لگا۔ کہنے لگا "تم نے "الفاظ شماری" کو جو نئے معنی پہنائے ہیں وہ بہت خوب ہیں، کہو تو ان معنی کی اطلاع حسن الدین احمد صاحب کو بھی دیدیں"۔

میں نے کہا "ایسا قطعاً نہ کرنا ورنہ وہ میری "الفاظ شماری" شروع کر دیں گے"۔

پھر وہ دن بھی آیا جب وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی کے ہاتھوں "الفاظ شماری" کی رسمِ اجرا عمل میں آئی۔ رسمِ اجرا میں وہ عجز و انکسار کا

نمونہ بنے ایک کونے میں یوں کھڑے رہے جیسے کہنا چاہتے ہوں "دیوانِ غالب کس نے لکھا ہے، یہ میں بالکل نہیں جانتا۔" جلسہ میں ان کے کام کی تعریفیں ہوتی رہیں اور شرم کے مارے ان کی آنکھیں جھکتی چلی گئیں۔

جلسہ کے بعد انہوں نے اس کتاب کا ایک نسخہ میرے دونوں ہاتھوں میں تھمایا تو اُسکے بھاری بھرکم بوجھ کو سنبھالتے ہوئے مجھے وہ مصرعہ یاد آگیا ؎ یہ تاب یہ مجال یہ طاقت کہاں مجھے

کتاب کیا تھی اچھا خاصا چبوترہ تھی۔ ایسی ضخیم کتابیں اُردو میں بہت کم چھپی ہونگی۔ میں تھوڑی دیر تک اس کتاب کو اپنے ہاتھوں میں اُٹھا کر اپنی قوت کا اندازہ لگاتا رہا۔ پھر اس ڈر سے یہ کتاب اُنہیں واپس کردی کہ اگر خدانخواستہ یہ کتاب میرے ہاتھوں سے چھوٹ کر پاؤں پر گر پڑی تو کئی دن لنگڑاتے پھرنا ہوگا۔ میں نے حسن الدین احمد صاحب کے گھر میں وہ منظر بھی دیکھا جب اس کتاب کے غالباً ڈھائی سو نسخے حیدرآباد سے آگئے تھے اور ان کا "دیوان خانہ" "اَلفاظ شماری" سے لبالب بھر گیا تھا۔ حسن الدین احمد صاحب کہنے کو تو آئی۔ اے۔ ایس عہدہ دار ہیں اور پھر سب سے بڑی بات یہ کہ حیدرآباد کے ایک ایسے ممتاز گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں جس کے افراد کے ناموں کے ساتھ "یار جنگ" کا لقب وابستہ رہا ہے لیکن ان دونوں مجبوریوں کے باوجود وہ عملی زندگی میں اپنے آپ کو ایک "عام آدمی" کیطرح پیش کرتے ہیں۔ اُن کے عام آدمی ہونے کا سب سے بڑا ثبوت تو یہ ہے کہ ایک بار اس خاکسار کی "آٹو سائیکل" کی پچھلی نشست پر بیٹھ چکے ہیں۔ میں نے لاکھ سمجھایا کہ آئی۔ اے۔ ایس عہدے داروں کے "قواعد ملازمت" میں اول تو "آٹو سائیکل" پر بیٹھنا ہی منع ہے اور آپ تو اس کی پچھلی نشست پر بیٹھنے چلے ہیں۔" لیکن وہ نہ مانے کہنے لگے "اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔" وہ پہلے اور غالباً آخری آئی اے ایس عہدیدار ہیں جنھیں میری آٹو سائیکل پر بیٹھنے کا شرف حاصل ہوچکا ہے۔ مگر اس کا ایک نقصان میرے حق میں یہ ہوا کہ اب جو کوئی بھی میری آٹو سائیکل کا مذاق اڑاتا ہے یا اس پر بیٹھنے سے انکار کر دیتا ہے تو میں اُسے حسن الدین احمد صاحب کا حوالہ دیکر چپ کرا دیتا ہوں۔ گھر اور دفتر میں بھی میں نے اُنہیں کام خود اپنے ہاتھوں سے کرتے ہوئے دیکھا ہے۔

وہ دفتر کا کام بڑی محنت اور لگن سے کرنے کے عادی ہیں بلکہ یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ دفتر کا نہیں گھر کا کام کر رہے ہوں۔

وقت کی پابندی تو سر آئی۔ اے۔ ایس عہدیدار کرتا ہی ہے، لیکن یہ شاعر بھی

وقت کی پابندی کے معاملہ میں دیگر آئی اے ایس عہدیداروں سے کم از کم آدھ گھنٹہ آگے رہتے ہیں۔ کہیں چھ بجے جانا ہو تو یہ ساڑھے پانچ بجے ہی پہنچ جائیں گے۔

اُردو زبان اور ادب اُن کی دو بڑی کمزوریاں ہیں۔ اُردو کی خدمت وہ کچھ اس انداز سے کرتے ہیں جیسے اگر وہ اُردو کی خدمت نہ کریں تو حشر کے دن اُردو والے اُن کے دامن گیر ہو جائیں گے۔ اسی خدمت کے جذبہ کے تحت اُنہوں نے حیدرآباد میں ایک "ولا اکیڈیمی" قائم کی ہے جس کی جانب سے اُردو کی کئی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ میں اکثر مذاق میں اُن سے کہتا ہوں کہ "ولا اکیڈیمی" کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ اُردو کی بہت سی ناقابلِ اشاعت کتابوں کی اشاعت کی صورت نکل آئی ہے۔ ورنہ یہ کتابیں کیسے چھپتیں۔

اُن کی ایک اور خوبی یا خرابی یہ ہے کہ کبھی خود موٹر نہیں چلاتے، بلکہ یہ ذمہ داری اُنہوں نے مسز حسن الدین احمد کے سپرد کر رکھی ہے۔ ایسا اُنہوں نے غالباً اسلئے کیا ہے کہ اگر کوئی شوہر اپنی بیوی کے ساتھ بیٹھ کر موٹر چلاتا ہے تو اس وقت وہ اپنی مرضی کے مطابق موٹر نہیں چلا سکتا بلکہ اُسے بحیثیت اپنی بیوی کی ان ہدایات پر عمل کرنا پڑتا ہے کہ رفتار کم کرو، بریک لگاؤ، ایکسیلیٹر کو دباؤ، ہارن بجاؤ، وغیرہ وغیرہ۔

وہ ایک سچے اور مخلص آدمی ہیں اسلئے ہر کس و ناکس کی بات پر یقین کر لیتے ہیں اور بعد میں حسبِ استطاعت نقصان اٹھاتے ہیں۔ بعض اوقات مجھے اُن کا خلوص معصومیت کی حدوں کو چھوتا ہوا نظر آتا ہے۔ اُن کی معصومیت کا ایک واقعہ مجھے یاد ہے کہ میرے اور ان کے ایک مشترکہ دوست نے ایک بار اُن سے کہا کہ "صاحب! آپ اگلے اتوار کو کھانا ہمارے ساتھ کھایئے۔" اور پھر اُن سے یہ بھی کہا کہ "وہ مجھے بھی ساتھ لیتے آئیں۔" حسن الدین احمد صاحب نے اس بات پر یقین کر لیا اور اگلے اتوار کا انتظار کرنے لگے۔ مجھے جب اطلاع دی کہ مجھے بھی کھانے پر اُن کے ساتھ چلنا ہے تو میں نے دبی زبان میں کہا "جناب والا! میں اپنے دوست کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ وہ تو رسمی طور پر ہر کسی کو ایسی دعوت دیتے ہیں۔ بڑے من موجی آدمی ہیں۔ آج کہی ہوئی بات انہیں کل یاد نہیں رہتی۔ پھر بھی آپ چلنے سے پہلے مزید ایکبار توثیق کر لیجئے کہ آیا واقعی اُنہوں نے ہمیں کھانے پر بلایا ہے۔ پھر ذرا سوچیے

کہ ہم اگر بیس میل کا فاصلہ طے کر کے اُن کے گھر پہونچیں اور بعد میں پتہ چلے کے وہ گھر پر نہیں ہیں تو اچھا نہیں معلوم ہوگا۔"

بولے "مگر یہ بھی تو اچھا نہیں معلوم ہوتا کہ ایک شخص نے کھانے کی دعوت دیدی اور آپ اس سے دوبارہ پوچھنے جا رہے ہیں کہ واقعی آپنے دعوت دی ہے یا نہیں ؟"

میں نے کہا "ایسا ہے تو مجھے آپکے ساتھ چلنے میں کوئی اعتراض نہیں بھلے ہی کھانا نہ ملے، آپکی موٹر میں ذراسی "آؤٹنگ" تو ہو جائیگی۔"

اگلا اتوار جب آیا تو میں وقت مقررہ پر ان کے ہاں پہنچ گیا۔ پھر میں حسن الدین احمد صاحب اور مسز حسن الدین احمد دعوت کی سمت روانہ ہوگئے۔ حسبِ معمول مسز حسن الدین احمد موٹر چلا رہی تھیں۔ کڑاکے کی سردی پڑ رہی تھی اور کہرے میں راستہ بھی صاف نہیں دکھائی دے رہا تھا۔ اور ہمیں شہر سے باہر جانا تھا۔ بڑی مشکل سے قدم قدم پر راستہ پوچھ کر ہم "دعوت" کی جانب بڑھ رہے تھے۔ موٹر میں بڑی دیر تک خاموشی طاری رہی۔ پھر میں نے سکوت کو توڑتے ہوئے مسز حسن الدین احمد سے پوچھا "بھابی! یہ بتایئے بیس میل دور جاکر واپس آنے میں کتنے روپیہ کا پٹرول خرچ ہوگا۔؟"

وہ بولیں "چالیس پچاس روپیہ کا پٹرول تو لگ ہی جائے گا۔"

اس پر میں نے کہا "چالیس پچاس روپیہ میں تو ہم دہلی کے کسی بھی اچھے ہوٹل میں کھانا کھا سکتے ہیں۔"

میری اس بات پر حسن الدین احمد صاحب کے چہرے پر خفگی کے آثار نمایاں ہوئے اور وہ بولے "آپ تو ہمیشہ غیر سنجیدہ رہتے ہیں۔ ایک شخص نے اتنے خلوص سے کھانے پر بلایا ہے اور آپ کھانے کی قیمت کا تعین کرنے چلے ہیں۔ قیمت تو کھانے کی نہیں خلوص کی ہوتی ہے۔"

میں نے کہا "یہ بات ہے تو چلتے رہیئے ورنہ میں تو آپ کو راہِ راست پر لانے کی ناحق ہی کوشش کر رہا تھا۔"

سفر کی بڑی صعوبتیں اٹھا کر ہم منزلِ مقصود پر پہونچے۔ منزلِ مقصود [illegible] چاروں طرف اندھیرا چھایا ہوا نظر آیا۔

میں نے کہا "میں سمجھتا ہوں میزبان صاحب کھانا کھا کر سوگئے ہیں۔ کیونکہ اُن کے گھر میں کہیں بھی کوئی بتی نہیں جل رہی ہے۔"

اس پر حسن الدین احمد صاحب نے اپنی گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "ہاں! ہمیں پہنچنے میں پندرہ منٹ کی دیر تو ہوگئی ہے — ہوسکتا ہے کہ اُن لوگوں نے انتظار کر کے کھانا کھا لیا ہو۔"

میں دل ہی دل میں اُن کی معصومیت پر مسکراتا رہا۔ اندھیرے میں جب ہم نے دستک دی تو اندھیرے نے اس دستک کو نگل لیا۔ کئی بار اُنہوں نے دروازہ کھٹکھٹایا مگر کوئی جواب نہ آیا۔ بالآخر بڑی دیر بعد مکان کے ایک گوشہ میں بتی جلی۔ بتی جلتے ہی حسن الدین احمد صاحب کے چہرے پر اُمید کی ہزاروں شمعیں روشن ہوگئیں۔ میری طرف طنزیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے بولے۔ "اب، تو یقین آیا نہ آپ کو کہ آج یہاں ہماری دعوت ہے۔ آپ تو یونہی لوگوں کو بدنام کرتے رہتے ہیں۔" پھر گھر میں ایک ایک کر کے بتیاں روشن ہوتی چلی گئیں اور بعد ہی ایک بڑھیا جو غالباً ہمارے دوست کی خادمہ تھی گھر سے باہر نکل آئی۔

میں نے پوچھا کہ آپ کے صاحب گھر پر ہیں ؟

وہ بولی "صاحب! وہ تو دو دن سے دہلی سے باہر ہیں۔"

میں نے حسن الدین احمد صاحب کی طرف دیکھتے ہوئے بڑھیا سے پوچھا "میم صاحبہ ہیں ؟"

وہ بولی "وہ بھی صاحب کے ساتھ گئی ہیں۔"

یہ سنتے ہی میں نے حسن الدین احمد صاحب پر ایسی نظر ڈالی جیسے ہندوستانی فلموں کے ولین ہیروئن پر ڈالتے ہیں۔ پھر میں چپ چاپ چلتا ہوا موٹر کے پاس آگیا۔ حسن الدین احمد صاحب بدستور ہمارے دوست کی خادمہ کے آگے ہاتھ باندھے کھڑے رہے۔ آس بھی کیا بری چیز ہوتی ہے۔ پھر آہستگی سے بولے: "اصل میں آپکے صاحب نے ہمیں رات کے کھانے پر بلایا تھا۔ کیا وہ تمہیں اس بارے میں کچھ کہہ گئے ہیں؟ ہوسکتا ہے کہ انہوں نے ہمارا کھانا تیار کروا دیا ہو۔"

یہ سنتے ہی بڑھیا دروازہ کے اندر چلی گئی اور دروازہ کے ایک پٹ کو بھیڑ کر اور دوسرے کو آدھا کھینچ کر دروازہ میں یوں کھڑی ہوگئی جیسے گولکنڈہ کے قلعہ پر اورنگ زیب کے حملہ کے وقت عبدالرزاق لاری قلعہ کے دروازہ پر کھڑا ہوگیا تھا۔ اس نے کہا "صاحب! معاف کرنا یہاں کوئی کھانا وانا تیار نہیں ہوا ہے۔ میں خود دوپہر سے بھوکی ہوں۔ صاحب کل آئیں گے تو اُن سے بات کیجئے۔" یہ کہہ کر اُس نے زور سے دروازہ یوں بند کیا جیسے آج سے ہمارا خیر ہو کر اگر [illegible] ہم لوگ گھر کے اندر گھس جائیں گے [illegible]

سارا کھانا کھالیں گے۔

حسن الدین احمد صاحب نڈھال قدموں سے چلتے ہوئے موٹر کی طرف آئے۔ نہ تو میں نے کچھ کہا اور نہ ہی انہوں نے۔ مسز حسن الدین احمد بھی چپ چاپ موٹر چلاتی رہیں۔ آدھا راستہ اسی خاموشی میں طے ہوا۔ اس کے بعد حسن الدین احمد صاحب نے بڑی خجالت کے ساتھ مجھ سے پوچھا "اس وقت کونسی ہوٹل کھلی ہوگی؟"

میں نے ایک زوردار قہقہہ لگا کر کہا "اب آپ کوئی تکلف نہ کریں۔ میرا کھانا تو گھر پر تیار ہے اور پھر آپ کے پاس تو ریفریجریٹر ہے۔ اس میں پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے"۔

وہ بڑی دیر تک مجھے کہیں لے جاکر کھانا کھلانے پر مُصر رہے۔ میں نے کہا "میں کھانا کھانے کے ارادے سے نہیں نکلا تھا۔ میرا مقصد تو صرف "اوٹنگ" تھا۔ وہ مقصد پورا ہوچکا ہے۔ میری گزارش اب صرف اتنی ہے کہ کل آپ ہمارے دوست کو فون کریں اور اپنے طور پر معذرت کرتے ہوئے اتنا کہیں کہ ہم کسی مصروفیت کی وجہ سے آپ کے ہاں کھانے پر نہیں آسکے"۔ انہوں نے وعدہ کیا اور چلے گئے۔

دو دن بعد حسن الدین احمد صاحب کا فون آیا۔ کہنے لگے "میں نے آپ کے کہنے کے مطابق آپ کے دوست کو فون کیا تھا۔ جیسے ہی میں نے کہا کہ ہم نہیں آسکے تو وہ دوسری طرف برہم ہوگئے۔ کہنے لگے صاحب ہم نے کھانا پکا کر رات ایک بجے تک آپکا انتظار کیا، مگر آپ نہیں آئے۔ یہ بہت بُری بات ہے۔ اب جرمانہ کے طور پر آپکو اپنے ہاں دعوت کرنی ہوگی"۔

سُنا ہے کہ حسن الدین احمد صاحب نے آٹھ دن بعد پھر ہمارے دوست کی دعوت کی اور مجھے اس میں نہیں بلایا۔ محض اس ڈر سے کہ کہیں میں راز فاش نہ کردوں۔

حسن الدین احمد صاحب نے بڑی الفاظ شماری کی ہے۔ ہزاروں لفظوں کو وہ شمار کر چکے ہیں مگر جب میں اُن کی شخصیت کی الفاظ شماری کرنا چاہتا ہوں تو شرافت، مروّت، خلوص، عجز و انکسار اور انسان دوستی کے سوائے مجھے کوئی اور الفاظ نہیں ملتے۔ ایک موہنی سی شخصیت اور بس اتنے ہی الفاظ پر مشتمل؟

مگر میں سوچتا ہوں کہ ایک انسان کی شخصیت پانچ لفظوں میں سمٹ جائے تو یہ بہت بڑی بات ہے۔ ہمارے اطراف ایسے کتنے افراد رہتے ہیں جن کے حصّہ میں ایک لفظ بھی نہیں آتا اور وہ زندگی بھر ایک ایک لفظ کے لئے ترستے رہتے ہیں۔ یہیں آکر میں "الفاظ شماری" کی اہمیت کا قائل ہوجاتا ہوں۔

OO

حسن الدّین احمد سے ایک مُلاقات

مخمور سعیدی
۹ - انصاری مارکیٹ، دریا گنج، دھلی - ۲

شُرکائے گفتگو • مخمور سعیدی • ڈاکٹر مظفر حنفی

مخمور سعیدی: حسن الدّین صاحب: سب سے پہلے تو آپ یہ بتائیے کہ آپکی ادبی زندگی کا آغاز کیسے ہوا؟

حسن الدین احمد: گھر کا ماحول ادبی ہونے کی وجہ سے بچپن ہی سے لکھنے پڑھنے کا شوق پیدا ہو گیا تھا۔ میری والدہ صاحبہ کو بھی اُردو، فارسی اور عربی کا اچھا ذوق تھا۔ میرا ذریعۂ تعلیم شروع ہی سے اُردو رہا۔ جس زمانے میں میں عثمانیہ یونیورسٹی میں معاشیات کا طالب علم تھا۔ جتھار اور بیری کی لکھی ہوئی مشہور کتاب "معاشیاتِ ہند" وہاں کے نصاب میں داخل تھی اور اس کا کوئی اُردو ترجمہ نہ ہونے کی وجہ سے طلبا کو بڑی دقت ہوتی تھی۔ دارالترجمہ نے اس کتاب کے کچھ تراجم شائع کئے لیکن وہاں ترجمہ ہونے میں خاصا وقت لگتا تھا۔ اور جب تک یہ ترجمہ شائع ہو اصل کتاب کا نیا نظرِ ثانی شدہ ایڈیشن بازار میں آجاتا تھا۔ ہمارے اُستاد جناب انور اقبال قریشی نے اس دشواری پر قابو پانے کی ایک انوکھی ترکیب سوچی۔ انہوں نے اس نو (۹) ابواب پر مشتمل کتاب کا ایک ایک باب ایم۔ اے کے لڑکوں، طالب علموں کے حوالے کر دیا کہ وہ جلد از جلد ان کا ترجمہ کر دیں۔ ہر لڑکے کے لئے ایک ایک باب کا ترجمہ کر دینا کچھ مشکل نہ تھا اور اس طرح ایک مہینے کے اندر ہی کتاب کا ترجمہ منظرِ عام پر آ گیا۔ ایک باب
شاعر، بصیرت
کا ترجمہ میں نے بھی کیا تھا، اس سے مجھ میں خود اعتمادی پیدا ہوئی اور آپ کہہ سکتے ہیں کہ یہیں سے میری قلمی اور ادبی زندگی کا آغاز ہوا۔

مخمور سعیدی: اپنی ادبی زندگی کے آغاز میں آپ کو کن لوگوں سے زیادہ قربت حاصل رہی؟

حسن الدّین احمد: حیدر آباد میں ۱۹۴۷ء تک خاصا ادبی ماحول تھا اور بہت سی نامور شخصیتیں وہاں موجود تھیں۔ میں جلیل مانک پوری، پروفیسر ہارون خاں شیروانی، ڈاکٹر محی الدین قادری زور، ڈاکٹر امیر علی اور ڈاکٹر عبداللطیف وغیرہ سے زیادہ قریب رہا۔

نام :	حسن الدّین احمد
نام والد :	علی الدّین احمد (نواب دین یار جنگ)
نام جدِّ امجد :	شمس العلماء نواب عزیز جنگ وِلا
مقامِ پیدائش :	حیدر آباد
تاریخِ پیدائش :	۱۲ر فروری ۱۹۲۳ء
تعلیم :	ایم اے (معاشیات)، جامعہ عثمانیہ۔
تصانیف :	ہندوستان کا معاشرتی نظام ۱۹۴۶ء، نغمۂ الوہیت (اُردو ترجمہ بھگوت گیتا) ۱۹۴۷ء، فطری علاج ۱۹۵۳ء، اردو الفاظ شماری ۱۹۷۳ء، انجمن (سوانحی مضامین کا مجموعہ) ۱۹۷۵ء، جامع اللطیات (نواب عزیز جنگ ولا کی تصنیفات کے اقتباسات پر مشتمل ہے جس کو ضیاء الدین احمد شکیب کے اشتراک سے مرتب کیا ہے ۱۹۷۵ء۔

مخمور سعیدی: سب سے پہلے آپکی کون سی کتاب شائع ہوئی؟

حسن الدّین احمد: میری سب سے پہلی کتاب تھی "ہندوستان کا معاشرتی نظام"

مظفر حنفی: آپکی مختلف تصانیف، مثلاً جس کتاب کا آپنے نام لیا اور "اُردو الفاظ شماری" "انجمن" "فطری علاج" ان میں آپس میں کوئی خاص ربط نظر نہیں آتا۔ کیا بہتر نہ ہوتا کہ آپ علم و ادب کے کسی ایک پہلو پر پوری توجہ صرف کرتے؟

حسن الدّین احمد: ایسا ہے کہ اب تک میں نے جو بھی کام کئے ہیں وہ اپنی بدلتی ہوئی دلچسپیوں کی وجہ سے کئے ہیں۔ مثلاً ایک زمانے میں

مجھے گیتا میں دلچسپی پیدا ہوئی اور جی چاہا کہ اس کا سلیس اُردو میں ترجمہ ہونا چاہیئے۔ چنانچہ ایک طالب علم کی حیثیت سے میں نے گیتا کے مختلف تراجم کا مطالعہ کیا اور پھر حتی الامکان تمام باریکیوں اور نزاکتوں کو نظر میں رکھتے ہوئے خود اس کا ترجمہ کیا۔ اسی طرح ایک عرصہ تک اُردو الفاظ شماری کی طرح میں لوگوں کو متوجہ کرتا رہا لیکن جب اس کام کے لئے کوئی بھی تیار نہ ہوا تو مجھے خود ہی اس کام کو انجام دینا پڑا۔ ان سبھی کاموں کو میں اپنا HUMBLE CONTRIBUTION سمجھتا ہوں۔

مظفر حنفی :۔ حال ہی میں آپ کی دلّی اکیڈمی کی طرف سے "جامع العطیات" نام کی ایک کتاب شائع ہوئی ہے۔ کیا موجودہ زمانے میں اس کی افادیت پر آپ کچھ روشنی ڈالیں گے ؟

حسن الدین احمد : یہ کتاب عہدِ وسطیٰ میں دیئے جانے والے عطیات کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ ہے۔ چونکہ اس دور کے معاشرے میں عطیات کا اہم مقام تھا۔ اس لئے اس دور پر ریسرچ کرنے والوں کے لئے یہ ضروری ہوگا کہ وہ فرامین اور اسناد کی اصطلاحی زبان، ان کے رسم الخط کی پیچیدگیوں، متعلقہ معاملات اور مقدمات کی کارروائی کے طریقوں وغیرہ سے واقفیت بہم پہونچائیں۔ اس کتاب میں انہی تمام امور سے بحث کی گئی ہے۔ سچ پوچھئے تو یہ کتاب قرونِ وسطیٰ کے ہندوستانی سماج کو سمجھنے کے لئے ایک بڑی اہمیت کی حامل ہے۔

محمور سعیدی : پچھلے دنوں آپ کے لکھے ہوئے سوانحی خاکوں کا جو مجموعہ "انجمن" کے نام سے شائع ہوا ہے، اسے پڑھ کر خیال ہوتا ہے کہ یہ خاکے لکھتے ہوئے کچھ اخلاقی ملحوظات سے آپ نے کام لیا ہے اور آپکی نظر متعلقہ شخصیتوں کے اُنہیں پہلوؤں پر مرتکز رہی ہے جنھیں اخلاقی طور پر پسندیدہ سمجھا جاتا ہے۔ ان شخصیتوں کے کچھ کمزور پہلو بھی ہونگے، کیا آپ نے اُنھیں ارادتاً نظر انداز کیا ہے ؟

حسن الدین احمد : ایسا نہیں ہے کہ کسی مقصد کو پیش نظر رکھ کر یہ خاکے لکھے گئے ہوں۔ یہ ضرور ہے کہ جن لوگوں کے بارے میں یہ خاکے ہیں، میں نے ان کی زندگی کے اچھے پہلوؤں کو اُجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ ہر خاکے میں میں نے یہ سُراغ لگانے کی کوشش کی ہے کہ اُس شخص نے زندگی کے کھیل کو کس انداز سے کھیلا اور اُسکی ذمّہ داریوں سے کس طرح عہدہ برآ ہوا۔

مظفر حنفی :۔ عام طور پر شخصی خاکوں میں آدمی کی خوبیوں اور

شاعری بھی

خامیوں دونوں کا ہی جائزہ لیا جاتا ہے۔ اس طرح آدمی اپنے استر سمیت اندر اور باہر سے صاف نظر آنے لگتا ہے اور اس کی جیتی جاگتی شخصیت واضح ہو جاتی ہے۔ چونکہ آپکے لکھے ہوئے خاکوں میں ایسا نہیں ہے۔ اس لئے کیا انہیں "سوانحی مضامین" کہنا زیادہ مناسب ہوگا ؟

حسن الدین احمد : جی ہاں ! میں سمجھتا ہوں اُنہیں خاکوں کی بجائے "سوانحی مضامین" کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔

مظفر حنفی : اگر میرا خیال غلط نہیں تو آپکی مشہور ترین کتاب "اُردو الفاظ شماری" ہے۔ کیا آپ اُس کی افادیت پر کچھ روشنی ڈالیں گے ؟

حسن الدین احمد : جیسا کہ آپ جانتے ہیں اس کتاب میں اُردو زبان کے الفاظ کی تکرار کا تعین کیا گیا ہے۔ ہر زبان میں کچھ الفاظ ایسے ہوتے ہیں جو بہت زیادہ استعمال میں آتے ہیں۔ کچھ الفاظ ناگزیر ہوتے ہیں اور کچھ الفاظ وہ ہوتے ہیں جن کی تکرار ان ناگزیر الفاظ کے مقابلے میں تو کم ہوتی ہے لیکن یہ بھی کثیر الاستعمال ہوتے ہیں۔ کسی زبان کو ثانوی زبان کے طور پر سیکھنے والے کے لئے زیادہ تکرار والے الفاظ کی اہمیت زیادہ ہوگی اور نسبتاً کم تکرار والے الفاظ کی اہمیت کم۔ اس طرح میری اس کتاب سے بچوں اور غیر ملکی طلبا کے لئے نصابی کُتب کی تیاری میں بڑی مدد لی جا سکتی ہے۔ کسی بھی زبان کو سکھاتے وقت ظاہر ہے کہ اولاً وہ الفاظ سکھلائے جانے چاہئیں جو سب سے زیادہ استعمال میں آتے ہیں۔ اس SELECT-ED VOCABULARY کی تیاری کے لئے الفاظ شماری سے بہتر کوئی طریقہ نہیں ہو سکتا کیونکہ یہ پوری طرح SECINTIFIC اور معروضی طریقہ ہے۔ الفاظ شماری کرنے والے کا کام بعینہٖ کمشنر مردم شماری کے کام کی طرح ہے۔ جس طرح وہ مردم شماری کے اعداد و شمار بے کم و کاست پیش کر دیتا ہے، میں نے الفاظ کی تکرار کے اعداد و شمار پیش کر دیئے ہیں۔ کسی قسم کے نتائج نکالنا میرا کام نہیں۔

مظفر حنفی : میرا تعلق ایک ایسے ادارے سے ہے جس میں اسکولوں کے لئے نصابی کتب تیار ہوتی ہیں۔ "الفاظ شماری" سے اُردو کی نصابی کتابوں کی تیاری میں کس طرح استفادہ کیا جا سکتا ہے، میں چاہوں گا کہ آپ اس سوال پر کچھ روشنی ڈالیں۔

حسن الدین احمد: "اردو الفاظ شماری" میں میں نے گیارہ ہزار الفاظ کی درجہ بندی کر دی ہے جن کی تکرار ایک یا اس سے زیادہ ہے۔ ان گیارہ ہزار الفاظ میں ایک ہزار بارہ الفاظ ایسے ہیں جن کی تکرار کا اوسط پچاس یا اس سے زیادہ ہے۔ نصابی کتب میں ان ایک ہزار بارہ الفاظ میں سے کون سے لفظ لئے جائیں اور کون سے نہیں، یہ فیصلہ کتابوں کے مرتبین ہی کو کرنا ہوگا۔

منصور سعیدی: آپ نے ان گیارہ ہزار الفاظ کا تعین کس بنیاد پر کیا ہے اور اُن کی درجہ بندی کی نہج کیا ہے؟

حسن الدین احمد: سب سے پہلے تو میں نے زبان کے دس مختلف شعبوں سے پچاس پچاس ہزار الفاظ پر مشتمل ذخیرۂ ادب لے کر پانچ لاکھ الفاظ کا ذخیرہ فراہم کیا اور پھر گنتی کے ذریعے ہر لفظ کی تکرار کا پتہ لگایا۔ اس پانچ لاکھ الفاظ پر مشتمل ذخیرے میں گیارہ ہزار الفاظ ایسے نکلے جن کی تکرار ایک یا اس سے زیادہ تھی۔

مظفر حنفی: آپ کا انتخاب کیا ہوا نمائندہ ادب کن شعبوں پر مشتمل تھا؟

حسن الدین احمد: ادب (نظم)، ادب (نثر، تنقید)، ادب (نثر، افسانہ، ناول)، سفرنامے، روزنامچے، سرکاری اور قانونی زبان، تاریخ و سوانح، مذہبی لٹریچر، صحافت، فلمی زبان اور بچوں کا ادب وہ دس شعبے ہیں جن پر یہ نمائندہ ادب مشتمل ہے۔

منصور سعیدی: نمائندہ ادب کا انتخاب آپ نے مختلف اُدوار کو سامنے رکھ کر کیا ہے یا کسی مخصوص دور کو پیشِ نظر رکھا ہے۔ اگر کسی مخصوص دور کو پیشِ نظر رکھا ہے تو باقی ادوار پر اسے ترجیح دینے کی کیا وجہ آپ کے ذہن میں رہی ہے؟

حسن الدین احمد: میں نے صرف جدید دور کے ادب کو سامنے رکھا ہے اور اس کی وجہ اس کا عصری زندگی سے متعلق ہونا ہے۔

مظفر حنفی: انتخاب صرف کتابی زبان سے کیا گیا ہے یا اس میں بول چال کی زبان بھی شامل ہے۔

حسن الدین احمد: انتخاب دونوں ہی زبان سے کیا گیا ہے بلکہ اس میں فلمی زبان کے الفاظ بھی شامل ہیں۔ بول چال کی زبان کے الفاظ جمع کرنے کا طریقہ میں نے یہ نکالا تھا کہ اکثر ایک ٹیپ ریکارڈ لیکر حیدرآباد کے کسی ہوٹل میں چلا جاتا اور وہاں بیٹھے ہوئے لوگوں کی شاعرانہ بھی بات چیت ریکارڈ کر لیا کرتا۔ ایک مرتبہ ہوٹل کی میزوں پر ہونے والی بات چیت کو اس طرح ریکارڈ کرتے دیکھ کر لوگوں کو یہ شک بھی گزرا کہ میں کوئی جاسوس تو نہیں ہوں۔

منصور سعیدی: میں سمجھتا ہوں کہ یہ ایک ادارے کا کام تھا جو آپ نے تنہا انجام دیا ہے۔ اس کی تکمیل میں آپ کے کتنے ماہ و سال صرف ہوئے؟

حسن الدین احمد: اس کام کی تکمیل میں چودہ برس لگے۔ لیکن عجیب بات یہ ہے کہ یہ لمبی مدت کوئی بوجھ نہیں معلوم ہوئی۔ اس کے برخلاف وہ گیارہ برس جب میں اس خیال کو اپنے ذہن میں لئے رہا اور لوگوں کو اس کام پر آمادہ کرنے کی ناکام کوشش کرتا رہا، بڑے سخت گزرے۔

مظفر حنفی: یہ ایک بنیادی اہمیت کا کام آپ نے کر دیا۔ یہ بتائیے کہ زبان کے اور کونسے گوشے ہیں جن پر آگے کام کرنے کی ضرورت ہے؟

حسن الدین احمد: میری رائے میں نصابی کتب کی تیاری کا مسئلہ بہت اہم ہے۔ اس شعبے میں سائنٹفک بنیادوں پر کام کرنے کی بڑی ضرورت ہے۔ اسی طرح زبان کے ڈھانچے یعنی structure کے بارے میں تحقیقات بھی ضروری ہے۔ اُردو میں ہندی اور یورپین زبانوں کے الفاظ کی تعداد کا تعین بھی ایک اہم کام ہے۔ میں نے جو الفاظ شماری کی ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ اُردو میں گو کہ یورپین الفاظ کی تعداد سات فیصد ہے لیکن پانچ لاکھ الفاظ میں تکرار صرف ایک فیصد ہے۔ اس تحقیق سے زبان کے مزاج کا ایک دلچسپ پہلو سامنے آتا ہے کہ ہماری زبان کسی دوسری زبان کے الفاظ کو قبول تو کر لیتی ہے، لیکن جذب اس وقت تک نہیں کرتی جب تک انہیں اچھی طرح پرکھ نہ لے۔

مظفر حنفی: ظاہر ہے کہ فہرستِ تکرار کے الفاظ کی ترکیب میں آپ نے ان کے کثیر الاستعمال ہونے کو پیشِ نظر رکھا ہوگا۔ یہ بتائیے کہ ابتدائی دس الفاظ کی جملہ تعداد کتنی ٹھہری؟

حسن الدین احمد: فہرستِ تکرار کے پہلے دس الفاظ کا اوسط ایک لاکھ تریسٹھ ہزار ہے، یعنی وہ کل ذخیرۂ الفاظ کے ۳۲ فیصد کی نمائندگی کرتے ہیں۔

مخمور سعیدی :۔ آپ نے الفاظ شماری کرتے وقت صرف مفرد الفاظ لئے ہیں یا مرکب الفاظ کو بھی شامل کیا ہے ؟

حسن الدین احمد :۔ میں نے مفرد الفاظ کے ساتھ ساتھ مرکب الفاظ بھی لئے ہیں لیکن ان مرکبات کو بھی ایک اکائی مانا ہے ۔ صرف افعال کے سلسلے میں ایسا نہیں کیا ہے ۔

مظفر حنفی :۔ کوئی غیر ملکی اردو زبان سیکھنا چاہے تو آپ کے خیال میں اس کے لئے اردو کے کتنے الفاظ سیکھنا ضروری ہیں ؟

حسن الدین احمد : میری رائے میں اگر کوئی غیر ملکی اردو کے تقریباً ایک ہزار کثیر الاستعمال الفاظ سیکھ لے تو اُسے اس زبان کو سمجھنے ، لکھنے ، پڑھنے اور کہنے پر خاصی قدرت حاصل ہو جائے گی ۔

مظفر حنفی :۔ آپ نے دس مختلف شعبہ ہائے ادب سے پانچ لاکھ الفاظ پر مشتمل نمائندہ ادب کا جو انتخاب کیا ہے ، اُس میں ہر شعبے کے حصّے میں پچاس ہزار الفاظ آئے ہیں ۔ کیا آپ کے خیال میں اس طریقۂ کار کے اختیار کرنے سے اردو شاعری کے ساتھ کوئی ناانصافی نہیں ہوئی ۔ کیونکہ اردو زبان کی مطبوعہ کتب زیادہ تر شعری ادب سے متعلق ہیں ۔

حسن الدین احمد : میں نہیں سمجھتا کہ اردو شاعری کے ساتھ کوئی ناانصافی ہوئی ہے ۔ میں نے شاعری کو ایک شعبہ قرار دیا ہے ۔ میری کوشش رہی ہے کہ نمائندہ ادب کے انتخاب میں میرے ذاتی نقطۂ نظر کو دخل نہ ہو لیکن کسی حد تک ایسا ہو جانا ناگزیر ہے ۔ بہرکیف ؛ الفاظ کے خاصے بڑے ذخیرے کی موجودگی میں ذاتی نقطۂ نظر نتائج پر اثر انداز نہیں ہو سکتا ۔

مخمور سعیدی : حسن الدین صاحب ! اب آپ حضرت امیر خسروؒ کی سات سو سالہ تقاریب کی قومی کمیٹی کے جنرل سکریٹری کی حیثیت سے یہ بتائیے کہ اس سلسلے میں جو کام ہوا ہے ، یا ہو رہا ہے ۔ وہ کس حد تک امیر خسروؒ کی پہلو دار شخصیت کا احاطہ کرتا ہے ؟

حسن الدین احمد :۔ اس سلسلے میں میں یہ کہنا چاہوں گا کہ قومی کمیٹی کا بنیادی کام یہ ہے کہ ملک میں ایک ایسا ماحول پیدا کیا جائے جس سے لوگوں کو حضرت امیر خسروؒ کی رنگا رنگ شخصیت اور اُن کے علمی اور عملی کارناموں میں دلچسپی پیدا ہو ۔ کمیٹی نے اس سلسلے میں کئی اقدامات کئے ہیں لیکن میرے خیال میں سب سے اہم کام جو کمیٹی کے زیرِ غور رہے وہ امیر خسروؒ کی اُن تصانیف کی دوبارہ طباعت ہے جو اس صدی کے اوائل میں علی گڑھ میں مرتب ہو کر شائع ہوئی تھیں ۔

مخمور سعیدی : کیا یہ کام کسی کے ذمّہ کیا گیا ہے ؟

حسن الدین احمد : توقع ہے کہ بہت جلد یہ کام کسی مطبع کو تفویض ہوگا ۔

مظفر حنفی :۔ میرے خیال سے ، امیر خسروؒ کی تصانیف کے بارے میں محققین کے درمیان جو اختلافات ہیں ، انہیں اگر اس موقع پر طے کر لیا جاتا تو اچھا تھا ۔

حسن الدین احمد : امیر خسروؒ کی فارسی تصانیف کے سلسلے میں تو کوئی خاص اختلافات نہیں ہیں ، ہاں ان کی ہندوی تصانیف کے بارے میں جو اختلافات ہیں اُن پر ۲۳ ر جنوری ۱۹۷۶ ء سے دہلی میں شروع ہونے والے بین الاقوامی سمینار میں بحث ہوگی ۔

مظفر حنفی : آپ کے ساتھ جناب ظ ۔ انصاری بھی کمیٹی کے جنرل سکریٹری ہیں ۔ آپ دونوں کے درمیان کام کی تقسیم کس طرح ہے ؟

حسن الدین احمد : یوں سمجھئے کہ تمام انتظامی کام میرے ذمّے ہے ۔ اور بیشتر ACADEMIC کام ظ ۔ انصاری صاحب کے ذمّے ۔

مخمور سعیدی :۔ حال ہی میں قومی کمیٹی اور ترقی اردو بورڈ کے اشتراک سے امیر خسرو پر ایک مجموعۂ مضامین شائع ہوا ہے ۔ مضامین میں ان کے فارسی کلام سے بہت سے حوالے دیئے گئے ہیں ۔ اب ہندوستان میں فارسی جاننے والوں کی تعداد بہت کم رہ گئی ہے ، کیا یہ بہتر نہ ہوتا کہ جو اشعار مضامین میں بطور حوالہ نقل ہوئے ہیں ۔ اُن کا اردو ترجمہ بھی ساتھ دے دیا جاتا ۔

حسن الدین احمد : میں آپ کے خیال سے اتفاق کرتا ہوں ۔

مظفر حنفی : NCERT سے امیر خسرو پر جو کتاب شائع ہوئی ہے اسکے بارے میں آپ کا خیال کیا ہے ؟

حسن الدین احمد : NCERT کی یہ کتاب ، یا اس قسم کے دوسرے کام جو سرکاری اداروں نے ہماری تحریک پر کئے ہیں ، ان کے لئے ہم ان اداروں کے شکر گذار ہیں ۔ ہم نے بہت سے سرکاری اداروں سے امیر خسرو سے متعلق کام کرنے کی درخواست کی تھی ۔ DAVP نے بہت خوشنما PUBLICITY BROCHURE نکالا ہے ۔ پبلی کیشنز ڈویژن نے امیر خسرو کی شخصیت اور ان کے کارناموں کے مختلف پہلوؤں پر انگریزی مضامین کا ایک مجموعہ شائع کیا ہے ۔ ترقی بورڈ نے ، جیسا کہ ابھی ذکر آیا تھا ، اردو مضامین کا ایک مجموعہ شائع کیا ہے ۔

NCERT نے اردو اور ہندی میں بچوں کے لئے ایک کتاب شائع کی ہے اور محکمۂ ڈاک و تار نے امیر خسرو کی یاد میں ایک ٹکٹ جاری کیا ہے۔ ان سبھی اداروں نے اپنے کام کو زیادہ سے زیادہ بہتر طور پر انجام دینے کی کوشش کی ہے۔

مظفر حنفی: پچھلے دنوں مختلف رسائل میں امیر خسرو پر اچھے مضامین آئے ہیں۔ کیا ان کا ایک اچھا انتخاب شائع نہیں کیا جا سکتا؟

حسن الدین احمد: یہ اچھا خیال ہے اور کمیٹی اس پر غور کر سکتی ہے۔

مظفر حنفی: امیر خسرو کی تصانیف اور ان کے بارے میں شائع شدہ تصانیف کا اگر ایک اشاریہ تیار کرایا جائے تو یہ ایک مفید کام ہوگا۔ اس سلسلے میں عبدالقوی دسنوی صاحب سے مدد لی جا سکتی ہے جنھوں نے اس قسم کے کئی اچھے اشاریے تیار کئے ہیں۔

حسن الدین احمد: یہ بھی اچھا خیال ہے اور اس پر عمل کیا تیار کی جائے گی۔

محمود سعیدی: اردو الفاظ شماری سے آپ نے جس قسم کے بنیادی کام کا آغاز کیا ہے، ظاہر ہے آپ اسے آگے بڑھانے کا ارادہ بھی رکھتے ہوں گے۔ GENERAL SERVICE LIST کی تیاری بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ اور کون سے توجہ طلب پہلو آپ کے ذہن میں ہیں؟

حسن الدین احمد: اس میدان میں ابھی کام کرنے کی بہت گنجائش ہے۔ بہت سی باتیں ہیں جن کی طرف میں نے "اردو الفاظ شماری" میں صرف اشارہ ہی کیا ہے۔ ان پر تفصیلی کام کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً میرا یہ دعویٰ کہ اردو چار ہزار سال پرانی ہے یا "الفاظ تاریخ کی دین ہیں" کے تحت میں نے جو باتیں کہی ہیں۔

مظفر حنفی: ۱۹۶۰ء کے بعد اردو ادب میں آنے والے رجحانات

سفر: ممالک یورپ، ترکی وغیرہ ۱۹۷۳ء، جاپان و مشرق وسطیٰ ۱۹۷۴ء۔ امریکہ و کینیڈا ۱۹۷۱ء

علمی مشاغل: ایڈیٹر مجلۂ عثمانیہ (۱۹۴۵ء)

ممالک غیر میں اردو کتب خانوں کے قیام کی تحریک کی بنیاد ۱۹۷۴ء)

بین الاقوامی امن کانفرنس اور بین الاقوامی مذاہب کانگریس (ٹوکیو، جاپان) میں بحیثیت مندوب شرکت ۱۹۵۴ء

بانی و صدر ولا اکیڈمی (بنیاد ۱۹۶۱ء)

صدر انسٹی ٹیوٹ آف انڈو مڈل ایسٹ کلچرل اسٹڈیز

جنرل سکریٹری: قومی کمیٹی تقریبات امیر خسرو

رکن انڈین ایڈمنسٹریٹو سروس

موجودہ عہدہ: آفیسر آن اسپیشل ڈیوٹی (وقف)، وزارت قانون حکومت ہند

مستقل پتہ: عزیز باغ۔ سلطان پورہ۔ حیدرآباد ۲۴ ۵۰۰۰

جا سکتا ہے۔

مظفر حنفی: کیا آپ اردو میں ایک ایسی کتاب کی ضرورت محسوس نہیں کرتے جس کی مدد سے غیر ملکی اتنی اردو جان لیں جو ان کی روزمرہ کی ضروریات کے لئے کافی ہو؟

حسن الدین احمد: جی ہاں! ایسی ایک کتاب کی بڑی ضرورت ہے۔ الفاظ کے اس ذخیرے کو جس میں زیادہ تکرار والے لفظوں کے ساتھ ساتھ روزمرہ کی ضرورتوں میں کام آنے والے الفاظ بھی شامل ہوں۔ GENERAL SERVICE LIST کہا جاتا ہے۔ اس میں گنتی، دنوں اور مہینوں کے نام اور اس طرح کے دوسرے لغات شامل رہتے ہیں۔ یہ GENERAL SERVICE LIST غیر ملکیوں کے لئے بہت کار آمد ثابت ہوتی ہے۔ میں نے پروفیسر گوپی چند نارنگ، صدر شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ کے ساتھ مل کر ایک منصوبہ بنایا ہے جس کے تحت اردو کی GENERAL SERVICE LIST شائع کی کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

حسن الدین احمد: جدید شاعروں اور ادیبوں میں اچھے لکھنے والے خاصی تعداد میں ہیں لیکن میرے خیال سے جدیدیت کے نام پر بہت سا کچرا بھی ادب میں راہ پا گیا ہے۔

محمود سعیدی: میری حقیر رائے میں یہ سوال تفصیلی گفتگو کا متقاضی ہے اور اب کہ ہماری گفتگو ختم ہو رہی ہے، آپ کا شکریہ ادا کرتے ہوئے ہم لوگ یہ جاننا چاہیں گے کہ GENERAL SERVICE LIST کی تیاری کے علاوہ اور کون سے کام ایسے ہیں جنھیں جلد ہی شروع کرنے کا آپ کا ارادہ ہو؟

حسن الدین احمد: کام تو بہت سے زیر غور ہیں لیکن ان میں GENERAL SERVICE LIST کی تیاری اور اردو میں افعال کی مختلف اشکال اور ان کی تکرار کے تعین کو میرے آئندہ پروگرام میں اولیت حاصل ہے۔

○○

حسن الدین احمد

برقی موسوی
سی آئی، پی، (۲۵۳) کاچی گوڑہ گڈس حیدرآباد ۲۷

آپ، اپنے آپ کو جیسا ظاہر کرتے ہیں، کیا حقیقت میں آپ ویسے ہی ہیں؟ آپ اپنے لئے جو پسند کرتے ہیں، کیا دوسروں کے لئے بھی وہی پسند کرتے ہیں؟ کیا آپ بڑوں کی عزت، چھوٹوں پر شفقت، مظلوم کی حمایت، ظلم کی مذمت اور مستمندوں کی اعانت کرتے ہیں؟ کیا آپ بنی آدم کو اعضائے یک دیگر سمجھتے ہیں؟ کیا دوسروں کے درد پر آپ کا دل تڑپ اٹھتا ہے؟ کیا آپ اپنے ضمیر کی آواز سنتے اور اپنے اعمال کا محاسبہ کرتے ہیں؟

اگر آپ ان سوالات کا جواب اثبات میں دے سکتے ہیں تو میں آپ کو مبارکباد دیتا ہوں کہ آپ محض آدمی نہیں "انسان" ہیں اور صرف انسان ہی نہیں بڑے انسان ہیں ـــــ خاندانی منصوبہ بندی کا بیان ہے کہ ہمارے وطن کی آبادی بہت زیادہ ہے اور روز بروز نہیں بلکہ ثانیہ بہ ثانیہ بڑھتی جارہی ہے ـ درست ہے۔ نہ صرف ہندوستان بلکہ تمام دنیا کی آبادی میں اضافہ ہوا اور ہو رہا ہے۔ لیکن اضافۂ آبادی سے نہ تو انسانوں کی تعداد میں فزونی ہوئی اور نہ انسانیت میں پیش رفت ـ آدمیوں کی یہ کثرت ایسی ہی ہے جیسے ہمالیہ پر کوئی پرندہ آبیٹھے اور اڑ جائے۔ اس پرندے کے بیٹھنے سے نہ ہمالیہ پر کوئی اضافہ ہوا اور نہ اڑ جانے سے کوئی کمی، کرۂ ارض کو ہمالیہ فرض کیجئے اور آدمی کو پرندہ ـــــ بے شک آدمیوں کی آبادی بڑھ رہی ہے لیکن انسانوں کا قحط (قحط الرجال) ہماں ست کہ بود" جیسا کہ مولانا رومؒ نے سات سو سال پہلے کہا تھا ؎

دی شیخ باچراغ ہمی گرد گشت شہر
کز دیو و دد ملولم و انسانم آرزوست

آدمیوں میں یا تو "نرے فرشتے" ہیں، ــــ تہلیل و تسبیح میں مشغول، احساس و اطلاعہ سے محروم ؎

چشم پرنم، نہ دل گرم، نہ ٹھنڈی آہیں
پوچھئے زاہد سے کہ کس بات پہ اِتراتے ہو؟!

شاعر ملت

یا بالکل شیطان، ملت کے بیچ بونے والے، دوستی کی راہ میں کانٹے پھیلانے والے، مجلس میں چنگاری ڈالنے والے، فرقہ داری جذبات کو ہوا دینے والے، نفرت کی آگ بھڑکانے والے اور رنگ و نسل، مذہب و سیاست کے نام پر نوعِ البشر کو جنگ پر اُکسانے والے ـــــ اس لئے یہ غلط نہیں کہ آج بھی انسانوں کی قلت ہے۔
" آدمی کو انسان ہونا میسر نہیں "۔

میں نصف صدی سے زیادہ مدت سے پرس و جو کر رہا ہوں، ہندوستان کے اکثر شہروں میں چراغ سُراغ لئے گھوم چکا ہوں۔ حکومت کی دعوت پر ایران کی سیاحت کر چکا ہوں۔ آسمانِ علم و فضل، زہد و تقویٰ، قیادت و خدمت قومی کے روشن ستاروں سے ملنے کی عزت حاصل کر چکا ہوں ـــــ لیکن " ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ" مسندِ ارشاد پر متمکن اُن خدارسیدوں سے بھی مل چکا ہوں، جو زمانے کا رنگ دیکھ کر ؎

کبھی بندے بنے اپنے کبھی اپنے خدا ٹھہرے

بعض بالیے پہنچے ہوئے "بزرگوں" سے بھی ملنے کی عزت حاصل ہوئی، جن سے ملنے کے بعد بے اختیار زبان سے نکلا ؎

قطرہ ہی رہا، قطرے سے، طوفاں نہ بنا
ذرّہ رہا، ذرّے سے، بیاباں نہ بنا
بننے کو یہ نادان، خدا بن بیٹھا
آدم، مگر آج تک بھی، انساں نہ بنا

جوئندہ، یابندہ ـ اس تلاش و تفحص میں بعض ایسے لوگ بھی ملے جو فی الواقع انسان ہیں، جو اوپر دیئے ہوئے جملہ سوالات کا اگر نہیں تو کم از کم کسی ایک سوال کا اثبات میں جواب دے سکتے ہیں ـــــ ایسے ہی برجستہ اور برگزیدہ افراد میں، جو انگلیوں پر گنے جاسکتے ہیں ــــ مولوی حسن الدین احمد بھی شامل ہیں۔

آج سے (۵۱) سال قبل ۱۹۳۰ء میں مجھے حسن الدین احمد صاحب سے ملنے کا پہلی بار اتفاق ہوا۔ اُسی سال میں نے شمس العلماء عزیز جنگ ولا کی زندگی

اور فارسی شاعری، جدید فارسی زبان میں ایک طویل مقالہ لکھا جو "یادگارِ ولاؔ" کے نام سے کتابی شکل میں چھپ چکا ہے۔ ۱۹۴۳ء میں میں نے نواب ذین یار جنگ مرحوم کی زندگی اور کلام پر ایک کتاب لکھی۔ ان کتابوں کی تالیف و تدوین کے سلسلہ میں مجھے بار بار حسن الدین احمد سے ملنے، گفتگو کرنے، عقائد و نظریات معلوم کرنے اور قول و عمل کو سننے اور دیکھنے کا موقع ملا۔ اسی احساس پر میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ یہ ممکن نہیں کہ آپ ایک مرتبہ حسن الدین احمد سے ملیں اور اُن کے گرویدۂ اخلاق نہ ہو جائیں ــــ خُلق ملکوتی صفت ہے، انسانیت کا جوہر ہے۔ سرورِ کائنات کا ارشادِ مبارک ہے: "خُلق آدھا دین ہے"۔ حضرت علیؓ کا قول ہے: "کشادہ رُوئی سے پیش آنا بھی ایک نیکی ہے"۔

ایک شخص ہر شخص کو خوش نہیں کر سکتا۔ حسن الدین احمد جہاں ہر شخص کو خوش نہیں کر سکتے وہیں کسی کو ناخوش بھی نہیں کرتے۔ اُن کا اُصول ہے

ہوا ممکن، تو یاری کی، نہیں تو غمگساری کی

اُن کے پاس مختلف لوگ آتے ہیں۔ ہندو، مسلمان، شاعر، ادیب، اخبار نویس، طالب علم، طالبِ معاش، عمالِ دفاتر، مستحق، مستمند۔ وہ خندہ پیشانی اور کشادہ دلی سے اُن کی پذیرائی کرتے ہیں اور جہاں تک ہو سکے قانون اور آئین کی حدوں میں عقدہ کشائی کرتے ہیں اور ایسی گتھیوں کے لئے، جن کا سُلجھانا اُن کے امکان سے خارج ہو، صائب مشورے دیتے ہیں، صحیح رہنمائی کرتے ہیں۔ اس طرح مستحق افراد کی یاس کو آس میں اور آزردگی کو آسودہ خاطری میں بدل دیتے ہیں۔ اور پھر وہی مایوس افراد نئی اُمیدوں کے ساتھ صحیح راستے سے منزلِ مقصود کی طرف چل پڑتے ہیں۔ حضرت علیؓ کا قول ہے: "کشادہ رُوئی ایک ایسی نیکی ہے جو بغیر کسی قسم کی مشقت اور تکلیف کے حاصل ہوتی ہے۔" لیکن آدمی کچھ ایسا خود خواہ اور متکبر واقع ہوا ہے کہ کشادہ رُوئی میں بھی، جس میں کچھ خرچ کرنا نہیں پڑتا، بُخل سے کام لیتا ہے۔

حسن الدین احمد ۱۲ فروری ۱۹۲۴ء کو "عزیز باغ"، بلدہ حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۴۳ء میں معاشیات اور سیاسیات میں ایم۔ اے کی تکمیل کے بعد بحیثیت مددگار ناظم اوقاف، سلکِ ملازمت میں شامل ہوئے۔ ۱۹۴۷ء میں حکومتِ حضورِ نظام نے انھیں حیدرآباد کے اوقافی انتظام کا دیگر ممالک کے اوقافی نظام سے موازنہ اور تقابلی مطالعہ کرنے کے لئے انگلستان، فرانس، سوئزرلینڈ، ناروے، سویڈن، ڈنمارک، ہالینڈ اور ترکی کے دورے پر روانہ کیا۔ جہاں انھوں نے اوقاف کے انضباط اور انتساق کے گہرے مطالعے اور رپورٹ کے بعد ایک جامع مطالعہ لکھ کر حکومت کے آگے

شاہد بھی

پیش کیا جس کے بعد انھیں ناظم اوقاف کے عہدے پر ترقی دی گئی۔ پولیس ایکشن کے بعد بحیثیت ڈپٹی کلکٹر محکمۂ مال میں منتقل ہوئے۔ بلدۂ اسپیشل سوشل سروس آفیسر بھی رہے۔ ۱۹۶۲ء میں آئی۔ اے۔ ایس کے لیے چُنے گئے۔ وشاکھاپٹنم میں جوائنٹ کلکٹر، ناگرجونا ساگر میں اسپیشل کلکٹر محبوب نگر میں ڈی۔ آر۔ او اور مجلسِ مال میں جوائنٹ سکریٹری کی خدمت مامور رہے۔ ۱۹۷۳ء میں مرکزی حکومت نے اُن کی بے مثال کارگزاری اوقاف کے تجربے اور فرض شناسی کی بنا پر اُن کے خدمات مرکز کے لئے حاصل کئے اور اب وہ وزارتِ قانون میں آفیسر آن اسپیشل ڈیوٹی (وقف) کے عہدے پر فائز ہیں۔

حسن الدین احمد کو مطالعے کا شوق اور تصنیف و تالیف کا ذوق اُن کے جدِ بزرگوار شمس العلماء عزیز جنگ ولاؔ مرحوم سے ورثے میں ملا ہے۔ زمانۂ طالب علمی ہی سے علمی، ادبی سرگرمیاں اُن کا محبوب مشغلہ رہا ہے۔ وہ بزمِ [illegible] کے معتمد رہے، عثمانیہ یونیورسٹی کے مجلۂ عثمانیہ (حصۂ اُردو) کے مدیر اور (حصۂ انگریزی) کے نائب مدیر رہے۔ ۱۹۴۹ء میں مجلۂ عثمانیہ کا جلیل نمبر مرتب کیا جو حضرت جلیلؔ کی حیات اور فن پر دستاویزی حیثیت رکھتا ہے۔ ہندوستان کے معاشرتی نظام پر کتاب لکھی جو بزمِ معاشیات جامعۂ عثمانیہ سے پروفیسر انور اقبال قریشی کی زیرِ نگرانی شائع ہوئی۔ ۱۹۴۵ء میں شریمد بھگوت گیتا کا اُردو میں ترجمہ کیا۔ جس کا پہلا ایڈیشن "نغمۂ الوہیت" کے نام سے ۱۹۴۶ء میں چھپا، دوسرا ایڈیشن ادارۂ علمیہ کی جانب سے ۱۹۵۵ء میں شائع ہوا اور تیسرا ایڈیشن ترقی اُردو بورڈ کی جانب سے ۱۹۷۵ء میں چھپا، جس کی رسمِ اجرا ہماری ہردلعزیز وزیرِ اعظم شریمتی اندرا گاندھی کے ہاتھوں عمل میں آئی۔ ۱۹۷۵ء میں "انجمن" کے نام سے سوانحی خاکے لکھے، جس کی رسمِ اجراء صدرِ جمہوریۂ ہند جناب فخرالدین علی احمد نے انجام دی ــــ گیارہ سال تک اپنی عمر کے بہترین ایام صرف کر کے اُردو الفاظ شماری پر کتاب لکھی اور خطیر رقم خرچ کر کے چھپوائی، یہ کتاب (۱۲×۹) بڑی تقطیع اور (۷۴۲) صفحات پر محیط ہے اور اُردو زبان میں اپنے موضوع پر پہلی کتاب ہے۔ ناقدین اور تبصرہ نگاروں نے اس کتاب کو ایک "تحقیقی پراجکٹ" دیا ہے۔ اس کتاب کی رسمِ اجرا بھی ۱۷ ستمبر ۱۹۷۳ء کو شریمتی اندرا گاندھی کے ہاتھوں عمل میں آئی ــــ فطری علاج پر ایک رسالہ لکھا۔ متعدد انگریزی مضامین کے اُردو میں ترجمے کئے۔ (۱۵) سے زائد اُردو کتابوں پر سیر حاصل مقدمے لکھے۔ ڈاکٹر لطیف کی مشہور انگریزی کتاب

وہ ذہن جس کی قرآن تعمیر کرتا ہے" اور نشی کانت چٹوپادھیا کی انگریزی کتابوں "میں نے اسلام کیوں قبول کیا؟" اور محمد پیغمبر اسلام پر انگریزی زبان میں مقدمے لکھے۔ ۱۹۶۱ء میں شمس العلماء عزیز جنگ ولا کی یاد میں "ولا اکادمی" قائم کی۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے قلیل مدت میں مختلف مصنفوں کی مختلف موضوعات پر متعدد کتابیں شائع کر کے قدیم اردو اداروں اور ناشرین کو مبہوت کر دیا۔

۱۹۵۴ء میں عالمی مذہبی کانگریس اور عالمی امن کانفرنس میں مندوب کی حیثیت سے شرکت کے لئے جاپان گئے جہاں انہوں نے "اسلام اور امن عالم" کے عنوان پر ایک پُر مغز مقالہ پڑھا۔ اور ریڈیو جاپان سے "بھودان تحریک" پر ایک تقریر نشر کی۔ ہندوستان کے باہر دیگر ممالک میں علاقہ مندانِ زبانِ اردو کے استفادے کے لئے "پُستک دان" تحریک کا آغاز کیا اور حصولِ امداد یا چندہ جمع کئے بغیر جاپان، روس اور چیکوسلاواکیہ، اسرائیل وغیرہ ممالک میں اردو کے کتب خانے قائم کئے۔ محبوب نگر کا غالب ہال انہی کی سعیٔ مشکور کی یادگار ہے۔

۱۹۶۲ء میں امریکہ کی سیاحت کی اور امریکہ کے ادبی اداروں کے طریقۂ کار کا مشاہدہ کیا۔ ۱۹۶۲ء سے ۱۹۷۵ء تک انسٹی ٹیوٹ آف انڈو مڈل ایسٹ کلچرل اسوسی ایشن کے صدر رہے۔ اس وقت ٹرسٹی ہیں (اس ادارے کے بانی اور صدر ڈاکٹر سید عبداللطیف مرحوم تھے۔ ادارے کی تاسیس مولانا آزاد کے تعاون سے عمل میں آئی تھی) ولا اکاڈمی کی صدارت اور "امیر خسروؒ قومی تقریبات کمیٹی" کے جنرل سکریٹری کے خدمات اِن ہی سے متعلق ہیں۔ اس کمیٹی کے بانی اور پہلے صدر فضیلت مآب فخرالدین علی احمد ہیں اور موجود صدر نواب علی یاور جنگ بہادر۔

حسن الدین احمد کے دادا شمس العلماء نواب عزیز جنگ ولا مرحوم اردو فارسی کے پُرگو شاعر، مورخ، سوشل ورکر، محکمہ مال کے اعلیٰ عہدہ دار، متصلح اور متشرع بزرگ تھے۔ ولا نے سترہ جلدوں میں فارسی زبان کی فرہنگ "آصف اللغات" تالیف کی جو ایک انسائکلوپیڈیا کا درجہ رکھتی ہے اس لُغت کو سر ریم۔ الیف۔ اُو۔ ڈُوڈیر نے magnum opus سے تعبیر کیا ہے۔ شبلی نعمانی، حالی، نواب عماد الملک بلگرامی، نواب محسن الملک، سر رچرڈ برن، معید اصفہانی، محمود زند یانی شیرازی اور علی اکبر شروانی شماخی جیسے دانشور، خاور شناس اور شعرا نے ولا کے کمالات کا اعتراف کیا ہے۔ یہ ولا ہی کا اثر ہے کہ ولا نے اگر سا لہا سال کی محنت کے بعد آصف اللغات لکھی تو ان کے نواسے نے گیارہ سال کی کد و کاوش کے بعد "اُردو الفاظ شماری" جیسی ضخیم کتاب مرتب کی۔

شاعرِ بحث

حسن الدین احمد کے پدر مرحوم نواب دین یار جنگ کا شمار ماہرِ نظم و نسق اور حیدر آباد کے تاریخ ساز افراد میں ہوتا ہے۔ وہ انسپکٹر جنرل پولیس تھے۔ پولیس ایکشن کے وقت ۱۷ ستمبر ۱۹۴۸ء کو جب ہندوستانی فوج حیدر آباد میں داخل ہوئی تو اُس وقت رضا کار لیڈر سید قاسم رضوی مرحوم شدتِ جذبات سے اپنا توازن کھو بیٹھے تھے اور انھوں نے رضا کاروں میں چند ہزار رائفل اس ہدایت کے ساتھ تقسیم کئے تھے کہ لڑتے ہوئے شہید ہو جاؤ۔ ایسے نازک وقت دین یار جنگ نے انتہائی دُور اندیشی، فرض شناسی اور جرأت سے کام لیتے ہوئے رضا کار لیڈر کو اس بات پر آمادہ کر لیا کہ وہ ہتیار ڈال دیں، اس طرح دین یار جنگ نے حیدر آباد کو میدانِ جنگ بننے سے بچا لیا۔

حسن الدین احمد کے عموئی بزرگوار نواب غازی یار جنگ مرحوم عدالت العالیہ کے رکن اور متشرع و فیض رساں بزرگ تھے اور دوسرے عم مولوی محی الدین احمد مرحوم کمشنر کے ناظم، قوانین مال اور نظم و نسق کے ماہر تھے۔

حسن الدین احمد کے چچا مولوی رکن الدین احمد وفا وظیفہ یاب ڈپٹی اکونٹنٹ جنرل، فینانس و حساب کے ماہر اور اردو، فارسی کے شاعر ہیں۔ حضرت وفا کے صاحبزادے جناب احمد عبدالعزیز آصف اردو کے شاعر اور مذہبی و تہذیبی سرگرمیوں میں پیش پیش رہتے ہیں۔

حسن الدین احمد کی شریکِ حیات محترمہ انیس فاطمہ، مولوی رکن الدین احمد صاحب وفا کی دختر ہیں۔ انھوں نے جامعہ عثمانیہ سے بی اے بی ایڈ کیا اور کئی کتابوں کی مؤلف ہیں۔ ان کی مشہور کتابیں "حیاتِ حالی" اور "حیاتِ سر سید" ہیں۔ بلدیہ حیدر آباد کی کونسلر بھی رہ چکی ہیں۔ موصوفہ نے اپنی آغوشِ تربیت میں اپنے دو فرزندوں شمس الدین احمد اور ظہیر الدین احمد کو پروان چڑھایا ہے۔ بڑے صاحبزادے انجینئر ہیں اور چھوٹے امریکہ میں ایم۔ بی۔ اے کی اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہے ہیں ـــــ عزیز باغ (جس کو ولا نے بسایا تھا) کے علمی، ادبی ماحول کو دیکھتے ہوئے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ "این خانہ تمام آفتاب است"۔

اسلام کے نزدیک بڑائی کی اساس تقویٰ ہے۔ لیکن اِتقا کے معنی یہ نہیں کہ انسان سجادہ بچھا کر تسبیح پڑھتا ہوا بیٹھا رہے۔ بُرائیوں سے بچنا بھی تقویٰ ہے۔ خدمتِ خلق بھی عبادت ہے ؎

عبادت بجز خدمتِ خلق نیست
بہ تسبیح و سجادہ و دلق نیست

آئن اسٹائن کا قول ہے: "انسانوں کی خدمت سے بلند اور کوئی مذہب نہیں سب کی بھلائی کے لئے کام کرنا ہی سب سے بڑا مذہب ہے۔"

حسن الدین احمد کو میں نے کبھی تقویٰ اور عبادت گزاری کی کاوش کرتے نہیں دیکھا۔ میرے نزدیک وہ اُن ریاکار عبادت گزاروں سے بہتر ہیں جن کی نسبت میں نے

بہ بیں چہ جامعِ اضداد شیخ پُر ہنر است
بہ دست سبحہ و در آستیں صنم دارد

بیان کیا جاتا ہے کہ ایک شخص نے حضرت ابراہیم ادہمؒ کی خدمت میں ایک مدت گزاردی اور وہ جب آپ سے رخصت ہونے لگا تو درخواست کی کہ مجھ میں جو عیوب دکھائی دیئے ہوں مہربانی کرکے مجھے بتا دیجئے تاکہ میں اپنی اصلاح کر سکوں۔ آپ نے فرمایا میں نے تم میں کوئی عیب نہیں دیکھا کیوں کہ تم کو ہمیشہ دوست کی نظر سے دیکھتا رہا ہوں تم اپنے عیوب کسی دوسرے سے دریافت کرو ——— ہر شخص میں کوئی نہ کوئی کمزوری ہوتی ہے۔

سہو و نسیان تقاضائے بشریت ہے۔ ہر انسان پیغمبر یا امام نہیں جو خامی اور کمزوری سے مُبرا و منزہ ہو ——— حسن الدین احمد میں بھی کوئی نہ کوئی کمزوری ضرور ہوگی لیکن بقول حضرت ابراہیم ادہمؒ میری نظر وہاں تک نہیں جاتی۔

یہ بات اہم نہیں کہ وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں۔ اہم ترین امر یہ ہے کہ اُنہوں نے علم کو "یار" بنایا "مار" نہیں بنایا ؎

علم را بر تن زنی ماری بود
علم را بر دل زنی یاری بود (اقبال)

اُنہوں نے علم اور عمل کو ساتھ ساتھ رکھا۔ باب العلم کا قول ہے: "علم بغیر عمل گمراہی ہے۔" ہر شخص چاہتا ہے عالم بن جاؤں لیکن بہت کم لوگ اُس کی قیمت ادا کرتے ہیں۔ قیمت کیا ہے؟ عمل!۔

اس کی کوئی اہمیت نہیں کہ اُنھوں نے کتنی کتابیں تالیف کیں۔ اہمیت اس میں ہے کہ اُنہوں نے اپنی تحریروں کو تنافر، تنگ نظری، دل آزاری، مناظرے اور مناقشے سے پاک رکھا۔ ہم زیستی، عدم تعصب، مسالمت، مساوات اور محبت کے پرچار کو اپنی تحریر کا موضوع بنایا۔ محبت بڑی چیز ہے، محبت انسان کی کسوٹی ہے۔ "محبت فاتح عالم ہے" اور سچ پوچھا جائے تو انسان کی تہذیب اور تمدن کی بنیاد محبت ہے اور صرف محبت ہے۔ اُنکی کتاب تحریر بھگوت گیتا کا ترجمہ اسی بات کی دعوت ہے کہ مسلمان دیگر مذاہب کی مقدس کتابوں کا مطالعہ کریں تاکہ بطور خاص غیر مذہب کے پیرو کا مسلمانوں کی مقدس کتابوں کا مطالعہ کریں جس نے اپنی کتاب الحسنی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ صرف ایک ہی قسم کے پھولوں سے گلدستہ نہیں بنایا جاتا۔ مختلف رنگ و بو رکھنے والے پھولوں سے گلدستہ بنتا ہے گل ہائے رنگ رنگ سے ہے زینتِ چمن

اور مختلف مذہب و مشرب رکھنے والے لوگوں کی موافقت اور مواخذہ سے بقائے انجمن ہے۔

یہ بات شایانِ اظہار نہیں کہ وہ صاحبِ تصنیفات ہیں بلکہ قابلِ فخر بات یہ ہے کہ وہ اپنی محنت سے حاصل کی ہوئی جائز دولت کو لہو ولعب اور عیش و نشاط کی بجائے علمی ادبی کام میں صرف کرتے ہیں۔

یہ بات قابلِ ذکر نہیں کہ وہ آئی۔ اے۔ ایس ہیں۔ ہمارے اکثر اعلیٰ عہدہ داروں کی تصویر اکبر الہ آبادی نے اس طرح کھینچی ہے ؎

ہم کیا کہیں دنیا میں کیا کارِ نمایاں کر گئے
بی۔ اے ہوئے، نوکر ہوئے، پنشن ملی اور مر گئے

قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ وہ ایک مثالی دیانت دار اور فرض شناس عہدہ دار ہیں۔ سرکاری فرائض کی انجام دہی کے بعد اپنے بہترین اوقات فرصت علمی ادبی سرگرمیوں کے لئے وقف کرتے ہیں۔

وہ بہت کم گو ہیں۔ صرف اُس وقت بات کرتے ہیں جب بات کرنا خاموشی سے بہتر ہو۔ میں نے اُن کی زبان سے کبھی کسی کی غیبت نہیں سُنی۔ اگر کسی سے اُن کو شکایت پیدا بھی ہوجائے تو اُس کا اظہار اس پیرائے میں کرتے ہیں کہ اُس پر غیبت کی بجائے "غائبانہ شکوے" کا اطلاق ہوتا ہے۔ میں نے اُن کو کبھی غصے کی حالت میں نہیں دیکھا۔ وہ نوکروں سے بھی نرمی سے گفتگو کرتے ہیں۔ اصولِ حفظانِ صحت کی پابندی کرتے ہیں میں نے انہیں کبھی بیمار ہوتے نہیں دیکھا۔

اس میں کوئی قصیدہ خوانی یا شاعرانہ غلو و اغراق نہیں بلکہ حقیقت ہے کہ حسن الدین احمد مادرِ وطن کے قابلِ فخر سپوت، اہلِ وطن کے سچے ہمدرد، اچھے ادیب، سچے مسلمان، حکومت کے فرض شناس اور دیانت دار عہدہ دار، والدین کے فرماں بردار اور خدمت گزار، بچوں کے مشفق، انیس زندگی کے بہترین ہمسر، دوستوں کے دستیار، ملنسار، متواضع، زود آشنا، دوست داشتنی، مرنجاں و مرنج، درگزر کرنے والے، بات کے سچے، وعدے کے پورے، معاملے کے کھرے اور جامع فضل و کمال ہیں، اور یہ سب کچھ بعید از توقع نہیں کیونکہ اُنہوں نے اپنے آپ میں انسانیت کا جوہر پیدا کیا ہے۔ علم و عمل اور فضل و کمال کے زینے طے کرنے کے لئے نہ صرف اولین بلکہ واحد شرط "انسان" ہونا ہے۔ اگر کوئی انسان بن جائے تو اُس کے لئے جامی کے الفاظ میں "محیطِ فضل و اہبِ دُرِّ جِ کمال، نتیجِ احساب" بن جانا بدیہی اور مسلّم ہے۔

مقالہ

اُردو الفاظ شماری

نثار احمد فاروقی
دہلی کالج - اجمیری گیٹ، دہلی ۶

زبانیں بھی انسانوں کی طرح قوم، قبیلے اور نسلوں میں بٹی ہوئی ہیں۔ الفاظ کی حیثیت افراد قوم کی سی ہے۔ جس طرح انسانوں میں بعض قبیلے دوسرے سے رشتے قائم کر لیتے ہیں اور اپنا حسب نسب اُن سے ملا لیتے ہیں اسی طرح بعض زبانیں دوسری زبانوں سے اتحاد کا رشتہ جوڑتی ہیں بعض سے نہیں۔

انسان پیدا ہوتا ہے، جوان ہوتا ہے، شہرت اور کمال کے بام عروج پر پہنچتا ہے، اپنی صلاحیت اور قدر و قیمت منواتا ہے، دوسروں کو فائدے پہنچاتا ہے، پھر ایک دن اُس کی افادیت ختم ہو جاتی ہے وہ کنج خول میں چھپ جاتا ہے۔ یا موت کا ہاتھ اُسے اُچک لیتا ہے۔ اور وہ سوسائٹی سے علٰحدہ ہو جاتا ہے۔ پھر رفتہ رفتہ اُس کی یاد بھی محو ہونے لگتی ہے، اس طرح کہ کچھ زمانے کے بعد کوئی شخص نہ اُس کا نام جان سکتا ہے۔ نہ اَتا پتا بتا سکتا ہے؛ اور کچھ انسان ایسے زندۂ جاوید ہو جاتے ہیں کہ وہ ہر زمانے اور ہر دَور میں زندہ رہتے ہیں۔

یہ اور اِس طرح کی ہزاروں باتیں جو آپ انسانوں کی اجتماعی اور انفرادی زندگی کے بارے میں سوچ سکتے ہیں۔ زبان اور الفاظ پر اُن کا اطلاق کیجئے تو بالکل مطابق حال ملیں گی۔ الفاظ بھی پیدا ہوتے ہیں، رواج پاتے ہیں، شہرت کے بام عروج پر پہنچتے ہیں اور رفتہ رفتہ گمنام یا مُردہ ہو جاتے ہیں۔ ہر انسان میں کچھ نہ کچھ صلاحیت اور ہر لفظ میں معنویت ہوتی ہے، انسان کی صلاحیت کا خزانہ بھی ایک دن ختم ہو جاتا ہے اور الفاظ بھی بے معنی ہو کر رہ جاتے ہیں۔ بعض انسان دوسری قوم یا قبیلے میں ایسے ضم ہو جاتے ہیں کہ اُن کے اصلی حسب نسب کا سُراغ لگانا تقریباً ناممکن ہو جاتا ہے۔ اِسی طرح دوسری زبانوں کے الفاظ اِس طرح کسی زبان میں دَر آتے ہیں کہ اُن کی اصلیت کا اندازہ بہت ہی تحقیق مطالعہ کرنے کے بعد ہو سکتا ہے۔ لیکن کچھ انسان ایسے بھی ہوتے ہیں جو برسوں تک دوسرے افراد کے ساتھ یا کسی بیگانہ سوسائٹی میں رہ کر بھی اپنی انفرادیت نہیں چھوڑتے اور دُور سے پہچان لئے جاتے ہیں۔ یہی حال لفظوں کا ہے۔

انسان کی سرگزشت ہوتی ہے۔ لفظوں کی بھی ہوتی ہے۔ ہر انسان کسی خاص کام کے لئے اپنی صلاحیتوں کو مجتمع اور CULTIVATE کرتا ہے۔ اُسی طرح الفاظ بھی خاص علوم و فنون کے لئے یا بعض مخصوص اظہار کے لئے مختص ہو کر رہ جاتے ہیں۔

غرض زبان اور علم زبان کا مطالعہ اِس نقطۂ نظر سے کیا جائے تو وہ بہت ہی دلچسپ نتائج پیش کرتا ہے۔ عہدِ حاضر میں ٹکنالوجی نے اتنی ترقی کر لی ہے کہ اب کمپیوٹر کے ذریعہ مواد و شمار جمع کر کے کچھ ایسے نتائج نکالے جا سکتے ہیں جن کا تصور ہمارے اسلاف آج سے سو دو سو سال پہلے نہیں کر سکتے تھے۔ دنیا کی بڑی اور ترقی یافتہ زبانوں میں یہ کوشش کی گئی ہے کہ ہر زبان کے الفاظ کا شمار کیا جائے اور اُن میں جو سب سے زیادہ استعمال میں آنے والے ہیں، اُن کا تناسب نکالا جائے۔ الفاظ کو اِس اعتبار سے دو بڑے خانوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ شناختی الفاظ RECOGNITIONAL اور مستعمل الفاظ FUNCTIONAL یعنی کچھ لفظوں کو ہم صرف لکھا ہوا دیکھ کر پہچان لیتے ہیں، لیکن جب خود بولتے ہیں تو وہ بے تکلف ذہن میں نہیں آتے اور کچھ الفاظ ایسے ہیں کہ جب ہم بولتے ہیں یا کچھ لکھنے بیٹھتے ہیں تو وہ خود بخود زبان یا قلم سے نکلتے ہیں اور ہمارے مفہوم یا مافی الضمیر کو دوسروں تک پہنچاتے ہیں۔

جدید علم اللسان نے الفاظ شماری کا طریقہ ایجاد کر کے ہمیں کسی حد تک یہ بتا دیا ہے کہ علم کے کس شعبے میں کون سے الفاظ زیادہ استعمال ہوتے ہیں اور یہ کام کمپیوٹر کی مدد سے لیا گیا ہے۔ اُسے مختلف علوم کی کتابوں سے کئی لاکھ الفاظ دے دئے جاتے ہیں اور پھر وہ ہر لفظ کی تکرار [illegible] بتا دیتا ہے۔ اِس سے فائدہ یہ ہوتا ہے کہ جب اُس علم کی یا کسی خا[illegible] سے متعلق مصطلحات کی فرہنگ مرتب کی جاتی ہے تو ایسے الفاظ کو ترجیح دی جائے گی اور اُن کی تشریح و تفسیر وغیرہ میں زیادہ کاوش سے کام لیا جائیگا جن کا چلن زیادہ ہے۔ اِسی طرح [illegible] کی نصابی کتابیں مرتب

شاعر۔ یہی

کرتے وقت الفاظ کے استعمال کا تناسب معلوم ہوگا تو وہی الفاظ بتدریج استعمال کئے جائیں گے جن کا چلن زیادہ ہے۔ اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ سیکھنے والا کم سے کم مدت میں زیادہ سے زیادہ کارآمد الفاظ سیکھ لے گا۔ اس کے سوا بھی الفاظ شماری سے دوسرے اعلیٰ درجے کے علمی اور لسانی نتائج برآمد کئے جاسکتے ہیں۔

اُردو زبان دنیا کی زندہ زبانوں میں سے ایک ہے۔ اُس کا ادب بھی عمر میں کم ہونے کے باوجود جاندار ہے لیکن ابھی تک اس زبان میں ایسی کوئی تحقیق نہیں ہوسکی جو یہ بتائے کہ اُردو کا وہ ذخیرۂ الفاظ جو کثرت سے فنکشن کرتا ہے کتنا ہے؟ اس میں افعال، اسماء اور حروف کا تناسب کیا ہے؟ مفردات اور مرکبات کس مقدار میں ہیں؟ غیر زبانوں میں عربی فارسی انگریزی سنسکرت وغیرہ زبانوں سے کتنے اور کس طرح کے الفاظ مستعار لئے گئے ہیں۔ ان میں کیا ردّ و بدل ہوا ہے اور وہ کن تاریخی ادوار سے گذرے ہیں۔ اس کے دو اسباب ہیں: ایک تو یہ کہ جدید علم لسانیات کی روشنی میں اُردو میں بہت کم حضرات نے کام کیا ہے۔ دوسرے یہاں کمپیوٹر جیسی مشین کا استعمال ابھی اتنا عام نہیں ہوا ہے۔

حسن الدین احمد صاحب بہت ہی متنوع ذوق اور علمی لگن کے انسان ہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ یہ ذوق انھیں وراثت میں پہنچا ہے۔ وہ نواب عزیز جنگ ولاؔ کے پوتے ہیں جن کی درجنوں تصانیف ہیں۔ اور ان میں صرف ایک آصف اللغات ہی ایک عظیم الشان کارنامہ ہے جس کی ۱۵ جلدیں بڑے سائز کی حرف جیم تک پہنچی ہیں۔ فارسی زبان کا اتنا جامع اور وسیع لغت دوسرا کوئی نہیں لکھا گیا۔ یہ منصوبہ اگر مکمل ہوجاتا تو کسی طرح ۸۰ جلدوں میں کم میں نہ سماتا۔ نواب عزیز جنگ کی تمام عمر تصنیف و تالیف میں مصروف رہے اور انھوں نے ایسے متنوع موضوعات پر اہم کتابیں یادگار چھوڑی ہیں کہ اب انھیں دیکھ کر نواب مرحوم کے ذوق اور لگن کی داد دینا پڑتی ہے۔ یہی حال ہمارے دوست حسن الدین احمد صاحب کا ہے۔ اُنھوں نے لغت، لسانیات، ادب فارسی، ادب اُردو، اسلامیات اور قانون کے موضوعات پر بہت وقیع کام کئے ہیں۔ لیکن اکثر مصنفوں کے ساتھ ایک ستم ظریفی ہوتی رہی ہے کہ خود وہ اپنی جن علمی کاوشوں کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں زمانہ اُسے اتنا نہیں پہچانتا۔ عمر خیام سے اگر پوچھا جاتا کہ تم ریاضی داں ہو یا شاعر۔ تو یقین ہے کہ وہ ریاضی کا نام لیتا۔ مگر آج خیام کے ہزاروں مداحوں کو یہ معلوم بھی نہ ہوگا کہ وہ اس فن میں کیا مرتبہ رکھتا تھا۔ اسی طرح اُردو میں مرزا محمد ہادی رسواؔ کو ناول نگار کی حیثیت سے سب جانتے ہیں مگر کم ہی لوگوں کو معلوم ہوگا کہ اُن کا فطری رجحان سائنس کی طرف تھا اور انھوں نے اپنی ایک چھوٹی سی لیباریٹری قائم کی تھی

بنا رکھی تھی جس میں سائنس اور کیمسٹری کے مختلف تجربات کیا کرتے تھے اور یہ ناول جن پر اُن کی شہرت کا ایوان قائم ہوگیا ہے۔ اُنھوں نے صرف اس لئے سرسری طور سے لکھے تھے کہ اُن کا کچھ معاوضہ ملے گا تو اس سے اپنی لیباریٹری کے لئے کچھ آلات خرید سکیں گے۔

حسن الدین احمد صاحب بھی آئی اے ایس آفیسر ہیں۔ وہ آندھرا کے مختلف اضلاع میں ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ رہے۔ اور اب وزارت قانون میں محکمۂ مسلم اوقاف کے لئے افسر خاص ہیں۔ اُنھوں نے کس محنت اور دیدہ ریزی کے ساتھ الفاظ شماری کا یہ کام کیا ہوگا، اس کا اندازہ اُن حضرات کو نہیں ہوسکتا جو اب ہر صفحے پر صرف چند الفاظ کی فہرست اور اُن کے سامنے کچھ اعداد و شمار دیکھ رہے ہیں۔ اس محنت اور لگن کو وہی لوگ سراہ سکتے ہیں جنھوں نے الفاظ شماری کی اہمیت کو سمجھا ہے اور اس میں جو اُصول اور طریق کار اپنائے جاتے ہیں اُن سے کچھ واقفیت حاصل کی ہے۔ بلکہ یہ بات صرف سراہنے ہی تک محدود نہ رہے اگر وہ یہ بھی محسوس کرسکیں کہ یورپ اور امریکہ میں جو کام مشینوں کے ذریعے ہوتے ہیں اُسے حسن الدین احمد صاحب نے اپنے ہاتھ سے چھوٹے چھوٹے کئی لاکھ کارڈ بنا کر کیا ہے۔ کئی سال کی لگاتار محنت کے بعد اُنھوں نے یہاں یہ بتایا ہے کہ اُردو زبان میں کن لفظوں کا چلن کتنا ہے اور وہ علوم کے مختلف شعبوں میں کس تناسب سے استعمال ہوتے ہیں۔ اُردو صحافت کی لفظیات شمار کرنے کا کام میک گل یونیورسٹی کناڈا میں ڈاکٹر بارکر صاحب نے بھی کئی سال کی محنت کے بعد کیا تھا، لیکن وہ صرف اخباری زبان کی لفظ شماری تک محدود تھا اور حسن الدین احمد صاحب نے اُسے دوسرے علوم بلکہ بول چال تک پھیلا دیا ہے۔

اُردو زبان میں اس نوعیت کا دوسرا کوئی کام آج تک نہیں ہوا۔ اس اعتبار سے حسن الدین احمد صاحب کی تالیف 'الفاظ شماری' کو تقدم کی فضیلت بھی حاصل ہے۔ اگر اس کام کی صحیح قدر و قیمت کا صحیح اندازہ کرلیا جائے تو ابتدائی کتابوں سے ڈگری کلاسوں تک کے نصاب کی تیاری میں بہتری پیدا ہوسکتی ہے۔

اس کام کی اہمیت کے علاوہ 'الفاظ شماری' کا مقدمہ خود مصنف کے ریاض اور غور و فکر کا ثمرہ ہے۔ اس میں بعض بنیادی نکات کی طرف حسن الدین صاحب نے اشارہ کیا ہے انھیں اگر وسعت دی جائے تو اُردو زبان کے الفاظ کی ایک ایسی تاریخ لکھی جاسکتی ہے جس میں ہر لفظ کا اشتقاق ہی نہیں اُس کی [illegible] بھی آسکتی ہے۔

جیسا کہ میں نے آغاز میں بھی اشارہ کیا ہے حسن الدین صاحب تصنیف و تالیف

(باقی ۴۲ پر دیکھئے)

بُنیادی اُردو

حسن الدین احمد
سی - ۳۰۷، کرزن روڈ، اپارٹمنٹ - نئی دہلی-۱

۱۔ بُنیادی اُردو کیا ہے؟

اُردو میں کم و بیش ۵۵ ہزار الفاظ ہیں۔ اگر علمی اور پیشہ ورانہ اصطلاحات، محاوروں اور بول چال کے الفاظ کو ملا لیا جائے تو یہ تعداد اور بھی بڑھ جائیگی۔ یہ کثیر ذخیرۂ الفاظ تو موجود ہے لیکن اس میں تقریباً ایک ہزار الفاظ ہی ناگزیر ہوتے ہیں اور ان سے روزمرہ کی بات چیت، کاروبار، پڑھنا لکھنا سب کچھ ہو سکتا ہے۔

بُنیادی اُردو کا مقصد کوئی نئی یا مصنوعی زبان رائج کرنا نہیں ہے۔ بلکہ اُردو کے منتخب لفظوں کو رائج کرنا ہے۔ بہ الفاظِ دیگر اُردو زبان کو منتخب لفظوں کی ایک مخصوص تعداد میں محدود کرنا ہے۔ جن الفاظ پر عام رواج کی مہر لگ گئی ہے یعنی کثیر الاستعمال ہیں یا جو اور کسی حیثیت سے اہم ہیں اُن کا انتخاب ماہرانہ احتیاط سے کرنا ہوگا۔ اس طرح جو فہرست مرتب ہوگی اس کو جنرل سروس لسٹ کہیں گے۔

کثیر الاستعمال ہونے کا تعین کوئی آسان کام نہیں۔ زبان کے مختلف شعبوں سے شائع شدہ ادب کا انتخاب کر کے، شائع شدہ ادب جن الفاظ پر مشتمل ہو اُن کی فریکوئنسی معلوم کرنا ہوتا ہے۔

اُردو الفاظ شماری[1] کے ذریعہ پہلی مرتبہ گیارہ ہزار اُردو الفاظ کی فریکوئنسی متعین کر دی گئی اور فہرست بلحاظِ فریکوئنسی (گھٹتی ہوئی ترتیب میں) مرتب کر دی گئی[2] جس کی مدد سے اُردو کے ایک ہزار، ڈیڑھ ہزار یا دو ہزار زیادہ مستعمل الفاظ معلوم کئے جا سکتے ہیں۔

اب دوسرا کام الفاظ کا انتخاب اُن کی اپنی افادی اہمیت کی بنیاد پر کرنا ہے۔ پہلا کام یعنی کثیر الاستعمال ہونے کا تعین ایک OBJECTIVE کام ہے اور اس میں فریکوئنسی کا تعین کرنے والے کی رائے کو دخل نہیں ہوتا لیکن دوسرا کام SUBJECTIVE ہے۔ اس میں انتخاب کرنے والے کی رائے کو دخل ہوگا۔ اسی لئے کسی فردِ واحد کی اختیارِ تمیزی پر اس کو نہیں چھوڑا جا سکتا۔ اس کام کو اسکالرز اور ماہرین کی ایک جماعت کے سپرد کرنا ہوگا۔

الفاظ شماری کا کام کئی مقاصد کو حاصل کرنے کا ذریعہ تھا۔ بذاتِ خود کوئی مقصد نہ تھا۔ یہ ایک بُنیادی کام تھا جس کے نتیجہ کو سامنے رکھ کر کئی ایک تحقیقاتی کام انجام دئیے جا سکتے ہیں جن سے زبان کو فروغ دیا جا سکے اور اس کی ترویج میں مدد مل سکے۔ یہ ایک دُشوار گذار راستہ تھا جس کو بہرحال طے کرنا ہی تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ وہ راستہ طے ہو چکا۔ اب ایک اہم کام بُنیادی اُردو کی فہرست یعنی GENERAL SERVICE LIST مرتب کرنا ہے۔ جس سے ایک عام آدمی اُردو میں اپنے خیالات کا پورا پورا اظہار کر سکے۔

اُردو الفاظ شماری کے ذریعہ الفاظ کی فریکوئنسی کی حد تک بُنیادی اعداد و شمار فراہم کر دئیے گئے۔ ان اعداد سے طرح طرح کے کام لئے جا سکتے ہیں۔ مثلاً اُردو زبان کی ساخت پر تحقیقاتی کام وغیرہ۔ ان ہی میں سے ایک کام جنرل سروس لسٹ GENERAL SERVICE LIST کی تیاری اور بنیادی اُردو کی ترویج بھی ہے۔

۲۔ بُنیادی اُردو کے فوائد

بُنیادی اُردو نہ صرف ایسے لوگوں کے لئے مفید ہوگی جن کی مادری زبان اُردو نہیں ہے اور جو اُردو سیکھنا چاہتے ہیں بلکہ ایسے لوگوں کیلئے بھی مفید ہوگی جن کی مادری زبان اُردو ہے۔ بُنیادی اردو کا ایک بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ دماغ پر ہزاروں غیر ضروری الفاظ کا بار نہ پڑے گا۔ اور معمولی پڑھا لکھا آدمی بھی ہر قسم کی علمی اور ادبی معلومات سے فائدہ حاصل کر سکے گا۔ بچّے بھی

[1] اُردو الفاظ شماری از حسن الدین احمد، سلسلۂ ولا اکیڈمی (۲، ۲) ۱۹۷۳ء

[2] ملاحظہ ہو صفحہ ۵۹۰۔ اُردو الفاظ شماری

زبان کی پیچیدگیوں سے بچ جائیں گے۔

اندازہ لگایا گیا ہے کہ عوام کی بڑی تعداد کو دو ہزار سے زائد الفاظ کی ضرورت نہیں ہوتی۔ صرف چند عالموں، ادیبوں اور مفکروں کو زائد الفاظ استعمال کرنا ضروری ہوتا ہے۔ زائد الفاظ کے گورکھ دھندے سے عوام کو آزاد کرنا ضروری ہے تاکہ غیر مانوس الفاظ کا بوجھ اُن کے ذہن پر نہ پڑے اور وہ اپنے دماغ کو تخلیقی خیالات کی آماجگاہ بنا سکیں۔

۴۔ بنیادی اُردو میں کتنے الفاظ ہوں؟

یہ ایک اہم سوال ہے۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ معمولی تعلیم پایا ہوا آدمی جس کی مادری زبان اُردو ہے کم و بیش سات آٹھ ہزار اُردو الفاظ جانتا ہے اور روزمرہ کاروبار میں اُن کا استعمال کرتا ہے[4] لیکن ان میں سے جو الفاظ ناگزیر ہیں اور جن کے بغیر چارہ نہیں، اُن کی تعداد کم و بیش ایک ہزار ہوگی۔ انگریزی میں بنیادی الفاظ کی تعداد ۸۵۰ قرار دی گئی تھی۔ اسی کے اتباع میں جناب سجاد مرزا مرحوم نے اُردو کے ۸۵۰ الفاظ کی فہرست مرتب کی۔ یہ فہرست کسی باضابطہ طریقۂ کار کا نتیجہ نہ تھی۔

جب ہم "بنیادی اُردو" کی بات کرتے ہیں تو اُس کو محض ایسے الفاظ تک محدود نہیں کرنا چاہیئے جن کے بغیر چارہ نہیں، بلکہ اس فہرست میں تمام ضروری الفاظ کو شامل کر لینا چاہیئے۔ بہ الفاظِ دیگر سات آٹھ ہزار الفاظ کی فہرست سے غیر ضروری الفاظ کو جن کے بغیر بھی ابتدائی کام چل سکتا ہے خارج کر دینا چاہیئے۔ اِس طرح جو فہرست حاصل ہوگی وہ حقیقی معنوں میں کام چلاؤ فہرست ہوگی۔ اگر ایسے الفاظ جن کے بغیر چارہ نہیں کم و بیش ایک ہزار ہو سکتے ہیں تو محتاط اندازہ کے مطابق جنرل سروس لسٹ دو ہزار الفاظ پر مشتمل ہونی چاہیئے۔

۴۔ علٰحدہ ج۔ س۔ ل کیوں؟

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیوں ایک علٰحدہ جنرل سروس لسٹ کی بات کی جائے۔ اور کیوں اُردو کے دو ہزار زیادہ مستعمل الفاظ ہی کو (یعنی ایسے الفاظ ہی کو جن کی فری کوئنسی زیادہ ہو) جنرل سروس لسٹ قرار نہ دیا جائے۔ دوسری زبانوں میں جو تجربے ہوئے ہیں اُن سے ظاہر ہوتا ہے کہ محض اعداد و شمار کی بنیاد پر حاصل ہونے والی فہرست ہماری تمام ضروریات کو پورا نہیں کر سکتی۔ اعداد و شمار سے فہرست کی ترتیب کے دوران ہر قدم پر مدد لی جائے گی، لیکن محض کثیر الاستعمال الفاظ کی فہرست کو جنرل سروس لسٹ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ زیادہ فری کوئنسی والے دو ہزار الفاظ میں تمام ناگزیر اور [illegible]

ضروری الفاظ موجود ہوں یہ ضروری نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ ناگزیر اور ضروری الفاظ گیارہ ہزار کی فہرست میں پھیلے ہوئے ہوں۔ جو ناگزیر اور ضروری الفاظ کی فری کوئنسی زیادہ ہوگی وہ ابتدائی ایک ہزار یا دو ہزار الفاظ میں موجود ہوں گے اور جن کی فری کوئنسی نسبتاً کم ہوگی وہ بعد میں ملیں گے۔ یہ صحیح ہے کہ ناگزیر اور ضروری الفاظ کی فری کوئنسی بھی بلحاظ مقابل [illegible] ہوگی اور بہت ہی کم نہ ہوگی۔ لیکن یہ ضروری نہیں کہ تمام ناگزیر اور ضروری الفاظ پہلے دو ہزار الفاظ کی فہرست میں موجود ہوں۔ ج۔ س۔ ل میں ہم کو ایسے الفاظ کو شریک کرنا ہیں جن کی فری کوئنسی زیادہ ہے اور ان الفاظ کو بھی جن کی فری کوئنسی زیادہ نہیں ہے لیکن جو زبان سیکھنے کے لئے از بس ضروری ہیں۔ مثلاً ناپ تول، گنتی، ہفتہ کے سات دنوں اور مہینوں کے نام، بین الاقوامی الفاظ وغیرہ۔ اس لئے بنیادی اُردو کی فہرست مرتب کرنے میں کئی پہلوؤں پر نظر رکھنا ہوگا۔ یہ کام ایسا آسان نہیں ہے جیسا کہ بعض اصحاب نے خیال کیا ہے۔ مثلاً جناب محمد اجمل خاں نے انگریزی فہرست کے ترجمہ ہی کو بنیاد قرار دیا ہے[3] اُس وقت تک اُردو میں الفاظ شماری کا کام نہیں ہوا تھا۔ اس لئے کسی نہ کسی فہرست کو بنیاد قرار دینا ہی تھا۔ اب اُردو الفاظ شماری کی تکمیل کے بعد فہرست بلحاظ فری کوئنسی کے پہلے ایک ہزار الفاظ ہی کو بنیاد قرار دینا ہوگا۔ مختلف طریقوں سے اہم الفاظ کا انتخاب کیا جائے گا اور دوسری زبانوں کی بنیادی فہرستوں سے بھی مدد لی جائے گی لیکن الفاظ کا آخری انتخاب فری کوئنسی کی بنیاد پر ہوگا۔

۵۔ ج۔ س۔ ل کیونکر بنائی جائے؟

جنرل سروس لسٹ کے دو ہزار الفاظ کے منجملہ کم و بیش ایک ہزار ایسے الفاظ تو وہ ہوں گے جو اُردو کے کثیر الاستعمال الفاظ ہیں یعنی فہرست بلحاظ فری کوئنسی کے پہلے ایک ہزار بارہ الفاظ جن کی فری کوئنسی ۵۰ اور اس سے زائد ہے۔ مزید ایک ہزار الفاظ کا انتخاب الفاظ کی اپنی اہمیت کے پیشِ نظر دوسرے طریقوں سے کرنا ہوگا۔ اگر دوسرے طریقوں سے منتخب کئے گئے الفاظ کی فری کوئنسی بہت کم ہو تو اُن کو خارج کیا جائے گا۔ اس طرح جو ناگزیر اور ضروری الفاظ کی فری کوئنسی ۵۰ یا اس سے زائد ہو وہ ایک ہزار بارہ الفاظ کی فہرست میں موجود ہوں گے۔

---

[3] "بنیادی ہندوستانی کے الفاظ" از محمد اجمل خاں، رسالہ اُردو، اکتوبر [illegible]

[4] ملاحظہ ہو اُردو کے ۱۰۹۴۰ الفاظ کی فہرست بلحاظ فری کوئنسی [illegible] میں مجموعی [illegible] الفاظ شماری [illegible]

[5] ملاحظہ ہو مقالہ "بنیادی ہندوستانی کے الفاظ" رسالہ اُردو اکتوبر ۱۹۳۸

ہیں شامل کرنا ہوگا۔

الفاظ کا انتخاب اُن کی اپنی اہمیت کے پیشِ نظر کرنے کے ضمن میں حسبِ ذیل گروہوں [illegible] پر غور کیا جاسکتا ہے۔

بین الاقوامی الفاظ

اُردو میں جو بہت سے بین الاقوامی الفاظ مستعمل ہیں اُن میں ایک قسم اُن الفاظ کی ہے جو محض سہولت کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں، لیکن جن کا ترجمہ ہوسکتا ہے مثلاً بکس (بکس)، پیمفلٹ (رسالہ)، ماچس (دیا سلائی) وغیرہ یا جن کو اُردو بنا لیا گیا ہے مثلاً Towel سے تولیہ۔ Bottle سے بوتل وغیرہ دوسری قسم اُن الفاظ کی ہے جن کا ترجمہ نہیں ہوسکتا یا نہیں ہونا چاہئے مثلاً موٹر، پٹرول، ٹیلیفون، ریڈیو، راکٹ، آکسیجن، ایٹم۔ بسکٹ۔ کالج۔ اسکول وغیرہ۔
—— ان ہی الفاظ کو بین الاقوامی الفاظ کہا جاتا ہے۔ ان کی تعداد اُردو میں ۵۰ اور ۷۰ کے درمیان ہوگی۔ جنرل سروس لسٹ میں ان کی شمولیت ضروری ہے۔

بنیادی مصدروں۔ اسموں اور صفتوں کا انتخاب

پہلے ہمیں یہ طے کرنا ہوگا کہ ج۔ س۔ ل میں مصدروں، اسموں اور صفتوں کا تناسب کیا ہو اور پھر اُن کی فہرستیں بنانا ہوں گی۔ جو مصدر اسم اور صفت ایک ہزار بارہ الفاظ کی فہرست (فہرست بلحاظ فری کوئنسی، میں موجود ہیں اُن کو چھوڑ کر بقیہ کو شامل کرنا ہوگا۔ اس طرح جن الفاظ کی فری کوئنسی بہت کم ہو اُن کو خارج کرنا ہوگا۔

بنیادی اسموں کے انتخاب میں نہایت احتیاط اور غور و فکر کی ضرورت ہے۔ اس ضمن میں دو فہرستیں بنانی ہوں گی۔ وہ اسماء جن کی تصویریں بن سکتی ہیں اور وہ جن کی تصویریں نہیں بن سکتیں۔

بنیادی مصدروں، اسموں اور صفتوں کی فہرستیں بناتے وقت مختلف پیشوں میں استعمال ہونے والے الفاظ کو پیشِ نظر رکھنا ہوگا۔ دیگر انگریزی اور دوسری زبانوں میں جن الفاظ کو بنیادی الفاظ قرار دیا گیا ہے اُن کے ترجموں کو بھی پیشِ نظر رکھنا ہوگا (یہ بات بنیادی انگریزی کے ترجمہ کو بنیاد بنانے سے مختلف ہے)

جب بنیادی انگریزی کی فہرست ۱۹۲۸ء میں مرتب اور ۱۹۲۹ء میں شائع ہوئی تھی تو ماہرین نے اس پر کافی بحث کی۔ بعض چاہتے تھے کہ افعال کی تعداد زیادہ ہو کیونکہ ہر مفہوم کو ادا کرنے کے لئے افعال استعمال ہوتے ہیں اس لئے اُن کو زبان کا جزو اعظم ہونا چاہئے۔ بعض کا خیال تھا کہ اسماء زیادہ ضروری ہیں۔ بالآخر طے پایا کہ ۸۵۰ الفاظ کی فہرست شائع کی

میں اسماء کی تعداد (جن سے ہمیں زیادہ سابقہ پڑتا ہے) ۴۰۰ سے کم نہ ہو۔ یعنی ۵۰ فی صد ہو۔ اس طرح تقریباً ۵۰ فی صد مشکوک الفاظ کو بھی ایسے الفاظ کو جو عملاً زیادہ اہم نہیں سمجھے گئے اُن کو خارج کیا گیا۔ اس طرح ۱۹۴۱ء میں بنیادی انگریزی کی مرتبہ اور مختتم فہرست شائع ہوئی۔

ہمیں اولاً فہرست بلحاظ فری کوئنسی کے پہلے ایک ہزار بارہ الفاظ کو لے کر اُن میں سے مشکوک الفاظ کو خارج کرنا ہوگا۔ اور اُن کی جگہ اس فہرست کے دوسرے ایک ہزار الفاظ میں سے اہم الفاظ کو شامل کرنا ہوگا۔

بنیادی اُردو کی فہرست مرتب کرنا ایک فنی کام ہے جس پر ابھی پوری توجہ نہیں دی گئی ہے۔ اگر اس کام کو شروع کیا جائے تو بہت سے مسائل سامنے آئیں گے، جن کو حل کرنا ہوگا۔ لیکن یہ کام اہم ضروریات کا حامل ہوگا۔

اُردو کے لئے جنرل سروس لسٹ وقت کی اہم ضرورت ہے۔

○○

خاکِ دردِل

بقیہ صفحہ ۳۶

راہ میں یونہی کئی مسافر ٭ مل جاتے ہیں آتے جاتے

اور اس شام میں سب سے دور۔ یہاں آگئی۔ یہاں کیا ہے۔ قبر کی سی سیلن۔ تاریکی۔ گھٹن اور تنہائی۔ اس زنداں میں نہ صبح ہوتی ہے نہ شام۔ کون جانے۔ کلیاں اب بھی کھل کر پھول بنتی ہوں گی۔ بچے کلکاریاں لگاتے ہوں گے۔ نوجوان و سرشار دل محبت کے نغمے گاتے ہوں گے۔ ہر طرف مسرتیں ہوتی ہوں گی۔ دنیا یونہی صحت مند اور جوان ہوگی۔ جیسی میں نے دیکھی تھی۔

راتوں کے خاموش سناٹے میں یہاں موت سرسراتی پھرتی ہے۔ آج کوئی کل کوئی اور۔ رخصت ہی ہوتا رہتا ہے۔

یہ سوچ کر میں سہم جاتی ہوں کہ جانے کب میری سانسیں ٹوٹ جائیں۔

آپ تو اب بھی نہیں آئے، میں نے ہی تو منع کر دیا تھا۔ لیکن آپ میرا کہا کیسے مان گئے، کیا آپ کو نہیں معلوم۔ میں آپکی راہ تکتی ہوں گی۔ ہر آہٹ پر گمان ہوتا ہوگا کہ اب کوئی آیا —!

آہ۔ آپ ظالم سنگدل — ایسی قربانی کا تو میں نے تصور بھی نہ کیا تھا۔

اب کیا ہے میرے پاس — اک تیرہ و تار گھر آنسو — کاش میرے مرنے کے بعد کوئی آپ سے کہدے۔

اب وفا ہے نہ جفا یاد وفا باقی ہے
تھی جہاں شمع، وہاں خاک ہے پروانے کی

○○

غزلیں

نازش پرتاپگڈھی

کبھی کبھی جو قریبِ سحر گیا ہوں میں
لے وہ سخت اندھیرے کہ ڈر گیا ہوں میں

تمام خوابوں کو آوارہ کر گیا ہوں میں
خود اپنی جاگتی آنکھوں میں بھر گیا ہوں میں

یہ بات صرف مری غیرتِ ہنر جانے
میں کتنا ٹوٹا ہوں، کتنا [illegible] گیا ہوں میں

ہزار بار سرِ رہگذر گیا، لیکن
ہر ایک بار بھٹک کر بکھر گیا ہوں میں

سُلگ سُلگ کے جلا ہے مرا غرورِ طلب
کسی جتن سے جو دل کے نگر گیا ہوں میں

ہزار سنگِ ملامت مری طرف آئے
دھن میں کر کے وہ جو حقِ ہنر گیا ہوں میں

کچھ اور کھُل کے غمِ دیگراں کی بات کہی
جب اپنی ذات کے اندر اتر گیا ہوں میں

ملا یہ پیدا کشِ زہرِ آگہی کا صلہ
بلا کی طرح خود اپنے ہی سر گیا ہوں میں

مرے شعور کی [illegible] ہی [illegible] گیا
یہ بات الگ ہے کہ جیتے ہی مر گیا ہوں میں

مرا ہی نقشِ کفِ پا ملا ہوا مجھ سے
کہیں جو راہِ [illegible] میں ٹھہر گیا ہوں میں

○ بیگم عارفہ، پرتاپگڈھ (یوپی)

مظفر حنفی

مسلسل ذہن میں گرداب کیسا
سدا سینے میں یہ سیماب کیسا

ہمیشہ کے لئے نیند اُڑ گئی ہے
شکستہ ہو گیا ہے خواب کیسا

لہو رنگ ریگستان آنکھیں
لگا ہے گوہرِ نایاب کیسا

یہ آ پہنچا تمہاری انجمن میں
پتنگے کی جگہ شب تاب کیسا

شہادت کی تمنا بھی نہیں ہے
ہمارے خون میں سیلاب کیسا

حبابوں کی طرح سر ٹوٹتے ہیں
یہ ہنگامہ برائے آب کیسا

پرانی چھال اُتاری ہے خزاں نے
نکل آیا شجر شاداب کیسا

○ شعبۂ اردو - جامعہ ملیہ اسلامیہ - دہلی ۲۵

اناج کی

زبردست پیداوار

○ مہاراشٹر میں ۱۹۷۵-۷۶ء میں اناج کی پیداوار ۸۸ لاکھ ٹن کے نشانے سے بڑھ کر اندازاً ۹۳ لاکھ ٹن ہوگی۔

○ ۱۹۷۳-۷۴ء میں ۷۱٫۲۰ لاکھ ٹن اور ۱۹۷۴-۷۵ء میں ۷۷٫۹۶ لاکھ ٹن پیداوار کے مقابلے میں یہ ایک نمایاں کامیابی ہے۔ خریف مہم برائے سال ۱۹۷۶-۷۷ء کے تحت پیداوار کا کم سے کم نشانہ ۶۵ لاکھ ٹن ہے، جب کہ ۱۹۷۵-۷۶ء میں ۶۳ لاکھ ٹن تھا۔

○ یہ کامیابی لگاتار کوشش اور خاص وسیع اقدامات کے باعث حاصل ہوئی۔ بڑے رقبہ پر مخلوط (ہائی برِیڈ) اور اچھی پیداوار دینے والے اقسام کے بیجوں کی کاشت ہوئی۔ ان اقسام کے تقریباً ۶۲ر۰۰۰ کوئنٹل بیج تقسیم کئے گئے۔

○ کافی مقدار میں کیڑا مار ادویات مہیا کی گئیں اور جہاں کہیں فصلی کیڑے نمودار ہوئے انہیں ختم کرنے کے لئے فوراً اقدامات کئے گئے۔ کڑی محنت اور محکمۂ زراعت، محکمۂ امداد باہمی اور ضلع پریشدوں کے درمیان ربط و تعاون کے ذریعہ پروگرام کامیابی سے زیرِ عمل لایا گیا۔

○ ہم اس اہم میدان میں نئی قوت لگائیں گے تاکہ اس سال اور بھی بہتر نتائج برآمد ہوں۔

ڈائرکٹریٹ جنرل آف انفارمیشن
اینڈ پبلک ریلیشنز
حکومت مہاراشٹر ۔ بمبئی ۔ ۴۰۰۰۳۲

خاکِ در دل

عفت موہانی
۵۶۵-۱-۱۴ سیتارام پیٹ، حیدرآباد ۱۲

بڑی دور شہر سے آتی ہوئی روشنیاں میرے کمرے کی دیواروں پر رقص کناں ہیں۔ قرب و جوار میں سناٹے کی حکومت ہے۔ نجانے کیوں، اتنی حساس خاموشی ہر طرف چھائی ہوئی ہے۔ کہیں سے کوئی آواز نہیں آتی۔ روز اس وقت تک مجھے نیند آجاتی تھی۔ لیکن آج وہ بھی دشمن بن گئی ہے۔ شاید کہیں روٹھ کے بیٹھ گئی ہو۔ سناٹے میں پرانی یادیں دل میں کچوکے لگا رہی ہیں۔ وہ یادیں جن سے میری زندگی کا حُسن عبارت ہے۔ اب تو یہی سرمایہ رہ گیا ہے۔ ورنہ ہسپتال کے الگ تھلگ سے وارڈ میں قدم رکھتے ہی میں اپنی پچھلی زندگی باہر کی دنیا میں چھوڑ آئی تھی۔ وہ دنیا جو جگمگا رہی ہے۔ خوش ہے، بہت مسرور ہے۔ جہاں وہ آنے جانے والوں کے قدموں تلے روندکر اپنے نشان بھی مٹا چکی ہوگی۔ یہ تو لاش ہے۔ ہسپتال کے سرد و سفید بستر پر پڑی ہوئی زندہ لاش۔

وہ دن میں آج تک نہیں بھولی۔ بی۔ اے میں نمایاں کامیابی حاصل کرنے کے بعد مجھے یونیورسٹی میں اعزازی طور پر داخلہ ملا۔ یعنی سپروائزر صاحب نے خود گھر آکر میری سفارش کی کہ اچھے طالب علم کو چاہیئے وہ دوسروں کو بھی اپنے علم سے فیض پہونچائے۔ اس طرح میں نہ چاہنے کے باوجود یونیورسٹی کے پُرشکوہ ماحول میں چلی گئی۔

شاید وہ پہلا فنکشن تھا۔ یونیورسٹی کی سنگی پُرشکوہ عمارت رنگ و نور میں ڈوبی کھڑی تھی۔ روشنیاں جل رہی تھیں، بجھ رہی تھیں۔ موسیقی، خوشبو اور قہقہے۔ ہر طرف زندگی رواں دواں تھی۔ میں سب سے الگ کھڑی بڑی بے دلی سے یہ چہل پہل دیکھ رہی تھی۔ مجھے پتہ نہیں کہ میرا دل کیوں اداس تھا۔ شاید کوئی حادثہ ہونے والا تھا۔ کاش مجھے پتہ ہوتا ——

پھر نوشینہ میرے پاس آگئی۔

"چلنے کا ارادہ نہیں ہے؟" اس نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ "تم تو موسیقی کی اتنی دیوانی ہو۔ آج تو بہترین فنکاروں کا اجتماع ہے۔"

"جی نہیں چاہتا۔" میں نے زیرِ لب کہا۔

"کیا سوچ رہی ہو؟"

"کاش میں جانتی کہ میں کیا سوچ رہی ہوں۔"

"اسی لیے میں نے منع کیا تھا کہ فلسفہ مت لو۔" اس نے کہا اور زبردستی مجھے کھینچ لے گئی۔ اسٹیج پر بہت سے فن کار تھے۔ بعض جانے پہچانے، بعض اجنبی چہرے۔ اُن اجنبی لوگوں میں مجھے ایک چہرہ نظر آیا۔ اداس اور مغموم سا۔ وہ کیسی اُداسی تھی جس نے مجھے اور زیادہ پریشان خاطر کردیا۔

نوشینہ نے تعارف کی رسم ادا کی۔ "آپ سے ملو۔ ماریہ۔ آپ ہیں مسٹر فرحان۔ لا کالج کے پروفیسر ——!"

اس وقت میں بوکھلا گئی۔ تسلیم بھی نہ کرسکی۔ اور جانے آہستہ سے کیا کہا کہ نوشینہ ہنس پڑی۔ میں اداس چہروں سے بہت متاثر ہوتی ہوں۔ انسان پر خوشی اس قدر جلد اثر انداز نہیں ہوتی جتنا کہ غم ہوتا ہے۔ نوشینہ نے سرگوشی کی کہ مسٹر فرحان بہترین پیانسٹ ہیں۔ ایک اچھے فنکار۔ مجھے پتہ نہیں چلا کہ وہ فنکشن کب ختم ہوا۔ میں اپنے آپ سے بھی بے خبر تھی۔ مجھے تو نوشینہ نے خواب شیریں سے بیدار کیا۔

"کم سے کم زمان صاحب کے فن کی داد تو دے دو۔"

جب میں نے سر اٹھایا تو آپ کو دیکھا۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ آپ ہزاروں قدردانوں کو چھوڑ کر صرف مجھ سے اپنے فن کی داد کیوں طلب کر رہے تھے۔

جب میں چُپ رہی تو نوشینہ بولی: "اس سے کچھ نہ مانگیے مسٹر فرحان! نہ داد نہ بیداد۔ کیونکہ یہ سو رہی تھی جب آپ پیانو بجا رہے تھے۔"

شاعر/نجمی

وہ ہنس پڑی۔ آپ کے لبوں پر ایسی مضمحل مسکراہٹ تھی، جیسے پژمردہ کلی بمشکل کھل سکی ہو۔ دوسروں کی خاطر مسکرانا بھی بڑا کام ہے۔

نوشین نے ہمیں گیٹ تک چھوڑا اور خدا حافظ کہہ کر واپس ہوسٹل چلی گئی۔ مجھے اپنی گاڑی کا انتظار تھا۔ اور آپ بس کے انتظار میں اُفق تک ناکام نظریں دوڑا رہے تھے۔ اتنے میں میری کار آگئی۔

میں نے دھڑکتے دل سے آپکو لفٹ دی۔

آپ کا بہت بہت شکریہ محترمہ ماریہ! میں یونہی چلا جاؤنگا۔

میرے احساسِ خودداری پر چوٹ پڑی۔ لیکن آپ کے مغموم چہرے اور اُداس آنکھوں میں ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ جس سے پتہ چلتا کہ آپ نے جان بوجھ کر میری دعوت ٹھکرادی ہو۔ پھر میں نے آپ سے کچھ بھی نہیں کہا چپ چاپ کار میں بیٹھ گئی۔ دور پہنچ کر میں نے دیکھا، آپ بدستور کھڑے تھے۔ گم صم۔ خود فراموش۔

میں چاہتی تھی کہ آپ کو اپنے دماغ سے نکال دوں۔ تب تک آپ کے قدم صرف میرے دماغ ہی تک آئے تھے۔ آپ نے میرے دردِ دل پر دستک دی نہیں تھی؛ گو کہ آپ کے قدموں کی آہٹیں دل کی نگری میں مدھم مدھم اُبھرنے لگی تھیں۔

دوسرے روز اسٹاف روم میں آپ کو دیکھ کر میں پھر گھبرانے لگی۔ خواہ مخواہ۔ مجھے تو پتہ بھی نہیں تھا کہ آپ کس لئے وہاں آئے تھے۔

"تسلیم۔ محترمہ ماریہ!" آپ نے کہا تھا۔

"تسلیم!" میں کانپتے ہاتھوں میں کتابیں سنبھالنے لگی۔

"بیٹھئے نا" میرے کلاس فیلو نے کہا۔ "آپ بہت دیر آشنا معلوم ہوتی ہیں۔ اتنی دور سے مسٹر وزان صرف آپ سے ملنے کے لئے آئے ہیں۔"

جب وہ چلا گیا تو ہم کمرے میں اکیلے رہ گئے۔

"میں آپ سے معافی چاہتا ہوں۔" آپ نے کہا: "آپ نے مجھے لفٹ دی تھی۔ میں نے منع کر دیا، آپ کو ضرور بُرا لگا ہوگا۔"

"جی نہیں...... ایسی کوئی بات نہیں۔ آپ کو بس کب ملی؟" میں نے کہا۔

"نہیں ملی۔ میں گھر تک پیدل گیا تھا۔" آپ خفیف سا مسکرائے۔ "بے کار ہونا بھی کتنا بُرا ہے۔"

"وہ کار میری نہیں۔" میں بہت زیادہ شرمندہ ہوگئی۔ "بھیا کی ہے۔"

اور دیر تک ہم بیٹھے چھوٹی چھوٹی باتیں کرتے رہے۔ مگر ہمیں معلوم نہ تھا کہ یہ باتیں ایکدن بڑی ہو جائیں گی۔ ہم قدرت کے جانے پہچانے لگ رہے تھے۔ بڑے غمگسار اور محبت سے پُر دوست۔ جنہیں پہلی بار ہی میں ایسا لگتا ہے، جیسے ہم ایک ہیں۔ کوئی دوئی درمیان میں نہیں۔ آپنے بھی اس احساس کا اعتراف کیا تھا۔

"میں بھی سوچتا رہا ہوں۔ جیسے آپ میرے لئے اجنبی نہیں ہیں۔ میں چاہتا تھا کہ آپ سے بہت سی باتیں کروں۔ چاہے ان کا کوئی مطلب ہو کہ نہ ہو۔ لیکن میں ایسا نہ کر سکا۔ پھر میں ساری رات پچھتایا۔ میں آپ سے باتیں کر تو لیتا۔ شاید آپ بُرا نہ مانتیں۔"

"آپ اتنے اداس کیوں رہتے ہیں؟"

"پتا نہیں۔ یہ دل کی اُداسی ہے کہ باہر کی۔"

میں نے آپکو خوش رہنے کی نصیحت کی۔ کیوں کہ میں آپکی اُداسی سے پیار کرنے لگی تھی۔ اور اس احساس سے گھبرانے لگی تھی۔ میں نے سوچا کہ مسرور آدمی کو ساتھی کی اتنی آرزو نہیں ہوتی جتنی دکھی انسان کو۔ آپ خوش رہنے لگیں گے تو پھر میری رفاقت کی ضرورت نہ رہے گی۔

میری زندگی میں قدم رکھنے والے آپ پہلے انسان تھے۔ جنہوں نے محبت کے نام پر کوئی دھوکا نہیں دیا۔ خلوص کی آڑ میں میرے جذبات سے مذاق نہیں کیا تھا۔ ہمدردی اور پیار کے بہانے مجھے لوٹنے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ وہ تو میں ہی پگلی نکلی۔

یہ مجھے بعد کو پتہ چلا۔ آپ کو صرف زبانی ہمدردی درکار تھی۔ اس میں کسی اور جذبے کو دخل بالکل نہیں تھا۔ میں نے آپ کی آنکھوں میں جو پیغام مچلتے دیکھے۔ وہ میرے لئے نہیں تھے۔ میں نے آپ کو چشمۂ شیریں سمجھا۔ آپ تو سراب تھے۔ خطا کار میں تھی۔ سودائی۔ احمق۔

پھر ہم روز ملنے لگے۔ جانے کہاں کہاں کی باتیں کرتے۔ آپ ہنسنے خوش رہنا سیکھ رہے تھے۔ اپنے ساتھیوں کی شرارتیں سُنا کر مجھے بھی ہنسا دیتے۔ مجھے آپنے تبسم کی دولت بخشی۔ مجھ پر یہ آپ کا احسان ہے۔

لیکن ایک خلش میرے دل میں پھانس کی طرح کھٹکتی۔ آپ ہنستے ہنستے دفعتاً چپ ہو جاتے۔ جیسے مسکراہٹ گویا بن گئی ہو۔ آپ کا لہجہ بہک جاتا۔ آواز خوابوں میں کھو جاتی۔ پھر آپ خالی خالی نگاہوں سے مجھے دیکھنے لگتے "اچھا تو میں کیا کہہ رہا تھا۔"

"مجھے آپ کی یہ راز داری بالکل اچھی نہ لگتی۔"

لیکن آپنے مجھ سے کبھی نہیں کہا کہ آپ کے خیالات کیوں ٹوٹنے لگتے تھے؟

میرے شکایت کرنے پر آپ تاویل پیش کرنے لگتے "بعض غم بانٹے والے نہیں ہوسکتے۔ ویسے دنیا بھر میں آپ وہ پہلی ہستی ہیں۔ جسے میں انسان سمجھتا ہوں۔ ... ماریہ۔ اگر کسی کی شکل انسانوں کی سی ہو تو اُسے انسان سمجھنا غلطی ہے۔ جب تک کہ اُس کا دل بھی انسانیت سے معمور نہ ہو۔"

"یہ سب دکھاوے کی باتیں ہیں۔" میں اپنی نسائیت سے مجبور ہوکر کہتی۔

"نہیں ماریہ۔ نہیں۔" آپکا چہرہ پھیکا پڑ گیا۔ "میں سچ کہتا ہوں کہ ——" اور گفتگو جب ذاتیات پر پہنچتی تو آپ رُخ موڑ دیتے۔

کاش میں اتنا حساس نہ ہوتا۔ آدمی کو پُرسکون زندگی گزارنے کیلئے کچھ سنگدل، کچھ ڈھیٹ اور تھوڑا سا بے غیرت بھی ہونا چاہیئے۔ ورنہ آدمی اپنے لئے عذاب بن جاتا ہے۔

مجھے اپنے آپ پر رشک آتا —— میں تو دنیا کی خوش قسمت ہستی ہوں۔ اکثر مجھے شبہ ہوتا ہے دن، یہ راتیں خواب تو نہیں۔ میں آپکو پاکر ساری دنیا کو فراموش کر گئی تھی۔ آہ وہ دن —— میرا گرد و پیش ابدی ترنم سے گونجا کرتا۔ زندگی میری تھی۔ دنیا میری تھی۔ مجھے آپ کی دوستی پر ناز تھا۔ نوشینہ نے مجھے بتایا تھا آپ اپنے کالج کے فیورٹ پروفیسر تھے۔ کئی لڑکیاں آپکی قُرب کی متمنی تھیں۔ لڑکے آپ کی ہم نشینی کو فخر کرتے تھے۔ لیکن آپ اتنے لا پرواہ تھے کہ نہ آپ کو اپنا احساس تھا نہ دوسروں کی پروا۔ لیکن آپ نے نجانے مجھ میں کیا دیکھا تھا۔ شاید میرا دل۔ جو وفا آشنا تھا۔ آپ نے میری آنکھوں کی زبان پڑھ لی تھی۔ یا پھر میں نے آپ کو محبت دی تھی۔ جو آپ نے کہیں اور نہیں پائی تھی.....

ایک شام میں آپکے انتظار میں برآمدے میں ٹہل رہی تھی۔ آپ نے آنے میں کچھ دیر کردی تھی۔ برآمدے کے نیچے گلاب کے جھنڈ تھے۔ میں نے ایک سُرخ پھول شاخ سے جُدا کیا اور اس کی رنگین پتیوں سے سفید سفید دیوار پر آپ کا نام لکھنے لگی۔ معلوم نہیں میں کب تک اسی شغل میں کھوئی رہی تھی۔ کتنی بار میں نے سرخ پنکھڑیوں سے آپ کا نام لکھا تھا۔

"اس کے آگے ایک نام اور لکھ دیجئے۔" دفعتہً آپ کی آواز سن کر میں چونک پڑی۔ آپکی مسکراہٹ کتنی معصوم تھی۔ آپ نے ایک ادھ کھلی کلی توڑی اور اس سے دیوار پر میرا نام لکھ دیا۔ "ماریہ"۔ لیکن میرا نام آپکے نام سے بہت دُور تھا۔ برابر برابر نہ تھا۔

ایک چبھن سی کسی نے میرے دل میں لے لی۔ میں نے اپنا نام مٹا دیا۔

"نہیں .... نہیں ....." آپ نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ اور اُن نگاہوں سے

شاعرہ بھیو

مجھے دیکھا کہ میری پیشانی پسیج گئی۔ وقت کا تاثر عجیب ہوتا ہے۔ میں رو پڑتی اگر خود کو سنبھال نہ لیتی۔ آپ نے مجھ سے نہیں پوچھا کہ میں کیوں چُپ تھی، کیا سوچنے لگی تھی۔ لیکن آپ افسردہ ضرور ہو گئے تھے۔ جیسے جو کچھ آپ کہنا چاہتے تھے، وہ الفاظ میں کہہ نہ سکتے تھے۔ کیا یہ محبّت تھی؟ میں نے اپنے آپ سے سوال کیا۔

آپکے دل میں میرے لئے بجلے کیا تھا۔ محبت یا صرف احساسِ محبّت؟ میں کبھی سمجھ نہ سکی۔ ویسے آپ نے مجھے بیشمار تحفے دیئے، کئی نذرانے ہدیے۔ جو آج بھی میرے پاس محفوظ ہیں۔ بیش قیمت سرمایے کی طرح..... ..... ان سب کا کیا ہوگا؟ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ کاش! یہ سب کچھ میرے ساتھ دفن ہوسکے۔ آپکے خط، آپکی تصویریں۔ پھول۔ خوشبوئیں۔

آپ مجھ سے بہت نزدیک تھے۔ بہت دُور تھے۔

یا میں اس قابل نہ تھی کہ آپ مجھے اپنے دُکھ میں شریک کر سکتے!

مجھے آپ سے شکایت تھی۔ "خدا جانے —— تم اتنی اچھی کیوں ہو۔ ماریہ؟" ایک روز آپ نے کہا تھا۔

"اتنی اچھی نہیں جو آپ کی غمگسار بن سکوں!" میں نے شکوہ کناں لہجے میں جواب دیا۔

"بن سکتی ہو۔ ماریہ، اگر تمہارا دل اتنا وسیع اور مضبوط ہے۔"

"آپ نے ابھی تک اندازہ نہیں لگایا۔" میں مُصر تھی۔

"ایک بات پوچھوں بتاؤ گی؟"

"پوچھئے!"

"کیا تم اپنی پسندیدہ اور محبوب چیز کسی کو دے سکتی ہو؟"

"کسی کو مجھ سے زیادہ پسند آئے۔ تب!"

ایسے دعوے نہ کرو۔ ماریہ۔ کیا خبر۔ تم مجھے خود غرض اور بے وفا کہنے لگو۔ جو کسی دریا سے پیاس بجھانے کی خاطر محبت کرتا ہو۔ لیکن اسکی تہہ میں غرق ہونا پسند نہیں کرتا!"

"محبّت ہمیشہ قربانی چاہتی ہے! آپ نے سُنا نہیں۔ عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا۔" آپ کچھ پریشان سے ہوگئے۔

پھر آپ نے بہت رُکتے رُکتے کہا "وہ وقت ضرور آئے گا جب میں تم سے سب کچھ کہہ دوں گا۔ لیکن وہ وقت نہ سکے کیں ہے نہ تمہارے لیکن کبھی نہ کبھی آئے گا ضرور۔"

روز کے دستور آپ کی بجائے مجھے آپ کا خط ملا۔ لرزتے ہوئے

ہاتھوں سے میں نے لفافہ چاک کیا۔!

تم متعجب ہوگی۔ آج میں تم سے ملنے نہیں آیا۔ رات بھر میں اس خیال سے سو نہ سکا۔ تم میری نسبت کیا سوچ رہی ہوگی۔ خدا جانے تم مجھے کیا سمجھتی ہو۔ میں کانپ اٹھتا ہوں۔ تم نے میرا نام لکھا تھا۔ ماریہ۔ اب کون سا ثبوت میں تم سے مانگ سکتا ہوں۔ تمہارے جذباتی اقدام نے مجھ سے یہ خط لکھوایا ہے۔ میرے پاس وہ الفاظ نہیں جو میں اپنی زبان سے کچھ تم سے کہہ سکوں۔ مجھ میں اتنی ہمت بھی نہیں!

ماریہ! تم مجھے دنیا میں بالکل اکیلا سمجھ کر ہمدردی کرتی ہو۔ خلوص، محبت کا متمنی سمجھتی ہو۔ لیکن میں اکیلا نہیں۔ میرے سب کوئی ہیں۔ لیکن نہ میں نے کسی کو سمجھنے، نہ کسی نے مجھے سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ بے بسی اور بے زبانی کے اس مجسمہ کو تم نہیں جانتیں۔ جسے دولت کی لالچ میں بہت عرصہ پہلے بزرگوں نے بیچ ڈالا۔ میرے قدموں میں سونے کی زنجیریں ڈالی گئیں۔ وہ بہت مضبوط ہیں۔ ٹوٹ نہیں سکتیں۔ بہت طویل ہیں۔ میں جہاں جہاں بھاگتا ہوں۔ وہ اتنی ہی طویل ہوجاتی ہیں۔ ماریہ! سترہ سال کی عمر میں میری شادی کر دی گئی۔ میری جائز بداعمالیوں کا ثمرہ ایک بچی بھی ہے۔ جو نہیں جانتی، اس کا باپ کون ہے؟ کہاں ہے، کدھر ہے؟ ماریہ معاف کرنا۔ میں تمہارے اصرار پر سب کچھ صاف صاف لکھ رہا ہوں۔ مجھے فریبی نہ سمجھنا۔ میں مجبور ہوں۔ بعض غلط فہمیاں بہت حسین مگر بہت خطرناک ہوتی ہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ کوئی غلط فہمی تمہیں کسی قسم کا صدمہ جھیلنے پر مجبور کردے۔ میں نہیں جانتا کہ اب تمہارے احساسات کیا ہیں؟ کیا اب بھی مجھے وہی بڑا نافرمان سمجھتی ہو۔ جو ہمیشہ اداس رہتا ہے۔ جس کے غم اس کے سینے میں ناسور کی طرح رستے رہتے ہیں۔ جس کے دکھ اس کی زندگی بن گئے ہیں۔ جس کی زندگی جبر مسلسل ہے۔ قید ہے۔ خمیازہ ہے۔ اور جو ہمیشہ ——"

آپکے خط میں اور بھی بہت کچھ تھا۔ لیکن میں پڑھ نہ سکی کیونکہ خط میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا تھا۔

"کیسے ہوتے ہیں یہ مرد۔ سمجھ میں نہ آنے والے۔ آدمی اندھا کنواں ہے۔ آدمی کے دل کی گہرائی تک کوئی جھانک نہیں سکتا۔ معمہ۔ پہیلی۔ لاکھ خلوص کے دعوے کریں۔ ہزار محبت جتائیں۔ مگر کسی نازک لمحہ پر پہنچ کر سارا الزام عورت کے سر رکھ دیتے ہیں۔

"تمہارے اصرار پر سب کچھ صاف صاف لکھ رہا ہوں"

اب میں شکوہ بھی نہیں کرسکتی۔

شاہدہ یحییٰ

"مگر کس کا شکوہ۔ کیا شوہر کہلانا، باپ بننا گناہ ہے؟"

ایک ہفتہ گزر گیا۔

دوسرا بھی گزر گیا۔

آپ نہیں آئے!

آپ کو پتہ بھی نہ تھا۔ دن رات کے جاں گسل لمحوں کو میں کیونکر کاٹتی تھی۔ میں نے بہت چاہا۔ بہت چاہا۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے آپکو بھول جاؤں۔ دل ٹوٹنے سے تھوڑی سی تکلیف تو ہوتی۔ لیکن تمام عمر کو آرام ہوگیا آپ کی یاد کی خلش۔ آپ کے قرب کی تمنا میں۔ میں نے کیونکر رات سے صبح کی! کون اندازہ لگا سکتا ہے۔ میرے سینے میں کتنے آتش فشاں دہک رہے تھے۔ میں خود کو بہلانا چاہتی تھی۔ جو اپنا نہ ہوسکے۔ اس کے لئے غم بے کار ہے۔ لیکن میری تقدیر —— میں کبھی وہ نہ کرسکی جو چاہتی رہی تھی۔

ہوسکتا ہے کہ آپ نے اپنے سوز و ساز میں مجھے فراموش کردیا ہو۔ کیا آپ ایسے ہی سنگدل تھے؟ کیا گزر رہی تھی آپ پر کون بتاتا۔

پھر جب جی کڑا کرکے میں آپ کے ہوسٹل پہونچی۔ تو پسینے میں شرابور ہوچکی تھی۔ آپ پیانو پر سر رکھے بیٹھے تھے۔ آپکے آس پاس سگریٹ بے شمار ٹکڑے بکھرے ہوئے آپکی ذہنی بے چینی کی کہانی کہہ رہے تھے۔ میں نے آپ کے کندھے پر ہاتھ رکھدیا۔

"کبھی ہم بھی تم بھی تھے آشنا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو"

"کیسے آئیں ماریہ"۔ آپ کے چہرے پر سرخی تھی۔ جانے شرمندگی کی تھی کہ جذبات کی فراوانی کی۔

"جیسے آپ میرے پاس آتے تھے" میں نے نہایت کسیلے لہجے میں کہا۔

"تم مجھے اب بھی گناہ گار سمجھنے پر آمادہ نہیں"

"گناہ گار"۔ میں نے حیرت سے کہا "اگر شادی کرنا باپ بننا گناہ ہے تو یہ دنیا گناہ گاروں سے بھری پڑی ہے"

"لیکن دوسروں کو کسی غلط فہمی میں مبتلا رکھنا تو گناہ ہے!"

اُس وقت —— مجھے یاد ہے —— موسم بہت حسین تھا۔ دریچے کے سامنے گہرے اودے اودے بادل منجمد تھے۔ دھیمی دھیمی ہوائیں چلتیں اور سارا عطر باغ سے چرا کر ہم پر انڈیل جاتیں۔ اُفق پر بجلی کے تازیانے تلملا رہے تھے۔ ہر طرف نغمگی تھی۔ کبھی خاموشی شور مچا رہی تھی۔ میں گم سم تھی۔ سوچ رہی تھی شاید اب آپ کچھ اور کہیں گے۔ اپنی

زندگی کی کہانی۔ کچھ تھوڑی سی اور۔ مگر آپ تو جیسے وہاں تھے ہی نہیں، کہیں اور تھے۔

پھر یکایک بادل گرجا اور آپ نے چونک کر مجھے دیکھا۔

"پروفیسر صاحب! آپ کہاں ہیں؟" میں نے ہنس کر کہا۔

پھر جانے کیا ہوا کہ دفعتاً آپ کی آنکھوں میں آنسوؤں کا ہجوم اکٹھا ہوگیا۔ آپ نے اپنے آنسو چھپائے نہیں۔ کبھی کبھی سچے دل سے رونے کو جی چاہتا ہے۔ آپ روتے رہے، میں آپکو دیکھا کی۔ نہ منایا، نہ سمجھایا، طغیانی ہتھیلی کی آڑ سے کہاں رکتی ہے۔

میں خاموش تھی، آپ بیتاب۔

ہائے۔ غلط فہمی۔ آپ سمجھے کہ مجھے آپ سے ہمدردی نہیں رہی تھی۔ میں آپ سے نفرت کرنے لگی تھی۔ کیونکہ آپکا جرم ناقابلِ معافی تھا۔ کاش آپ نے اندازہ لگایا ہوتا۔ کاش! دل ایک کتاب کی طرح پڑھا جا سکتا۔ میں کیسے کہوں کہ آپ کے لئے میں نے اپنا قرار کھو دیا۔ اپنی زندگی تباہ کی۔ اور مجھے کچھ بھی تو نہ ملا۔ آپ سمجھ ہی نہ سکے۔ "من از تو بغیر از تو ندارم تمنا"۔ میں آپکی زندگی میں بعد کو آئی تھی۔ پھر آپ نے مجھ سے کوئی سودا تو نہیں کیا تھا۔ آگ کا کام جلانا ہے۔ میں اگر آگ سے نہ کھیلتی تو کیوں خاکستر ہوتی۔

ہماری راہیں غیر ارادی طور پر الگ الگ ہوگئیں۔ آپ اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرکے مطمئن ہوگئے۔ آپ کے سلوک میں وہ گرمجوشی اور اضطراب نہ رہا۔ یہ اور بات تھی کہ آپکی آنکھیں اب بھی اداس تھیں۔ آپکے شاگردوں کا کہنا تھا کہ آپ بکھر دیتے کھو جاتے تھے۔ ایسے اداس رہتے تھے کہ اب لوگوں نے آپ پر ترس کھانا شروع کر دیا تھا۔ کتنی بری بات تھی۔ آپ میں یہ رحم طلبی کیوں آگئی تھی۔ میں نے یہ آرزو کرنی چھوڑ دی تھی کہ شاید آپ مجھ سے کہدیں۔ ماریہ۔ مجھے تم سے محبت ہے۔

لیکن پتھروں کو زبان نہیں ملی۔ انہیں اگر دل دیا گیا ہے تو بھی پتھر ہی کا۔ آپ اُلٹا مجھ سے خفا خفا رہنے لگے تھے۔

عید کا دن تھا۔

میں آپ سے ملنے ہوسٹل پہونچی۔

آپ کمرے میں نہیں تھے۔ کمرے کے ماحول سے معلوم ہو رہا تھا۔ عید یہاں نہیں آئی تھی۔ میں نے وقت گزاری کے لئے ٹیبل سے "ارمغانِ حجاز" نکال لی۔ اوراق اُلٹ رہی تھی کہ ایک مڑا تڑا سا کاغذ نکل کر میری گود میں گر پڑا۔

کاش! یہ چھوٹا سا حادثہ مجھ پہ نہ گزرا ہوتا۔ یا شاید تقدیر کو یہی منظور تھی

منظور تھا۔ میں ابھی تک کچھ فیصلہ نہ کر سکی۔ میں نے وہ کاغذ کھولا۔ بچے کی سی تحریر تھی۔ نامکمل ٹیڑھی ترچھی۔

پیارے پپّا جی! آج عید ہے۔ آپ آج بھی نہیں آئے۔ آپ مجھ سے بڑی دور ہیں۔ امّی کہتی ہیں۔ آپ ہم سب سے بہت خفا ہیں۔ پپّا جی! کیا آپ اپنی موتی سے بھی خفا ہیں..... میں تو کوئی شرارت بھی نہیں کرتی۔ امّی کا کہنا مانتی ہوں۔ آپ آکے دیکھئے کہ آپکی موتی کتنی اچھی بچی ہے۔ میں آپکو بہت یاد کرتی ہوں۔ آج میں نے اچھے اچھے کپڑے بھی نہیں پہنے۔ جب آپ نہیں ہیں تو میں کس سے عید ملونگی۔ میں دروازے میں کھڑی ہوں۔ آپ کی راہ تک رہی ہوں۔

یہ آپ کی بچی کا خط تھا۔ وہ آپکی راہ تک رہی تھی۔ کتنی دیر تک میں خط ہاتھ میں لئے بیٹھی سوچتی رہی۔ اِس بچی کی کیا خطا ہے؟ وہ کیوں آپکی یاد میں رونے پر مجبور ہے۔ ابھی سے اس کا دل آہستہ آہستہ گھلنے لگا ہے۔ میں نے خط کتاب میں رکھ دیا اور کتاب ریک میں لگا دی۔

"عید کے دن اور یہ آنسو"۔ اچانک آپکی آواز نے مجھے خوابِ گراں سے بیدار کر دیا۔ آپکے ہاتھوں میں ایک بنڈل تھا۔ آپ نے میرے پاس آکر وہ بنڈل میری گود میں رکھ دیا۔ اور پاس کرسی پر بیٹھ گئے۔

"زہے نصیب..... تم خود عید ملنے پہونچیں"۔ آپ نے کہا۔ "اچھا ہوا کہ میں تحفے سمیت پہونچا، ورنہ تمہیں پھر مجھ سے کوئی شکوہ ہوتا"۔

آپ نے بنڈل اُدھیڑ ڈالا۔ اور نجانے کیا کچھ بیش قیمت چیزیں میری آغوش میں گر کر اِدھر اُدھر بکھر گئیں۔

یہ تحفے نہ تھے۔ سیکڑوں دل کے ٹکڑے تھے۔ حسین دل آویز۔ مگر میں بڑی بے رحمی سے ہنسی۔

شاد نے تو یونہی کہدیا ہوگا ؎

تمناؤں میں اُلجھایا گیا ہوں کھلونے دے کے بہلایا گیا ہوں

لیکن آپ نے ہم نے اُن کا تخیل سچ کر دکھایا۔ ٹھیک ہی تو ہے۔ چاند نہیں اس کا عکس ہی سہی۔ پھر میں نے بڑی سادگی سے پوچھ لیا۔

"سچ بتایئے، کیا آج کے دن بھی آپ کو اپنی بچی یاد نہیں آئی؟"

آپ فوراً سنجیدہ ہوگئے۔ "جنہیں میرے بغیر جینا نہیں آیا میں انہیں کیسے یاد کر سکتا ہوں؟"

"آپ سچ نہیں بولتے"۔ میں نے ناخوشگوار لہجے میں کہا

"میں سچ بولتا ہوں۔" آپ نے کہا مگر فوراً آپکی نظر ادھر اُدھر بھٹک گئی۔ اور سارا چہرہ پسینے میں بھیگ گیا۔

"کیا اسی لئے آپ نے ایک دن مجھ سے پوچھا تھا کہ میں کوئی ایثار کر سکتی ہوں یا نہیں؟" میں نے پھر کہا۔

"وہ لوگ مجھے سمجھ نہیں سکتے ماریہ۔" آپ نے کہا۔

کچھ بھی ہو وہ رشتے ٹوٹ نہیں سکتے۔

پھر ہم میں ایک طویل اور ناگوار بحث چھڑ گئی۔ اور نہ آپنے مانی نہ میں نے۔ میں بگڑ کر چلی آئی۔ ساری رات میں شدید ترین کرب میں مبتلا رہی۔ صبح ہوتے ہوتے مجھے دماغی بخار نے آلیا۔ میں اب پچھتا رہی تھی۔ میں نے آپکو خود سے کیونکر جدا کر دیا۔ میں نے یہ کیا کیا۔ بخار کی غفلت میں میں نے کتنی بار آپ کو اپنے سے قریب محسوس کیا۔ میری بے چینی میں آپ مجھے ڈھارس بندھاتے۔ میں گھبرا کر رونے لگتی۔ آپ کا خیالی رومال میرے آنسو پونچھتا۔ کتنی بار میں نے آپ سے معافی مانگی۔ مگر سب خواب و خیال۔ جب آنکھ کھلتی۔ یا تو دن کی تیز دھوپ کمرے سے باہر پھیلی ہوئی دکھائی دیتی۔

آپ نہیں آئے۔

بہت ناراض تھے۔

پھر جب میں نے ہوش سنبھالا۔ آنکھیں کھولیں۔ اور سوچا کہ میں نے یہ سب کیا کیا تھا۔ تب مجھے ایک گونہ اطمینان ہوا۔ جب آدمی مایوس ہو جاتا ہے تو اپنی آرزو سے بھی دستبردار ہونے لگتا ہے۔ مجھے اپنا غم پیارا لگا۔ وہ دکھ مجھ سے برداشت نہ ہوتا جو آپ کی بچی کے آنسو مجھے بخش دیتے۔ مجھے اپنی آن پیاری تھی۔ آپکی ضد بچوں کی ضد تھی۔ اگر میں آپ کو نہ ملتی۔ یہی کھیل آپ کسی اور سے کھیلتے۔ مرد زندگی کے ہر دور میں بچہ بنے رہتے ہیں۔

کاش آپ نے سوچا ہوتا ؎

تمہیں بیگانہ گر سمجھ لیتے شکوۂ غم بھلا کہاں کرتے

نہ آپ آئے نہ خط لکھا۔ میری خطا یہی تھی کہ میں نے وفا سمجھ کر وفا نبھائی تھی۔ آپنے مجھے سزا دی۔ خاموشی کی ہولناک سزا۔

اور پھر دن گزرتے رہے۔ ہفتے مہینے۔ ہفتوں نے مہینوں کی شکل اختیار کی۔ میں نے بھی دل کو بہلانا چاہا۔ لیکن یہ میرے بس کی بات کہاں تھی؟

اور ایک دن مجھے میرے معالج نے مژدہ سنایا

"آپکا یہ بخار مستقل ہو گیا ہے۔ محترمہ ماریہ۔ آپکو سینی ٹوریم میں شریک ہو جانا چاہیئے۔"

بہت سہانی تھی وہ گھڑی۔ جب ملک الموت نے مجھے بلایا ..... عشرت آفریں۔ میری تمنا بر آئی۔ میں آپکی محبت میں گم۔ اس جہانِ خراب سے رخصت ہو جاؤں۔ میں کالج سے جا رہی تھی۔ میری سہیلیاں مغموم تھیں۔ لڑکیاں رو رہی تھیں۔ وہ مجھے جدا کرنا پسند نہیں کرتی تھیں۔ میں نے سب سے وعدہ کیا تھا۔ اپنی زندگی میں ایک بار سب سے ضرور ملونگی۔ مگر مجھے اپنے وعدہ پر ہنسی آئی تھی۔ میں ایسی جگہ نہیں جا رہی تھی۔ جہاں سے واپسی ہوتی۔ موت کی سرزمین سے کون واپس آتا ہے۔

جانے سے پہلے میں اپنے کمرے میں آئی۔ میں نے دیوار سے سر ٹیک دیا اور نہ چاہنے کے باوجود پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

پھر بڑی آہستگی سے دروازہ کھلا اور بے سان گمان آپنے اندر قدم رکھے۔

"یہ کیا ہو گیا ہے ماریہ!" آپ کا چہرہ فرطِ خوف و یاس سے سفید ہو گیا تھا۔

"خدا جانے۔" میں مسکرائی۔

آپنے آگے بڑھ کر چاہا تھا کہ مجھے اپنے سینے سے لگالیں۔ مگر میں نے آپ کو الگ کر دیا۔ اور بے رخی سے بولی۔ "مجھ سے دور رہئے۔ میں آپکی کون ہوں۔"

"ایسا نہ کہو ماریہ!" آپکو ہمیشہ کی طرح اب بھی رونا آیا۔ "میں تم سے معافی مانگنے آیا ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ تم نے میرے ساتھ بہت کچھ کیا ہے۔ مگر میں تمہیں کچھ بھی نہ دے سکا۔ میں بدنصیب تم سے خفا رہا — جب گھر گیا تو تم سے مل کر بھی نہیں گیا۔ مجھے ساری زندگی پچھتاوا رہے گا۔ کیا کسی کے احسان کا بدلہ اسی طرح دیا جاتا ہے؟"

میں ہنس رہی تھی۔ اگرچہ صرف ہنسی کی آواز لبوں سے نکالنا ہنسی ہے۔ ورنہ کون سنتا کہ میرا دل کس طرح رو رہا تھا۔ میں چاہ رہی تھی کہ آپ کے سینے سے لپٹ جاؤں۔ اور کبھی الگ نہ ہوں۔ آپ سے کہہ دوں۔ زمان! تم میرے سب کچھ ہو۔ میں تمہیں بھول نہیں سکتی۔

"تم میرے ساتھ چلو۔ ماریہ میں تمہارا علاج کراؤں گا۔" آپنے کہا تھا۔

"بالکل نہیں ....." میں نے انکار کر دیا۔ "میں نہیں چاہتی کہ میری مسموم سانسیں یہاں وہاں پھیلیں۔ آپ بھی میرے پاس سے جائیے۔ اور بھول جائیے کہ کبھی کوئی پاگل لڑکی آپکی زندگی میں آئی تھی۔ کیا آپ نہیں جانتے۔ زمان صاحب —

پل بھر کی فانی دنیا میں + کیسے رشتے کیسے ناطے

شاذیہ جبیں

(بقیہ صفحہ ۱۱۹ پر دیکھیے)

غزلیں

رشی پٹیالوی

اِس غبار آلود دل کی وادیاں!
بچ کے اِس ماحول سے جائیں کہاں
داستاں در داستاں ہے زندگی
کثافت کا رواں در کارواں!
پاؤں کے نیچے لرزتی ہے زمیں
آسماں پر کوندتی ہیں بجلیاں!
اب وہ ربطِ شعلہ و شبنم نہیں
کیا ہوئیں اِحساس کی سرگرمیاں
غم نصیبوں کا مقدر بن گئیں،
موسم و ماحول کی بے کیفیاں!
زندگی کا معجزہ کہیئے اِسے
لٹ رہی ہے حادثوں کے درمیاں
چھوڑ کر جانے سے پہلے سوچ لو
ساتھ جائیں گی مری پرچھائیاں
سے بنی ہے خوبیٔ عزم و عمل،
منزل آسودہ ہوگا کارواں

○ 15-C/157/2 چندی گڑھ
(پنجاب)

خالد رحیم

بار بار اپنے ارادے کو پرکھتے کیوں ہو
چل پڑے ہو تو سرِ راہ ٹھہرتے کیوں ہو
عمر بہ جائے گی بہتے ہوئے پانی کی طرح
خود ہی خوابوں کی صلیبوں پہ لٹکتے کیوں ہو
اپنی گہرائی کا احساس اگر ہے تم کو
موجِ ساحل کی طرح سر کو پٹکتے کیوں ہو
ریت کے ڈھیر میں امکان ہے دب جانے کا
تیز آندھی ہے تو پھر گھر سے نکلتے کیوں ہو
تیرگی ہی سے مسرت کی کرن پھوٹے گی
سرکشیدہ غمِ ایام سے ڈرتے کیوں ہو
تم سمجھتے ہو اگر شہرِ طلسمات ہے یہ
پھر صداؤں کی طرف دوڑتے پھرتے کیوں ہو
زندگی اپنا پتا دے گی تمہیں خود خالدؔ
تم عبث اِس کے تجسس میں بھٹکتے کیوں ہو

○ سپنا اسٹور بخشی بازار۔ کٹک (اڑیسہ)

یعقوب راہی

(۱)

لفظوں کی بوند بوند میں جنگل کی آگ بھر
اظہارِ درد و کرب کی لے اور تیز کر
انکار ہی کو مسلکِ سرکش قرار دے
فرمانِ جبر کو نہ سمجھ حرفِ معتبر
تیرے لہو کا خوف نہ ظاہر کسی پہ ہو
یوں سر اٹھا کے مقتلِ امروز سے گزر
دشمن سے رسم و راہ کی کوشش بھی جرم ہے
اپنی انا کو بیچ نہ غیروں کی موج پر
غصے کی آگ بحث کی صورت نہ سرد ہو
دستِ ہوس سے بڑھ کے اُٹھو اسکو زیر کر

(۲)

فصلِ گل کا زعم جھٹلانے لگیں
کونپلیں رہ رہ کے مرجھانے لگیں
خشک پودے، خشک پتے، خشک پھول
بدلیاں پیاسوں کو ترسانے لگیں
دشت و صحرا میں خلا ہوگا کہیں.
آندھیاں بے وجہ کیوں آنے لگیں
منتظر آنکھوں میں جاگی تشنگیاں
زیست سے لپٹے پہ اکسانے لگیں

○ 5/60 چندولال س۔ ۱۴۳ ... اندھیری کرلا روڈ۔ اندھیری (ایسٹ) بمبئی

شاعر کا تخلیقی عمل

غوث محمد خاں
۴۹۹-۲۲۶ ۔ ڈورروالی گلی حسن گنج ، فیض آباد روڈ لکھنؤ

شاعر کے دل میں پہلے احساسات اور جذبات اُبھرتے ہیں پھر تخیل متحرک ہوتا ہے۔ شعوری اور لاشعوری کیفیات اندر سے اکساتی رہتی ہیں۔ بالآخر یہی کیفیات اور احساسات فن کار کے تجربات اور مشاہدات سے ٹکراتے رہتے ہیں۔ یہی احساسات شاعر کی ذات میں جذب و تحلیل ہو کر تخلیقی حیثیت کے لئے کچے مواد بن جاتے ہیں۔ اور پھر شاعر فن پارے کو وجود میں لانے میں کامیاب ہوتا ہے۔ ایک بڑا شاعر جب تخلیقی عمل کے مراحل سے گذرتا ہے تو اُس عمل کا تجزیہ بھی کرتا ہے۔ اور اس کے مختلف پہلوؤں پر بار بار غور کرتا ہے۔ جو تخلیقی لمحات کے وقت اُس پر اثر انداز ہوتے ہیں۔

بعض شعراء نے اپنے نجی تجربہ کو اس انداز میں بیان کیا ہے کہ شعر ایک عالم بے خودی میں وجد میں آتا ہے۔ یا کوئی پُراسرار کیفیت شاعر کے وجود میں ایک ہلچل برپا کر دیتی ہے اور جذبۂ تخلیق کی طرف اُس کو بہا لے جاتی ہے۔ اِس کیفیت کو بعض مفکرین نے الہامی بتایا ہے۔

شاعر بنیادی طور پر ایک کولمبس کی طرح ہے۔ ایک ایسا کولمبس جو نئی دنیا کی اُس جھلک کو پیش کرتا ہے۔ جو اُس نے خود دیکھی ہے۔ جس میں اس کے جذبات، احساسات، تجربات اور مشاہدات شامل ہیں۔ فن کار کی شخصیت اور اس کا ماحول اور اُس کے دیکھنے کا خاص زاویۂ فن ہی شاعر کی تخلیق پر اپنے اثرات مرتسم کرتے ہیں۔

شاعری کو فنونِ لطیفہ کا آمیزہ کہا گیا ہے۔ وہ یُوں کہ شعر میں بدن کا لوچ، خط کا تحرک، اور سُر کا ترنم یہ تمام خصوصیات یکجا ہو جاتے ہیں۔ لیکن ساتھ ساتھ شاعر کا ذریعۂ اظہار چونکہ زبان ہوا کرتی ہے۔ اس لئے یہ فن زیادہ مشکل اور نازک بھی ہے۔ شاعر کو ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ وہ ہر بار زبان کو ایک نئے انداز سے استعمال کرے۔ ہر لفظ کے ساتھ مفہوم کی ایک پرچھائیں منسلک ہے۔ یہی وجہ ہے کہ

شاعر بھی

جب شاعر لفظ سے کوئی شعری کیفیت پیدا کرتا ہے۔ تو وہ لفظ کو بدن، خط، یا سُر کی طرح استعمال نہیں کرتا ہے بلکہ پہلے اس لفظ کے کاروباری مفہوم کو توڑتا ہے۔ اور پھر ایک نئے مفہوم سے آشنا کرتا ہے۔ مثلاً پہاڑ کے لفظ سے ایک خاص کاروباری مفہوم ملتا ہے۔ لیکن جب شاعر اپنی غزل میں یہی لفظ استعمال کرتا ہے تو کہتا ہے کہ "غم کا پہاڑ" اور لفظ پہاڑ اپنے لغوی مفہوم سے الگ ہو کر ایک شعری مفہوم میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ اس مفہوم کو خلق کرنا بھی شاعر کا تخلیقی عمل ہے۔

شاعر کے لئے ضروری ہے کہ وہ لفظوں کی ایک نئی ترتیب سے اس مفہوم کو بیان کر سکے۔ جس کی طرف وہ تخلیقی عمل رواں دواں ہو۔ اس لئے شعر میں الفاظ کا موزوں اور صحیح مقام پر ہونا ضروری ہے۔ ورنہ شعر سے اُس کا سحر چھن جائے گا۔ انیس اور دبیر کے کلام میں جو فصاحت اور بلاغت کی تنقیدی بحث چلتی آرہی ہے۔ وہ اس بات کی شاہد ہے کہ اگر اچھے شعر میں کسی لفظ کے بجائے اُس کا مترادف لفظ رکھ دیں تو شعر کا مفہوم تو شاید برقرار رہے۔ لیکن وہ فصاحت نہیں رہےگی۔ بات عیاں ہے کہ ہر لفظ کا اپنا ایک مزاج ہوا کرتا ہے۔ اِس لئے ایک اچھا شاعر جوہری کی طرح الفاظ کے نگینوں میں سے وہی نگینہ چنا کرتا ہے۔ جو زیور میں جڑے ہوئے دوسرے نگینوں کی مجموعی کیفیت کو اُبھارے۔

شاعر کسے کہتے ہیں؟ اور وہ کن لوگوں سے خطاب کرتا ہے؟ وہ عام انسانوں کے مقابلے میں زیادہ قابلیت، احساس، زیادہ جوشِ قلب اور نزاکتِ طبع کا مالک ہوتا ہے اور فطرتِ انسانی کا زیادہ وسیع علم اور اپنے ہم جنسوں کے مقابلہ میں اُس زندگی

ہے جو اُس نے [illegible] صلاحیت رکھتا ہے اور عام موجودات میں جہاں کہیں انہی کے مثل جذبات و واردات کے نشانات ہوتے ہیں اُن کی [illegible] ہے۔ حتیٰ کہ اگر کہیں اُن کے نشانات ہرگز دکھائی دیں تو اپنی تقاضائے طبع کی بدولت انھیں تخلیق کرتا ہے۔ ان خوبیوں کے علاوہ ایک اور صفت شاعر میں عام انسان کے مقابلے زیادہ ہوتی ہے۔ وہ نظر نہ آنے والی چیزوں سے [illegible] اس طرح متاثر ہوتا ہے گویا فی الواقع موجود ہیں۔ اور اس بات کی بھی قدرت رکھتا ہے کہ اپنے اندر ایسے جذبات اور احساسات پیدا کرے جو امور واقعہ کے زیر اثر خود بخود [illegible] ہوتے ہیں۔ یہ جذبات اور احساسات شاعر ہی اپنے اندر پیدا نہیں کرتا بلکہ دوسرے لوگوں میں بھی پیدا ہوتے ہیں لیکن دونوں میں جو بنیادی فرق ہے وہ یہ کہ ایک شاعر کے داخلی جذبات بہ نسبت عام انسان کے جذبات کے حقیقی اور واقعی جذبات سے بہت قریب کی مشابہت رکھتے ہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ شاعر میں بمقابلہ دوسرے لوگوں کے قوتِ احساس زیادہ ہوتی ہے۔ اور اپنے اندر عمیق وہ کیفیت طاری کر سکتا ہے کہ جو کسی شخص کے دل میں امرِ واقعہ کے زیرِ اثر پیدا ہوتی ہے۔ شاعر محض جذبات کا ایک عکس اپنے دل میں اتارتا ہے یا یوں کہیے کہ وہ سمجھتا ہے کہ ان کا عکس خود بخود اُس کے دل میں اُتر آتا ہے۔

شاعر کو ایک [illegible] سے تعبیر دے سکتے ہیں۔ جس میں برق کی چمک پوشیدہ ہے۔ شاعر کے ذہن میں گویا ایک برقی رَو ہوتی ہے۔ اور اس کے [illegible] تصور میں اس برقی رَو سے ٹکراتی ہیں، تو تخلیق کے شرارے اس کے ذہن سے باہر نکلتے ہیں۔ اور ذہن کا دائرہ حیات کی ساری وسعتوں کو اپنے اندر سمیٹ لیتا ہے۔ اس طرح شاعر کی وسعت حیات کی وسعت سے وابستہ ہو جاتی ہے۔ [illegible] اس میں روح بسیط و [illegible] ہوتی ہے۔ عام طور پر تمام [illegible] اس کی جذباتیت اُس کا اپنے خیالات اور احساسات کے اظہار کا [illegible] اور اُس کی تخلیق میں [illegible] پیدا [illegible] ہے۔

ایمرسن نے چند [illegible] کو حقیقی [illegible] ہے۔ [illegible] نظم، یعنی

[illegible]

"اگر تم انسان ہو تو سخت سے سخت الفاظ میں کچھ ایک توپ کے گولے کی طرح۔ جو کچھ کہ تم نے سوچا ہے۔ اور جو کچھ کل سوچو وہ کل پھر سخت الفاظ میں کہو خواہ وہ آج کہی ہوئی تمام باتوں کے خلاف ہی کیوں نہ ہو کیونکہ حقیقی تخلیقی ذہن کی اسپرٹ ہے"۔ [1]

شاعر صرف اپنے لئے شعر نہیں کہتا۔ بلکہ اُسے اپنے آپ کو دوسروں تک پہونچانا ہوتا ہے۔ شاعر کی کامیابی یہی ہے کہ وہ شعر میں تخلیق کے وقت طاری شدہ جذبے کو کامیابی کے ساتھ اپنے قاری میں یا سامع میں طاری کر دے۔ اگر وہ ایسا کرنے میں کامیاب نہیں ہوتا تو اس کی تخلیق کوئی کتنا ہی خواہ اثر نہیں چھوڑے گی۔ اپنے کو دوسروں تک پہونچانا یا دوسروں کو متاثر کرنا ایک شاعر کی حقیقی صفت ہے۔ یہ کام ایک اچھے تخلیقی شاعر کا ہوتا ہے۔ [illegible] میں رونالڈ لیوس نے اپنے خیالات کا اظہار اس طرح کیا ہے:۔

"تخلیقی شاعر کو چاہیئے کہ وہ اپنے خیال اور جذبے کو موثر طریقے سے پڑھنے والے تک پہونچا سکے۔ ورنہ وہ بلند تخلیقی فن کے حاصل کرنے سے قاصر رہے گا"۔ [2]

اس لئے ایک شاعر کو صرف اپنے اظہار پر اکتفا نہ کرنا چاہیئے بلکہ اس کو اپنے تئیں دوسروں تک پہونچانا چاہیئے۔ آسکر وائلڈ نے یوں کہا ہے:

"کسی فن کار کا کام یہ ہے کہ وہ اپنے ناظر پر حاوی ہو جائے۔ دیکھنے والا کسی صورت میں فن پر حاوی نہیں ہو سکتا"۔

---

1. EMERSON – CREATIVE POETRY (A STUDY OF ITS ORGANIC PRINCIPLES) BY. RONALD LEWIS. PROF. OF ENG. UNIVERSITY OF UTAH. 1931.
2. RONALD LEWIS: "THE POETIC MIND"
3. CREATIVE POETRY "THE POETIC MIND".

آگے چل کر اُس نے لکھا ہے کہ شاعر کو چاہیئے کہ وہ اپنے پڑھنے والے کو بھی شاعرجیسا ...ب کا کہنا ہے کہ مطالعہ کے دوران پڑھنے والے کی شدت مصنف کے فہم اثر رہتی ہے : ایک نظم والے کا کوئی شاہکار اس وقت تک فن کے زمرے میں شامل نہیں کیا جا سکتا۔ جب تک وہ مطلب تک رسائی نہ کرے۔ اور اُسے متحرک نہ بنا دے۔ اور پڑھنے والے کو مجبور کرے کہ جو فن کار سوچتا ہے وہی یا ویسا ہی سوچے اور اُسی طرح محسوس کرے جس طرح شاعر خود محسوس کرتا ہے۔

شعر کو لافانی بنانے کے لئے شاعر کو تین منزلوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ پہلے تو وہ حالات، خیالات، یا واقعات کا مشاہدہ، مادّی (CONCRETE) حیثیت سے کرتا ہے۔ پھر اس مادّی حیثیت کو تجرید (ABSTRACT) میں تبدیل کرتا ہے۔ جب وہ تجرید اُس کے شعور سے لاشعور میں پہنچ جاتی ہے۔ تو اُس کو پھر ہمارے آپ کے واسطے مادیت میں بدلتا ہے۔ یہی کٹھن منزل شاعر کے لئے بےحد دشوار ہے۔ اِس میں کامیابی شاعر کو انفرادیت عطا کرتی ہے۔ تجربات، مشاہدات تو عام انسان بھی کرتے ہیں۔ ہمارے لاشعور میں تاثرات یکجا ہوتے رہتے ہیں۔ مگر ہم تاثرات کو مادّی یا لفظی جامہ پہنانے سے قاصر رہتے ہیں۔ فن کار تشبیہ، استعارہ، تمثیل، تلمیح کی مدد سے مادّی یا لفظی تصویر بناتا ہے۔ اگر وہ ایسا نہ کرے تو شاعری میں نہ اجمال پیدا ہو اور نہ آفاقیت اور ابدیت ہی جنم لے سکتی ہے۔

بقول ہربرٹ ریڈ :

"جب کوئی فن کار تخلیق کے عمل میں مبتلا ہوتا ہے تو خود ایک لمحہ مرتکز کر لیتا ہے۔ اور اُس ارتکاز کی مدد سے ایک ہی لمحے میں اُس سارے کے سارے مُرتب تانی کو دریافت کر لیتا ہے۔ جو اُس کے باطن میں پوشیدہ تھا"[1]

اِس میں کوئی شک نہیں ہے کہ داخلی آہنگ کی مہیا کردہ برقی قوت کے بغیر ایک شاعر کا تخلیقی عمل جاری نہیں ہو سکتا۔ تخلیقی عمل کے بارے میں جان ڈرائیڈن (JOHN DRYDEN) کا خیال ہے کہ "تخلیق سے قبل الجھے ہوئے خیالات ایک گہری تاریکی میں ایک دوسرے سے تصادم برپا کرتے رہتے ہیں گویا شکست و ریخت کا عمل جاری رہتا ہے کہ تخلیقی عمل انہیں ایک روشنی میں لے آتا ہے۔ ویلری (VALERY) نے لکھا ہے "مزاج ذہن کی کی ندخیزی کی علامت ہے" نیز یہ کہ شاعر کو ایک مصرع تو خداوند تعالیٰ سے ودیعت ہوتا ہے دوسرا خود اسے دریافت کرنا پڑتا ہے۔ اس سلسلے میں ہربرٹ ریڈ نے کہا ہے کہ

"شاعری، مزاج کی حالت سے شاعر کا فرار ہے" :

علامہ اقبالؔ نے اپنے خطبات میں کہا ہے کہ خیال اور لفظ، احساس کے بطن سے بیک وقت ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ یہ بات شعری تخلیق کی وجدانی کیفیت کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ وہی شعراء فکر کو شعری قالب میں ڈھال سکے ہیں جو اپنے تجربے اور محسوسات کو بنیاد بنا کر خاص سے عام حقیقت کے متلاشی رہتے ہیں۔ اس کی بڑی اچھی مثال غالبؔ کے ایک شعر میں موجود ہے۔ وہ متصوفانہ رنگ میں بحیثیت اعتقاد کے لاموجود الا اللہ کے قائل تھے۔ لیکن جب شعر کہتے تھے تو اپنے ہی عقیدہ پر شک کرتے۔ یہاں محسوس اور مرئی حقیقت اُن کے عقیدے سے ٹکراتی نظر آتی ہے۔ شعر اس انداز میں ہے ؎

جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود
پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے

حقیقت یہ ہے کہ شعر ایک تخلیقی پیکر ہے۔ فن کار خیالات کو ماورائے شعور کی گہرائی سے کھینچتا ہے۔ پھر انہیں زبان کے سانچے میں ڈھالتا ہے اور جھلک کر لفظ یا استعارہ کہتا ہے۔ ایک شاعر یا ادیب دنیا کے تمام تجربات و مشاہدات کو اپنی شخصیت میں ضم کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ جب شاعر کی نگاہ اتنی وسیع ہوتی ہے۔ تو وہ صرف نئی لہر کو منتقل نہیں کرتا ہے بلکہ باہر کی تحریک کو اپنے ذاتی و فکری نظام میں جذب کرتا ہے۔ اور نئے خیال کی صورت میں اس کا نظم پر اثر انداز ہوتا ہے اور اُسے ایک نئی وحدت عطا کرتا ہے۔ شاعر اپنی فطرت پر منحصر ہوتا ہے اور جب وہ تخلیقی کرب میں مبتلا ہوتا ہے تو اپنی شخصیت

---

[1] HERBERT READE: THE FORMS OF THINGS UNKNOWN. P. [illegible]

کا احساس کچوکے دیتا ہے۔ یہ ایک فن کار کی بلند جذباتی کیفیت کی منزل ہوتی ہے۔ ایک تخلیقی شاعر کی شاعری اس وقت تک تخلیق کے عمل سے نہیں گزرتی، جب تک کہ وہ کوئی نامعلوم طور پر خیالات کے سہارے بیان کرنے میں دشواریاں محسوس کرے۔ سپیفر ([illegible]) نے اس خیال کو اس طرح بیان کیا ہے:

"جب کسی بات کا اظہار کرنے میں رکاوٹ پیدا ہوتی ہے۔
تب شاعری جلوہ گر ہوتی ہے۔" ؎۱

ورڈزورتھ کو بھی تخلیقی موڈ کا علم ہے:

"میرے لئے معمولی پھول جو شگفتہ ہوتا ہے۔ خیال کا حسین
وجدان پیدا کرتا ہے۔ جو اتنی گہرائی میں ہوتا ہے کہ اس پر
آنسو کبھی نہیں گرائے جا سکتے۔" ؎۲

یہ اچھی نفسیاتی کیفیت ہے، جو اس خیال کی تصدیق کرتی ہے کہ غم کی کیفیت تخلیقی عمل کے اندر کارفرما ہوتی ہے۔ میر تقی میر جس کرب کی کیفیت سے گزرے ہیں۔ اس کا اظہار ان کے اس شعر سے عیاں ہے ؎

مجھ کو شاعر نہ کہو میر کہ صاحب میں نے
درد و غم کتنے کیے جمع تو دیوان کیا

شاعر کسی حقیقت سے متاثر ہو کر شعر کہتا ہے۔ اس کی ہر داخلی کیفیت کسی نہ کسی خارجی کیفیت کا پرتو ہوتی ہے۔ ایسی شکل میں شاعر کی داخلی کیفیت اور خارجی حقیقت میں گہرا ربط اور ایک نامیاتی وحدت ملتی ہے۔ شاعر حقیقت کو پہلے اپنے ہی ذہن کی سطح پر پیش کرتا ہے۔ جب تک حقیقت کا عکس اس کے خون میں تحلیل نہ ہو جائے، اور نبض حیات نہ بن جائے، وہ شعری پیکر نہیں اختیار کرپاتا۔ اس عمل کی [illegible] وجود میں نہیں آتی ہے یہ کرب کی کیفیت اسی لئے پیدا ہوتی ہے کہ خارجی حقیقت شاعر کو اس وقت تک مضطرب رکھتی ہے جب تک وہ اس کا اظہار کے ذریعے آزادی نہیں حاصل کر لیتا۔ اور تخلیقی جذبے کا بوجھ اور

؎۱ The "poetic mind" By Ronald Lewis.
؎۲ The "poetic mind" By Rescott's

منزل ہے کہ ایک شاعر اس وقت مطمئن ہوتا ہے جب اسے اس بات کا علم ہو جاتا ہے کہ وہ جس خیال کی مصوری کر رہا ہے اس میں وہ کامیاب رہا ہے۔ وہ تخلیقی سفر کے دوسرے موڑ تک پہنچ گیا ہے۔

ٹینی سن (TENNYSON) کا اس سلسلے میں کہنا ہے:

"کہ ہم میں سے سب کے سب کسی نہ کسی حد تک شاعر ہیں۔
کیونکہ ہمارے اندر احساس اور یہ قدرت ہے کہ جو احساسات
اور خیالات ہمارے اندر شعوری یا لاشعوری کیفیت میں
ہیں، وہ کسی نہ کسی حد تک دوسروں تک پہونچا سکیں لیکن
وہ لوگ جو شاعر یا فن کار کہلاتے ہیں وہ عام انسانوں
سے زیادہ حساس ہوتے ہیں۔ ان کی حس کا دائرہ وسیع
ہوتا ہے اور اپنے احساس کے اظہار میں صاف دل
ہوتے ہیں۔ وہ دوسروں کو بھی اپنے احساس کے اندر
شریک ہونے کی دعوت دیتے ہیں۔" ؎۱

شاعر جودت طبع رکھتا ہے۔ اور شاعر کی آواز کی گونج دور تک سنائی دیتی ہے۔ شاعر کے خیالات اور احساسات دائرہ وسیع ہوتا ہے۔ جو عام کے اندر نہیں پایا جاتا ہے۔ ہم لوگ تو صرف مثال کے طور پر دھندلے دھندلے انداز میں دیکھ لیتے ہیں، جیسے نصف اندھا روشنی کو دیکھتا ہے۔ شاعر ہر شے میں بے حد تجلی کا ظہور دیکھتا ہے۔ جب وہ کسی پھول کے حسن سے لطف اندوز ہوتا ہے تو مسرور ہوتا ہے جو اسے یہ کہلاتی ہے کہ وہ مسرت سے چیخ اٹھے۔ اور ہم سب کو دیکھنے کی دعوت دے اور اس کے لطف اندوز ہونے میں ہم بھی شریک ہو جائیں۔ ہم سنتے ہیں مگر ایک بہرے کی مانند لیکن شاعر آواز کا شعور رکھتا ہے۔ پانی کی روانی جو نغمے پیدا کرتی ہے۔ شاعر ان کی عمل کیفیت سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ اور یہی الفاظ دیتا ہے کہ سمندر کے شور کا تم اس سے فائدہ اٹھاؤ۔ شاعر کا تخیل جو حسی تصویروں کے ذریعے سوچتا ہے جو روشن اور محسوس نقوش کو ذہن میں ابھارتا ہے، جو ادراک اور جذبات کے سانچے میں خود کو ڈھالتا ہے۔ پھر اپنے میں ایک نئی بیداری پیدا کرتا ہے۔

انگلینڈ کے مشہور شاعر ورڈز ورتھ نے اپنی مشہور نظم

؎۱ The "Poetic mind" By Rescott's

"WESTMINSTER BRIDGE" میں اس خیال کو اس طرح بیان کیا ہے کہ جو آدمی اس پل پر سے گزرے۔ اور گزرتے وقت اس پل کے چاروں طرف جو خوبصورت منظر دکھائی دیتا ہے، اس کو نہ دیکھے، اس سے لطف اندوز نہ ہو، اُس سے متاثر نہ ہو۔ تو اُس کی روح مردہ کہی جائے گی اور کہا جائے گا کہ اُس میں تخلیقی صلاحیت بالکل نہیں ہے۔ اس لئے تخلیقی صلاحیت کا بنیادی عنصر مشاہدہ کرنا، محسوس کرنا، اور [illegible] ہونا ہے۔ صرف کسی چیز کو دیکھ لینا ہی تخلیقی صلاحیت نہیں کہلائے گا۔ جب تک اُس چیز کا تاثر، احساس اور جذبہ ذہن کی گہرائی میں نہ بیٹھ جائے۔

[illegible] نے شاعر کے تخلیقی عمل کے متعلق کہا ہے:

"ہم سب شاعر ہیں جب ہم شاعرانہ انداز میں مطالعہ کرتے ہیں۔ شاعری کبھی کبھی ہر انسان کے تجربہ میں جنم لیتی ہے۔ ہزلٹ، ایمرسن، کیٹس وغیرہ عظیم شعراء کے ساتھ بھی رہا۔" ۵۱

کیٹس اُسے اس طرح بیان کرتا ہے:

"تو شاعر نہیں ہے۔ اگر اپنے خواب کو بیان نہ کر سکے۔ کیونکہ ہر انسان جس کا دل سرد نہ پڑ گیا ہو۔ کوئی نہ کوئی ذہنی منظر رکھتا ہے۔ اور کلام کرتا ہے۔" ۵۲

حقیقت یہ ہے کہ شاعری میں مشاہدات اور تجربات ہی نظم ہوتے ہیں۔ لیکن وہ علم کے دامن سے چھن کر آتے ہیں۔ یہ تخلیقی شعور ہی ہوتی ہے جو زندگی کی تخلیق میں مددگار ہوتی ہے۔ زندگی کے شعور کو زندگی کے حسن کو اُجالتی ہے۔

اس میں شک نہیں ہے کہ داخلی آہنگ کی مہیا کردہ قوت کے بغیر کسی شاعر کا تخلیقی عمل جاری نہیں ہو سکتا۔ تخلیقی فن میں چار کردار حصہ لیتے ہیں۔ اجتماعی لاشعور، معروضی دنیا، تخلیقی مشین اور آہنگ، یہ سارا ڈرامہ فنکار کی ذات کے اندر کھیلا جاتا ہے۔ فن کار کی ذات میں پوشیدہ، تخلیقی مشین جو داخلی آہنگ سے متحرک ہوتی ہے۔ وہ تخلیق کو جنم دیتی ہے۔

---

۵۱ "POETRY RHYTHM" BY LOTSPEICH'S

۵۲ "THE POETIC MIND" BY RESCOLT'S بمبئی

وحدتِ مکان، اور وحدتِ عمل تو ناگزیر ہی ہیں۔ کیونکہ یہ مختصر اور مقررہ وقت کے لئے ہوتے ہیں لیکن وحدتِ تاثر کی انتہائی ضرورت ہے۔ یہی وہ مرکزی تاثر ہے جس کی ترسیل وہ سامعین تک کرنا چاہتا ہے۔ ریڈیائی ڈراموں میں اس کی کامیابی یا ناکامی کا معلوم ہونا تقریباً ناممکن ہے۔ کیونکہ اسٹیج کے ڈراموں میں ناظرین کے ردِ عمل سے ترسیل کی کامیابی یا ناکامی معلوم ہو جاتی ہے لیکن ریڈیو سننے والوں کا کوئی ردِ عمل ڈرامے کے نشر ہوتے وقت معلوم ہونا ممکن نہیں۔ اس لئے ڈرامہ نویس کو کافی احتیاط سے کام لینا پڑتا ہے۔

ریڈیائی یک بابی ڈرامہ زیادہ کرداروں، پیچیدہ واقعات اور فضولیات کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ ریڈیائی ڈراموں میں ہر کردار کے وُرود و اخراج صوتی اشارات اور مکالموں کی ادائیگی کے ذریعے ظاہر کئے جاتے ہیں۔ کرداروں کو نام سے یا رشتے سے مخاطب کرا کے اُن کو متعارف کرایا جاتا ہے۔ اس لئے اس مختصر مدت میں جو عام طور سے پندرہ منٹ کی ہوتی ہے، زیادہ کرداروں کو ڈرامے میں لانا یا پیچیدہ واقعات پیدا کرنا ممکن نہیں۔ ریڈیائی ڈرامے میں جس قدر کم اور ضروری کردار ہوں اُسی قدر ڈرامے کی ساخت کسی ہوئی ہوگی۔ اس مختصر مدت میں اتنا وقت بھی نہیں ہوتا کہ پیچیدگیاں پیدا کر کے پھر رفتہ رفتہ اُن گتھیوں کو سلجھایا جائے۔

ریڈیائی ڈراموں کی کامیابی کا انحصار کافی حد تک ریڈیو کے فنکاروں کی مہارت و چابک دستی پر ہوتا ہے۔ آوازوں کے اُتار چڑھاؤ، آوازیں بنانے، مکالموں کی صحت و تلفظ کے اعتبار سے ادائیگی اور کامیاب ہدایت کاری سے معمولی ڈرامہ بھی بہت کامیاب اور مقبول ہو سکتا ہے اور اِن کی خامیوں کی وجہ سے عمدہ ڈرامہ بھی ناکام ہو سکتا ہے۔ ۵۵

[illegible]
[illegible]
[illegible]
یہ اندازہ کیا کہ اہلِ علم سے اُن کے [illegible] کا سبب ہے۔
چونکہ وہ خود اس تجربے سے گزرتے رہتے ہیں جس سے ہر ایک مصنف
اور محقق کو گزرنا پڑتا ہے [illegible]
[illegible]
[illegible] خود احتسابی اور
ترک و تجرید کی فرصت ہوتی ہے۔ ۵۵ ۴۲

دانش گوہر

شیشۂ لب

شفق کا عارض بنا ہوا ہے دریا کا چمکیلا سینہ
ایسے میں چپکے سے اگر تم بھی مجھ کو چونکا دیتے
سوچوں کے گہرے ساگر میں ڈوبے دل کا زم سینہ
میرے اندر والے کو تم پیار کی منطق سمجھا دیتا

اس دنیا میں پیار کی ریکھا بنانی تو انجانی شے ہے
پھر بھی برگ دل پر اس سے بوجھ سا آخر لاگے کیوں ہے
عشق جسے کہتی ہے دنیا سات سروں کی میٹھی لے ہے
پھر احساس کی شاخ [illegible]

تم ہی میری جانِ غزل ہو تم ہی نغموں کی شہزادی
میری بیاضِ دل [illegible]
وقت نے اپنی تیغ [illegible] اک حسین رشتہ ہے
پہلے کم تھے، لیکن [illegible]

ایسا بھی اک پل آئے جو ذہن پہ ماضی کا در کھولے
اور زبانِ خاموشی میں شیشۂ لب خود [illegible]

○ [illegible] حیدرآباد [illegible]

زندگی کے سناٹے کتنے عجیب ہوتے ہیں کچھ بنا
قریب سے دیکھو اور دیکھ [illegible]
[illegible] بدلتے۔
اب بھی چبھ رہے ہوں گے۔
[illegible] میں اب [illegible] خلش ہو گی
[illegible] ہو گا۔
اور [illegible] تنہائی۔
گدگدا رہا ہو گا تم کو چھیڑتا ہو گا۔
[illegible]
[illegible] دو یہ تنہائی
زندگی محبت ہے۔

○ سرائے میر، [illegible]

قوم نئی ہمت سے آگے بڑھنے لگی ہے

1975-76ء

کالے دھن کے خلاف مہم

- اسمگلروں کی مجرمانہ سرگرمیوں کا قلع قمع کر دیا گیا۔ نامی اسمگلر جیل میں ڈال دیے گئے۔ 24 اسمگلروں کو مفرور قرار دیا گیا۔ اور اُن کی جائداد ضبط کر لی گئیں۔

- خالی شہری زمین کی ملکیت کی حد مقرر کر دی گئی۔ مقررہ حد سے زائد زمین کی منتقلی ممنوع قرار دی گئی۔

- رہائشی مکانوں کے رقبہ کی حد مقرر کر دی گئی۔ ٹیکس چوروں کو گرفت میں لینے کے لئے عالیشان و آراستہ مکانوں کی ملکیت کا تعین کیا گیا۔ [illegible] کے سلسلے میں چھاپے مارے گئے۔ چھاپوں کے نتیجے میں بالواسطہ ٹیکسوں کی وصولی میں [illegible] 37 فیصد کا اضافہ ہوا۔

- 2,50,000 افراد نے رضاکارانہ انکشاف کی اسکیم کے تحت 1,587 کروڑ روپے سے زیادہ دولت اور آمدنی کا انکشاف کیا۔ اس سے 249 کروڑ روپے ٹیکس کی صورت میں حاصل ہوئے۔

مسافر تھا کارواں لٹ گیا

علی نافع صاحب
گبیر محلہ، پوسٹ، اورنگ آباد - (بہار)

(بیت المقدس کی حرمت ہجرت کے نام)

اُم کلثوم ہوا کے دوش پہ چھوتی ہوئی جب شانِ سخن اور شائقین تک پر آئی تو ایسا لگا پوری محفل پر کیف و سرور کا عالم چھا گیا ہے۔ محفل کا ایک ایک فرد جھوم رہا ہے۔ لگ رہا ہے ایک زندگی دم توڑ رہی ہے اور ایک نئی زندگی کا آغاز ہو رہا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے، یہ زندگی اور زندگی کی پناہ گاہ اور نظر کی وسعتوں تک بکھری ہوئی کائنات کا کوئی عکس ہو۔

ایک ملک، ملک کا خوبصورت خوبصورت شہر، سنہرے چمکیلے خطے اور کنارے سبزہ، آب، آفتاب کی تڑپتی کرنیں جو آب کو سونا بنا رہی ہیں اور انہیں کرنوں کا کمال پہاڑوں پہ چمکتی ہوئی چٹانیں، اور ان چٹانوں میں سنگتراشوں کا کمال جہاں تاریخیں بول رہی ہیں۔

فلک بوس عمارتیں اور ان کا پارکنگ سنٹر، مختلف سیاحوں کے کلب اور ان کے چکنے اور نفیس فرشوں پر رقص کرتی ہوئی حسینائیں، کا رخانوں سے آتی ہوئی گھن گھن اور کھٹک کھٹک کی آوازیں، دفتر، دفتروں کے سفید سفید کاغذوں پر قطرہ قطرہ مشغول روشنائیاں، فوجی کیمپ، کنٹ اور فوجیوں میں بے خودی کی کوشش، دیوار، قوم جن کے جسم چھپکے ہوئے تھے، گرم گرم جسم اور بھرپور بے پناہ نیند کی غنودگی۔

[illegible] ایک [illegible] جنگ [illegible] حزب کا [illegible] کی نئی نئی بولیاں اور کراں کراں سے پھوٹتی ہوئی نغموں کی آواز ____ ایک خاموشی ____ خاموشی پر مسلط شادی دن اور شادی لو سے آتی ہوئی ام کلثوم کی درد میں ڈوبی ہوئی آواز: نَصْرٌ مِّنَ اللّٰهِ وَفَتْحٌ قَرِيبٌ، نَصْرٌ مِّنَ اللّٰهِ وَفَتْحٌ قَرِيبٌ ____ !!

اچانک فوجیوں کے مدہوش ذہنوں کا محور ذکر ہوا۔ جب شادی دن اور شادی لو سے اچانک جنگ کی گھنٹی اللہ اکبر اچانک ہو گئی۔ ایسا لگا محفل کا خمار ٹوٹ گیا ہے۔ بھرپور نغمہ ترنگ کی کنٹرولنگ سے جوڑ ہو گیا شاعر خاموش۔

بیرکوں میں گونج اٹھی ____ نشانِ اللہ اکبر، خطرے سے ہوشیار ہے۔ کسی وقت بھی دشمن کی یلغار ہو سکتی ہے۔ فوجی ہر وقت اسلحوں سے لیس رہیں۔ اور یہ فوجیوں کے ذمہ داروں کو حکم دیا جاتا ہے:

گشت کرنے والے سپاہی، سکوت اور صرف سپاہی سپاہی کی آوازیں۔

____ اسی بیچ بیرک میں قہقہوں کا طوفان جیسے پورے بیرک کی فضا دھواں دھواں ہو گئی۔ بیرک کے ہر گوشے سے بھری گرجتی اور چنگھاڑتی ہوئی آوازیں، مختلف انداز میں مختلف شکایت ____ ہمارے یہی دشمن ہیں انہیں ٹیپ کیا کیا سکتا ہوگا جو ابھی ابھی تک خاموش تھا ہے اور فوجیوں کے بیچ قہقہہ ابل پڑتا ہے۔ اٹومیٹک کی ایجاد اس سے بھی بڑھ کر قسمت کا ہے۔ اب سائنس کی ترقی بھی کتنی تکلیف دہ ہے۔ سارے فوجی قہقہوں سے لوٹ پوٹ رہے ہیں۔ ریڈیو کا بٹن بند تک ہوئی ہے۔ لیکن جب اس پر صرف ام کلثوم کے نغمے ہوتے ہیں تو یہ دلکش بنے کا رہے۔ لوگوں کے سامنے سائیں ختم ہو گئی اور ام کلثوم کی آواز پھر آنے لگی۔ اس بار کی آواز میں درد تھا، کراہ تھی، غصہ، جذبات، رنج و ملال تھا۔ لیکن بہت پا تھیوں کو اس سے کیا غرض ____ یہ تو ام کلثوم کی آواز ہے جس پر جھوم پڑو۔ پھر وہی محفل، وہی کیف و سرور اور [illegible] ہوئے [illegible] جسم اور [illegible] حزب کا [illegible] تو زندگی [illegible] جب [illegible] سے [illegible] تھا اور [illegible] انسان [illegible] کی [illegible] ہے۔ انسان تو [illegible] کیا کہہ سکتا ہے۔ [illegible] جب ذہن اور دل کی [illegible] سے آگے نکل جاتا ہے تو آب حیات بن جاتا ہے ____

نیند کا خمار ٹوٹنے لگا جو جنگوں کی بلا میں [illegible] زندگی

[illegible] خلائی خاموش ہیں۔ دفتر ویران ویران لگ رہے ہیں۔
[illegible] گئے ہیں۔ رقاصائیں ختم سی گئی ہیں۔ فرق زندگی
میں کہیں کہیں گر رہی ہیں اور چھن چھن کی آوازیں آ رہی ہیں۔
[illegible] بھی خالی خالی نظر آ رہی ہیں۔ رہبران قوم کے محلوں
[illegible] خوف [illegible] ہیں — جنگی جہازوں
[illegible] — [illegible] پر سیرن کی لپکتی ہوئی چال۔
کائنات ہنگاموں میں ڈوب رہی ہے۔ اردگرد سے توپوں
[illegible] جنگی جیٹ کی زناٹے دار آواز [illegible] کی گھن گرج
[illegible]
[illegible] ختم ہو گئے
[illegible] دشمنوں کی یلغار ہر جانب
[illegible] مشرق سے مغرب [illegible] فضا کی وسعتوں
[illegible] ویران ویران ریگستانوں
[illegible] کی بو آ رہی ہے۔
[illegible] نظام منجمد ہو گیا ہے۔
[illegible] ہوئے زمین
[illegible] فضاؤں میں
[illegible]
[illegible] گھن گرج کی
[illegible] قدم [illegible] اس کی زد میں
[illegible] شاید [illegible] ہو چکی
[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible] حصوں میں تقسیم ہو گئی ہے — !!!!
[illegible] کر آ چکا ہے — !!!
[illegible]

پہاڑ کی چٹانیں ہوا میں اڑ رہی ہیں — !
اور فضاؤں میں اڑتے ہوئے ذرات میں سے مختلف آوازیں
[illegible]
[illegible] حسرت کی [illegible]
تو قہقہہ کی آواز سے کان پھٹا جا رہا ہے !!
تو کبھی سسکیوں اور دعاؤں کی آوازیں آ رہی ہیں !!!
اور کبھی حیف [illegible] کی لرزش ہے !!!!
اور سفید پرچم بھی بلند ہو چکا ہے لیکن عدل کی آج عجیب
[illegible] بالکل خاموش [illegible] ہے۔ اور [illegible] حسرت سے
[illegible]

کیا آج عدل ثابت قدم رہے گا — ؟
کیا نہیں — اب [illegible] کی حکومت ہو گئی ہے ؟؟
عجیب بات ہے — ایسا بھی ہو سکتا ہے — ؟؟؟
[illegible] زمین والے — جو [illegible] نہیں پا سکتی
ہے۔ زمین والے — مقدس فرشتہ [illegible] ہو چکا ہے اب اسے
[illegible] نہیں مل سکتی۔ بالکل نہیں — کبھی نہیں — یہ صرف زعم
کی بات ہو گی ورنہ ہاتھ میں ایسی طاقت کہاں۔ [illegible] — وقت
[illegible] نکل گئے ہیں [illegible] سکتے۔
[illegible] مریخ۔ مشتری۔ اور زحل [illegible]
[illegible] سکوت یا خاموشی [illegible]
[illegible]
[illegible]

زرِ سالانہ ختم ہونے کی اطلاع

[illegible] کہ آپ کا
سالانہ [illegible] اگست ۱۹۷۹ء میں ختم ہو چکا ہے۔ [illegible]
سال [illegible] روپے جلد بھیج دیجئے۔ امید ہے کہ آپ
تجدید خریداری [illegible] گے۔ اگر [illegible]
[illegible] — زرِ سالانہ [illegible]
[illegible]

قوس صدیقی

اپنی مٹی میں ہوا ایسے کہ سفر سے لوٹا
لوٹنے والا جو لوٹا تو [illegible] سے لوٹا
اس کی خودداری کے چہرے پہ خراشیں [illegible]
جانے کیا لے کے وہ احباب کے در سے لوٹا
اپنے ہی شہر کی گلیوں نے نہ پہچانا اسے
وہ جو برسوں کی سزا کاٹ کے گھر سے لوٹا
کتنی آوازوں کا قاتل ہے یہ جنگل کا سکوت
میرا احساس بھی ٹکرا کے شجر سے لوٹا
ہاتھ میں کاسۂ اخلاص لئے قوس پھرا
پھر بھی مایوس ہر اک یاد کے در سے لوٹا

○ آرٹ سرکل، اسٹیشن روڈ، پٹنہ

ساحل سہارنپوری

[illegible]

جیسے شفاف آئینہ ہوں میں
ٹمٹماتا ہوا دیا ہوں، مگر
تیز جھونکوں سے لڑ رہا ہوں میں
کوئی میری طرف نہیں آتا
ایک ویران راستہ ہوں میں
تم کو مل جاؤں تو بتا دینا
ایسا لگتا ہے کھو گیا ہوں میں
دور تک جانبِ گمانِ منزل ہے
[illegible] پر کھڑا ہوں میں
صورتِ شمعِ انجمن ساحل
اپنی ہی لو میں جل رہا ہوں میں

○ مالیان اسٹریٹ، سہارنپور، یوپی

غزلیں

حسن عزیز

مجھے کسی کا بھلایا ہوا ہنر جانو
مزاجِ خاک سے نکلوں تو معتبر جانو
غبار میں جو چمکتی سی ایک شے ہے
شرارِ جسم کہو یا گلِ نظر جانو
شعاعِ خلد ابھر آئی ہے میرے گھر میں
[illegible] میں ہوں مجھ کو [illegible] جانو
جھلس چکے ہیں کوئی دھوپ [illegible]
[illegible] کو گھٹا کی خبر جانو
میں شہر شہر بہت گھوم آیا [illegible]
[illegible] مجھے اُدھر جانو

○ [illegible]
شاعر [illegible]۔

صفدر

بھاگتے ہیں ہرے بھرے منظر
روشنی دیکھ کر گھنے منظر
لمس کی لذتیں ترو تازہ
نرم گیلے ہرے ہرے منظر
[illegible] کی دلربائی کو
منظر اک اور ڈھونڈتے منظر
قطرہ قطرہ ٹپک رہی ہے پیاس
شاخ در شاخ زرد سے منظر
صحراؤں پہ جلتے ہیں آ کے
[illegible] سے منظر

○ [illegible]

[illegible]

مقالہ

اُردو کے یک بابی ریڈیائی ڈرامے

ڈاکٹر سید محمد علی زیدی
صدر شعبۂ اُردو - راجستھان یونیورسٹی - جے پور - ۴

ڈراما دُنیا کے ہر ادب کی ایک اہم و پُر زور صنف ہے۔ یہ زندگی کا عکس بھی ہے اور آئینہ بھی ہے۔ یہ انسان کے احساسِ جمال و کمال کا آئینہ دار ہے۔ یہ لذت بخش بھی ہے اور فہم انگیز بھی ہے۔ یہ ہزاروں سال سے انسانی ذوق و شعور کو متحرک و متاثر کرتا رہا ہے اور اُن کے گوناگوں جذبات کی وقتی تسکین کا باعث بھی ہوا ہے۔ اپنی اسی ہمہ گیری و دلکشی کی وجہ سے اس کا اعلیٰ ترین نمونہ کا شمار ادبِ عالیہ میں ہوا ہے۔ ڈرامے کے تدریجی ارتقا اور عروج کے مطالعہ سے کامرانی اور ادبیت کی صحت و رفتار اور تہذیب کے ارتقائی تسلسل کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کیونکہ یہ ہر دور کے عصر کا امین رہا ہے۔ خوب سے خوب تر کی تلاش کا جذبۂ تجربہ کا محرک ہے۔ اسی جذبے کے تحت ڈرامے کا فن نئے سانچوں میں ڈھلتا رہا اور اسٹیج کے اصول بدلتے رہے۔ ڈراما ہر بہتر اور خوش آئند تبدیلی کو قبول کرتا رہا۔ چنانچہ صنفِ ڈراما کا قدیم سے جدید کی طرف سفر کا حال ایک دلچسپ داستان ہے۔

بُنیادی طور پر ڈراما اسٹیج پر پیش کش کے لئے ہوتا ہے لیکن اُردو اسٹیج کے زوال کے بعد کچھ ڈراما نگاروں نے اسے اسٹیج سے الگ کر کے 'ادبی ڈرامے' بھی لکھے جو ناظرین یا سامعین کے بجائے افسانوں یا ناولوں کی طرح پڑھنے کے لئے تھے۔ اگر ریڈیو یہ کام نہ کرتا تو شاید اُردو میں فنِ ڈراما نگاری جو عہدِ طفولیت میں تھی ارتقا کی منزلیں اس قدر سُرعت سے طے نہ کر پاتا۔ ٹیلی ویژن چوں کہ چند بڑے شہروں تک ہی محدود رہا ہے اس لئے اس کا دائرہ کار بھی محدود ہی رہا۔ لیکن ریڈیو کا دائرہ کافی وسیع ہے۔ اس کی نشریات نے اگر ایک طرف کم سے کم مدت میں ڈرامے کو قبولِ عام کا شرف دلایا تو دوسری طرف بہت سے ایسے ڈراما نویسوں کو پیدا کیا جن کی فنکارانہ صلاحیتیں اس کی عدم موجودگی میں شاید پردۂ خفا ہی میں رہتیں۔

ریڈیائی ڈراموں کی تکنیک ڈراموں کی دوسری اقسام سے مختلف ہوتی ہے۔ پلاٹ، مکالمہ، صحت و آہنگ اور مرکزی خیال اس فنی تخلیق کے اہم اجزا ہیں۔ علاوہ کہ عمل فنِ ڈراما میں خاص اہمیت رکھتا ہے۔ لیکن ریڈیائی ڈراموں میں خصوصاً یک بابی ڈراموں میں عمل کی بہت کم گنجائش ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر مختصر یک بابی ڈرامے محض مکالمہ معلوم ہوتے ہیں۔ ان میں ڈرامے کا عمل مکالمے یا اصوات کے سہارے عشست روی سے آگے بڑھتا ہے کیوں کہ ریڈیائی ڈراموں کا تعلق تمام تر سماعت سے ہوتا ہے۔

بُنیادی خیال اس میں خاص اہمیت رکھتا ہے۔ زندگی کے گوناگوں حالات و مسائل اور متنوع واقعات میں سے کوئی ایک مخصوص واقعہ یا موضوع فن کار کے تخلیقی وجدان کو اُبھارتا یا اکساتا ہے۔ وہ اپنے مشاہدے یا خیال کو تخیل کی بھٹی میں تپا کر اور جذبے اور تجربے کی رنگ آمیزی کر کے اس انداز میں پیش کرتا ہے کہ وہ محرک جذبہ ممکن الوقوع معلوم ہو۔ اپنے نقطۂ نظر کو پیش کرنے میں ڈراما نویس جو تاثر سامعین کے اذہان پر ڈالنا چاہتا ہے۔ وہ بھی منفرد نوعیت کا ہوتا ہے۔ دراصل اسی بنیادی خیال کی صراحت و وضاحت کیلئے فن کار کہانی کا ڈھانچہ تیار کرتا ہے اور اپنے زورِ تخیل سے اس کے تمام ممکنہ پہلوؤں پر غور کرتا ہے۔ اور ان میں انھیں امکانات کو منتخب کرتا ہے جو بنیادی، نفسیاتی اور منطقی معلوم ہوتے ہیں۔ انہیں ایک سلسلے سے اس طرح منسلک کر دیتا ہے کہ وہ ایک زنجیر کی مختلف کڑیاں معلوم ہوں۔ فن کار کو قدم قدم پر وقت اور ریڈیائی تقاضوں اور مجبوریوں کو پیشِ نظر رکھنا پڑتا ہے۔ کیوں کہ ریڈیائی ڈرامے ایک مقررہ اور محدود وقت کے لئے لکھے جاتے ہیں بلکہ زیادہ تر پہلے سے طے شدہ پروگراموں کے خاکے بند منٹ کے لئے ہوتے ہیں۔ چنانچہ انہیں تمام پابندیوں اور حد بندیوں میں فن کار اپنا راستہ بناتا ہے اور اپنی تخلیق پیش کرتا ہے۔

اگرچہ [illegible] ڈراموں اور ریڈیائی یک بابی ڈراموں میں وحدتِ تاثر [illegible] مشترک حیثیت رکھتا ہے۔ لیکن دونوں کی تکنیک مختلف ہے۔ [illegible] ریڈیائی یک بابی ڈراموں میں اظہار و ترسیل کا واحد ذریعہ صوت ہے۔ مختلف صوتی اثرات، تنفس کے آثار چڑھاؤ، لہجے، سُر اور آہنگ کے ذریعے ہی مختلف کیفیات، جذباتی، ڈرامائی اور [illegible] اور مجموعی تاثرات کو مختلف توقیت اور مختلف لفظوں سے سامعین تک پہونچانا پڑتا ہے۔ اور انھیں کے ذریعہ سامع کے تخیل میں اِن کرداروں کا ہیولا تیار کرتا ہے۔ کیوں کہ ہر سننے والے کو خواہش دیکھنے کی ہوتی ہے۔ یک بابی ڈرامے میں تشویش و تعویق کا عنصر جس قدر شدید اور تیز ہوگا۔ اُسی قدر اُسکی دلچسپی میں اضافہ ہوگا۔ اِس کے برخلاف اسٹیج ترسیل و اظہار کے بہت سے وسائل فراہم کرتا ہے۔ مثلاً سامانِ آرائش، پردے، لباس، نوری اثرات، کرداروں کے حرکات و اعمال، میک اَپ، صوتی اثرات وغیرہ۔ اِن کی وساطت سے ڈراما نگار نسبتاً آسانی سے اپنی منزل تک پہنچنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ جب کہ ریڈیائی ڈراما نگار کو اِن سب مراحل کو اصوات، آہنگ اور دوسری جدید ریڈیائی تکنیک مثلاً فلیش بیک، فیڈ اِن، فیڈ آوٹ جو ساز و آہنگ کے صوتی اثرات سے پیدا کی جاتی ہیں، سہارا لینا پڑتا ہے۔ غم اور خوشی اور دوسرے اثرات بھی ساز و آواز کے ذریعہ ہی پیدا کئے جاتے ہیں۔ اسی لئے ریڈیائی یک بابی ڈرامے میں مکالمے کی بہت زیادہ اہمیت ہوتی ہے۔

ریڈیائی یک بابی ڈرامے میں مکالمہ ہی ترسیل کا ذریعہ ہے۔ اِسی کے ذریعہ کرداروں کا ہیولہ تیار ہوتا ہے۔ اسی کے ذریعہ عمل و حرکت ظاہر کی جاتی ہے۔ اور اسی کے ذریعہ سامعین کو راغب کیا جاتا ہے۔ اور اُن تک مجموعی اثرات پہنچتے ہیں۔ غرض مکالمے کے ذریعہ ہی تشویش، ترغیب، تجسس، دلچسپی، تحیر، بحران اور تصادم کی کیفیات پیدا کی جاتی ہیں۔ آوازوں کے تنوع اور لہجے کے فرق سے مختلف کرداروں کی شناخت کرائی جاتی ہے۔ مکالمے میں اس کا دھیان بھی رکھنا پڑتا ہے کہ جتنے کردار متعارف کرائے گئے ہیں وہ مکالمے میں برابر کے شریک رہیں۔ اور کوئی کردار لمبے وقفے کیلئے خالی نہ رہے۔ اسٹیج پر اس کی ضرورت نہیں ہوتی۔ کیوں کہ وہ کردار جو مکالمے میں حصہ نہیں لے رہے ہیں وہ بھی اپنے اعمال و حرکات سے ناظرین کی توجہ اپنی طرف مبذول کرسکتے ہیں۔ لیکن ریڈیائی ڈراموں میں اپنی آواز کے ذریعہ ہی وہ اپنی موجودگی کا احساس دلا سکتے ہیں۔

مکالموں [illegible] کی بہت اہمیت ہے۔ ادبی ڈراموں یا اسٹیج کے ڈراموں کے برخلاف ریڈیائی ڈراموں کے سامعین اَن دیکھے اور مختلف طبقوں اور مختلف معیاروں کے ہوتے ہیں اسلئے اِن مکالموں کی زبان کا عام فہم اور اُس کردار کے طبقاتی اور معاشرتی درجے کے مطابق ہونا ضروری ہوتا ہے۔ جو ان کو ادا کر رہا ہے۔ [illegible] کے ہر قسم کے ڈراموں میں اِسکا خیال رکھنا اور ان میں تناسب و توازن پیدا کرنا ضروری ہوتا ہے لیکن ریڈیائی ڈراموں میں اس کی اہمیت کچھ زیادہ ہی ہوتی ہے۔ اسی لئے لفظوں کے انتخاب میں بہت سی باتیں مدِ نظر رکھنا پڑتی ہیں۔ کردار کے خیالات اور ذہنی سطح سے مطابقت رکھنے والے مترنم اور آسانی سے سمجھ میں آنے والے، صوتی اثرات اور پس منظر موسیقی میں گھل مل جانے والے، وہ الفاظ جو کہانی کو آگے بڑھائیں۔ ادا کرنے والے کی سیرت کے کسی پہلو کو بے نقاب کریں اور اپنے مجموعی تاثر سے منظر کشی بھی کریں۔ غرض کہ تمام کیفیات کی ترجمانی کرنے والے ہوں۔

بعض حضرات کا خیال ہے ریڈیائی یک بابی ڈرامے کے مکالمے سوال و جواب کی شکل میں ہونے چاہئیں لیکن میرے خیال میں یہ طریقہ کار ڈرامے کی فنی تکنیک کے مطابق نہیں ہے۔ کیونکہ اِس طریقہ کار کو اپنانے سے نہ کہانی آگے بڑھے گی نہ ڈرامے کے دوسرے تقاضے پورے ہوسکیں گے۔ بلکہ کہانی مختلف اکائیوں میں تقسیم ہو جائے گی اور اِن میں ربط مسلسل شکل سے قائم ہو پائے گا۔ ڈرامے کی جمالیاتی قدر کو جو مجموعی تاثر سے پیدا ہوتی ہے شدید نقصان پہنچنے کا بھی اندیشہ ہے۔ مکالمے [illegible] دوسری جہتوں کے علاوہ ڈرامے کے پیرائے سے بھی ہوتا ہے جن کو کردار کے جملوں میں ایک یا ایک سے زیادہ کلیدی الفاظ ہوتے ہیں۔ انہیں [illegible] ذریعے مخاطب مکالمے کو آگے بڑھاتا ہے جس کو [illegible] شخصیت اور نفسیات کے پہلوؤں میں سے کسی نہ کسی پہلو کو بے نقاب کرتے ہیں [illegible] کی فضا تیار کرتا ہے۔ غرض ریڈیائی یک بابی ڈرامے میں مکالمے کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ اور اسی دشوار گزار منزل میں ڈراما نویس کی صلاحیتوں کے جوہر نمایاں ہوتے ہیں۔ اِسی کے ذریعے وہ کردار نگاری اور منظر نگاری کرتا ہے۔ اسی لئے ریڈیائی ڈراموں خصوصاً مزاحیہ خاکوں میں الفاظ کا استعمال بہت جھجک [illegible] اور ہوشیاری سے کرنا [illegible]

نثری یا سماعی ڈراموں کے لئے تین وحدتیں، وحدتِ زماں، [illegible]

THE "SHAIR" - BOMBAY

حمل گرانا جائز ہے

کن حالتوں میں؟



بعض اوقات حمل گرانا بہت ضروری ہو جاتا ہے۔

جب حمل کا جاری رہنا عورت کی زندگی کے لئے خطرہ بن جائے یا اس سے اس کی جسمانی یا ذہنی صحت کو شدید نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو،

جب اس بات کا خطرہ ہو کہ پیدا ہونے والے بچے کی نشو ونما میں کوئی شدید جسمانی یا ذہنی نقص رہ جائیگا،

جب حمل عصمت دری کے نتیجے کے طور پر ہوا ہو،

جب معاشی و سماجی حالت دراصل ایسی ہو یا مستقبل قریب میں ایسی حالت پیدا ہونے کا امکان ہو، جس سے ماں کی صحت کو نقصان پہنچ سکتا ہو،

جب حمل روکنے کے کسی طریقے کے ناکامیاب ہو جانے سے حمل ٹھہر گیا ہو،

پہلے بارہ ہفتوں میں حمل آسانی سے گرایا جا سکتا ہے۔



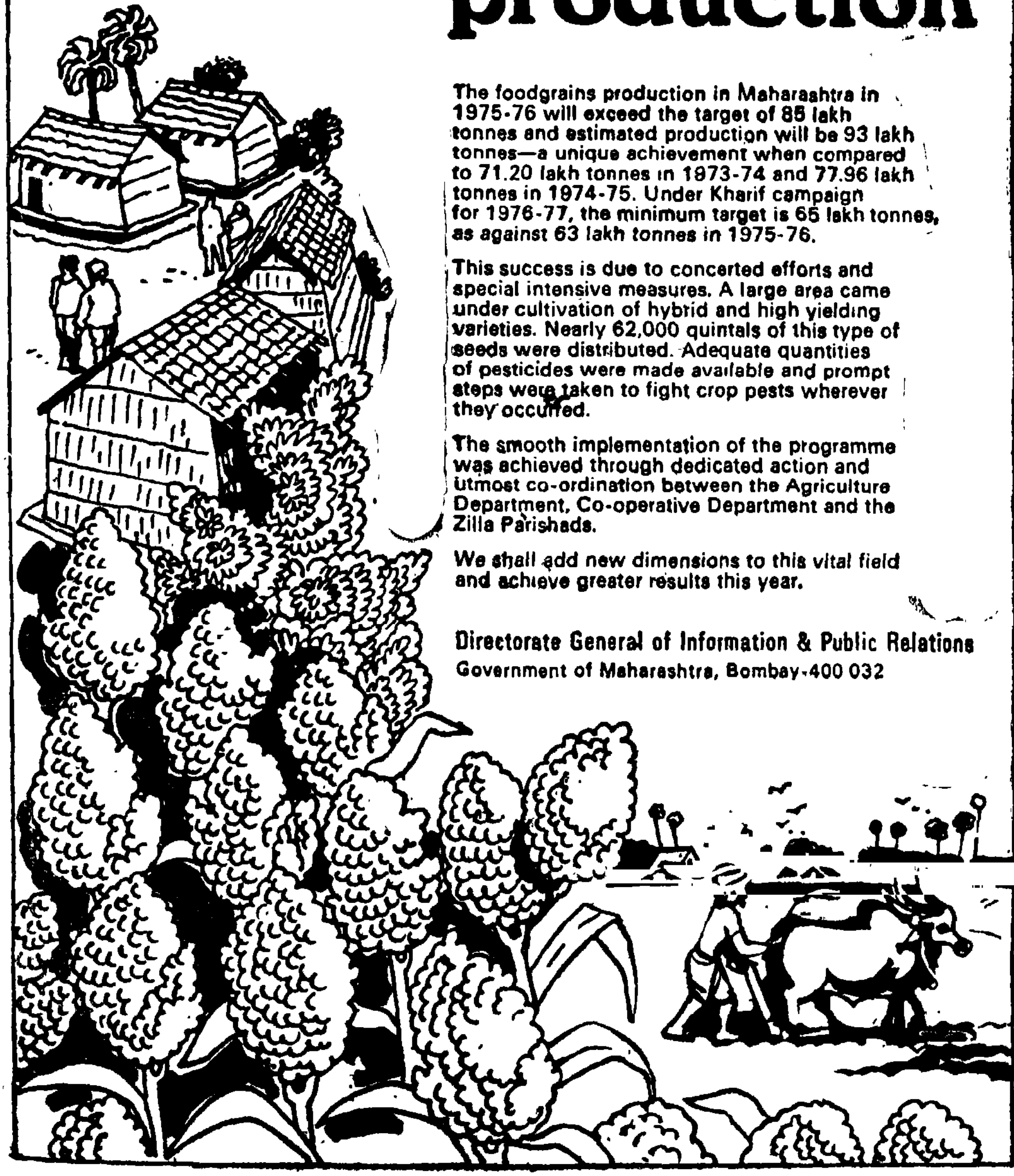
مفت مشورے کے لئے نزدیک ترین سرکاری ہسپتال میں جائیں۔

... پریس ۲۲ ... بمبئی ... سے شائع کیا۔



جاں نثار اختر مرحوم

record foodgrains production



The foodgrains production in Maharashtra in 1975-76 will exceed the target of 85 lakh tonnes and estimated production will be 93 lakh tonnes—a unique achievement when compared to 71.20 lakh tonnes in 1973-74 and 77.96 lakh tonnes in 1974-75. Under Kharif campaign for 1976-77, the minimum target is 65 lakh tonnes, as against 63 lakh tonnes in 1975-76.

This success is due to concerted efforts and special intensive measures. A large area came under cultivation of hybrid and high yielding varieties. Nearly 62,000 quintals of this type of seeds were distributed. Adequate quantities of pesticides were made available and prompt steps were taken to fight crop pests wherever they occurred.

The smooth implementation of the programme was achieved through dedicated action and utmost co-ordination between the Agriculture Department, Co-operative Department and the Zilla Parishads.

We shall add new dimensions to this vital field and achieve greater results this year.

Directorate General of Information & Public Relations
Government of Maharashtra, Bombay-400 032

جاری شدہ سنہ ۱۹۳۰ء

بانی: علامہ سیماب اکبرآبادی رحمہ

اردو کا ستّالیس سالہ علمی ادبی اور تہذیبی

ماہنامہ

بمبئی

شاعر

جلد: ۴۷ شمارہ: ۹

ستمبر سنہ ۱۹۷۶ء

مدیرِ اعلیٰ

اعجاز صدیقی

مدیرِ معاون

یونس اگاسکر

ادارۂ تحریر:

کرشن چندر

ڈاکٹر محمد حسن

ڈاکٹر ظ۔ انصاری

آغا رشید مرزا

مہتمم: ناظر نعمان صدیقی

فون: ۳۵۹۹۰۴

بدلِ اشتراک

زرِ سالانہ ۔۔۔ ۱۶ ۔۔۔ روپے

معاونت سے ۔۔۔ ۵۰۰ ۔۔۔ روپے

تاحیات خریداری ۔۔۔ ۲۵۰ ۔۔۔ روپے

ممالک غیر سے ۔۔۔ ۳۰ ۔۔۔ شلنگ

ترتیب

بیادِ جاں نثار اختر مرحوم

مقالہ

فن اور فنکار

طنز و مزاح

ترسیلِ زر کا پتا

ماہنامہ شاعر قصر الادب بمبئی ۴۰۰۰۰۸

خط و کتابت کا پتا

ماہنامہ شاعر مکتبہ قصر الادب پوسٹ بکس نمبر ۴۲۷۴ بمبئی ۴۰۰۰۰۸

ہریانہ میں دس سالہ سود مند ترقیاتی سرگرمی

ملکی شرح کے مقابلہ میں چار گنا ترقی ہوئی ہے۔

فی کس آمدن کے لحاظ سے ہریانہ کا ملک میں دوسرا مقام ہے۔

زرعی پیداوار 92.25 لاکھ ٹن سے بڑھ کر 50.49 لاکھ ٹن ہوگئی ریاست 13.55 لاکھ ٹن خوردنی اجناس مرکزی ذخیرہ کو دے رہی ہے۔

زیادہ پیداوار دینے والی فصلوں کے تحت آنے والا رقبہ 1.41 لاکھ ہیکٹر سے بڑھ کر 15.23 لاکھ ہیکٹر ہوگیا ہے۔

مندرجہ طریقِ کار سے مزید 4.66 لاکھ ہیکٹر اراضی کو زیرِ آبپاشی لایا گیا۔

(۱) لفٹ آبپاشی سکیم کے تحت پانی کو 570 فٹ اونچا اٹھا کر۔

(۲) 638 کیوزکس پانی کو رسنے سے بچا کر۔

(۳) 6241 کیوزکس سیلاب کے پانی کو استعمال میں لا کر اور

(۴) 1575 کیوزکس زیرِ زمین پانی کو بروئے کار لا کر۔

زرعی کاموں کے لئے کل میسر بجلی کا 45 فیصد استعمال ہو رہا ہے۔ بجلی کی فی کس کھپت 57 یونٹ سے بڑھ کر 132 یونٹ ہوگئی ہے۔

کمزور طبقہ کے لئے 16,000 مکانوں کی تعمیر کی گئی ہریجنوں کو 2 لاکھ کے قریب مکانوں کے پلاٹ دیئے گئے مزید برآں بے زمین افراد کو 3 لاکھ پلاٹ تقسیم کئے گئے۔ اصلاحِ اراضی کے نتیجے کے طور پر 50,000 بے زمین کنبے مستفید ہوئے۔

صحت اور علاج پر خرچ ہونے والا خرچ 4.60 روپے فی کس سے بڑھ کر 10.79 روپے ہوگیا اور دواؤں پر ہونے والا خرچ 12 پیسے فی کس سے بڑھ کر 99 پیسے ہوگیا ہے، جو کہ ملک میں سب سے زیادہ ہے۔

کنبہ بندی سے متعلقہ امور میں ہریانہ رہنمائی کر رہا ہے۔ اور 32.2 فیصد نس بندی کے نشانہ کو حاصل کیا ہے۔

ہریانہ روڈویز کی بسیں 4.08 لاکھ کلومیٹر روزانہ مسافت طے کرتی ہیں جو زمین سے چاند تک کا فاصلہ ہے اور روزانہ 4.25 لاکھ مسافروں کو ایک مقام سے دوسرے مقام پر لے جاتی ہیں۔

ہریانہ قابلِ دید اور فرحت افزا مقام ہے۔ چھٹیاں گذارنے کے لئے دبچک، گولڈن اوریل، وسلنگ ٹیل، پرپل سن برڈ، میگپائی اور روزی پیلکن جیسے نام ہندوستان کے سیر و سیاحت کے نقشے پر آچکے ہیں۔

جاری کردہ،

محکمہ تعلقاتِ عامّہ - ہریانہ

اعجاز صدیقی

جاں نثار اختر —— آخری نقشِ خاکِ خیرآباد

جاں نثار اختر (جنہیں مرحوم کہتے ہوئے کلیجا منہ کو آتا ہے) کی بات کہاں سے شروع کروں؟ کیا وہاں سے، جب وہ ۱۴ سال کے تھے اور میں ۱۰ سال کا۔ اُن کے نامور والد حضرت مضطر خیرآبادی ہمارے یہاں تشریف لایا کرتے تھے۔ اُن کے خطوط بھی آتے تھے۔ اُن کا کلام ہمارے یہاں سے نکلنے والے ترقی پسند ماہنامہ "پیمانہ" میں شائع ہوتا تھا اور اپنی موت کی جھوٹی خبر شائع ہونے پر انہوں نے ایک برجستہ و دلچسپ منظوم خط میرے والد علامہ سیماب اکبرآبادی کو لکھا تھا جو ماہنامہ "پیمانہ" ہی میں شائع ہوا تھا۔ وہ میرے والد کو "بھائی صاحب" کہہ کر مخاطب کیا کرتے تھے۔ کیا وہاں سے اُن کا ذکر چھیڑوں، جب اُن کی نظم "کون سا گیت گنگنوگی انجم" بہت مقبول ہوئی تھی اور رومان و انقلاب کی ایسی ہی ملی جلی کیفیت کی میری بھی ایک نظم "میں نہ کہتا تھا مجھے پیار کی نظروں سے نہ دیکھ" مختلف اخبارات و رسائل میں شائع ہوکر پسند کی گئی تھی۔ کیا وہاں سے بات شروع کروں جب وہ علیگڑھ میں پڑھتے تھے اور مولانا احسن مارہروی کے بعد رشید احمد صدیقی صدرِ شعبۂ اُردو مقرر ہوئے تھے۔ یا وہاں سے جب خود جاں نثار اختر نے وکٹوریہ کالج گوالیار میں پڑھانا شروع کیا تھا۔ گوالیار اور آگرہ میں صرف چند میل کا فاصلہ ہے۔ حضرت مُسیح نرائن مہر گوالیاری، جناب محمد خاں تیر نورجوی (رنج)، جناب ضیاء کے عباس ہاشمی اور کتنے ہی دیگر اہلِ علم وہاں موجود تھے۔ کیا وہاں سے جاں نثار اختر کو یاد کروں جب وہ حمیدیہ کالج بھوپال میں آگئے تھے اور بھوپال ہی سے کوثر چاندپوری کا "جادہ" اور صہبا لکھنوی کا "افکار" نکلنا شروع ہوا تھا۔ ایک مولانا سُہا مجددی اور حضرت حامد سعید خاں حامد (اختر سعید خاں کے والد) ہی نہیں اور بھی کتنے ہی علماء، فضلاء اور شعرائے بھوپال کی بساطِ علم و ادب پر جلوہ فگن تھے۔ بڑے اہتمام سے دو دو دن سرکاری مشاعرے ہوتے تھے۔ نواب حمیداللہ خاں کے عہد "شملہ کوٹھی" پر صاحبزادہ رشید الظفر خاں اور شاعر بھی صاحبزادہ سعید الظفر خاں جیسے قدر دانِ شعر و سخن موجود تھے۔ کیا اختر کی بات وہاں سے نکالوں جب وہ ۱۹۴۹ء میں بمبئی آئے اور میں بھی اُن کے چند ماہ بعد آگرہ سے ہجرت کر کے ۱۲ فروری ۱۹۵۱ء کو مستقلاً بمبئی آگیا تھا۔ جاں نثار اختر آرکیڈیا بلڈنگ کے ایک چھوٹے سے کمرے میں رہتے تھے اور میں خانہ بدوشوں کی طرح مع اہل و عیال کبھی اِس مسافر خانہ میں کبھی اُس ہوٹل میں اپنا وقت گزار رہا تھا۔ آرکیڈیا بلڈنگ کے اُس کمرہ میں جہاں بیڑیوں، سگریٹوں کے ٹکڑے بکھرے رہتے تھے، ہوٹل کا "باہر والا" چائے کے غلیظ کپ دے کر اور لے کر جاتا تھا۔ جہاں اختر نے اپنی نظم "امن نامہ" لکھی اور جہاں اپنی پیاری بیوی صفیہ کے خطوط مرتب کر کے "زیرِ لب" کے نام سے شائع کئے۔ اِن خطوط کی ترتیب میں میرے بھی کچھ مشورے شامل تھے۔ میں نے صفیہ کے اصل خطوط دیکھے ہیں۔ کبھی کبھی اُن کے ساتھ دیر تک بیٹھنے اور باتیں کرنے کا بھی اتفاق ہوتا تھا۔ صفیہ کی یاد میں اُن کی آنکھیں بھیگ جایا کرتی تھیں۔ صفیہ اپنی تنخواہ میں سے اُن کے لیے روپے بھیجا کرتی تھیں۔ وہ وقت جاں نثار اختر کے لئے بڑا صبر آزما تھا۔ یادیں، یادیں۔ اُن یادوں کو کیسے روکیں جن کا اژدحام ہے۔ اُن واقعات کے لئے تو دفتر کے دفتر چاہئیں جو میرے اُن دوستوں سے تعلق رکھتے ہیں، جو مجھے تڑپتا چھوڑ کر اِس دنیا سے سدھار گئے۔ اختر تو اب گئے ہیں، اُن سے پہلے نریش کمار شاد، پرویز شاہدی، شکیل بدایونی، مُسلم صدیقی، مخدوم محی الدین، روش صدیقی، [illegible] مظفر نگری، سلام مچھلی شہری، سجاد ظہیر، جسنیا تمہ، سراج الدین ظفر، تقیم کرہانی، عزت کاکوری، احتشام حسین، عظمت حسین خاں، نیش وغیرہ کے کچھ جیتے پر ہول [illegible] دھڑکنوں کا سلسلہ اور جیتے جاگتے دلوں کی بتیاں بجھتی گئی ہیں اور یادوں کے جلتے روشن ہوگئے ہیں۔ اِن میں سے اکثر کی موتیں اتنی اچانک اور نادقت ہوئی ہیں کہ اپنے دل ناتواں کو سنبھالنا مشکل ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ میری [illegible]

دھوؤں دھوؤں اور خلا خلا سی ہو کر رہ گئی ہے۔

اِس برسوں کے جانے پہچانے شہر میں یُوں تو پہلے ہی سے ایک وسیع حلقۂ احباب تھا لیکن اسے وطنِ ثانی بنانے کے بعد ظاہر ہے کہ اُس ادبی حلقے ہی میں مجھے سمانا تھا جو زندگی پرست، حقیقت پسند اور شعر و ادب کی اعلیٰ قدروں کا حامل تھا اور جس میں سردار جعفری، کرشن چندر، خواجہ احمد عباس، راجندر سنگھ بیدی، اختر الایمان، عصمت چغتائی، ظ۔ انصاری، مجروح سلطان پوری، ساحر لدھیانوی، جیندر ناتھ، کیفی اعظمی اور جاں نثار اختر وغیرہ تھے۔ مجھے اپنے دوستوں پر پہلے بھی ناز تھا، اب بھی ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ ہم میں کبھی کبھی اختلافات اُبھرتے ہیں، تلخیاں بھی پیدا ہوتی ہیں، لیکن ہمارے دل ایک دوسرے کے لئے ہمیشہ کھلے اور وسیع رہتے ہیں۔ ہم ایک دوسرے کے درد و غم میں بھی برابر کے شریک ہیں۔ اِس ادبی گروہ میں جن سے پہلے سے تعلقات تھے، اُن میں ایک جاں نثار اختر بھی تھے۔ جب وہ موڈ میں ہوتے تو کہتے ـــ "اعجاز صاحب! بمبئی میں تین یادگاریں بڑی اہم ہیں، ایک پانی پت کی، ایک اکبر آباد کی اور ایک خیر آباد کی۔ میں کہتا، ہماری ذمہ داریاں بھی بڑی ہیں۔ ہمیں اپنے خاندان کی ادبی و شعری روایات کو نہ صرف قائم رکھنا ہے بلکہ ان میں اضافہ بھی کرنے ہیں اور وہ "جی ہاں جی ہاں" کہہ کر خاموش ہو جاتے۔

میں نے اُنہیں بارہا احساس دلایا کہ وہ اپنے والد حضرت مضطر خیر آبادی کا کلیات مرتب کریں، اُس پر مقدمہ لکھیں، دوسروں سے لکھوائیں۔ وہ مضامین جمع کریں جو معاصروں نے مضطر صاحب پر لکھے ہیں۔ مضطر صاحب کی بہت سی تحریریں، ان کے بہت سے خطوط ذرا سی کاوش سے دستیاب ہو سکتے ہیں۔ میں بھی اس کام میں اُن کی مدد کروں گا۔ ہر بار اُنہوں نے وعدہ کیا، لیکن کچھ نہ کر سکے۔ ابھی چار سال پہلے "شاعر" کے شمارۂ اپریل ۱۹۷۳ء میں "مضطر خیر آبادی" کے عنوان سے ڈاکٹر خلیل اللہ خاں کا ایک نہایت تفصیلی مضمون شائع ہوا تھا اس کے تین ماہ بعد "مضطر خیر آبادی۔ کچھ ایراد و ایزاد" کے عنوان سے اگست ۱۹۷۳ء کے شاعر میں سید منظور الحسن برکاتی کا مضمون شائع ہوا۔ میں نے جاں نثار اختر کو پھر توجہ دلائی۔ یہ دونوں مضامین اُنہوں نے دلچسپی سے پڑھے تھے۔ اُنہوں نے مجھ سے وعدہ کیا کہ اب میں فوراً اپنے والد کے سلسلے میں کام کروں گا، مگر افسوس کہ وہ پھر بھی کچھ نہ کر سکے۔

جاں نثار اختر سے کسی نہ کسی حیلے اور تقریب سے ملاقاتوں کا سلسلہ ہمیشہ رہتا تھا۔ بمبئی کے بڑے مشاعروں، مخصوص علمی، ادبی اور شعری نشستوں، دعوتوں اور تقریبی جلسوں کے علاوہ بیرونی مشاعروں، کانفرنسوں اور سیمیناروں میں بھی بارہا اُن کا ساتھ رہا۔ بمبئی کے علاوہ اُنہوں نے اور میں نے دوسرے شہروں میں کئی بار ساتھ ساتھ سفر کیا، جلوتوں میں بھی ساتھ ساتھ ٹھہرے۔ کم سخنی کے باوجود اُن کی شگفتہ مزاجی سے میں ہمیشہ محظوظ ہوا۔ خواہ بمبئی ہو یا باہر کا کوئی شہر، میں اپنے دوستوں کے شغلِ جام میں مُخل نہیں ہوتا۔ اُن کے ساتھ بیٹھتا ہوں، اُن کی باتوں سے محظوظ ہوتا ہوں، اُنہیں اپنی باتوں سے لطف اندوز کرتا ہوں۔ پی کر آدمی کھُل جاتا ہے۔ مگر جاں نثار اختر کبھی نہیں کھُلے۔ وہی وضعِ احتیاط، وہی سنجیدگی۔ (آخری تین سالوں میں کچھ فرق آ گیا تھا کہ شراب اُنہیں بچتی نہیں تھی اور اُن کی تشنگی انتہا کو پہنچ گئی تھی)۔ اُنہوں نے اپنی اِس کیفیت کی تصویر اپنے ایک شعر میں کھینچی ہے

زندگی یہ تشنگی ٹھہرے تو اِس کا کیا علاج
جس قدر پیتے گئے ہم تشنگی بڑھتی گئی

میں نے اِس طویل مدّتِ تعلق میں جاں نثار اختر سے باہر کے جس مشاعرہ کی بھی دعوت قبول کرنے کے لیے کہا، اُنہوں نے انکار نہیں کیا۔ احمد آباد، بڑودہ، دھرم سالہ (ہماچل)، جموں، سری نگر، مالیگاؤں، شہادہ اور نہ جانے کہاں کہاں دوسرے اسفار پر گئے۔ شہادہ (خاندیش) کا سفر تو اتنا دلچسپ تھا کہ مجھے یا ظ۔ انصاری کو ایک رپورتاژ لکھنا چاہیئے تھا۔ اِس سفر میں کرشن چندر، ظ۔ انصاری، میں اور جاں نثار اختر ساتھ ساتھ تھے۔ غالباً چالیس گاؤں سے ریل کا سفر ترک کر کے ہم اپنے میزبان کے ساتھ شہادہ تک موٹر سے گئے تھے۔ راستے میں کیسی کیسی چھیڑ خانیاں اور جملہ بازیاں ہوئی ہیں، بتا نہیں سکتا۔ ہم نے ایک دوسرے کی خوب "گتیں" بنائیں۔ شہادہ کا دو روزہ قیام، پھر موٹر ہی سے دھولیہ ہوتے ہوئے مالیگاؤں کا ایک شب، روز کا قیام یادگار تھا۔ احمد آباد کے مشاعرہ میں مجروح سلطانپوری، جاں نثار اختر اور میں ساتھ ساتھ تھے۔ مجازؔ لائبریری کے : جیاد کے سلسلے میں جو جلسہ ہوا، اُس میں جاں نثار اختر نے مجھے پیش پیش رکھا۔ ہر جگہ اُن کی بے انتہا قدر ہوتی تھی، اُن کی تہذیب، بے نیازی اور معصومیت سے سب ہی متاثر ہوتے تھے اور شعروں پر تو اُنہیں بے پناہ داد ملتی تھی۔

جموں کی سہ روزہ ادبی کانفرنس میں پہلے دن ۲۰ مارچ ۱۹۷۶ء کو گلاب بھون میں شام کے وقت جناب سید میر قاسم وزیرِ اعلیٰ جموں و کشمیر نے اپنا افتتاحی خطبہ پڑھنے کے بعد اصرار فرمایا کہ چند بیرونی شعرا اختصار سے اپنا کلام بھی سُنائیں۔ یہ فرمائش بالکل غیر متوقع تھی۔ اس کانفرنس میں تو الگ سے ایک بڑا مشاعرہ ہونا ہی تھا۔ بہرحال جس کو جو کچھ یاد آیا، اُس نے سُنایا۔ جاں نثار اختر نے بھی تین چار شعر سُنائے۔ اُن کا مطلع تھا۔ ؎

اِسی سبب سے ہیں شاید عذاب جتنے ہیں
جھٹک کے پھینک دو پلکوں پہ خواب جتنے ہیں

یے پنے دو تین شعر بھی یاد نہیں رہتے۔ میں بہت پریشان تھا لیکن جاں نثار اختر کے مطلع نے مجھے اپنے چند تازہ شعر یاد دلا دئے۔ میں نے کچھ خیال کئے بغیر وہی شعر سنا دئے۔ میرے پانچ شعر کی غزل کے پہلے شعر کا محرک جاں نثار اختر کا مطلع ہی تھا۔ ؎

انہیں سجائے رکھو خود ہی اپنی پلکوں پر
یہ کون پوچھے گا آنکھوں میں خواب کتنے ہیں

یہ شعر سن کر انہوں نے مجھے بڑی معنی خیز نظروں سے دیکھا۔ میں سمجھ گیا۔ وہی قافیہ، صرف ردیف میں "جتنے" اور "کتنے" کا فرق۔ شعر کا مفہوم جاں نثار اختر کے مطلع کے برعکس۔ انہیں اُن کے اشعار پر خوب داد ملی۔ مجھے بھی اپنے اشعار پر خوب داد ملی تھی۔ جلسہ ختم ہونے کے بعد جب ہم "جموں ہوٹل" پہنچے تو اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے۔ میرا کمرہ اُن سے ملحق تھا۔ میں کپڑے وغیرہ اُتار کر اور گرم چادر اوڑھ کر کچھ دیر بعد اُن کے کمرے میں پہنچ گیا۔ وہ تنہا تھے۔ میں نے اُن کے پاس سے سگریٹ اُٹھا کر سلگائی اور پلنگ پر بیٹھ گیا۔ وہ خاموش تھے۔ میں نے اپنے شعر پر اُن کی معنی خیز نظروں کا ذکر چھیڑ دیا۔ کہنے لگے نہیں کچھ نہیں، کوئی خاص بات نہ تھی۔ میں نے کہا اختر صاحب بات ضرور تھی اور ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ میں کسی دوسرے کی زمین میں کبھی غزل نہیں کہتا۔ کوئی ایسا ہی اتفاق ہو جائے تو یہ دوسری بات ہے۔ میں اپنی زمین خود نکالتا ہوں۔ میرا لہجہ اور میری فکر بھی میرے ہم عصروں سے بالکل مختلف ہے۔ دراصل جب بھی میں پہلی بار میں نے آپ کا یہ مطلع سُنا تھا تو مجھے نہ جانے کیوں آپ کی بات کھٹکی تھی۔ خوابوں کو جھٹک کر پھینک دینے کے بعد پھر رہ ہی کیا جاتا ہے؟ آپ تو خود کہہ چکے ہیں۔ ؎

ایک بھی خواب نہ ہو جس میں وہ آنکھیں کیا ہیں
اک نہ اک خواب تو آنکھوں میں بساؤ یارو

میں نے اپنے شعر میں خوابوں کو پلکوں پر سجائے رہنے پر زور دیا ہے۔ میں تو یہ بھی پسند نہیں کرتا کہ خواب صرف آنکھوں میں بسے رہیں۔ انہیں پلکوں پر سجنا ہی چاہیئے۔ آنکھوں میں بسے ہوئے خوابوں کو نہ کوئی دیکھتا ہے اور نہ پوچھتا ہے۔ میں نے اُن کا مطلع اور اپنا شعر دوبارہ پڑھا اور کہا کہ اگر آپ کہیں تو میں اپنے دیوان سے اس شعر کو نکال دوں۔ کہنے لگے ہرگز نہ نکالئے۔ دونوں کا مفہوم الگ الگ ہے۔ میں نے یہ کہنا چاہا ہے کہ ہم اپنے خوابوں ہی کی وجہ سے عذابوں میں مبتلا ہیں اس لئے کہ ہمارے خواب پورے نہیں ہوتے۔ اُن کی تعبیر نہیں ملتی۔ جلسہ میں یکایک آپکا شعر سُننے پر مجھے مماثلت کا احساس ہوا تھا۔ یہ تھی جاں نثار اختر کی حقیقت پسندی۔

اِدھر چند سال میں جب اُن کی غزلوں نے چونکا دینے والا انداز اختیار کیا تھا اُس سے اور بھی زیادہ ربط و تعلق بڑھ گیا تھا۔ فون اُن کے یہاں بھی میرے یہاں بھی۔ مختلف موضوع پر اکثر ہماری باتیں ہوتیں۔ کبھی اِدھر سے اور کبھی اُدھر سے ایک دوسرے کی خیریت دریافت کرتے رہتے ہیں۔ کبھی نئی غزل سُنا رہے ہیں۔ کبھی کسی لفظ اور محاورہ کے تعلق سے بات ہو رہی ہے۔ کبھی مشاعرے اور مشاعرہ پڑھنے کی بات۔ "شاعر" کے لئے میں نے جب بھی اُن سے تازہ غزل کی فرمائش کی انہوں نے انکار نہیں کیا۔ اُن کی کئی مشہور غزلیں "شاعر" ہی میں شائع ہوئی ہیں۔ اُن کا ایک اہم کارنامہ "ہندوستان ہمارا" نامی کتاب ہے۔ اس کتاب کے سلسلے میں بھی اُن کے بے شمار فون آتے رہے تھے۔ مجھ سے جو جو مواد ممکن ہو سکا میں نے انہیں دیا۔ اس کتاب کا اُن کا طویل دیباچہ بہت ہی قابلِ قدر ہے۔ دیباچہ کے پروف میں جاں نثار اختر کو بہت غلطیاں نظر آئی تھیں۔ وہ اُسے میرے ساتھ [illegible] رہے گئے تھے اور ایر پورٹ پر کافی دیر تک اُس دیباچے کے سلسلے میں ہماری باتیں ہوتی رہی تھیں۔

رسالہ "فن اور شخصیت" کا جاں نثار اختر نمبر (جو اُن کے لئے منحوس ثابت ہوا) جب نکلنے لگا تو دونوں وقتوں سے اُن کے کئی فون آتے میری بھی تمنا تھی کہ میں اُن پر مضمون لکھوں۔ لیکن میں اُن کی نظمیہ شاعری پر لکھنا چاہتا تھا جو میری نظر میں اُن کی غزلیہ شاعری سے زیادہ وقیع ہے میں فیض اور مخدوم کی بھی غزلیہ شاعری پر ان دونوں کی نظمیہ شاعری کو ترجیح دیتا ہوں۔ جاں نثار اختر کی غزلیہ شاعری کو تو [illegible] ڈاکٹر محمد حسن اور خواجہ احمد فاروقی جیسے نقاد مل گئے لیکن اُن کی نظمیہ شاعری کو تنقیدی آئینے میسر نہ ہو سکے۔ مجھے اُن کی نظموں کا [illegible] اُن کے پاس بھی ایک ہی کاپی تھی جو اِدھر اُدھر گم ہو رہی تھی۔ افسوس کہ میں اُن پر مضمون لکھنے سے قاصر رہا۔ وہ سب سے پہلے اپنی نظموں کا [illegible] ہندوستان [illegible] سے وہ اور اُن سے [illegible] کے کمرے میں خوب محفل [illegible] آخر سے زیادہ ملاقاتیں [illegible] یہاں ہوئیں۔ شکایتیں اور حکایتوں کے سلسلے چلتے۔ جاں نثار اختر کی [illegible] جس ہی بڑی ہوتی تھی بلکہ وہ خود سراپا جمال تھے۔ مزاج میں جلال [illegible] نہ تھا۔ اُن کے ایک بہت دیرینہ اور قریبی دوست سے اُن کا جھگڑا ہو گیا۔ وہ دوست

دوست آں باشد کہ گیرد دستِ دوست
در پریشاں حالی و درماندگی!

کی سچی تصویر تھا لیکن صاحبِ اختر کی عزتِ نفس کو ٹھیس لگی ہوگی۔ واقعہ

[illegible] ندرناتھ کو معلوم ہے کہ ادیبانی ہونے کے بعد میں صلح صفائی کرائی تھی۔ اس
بات پر اختر نے اپنے مزاج کی عکاسی ذیل کے شعر میں یوں کی تھی۔

اُن کی روِش جُدا ہے ہماری روِش جُدا
ہم سے تو بات بات پہ جھگڑا کیا نہ جائے

صابر دت بہت دنوں تک اختر کے سکریٹری رہے۔ پھر کسی بات پر کھٹک گئی
صابر دت نے ایک طرحی مشاعرہ میں اُنہی کی زمین میں اُنہیں
[illegible] طب کر کے شعر سُنائے۔ جاں نثار اختر سنتے رہے اور مسکراتے
رہے۔ ان میں تنا فاصلہ کی شوخی کو بھی دخل تھا۔ پھر کچھ دن بعد صابر دت
[illegible] لیا۔ اور صابر دت نے اُن پر مہندر ناتھ ہی کی طرح ایک
[illegible] سادہ دل اور بھولے لوگ ایسے ہی ہوتے ہیں۔ ایک
[illegible] باقر مہدی مرحوم ایک بڑے مشاعرہ میں شریک
[illegible] دلاور بھائی فاضل بھائی ایجوکیشنل ٹرسٹ
کی طرف سے ہوا تھا اور جاں نثار اختر مشاعرہ کمیٹی کے چیرمین بھی تھے
[illegible] سنگھ بیدی مشاعرہ کی صدارت کر رہے تھے۔ بیدی صاحب اور میں
[illegible] جاں نثار اختر ذرا دور۔ باقر مہدی کی باری آئی
[illegible] ترقی پسند شعراء کے خلاف
[illegible] اشعار میں باقاعدہ سردار جعفری اور جاں نثار اختر وغیرہ
[illegible] معلوم ہوتا کہ حکومت کر رہے ہیں۔ باقر شعر پڑھتے اور جاں نثار
[illegible] اُن کے اشعار ختم ہونے تک جاں نثار اختر کی
[illegible] مسکراتے رہے اور بیدی صاحب کو
[illegible] میں نے احتجاج کرنا چاہا لیکن بیدی صاحب
[illegible] جاں نثار اختر نے روک دیا۔ اُن کی اپنی باری آئی تو اپنے مخصوص انداز
[illegible] اُنہوں نے اپنا کلام سُنایا اور خوب خوب داد حاصل کی۔
[illegible] باقر مہدی کے خلاف [illegible] مشاعرے کے [illegible] یہی نہیں
[illegible] اختر کے [illegible] باقر مہدی اور [illegible] جعفری کا رسالہ نکلا تو اس کے
[illegible] غزل کہی [illegible] قلب کی صفائی کے اظہار کے لیے
[illegible] شعر کافی ہے۔

تمہارے دل میں جو اب بھی ہو کوئی بات تو ہو
ہمارے دل سے تو سب کچھ نکل گیا ہے میاں

باقر مہدی کو اُن کے جارحانہ رویہ کے باوجود میں بھی چاہتا ہوں، راجندر سنگھ
بیدی بھی چاہتے ہیں اور جاں نثار اختر بھی چاہتے تھے۔ ویسے دوستی، خلوص

اور مراسم کے سلسلے میں اُن کی داخلی کیفیت کا اندازہ اُن کے اِس شعر سے لگایا
جا سکتا ہے۔

یہ دوستی، یہ مراسم، یہ چاہتیں، یہ خلوص
کبھی کبھی مجھے سب کچھ عجیب لگتا ہے

اِس عجیب لگتا ہے نے اُنہیں خود فراموشی پر مجبور کیا۔ وہ سب کچھ بھول جانا
چاہتے تھے۔ مداوائے درد و غم کے لیے اس کے سوا اُن کے پاس اور کیا تھا۔

اب سوا اس کے مداوائے غمِ دل کیا ہے
اتنی پی جائیں کہ ہر رنج و محن کو بھولیں

مگر خود کو بھولنا کوئی آسان کام نہیں!

آپ اپنے کو بھلانا کوئی آسان نہیں
بڑی مشکل سے میاں بے خبری آتی ہے

وہ ندا فاضلی ہوں یا عزیز قیسی، باقر مہدی ہوں یا حسن کمال یا دوسرے قابلِ قدر
پڑھے لکھے نوجوان۔ جاں نثار اختر ان سب کے ساتھ بے تکلفی سے بیٹھتے، پیتے،
بولتے، ہنستے، شعر سُنتے اور سُناتے۔ پابندی کے ساتھ شام سے رات تک
اُن کے یہاں محفلِ ناؤ نوش جمتی، ہوش و گوش کی باتیں بھی ہوتیں۔ نوجوانوں
کے بیچ بیٹھنے میں وہ خوشی محسوس کرتے تھے۔ دوسرے لوگ تو ترقی پسندی اور
جدیدیت کی بحثوں میں پھنسے رہے اور وہ یہ کہہ کر ــــ

شعر و فن کی سجی ہے نئی انجمن
ہم بھی بیٹھے ہیں کچھ نوجوانوں کے بیچ

اِس نئی انجمن میں شامل ہو گئے۔ اُن کی انجمن آرائی اُن کے اُن اشعار سے
ظاہر ہے جن میں تہ داریت ہے۔ میری اور ظ۔ انصاری ہی کی طرح جاں نثار اختر
بھی نئی نسل کے قدردان تھے۔ جدیدیت کے تعلق سے کئی بار اُن سے باتیں
ہوئیں۔ میں نے اُنہیں بہت روشن خیال پایا۔ بہت وسیع القلب اور وسیع النظر
اُنکی غزلیہ شاعری میں جو تبدیلی آئی وہ شعوری تھی۔ اس خود تنقیدی کے بعد ــــ

کیا پتا ہو بھی سکے اِس کی تلافی کہ نہیں
شاعری تجھ کو گنوایا ہے بہت دن ہم نے

جاں نثار اختر کی شاعری نے جو انگڑائی لی اور اُن کے لہجے میں جو بانکپن آیا،
وہ اُن کی تمام عمر کی شاعری کا حاصل ہے۔ ادھر چند سال میں اُنہوں نے
جتنی بھی غزلیں کہی ہیں، اُنہیں فراموش نہیں کیا جا سکے گا۔ آخر میں خود کو [illegible]

ہر چند نیا ذہن دیا ہم نے غزل کو
پر آج بھی دل پاسِ روایات کرے ہے

پاسِ روایت" کے ساتھ ساتھ، جاں نثار اختر میں روایت شکنی کا بھی حوصلہ تھا۔

ہم سے پوچھو کہ غزل کیا ہے، غزل کا فن کیا
چند لفظوں میں کوئی آگ چھپا دی جائے

اور واقعی اُنہوں نے اپنے بعض اشعار میں آگ چھپا دی مگر یہ "ٹھنڈی آگ" تھی۔ وہ چنگاریوں کو اپنے لہجے کی حلاوت سے اتنا دلکش بنا دیتے ہیں کہ اُنہیں سینہ میں بھر لینے کو جی چاہتا ہے۔ یہ چند شعر دیکھیے۔

اپنے تاریک مکانوں سے تو باہر جھانکو
زندگی شمع لیے در پہ کھڑی ہے یارو
کس کی دہلیز پہ لے جا کے سجائیں اِس کو
بیچ رستے میں کوئی لاش پڑا ہے یارو

ہم کو گزری ہوئی صدیاں تو نہ پہچانیں گی
آنے والے کسی لمحے کو صدا دی جائے

نہ جانے وقت کی رفتار کیا دکھاتی ہے
کبھی کبھی تو بڑا خوف سا لگے ہے مجھے
بکھر گیا ہے کچھ اِس طرح آدمی کا وجود
ہر ایک فرد کوئی سانحہ لگے ہے مجھے
یہ ایک آدھ قدم کا حساب کیا رکھیے
ابھی تلک تو وہی فاصلہ لگے ہے مجھے

اور تو مجھ کو ملا کیا مری محنت کا صلہ
چند سکّے ہیں مرے ہاتھ میں چھالوں کی طرح

سستے داموں لے تو آئے لیکن دل تھا بھر آیا
جانے کس کا نام کھدا تھا پیتل کے گلدانوں پر

ہاں خبردار کہ اک لغزشِ پا سے بھی کبھی
ساری تاریخ کی رفتار پلٹ جاتی ہے

انقلابوں کی گھڑی ہے
ہر "نہیں"، "ہاں" سے بڑی ہے

اِدھر چند سال سے جاں نثار اختر کا ستارہ مائل بہ عروج تھا۔ جمود اور دل کے دوسرے دَورے سے سنبھلنے کے بعد اُن کی شاعری نے ایک سیلِ رواں کی صورت اختیار کر لی تھی۔ وہ سب کی توجہ کا مرکز بنتے چلے جا رہے تھے، کیا حکومت اور کیا عوام و خواص۔

"آواز دو، ہم ایک ہیں"

اُن کا یہ نغمہ پورے ملک میں گونجا اور اس نے قومی یکجہتی کی گرتی ہوئی دیوار کو بڑا سہارا دیا۔ وہ جو انہوں نے بھنّا کر شکایت کی تھی کہ

انعام ہو، خطاب ہو، ویسے ملے کہاں
جب تک سفارشوں کو اکٹھا کیا نہ جائے

تو اُن کی یہ حسرت بھی پوری ہو گئی۔ اُنہیں نہرو ایوارڈ ملا، کئی دیگر اعزازات و انعامات بھی ملے۔ کئی فلموں کے گانے لکھنے کے لیے بھی اُن کی خدمات حاصل کی گئیں۔ وہ جسلوک ہسپتال میں تھے اور "خاکِ دل" اُن کا آخری انعام لینے کے لیے لکھنؤ گئے ہوئے تھے، مگر خاکِ دل کی واپسی سے پہلے ہی اختر کو موت کا انعام مل گیا۔

ہماری قدر کر لو اے سخن کے متوالو
غزل کے کل نہ ملیں گے مزاج داں ہم سے

اُن کی قدر دانی کا سلسلہ جاری ہی تھا کہ "کل" آ گیا، جس نے غزل کے اس مزاج داں کو ۱۸ جولائی ۱۹۷۶ء کی شام کے تین بجے جسلوک ہاسپٹل بمبئی میں ابدی نیند سُلا دیا۔ موت بھی آئی تو اُسی نرمی، اُسی حلاوت اور اُسی شائستگی سے جو اُن کی سرشت میں شامل تھی۔ اسپتال کا تیمار گر بیہوش ہیں .... ایک اپنی بیوی خدیجہ کے زانو پر سر رکھا اور ہمیشہ کے لیے آنکھیں موند لیں۔ نہ چہرے پر موت کے کرب کی کوئی نشانی، نہ جسم میں کوئی تشنج ..... بیہوش ہو جاتی ہیں اور ہوش آتا ہے تو کسی طرح اپنی بچیوں کو گھر پر ایک ناتمام سا فون کر کے بند کر دیتی ہیں۔ بچیاں گھبرا کر سردار جعفری کو فون کرتی ہیں۔ وہ اتفاق سے گھر پر موجود تھے۔ اسپتال اُن سے قریب ہے، فوراً دوڑ جاتے ہیں۔ دھڑکتا ہوا دل، لرزتے ہوئے ہاتھ، بھیگی بھیگی آنکھیں اور اس عزیز ترین دیرینہ دوست کا سرد جسم، جو اُن کے لیے زندگی بھر گرم جوش رہا۔ لاش گھر لائی جاتی ہے، کسی کو فون سے، کسی کو آدمی بھیج کر حتیٰ الامکان اختر کی مرگِ ناگہاں کی اطلاع کرائی جاتی ہے ..... کو شام کے پانچ بجے گورنمنٹ پریس میں جہاں اختر اور ..... کا اردو حصّہ سونپا جانے والا تھا، اس تقریب میں ایک بڑا جلسہ

ان دنوں میری طبیعت کافی خراب تھی۔ محبِ گرامی سید شہاب الدین دسنوی اور عزیز مکرم سید محمد زیدی صاحب غریب خانہ کے قریب گاڑی لے کر آگئے تھے۔ جی بہلانے کو اُن کے ساتھ جلسہ میں چلا گیا تھا۔ ابھی جلسہ گاہ میں جا کر بیٹھا ہی تھا کہ پیچھے سے خواجہ عبدالغفور صاحب نے یہ المناک خبر دی کہ جاں نثار اختر کا انتقال ہو گیا۔ اُس گھڑی سے جلسہ کے اختتام تک دل و دماغ بہت بے قابو رہے یکے بعد دیگرے مختلف خیالات آ رہے تھے اور جا رہے تھے۔ ۱۵ مئی کو بھوپال میں میرے بڑے صاحبزادے تاجدار احتشام کی شادی تھی۔ اور اُس سے ایک دن پہلے اِسی تقریب میں ۱۴ مئی کو اختر سعید خاں صاحب کے دولت کدہ کے بڑے سے صحن میں ایک مشاعرہ تھا۔ میں، میری بیوی اور بمبئی سے جانے والے دیگر احباب مع اعزا اختر سعید ہی کے یہاں ٹھہرے تھے۔ بارات بھی اُن ہی کے یہاں سے گئی تھی۔ اُن دنوں جاں نثار اختر بھوپال ہی میں تھے۔ وہ مع اپنی بیگم خدیجہ کے مشاعرے میں آئے تھے۔ صدر بھی وہی تھے۔ اُن سے بمشکل تخت پر چڑھا گیا، پاؤں لڑکھڑا رہے تھے۔ چہرہ پر سخت اضمحلال تھا۔ انہوں نے اپنی طویل نظم "آخری لمحہ" سنائی جو دوسرے دورۂ قلب کے وقت اپنی بیٹی سے مخاطب ہو کر کہی تھی اور جو اُن کی بیحد قیمتی نظم ہے۔ میں دو دن بعد بھوپال سے بمبئی واپس آگیا۔ جون کی کسی تاریخ کو (تاریخ یاد نہیں آ رہی ہے) وزیرِ اعلیٰ مہاراشٹر کے یہاں اُردو صحافیوں کا ڈنر تھا۔ اُس ڈنر میں حسن کمال نے مجھے بتایا کہ وہ آج ہی لکھنؤ سے واپس آئے ہیں۔ اُن کے ساتھ لکھنؤ سے جاں نثار اختر بھی آئے، انہیں بھوپال اُتار دیا ہے۔ سخت بخار تھا اور ٹانگ پر فالج کا اثر۔ اِس اطلاع کے بعد اُن کے گھر متعدد فون لگائے مگر نوکر کے سوا گھر پر کوئی نہ تھا۔ سب بھوپال گئے ہوئے تھے۔ بھوپال کے خطوط سے پتہ چلا کہ انہیں حمیدیہ اسپتال میں بغرضِ علاج رکھا گیا ہے۔ کوئی تین ہفتے بعد معلوم ہوا کہ وہ بمبئی آگئے ہیں۔ میں جانے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ ۲۸ جولائی کو کرشن چندر پر دل کا تیسرا سخت دورہ پڑ گیا۔ اختر کے گھر مسلسل فون لگائے، مگر صدائے برنخاست ـــ! معلوم ہوا کہ اُن کی غیر موجودگی میں فون کا کنکشن کٹ گیا ہے۔ بات پھر ٹل گئی اور اطلاع ملی کہ وہ "جسلوک اسپتال" میں ہیں، طبیعت سنبھل گئی ہے۔ گورنمنٹ پریس کے جلسے میں جاتے ہوئے میں دسنوی صاحب اور زیدی صاحب سے کہہ ہی رہا تھا کہ جاں نثار اختر کو دیکھنے اسپتال چلنا ہے، کل کا پروگرام بنا لیں راجندر سنگھ بیدی بھی بیمار تھے، انہیں بھی دیکھنے کے لئے جانا تھا ـــ قدرت کو یہ منظور نہ تھا کہ جاں نثار اختر کو زندہ دیکھ سکوں۔ جلسہ کے آخر میں صدرِ جلسہ جناب ڈاکٹر رفیق زکریا نے بھی بڑے دکھ کے ساتھ اختر کی موت کی توثیق کی۔ ہال میں بہت سے شاعر، ادیب، صحافی اور اُردو دوست تھے، مگر کسی کو صحیح اطلاع نہ تھی کہ تجہیز و تکفین کب ہوگی۔ جلسہ میں ریاض احمد خاں صاحب نے بتایا کہ سیّجو الیہ سے انہوں نے میرے گھر پر یہ المناک اطلاع دے دی تھی۔ میں جلسہ میں آنے کے لیے گھر سے نکل چکا تھا۔ اُس فون کے بعد گھر والے سخت پریشان ہو گئے کہ جب میں نے جلسہ میں یہ اطلاع سُنی ہوگی تو میرا کیا حال ہوا ہوگا۔ میں گھر لوٹوں گا یا براہِ راست باندرہ چلا جاؤں گا۔ جلسہ کے بعد ڈاکٹر عبدالستار دلوی، بیگم دلوی (میمونہ صاحبہ) عزیزی یونس اگاسکر اور ڈاکٹر عبدالکریم نائک نے سہارا دیا اور اُن کی معیت میں گرتا پڑتا باندرہ پہنچا۔ باندرہ اسٹیشن سے عزیزی یونس اگاسکر نے میرے گھر فون کر دیا تھا کہ وہ ساتھ ہیں اور مجھے ساتھ لیکر ہی واپس ہوں گے۔

جاں نثار اختر کی رہائش گاہ، ماتم کدہ بنی ہوئی تھی۔ سوگواروں کا ایک ہجوم تھا۔ مرد کمپاؤنڈ میں کرسیوں پر فروکش، کچھ سڑک پر کھڑے ہوئے۔ خواتین بالائی منزل پر۔ مجروح سلطان پوری، اختر الایمان، سردار جعفری، ساحر لدھیانوی، کیفی اعظمی، نوشاد علی اور مرنے والے کے دوسرے قریبی عزیزوں اور دوستوں کے چہروں سے درد و غم آشکار۔ کچھ چہرے بے تاثر اور شاداں، ادب اور شاعری کی بحثیں۔ نہ کلمہ نہ درود، حقیقت پسندی کے دعویدار موت کی حقیقت اور عاقبت سے بے پروا۔ !! نہایت کم وقت میں ادیب شاعر، صحافی، میوزک ڈائرکٹرز، علم والے، فلم والے چھوٹے بڑے کافی لوگ وہاں پہنچ گئے تھے۔ تقریباً دس بجے جاں نثار اختر کو کفن بردوش، بالائی منزل سے نیچے لایا گیا اور گہوارے میں لٹاتے ہی یوں لگا جیسے وہ کہہ رہے ہوں ـــ

"کفن سرکاؤ میری بے زبانی دیکھتے جاؤ"

چہرے سے کفن سرکایا گیا اور عزادارانِ اختر قطار در قطار اُس چہرے کو بہ صد حسرت و یاس دیکھتے ہوئے ایک طرف سے دوسری طرف نکلتے گئے، جس کی خندہ روئی، پاسِ وضع اور ملنساری مثالی تھی۔ موت کے بعد بھی وہ یہ مصرع یاد دلا رہے تھے ـــ

"آخری وقت میں کیا اپنے چلن کو بھولیں"

احباب و اعزا انہیں تھوڑی دور اپنے کاندھوں پر لے گئے اور پھر سانتا کروز قبرستان تک لیجانے کے لیے گہوارے کو ایک ٹرک پر رکھ دیا گیا۔ آگے پیچھے ٹیکسیاں اور کاریں۔ بعد نمازِ جنازہ (مقامِ عبرت، کہ علامہ سید تفضل حسین خاں کے پڑپوتے اور مولانا فضلِ حق خیرآبادی کے پرنواسے کی

نمازِ جنازہ میں دس بارہ آدمیوں سے زیادہ نہ تھے) ——————
ساڑھے دس بجے رات کو قبر کی گیلی مٹی سے آتی ہوئی سوندھی سوندھی خوشبو میں اُن کا جسدِ خاکی اُس صندوق میں اُتار دیا گیا جو تختے لگا کر بنایا گیا تھا۔ لوگ جب اُنہیں مٹی دے رہے تھے تو آواز آ رہی تھی۔

جینے کا ہمیں خود نہ ملا وقت تو کیا ہے
لوگوں کو سکھاتے رہے جینے کا ہنر ہم!

مگر یہ ہنری اور بے ہنری منوں مٹی کے نیچے دب چکی تھی۔ میری چشمِ تصور نے دیکھا کہ اُن کے دودھیا لباس ہی کی طرح صاف شفاف سنگِ مرمر سے اُن کا مزار بنا ہوا ہے اور لوحِ مزار پر میرا ہی لکھا ہوا قطعۂ تاریخِ وفات کندہ ہے۔ شب کے سناٹے میں قبرستان کی عبرتناک فضاؤں سے آوازیں آ رہی تھیں —

کُلُّ مَنْ عَلَیْهَا فَانٍ ۞ کُلُّ مَنْ عَلَیْهَا فَانٍ ۞

جاں نثار اختر (سید جاں نثار حسین رضوی) ۱۹۱۴ء میں گوالیار میں پیدا ہوئے تھے، جہاں اُن کے والد ہائیکورٹ کے جج تھے۔ خوب خوب شادیانے بجے، ہفتوں اُن کا جشنِ ولادت منایا گیا۔ وہ اپنے خاندان میں تنہا اولادِ نرینہ تھے۔ خیرآباد (یو۔پی) کے اُس خاندان سے تعلق رکھتے تھے جو اپنے علم و فضل میں بیحد ممتاز تھا۔ اُن کے پردادا علامہ سید تفضل حسین خاں، دادا سید احمد حسین رسوا بھی عالم اور شاعر تھے۔ جاں نثار اختر مرحوم کی دادی بی بی سید النساء مولانا فضلِ حق کی صاحبزادی تھیں، نہایت ذی علم۔ وہ شاعرہ بھی تھیں اور حرماں تخلص کرتی تھیں۔ مولانا فضلِ حق خیرآبادی کا جنگِ آزادی میں جو حصہ رہا اُسے تاریخ فراموش نہیں کر سکتی۔ اُن کے تایا حافظ محمد حسین بسمل خیرآبادی غالب کے شاگرد تھے اور نواب ابراہیم علی خاں والیٔ ٹونک کے اُستاد۔ اختر کے والد سید افتخار حسین رضوی مضطر خیرآبادی نے اپنے بڑے بھائی ہی سے ابتداً اصلاح لی۔ بعد میں امیر مینائی کے شاگرد ہوئے۔
مضطر خیرآبادی اپنے خاندان میں سب سے زیادہ ذہین اور طباع تھے، بڑی شان و شوکت والے۔ ہر وقت سنہری دستے کی تلوار پاس رکھتے تھے۔
بسمل خیرآبادی کی وفات کے بعد اُنہیں نواب صاحب ٹونک نے اپنا اُستاد بنا لیا تھا۔ ٹونک میں مختلف بڑے عہدوں پر فائز رہے۔ آخر میں سول جج صدر ٹونک بنائے گئے۔ ۱۹۰۲ء میں ریاست گوالیار سے تعلق قائم ہوا۔ اس ریاست میں وہ وکیلِ دربار گوالیار، پھر سپرنٹنڈنٹ کورٹ آف وارڈس بعد میں ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ اور ڈسٹرکٹ جج، سشن جج وغیرہ بنائے گئے۔ ۱۹۲۳ء تک وہ گوالیار میں رہے۔ وہاں سے ریٹائرڈ ہونے کے بعد نواب نصراللہ خاں والیٔ بھوپال نے اپنے یہاں بلا کر جوڈیشل سکریٹری کے عہدہ پر فائز کر دیا تھا۔ اس سے پہلے جب وہ گوالیار میں تھے تو کچھ عرصہ کیلئے نواب رامپور نے اُن کی خدمات مستعار لے لی تھیں۔ نواب بھوپال کے بعد مہاراجہ ٹکم گڑھ اندور نے عزت افزائی کی اور اُنھیں اپنے پرسنل اسٹاف میں شامل کر لیا۔ ریاست اندور کی ملازمت کا سلسلہ تاحیات جاری رہا۔ بیمار ہوئے تو بغرضِ علاج گوالیار آ گئے اور یہیں ۱۹۲۷ء میں اُن کا انتقال ہوا۔ مضطر خیرآبادی عربی، فارسی، اُردو اور انگریزی کے علاوہ ہندی زبان بھی بہت اچھی جانتے تھے۔ موسیقی سے گہرا لگاؤ تھا۔ بہت اچھے غزل گو ہونے کے علاوہ نعت گو اور نظم نگار بھی تھے۔ مضطر نے اپنی ہندی شاعری میں نہ صرف ہندی الفاظ اور اُس کے صحیح مزاج کو برتا، بلکہ ہندو مذہب اور ہندو کلچر کو شاعری کا محور بنایا۔ اُنہوں نے بھجن، ٹھمری، دوہا، سندلیسا، برہا اور ملہار سب کچھ لکھا۔
جاں نثار اختر مرحوم کے خاندان اور اُن کے والد کے اس مختصر تعارف سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ اُن میں اپنے خاندان کی بہت سی خصوصیات جمع ہو گئی تھیں۔ اُنہیں ورثہ میں اپنے والد سے تادر الکلامی کے ساتھ ساتھ نرمی، حلاوت اور برج بھاشا کی خوبصورتی ملی تھی۔ انہوں نے اپنی طویل نظم "آخری لمحہ" میں اپنی بیٹی سے کہا تھا ؎

تم ایک ایسے گھرانے کی لاج ہو جس نے
ہر ایک دَور کو تہذیبِ آگہی دی ہے
تمام حکمت و دانش، تمام علم و ادب
چراغ بن کے زمانے کو روشنی دی ہے
جلا وطن ہوئے آزادیٔ وطن کے لئے
مرے تو ایسے کہ اوروں کو زندگی دی ہے

جاں نثار اختر کی شاعری میں لہجے کی حلاوت، دھیمے اور سیلے پیرایۂ اظہار اور تہہ پیکر وں کے غنائی انداز کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اُن کی پوری شاعری آمد کی شاعری ہے جس میں ایک لطیف و جدانی فضا کا احساس ہوتا ہے، اِسی کے ساتھ نشاطِ کرب کا بھی۔ اختر مرحوم صحیح معنوں میں "نغز گو" تھے۔ اُن کی شاعری کے استعاراتی پہلو بڑے تابناک ہیں۔ حسرت اور جگر کے بعد تہذیبِ عاشقی کے سلسلے میں بھی جاں نثار اختر کا نام ہمیشہ لیا جائے گا۔ جنسیاتی تخیل اور تہذیب بدنامی میں وہ فراق کے

ہم پلہ نظر آتے ہیں اور کہیں کہیں فراق سے آگے۔ ہر چند اُن کی آواز میں بہت سی آوازیں شامل ہیں لیکن بہت سی آوازوں کو اپنی آواز بنا کر پیش کرنا جاں نثار اختر کا کمال تھا۔ شاعری کو آرٹ کا درجہ دینے والوں میں ایک جاں نثار اختر بھی تھے۔ اُن کے بعض شعر نہیں، paintings معلوم ہوتے ہیں۔

جاں نثار اختر کی نظمیہ شاعری اُن کی غزلیہ شاعری سے بھی زیادہ اہم، مؤثر اور مایہ دار (rich) ہے۔

شعری مجموعے: سلاسل، جاوداں، امن نامہ، خاکِ دل، گھر آنگن، پچھلے پہر

مرتبہ مجموعے: زیرِ لب۔ ہندوستاں ہمارا

○○

۷۸۶

قطعۂ تاریخِ وفات جاں نثار اختر مرحوم

خلفِ افتخار الشعراء اعتبار الملک خان بہادر سید افتخار حسین مضطر خیر آبادی

نتیجۂ فکر: اعجاز صدیقی

چل بسا آہ دارِ فانی سے — شاعرِ عصر جاں نثار اختر
آخری نقشِ خاکِ خیرآباد — خلفِ صدق حضرتِ مضطر
بدھ، اٹھارہ اگست، شام کے وقت — باندھ کر آخرت کا رختِ سفر
جا ملا خود مجاز و صفیہ سے — ان کی یادیں تھیں روح کا محور
تھی تریسٹھ (۶۳) برس ہی عمر ابھی — کرلیا زندگی سے قطعِ سفر
دورۂ قلب اور فالج سے — فرصتِ یک نفس ملی نہ مگر!
حاملِ خوش دلی و خوش طبعی — حلم و اخلاص و خلق کا پیکر
آستیں کا نہ ہوش دامن کا — صرف ہونٹوں پہ جامِ کیف آور!
"خاکِ دل"، "پچھلے پہر"، "گھر آنگن" — حسیت کے تمام تر مظہر
نرم الفاظ اور ترکیبیں، — پھول کی پتیوں سے نازک تر
انتہا قادر الکلامی کی — صاحبِ طرزِ خاص و فکر و نظر

لکھ دو اعجاز مصرعِ تاریخ
"چاکِ داماں خاکِ دل اختر"

۱۹۷۶

بشر نواز

ایک نظم

(جاں نثار اختر کے لیے)

ہم نے دیکھا تھا اُسے بارہا
باتیں کی تھیں
اُس کے منصبِ [illegible] کی [illegible] سے کیسے؟
اپنے ہی رنگ سی ساگروں کو سجا لیتے تھے۔
کوشتی رات کی بے وجہ اداسی میں بھی
اور محبت کے مہکتے ہوئے لمحات میں تنہائی میں
وہ تو شامل رہا اک ہمدم و محرم کی طرح
کبھی نغمے، کبھی غزلیں بن کر

ہم مگر اُس کے کسی دَرد کے محرم نہ بنے
اس کے سینے میں تڑپتے ہوئے طوفانوں سے
بے خبر۔ چُنتے رہے سیپیاں اُس ساحل سے
جس پہ موجوں کی عطا کردہ خراشوں کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔

اُس نے جب درد کے طوفانوں میں
ہم کو دیکھا ہوگا
ہم نہ جانے کہاں، کس حال میں، کس محفل میں،
اپنے ہنگاموں سے اُلجھے ہوں گے
ہم تو اُن ٹوٹتی نظروں کی کراہیں بھی نہ سُن پائے جنھیں
ایک تہذیب نے محتاط ادا بخشی تھی
مر گیا [illegible] وہ خون نہ ہم دیکھ سکے۔
جس نے اک دور کے ماتھے کو ضیا بخشی تھی
ہم کہیں دور تک اُلجھے ہوئے اپنے دکھ سے۔
پھر بھی اک رشتۂ پنہاں میں بندھے ہیں ہم سب
وہ بھی جو پاس رہے۔
وہ بھی جو دور رہے۔
اور وہ بھی
ہم نے چاہا ہے جسے چاہنے والوں کی طرح
اور جو آج گزر گیا ہم سب کو غزالوں کی طرح

○ [illegible]

منظور سلطان پوری

بیادِ جاں نثار اختر مرحوم

جس راہ سے وہ آیا اُسی راہ کو گیا
مٹی کا جسم مٹی تلے دب کے کھو گیا

دردِ غمِ حیات کا بیباک ترجماں
دنیائے بے ثبات سے لے دکھ [illegible] گیا

جذبوں کی بے زبانی کو جس نے زباں دی
لفظ و نوا میں کرب کے موتی پرو گیا

حرف و قلم سے وقفِ غمِ آدمی رہا
اپنے وجود کو بھی لہو میں ڈبو گیا

نظموں میں انبساط کا اک سیلِ بیکراں
غزلوں میں درد و غم کی کہانی سمو گیا

پیہم یہی نصیب شاعرِ آشفتہ ذہن کا
احساس کی صلیب پہ مصلوب ہو گیا

رشتہ نفس کا ٹوٹ گیا شمع بجھ گئی
جیا دُکھوں کی تان کے بیمار سو گیا

اب اس کی آتما کو گھنی چھاؤں مل گئی
اختر سہاگ رات کی صفیہ کا ہو گیا

○ مرحوم نرم دلی سے جیا۔ لیڈر و کیٹ سال کر رشتہ جیا (؟)

ے صفیہ کے نام موصوف کی معرکۃ الآرا نظم

اسحاق ملک

نئی غزل کی مہک

(جاں نثار اختر کی یاد میں)

اُسے شہرِ وفا لکھوں
اُسے حرفِ جنوں لکھوں
نئے لہجے کی رنگینی لکھوں
لکھوں تو کیا لکھوں — !
غزل جس نے لکھی ایسی نئی ایسی تر و تازہ
سُنی جس نے دعائیں دیں —
پڑھی جس نے تو بلائیں لیں۔
وہ "پچھلے پہر" جو ہم دل میں "گھر آنگن" میں بستا تھا
تو لگتا تھا خرابے میں بہاریں رقص فرما ہیں —!!
اشارت کیا، عبارت کیا، ادا کیا،
وہ شخصیت سراپا فکر و فن، نغمۂ جنّت
ہمارے عہد میں سر چشمۂ اخلاص و اُلفت تھی۔

وہ اب ہم میں نہیں، لیکن —
سخن کی چاندنی، خوشبو، مہک نزدیک لگتی ہے۔

○ مکان نمبر ۲۲-۱-۸۷۳ سلطان پورہ - حیدرآباد

ایم - ایم - وفا

جُستجو کا کرب

(بیادِ جاں نثار اختر مرحوم)

کہاں تلاش کریں ؟
وہ روشنی جو اندھیرے میں ہو گئی ہے گم۔
وہ روشنی جو نہیں محفلِ رفیقاں میں
چراغ ہو گئے خاموش سو گئی قندیل
دُھواں دُھواں سی لگے ہے فضائے کیف و سُرور
کہاں تلاش کریں ؟

وہ زندگی جو مکمل بیاضِ چاہت تھی
پیامِ درد تھی پیغمبرِ محبت تھی
جہانِ مہر و وفا کی اہم ضرورت تھی
وہ شاعری جو حدیثِ دلِ شکستہ تھی
وہ شاعری جسے تلخیصِ دردِ دل کہیئے
فسانۂ غمِ ہجراں، بیانِ محرومی،
وہ حالِ جذبۂ مجروح و ذکرِ نالۂ شب
وہ شاعری کہ جہاں غم بھی تھا نشاط انگیز
دلِ حزیں سے عجب مستیاں ٹپکتی تھیں
وہ شاعری جو مفسّر تھی شوخ جذبوں کی
کھلی تھی آرزوؤں کی شگفتہ چاہوں کی
کنواریوں کے حسین دلگداز سپنوں کی
دیارِ شوق کی جانب بہکتے قدموں کی
کہاں تلاش کریں ؟
وہ روشنی جو اندھیرے میں ہو گئی ہے گم۔

○ معرفت ناظم مبارکی - تازی چوک بنیا (بہار)

جگر بریلوی ــــ خطوط کے آئینے میں

مُبشّر علی صدیقی
محلہ سوتھہ - بدایوں - یوپی

آج کل جس تیز رفتاری سے بزرگ ادیب ہمارے درمیان سے اُٹھتے جارہے ہیں اُس پر جتنا بھی ماتم کیا جائے کم ہے۔ مسعود حسین رضوی کا انتقال ہوا تو چند دن بعد جوشؔ ملسیانی کی رحلت کی خبر سُننے میں آئی۔ ابھی اُردو داں طبقہ ان حادثات سے سنبھلا بھی نہ تھا کہ ۵ مارچ ۱۹۷۶ء کو شیام موہن لال جگرؔ بریلوی ۸۷ سال کی عمر پاکر اس دنیا سے کوچ کر گئے۔ اُن کے انتقال سے اُردو غزل کے ایک اہم دور کا جس کا سلسلہ عزیزؔ لکھنوی سے ملتا تھا خاتمہ ہو گیا۔ اُنھوں نے "پی کہاں" جیسی نظم لکھی تھی جو اس صدی کے تیسرے دہے میں نظامی پریس بدایوں سے شائع ہوئی تھی۔ یہ نظم اُردو داں طبقے میں کافی مقبول ہوئی۔ غزلیات کا انتخاب انجمن ترقیٔ اُردو (ہند) نے اپنے اُس نوعیت کے سلسلے کے انتخابات میں علی گڑھ سے شائع کیا تھا۔ انجمن نے اُن کی ایک کتاب "یادگارِ نظر" بھی شائع کی۔ لکھنؤ سے اُن کی مثنوی "پیامِ ساوتری" اور رباعیات کا مجموعہ "رس" شائع ہوئے۔ اُن کی ایک اور اہم کتاب "یادِ رفتگاں" ہے جو ہندوستان کی بعض یونیورسٹیوں کے نصاب میں اب تک شامل ہے۔

جگرؔ بریلوی کی شخصیت اور فن پر متعدد مضامین اور کتابیں لکھی گئی ہیں۔ مالک رام اور سیفی پریمی کی "جگر بریلوی ــــ شخصیت اور فن" کافی اہم ہے۔ ڈاکٹر عبداللطیف بریلوی نے بھی "جگر بریلوی ــــ ایک تعارف" تین سال ہوئے انجمن ترقیٔ اُردو (ہند) سے شائع کی تھی۔

اُن کی غیر مطبوعہ کتابوں میں ان کی خود نوشت سوانح عمری (جو انگریزی زبان میں ہے) Mysteries of my mind کافی اہم ہے۔

مرحوم نے اپریل ۱۹۷۲ء میں (جب میں اپنی مرحومہ اہلیہ کے علاج کے سلسلے میں میرٹھ گیا ہوا تھا تو ایک دن شام کو اُن کے دولت کدہ پر حاضر ہوا تھا) اس کتاب کا مسودہ مجھے دکھایا تھا۔ بعد کو وہ اپنے ایک خط مورخہ ۲۸ اکتوبر ۱۹۷۲ء میں لکھتے ہیں۔

"میں نے اپنی سوانح عمری بھی لکھی ہے، جو تین مختلف جلدوں میں ہے۔ دو اُردو میں ہیں۔ اُن میں سے ایک کوئی تین سو صفحات کے قریب ہے۔ دوسری جو تین سو صفحات پر مشتمل ہے "حدیثِ خودی" کے نام سے شائع ہو چکی ہے۔ اسے میں نے اپنے ایک لڑکے کے کہنے پر کہ آپ کے بہت سے اشعار میں کچھ ایسی بات معلوم ہوتی ہے جس کی تشریح آپ ہی کر سکتے ہیں، لکھی ہے۔ میرے پاس اس کی کوئی جلد نہیں ورنہ آپ کی خدمت میں بھیجتا۔ عزیزی وریندر کے پاس ہوگی۔ یہاں سے آپ طلب فرما لیجئے۔ تیسری یہ انگریزی کی کتاب ہے جو ہنوز غیر مطبوعہ ہے۔ حقیقت میں میری زندگی اُنہی نفسیاتی کارفرمائیوں سے عبارت ہے جس کا اُس میں مفصل بیان ہے۔"

اُن کی کتاب "پیامِ ساوتری" پر اُتر پردیش سرکار نے انعام دیا تھا اور ۱۹۷۳ء میں اُتر پردیش اُردو اکاڈمی نے ادبی خدمات کی بنا پر پانچ ہزار روپے کا انعام بھی دیا تھا۔ طبیعت میں بذلہ سنجی کا بھی مادّہ تھا۔ چنانچہ "پیامِ ساوتری" اور "جگر بریلوی ــ فن اور شخصیت" پر میرے تبصرے "خضرِ حیات" اور "کتاب نما" میں پڑھ کر ۲۵ اپریل ۱۹۷۳ء کے خط میں لکھتے ہیں

"کل مجھے "خضرِ حیات" اور "کتاب نما" ملا۔ یہ آپ ہی کا کرم سمجھتا ہوں۔ آپ کا مضمون پڑھا۔ طبیعت خوش ہوئی۔ کاتب صاحبان بسا اوقات بیک جنبشِ قلم آدمی کو آسمان سے زمین پر پھینک دیتے ہیں یا زمین سے آسمان پر اُچھال دیتے ہیں۔ صفحہ ۱۳ پر کاتب صاحب نے مجھ پر یہی کرم فرمایا اور "فقیر کدے" کو "قیصر کدے" میں بدل کر مجھے آسمان پر پہنچا دیا۔ میں کا شکریہ ادا کرنے کے لئے کس کی زبان اور کہاں سے زبان لاؤں۔ آپ کی کتاب "صحیفۂ بشارت" کے نکلنے میں کتنی دیر ہے"

میرے پاس اُن کے ۳۱ خطوط محفوظ ہیں۔ جو ایک یادگار ادبی سرمایہ ہیں۔ پہلا خط ۱۵ ستمبر ۱۹۷۲ء کا لکھا ہے اور آخری ۱۴ نومبر ۱۹۷۵ء کا۔ اُنھوں نے

۱۹۷۲ء کے آخری مہینوں میں میرے ادبی، تحقیقی اور تنقیدی مضامین کے مجموعے "صحیفۂ بشارت" کا مقدمہ لکھا تھا۔ اور کتاب کا نام بھی اِن ہی کا تجویز کیا ہوا تھا۔ کسے معلوم تھا کہ میری اِس ناچیز کتاب پر اُن کی یہ پہلی اور آخری تحریر ہوگی۔
اِن خطوط میں کچھ خطوط کافی ادبی اہمیت کے ہیں۔ جگر بریلوی نے دوسرے شعرا کے کلام پر اپنی رائے کا اظہار کیا ہے۔ خود اپنی تصانیف کے متعلق بعض اہم نکتے بیان کئے ہیں۔ اخبارات اور رسائل کے مدیران کے طرزِ عمل کی شکایت کی ہے۔ اپنا مجموعۂ غزلیات چھپوانے کے متعلق لکھا ہے۔ اپنے لڑکے مادھو موہن جاؔمی کی ادبی مکتہ سنجی کی تفصیل بیان کی ہے۔ مثلاً اپنے یکم ستمبر ۱۹۷۲ء کے خط میں ایڈیٹر "خضریات" نجیب آباد کی شکایت کی ہے کہ اُنہوں نے وہ شمارہ اُن کو نہیں بھیجا جس میں "پیامِ ساوتری" پر میرا مضمون شائع ہوا ہے۔ اِسی خط میں اپنے صاحبزادے جاؔمی کے تبصرے کی طرف اشارہ کیا ہے جو اُنہوں نے اس مثنوی پر کیا تھا۔ وہ لکھتے ہیں۔

میرٹھ
یکم ستمبر ۱۹۷۲ء
مکرمی تسلیم

آپ کا گرامی نامہ مورخہ ۲۸ اگست کل ملا۔ آپ نے لکھا ہے کہ ایڈیٹر "خضریات" کو دوبارہ لکھا کہ اُس کے جس شمارے میں آپ کا تبصرہ "پیامِ ساوتری" پر ہے مجھے بھیجدیں، مگر اُنہوں نے نہیں بھیجا۔ میں سمجھتا ہوں کہ مدیرانِ جرائد نے یہ اُصول بنا رکھا ہے کہ مضمون نگاروں کے کہنے پر پرچہ کسی کو نہیں بھیجتے۔ مجھے بھی ایسا دو چار بار تجربہ ہوچکا ہے۔ پھر میں نے تو یہ لکھنا ہی بند کردیا۔

"پیامِ ساوتری" پر تُسرخیاں تو کیا اپنے منجھلے بیٹے مادھو موہن رائے جاؔمی کی رائے علاحدہ لکھتا ہوں۔ اس کے ادبی شعور اور تنقیدی اور تدقیقی نقطۂ نظر کا اندازہ آپ اِس سے کرسکتے ہیں کہ بی۔ اے میں اُس کی خاص ادب انگریزی اور پولیٹیکل سائنس تھی اور یونیورسٹی بھر میں پانچواں نمبر اوّل ڈویژن والوں میں تھا۔ اسکالرشپ پایا۔ پھر ایم۔ اے انگریزی میں کیا۔ اوّل ڈویژن اور اوّل نمبر۔ امریکہ میں ہندوستانیوں کا سکّہ جما آیا۔ انگریزی دانی میں۔ اب راجستھان یونیورسٹی (دے پور) میں انگریزی ادب کا ہیڈ ہے۔ پہلے میرٹھ کالج میرٹھ میں تھا۔ دس بارہ سال کا پڑھنے پڑھانے کا تجربہ ہے۔ یوں تو اُس نے کبھی میری تصنیفات کی طرف بظاہر التفات نہیں کیا۔ اب سکے گرمیوں کی تعطیلات میں کچھ ایسے حالات رُونما ہوسکے کہ مجھے یورپ میں رہنا پڑا ورنہ یہ تعطیلات ہر سال میرے پاس میرٹھ میں گذرتی تھیں۔ بس اِس فرصت میں میری جملہ مطبوعہ تصانیف پر نہایت جامع مگر نہایت مختصر تبصرہ کرڈالا۔

"پیامِ ساوتری" پر کم و بیش آٹھ سات تبصرے مختلف رسالوں میں شائع ہو چکے ہیں، سب نے کچھ نہ کچھ نئی بات لکھی ہے۔ میرے علم میں آلِ احمد سرور نے کوئی مضمون اِس پر نہیں لکھا۔ البتہ یہ لکھا تھا کہ موضوع کے اعتبار سے اُردو ادب میں ایک اضافہ ہے۔ بعض دیگر بڑے ادیبوں نے بھی یہی لکھا۔ علی عباس حسینی مرحوم کا مضمون سلسلہ وار "صبحِ نو" پٹنہ کے ماہانہ رسالے میں نکلتا رہا تھا۔ اس کی دس قسطیں نکل چکی تھیں۔ جب میں نے مُدیر جریدہ کو لکھا کہ میں اِس کتاب کا مصنف ہوں۔ ممنون ہوں گا اگر یہ کل شمارے مجھے بھیجدیں۔ جواب آیا کہ ہر شمارے کی قیمت (ایک روپیہ) ہے، آپ دس روپے منی آرڈر سے بھیجدیجئے تو رسالے روانہ کئے جائینگے۔ میں نے جواب میں لکھا آپ کی قدردانی کا ممنون ہوں۔ اب زیادہ لکھا نہیں جاتا۔ دل و دماغ جواب دے جاتے ہیں۔ کل لکھوں گا۔ آپ کی اہلیۂ محترمہ کے انتقال سے جو صدمہ آپ کے دل پر گذرا ہوگا، اُس کا اندازہ محال ہے پروردگار آپ کو طاقتِ صبر عطا کرے۔ برخوردار گرامی سلام عرض کرتا ہے

جگر بریلوی

دوسرے دن یعنی ۲ ستمبر ۱۹۷۲ء کو دوسرا خط لکھا جاتا ہے جس پر اظہارِ ناراضگی کیا جاتا ہے کہ میں نے اپنے مضمون میں اُن کو کہنہ مشق شاعر کیوں لکھا۔ اِسکے بعد جاؔمی صاحب کا "پیامِ ساوتری" پر تبصرہ درج کیا جاتا ہے۔ ملاحظہ ہو

میرٹھ
۲ ستمبر ۱۹۷۲ء
مکرمی تسلیم

سب سے پہلے ایک لفظ کی طرف آپ کی توجہ دلانا چاہتا ہوں۔ وہ لفظ "کہنہ مشق" ہے جو آپنے اپنے "خضریات" کے مضمون میں استعمال کیا ہے۔ یہ لفظ شاعروں کے لئے کوئی استعمال نہیں کرتا کیونکہ اس سے اُن کی توہین و تحقیر کی بُو آتی ہے۔ مُتشاعر کے لئے استعمال کیا جائے تو وہ مزید اُسے باعثِ فخر سمجھ سکتا ہے۔

اب صاحبزادے جاؔمی کا مختصر تبصرہ نقل ہے۔

"اسماعیل صاحب پُرانی مثنویوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں[۱]۔ سطر ۱۹۔۲۰
آج سحر البیان اور گلزارِ نسیم ... نقشِ ونگارِ طاقِ نسیاں ہوگئیں۔"

۱؎ کتاب "جگر بریلوی شخصیت اور فن" میں

[illegible] بمبئی

لیکن یہ نہ لکھا کہ کیوں۔ میرے خیال میں وہ پرانی مثنویاں ایک ایسے مصنوعی تہذیب و تمدّن کو پیش کرتی ہیں۔ (اگر اس کو تہذیب و تمدّن کہا بھی جا سکتا ہے) جو ہندوستان کے اصلی اور دائمی تہذیب و تمدّن سے بہت دور تھا، بلکہ اُس پر ایک غیر قدرتی اور زبردستی ٹھپا۔ اس کے برخلاف پیام ساوتری وہ تصویر اور معیار پیش کرتی ہے جس نے ہمارے ملک کی تہذیب اور تمدّن کی انفرادیت کو آج تک قائم رکھا ہے۔ اور رکھیگا۔ اقبال بھی اس کو نہ سمجھ سکے، صرف اتنا ہی کہہ کر رک گئے " کچھ بات ہے کہ ہستی مٹتی نہیں ہماری"۔ یہ نہ سمجھے کہ "کیا بات" ہے جو ہماری ہستی کو قائم رکھے ہوئے ہے۔ مثنوی پیام ساوتری میں بھارت کی رُوح کی ایک جھلک ملتی ہے۔" تحریر صفحہ ۱۷۹ ساوتری کے حُسن کے بیان میں ایک شعر ہے ؎

دیکھا نہ کسی نے بھی عُریاں ۔ بجلی میں نظر ہو جیسے پنہاں

اس سلسلے میں فارسی کا ایک شعر یاد آیا۔ پڑھا کہیں نہیں سُنا تھا، شاید آپ کو واقعہ یاد آجائے۔ سنہ ۱۹۴۴ء کا ذکر ہے محلہ عالمگیری گنج (بریلی) میں ایک بنئے تھے۔ کافی عمر تھی۔ غالباً کسی جرم (شاید خون) میں سزا یافتہ تھے۔ فارسی خوب جانتے تھے۔ ایک بار شام کو آپ اُن سے ملنے گئے۔ میں بھی ساتھ تھا۔ جب آپ نے ساوتری کے بارے میں مندرجہ بالا شعر پڑھا تو اُن بزرگ نے رامائن کے کسی فارسی ترجمے سے سیتا جی کے حُسن کے بیان کا یہ شعر پڑھا۔

نقش ہا پیرہن عُریاں ندیدہ ۔ چوں جاں اندر تن و تن بیجاں ندیدہ

اور پھر کہا کہ آپ کا شعر اس سے کہیں بالا ہے۔ آپ کا مصرع اوّل فارسی مصرع کا قریب قریب لفظ بلفظ ترجمہ ہے۔ لیکن دوسرے مصرعے میں آپکی SIMILE کی بات ہی اور ہے۔"

جگر بریلوی

پیام ساوتری سے کافی متاثر ہوا تھا۔ اکثر خطوط میں اس کے متعلق استفسار کرتا رہتا تھا چنانچہ ۱۱ نومبر ۱۹۶۲ء کے خط میں تحریر فرماتے ہیں۔

" پیام ساوتری کا جنم ایسے طالعِ سعید میں ہوا ہے کہ شروع سے اب تک ہر جگہ اس پر پھول نچھاور ہو رہے ہیں۔ سنہ ۱۹۴۴ء کے پنجاب کے ایم۔اے کے امتحان میں یہ مثنوی بحیثیت Text Book اور میری دوسری کتاب یادِ رفتگاں جو ہندو شعراء و اُدبا کا تذکرہ ہے، بحیثیت Rapid Reader کے ہے۔ [illegible] کی کتاب "اردو مثنویاں" میں اسکا بہت مفصل ذکر ہے۔ مگر افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ یو۔ پی میں اس کی کوئی پرسش نہیں کیونکہ یہاں اُردو کے ہندو خدمت گزاروں کی کوئی ہستی ہی نہیں بلکہ انہیں تحقیر کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ اُن کے کمالات پر خاک ڈالنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ خیر اپنا تو تجربہ تو یہ ہے کہ جوہر ایک نہ ایک دن چمک کر رہتا ہے۔ پنجاب میں جو قدر پیام ساوتری کی ہوئی وہ تو میں نے بتائی۔ اب سُنتا ہوں کہ کشمیر میں یہ مثنوی ایم۔اے کے نصاب میں داخل ہے۔ اسے غلط ماننے کی کوئی وجہ نہیں۔ کیونکہ ذرائع معتبر ہیں اور مثنوی ہے بھی اسی قابل۔

ضمیمہ خطِ ہٰذا منسلک ہے۔ نیازمند
جگر بریلوی

ضمیمہ میں اپنی کتاب "صحتِ زبان" کے متعلق لکھا ہے اور جاؔمی سلمہٗ کی رائے اس کتاب پر قلمبند کی ہے۔ ضمیمہ کے آخر میں اپنا نام لکھنا بھول گئے ہیں۔ ملاحظہ ہو۔

" میری ایک کتاب "صحتِ زبان" ہے۔ نظامی پریس بدایوں نے شائع کی تھی۔ ہے تو میرے ذخیرۂ کتب میں بھی مگر موجودہ صحت کے پیشِ نظر اُس کو تلاش کرنا میرے بس کی بات نہیں۔ اگر آپ کو نظامی پریس سے ایک جلد مل جائے اور کوئی وجہ نہیں جو نہ ملے، تو اُسے ملاحظہ فرمائیے۔ نیاز فتحپوری نے اپنے رسالہ نگار میں بہت معقول تبصرہ کیا تھا۔ جاؔمی مرحوم نے اس پر حاشیہ زنی کرتے ہوئے کیا لکھا ہے خود فرمائیے:۔

(صفحہ ۲، سطر ۵) "آپ نے جو فصاحت کی [illegible] دی ہے وہ فیصلہ کُن ہے۔ متروکات پر بحث کرتے ہوئے آپنے اُسی صفحہ پر ایسے الفاظ جن کا ایک جزو ہندی اور دوسرا عربی یا فارسی ہے کے بارے میں بتایا ہے کہ یہ ہندوستان کے ملے جُلے تمدّن کا ایک رُخ ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس معاملے میں بھی ہماری تہذیب کا اُصول رہا جسے اقبال نہ سمجھ سکے، جس نے [illegible] سے [illegible] کارفرما ہے۔ ہماری تہذیب و تمدّن اس بات کا گواہ ہے [illegible] ہم نے باہر سے چیزوں کو لیا اور اپنی فطرت کے [illegible] اپنے الگ سانچے میں ڈھالا۔ اگر اُردو شعراء و انشاپرداز ایسے الفاظ کو ترک کر کے یعنی توڑ مروڑ کر بنا لفظ گڑھتے ہیں (صفحہ ۹ سطر ۲۰) [illegible] یہاں کے تمدّن سے الگ ہوتے چلے جائیں گے۔ اپنا [illegible] لکھا ہے "زبان جمہور بناتے ہیں"۔ انگریزی زبان و قواعد پر اتنی دسترس رکھنے والے یاسیں کو [illegible] پر مانتے ہیں۔

English Grammarians & Linguisticians

اج چالیس سال سے دنیا کہہ رہے ہیں جو آپ نے صفحہ ۲ سطر ۱۲ پر لکھا ہے ادیبوں اور شاعروں کا فرض ہے کہ زبان کے جکڑ بندوں کو ڈھیلا کریں۔ "صفحہ ۲ سطر ۲۰ پر آپ نے سوال کیا ہے " اُردو کو فارسی قواعد کا غلام کیوں بنایا جائے" انگریزی قواعد نگاروں نے جس میں مشہور Nesfield Grammarian بھی شامل تھا آئی سو سال پہلے یہ غلطی کی مگر ۱۹۲۰ء کے بعد سے وہ اس غلطی کا اعتراف کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ انگریزی زبان کے قواعد لاگو ہوتے ہیں۔

اقبال کی شاعری کے متعلق میں نے ان سے اختلاف کیا، اپنے دلائل پیش کئے۔ لیکن انہوں نے اپنی رائے اس سلسلے میں نہیں بدلی۔ اور اقبال کی قومی نظموں کی اہمیت کو محسوس نہیں کیا۔ اپنے خط ۱۱ دسمبر ۲۰ء میں لکھتے ہیں۔

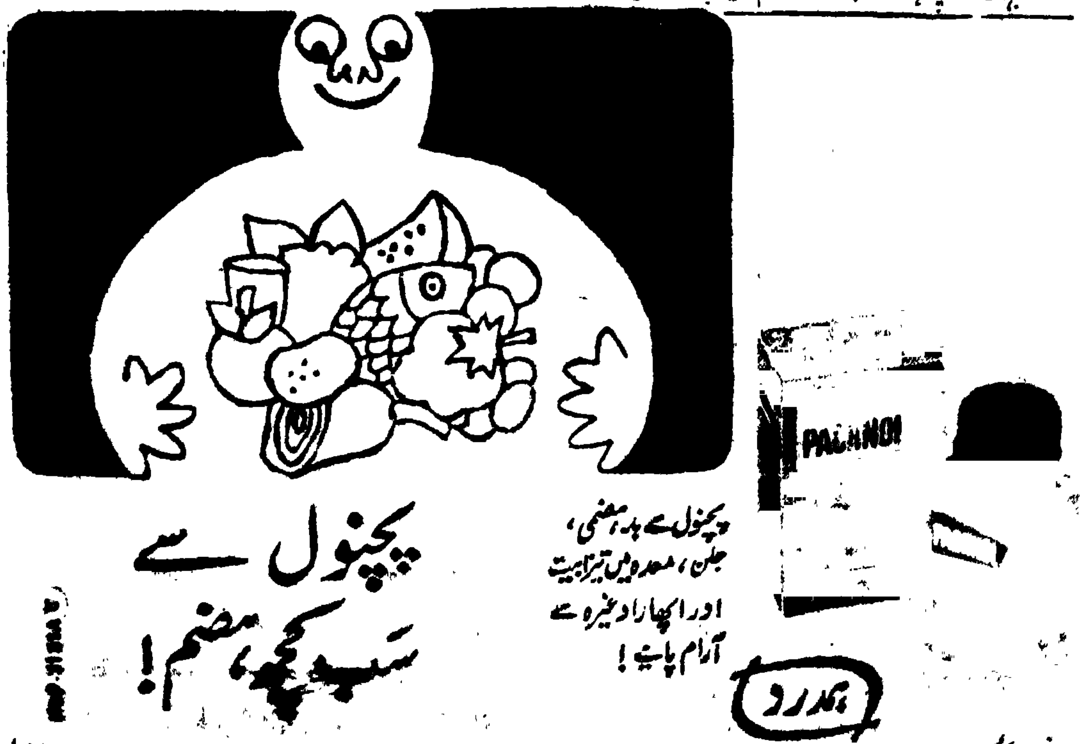
" دراصل پاکستان کی تعمیر میں اس کی شاعری کو محمد علی جناح کی مساعی کے بعد دوسرا درجہ حاصل ہے۔ ورنہ اس کی بے نظیر نظم کو آج قومی ترانہ کا درجہ حاصل ہوتا ہے

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا   ہم بلبلیں ہیں اس کی وہ گلستاں ہمارا

جو پبلشر آپ کی کتاب "صحیفۂ بشارت" شائع کرے گا، میرے مجموعۂ غزلیات کی اشاعت کا تخمینہ بھی اس سے بنوا دیجئے۔ اس مجموعہ میں پانچ ہزار اشعار ہیں۔ فی الحال بوجہ عدم استطاعت میں اسے نہیں چھپوا سکتا۔ شاید مستقبل قریب میں بشرطِ زندگی یہ آرزو پوری ہو جائے۔ تحریر آپ کی واپس ہیں۔ رسید کا انتظار رہے گا۔"

اب سُنتے ہیں عزیزی جامی سلمہٗ اُن کے مجموعۂ غزلیات کی اشاعت کا انتظام کر رہے ہیں اور اس طرح مرحوم کی ایک دیرینہ خواہش کی تکمیل ہو جائے گی۔

OO



کرشن موہن

دو غزلیں

صاحبِ ادراک ہیں میرے حواسِ باختہ
حُسن و افسونِ جنوں کیوں ہے نظر انداختہ

کیا خبر ہو اہلِ عقل و تمکنت کو، عشق کا
جذبۂ آوارہ ہے امن و اماں کی فاختہ

خیمہ زن ہے حسرتوں کی اِک سپاہ بے پناہ
بیکس و مجبور ہے مُدّت سے قلبِ تاختہ

اُڑ رہا ہے شہرِ فن میں حُسنِ ماضی کا مذاق
عسکرِ جذباتِ باغی ہے علم افراختہ

دلبرانِ شوخ کا مسلک ہے تزئینِ بدن
حُسن ہے تہذیبِ نَو کا ساختہ پرداختہ

اہلِ غمزہ ہر طرف محوِ خرامِ ناز ہیں
تیرِ چشم انداختہ شمشیرِ ابرو آختہ

دل نشیں ہے طَور اُس کا لُطف ہی کچھ اور ہے
کرشن موہن دل سے نکلے جو صدا بے ساختہ

قحط اب ایسا پڑا ہے دل ہے بہا فروختہ
بھوک نے ہمکو بُھلایا عشق کا آموختہ

کیوں غلط سمجھے ہوئے ہیں مجھ کو اربابِ ہنر
زر کہاں علم و ادب ہے بس مرا اندوختہ

ڈھونڈتے ہو اس میں کیا کوئی شرارِ آرزو
راکھ کا اک ڈھیر ہے اب میرا قلبِ سوختہ

یاد کے کُہرے میں سب تحلیل ہو کر رہ گئے
رنگ و آہنگ و فسونِ چہرۂ افروختہ

کُھل نہ جائے کوئی ٹانکا فکر ہے یہ رات دن
کرشن موہن دل ہمارا جا بجا ہے دوختہ

بی - ۱۲۴۰ - پنڈارا روڈ - نئی دہلی - ۳

افسانے

آگہی کے اندھیرے

بیگ احساس
۱۱-۵-۲۱۲ کالی مسجد حیدرآباد-۲۳

کبھی کبھی منزل کی تلاش میں راہیں کھو جاتی ہیں اور کبھی راہیں مل جاتی ہیں تو منزل نہیں ملتی۔ میں نے صنوبر کو اپنی منزل سمجھا۔ اُسے حاصل کرنا چاہا تو راہیں گم ہو گئیں۔ میں اُن راہوں کی تلاش میں بھٹک رہا تھا جہاں تم مجھے مل گئیں۔ تم نے ہاتھ بڑھایا میں نے ہاتھ تھام لیا۔ پھر ہم دونوں نئی راہوں پر نکل پڑے۔ وہ راہیں ہموار تھیں لیکن بہت اندھیرا تھا گھٹن تھی سیکڑوں چمگادڑیں اور ابابیلیں منڈلا رہی تھیں۔ وہاں ایسی کوئی روشنی نہ تھی جس میں ہم اپنے چہرے شناخت کر سکتے۔ صرف تمہارے وجود کا احساس تھا۔ یہ اندھیرے میں نے تمہارے لئے برداشت کئے۔ ہم بہت دُور تک چلتے رہے لیکن میں منزل تک پہنچنے کی ہمت نہ کر سکا۔ تم مجھ سے وہ روشنی چاہتی تھیں جو تمہاری منزل کو روشن کر سکے۔ میں وہ روشنی دے دیتا تو تمہاری منزل روشن ہو جاتی لیکن میں ہمیشہ تاریکیوں میں ڈوب جاتا۔ اور یہ تاریکی جو تمہارا مقدر ہے میری منزل نہیں۔ میں خود روشنی کی تلاش میں نکلا تھا اس لئے میں تمہیں ان اندھیروں میں تنہا بھٹکتا چھوڑ کر بھاگ آیا ہوں۔ تمہاری آوازیں میرا پیچھا کرتی رہیں لیکن میں پیچھے مڑ کر دیکھنے کی ہمت نہ کر سکا۔ دیکھتا تو پتھر ہو جاتا۔۔۔ اور میں پتھر نہیں بننا چاہتا تھا۔

اندھیرے اور روشنی کے اس دوراہے پر بڑا سناٹا ہے۔

پہلی بار تم کہاں ملیں مجھے اچھی طرح یاد نہیں۔ لیکن اتنا ضرور یاد ہے کہ نہ تو تم اتنی حسین ہی لگی تھیں اور نہ اتنی بے باک، جتنی تمہارے ماحول کی لڑکیاں ہوتی ہیں۔

تمہارا ماحول ۔۔ !!

تمہاری ماں نے اتنی شادیاں کی تھیں کہ جنسی تعلقات کا یہ جائز طریقہ بھی ناجائز سا لگتا ہے۔ طریقہ جائز ہو یا ناجائز، بات جب ضرورت کے دائرے سے نکل کر خواہشات اور حرص کے دائرے میں پہنچتی ہے تو ہوس کی تسکین ہی کا گمان ہوتا ہے۔ تمہارے گھر میں بھی اسی تہذیب کا رواج تھا جو طوائفوں کے یہاں شاعری جیسی پائی جاتی ہے۔ گھر میں ہر آنے والے کا پُرتپاک استقبال ہوتا اور محفل میں موجود کسی شخص کو یہ محسوس نہ ہوتا کہ اس کی طرف توجہ کم ہے۔۔۔ جوان لڑکیوں کو سامنے بٹھا کر اُن کے نام سے فرمائشیں کی جاتی ہیں۔ جہاں پہنچ کر ہر مرد ایک ہی سطح پر آ جاتا ہے جہاں شعور گہری نیند سو جاتا ہے اور جذبات جاگنے لگتے ہیں۔

تم حسین نہیں تھیں لیکن تمہارے چہرے میں ایسی کشش ضرور تھی جو تمہیں قابلِ توجہ بناتی تھی۔ شاید یہ آنکھوں کی معصوم چمک تھی یا چہرے پر پھیلا ہوا وہ فطری شرمیلا پن جو جوانی اور بچپن کی کشمکش کو اُبھارتا ہے۔ یا پھر کم عمری کے ساتھ جسم کی وہ دل آویز اُٹھان تھی۔

جنسی کشش سے بھرپور جسم تمہاری معصوم آنکھوں کا دشمن تھا لیکن تمہاری ماں کی شخصیت کا پَرتو تم میں نہ تھا۔ نہ وہ آنکھوں میں لگاوٹ اور نہ وہ دعوت بھری مسکراہٹ جو مردوں کو خواہ مخواہ ہی اُکساتی ہے۔

وہ کوئی غیر اہم واقعہ ہی تھا جب پہلی بار تم مجھ سے ملی تھیں۔ مجھے ایسی لڑکیاں یاد نہیں رہتیں جو عام لڑکیوں سے مختلف نہ ہوں جن میں انفرادیت کی کوئی جھلک نہ ہو۔ جو اپنے اطراف تکلف کا حصار نہیں رکھتیں۔ جو سب سے یکساں بے تکلف ہو جاتی ہیں۔ جنہیں اپنی شخصیت کی اہمیت کا احساس نہیں ہوتا، اپنے دلکش اعضا اور لوگوں کی غلط فہمیوں کے جاننے کا شعور نہیں ہوتا۔ تم ویسی ہی عام لڑکی تھیں جس سے بات کرنے کی جرأت کوئی بھی کر سکتا ہے۔ بات شروع کرنے سے پہلے دل نہیں دھڑکتا ماتھے پر پسینہ نہیں آتا۔ لیکن تم میں کوئی خاص بات ضرور تھی۔۔۔

مجھے وہ ملاقات یاد ہے جس روز تم عام لڑکیوں سے زیادہ حسین لگ رہی تھیں۔ سرخ میک اپ، سرخ ساری اور سیاہ بلاؤز میں تمہارا جسم دہکتا ہوا سا لگ رہا تھا۔ تمہارے حسن کی حدت سے کوئی بھی پگھل جاتا۔ میں بھی پگھل گیا۔

ہم دونوں ساتھ ساتھ زینے سے اُتر رہے تھے۔ روشنی بہت کم تھی تمہارے اور میرے علاوہ کوئی اور نہ تھا۔ میں نے مسکرا کر ہاتھ بڑھایا۔ تم نے تھام لیا۔ تمہاری ہتھیلیاں پسینے سے بھیگی ہوئی تھیں جو میرے ہاتھوں کی گرمی سے خشک ہونے لگیں۔

ممنوعہ چیزوں کی طرف راغب کرنا عورت کی فطرت ہے اور مرد کا کام شاید بہکنا ہے۔ ورنہ جنّت سے زمین کا یہ فاصلہ یوں سمٹ نہ جاتا۔ خوشۂ گندم سامنے ہو تو انسان کے لئے جنّت بھی بے کار ہو جاتی ہے۔ دل نافرمانی اور بغاوت کے لئے اُکساتا ہے، مذہب اور سماج کے دائرے تنگ اور فرسودہ لگتے ہیں۔ اخلاقی قدریں، پابندیاں بے معنی اور کھوکھلی ہو جاتی ہیں اور یہیں انسان فرشتوں سے الگ ہو جاتا ہے۔ عورت ساتھ ہو، تنہا ہو اور مرد یہ جانتا ہو کہ وہ عورت ایسے ماحول سے تعلق رکھتی ہے جہاں جسموں کا کھیل کوئی معنی نہیں رکھتا تو خواہ مخواہ ہی بہکنے کو جی چاہتا ہے۔

زینوں کے موڑ پر سنبھل سنبھل کر چلنے لگے تم رکھے تاکہ بہکے ہوئے قدم لڑکھڑا نہ جائیں۔ اور یہیں میرے قدم لڑکھڑانے لگے تھے۔

"کیا ہوا؟" مجھے رُکتے دیکھ کر تم نے پوچھا تھا۔

"بہت حسین لگ رہی ہو۔"

"اُوں" تم بے نیازی سے مُسکرا دیں۔ چہرے پر تعریف کی خوشی کے ساتھ ہلکا سا غرور بھی تھا جو مرد کو اپنے حُسن کے دام میں پھنسا دیکھ کر عورت محسوس کرتی ہے۔

"پیار کروں؟" میں نے پُوچھا۔

"نہیں۔" تم نے دھیرے سے کہا۔

"اچھا تو میں واپس جا رہا ہوں۔" میں واپس جانے کو مُڑا تو تم نے ہاتھ نہیں چھوڑا۔ اور میں نے تمہیں پُوری شدّت سے چُوم لیا۔ تم کھلکھلا کر ہنس پڑیں ——— نہیں!! اپنی فتح اپنی فتح پر ہنس پڑی ——— وہ ایک فطری تقاضا تھا، ایک وقتی جذبہ تھا، ایک لمحاتی لغزش اور وہ لمحہ جس نے آدم کو جنّت سے زمین تک پہنچایا تھا۔

اور میں وہ سب کچھ بھول گیا۔ زندگی میں اکثر ایسے لمحے شاید بھولنے کے لئے ہی ہوتے ہیں۔ میں یاد بھی کیسے رکھتا۔ صنوبر جو میرے حواس پہ چھائی ہوئی تھی۔ میں اُسے شدّت سے پیار کرنے لگا تھا۔ لیکن تمہارے عشق کے والہانہ پن کو دیکھ کر اُسے اچانک ہی مجھ سے بہت دُور سیکڑوں میل کے فاصلے پر بھیج دیا گیا۔ صنوبر کی جدائی سے میں بہت دل برداشتہ تھا۔ شامیں بے کیف سی گزر رہی تھیں۔ اُن ہی دنوں تم مجھ سے ٹکرائیں تو وہ سارے لمحے شملہ۔ بمبئی

یاد آ گئے۔ رحیمی دوست کے ذریعہ تم نے مجھ سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا تھا اس نے مجھے بتایا کہ تم اسی کے محلّے میں رہتی ہو۔

میں تم سے ملا تو کچھ بھی نہیں بدلا تھا۔ وہی معصوم مسکراہٹ وہی آنکھوں کے جلتے بجھتے چراغ ——— وہی جنسی کشش، وہی سرکش اُمنگ۔

"بے ایمان ہیں آپ۔" تم نے شکایت بھرے لہجے میں کہا تھا۔

"وہ کیسے؟"

"تین مہینے میں آپ نے ایک بار بھی ملنے کی کوشش نہیں کی۔"

"کیسے ملتا۔ تمہارے گھر گیا تو پتہ چلا کہ تم وہاں نہیں رہتیں۔"

"جھوٹ ——— آپ گئے ہی نہیں۔"

"نہیں یقین کرو ——— ! تم وہاں سے کیوں چلی آئیں؟"

"یوں ہی ———" تمہارا چہرہ تاریک ہو گیا۔ ایسا محسوس ہوا جیسے تم کوئی بڑا درد چھپا رہی ہو۔

"اب واپس بھی نہیں جانا ہے۔ یہیں رہوں گی۔ آپ روز ملا کیجئے نا۔ کتنا یاد کرتی ہوں۔"

"سچ؟"

"بالکل سچ ——— آپ کل بھی آئیے گا ——— آئیں گے نا؟"

میں انکار نہ کر سکا۔ دوسرے روز بھی میں تم سے ملنے گیا۔ پھر روزانہ ملاقاتیں ہونے لگیں۔ میری یہ ملاقاتیں دراصل میری خود غرضی پہ مبنی تھیں۔ میں مسرّت کے وہ لمحے جو صنوبر چُرا لے گئی، تم سے حاصل کرنا چاہتا تھا۔ صنوبر کی غیر موجودگی نے جو خلا، جو سنّاٹا پیدا کر دیا تھا اُسے میں تمہارے وجود سے پُر کرنا چاہتا تھا۔ صنوبر کی جدائی نے جو زخم دئے، وقتی طور پر اُن زخموں پر تمہارے قُرب کا پھاہا رکھنا چاہتا تھا۔ تمہارے گھرانے کے پس منظر میں کوئی بھی یہ سوچ نہیں سکتا تھا کہ تم کسی کو بے لوث پیار کر سکتی ہو۔ لیکن تمہاری شخصیت کی تہیں کھلیں تو میں حیران رہ گیا۔ ایک معصوم دیا کی زندگی تمہاری ——— !! درد ہی درد تھا ——— اکیلے پن کا احساس ——— تنہائی کا کرب ——— !! مجھے تم نے بتایا کہ وہ کئی شوہروں کی بیوی جسے تم ماں کہتی ہو وہ تمہاری ماں نہیں ——— اور وہ جو اس کا موجودہ شوہر ہے تمہارا باپ نہیں تمہارا ان لوگوں سے کوئی خونی رشتہ نہیں۔ تمہارے باپ نے تمہاری ماں کے مرنے کے بعد اس عورت سے شادی کی تھی اور تم ساتھ چلی آئیں تب سے تم اسی عورت کو ماں کہتی ہو۔ تمہاری بھی ماں ایک ہفتے سے شہر سے باہر تھی۔ اس کی غیر موجودگی میں اس کے شوہر نے تمہارا سودا کرنا چاہا تو تم بھاگ

کی پیاس جاگ آئیں۔ تمہاری بہن بھی تمہاری ماں کے کسی ایک شوہر کی اولاد تھی۔ عجیب گورکھ دھندہ تھا۔ ان ساری باتوں میں مجھے صرف اتنا یاد رہ گیا کہ تم تنہا ہو۔ اس دنیا میں تمہارا کوئی ایسا نہیں جسے تم اپنا کہہ سکو۔ تمہارا وجود اُس پھول کی طرح ہے جو بڑے سے سمندر کی لہروں پر ہچکولے کھا رہا ہو۔ مجھے تم سے گہری ہمدردی ہو گئی۔

تم سے ملنے کے ایک عرصہ بعد تمہاری بہن سے ملاقات ہوئی۔ بہت موقع شناس اور باتونی تھیں۔ وہ ان لوگوں میں سے تھیں جن کی زندگی کا سہارا اُونچی اُونچی کھوکھلی باتیں ہوتی ہیں۔ تمہاری بہن نے ہماری ملاقاتوں پر اعتراض تو نہیں کیا، لیکن ہمیں مختلف اوقات میں آزماتی رہیں۔ اکثر جب ہم تنہا ہوتے وہ اطلاع کئے بغیر آہستگی سے کمرے میں آ جاتیں۔ لیکن کبھی کسی قسم کی نازیبا حرکت کرتے ہوئے وہ ہمیں پکڑ نہ سکیں۔ رفتہ رفتہ شاید انہیں ہماری شرافت پر پُورا بھروسہ ہو گیا۔ پتا نہیں وہ شرافت پر بھروسہ تھا یا پھر ان کی نگاہیں دُور کسی حصول کی تلاش میں سرگرداں تھیں۔ کیونکہ کبھی کبھی ایسا محسوس ہوتا جیسے وہ چاہتی ہوں کہ تم مجھ سے اپنے پیار کی قیمت وصول کرو۔

تمہارے لئے یہ کوئی بڑی بات بھی نہ تھی۔ تمہاری سب سے بڑی خوبی تمہارا جوان ہوتا ہوا جسم تھا۔ وہ جوان جسم جو ہوس کی آگ لگاتا ہے۔ گناہ کے شعلے بھڑکاتا ہے۔ جسے دیکھ کر کسی شدید پیاس کا احساس جاگتا ہے۔ تم کسی بھی مرد کو بے وقوف بنا کر عیش کی زندگی گزار سکتی تھیں لیکن پتا نہیں تم کس مٹی سے بنی تھیں۔ دانستہ طور پر میں نے تمہیں آزمانے کے لئے تمہارے جذبات کو چھیڑ کر اُس عورت کو جگانا چاہا جو تجارتی ہوتی ہے، جو اپنی ہستی کا مول جانتی ہے۔ لیکن تمہارے اندر ایسی کوئی عورت چھپی نہ تھی۔ عام لوگوں کے لئے جنسی کشش رکھنے والے بدن کے خول میں بڑی معصوم اور پاکیزہ رُوح چھپی ہوئی تھی۔ میں نے اس رُوح کی گہرائی میں جھانکا۔ پیار ہی پیار تھا میرے لئے ـــــ وہ پیار جو بندشوں، خوف، مصلحت و سیاست سے پاک ہوتا ہے جس میں والہانہ پن ہوتا ہے۔ اور یہ وہی والہانہ پن تھا جس سے مجبور ہو کر تم تیز بارش اور سخت بخار میں بھی مجھ سے ملتی رہیں۔ تمہاری چاہتوں کے بے شمار واقعات تھے۔ ایک دن میں روز کی طرح تم سے ملا۔ میں نے تمہارا ہاتھ چھُوا تو تم نے کہا تھا۔

"آپ کو بخار ہے!"

"ہلکی سی حرارت ہو گی۔ کوئی خاص بات نہیں۔"

"لاپروائی مت کیجئے۔ ڈاکٹر کو ضرور بتایئے گا۔"

"تھوڑا سا بخار ہے۔ اپنے آپ چلا جائے گا۔" لیکن تم اصرار کرتی رہیں۔

"دیکھو آگ قریب ہو تو حرارت آتی ہی ہے۔"

"کہاں ہے آگ؟" تم نے بے خیالی میں پُوچھا۔

"یہاں۔" میں نے تمہیں بتا کر کہا۔

"دُھت۔" تم شرما گئیں۔ میں جانے لگا تو تم نے پھر یاد دلایا۔

"ڈاکٹر کو ضرور بتایئے گا۔ اور ہاں طبیعت ٹھیک نہ ہو تو کل آنے کی ضرورت نہیں۔"

دوسرے روز میں تم سے ملا تو مجھے دیکھ کر بے چین ہو گئیں۔

"ایک منٹ ٹھہریئے میں ابھی آئی۔"

تم چند منٹوں میں لوٹیں تمہارے ہاتھ میں دُودھ سے بھرا گلاس تھا۔

"یہ کیا؟"

"جلدی سے پی جایئے۔ ٹھنڈا ہو جائے گا۔"

"لیکن تم نے یہ تکلیف کیوں کی؟"

"آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے نا؟"

"تم چکھ کر دو"

تم نے ایک ہلکا سا گھونٹ بھرا اور دونوں ہاتھوں میں گلاس تھام کر میرے منہ سے لگا دیا۔ میری آنکھیں نم ہو گئیں۔ تمہاری حالت مجھ سے چھپی نہ تھی۔ تمہاری بہن زندگی کی گاڑی بڑی مشکل سے کھینچ رہی تھیں اور اس کمزور سی گاڑی میں تمہارا بھی بوجھ لد گیا تھا اور کئی بار اس بات کا ذکر تمہاری بہن موقع بے موقع کرتی رہتیں کہ انہوں نے بڑے نازک وقت میں تمہیں سہارا دیا ہے۔ کوئی بھی عورت اپنی کسی مجبوری اور کمزوری کا اظہار اپنے محبوب کے سامنے برداشت نہیں کرتی۔ لیکن تم یہ زہر بھی خاموشی سے پی جاتیں۔ پتہ نہیں دودھ کا انتظام تم نے کہاں سے کیا تھا میری آنکھیں نم ہو گئیں۔ میں نے تمہیں لپٹا لیا۔

"چھوڑیئے کوئی دیکھ لے گا۔"

"میں کیا کروں تمہارے لئے۔"

"کچھ بھی نہیں۔" تم نے دھیرے سے کہا۔

"نہیں تم بولو۔"

"کچھ بھی نہیں چاہیئے مجھے۔ آپ نے میرے پیار کی قدر نہیں کی۔" تم چلی گئیں۔ میں تڑپ اُٹھا۔ میرے ہاتھوں میں کیا تھا۔ میں ایک احمد اللہ

شگفتہ بیگم

جو تمہارے جسم کی رعنائیوں میں کھو کر گناہ کی لذت بھی حاصل نہ کر سکا۔ تمہارے درد کو میں نے تلاش کیا تھا جو تمہاری رگ و پے میں بسا ہوا تھا۔ لیکن مداوا نہ کر سکا۔ اور مداوا کرنا انسان کے ہاتھ میں ہے بھی نہیں۔ میں تمہارے قرب کے لمحوں کو رنگین بنا کر انجان ہو سکا اور نہ تمہیں مستقل طور پر اپنا سکا۔ باشعور ہونا بھی کتنا تکلیف دہ ہوتا ہے کہ انسان خود کو ہمیشہ تلوار کی دھار پر محسوس کرتا ہے۔

میں جانتا تھا تم تنہا ہو۔ تمہارا کوئی بھی نہیں جو تمہارے درد کو محسوس کر سکے۔ جسے تم اپنا کہہ سکو۔ تمہاری ساری زندگی میں کبھی خوشی کے لمحے ایک ساتھ نہیں آئے۔ دن بھر میں تمہیں صرف مجھ سے مل کر مسرت ہوتی اور میں تم سے وہ مسرت چھیننے کی ہمت نہ کر سکا۔ چھوٹے موٹے واقعات کی بنیاد پر تم نے پیار کی ایک بہت ہی خوبصورت عمارت کا خواب دیکھا۔ اور اس خواب سے چونکاتے ہوئے مجھے خوف ہوتا تھا کہ کہیں تم ٹوٹ نہ جاؤ، بکھر نہ جاؤ اور تمہاری ریزہ ریزہ شخصیت کوئی خطرناک پہلو اختیار نہ کر لے۔ مجھے اُس وقت کا انتظار تھا جب خواب حقیقتوں سے ٹکرا جاتے ہیں اور خواب دیکھنے والا اس ٹکراؤ کو برداشت کر لیتا ہے۔ میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ تمہارے دامن کی مسرتیں نہ چھینوں گا۔ تمہاری کسی خواہش کو نہ ٹھکراؤں گا۔ تمہاری خواہشیں بھی کیا ہوتیں مجھ سے روزانہ ملاقات۔ اور کبھی کبھی کوئی نئی فلم ــــ !!

پھر اچانک ہی تاریکی بہت بڑھنے لگی۔ یہ وہی وقت تھا کہ یا تو ہم ایک دوسرے کا ہاتھ مضبوطی سے تھام کر اُن راہوں سے گزر جاتے یا میں اپنا ہاتھ چھڑا کر تمہیں ان اندھیروں میں بھٹکنے کے لئے اکیلا چھوڑ دیتا۔

ہماری ملاقاتیں رنگ لانے لگیں۔ چہ می گوئیاں گھر سے شروع ہوئیں تو سارے محلے میں پھیل گئیں۔ تمہارا ماحول صاف نہ تھا۔ تمہاری بہن کی پوزیشن بھی مشکوک تھی۔ پھر تمہاری ماں کی بدنامی الگ تمہارے گلے کا طوق بنی ہوئی تھی۔ محلے کے نوجوان لڑکے ہماری تاک میں رہنے لگے تھے۔ سارے محلے میں تمہیں بدنام کر دیا گیا۔ تمہارے کمرے میں آتے ہی لڑکے کھڑکیوں کے جھروکوں سے جھانکنے لگتے۔ چھت پر چھوٹے چھوٹے پتھر پھینکے جاتے۔ بہت گندے اور رکیک جملے کسے جاتے۔ ہم سب کچھ برداشت کرتے رہے کیونکہ ہم سب مجبور تھے۔

محلے کے لوگ بُرا سوچنے پر مجبور تھے کیونکہ میرا تمہارا ایسا کوئی رشتہ نہ تھا جو شبہ سے بالاتر ہوتا۔ تم اپنے دل کے ہاتھوں مجھ سے ملنے پر مجبور

خاطر۔ بھٹی

تھیں۔ میں تمہاری خاطر تم سے ملنے پر مجبور تھا۔ لیکن تمہاری بہن یہ جانتے ہوئے بھی کہ ہمارے تعلقات کسی گندگی پر مبنی نہیں ہیں ہمیں رد کرنے پر مجبور ہو گئیں۔

اب ہم روز نہیں مل سکتے تھے۔ میرے دوست کی مدد سے کبھی کبھار ہم رات میں سب کی چوری سے مل لیتے۔ تم مکان کی راہداری میں آ جاتیں۔ یا کمرے میں آتیں تو لائٹ بجھا دی جاتی تاکہ کسی کو پتا نہ چلے۔ صرف چند لمحے کی اس ملاقات کے لئے تم اتنا بڑا خطرہ مول لیتی تھیں۔ میں تو مرد تھا، مرد کی بدنامی بھی قابل فخر بن جاتی ہے۔

کبھی کبھی میں تھک کر سوچنے لگتا کہ اس سلسلے کو میں یہیں ختم کر دوں۔ تم میری منزل نہیں ــــ میرا پیار نہیں ــــ لیکن میں تمہیں اس موڑ پر چھوڑ دینے کی ہمت نہ کر سکا۔ کچھ جذبے تھے ــــ کچھ جذبوں کی تسکین تھی ــــــ

اندھیرا بڑھتا جا رہا تھا۔ منزل کا کوئی پتا نہ تھا۔ میں نہیں جانتا تھا اس سفر کا اختتام کہاں ہو گا۔ انسان کے ہاتھ میں کچھ بھی نہیں۔ آغاز بھی نہیں انجام بھی نہیں۔ حالات کا رُخ موڑنا بھی نہیں اور کبھی کبھی حالات کے دھارے پر بہنا بھی نہیں۔ صنوبر واپس آ گئی تھی۔ وہ جو میرا پیار تھی۔ جس کے لئے میں کچھ بھی کرنے کو تیار تھا۔ لیکن سماج کی سماجی دیواریں، بندشیں۔ خوف۔ مصلحتیں۔ سمجھوتے سب اسی طرح برقرار تھے۔ میں تم سے برابر ملتا رہا۔

ایک روز اچانک ہی معلوم ہوا کہ تمہارے کوئی ماما بمبئی سے آئے ہوئے ہیں اور یہ کہ تم اُن کے ساتھ بمبئی بھیج دی جاؤ گی۔ میں اس خبر کے لئے تیار نہ تھا۔ بے چین ہو گیا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ وہ واقعی تمہارے ماما ہیں یا کوئی اور ــــــ لیکن یہ ضرور جانتا تھا کہ بمبئی جا کر تم اتنی بڑی دنیا میں گم ہو جاؤ گی۔ کوئی بھی بوجھ خواہ مخواہ برداشت نہیں کرتا۔ جسموں کی اس بھیڑ میں تم بھی کھو جاتیں ــــ دلوں میں جھانکنے والے کتنے ہیں؟ اور پھر دل تو جسم کے اندر ہوتا ہے۔ جسم خوبصورت ہو تو اندر کون جھانکے؟

میں تم سے ملا۔ تم بہت اداس تھیں

"سنا ہے تم بمبئی جا رہی ہو؟"

"ہاں!" تمہاری آواز کسی اندھے کنوئیں سے آ رہی تھی۔

"مجھے چھوڑ کر جاؤ گی؟" تم نے کوئی جواب نہیں دیا۔ تمہاری آنکھوں میں آنسو اٹکے ہوئے تھے۔

"بمبئی اچھا شہر نہیں تم مت جاؤ۔"

"پھر کیا کروں — کہاں رہوں — کون رکھے گا مجھے ؟" تم پھٹ پڑیں۔

"اب تک جہاں رہتی تھیں ۔"

"جن کے پاس رہتی ہوں وہی بیچ رہے ہوں تب ؟"

میں خاموش ہوگیا۔ اس کی آنکھوں میں کئی سوالات جھلملا رہے تھے۔ کیا میں اُسے سہارا دے سکتا ہوں۔ اُسے روک سکتا ہوں۔ اُسے اپنا سکتا ہوں۔ اسے غیر یقینی مستقبل سے بچا سکتا ہوں ؟ میرے پاس کوئی جواب نہ تھا میں نے نظریں جھکا لیں۔ تم تیزی سے باہر نکل گئیں۔ میں تمہاری بہن سے ملا۔

"صوفیہ بمبئی جا رہی ہیں ؟"

"ہاں — ماما امرار کر کے ساتھ لیجا رہے ہیں۔ ممی بھی وہیں ہیں۔"

"ممی کے واپس لوٹنے تک کیوں نہیں یہیں رکھ لیتیں آپ — !"

دیکھو — صاف صاف بات یہ ہے کہ میرے حالات ٹھیک نہیں ہیں جیسے تیسے زندگی گذر رہی ہے۔ جس وقت صوفیہ یہاں آئی تھی یہی سوچ کر میں نے روک لیا تھا کہ ممی کے لوٹتے ہی واپس بھیج دوں گی لیکن ممی کا کوئی پتا نہیں۔ بہت مقروض ہوگئی ہوں۔ مزید اخراجات برداشت کرنے کی سکت نہیں ہے۔ وہاں بھیجنے کو تو میرا بھی جی نہیں چاہتا لیکن" انہوں نے بات ادھوری چھوڑ کر میری طرف دیکھا۔ ان کی آنکھیں کہنے لگی تھیں — وہی سوال تھے — کیا تم سہارا دے سکو گے ؟ ان کی آنکھوں میں بھی وہی کرب تھا جو کسی کو لٹتے دیکھ کر سمٹ آتا ہے۔ تمہارا کوئی نہ تھا۔ جو ممی تھیں وہ مر گئیں جو ڈیڈی تھے وہ بھی مر گئے۔ جسے ممی کہا وہ تمہیں چھوڑ کر چلی گئی۔ جسے ڈیڈی کہا وہ سودا کرنے لگا جسے بہن کہا وہ تھک گئی تھی — ان سب کے بعد جسے تم نے اپنا سمجھا وہ میں تھا۔

میں — ؟؟

وہ منزل آگئی جہاں میں اپنی روشنی دے کر تمہیں تاریکی سے بچا سکتا تھا لیکن میں نے وہ روشنی تمہیں دینی چاہی تو اُسی روشنی میں مجھے نظر آیا — کہ تم صنوبر کی طرح خوبصورت اور شریف الخاندان نہیں ہو کر میں تمہاری خوبصورتی اور خاندان کے سہارے گھر والوں سے، سماج سے لڑ سکوں — تم اتنی شریف ہو کہ کئی معزز گھرانوں کی لڑکیوں کے قد تمہارے آگے بہت چھوٹے لگتے ہیں لیکن قدوں کے ناپنے والے اس سماج میں، میں تمہارا قد اونچا کرنا چاہوں گا تو خود بہت پستی میں چلا جاؤں گا۔ تم مجھے ٹوٹ کر چاہتی ہو۔ لیکن تمہارے گھرانے کے پس منظر میں تمہاری چاہت اور محبت کو تجارت ہی سمجھا جائے گا۔ میرے علاوہ اس پیار کی آنچ کو محسوس کرنے والا کون ہے ؟ اور میں اکیلا پورے سماج سے کیسے لڑ سکتا ہوں ؟ سہارا دینا اُس وقت اچھا لگتا ہے جب وہ بوجھ نہ بن جائے۔ مدد کا جذبہ اس وقت تک زندہ رہتا ہے جب تک کہ وہ ذمہ داری نہ بن جائے۔ نیکی وہی اچھی ہوتی ہے جس کا بوجھ نیکی کرنے والا سہار سکے۔

یہی کیا کم ہے کہ میں نے تمہیں دھوکا نہیں دیا۔ میں نے تمہیں پیار دیا۔ مسرت کے لمحے دیئے۔ تمہارے درد کو سمجھا۔ میں نے کوئی گناہ نہیں کیا۔ رنگین خواب نہیں دکھائے۔ پھر بھی وہ سہارا کیوں دوں — ؟ کیا رشتہ ہے میرا اور تمہارا ؟ کیا رشتہ تھا — ؟ تم میری کون ہوتی ہو ؟

عقل و شعور کی روشنی میں، میں اُن اندھیروں سے بھاگ آیا۔ تم بمبئی چلی گئیں۔ مجھ سے ملے بغیر — جن اندھیروں میں تم نے جنم لیا تھا اُن ہی اندھیروں میں کھو گئیں —

روشنی اور اندھیرے کے اس دوراہے پر ایک سناٹا ہے لیکن عقل و شعور کی روشنیاں مدھم پڑ جاتی ہیں تو جذبات کے اندھیروں میں بڑا شور اٹھتا ہے۔ ان اندھیروں سے آتی ہوئی چیخوں کی آواز سارے وجود کو لرزا دیتی ہے۔ میں نے خوابوں کے لٹنے کا وہ منظر نہیں دیکھا۔ لیکن زخم محسوس ہوتے ہیں۔ لہو رستا ہے۔ تمہاری خوشبو کہیں گم ہے، لیکن مہک کا احساس باقی ہے۔ وہ الفاظ وہ ہنسی کا ترنم۔ وہ سسکیاں، وہ سرگوشیاں، سب کچھ اسی طرح فضا میں بکھرے ہیں جو میرے لئے تھے۔ ایک ادھورے پن کا احساس ہوتا ہے، کرب جاگتا ہے — ایسا لگتا ہے — عقل و شعور کے درمیان — بدی اور نیکی کے درمیان — گناہ اور ثواب کے درمیان — محبت اور مصلحت کے درمیان — خواب اور حقیقت کے درمیان — انسان اور سماج کے درمیان — پیار اور سمجھوتے کے درمیان — خون اور دل کے درمیان کوئی رشتہ ہے — شاید درد کا — !!

OO

زرِ سالانہ ختم ہونے کی اطلاع

اِس حلقے میں سُرخ نشان کے معنی یہ ہیں کہ آپ کا سالانہ خریداری ستمبر ۱۹۷۶ء میں ختم ہو چکا ہے۔ ازراہِ کرم سالِ رواں کے لئے مبلغ ۱۶ روپے جلد بھیج دیجئے۔ امید کہ آپ تجدیدِ خریداری سے فرمود نوازیں گے۔ اگر منی آرڈر نہ بھیج سکیں تو دفتر کو وی پی بھیج دینے کی ہدایت کریں۔ زرِ سالانہ وصول نہ ہونے کی صورت میں شمارہ کی روانگی روک دی جائے گی۔

بھی

اسلم عمادی

معصومیت

ایک گوشے میں
کسی معصوم بچے کی طرح،
دیوار کے آگے
اکیلے بیٹھ کر
آپ ہی اپنے سے باتیں
الٹی سیدھی - چھوٹی موٹی
ایسے کرتا ہوں کہ
جیسے، وہ بہت ہی کارآمد ہیں اہم ہیں

بلب

رات کے ویران منظر میں جلا کرتا ہوں میں
دور تک محسوس ہوتا ہے کہ بس تنہا ہوں میں
روشنی میری ہوا میں پھیلنے پاتی نہیں،
کھڑکیوں سے بے بسی سے جھانکتا رہتا ہوں میں

○ پلاٹ - ۴ - ۱۰۰ ہمایوں نگر - حیدرآباد ۲۸

رادھا کرشن سہگل

رات باقی ہے ابھی !

چاندنی رقص کناں تھی مرے آنگن میں کبھی
دودھیا کرنیں مچلتی تھیں مرے سینے پر
اور دیتی تھیں مجھے زندگی نو کا پیام
مجھے تڑپانے کا ساماں کیا کرتی تھیں

آج بھی کاش وہی کرنیں اتر آئیں ذرا
ان کا پیغام محبت لیکر
دل کی مرجھائی ہوئی کلیوں کو دیں اذن شگفت
رات باقی ہے ابھی!

○ جے ۳ راجوری گارڈن - نئی دہلی ۲۷

حامد مجاز

تنہائی

کوئی آواز کھنک اٹھتی ہے.
ضبط کی نیند اچٹ جاتی ہے
دل دھڑکتا ہے تمنا کے صنم خانے کا
درد ہنستا ہے خیالوں کے پری خانے میں
دور تک کوئی نہیں
ایک سایہ بھی نہیں.
ایک آہٹ بھی نہیں سانس کی آہٹ کے سوا
جیسے سناٹا دھڑک جائے خیالوں میں کہیں
کوئی آواز کھنک اٹھتی ہے.
زندگی خواب نہ ہو
نغمۂ بے خواب تو ہے.
ایک ساحر ہے مسیحا تو نہیں

○ اے ۳۰-۹۰-۶-۲ کاچی گوڑہ حیدرآباد

غزل گائیکی

شاہد میر
شعبۂ دوئنی - گورنمنٹ کالج - بانسواڑہ (راجستھان)

"شاعر" میں "فن اور فنکار" کا یہ نیا عنوان قائم کیا جا رہا ہے۔ اس دورِ جدید میں فنونِ لطیفہ موسیقی، مصوری، بُت تراشی (سنگ تراشی)، تصویر کشی، تعمیرات اور نقاشی وغیرہ کے ارتقا اور مشہور و ممتاز فنکاروں کے فنی اختراعات پر اگر علمی و ادبی انداز میں مضامین لکھے جائیں تو اُردو حلقوں کی دلچسپی کا باعث ہوں گے۔

—— "صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کیلئے" —————— (ادارہ) ——

مشاعروں نے اُردو غزل کی مقبولیت کو بڑھانے میں جس قدر اہم رول ادا کیا ہے وہ کسی سے چھپا نہیں ہے مگر یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ غزل کو ہر دل عزیز بنانے کا فخر ان گلوکاروں کو بھی ہے جنہوں نے سازوں پر غزلیں گا کر غزل کو امر کر دیا ہے۔ بیگم اختر، لتا منگیشکر، مہدی حسن، غلام علی، برصغیر کے چند ایسے نام ہیں جن کا ذکر آتے ہی کوئی نہ کوئی غزل پردۂ سماعت پر نمودار ہونے لگتی ہے۔

جن لوگوں نے سنگیت کی محفلوں میں شرکت کی ہے وہ اس حقیقت سے واقف ہوں گے کہ غزل کا نمبر خیال اور ٹھمری گانے کے بعد آتا ہے۔ یعنی جب گانے والے کا گلا پورے طور سے تیار ہو جاتا ہے تب غزل گائی جاتی ہے۔

"خیال" ہندوستانی سنگیت کی وہ صنف ہے جس میں لفظوں کی معنویت کو کوئی دخل نہیں ہے۔ "سُروں" کے آتار چڑھاؤ سے گانے والا ایک ایسی تصویراتی امیج بناتا ہے جس میں "راگ" کے شودھ (पवित्र) (سچے) ہونے اور "شُدّے" کے برقرار رہنے کو خیال گائیکی کا جزو کہا جاتا ہے۔ اس کے برخلاف ٹھمری میں راگ "شودھ" نہیں رہتا۔ مثلاً اگر راگ میں ग रे मम मम रे ग سُروں کا استعمال ہوا ہے تو ٹھمری گانے والا بہ قدرِ ضرورت ग اور नि کا بھی استعمال کر سکتا ہے۔ "غزل گائیکی" "خیال" اور "ٹھمری" دونوں کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ غزل گانے کے لئے "پوری تیاری" کی ضرورت پیش آتی ہے۔ خیال کے مقابلے میں ٹھمری گانے والا زیادہ کامیابی سے غزل گا سکتا ہے۔ غزل کے اشعار میں پوشیدہ تصور کے اعتبار سے راگ کا انتخاب، مناسب تال اور مناسب سازوں کا تعین غزل گانے کی اہم ضروریات میں سے ہیں۔ زمانۂ قدیم میں غزلیں عام طور سے ہلکے پھلکے راگوں مثلاً ایمن، بہار، دیس، پیلو، جے جے ونتی وغیرہ ہی میں گائی جاتی تھیں۔ سنگت کیلئے ہارمونیم اور زیادہ سے زیادہ سارنگی کا سہارا لیا جاتا تھا۔ لیکن اس دورِ ترقی نے زندگی کے ہر شعبہ میں خاطر خواہ تبدیلیاں پیدا کی ہیں۔ غزل کی ہیئت ولی دکنی سے لیکر بشیر بدر تک یکسر بدل گئی ہے۔ "غزل گائیکی" بھی اس تبدیلی کی نشاندہی کرتی ہے۔ للت، توڑی، درباری، ابھوگی جیسے گمبھیرِ (سنجیدہ) راگوں میں غزل گائی جا رہی ہیں۔ ستار، سرود، اکارڈین، کلارنیٹ، بانسری، پیانو، گٹار، سورمنڈل وغیرہ غزل کے لئے بطورِ آرکیسٹرا (ORCHESTRA) استعمال کئے جا رہے ہیں۔ غزل کی بندشیں "دادرا" اور "کہروا" کے ساتھ ساتھ "روپک"، دیپ چندی، تیورا تالوں میں بھی کی جانے لگی ہیں۔ پاکستانی موسیقاروں نے تو غزل کے ساتھ طبلے کے بجائے بانگو اور کانگو ڈرم کے استعمال کو بھی روا رکھا ہے۔

بہرحال غزل کسی بھی راگ اور کسی بھی تال میں گائی جائے، گانے والے کو ایسا انداز اپنانا ضروری ہے جس کے ذریعے اشعار میں چھپے ہوئے تصور کا EXPRESSION پوری طرح سے ہو جائے۔ بہ الفاظِ دیگر گلوکار

شاعر بنتی

کو تاثر کے احساسات سے پوری طرح ہم آہنگ ہو جانا چاہیئے۔ مشہور پاکستانی گلوکار مہدی حسن کا کہنا ہے کہ "چاہے گانے کی لَے قائم نہ رہے، راگ بدل جائے مگر الفاظ کی ادائیگی پوری خوبصورتی کے ساتھ ہونا ضروری ہے۔ جس لفظ کا جیسا تلفظ ہے ویسا ہی غزل گاتے وقت بھی قائم رہنا ضروری ہے"۔ مثال کے طور پر مہدی حسن نے فیض کی مشہور غزل "رنگ پیراہن کا خوشبو زلف لہرانے کا نام" گائی ہے، جس کا ایک مصرعہ یوں ہے "محتسب کی خیر اونچا ہے اسی کے نام سے"۔ لفظ "محتسب" کو اگر پوری توجہ کے ساتھ ادا نہ کیا جائے تو "تال" اور "لَے" کی بندشوں کی وجہ سے گانے والا "موحتا سب" پڑھے گا۔ لیکن مہدی حسن نے "محتسب" کو محتسب ہی پڑھا ہے۔ اور یہی اُن کی غزل گائیکی کی بڑی خوبی ہے۔

جن شعراء کی غزلیں عام طور سے ہندوستان اور پاکستان میں گائی جاتی رہی ہیں اُن میں غالب کا مقام منفرد ہے۔ غالب اس میدان میں بھی وہ خوش نصیب شاعر ہے جس کا کلام سب سے زیادہ گایا گیا ہے۔ غالب کی مشہور غزل "یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا" لتا منگیشکر، ثریا، محمد رفیع، سہگل، بیگم اختر، غرض تمام قابلِ ذکر فن کاروں نے گائی ہے۔ اس کے علاوہ غالب کی چند اور مشہور غزلیں جو گائی جا رہی ہیں مندرجۂ ذیل ہیں

ط: شوق ہر رنگ رقیبِ سر و ساماں نکلا۔ (محمد رفیع)
غ: میری رفتار سے بھاگے ہے بیاباں مجھ سے (مہندر کپور)
غ: درد منت کشِ دوا نہ ہوا (لتا)
غ: بس کہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا (سہگل)
غ: مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کئے ہوئے (سدھا ملہوترا)
غ: ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ تو کیا ہے (بیگم اختر)
غ: رہیئے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو (ثریا)
غ: دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت (بیگم اختر)
غ: دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے (ثریا اور طلعت محمود)
غ: دل سے تری نگاہ جگر تک اتر گئی (سہگل)
غ: دہر میں نقشِ وفا وجہ تسلّی نہ ہوا (لتا)
غ: کہتے ہو نہ دیں گے ہم دل اگر پڑا پایا (ثریا اور لتا)
غ: ابنِ مریم ہوا کرے کوئی (استاد برکت علی خاں)
غ: کعبے میں جا رہا تو نہ دو طعنہ کیا کہیں (؟) — کہتے ہیں محبت تو گزرتا ہے گماں اور (محمد رفیع)

غالب کے بعد اساتذہ میں جن کا کلام گایا گیا ہے وہ ہیں میر تقی میر،

شاعر بجتی

ذوق، مصحفی، داغ، آرزو، بہادر شاہ ظفر، حسرت موہانی، جگر مرادآبادی، سیماب اکبرآبادی، فانی بدایونی وغیرہ چند ایسے شعرا بھی ہیں (مختار، شکیل، شمیم جے پوری وغیرہ) جن کا کلام رسائل میں کم دیکھا گیا ہے مگر گلوکاروں نے ان کی بے شمار غزلیں گائی ہیں۔ ترقی پسند شعراء میں فیض احمد فیض کی غزلیں رونا لیلےٰ (غ: آئے کچھ ابر کچھ شراب آئے)، نور جہاں (غ: تم آئے ہو نہ شبِ انتظار گزری ہے)، اور مہدی حسن (غ: گلوں میں رنگ بھرے بادِ نو بہار چلے) نے بڑے ذوق و شوق سے گائی ہیں۔ ایک دو غزلیں احسان دانش اور مخدوم محی الدین کی بھی گائی گئی ہیں۔ کیفی، ساحر، اور مجروح کی فلمی اور غیر فلمی غزلوں کی تعداد بھی خاصی ہے۔

"جدید شاعری" کی نمائندگی بھی گانے کی محفلوں میں کم از کم پاکستان میں برابر جاری ہے۔ ہندوستان میں یہ سلسلہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ یہاں گلوکاروں اور موسیقاروں کو میر، غالب، داغ، جگر کے علاوہ اور کوئی نظر ہی نہیں آتا۔ عام الزام یہ ہے کہ جدید غزلیں اتنی "کھُردری" اور "خشک" ہیں کہ سُروں کے اتار چڑھاؤ بھی اُن میں نرمی اور نازکی پیدا نہیں کر سکتے۔ بے شک بشیر بدر کی وہ غزلیں ـــــ

تین سمندر۔ وہ صحرا جس کے آگے ناگن جیسی ایک لکیر چمکتی ہے
حقیقت سُرخ مچھلی جانتی ہے سمندر کتنا بوڑھا ہو گیا ہے

بالکل نہیں گائی جا سکتی۔ پاکستان میں ظفر اقبال کی (غ: کھیلنے پلنگ پر کبڈی) والی غزل بھی کہاں گائی گئی ہے۔ مگر ظفر اقبال کی وہ غزل ــ

ابھی وہ جانے کہاں ہے کہ ٹوٹتا ہے بدن
غبار آمدِ گل کی خبر میں اتنا ہے

غلام علی خاں نے بڑے فن کارانہ انداز میں گائی ہے۔ ظاہر ہے بشیر بدر کی صاف ستھری غزلیں (غ: پتھر کے جگر والو غم میں وہ روانی ہے) یا (غ: اس برس باغ میں گلاب کہاں) بڑی خوبصورتی کے ساتھ گائی جا سکتی ہیں۔ بشیر بدر کی "بابا" ردیف والی غزل کی بندش اگر راگ "جوگیا" میں کی جائے تو سُننے والوں پر مکمل "بیراگ" کی کیفیات طاری ہو سکتی ہے۔ خورشید احمد جامی، جاں نثار اختر، شاذ تمکنت، شہریار، وحید اختر، زیب غوری، زبیر رضوی، بشر نواز، مظفر حنفی، محمود سعیدی، عقیل شاداب وغیرہ کی غزلیں صاف ستھری زبان سے آراستہ ہیں۔ مناسب ہوگا اگر آل انڈیا ریڈیو کی اُردو سروس ان شعراء کی غزلوں کے ریکارڈ تیار کرنے کی طرف

تو حیثہ دے۔ ہندوستان میں جدید شاعری "عام آدمی" سے اپنا رشتہ نہیں جوڑ سکی۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ یہاں جدید غزلوں کو سازوں کے ساتھ باندھا نہیں گایا جاتا۔ اس کے برخلاف پاکستان میں ناصر کاظمی، احمد فراز، منیر نیازی، ظفر اقبال، امجد اسلام امجد، خاطر غزنوی، ناصر زیدی، قتیل شفائی، عارف عبدالمتین، بہزاد جالندھری، محبوب خزاں، ساغر صدیقی، فاروق عادل، جمیل الدین، عبداللہ علیم، رفعت سلطان وغیرہ کا کلام اس لئے زبان زدِ خاص و عام ہے کہ ان شعراء کی بے شمار غزلیں پاکستانی گلوکاروں نے گائی ہیں۔

پاکستان کے ممتاز غزل گانے والوں میں استاد برکت علی خاں، استاد سلامت علی خاں، مہدی حسن، غلام علی، پرویز مہدی، اور زاہدہ پروین کی گائی ہوئی غزلوں میں گہری کلاسکی چھاپ نظر آتی ہے۔ غزل کے مطلع کا پہلا مصرعہ جسے استھائی کہا جاتا ہے۔ بالکل ٹھہری ہوئی لے میں ہوتا ہے مگر دوسرا مصرعہ شروع ہوتے ہی طبلہ دوگنی چوگنی رفتار سے بجنے لگتا ہے۔ "خیال" کی تانیں اور "ٹھمری" کی مرکیاں" غزل کے شعروں میں وہ اثر پیدا کرتی ہیں کہ ماحول پر خواب کی سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ روناليلےٰ، نورجہاں، آصفہ، عائشہ سلطان، اعجاز حسین، مجیب عالم، حبیب ولی محمد اور تسلیم رضا کی گائی ہوئی غزلیں ہلکی کلاسکی موسیقی کی بہترین مثال ہیں۔

اِسی طرح ہندوستان میں ملکۂ غزل بیگم اختر نے غزل گائیکی میں ایک نئی رُوح پھونکی ہے۔ جگر، فانی، اور شکیل بدایونی کی غزلوں کی مقبولیت کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ انہیں بیگم اختر، کی آواز نصیب ہوئی۔ دیگر ہندوستانی فن کاروں میں جگجیت سنگھ، (جنہیں ہندوستان کا مہدی حسن کہا جاتا ہے)، غلام مصطفےٰ خاں، تانگیشکر، نرملا دیوی، پروین سلطانہ، محمد یعقوب، محبوب نیازی، پشپا گیدھرے، نسیم بانو چوپڑا، سمن کلیان پور، محمد رفیع، طلعت محمود، وغیرہ نے بھی کامیاب غزلیں گائی ہیں۔

غزل اُردو ادب کی وہ شمع ہے جو آج بھی پوری آب و تاب کے ساتھ روشن ہے۔ مجھے یہ کہنے میں ذرا بھی تامل نہیں کہ جب تک ہندوستانی سنگیت زندہ ہے "غزل گائیکی" بھی پورے وقار کے ساتھ زندہ رہے گی OO

مُراسلت کے وقت

اپنا نمبر خریداری ضرور تحریر کیجئے۔ جواب طلب امور کے لئے پوسٹ کارڈ۔ ٹکٹ یا لفافہ بھیجئے۔ منیجر

حرمت الاکرام

نکتہ دانِ سحر و شام نہیں ہے کوئی
محرمِ گردشِ ایام نہیں ہے کوئی

تیز کتنا ہی چلو، راہ میں رہ جاؤ گے
وقت سے بڑھ کے سبک گام نہیں ہے کوئی

جس کو دیکھا، وہ ملا پنے ہوسے سرشار
بزمِ حرماں میں تہی جام نہیں ہے کوئی

طائرِ جاں کو پھڑکنے کا سلیقہ ہی کہاں!
کون جانے کہ تہِ دام نہیں ہے کوئی

میں ہوں اک خلوتِ میکدۂ آخرِ شب
کیا سرور آئے کہ ہم جام نہیں ہے کوئی

زندگی خود بھی سبکسار رہی دے کے لہو،
اور قاتل پہ بھی الزام نہیں ہے کوئی

پیچ در پیچ ہے لمحاتِ گریزاں کا سفر
راہ میں منزلِ یک گام نہیں ہے کوئی

عشرتِ ہمسفری للورنہ کر دے تنہا
زندگی رہگزرِ عام نہیں ہے کوئی

افقِ تیرہ کو ہے اپنے مسافر کی تلاش
کیا پسِ مرحلۂ شام نہیں ہے کوئی

بے نیا تا نہ گزرتی تھی صبا کب اس طرح
کیا مرے نام کا پیغام نہیں ہے کوئی

حرمت آخر اسے کس طرح پکارا جائے
روپ کتنے ہیں مگر نام نہیں ہے کوئی

○ رام باغ مرزاپور (یوپی)

انجم مظہری

بحرِ ماضی میں کہیں ڈوب گیا ہوں میں بھی
کھا گئیں جس کو ہوائیں وہ صدا ہوں میں بھی

دورِ کم مایہ کو بن مانگے ملا ہوں میں بھی
کتنے انمول خزانوں کا پتا ہوں میں بھی

ہے مرے دم سے یہاں فہم و بصیرت میں نمو
صحنِ ادراک تری آب و ہوا ہوں میں بھی

ایک تجھ کو ہی نہیں ہے مرے پانے کی لگن
ڈھونڈنے والے تجھے ڈھونڈ رہا ہوں میں بھی

مجھ میں پوشیدہ اُجالوں کے خزانے ہیں بہت
یہ الگ بات کہ مفلس کا دیا ہوں میں بھی

ہر زمانے نے مرا ورد کیا ہے، جیسے،
کسی درویش کی مقبول دعا ہوں میں بھی

یہ نہ پوچھو کہ مری دربدری کیسی ہے
اپنے ہونے کی سزا کاٹ رہا ہوں میں بھی

ایک گوہر کی طرح کل تھی نمائش انجمؔ
آج آنسو کی طرح سوکھ گیا ہوں میں بھی

○ کنوتھٹ جہاری ۸۴۳۱۰۲

نرسری

انور خان

۴۰ - تیسری پیرخان اسٹریٹ، دوسرا فلور، روم نمبر ۲، بمبئی ۸

نرسری کے دروازے پر ایک خوش رُو نوجوان لڑکی نے ہمارا استقبال کیا۔ الطاف کے گال تھپتھپاتے ہوئے اُس سے کہا 'کیوں آج پپّا کو بھی ساتھ لائے ہو؟'

'ہاں' الطاف نے کہا' آج ہم پپّا کو اپنی نرسری دکھائیں گے'

'آیئے' الطاف کی ٹیچر نے خوش مزاجی سے کہا' دیکھئے ہم نے الطاف کے لئے کتنا خوبصورت شہر بنایا ہے'

شہر واقعی خوبصورت تھا۔

'چھت پر ایک خوش نما سا گولا لگا تھا جس میں ٹکلیاں لگی تھیں۔

'یہ کیا ہے؟ میں نے پُوچھا۔

یہ سورج ہے'

اچھا' اور وہ دیوار میں جو سنگترہ سا لٹک رہا ہے؟'

وہ چاند ہے'

آپ کے شہر میں پہاڑ بھی ہے'

'جی ہاں اور دریا بھی'

'یہ دیکھئے' الطاف کی ٹیچر نے کہا' ہمارے شہر کی پولیس کتنی خوش اسلوبی سے ٹریفک کنٹرول کرتی ہے اور بدزبان تو بالکل نہیں۔ ہر پولیس مین مُسکراتا رہتا ہے!

موٹر گاڑیاں دوڑ رہی تھیں۔ دو ننھے بچے کراسنگ پر آئے تو پولیس مین نے سگنل چلا اور اُن کی اُنگلی پکڑ کر روڈ پار کرا دیا۔

راستے بڑے صاف ستھرے اور کافی چوڑے تھے۔ درمیان سے درختوں کی قطار چلی گئی تھی جن کے سایہ میں کہیں کہیں راہگیر سستا رہے تھے۔ مختلف شکلوں کے خوشنما مکانات قرینے سے قطار اندر قطار رکھے تھے' جا بجا باغات تھے جن میں بچّے کھیل رہے تھے۔ چند بچّے باتصویر کہانیوں کی کتابیں دیکھ رہے تھے۔ چند پتنگیں اور غبارے اُڑا رہے تھے۔ کچھ خرگوش' ریچھ

شاعرہ بمبئی

کتوں' شیر' چیتوں اور بندروں کے ساتھ کھیل رہے تھے۔ الطاف نے ایک خرگوش کے کان پکڑ کر اُسے اُٹھایا اور پیار کرنے لگا۔ الطاف کی ٹیچر نے مجھے اخبار بھی بتایا جس میں صرف کارٹون' چٹکلے اور کہانیاں چھپتی تھیں اور بچّے اخبار پڑھنے کے بعد اُسے کھا جاتے تھے۔

'وہ کیا ہے؟' میں نے اُنگلی کے اشارے سے پُوچھا

'وہ ریستوران ہے'

ریستوران میں چند نوجوان بیٹھے خوش گپیوں میں مشغول تھے' اُن کے سامنے چائے رکھی تھی

'آپ کے شہر کے لوگ کام بھی کرتے ہوں گے؟' میں نے پُوچھا

'ہاں جس کام کے کرنے کو اُن کا جی چاہے اور جب تک اُن کا مُوڈ ہو'

مجھے اس شہر کے باسیوں پر رشک آیا۔

یہاں لوگ بڑے صحت مند نظر آتے ہیں'۔

'ہاں' یہاں سب کو پیٹ بھر کھانا ملتا ہے' یہاں کے لوگ پیٹو بھی نہیں ہیں۔ چیزیں اصلی ملتی ہیں اور افراط سے۔ پھر سستی بھی۔ اس دوکاندار کو دیکھئے کتنا خوش مزاج ہے'۔

'آپ کے شہر میں سب اچھے شہری رہتے ہیں'

'جی ہاں' یہاں کوئی بدقماش یا عیار نہیں'۔

ایک چھوٹے سے گھر کے دالان میں ایک بڑے میاں اپنے بچوں کے ساتھ کھیل رہے تھے۔ چند خوبصورت لڑکیاں باغ میں چہل قدمی کر رہی تھیں۔

'آپ کے شہر کی لڑکیاں بڑی خوش نظر آتی ہیں' میں نے الطاف کی ٹیچر سے کہا۔

ہاں' ہمارے شہر میں ہر لڑکی کی مناسب وقت پر شادی ہو جاتی ہے'

(باقی صفحہ ۲۸ پر دیکھئے)

خالد شفائی

غزل

(نذرِ ایمرجنسی)

سر زمینِ بھارت پر رُوحِ عزم گاتی ہے
رات کی نگاہوں سے صُبح جِھلملاتی ہے
کِھل رہے ہیں گُلشن میں، پھُول امن و راحت کے
چھاؤں میں بہاروں کی زیست مُسکراتی ہے
مِٹ رہی ہیں دُنیا میں "ظُلم و جبر و وحشت" کی
"انقلاب کی دیوی" "اِنقلاب" لاتی ہے
رہ گئے دھرے سارے "سازشوں کے ہتھکنڈے"
"ظُلمتوں کی عیّاری" خود ہی مات کھاتی ہے
خاک ہو گئے آخر "قاتلوں کے منصوبے"
بالیقیں، عزائم کی آگ رنگ لاتی ہے
اک نیا جہاں ہوگا، اک نئی زمیں ہو گی
تیرگی کے ہونٹوں پر صُبح گنگناتی ہے
کُھل گیا ہے میخانہ، میکشو بڑھو آگے
جام نوش کے ساون کی اب گھٹا بُلاتی ہے
ڈھل چلی شبِ ہجراں تو بھی مُسکرا خالد
دیکھ غم کے ماروں کو زندگی بلاتی ہے

○ گورنمنٹ اردو ہائی اسکول، سندرگڑھ (اڑیسہ)

شاعر۔ بمبئی

اعجاز اعظمی

تکمیلِ عشق

اے وطن! تجھ سے دُور ہوں لیکن
تیری فرقت کے غم کی چنگاری
میرے دِل میں دَبی ہوئی ہے ابھی
حسرتوں کے عظیم صحرا میں
شمعِ دِل ہے کہ جل رہی ہے ابھی
یوں بھی تجدیدِ عشق ہوتی ہے

اے وطن! تیری دلدہی کیلئے
اپنے احساسِ دلنوازی سے
تیری یادوں کی پاکبازی سے
روز و شب سے حسین لمحوں کو
رشکِ خُلدِ بریں بنایا ہے
جب بھی تو مجھ کو یاد آیا ہے

اے وطن! تیری دلبری کی قسم
ہے یہی میری آخری خواہش
جب تھکا ہارا تیرے پاس آؤں
دستِ اُلفت کا لمس ملتے ہی
تیرے پہلو میں پڑ کے سو جاؤں
اور تکمیلِ عشق ہو جائے

○ AZMI BAKERY
BATU 4, JALAN PANTI,
PORT DICKSON, MALAYSIA

ایک دھنک

(ہندی)

سورج بالا

ترجمہ: صبا وید اقبال

معرفت پوسٹ ماسٹر خضر بیگ - پہلو، پرلونی ضلع بیگو سرائے (بہار)

اُدھر دُھلے فیروزی آسمان میں قوسِ قزح لہک رہی ہے... اٹالہ مسجد کے میناروں کے اُوپر، ہفت رنگ جادوئی ریشوں میں خمیدہ، پوری کمان سی دھنک... ایک پُرانی غزل کا مصرع زبان پر آیا ہی تھا کہ شامیانے کے پردے کھسکا کر غفورے نے چٹکی لی: "گویا جوانی لوٹ رہی ہے... کیوں اُستاد؟"

ٹھہرتابی مسکراہٹ کر ایک ساتھ ہونٹوں سے مسکرائیں: "دھنک دیکھ رہا تھا میاں! دیکھو کیا نظارہ ہے قدرت کا!" اور نظارے کا پورا لطف اٹھانے کے لئے جو گردن ٹکانے کی کوشش کی تو دیوار سے بالشت بھر لونی جھڑ گئی۔ اُستاد توبہ کہہ کر جھپ گردن سے لونی کے ذرّے جھاڑنے لگے۔

"اور مزاج کیسے ہیں؟"

"دُعا ہے تم سب کی۔ ٹھیک ہوں۔ ابھی کوٹھری کے گوربے سے دھنک کا ٹکڑا دکھا تو خود کو روک نہ سکا۔ سوچا باہر چل کے نظر بھر دیکھوں۔ میناروں پہ لہکتی دھنک، اس لئے دیوار کا سہارا لئے لئے صحن میں آگیا۔"

"ارے، تو میں کون سا دُور تھا! آواز لگا دیتے۔ آج تو یہ کھاٹ بھی پانی کھا گئی دِکھے... اپنی ڈال دوں؟"

"نہیں نہیں۔ لمحے بھر ہی میں اندر چلا جاؤں گا۔ کوٹھری میں اُمس ذرا زیادہ ہی ہے۔" اُستاد نے پھر ہنسنے کی کوشش کی کہ کھانسی اُمڑ گئی۔ غفورے نے پیک دان آگے سرکا دیا۔

"بس کرو اُستاد۔ دھنک مٹ رہی ہے۔ چلو کمرے میں پہنچا دوں۔"

"سچ مچ دوسرا سرا رفتہ رفتہ ہلکا ہو رہا تھا... اُستاد دیکھتے رہے۔ جانے کتنے موسموں، جانے کتنے سالوں بعد دھنک... یعنی... یعنی زلیخا کی ہری فیروزی اوڑھنی سے ڈھکی پیشانی... یعنی وہ غزلیں... یعنی وہ ترنم، وہ الفاظ، اُن کی بیٹی آواز... اسی دھنک کی طرح جسے وہ ساری ساری رات محفلوں میں اتارا کرتے تھے۔ آج، آج کتنے سالوں بعد دکھی ہے یہ دھنک جسے وہ شاید بھی گذشتہ سالوں کی طرح نظر انداز نہیں کر سکے... سیکڑوں برساتوں کے بعد دیکھا۔ ادھر موسم کی پہلی دھنک۔ یاد آئیں شامیانوں تلے سجی عطر بیز محفلیں، جب "بادل ہیں ترے گیسو، بجلی ہے ترا جلوہ"... سُن کر ماشقوں کی نظریں چلمن کے پیچھے سے اُلجھ اُلجھ کر جھوم جایا کرتی تھیں اور بزرگوں کی آنکھوں کی چلمن میں حسین یادیں مُرغِ بسمل کی طرح پھڑپھڑانے لگتیں... گرم جوشی سے بھرے، لبریز جام چھلکتے تو استاد کی آنکھیں زلیخا کے مسحور کن تبسم کے نُور سے چھلکنے لگتیں۔ اُستاد کی ہر محفل کی کامیابی کے لئے نماز کے بعد دست بدعا زلیخا... اور جب بلاوا آتا تو آدھی آدھی رات تک کھانا لگائے محوِ انتظار زلیخا۔ اُستاد لوٹنے پر سب سے پہلے نیند کی ماتی زلیخا کی پیشانی چومتے۔ زلیخا کی پیشانی۔ یعنی فیروزی آسمان پر لہکتی دھنک۔ یادیں بھی اب حد سے گزر گئی ہیں۔ اتنے سالوں، مہینوں، ہفتوں، گھڑیوں میں گھسٹتے گھسٹتے، دہلتے تھرلتے ان کا بھی رنگ و آب، چمک دمک پھیکی پڑتی جاتی ہے۔ لیکن آج کچھ جنون ہی چڑھا ہے کہ اُستاد ان پھیکی، ٹوٹی پھوٹی یادوں کو جھاڑ پونچھ کر، نرمی سے تہہ کر کر کے رکھ رہے ہیں۔

پُروائی کا مدھم سا جھونکا لہرا گیا۔ استاد کی آنکھوں سے لمحے بھر کو بھی ہائی کورٹ کے بڑے ہال کا نظارہ نہیں ہٹ رہا ہے۔ بتیاں جلنے کے ساتھ ہی وہ شبّن مستانے کے پیچھے سارنگی لئے بیٹھے تھے۔ دل کیسا دھڑکا تھا جیسے پہلی بار اسٹیج پر آئے ہوں۔ آئے تو پہلی بار ہی تھے۔ زلیخا کے مرنے کے اتنے... اتنے سالوں بعد۔ نہیں تو اِدھر جنازہ اٹھا تھا اور اُدھر استاد کی قوالیوں کا مجلسوں سے جنازہ اٹھ گیا تھا۔ تب چہیتے شاگردوں نے سمجھایا بجھایا، آرزو منت کی۔ لیکن سب بے کار۔ بس ایک جملہ بولے تھے۔ "شبّن! میری آواز چلی گئی۔" بلاوے آتے رہے۔ رائے صاحب کی سگائی کے جشن کے۔ ٹھاکر امراؤ سنگھ کی پچاسویں سالگرہ کے۔ نواب [illegible] کی لڑکی کے نکاح

کے ... لیکن وہ باہر نہ جاتے۔ نہ ہاتھ جوڑ کر معافی مانگتے۔ پانچ سالہ زبیدہ کو گود میں لئے یا چارپائی پر لٹائے پڑے رہتے۔ نہیں تو پہلے زلیخا چق کی اوٹ سے دیکھا کرتی تھی۔ استاد کس ادب سے سر جھکا جھکا کر آئے ہوئے بلاوؤں کے لئے اپنی مجبوری ظاہر کرتے کہ کل کے لئے تو جناب خدا بخش کے گھر، جمعو کو نواب کی ڈیوڑھی پر ہفتے پہلے کا بلاوا ہے۔ زلیخا خوش ہو کر آسمان کی جانب ہاتھ پھیلا کر خدا کا شکر ادا کرتی کہ اس کی عبادت، پابندی سے پڑھی گئی پنجگانہ نماز کامیاب ہوئی۔ استاد ایک فاقہ مست بے روزگار سے زمانے کے مشہور قوال بن چکے تھے۔

لیٹے لیٹے کرتے کی بغلی جیب میں ہاتھ جاتا ہے۔ وہی مٹ میلا بادامی پوسٹ کارڈ۔

"پیارے ابا حضور کو زبیدہ کا آداب قبول ہو!

آگے ابا آپ کو پتا ہو کہ ادھر چھ مہینوں سے ہم سندیلے میں ہیں۔ نوری کے ابا کی بل مشین سے جلنے لگی، کام چھوٹ گیا۔ روزی کی تلاش میں سندیلہ آگئے۔ کچھ نہ کچھ کام مل جاتا ہے۔ ادھر ڈیڑھ دو مہینے سے گذارے کا آسرا ہو گیا ہے۔ آگے خدا مالک۔ آگے ابا، ہم ایک دن آپ کے پاس آئیں گے۔ پہلے تو بہت دور تھے۔ کچھ بس نہ تھا۔ یہاں سے ٹھیکیدار کی ٹرک جاتی ہے۔ عید کے اگلے ہفتے تک پہنچ سکوں تو روزے کا سب سے بڑا ثواب اسے ہی مانوں گی۔ نوری اور اس کے ابا کا سلام منظور ہو۔

آپ کی پیاری بیٹی
زبیدہ عرف زبی

پچھلے جمعہ کو ڈاکیہ بھٹکتا بھٹکتا لوٹنے کو تھا کہ غفورے سے ملاقات ہوئی تھی اور بھلا ہو غفورے کا کہ پوسٹ کارڈ پر لکھا نام دیکھ کر لمحے بھر کان کے پاس کی جوں ٹٹولتے ٹٹولتے اسے اچانک یاد آ گیا، ٹھہرو! ایسا ہی کچھ تو اپنے استاد کا نام ہے۔ استاد کی کوٹھری پہ آواز دے کر ڈاکیہ جھنجھلا اٹھا تھا: توبہ ہے استاد۔ جسے ڈھونڈتے تھے گلی گلی، وہ مکان کے پچھواڑے نکلا۔ خاصا بڑا نام تھا کسی زمانے میں تمہارا ... شرط لگا سکتا ہوں جو شہر کو تمہارا یہ نام یاد ہو ...

'آپ کی پیاری بیٹی زبیدہ عرف زبی' کے بادامی پوسٹ کارڈ نے وہ کام کیا کہ وہ حکیم سمیع اللہ خاں کی دواؤں سے کہیں زیادہ موثر ثابت ہوا۔ ابا بوسیدہ کوٹھری کے دروازے پر جب ڈاکیے کی ہتھیلی پہ استاد کی ... بھی

دی ہوئی چونی پڑی تھی تو وہ چند لمحے مبہوت سا کھڑا رہا ... رک رک کر اس کی نظر کونے میں رکھی المونیم کی پچکی رکابیوں، زنگ آلودہ، ٹوٹے ڈھکن والی دیگچیوں اور پتیلی اور پلستروں کے ساتھ جھپکتی اکھڑتی رہی۔ اور آخر میں چونی پر اٹک گئی۔ "یہ کیا استاد! تمہاری بیٹی میری بیٹی ہوئی۔ بخشش کیسی!"

استاد نے کوشش تو کی، لیکن کچھ بول نہ سکے۔ بولتے کیسے؟ جانے کتنے ماہ و سال کی بھولی بسری داستانیں آ کر دھنسی ہوئی تھیں گلے میں، آنکھوں میں، دل و دماغ میں۔ ہر جگہ انہیں داستانوں کا پہرہ تھا ... فیروزی، کاسنی، سرمئی داستانوں کا پہرہ ...

انہوں نے ہاتھ آگے بڑھا کر ڈاکیے کی چونی والی ہتھیلی بند کر دی۔ پھر غفور میاں کو بلوایا۔ رائے لی کہ کم سے کم کتنے میں ڈیڑھ فٹ کی دیوار تھوڑی درست ہو جائے۔ تارکول ہی لیپ دیں۔ سنڈاس کے لئے ایک ٹاٹ کا پردہ ... نئی رکابیاں غفور میاں اپنی دے دیں گے ... دیواروں کے لئے مزدوروں سے بات کرنی ہوگی۔ پھر ایک گوٹہ کنارے والی فراک، چڈھی، داماد کو اور کچھ نہیں تو ایک تولیہ ہوا اور ایک پھول دار ساڑھی۔ غفور میاں چلے گئے تو استاد اکیلے بیٹھے بیٹھے کتر بیونت کرنے لگے۔ ایک ایک پاؤ بھی دو دن گوشت آئے تو، تیل، صابن، منجن ... ارے نوری کے لئے دودھ ... سارا حساب لگا کر جوڑا تو لگا بہت تھک گئے ہیں۔ یوں ہی پڑے پڑے جالوں میں پھنسی مری مکھیاں دیکھتے دیکھتے اچانک اٹھے اور چھڑی اٹھا کر شبن کے گھر چل دیئے۔

وہی شفاف بتیاں، وہی مجلس، وہی سماں ... ہارمونیم اور سارنگی کے ہم آہنگ آواز۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اسٹیج کے درمیان میں مخملاتی کامدانی کی اچکن، دھلے دھلے گراری پاجامے اور ترچھی مخملی ٹوپی لگائے استاد نہیں شبن مستانہ بیٹھے تھے۔ استاد تو اپنی بوسیدہ اور شکن آلود اچکن اور غفورے سے مانگا پاجامہ پہنے، جھینپتے سے، اس زمانے کے اپنے پیارے شاگرد اور اس زمانے کے مشہور قوال شبن مستانہ کے پیچھے بیٹھے تھے۔ شبن نے ایک آدھ بار سامنے آنے کا اشارہ کیا تھا لیکن استاد اپنی اچکن اور میلی ٹوپی کو دیکھ کر جھینپ گئے تھے۔ ویسے اس بد لباس اور جھری دار جسم میں عہد گذشتہ کی کامرانی میں گھسے کسی ... اور ... کو ڈھونڈنا مشکل ہی تھا، لیکن ہاتھ میں سنبھالی سارنگی کے ... [illegible]

ٹپکتے آنسوؤں کو چھپانا شاید ناممکن ...

سُر بندھے ... ہاتھ پھیلے ۔ استاد کے نہیں، شبّن کے اور ماحول میں اُستاد کی اپنی بہت پیاری غزل کے الفاظ شبّن کی آواز میں تیر گئے ...

سہرا رنگت بھری شامیں کبھی ہم نے گزاری تھیں

شفق، بادل، تڑپتی بجلیاں سب کچھ ہماری تھیں

سرگم کے ساتھ ڈھولک تڑکتی رہی۔ پیچھے بیٹھے شاگرد اُسی تال میں ہتھیلیاں گھما گھما کر تالیاں بجاتے رہے ۔ جیسے کبھی شبّن بجایا کرتے تھے۔

لے تیز ہو گئی ... یہی شامیں، تڑپتی بجلیاں ... ں ... ں .. ں ... ہماری تھیں، ہماری تھیں ... ہتھیلیاں تیزی سے گھوم کر تالی دینے لگیں۔ شبّن نے ٹھہر کر استاد کو اشارہ کیا۔ ایک الاپ کھینچنے کے لئے استاد سنبھلے۔ ایکدم خیال آیا ... لے آنے سے پہلے شبّن نے کہا تو تھا " دو تین الاپ بھی کھینچنے پڑیں گے استاد! لیکن تمہارا دم اُکھڑ گیا تو؟ ایسا ہے کہ سارنگی تو اتنیان کے نہ آنے پر یہ لونڈا گجّو ہی سنبھال لیتا ہے، لیکن اب تم اتنی مدّت سے آئے ہو اور استاد ٹھہرے " نہ " نہیں کر سکتا ورنہ جب کبھی کبھی ضرورت پڑتی ہے اسی گجّو کے بھائی کو بلا لیتا ہوں۔ نویں میں پڑھتا ہے لیکن فلم کے ترانے گاتے گاتے قوّالی کے الاپ بھی کھینچ لیتا ہے۔ دس پندرہ دے دیتا ہوں۔ کچھ کہتا نہیں۔ بڑا ادب کرتا ہے میرا۔ لیکن تم سے انکار کر کے اللہ تعالیٰ کو کیا مُنہ دکھاؤں گا۔ اُستاد ٹھہرے۔ پچیس سے کم کیوں دوں گا۔ ... ویسے محفلوں میں بھی وہ آمدنی اب کہاں رہی!

شبّن شروع ہی سے ہوشیار تھا اور وقت کے ساتھ ساتھ آدمی اور بھی ہوشیار اور محتاط ہوتا جاتا ہے۔ کیا بُرا کہہ رہا ہے ... پہلے ہی بات صاف ہو جانی چاہیئے۔ نہیں تو استاد دل ہی دل میں سیکڑا سوائی کے منصوبے باندھ کر آئے ہوں تو بعد میں جھک جھک ہو۔ بعد کو لوگ کہتے پھریں کہ شبّن مستانہ بوڑھے اُستاد سے کائیاں پن کر بیٹھے۔ شہر کا بچہ بچہ شبّن مستانہ کو جانتا ہے۔ عزّت کا سوال پہلے ہے پیسے کا بعد میں۔ اس لئے پہلے سے بات پکّی ہونی چاہیئے۔

شبّن اپنی طرف سے اتنی دریادلی کر رہا ہے۔ آخر استاد کو بھی تو کچھ کہنا چاہیئے۔ لہٰذا وہ بولے۔

" تم سے کوئی مول بھاؤ نہیں کرنا شبّن! کچھ بھی ... "

" نہ دو تو بھی " نہیں کہہ پائے وہ۔ اِتنا بڑا جھوٹ کیسے، کس بوتے پر وہ بولتے! آدمی کبھی کچھ چاہ کر بھی تو نہیں کہہ پاتا۔ وقت کی پہرہ داری

خاموشی

شاید ... وقت کا پہرہ دار قہقہہ لگا کر کہے گا " کچھ بھی نہیں چاہیئے! ... تب کیا یہ شکن آلود اچکن اور مانگے کا پاجامہ پہن کر شوقیہ محفلوں سے لطف اندوز ہونے جا رہے ہیں؟۔

نہیں نہیں۔ شبّن کو اُنہوں نے بیٹے کی طرح چاہا ہے۔ آواز کی ایک ایک کشش، اپنے گلے کی ایک ایک باریکی اُس کے گلے میں اُتاری ہے .. تو؟ وہ بھی تو ان کی کتنی قدر کرتا ہے! وہ جانتے تھے کہ شبّن منع نہیں کرے گا۔ ضعیفی اور تنگدستی میں آج اتنے سالوں بعد جب اُنہیں ضرورت پڑی تو مدد ضرور کرے گا ۔ اور کی بھی اُس نے۔

" بُرا مت ماننا استاد! اپنے بھی بال بچّے ہیں۔ سال چھ مہینے بیٹی کا نکاح کر ڈالنا ہے۔ وقت کی تنگی تمہارے سامنے ہے۔

ٹھیک کہتا ہے ۔ کچھ غلط نہیں ۔ آدمی نہیں بدلتا۔ حالات بدل دیتے ہیں اُسے۔

شبّن کے دوسرے اشارے پر اُستاد نے کانپتے گلے سے سنبھالتے ہوئے، اللہ کا نام لے کر الاپ کھینچا۔ بدلی ہوئی آواز سے لوگ چونکے۔ اچانک جیسے تیرتا ہوا سب کچھ رک گیا ہو... چاروں طرف سے خاموش مسحور، مبہوت نگاہیں ان پر مرکوز ہو گئیں ... یہ ... یہ کیسی کشش ہے! ... لفظ کہیں نہیں، بس آواز ... آواز ... غیر مجسّم ... ان آوازوں کو کھینچتے ہوئے جیسے کوئی دل کھینچے لئے جا رہا ہو ... جانکار تو ایک دم واہ واہ کر کے پاگلوں کی طرح چلا اٹھے " کمال ہے۔ کمال ہے ..." سامنے آرام کرسیوں پر بیٹھے ہائی کورٹ کے افسران - مجسٹریٹ صاحب، سرکاری وکیل جناب مشتاق علی، ریٹائرڈ جسٹس سہائے صاحب ... سب کی آنکھوں میں محویت کے ساتھ قدر دانی بھی تھی۔ الاپ ختم ہوتے ہی جناب مشتاق علی ایک بلند " واہ " کے ساتھ اُٹھ کھڑے ہوئے " مستانہ! اس ہیرے کو سامنے لاؤ۔ ایک آدھ پھڑکتی ہوئی چیز سنواؤ "

شبّن نے اشارہ کیا۔ استاد جھکی نظروں میں واہ واہیاں رولتے تھوڑا آگے کھسک آئے۔ حقدار کی طرح نہیں، گنہگار کی طرح۔ اُنہوں نے شبّن کی طرف پھر دیکھا جیسے معافی چاہتے ہوں۔ لیکن شبّن نے مسکراتے ہوئے حوصلہ افزائی کی " سُناؤ استاد! پرانی چیز کی لذّت ہی اور ہوتی ہے "۔ لیکن فرمائشوں کا تانتا بندھ گیا۔ اُستاد کو خود پتا نہیں وہ کیسے گاتے چلے گئے۔ ایک بار بھی کھانسی نہیں ابھری ... گلا نہیں پھنسا ....

یہ شمہ تھا یا روزے کا ثواب ...

سماں بندھتا گیا۔ پوری مجلس سمندر کی لہروں کی طرح مچلتے لہراتے الفاظ پہ جھوم رہی تھی ...

انہیں اشکوں کے رازدار کو ہم ڈھونڈنے نکلے
ابھی ہم ڈھونڈنے نکلے ...

آواز کی لہریں تیز تر ہوتی جا رہی ہیں اور استاد کو لگتا ہے ایک ساتھ ہزار ہزار بجلیاں تڑپ رہی ہیں تمام جادوئی رنگوں میں دھنک لہرا رہی ہے۔ سمندری جھاگوں میں جل پری سی جھلملاتی زلیخا انہیں آواز دے رہی ہے۔ زبیدہ روزے کا ثواب پانے آ رہی ہے۔ شوہر کے ہمراہ ... نوری کو گود میں اٹھائے۔ رحمت خدا کی، کھانسی نہیں اکھڑی۔ عزت رہ گئی۔ شبن کی بھی۔ استاد کو، بھی شبن نے اوپر سے بھلے ہاں کہہ دی ہو، لیکن رہا ہوگا کشمکش و ہیچ میں کہ کہیں استاد محفل لوٹ نہ لیں۔ یا خدا ——

قوالی ختم ہوئی تو سہائے صاحب ایکدم سامنے آ گئے۔ " آپ کی تعریف ؟" جھکی نظر سے تمام جادوئی ریشے بکھر گئے تھے۔ " خاکسار کو علی افضل مراد کہتے ہیں۔"

" کیا ؟ ؟ " سہائے صاحب کی یادداشت میں جھماکا سا کوندا۔ " افضل مراد ؟ مشہور قوال ؟ ستارِ قوالی ؟ شاہجہاں گڑھی والے ؟ " انہوں نے آگے بڑھ کر استاد کو گلے سے لگا لیا تھا اور لگاتار باقی افسران کو بتاتے جا رہے تھے " کتنی بار پتاجی کے ساتھ بچپن میں آپ کی قوالیوں کا لطف اٹھایا ہے۔ آپ لوگوں نے کیا سنا ... میں نے جو اس شخص کو جوانی کے دنوں میں سنا ہے۔ مشتاق علی ! یہ گدڑی کے لعل ہیں، لعل !"

تب، تب ایک لمحے کو بادل، بجلیاں، کچھ نہیں، بس سارے آسمان پر دھنک ہی دھنک پھیل گئی تھی۔

بعد میں جھجکتے ہوئے شبن کو یاد دلایا۔ " ادھر ایک دو مجلسوں میں بلا لیتے تو ..."

" ضرور۔ ضرور۔"

غفور نے کتنی مدد کی۔ خدا جھوٹ نہ بلائے۔ دن کے دن مزدور کے ساتھ لگا دیا۔ پھر بھی جھجک تو ہوتی ہی ہے۔ مناسب موقع ہاتھ آئے تو پوچھنا ہے۔ " میاں دو چار مجلسوں کے لئے تمہارا ساتھ چاہیے۔ تم سے کچھ چھپا نہیں ہے — کیا کہوں، بہتیری پریشانی تو ہے گر ... لگتا تو یہ ہے کہ غفور انکار کریں گے اور انہیں کسی اور سے یا جانا مانگنا پڑے گا۔ آتے تو تھوڑا خرچ کا کچھ ... بھی بٹا لیتے ... ایک پاؤ دودھ روز، کم از کم بچوں کے لئے۔ چائے، پان، زردہ، تیل، ترکاری اور گوشت۔ غفور ہوتے تو اسی دھنک کی طرف انگلی دکھا کر سمجھا دیتے۔ " میاں ! ایسی ہی شوخ رنگوں والی لہریئے دار ساڑھی زبیدہ کے لئے لے آنا۔"

اتنے میں شبن کا شاگرد آتا دکھا۔ آتا تو لے پن میں بلانے ہی والے تھے کہ وہ خود لوٹا۔

" آداب استاد ! آپ کا ہی گھر تلاش کر رہا تھا۔ طبیعت ناساز نظر آتی ہے ؟"

استاد نے پیکدان کھینچا اور گلا صاف کر کے ہلس دیئے " نہیں۔ یوں تو اب بڈھا ہو رہا ہوں۔ لیٹے لیٹے دھنک دیکھ رہا تھا۔ شبن نے بھیجا ہے ؟"

" جی ہاں۔"

" کب لگ رہی ہے مجلس ؟"

" کل شام کی ہے۔"

" ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔ کتنے بجے ؟ وہی ساڑھے آٹھ نو کا ٹائم ہوگا اور کیا —— ہے نا ؟"

" ہاں ..."

" کہنا آٹھ تک ضرور پہنچ جاؤں گا۔ فکر نہ کریں ... ضرورت پڑی تو ہارمونیم بھی سنبھال لوں گا۔ ہاں۔ کہنا سارنگی ذرا کسوا لیں گے۔ کھونٹیاں ہر وقت ڈھیلی ہو جاتی ہیں ... کس ڈالو پھر ڈھیلی ..."

شاگرد کھڑا رہا تو استاد کو اپنی ضعیفی پر کوفت ہوئی۔ بیٹھنے کو نہ پوچھا۔

" بیٹھو بیٹھو میاں ! چائے پیو گے ؟"

" نہ ... نہیں۔" شاگرد دھیمے سے مسکرایا۔ " مجھے تو شبن میاں نے اس لئے بھیجا تھا کہ آپ سے کہہ دوں، کل آنے کی تکلیف نہ کریں۔"

جیسے چپ چاپ کہیں کھڑے ہوں اور کسی نے پیچھے سے گہری خندق میں دھکا دے دیا ہو۔ اسی گہری خندق سے آواز آئی۔ " کیا ... کیا کہا ہے شبن نے ... ؟"

" کہ ان کا سارنگی والا آ گیا ہے۔ آپ تکلیف نہ کریں۔ بڑھاپے میں تھک تھکا اکھڑ جائے گا ... آرام کی ضرورت ہے آپ کو ... اچھا آداب !"

چلا گیا شاگرد ... مسجد کے ٹیلوں کے پیچھے اتر رہا تھا۔ اوپر آسمان بے حد صاف تھا ...

OO

غزلیں

سید ضیاء الدین ضیا

تضادِ ظاہر و باطن کی حد ہے بوالعجبی
کہاں وہ تند کلامی کہاں یہ غنچہ لبی
سُنے گا کون وہاں شکوہ ہائے زیرلبی
جہاں گزارشِ احوال بھی ہے بے ادبی
جہادِ زیست میں آرام کی تلاش نہ کر
یہاں شکست کا اعلان ہے سکوں طلبی
وہ بادہ کش کہ نہیں جن میں جرأتِ بیباک
مقدر اُن کے لئے ہو چکی ہے تشنہ لبی
جلا کے خاک نہ کر دے نوائے شوق ضیا
یہ آگ ہی تو ہے ظالم دبی دبی نہ دبی

○ پیٹھا نگر ڈیرا کھنڈوہ (ایم پی)

نثار الماس

ذہن کی سطح سے اُترو تو کوئی بات بنے
دل کے آفاق میں پھیلو تو کوئی بات بنے
صبح تک نیند کی شہ رگ سے لہو بہتا ہے
شب کی تنہائی میں سوچو تو کوئی بات بنے
شیش محلوں میں بنے بیٹھے ہو پتھر کے صنم
شمع کی آنکھ سے پگھلو تو کوئی بات بنے
شہر کی بھیڑ میں تم خود کو کہاں پاؤ گے
اپنے اندر کہیں ڈھونڈو تو کوئی بات بنے
ورقِ گل کی ہتھیلی پہ ہے دہکی ہوئی آگ
یہ پہیلی کبھی بوجھو تو کوئی بات بنے

○ ۲۹۰ - وکیل احمد اسٹریٹ کورٹ وانمباڑی (تامل ناڈو)

شاہین بدر

وقت کا جھونکا شکستہ برگ سے اُلجھا بہت
میں حصارِ ذات سے نکلا تو گھبرایا بہت
اب تو یادوں کے اُفق پر کوئی تارہ بھی نہیں
تیرے پیمانِ وفا کا چاند گہنایا بہت
دیکھ کر میرے بدن پر کاغذی پوشاک کو
برق کوندی اور بادل ٹوٹ کر برسا بہت
شام سے تا صبح گزری کہکشاں کے درمیاں
پھر بھی شاہیں کی طرح مہتاب ہے تنہا بہت

○ معرفت سید یعقوب احمد ایڈوکیٹ محمد یوسف سرا، موتی بازار
شلعو - بمبئی ۔

حسن رضا

بلندیوں پہ نظر کو پیامبر نہ ملا،
مرے خیال کو رستے میں ہمسفر نہ ملا،
وہ جس کے واسطے میں دھوپ میں سلگتا رہا
اُسی شجر سے مجھے عمر بھر ثمر نہ ملا :
قدم قدم پہ مرے ساتھ ریگِ صحرا تھی
رہِ حیات میں سائے کو اک شجر نہ ملا
بھٹک رہی ہے دعا اپنا سر جھکانے کو
جبینِ شوق کو کوئی بھی سنگِ در نہ ملا
ہزار عیب کھلے اپنے خود پہ تھا لیکن
کسی کے عیب کے اظہار کا ہنر نہ ملا ۔

○ قاضی پورہ - کھنڈوہ (ایم پی)

طنزیہ

جُوتا

(ہندی)

شرد کمار ورما

ترجمہ: مُفیض الرحمٰن

۱-بی-۲۰۷ گوراچند روڈ - کلکتہ - ۱۴

[illegible] کہتے ہیں جب مور رقص کرتے کرتے اپنے پیروں کو دیکھتا ہے تو رونے لگتا [illegible] شروع میں آدمی بھی رویا ہوگا، لیکن چونکہ انسان اشرف المخلوقات ہے اِس لئے [illegible] نے موچی بنایا، جس کے لئے اُس نے جُوتا بنایا۔ اب سمجھ میں نہیں آتا کہ اُس آدمی [illegible] تعریف کی جائے جس نے موچی بنایا یا اُس موچی کی جس نے جُوتا ایجاد کیا۔ کہتے ہیں [illegible] سا خطرہ ہو تو تیسرا راستہ اختیار کرنا چاہیئے۔

[illegible] لیجئے صاحب! جُوتے کی تعریف کرتے ہیں، جُوتا وہ شئے ہے جسے پیروں [illegible] پہن کر چلتے ہیں اور بغل میں دبا کر بھاگتے ہیں۔

[illegible] جُوتا بغل میں دبا کر بھاگنے والے کو فوراً جُوتا چور نہ کہہ دیجئے۔ یہ دیکھئے کہ آس [illegible] کوئی مندر مسجد تو نہیں۔ عام چوری پُوجا کی طرح کہیں بھی اور کسی بھی وقت کی [illegible] ہے لیکن جُوتے خدا کے گھروں سے ہی چُرائے جاتے ہیں۔ کہتے ہیں [illegible] عام طور سے ننگے پیر یا گھِسے ہوئے جُوتے پہنے ہوتے ہیں۔ اِس لحاظ [illegible] بھگ ہر ہندوستانی جُوتے چور ہوا۔

[illegible] کسی کے چہرے پر لکھا نہیں ہوتا کہ وہ جُوتا چور ہے، اِس لئے اپنی پولس [illegible] کسی کو پکڑ پاتی ہے۔ ویسے اپنی زبان کا مزا بدلنے لئے رجسٹر سیاہ کرنے [illegible] سے کسی نہ کسی شریف کو پکڑ لیتی ہے۔ آخر پولس کا کام پکڑنا ہی تو ہے۔ [illegible] ہوشیاری سے یہ کام کرتی رہتی ہے۔ اب اگر چور ہاتھ نہ آئے تو پولس [illegible] چوروں کو خود ہی پولیس سے اتحاد کرنا چاہیئے۔ بھارت کی نئی پولس [illegible] کے مطابق چوروں کو حکم دیا جائے تاکہ وہ شرافت سے خود کو پولس [illegible] کریں ورنہ پولس پُرزور الفاظ میں پروٹسٹ کیا کرے گی۔

جس طرح ادیب [illegible] کا [illegible] دامن کا ساتھ ہے، ویسے ہی جُوتے اور [illegible] کا رشتہ [illegible] کے ساتھ دوسرا یاد آتا ہے۔ [illegible] جاتے [illegible] ملکوں میں کسی کو موچی [illegible] کہا جاتا ہے [illegible] بناتا ہے [illegible] جو [illegible] بناتا ہے [illegible]

[illegible]

بناتا ہے، اُس کے پاس گھر نہیں ہوتا۔

جُوتے کئی کام میں آتے ہیں۔ پہننے، سُنگھانے اور مارنے کے بشرطیکہ اگر اپنے ہوں۔ چُرانے، کھانے اور اُتارنے کے ـــ اگر پرائے ہوں۔ جُوتے اپنی مرضی سے مارے جاتے ہیں لیکن کھانے اوروں کی مرضی سے پڑتے ہیں یعنی پھل اور مٹھائی سے بالکل برعکس معاملہ ہے۔ مارنے والے زیادہ اور کھانے والا ایک ہوتا ہے۔

جُوتے بطور فیشن کے تو استعمال ہوتے ہی ہیں، کبھی کبھی بطور نسخہ کے بھی استعمال کئے جاتے ہیں۔ مرگی کے دورے اور عشق کا بھوت اُتارنے کیلئے فائدہ مند سمجھے جاتے ہیں۔ سیانے فرما گئے ہیں۔ غریب کو خدا عشق کے پھندے میں نہ ڈالے۔ اِس کے دو نقصان ہیں جوتے پڑتے ہیں اور نفقہ کھسکتے ہیں [illegible] کامیابی اِس کی وجہ سے ہوتی ہے یعنی عاشق کی جانب سے ہاں ہوتی ہے اور معشوق انکار پر قائم رہتا ہے اور اُس کے باپ اور بھائی جُوتے سے عزت کرنے پر اُتر آتے ہیں۔ پیروں کی چیز کو سر پر بٹھاتے ہیں یعنی سانپ رینگنے والے سانپ سینکنے لگتے ہیں۔ ایسے وقت میں اپنے بھی پرائے ہو جاتے ہیں۔ مطلب یہ کہ لوگ عاشق زار کے جُوتے اُٹھا کر جس کا جُوتا اُسی کا سر کو عملی جامہ پہنا دیتے ہیں اور بازار کا جو بھی بدمعاش ہوتا ہے ہندوستانی فلموں کی طرح اچانک تشریف بھی لے آتا ہے۔ اُس وقت بے چارا عاشق محسوس کرتا ہے کہ ہندو کیوں گئو کشی کے خلاف ہیں۔ نہ ہو بانس نہ بجے بانسری۔ مارنے والوں کو اعتراض ہوتا ہے کہ اُن کی بہن یا بیٹی سے عشق کیا جا رہا ہے اور مصیبت یہ ہے کہ اُنہیں چھوڑ کر کسی اور سے کیا بھی نہیں جا سکتا۔ بڑے کہتے ہیں فطرت کی ستم ظریفی۔ اِدھر عشق پیدا کیا اور اُدھر جُوتا۔

جُوتے جانور سے خریدے جاتے ہیں لیکن پڑتے بے بھاؤ ہیں۔ خریدنے والے جُوتا پہن کر دوکان کے سامنے اِس طرح چلتے ہیں جیسے مقابلۂ حسن میں حصہ لینے والی لڑکیاں ججوں کے سامنے سے گزرتی ہیں [illegible]

جوتا پہن کر چلتا ہے لیکن کبھی کبھی جوتا خود بھی چلنے لگتا ہے' ایسا اکثر قانون ساز اسمبلیوں میں ہوتا ہے۔ حالانکہ کسی پارٹی کے مینی فسٹو میں یہ پروگرام صحیح نہیں ہوتا۔

عورت ذات کو ہمیشہ اہمیت اور ترجیح دی جاتی ہے۔ اس لئے دال جوتوں کی بجائے جوتیوں میں بٹتی ہے۔ دوسرے سال کیوں نہیں بٹتے' یہ کسی باورچی سے پوچھئے۔

آدمی نہ صرف اپنے احباب سے جانا جاتا ہے بلکہ اپنے جوتے سے بھی پہچانا جاتا ہے۔ آپ جوتا دیکھ کر فوراً ہی بتا سکتے ہیں کہ آدمی شکاری ہے کہ بھکاری۔

زیادہ ذہین آدمی تو شکل دیکھے بغیر جان لیتے ہیں کہ پہننے والا مرد ہے یا عورت۔ جوتا گھسا ہو تو فوراً سمجھ لیجئے کہ آدمی یا تو بے کار ہے یا عاشق۔ اعلا درجے کے لوگ اپنے ملنے والوں کے چہرے نہیں' جوتے دیکھتے ہیں۔ بعض ایبل لڑکیاں جوتا دیکھ کر محبت کرتی ہیں۔ عورتوں کے معاملے میں جوتا غضب ڈھاتا ہے' ایڑی سے جسم کے زاویئے اور چال ڈھال بدل جاتی ہے' قد بڑھ جاتا ہے۔

بہت سے لوگ جوتے کے یار ہوتے ہیں' اپنا اپنا معیار ہے دوستی کا۔

کچھ جوتے چاٹنے کے عادی ہوتے ہیں' لیکن یہاں زبان اور جوتا دونوں تیار ہوتے ہیں۔ کئی کام صرف جوتے سے نکلتے ہیں' جیسے گھی ٹیڑھی انگلیوں سے نکلتا ہے۔ کہتے ہیں لڑکیاں کڑوی بیل کی طرح اور مرد ٹوٹے جوتے کی طرح بڑھتے ہیں۔ جوتوں کا ہار بھی بنتا ہے' مگر اس سیزن میں جب عوام اپنے لیڈروں کو اچھی طرح سمجھنے لگتے ہیں۔ کہتے ہیں شراب کی طرح جوتا بھی پرانا ہو کر ہی مزا دیتا ہے۔

پہلے خدا آدمی بنایا کرتا تھا اب نائی درزی اور موچی آدمی بناتے ہیں۔ وقت وقت کی بات ہے بدلتے دیر نہیں لگتی۔

"اردو کے شاعر جوتا پہنتے تھے کہ نہیں" اس پر تحقیق ہو رہی ہے۔ کچھ جوتا کمپنیوں کی جانب سے پانچ ہزار جوتے اس محقق کو دئے جائیں گے جو یہ ثابت کرے گا کہ شاعر جوتا پہنتے تھے۔ یہ ثابت کرنے کے بعد محقق حضرات جوتوں کی دوکان کھولیں گے کیا؟ (نہیں تو پانچ ہزار جوتوں کا کیا ہوگا)

سنا ہے اس درمیان اک محقق نے اعلان کر دیا ہے کہ اردو شاعروں کے قطب مینار چچا غالب جوتا نہیں پہنتے تھے۔ انہوں نے اپنی دلیل کے ثبوت میں غالب کا یہ شعر پیش کیا ہے۔

ان آبلوں سے پاؤں کے گھبرا گیا تھا میں
جی خوش ہوا ہے راہ کو پُر خار دیکھ کر

اسکی تشریح کرتے ہوئے ان حضرت نے بتایا ہے کہ اگر غالب جوتا شوز بھی پہننے کے عادی ہوتے تو پاؤں میں آبلے کیوں نہ پڑتے۔ دوسرا مصرع اسکی خاص دلیل ہے۔

جیسے لوپ سے ٹوپی' چھرا سے چھری اور ڈبا سے ڈبی بنتا ہے ویسے ہی جوتا سے جوتی ہوتی ہے۔ سنا ہے جوتا تنہائی سے تنگ آکر موچی کے پاس گیا اور عرض کیا۔

"تنگ آ چکے ہیں کشمکشِ زندگی سے ہم"

موچی اس کی شاعرانہ درخواست سے بہت متاثر ہوا اور فوراً جوتی سلائی کر دی' جیسے لوگ جھنجھلاتے پھرتے ہیں۔ عورت ملنے کے بعد جیسے مرد خدا کو بھول گیا' ویسے ہی جوتا موچی کو بھول گیا (ورنہ وہ غریب ننگے پاؤں نہ رہتا) جب جوتی آئی ہے جوتے بن ٹھن کر اس کے پیچھے بھاگے پھرتے ہیں۔ یقین نہ ہو تو لڑکیوں کے اسکول کالج اور تانگے کے پیچھے دیکھ لیجئے۔

تبھی تو گلی کوچوں میں جوتے کے گن گائے جاتے ہیں۔

جوتا ہے تو جہان ہے پیارے!

OO

بقیہ: نرسری صفحہ ۳۰

'آپ کے شہری سیاست داں کیسے ہیں؟'

'ان کے بغیر کیسے کام چل سکتا ہے؟ دیکھئے ہمارے شہر کے سیاست داں بڑے شفیق' مہربان اور خوبصورت داڑھیوں والے ہیں'

میں نے دیکھا ایک مکان کے باہر ایک چھوٹے سے باغیچے میں چند خوش پوش معمر لوگ' ہاتھوں میں منقش دل آویز چھڑیاں' پرجوش گفتگو میں مصروف ہیں۔

'آپ کی نرسری واقعی شاندار ہے' میں نے تعریفاً کہا۔

الطاف کی ٹیچر مسکرائی۔ اس کی قمیص میں لگا گلاب کا پھول بھی مسکرایا۔

میں نے الطاف کو پیار کیا اور ٹیچر سے رخصت ہوکر باہر آیا۔ سورج کی تیز کرنوں نے باہر میرا استقبال کیا۔ دھوپ کی تمازت سے پریشان ہوکر میں پیچھے ہٹا۔ نرسری کا دروازہ بند ہوچکا تھا۔

OO

من کی بات

شکر و سپاس

میری ریاست کی اُردو اکاڈمی نے میری حقیر خدمات کی طرف نگاہِ التفات و اعتراف ڈال کر نہ صرف مجھے عزت بخشی بلکہ پوری اُردو دنیا اور خصوصیت کے ساتھ میرے مخلص احباب کو بھی بے انتہا مسرور ہونے کا موقع دیا۔ میرے لئے سب سے زیادہ مسرت بخش علمی و ادبی شخصیتوں کے وہ احساسات ہیں جن کا اظہار مجھ ناچیز کے حق میں بے شمار خطوط میں کیا گیا ہے۔ مبارکباد کے خطوط اور تار اتنی بڑی تعداد میں آئے ہیں کہ میں فرداً فرداً سب کا شکریہ ادا نہیں کر سکتا اور ہر صاحب نامہ کے خلوص و اعتراف "شاعر" کے صفحات کی زینت بن سکتے ہیں۔ میں تمام عمر صلہ و ستائش سے بے نیاز رہا ہوں۔ اس موقع پر بعجلت "مجھدی" شاعر میں چند خطوط کی اشاعت کی اجازت دیتے ہوئے الزامِ خود ستائی کے خوف سے لرز رہا ہوں اور اس کے لئے اپنے ضمیر سے معافی خواہ بھی ہوں۔

"کس منہ سے شکر کیجئے اِس لطفِ خاص کا"

اعجاز صدیقی

ڈاکٹر گیان چند — جموں یونیورسٹی (جموں)

کل شاعر کا شمارہ ۔۔ ۲ ملا جس سے یہ مژدہ ملا کہ مہاراشٹر اُردو اکیڈمی نے آپ کی ۴۵ سالہ خدمات کے اعتراف پر آپ کو پانچ ہزار روپے کا ایوارڈ دیا ہے اکیڈمی نے بہت مناسب اقدام کیا۔ آپ کی عمر بھر کی خدمت کو یک بارگی نظر انداز کر کے "شاعر" کی اشاعت ہی کو سامنے رکھیں تو بھی اُردو کے ادب میں آپ کے [illegible] کو تسلیم کرنا ہوگا [illegible] کے بعد بر صغیر میں آپ سب سے [illegible] ہیں۔

خدا آپ کو [illegible]

صالحہ عابد حسین (جامعہ نگر۔ نئی دہلی)

کل ہماری ریاست کی طرف سے [illegible] کی خبر پڑھ کر بہت خوشی ہوئی۔ خدا مبارک کرے [illegible] ایک حقیر [illegible] کی خدمات کا [illegible] سچ یہ ہے کہ مبارکباد قبول کیجئے [illegible] کو دینی چاہئے جس نے یہ کام کیا۔

ڈاکٹر عطیہ نشاط (اللہ آباد)

"شاعر" [illegible] آپ کی [illegible] اکیڈمی نے آپ کی شعری [illegible]

ادبی خدمات کے صلہ میں آپ کو انعام سے نوازا ہے۔ میری طرف سے دلی مبارکباد قبول کیجئے۔

میں اکثر سوچا کرتی تھی کہ باوجود اپنی خرابیِ صحت کے جن تیز و تند ہواؤں کا سامنا کرتے ہوئے آپ نے "شاعر" کو جلائے رکھا، وہ واقعی قابلِ صد ستائش ہے۔ [illegible] افسوس ہوتا تھا کہ [illegible] [illegible] درخت کی مانند [illegible] مبارکباد دینا چاہتی تھی لیکن یہ سوچ کر خاموش رہ جاتی کہ چھوٹا منہ بڑی بات ہو جائیگی۔ مہاراشٹر اُردو اکیڈمی نے [illegible] کے لئے آپ کو مبارکباد دینے سے زیادہ [illegible] عزت حاصل ہوگی۔

ڈاکٹر [illegible] چشتی (جامعہ ملیہ اسلامیہ۔ نئی دہلی)

مہاراشٹر اُردو اکیڈمی نے آپ کی جلیل القدر علمی، شعری اور صحافتی خدمات کے اعتراف میں [illegible] ہے، اس کا عام طور پر زبردست خیر مقدم کیا جا رہا ہے [illegible] مبارکباد دیجئے [illegible] آپ کو مستحق طور پر انعام دینے کا اعلان کر کے [illegible]

اور شاعر کی کفالت کی طرف متوجہ ہوں گی۔

ڈاکٹر حامدی کاشمیری (سرینگر یونیورسٹی)

یہ جان کر دلی مسرت ہوئی کہ آپ کو مہاراشٹر اردو اکاڈمی نے آپکی گرانقدر ادبی خدمات کیلئے خصوصی ایوارڈ دینے کا اعلان کیا ہے۔ آپ نے یقیناً اپنی زندگی اردو زبان و ادب کی خدمت کے لئے وقف کر دی ہے خدا کا شکر ہے کہ کچھ لوگوں کو اس کا احساس ہو رہا ہے

ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید (ایس۔ وی یونیورسٹی تروپتی)

ہماری زبان کے ذریعہ یہ جان کر مسرت ہوئی کہ مہاراشٹر اردو اکیڈیمی نے آپکی ۴۵ سالہ طویل ادبی و صحافتی خدمات کے اعتراف میں پانچ ہزار کا خصوصی انعام دینا منظور کیا ہے۔ میری جانب سے دلی اور پُرخلوص مبارکباد قبول فرمائیے۔ آپکی شخصیت اور خدمت بلا شبہ اس طرح کے انعامات اور اعزازات سے بالاتر ہے۔ لیکن ایسے اعلانات اس امر کا ثبوت ہیں کہ سرکار اردو کے تعلق سے اب اپنی منفی پالیسی کو ترک کر رہی ہے اور اردو زبان و ادب اور اس کے فنکاروں کی خدمات کا اعتراف کیا جا رہا ہے۔

پروفیسر عبدالقوی دسنوی (سیفیہ کالج۔ بھوپال)

ابھی ابھی "ہماری زبان" سے معلوم ہوا کہ مہاراشٹر اردو اکیڈمی نے آپ کی ادبی خدمت پر پانچ ہزار روپیہ کی رقم دینے کا اعلان کیا ہے۔ بیحد خوشی ہوئی۔ امید کہ حکومت مہاراشٹر کی جلد اس طرف توجہ کرے گی۔ آپکی خدمات اس سے زیادہ کی مستحق ہیں۔

پروفیسر مبشر علی صدیقی (بریلی)

ہماری زبان کا تازہ شمارہ دیکھا اس سے معلوم ہوا کہ مہاراشٹر اردو اکاڈمی نے آپکو پانچ ہزار روپیہ کا خصوصی انعام دیا ہے بیحد مسرت ہوئی کہ آخر آپ کی خدمات کا اعتراف اتر پردیش اردو اکاڈمی نے نہ سہی مہاراشٹر اردو اکاڈمی نے تو کیا۔ میری جانب سے مبارکباد قبول فرمائیے۔

ڈاکٹر محمد علی زیدی (راجستھان یونیورسٹی جے پور)

ہماری زبان میں یہ خبر پڑھ کر انتہائی دلی مسرت ہوئی کہ مہاراشٹر اردو اکاڈمی [illegible]

نے آپکی ۴۵ سالہ طویل ادبی و صحافتی خدمات کے اعتراف میں پانچ ہزار روپے کا خصوصی انعام دینا منظور کیا ہے۔ میں آپ کو دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں آپکی طویل ادبی و صحافتی خدمات تاریخ ادب میں سُنہری حروف میں لکھے جانے کے لائق ہیں۔ میں دعا کرتا ہوں کہ خداوند عالم آپکو عمرِ خضر عطا فرمائے۔ مہاراشٹر اردو اکاڈمی کا یہ اعلان لائقِ ستائش ہے۔

پروفیسر علقمہ شبلی (کلکتہ)

مہاراشٹر اردو اکاڈمی کے خصوصی انعام کی اطلاع ملی تو آپ کو دو حرف لکھنے بیٹھ گیا۔ آپ تقریباً نصف صدی سے اردو ادب و صحافت کی جو خدمت کر رہے ہیں اور اردو کے کاز کو جس مجاہدانہ بے باکی سے پیش کرتے رہے ہیں، اُسے دیکھتے ہوئے آپ بجا طور پر اس کے مستحق ہیں۔ اور آپ کو یہ اعزاز دے کر اکاڈمی نے بے پناہ وقار بڑھایا ہے۔ دلی مبارکباد قبول فرمائیے۔

ابراہیم یوسف (بھوپال)

مہاراشٹر اردو اکاڈمی نے آپکی خدمات کا اعتراف کیا، اس سے دلی مسرت ہوئی مبارکباد قبول کیجئے۔

پروفیسر طیب انصاری (گلبرگہ)

"تازہ "ہماری زبان" میں یہ پڑھ کر بے حد خوشی ہوئی کہ مہاراشٹر اردو اکاڈیمی نے آپکی طویل ادبی خدمات کے پیش نظر مبلغ پانچ ہزار روپیہ کا انعام دینے کا اعلان کیا ہے۔ مجھے اس بات کی خوشی نہیں کہ آپ کو پانچ ہزار روپے مل رہے ہیں۔ آپکی خدمات کا اعتراف میرے لئے باعثِ طمانیت ہے۔

ابراہیم شفیق (حیدرآباد)

دوہری مبارکباد مہاراشٹر اردو اکاڈمی کی طرف سے آپکی ۴۵ سالہ طویل ادبی صحافتی خدمات کے اعتراف کے سلسلے میں ہے۔

ملک کی دوسری اکاڈمیوں کو بھی چاہئے کہ وہ آپکی ادبی اور صحافتی خدمات کے اعتراف میں آپکو ایوارڈ دیں۔

صابر البوہری (جے پور)

ہماری زبان کے تازہ شمارہ میں مہاراشٹر اردو اکاڈمی کی طرف سے آپکی ادبی

خدمات کے سلسلے میں عزت افزائی کی خبر پڑھ کر دلی کمال مسرت ہوئی۔ تہہ دل سے مبارکباد دیتا ہوں۔ حالانکہ میں سمجھتا ہوں کہ آپ اس سے کہیں زیادہ کے مستحق ہیں۔

حرمت الاکرام (مرزا پور)

آپکی پینتالیس سالہ ادبی و صحافتی خدمات کے اعتراف کے طور پر بہار اسٹیٹ اُردو اکاڈمی پانچ ہزار روپیے کا انعام دے رہی ہے جو نہایت مسرت بخش ہے۔ میری دلی مبارکباد قبول کیجئے۔

آپ کی بیش بہا خدمات کا حق اس قسم کے انعامات سے ادا کرنا ممکن نہیں۔ لیکن قدر شناسی کا یہ جذبہ بہر اعتبار قابلِ قدر ہے اور میری نظر میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔

نریندر بھاٹیا۔ (کالمپا۔ بنگال)

یہ چٹھی صرف آپکو مبارکباد دینے کے لئے لکھ رہا ہوں۔ از حد خوشی ہوئی کہ بہار اسٹیٹ اُردو اکاڈمی نے آپکو آپکی طویل خدمات کے صلے میں پانچ ہزار روپیے کا ایک خصوصی انعام دینے کا اعلان کیا ہے۔ یہ حوصلہ افزائی بالکل برموقع ہے۔ میں ہمیشہ اس بات کا قائل رہا ہوں کہ آپ نے جو اس زبان کی خدمت کی ہے اور اپنی زندگی اس زبان کے لئے وقف کر دی ہے اس کا پورا صلہ آپکو ملا نہیں۔

تنہا تماپوری (دگمبیٹ۔ کرناٹک)

۴۵ سالہ ادبی و صحافتی خدمات کے اعتراف میں صرف پانچ ہزار روپیے کا انعام!!؟ محترم شاعر نے جن خدمات کو اپنا خون پلا کر توانائی بخشی اُنکا انعام بس صرف پانچ ہزار روپیے۔ جو اس قدردانی پر آنسو بہا سکتا ہے' وہ مبارکباد کا حوصلہ کہاں سے لائے۔ ہماری قوم کے پاس حل کی تسلی کے لئے یہ اقوال بھی موجود ہیں۔" انعام تو لوٹا نہیں جا سکتا۔ لیجئے خوشی ہوگئی —!!

نصر قریشی (الہ آباد)

سب سے پہلے بہار اسٹیٹ اُردو اکاڈمی کی جانب سے ادبی خدمات کے صلے میں پانچ ہزار کا عطیہ ملنے پر میری دلی مبارکباد قبول فرمائیں۔ آپکی گرانقدر ادبی خدمات کو دیکھتے ہوئے یہ انعام کم ہے' مگر اس بات سے خوشی ہوتی ہے کہ بہار اسٹیٹ بے لوث خادمانِ ادب کو بھی نوازنے میں پیچھے نہیں ہے۔ یہ خبر ادبی حلقوں کے لئے مسرت بخش ہے۔ خدا سے دعا کی بہت تمنا ہے کہ ہر طرح شاعر اور معتبر شاعر جناب اعجاز صدیقی کو مزید اعزازات بخشے۔

شاعر۔ بمبئی

گنور سین (نئی دہلی)

آپکو بہار اسٹیٹ اُردو اکاڈمی کی جانب سے اُردو کی خدمات کے صلے میں دیئے جانے والے پانچ ہزار کے انعام کا پڑھ کر دلی مسرت ہوئی۔ اگرچہ یہ آپ جیسے مجاہد ادب و فن کے لئے بڑی نہیں۔ پھر اس وقت جبکہ آپ جیسی ہستی گوشۂ گمنامی میں ہے خلوص کے انسان خال خال ہیں۔ میری طرف سے مبارکباد قبول فرمائیں۔

ڈاکٹر احسن رضوی (جالندھر)

بہار اسٹیٹ اُردو اکاڈمی نے آپکی خدمات کو سراہتے ہوئے انعام سے نوازنے کا اعلان کیا ہے۔ میری طرف سے دلی مبارکباد قبول فرمایئے۔ خدا کرے بھارت سرکار بھی آپ کی گرانقدر خدمات کا اعتراف کرے۔

منوہر لال ہادی (نئی دہلی)

"ہماری زبان" کے تازہ شمارہ سے معلوم ہوا کہ بہار اسٹیٹ اردو اکاڈمی نے آپکو آپکی طویل ادبی خدمات کے اعتراف میں پانچ ہزار روپیے کا خصوصی انعام دینا منظور کیا ہے۔ میری جانب سے ہدیۂ تہنیت قبول فرمائیں۔

یوں تو نام انعام ہوتا ہے لیکن حق بات یہ ہے کہ یہ آپکی موقر اور بہادرانہ خدمات کے پیشِ نظر ناکافی ہے۔ مجھ ناچیز کے خیال میں آپ کم از کم پدم بھوشن کے خطاب اور پچیس ہزار نقد انعام کے حقدار ہیں۔ اتنا اعزاز تو آپ کی شاعری کے قومی یکجہتی کے فروغ میں ملنا چاہئے تھا لیکن شاید آپکے کتابت کلام کے نوگر نہیں ہیں۔ نہ جانے کیوں!

"ہماری زبان" کی یہ خبر پڑھ کر انتہائی مسرت ہوئی کہ دیر آید درست آید انصاف کی جھلک نظر آئی۔ خدا آپکی صحت اچھی رکھے اور آپکو اُردو زبان و ادب کی خدمت کے حوصلے سے نوازتا رہے۔

مہندر پرتاپ گدمی (پرتاب گڑھ)

آپکو انعام ملنے کی خبر پڑھکر انتہائی مسرت ہوئی۔ اُردو زبان کی جو خدمات آپنے انجام دی ہیں' اُنہیں مدِنظر رکھتے ہوئے یہ انعام بہت معمولی ہے — پھر بھی وہ ارباب نظر شکریہ کے مستحق ہیں جن کی حق شناسی نے آپ کا انتخاب کیا۔

ڈاکٹر فضیل امام رضوی (راجستھان یونیورسٹی۔ جے پور)

بہار اسٹیٹ اُردو اکاڈمی کے گرانقدر انعام پر مبارکباد قبول فرمایئے۔ آپ جیسے اُردو زبان و ادب کے بے لوث خادم کو ضرور نوازا جانا چاہئے تھا۔

بشر نواز (اورنگ آباد)

اُردو اکاڈمی کا یہ کام واقعی قابلِ ستائش ہے کہ آپ کی ادبی خدمات کا اعتراف کیا۔ انعام یا چیک کی رقم زیادہ اہمیت نہیں رکھتی۔ اہم بات یہ ہے کہ خدمات کا اعتراف کیا گیا۔

ابراھیم اختر (پربھنی)

ہمارا خیال ہے اُردو اکاڈمی کی طرف سے آپ کی ناقابلِ فراموش خدمات کے صلہ میں آپ کو انعام ملا ہے۔ دلی مبارکباد قبول فرمائیے۔

اختر بستوی (ڈگری کالج۔ بستی)

سب سے پہلے ہماری طرف سے اُردو اکاڈمی کی طرف سے خصوصی انعام ملنے پر مبارکباد قبول فرمائیے۔ اکاڈمی والوں کا یہ فیصلہ موزوں ترین ہے۔

ادبی ماہنامے اور اُردو اکاڈمیاں
گوشۂ صالحہ عابد حسین کی گونج

○ شاعر کا تازہ شمارہ (۶-۷) نگاہ سے گزرا۔ پیشِ نظر شمارے میں آپ کا اداریہ بروقت، درست اور پُر از فکر ہے۔ ادبی رسائل کی اہمیت اظہر من الشمس ہے لیکن ہمارے ملک میں کثرت اُن ادیبوں کی ہے جو مدت العمر تک اچھے ادبی رسائل خرید کر پڑھنے کی سعادت سے محروم رہتے ہیں۔ اِن میں بعض تو ایسے ہیں کہ جن کی تحریروں کی مقدار ہی اتنی نہیں ہو پاتی کہ کتابی صورت میں آسکے اور زیادہ وہ ہیں کہ جو صرف اپنی تخلیقات ادب کا ترجمان [illegible] اشاعت سے بے پرواہ ناشروں کی سنگدلی کا شکار ہوتے ہیں۔ یہ نامعقولیت اُسے [illegible] ہے کہ ادیب اپنے پیسے سے اپنی کتاب چھپوائے پھر اُس کی اشاعت کے لئے کاسۂ گدائی لے کر نکلے اور حالت مزدور کے مدیر جیسی ہو [illegible] بلکہ تمام تر [illegible] سرکاری [illegible] ادیب کی رگوں سے لہو نچوڑ کر ہی اپنے لئے بڑے بڑے لاکھوں والے مکانات اور قیمتی کاریں مہیا کرتے ہیں۔ ان حالات میں ادبی رسائل کا قائم رہنا ادب اور ادیب کے لئے نہ صرف ضروری بلکہ ناگزیر ہے۔ [illegible] اس جانب فوری توجہ کرنی چاہئے کہ ادب کے [illegible] رسائل کی بقا سے ایک بڑا کام اگر ممکن ہے تو ادیب کی بقا کا [illegible] نہیں۔

تازہ شمارے میں "گوشۂ صالحہ عابد حسین" نکال کر آپ نے ایک نہایت نیک اور ضروری کام انجام دیا ہے۔ گوشہ بہت اچھا ترتیب دیا ہے [illegible] محض اس گوشہ کو پڑھنے والا قاری صالحہ عابد حسین سے خاصا واقف ہو جائے گا۔ اس میں دو رائیں نہیں ہو سکتیں کہ صالحہ کو نقادوں نے بیجا طور پر نظر انداز کیا ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ صالحہ جینئس ہیں مگر ہر ایک ادیب جینئس نہیں ہو سکتا۔ جینئس تو ایک صدی میں زیادہ سے زیادہ دو تین ہی ہو سکتے ہیں کسی بھی ایک زبان کے ادب میں۔ باقی تمام ادیب تو [illegible] ہوتے ہیں۔ صالحہ نے اتنا لکھا ہے اور کئی انداز سے لکھا ہے کہ اُن کی ادبی قدر و قیمت متعین کرنے کے لئے مقالات لکھے جانے چاہئیں۔ اُن کا نوٹس نہ لینا ادبی دیانت کے خلاف ہے۔ آپ کا پیش کردہ گوشہ اس خلا کا کم از کم ایک گوشہ بھرتا ہے۔

CRITICAL EVALUATION

آپ کے گوشوں میں البتہ ایک کمی یہ کھٹکتی ہے کہ وہ [illegible] سے خالی ہو کر محض تعارفی یا توصیفی ہو جاتے ہیں۔ کم از کم ایک مضمون اس نوعیت کا ضرور ہونا چاہئے۔ وہ گوشے کھانے کا نمک بن جائے گا اور گوشے زیادہ قابلِ قبول ہوں گے۔ دوسرے شاعر جیسے اہم رسالے میں کتابت کی غلطیاں بہت گراں گزرتی ہیں۔ اِس خلاصہ میں اُن کی مقدار کافی ہے۔

ترقی اردو بورڈ۔ آر کے پورم ویسٹ بلاک نمبر ۸ نئی دہلی ۲۲ — **انوار رضوی**

○ شاعر کا تازہ شمارہ نمبر ۷-۶ سنہ ۱۹۷۶ء موصول ہوا۔ گوشۂ صالحہ عابد حسین پڑھا۔ پسند آیا۔ لیکن اس خطیہ میں "تجربات" کے متعلق کچھ عرض کرنا ہے۔ آپ تحریر کرتے ہیں کہ اس وقت ملک میں پانچ اُردو اکاڈمیاں بن رہی ہیں* [illegible] اُردو اکاڈمیاں ہیں [illegible] قیام کا ابھی نفاذ میں اعلان ہوا [illegible] اپنے بجٹ میں اُردو کے پانچ معیاری غیر سرکاری ماہناموں کے لئے کم از کم ایک ہزار روپے فی ماہنامہ مخصوص کر دیں تو اُن رسائل کی مالی پریشانیاں ایک حد تک دور ہو جائیں گی۔ آپ نے دو تجاویز بھی اس کے لئے دی ہیں اور دونوں قابلِ عمل ہیں۔ لیکن کیا اردو اکاڈمیاں اس کے لئے تیار ہو جائیں گی؟ یہ ایک سوالیہ نشان ہے۔ ان اکاڈمیوں پر سرخ فیتے کا دور دورہ ہے اور کوئی معقول طریقہ آسانی سے [illegible] کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتیں۔ مثلاً ایک اکاڈمی اپنی لائبریری کے لئے بجٹ میں معقول رقم مخصوص کر سکتی ہے۔ اُردو کے شعراء اور ادیبوں کی تصاویر کی نمائش کر سکتی ہے۔ چارٹ اور گراف بنوا سکتی ہے۔ تقاریر اور جلسے منعقد کرا سکتی ہے۔ لیکن اُردو میڈیم اسکولوں کو مالی امداد نہیں دے سکتی جو اُردو کی بقا

---

* یہ بات [illegible] تک محدود ہے۔ ابھی مدھیہ پردیش میں اُردو اکاڈمی قائم نہیں ہوئی ہے۔ مُدیر

کے لئے ہیڈروس کی شہری کا اہتمام کر رہے ہیں۔ ایسی اکاڈمی نے ابھی حال میں ایک نیا ایوارڈ بھی نافذ کیا ہے۔ کسی مصنف کو اگر کسی سال اکاڈمی نے اس کی تصنیف پر انعام دیا ہے تو وہ آئندہ دو سال تک اپنی کوئی تازہ تصنیف انعامی مقابلہ میں شامل نہیں کر سکتا۔ ان حالات میں آپ کی تجاویز ان اداروں کے لئے صدا بصحرا ثابت ہوں گی۔ میری تجویز تو یہ ہے کہ جیسا کہ اردو ماہناموں کو زندہ رکھنے کے لئے اردو دوست ایک ٹرسٹ قائم کریں جو ان رسائل کو مالی امداد دے اور ان کے آڑے وقت کام آئے۔ اکاڈمیاں شاید ہی یہ کام انجام دے سکیں۔

گلی وجے بخش محلہ سوتہ بریلی — مظفر علی صدیقی

○ "شاعر" کا تازہ شمارہ نظر نواز ہوا۔ گوشۂ صالحہ عابد حسین میں ڈاکٹر زرینہ ثانی کا مضمون اور حسان چشتی کا انٹرویو خوب ہے۔ غیاث اقبال نے بہت اہم موضوع پر جامع اور مبسوط مقالہ لکھا ہے۔ م۔ ق۔ خان کی کہانی کے علاوہ تلگو کہانی کا ترجمہ بھی پڑھا۔ اسی نوع کی کہانی "کبھی" سارنیکا میں پڑھی تھی۔ تنہا تماپوری اور رشید عبدالسمیع جلیل کی نظمیں بہت تاثراتی ہیں۔ شمس الرحمان فاروقی اور جون ایلیا کے مابین اقبال پر ہوئی گفتگو سے گراہ کن نتیجہ سامنے آتا ہے۔ نظریاتی کرتب جب دماغ کو جھنجھوڑنے لگیں تب ایسا ہی ہو سکتا ہے۔ ظہیر غازی پوری اب غزلیں گھیٹ کر نہیں بلکہ اُبھر کر کہنے لگے ہیں۔ ایک دو کے علاوہ تمام اشعار ہلکے پھلکے ہیں۔ میں ان سے خوش مند اور فکر کی تخلیق کی توقع رکھتا ہوں۔ شمارہ ہذا میں مندرجہ ذیل شعرا کے یہ اشعار خصوصاً پسند آئے۔

چہرے کے چہرے کو سمجھنا مشکل ہے
مشکل اسلوب ہو گئے ہیں میاں — (ظہیر غازی پوری)

فکر کی جنبش پیہم جو نہ گلدستے
یہ اضافے گئے ہیں نئی صدی کے لئے — (رتن لال مکی سجالی)

صرف سانسوں کے گنہگار ہیں ہم
کچھ نہ کرنا ہے نہ پانا دیکھو — (داعی قریشی)

آؤ کلمات کے ساحل پہ کبھی بیٹھ کے
ہم صداقت کو ترستے ہیں بھر کے
میں صبح ہی سا تھا نہ آئینہ کوئی لب
جب سناٹا سسکیوں کی صداؤں میں ڈھل گیا — (شکیلہ بکانیہ)

بہار کرانفیلڈ کمپاؤنڈ۔ عمر ودیبا — صداقت گیاوی
ضلع بستی

○ "شاعر" کے تازہ شمارہ میں غیاث اقبال کا مقالہ "کرشن چندر اور نسوانی کردار" پڑھ کر قلبی سکون ملا۔ غیاث صاحب نے جس ہوشمندی سے کرشن چندر کے افسانوں، ناولوں میں نسوانی کرداروں پر روشنی ڈالی ہے وہ قابل داد ہے۔

مونگیاں پالک۔ کرشن نگر غلی مدہ — چندر دیپ اُجالا

○ گوشۂ صالحہ عابد حسین بہت خوب ہے، خاص کر ڈاکٹر حسان چشتی کا انٹرویو دلچسپ اور معلوماتی ہے۔ کرشن چندر کے نسوانی کرداروں پر غیاث اقبال کا مقالہ کافی عرق ریزی کے بعد سپرد قلم کیا گیا ہے۔ آپ نے عصری اردو ادب نمبر کا اعلان کر کے وقت کی ایک اہم ضرورت کو پورا کرنے کی کوشش کی ہے۔ خدا کرے آپ کے حق میں اس کار عظیم کی انجام دہی میں آپ کی معاون ہو۔ (آمین)

اورنگ آباد ڈویژن۔ پرتاپ گڑھ — تہذیب پرتاپ گڑھی

○ "شاعر" کا شمارہ ۷ - ۸ پیش نظر ہے۔ آپ نے آخر کا اضافہ کر کے "شاعر" کے ہر نمبر کو خصوصی نمبر بنا دیا ہے جس کی تقلید اب دوسرے جرائد بھی کرنے لگے ہیں۔ آپ کا یہ اقدام اردو ادبیات و صحافت میں ایک سنگ میل ہے۔

ٹیلیفون ایکسچینج کے پاس۔ اسلام آباد ٹاؤن — ڈاکٹر ستارہ اجمل ستاری

○ تازہ "شاعر" باصرہ نواز ہوا۔ گوشۂ صالحہ عابد حسین مختصر ہونے کے باوجود موصوفہ کے فن اور شخصیت سے متعلق بھرپور مواد فراہم کرتا ہے۔ نکہت فاروقی اور حلقۂ تخلیق کے شعرا میں آج کے بیشتر نقادوں اور ادیبوں کو مبتلا کرتی وابستہ نظر انداز کرتے ہیں۔ صالحہ عابد حسین سے لئے گئے انٹرویو سے بھی اس بات کی تصدیق ہوتی ہے۔

تنہا تماپوری کی نظم "خون اور خواب" کے مصرعے "فیصلہ فیصلہ ہے، عقیدہ عقیدہ ہے" میں لفظ "فیصلہ" بمعنی "زندگی" استعمال ہوا ہے۔ حالانکہ لفظ "نظریہ" یا "نظریت" بمعنی "منتقلی" زیادہ بہتر ہوتا۔ بیس سالہ شعری مشق کے باوجود اس قسم کی فاش غلطی سے شاعر کی الفاظ ناشناسی کا ثبوت ملتا ہے۔

حصہ نثر میں احمد قریشی اور احسان شام بہت خوب ہیں۔ نثر میں میرا مضمون اور حسان چشتی کا انٹرویو بھی ہیں۔

بیکر ۱۰ - ۹ کمرہ بلڈ - جگر گوہ — علیم احمد

شمارہ ۔۔۔ رفتہ رفتہ "شاعر" باقاعدہ اشاعت کی سمت میں مضبوط ہے۔ رہا مخزونِ مواد ۔۔۔ تو وہ "شاعر" کا مقسوم ہونا ہی ہے ۔۔۔ اس کا کیا کہنا ۔۔۔ پروفیسر غیاث اقبال کا مقالہ "کرشن چندر در نسوانی کردار" بالکل سرسری اور سطحی ہے۔ اُم ہانی اشرف کا ڈیو اور کیڈی یقیناً ایک محققانہ مقالہ ہے حالانکہ انداز کا بصیرت افروز اور دعوت غور و فکر دیتا ہے۔ دانتے کا محی الدین ابن عربی سے قریب ہونا یا متاثر ہونا منطقی اور تاریخی طور پر امرِ مسلّمہ ہے۔ لیکن لگتا ہے ڈاکٹر تارا چرن رستوگی کو اس میں شبہ ہے جیسا کہ "اقبال اور دانتے" (شاعر، شمارہ ۔۔۔) میں سرسری طور پر انہوں نے اشارہ کیا ہے ۔۔۔ آذر صاحب کا "۔۔۔" خاصا متاثر کن ہے۔ قلم میں درد کی چنگاریاں پھوٹی ہیں ۔۔۔ افسانوی حصے ابھی نہیں دیکھ سکا ہوں ۔۔۔ "گوشہ" بھی خالی ہے ۔۔۔ ویسے گوشہ مجھے اچھا نہیں لگتا ۔۔۔ حالانکہ میں خود گوشہ نشین ہوں ۔۔۔

منظومات سبھی اوسط درجہ کی ہیں۔ پریم کی غزل سرِفہرست ہے۔ باقی ظہیر غازی کا پورا ہے۔ شاہد پرویز، ڈی کمار، احسان شام کی غزلیں اچھی ہیں اور اچھا تاثر پیش کرتی ہیں ۔۔۔ آنے والے "ہم عصر اردو ادب نمبر" کی جو ایک جھلک دکھائی ہے اور جو مندرجات دئے ہیں انہیں سے اس کے گرانقدر دستاویز ہونے کا اندازہ لگ جاتا ہے۔ خدا کرے جلد ہی دیکھنے کو ملے۔

اکسں بلا "تجرمات" میں اُردو اکیڈمیوں کو اچھی راہ سجھائی ہے اور بہتر تجاویز پیش کی ہیں۔ اگر ان پر عمل درآمد کیا گیا تو میں کہتا ہوں کہ یہ اُردو کی بحالی میں سب سے بڑی خدمت ہوگی۔

نظمی صدیقی سلونوی
۴۰۰/۱۸ چندنا، بارہ بنکی

○ تازہ شمارہ پڑھ چکا ہوں۔ ڈاکٹر عنوان چشتی کا انٹرویو بطورِ خاص پسند آیا۔ یہ ملاقات محترمہ صالحہ عابد حسین کو سمجھنے میں کارآمد ثابت ہوگی جو انٹرویو کا مختصر ہونے کے باوجود شخصیت کی بڑی خوبصورت تصویر پیش کرتا ہے۔ کبیر احمد جائسی کا مضمون بھی خوب ہے۔ محترمہ کی ادبی کاوشیں ہمارے نقادوں کی بے توجہی کا شکار ہوتی رہیں۔ آپ نے اس گوشہ کے ذریعہ اُن کی مناسب قدرشناسی کے لئے راہ ہموار کر دی ہے۔ "شاعر" کے یہ "گوشے" بھولے بسروں کو نئی زندگی عطا کر رہے ہیں۔ اگلے گوشہ کے لئے حسن الدین احمد کا انتخاب اس بات کا ثبوت ہے کہ ہماری گروپ بندیاں شاعر بھی

جن گوشوں سے نظریں چرائی رہی ہیں آپ اُن گوشوں کو نمایاں کرتے چلے جاتے ہیں اور اس طرح علم و فن کو آگے بڑھانے میں آپ کی کاوشیں ناقابلِ فراموش کارناموں کا روپ اختیار کر رہی ہیں۔ معیاری ادبی ماہناموں کی زندگی کے لئے ریاستی اُردو اکاڈمیوں سے آپ کی اپیل دشمنوں کو بھی یہ سوچنے پر مجبور کرے گی کہ کاش اُردو ادب کی بقا کے لئے صرف "شاعر" کے "اداریوں" ہی پر عمل کیا جائے تو یہ زبان کبھی نہیں مٹ سکتی۔

تنہا تماپوری
رقم پیٹ دگلبرگہ)

○ زیرِ نظر شمارہ میں گوشۂ صالحہ عابد حسین بہت پسند آیا۔ علی الخصوص زرینہ ثانی (پی ایچ ڈی) کا مقالہ عنوانِ "ابھی ڈوڑنگ ۔۔۔" تھا اور انٹرویو (عنوان چشتی، پی ایچ ڈی) بھی دلچسپ ہے۔ OF AN ARTIST

خبر اُردو۔ گورنمنٹ ٹی۔ ایم کالج۔ گڈیاتم (تامل ناڈو) **غیاث اقبال**

○ "شاعر" کا تازہ شمارہ نظر نواز ہوا۔ گوشۂ صالحہ عابد حسین بہت جاندار ہے۔ انٹرویو میں کھل کر صالحہ صاحبہ کے خیالات سامنے آتے ہیں۔ اُن کی کہانیاں بھی خوب ہیں۔ ابھی سے "ہم عصر اردو ادب نمبر" کا منتظر ہوں۔ اعلان اور ترتیب دیکھ کر آتشِ شوق بھڑک اُٹھی ہے۔

مشتاق احمد نوری
دارالشین۔ رمنہ روڈ، پٹنہ ۱۲

○ "شاعر" کا تازہ شمارہ نظر نواز ہوا۔ گوشۂ صالحہ عابد حسین خوب ہے۔ واقعی یہ سلسلہ جاری ہے برگزیدہ فنکاروں کو حقیقی ستائش سے نواز رہا ہے۔ مجھے تو انتظار ہے کہ "گوشۂ اعجاز صدیقی" منظرِ عام پر آئے۔

حالیہ شمارہ میں جناب ظہیر غازی پوری کی غزل "صبحِ ادب" لکھنؤ کے سالنامہ میں شائع ہو چکی ہے۔

ایم۔ ایم۔ وفا
معرفت ناظم بھارتی۔ نازنین چوک۔ بتیا (بہار)

○ زیرِ نظر شمارہ میں گوشۂ صالحہ عابد حسین خاصے کی چیز ہے۔ ڈاکٹر زرینہ ثانی اور غیاث اقبال صاحب کے مقالے بہت پسند آئے۔ کہانیوں میں "یہ چوتھا ۔۔۔ تھا" اور "ماڈل" قابلِ داد ہیں۔ غزلوں میں جناب پرویز، ظفر بدایونی اور احسان شام کی غزلیں دل کی گہرائیوں کو چھو گئیں۔

حفیظ کیفی
فلیٹ نمبر ۹۔ بیوا مالمر بلڈنگ۔ پاٹ نمبر ۴۴
سانتا کروز بمبئی ۵۵

○ تازہ "شاعر" موصول ہوا۔ گوشۂ صالحہ عابد حسین سے متعلق مقالہ جات پسند آئے۔ غلام ربانی صاحب کا مضمون "بُجھا نہ سکے" بہت دلچسپ

اور معلومات افزا ہے۔ منظومات میں خاص طور پر جناب پریم وار برٹنی کی غزل بہت ہی پسند آئی۔ موصوف کے یہ اشعار قابلِ صد داد و تحسین ہیں۔

غبارِ غم سے حریمِ سحر تک، کوئی بھید سمجھا نہ شہرِ ہوس کا
گناہوں کے تاریک پردے میں ہر شب، برہنہ اُٹھے کتنے پیکر شبیہ
یہ کیسی پُر اسرار اندھی گپھا ہے، زمانہ ہے چپ زندگی بے صدا ہے
وہیں چاندنی آبلہ پا کھڑی ہے جہاں گھر سے زخموں کے ہے جو شعلہ

پوری غزل ماشاء اللہ خوب ہے۔ جناب رونق دکنی، راہی قریشی، ظہیر غازیپوری، احسان شاہ فکری بدایونی اور رونق گیاوی وغیرہ کی غزلیات بھی پسند آئیں۔

محلہ قاضی۔ کوریخ (جالون)　　　　**شاہ کوکب القادری**

○ "شاعر" کا تازہ شمارہ نظر نواز ہوا۔ گوشۂ صالحہ عابد حسین میں مضامین اور اُن کے افسانے خوب ہیں۔ عنوان صاحب کی ملاقات اہم اور دلچسپ ہے۔ ڈاکٹر محمد احسن فاروقی کے ایک جملہ کی وجہ سے ڈاکٹر نعیمہ ثانی کا یہ کہنا کہ "مرد تنقید نگار عموماً خواتین قلم کاروں کے ساتھ انصاف نہیں کرتے" کچھ اچھا نہیں لگا۔ فاروقی صاحب نے جہاں صالحہ عابد حسین کے فن کے بارے میں کچھ کہنے سے پرہیز کیا ہے وہاں کئی دوسرے ناول نگاروں کا بھی ذکر نہیں کیا ہے۔ لیکن ایسا نہیں کہ انھوں نے خواتین کے ساتھ ناانصافی کی ہو۔ عصمت چغتائی اور قرۃ العین حیدر کا تفصیلی ذکر ہوا اسی تصنیف میں ہے۔ ڈاکٹر زرینہ صاحبہ کا یہ جملہ کہ "اُن کا دل نہیں بڑھاتے" خاموش رہنے کے لئے کہتا ہے ورنہ خود ڈاکٹر صاحبہ نے اپنے مضمون کے آغاز میں دیئے گئے خواتین کے ناموں میں کئی اہم ناول نگاروں کے نام نہیں لئے ہیں۔ اور نہ ہی اُنھوں نے "عذرا" کے علاوہ دوسرے ناولوں کا تفصیلی جائزہ پیش کیا ہے ــــــ ریاستی اُردو اکاڈمیوں نے اُردو کے علمی و ادبی ماہناموں کی امداد کے لئے غالباً پہلے بھی آپ نے "شاعر" میں لکھا تھا۔ یہ کام ہم سب اُردو والوں کا ہے کہ اس امداد کو دلانے کی کوشش کریں۔ میرا خیال ہے کتب خانوں کو مالی امداد دینے سے زیادہ ضرورت رسائل کو ہے کیونکہ رسالوں کا تعلق صرف قارئین ہی سے نہیں بلکہ ادبا و شعراء سے بھی ہے۔ اُمید ہے اکاڈمیوں کو اس پر سنجیدگی سے غور کرنا چاہئے ــــــ ہمارا خضر اُردو اکاڈمی کا خصوصی ایوارڈ مبارک ہو۔

شعبۂ اردو۔ مسلم یونیورسٹی علیگڑھ　　　　**ابنِ کنول**

○ "شاعر" کا نیا شمارہ موصول ہوا۔ گوشۂ صالحہ عابد حسین بہت خوب ہے آپ نے یہ سلسلہ بہت اچھا جاری کیا ہے۔

محترم [illegible] بتالی صاحب کا مضمون "بنگال نے جنگ" معلومات سے بھرپور ہے۔

شاہد۔ بمبئی

اسلامی سکوں کے سلسلے میں موصوف نے لکھا ہے "اسلام میں انسان جاندار کی شکل بنانا حرام ہے چنانچہ مسلمانوں کے سکوں پر ایک طرف کلام مجید کی آیت اور دوسری طرف بادشاہ کا نام اور سنہ ہوتا تھا" "عجب اتفاق ہے کہ پہلا اسلامی سکہ ہی اس قید سے بَری ہے جو کہ عبد الملک بن مروان کے عہد میں جاری ہوا تھا۔ اس سے قبل اموی سلطنت میں بازنطینی سکے رائج تھے جو کہ دینِ مسیحی کی تبلیغ کا منصوبہ پیش کرتے تھے۔ عبد الملک بن مروان ہی کے عہد میں طلائی دینار بھی ڈھالے گئے جو کہ قاہرہ کے تحفِ اسلامی میں موجود ہیں۔ یہ طلائی دینار عبد الملک کی شبیہ سے مزین ہیں۔"

محترم حسن واصف عثمانی نے اپنے مضمون "دینار و درہم کی خاموش گویائی" میں اس کا اعتراف کیا ہے۔ یہ مضمون اکتوبر ۱۹۷۳ء میں قومی آواز میں چھپا تھا۔ تاریخ اشاعت یاد نہیں ہے۔ موصوف کے الفاظ یہ ہیں "عبد الملک بن مروان کے طلائی دینار پر ایک سمت کلمۂ شہادت ہے اور دوسری سمت خود اُس کا چہرہ ہے اور یہ اس الزام کی تصدیق ہے کہ تاریخ کی سب سے بڑی مسلم مملکت پر حکمرانی کرنے والے اموی خلفاء کو اسلامی شریعت کی پابندی کا کچھ زیادہ خیال نہ تھا۔"

بی ۶۶۔ بیشن پاڑہ۔ تلک نگر۔ جے پور　　　　**روشن اختر کاظمی**

بقیہ: رفتار صفحہ ۴

[illegible] اُن کی قابلِ ذکر تصانیف ہیں۔

[illegible] ۳۰ ستمبر ۸۰ء کو حیدرآباد کی ایک دوسری ممتاز شخصیت [illegible] ہوا۔ "شاعر" کے پچھلے شمارے [illegible] مرحوم [illegible] ایک مضمون [illegible] تھا۔ [illegible] عثمانی [illegible] سال کی [illegible] پہلے اورنگ آباد اور پھر مستقلاً حیدرآباد [illegible] تھے۔ [illegible] سال تک اُنھوں نے [illegible] کے ساتھ کام کیا [illegible] میں نہیں [illegible] ایک [illegible] دکن کے [illegible] پر اُن کے کئی مضامین شائع ہوئے۔ اُنھوں نے [illegible] کی تدوین میں حصہ لیا [illegible] گلزار [illegible] وغیرہ وغیرہ [illegible] اُن کے [illegible] تعداد [illegible] ہے۔

نقد و نظر

(تبصرے کے لیے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

○ فکر پیما
○ عصمت جاوید
○ قیمت ـــــ بارہ روپے
○ ملنے کا پتا: مکتبہ جامعہ، اُردو بازار دہلی ۶۔ کارنر جے جے ہاسپٹل بمبئی

لسانیات یا علم زبان کوئی نئی چیز نہیں ہے بلکہ جب سے انسان اِس دنیا میں آیا ہے اِس مسئلہ پر مسلسل سوچتا اور اپنے نتائج فکر کو قلمبند کرتا رہا ہے۔ لیکن بیسویں صدی کے ابتدا سے اس علم میں خصوصیت کے ساتھ دلچسپی لی جانے لگی اور اِسے باقاعدہ ایک سائنس کی شکل دے کر دنیا بھر میں اس کو مقبول بنا دیا گیا اور آج لسانیات کے مختلف پہلوؤں پر ہر زبان میں کچھ نہ کچھ لکھا جا رہا ہے۔ اِس ذیل میں اُردو زبان بھی پیچھے نہیں رہی ہے۔ اِس نے وقت کے تقاضوں کا ساتھ دیا ہے۔ اور ہر نئے علم کو آگے بڑھ کر سینے سے لگایا ہے۔ چنانچہ ادھر کچھ سالوں سے لسانیات کے مختلف موضوعات پر اُردو میں بھی کچھ نہ کچھ لکھا جا رہا ہے۔ جو لوگ اِن موضوعات پر لکھتے رہتے ہیں اُن میں عصمت جاوید بھی شامل ہیں۔ "فکر پیما" اُن کے تقریباً اسی قسم کے مضامین کا مجموعہ ہے۔

عصمت جاوید نے "فکر پیما" کے مضامین کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے (الف) زبان (ب) شعر و ادب (ج) تنقید۔ خود مصنف کی اپنی وضاحت کے مطابق "زبان کے تحت جتنے مضامین شامل کیے گئے ہیں اُن کا تعلق لسانیات سے ہے۔ شعر و ادب میں چند اہم نظریاتی بحثیں ہیں۔ تنقید کے زیر عنوان غالب اور اقبال کو خراجِ عقیدت پیش کیا گیا ہے۔"

بالخصوص جو حصہ میں "اُردو صوتیات کے ذیلی مسئلے"، "ہیں لسانی انتشار کا سبب قطع الوقت نظریہ"، "وضع اصطلاحات کی چند اصولی اصطلاحیں"، "اُردو کے دو حروف ظاہر ہونے والے"، "تخیل سے ملفوظ تک" اور "لفظ و معنی کا رشتہ اور ابلاغ" عنوانات سے جو مضامین شامل ہیں اُن کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ زبان و ادب کے متعلق اُن کا مطالعہ کافی وسیع ہے۔ ساتھ ہی قدیم اور جدید مغربی قسم کی لسانیات پر وہ نہ صرف اچھی نظر رکھتے ہیں، بلکہ اُن کے مختلف پہلوؤں پر پورے اعتماد اور شعور سے بحث اور باریکیوں سے بحث بھی کر سکتے ہیں۔ تقریباً یہی کچھ حال اُن کے دو (۲) مضامین "غالب کی عملی سوجھ بوجھ اُن کے نہاں خانے میں" اور "حسرت کا تغزل غزل کے آئینے میں" کا ہے۔ یہ دونوں مضمون شعر فہمی کی باریکیوں پر اُن کی وسعت نظر کو ظاہر کرتے ہیں۔

عصمت جاوید کو زبان و ادب کا ذوق ورثہ میں ملا ہے، اور وہ اپنی زندگی کے مختلف ادوار میں اُس وقت کی اکثر علمی، ادبی اور لسانی تحریکوں میں عملاً حصہ لیتے رہے ہیں۔ اُن کا مطالعہ وسیع اور اُن کا تجربہ گہرا ہے۔ وہ قدماء ادبی اور لسانی تفکر سے ناتا نہیں رکھتے بلکہ دوسروں کے ادبی و لسانی افکار کی پیمائش بھی خوبی سے کرتے ہیں۔ اُن کا ذہن بے لاگ اور سوچنے کا طرز فکر منفرد ہے۔ اور اس بات میں ذرا بھی مبالغہ نہیں ہے کہ اگر ادب و لسانیات کے طلبہ درسی کتابیں پڑھنے کے ساتھ ساتھ ان مضامین کا بھی مطالعہ کریں تو زیر مطالعہ موضوعات کے کچھ نئے پہلو اُن کے سامنے آجائیں گے اور غور و فکر کی نئی راہیں کھلیں گی۔

(حامد اللہ ندوی)

○ قدیم ادبی تنقید
○ ڈاکٹر وہاب اشرفی
○ قیمت چار روپے
○ تعلیمی مرکز خواجہ کلاں پٹنہ ـ ۴

زبان و ادب کی طرح ادبی تنقید کا فن بھی بہت قدیم ہے اور اسے باقاعدہ ایک فن کے طور پر سب سے پہلے یونانی مفکروں نے فروغ دیا۔ دیگر علوم و فنون کی طرح اِس سلسلہ میں بھی افلاطون اور ارسطو کا نام سرفہرست ہے۔ بعد کے آنے والے مفکرین نے اُن کے نقشِ قدم پر چل کر اُن کے پیش کیے ہوئے افکار و نظریات کو اپنی اپنی فکری استطاعت کے مطابق آگے بڑھانے کی کوشش کی۔

قدیم تنقید پر مغربی زبانوں میں کافی مواد ملتا ہے لیکن اُردو میں افلاطون اور ارسطو کے نظریات تک کے مطالعے کی کتابیں نہیں تھیں۔ خوشی کی بات ہے کہ ڈاکٹر وہاب اشرفی نے اِس کو اپنا ایک مستقل موضوع بنا لیا اور اپنی کوششوں کا حاصل "قدیم ادبی تنقید" کے نام سے ہمارے سامنے پیش کر دیا ہے۔

"قدیم ادبی تنقید" میں پانچ قدیم مغربی نقادوں کی تنقید کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ یہ نقاد ہیں: افلاطون، ارسطو، [illegible]

اور لانجائنس۔ یہ طلاؤ گوڑن شیلین کو چھوڑ کر کہ جو اسپین کا رہنے والا تھا، سارے کے سارے یونان و روم سے تعلق رکھتے تھے۔ فاضل مصنف نے شعر و ادب پر اُن میں سے ہر ایک کے افکار و نظریات پر روشنی ڈالنے سے پہلے قاری کی معلومات کے لئے اُن کے حالاتِ زندگی بھی مختصراً دیئے ہیں۔ اس کے بعد اُن کے افکار و نظریات پر فاضل مصنف کا اُن کا اپنا ہلکا پھلکا تبصرہ ہے۔ تعارف، جائزہ اور تبصرہ تینوں سلیقے سے ایک خاص ترتیب کے تحت اس انداز سے مرتب کئے گئے ہیں کہ قاری کا ذہن آسانی کے ساتھ اُن کی باریکیوں کو سمجھ لیتا ہے۔

ابتدا میں کلیم الدین احمد کا پیشِ لفظ ہے اور آخر میں کتابیات۔ پیش لفظ میں کلیم الدین احمد نے ارسطو کے ادبی نظریات پر دلچسپ انداز میں بحث کرنے کے بعد فاضل مصنف کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے لکھا ہے:

"ارسطو سے تو لوگ واقف ہیں لیکن دوسرے قدیم مغربی نقادوں سے واقفیت عام نہیں۔ قدیم ادبی تنقید میں ارسطو کے علاوہ چار نقاد اور بھی ہیں۔ افلاطون، ہورس، کوئن ٹیلین، لونجائنس۔ اس طرح اس کتاب میں پانچ مشہور قدیم مغربی نقادوں کو پیش کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر وہاب اشرفی نے ان کی تنقیدوں کا بغور مطالعہ کیا ہے اور اُن کا خلاصہ ایسی صاف ستھری زبان میں پیش کر دیا ہے کہ ساری باتیں اور اُن میں کچھ دشوار باتیں بھی آسانی سے ذہن نشین ہو جاتی ہیں۔"

(حامد اللہ ندوی)

○ **خورشید**
○ ڈاکٹر مسیح الزماں (مرتب)
○ قیمت ۵ روپئے
○ کتاب نگر، دین دیال روڈ، لکھنؤ

"خورشید" ایدل جی جمشید جی کھوری کا لکھا ہوا ایک گجراتی ناٹک ہے جس کو ۱۸۷۱ء میں ہیرا جی فردون جی مرزبان نے وکٹوریہ ناٹک منڈلی کے لئے ہندوستانی زبان میں منتقل کیا تھا۔ یہ اُردو تھیٹر کا پہلا دستیاب ڈراما ہے جو گجراتی رسم خط میں ہونے کی وجہ سے ایک مدت تک اُردو ادب کے محققین کی نظروں سے اوجھل تھا۔ ڈاکٹر مسیح الزماں نے اس کو پہلی بار اُردو رسم خط میں منتقل کر کے ہمارے سامنے پیش کیا ہے۔

خورشید کے متن سے پہلے فاضل مرتب کا لکھا ہوا بارہ صفحات کا شامل ہے

ایک مقدمہ ہے جس میں انہوں نے اُردو ڈرامے کے ابتدائی نقوش دکھانے اور اُردو تھیٹر کے آغاز و ارتقا سے مختصر بحث کرنے کے بعد بتایا ہے کہ خورشید کو اُردو تھیٹر کی دنیا میں ایک اہم قدم کیوں سمجھا گیا اور اس کو اس قدر شہرت و مقبولیت کیوں حاصل ہوئی اور ساتھ ہی انہوں نے اس کے پلاٹ، اس کے کردار، اس کی زبان اور اس کے مکالموں کا ادبی و فنی نقطۂ نظر سے جائزہ لے کر اُردو ڈراموں میں اس کا درجہ متعین کرنے کی بھی کوشش کی ہے۔

ڈاکٹر مسیح الزماں اب اس دنیا میں نہیں رہے۔ لیکن وہ ایک شفیق استاذ، ایک کہنہ مشق ادیب اور ایک بے لاگ ناقد تھے۔ انہوں نے شعر و سخن اور تاریخ و تنقید کی تاریک راہوں میں وقتاً فوقتاً متعدد دیئے جلائے۔ خورشید اس سلسلے کی آخری کڑی ہے جو ہمیں یاد دلاتی ہے۔

"خوشش در خشید و لے شعلۂ مستعجل بود"

امید ہے کہ اُردو زبان و ادب کی تاریخ اور اُردو ڈرامے کے آغاز و ارتقا سے دلچسپی رکھنے والے احباب اس کی قدر کریں گے۔ (حامد اللہ ندوی)

○ **بھوجپوری ادب کا تعارف**
○ ڈاکٹر افضل امام
○ قیمت۔ چار روپئے
○ پتا۔ ۱۷، لیڈر روڈ، الہ آباد

جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، یہ کتاب بھوجپوری ادب کی مختصر سی تاریخ ہے جو ڈاکٹر افضل امام کی ادبی کاوش کے نتیجے میں ہمارے سامنے آئی ہے۔ اس میں حسبِ ذیل سرخیوں کے تحت بھوجپوری ادب کی تاریخ کا جائزہ لیا گیا ہے۔ بھوجپوری زبان، بھوجپوری کا علاقہ، بھوجپوری شاعری، بھوجپوری شاعری کا دورِ جدید، بھوجپوری نثر، بھوجپوری کے دیگر اصنافِ سخن۔

اس کتاب کا پیش لفظ خود مصنف کا لکھا ہوا ہے۔ اس میں انہوں نے اب تک بھوجپوری کے پردۂ گمنامی میں پڑے رہنے کی وجہ پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے "... برج بھاشا کو سور داس جیسا فنکار اور تلسی جیسا کوی ملا، اودھی کو ملک محمد جائسی اور کبیر داس جیسا شاعر ملا، [illegible] کو میرا بائی جیسی نعمت حاصل ہوئی، لیکن بھوجپوری کو کوئی ایسا فنکار نہیں ملا جو اس کی عظمت میں چار چاند لگا دیتا [illegible]

اس بات کا اعتراف ہے کہ بھوجپوری کو بھی کبیر جیسا شاعر ملا، لیکن چونکہ کبیر کی وسعتِ نظر کسی ایک زبان تک محدود نہیں تھی لہٰذا اُن کی زبان کو خالص بھوجپوری نہیں کہا جا سکتا۔"

کتاب مختصر ہے مگر موضوع کے اعتبار سے اہم ہے۔ مصنف نے تاریخی حقائق کو پیش کرتے وقت اس میں کسی بے جا طوالت سے کام نہیں لیا ہے بلکہ صرف ضروری معلومات ایک خاص منطقی ترتیب اور اختصار کے ساتھ سلیقے سے پیش کر دی ہیں اور اکثر شعرا و اُدبا کے حالاتِ زندگی کے ساتھ اُن کی تخلیق کا نمونہ دے کر اس کی افادیت کو بڑھا دیا ہے۔ قاری اسے پڑھ کر آسانی سے پتہ چلا سکتا ہے کہ بھوجپوری کا پچھلا اور موجودہ ادبی سرمایہ کیا ہے، اس کے علاقے کون سے ہیں اور یہ اپنی دوسری علاقائی زبانوں سے کن باتوں میں مختلف ہے۔

آج ملکوں اور قوموں کی طرح ترقی یافتہ زبانوں کی بالادستی کا بھی زمانہ نہیں رہا۔ چھوٹی چھوٹی بولیاں بھی کسی نہ کسی رسمِ خط کا لبادہ اوڑھ کر اپنا وجود اور اپنی اہمیت منوانے کی فکر میں ہیں۔ ایسے میں اگر بھوجپوری کے بولنے والے بھی اس کے اپنے ایک مستقل وجود کو منوانا چاہتے ہیں تو اس کا اُنہیں پورا پورا حق ہے۔ ڈاکٹر فضیل امام داد کے مستحق ہیں کہ اُنہوں نے اس زبان کی تاریخ لکھنے میں پہل کی اور اُردو والوں کو اس سے مستفیض ہونے کا موقع دیا۔ اُمید ہے کہ ان کی یہ کوشش قدر کی نگاہ سے دیکھی جائیگی۔

(حامد اللہ ندوی)

○ تم کون ہو؟ (ناول)

○ آمنہ ابوالحسن

○ ۱۲۷ صفحات۔ قیمت چھ روپے

○ ملنے کا پتا: نیشنل بک ڈپو۔ مچھلی کمان۔ حیدر آباد

نعیم ایک پڑھا لکھا انقلابی جماعت سے وابستہ نوجوان ہے جس کے ذہن میں ایک آئیڈیل لڑکی کا تصور بسا ہوا ہے۔ انیسہ اس آئیڈیل سے ملتی جلتی دولت مند لڑکی ہے۔ دونوں کی شادی ہو جاتی ہے لیکن انیسہ اُس کی خواہش کے قالب میں نہ ڈھل سکی۔ نتیجے میں نفسیاتی تصادم اور کشمکش شروع ہو جاتی ہے۔ اس سے گریز نعیم کو انیسہ کی چھوٹی بہن رابعہ کی طرف مائل کر دیتا ہے۔ لیکن بیل منڈھے چڑھنے سے پہلے ہی رابعہ کی شادی کر دی جاتی ہے۔ نعیم بھی انقلابی سرگرمیوں کی پاداش میں جیل چلا جاتا ہے۔ انیسہ کے دولت مند باپ کے رسوخ سے رہائی پانے کے بعد انیسہ کے گھر پلنے والی عائشہ پر ڈورے ڈالتا ہے۔ عائشہ ہاتھ نہیں آتی۔ انیسہ کے ماں باپ چل بستے ہیں اور انیسہ عائشہ کے ہاتھ پیلے کر دیتی ہے۔ نعیم جو ایک کالج میں ملازمت اختیار کر چکا ہے، ثروت اور دوسری کئی لڑکیوں سے جنسی تعلق قائم کر لیتا ہے۔ "وہ نظریات کے لحاظ سے اب تک سوشلسٹ تھا مگر جنسی بحران اور ہیجان کا شکار ہو کر سمجھوتوں کا بھی عادی ہو چکا تھا۔" انیسہ بھی سوشیل لائف کی ماری اپنی شامیں باہر بِتانے لگتی ہے۔ آہستہ آہستہ دونوں معاشی طور پر تباہ ہو کر ایک دوسرے کا سہارا لینے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

آمنہ ابوالحسن ایک کامیاب افسانہ و ناول نگار ہیں۔ اُن کی تحریر میں روانی اور تاثر کی کمی نہیں۔ وہ ایک ہی مرتبہ گھن نہیں لگاتیں۔ آہستہ آہستہ شدت کو بڑھاتی جاتی ہیں۔ ناولٹ میں بات کو بہت ہی ایجاز کے ساتھ بیان کرنا ہوتا ہے۔ مصنفہ نے اس کا خیال رکھا ہے اور پلاٹ کو بڑی تیزی کے ساتھ آگے بڑھایا ہے۔ خصوصاً نعیم کے کردار کو جس سُرعت کے ساتھ تکمیل تک پہنچایا ہے وہ اُن کے فنکارانہ چابکدستی کی دلیل ہے۔ البتہ انیسہ کا کردار قدرے جامد ہو گیا ہے۔ پھر مزے کی بات یہ ہے کہ مصنفہ ناولٹ کے آخری حصّے میں انیسہ پر بھی توجہ مرکوز کر دیتی ہے جس سے نعیم کا کردار زیادہ نمایاں نہیں ہو پاتا۔ دونوں پرچھائیوں کی طرح زندگی گزارتے نظر آتے ہیں۔

آمنہ ابوالحسن نے یہ کرداری ناولٹ لکھا ہے اور بڑی کاوش کے ساتھ نفسیاتی مطالعہ پیش کیا ہے۔ تحریر کی روانی میں البتہ زبان اور مشاہدے کی چھوٹی موٹی لغزشیں رہ گئی ہیں، جنھیں نظرِ ثانی میں دور کیا جا سکتا تھا۔ اس تبصرہ نگار کو مصنفہ کی یہ ادا خاص طور سے پسند آئی کہ وہ ہندی الفاظ کے ساتھ فارسی عربی تراکیب کو روا رکھتی ہیں اور قابلِ قبول زبان لکھتی ہیں۔ البتہ اس سلسلے میں جذباتیت سے پرہیز کرنے کا مشورہ کوئی دے تو اُنھیں قبول کر لینا چاہیئے۔ ناول "تم کون ہو" دلچسپ اصلاحی مطالعہ ناولوں میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ ناول کی طباعت کافی ناقص ہے۔ (یونس اگاسکر)

○ ادب اور صحافت

○ عابد صدیقی

○ پتا: نیرنگ اکیڈمی حیدرآباد

○ قیمت: تین روپے پچاس پیسے

ادب اور صحافت عابد صدیقی کے مضامین کا مجموعہ ہے اس میں آٹھ ادبی مضامین

پرمشتمل ہے۔

عنوان ہیں: اقبال اور بجنوری بھی‘ اُردو نثر میں قلب کے خطوط کی اہمیت‘ ہندوستانی تہذیب اور امیر خسرو‘ اُردو نثر کا ایک شاہکار۔ سب رس‘ نکڑ و ناول نذیر احمد سے پریم چند تک‘ ادب اور صحافت‘ سرسید اُردو کے صحیفہ نگار ادیب‘ فیچر نگاری‘ مصنف کی وضاحت کے مطابق ادب اور صحافت کے موضوعات پر اُن کے مضامین کا یہ مجموعہ ادبی میدان میں اُن کی اوّلین کوشش ہے‘ اور اپنا ایک مقصد ایک پیغام رکھتی ہے۔

جیسا کہ عنوانات سے ظاہر ہے‘ اس میں دو قسم کے مضامین ہیں ایک وہ جو ادبی نوعیت کے ہیں اور دوسرے جن کا تعلق صحافت سے ہے‘ چونکہ فاضل مضمون نگار تاریخ کے لیکچرر بھی ہیں اور رہنمائے دکن کے سب ایڈیٹر بھی‘ اس لئے انہیں ادب اور صحافت دونوں کا عملی تجربہ ہے اور اُن کی یہ خواہش ہے کہ مغرب کی طرح یہاں بھی ادب اور صحافت ایک دوسرے کے دوش بدوش چلیں اور ادب سے صحافت کو اور صحافت سے ادب کو طاقت ملے۔ اس مجموعے کے سارے مضامین اُن کے اس تجربے اور خواہش کی پیداوار ہیں اور مختصر ہونے کے باوجود کافی دلچسپ‘ معلوماتی اور اہم ہیں۔

ابتدا میں ڈاکٹر غلام عمر خاں کا تعارفی پیش لفظ ہے پھر چند باتیں کے عنوان سے خود مقالہ نگار نے اپنے مضامین کا پس منظر بیان کیا ہے اور آخر میں "عابد صدیقی" کے نام سے دو صفحات میں اُن کے حالاتِ زندگی بھی دیئے ہیں۔ یہ سب مقالہ نگار کی ادبی شخصیت کو سمجھنے میں ہماری مدد کرسکتے ہیں بحیثیت مجموعی یہ ایک مفید اور کارآمد کتاب ہے۔ اور ان طلبہ کے لئے کہ جو ادب اور صحافت کے میدان میں داخل ہونے کی خواہش رکھتے ہیں‘ مشعلِ راہ بھی‘ اُمید ہے کہ ادبی حلقوں میں پسند کی جائے گی۔

(حامد اللہ ندوی)

رفتار

علمی، ادبی اور تہذیبی خبریں

رُوسی ادب پر ڈاکٹر ظ. انصاری کی کتابوں کا اجراء

۲۰ اگست ۱۹۷۸ء کو جواہر لال نہرو یونیورسٹی دہلی میں ڈاکٹر ظ. انصاری کی دو کتابوں "چیخوف" اور "پُشکن" کی رسم اجراء عمل میں آئی۔ جلسے کی صدارت کرنل بشیر حسین زیدی نے فرمائی اور اجراء پروفیسر محمد مجیب کے مبارک ہاتھوں سے ہوا۔ اس موقع پر اُردو، ہندی اور رُوسی ادبیات کے پروفیسر، ماہرین اور اہل قلم موجود تھے۔ پروفیسر مجیب ایک سال کی طویل علالت کے بعد کسی جلسے میں شریک ہوئے۔ انہوں نے ظ. انصاری کو داد دیتے ہوئے کہا کہ پچاس سال پہلے انہوں نے رُوسی ادب کی دو جلدیں شائع کی تھیں۔ اُسی کام کو مصنف نے اور زیادہ خوبی سے آگے بڑھایا ہے۔

کرنل زیدی نے اپنی تقریر میں فرمایا کہ ہندوستان بھر میں کسی ایک شخص نے آج تک رُوسی ادب پر اتنا زیادہ کام پیش نہیں کیا جتنا ظ. انصاری نے کیا ہے۔

دوسرے مقررین میں ڈاکٹر محمد حسن صدر شعبۂ اُردو جواہر لال نہرو یونیورسٹی، پروفیسر وی. چلیا اور رُوسی کونسل اوینگ سوزیوف نے بھی ڈاکٹر ظ. انصاری کی علمی خدمات کا جائزہ لیا۔ موخر الذکر نے کہا کہ پُشکن جو رُوس کا قومی شاعر ہے ظ. انصاری کے منظوم تراجم میں ہندوستانی لباس میں ظاہر ہوا ہے اور یہ مشرقی زبانوں میں سب سے پہلے اُردو میں آیا ہے اس لئے ہم اُردو کو بھی مبارکباد دیتے ہیں۔ ظ. انصاری کی تیسری کتاب دنیا کے عظیم ناول نگار دستوئیفسکی پر لکھی گئی ہے جو اُس دن پریس سے چھپ کر نہ آسکی تھی۔

دہلی میں انڈو پاک سیمینار کی تجویز

نئی دہلی۔ ۱۹ اکتوبر کو غالب اکیڈمی (بستی حضرت نظام الدین اولیاء) میں خواجہ حسن نظامی میموریل سوسائٹی کی گورننگ کاؤنسل کا ایک جلسہ جناب حکیم عبدالحمید صاحب کی صدارت میں ہوا۔ جس میں طے کیا گیا کہ حضرت خواجہ حسن نظامی کے سالانہ عُرس (دسمبر ۱۹۷۸ء) کے موقع پر اُن کی علمی و ادبی خدمات کے سلسلے میں ایک انڈو پاک سیمینار منعقد کیا جائے۔

خواجہ حسن نظامی پانچسو کے قریب چھوٹی بڑی کتابوں کے مصنف تھے۔ خود وہ ... سے ... کی ایک ... جو ... ہندی زبان میں قرآن پاک کا ... شائع کرنے کا فخر بھی خواجہ صاحب ہی کو حاصل تھا۔

خواجہ صاحب کی کئی کتابوں کے تراجم دوسری ہندوستانی زبانوں میں ہو چکے ہیں۔ انڈو پاک کی کئی یونیورسٹیوں میں خواجہ حسن نظامی کی زندگی اور اُن کی تصانیف پر تحقیقی کام ہو رہا ہے۔

ڈاکٹر حامدی کاشمیری کی "نایافت" کی رسم اجراء

۲۰ اگست ۱۹۷۸ء کو انجمن ترقی اُردو کشمیر کے زیر اہتمام کلچرل اکادمی کے ہال میں ڈاکٹر حامدی کاشمیری کے مجموعۂ کلام "نایافت" کی رسم اجراء عمل میں آئی۔ اس تقریب کی صدارت ممبر پارلیمنٹ جناب شمیم احمد شمیم نے کی۔ انہوں نے صدارتی تقریر میں کہا کہ حامدی کاشمیری ایک ممتاز و معتبر نقاد اور شاعر ہیں جن کے افکار و اشعار نے اُردو دنیا میں وقار و اعتبار رکھتے ہیں۔ انہوں نے اپنی مُدلل اور پُر جوش تقریر میں حامدی کاشمیری کی شخصیت اور شاعری کے بعض دلچسپ گوشوں پر روشنی ڈالی اور کہا کہ وہ جدید اُردو ادب میں ایک اہم آواز بن کر اُبھر رہے ہیں۔ اُن کی کتاب "نئی حسیت اور اُردو شاعری" معاصر تنقید میں اضافے کی حیثیت رکھتی ہے۔

مظہر امام، رحمان راہی اور ڈاکٹر شکیل الرحمٰن نے بھی تقریریں کیں اور سب نے حامدی کاشمیری کی خصوصیات اور اُن کی انفرادیت کو سراہا۔ جلسے کے آخر میں شمیم اور کیلاش مہرو نے حامدی کاشمیری کی غزلیں سازوں کے ساتھ پیش کیں۔

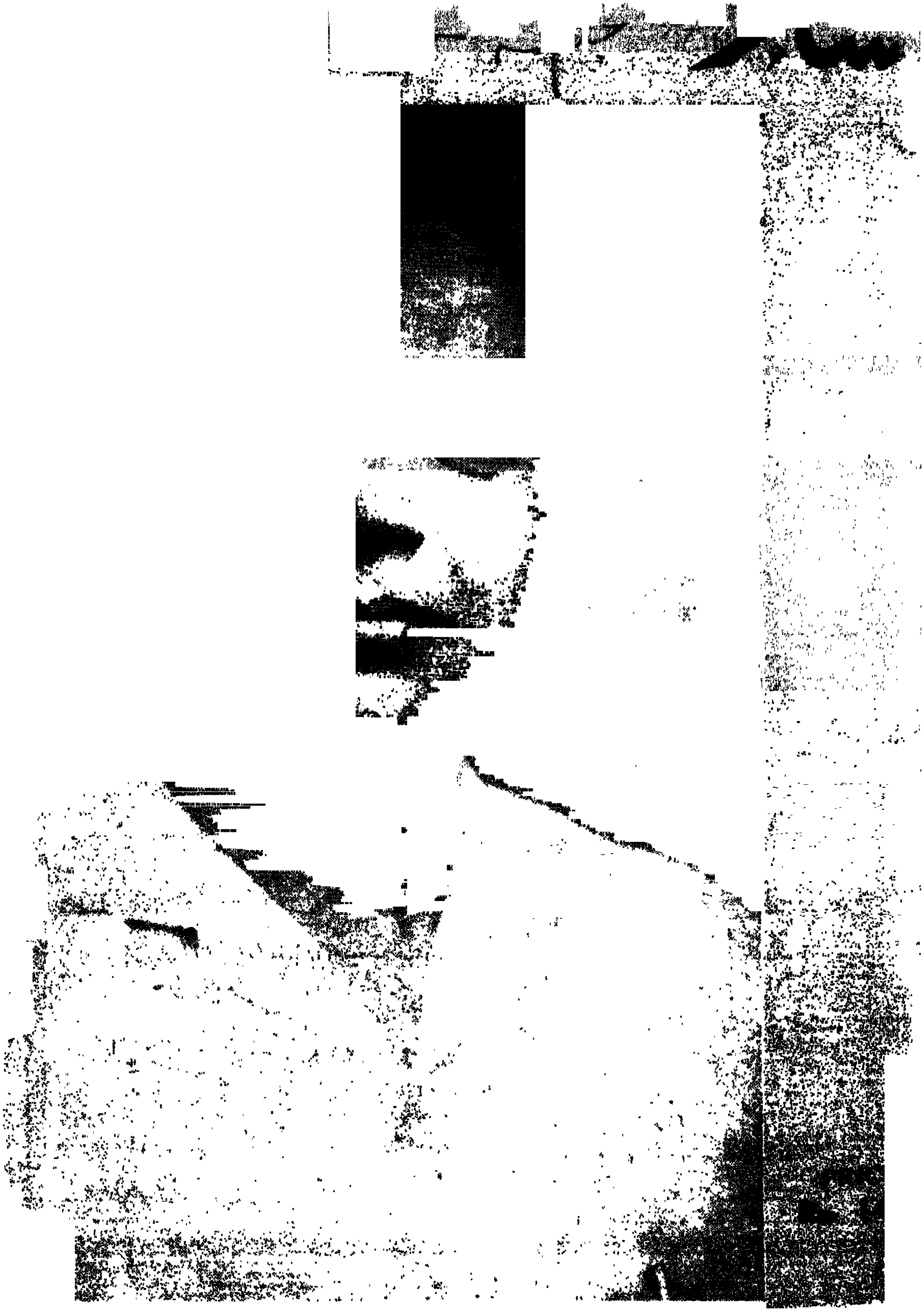
وفیات

بہت دیر سے یہ اطلاع موصول ہوئی کہ اکبر آباد کی نامور شخصیت سید محمود محمود اکبر آبادی کا ۱۷ اپریل کو خیر پور (پاکستان) میں انتقال ہو گیا۔ محمود اکبر آبادی مرحوم کا اولین کارنامہ اُن کی کتاب "زودِ نظیر" ہے۔ پاکستان میں انہوں نے "قاموس الفصاحت" مرتب کی۔ یہ قدیم محاورات اور کہاوتوں کی لسانی اہمیت اور ان کی تشریح و توضیح پر ایک اہم کتاب ہے۔ مرحوم کی تیسری کتاب "نظیر نامہ" ہے۔ اُن کے کئی مضامین بھی رسائل میں شائع ہوئے۔ پیشے کے اعتبار سے تو محمود اکبر آبادی وکیل تھے لیکن علم و ادب و تنقید و تحقیق سے انہیں گہری دلچسپی تھی۔

اگست کو حیدر آباد میں پروفیسر سید محمد کا ۸۰ سال کی عمر میں انتقال ہو گیا۔ وہ حیدر آباد کی عثمانیہ یونیورسٹی ... اور علمی و ادبی شخصیت تھے مرحوم عثمانیہ یونیورسٹی میں اُردو کے ریڈر رہے۔ ادارۂ ادبیاتِ اُردو کے ڈائریکٹر بھی رہے۔ ڈاکٹر زور اور عبدالقادر سروری کے ساتھیوں میں سے تھے۔ علمی و ادبی تنظیموں اور اداروں میں ان کی حیثیت نمایاں تھی۔

... اُردو ... شعرائے ... کی ... تھے ... یادگار ہے ... حیدرآباد ...

... نے ... سے ... ڈاکٹر ... میں چھپوا کر دفتر ... سے شائع کیا۔



جاری شدہ سنہ ۱۹۳۰ء
بانی علامہ سیماب اکبر آبادی (مرحوم)
اردو کا سینتالیسؔ سالہ علمی ادبی اور تہذیبی ماہنامہ

شاعر بمبئی

مدیر اعلیٰ
اعجاز صدیقی
مدیر معاون:- یونس اگاسکر

مہتمم
ناظر نعمان صدیقی

جلد ۔ ۴۷ | فون نمبر ۳۵۹۹۰۴ | شمارہ ۔ ۱۰

بدلِ اشتراک

زرِ سالانہ — ۱۶ — روپئے
معاونین سے — ۵۰ — روپئے
تاعمر خریداری — ۲۵۰ — روپئے
ممالکِ غیر سے — ۳۰ — شلنگ

ترسیل زر کا پتا

ماہنامہ "شاعر" قصر الادب۔ بمبئی ۴۰۰۰۰۸
خط و کتابت کا پتا
ماہنامہ "شاعر" مکتبہ قصر الادب
پوسٹ بکس نمبر ۴۵۲۶ بمبئی ۴۰۰۰۰۸

ترتیب

جرعات

گوشۂ ڈاکٹر سید حامد حسین

مقالات

نظمیں

کہانیاں

غزلیں

تصویرِ سرورق: ڈاکٹر سید حامد حسین

اُردو ادبی ماہناموں کی بدقسمتی

۱۰ اور ۱۱ نومبر ۱۹۷۶ء کو لکھنؤ میں اُردو اکاڈمیوں کی کُل ہند کانفرنس کا دو روزہ اجلاس خیر و خوبی کے ساتھ ختم ہوا۔ صدر جمہوریۂ ہند عالیجناب فخرالدین علی احمد نے کانفرنس کا افتتاح فرمایا اور اپنی افتتاحی تقریر میں اُردو کی تعمیر و ترقی کے سلسلے میں اپنے قیمتی خیالات سے نوازا۔ اُتر پردیش کے وزیرِ اعلیٰ نرائن دت تیواری نے اپنی مہمان نوازی اور اُردو زبان کی سرپرستی کا پُرجوش مظاہرہ فرمایا۔ اُتر پردیش میں تیواری وزارت کے دوران اُردو کے فروغ کے لئے مزید نمایاں اقدامات کئے گئے ہیں۔ وزیرِ اعلیٰ اُتر پردیش نے اُردو اکاڈمی کی گرانٹ دس لاکھ روپئے سالانہ تک بڑھا دی اور اپنی تقریر میں ایک خصوصی فنڈ قائم کرنے کا بھی اعلان کیا جس کا نام "فخرالدین علی احمد فنڈ" ہوگا اور اس کے لئے حکومت اُتر پردیش پانچ لاکھ روپئے کا عطیہ پہلی قسط کے طور پر دیگی۔ یہ رقم سرمایہ کے طور پر جمع رہے گی اور اس کی آمدنی سے مصنفین کی کتابوں کی اشاعت میں مدد دی جایا کرے گی۔

اُردو اکاڈمیوں کی اس دو روزہ کانفرنس میں نہایت اہم تجاویز پیش اور منظور کی گئیں۔

اس کانفرنس کے انعقاد سے چند ماہ پہلے اُردو کے خالص ادبی ماہناموں کی سالانہ امداد کی بات اُٹھائی گئی تھی۔ اس سلسلے میں ادبی ماہناموں (بشمول شاعر) نے اداریئے لکھے تھے۔ ادبی ماہناموں کی اقتصادی بدحالی، اور اُن کی اہمیت و ضرورت کی طرف اُردو اکاڈمیوں کو توجہ دلائی تھی۔ ان کے بعض سربراہوں کو خطوط لکھے گئے۔ اُردو حلقوں کی طرف سے بھی بہت سے خطوط ریاستی اکاڈمیوں کے صدور کو بھیجے گئے اور بڑی اُمید تھی کہ اکاڈمیوں کی سالانہ کانفرنس میں اُردو زبان کے فروغ کی دوسری باتوں پر غور و خوض کے ساتھ ساتھ چند گِنے چُنے معیاری ادبی ماہناموں کو زندہ رکھنے اور اُن کو بہتر بنانے کی طرف بھی دھیان دیا جائے گا۔ مگر بڑے دُکھ اور افسوس کے ساتھ یہ بات سُنی گئی کہ اُردو کے ادبی ماہناموں کے مسئلہ پر الگ سے کوئی غور نہیں کیا گیا۔

اُردو رسائل کی امداد کا مسئلہ ایجنڈے میں موجود تھا۔ اس پر معمولی سی بحث کے بعد اسے اخبارات و رسائل کا مشترکہ مسئلہ بنا کر حکومت کے اشتہارات اور آفسیٹ مشینوں کی قیمتوں میں کمی وغیرہ سے جوڑ دیا گیا۔ کتنے تعجب کی بات ہے کہ ادبی ماہنامے جو زبان اور شعر و ادب کے لئے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتے ہیں اور جن کے بغیر ادب کا فروغ ممکن نہیں، جن کی اہمیت کتابوں کی اشاعت سے کہیں زیادہ ہے، اُن کی طرف سے کانفرنس میں چشم پوشی کی گئی۔ اس موقع پر اُن ادیبوں اور شاعروں کی عدم توجہی اور بھی زیادہ قابلِ افسوس بھی جاسکتی ہے جو مختلف اکاڈمیوں کے رکن کی حیثیت سے اس کانفرنس کی کارروائیوں میں شریک تھے۔

ترقی اُردو بورڈ ہو یا ریاستی اُردو اکاڈمیاں ہوں، ان کے لئے سرمایہ کی کمی نہیں ہے۔ یہ لاکھوں روپے کے سرمائے میں کھیل رہی ہیں اور ان کے سرمایہ کا بڑا حصہ کتابوں پر انعامات یا اُن کی اشاعت پر صرف ہوتا ہے۔ کیا سب اکاڈمیاں مل کر اُردو کے معیاری ادبی ماہناموں کے لئے لاکھ دو لاکھ سالانہ کا ایک فنڈ مخصوص نہیں کرسکتی ہیں؟——

کاش ادبی ماہناموں کے مسئلہ پر حقیقت پسندانہ اور ہمدردانہ نظر ڈالی جاتی۔

اُردو اکاڈمیوں کی سالانہ کانفرنس تو ہو چکی، مگر اُن کی رابطہ کمیٹی سے ہم اب بھی یہ درخواست کریں گے کہ اُردو کے خالص علمی و ادبی ماہناموں کی سالانہ امداد و اعانت کے مسئلہ کو پھر سے ریاستی اکاڈمیوں کے سامنے لایا جائے اور انھیں کسی مثبت اجتماعی اقدام کے لئے مجبور کیا جائے۔ کیا اُردو کے ترقیاتی منصوبوں میں ادبی ماہناموں کی اعانت کو شامل نہیں کیا جاسکتا؟ پُرانے مشہور اور معتبر ادبی ماہناموں کی زبوں حالی ترقی اُردو بورڈ، اُردو اکاڈمیوں اور انجمن ترقی اُردو (ہند) ہی کے لئے نہیں بلکہ پُورے ملک کے لئے انتہائی شرمناک بات ہے۔ جس زبان میں خوبصورت اور معیاری ادبی ماہنامے نہ ہوں، اُس کا مستقبل معلوم۔۔!

۲۲ نومبر ۱۹۷۶ء

شاعر ۔۔

ایک تاثر

فرمان یہ ہے، اُردو کو آسان بناؤ*
ہندی کو بھی کاش ایسا دیا جائے سجھاؤ
اُردو ہے عوام کی زباں پہلے ہی!
ہے ساری زبانوں کی طرف اس کا جھکاؤ

*اُردو اکاڈمیوں کی کانفرنس میں صدرِ جمہوریۂ ہند کا ارشاد۔

پنڈت سیم سوا دبر ٹنی

نئے رنگ، نئے اُجالے

(بیس رنگوں کی مقدس بہار کے نام)

ہر برس ہوتی ہے دیوالی کی رونق یوں تو
جشنِ نو دیتا ہے پیغامِ طرب آزادی
اب کے کچھ اور طرح دیش کی دلہن لیکن
بیس رنگوں کی نئی شمعیں جلا کر لائی

ہر نئے رنگ میں ہے نور نئے خوابوں کا
ہر نئے جشن میں ہیں گیت نئے، ساز نئے
ایک بھی گھر میں غریبی نہ رہے غم نہ رہے
وقت لایا ہے مسیحائی کے انداز نئے

ملک اور قوم کی تقدیر بدلنے کے لئے
کفر و ایماں کا بھی کردار بدلنا ہو گا
حق و انصاف سے ہے پیار تو ہر صورت میں
ہم کو اِس عہد کا معیار بدلنا ہو گا

کیوں نہ چمکے گا بھلا حسنِ نگارِ ہستی
بادۂ نور جو چھلکے گا سبو سے اپنے
آج ہر ذہن کی ظلمت کو مٹانے کیلئے
ہم نیا جشن منائیں گے لہو سے اپنے

یہ نیا جشن نئے سال کا پیغامِ حسیں
جس سے پیشانیٔ تاریخ نکھر آئی ہے
ایسا لگتا ہے کہ آکاش سے اِس دھرتی پر
بیس رنگوں کی دھنک آج اُتر آئی ہے

آندھیاں لاکھ اُٹھیں ہم ہیں صداؤں کے شجر
اپنے نغموں کی بہاریں ہیں بڑی متوالی
دیش کی مانگ میں ہے رنگ نئے سپنوں کا
کوئی دیکھے تو ستاروں سے سجی دیوالی

◯ ۱۱۶۹ - سیکٹر سی - چنڈی گڑھ (پنجاب)

گوشۂ ڈاکٹر سید حامد حسین



خاکہ

ڈاکٹر سیّد حامد حسین — سوتا جاگتا آدمی

شفیقہ فرحت
ای - ۱۲۶/۲ ودیا وہار بھوپال - ۲

دنیا میں (فی الحال اپنے تخیّل کے بونگ کو اسی عالم فلم و علم تک محدود رکھئے۔ کہ اسی میں سب کا بھلا ہے —!) ایسے لوگوں کی کمی نہیں (اس کندہ ناتراش و باخراش سمیت —!) کہ جن سے کبھی آپ کی پہلی ملاقات ہوتی ہی نہیں۔ ہوتی ہے تو ساتویں آٹھویں۔ یا دسویں بارہویں۔

جی ہاں۔ اُن کے غیر آباد چہرے پر سطح مرتفع سے تینتیس ہزار میل میٹر کی بلندی سے نظر ڈال کر (بلکہ زن سے پھینک کر) پلٹ جاتے ہیں اور اس غیر تاریخی اور سرتا پا جغرافیائی ملاقات پر ایک بڑا سا × لگ جاتا ہے۔

ڈاکٹر حامد حسین سے ملئے (بلکہ نظارہ کیجئے۔!) آپ کو میرے اس اسٹیلی قول (کہ عیسا اور میسا کے صدقے مونا اب بچا ہی کہاں ہے۔!) پر اعتبار آجائے گا۔

گہری سانولی رنگت، چوڑا چہرہ جس پر چیچک کے داغ۔ آنکھیں چھوٹی لیکن اتنی نہیں کہ انھیں دیکھنے کے لئے کسی دیدہ ور کی تلاش ہو — قد بلندی کی طرف مائل اور جسم (مع توند کے) مٹاپے کی طرف —!) اور بالوں نے کچھ اس خلوص سے پیچھے کی طرف سفر کرنا شروع کیا ہے کہ پیشانی اور کھوپڑی کی جغرافیائی حدود متعین کرنے میں بڑے فتنہ و فساد کا خدشہ ہے —!!

کپڑے ہمیشہ ڈھیلے ڈھالے۔ کلف استری کی تیزی طرّاری، چمک دمک ناز اور غمزوں سے بے نیاز۔ خواہ آپ لیبرٹی ٹیلرس اور میسنس کی بینٹ بش شرٹ پہنیں یا گھر کا سِلا کرتا اور قدرے اونچا بھوپالی پاجامہ نتیجہ سب کا ایک ہی ہوتا ہے —! (آپ کا طول طویل کرتا اگر خدانخواستہ کبھی ڈرائی کلینرس کے یہاں چلا گیا تو وہ یقیناً یہ کہہ کے واپس کر دے گا کہ ہمارے یہاں تمبو کی دھلائی کا انتظام نہیں —!!) اور مزہ شاعر بھی

مزہ یہ کہ آنکھوں میں ہر وقت اونگھتی ہوئی سست سی کیفیت کا پرچم لہراتا رہتا ہے اور چہرے پر TO LET کا بورڈ لٹکا رہتا ہے —! پھر بتائیے۔ پہلی ملاقات میں آپ کس کے ذہن کی جھولی میں بیٹھ کے کچھ دور ساتھ جا سکتے ہیں

مگر صاحب — جہاں ملاقاتیں بڑھیں، حامد حسین کی شخصیت کے نئے نئے پہلو سامنے آتے گئے — آپ نے لکڑی کی وہ روسی گڑیا دیکھی ہے جس کے اندر تین چار اور گڑیاں چھپی ہوتی ہیں —؟ حامد حسین بھی اُسی گڑیا کی طرح اپنے اندر بہت سے حامد حسین چھپائے بیٹھے ہیں، جنھیں وہ دھیرے دھیرے نکال نکال کے آپ کے سامنے رکھتے جائیں گے اور تب آپ کو پتہ چلتا ہے کہ یہ اتنا مسکین سا حامد حسین تو یہاں سے وہاں تک پھیلا ہوا ہے —!

حامد حسین — انگریزی کے پی۔ ایچ۔ ڈی اور اچھے اُستاد۔
حامد حسین — اُردو کے سندیافتہ محقق اور اُستاد —
حامد حسین — مطالعے کے اِس درجے شوقین کہ کتاب ہاتھ میں ہو تو شام کے صبح ہونے کی خبر تک نہ ہو۔
حامد حسین — فلموں کے دیوانے، جو ہر اچھی اور بُری، انگریزی اور ہندوستانی فلمیں اس خلوص اور ریاضت سے دیکھتے ہیں، جس خلوص سے وہ رمضان میں روزے رکھتے ہیں اور سارا سال تراویح پڑھتے ہیں۔
حامد حسین — جو شہر کی ادبی مجلسوں میں شرکت کرتے ہیں اور
حامد حسین — جو دوستوں کی محفلوں میں اپنی علمیت اور قابلیت سے چھا جاتے ہیں۔

اور جب اتنے بہت سے حامد حسینوں کو دیکھئے تو آنکھیں چکا چوند ہو جاتی ہیں۔

اور جب باتیں سُنیئے تو عقل ایک پٹخنی اور کھاتی ہے۔ اور خواہ مخواہ رعب طاری ہونے لگتا ہے۔ قدم قدم پر ذہانت کی بجلیاں، بات بات میں لطیفوں کی پھلجھڑیاں۔ کبھی چٹکلے ہیں تو کبھی فقرے بازیاں۔

ایک صاحبہ ایم۔ اے کے امتحان کی دھوم دھام سے تیاری کر رہی تھیں۔ اُسی زمانے میں اُن کے دانتوں میں درد ہوا اور دو داڑھیں نکلوانی پڑیں۔ حامد حسین نے سُنا تو فرمایا — "بڑی دنداں شکن پڑھائی ہے —"

پچھلے دنوں ہم بیماری کی پہلی قسط ادا کر رہے تھے۔ آپ عیادت کے لئے تشریف لائے اور حسبِ روایت پوچھا۔ "کس کا علاج ہے"۔ میں نے جواب دیا — کسی کا نہیں۔ بس یوں ہی دو چار گولیاں کھائی ہیں۔ فوراً چہکے — "تو یوں کہئے نا کہ جیبی ڈاکٹر کا علاج ہے۔"

رمضان میں شام کو جو دیکھا تو کیل کانٹے سے لیس سب چھوٹے بڑے سکوٹر پر حملہ آور ہونے کا ارادہ کر رہے تھے۔ میں نے پوچھا — خیریت، کھٹ سے جواب ملا — "آج ذرا آؤٹ ڈور افطاری کا پروگرام ہے"

کہاں تک گنواؤں۔ بس یہ سمجھ لیجئے کہ لطیفوں کا MOBILE BANK ہیں اور ایک چھیڑ ہے جو ہر ایک سے ہر دم چلی جائے ہے —! یہ چھیڑ بیوی بچوں سے بھی ہوتی رہتی ہے (عام روایتوں کے برخلاف —!) دوست احباب سے بھی — اور ادب میں بھی — ! کبھی کبھی ایسا شگوفہ چھوڑ دیتے ہیں کہ قاری سے لے کر نقاد تک سب دنوں اور مہینوں تڑپتے رہتے ہیں۔

غالب صدی میں جب ہر اہل و نا اہل نے غالب پرستی کو شعار بنالیا، تب آپ نے ایک مفصل اور مدلل مضمون کے ذریعہ یہ نعرہ لگایا کہ غالب کا تقریباً سارے کا سارا کلام نظیر اکبرآبادی کا کہا ہوا ہے — اور مہینوں اور دنوں تمام غالب پرستوں کو تڑپاتے رہے۔

یوں اور معاملوں میں کنجوس ہیں مگر قہقہے دل کھول کر لگاتے ہیں۔ وہ بھی ایک خاص تال اور سُر میں۔ جس میں سُر تو کم ہی ہوتا ہے —!

اُردو اور انگریزی دونوں زبانوں سے بیک وقت دلچسپی اُن کی ذات پر بڑا ستم ڈھا رہی ہے۔ جب وہ اُردو میں گفتگو کرتے ہیں تو سُننے والے کو فوراً اعتبار آجاتا ہے کہ آپ انگریزی کے اُستاد ہیں۔ اور جب انگریزی بولتے ہیں تو اُردو سے محبت کا اظہار ہوتا ہے۔ یعنی انگریزی لہجے میں اُردو اور اُردو لہجے میں انگریزی بولنے میں آپ کو بڑی مہارت

شامل ہی

حاصل ہے۔ اور کیوں نہ ہو آپ اِس فن کے مُوجد ہی نہیں اِس میدان میں مُنفرد حیثیت کے مالک بھی ہیں —! ویسے غازی بھی یہ گفتار ہی کے ہیں۔ دوڑ دھوپ، مٹر گشتی، یہاں تک کہ بازار سے سودا سُلف لانے کے نام سے دنیا کا ہر مرض اپنی آمد کا ڈبل ایکس (× ×) تار بھیج دیتا ہے۔

اِس لئے یہ عام طور پر گھر میں پائے جاتے ہیں (کالج عرف انسٹی ٹیوٹ کے علاوہ جہاں وہ جونیور کے قاضی کی طرح کے فرائض انجام دیتے ہیں۔!) لہذا پڑھنے اور کھانے کے بعد دوسرا بلکہ تیسرا محبوب مشغلہ سونا ہے۔ مگر سوتے یہ قسطوں میں ہیں اور جاگتے بھی قسطوں میں ہی ہیں (آج کل کی قسطیہ پالیسی کے تاثر کے تحت —!) لہذا نہ انھیں خبر ہے نہ اوروں کو علم کہ اُن کی صبح کب ہوتی ہے اور رات کب؟

جب گھر کے سارے اہل و نا اہل صبح کے ½۸ بجے رخصت ہوتے ہیں تو یہ جاگنے اور سونے کی پہلی قسط ادا کرتے ہیں۔ یعنی آنکھیں بند کرکے دروازہ بند کرتے ہیں۔ اِسی عالم میں وہ کئی مرتبہ اپنے بجائے پڑوس کا دروازہ بند کرکے اُسی گھر میں داخل ہونے کی کوشش کامیاب میں گرفتار کئے گئے ہیں۔

یہ اوروں کی صبح ہے۔ اُن کی نہیں۔ اُن کی اپنی صبح ½۹ اور دس کے درمیان ہوتی ہے۔ سونے کی ایک اور قسط کی ادائیگی بڑے خضوع و خشوع سے دفتر سے لوٹ کے ہوتی ہے۔ جب بقول اُن کے وہ لوٹ پوٹ کے آدمی بنتے ہیں۔ اور پھر رات نہ پوچھئے کب ہوتی ہے۔ اکثر نور کے تڑکے اور گاڑیوں کی آواز کے بھڑاکے کے ساتھ —!

مطالعہ کے بعد اگر کسی چیز کا شوق ہے تو وہ ہے اچھا کھانا۔ پینے کا ذوق اِس درجہ معصومانہ بلکہ فردوسانہ ہے کہ اسے شوق کا درجہ نہیں دیا جا سکتا۔ چلئے جامِ مے نہ سہی، کافی کی پیالی تو ہو — چائے کا کلھڑ تو ہو — سستی سگریٹ کا بڑھیا کش تو ہو — ! یہ کیا کہ بیٹھے ہوئے ہیں دودھ کا پیالہ لئے ہوئے۔ (وہ بھی نخالص) خیر تو دستر خوان پر آئیے اور اُن کے اُس شوق کی داد دیجئے جو بیوی کے لئے بے داد بنا ہوا ہے۔

کھانا صوری اور معنوی دونوں خوبیوں سے آراستہ ہو اور جدتوں سے ہم کنار — مُراد یہ کہ سالن خوش رنگ بھی ہو اور خوش ذائقہ بھی اور بدل بدل کے پکایا جائے۔ جس کے پکانے میں مخصوص بحر اور وزن کا التزام رکھا جائے یعنی کس چیز میں کون سے مصالحے ہوں، انھیں کس طرح سے پیسا جائے، کس ہنڈیا میں پکایا جائے، چمچہ کس انداز سے

چلایا جائے وغیرہ وغیرہ ـــــ عروض کے یہ قواعد کچھ تو خاندانی ہیں جو سینہ بہ سینہ چلے آ رہے ہیں اور کچھ خود اُن کی شوخیٔ طبع کا نتیجہ ـــ

بہرحال سالن ذرا وزن سے گرا اور بحر سے خارج ہوا تو مزاج کا پارہ چھلانگیں لگانے لگتا ہے اور گھر میں انگریزی باجے زور شور سے بجنے لگتے ہیں ـــ!

اگر غصّہ بہت زیادہ ہو تو انگریزی کے ساتھ عربی فارسی ہر قسم کے باجے بجا کر JAZ MUSIC کا سماں پیش کرتے ہیں ـــ!

موت کی طرح اُن کے غصّے کا کوئی وقت معیّن نہیں۔ اور موت ہی کی طرح آنے کے لئے اُسے ایک ذرا سا بہانہ چاہیئے۔ مگر جس تیزی اور تُندی سے یہ شعلہ فشاں ہوتے ہیں۔ اتنی ہی تیزی سے آگ گلزار بھی بن جاتی ہے۔

ایک بات جو شاید کسی کو نہ معلوم ہو وہ یہ کہ حامد حُسین بہت بڑا اور بہت کامیاب ایکٹر ہے۔ اتنا بڑا کہ اُس کی باتوں پر اداکاری کا شُبہہ تک نہیں ہوتا۔ اور ہم اُسے حقیقت اور اُن کی فطرت مان کے خواہ مخواہ مرعوب ہونے لگتے ہیں۔ اور کامیاب اِس لئے کہ اتنے برس گُذر جانے پر بھی وہ اپنا پارٹ بھُولے نہیں۔

آپ ہی فیصلہ کیجئے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ کوئی ادیب اپنے کسی ہم عصر کی بُرائی نہ کرے اور خود اپنی تعریف نہ کرے ـــــ؟ حامد حسین نے نہ کبھی اپنے متعلق شاعرانہ بلکہ نقادانہ تعلّی سے کام لیا نہ ادیبوں کے سلسلے میں ادیبانہ روایتوں سے ـــ بلکہ اکثر بڑی بے ساختگی سے دوسروں کی تعریف تک کر دیتے ہیں ـــ!

اور اپنی باتیں سُنا کر سُننے والے کی جانِ عزیز کو de-valuate کرنے کے بجائے دوسروں سے فرمائش کر کے اپنی سخت جانی کا ثبوت دیتے ہیں ـــ!

نہیں آیا نا یقین؟ پھر مجھے کیسے آتا ـــ میری طرح آپ بھی ایسے قد آور ادیبوں سے واقف ہوں گے، جو ہر موقع پر یہ بے موقع دعویٰ غیر مدلّل کرتے پھرتے ہیں کہ دسا ورکی بات تو خیر جانے دیجئے مگر شہر کی تاریخ میں اُن سے بہتر ادیب اب تک پیدا نہیں ہوا۔

اس ادبی اور تاریخی پس منظر میں حامد حسین کی اِس حرکت نازیبا کو آپ کیا کہیں گے؟ ـــ معصومیت ـــ! بہت ممکن ہے، دُودھ پیتے رہنے سے بچّوں والی یہ خصوصیت تھوڑی بہت باقی رہ جاتی ہو مگر صاحب عمر کے ساتھ اُس کا نام بدل جاتا ہے اور تب اُسے شاعر بمبئی معصومیت نہیں حماقت کہتے ہیں۔

خیر آپ خواہ اُسے حماقت کہیں یا اداکاری، حامد حسین کی ذات پر اس کا مطلق اثر نہیں ہوگا اور وہ اُسی طرح بلکہ پہلے سے بھی زیادہ شدّ و مد سے دوسروں کی تعریف کریں گے اور پہلے سے زیادہ انہماک سے دوسروں کی چیزیں سُنیں گے ـــ!

دھیرے دھیرے اِس خاکسار کو بھی اُن کی حماقتوں کے حشر سامان جلوؤں سے خاک ہو جانے کے زرّیں مواقع نصیب ہوتے جا رہے ہیں۔

عجب آدمی ہیں، شہر میں کسی سے دشمنی نہیں، کسی سے عداوت نہیں، کسی سے پرخاش اور جھپٹاک نہیں، نہ کسی کو گرانے اور کسی کو اُٹھانے کے منصوبے۔ نتیجے میں کسی کی بُرائی کسی کی غیبت نہیں۔ لاحول ولا قوۃ۔ کیا روکھی پھیکی "بے رنگ" بے رُوح گفتگو ہوتی ہوگی اُن کی ـــ؟

اور ستم یہ کہ آپ ادیب کیسے ہیں کہ اپنے حلقے کی ادبی سیاست سے باخبر نہیں۔ اُن کی چالوں اور اُن کے پانسے سے واقف نہیں صرف لکھتے رہتے ہیں ـــ ایسے بھی کوئی ادیب یا شاعر بنتا ہے ـــ؟ اِس سے تو صرف نظیر اکبر آبادی بن کے رہ جاتا ہے ـــ!

شاید حامد حسین کو نظیر ہی بننا پسند ہو ـــ!

○○

ڈاکٹر سیّد حامد حُسین سے ایک مُلاقات

ابراھیم یُوسف
۱۶۔ نیم روڈ ۔ امامیہ گیٹ ۔ بھوپال ۱

شرکائے گفتگو: ابراھیم یُوسف، خالد عابدی، انجم سلمانی

بھوپال کا موسم برشگال انتہائی زُہد شکن ہوتا ہے۔ جب کالی گھٹائیں گھر آتی ہیں، تو پیر صد سالہ بھی اپنی جوانی کو یاد کرنے لگتے ہیں اور زاہد توبہ شکنی پر آمادہ ہوجاتے ہیں، ایسے ہی ایک دن جبکہ کالی گھٹائیں اُمنڈ اُمنڈ کر آرہی تھیں۔ میں انجم سلمانی اور خالد عابدی، ڈاکٹر حامد حسین کے مختصر مگر سلیقہ سے سجائے ہوئے فلیٹ پر جادھمکے۔ معلوم ہوا کہ حضرت اس زُہد شکن موسم میں روزہ رکھے ہوئے ہیں۔ انجم سلمانی ایک زمانہ میں معروف افسانہ نویس تھے مگر جانے کیا دل میں سمائی کہ افسانہ نگاری سے توبہ کر بیٹھے مگر وہ جو کہا ہے ناکہ چور چوری سے جائے مگر ہیرا پھیری سے نہ جائے۔ اب بھی چوری چھپے افسانہ پڑھتے رہتے ہیں اور یہ حقیقت ہے کہ مختصر افسانے پر اُن کی نظر بہت گہری ہے۔ خالد عابدی ابھرتے ہوئے ادیب ہیں۔ اسی سال اُن کے ریڈیو ڈراموں کے مجموعے "آوازنما" پر اُتر پردیش اُردو اکاڈمی کا انعام مل چکا ہے۔ ہم لوگوں کو دیکھ کر حسب عادت ڈاکٹر حامد حسین نے مسکراتے ہوئے استقبال کیا۔ ڈاکٹر حامد حسین ایک مرنجان مرنج اور کم آمیز انسان ہیں۔ اُن کی کم آمیزی کو میں گھریلو پن سے تعبیر کرتا ہوں تو وہ اس کا بُرا نہیں مانتے۔ میرے اُن کے ذاتی تعلقات پچیس تیس سال سے ہیں مگر مجھے اس شخص کی اس نالائقی پر سخت غصہ آتا ہے کہ وہ کسی سے لڑتا جھگڑتا نہیں۔ جب دیکھئے مسکرا رہا ہے۔ بھلا یہ بھی کوئی شرافت ہے۔ ارے صاحب مُسکرانا ہی ہے تو مُسکراہٹ میں کچھ طنز ہی پیدا کرلو، یہ کیا کہ مسکراہٹ اور وہ بھی معصوم لاحول ولا قوۃ۔ پہلے تو خاصے دُبلے پتلے تھے مگر مُسکرا مُسکرا کر سمت دیگر میں مائل پرواز ہوگئے۔ خدا رحم کرے۔ میری جب اُن سے ملاقات ہوئی تو معلوم ہوا کہ حضرت تنقید نگاری سے شوق فرماتے تھے۔ جوانی میں ایسی خشک طبیعت؟ پناہ بخدا۔ مگر آپ اُنکی دلچسپی کا کوئی موضوع شاعر بھی

چھیڑ دیجئے "پھر دیکھئے اندازِ گل افشانیٔ گفتار"۔ بہرحال اِدھر اُدھر کی رسمی اور غیر رسمی گفتگو کے بعد میں نے کہا دیکھئے حامد صاحب ہم لوگ آپ کا پوسٹ مارٹم کرنے آئے ہیں اُمید کہ آپ جو کچھ کہیں گے سچ کہیں گے اور سچ کے علاوہ کچھ نہیں کہیں گے۔ ویسے بھی اس وقت آپ روزہ دار ہیں۔ حسب عادت پہلے تو مسکرائے پھر کچھ سوچ کر بولے "جی ہاں ضرور کیجئے۔ ضرور کیجئے۔" میں نے پہلا سوال داغا۔

ابراھیم یُوسف: کالج کے زمانے میں آپ کا شمار ذہین طالب علموں میں ہوتا تھا کبھی کوئی حسینہ بھی آپ کی طرف مائل ہوئی۔

حامد حسین: ایسے صاحب کہاں۔ ہم ایسے خوش قسمت کہاں تھے۔

انجم سلمانی: دیکھئے حامد صاحب چھپانے کی ضرورت نہیں بیگم حامد حسین تک یہ بات نہیں پہنچے گی۔

حامد حسین: آپ شرارت پر آمادہ ہیں تو ضرور پہنچا دیجئے۔ ویسے جب میں کالج میں پڑھتا تھا تو کو ایجوکیشن ضرور تھی مگر لڑکیاں برقع پہن کر آتی تھیں اور پردے کے پیچھے بیٹھ کر پڑھتی تھیں۔

ابراھیم یُوسف: تو یہ حسرت دل ہی میں رہ گئی۔ خیر صبر کیجئے خدا صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ آپ گھریلو قسم کے "بزرگ" ہیں اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت پر کتنا وقت صرف کرتے ہیں۔

حامد حسین: وقت تو کوئی مقرر نہیں ہے مگر جب وہ اپنی کوئی دِقت لیکر آتے ہیں تو میں اُن کی راہنمائی کر دیتا ہوں۔

خالد عابدی: یعنی آپ بچوں کو صرف ڈانٹنے پر اکتفا کرتے ہیں۔

حامد حسین: جی نہیں۔ میں بلا ضرورت اُن کے مشاغل میں دخل نہیں دیتا اُن میں

زادانہ طور پر خود سوچنے سمجھنے کی قوت پیدا کرنا چاہتا ہوں۔

نجم سلمانی: آپ کی تمام تر دلچسپی اُردو میں ہے مگر آپ نے ڈاکٹریٹ انگریزی میں کیا اس کے محرکات کیا تھے۔

حامد حسین: بنیادی طور پر دلچسپی تو اُردو ہی میں تھی۔ یہاں تک کہ بی۔ اے میں مَیں نے انگریزی ادب بحیثیت مضمون لیا بھی نہیں تھا مگر یہ سوچ کر کہ ہندوستانی زبانیں بالواسطہ انگریزی ادب سے متاثر ہو رہی ہیں۔ میں نے انگریزی ادب کا مطالعہ شروع کیا اور انگریزی کے ہی ایک ناولسٹ کو اپنی ریسرچ کا موضوع بنایا۔

حامد حسین: ادب سے مطمئن ہونے کا سوال ذرا پیچیدہ ہے۔ ضروری نہیں کہ اگر میں مطمئن ہوں تو دوسرے بھی مطمئن ہوں کیونکہ معیار اور مقدار ایک سوالیہ نشان کی طرح سامنے کھڑا نظر آتا ہے پھر بھی نظم و نثر اور ڈرامے میں یہاں خاصا اچھا ادب تخلیق ہو رہا ہے۔

خالد عابدی: آپ نے اُردو شاعری میں تلمیحات و مصطلحات تالیف کی ہے وہ طباعت کی کس منزل میں ہے۔ اس کتاب کو چھپوانے میں آپ کو کیا تجربات ہوئے ہیں۔

حامد حسین: یہ بڑی دلچسپ رگ ہے۔ مجھے یہ تجربہ ہوا کہ آدمی دو بیویاں کر لے

۱۔ تاریخ ولادت: ۱۵ جنوری ۱۹۳۵ء

۲۔ تعلیم: (الف) ہائی اسکول۔ ۱۹۴۹ء فرسٹ ڈویژن۔ مضامین عربی، اُردو، ریاضی میں امتیاز

(ب) انٹرمیڈیٹ۔ ۱۹۵۱ء فرسٹ ڈویژن۔ بورڈ میں چوتھی پوزیشن اور عربی اور ریاضی میں امتیاز

(ج) بی اے، ۱۹۵۳ء۔ (د) ایم۔ اے (اقتصادیات)

(ہ) ایم اے (انگریزی) ۱۹۵۷ء

(و) پی۔ ایچ۔ ڈی (انگریزی) ۱۹۶۳ء "ای ایم فارسٹر کی ناولوں کا مطالعہ" موضوع۔

۳۔ زبانوں کا علم (الف) اُردو۔ بی اے تک اور جامعہ اُردو علی گڑھ سے "ادیب کامل" (ب) انگریزی۔ ایم۔ اے اور ڈاکٹریٹ (ج) عربی انٹرمیڈیٹ تک۔ (د) فارسی ادیب کامل۔ (ہ) ہندی بی۔ اے میں ابتدائی نوعیت۔ (و) رُوسی انڈو سوویت کلچرل سوسائٹی کے ذریعہ سرٹیفکیٹ اور ڈپلوما کورس، ڈاکٹر بالیگا نقرئی تمغہ حاصل کیا۔ (ز) جرمن میکس مولر بھون کا سرٹیفکیٹ کورس۔ (ح) سنسکرت۔ عبارتیہ وِدیا بھون کے دو ابتدائی امتحانات

۴۔ تصنیف و تالیف:

(۱) مکمل (الف) دیوانِ غالب نسخۂ حمیدیہ کی تدوینِ نو۔

(ب) اُردو شاعری میں تلمیحات و مصطلحات (ج) حواشی قصائدِ سودا

(د) نذیر احمد کے توبۃ النصوح کا تنقیدی مطالعہ (ہ) ڈاکٹر رادھا کرشنن کی تصنیف "ہندو نظریہ زندگی" کا ترجمہ۔ (و) نثر اور اندازِ نثر (ز) تنقید اصول و نظریات (ح) دیوانِ غالب کے خطی نسخے"

(۲) نامکمل (الف) اصطلاحاتِ ادب

(ب) اصطلاحاتِ لسانیات CONCORDANCE

(ج) کلیدِ غالب، کلامِ غالب کی جن کی مدد سے ایک لفظ کے ذریعے پورے شعر کو تلاش کرنا ممکن ہے

راسم یوسف: آپ اپنے کن کن اساتذہ سے متاثر ہوئے۔

حامد حسین: سب سے زیادہ میں بیگم صفیہ اختر سے متاثر ہوا۔ اُنہی کی حوصلہ افزائی سے لکھنے کی طرف مائل ہوا۔ ترقی پسند تحریک سے وابستگی اور تنقید کی طرف رُجحان بھی اُنہی کی وجہ سے پیدا ہوا۔ تحقیق میں دلچسپی ڈاکٹر گیان چند جین کے عالمانہ مشوروں کے باعث ہوئی۔ اُن کی رہنمائی نے مجھے بہت متاثر کیا۔

سلمانی: بھوپال اُردو کا مرکز خیال کیا جاتا ہے۔ یہاں جو ادب تخلیق ہو رہا ہے اُس سے آپ مطمئن ہیں۔

مگر اپنی کتاب خود نہ چھپوائے۔ دو بیویوں کے جھگڑے چکائے جا سکتے ہیں مگر پریس والوں اور کاتب کے نخرے برداشت کرنا ایک ٹیڑھی کھیر ہے۔

انجم سلمانی: حامد صاحب عام طور پر نوجوان اپنی ادبی زندگی کا آغاز شاعری یا افسانہ نویسی سے کرتے ہیں مگر آپ نے ابتدا ہی سے تنقید کو اپنایا اس کے کیا محرکات تھے۔

حامد حسین: تنقید میں دلچسپی کے لئے میں سب سے اہم اس "کون اور کیسے" کے رجحان کو سمجھتا ہوں جو میری طالب علمانہ زندگی میں کافی پہلے پیدا

د.بھی

ہوا۔ اتفاق کچھ ایسا رہا کہ بچپن میں گھریلو ماحول نے مجھے مذہبیات اور معقولات کی جانب خاص طور پر متوجہ کیا۔ پھر اسکول میں یہ ہوا کہ اس سے پہلے کہ میں تخلیقی ادب سے بحیثیت مجموعی محظوظ ہونا سیکھوں میرے اُستادوں نے مجھے یہ سکھایا کہ شعر کو زبان و بیان، صنائع بدائع، محاورہ روزمرہ کے اجزا میں تقسیم کر کے سمجھا یا اور بتایا جائے یہ احساس رفتہ رفتہ اتنا قوی ہوتا گیا کہ مجھے نظم یا افسانہ کے علامتی یا بالواسطہ پیرائے کے مقابلے میں اپنے اظہارِ خیال کے لئے ایک براہِ راست منطقی پیرایہ زیادہ قابلِ اطمینان معلوم ہونے لگا۔ کالج میں داخلے کے وقت تک میرا تعلق نوجوانوں کی ایک ادبی انجمن ادارہ مشعلِ ادب" سے ہو چکا تھا۔ اس انجمن نے مجھے مضامین لکھنے کی زبردست ترغیب مہیا کی۔ انجمن کے اراکین میں سے بیشتر افسانہ نگاری یا شاعری کی جانب رُجحان رکھتے تھے چنانچہ اپنی تنقید نگاری پر مجھے کافی حوصلہ افزائی ملی

ابراہیم یوسف: استغفراللہ۔ نہ آپ کسی کی زلفوں کے اسیر ہوئے۔ نہ آپ نے عشقیہ شاعری کی اور نہ رُومانی افسانے لکھے۔ خدا کی قسم ساری جوانی برباد کر ڈالی۔ خیر یہ آپ کا اور خدا کا معاملہ ہے۔ آپ کو ہی خدا کے سامنے جوابدہ ہونا پڑے گا آپ۔

خالد عابدی: ابراہیم صاحب اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ نے اپنی جوانی برباد نہیں کی۔

ابراہیم یوسف: ارے بھئی تم نوٹس لکھو۔ بڑوں کے بیچ میں نہیں بولا کرتے۔ ہاں تو حامد صاحب تنقید بھی کئی پہلو سے کی جاتی ہے مثلاً تاثراتی تنقید مارکسی تنقید، ہیئتی تنقید وغیرہ آپ ان میں سے کس تنقید سے زیادہ متاثر ہوئے۔

حامد حسین: جس دَور میں میں نے تنقیدی مضامین لکھنا شروع کئے وہ ترقی پسند تحریک کے عروج کا زمانہ تھا اور تنقید میں مارکسی نظریات کا اثر نمایاں تھا۔ میں نے بھی اس رجحان سے اثر قبول کیا۔ مارکسی تنقید نے ادب اور سماج کے رشتے کو سمجھنے اور ایک معروضی نقطۂ نظر پیدا کرنے میں میری مدد کی۔ تاثراتی انداز کے بعض مضامین میں نے تحریر کئے ہیں لیکن مجھے منطقی اور تجزیاتی اسلوب کو اختیار کر کے زیادہ اطمینان حاصل ہوتا ہے۔

انجم سلمانی: آپ کا کیا خیال ہے تخلیق کار تنقید نگار کو متاثر کرتا ہے یا تنقید نگار تخلیق کار رہنمائی کرتے ہیں۔

حامد حسین: اس میں کوئی شبہ نہیں کہ تنقید کی بنیاد تخلیق ہے۔ تنقید کا کام یہ ہے کہ شاعر یعنی

وہ اس معنویت کو شعوری طور پر نمایاں کرے جس کی محسوساتی ترجمانی تخلیقی ادب میں کی گئی ہے لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ تنقید نگار تخلیق نگار سے متاثر ہوتا ہے۔ تنقید نگار اپنے نقطۂ نظر سے تخلیق کا تجزیہ کرنے کے لئے پُوری طرح آزاد ہے۔ اُسی طرح تخلیق کار کے لئے ضروری نہیں ہے کہ وہ تنقید نگار سے رہنمائی کا طلب گار ہو۔ ایسا ادب جس کا انحصار کسی بنے بنائے لائحۂ عمل پر ہو صرف فرمائشی ادب کا معیار حاصل کر سکتا ہے۔ اعلیٰ ادب اپنے اُصول خود مقرر کرتا ہے۔ اپنی توجیہات خود متعین کرتا ہے اور اپنا اُسلوب خود وضع کرتا ہے۔ تنقید نگار ان رجحانات کی جانب ضرور نشاندہی کر سکتا ہے جو کسی دَور میں شعوری طور پر زیادہ قابلِ قبول معلوم ہوتے ہیں وہ اپنے وقت کے شعوری تقاضوں کو اور فکری مطالبات کا احساس بھی دلا سکتا ہے لیکن اُسے تخلیقی ادب کے واسطے سانچے تیار کرنے کا ذمہ دار نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔

ابراہیم یوسف: حامد صاحب آپ نے تو کچھ ایسی بات کہہ دی کہ "باغباں بھی خوش رہے راضی رہے صیّاد بھی" خیر صاحب آپ کی مرضی پھر بھی جدید ادب میں کچھ ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ تخلیق کار وہی کچھ لکھ رہے ہیں جو جدید ادب کے ناقد چاہتے ہیں۔ آپ کا کیا خیال ہے۔

حامد حسین: یہ بات صحیح ہے کہ دورِ حاضر کا ادیب زندگی کے حقائق کا ایک واضح شعور رکھتا ہے اور جدید ادب کا فکری پہلو بہت زیادہ نمایاں ہے، چنانچہ عہدِ حاضر کی فکری کاوشوں کا اثر آج کے ادب پر بھی نظر آتا ہے۔ آج زندگی کا مطالعہ، معاشی، معاشرتی یا نفسیاتی پہلوؤں سے کیا جا رہا ہے اُنہی پہلوؤں سے تخلیق کار اپنے فن پاروں میں زندگی کی عکاسی کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اسی طرح بعض اوقات ناقدین یا مفکرین وہ بنیاد مہیا کر رہے ہیں جن پر تخلیقی فنکار اپنی تخلیقات کی عمارتیں بلند کر رہے ہیں۔ ایک زمانے میں جس طرح مارکسی نظریات نے تخلیقی ادب کیلئے بعض اسالیب کو زیادہ معتبر بنا کر پیش کیا اُسی طرح وجودیت کے فلسفے نے بعد کے اندازِ فکر و احساس کو اپنا تابع بنایا لیکن اس صورتحال کو ناقدین کی آمریت کے مترادف سمجھنا زیادتی ہوگی۔ عصری تحریکات کو فیشن یا ماڈ ہونے کے طور پر اختیار کرنے کے رجحان کو تخلیق کاروں کی مرعوبیت کا نتیجہ سمجھا جا سکتا ہے۔

ابراہیم یوسف: جدیدیت آپ کے نزدیک ترقی پسندی کی ترقی یافتہ شکل ہے یا بالکل نئی تحریک۔

حامد حسین: تاریخی اعتبار سے یہ رجحان ترقی پسند تحریک کے بعد کا نہیں، بلکہ بعض شکلوں میں اس کی ابتدا خود اس تحریک کی مقبولیت کے زمانہ میں ہو چکی تھی۔ یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ ترقی پسند تحریک کے زیرِ اثر معقولیت اور اجتماعیت پر جو زور دیا گیا اُس کے ردّ عمل کی صورت میں جدیدیت کے انفرادیت پسندانہ رُجحان کو خاص طور پر تقویت حاصل ہوئی۔

ابراہیم یوسف: کیا آپ اِس خیال سے متفق ہیں کہ جدیدیت ہر دَور میں کسی نہ کسی شکل میں موجود رہی ہے، بالخصوص انسان کا اپنی تنہائی کا احساس۔

حامد حسین: اگر جدیدیت سے آپ کی مُراد روایت کی قید و بند سے آزاد ہو کر نئے تخلیقی تجربات کی جانب راغب ہونے کا رُجحان ہے تو یہ رُجحان ہر دَور میں موجود رہا ہے۔ لیکن اگر جدیدیت سے آپ کی مُراد وہ ادبی رُجحان ہے جو گذشتہ دو دہائیوں میں نمایاں ہوا ہے تو میں اِسے اِسی دَور کی خصوصیت سمجھتا ہوں کیونکہ یہ عہدِ حاضر کی منظم اور میکانکی زندگی کے خلاف ردِّ عمل کو ظاہر کرتا ہے۔ انسان کی جس تنہائی کے احساس کی بات آج کا نیا ادیب کرتا ہے۔ اس کا پس منظر آج کی ہی مصروف پُرشورش اور مشینی زندگی ہے۔

ابراہیم یوسف: بالعموم انسان کی جس تنہائی کے احساس کی بات آج کا ادیب کرتا ہے اُس کا رشتہ آج کی مشینی اور مصروف زندگی سے ہی جوڑا جا رہا ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ تنہائی کا یہ احساس انسان کے فطری جذبہ کے طور پر کسی نہ کسی شکل میں ہر دَور میں موجود رہا ہے۔ یہاں تک کہ بعض مذاہب کے فلسفہ میں بھی اِس کی نمایاں جھلکیاں ملتی ہیں۔ فرد جب بھی مشکلات میں گھرا ہے اسے شدید تر تنہائی کا احساس ہوا ہے۔ خیر جدیدیت کے زیرِ اثر جہاں نظمیہ شاعری میں کچھ نئے موڑ آئے ہیں وہیں غزل نے بھی کچھ نئی راہیں تلاش کی ہیں کیا یہ نئی راہیں غزل سے انحراف تو نہیں ہے۔

حامد حسین: جدیدیت کے زیرِ اثر غزل کے مندر میں بہت سے اچھوتوں کو داخلہ ملا ہے اور بہت سے ایسے موضوعات جو غزل کے لئے شجرِ ممنوعہ تھے انھیں بھی اس صنف کے چمن زار میں جڑیں پھیلانے کی اجازت ملی ہے۔ غزل کی انفرادیت اُس کی داخلیت اور جُزشی میں کائنات شاعر۔ بھی سمیٹنے کی ادا ہے۔ اگر یہ خصوصیت برقرار رہتی ہے تو غزل کی روایت سے انحراف بھی ایک اچھا تجربہ ہو سکتا ہے۔

انجم سلمانی: جدیدیت کے زیرِ اثر جو کہانیاں لکھی جا رہی ہیں اُن سے آپ مطمئن ہیں؟

حامد حسین: جدیدیت کے تحت افسانہ نگاری کے میدان میں جو تجربے کئے گئے ہیں اُن سے نظریاتی طور پر یہ مقصود ہے کہ افسانے کے فن کو شعور و احساس کے نئے گوشوں کو سمیٹنے کے لئے اہل بنایا جائے، لیکن اس ذیل میں کبھی کبھی یہ بات نظرانداز ہو گئی ہے کہ افسانہ ایک بیانیہ صنف ہے اور اس لئے وہ اِس کی ضرورت مند ہے کہ وہ جن رشتوں سے بحث کرتی ہے وہ مذکور ہوں مقدّر نہیں۔ نظم میں ان رشتوں کے اظہار کے لئے علامتوں اور کنایوں کو حُسن اور خوبی کے ساتھ استعمال کیا جا سکتا ہے، لیکن افسانے میں اگر واقعات کے سِرے مُٹھی میں دبائے جائیں تو افسانہ اُلجھے ہوئے اُون کا گچھا تو بن سکتا ہے، اس سے زندگی کی قبا میں انسانی رشتوں کے ڈیزائن اُبھارنے میں مدد نہیں لی جا سکتی۔ چنانچہ جن افسانوں میں بیانیہ ضرورت کی وضاحتوں کو مدِّ نظر رکھا گیا ہے وہ یقیناً ہمارے ادب میں اچھا اضافہ ہیں۔

ابراہیم یوسف: اور میں سمجھتا ہوں کہ جدید افسانہ نگار اُون کے گچھے کو اُلجھا کر قاری کی طرف سُلجھانے کے لئے پھینک دیتے ہیں اور بیچارا قاری جو افسانہ کو تھوڑی دیر کی دلبستگی کے لئے پڑھتا ہے۔ ذہنی جمناسٹک میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ حامد صاحب! عام طور پر کہا جاتا ہے کہ تخلیق کار کو اپنے ماحول اور ادبی ورثہ سے رشتہ جوڑنا چاہیئے، مگر جب اُردو کا ناقد اُردو کے فن پاروں کو پرکھتا ہے تو وہ مغربی مُفکّروں سے رشتہ منقطع نہیں کرتا۔ آپ کے خیال میں اِس کی وجہ کیا ہے؟

حامد حسین: اس کی بُنیادی وجہ یہ ہے کہ ہم نے نہ صرف مادی ترقی کے لئے مغرب کو اپنا امام تسلیم کر لیا ہے، بلکہ اپنی فکری زندگی کی معراج بھی اِسی میں سمجھتے ہیں کہ ہم مغربی اندازِ فکر کو اپنا رہنما بنائیں مغرب سے اِس فکری مرعوبیت کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ زندگی کو سمجھنے اور پرکھنے کے لئے ہم زیادہ سے زیادہ مغربی پیمانے استعمال کرنے کے عادی ہوتے جا رہے ہیں۔ مارکس، فرائڈ، کرکے گارڈ

یا دوسرے مغربی مفکرین نے ہمیں زندگی کا جو شعور دیا ہے وہ ہمیں زندگی کی مستند توجیہات پر مبنی محسوس ہوتا ہے۔ چنانچہ اگر ایک جانب اپنے تخلیقی ادب میں ہماری زندگی کے تجربوں کو ان مغربی پیمانوں میں بھر کر پیش کیا جارہا ہے تو دوسری طرف اُس کی توجیہہ کے لئے مغربی فکر و فلسفہ کا سہارا لیا جاتا ہے۔

خالد عابدی: کیا اُردو تنقید اس قدر پچھڑی ہوئی ہے کہ ہم کو قدم قدم پر مغرب کی طرف دیکھنا پڑتا ہے اور بغیر اُن کے حوالوں کے ہم ایک قدم نہیں بڑھا سکتے۔

حامد حسین: اُردو تنقید کے پچھڑے ہوئے ہونے کا سوال تو اُس وقت پیدا ہوتا ہے جب ہم نے اُردو تنقید کے کسی خصوصی انداز کو ترقی دی ہوتی۔ صورتِ حال یہ ہے کہ اُردو تنقید ابھی تک کرائے کے مکان میں رہنے پر قانع ہے۔ تخلیقی عمل کو سمجھنے اور پرکھنے کے لئے ہم مغربی اصولوں کو مجرب نسخوں کی طرح استعمال کر رہے ہیں اور اکثر یہ بھول جاتے ہیں کہ ہمارے تخلیقی ادب کے مزاج کے لئے مغرب کے پیٹنٹ کئے ہوئے نسخے موافق پڑتے ہیں یا اُن کا کوئی مہلک ردِ عمل بھی ہو سکتا ہے۔ چنانچہ ہم نے مغرب سے سراب شعور کی مدد سے غزل کی پراگندہ خیالی پر نکتہ چینی کی ہے۔ عدم تسلسل کی شکایت کی ہے۔ اخلاقی اقدار کے ذکر پر پیشانی پر بل ڈالے ہیں اور واضح معنویت کے مطالعے کے لئے جو اصول اور اسالیب مقرر کئے ہیں اُن سے بے توجہی تو ممکن نہیں ہے لیکن اپنی ثقافتی وراثت، ادبی روایت، تخلیقی رُجحان اور جمالیاتی تقاضوں کے پیشِ نظر یہ ممکن ہے کہ ہم ایک ایسے نقطۂ نظر کو ترقی دے سکیں جو ہمیں ہمارے ادب کو زیادہ پُر معنی انداز میں سمجھنے میں مدد دے سکے۔

ابراہیم یوسف: حامد صاحب! میں آپ کے اِس خیال سے تو متفق نہیں کہ ہم نے اُردو تنقید کے کسی خصوصی انداز کو ترقی نہیں دی۔ ہمارا اپنا ایک اندازِ فکر اور ایک طریقۂ تنقید ہے، ظاہر ہے کہ اُصولِ تنقید جو بھی کسی زبان کے لئے مقرر کئے جاتے ہیں اُن کا تعلق نہ صرف زبان سے ہوتا ہے، بلکہ اُس کے پس منظر میں ایک پوری تہذیب اور ثقافت ہوتی ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ ہم کرائے کے مکانوں میں رہنے پر قانع ہیں۔ اگر اس کو ہم یوں کہیں کہ ہم رہتے تو اپنے ہی مکانوں میں ہیں، مگر اُس کی سجاوٹ کو مغربی عینک لگا کر بُرا بھلا کہنے لگتے ہیں، تو بات بنتی نظر آنے لگتی ہے۔

حامد حسین: میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح ہر شعر میں معنی کا جہان تلاش کرنے والے ہندوستانی سخن فہم کو ورڈس ورتھ کی شاعری سطحی اور بیجا طوالت کا شکار معلوم ہوتی ہے اسی طرح مغرب کے اُصول مشرقی شاعری کی رُوح کو سمجھنے کے لئے ناکافی ہیں۔

انجم سلمانی: آپ نے فارسٹر کے ناولوں پر ریسرچ کی ہے لیکن اُردو ناولوں پر بہت کم لکھا ہے اس کی کیا وجہ ہے۔

حامد حسین: اُردو ناولوں پر میں نے چند مضامین تحریر کئے ہیں اور چند مقالوں میں خصوصی طور پر ان کا ذکر ہے۔ میرے ایسے مضامین کی تعداد زیادہ ہے جن کا تعلق عملی تنقید کے بجائے نظریاتی تنقید سے ہے۔ یہی وجہ ہو سکتی ہے کہ آپ کو شبہ ہوا کہ میں نے ناولوں پر توجہ نہیں دی۔

انجم سلمانی: کیا آپ اُردو ناولوں سے مطمئن نہیں ہیں۔

حامد حسین: میں سمجھتا ہوں کہ اُردو ناول کو وہ بلندیاں نہیں چھو پائی ہیں جہاں تک اُردو افسانہ پہنچا ہے۔ میرے نزدیک ایک بڑا سبب یہ ہے کہ اُردو میں اچھے معیاری یا تجرباتی انداز کے ناول لکھنا اور انہیں چھپوا لینا اتنا ہی دشوار ہے جتنا کہ کسی نئے اور سنجیدہ موضوع پر فلم بنا لینا۔ اسی وجہ سے تعداد کے اعتبار سے اُردو میں ایسے ناول زیادہ تحریر کئے جارہے ہیں جن کے بارے میں ناشر کو یہ یقین ہے کہ وہ بک جائیں گے۔ اور لکھنے والے کو یہ اطمینان ہو کہ ناشر اُنہیں قبول کرلے گا۔ چنانچہ فارمولا فلموں کی طرح فارمولا ناول بھی بہت لکھے گئے اور کرشن چندر جیسے اعلیٰ افسانہ نگار نے بھی اپنے ناولوں کیلئے ایک فارمولا تیار کر لیا۔ اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اُردو میں اچھے ناول لکھے گئے میں مثال کے طور پر قرۃ العین حیدر اور قاضی عبدالستار کے ناولوں کا نام لوں گا۔ لیکن اِن گنے چنے اچھے ناولوں کے باوجود ابھی اُردو میں ایسے ناولوں کی زبردست کمی ہے جو کسی انفرادی نظریۂ حیات اور منفرد نقطۂ نظر کے حامل ہوں۔ اسی طرح ایسے ناولوں کی بھی کمی ہے جو ہندوستان کی پیچیدہ سماجی زندگی کی بھرپور عکاسی کرسکیں۔

خالد عابدی: آپ اُردو ناقدوں میں سب سے زیادہ کس سے متاثر ہوئے۔

حامد حسین: جیسا کہ میں عرض کرچکا ہوں میں نے اس وقت لکھنا شروع کیا اُس وقت ترقی پسند تحریک اپنے عروج پر تھی چنانچہ میں نے ترقی پسند تنقید کا دلچسپی سے مطالعہ کیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ

اِس دَور میں جن ناقدوں نے خاص طور پر مجھے متاثر کیا وہ احتشام حسینؔ اختر حسین رائے پوری اور ممتاز حسین تھے۔

ابراہیم یوسف : کیا آپ کا خیال ہے کہ ترقی پسند تحریک اب ختم ہو چکی ہے؟

حامد حسین : میرے نزدیک ابھی ترقی پسند تحریک ختم نہیں ہوئی ہے۔ یہ ضرور ہے کہ اِس سے وابستہ ادیبوں میں اب نہ وہ مبلغانہ جوش و خروش باقی رہا ہے جو اس صدی کی پانچویں دہائی کے ادب میں نظر آتا ہے اور نہ اس تحریک کی حمایت محض ایک رائج فیشن کی طرح کی جا رہی ہے۔ اِس کے نتیجہ میں ترقی پسند نقطۂ نظر کی تحریرات میں ایک زیادہ متوازن اور زیادہ حقیقت پسندانہ اُسلوب اختیار کیا جا رہا ہے۔ اِس توازن کو ممکن بنانے میں کچھ حد تک اُن انفرادیت پسند رُجحانات کا بھی حصّہ ہے جو ترقی پسند نقطۂ نظر کی مادیت اور قطعیت کے ردِ عمل کی شکل میں پیدا ہوئے۔

انجم سلمانی : ترقی پسند تحریک نے اُردو تنقید کی کس حد تک خدمت کی ہے؟

حامد حسین : اُردو تنقید کی تاریخ میں ترقی پسند تحریک نے بہت اہم کردار ادا کیا ہے۔ اِس تحریک نے ادب کو سمجھنے اور پرکھنے کے لئے تاریخی اسباب، مادی وسائل، معاشی اور معاشرتی نظام کے اثرات کی اہمیت کو واضح کیا ہے اور ادبی تخلیق کے پس منظر کو سمجھنے اور ادب کی سماجی معنویت پر توجہ دینے کے لئے راہیں کھولی ہیں۔ ترقی پسند تحریک کے زیرِ اثر تنقید تاثراتی انداز کے مقابلے میں منطقی اُسلوب کو زیادہ اعتبار حاصل ہوا ہے اور تنقید میں معروضیت کو قبول کیا گیا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ اس تحریک کے تحت نظریاتی تنقید کو بھی فروغ حاصل ہوا ہے۔

ابراہیم یوسف : تنقید میں بھی کچھ لوگ چونکا دینے والی باتیں کرتے ہیں۔ تنقید میں اس رویّے کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے۔

حامد حسین : تنقید میں اگر چونکا دینے والی بات صرف چونکانے کے لئے کی جاتی ہے تو وہ اپنا اعتبار پیدا نہیں کر پاتی۔ تنقید ایک منطقی اور شعوری عمل ہے اور اچھی تنقید کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ وہ قاری کو ذہنی طور پر مطمئن کرے۔ اچھا ناقد اپنے منطقی تجزیے کے ذریعہ قاری کو اپنے ذہنی سفر میں شریک کرتا ہے اور زیرِ بحث تخلیقی تجربے کے بارے میں اپنی دریافت کا حصّہ دار بناتا ہے۔ اِس طرح اگر کوئی اچھا ناقد کوئی نئی بات کہتا ہے تو اس کا مقصد محض چونکانا نہیں بلکہ اظہارِ حقیقت کے مثل ہوتا ہے۔

ابراہیم یوسف : کیا آپ نے کبھی کوئی چونکا دینے والی بات کہی ہے؟

حامد حسین : غالباً آپ کا اشارہ میرے ان مضامین کے بارے میں ہے جن میں غالبؔ اور نظیرؔ کے تعلق سے بحث کی گئی تھی۔ بعض احباب کو میرے اخذ کئے نتائج حیران کُن اور چونکا دینے والے محسوس ہوئے لیکن جن احباب نے ان دلائل پر توجہ کی ہے جو میں نے اپنے مضامین میں پیش کئے ہیں اُنھوں نے ان نتائج پر اطمینان کا اظہار کیا ہے۔ یعنی غالبؔ صدی کے دوران ڈرامائی انداز سے دیوانِ غالبؔ کا جو خطی نسخہ رُونما ہوا اُس کی بنیاد پر بعض ماہرینِ غالبؔ نے قیاسات قائم کئے وہ کچھ کم حیران کن نہ تھے۔ چنانچہ میں نے اپنے مضامین میں یہ دکھانے کی کوشش کی کہ اگر ان مفروضوں کو صحیح تسلیم کر لیا جائے تو کس قسم کے نتائج مرتب ہو سکتے ہیں۔ غالبؔ کی شاعری کے ابتدائی دَور کے بارے میں اب بھی تحقیق کی گنجائش باقی ہے اور میں نے یہ پوری کوشش کی ہے کہ موجودہ حوالوں اور ضروری شواہد کی مدد سے اس پہلو پر معروضی انداز سے بحث کی جائے۔

ابراہیم یوسف : حامد صاحب شکریہ! ہم نے آپ کے روزے میں آپ کا خاصا پوسٹ مارٹم کیا۔ اب آپ لاحول پڑھئے کہ ہم لوگ روانہ ہوں۔

حامد حسین : لاحول ولاقوۃ۔ آپ بھی کیسی باتیں کرتے ہیں۔

○○

مقالہ

ڈاکٹر سید حامد حسین اور اُن کی ادبی کاوشیں

ڈاکٹر اخلاق اثر
صادق منزل۔ چوکی امام باڑہ ۔ بھوپال ۱

ڈاکٹر سید حامد حسین اُردو زبان و ادب کے اُن خدمت گاروں میں سے ایک ہیں جو ادب کی دنیا میں دبے پاؤں داخل ہوتے ہیں، خاموشی سے ادب کی خدمت کرتے ہیں اور دیکھتے ہی دیکھتے قابلِ قدر ادبی سرمایہ اکٹھا کر لیتے ہیں۔ ان کا تعلق اردو ادب کے ان ناقدوں سے زیادہ ہے جو مشرقی ادبی روایات کی اہمیت بھی تسلیم کرتے ہیں اور مغربی علوم و فنون، شعر و ادب سے استفادہ بھی کرتے ہیں۔ ڈاکٹر سید حامد حسین نے بھوپال میں تعلیم حاصل کی۔ ۱۹۶۳ء میں ای۔ ایم۔ فارسٹر کے ناولوں کا مطالعہ" پر تحقیقی مقالہ پیش کر کے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ اردو، اور انگریزی زبانوں میں مہارت حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ انہوں نے ہندی، عربی، فارسی، روسی اور جرمنی وغیرہ زبانوں سے اچھی واقفیت حاصل کر لی ۔۔ انہوں نے روسی زبان میں سرٹیفکیٹ کے ساتھ ڈپلوما حاصل کیا۔ اور ڈاکٹر بالیگا نقرئی تمغہ انہیں عطا کیا گیا۔

صفیہ اختر اور بھوپال کے ادبی ماحول نے ڈاکٹر سید حامد حسین کی ادبی شخصیت کو بنانے، سنوارنے اور نکھارنے میں اہم حصہ لیا۔ ۱۹۴۹ء کے آس پاس سید حامد حسین کو مضمون نگاری کا شوق پیدا ہوا۔ اردو ادب اور مضمون نگاری میں باقاعدہ دلچسپی صفیہ اختر کی تربیت اور شفقت سے پیدا ہوئی۔ صفیہ اختر اُن دنوں شعبۂ اُردو حمیدیہ کالج، بھوپال سے وابستہ تھیں۔ وہ ایک ذہین خاتون اور بہترین اُستاد تھیں۔ اور الفاظ و معنی کے رموز سے آگاہ تھیں اور طلبا میں ادبی ذوق پیدا کرنے کے فن سے بھی واقف تھیں صفیہ اختر ترقی پسند تحریک سے بھی متاثر تھیں اور اُن چند لوگوں میں سے ایک تھیں جو ترقی پسند تحریک سے وابستہ ہونے کے باوجود کلاسیکی ادب سے بھی دلچسپی رکھتی تھیں۔ ڈاکٹر سید حامد حسین نے کلاسیکی ادب کا احترام اور نئی اقدار کی تلاش کی تحریک انہیں سے حاصل کی اور یہ صفات ڈاکٹر سید حامد حسین کے ادبی سرمایہ میں بڑی اہمیت کی مالک ہیں اور اُن کی ذہنی اور فکری زندگی میں نمایاں مقام رکھتی ہیں۔

صفیہ اختر نے حامد صاحب کی صلاحیتوں کو بھانپا اُن کی تربیت کی اور حامد صاحب کو اُن کی اپنی صلاحیتوں سے واقف کرایا۔ جس سے اُن میں خود اعتمادی پیدا ہوئی۔ یہی وہ زمانہ تھا جب پورے ملک میں ترقی پسند تحریک سے اُردو ادب میں نشاۃ الثانیہ کے دور کا آغاز ہو گیا تھا۔ بھوپال بھی ترقی پسند تحریک کا اہم مرکز بن گیا۔ بھوپال میں انجمن ترقی پسند مصنفین قائم ہوئی۔ کانفرنس ہوئی۔ اردو کے چوٹی کے ادیب، شاعر، نقاد، محقق تشریف لائے اور ادبی دنیا میں جان پڑ گئی۔ بھوپال میں ترقی پسند تحریک اور انجمن ترقی پسند مصنفین کے زیر اثر بہت سی ادبی انجمنیں قائم ہوئیں۔ ان انجمنوں کے ادبی جلسے پابندی سے ہوتے تھے۔ ان جلسوں میں انجمن، شہر کی دوسری ادبی انجمنوں کے اراکین، بھوپال کے بزرگ ادیب و شاعر اور بھوپال کے مہمان ادیب و شاعر شرکت کرتے تھے۔ اور تخلیقات پر سیر حاصل تبصرہ کرتے تھے۔ ڈاکٹر سید حامد حسین نے ان ادبی جلسوں میں نہ صرف پابندی سے شرکت کی بلکہ ان کے لئے باقاعدگی سے لکھا بھی۔ ان کے بیشتر مضامین اسی دور کا یادگار ہیں۔ اردو تنقید میں ان کی دلچسپی بڑھتی گئی، اردو تنقید کے مطالعہ سے انگریزی ادب میں دلچسپی بڑھی اور انگریزی کی اعلیٰ تعلیم نے اس دلچسپی کو اور بڑھایا۔ بعد میں انگریزی ادب کا مطالعہ اور تدریس پیشہ بن گیا۔

حامد صاحب کی اپنی قابلِ قدر ادبی خدمات ہیں۔ صرف تنقیدی اور تحقیقی مقالات کی تعداد سو سے تجاوز کر چکی ہے۔ نظریاتی تنقیدی مقالوں میں "ادب اور پروپگنڈا" "ہمارے ادبی نظریات" "جاسوسی ادب" "خود تنقید" "ادب اور گندگی" "ادب اور صحافت" "معاصرانہ تنقید" "ادب کی اقلیمیں" "اُردو ادب کے مطالعہ اور تحقیق سے متعلق چند مسائل" "کتابوں کا مستقبل" "ادب میں روایت کی اہمیت" "صحت مند اور جاندار ادب" "اُردو تنقید کے اصول و مسائل" اور "جدید اُردو تنقید کے رجحانات" شامل ہیں۔ عملی تنقید میں انہوں نے اپنے

۱ سے ۵ زیرلب ۔ صفیہ اختر
ناشر بمبئی

تنقیدی نظریات کی روشنی میں مختلف شعراء کے کلام اور ادیبوں کے ادبی سرمایہ کا جائزہ لیا ہے۔ ان مقالوں میں "دو افسانہ نگار — شفیق الرحمٰن اور خواجہ احمد عباس" "پریم چند کی زندگی اور اُن کا آرٹ" "نذیر احمد اور توبۃ النصوح" "فانی کے مفروضاتِ غم" "اصغر کی شاعری میں حرکت و عمل" "ذوق کی قصیدہ نگاری کے فکری عناصر" "مہدی افادی" "فانی و اصغر" "صوفی کی شاعری" "نیاز فتحپوری" "کوثر چاندپوری کے ناول" "پریم چند کے فن میں اعتدال" "مومن کا فکرِ شاعرانہ" "ذوق کی قصیدہ نگاری" "پریم چند" "اصغر کی صوفیانہ شاعری" "حالی بحیثیت نثر نگار" "ابوالکلام آزاد" "لارنس" "فنِ شاعری کا نباض — شفا گوالیاری" "ای. ایم فارسٹر اور اُس کی تصانیف" "فارسٹر اور ان کی ناول نگاری" "ڈاکٹر اقبال اور مرزا غالب" اور "اُردو تنقید میں فراق گورکھپوری کا مقام" شامل ہیں۔ تحقیقی مضامین کا تعلق غالب سے ہے۔ غالب صدی کے دوران ڈاکٹر سید حامد حسین نے غالب اور غالب سے متعلق شخصیات پر بہت اچھے مراسلے اور مقالات تحریر کیے اور ان سے غالبیات میں قابلِ قدر اضافے ہوئے۔ اِن مقالات میں "دیوانِ غالب — (نسخۂ بھوپال) کی کہانی کتابت سے گمشدگی تک" "سکندر بیگم۔ میاں فوجدار محمد خان اور غالب — چند روایات اور قیاسات" "بھوپال اور غالب" "دیوان غالب (نسخۂ بھوپال) پر ثبت دستخط اور مہریں" "کلام غالب کے خطی نسخوں میں محذوف سنہ کتابت" "بھوپال سے غالب کی قربت" "نو دریافت خطی دیوان غالب کے بارے میں" "دیوانِ غالب اور ڈاکٹر بجنوری" "دیوانِ اسد کے قطعے" "نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا" "نظیر بنام غالب" "عبدالرحمٰن بجنوری" "ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری کی تحریریں" "ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری کا قومی شعور" "کلامِ غالب کی شرحیں" اور "نسخۂ بھوپال کے مرتب — مفتی انوار الحق" وغیرہ شامل ہیں۔

ڈاکٹر سید حامد حسین نے مختلف اصناف پر بھی تنقیدی مقالے تحریر کیے ہیں۔ "ہیئت ناگ افسانے" "خطوط کی اہمیت" "انشائیہ کا مفہوم" "اُردو میں مختصر ڈراما" "اُردو میں کتابیات کی ترتیب اور اُس کے چند اصول" "رمزیہ نگاری — مفہوم اور روایت" "فنِ سوانح نگاری اور یادگارِ غالب" "خاکہ نگاری کا فن اور چند معروف" "اُردو مرثیہ کا ارتقاء" "آزادی کے بعد اُردو ناول" "اُردو کا رمزیہ ادب" "اُردو میں ببلوگرافی" "آج کے ادب میں غزل کی جگہ" اصناف ادب سے تعلق رکھتے ہیں۔ مزاحیہ مضامین میں "روپیے اور زرکھوں" "نئے بھارت کا نیا جغرافیہ" "لاٹھیوں کا اچار" "کھٹاری کل زیر کا خط ایڈیٹر طوفان میل کے نام" اور تراجم میں "منصور لورسا ڈل" مشاہرات بجلی

ای. ایم فارسٹر اور ڈاکٹر اقبال" اہم ہیں۔

احتشام حسین نے حامد صاحب سے پہلی ملاقات میں پوچھا تھا کہ "شاعر کے علاوہ آپ دوسرے رسائل کے لیے کیوں نہیں لکھتے"۔ حامد صاحب کے بیشتر مضامین "شاعر" بمبئی میں ہی شائع ہوتے ہیں۔ جناب اعجاز صدیقی صاحب نے اُن کی بڑی قدردانی کی اور ان کی فرمائش پر ہی حامد صاحب نے بہت سے مضامین لکھے ہیں۔ سید حامد حسین کے مضامین کالجوں کے میگزین، اخبارات، رسائل اور ان کے خاص نمبر میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ مضامین حمیدیہ کالج، سائنس کالج، گرلس کالج، سیفیہ کالج کے مجلّوں میں بھی شائع ہوئے اور "ندیم" "افکار" اور "قومی آواز" جیسے روزناموں میں بھی "آرٹ و کلچر" "نیا سماج" "زنجیر" "کردار" "تشکیل" "الہام" "راہی" "کتاب" "نیا دور" "سب رس" "ہماری زبان" "اردو ادب" "غبار خاطر" "افکار" (کراچی) "نگار" "عصری ادب" اور "غالب نامہ" وغیرہ میں بھی اُنکی تحریریں شائع ہوتی ہیں۔ سید حامد حسین ان لوگوں میں سے ہیں جو حوصلہ افزائی کے جذبہ میں یہ نہیں دیکھتے کہ ان کی تحریر کس معیار کے اخبار یا رسالے میں شائع ہو رہی ہے۔ چنانچہ اُنہوں نے ان لوگوں کی درخواست کبھی رد نہیں کی جو بھوپال سے رسائل نکالنے کی کوشش میں مصروف تھے۔ اُردو اخبارات کے اندرونی صفحات میں شائع ہونے والے بھرتی کے مواد کے بارے میں ہمیشہ فکرمند رہتے ہیں اور اُنکی خواہش رہتی ہے کہ کاش اخبارات کے ذمہ داران صفحات کو زیادہ مفید بناتے اور اُردو زبان کے فروغ میں حصہ لیتے۔ سید حامد حسین کی خلوص سے کئی صحافی اور مدیر متاثر بھی ہوئے اور ان کے مشوروں پر عمل بھی کیا۔

حامد صاحب کی کئی تصانیف (تالیفات اور تراجم) پایۂ تکمیل کو پہنچ چکے ہیں۔ "اردو شاعری میں تلمیحات اور مصطلحات" "حواشی قصائد سودا" "توبۃ النصوح کا ایک تنقیدی مطالعہ" "کلیدِ اقبال" "نسخۂ حمیدیہ" "تدوینِ لغت" "ادبی اصطلاحات" "اُردو بہتر بنائیے" "ہندو نظریۂ زندگی" (ڈاکٹر رادھا کرشنن کی کتاب کا ترجمہ) "مسجد، مندر اور گرجا گھر" (فارسٹر کی کتاب کا ترجمہ) اور انگریزی میں

A STUDY OF THE NOVEL BE 'E.M. FORSTER.

E.M. FORSTER AND INDIA

FORSTER'S LETTERS TO HIS INDIAN FRIENDS اور

وغیرہ اشاعت کیلئے تیار ہیں۔

"اردو شاعری میں تلمیحات اور مصطلحات" اُردو شاعری کے مطالعے کے لئے حوالے کی اوّلین کتاب ہے جو انگریزی زبان میں موجود حوالے کی کتابوں کے نمونے پر دس سال کی محنت کے بعد تیار کی گئی ہے۔ اس میں اُردو شاعری میں مستعمل تاریخی

واقعات، قرآن و احادیث کے حوالوں، شاہنامے اور دوسری منظومات میں مذکور افراد اور نجوم، تصوف، فلسفہ اور جنگ وغیرہ کی اصطلاحات پر توضیحی اندراجات شامل ہیں۔ اس کارنامے کے بارے میں ڈاکٹر مسیح الزماں نے تحریر فرمایا تھا کہ "آپ نے جو کام کیا ہے، اُس پر اس میدان میں برسوں گزارنے والوں کو بھی رشک آئیگا۔" "حواشی قصائدِ سودا" میں سودا کے منتخب قصائد پر حاشیے لکھے ہیں جن میں مشکل الفاظ اور حوالوں کی وضاحت کی گئی ہے۔ "ادبی اصطلاحات" میں شاعری، ادب، قواعد اور لسانیات کی اصطلاحات پر بڑی عرق ریزی اور دیدہ وری سے مواد اکٹھا کیا ہے۔ ابہام، استعارہ، ایکٹ، انشائیہ، اصولِ تعمیر، اظہاریت اور امیج وغیرہ پر بہت مفید اور مستند مواد یکجا کیا ہے۔ "کارِ غالب" میں کلامِ غالب کا CONCORDANCE تیار کی ہے جس کی مدد سے ایک لفظ کے ذریعے پورے شعر کو تلاش کیا جاسکتا ہے۔

غالب صدی کے دوران ڈاکٹر ابو محمد سحر صاحب کے ساتھ حامد صاحب کو نسخۂ حمیدیہ طبع ثانی کے لئے تیار کرنے کا موقع ملا اور نسخۂ حمیدیہ کے متن کا دوسرے نسخوں سے تقابل کرنے کے بعد صحیح اور معیاری متن تیار کرنے کی کوشش کی۔ غالبیات میں اُن کی دلچسپی بڑھتی گئی اور ہندو پاک کے معیاری رسائل میں ان کے بصیرت افروز مقالے شائع ہوئے۔ ان کے مقالے کاغذ کا بوجھ نہیں بلکہ غالبیات میں اضافہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ سید حامد حسین نے نواب فوجدار محمد خاں کے کتب خانہ کی مہر تلاش کی اور اُس کی مدد سے اس کا سن کا تعین کیا جس سے پہلے نسخۂ بھوپال اس کتب خانہ میں پہنچ چکا تھا۔ ساتھ ہی انہوں نے نواب فوجدار محمد خاں کے حالات و واقعات اور اُن کے علمی مشاغل کو تفصیل سے پیش کیا۔ عام طور سے یہ تسلیم کیا جاتا تھا کہ مفتی انوار الحق کو علمی و ادبی کاموں سے دلچسپی نہیں تھی اور انہوں نے صرف محکمۂ تعلیمات میں ہونے کی وجہ سے ہی نسخۂ حمیدیہ مرتب کیا تھا۔ انہوں نے مفتی انوار الحق کی سوانحِ حیات، علمی و ادبی خدمات سے واقف کرایا۔ ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری کے حالاتِ زندگی سے اُردو دنیا واقف نہیں تھی۔ سید حامد حسین نے ریاست بھوپال کے سرکاری ریکارڈ سے ان کی تاریخ پیدائش تلاش کی۔ ان کی زندگی کے حالات پر سے پردہ اٹھایا۔ انجمن ترقی اُردو کی رپورٹوں سے بجنوری کے دیوانِ غالب کی ترتیب میں حصے کے بارے میں معلومات یکجا کیں اور حمیدیہ لائبریری کے پرانے ریکارڈ سے نسخۂ بھوپال سے دریافت کی قریب ترین تاریخ متعین کی۔ غالب صدی کے دوران دستیاب خطی نسخہ کو انہوں نے "دیوانِ اسد" کا نام دیا اور اس کی دریافت کے بعد اسکے ۱۹ سال کی عمر میں تکمیل پانے کے بارے میں دعوے کئے گئے۔ حامد حسین نے اس رجحان میں اعتدال پیدا کرنے کے

شاعری بھی

لئے تین دلائل کے ذریعے کوشش کی۔ نودریافت دیوان میں بعض غزلوں میں تخلص کی کمی اور آخر میں سنہ کی غیر موجودگی سے پیدا ہونے والے نتائج کی جانب توجہ دلائی۔

غالب اور نظیر اکبرآبادی کے تعلق پر ماہرینِ غالبیات نے زیادہ دلچسپی نہیں لی۔ حالانکہ حالی اور حسرت وغیرہ نے دبی زبان سے تعلق کا امکان ظاہر کیا ہے۔ سید حامد حسین نے اس موضوع پر بہت کھل کر بے جگری سے لکھا اور ان کے اس مقالے پر سخت اعتراضات بھی ہوئے۔ اس سلسلہ میں ان کا نقطۂ نظر ہے کہ ابتدا میں نظیر اور غالب کی بحث استادی اور شاگردی تک محدود رہی۔ بعد میں اس بحث سے نئے گوشوں کا اضافہ ہوتا رہا۔ مخمور اکبرآبادی نے "روحِ نظیر" میں دونوں شعراء کے کلام میں مماثلت اور تراکیب سازی کے رجحان میں یکسانیت پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ "نسخۂ بھوپال" اور "نسخۂ اسد" کی دریافت کے پیشِ نظر اس مسئلہ کا جو جائزہ لیا جانا چاہئے تھا وہ نہیں لیا جاسکا تھا۔ اس کمی کو پورا کرنے کی انہوں نے کوشش کی تھی۔ ان کے نزدیک غالب کی شعری زندگی کے ابتدائی دور کے بارے میں اتنی کم معلومات دستیاب ہیں کہ ابھی تک اُس دور کے بارے میں وثوق کے ساتھ کچھ کہنے کیلئے بہت کم بنیاد ملتی ہے۔ خود غالب کے اپنے بارے میں بیانات اتنے متضاد ہیں کہ ان سے کوئی ایک نتیجہ نکالنا مشکل ہے۔ لیکن غالب کے بارے میں تحقیق میں جو ایک اندیشہ ناک رجحان پیدا ہوا ہے وہ یہ ہے کہ دریافت کے جوش میں محققین بعض اوقات اتنی جلدی میں ہیں، احتیاط اور معروضیت سے کام نہیں لیتے جو تحقیق کے لئے ضروری ہے۔ ایسی اضطراری تحقیق جس کی بنیاد خوش عقیدگی پر رکھی گئی ہو کبھی کبھی بعض انتہائی خطرناک نتائج کی جانب بھی لے جاتی ہے۔ اس طرح بعض محقق نسخۂ بھوپال کے بارے میں خوش عقیدگی کے تحت یہ سمجھ رہے ہیں کہ یہ خطی نسخہ بار بار غالب کے پاس تصحیح کے لئے گیا اور اس میں جتنی اصلاحات ہیں وہ سب غالب کے اپنے ہاتھ سے کی گئی ہیں اور ایسی اصلاحات جن میں املے کی فاش غلطیاں ہیں وہ بھی غالب نے اپنے ہاتھ سے کی ہیں اور اُنکے لئے شاعر کا عالمِ مدہوشی میں ہونا بتایا گیا ہے۔ بعض محققین بیس سال کے بعد اس حالت میں جبکہ نسخہ کی اصل گم ہو چکی تھی اور اس سے توثیق کرنے کے موقع نہ تھے، اس نتیجے پر پہنچے کہ یہ اصلاحات کسی اور نے کی تھیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ یہ محققین تحقیق کے منصب اور اس کی ضروریات کو سمجھتے ہیں لیکن خوش عقیدگی کی وجہ سے وہ صحیح نتائج تک نہیں پہنچ سکے۔

"نسخۂ اسد" کے بارے میں بھی کئی نتائج نکالے گئے ہیں اور ان

میں اس اضطراری تحقیق کے نشانات ملتے ہیں۔ سید حامد حسین نے اپنے مضامین میں اُن پہلوؤں کی جانب توجہ دلائی ہے جو ان قیاسات کے برخلاف ثبوت پہونچاتے ہیں کہ غالب نے ۱۹ سال کی عمر میں ایک ایسا دیوان مکمل کرلیا ہوگا جس کا کلام پختگیِ فکر اور متانتِ خیال میں اپنی مثال نہیں رکھتا جبکہ غالب کی عنفوانِ شباب کی زندگی کے بارے میں جو بیانات ملتے ہیں وہ بظاہر یہ ثابت کرنے میں ناکافی ہیں کہ اس کم عمری میں غالب نے سوائے فکرِ سخن کے اور کسی مشغلے میں وقت صرف نہیں کیا۔ جہاں تک نظیر سے استفادہ کا سوال ہے اس کے لئے قرائن موجود ہیں اور ان پر سید حامد حسین نے داخلی اور خارجی شہادتوں کی مدد سے تفصیل سے بحث کی ہے۔

ان کی خواہش ہے کہ غالب کے بارے میں بالخصوص اُن کی شعری زندگی کے ابتدائی دور کے بارے میں احتیاط کے ساتھ چھان بین کی جائے اور محض عقیدت یا مروّت کو بنیاد نہ بنایا جائے اور کیونکہ وہ خود نظریہ کو عقیدہ بنانا ٹھیک نہیں سمجھتے اس لئے انہیں اصرار نہیں کہ نظیر سے متعلق ان کے نظریے کو حرفِ آخر سمجھا جائے۔ ان کا مقصد یہ ہے کہ ان مسائل پر کھلے دماغ کے ساتھ دلائل کی روشنی میں بحث کی جائے۔ ان کا کام ایک بُت توڑ کر دوسرا بُت بنانا نہیں ہے بلکہ غالب کے شعری امتیاز کو سمجھ میں آنے والے دلائل کی مدد سے زندگی کی کمزوریوں اور بلندیوں کو بیک وقت نظر میں رکھتے ہوئے سمجھنے کی کوشش کرنا ہے۔ ایک وقت تھا جبکہ غالب کی شراب نوشی اور قمار بازی کا ذکر کرنے سے غالب کے سوانح نگار اور محققین کو تامل ہوتا تھا۔ لیکن عصرِ حاضر کے حقیقت پسندانہ رویّہ نے اب اس سلسلہ میں کھل کر بات کرنے کیلئے راستہ کھول دیئے ہیں۔ اسی طرح انہیں توقع ہے کہ غالب کی شاعری کو الہام سمجھنے کی روایت بھی زیادہ حقیقت پسندانہ رنگ اختیار کرے گی اور غالب کے شعری سرمائے میں کہیں پیوندکاری کا شبہ ہوتا ہے تو اس کے بارے میں بھی ناقد اور محقق بے جھجک بات کرسکیں گے۔

انگریزی زبان و ادب کے مطالعہ اور تدریس نے حامد صاحب پر اُردو زبان و ادب کی تدریسی تنگ دامنی عیاں کردی۔ اُنہوں نے اُردو میں حوالوں کی کتابوں کی ضرورت کو پورا کرنے کی کوشش کی ہے اور اُردو زبان و ادب کے طلبا اور اساتذہ ان سے مستفید ہوں گے۔ انگریزی ادب کے مطالعے نے ہی اُن کے دل و دماغ کو روشن کیا اور اس بصیرت سے اُنہوں نے اُردو زبان و ادب کے مسائل کو سلجھانے کی کوشش کی۔ انگریزی اور اُردو ادب کا تعلق، ایک زبان کے دوسری زبان پر اثرات، مغربی تنقید اور مشرقی تنقید پر اُن کے خیالات ٹھوس اور جاندار ہیں۔ اُن کے مطابق انگریزی میں لکھا جانے والا ادب اس وقت دنیا کے جاندار ادبوں

[illegible]

میں سے ہے اور بیسویں صدی نے اس کے اثرات اردو پر مرتب ہوئے ہیں۔ نظریاتی تنقید میں اُردو نے انگریزی سے بہت استفادہ کیا ہے۔ اس استفادہ کے دو پہلو ہیں۔ اولاً یہ کہ ان سے فن اور تخلیقِ فن کے عمومی مسائل کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ دوسرے یہ کہ خود مغرب کے زیرِ اثر جو اصناف اور تحریکات اُردو میں آئیں ان کو سمجھنے میں سہولت ہوئی۔ دورِ حاضر کی فکر بڑی حد تک مغربی افکار کی مرہونِ منت ہے۔ انسان کی تہذیبی زندگی اور اُس کے نفسیاتی مسائل کو سمجھنے کے لئے مغرب میں جو نظریات بنائے گئے ہیں انہوں نے ہمارے ذہن و فکر کو بھی متاثر کیا ہے اور اکثر مغرب میں وضع کئے گئے تنقیدی اصولوں سے بھی روشنی ملتی ہے۔ حامد حسین کے نزدیک یہ بات مدِنظر رکھنے کے قابل ہے کہ جہاں تک فن اور تخلیقِ فن سے متعلق آفاقی نوعیت کے مسائل کا تعلق ہے مغرب کے اصول ہماری رہنمائی کرسکتے ہیں۔ لیکن فن کی تخلیق مقامی اثرات سے کاملاً آزاد نہیں رہ سکتی۔ اس لئے ہمیں اپنے ادب پر مغربی اصولوں کو جوں کا توں استعمال کرنے میں احتیاط برتنے کی ضرورت ہے۔ وہ نظریات جو ایک خاص خطۂ زمین کے حالات کے پروردہ ہیں دُنیا کے ہر حصے میں یکساں طور پر پورے نہیں اُتر سکتے۔ غزل اور قصیدے کی شاعری۔ روایات و محاکات۔ مُٹھی میں کائنات کو سمیٹنے اور قطرہ میں دجلہ دیکھنے کا رجحان۔ یہ سب تہذیب کی تاریخ میں محض ایک سراب صفت جلوہ نہ تھے بلکہ یہ ایک ایسا طاقتور سیلان تھا جو تقریباً چار صدی ہند ایرانی تہذیب کا امتیازی انداز اظہار بنا رہا۔ اور جس کی گونج سے آج کا ہندوستانی ادب بھی آزاد نہیں ہے۔ چنانچہ جس طرح ہندوستانی موسیقی کو سمجھنے کے لئے مغربی موسیقی کے اصول پوری طرح مدد نہیں کرسکتے اسی طرح اُردو ادب کی روایات اور اُس کی رُوح کو سمجھنے کیلئے بھی مغربی اصول ناکافی ہیں اور اس کی ضرورت باقی رہتی ہے کہ ہم اپنی اس ثقافتی میراث کے سرچشموں اور اس سے سیراب ہونے والی تحریکات کا پورا جائزہ لیں۔ اور ان کے فکری اور منطقی روابط کو سمجھیں۔ اپنے ادبی سرمائے کو سمجھنے کے لئے خود نظریات وضع کریں۔

مشینی زندگی پر ناز کرنے والے ممالک کی سماجی اور نفسیاتی زندگی میں جو اُلجھنیں اور گتھیاں پیدا ہوچکی ہیں اُن سے ابھی تک بعض ترقی پذیر ممالک دُور ہیں۔ چنانچہ ادب اور تنقید کے جو نظریات میکانکی زندگی کے مسائل کو مدِنظر رکھتے ہوئے تیار کئے جائیں گے وہ یقیناً اس ادب کے لئے صحیح نہیں ہوں گے جہاں یہ مسائل بنیادی اہمیت نہیں رکھتے۔ چنانچہ ان کی رائے میں اس وقت ہمیں تنقید کے لئے نظریہ سے زیادہ تنظر کی ضرورت ہے۔ ان کے نزدیک ہمارے لئے دوسرے ماحول پر صادق آترنے والے اصولوں کی پیروی

سے زیادہ یہ ضروری ہے کہ اس صلاحیت کو فروغ دیں جو ہمیں ہمارے اپنے ادب کی عصری تحریکات کو سمجھنے میں مدد دے۔ اصولِ فن اور انسانی عوامل کو سمجھنے میں مدد دینے والے علوم سے ہمیں مغرب سے استفادہ کرنے میں ہچکچانے کی ضرورت نہیں لیکن ادب اور زندگی کی تعمیر کے لئے ہمیں ہمارے اپنے نقطۂ نظر کی ضرورت ہے جو ہمارے آس پاس تخلیق کئے جانے والے ادب کی معنویت کو نمایاں کرسکے اور انسان کے تہذیبی سرمائے میں اس فن کے ذریعے کئے جانے والے اضافے کو دوسرے احوال میں انسانی تجربے کے اظہار سے ممتاز کرسکے۔

اردو میں عملی تنقید کے بارے میں ان کا خیال ہے کہ ابھی اس میدان میں کام کرنے کی کافی گنجائش ہے۔ اسوقت اردو میں اس نوعیت کی تنقید کے جو نمونے ملتے ہیں ان میں یہ بات نمایاں ہے کہ وہ اکثر تنقید نگار کی منفرد تخلیقات ہیں۔ ان میں تسلسل، ناقد کے عرفانِ حیات اور زاویۂ نظر کی وضاحت اور ان میں وسعت، ناقد کی دوسری تنقیدی تخلیقات کے ذریعے نہیں ہوگا۔ تنقید نگار کا فن ایک جامد فن نہیں، جو کہ صرف چند متعین پیمانوں سے پیمائش کرتا ہے بلکہ وہ ایک ترقی پذیر فن ہے۔ ایک عمل ہے، جو نئے نئے فن پاروں اور فن کاروں کو زیرِ بحث لاکر زیادہ سے زیادہ متوازن اور آفاقی نوعیت اختیار کرلیتا ہے۔ اس طرح خود ناقد کا نظریۂ حیات ترتیب پاتا ہے اور اس کا کام تعبیر و تشریح سے بڑھ کر بجائے خود زندگی اور کائنات کا ایک نیا عرفان پیش کرنا بن جاتا ہے۔ اردو میں اس قسم کی پیہم تنقیدی کاوشوں کی کمی ہے۔ اس کی دو وجہیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ ہمارے ہاں اکثر تنقید یا تو فرمائش یا پھر ضرورت کا نتیجہ ہوتی ہے کسی رسالے کے ذریعہ مضمون کی فرمائش، کسی جلسے کیلئے خطبۂ صدارت، ریڈیو کے لئے کسی موضوع پر تقریر یا پھر کسی ڈگری کے حصول کیلئے تیار کیا گیا مقالہ عملی تنقید کا نمونہ ہوسکتا ہے لیکن اگر ایسی کوشش کسی مستقل تنقید نگاری کی کڑی نہیں ہے تو صرف اسکے ذریعے تنقید نگار کو اپنے تنقیدی نقطۂ نظر کو ترقی دینے کے مواقع نہیں مل سکتے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ تنقیدی کاوشوں کے لئے حیات و کائنات کے کسی منفرد اور مربوط نقطۂ نظر پر زور نہیں دیا ہے۔ اس کے نتیجے میں پیہم تنقیدی عمل کے لئے حوصلہ افزائی نہیں ہوپائی۔ ان کے نزدیک مجنوں گورکھپوری نے عملی تنقید کو فروغ دینے میں نمایاں خدمات انجام دی ہیں۔

تنقید اور تخلیق کے قریبی رشتہ کے وہ قائل ہیں لیکن دونوں کو ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم نہیں سمجھتے۔ ان کا خیال ہے کہ تنقید کا کام موجود حقائق کی چھان بین اور ان میں ربط و معنی کی تلاش ہے۔ تحقیق کا کام موجودہ حقائق کی توثیق اور نئے حقائق کی تلاش ہے۔ یہ دونوں کام آزادانہ طور پر بھی کئے جاسکتے ہیں۔

ثناء بمبئی

لیکن زیادہ متوازن رجحان یہ ہوگا کہ تنقید کے دوران حقائق کی تحقیق بھی مدِنظر رکھی جائے اور تحقیق کے دوران یہ بات بھی پیشِ نظر رکھی جائے کہ دریافت کئے جانے والے حقائق فنکار یا اس فن سے بامعنی ربط رکھتے ہوں۔ قدیم ادبی تخلیقات کی تلاش اور ان کا تعارف یقیناً اہمیت کا حامل ہے۔ ایسی تخلیقات نہ صرف ادبی تاریخ میں اضافے کی حیثیت رکھتی ہیں بلکہ وہ ہمیں انسانی ذہن و فکر کو سمجھنے میں مدد دیتی ہیں۔

معاصر تنقید کے بارے میں وہ تحریر فرماتے ہیں کہ "اپنے دور کے فن پر تنقید کرتے ہوئے ناقد کو پہلے اپنے عہد سے ہمدردی ہونا ضروری ہے۔ ہمدردی سے مراد وہ جانبداری نہیں ہے جو سیاسی یا دوسری سماجی تحریکات کے تحت پیدا ہوتی ہے۔ تنقید نگار کی ہمدردی اپنے دور کے تخلیقی سرچشموں اور اپنے دور کے نئے فنی تجربوں سے تعلق رکھتی ہے۔

جہاں ایک تنہا ادیب پر تنقید کرنے کی بات ہے وہاں کبھی کبھی ایک دقت پیدا ہوجایا کرتی ہے۔ وہ ادیب سے ناقد کا ذاتی ربط ہے۔ سائنٹفک تنقید کرتے وقت ہم ناقد سے یہ چاہتے ہیں کہ وہ بالکل غیر متاثر ہو اور جو کچھ کہے ایک سائنسداں کی طرح تاکہ سماجی، معاشی اور نفسیاتی پہلو آسکیں۔ یہ تنقید کا آئیڈیل ضرور ہے مگر صحیح معنوں میں ہم زندہ ادیب کی شخصیت کو زندہ ناقد کے ذہنی پس منظر سے جدا نہیں کرسکتے۔ ناقد کے فیصلے اور اس کی نظر میں ادیب کے بارے میں، اس کی شخصیت کے بارے میں کسی نہ کسی قسم کا ردِ عمل شامل ہوسکتا ہے۔ ادیب کی شخصیت سے تعلق رکھنے والے عناصر اگر وقتی طور پر کسی ناقد کے فیصلوں کو رنگ بھی دیتے ہیں تو بھی وہ کم از کم آنے والے دور کے ناقدوں کے لئے کچھ معلومات مہیا کردیتے ہیں۔" ان کی معاصر تنقید میں بھی کئی رنگ ملتے ہیں۔ سائنٹفک تنقید، وہ تنقید ہے جو زندہ ادیبوں اور ناقدوں سے شخصی تعلق اور تاثر سے وجود میں آئی ہے، اور وہ تنقید جو حوصلہ افزائی کیلئے کی گئی ہے۔

حامد صاحب مختصر تنقیدی مضامین لکھنے کے حق میں ذاتی طور پر نہیں ہیں، وہ مستقل اور مبسوط نوعیت کے ایسے کاموں کو ترجیح دیتے ہیں جن میں لکھنے والے کو ایک موضوع کے ہر گوشے سے بحث کرنے کا موقع ملے اور قاری کو موضوع سے متعلق زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل ہوجائیں اور وہ ان مضامین کو محفوظ رکھنے کی ضرورت محسوس کرے۔ عام طور سے انہوں نے ایسے ہی مضامین تحریر فرمائے ہیں جو اپنے اندازِ نظر، علمی اور منطقی اندازِ پیشکش اور تحقیقی معلومات، نتائج کیلئے اہم ہیں اور انہیں طلباء سے لیکر اساتذہ تک محفوظ رکھتے ہیں۔ حامد صاحب نے

ن تحریروں میں اسلوبِ بیان کے مختلف نمونے پیش کئے ہیں۔ یہ اقتباسات طویل ضرور
وۓ مگر حامد صاحب کے طریقۂ تنقید و تحقیق اور اسلوبِ بیان کے مطالعہ کے لئے ضروری
ں۔ سکندر بیگم، میاں فوجدار محمد خاں اور غالب (چند روایات اور اقتباسات)
ں تحریر فرماتے ہیں۔

"غالب سے اگر فوجدار محمد خاں کی بکثرت مراسلت
تھی، تو وہ کہاں گئی۔ نہ تو غالب کے مجموعۂ مکاتیب
میں کہیں فوجدار محمد خان کے نام کوئی خط نظر آتا
ہے اور نہ غالب کے نام فوجدار محمد خان کے کسی
خط کا حوالہ ہی ملتا ہے۔ فوجدار محمد خان کی
حیثیت عام لوگوں جیسی نہ تھی کہ اُن کی یا ان سے
کی گئی مراسلت ضائع ہو جاتی۔ وہ والیٔ بھوپال
قدسیہ بیگم کے حقیقی بھائی تھے اور سکندر بیگم کے
حقیقی ماموں تھے۔ ایک اچھی جاگیر کے مالک تھے۔
ان کے یہاں باقاعدہ محررین مقرر تھے۔ جو ان کی
مراسلت کی نقلیں رکھتے تھے۔ اس وقت بھی
بھوپال سنٹرل لائبریری میں فوجدار محمد خان
کے خطوط کی نقول پر مشتمل سات جلدیں محفوظ
ہیں۔ لیکن ان میں بھی کہیں بالواسطہ یا براہ
راست غالب سے اُن کی خط و کتابت کے بارے
میں کوئی اشارہ نہیں ملتا۔ یہاں تک کہ فوجدار
محمد خان کے بیٹے یار محمد خان شوکت نے جب
"انشائے نورِ چشم" مرتب کی تو وہ کوئی ایسا خط
شامل نہیں کر سکے جو ان کے والد نے یا غالب
نے ایک دوسرے کو لکھا ہو۔"

"اردو میں مختصر ڈرامہ" میں زندگی اور ادب کے تعلق پر اظہار ملاحظہ
کیجئے:—

"زندگی کا نہ مربوط اور محیط تصور تو کبھی زیادہ
اہم بالشان فن پاروں کی تخلیق کا سبب
بنتا تھا، آج کی پراگندہ خیال دنیا میں ناممکن
ہے اور ایسے فن پاروں کی تخلیق، یوں سمجھئے،
موجودہ دور کے انسانی تجربہ کے خلاف ہے۔
اس تیزی کے ساتھ بدلتے ہوئے اور مصروف
اور عجلت پسند مشینی دور میں انسان کے پاس
صرف اتنی فرصت ہے کہ وہ بجائے زندگی کے
ایک کلّی تصور کے صرف چند بامعنی پہلوؤں
کے شعور پر اکتفا کرے۔ یہ جزوی شعور دراصل
اس تجزیاتی رجحان کی دین ہے جو عہدِ حاضر کی
پارہ پارہ ہوتی ہوئی زندگی میں ترقی پا رہا
ہے۔ ہمارا زمانہ تخصیصی مہارت کا زمانہ
ہے جب کہ ہم موضوع کو کلّی طور پر مطالعہ کرنے
کے بجائے موضوع کو اُس کے فروعی مسائل میں
تقسیم کر کے اُس کا جزواً جزواً مطالعہ کرنے پر
زور دیتے ہیں۔ اس تخصیصی مطالعے نے ہمیں
چیزوں کو قریب سے دیکھنا سکھایا ہے۔ اور اسی
تجزیاتی رجحان نے ہم کو انسان کی ذہنی زندگی
کی پیچیدگیوں سے روشناس کیا ہے۔ اور
نفسیاتی کشمکشوں اور داخلی آویزشوں سے
ایک ایسی دنیا ترتیب دی ہے جو اپنی ہئیت کے اعتبار سے
میں خارجی دنیا کے پیچ و خم سے کسی طرح
کم نہیں ہے۔"

"جدید تنقید کے اصول و مسائل" میں استدلالی اور منطقی انداز اور
اسلوب دیکھئے:—

جدید ناقد کو بالغ نظری کی ضرورت اس وجہ
سے ہے کہ عہدِ حاضر کی وہ تخلیقات جن کا اس
کو محاکمہ کرنا ہے بسا اوقات اپنے توازن و
ترتیب اور ترسیل و ابلاغ کے ضابطے خود بناتی
ہے۔ فنکار نیا سلسلۂ علامت وضع کرنے کیلئے
اپنے شعور و عرفان کے سارے سرچشموں سے
فائدہ اٹھایا جاتا ہے اور اپنے معنی خیز رموز کے
درمیان جو باہمی روابط و علائق تیار کرتا ہے
ان میں بعض اوقات ایک مخصوص نحوی ترتیب اور
معنوی توازن ہوتا ہے۔ ناقد کے لئے یہاں

زینبی

ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ فن کار کے تخلیقی تجربے سے کم از کم ایک نظریاتی ہم آہنگی قائم کر سکے۔ اگر ناقد فنکار کے تخلیقی سرچشموں کو سمجھنے سے قاصر ہے تو وہ فن کار کی تخلیق کے محسن اور اس کی معنویت کو سمجھنے میں کچھ کوتاہی کرے گا۔

چنانچہ ناقد کو ان محرکات کا شعور حاصل کرنا ضروری ہے جو کسی فن کار کے فن کو ایک مخصوص اسلوب و رنگ دیتے ہیں اور فکر و خیال کو ایک خاص انداز میں یا چند منفرد اشاروں کے ذریعے متشکل کرنے پر آمادہ کرتے ہیں۔ چنانچہ آج پہلے سے کہیں زیادہ ناقد کے لئے یہ ضروری ہو گیا ہے کہ وہ ایسی بالغ نظری سے کام لے کہ وہ فن پارے کی تہ در تہ معنویت کے پس پردہ محرکات و تاثرات کو تلاش کر سکے۔ اور ان کے درمیان ربط کو سمجھ سکے۔ اس طرح آج تنقید ایک نہایت ذمہ دارانہ فن ہے۔ جہاں اسے خس و خاشاک اور سورج کی کرن میں امتیاز کرنے میں احتیاط لازم ہے وہیں اسے تنے فن کار کے تجربے سے ہمدردانہ مفاہمت اور بالغ نظری کی بھی احتیاج ہے۔ ان دو بنیادی ضرورتوں کے پورا ہونے کے بعد وہ اپنی تنقید کے لئے کوئی بھی رجحان اختیار کر سکتا ہے۔ وہ چاہے نقد فن کے ذریعہ انسانی نفسیات کی پیچیدگیوں کو واضح کر سکتا ہے۔ چاہے تو محض فن پاروں میں معاشرتی مسائل کے پرتو کو تلاش کر سکتا ہے۔ عہد جدید میں ایک نظام فکر کی حیثیت سے تنقید کو مختلف زاویوں سے تفتیش کرنے اور انسان کے مخزن فکر میں اضافہ کرنے کا پورا حق ہے۔ لیکن دوسرے سارے فکری علوم کی طرح اس میں بھی معروضیت (OBJECTIVITY) متانت (SERIOUSNESS) اور موزونیت (RELEVANCE) انتہائی ضروری ہے۔"

عابد صاحب کی تخلیقی تنقید کے نمونے ملاحظہ فرمائیے :-

"فراق کی تنقید میں تاثر عقل کے تہ خانوں سے داخل نہیں ہوتا۔ وہ لمس و صوت اور رنگ و بو کے وسائل سے ذہن میں اتر کر گونج پیدا کرتا ہے۔ اُن کی تنقید فکر کا ریاض نہیں، شعور کا نغمہ ہے۔ وہ سرگرانی پیدا نہیں کرتی بلکہ احساسات کو جلا بخشتی ہے۔ اس کا مقصد تاثر کو علمیت کا آہنی خول پہنانا نہیں بلکہ اسے زندگی کے وجدان کا ایک پر تاثیر جزو بنانا ہے .... اس طرح فراق یہ چاہتے ہیں کہ تنقید کا منصب ادب کے طفیلی کا نہ ہو بلکہ وہ بجائے خود زندگی کا بھرپور تجربہ ہو۔ چنانچہ فراق نے اپنی تنقید میں شاعری کے پیراہن کے ایک ایک تار کو الگ کر کے آسودگی محسوس نہیں کی ہے، بلکہ اس کے تار و پود سے پیدا ہونے والے نقوش کے حسن کو اپنے ذہن میں جذب کرنے کی کوشش کی ہے۔"

تنقید کا نام، شعور اور آل احمد سرور کا سا انداز بیان دیکھئے :

"اردو میں تنقید کو تختۂ گل بنا کر پیش کرنے کی بنا محمد حسین آزاد نے ڈالی تھی۔ لیکن اس اسلوب میں تخلیقی تجربے کی گہرائی، احساس کی گرمی اور فکر کے وزن کے لئے گنجائش پیدا کرنے کا سہرا فراق کے سر ہے۔ فراق نے تنقید کے راہبانہ فن کو رندی کے آداب سکھائے ہیں۔ انہوں نے تنقید کی سنگلاخ راہ میں شعری تخیل کے لئے نازک روشیں تیار کی ہیں۔ ان کے قلم سے نکلی ہوئی تنقید سیال شاعری ہے جسے انہوں نے منطق کے پیمانے میں انڈیل کر پیش کیا ہے بلکہ یوں کہیے کہ

شاہد جیبی

ان کی تنقید نثرِ شعر کی آبرو کی خراج ہے۔

حامد صاحب مشرق و مغرب کے بہترین فکری سرچشموں سے سیراب ہوئے ہیں اور انہوں نے عرفانِ حیات کے ساتھ عرفانِ ادب حاصل کیا ہے۔ ان کے ہاں آفاقی تصورات اور اصولوں کے ساتھ ساتھ مقامی اور علاقائی اثرات اور اصولوں کی بھی اہمیت ہے۔ وہ ادب کے صالح اور صحت مند روایات کے ساتھ ساتھ روحِ عصر سے ہم آہنگ جدت کا احترام بھی کرتے ہیں۔ وہ اجتماعی شعور کے ساتھ ساتھ انفرادی شعور و عرفان کے بھی قائل ہیں۔ ان کے نزدیک ہمارے اپنے دور کی تخلیقات جن میں توازن و ترتیب، ترسیل و ابلاغ کے اپنے ضابطے ہیں، اپنی ترتیب اور معنوی توازن ہے۔ ان کے مطالعہ کے لئے فن کار کے تخلیقی تجربے سے نظریاتی ہم آہنگی ضروری ہے۔ وہ فن کی تہ در تہ معنویت کے پس پردہ محرکات و تاثرات کی تلاش اور ان کے درمیان رابطہ پر زور دیتے ہیں۔ ان کے تنقید و تخلیق کا عمل آزاد ہے یہ فنون میکانکی اور جامد نہیں ترقی پذیر ہیں۔ دونوں ایک دوسرے سے آزاد رہ سکتے ہیں مگر بہتر نتائج دونوں کے رابطہ سے پیدا ہوتے ہیں۔ وہ ناقد میں ہمدردانہ مفاہمت اور بالغ نظری چاہتے ہیں۔ اُسے کسی بھی رجحانِ فکر رکھنے کی اجازت دیتے ہیں اور وہ مخزنِ فکر میں اضافہ کر سکتا ہے۔ ایک معیاری تنقید میں معروضیت، متانت اور موزونیت ہوتی ہے۔

حامد صاحب نے عالمی ادب کا مطالعہ کیا ہے اور وہ آفاقی ذہن کے مالک ہیں۔ اُن کی تنقید میں ایک مقدس سنجیدگی، متانت، معروضیت اور موزونیت ملتی ہے۔ اُن کی ہم عصر ادیبوں اور شاعروں سے متعلق تنقیدی تحریریں فن کاروں سے ذہنی قربت اور حوصلہ افزائی کے جذبہ کی وجہ سے معروضیت کا معیار قائم نہیں رکھ سکی ہیں اور وہ ہمعصر تنقید کے اس کمزور پہلو سے واقف ہیں۔ موضوع کے ساتھ ساتھ ان کا اسلوب بیان بھی تبدیل ہوتا جاتا ہے اور اُن کی تحریروں میں اسالیبِ بیان کے کئی رنگ ملتے ہیں۔ اصنافِ شاعری اور شعراء سے متعلق تنقیدی مضامین میں دلشگفتگی ملتی ہے جس کے اعلیٰ نمونے قاضی عبدالستار، خورشید الاسلام، خواجہ احمد فاروقی اور آل احمد سُرور کے یہاں ملتے ہیں۔

ایسے لوگوں کی کمی نہیں ہے جو احتشام حسین اور آل احمد سرور کو ہی اُردو کے اچھے ناقدین میں شامل کرتے ہیں۔ دونوں کی بڑائی سے انکار بھی نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اس عرصہ میں اُردو تنقید و تحقیق کی تاریخ میں بہت سے نئے گراں قدر ناقد و محقق شامل ہوئے ہیں۔ ایسے ناقدین و محققین کے تین گروپ ہیں۔ پہلے گروپ کے خالص مشرقی روایات اور اصولوں کو ہی کافی سمجھتے ہیں۔ دوسرے مغرب کی اندھی تقلید میں اُردو ادب کا فلسفہ ثانیہ تلاش کرتے ہیں۔ تیسرے گروہ سے متعلق مشرق و مغرب کی اعلیٰ اقدار اور اصولوں کو مقامی اور علاقائی، انفرادی اور ذاتی اثرات کے ساتھ اہمیت دیتے ہیں۔ اور حامد صاحب کا تعلق اسی گروہ سے ہے۔ انہوں نے محض مقامی اثرات اور اُردو ادب و اُردو تہذیب کے مزاج کو بھی سمجھا اور برتا ہے اور مغرب کی فکری فرزانگی سے بھی فائدہ اٹھایا ہے۔ تنقید و تحقیق، ترجمہ و تخلیق کے میدان میں حامد صاحب نے خوشگوار اضافے کئے ہیں اور اُن سے بہترین ادب پاروں اور فن پاروں کی اُمید کرنے میں خود کو حق بجانب سمجھتا ہوں۔

OO

ادب اور حقیقت کا جبر

ڈاکٹر سید حامد حسین
ای ۱۸۱/۲، پروفیسرز کالونی۔ بھوپال ۲

غالباً سب سے پہلے ارسطو نے اس خیال کا اظہار کیا تھا کہ ادب زندگی کی نقل پیش کرتا ہے۔ ادب زندگی کا آئینہ ہے اور اس میں ہمیں اپنے گرد و پیش کی زندگی کا عکس نظر آتا ہے۔ آج تقریباً ۲۲ صدیاں گزر جانے کے بعد بھی ادب کے ناقدین اور ادب کو شعوری طور پر تخلیق کرنے والے ادیب اس مفروضے کو صحیح ثابت کرنے میں سرگرم عمل ہیں۔ اگر عالمی ادب کی تاریخ کا بغور مطالعہ کیا جائے تو یہ اندازہ ہوتا ہے کہ جوں جوں انسان کے ادراکِ حقیقت کے انداز میں فرق آتا گیا ویسے ہی ویسے ادب کی تخلیق اور اس کے اسالیب کے بارے میں نقطۂ نظر بدلتا گیا۔ جب انسان نے مذہب کی شکل میں ایک نظامِ حیات و کائنات کا شعور حاصل کیا تو ادب کو مابعد الطبیعاتی مسائل سے منسلک سمجھا جانے لگا۔ اخلاقی اقدار متعین ہونے لگے تو ساتھ ادب کو اخلاقی مقصدیت کا تابع خیال کیا جانے لگا۔ دورِ تعقل کے ساتھ ساتھ ادب کو منطق اور ممکنات کی حدود میں مقید کیا جانے لگا اور تخئیل آفرینی، مبالغے اور فینٹسی کو خلافِ عقل قرار دے کر خیرباد کہہ دیا گیا۔ سائنسی مادیت نے اوہام، قیاسات اور تمثیلیت کو ادب کی قلمرو سے حکمِ سفر سنا دیا۔ میکانکی فتوحات کے زیرِ اثر انسانی زندگی اور اس کے عوامل کو پوری طرح مادی اسباب کی زنجیر سے جکڑا جانے لگا۔ تاریخی جبریت کے نظریے نے انسان کو بے دست و پا بنا کر پیش کیا اور ادب میں انسانی کردار کو تاریخی عمل میں مقید کر دیا گیا ہے۔ لاشعوری نفسیات نے انسانی افعال کو لاشعوری محرکات سے منسلک کر کے پیش کیا۔ اور ادب لاشعوری دھندلکوں میں غوطہ زن ہونے لگا۔ تب ہی انسانی معاشرے پر معاشی نظام کی بالادستی کو تسلیم کیا گیا اور سماجی حقیقت نگاری ادیب کا فرض بن گئی۔ اسی دوران زندگی کی بے ترتیبی، لایعنیت اور انتشار کے احساس نے ہراساں کرنا شروع کیا اور اس سراسیمگی کا اظہار ادب کا مقدر ٹھہرا۔ حقیقت کے ادراک کا یہ سفر یہیں ختم نہیں ہو جاتا بلکہ وقت کے ساتھ ساتھ زندگی کی حقیقت کے بارے میں انسانی شعور میں نئے گوشوں اور نئی سمتوں کا برابر اضافہ ہو رہا ہے اور یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ اس شعور میں تبدیلی کے ساتھ ساتھ ادب میں پیش کی جانے والی حقیقت میں فرق کرنا تقریباً ایک میکانکی ضرورت ہے۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ نہ تو ادب کی تخلیق اور نہ ادب سے لطف اٹھایا جانا کوئی میکانکی فعل ہے۔ ادب اگر کوئی آئینہ ہے تو اس کی عکس پذیری خالصتاً میکانکی نہیں ہے۔ ادب کا کردار منفعل نہیں بلکہ فعّال ہے۔ اس کا وصف اثر پذیری نہیں بلکہ اثر اندازی ہے۔ ادب صرف حقیقت کا تجربہ یا نظریے کا پرتو نہیں ہے بلکہ اس میں ان کے علاوہ بھی کوئی ایسا عنصر موجود ہے جو اسے انسان کی ذہنی اور محسوساتی زندگی کے لئے اہم بناتا ہے۔ اگر محض امرِ واقعہ کی عکاسی ادب کا مقصد ہوتا تو ادب کو صحافت سے ممتاز کرنا دشوار ہو جاتا۔ صحافت امرِ واقعہ سے اپنا بنیادی تعلق رکھنے کے باوجود ادب کے اعتبار اور ادب کے دوام کا حصہ دار نہیں بن پاتی۔ نہ ہی تحلیلِ نفسی کے ماہر کے دفتر میں موجود مختلف مریضوں کے بیانات یا پولس میں موجود مختلف مجرموں کی فائلیں ادب کا درجہ حاصل کر پاتی ہیں۔ ہر ہنرمند اور ہر پیشہ ور، ہر جسمانی یا دماغی کام کرنے والا بلا ارادہ انسانی زندگی کی حقیقت کے کسی نہ کسی پہلو کے بارے میں کوئی نہ کوئی ذاتی تجربہ کر رہا ہے۔ لیکن ان میں سے ہر حقیقی تجربہ ادب کے خیالی تجربوں جیسی اثر اندازی حاصل کرنے کا اہل نہیں۔

در اصل وہ حقیقت جو ادب پیش کرتا ہے وہ مجرد حقیقت نہیں اور نہ ہی اس کے حدود واقعی تجربے تک محدود ہیں۔ ادب مجرد حقیقت اور واقعی تجربے سے کچھ زیادہ ہے اور اسی اضافے، اسی زائد عنصر میں ادب کا لطف، اس کا اثر اور اس کی کشش پنہاں ہے۔ لطف اور کشش، ضرورت کے احساس سے کسی قدر بالاتر احساس سے تعلق رکھتے ہیں۔ بھوک ایک حیاتیاتی ضرورت کا اظہار ہے، لیکن ذائقہ اس ضرورت سے بالاتر احساس ہے۔

جنسی افعال حیاتیاتی ضرورت ہیں لیکن عشق، محبت اور حُسن ایک شعور ان ضرورتوں کے احساس سے بالاتر جبلّیات ہیں۔ کلام ایک انسانی ضرورت ہے لیکن خوش الحانی کا لطف اس ضرورت سے بالاتر احساس ہے۔ ادب بھی اسی لئے محظوظ اور متاثر کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے کہ وہ محض زندگی کی نقّالی سے زیادہ کچھ اور بھی ہے۔ چنانچہ ادیب کیلئے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ صرف اپنی نقّالی کے فن کو پختہ سے پختہ تر بنانے کی فکر میں سرگرداں رہے۔ اس کے فن کا اصل کمال اس زائد عنصر کی تلاش و تخلیق ہے جو حقیقت میں اضافہ بن کر قاری کے ذہن و شعور پر گرفت حاصل کرتا ہے۔

اگر ادب کا کام صرف حقیقت کی عکّاسی تک محدود ہوتا، تو شاید پرانے ادب پارے حقیقت شناسی کے نئے انداز اختیار کرلینے پر اُسی طرح پرانے اور از کار رفتہ ہو جایا کرتے جس طرح نئے تکنیکی اضافوں کے بعد پرانی مشینیں بیکار ہو جایا کرتی ہیں۔ لیکن قبل از تاریخ زمانے کی تاریکی سے اُبھر کر آنے والے رزمیے اور داستانیں آج بھی اپنے لطف و اثر کی مالک ہیں۔ ہومر، دانتے، شیکسپیر، حافظ، خیّام، اور کالی داس کی عظمت دورِ تعقّل کی سخت گیریوں کے آگے سرنگوں نہیں ہوئی ہے۔ ہتوپدیش، کلیلہ و دمنہ کی حکایتوں اور الف لیلہ کی کہانیوں کا جادو آج کی مادہ پرستی بھی کم نہیں کر پائی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حقیقت شناسی کے معیار بدلتے رہتے ہیں لیکن اس تبدیلی سے ادب کا تاثر متاثر نہیں ہوتا۔ ادب میں کوری حقیقت کے علاوہ بھی کوئی ایسا عنصر شامل ہے جو اُسے وقت کے زنگ سے محفوظ اور اس میں تازگی برقرار رکھتا ہے۔

اس عنصر کی تلاش اور تشخیص کیلئے انسانی زندگی میں نظامِ احساس کو سمجھنا ضروری ہے۔ یہ نظام ایک نہایت ہی نازک اور خود کار نظامِ توازن پر منحصر ہے۔ جسمانی ضرورت کے کسی عنصر کی کمی ایک خواہش یا احساس کی صورت میں پیدا ہوتی ہے اور اس خواہش کی تکمیل کی صورت میں اس عنصر کی کمی پوری ہو جاتی ہے۔ جسم میں پانی کی کمی کی صورت میں پیاس محسوس ہوتی ہے اور پانی پینے سے جسم کو پانی کی جو ضرورت تھی وہ پوری ہو جاتی ہے۔ اسی طرح دھوپ میں سائے کی خواہش اور جاڑے میں گرمی حاصل کرنے کی خواہش، ان جسمانی ضرورتوں کو پورا کرتی ہیں۔ یہی کیفیت انسان کے ذہنی نظام میں نظر آتی ہے۔ خوف کی حالت میں پناہ کی تلاش، مایوسی کی حالت میں اُمید کی کھوج، پُراسرار صورتِ حال میں حقیقتِ حال کی لئے تجسّس فطری ردِ عمل ہیں۔ لیکن انسان کی جسمانی زندگی کے مقابلے میں اس

شاعر بھی

کی ذہنی زندگی کو کہیں زیادہ چیلنجوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ایک جانب انسان خود کو حیات و کائنات میں موجود غیر یقینی پن، الجھاؤ، تاریکی اور انتشار سے نبرد آزما پاتا ہے اور دوسری طرف اُسے اپنی جسمانی کمزوریوں اور معذوریوں اور اپنے مادّی وجود کی حدود اور قیود کا احساس پریشان کرتا ہے۔ حیات و کائنات کے ساتھ اس نبرد آزمائی کے لئے، خود کو مسلح کرنے کے لئے اس کے پاس صرف ایک طریقہ ہے کہ وہ ذہنی اور محسوساتی سطح پر اپنے توازن کو برقرار رکھے۔ چنانچہ وہ مایوسی میں اُمید، غم میں تسلّی، پراگندگی میں ترتیب، انتشار میں معنی، غیر یقینی پن میں یقین اور بے نظمی میں اُصول کی تلاش جاری رکھتا ہے۔ وہ رُکتی ہوئی نبض کو محسوس کرتے ہوئے بھی کسی معجزہ کی اُمید رکھتا ہے۔ اس زندگی کی نامرادیوں کی دوسری زندگی میں تلافی کے خواب دیکھتا ہے اور مظلوم ہو کر ظالم پر عتابِ الٰہی کی توقع کرتا ہے۔ زندہ رہنے کیلئے تو وہ مجبور ہے۔ وہ چاہے یا نہ چاہے، وہ زندہ ہے۔ لیکن زندگی کو گوارا، قابلِ قبول اور زندہ رہنے کے لائق بنانے کے لئے اُسے ایک ہزار ایک ذہنی سمجھوتے کرنے پڑتے ہیں۔ حقیقت مجبوری ہے، لیکن حقیقت کے حصار کو توڑ کر اپنی سمت خود بنانے کی ذہنی جدوجہد اُس کی انفرادیت کا کرشمہ ہے۔ وہ انفرادیت جو اُسے یہ احساس دلاتی ہے کہ وہ ایک زندہ اور فعّال فرد ہے۔ وہ انفرادیت جو اُسے یہ اعتماد بخشتی ہے کہ وہ وقت اور مادّے کی جبریت سے آزاد ہونے کی طاقت رکھتا ہے۔ یہی اعتماد اُسے خالق بننے کا حوصلہ دیتا ہے اور وہ اپنی دُنیا خود تخلیق کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہی تخلیقی رُجحان ادب کی بُنیاد بنتا ہے۔

ادب کی تاریخ، ریکارڈ کی ہوئی تاریخ سے زیادہ پرانی ہے، اس لئے کہ ادب کا سرچشمہ انسان کا وہ تخلیقی رجحان ہے جس کی فطری جبلّتوں سے آبیاری ہوئی ہے۔ اسی تخلیقی رُجحان کا ایک کرشمہ وہ دیومالائیں تھیں جو تاریخ سے پہلے کے انسان نے ترتیب دی تھیں۔ یہ نام نہاد غیر مہذّب انسان فطرت کی شمشیر برہنہ طاقتوں سے نبرد آزما تھا۔ فطرت ایک خوفناک اسرار تھی اور انسان اپنے محدود شعور کے حصار میں بند تھا۔ لیکن اس انسان نے اپنے تخلیقی تخیل سے اس حصار کو توڑا اور اپنے تجربے سے حاصل شکلوں کو توسیع دے کر دیوی دیوتاؤں کی ایک دُنیا تیار کی اور انہیں ایک قیاسی نظام میں منظّم کیا۔ اس طرح وہ انسان شعور و احساس کی مدد سے زندگی

کے اندھیرے کنوئیں سے باہر نکلنے میں کامیاب ہوگیا۔ انسانی وجود کو گھیرے ہوئے ابدی تاریکی کے ساتھ انسانی شعور کی یہ جدوجہد برابر جاری ہے اور تخلیقی فن کار اس تاریکی میں فہم و شعور کے نئے چراغ روشن کرنے اور ازلی بے ترتیبی میں ترتیب و معنی تلاش کرنے میں معروف ہے۔

چنانچہ تخلیقی تجربہ صرف معلوم و معروف کی تکرار کو اپنا منتہا نہیں سمجھتا وہ معلوم و معروف کے گرد محیط لامعلوم اور غیر معروف کے خول میں شگاف لگا کر نئے معنی اور نئی اشکال دریافت کرکے مادی امکانات پر تخلیقی عمل کی برتری کا ثبوت فراہم کرتا ہے۔ حقیقت کو للکارنا، اور امکان کے حدود کو ڈھکیلنا تخلیقی عمل کا وصف ہے۔ حقیقت کی دست نگری اور دنیائے امکان کی اسیری تخلیقی بے بضاعتی کی علامت ہے۔

ادب کا قاری اور سامع اس تخلیقی تجربے میں حصہ دار بن کر ہی ادب کا تاثر قبول کرتا ہے۔ وہ خود لامعلوم اور غیر معروف، تاریک اور پراگندہ حقیقتوں کے دباؤ سے ہراساں ہے۔ ادب کا تخلیقی تجربہ اس کو ذہنی اور نفسیاتی انقباض سے رہائی دلاتا ہے اور وہ زندگی کے خواب پریشاں کی نئی معنویت یا اس کی ترتیب سے متعارف ہوکر زندگی کے ایک نئے تجربے سے روشناس ہوتا ہے۔

یہ امر بھی قابل توجہ ہے کہ انسان کی نفسیاتی زندگی کا سرمایہ صرف کوری حقیقتیں اور ان کے بھیانک سائے نہیں ہیں بلکہ انسان کے ذہن پر نجانے کتنے خواب، کتنی موہوم خواہشیں، کتنے تصور، کتنی فرضی شکلیں بھی گل کاری کرتی رہتی ہیں، وہم و قیاس، منطقی کیلئے کتنے ہی بے حقیقت کیوں نہ ہوں، انسان کی ذہنی زندگی کا حسین تانا بانا انہیں وہم و قیاس کے عنکبوتی تاروں پر قائم ہے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ انسان فانی ہے۔ مشاہدہ تصدیق کرتا ہے۔ کہ گرد و پیش کے افراد مر رہے ہیں۔ لیکن ہم اس طرح جیئے جاتے ہیں کہ ہمیں کبھی مرنا نہیں۔ موت حقیقت ہے۔ موت سے آزادی وہم۔ لیکن یہ وہم حقیقت سے طاقتور ہے اور ہمیں جیتے جی مرنے نہیں دیتا۔ اسی وہم پر انسانی زندگی میں ادب کی معنویت اور اس کے تاثر کا انحصار ہے۔ افسانہ، جس کو پڑھنے والا جانتا ہے کہ وہ جھوٹی کہانی ہے، متاثر کرتا ہے۔ ڈراما، جسے دیکھنے والا جانتا ہے کہ سارے کردار فرضی ہیں، ذہن پر اپنی گرفت پیدا کرتا ہے۔ شعر، جس میں پرایا احساس اور غیر کا تجربہ ہے، دماغ میں اپنی گونج پیدا کرتا ہے۔ ان پر سے صرف اس لئے اعتبار نہیں اٹھتا کہ وہ جھوٹے، فرضی یا پرائے ہیں۔ ان کے تاثر کا راز یہ ہے کہ وہ ہمارے تجربے کی حدود کو آگے بڑھاتے ہیں اور ہمارے فکر و شعور میں چند چراغ اور روشن کرتے ہیں۔ ادب اس لئے ہمیں متاثر نہیں کرتا کہ وہ صرف ہماری ادھوری زندگی کا عکس اور ہماری مجبور ذات کا نوحہ ہے بلکہ اس لئے کہ وہ ہماری زندگی کا تکملہ اور ہماری ذات کی توسیع ہے۔

لازوال ادب وہ ہے جو اس تکمیل اور توسیع کا سامان رکھتا ہے۔ اندھیرے کمرے میں اندھیرے کی تصویر انسانی تجربے میں کوئی اضافہ نہیں کرتی۔ یہ تخلیقی تجربہ نہیں، فقط عکس پذیری ہے۔ یہ کمال نہیں مجبوری ہے۔ اور محض عکس پذیری اور مجہولیت بلند ادب کی ضمانت نہیں بن سکتی۔ ادب ذہن و دماغ کے لئے ایک بامعنی تجربہ اُس وقت بن پاتا ہے جب وہ ہمیں فطری معذوریوں پر قابو پانے میں مدد دے۔ جب وہ، وہ کچھ کہے جو ہمارے بھی دل میں ہو مگر زبان تک نہ آسکے۔ جب وہ اُن دکھوں کو بھی بیان کردے جو دوسروں کو دکھی بناتے ہوئے اور ہم اُسے صرف اپنا ہی درد سمجھے بیٹھے تھے۔ جب وہ یہ بتادے کہ وہ آنسو کا قطرہ جو ہمارے دل کی گہرائیوں سے چھن کر پلکوں پر اُمڈ آیا ہے۔ اُس کا مقدر ٹپک جانا نہیں، بلکہ اس میں احساسات کی ایک ایسی دھنک بھی پوشیدہ ہے جو دوسروں کے دلوں میں بھی جھنکار بن کر پیوست ہوسکتی ہے۔

ادب کو پوری طرح مادی افادیت اور منطقی معقولیت کا غلام سمجھ لینا ادب کے ساتھ انصاف نہیں ہے۔ ادب میں بلاشبہ متاثر کرنے کی صلاحیت ہے اور ہر ایسی چیز جو متاثر کرسکتی ہے اُس سے غلط فائدہ اٹھانے کیلئے بھی ترغیب پیدا ہوتی ہے۔ ادب اور مذہب کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا ہے۔ ان دونوں کو بھی ایسے مقاصد کے آلۂ کار کی حیثیت سے استعمال کیا گیا ہے جو دراصل اُن کے دائرۂ عمل میں نہیں آتے۔ ادب کو پرچار کے لئے ہیجان پیدا کرنے یا کسی نظریے کا ثبوت فراہم کرنے کیلئے استعمال کرنا، ادب کی بنیادی نفسیاتی ضرورت کے برخلاف ہے، اسی طرح دوسرے علوم اور دوسرے نظاموں پر صحیح اُترنے والے اصولوں کو ادب پر منطبق کرنا صحیح نہیں ہے۔ ادب کی اپنی خصوصی منطق ہے اور اس کا اپنا ایک اندازِ عمل ہے۔ بہتر ہے کہ ادب کو ایک آزاد نظامِ عمل کی حیثیت سے سمجھا اور برتا جائے۔

اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ادب کا تعلق زندگی کے حادثات اور تجربات سے ہوتا ہے۔ لیکن یہ سمجھنا صحیح نہیں ہے کہ ان حادثات کی

شاعر/کبھی

جوں کی توں عکاسی کا ہی نام ادب کی تخلیق ہے۔ یہ حادثات اور تجربات تو ادیب کے لئے تو ایک خام مواد کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جس وقت ان حادثات و واقعات کو ادیب کا ذہن اپنی گرفت میں لیتا ہے اُس وقت اُن پر ہونے والا عمل کم و بیش ویسا ہی ہوتا ہے جیسے ایک صورت گر کے ہاتھ میں آ جانے پر گیلی مٹی پر عمل ہوتا ہے۔ نرم مٹی کے گولے کو جب وہ اپنی انگلیوں میں پکڑتا ہے تو گولے کی بعینہٖ وہی شکل باقی نہیں رہتی جو اس وقت تھی جب وہ گولا اُسکے سامنے تختے پر پڑا تھا۔ انگلیوں کی گرفت میں آنے کے بعد کچھ مٹی انگلیوں کے درمیان خالی جگہوں میں سے اُبھر آتی ہے اور جہاں انگلیوں کا دباؤ پڑتا ہے وہاں سے دب جاتی ہے اور اُس پر انگلیوں کے نشان بن جاتے ہیں۔ ادب میں استعمال ہونے پر زندگی کے واقعات میں بھی اسی طرح تبدیلی آ جانا لازمی ہے۔ اُن پر فن کار کی شخصیت کی چھاپ (انگلیوں کے نشانوں کے مثل) ہی نہیں لگتی بلکہ وہ نئی سمتیں (انگلیوں کے درمیان سے اُبھرنے والی مٹی کی طرح) اور نئی شکل بھی اختیار کر لیتے ہیں۔ اور گو کہ صورت گر جو شکل مکمل کرتا ہے وہ مٹی کی ہی بنی ہوئی ہوتی ہے، اُس کا اصل تاثر شکل کے نقوش میں ہے اور یہ بات ثانوی اہمیت رکھتی ہے کہ اس مٹی کو کس طرح گوندھا گیا تھا اور اس میں کیا کیا اجزا شامل کئے گئے تھے۔ اسی طرح ادبی تخلیق میں اصل اہمیت اس بات کی ہے کہ کیا اُس نے جو تاثر پیدا کیا ہے وہ تخلیقی تجربے کے لحاظ سے کوئی اضافہ سمجھا جا سکتا ہے۔ کیا وہ ہماری زندگی کے سطحی تجربوں میں کوئی توسیع کرتا ہے۔ کیا اُس میں عرفانِ حیات کا کوئی شائبہ ہے۔ کیا اس میں حیات و کائنات کا کوئی وژن ہے۔

یہیں یہ بات بھی سمجھ لینا ضروری ہے کہ کیونکہ ادب انسانی ذہن کو پراگندہ اور بے ترتیب حوادث کے جبر سے آزاد کرنے کا کام کرتا ہے، اس لئے اس کی انتہا بلیغ معنویت اور پرکشش صورت گری سمجھی جا سکتی ہے۔ تخلیق، عناصر کی ترتیب سے شکل پیدا کرنے کا نام ہے۔ کتابِ پیدائش (بائبل) میں آفرینشِ کائنات کے آغاز کو جن الفاظ میں بیان کیا گیا ہے، وہ بڑے پُرمعنی ہیں۔ انتشار اور تاریکی میں روشنی کا ظہور اور روشنی کے سبب اشکال کا شعور، یہ تخلیقی عمل کا ضروری آغاز ہے۔ اسی طرح خیال و تجربے کے انبار کو پُرمعنی اشکال میں متصور اور مرتب کرنا تخلیقی جوہر کا صحیح استعمال ہے۔ انبار کو انبار کی حیثیت سے پیش کر دینا اچھی منطق اور جائز حقیقت پسندی ہو سکتی ہے، لیکن صحیح خلاقی نہیں۔ تخلیق کار اگر خام مواد پر عمل کر کے اُسے کوئی شکل نہیں دیتا تو یہ اس کے تخلیقی کمال کی نفی ہے۔ ادب میں ترتیب و معنی کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ یہ ادیب کی انفرادی صلاحیتوں پر منحصر ہے کہ وہ اس ترتیب کو کتنا منفرد بنا کر اور اس مفہوم کو کتنے خیال انگیز انداز سے پیش کر سکتا ہے۔

کیوں کہ ادیب واقعے کو ایک معنوی توسیع بخشتا ہے۔ اور یہ توسیع ایک بہتر ترتیب یا بلند تر معنی کی جانب اشارہ کرتی ہے اس لئے اُس میں مثالیت کے داخل ہونے کے امکانات موجود ہیں۔ منطقی اعتبار سے، ناگوار حادثات اور مکروہ پہلو زندگی کی حقیقت کا لازمی جزو ہو سکتے ہیں۔ لیکن تخلیقی فنکار کا وہ وژن جو کہ وقت اور فطرت کے جبر سے پیدا ہونے والے فکر و احساس کے عدمِ توازن کے واسطے، توازن کی ایک بنیاد فراہم کرتا ہے، وہ خود کو مکروہات کا اسیر نہیں بنا سکتا۔ ادب کے تاثر کو خوب سے خوب تر کے لئے قاری کی بنیادی اور جبلی خواہش سے یکسر جدا نہیں کیا جا سکتا۔ افسانے میں حق پر باطل کی فتح، خیر کی شر پر فوقیت، اُمید پر مایوسی کی برتری کی خواہش ایک عام قاری کی فطری اور جبلی خواہش ہے۔ اور اس کا تعلق اسی فکری اور محسوساتی تقاضے سے ہے۔ جس کا پہلے ذکر ہو چکا ہے۔ اعلیٰ ادب عام قاری کی خواہشات کا احترام کرنے کے لئے کوئی بنا بنایا فارمولا تو اختیار نہیں کرتا لیکن وہ ان احساسات کا اس انداز سے ارتفاع (SUBLIMATION) کرتا ہے کہ اُس میں قاری اپنی توقعات کی ایک نئی تشکیل کا تجربہ کرتا ہے۔ اعلیٰ ادیب کے لئے مکروہات اس کی تخلیق کا منتہا بن کر نہیں آتے بلکہ وہ اُن کو اس نوعیت سے پھیلانے اور پیش کرنے میں کامیابی حاصل کرتا ہے کہ وہ زندگی کی ایک پُرمعنی بصیرت فراہم کرنے کا سبب بنتے ہیں۔

لہٰذا یہ نہایت ضروری ہے کہ ادب کو اُس کے آفاقی تاثر کا حصہ دار بنانے کے لئے انسانی فہم و شعور اور انسانی نفسیات کے لئے اُس کے معاون کردار کو مدِ نظر رکھا جائے اور حقیقت کی محض میکانکی عکاسی کو اس کا منتہا اور مقصود تصور نہ کیا جائے۔ ادب کی تخلیق صرف آئینہ سازی نہیں ہے کیونکہ ادب میں پیش کی جانے والی حقیقت، تجرباتی حقیقت سے زیادہ مکمل اور بھرپور حقیقت ہے۔ اور ادب کے ذریعہ زندگی کی سطحی لایعنیت، اوچھے پن اور بے جہتی کے مقابلے میں ادیب زندگی کا ایک زیادہ بامعنی بصیرت افروز اور مؤثر نقش پیش کرنا چاہتا ہے۔

غزلیں

محمد عثمان عارف نقشبندی ایم۔پی

نگدل ظلم کی فطرت کو بدلتا کیوں ہے
ر دیا قتل تو اب ہاتھ بھی ملتا کیوں ہے

زِ ظلمت کے شب و روز کا ایسا سمجھو
ورسے دیکھو زمانہ یہ بدلتا کیوں ہے

یک دیوانے کو سمجھا نہ سکے فرزانے
شہر کی سڑکوں پہ یہ خون اُچھلتا کیوں ہے

تم نے پُوچھا بھی کبھی آج کے انسان کا غم
نی تقریر میں وہ زہر اُگلتا کیوں ہے

عظمتِ ذات کا احساس اگر ہے کچھ بھی
تل بچوں کے کھلونوں سے بہلتا کیوں ہے

وہ مخاطب نہیں مُنھ پھیر لے تو بھی اپنا
زرد چہرہ نہ بنا رنگ بدلتا کیوں ہے

ادیں گھیر کے مجھکو یہ کہا جاتا ہے
پنی منزل کی طرف چین سے چلتا کیوں ہے

رم سنگیں ہے مرا خاص نگاہوں میں یہی
ام انساں کی مصیبت پہ پگھلتا کیوں ہے

وب کے رہنا ہو ماضی کے اندھیروں میں اگر
پھر نئی شان سے خورشید نکلتا کیوں ہے

رخروئی یہ غمِ عشق کی خوش ہو عارف
ل ہوا خون تو پھر خون اُگلتا کیوں ہے

○ ۷۴۔ نارتھ ایونیو، نئی دہلی
عزابھی

مُصحف اقبال توصیفی

بے چہرہ آرزو تھی، خوشی بے لباس تھی
شاید وہی گھڑی مرے غم کی اساس تھی

میرے بدن پہ ہوگی ہزاروں برس کی گرد
آنکھوں ہی میں چھپی ہوئی صدیوں کی پیاس تھی

وہ کاغذی سہی، مگر اچھے لگے مجھے
ہر چند اُن گلوں میں نہ بُو تھی نہ باس تھی

کیا بات تھی نہ جانے جو دل ہی میں رہ گئی
کیوں اُن دنوں بہت ترے ملنے کی آس تھی

وہ آنکھیں کہہ رہی تھیں ہمیں چوم لے کوئی
وہ میرے پاس آئی تو کتنی اُداس تھی

○ ۳۱۰-۲-۱۲، مُراد نگر- حیدرآباد ۲۸

شکیل مظہری

ذات کا گہرا اندھیرا ہے، بکھر جا مجھ میں
ڈوبتی شام کے سورج، تو اُتر جا مجھ میں

ابنِ آدم ہوں میں، شہزادۂ تعمیرِ حیات
تو جو بگڑا ہو تو اے وقت سنور جا مجھ میں

آئے اور بیت گئے کتنے ہی ساون لیکن
کوئی جذبہ، کوئی بادل نہیں گر جا مجھ میں

سخت جانی پہ مری کرتی ہے دنیا حیرت
زندگی اپنا کوئی زہر ہی بھر جا مجھ میں

تیری پیراہنِ الفاظ سے تزئین کروں
اے مرے کرب ذرا دیر ٹھہر جا مجھ میں

رُوح کا دشت ہوں، صحرائے تخیّل ہوں میں
ہر طرف ایک اُداسی ہے، گذر جا مجھ میں

یہ صدائے پسِ انفاس کا پردہ کب تک
تو کہیں ہے تو تڑپ اور اُبھر جا مجھ میں

رنگ ہوں، گیت ہوں، نغمہ ہوں، میں خوشبو ہوں شکیل
زیست ہی زیست ہے بکھری ہوئی ہر جا مجھ میں

○ شیخ آدم بلڈنگ، گنیش پیٹھ- ہبلی ۲۰

خشک پتّہ

عائشہ صدیقی
فلیٹ نمبر ۶۔ احاطہ ناظر۔ قبر ماموں بھانجا۔ لکھنؤ ۱

توکیا میں مر گیا ہوں ؟

نہیں ایسا نہیں ہوسکتا۔ وہ گہری گہری سانسیں لے کر خود کو زندہ ہونے کا یقین دلاتے ۔ تو شاید میرے خلاف کوئی سازش کی جارہی ہے۔ مجھے بے موت مارا جارہا ہے۔ میں مرنا نہیں چاہتا۔ پھر ایسا کیوں کیا جارہا ہے۔

کیا عمر مجھے اس مقام پر لے آئی ہے کہ زندگی کی فہرست سے میرا نام کاٹ دیا گیا ہے ؟ نہیں یہ بھی نہیں ہوسکتا۔ بھلا عمر اور موت کا کیا تعلق۔ اگر ایسا ہوتا تو رزّاق اسّی سال کی عمر میں بھی یوں چست اور پھُرتیلا نہ ہوتا۔ کتنے برسوں سے وہ زندگی کے بوجھ کو جوانمردی سے ڈھو رہا ہے۔ کتنے سال وہ اس بوجھ کے نیچے دبا چکا ہے۔ اُسے تو یاد بھی نہیں ہوگا۔ وہ کبھی اپنی عمر کا صحیح حساب نہیں کر پاتا۔ ایک میں ہوں کہ لگتا ہے ہر لمحہ گھٹتا جارہا ہوں۔ پل پل کم ہوتا جارہا ہوں۔ بکھرتا جارہا ہوں ـــــ نہیں۔ میں خود نہیں مٹ رہا ہوں۔ یہ ایک منظم سازش ہے، یہ سب مجھے مار ڈالنا چاہتے ہیں۔ یہ میری سانسیں بھی مجھ سے چھین لینا چاہتے ہیں۔ رات کے اندھیرے میں مجھے محسوس ہوتا ہے کہ کچھ سائے میری طرف بڑھ رہے ہیں، کبھی کبھی مجھے اپنی گردن پر ہاتھوں کی مضبوط گرفت محسوس ہوتی ہے۔ دم گھٹتا سا لگتا ہے۔ یہ ضرور مجھے مار ڈالیں گے۔ میں سب کو پہچان گیا ہوں۔ میرا تجربہ مجھے دھوکہ نہیں دے سکتا۔ یہ ڈرتے ہیں کہ یہ چمکتی ہوئی دنیا جو میں نے اپنا خون پسینہ ایک کرکے بنائی تھی کہیں میں اُن سے واپس نہ لے لوں۔ میرا جما جمایا کاروبار جسے میں نے کولہو کے بیل کی طرح جُٹ کر سنبھالا اور بڑھایا تھا ان سب کے ہاتھوں تباہ ہورہا ہے۔ یہ چاہتے ہیں کہ میرے ہونٹ سِل جائیں، آنکھیں بند ہوجائیں تاکہ کوئی ان کے کاموں میں دخل نہ دے سکے

وہ اکثر اسی طرح کے خیالات میں غرق رہتے۔ اُلجھی اُلجھی لکیریں جو پہلے کبھی ماتھے پر سلوٹ بن کر اُبھرتی تھیں، اب بڑی تیزی سے سارے چہرے پر اپنا جال پھیلا رہی تھیں۔ وہ اکثر سر جھٹک جھٹک کر جیسے خود کو اس جال سے نکالنے کی کوشش کرتے۔ جب اُن کے بیٹوں نے کاروبار کی ساری ذمہ داریاں خود سنبھال کر اُنہیں آرام کرنے کے لئے بستر پر لٹا دیا تھا تو ممنونیت کے احساس سے اُن کی آنکھیں بھیگ گئی تھیں۔ اُن کے بیٹوں کو اُن سے اتنی محبت ہے، اِسی خیال ہی سے اُنہیں بڑا سکون ملا تھا۔ وہ کئی دن اتنی گہری نیند سوئے جیسے ساری زندگی جاگتے گذاری ہو۔ لیکن دو چار دن میں ہی اس نیند سے اُن کا دل بھر گیا ہو۔ اب وہ پہروں بستر پر پڑے سوچا کرتے کہ کیا کریں۔ اُنہیں اپنی زندگی میں خلا کا احساس ہونے لگا۔ اپنا وجود بے مصرف سا لگنے لگا تھا۔ وقت جسے اُنہوں نے کنجوس بنئے کی طرح لمحہ لمحہ گن گن کر اور حساب کرکے خرچ کیا تھا یوں ضائع جارہا تھا۔ وہ بے چینی سے ہاتھ ملتے۔ خود کو بہلانے کے لئے وہ طرح طرح کی مصروفیتیں ڈھونڈھتے۔ وارڈروب سے سارے کپڑے نکال کر مسہری پر بکھیر دیتے۔ فرش پر کتابوں کا ڈھیر لگ جاتا۔ الماریوں میں ڈھیر لگے اخبار اُلٹ ڈالتے ۔ چادر کونے میں ڈال دیتے۔ کمرے کی کوئی چیز اپنی جگہ نہ رہتی۔ وہ کبھی ایک کتاب اُلٹ کر دیکھتے اور پھر اُسے کھُلی ہی چھوڑ کر کسی دوسری کتاب میں کھو جاتے۔ گھنٹوں ان کے ورق پلٹتے جیسے انہیں اُن اوراق کی تلاش ہو جو اُن میں سے کوئی چُرا لے گیا ہے۔ وہ ایک مشّاق کباڑی کی طرح گھنٹوں ان بکھری چیزوں کو چُننے اور آخر تھک کر سب کچھ اُسی طرح پھیلا ہوا چھوڑ کر باہر باغ میں نکل جاتے یا سو جاتے۔ کبھی کبھی بے اختیار اُن کا جی چاہتا تھا کہ اپنی دکان پر جائیں اور پھر سے سارا کاروبار سنبھال کر بیٹھ جائیں۔ ایک آدھ بار تو وہ وہاں پہنچ بھی گئے، لیکن وہاں پہنچ کر تو وہ اور بھی اُداس ہوگئے۔ سب کچھ بدل کر رکھ دیا گیا تھا۔ پُرانی کرسیوں کی جگہ نیا صوفہ لگا ہوا تھا۔ شیشم کی میلی سی لکڑی ہٹا کر سن مائیکا کا کاؤنٹر بنایا گیا تھا۔ وہ کاؤنٹر جہاں وہ خود ایک ڈھیلا ڈھالا کُرتا پہنے اِدھر سے اُدھر بھاگا کرتے تھے، اب وہاں اُن کے دونوں بیٹے بیش قیمت سوٹ پہنے

کسی کو اُن سے محبت نہیں ہے۔ جیسے اُنہوں نے اُن کی دولت بانٹی ہے۔ اُن کے ہاتھوں پیروں کو بھی بانٹ لینا چاہتے ہیں۔ یہ ہمدردی نہیں ہے دکھاوا ہے۔ ڈھونگ ہے۔ ان سب کی مکاری کا خیال کر کے وہ مسکرا دیتے۔

"کتنے فریبی ہیں۔ کیا میں نہیں سمجھتا کہ یہ کیا چاہتے ہیں۔ میں ان سب کو پہچان گیا ہوں۔ اب کوئی مجھے قید نہیں کر سکتا۔ کوئی مجھے مار نہیں سکتا۔ میں خود کو ان سب سے چھپا لوں گا۔ میں یہاں سے کہیں دور چلا جاؤں گا۔ اتنے بہت سے دوست ہیں کہیں بھی پناہ لے لوں گا۔ خوب گھوموں گا۔ یہ ساری روشنی اور چمک ان کی ہی نہیں ہے، میں بھی ان کا حصہ دار ہوں ۔۔۔ میں ساری چمک، ساری روشنی خود میں جذب کر لوں گا۔

وہ اپنا کوئی پرانا خوبصورت سوٹ پہنتے سب کی نظریں بچا کر کالر میں گلاب سجاتے۔ جوتوں کو چمکاتے۔ قرینے سے اپنے بال جماتے۔ آئینہ میں خود کو دیکھ دیکھ کر مسکراتے اور گھر سے نکل جاتے۔ گھنٹوں وہ سڑکوں پر بے مقصد پھرتے۔ پتلی پتلی گلیاں شاہراہیں بن گئی تھیں۔ اندھیرے راستے اب تیز روشنیوں سے جگمگاتے تھے، کھنڈروں کی جگہ اونچی اونچی نئے طرز کی عمارتیں تعمیر ہو گئی تھیں۔ وہ سب کو حیرت سے تکتے۔

"تو یہاں تک اُن کی پہنچ ہے۔ اُنہوں نے میرے راستوں تک پہ قبضہ کر لیا ہے۔ میری پناہ کے سارے ٹھکانے بند کر دئیے ہیں۔ وہ ٹہلتے ٹہلتے دور ویرانوں میں نکل جاتے۔ کوئی پرانی یاد ذہن میں جھلکتی اور وہ کسی گھر کے سامنے کھڑے ہو جاتے۔ کبھی کسی دروازے میں جھانکنے لگتے۔ گھستے، جیسے کسی پرانے دوست کے مل جانے کا یقین ہو اور جب کوئی اجنبی چہرہ باہر منہ نکال کر حیرانی سے انہیں دیکھتا تو وہ خجل ہو کر آگے بڑھ جاتے۔ راستہ میں اگر کبھی کوئی اُنہیں غور سے دیکھتا تو وہ چونک جاتے۔ جلدی جلدی آگے بڑھ جاتے کہ کہیں کوئی اُنہیں قید نہ کر لے۔ اگر اُن کے بیٹوں کا کوئی شناسا اُنہیں مل جاتا اور سلام کرتا تو وہ نظریں چرا کر جلدی سے کسی گلی میں گھس جاتے اور جب تک وہ نگاہوں سے اوجھل نہ ہو جاتا وہ خوفزدہ سے دبکے کھڑے رہتے اور باہر نہ نکلتے۔

"میرے پیچھے جاسوس لگا رکھے ہیں۔ ایک ایک قدم پہ میرا پیچھا کیا جاتا ہے۔ اُف اُن کو ذرا بھی رحم نہیں۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ سب میرے دشمن ہیں اُنہوں نے میرے سب دوستوں کو کہیں چھپا دیا ہے کہ میں اُن سے مل نہ پاؤں۔

وہ بڑے مایوس سے گھر لوٹتے اور تھکے تھکے قدموں سے اپنے کمرے میں چلے جاتے۔ اُن کی خستہ حالت دیکھ کر سب اُن کی طرف دوڑتے، لیکن وہ دروازہ نہ کھولتے۔ سب باہر کھڑے پکارا کرتے۔ وہ سب کی آوازیں سنتے

کھڑے تھے۔ اُن کو دیکھ کر اُن کے بیٹوں نے بڑی حیرت کا اظہار کیا تھا کہ وہ وہاں کس طرح آ گئے۔ اُنہوں نے جب کسی کام میں اپنی رائے دینا چاہی تو اُنھیں یہ کہہ کر روک دیا گیا تھا۔

"ڈیڈی اب آپ کے آرام کا زمانہ ہے۔ آپ کیوں بیکار اپنے دماغ کو تھکا رہے ہیں۔ ہم خود ہی سب ٹھیک کر لیں گے۔ آپ گھر واپس چلے جائیے۔ کس بلا کی گرمی ہے۔ آپ اس دھوپ میں کیوں نکل آئے، خدانخواستہ اگر آپ کو کچھ ہو گیا تو ہم کو پریشانی اُٹھانا پڑے گی۔"

اُنہیں عجیب شرمندگی نے گھیر لیا تھا۔ اپنی بے عزتی کا احساس ہوا تھا۔ وہ سوچ رہے تھے۔ سب میرے آنے سے پریشان ہو گئے۔ یہ نہیں چاہتے کہ اب اس چمکتی ہوئی دنیا کی کوئی کرن بھی مجھ پر پڑے۔ اسی لئے یہ مجھے گھر میں قید کر دینا چاہتے ہیں۔ یہ سوچتے ہیں کہ شاید میں نے اپنا دماغ بھی ان میں بانٹ دیا ہے اور مجھ میں معمولی رائے تک دینے کی صلاحیت باقی نہیں رہ گئی ہے۔

وہ اپنے بستر پر لیٹے لیٹے کڑھا کرتے یا اخبار پڑھا کرتے۔ مسلسل سوچتے رہنے سے سر میں درد رہنے لگا تھا۔ روشنی تھی کہ جیسے آنکھوں سے پَر لگا کر اُڑتی جاتی تھی۔ اب وہ پڑھتے تو الفاظ آنکھوں کے سامنے ناچنے لگتے۔ وہ بار بار آنکھیں ملتے اور پھر تھک کر اخبار رکھ دیتے۔ ان کی پریشانی کو دیکھ کر اُنہیں پڑھنے سے بھی منع کر دیا گیا تھا۔ وہ اخبار اُٹھاتے اور کوئی نہ کوئی لپک کر اخبار اُن کے ہاتھ سے لیکر سُنانے بیٹھ جاتا۔ جب بھی ایسا کیا جاتا وہ منہ پھیر کر لیٹ جاتے اور کانوں پر اس طرح ہاتھ رکھ لیتے کہ کچھ سُنائی نہ دے۔ آخر بہت ہی فکر کے ساتھ اُنہوں نے فیصلہ کیا کہ وہ کچھ نہیں پڑھیں گے بیٹوں نے جب اُن کی آنکھیں ٹیسٹ کروانے کی کوشش کی تو وہ ضدی بچے کی طرح اَڑ گئے اور چشمہ بدلوانے سے صاف انکار کر دیا۔ اُنہوں نے غصہ ہو کر اپنی آنکھیں بھی دوسروں میں بانٹ دیں۔ اب کوئی اُن کا دل بہلانے کے لئے بھی کچھ سُنانے کی کوشش کرتا تو وہ گردن موڑ لیتے یا اُٹھ کر باہر چل دیتے۔ سب کو اُن سے شکایت تھی، لیکن کوئی حرفِ شکایت زبان پر نہ لاتا کہ وہ گھر کے بزرگ تھے کوئی کچھ سمجھانے کی کوشش کرتا تو وہ سُنتے کب تھے۔ سب اپنی کہے جاتے اور وہ اپنی کئے جاتے۔ گھر کے سبھی فرد چاہتے تھے کہ وہ خود کو اس طرح تھکایا نہ کریں اتنی دور دور تک سیر کو نہ جایا کریں، لیکن وہ روز صبح صبح گھر سے نکلتے تو دوپہر کو دھول سے اٹے ہوئے لوٹتے۔ اگر کوئی ٹوکتا بھی تو وہ بغیر سُنے اپنے کمرے میں چلے جاتے اور دیر تک نہ نکلتے۔ وہ سمجھتے تھے کہ سب اُن کے دشمن ہیں۔

شاہد کیفی

اور دم سادھے پڑے رہتے اور مسکرایا کرتے۔ جب سب تھک کر چلے جاتے تو زور سے قہقہہ لگاتے۔ "سب مجھے مارنے آئے تھے۔ ہاہا۔ ہاہا ـــــ میں زندہ ہوں۔ میں زندہ ہوں ہاہا۔ دیکھیں یہ میرا کیا بگاڑ لیتے ہیں۔

وہ کسی کو اپنے کمرے کی طرف آتا دیکھتے تو اوڑھ لپیٹ کر لیٹ جاتے۔ کوئی ماتھا چھوتا تو وہ ویسے ہی سانس روکے لیٹے رہتے۔ کوئی نبض چھوتا اور وہ ہاتھ کو اُس طرح ڈھیلا چھوڑ دیتے جیسے جان ہی نہ ہو۔ جب وہ سرے پریشان ہوتے اور جلدی جلدی ڈاکٹر کو بلاتے تو وہ عجیب سا سکون محسوس کرتے میں اسی طرح ان سب کو دھوکا دوں گا۔ میں اپنی زندگی کو ان سب سے چھپاؤں گا۔

واقعی وہ سب سے چھپے گھر کے کسی دُور دراز حصّے میں اندھیرے کی چادر اوڑھے بیٹھے رہتے' یا پھر اپنے کمرے میں بند رہتے۔ تیوہار آتے۔ پارٹیاں ہوتیں۔ جشن منائے جاتے۔ وہ کسی میں شریک نہ ہوتے۔ ایسا لگتا تھا کہ آدمیوں کے سامنے جاتے ہوئے اُنہیں جھجک اور وحشت ہوتی ہو۔ اب تو وہ تیز روشنی سے بھی ڈرنے لگے تھے کہ کہیں کوئی پہچان کر یہ سوال نہ کر بیٹھے کہ اب تک زندہ کیوں ہو۔ جب بھی گھر میں کوئی پارٹی ہوتی وہ اپنے کمرے کے دروازے سے کان لگائے ان آوازوں کو سنا کرتے کبھی کبھی اندھیرے میں دھیرے دھیرے چلتے ہوئے جاتے اور کسی سوراخ پر آنکھیں رکھ کر کھڑے ہو جاتے۔ قہقہوں کا طوفان جیسے کانوں کے پردے پھاڑنے لگتا۔ جگمگاتا ہوا ماحول آنکھوں میں چنگاریاں بھرنے لگتا۔

"تم لوگوں نے مجھ سے یہ زندگی چھین لی اور مجھے اندھیرے میں ڈھکیل دیا ہے۔ میں اسے ضرور لے لوں گا۔ یہ میری ہے یہ میری ہے"۔ وہ بڑبڑاتے ہوئے کمرے میں جا کر بیٹھ جاتے۔ اور کئی کئی وقت کسی کے سامنے نہ آتے کوئی اب انہیں اس کے لئے مجبور بھی نہیں کرتا تھا۔

ایسے ہی روشنیوں میں نہائی ہوئی ایک شام تھی' قہقہے پہاڑی جھرنوں کی طرح بکھر رہے تھے۔ سازوں کی آوازیں سب کو مدہوش کئے ہوئے تھیں۔ تھرکتے ہوئے قدم جیسے پاگل ہو اُٹھے تھے۔ کتنی دیر سے وہ اندھیرے کا حصّہ بنے روشنی کے اس سیلاب کو دیکھ رہے تھے۔ انہیں تو ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے زندگی کا اُبلتا ہوا دریا ان کے قریب سے ہو کر بہہ رہا ہے اور وہ اندھیرے قبرستان سے اس ہنگامے کو دیکھ رہے ہیں۔ بے اختیار ان کا دل چاہنے لگا کہ وہ وہاں جائیں' انہیں اپنے بے جان ہاتھ پیروں میں خون تیزی سے گردش کرتا ہوا محسوس ہوا۔ تلوؤں میں سرسراہٹ ہونے لگی۔ دل آگے کھینچنے لگا اور آخر وہ وہاں پہنچ گئے۔ سب اتنا خوش تھے کہ

کسی نے اُن کی طرف توجہ بھی نہ دی۔ وہ خاموشی سے کھڑے ایک ایک چہرے کو تک رہے تھے۔ آنکھوں کی وحشت بڑھتی جا رہی تھی۔

کیا میں کسی کو دکھائی نہیں دے رہا ہوں۔ کیا میرا وجود ـــــ اور پھر ایک زوردار چیخ نے سب کا دھیان کھینچ لیا۔ چیخ چیخ کر انہوں نے آسمان سر پر اٹھا لیا۔ منہ سے نکلتے ہوئے جھاگ کے ساتھ ہی لفظ اِدھر اُدھر گر کر اپنی وقعت کھو رہے تھے ـــ موت۔ دھوکا۔ زندگی۔ فریب۔ چمک ـ دنیا ـــ

اُن کے بیٹوں نے بڑی مشکل سے اُنہیں قابو میں کیا اور بستر پر لٹا کر کمرے کا دروازہ بند کر دیا۔

عرصہ سے جسم میں قید چیخیں اب بھی پوری قوت سے باہر آ رہی تھیں۔ آنسوؤں کا اُبلتا ہوا طوفان تیزاب کی طرح چہرے کو کاٹ رہا تھا وہ بلک بلک کر رو رہے تھے' تڑپ تڑپ کر اپنی موت پر آنسو بہا رہے تھے۔ باہر لوگ حیرت سے کھڑے ایک دوسرے کا منہ تک رہے تھے۔

○○

رشی پٹیالوی

ہُوا ہے جشنِ چراغاں کا اہتمام بہت.....

چمن کو گوشۂ خلدِ بریں کہا جائے
فضا کچھ اتنی تو آسودۂ بہار نہیں
ابھی چراغِ محبت میں روشنی کم ہے
ابھی حیات کا ماحول سازگار نہیں

وہ دور جسکو کہیں دورِ انبساط افروز
ابھی وہ دورِ نشاط آفریں نہیں آیا
وہ جشن، جشنِ چراغاں کا نام دیں جس کو
نفس نفس کیلئے دل کشی نہیں لایا

چراغ جل تو گئے ہیں مگر حقیقت میں
وہ روشنی ہے کہ ظلمت کا رُوپ بھرتی ہے
قریب و دُور چراغاں کی دھوم ہے لیکن
صعوبتوں سے ابھی زندگی گزرتی ہے

عروسِ زیست کے جلوے ہیں نو بہ نو لیکن
ادائے حُسن میں حُسنِ ادا کہاں پائیں
وفا کا نام تو لینے کو لوگ لیتے ہیں
مگر ضیائے خلوصِ وفا کہاں پائیں

نہ کوئی محرم و مونس نہ دوست اور دمساز
غریب و بے کس و لاچار ہیں عوام بہت
مزہ تو جب ہے کہ اب جھونپڑے بھی روشن ہوں
ہُوا ہے جشنِ چراغاں کا اہتمام بہت

○ بنگلہ نمبر ۲۱۵-سیکٹر C-15، چنڈی گڑھ - ۱۶۰۰۱۱
شاعر، بمبئی

سنتو بہادر سنگھ

جشنِ ظفر[1]

گزر گیا وہ زمانہ کہ کاروانِ وطن
بھٹک رہا تھا بگولوں کی رہگذاروں میں
کہاں کا جادۂ اُمید کیسی منزلِ شوق؟
بجز غبار نہ تھا کچھ سراب زاروں میں

قدم قدم پہ یہ کھٹکا تھا راہگیروں کو
چھپے ہوئے نہ ہوں رہزن کمین گاہوں میں
برنگِ بادہ جو پیتے ہیں آدمی کا لہو
لگائے گھات نہ بیٹھے ہوں تیرہ راہوں میں

خوشا نصیب کہ اک صاحبِ کرامت نے
بچایا حلقۂ ظلمت سے شب گزیدوں کو
اُداس چہروں کو بخشی شگفتگی کی ضیا
نراش سینوں میں زندہ کیا اُمیدوں کو

یہ معرکہ بھی ہے اپنی صدی کی 'رام کتھا'
جہادِ نور سے ظلمت کے مات کھانے کی
قدم قدم پہ چراغاں کا اہتمام کرو
کہ آج رات ہے 'جشنِ ظفر' منانے کی

○ ماریا آشرم۔ راگھو ماجرا۔ پٹیالہ

---

[1] جب مریادا پرشوتم رام، راون کو شکست دے کر اجودھیا لوٹے تو سارے شہر میں چراغاں کر کے 'جشنِ ظفر' منایا گیا۔ دیوالی کا تہوار اسی تقریب کی یاد میں منایا جاتا ہے۔

مقالہ

اُردو میں ترجمہ شدہ ادب

یُونس اگاسکر

شعبۂ اُردو۔ مہاراشٹر کالج۔ بلاسس روڈ۔ بمبئی

اُردو میں تراجم کا سلسلہ مذہبی اور نیم مذہبی کتابوں کے ترجموں سے شروع ہوتا ہے۔ اس میں سب سے قدیم ترجمے کی تلاش اور اُس کا حُصول مشکل ہے۔ دکن کے صوفی بزرگوں کے رسالوں میں سے چند کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ وہ فارسی کے تراجم ہیں۔ یہ رسالے پندرھویں' سولھویں اور سترھویں صدی میں لکھے گئے۔ سترھویں صدی کی مشہور ترین کتاب مُلّا اسد اللہ وجہی کی "سب رس" ہے' جو محمد یحیٰ ابن سیبک فتاحی نیشاپوری کی فارسی تصنیف "دستورِ عشاق" کا ترجمہ ہے اور اِس میں قصّے کے پیرائے میں مذہبی و صوفیانہ امور پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اِس کتاب کا اصل ماخذ سنسکرت کی विनय प्रवेश کو بتایا جاتا ہے۔ یہ ترجمہ غالباً ۱۶۳۵ء میں عام ہوا۔ زبان کی قدامت دیکھئے :

"ایک شہر تھا اُس شہر کا نانوٗ سیستان۔ اُس کے بادشاہ کے ناوٗ عقل۔ دین و دنیا کا تمام کام اُس سے چلتا۔ اُس کے حکم باج ذرا کیں نئیں ہلتا۔ اُس کے فرمائے پر جو چلے' ہر دو جہاں میں ہوئے بھلے۔" شمالی ہند کے قدیم ترجمے کی حیثیت سے فضل علی فضلی کی "دہ مجلس یا کربل کتھا" مشہور ہے جو مُلّا حسین واعظ کاشفی کی "روضۃ الشہدا" کا اُردو رُوپ ہے۔ یہ ۱۷۳۱ء میں لکھی گئی۔ اِس کے تقریباً پینتالیس سال بعد قرآن مجید کا پہلا اُردو ترجمہ ۱۷۷۶ء میں وجود میں آیا جو مولانا شاہ رفیع الدینؒ کی کاوش سے مرتب ہوا تھا۔ یہ ترجمہ لفظی' بے محاورہ اور قدرے دشوار ہے۔ قرآن کے دیگر مترجمین میں اٹھارہویں صدی سے بیسویں صدی تک شاہ عبد القادر دہلوی' مولوی نذیر احمد دہلوی' مولانا محمود الحسن و مولانا شبیر احمد عثمانی' مولوی فتح محمد خاں جالندھری' مولانا اشرف علی تھانوی' مولانا ابو الکلام آزاد' مولانا عبد الماجد دریا بادی اور مولانا ابو الاعلیٰ مودودی کے تراجم اہمیت کے حامل ہیں۔

گذشتہ ایک صدی میں ہندو دھرم کا بھی بہت سا لٹریچر اُردو میں منتقل کیا جا چکا ہے۔ اِس میں سب سے قدیم چاروں ویدوں کا "خلاصۃ الکھم پرکاش" ہے جو ۱۸۶۱ء میں منظرِ عام پر آیا اور جو منشی کنھیا لال کی کاوش کا نتیجہ ہے۔ بھاگوت گیتا کے قدیم ترین ترجمے کے خالق بھی منشی کنھیا لال ہی ہیں۔ گیتا کے اوّلین ترجمے کی زبان کا رنگ ملاحظہ ہو۔ کرشن اُرجن سے کہتے ہیں

"جب اخلاقِ حمیدہ گُم ہو جاتے ہیں اور شر و فساد زیادہ
ہو جاتا ہے تو اعتدال دینے کو ایک صورت پیدا ہوتی ہے
میں وہ صورت ہوں۔"

اُردو میں گیتا کے ڈیڑھ درجن سے اُوپر ترجمے پائے جاتے ہیں' جن میں چار پانچ منظوم ہیں۔ منظوم ترجموں میں مُنشی بشیشور پرشاد منوّر لکھنوی کا ترجمہ "نسیم عرفان" اور پربھو دیال عاشق لکھنوی کا ترجمہ "غذائے رُوح" قابلِ ذکر ہیں۔ ویدوں اور گیتا کے علاوہ اُپ نشدوں کو بھی اُردو میں منتقل کیا جا چکا ہے۔ بارہ اُپ نشدوں کا مجموعہ اُردو ترجمے اور شرح کے ساتھ بابو پیارے لال نے ۱۹۰۰ء میں مُرتب کر کے چھپوایا تھا۔ مُنشی سورج نرائن مہر دہلوی نے اُپ نشد کی شرح چار جلدوں میں لکھی' جس میں ترجمہ بھی شامل ہے۔ مُنشی سورج نرائن مہر نے متعدد دھارمک پُستکوں اور شرحوں کا ترجمہ اُردو میں کیا۔ اُن کی زبان بڑی صاف اور سلیس ہے۔ اُردو میں کلکی پُران' وشنو پُران' منو سمرتی' بھرتری ہری شتک کے بھی کئی ترجمے ملتے ہیں؛

رامائن کو اُردو کے بڑے نامی گرامی شاعروں اور ادیبوں نے اپنی زبان میں کیا ہے۔ اِن تراجم میں دوارکا پرشاد اُفق لکھنوی' شنکر دیال فرحت اور سورج نرائن مہر کے تراجم اپنی اپنی جگہ اہمیت کے حامل ہیں۔ اُردو کے مشہور شاعر برج نرائن چکبست اور دُرگا سہائے سرور جہان آبادی نے بھی رامائن کے چند حصّوں کے منظوم ترجمے کئے ہیں جو اُردو میں امر ہو گئے ہیں۔

سناتن ہندو دھرم کے علاوہ ہندو مت کے دوسرے فرقوں اور طبقوں مثلاً برہمو سماج' آریہ سماج وغیرہ کی کتابوں کے ترجمے بھی اُردو میں کئے گئے ہیں۔ آریہ سماج کی بُنیادی کتاب سوامی دیانند سرسوتی کی تصنیف "ستیارتھ پرکاش" کے ترجمے

شاعر۔ بمبئی

پانچ یا چھ تراجم پائے جاتے ہیں۔ شانتی نرائن کا کیا ہوا سوامی وویکانند کی "بھگتی اور ویدانت" کا ترجمہ بھی مشہور ہے۔ اِسی طرح جین مَت، سکھ مَت، بہائی مذہب اور عیسائی مذہب کی کتابوں کے ترجمے اُردو میں بہ آسانی مل جاتے ہیں۔ کوئی شخص اُردو زبان کے ذریعے اِن مسلکوں کا مطالعہ کرنا چاہے تو اُسے کوئی دشواری پیش نہیں آئے گی۔ خصوصاً عیسائیت کا اچھا خاصا لٹریچر اُردو میں موجود ہے۔ انجیل کے متعدد تراجم ہیں، جن میں جرمن پادری بنجمن شُلٹز کا ترجمہ قدیم ترین یعنی سوا دو سو سال پُرانا ہے۔ اِس کے علاوہ عہد نامۂ قدیم و جدید کے جُزوی یا مکمل ترجمے مختلف ادوار کیے گئے ہیں۔ اِن میں مرزا فطرت دہلوی کا عہد نامۂ جدید زبان و بیان کے اعتبار سے خاصا اہم ہے۔ اِس پر ولیم ہنٹر نے نظرِ ثانی کی تھی اور غالباً یہ ترجمہ یونانی زبان سے کیا گیا ہے۔ اِس کا سالِ اشاعت ۱۸۰۵ء ہے۔ عیسائی مذہب کی دوسری اہم کتابوں، تفسیروں اور شرحوں کے بھی متعدد تراجم اُردو میں ملتے ہیں۔

۱۸۰۱ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے انگریز ملازمینِ سرکار کو ہندوستانی زبانیں سکھانے کے لئے کلکتے میں فورٹ ولیم کالج قائم کیا تھا۔ اُس وقت اُردو ادب کا بیشتر حصّہ شعر و شاعری پر مشتمل تھا، نثری کتابیں خال خال اور دقیق تھیں جن سے اُردو سیکھنا ممکن نہ تھا اور اُردو سیکھنا ضروری تھا۔ چنانچہ اِس مقصد کے تحت سلیس و بامحاورہ اُردو میں مشرقی زبانوں کے ادب کو منتقل کرنے کی کوششوں کا آغاز ہوا۔ عربی، فارسی، سنسکرت، برج بھاشا کے اُردو داں عالموں کو یہ ذمے داری سونپی گئی۔ نتیجے میں میر امّن کا ترجمۂ چہار درویش بعنوانِ باغ و بہار، للّو لال جی کی سنگھاسن بتیسی و بیتال پچیسی، شیر علی افسوس کا ترجمۂ گلستاں بعنوان باغِ اُردو، میر بہادر علی حسینی کا ترجمۂ ہتوپدیش بعنوان اخلاقِ ہندی، سید حیدر بخش حیدری کا ترجمۂ شک سپتتی عرف توتا کہانی، کاظم علی جوان کا ترجمۂ شکنتلا، مولوی اکرام علی کی اخوان الصفا جیسی یادگار کتابیں منظرِ عام پر آئیں۔ ان میں میر امّن کی باغ و بہار اور للّو لال جی کی سنگھاسن بتیسی تو اس لحاظ سے اہم ترین ہیں کہ ایک سے اُردو کا اور دوسری سے موجودہ ہندی کا اُسلوب متعین ہوتے میں مدد ملی ہے۔

فورٹ ولیم کالج کے علاوہ جن اداروں نے مشرقی و مغربی زبانوں کے تراجم کو بڑھاوا دیا اُن میں حیدرآباد دکن میں نواب شمس الامرا کا قائم کردہ دارالتالیف والترجمہ، شاہانِ اودھ کا دارالترجمہ، دہلی کا دہلی کالج، سرسید کی قائم کی ہوئی سائنٹفک سوسائٹی علی گڑھ اور بیسویں صدی میں دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ، حیدرآباد، انجمن ترقیٔ اُردو اورنگ آباد اور دارالمصنّفین اعظم گڑھ کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔

اِن کے علاوہ جامعہ ملّیہ دہلی، ساہتیہ اکادمی، نیشنل بک ٹرسٹ اور ترقی اُردو بیورو وغیرہ نے ملکی و غیر ملکی زبانوں سے اُردو میں مختلف موضوعات پر کتابیں منتقل کرنے کا کام ماضی میں بھی کیا ہے اور اب بھی اِس کا سلسلہ جاری ہے۔ جن کاروباری اداروں نے اِس کام میں ہاتھ بٹایا ہے اُن میں منشی نول کشور لکھنؤ، نیشنل اکاڈمی، دہلی، نرائن دت سہگل اینڈ کمپنی دہلی وغیرہ خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔

نواب شمس الامرا اور اُن کے مصاحبین نے جن کتابوں کے ترجمے کئے وہ زیادہ تر فلسفہ و سائنس سے متعلق ہیں۔ اِن تراجم کی زبان سادہ، سلیس اور عام فہم ہے لیکن متروک الفاظ کے استعمال اور جملوں کی ساخت کی قدامت نے اُسے روانی سے محروم کر دیا ہے۔ جیسے "چھپوایا تھا بیچ لندن میں، واسطے سیکھنے اور دل نوشتہ بابوں کے"۔ بعض جگہوں پر اصطلاحات کے مترادفات مضحکہ خیز ہو گئے ہیں مثلاً FORCE PUMP کے لئے "زبردستی کا پمپ"۔ اس کے باوجود مترجمین کی یہ کاوش قابلِ داد ہے۔ اِن کے تراجم میں "کیمسٹری کا مختصر رسالہ"، "رسالہ مفتاح الافلاک"، "رسالہ مختصر جرِ ثقیل"، "رسالہ علمِ آب"، "رسالہ علمِ ہیئت" وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔

بیسویں صدی کے نصفِ اوّل میں حیدرآباد کے دوسرے ادارے دارالترجمہ جامعۂ عثمانیہ نے جو بیش بہا خدمات انجام دی ہیں، اِس کی کوئی دوسری مثال ابھی سامنے نہیں آئی ہے۔ دارالترجمہ نے مختلف علوم و فنون کی تقریباً تین سو کتابوں کے تراجم پیش کئے، جو ہندوستان کے چیدہ چیدہ ادیبوں اور عالموں کی کوششوں کا نتیجہ ہیں۔ اِن میں تاریخِ یورپ، تاریخ یونان و رُوما، جغرافیہ، سیاسیات، معاشیات، عمرانیات، نفسیات، اخلاقیات، فلسفہ، قانون، ریاضی، کیمیا، حیاتیات، طب، انجنیئری جیسے علوم پیش کئے گئے ہیں۔ دارالترجمہ کی یہ خدمات اظہر من الشمس ہیں اور کسی تفصیل کی محتاج نہیں۔

گزشتہ صدی میں "مجموعۂ گنج" کے نام سے کسی انگریزی کتاب کا ترجمہ چھپا ہے، جو زبان اور اندازِ بیان کے اعتبار سے "معیاری" فرنگی اُردو کا نمونہ ہے۔ کسی انگریز نے ۱۸۴۵ء میں ہندوستانیوں کے استفادے کی خاطر "عقل روشن کرنے والی تعلیموں کا اور دانائی سکھانے والی تاریخوں کا" بیان کیا ہے۔ اِس کتاب کی زبان کا ایک نمونہ ملاحظہ کیجئے: "کمپنی کے ۔۔ کوئی آدمی پوست کا کھیت کرنے اور افیون مول لینے نہیں سکتا، مگر کمپنی کے حکم سے"۔ اِس کتاب کے آخر میں یہ ہدایت بھی درج ہے کہ ہندوستانیوں کو چاہیئے کہ مغربی علوم کو اپنی زبان میں بھی منتقل کرنے کی کوشش کریں۔

انیسویں صدی میں مغربی علوم و فنون کو اُردو میں منتقل کرنے کی کوششوں

* شاعر ۔ بمبئی

سلسلہ نعدد شہوں سے جاری رہا اور آج تک جاری ہے۔ اب اس میں دیگر ملکوں کی عقل و دانش کو بھی شامل کر لیا گیا ہے۔ چنانچہ مشرق و مغرب کا علم و فلسفہ ہماری زبان میں ڈھل چکا ہے۔ اگرچہ ابھی بہت کچھ ہونا باقی ہے لیکن ہم کس رفتار سے چل رہے ہیں اور ہماری سمتِ سفر کیا رہی ہے، اس کا اندازہ ذیل کے چند عنوانات سے ہوگا جو ہماری زبان میں منتقل ہو چکے ہیں۔ ان میں اُن ترجموں کا ذکر نہیں ہے جو عربی فارسی سے کئے گئے ہیں کیونکہ اُن سے اُردو والے بخوبی واقف ہیں۔

کتاب	مصنف	مترجم
۱۔ مبادیٔ علم جیالوجی	نامعلوم	الطاف حسین حالی
۲۔ جبر و مقابلہ	گنال بریجر	مولوی ذکاء اللہ
۳۔ قواعدِ حساب مستعد فی تخمیں	کرنل ایم بریڈیاتھ	لالہ جگ موہن لال
۴۔ استعمالِ جرِّ ثقیل	تھامس ٹیٹ	منو لعل بہاری
۵۔ رسالہ اعمالِ جرّاحی	کوپر	جیمز ہنری بٹلر
۶۔ اُصول علم مثلث و تراشہائے مخروطی و علم ہندسہ بالجبر	ہٹن، بوشارٹ اور سمسن	ماسٹر رام چندر
۷۔ نفسیاتی اصول	جیمز وارڈ	مولوی معتصد ولی الرحمان
۸۔ معاشرتی نفسیات	ولیم میک ڈوگل	مرزا محمد ہادی رُسوا
۹۔ تجزیۂ نفس	برٹرینڈ رسل	شجاعت حسین بخاری
۱۰۔ نفسیاتِ واردات روحانی	ولیم جیمز	خلیفہ عبدالحکیم
۱۱۔ تشکیلِ انسانیت	رابرٹ بریفالٹ	عبدالمجید سالک
۱۲۔ علم کے نئے اُفق	سی ای ایم جوڈ	سیّد قاسم محمود
۱۳۔ تاریخ اخلاقیات	آر اے پی روجرس	مولوی احسان احمد
۱۴۔ اخلاقیات	جان ڈیوی اصولِ جمیز اخلاقِ نفس	عبدالباری ندوی
۱۵۔ جینے کی اہمیت	لن یوتانگ	مختار صدیقی
۱۶۔ ریاست	افلاطون	ذاکر حسین
۱۷۔ داس کیپٹل	کارل مارکس	سید محمد تقی
۱۸۔ فلسفے کا نیا آہنگ	سوسین لینگر	بشیر احمد ڈار
۱۹۔ جنس کا نفسیاتی پہلو	کینتھ واکر	سید قاسم محمود
۲۰۔ جنس کا نیا پہلو	پیٹر غلیمر	. . .

اُردو میں مغربی فکشن بھی کافی تعداد میں منتقل ہو چکا ہے۔ آئے دن انگریزی، فرانسیسی، جرمن وغیرہ سے ناول، ڈرامے اور افسانے اُردو میں ترجمہ ہوتے رہتے ہیں۔ مغرب کے تقریباً تمام شاہ کاروں کا اُردو میں ترجمہ ہو چکا ہے ان میں گوئٹے کا ولہیلم مائسٹر (سید عابد حسین) بالزاک کا بڈھا گوریو (سید نسیم ہمدانی) ستاں دال کا سُرخ و سیاہ اور گستاو فلابیر کا مادام بوواری (محمد حسن عسکری)، میکسم گورکی کا ماں (؟)، نکولائی آستراوسکی کا فولادی کی آزمائش (؟)، بورس پیسترنک کا ڈاکٹر ژواگو (یوسف صدیقی)، فیودور دستوئیفسکی کا ذلتوں کے مارے لوگ (ظ۔ انصاری)، بجہ عظیم، جان سٹیلنس کا ہماری سڑک (سید احتشام حسین) ہنری جیمز کا پورٹریٹ آف اے لیڈی (قرۃ العین حیدر) الیگزنڈر سولزنسٹن کا کینسر وارڈ (گوپال متل)، یہ محض چند نام ہیں۔ خلیل جبران کو پورا کا پورا حکیم حبیب اشعر دہلوی نے اُردو میں منتقل کر دیا۔

غیر ملکی ادب کے علاوہ ملکی و علاقائی ادب کو بھی اُردو والے اپنا رہے ہیں۔ ہندوستان کی تقریباً سبھی زبانوں سے اُردو میں فکشن منتقل ہو رہا ہے اور اس کام میں نیشنل بک ٹرسٹ خاصا نمایاں رول انجام دے رہا ہے: چنانچہ گجراتی سے پنالال پٹیل نے زندگی ایک ناٹک (کشور سلطانہ) مراٹھی سے وینکٹیش ماڈگل کر کا بنگر وادی (درشن ملیانی) پنجابی سے نانک سنگھ کا سفید خون (رتن سنگھ) بنگالی سے بنکم چندر چٹرجی کے متعدد ناول (مترجمین سدرشن، گوپال متل وغیرہ) اُردو میں منتقل ہو چکے ہیں۔ ہندی سے تو آئے دن ترجمے ہوتے رہتے ہیں۔ خاص طور سے ہندی کا مختصر افسانہ اُردو میں کافی منتقل ہو رہا ہے۔ یہ جائزہ نامکمل ہے دوسری بے شمار ترجمہ شدہ کتابوں کے نام اور اُن کا تعارف اس مختصر مضمون میں شامل ہونا ممکن نہیں۔

بڑی ضرورت اس بات کی ہے کہ اُردو میں ترجمہ شدہ ادب کی ایک مکمل ببلوگرافی تیار کی جائے۔ ترجمہ شدہ ادب کی طباعت و اشاعت پر بھی مزید توجہ کی ضرورت ہے۔

OO

(بشکریہ آل انڈیا ریڈیو بمبئی)

محکمۂ تعلقاتِ عامہ، ہریانہ

ہریانہ ۔ برق رفتار تعمیر و ترقی کے دس برس

یقیناً ایک دس سالہ عرصہ لوحِ وقت پر ایک ادنیٰ نقطے کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ قلیل مدت کسی چھوٹے سے کام کے لئے بھی بہت تھوڑی ہے۔ لیکن

ہریانہ کی بات تو کچھ اور ہی ہے۔

یہاں وقت اور محنت کی بدولت دہقانوں کی ترقی کی جھلک ایک ہی دہائی میں آشکارا ہوئی ہے۔ اس دوران یہاں کچھ ہوا ہے۔ وہ کیا؟ ہندوستان کی اس تیز ترین ترقی کی حامل ریاست کو فی کس آمدنی کے لحاظ سے ملک میں دوسرا مقام حاصل ہے اور یہ بات اس کے روشن مستقبل کی غماز ہے۔

دھرتی کا سینہ دھڑکنے لگا

ہم نے کئی سمتوں کی جانب پیش قدمی کی ہے۔ دس برس پہلے زرعی پیداوار صرف ۲۵.۹۲ لاکھ ٹن تھی جو ہمارے خود کے لئے بھی ناکافی ہوتی تھی۔ لیکن اب ۴۹.۰۶ لاکھ ٹن زرعی پیداوار حاصل ہے۔ ۱۴ لاکھ ٹن اناج مرکزی ذخیرہ کو دیا جاتا ہے۔

تشنہ لب دھرتی کی پیاس بجھی

مزید ۴.۰۶ لاکھ ہیکٹر اراضی کو مندرجہ ذیل طریق کار سے زیر آبپاشی لایا گیا۔

(i) پانی کو ۵۷۰ فٹ اونچا اٹھا کر

(ii) ۶۳۸ کیوزکس پانی کو رسنے سے بچا کر

(iii) ۱۴۲۹ کیوزکس سیلاب کے پانی کو استعمال میں لا کر، اور

(iv) ۵۷۵ کیوزکس زیر زمین پانی کو بروئے کار لا کر

کل آبپاشی رقبہ ۱۳ لاکھ ہیکٹر سے بڑھ کر ۱۷ لاکھ ہیکٹر ہو گیا ہے۔ راوی اور بیاس دریاؤں سے ہریانہ کے حصے کا پانی ملنے کے ساتھ ہی آبپاشی رقبہ ۲۳ لاکھ ہیکٹر ہو جائے گا۔

زندگی کی راہیں منور ہوئیں

سال ۱۹۷۰ء میں ریاست نے سو فی صد بجلی لگانے کا نشانہ حاصل کر کے ملک میں امتیازی مقام حاصل کیا۔ فی کس بجلی کی کھپت ۵۷ یونٹ سے بڑھ کر ۱۳۹ یونٹ ہو گئی اور کھپت کاروں کی تعداد ۵۷۵.۹۴ ہزار سے بڑھ کر ۱۲۹،۹۳۰.۷ ہو گئی ہے۔ کل میسر بجلی کا ۴۵ فی صد زرعی استعمال میں لایا جا رہا ہے اور یہ اوسط ملک میں سب سے زیادہ ہے

کمزور طبقہ جات کے لئے گھر

ہریجنوں کو ۲.۱۵ لاکھ سے زائد رہائشی پلاٹ دیئے گئے اور اس کے علاوہ ۳ لاکھ مزید پلاٹ بے گھر افراد میں تقسیم کئے گئے ہیں۔

خوشحالی کی مظہر۔ صحت اور تندرستی

ضرورت مندوں کو طبی سہولیات مہیا کی جا رہی ہیں۔ علاج اور صحت سے متعلق فی کس خرچ ۴.۶۰ روپے سے بڑھ کر ۱۰.۷۹ روپے ہو گیا ہے۔ اکیلے دواؤں پر ہی ۹۹ پیسے فی کس کی در سے خرچ کیا جا رہا ہے جو ملک کی دوسری ریاستوں کے مقابلے میں زیادہ ہے۔

منصوبہ بند کنبے

قومی نشانہ ۱۸ فی صد کے مقابلے میں ہریانہ نے خاندانی منصوبہ بندی کا ۳۷.۲ فی صد نشانہ حاصل کر کے ایک امتیازی پوزیشن حاصل کی ہے۔ بڑھتی ہوئی آبادی کی شرح کو صفر کے درجے تک لائے جانے کا پروگرام مرتب کیا گیا ہے۔

چاند کی دوری اب حیران کن نہیں رہی

ہریانہ ...

ن بسیں ۳۶۳ ، ۴ لاکھ کلومیٹر روزانہ مسافت طے کرتی ہیں
ور یہ فاصلہ زمین سے چاند تک کے فاصلے سے زیادہ ہے۔
ران میں ۶۴ ، ۵ لاکھ مسافر روزانہ سفر کرتے ہیں۔

پہیے کی گردش ریاست میں صنعتی اعتبار سے ایک انقلاب آیا ہے۔ موجودہ دور میں لگ بھگ ۳۰ بڑے، ۵۰۰ درمیانے اور تقریباً ۱۸۰۰۰ چھوٹے صنعتی یونٹ مصروفِ کار ہیں۔ صنعتی اشیا کی برآمد ۶۵ ، ۴ کروڑ روپے سے بڑھ کر تقریباً ۳۴ کروڑ روپے ہوگئی ہے۔

یرگی سے روشنی کی جانب روہتک کوروکشیتر اور مقیم نیورسٹیاں نوجوان دماغوں کو علم کی روشنی سے منور کر رہی یں۔ وقاری زراعتی یونیورسٹی حصار اور مثالی موتی لال نہرو سپورٹس اسکول رائے نے اہمیتی شکل اختیار کی ہے۔ مختلف

زمروں کے ۱۸ لاکھ طلبا کو ریاستی تعلیمی صنعت کے تحت لایا گیا ہے۔

فلاح و بہبود کے کارہائے نمایاں ہریجنوں اور پسماندہ طبقوں، بڑھاپے کی پنشن جیسی فلاح و بہبود سے متعلق اسکیموں پر خرچ کی جانے والی رقم ۹۶ ، ۲۷ لاکھ روپے سے بڑھ کر ۱۴۱ ، ۵۴ لاکھ روپے ہو گئی ہے۔

سیاحوں کی جنت سیر و سیاحت کے نقشے پر ہریانہ نے اپنا خاص مقام بنا لیا ہے اور اب دبچک، گولڈن اوریل، وسلنگ ٹیل، پرپل سن برڈ، میور، میگپال اور روزی پیلکن جیسے مقامات سیلانیوں کی دلکشی کے مرکز بنے ہوئے ہیں۔ ہریانہ کی مختصر ترین سیر بھی آپ کو مطمئن کرنے کے لئے کافی ہوگی

جاری کردہ :
محکمۂ تعلقاتِ عامہ، ہریانہ
چنڈی گڑھ



وقار خلیل

غزل

(نذرِ مسعود حسین خاں)

صبا رُکے نہ رُکے ذکرِ یار میں کیا تھا
کیسے بتائیں کہ اِس انتظار میں کیا تھا

ورا جنوں کو سمجھتے خرد کے دیوانے
یقینِ موسمِ فصلِ بہار میں کیا تھا

یہی کہ لوگ مسرت کی آرزو ہی کریں
نقیبِ شہر کے بھی اِقتدار میں کیا تھا

نہ زندگی، نہ رفاقت، نہ سرخوشی، نہ وفا
دھواں دھواں تھی فضا انتشار میں کیا تھا

ہمارا عہد بنانے چلا ہے اِک تاریخ
ثبوت کچھ تو ملے اختیار میں کیا تھا

وہ خوش نہیں نہ سہی پھر اُسے منا لیتے
اِک اور بار ذرا اعتبار میں کیا تھا

وقار تم ہی بتاؤ یہ فلسفہ کیا ہے
خوشی نہیں تھی غمِ روزگار میں کیا تھا

○ ایوانِ اردو، پنجہ گٹہ روڈ، حیدر آباد ۴....۵

وقار خلیل

ہماری رہ گزر

ملے، ہم تم وہیں اکثر
جہاں احساس پہنچا ہے
وہی منزل تو اپنی ہے
جسے کم لوگ پہچانے
یہ دُنیا:
اور اِس کی بے نہایت آرزوئیں
خواہشیں: ارماں
فقط سانسوں کے چلنے تک
یہ سانسیں چند روزہ ہیں؛
مگر اپنی بساطِ زندگی
ہر اِک منزل، ہر اک رستے سے آگے ہے
جہاں محدود ہوں راہیں
ہماری رہگزر جادہ بناتی ہے۔

فصیح اکمل قادری

غزل

یوں سادگی سے دل کو نہ اپنے اُداس رکھ
دُنیا ہے بوچھال تو پتھر بھی پاس رکھ

کرتے ہیں لوگ وار بھی کتنے خلوص سے
اب ساتھ اپنے کوئی قیافہ شناس رکھ

الفاظ جیسے سربگریباں ہوں اندلوں
ہر پیکرِ خیال ابھی بے لباس رکھ

انسانیت کے شعلۂ آخر کا رقص ہے
انسان کو کچھ اور ابھی بدحواس رکھ

برداشت کی حدوں سے گزرنے لگے ہیں لوگ
نعروں پہ پھر کسی نے سیگ کی اساس رکھ

مانگے کے طاق کوٹ سے بنتی نہیں ہے بات
چہرا اگر ہے تیرا تو اپنا لباس رکھ

○ "ویشان منزل" ۔ ابھی تھان ۔ شاہجہاں پور ۳

گھر۔ باہر

مادھوری شاہ

ترجمہ :۔ رفعت نواز
محلہ گھاٹی۔ اورنگ آباد (مہاراشٹر)

مجھے رہ رہ کر ماں پر غصہ آ رہا تھا حالانکہ اس میں اُن کی کوئی غلطی ں تھی۔ اُنھوں نے کبھی ہم پر وہاں جانے کے لئے دباؤ نہیں ڈالا تھا' نہ ہی ارکیا تھا' لیکن وہ اکثر وہاں کی باتیں کیا کرتیں اور وہ باتیں ہمارے لئے ابل یقین ہوتی تھیں۔ بھائی تو اکثر باتیں سُنتے سُنتے اُکتا کر اُٹھ جاتا کہ ں کے لئے اِن باتوں میں کوئی نیا پن نہیں تھا' بعد میں ماں کی باتیں بڑی بسی سے سُنا کرتی تھی' لیکن بعد میں مَیں بھی محسوس کرنے لگی تھی کہ ماں وہاں باتیں سُنانے کے بہانے بیتی باتوں اور چھوڑے ہوئے مقامات کی یاد ہ کر لیا کرتی ہیں بس' لہذ مجھے اُن سے ہمدردی ہونے لگتی۔ ایسا نہیں تھا ماں وہاں جا نہیں سکتی تھیں بلکہ وہاں جانے کا کوئی نہ کوئی موقع ہر سال ں آتا تھا لیکن ماں خود ہی ٹال دیتی تھیں۔ آس پاس کا ماحول دیکھ کر شاید زدہ رہتیں کہ وہاں جانے پر سب کچھ ویسا ہی نہ ملے جیسا وہ چھوڑ کر آئی تھیں۔

ماں اور پتاجی کوئی پچیس سال پہلے وہاں سے نکل آئے تھے' تب ایدیہ نہیں سوچا تھا کہ اب لوٹنا نصیب نہیں ہوگا۔

آزادی کے بعد کے کئی برسوں تک تو ماں بڑے جوش سے ہمیں بتایا تی تھیں کہ ارے تم جب گھر دیکھو گے تب تک تو وہ کتنا ہی بدل گیا ہوگا۔ ے دقتوں کا کچھ تمہیں کہاں دیکھنے کو ملے گا۔ تم وہاں بھی یہاں جیسی یزیں پاؤ گے۔ گاؤں میں بجلی آ چکی ہوگی' نل لگ گئے ہوں گے اور یں دوڑنے لگی ہوں گی۔ کنوئیں سے پانی بھر کر لوٹتی پنہاریوں کی ایک دوسرے آگے نکل جانے کی دوڑ دیکھنا' بیلوں کے گلوں میں بندھی گھنٹیوں کی میٹھی ن جھن کے بیچ دھیرے دھیرے چلتی بیل گاڑیوں میں سفر تمہاری تقدیر ں کہاں' یہ کہتے کہتے ماں کی آنکھوں میں ایک چمک سی آجاتی اور دھیرے دھیرے گنگنانے لگتیں۔

"بڑا میٹھا ہے ہمارا گھر' ہم تو اپنے گھر جائیں گے۔"
شاعر۔ بچی

لیکن بعد میں اُن کا گھر کے بارے میں جوش و خروش ٹھنڈا پڑ گیا تھا' اُنھیں شاید یہ معلوم ہو گیا تھا کہ اُن کے خوابوں کی تعبیر اُن کے خیالوں کے مطابق نہیں نکلی' پر وہ گھر کا ذکر جب تب کر لیا کرتی تھیں اور ماں کی اِن ہی باتوں نے مجھے گھر جانے کے لئے اُکسایا تھا۔

ٹرین کے احمد آباد چھوٹنے کے بعد کافی وقت اچھا گذر گیا۔ نیا ماحول' نئے مقامات دل کو کھینچ رہے تھے۔ اپنی جنم بھومی کا لگاؤ شاید دل میں جوش سا بھر دیتا ہے۔ جوں جوں ٹرین آگے بڑھتی گئی یہ سہانا پن اور سنسنی سب بدلنے لگا۔ اب بنجر کھیت نظر آ رہے تھے۔ چھوٹے چھوٹے ٹوٹے پھوٹے اسٹیشنوں کے بیچ ریت اور دھول اُڑ رہی تھی اور ہمیں جیسے گھٹن کا احساس ہونے لگا تھا۔ جوں جوں آگے بڑھتے گئے یہ گھٹن بڑھتی گئی اور دل میں انجانا سا خوف گھر کرنے لگا۔ پچھڑا پردیس دیکھ کر لگتا تھا کہ ہمارا رشتہ تہذیب یافتہ سماج سے ٹوٹ رہا ہے۔ سوچ رہی تھی اب لوٹ بھی سکوں گی کہ نہیں' لہذا اس وقت ماں پر بھی غصہ آ رہا تھا کہ اُن ہی کی باتیں سُن سُن کر گھر دیکھنے کی تڑپ پیدا ہوئی تھی۔ پر اب تو واپس لوٹنے کو جی چاہ رہا تھا۔

گرمی اور پیاس سے گلا سوکھا جا رہا تھا۔ کئی کئی اسٹیشن بعد کسی ایک اسٹیشن پر بڑی مشکل سے پانی ملتا۔ آخر تنگ آ کر ہم نے بستر سے کئی گڑیاں نکالیں۔ پلاسٹک کی تھیلیوں میں ہم نے بہت سی گڑیاں' بسکٹ وغیرہ رکھ لئے تھے۔ ہمارے اپنے یہاں کوئی چھوٹا بچہ تو تھا نہیں' لیکن پاس پڑوس میں تو ہوں گے ہی۔ بچوں کو یوں بھی باہر سے آنے والوں کو دیکھنے کا ان سے کچھ پانے کا شوق ہوتا ہے نا' اُن ہی کے لئے یہ چیزیں رکھی تھیں۔

پتاجی کہا کرتے کہ جب وہ بہت چھوٹے تھے تو اُن کے پتاجی [illegible]

ہوگیا تھا۔ گھر میں کوئی مرد نہیں تھا۔ اُن دنوں گاؤں کے بہت سارے لوگ کچھ چھوڑ کر کام کی تلاش میں بمبئی جایا کرتے تھے۔ مگر ان کے خاندان کے افراد کچھ میں ہی رہتے تھے۔ ہر سال مرد بمبئی سے آتے تھے تو بچوں کے لئے کھانے کی چیزوں کی ٹوکری ضرور لاتے تھے۔ اُن دنوں چیزیں بڑی سستی تھیں، اس لئے ٹوکری کاجو کشمش بادام اور ماہم کے حلوے سے بھری ہوتی تھی۔ گو کہ پتا جی کے کوئی قریبی عزیز بمبئی میں نہیں تھے، پھر بھی اُنھیں بمبئی سے آئی چیزیں کھانے کو مل جاتی تھیں کہ بمبئی سے آنے والا سب سے پہلے ان گھروں میں مٹھائی وغیرہ بھجواتا جن کیلئے مٹھائی لانے والا گھر میں کوئی نہ ہوتا تھا۔

پانی نہیں ملا تو میں اور بھائی سنگترے کی گولیاں چوسنے لگے تھے۔

احمد آباد سے ٹرین میں بھوج سے مانڈوی اور مانڈوی سے بس میں بھوجائے کا یہ لمبا سفر بڑی مشکل سے کٹا۔ بھوجائے پر اترنے والے ہم دونوں ہی تھے۔ ہمارے اُترتے ہی بس چل پڑی اور پیچھے دُھول کا غبار چھوڑ گئی اور جب غبار چھٹا تو ماحول ایکدم بدل سا گیا، دُور دُور تک کوئی نظر نہیں آرہا تھا۔ اُداس اور بوجھل شام اُتر رہی تھی، چھوٹے چھوٹے ٹیلے بے بس گونگوں کی طرح لگ رہے تھے اور چاروں طرف کھیت سُونے پڑے تھے۔ یہی وہ گاؤں تھا جس کی کہانیاں میں بچپن سے سُنتی آرہی تھی۔ ماں کا خیال تھا کہ گاؤں کے باہر چھوٹا سا بس اسٹاپ ضرور بن گیا ہوگا۔ لیکن جہاں بس رُکی تھی وہاں بس اسٹاپ تو نہیں تھا، ہاں ایک پُرانا اور گھنا پیڑ ضرور تھا جس کے اطراف ایک بڑا چبوترہ بنا ہوا تھا۔ میں نے سوچا شاید یہی وہ پیڑ ہے جس کے بارے میں ماں بتایا کرتی تھیں کہ جب بھی کوئی بارات گاؤں میں آتی یا جاتی تب اُسے لینے یا وداع کرنے والے اسی چبوترے پر بیٹھا کرتے تھے۔ ایک طرف مرد چلمیں پیتے بیٹھ جاتے، دوسری طرف رُو رُو تے بسورتے بچوں کی مائیں بچوں کو ساڑی کا پلّو ڈھانک کر دودھ پلایا کرتی تھیں۔

ہم گاؤں کی طرف بڑھنے لگے۔ دُور سے ایک مرد اور اُس کے پیچھے ایک بوڑھی عورت آتے دکھائی دئیے۔ آگے آگے بھاگتے اُس مرد کو شاید بڑھیا آوازیں دے رہی تھی ـــــ جُوں جُوں ہم اُن سے قریب ہوتے گئے، بڑھیا کی آواز صاف سنائی دینے لگی "مُرجی" اے مُرجی سُن تو" وہ رُک رُک کر پکار رہی تھی "ٹھہر جا بیٹا" ایسے دوڑ مت، واپس گھر چل، تجھے میری قسم گھر چل، لیکن وہ مرد ذرا رُکتا، پیچھے مڑ کر دیکھتا اور ہنستا منہ چڑاتا پھر دوڑنے لگتا۔ اُس کی حرکتیں بڑی عجیب سی لگ رہی تھیں۔ بڑھیا تھک کر ہانپ رہی تھی، تھک جانے کی وجہ سے یا ہمیں دیکھ کر وہ پیڑ کے پاس رُک گئی اور ہمیں غور سے دیکھنے لگی۔ اُس کی آنکھیں کمزور لگ رہی تھیں۔ بھائی شاید اُسے پہچانتا تھا، اِس لئے وہ بڑھیا کے پیروں کی طرف جھکتا ہوا بولا

" دادی ماں سلام "

" جیتے رہو بیٹا" بڑھیا نے سر پر ہاتھ رکھ کر کہہ تو دیا، لیکن وہ ہمیں پہچان نہیں پائی تھی۔ "تُو، مبا ئی ماں کا وسنت تو نہیں ہے"

' ارے واہ دادی ماں تم نے تو مجھے پہچان لیا' بھائی نے ہنس کر کہا تو بڑھیا خوش ہوگئی۔

وہاں کیسے ہیں سب لوگ، ماں اور پتا جی کیوں نہیں آئے۔ اور یہ کون ہے؟' اُس نے میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

'یہ تو اپنی مالتی ماں ہے' بھائی نے میری طرف اشارہ کرکے جواب دیا۔

'لو بھئ آپا، کتنی بڑی ہوگئی ہے ہماری بٹیا' اور دادی ماں نے مجھے باہوں میں بھر لیا۔

' دادی ماں' میں نے جذبات سے پُر آواز میں کہا۔

وہ شاید کسی دُور کے رشتے سے ہماری دادی لگتی تھی، لیکن میں جانتی تھی رشتوں اور ناطوں سے یہاں کوئی خاص فرق نہیں پڑ گیا، چونکہ یہاں جس بڑھیا کو میں ماں کہوں گی وہ میرے ساتھ ویسا ہی سلوک کرے گی جیسے میری اپنی ماں ہو، گومی ماں سے مل کر لگا کہ یہاں پُرانا بہت کچھ ابھی باقی ہے۔

گومی ماں کو شاید مُرجی کی یاد آگئی اور وہ چاروں طرف اُسے دیکھنے لگی اور مُرجی کو نہ پاکر اُس نے لمبی سانس لی اور ہماری طرف مڑ کر بولی چلو چلیں'

'کیوں کیا ہوا مُرجی بھائی کو' کہاں چلے گئے وہ' بھائی نے چلتے چلتے پوچھا۔

کوئی خاص بات نہیں' گیا ہوگا یہیں کہیں' گومی ماں نے جواب دیا۔

اب گھر دکھائی دے رہے تھے۔ گومی ماں موڑ والی گلی کے پاس رُک گئی۔

' اب چلتی ہوں بیٹا بہت سارا کام پڑا ہے۔ رات کو آؤں گی' سامنے سے آتے کسی بوڑھے کو دیکھ کر جھٹ سر کا پلّو نیچے کھسکا کر منہ پر گھونگھٹ ڈالتے ہوئے گومی ماں نے کہا۔ اور وہ دھیرے سے چل کر گلی میں غائب ہوگئی۔ میں حیرت سے گومی کو دیکھتی رہ گئی تھی۔ اُن کی آنکھوں کی پلکیں تک سفید ہوگئی تھیں، لیکن کسی بوڑھے کو دیکھ کر جسے شاید ٹھیک سے دکھائی بھی نہیں دیتا، اُنھوں نے گھونگھٹ کاڑھ لیا تھا۔

شام کے دُھندلکے میں ہر گھر اُداس لگ رہا تھا اور ہم اُداس ماحول میں بوجھل قدم اُٹھاتے ہم چلے جارہے تھے۔ سارا گاؤں شانت تھا۔ کسی گھر سے آگ کی جھلک کھڑکی میں سے دکھائی پڑتی تھی۔ جگہ جگہ کُتے آنکھیں میچے پڑے تھے۔

اپنے گھر کے قریب پہنچے تو دیکھا کہ دادی ماں دروازے میں بیٹھی مالا پھیر رہی تھیں۔ بھائی ہاتھ کا سامان نیچے رکھ کر فوراً دادی ماں کے پاؤں چھونے کے لئے جھک گیا، پر میں دادی ماں کو دیکھ کر بھونچکا رہ گئی۔ ابھی ابھی گومی ماں کو جن کپڑوں میں دیکھ آئی تھی بالکل ویسے ہی، اُسی رنگ کے کپڑے دادی ماں پہنے ہوئی تھیں۔

ہاں بیٹا یہاں کا یہی طریقہ ہے۔ بڑی عمر کی بیوہ عورتیں ایک جیسے کپڑے پہنتی ہیں جیتو بھائی کہہ رہے تھے۔

کتھئی رنگ کے کپڑے پہنے کئی عورتیں رات کو ہم سے ملنے آئی تھیں۔ لالٹین کی مدھم روشنی میں گہرے رنگ کے کپڑوں میں ملبوس عورتیں بڑی ڈراؤنی لگتی تھیں۔

دھوپ دھیرے دھیرے آنگن سے رخصت ہو رہی تھی، اور اُداسی بڑھتی جا رہی تھی۔ ایسے میں کھیم جی بابا کی باتوں نے اور بھی اُداس کر دیا۔ وہ کہہ رہے تھے "ہاں بیٹا آدمی کو جو بھی کچھ ملتا ہے اُس میں سے اپنے چھوٹے چھوٹے سکھ بنا لیتا ہے۔ لیکن آج تو وہ بھی ہم سے چھن گیا ہے۔" کہتے کہتے بابا نے آنکھیں بند کر لیں اور دیوار سے پیٹھ لگا کر بیٹھ گئے۔ جیٹھی ماں بھی دیوار کے پاس بیٹھی تھیں، وہ خاموش تھیں لیکن مجھے لگ رہا تھا کہ اُن کی خاموشی بھی بہت کچھ بول رہی ہے۔

دوپہر کو ہم گاؤں سے نکل پڑتے۔ سارے گاؤں میں دوپہر میں ہی رات کا سناٹا چھایا رہتا۔ گھر سے باہر سائبانوں میں آنکھیں بند کئے ہاتھ سے مکھیاں اُڑاتے، دھیمی دھیمی سانسیں لیتے بوڑھے دام جی بپّا، کھیم جی بپّا، رائیشی بپّا، میگھ جی بپّا بیٹھے، لیٹے ہوتے۔ پاس ہی مٹی میں کان کھجلاتے کتے لوٹتے رہتے، ہمیں دیکھ کر وہ پہچاننے کی کوشش کرتے اور پھر اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگتے۔ "اب تو یہاں رہنا مشکل ہوتا جا رہا ہے۔ کھیتی کی تو خیر بات ہی جانے دو۔ دو تین سال سے بارش نہیں ہوئی تو کنوئیں بھی سوکھتے جا رہے ہیں۔"

میں نے سوچا یہ ساری باتیں ماں کو بتانی ہیں، اُن سے کہنا ہے کہ ماں تمہاری آدھی بات تو سچ ثابت ہوئی، تمہارے وقتوں کا کچھ واقعی بدل گیا ہے۔ نل تو نہیں لگے، البتہ لگاتار اکال کے سبب کنوئیں ضرور سوکھ گئے ہیں۔ بجلی بھی نہیں آئی اس کی ضرورت بھی نہیں ہے کہ وہاں صرف بوڑھے ہی رہ گئے ہیں جن کی آنکھیں کچھ دیکھ ہی نہیں پاتیں۔ پانی کے گھڑے سر پر رکھ کر دوڑنے والی اُس زمانے کی پنہارنیں تو اب بوڑھی ہو چکی ہیں اور اُن کی بہو بیٹیاں اپنے شوہروں کے ساتھ شاید بھی

شہروں میں رہنے لگی ہیں۔

یہاں نہ رہیں تو اور جائیں بھی کہاں، جیٹھی ماں نے بڑی لاچاری سے کہا۔ میں بھی بے بسی سے اُن کی طرف دیکھنے لگی۔ بڑھاپے میں شاید سب کے چہرے ایک جیسے ہو جاتے ہیں۔ جھرّیوں بھرا بے نور آنکھوں والا ایک ہی چہرہ ہر دھڑ پر لگا ہوا دکھائی دیتا اور میرے لئے دام جی بپّا، کھیم جی بپّا، گورجی بپّا یا سوم جی بپّا کے چہرے میں فرق کرنا مشکل ہو جاتا اور تب میری گھٹن اور بھی بڑھ جاتی۔ گھر لوٹتے ہوئے گاؤں کے ٹوٹے پھوٹے گھروں کو ماں کی کہی وہ باتیں یاد آ جاتیں۔

گھر کے سنبھالنے والے مرد تو گھر چھوڑ کر چلے گئے اب تو صرف دُکھ میں ڈوبے گھر اور یتیم آنگن رہ گئے ہیں۔

اکثر گھروں کی حالت ایسی ہی تھی اور گھر جیسے ہی ٹوٹے پھوٹے بوڑھے گھروں میں رہ گئے تھے۔ یہ کہنا مشکل تھا کہ پہلے گھر گر پڑے گا یا بوڑھا چل بسے گا۔ چہروں کو دیکھ کر لگتا تھا کہ اِس علاقے میں دھرتی کے چہرے اور انسانی چہرے میں بڑی مماثلت ہے۔ سوکھی دھرتی میں پڑی دراڑوں کا عکس ہر انسانی چہرے پر دیکھا جا سکتا تھا، چاروں طرف اُڑتی ریت، حدِ نگاہ تک پھیلا ریگستان، سائیں سائیں کرتی ہوا، پیروں تلے تپتی زمین اور سر پہ بے مہر آسمان جو کبھی کبھار بارش کے چار چھینٹوں کی بھیک دھرتی کی گود میں ڈال دیتا تھا۔ چھوٹے چھوٹے مٹی کے گھر اور ساتھ ان سب کو منہ چڑاتے زندگی سے جوجھتے یہاں کے لوگ، چھوٹے چھوٹے رنگ برنگے کھلونوں جیسے لوگ۔ پانی کے لئے اپنے دُکھی دل کی شانتی کے لئے ایشور سے پرارتھنا کرتے لوگ۔ دکھ بھری باتیں کر کے اپنے دن کاٹتے یہ لوگ۔

رات کو جیتو بھائی کے ساتھ اور لوگ آ جاتے اور دیر تک باتیں ہوتی رہتیں۔ یہ بھولے بھالے لوگ شاید موجودہ حالات سے بے خبر تھے اس لئے بھائی کی باتیں وہ بڑی دلچسپی سے سُنتے، اُن کی حیرانی دیکھ کر تیسری کلاس کی پڑھی کہانی یاد آ جاتی، پرندہ کے مادا جی برسوں بعد جاگے تو ایک دم بدلی ہوئی دنیا کو دیکھ کر بھونچکے رہ گئے تھے۔

جیتو بھائی لگتا ہے کچھ بالکل نہیں بدلا۔ دوسرے خطّوں کو دیکھئے کتنے بدل گئے ہیں۔ یہ بات میں کب سے کہنے کو سوچ رہی تھی۔

ہاں بیٹا۔ سُنا تو تھا کہ یہاں بھی دھول اُڑنی بند ہو جائے گی اور نل آ جائے گی۔ ہم انتظار ہی کرتے رہ گئے۔ سوچ میں ڈوبے جیتو بھائی کہنے لگے "لوگ کہتے ہیں ہوا آئی تو تھی لیکن یہاں پہنچتے پہنچتے زہریلی ہو گئی۔ ہمیشہ زندہ دل

کھائی دینے والے جیتو بھائی کا درد بھرا بکھان اندر ہی اندر سُلگتی آگ پر سے راکھ ہٹا رہا تھا۔

اس مرچی کو بھی دیکھو۔ شاید وہ بھی زہریلی ہوا اُسے لگ گئی ہے اچھا خاصا سیدھا سادا کسان تھا۔ باپ نہیں تھا۔ کم عمری میں بمبئی جا کر کمانے لگا تھا۔ آزادی کے بعد رام وکاس کی باتیں سُن سُن کر اُس کے دل میں بھی اپنی بھوئی کا موہ جاگ اُٹھا کر کچھ لوٹ آیا تھا، یہ سوچ کر کہ یہاں کسی طرح دال روٹی تو مل ہی جائے گی اور اپنی بھوئی کی خدمت بھی کر سکوں گا، مگر کچھ ہوا نہیں۔ حالات اور بھی خراب ہوتے گئے اور جب نئے قانون کے مطابق تین سال سے غیر کاشت شدہ اُس کا کھیت ضبط کر لیا گیا تو پہلی بار اُس کی آنکھوں کا پاگل پن جھلک اُٹھا تھا۔

اور تب سے اُس پاگل کی فکر بڑھیا کو کھائے جا رہی ہے۔ جیتو بھائی کی باتوں میں مرچی سے ہمدردی تو کم تھی موجودہ حالات کا شکوہ زیادہ تھا۔

گومی ماں نے سر اُٹھا کے کہا "پاگل کی فکر کیوں کریں بھائی۔ سیانا ہوتا تو فکر بھی ہوتی شادی بیاہ کی۔ سب فکروں سے چھٹکارہ مل گیا۔ اب تو آرام ہی آرام ہے"۔ گومی ماں کی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے۔ اُنھیں روتا دیکھ کر نہ جانے کیوں مجھے ماں کی یاد شدت سے آنے لگی۔ بھائی نے دو تین دن لوٹنے کی بات کہی۔

دادی ماں نے چمچہ بھر دہی منہ میں ڈالا اور گُڑ کی ڈلی دیتے ہوئے ہدایت دینے لگیں کہ ایک بار گھر سے نکلنے کے بعد پیچھے مُڑ کر نہ دیکھنا۔ ہم نکلنے والے ہی تھے کہ جیتو بھائی آ گئے۔ بھائی نے جھک کر اُن کے پیر چھوئے۔ میں بھی بھائی کی نقل میں اُن کے پیروں کی طرف جھکنے لگی تو ایک دم اُچھل کر وہ پیچھے ہٹ گئے، جیسے بچھو نے اُنھیں ڈنک مار دیا ہو۔ "ارے بیٹیا تُو تو ہمیں گنہگار بنا رہی ہے"۔ بوکھلا کر اُنھوں نے کہا۔ اُن کے ایکدم اُچھلنے اور بوکھلانے سے میں اتنا تو سمجھ گئی کہ یہ محض دکھاوا نہیں ہے۔ شاید مجھ سے ہی کوئی غلطی ہو گئی ہے۔ میں سہم کر اُن کی طرف دیکھنے لگی۔ وہ شاید بات سمجھ گئے۔ کہنے لگے "بٹیا اپنے یہاں لڑکیاں صرف اپنے پتی کے پیر چھوتی ہیں۔ وہ سب سے پہلے ماں مانی جاتی ہے اور ماں کبھی بچوں کے پیر چھوتی ہے کیا؟" کہتے کہتے وہ میرے پیروں پر جھک گئے میں گھبرا کر پیچھے ہٹی لیکن تب تک وہ پیر چھو چکے تھے۔

ہم گھر سے باہر نکل آئے۔ مرد عورتوں کی بھیڑ ہمارے ساتھ چل پڑی۔ ہمیں بس کے اڈے تک چھوڑنے کے لئے۔ وہ کہہ رہے تھے: "بیٹا اب جلدی آنا۔ اپنے بیاہ کو بھی سمجھا نا ماں کو بھی۔ ہم تو اُنھیں دیکھنے کو ترس رہے ہیں۔ کیا پتہ کتنے دن اور جئیں۔

سر اور پیٹھ پر گھومتے ہاتھوں کے بھیگے لمس ہمیں بہلاتے رہے۔ رُومال سے

شامہ۔ بیٹی

ناک اور آنکھ پونچھتی میں بس ہاں ہاں کرتی رہی۔ اور اُس وقت تو میں حیران رہ گئی جب عورتیں پانچ دس پیسے یا چار آنے میری مٹھی میں دینے کی کوشش کرنے لگیں۔ مجھے ہاتھ پیچھے کرتے دیکھ کر ایک بڑھیا نے کہا "تو پہلی بار یہاں آئی ہے بیٹی۔ دینا تو بہت کچھ چاہیے لیکن ابھی تو اتنا ہی ہے۔ بیٹی یہ تو تیرا حق ہے"

مجھے لگا ان ہتھیلیوں پر پڑے پانچ اور دس پیسے کے دو سکے ہماری سماجی اور معاشی قدروں کو، ہمارے جھوٹے رواجوں کو منہ چڑا رہے ہیں۔

اور بس میں بیٹھ کر میں سوچتی رہی "بڑا میٹھا ہے ہمارا کچھ ہم تو اپنے کچھ جائیں گے، گنگنانے والی ماں سے جا کر کیا کہنا ہے؟ ○ ○

بقیہ:- مہدی کی خط نگاری صفحہ ۴۸

گھریلو زندگی کی جھلک ملتی ہے گھر سے باہر کا سماں جھلکتا ہے۔ دوست، اقارب، ملنے والے سب باری باری جلوہ گر نظر آتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مہدی کے یہ تمام خطوط اپنے زمانہ کی ادبی تاریخ ہیں اور قابلِ رشک ادب پارے۔ ان کی زندگی کی دھوپ چھاؤں بھی اُن میں محفوظ ہے اور اُن کے مزاج، عادات، دلچسپیوں، وابستگیوں پسند و ناپسند، تنقیدی شعور، جمالیاتی حِس کی بھرپور ترجمانی بھی ہوتی ہے۔

جو اہلِ قلم یہ کہتے ہیں کہ مہدی نے خط نگاری میں نہ صرف غالب کی عظمت کو چھو لیا ہے بلکہ وہ اُس سے بھی کچھ آگے آ گئے ہیں، مجھے اس سے اتفاق نہیں۔ غالب اور مہدی کے مزاج، افکار و خیالات اور زمانہ میں بڑا فرق ہے۔ غالب کے یہاں تنوع ہے مہدی کے یہاں بہت حد تک یکسانیت ہے۔ غالب کے خطوط میں گفتگو کی فضا ہے، مہدی کے یہاں یہ بات پیدا نہیں ہو سکی ہے۔ غالب سادگی کے علمبردار ہیں مہدی (صحیفۂ محبت کے خطوط چھوڑ کر) پُرکاری کے شائق نظر آتے ہیں۔ چنانچہ دونوں کے خطوط کا رنگ و آہنگ جداگانہ ہے لیکن ہم یہ ضرور کہہ سکتے ہیں کہ مہدی کے خطوط اردو خط نگاری میں ایک الگ مقام رکھتے ہیں۔ عام طور سے ان خطوط میں ادبی محفلیں جمی ہوئی ہیں، مختلف علمی، ادبی کاموں کا جائزہ لیا جا رہا ہے، تبصرہ کیا جا رہا ہے، رائیں دی جا رہی ہیں، رہنمائی کی جا رہی ہے۔ ان میں حالی، شبلی، نذیر احمد، آزاد وغیرہ کی ادبی شخصیتیں اُبھرتی ہیں، سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالماجد دریابادی، پروفیسر بارلی وغیرہ سے تعارف ہوتا ہے۔ جوانی کی باتیں ہیں، دوستوں کا خلوص اور بے تکلفی ہے۔ جیسے جیسے زمانہ گزرتا جائے گا۔ ان خطوط کی اہمیت و عظمت اور زیادہ بڑھتی جائے گی۔ ○ ○

نصر قریشی

میرا قلم

حرف و لفظ و صوت کی پرچھائیاں میرے قلم میں چبھ رہی ہیں
منعکس ہیں ذات کی اندھی گپھائیں
دھند میں ڈوبی دِشائیں
کورے کاغذ پر اَدھورے خاکوں کا اِک کارواں ہے
گنجِ معنیٰ بے نشاں ہے
جذبۂ تخلیق پھر بھی جستجو کا کرب لے کر
سرحدِ ادراک میں روشن مِنارے ڈھونڈتا ہے
خونِ دل میں ڈوب کر میرا قلم ہر دم رواں ہے
سوکھے پتّوں کی کہانی لکھ رہا ہے
زندگی کا ترجماں ہے
منجمد لمحوں کی شریانوں میں گرمی بھر رہا ہے
چل رہا ہے، بولتا ہے
لکھنا، چلنا، بولنا ہی زندگی ہے
زِندگی خاموشیوں میں ٹوٹتی ہے

میرا نورانی قلم اندھی گپھاؤں میں یونہی روشن رہے گا
دھند میں ڈوبی دِشاؤں کے لئے سورج بنے گا
میرے مَرجانے پہ بھی میرا قلم زندہ رہے گا
ظلمتوں کو نور دے گا
خیر و برکت کی بشارت لے کے ہر یگ میں اُٹھے گا
میرا قلم زندہ رہے گا !
میرا قلم زندہ رہے گا !!

(بشکریہ آل انڈیا ریڈیو اُردو سروس، دہلی)

○ ۴۷۷- ہٹیا بہادر گنج - الٰہ آباد - ۳ (یوپی)

حفیظ فضا

تعارُف

خالقِ نغمہ ہوں آواز مِری پہچانو
میں سویروں کا پیامی ہوں، اُجالوں کا نقیب
مشعلِ نور اندھیروں میں نوا ہے میری
مجھ سے سرخیٔ اُفق، مجھ سے تجلّیٔ اُفق
میں ہوں پیغامِ سحر، میں ہوں شعاعِ خورشید
حُسن کے رُوئے نگاریں کی تب و تاب ہوں میں
عشق کے سینۂ سوزاں کا مجھی سے ہے گداز
میں نے اپنی ہی رگِ جاں کا نچوڑا ہے لہو
فکر کی تشنگیٔ شوق بجھانے کے لئے
میں نے بخشا ہے تمدّن کو تمنّا کا شعور
میں نے تاریخ کی نظروں کو بصارت دی ہے
میں نے کردار کی نبضوں کو حرارت دی ہے
میرا احساس مِرے دور کا آئینہ ہے
میرا فن ہے نئی تہذیب کی قدروں کا جمال
شعلۂ دردِ گل و لالہ سے رہتا ہوں تپاں
اشکِ شبنم ہوں، نہ بخشو مجھے خاروں کی صلیب
شاعرِ عصر ہوں، دیکھو مری آواز کے رنگ
خالقِ نغمہ ہوں آواز مِری پہچانو!

○ ۱۲-۵-۲۰ - ڈیوڑھی عزیز الدّین تعلقدار
بازار روپ لال - شاہ علی بنڈہ - حیدرآباد ۲

مہدی کی خط نگاری

عبدالقوی دسنوی
شعبۂ اُردو - سیفیہ کالج - بھوپال ۱

مہدی افادی جو اپنی شگفتہ، رنگین، دلچسپ، مخصوص اور منفرد طرز کے لئے مشہور ہیں، دراصل اُردو ادب کے کوئی باقاعدہ نثر نگار نہ تھے مگر چونکہ اُردو کے عاشق اور اُس کے چاہنے والوں کے شیدائی تھے اور اُس کی بقا اور ترقی کے لئے فکرمند رہتے تھے، اِس لئے کبھی خاموش نہیں بیٹھے بلکہ اپنی ساحرانہ طرزِ تحریر اور گفتگو کے ذریعہ اِس زبان کی طرح طرح سے خدمت کرتے رہے یا دوسروں کو خدمت کرنے پر آمادہ کرتے رہے۔ افسوس کہ اُن کی عمر نے وفا نہیں کی اور وہ عین اُس وقت جب اُن کی عمر اکاون سال میں داخل ہو رہی تھی اور اُن کی بات میں بات اور تحریر میں نکھار، شعور میں پختگی اور فکر میں گہرائی پیدا ہو چکی تھی، وہ اِس جہانِ فانی سے رخصت ہو گئے۔

اُنھوں نے اپنے پیچھے کوئی باضابطہ تصنیف نہیں چھوڑی، سوائے اُن تحریروں کے جو مضامین کی صورت میں مختلف وقتوں میں مختلف رسائل میں شائع ہوئی تھیں، یا کچھ حسین خطوط کے جو اُن کے چاہنے والے دوستوں اور عزیزوں نے محفوظ رکھے، یا وہ خطوط جنھیں اُن کی چہیتی بیوی مہدی بیگم نے حرزِ جاں بنا کر محفوظ رکھا تھا۔ یہ بیگم مہدی کا اُردو ادب پر بڑا احسان ہے کہ اُنھوں نے اپنے شوہر کے بکھرے ہوئے مضامین کو "افاداتِ مہدی" کی صورت دی اور اُن کے ان قیمتی خطوط کو جو اُنھوں نے اپنے مختلف دوستوں، عزیزوں اور مشفقوں کو لکھے تھے، یکجا کر کے دنیائے ادب کو دئے اور وہ خطوط جو اُنھوں نے خود محفوظ رکھے تھے، جنھیں اُن سے والہانہ محبت کرنے والے شوہر نے لکھے تھے، ڈاکٹر محمود الٰہی زخمی کے ہاتھوں "صحیفۂ محبت" کے نام سے مرتب کرا کے اُردو ادب میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا۔

اِن کے علاوہ مہدی کے سترہ خط "مرقعِ ادب" میں، دو خط مکاتیب نمبر "نقوش" لاہور میں، تین خط "خطوط نمبر" نقوش لاہور میں، ایک خط ہماری زبان علی گڑھ یکم دسمبر ۱۹۶۶ء اور فروغِ اُردو لکھنؤ جنوری ۱۹۶۷ء میں، ایک خط "دلکشی بات بات میں اُس کی" کے عنوان سے علی گڑھ میگزین ۵۲-۱۹۵۱ میں شائع ہوئے ہیں۔
شاعر بمبئی

انھیں[1] خطوط کے مطالعہ سے ہم اُن کی خط نگاری کے فن کو جان پہچان سکتے ہیں۔

خط کی سب سے بڑی خوبی یہ ہونی چاہیئے کہ اِس کے ذریعہ مکتوب نگار کی بات مکتوب الیہ تک بلا کسی روک ٹوک کے پہنچ جائے اور غیر کی نگاہ پڑنے سے محفوظ رہے، دوسرے لفظوں میں یہ کہئیے کہ خط عام طور سے ایک کے دل کی بات دوسرے کے دل میں اُتارنے کا قابلِ اعتماد ذریعہ ہے۔ خود وہ تو کاغذ کا ایک بے جان ٹکڑا ہوتا ہے، لیکن اُس کی سطح پر دل دھڑکتا ہے، آنسو کے قطرے چمکتے ہیں، مسکراہٹیں رقص کرتی ہیں، خوشیاں چھلکتی ہیں، رنج و غم دھول اڑاتے ہیں، ناراضگی اور غصّہ زہر گھولتے ہیں، اُمیدوں کی کرنیں پھوٹتی ہیں اور مایوسیاں تاریکی پھیلاتی ہیں۔

ایسے ہی خطوط جن میں کم و بیش یہ تمام خصوصیات پائی جاتی ہیں بغیر کسی ارادے اور تیاری کے لکھے جاتے ہیں، جن میں کھلے دل سے اپنے خیالات، احساسات اور جذبات کا اظہار ہوتا ہے۔ صحیح معنوں میں یہی خط کہلانے کے مستحق ہوتے ہیں۔ اور ایسے ہی خطوط کے مطالعہ سے سرگوشی اور سرخوشی کی کیفیت سے لطف اندوز ہوا جاتا ہے اور رازہائے سربستہ کی آگاہی سے لذت یاب ہونے کا موقع ملتا ہے۔ خط کے متعلق مہدی کا خود یہ کہنا تھا:

"...... خط لٹریچر کا ایک ایسا عنصر ہے جس میں لکھنے والے کے اہتمام کو چنداں دخل نہیں ہوتا۔ یعنی وہ یہ نہیں جانتا کہ کبھی اُس کی اشاعت کی نوبت آئے گی، اِس لئے سرسری اظہارِ خیال بھی اگر اُس پایہ کا ہو کہ انشا پردازی اُس کی بلائیں لیتی ہو تو یہ بھی کمال کا ایسا رُخ ہے جس سے قطع نظر نہیں کی جا سکتی۔"[2]

۱؎ ممکن ہے کہ ان خطوط کے علاوہ اِدھر اُدھر مہدی کے اور بھی خطوط شائع ہوئے ہوں۔ لیکن وہ میری نظر سے نہیں گزرے۔ — دسنوی

۲؎ مکاتیبِ مہدی ص ۱۸۵

لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اس کے باوجود کہ مہدی خط نگاری کے رموز سے آگاہ تھے وہ خطوط بڑے اہتمام اور محنت سے لکھتے تھے، اس لئے کہ یہ اُن کا محبوب اور دل پسند مشغلہ تھا۔ چنانچہ شبلی کے نام جب مہدی کے خطوط دستیاب نہیں ہوئے تو بیگم مہدی اظہارِ افسوس کرتی ہوئی لکھتی ہیں۔

"اس کا افسوس ہے کہ مرحوم کے بہت سے خطوط حاصل نہ کر سکی، خاص کر مولانا شبلی مرحوم کو انھوں نے کیسے کیسے بہترین خطوط لکھے، لیکن مولانا مرحوم نے باوجود اتنے خلوص اور قدردانی کے ساتھ بھی خطوط کو محفوظ نہیں رکھا[1]"

اپنے خطوط سے متعلق خود مہدی کی رائے یہ تھی:

"آپ کی ستائش جنبشِ لب میری زندگی کی آخری بہار ہے۔ اس خط کو محفوظ رکھئے گا، اس کا افسوس ہے کہ میرے خیالات پریشان اور خاص کر خطوں کے انبار سے ایسا مجموعہ تیار ہو سکتا تھا کہ دنیائے ادب میں کچھ دنوں چرچا رہتا اور یہ ایک فانی ہستی کا بڑے سے بڑا تخیل ہے[2]"

مندرجہ بالا تحریروں سے صاف ظاہر ہے کہ اُنھیں خطوط سے بیحد دلچسپی تھی اور وہ بہت محنت سے خط لکھا کرتے تھے۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ خط لکھنے میں اس اہتمام اور ذوق و شوق کا تعلق اُن کے مزاج سے تھا، اس لئے اگرچہ اُن خطوط میں الفاظ کی سج دھج، تراش خراش اور عبارت آرائی کا احساس ہوتا ہے، لیکن اُن کے دلی جذبات، احساسات اور کیفیات کی صداقتوں سے محرومی نہیں ہوتی ہے بلکہ جُوں جُوں ہم خطوط کا مطالعہ کرتے جاتے ہیں، اُن کے مزاج اُن کی پسند ناپسند، اُن کی آگہی، اُن کے رجحانات، اُن کے تعلقات، اُن کی مشغولیات، اُن کی دلچسپیاں، اُن کے اندیشہ ہائے دور دراز سے اچھی طرح واقفیت ہونے لگتی ہے اور اس طرح مہدی اپنی پوری شخصیت کے ساتھ جلوہ گر ہوتے نظر آتے ہیں۔

مکاتیبِ مہدی میں ۱۹۰ خطوط ہیں جو ۹ مئی ۱۸۹۴ سے ۳۰ نومبر ۱۹۲۱ء تک کے پھیلے ہوئے زمانے میں لکھے گئے ہیں۔ اس طرح گویا یہ خطوط تقریباً پچیس سال کو احاطہ کرتے ہیں۔

یہ خطوط چند حضرات کے نام ہیں، جن سے ان خطوط کے مطالعہ کے بعد نہ صرف جان پہچان ہوتی ہے، بلکہ اُن کے علاوہ بھی بہت سی ادبی شخصیتیں اُبھرتی اور اپنا تعارف کراتی نظر آتی ہیں۔

۲۵ سال کے درمیان لکھے گئے ان خطوط میں اگرچہ مختلف موضوعات پر روشنی پڑتی ہے لیکن حق بات یہ ہے کہ پوری فضا پر اُردو زبان و ادب کا رنگ غالب ہے۔ مہدی کے بہت سے خیالات و افکار جو افاداتِ مہدی کے اوراق میں پھیلے ہوئے ہیں اُن کی جھلکیاں مکاتیبِ مہدی میں واضح طور سے نظر آتی ہیں، کبھی کتابوں کی باتیں ہیں، کبھی رسائل کا ذکر ہو رہا ہے۔ کبھی کسی اچھے ادبی کام کو سراہا جا رہا ہے، کبھی مشورے دئے جا رہے ہیں، کبھی ادبی کام کے سلسلے اُکسایا جا رہا ہے اور کبھی کسی کی غلطی یا لغزش پر ٹوکا جا رہا ہے۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ وہ جس شخصیت کے سب سے زیادہ دلدادہ تھے، وہ علامہ شبلی کی شخصیت تھی، وہ کبھی اُن سے ہمکلام ہوتے ہیں اور اُن کی عظمت کا احترام کرتے ہیں اور کبھی پیٹھ پیچھے اُن کا ذکرِ خیر کرتے ہیں، لیکن اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کہ علامہ شبلی کے علاوہ بھی بہت سی ادبی شخصیتوں کے وہ معترف ہی نہ تھے، بلکہ اُن کے لئے بھی اُن کے دل میں بڑی جگہ تھی۔ ایسے ہی لوگوں میں علامہ سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالماجد دریابادی، مولانا عبدالباری ندوی، جوشش بلگرامی، مولانا ابوالکلام آزاد، عبدالسلام ندوی، مولوی عبدالحق، خان بہادر میرزا ناصر علی وغیرہ کا شمار ہوتا ہے۔

مہدی افادی کو کتابوں سے، ادب سے، علم و فن سے اور علمی و ادبی کاموں سے گہرا لگاؤ تھا۔ وہ رات دن علم و ادب کے سمندر میں غوطہ زن رہتے تھے اور جب کوئی نئی چیز ہاتھ لگتی تو دوسروں کو اُس کی طرف متوجہ کرتے تھے یا اُن میں کسی علمی ادبی کام سے رغبت پیدا کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ یہ سلسلہ ہمیشہ جاری رہتا تھا اور وہ اس کام میں تھکتے نہ تھے۔ مولانا عبدالباری کے سپرد ایک کام کرتے ہیں:

"... علامہ شبلی نے "فلسفۂ یونان و اسلام" کے سلسلہ میں فلسفۂ قدیم و جدید کا موازنہ کرنا چاہا تھا لیکن یہ کوشش مجھے افسوس ہے کہ ناتمام رہی۔ میری خواہش تھی کہ آپ کے ہاتھوں سے اس کی تکمیل ہوتی[3]"

ان خطوط میں بعض نکتے کی ایسی باتیں بھی تحریر ہیں جن کا عرفان مسلسل مطالعہ، فکر و تجسس اور گوناگوں تجربوں کے بعد ہی ہوتا ہے، عام تحریروں میں یہ بات کہاں، ایک جگہ لکھتے ہیں:

"... گو ہمارے دل کی سیاہی جب قلم سے ٹپکتی ہے تو زیادہ پھیلتی ہے[4]"

"فلسفۂ آرزو" کی وضاحت یوں کرتے ہیں:

"دنیا میں یہ لازمی نہیں کہ جو کچھ ہو میرے آپ کے نقطۂ نظر کے مطابق ہو

---

[1] مکاتیبِ مہدی صفحہ نمبر ۹   [2] مکاتیبِ مہدی صفحہ ۲۳۵، مکاتیبِ مہدی صفحہ ۱۰۱

[3] مکاتیبِ مہدی صفحہ ۴۲

خیال کا پیدا نہ ہونا ہی "آرزو" ہے اور یہی کشمکش سلسلۂ حیات کی وہ کڑی ہے جو بقائے ہستی کی ضامن ہے۔ جس روز یہ نہیں ہم بھی نہیں [1]

مہدی افادی کے مزاج کی شوخی اور شگفتگی نے ان خطوط کے بعض حصّوں کو نہ صرف جاندار بنا دیا ہے بلکہ اُن سے ایک خاص تہذیب یافتہ ذہن کی تیزی جھلکتی اور دل و دماغ کو متاثر کرتی دکھائی دیتی ہے۔ اُن کی شوخ مزاجی کے ساتھ بیباکی، اُن کی تحریروں میں لالہ زار کی سیر کا لطف دیتی ہے۔ صفحات کے صفحات پڑھتے جائیے لیکن کہیں بے کیفی پیدا نہیں ہوگی۔ ملاحظہ کیجئے:

"لیکن میں نے شاید آپ کو اپنے "احرامِ جدید" کی خبر نہیں دی یعنی مدّت کی تلاش کے بعد وہ "جنسِ لطیف" ہاتھ آئی جو آپ لوگوں کو دوسری دنیا میں ملے گی۔۔۔ [2]"

"سلیمان اعظم تو اس طرح گئے جیسے کسی کے سر سے سینگ "کعبہ" پہلے حرمِ لندن کا تھا! اُن سے یہ پوچھنا رہ گیا کہ تنہا آئیں گے یا وہاں سے بھی لائیں گے۔ مولویوں کے لئے تعددِ حرم ناجائز نہیں ہے [3]"

مہدی افادی اپنی اہلیہ سے بے حد محبت کرتے تھے یہی وجہ ہے کہ دوستوں کے خطوط میں جو بزم سجتی ہے۔ اس میں بیگم مہدی بھی کبھی کبھی جلوہ افروز ہوتی ہیں اور اُن کی آواز فضا میں گونجتی سنائی دیتی ہے، عام طور سے اُردو خطوط کے سرمایہ میں یہ بات کم نظر آتی ہے:

". . . . بیگم کہتی ہیں" اِن ہاتھوں کی چوڑیاں خدا نے رکھی ہیں جن کی مہندی بھی ابھی اُداس نہیں ہوئی تھی" میری ادبی دلچسپیوں میں وہ شریک رہتی ہیں آپ کے عنایت نامے اُن کی نظر سے بھی گذرتے ہیں [4]"

"ایک صاحبہ جو پاس بیٹھی ہیں اس خط کو دیکھ کر فرماتی ہیں تم سرسری خط میں جو کچھ لکھ دیتے ہو۔ بڑے "مضمون" میں بھی اُس کی سمائی نہیں ہو سکتی کیا یہ سچ ہے [5]"

مہدی افادی کے خطوط میں جنسِ لطیف کا ذکر طرح طرح سے ملتا ہے۔ کبھی کبھی تو ایسا محسوس ہونے لگتا ہے کہ وہ اِس ذکر سے بہت لطف اُٹھایا کرتے تھے۔ چنانچہ جہاں اُس کے ذکر کی ضرورت بھی نہیں ہوتی، وہاں بھی وہ اس کا ذکر چھیڑ کر گل افشانیاں شروع کر دیتے ہیں جس سے اُن کے خطوط میں رنگینی اور ایک خاص کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ مہدی کے قلم سے جو شوخیاں

[1] مکاتیبِ مہدی، صفحہ ۹۳ [2] مکاتیبِ مہدی صفحہ ۶۰ [3] مکاتیبِ مہدی صفحہ ۹۱
[4] مکاتیبِ مہدی صفحہ ۶۰ [5] مکاتیبِ مہدی صفحہ ۱۱۵
[6] مکاتیبِ مہدی صفحہ ۹۰ [7] مکاتیبِ مہدی صفحہ ۱۸،

کا ذکر اس انداز سے ہوتا ہے کہ اس منظر کو دیکھ کر شاید فرشتے بھی انگڑائیاں لینی شروع کر دیتے ہوں گے، ملاحظہ کیجئے:

"۔۔۔ کس قدر یہ لائقِ رشک ہے کہ آپ نے ایک شب شاہی وہاں بسر کی جو "رقاصۂ فلک" نہیں بلکہ جیتی جاگتی "زہرہ جبینِ شب" اور وقتِ بے ضرر کے لحاظ سے دنیا کا پرستان ہے [6]"

"آپ کا پرستانِ سفری، وہ بھی تختِ رواں (ریل) پر بہت ہی لائقِ رشک رہا۔ سچ یہ ہے کہ جنسِ لطیف اپنی پاکیزہ وضعی اور کافرادائی کے ساتھ "کائنات" کے خوبصورت چہرہ کا "غازہ" ہی نہیں ہے، بلکہ ہمارے لئے شرطِ زندگی بھی ہے کہ بغیر اُس کے دنیا مرنے سے لینے کے لائق نہیں تھی [7]"

"مجھے سیج پر جوانی کی ورزش میں (آپ ان تعریفات کے لئے معاف فرمائیں گے۔ اتنا لطف نہیں آتا جتنا ریشمی آنچل کے باریک تاروں میں [8]"

"جانِ بے ساختہ از بحرِ کافور" کا تصوّر پاکیزہ پیدا کر سکتا ہے جس کی لطافت ثقلِ کامیابی کو برداشت نہیں کر سکتی۔

خیال ہی میں مزے وصلِ دلربا کے لئے
لئے جو بوسے تو ہونٹوں سے بھی چھپا کے لئے

ایک خط میں لکھتے ہیں:

"عورت جب مُنہ پھیر کر چلنے کے لئے اُٹھ کھڑی ہو تو اس کے یہ معنی ہیں کہ یہ چاہتی ہے کہ کوئی دوڑ کر دامن پکڑے [9]"

صنفِ نازک کے مزاج سے وہ بہت اچھی طرح آگاہ تھے اس لئے جو کچھ اس کے متعلق اظہارِ خیال کرتے تھے آشنا ہو کر کرتے تھے، کوئی کافر ہی ہوگا جو اُن کی باتوں پر ایمان نہ لائے۔

دراصل مہدی کے خطوط سادہ بھی ہیں اور پُرکار بھی، آپ بیتی بھی ہیں اور جگ بیتی بھی۔ اُن میں ان کا اپنا درد بھی ہے دوسروں کا غم بھی، شوخی بھی ہے اور سنجیدگی بھی، اُن میں ادبی چاشنی بھی ہے، تنقید کی خشکی بھی، اُن میں اُن کا شگفتہ چہرہ، ہنستے لب اور چمکتی ہوئی آنکھیں بھی دکھائی دیتی ہیں اور سنناک پلکیں بھی۔ اُن کا غیظ و غضب بھی ہے اُن کی سنجیدہ مسکراہٹ بھی۔ ان خطوط میں ان کے روز و شب سامنے ہوتے ہیں، ماحول کی عکاسی ہے

[8] مکاتیبِ مہدی صفحہ ۹۳ [9] مکاتیبِ مہدی صفحہ ۹۳

(باقی صفحہ ۴۹ پر دیکھئے)

غزلیں

نصیر پرواز

کام اتنا بھی نہ اُس دستِ زلیخا سے ہُوا
پیرہن چاک مرا دیدۂ بینا سے ہُوا

تو نے بھی اپنے خیالات کا رُخ موڑ لیا
میں بھی مغلوب بہت خواہشِ دنیا سے ہُوا

کیسے ماضی کی ہتھیلی پہ اُگاؤں سورج
میرا آغاز ہی تاریکیٔ فردا سے ہُوا

وہ مقدر میں لکھا لایا تھا جلتے رہنا
اُس کا رشتہ بھی تو بہتے ہوئے دریا سے ہُوا

جانے کیا میں نے خطا کی تھی کہ موسم کا عتاب
جب بھی بیدار ہوا میری ہی دنیا سے ہُوا

میرے ماتھے پہ لکھی جس نے لہو کی تحریر
سامنا میرا اُسی سنگِ شناسا سے ہُوا

ایک احساس کی دیوار ابھی حائل ہے
حادثہ کوئی کہاں خواہشِ بے جا سے ہُوا

جاگ اُٹھے میری آنکھوں میں جھلستے صحرا
جب بغل گیر کسی خوابِ تمنّا سے ہُوا

چاہتا ہوں کہ وہ تکمیل مجھی سے پائے
جس روایت کا جنم دستِ زلیخا سے ہُوا

سامنے کب کوئی فرعون کھڑا تھا پرواز
کیوں اُجالا مرے گھر میں یدِ بیضا سے ہُوا

○ اسسٹنٹ کیشئر بھارت ہیوی الکٹریکلس لمیٹڈ۔ کھیلار، جھانسی (یوپی)

شاعر، ممبئی

ظفر صہبائی

نگاہِ ادراک دیکھ جوہر غبار سا ہے
ہوا کے ہمراہ سارا منظر غبار سا ہے

ہر ایک کشتی کے دیدبانوں نے یہ خبر دی
سفر نہ کیجے ابھی سمندر غبار سا ہے

زمیں قدموں تلے دُھواں سی، یقیں مُبہم
اور آسماں بھی ہمارے سر پر غبار سا ہے

نہ شکل کوئی، نہ عکس کوئی، نہ کوئی سایا
اُس آئینے میں تمام جوہر غبار سا ہے

فنا کی آندھی اُڑا کے لے جائیگی کسی دن
کشیدِ خاکستر اپنا پیکر غبار سا ہے

فضا دُرونِ وجود شفّاف کانچ جیسی
دِکھائی کیا دے بدن کے باہر غبار سا ہے

○ بزمِ سخن۔ بھوپال

نظمی صدیقی سلونوی

نیچے سے اُوپر تک دیکھو بانسوں کی لمبائی کو
نابینا لوگو اِس کے بعد ہی ساگر کی گہرائی کو

میری بلندی کا اندازہ کرتے ہیں جو سائے سے
کیا کہیئے اُن داناؤں کی دانائی، بینائی کو

گزری ہے اک عمر ہماری گھر آنگن کے چکر میں
ہم کیا جانیں دانشمندو دنیا کی گولائی کو

تم ہی کہو کیا سر پہ سلامت رہ بھی سکے گی یہ ٹوپی
سر جو اُٹھا کے دیکھو گے تم پربت کی اونچائی کو

اُف یہ ہوائے گرم، یہ تپتی دھوپ، سُلگتا یہ موسم
چٹیل راہیں ڈھونڈھ رہی ہیں میری برہنہ پائی کو

ایسی بے سُر تال فضا میں تیری صدا درد کہاں
سُنتا ہے بے وقت کی نظمی کون یہاں شہنائی کو

○ ۴۰۰/کے، چندنا۔ بارہ بنکی (یوپی)

(بنگلہ کہانی کا عکس)

زمین

رونق دکنی سیمابی
۳۱۔ کراس روڈ نمبر ۶ - اگریکو - جمشید پور ۹

"کون ہو تم! کس کے!!" ہیڈ ماسٹر بابو غرّائے۔ صبح ہی سے ایک سایہ اُن کے دروازہ پر منڈلا رہا تھا۔ اور وہ نکلا اُن کا ایک تنک مزاج طالب علم عزیز الرحمٰن! جو ہیڈ ماسٹر بابو کی نگاہوں کی گرفت میں آجانے کے بعد تیز قدم آگے بڑھ گیا تھا اور اب جبکہ وہ پہچان ہی لیا گیا تو ڈھٹائی سے سامنے آ گیا۔ اور سینہ تان کر کھڑا ہو گیا۔ "دیکھ لیجئے کون ہے۔"

سال کے اُنہیں دنوں میں جب کہ اسکول کے امتحان ہو چکے ہوتے ہیں، ہیڈ ماسٹر بابو کو اس قماش کے لوگوں سے سابقہ پڑتا رہتا تھا۔ کبھی کبھی اُن کے جان کے لالے بھی پڑ جاتے تھے۔ تین سال پہلے جب وہ نروتم پور میں ہیڈ ماسٹر تھے، ایسے ہی خود سر اور تنک مزاج طلبا نے اُن کے گھر کو نذر آتش کر دیا تھا، دھمکیوں کے خطوط الگ ملتے تھے۔ وہ تو گاؤں کی بات تھی اب شہر میں آجانے کے بعد بھی وہ محفوظ نہ تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ آج کے طلبا کے مزاج کا حال معلوم کرنا مشکل امر ہے۔

"یہ میرے فادر ہیں سر" عزیز الرحمٰن نے بڑے ہی بے ڈھنگے پن سے اپنے باپ کا تعارف کرایا۔ گور دیال بابو کو اس کا علم نہ تھا کہ یہ اپنے باپ کو بھی ساتھ لایا ہے۔ امانت عزیز کا باپ تھا، ایک مفلوک الحال دیہاتی ہمت کر کے بلب اندر چلا آیا۔ بیٹے اور باپ کے چہرہ اور لباس میں کوئی مطابقت نہ تھی۔ عزیز بھڑکیلا لباس پہنے ہوئے تھا۔ دھاری دار سستے قسم کے سلک کی قمیص پر فٹ پاتھ سے خریدا ہوا گرم کوٹ اور ڈھیلا سلیپنگ سوٹ کا پائجامہ۔ قمیص اور کوٹ کے کالر کالی استری کی وجہ سے بجلی کے پنکھے کی طرح اُوپر اُٹھے ہوئے تھے۔ وہ ربر کے چپل پہنے ہوئے تھا۔ اور باپ ننگے پاؤں گھٹنوں سے اونچی لنگی اور تنگ میلا کچیلا واسکوٹ جس پر ایک پھٹی پرانی اُونی شال جو خاص موقعوں پر استعمال کی جاتی تھی۔ وہ طبعی عمر سے بھی

شاعر بھی

زیادہ کا معلوم ہوتا تھا۔

گور دیال بابو سمجھ چکے تھے کہ امانت کیوں آیا ہے۔ اس کے باوجود اُنہوں نے کہا، "بیٹھ جاؤ میاں!" اور امانت دروازہ کے پاس ہی زمین پر بیٹھ گیا گو اُس کے قریب ہی خالی کرسی پڑی تھی۔ اُس نے ہاتھ جوڑے اور کہا "عزیز میرا اکلوتا بیٹا ہے ماسٹر بابو اور آپ کی عنایت کا طالب ہو کا جا چکا تھا۔" "تمہارا لڑکا تین سبجیکٹ میں فیل ہے اور ہم دو سبجیکٹ تک رعایت کر سکتے ہیں۔" دیہاتی کسان ان باتوں کو کیا سمجھے "میرے لڑکے پر صرف آپ کی مہربانی چاہئے۔" "افسوس ہے" گور دیال بابو مسکرائے "اگر مہربانی کی بات ہے تو کلاس کے دوسرے طلبا نے کیا پاپ کیا ہے، وہ بھی اس کے مستحق کیوں نہیں ہو سکتے۔" "میرا اور کوئی نہیں بابو" امانت کہے جا رہا تھا۔ ہیڈ ماسٹر بابو کو ایسے معاملوں سے اکثر دو چار ہونا ہی پڑتا تھا۔ وہ دالان میں چلے آئے اور امانت بھی سایہ کی طرح ساتھ چلا آیا۔ وہ اب بھی ملتجی نگاہوں سے بابو کو دیکھ رہا تھا۔ بابو کی دُور رس نگاہوں نے بھانپ لیا تھا کہ امانت سے کوئی اُمید نہیں کی جا سکتی ہے۔ پھر بھی گرتی ہوئی دیوار کو سنبھالا دیتے ہوئے پُوچھا "تم کیا کرتے ہو۔" "میں مکان دار ہوں" "یعنی کھیتی کرتے ہو۔" "جی ہاں! ورنہ بال بچے بھوکوں نہ مر جاتے بابو۔" مکان کا کچھ حصہ یا کھیت کا ایک حصہ کرایہ پر دے کر چھوٹے ہوئے ہو کیا؟ امانت نے ایک لانبی ٹھنڈی سانس لی۔ "اب تو صرف دس بیگھہ زمین ہی رہ گئی ہے۔ اسے بھی کرایہ پر چھوڑ دوں تو کیا کھاؤں۔" "کیا تم تنہا کھیت میں کام کرتے ہو۔" "جی ہاں! اور ساتھ ہی گھر کا سارا کام مجھے ہی کرنا پڑتا ہے۔" گور دیال بابو نے پہلی نظر میں اُسے کوئی دوکاندار سمجھا تھا مگر جب حقیقت معلوم ہوئی تو اُنہیں غصہ آیا۔ "گھر کی مالی حالت دُرست نہیں تو لڑکے کو

م دینے کی ضرورت کیا ہے" میں کیا کروں بابو۔ لڑکا پڑھ لکھ کر بڑا
ا بننا چاہتا ہے" تو اس کی آنکھوں میں ایک غیر معمولی چمک چند لمحوں
لئے نمودار ہوئی اور اُسی طرح غائب بھی ہو گئی۔ "اوہ تو وہ بڑا آدمی
چکا۔ ایک غریب کسان کا بیٹا۔" اس حقارت آمیز جملے کو امانت
س نہ کر سکا۔ "لڑکا تو دس کلاس تک پڑھ چکا ہے۔" وہ دیہات
سی پرائمری اسکول میں ماسٹری کر سکتا ہے یا پھر رجسٹرار آفس میں
تاویز کی نقل کر سکتا ہے۔" "مگر نہیں بابو" امانت کی آنکھیں پھر چمک
ں۔" وہ ایسے چھوٹے کام نہیں کرنا چاہتا۔ وہ مجسٹریٹ یا وزیر۔ ۔ ۔ ۔"
بابو نے اُسے ٹوکا" تو پھر وہ توجہ سے کیوں نہیں پڑھتا۔" وہ پڑھے گا۔
ر پڑھے گا۔ کیوں نہیں پڑھے گا۔ صرف اِس سال کے لئے۔ ۔ کسی طرح
، پاس کرا دیجئے۔ میں پھر کسی معلم کی خدمات حاصل کروں گا۔" اُس کے
یہ ہوئے کہ تمہارے پاس کافی روپیہ ہے اور تم۔ ۔ ۔ ہا۔ ہا۔" اِس
کے معنی اب بھی دیہاتی گنوار نہ سمجھ سکا۔" کیا تم سُود پر روپیہ دیتے ہو"
ٹر بابو نے طنز بھرے نشتر لگانے شروع کر دئیے۔ "میرے پاس اتنا
روپیہ کہاں ہے بابو۔" "تو پھر یہ الگ خرچ کس طرح برداشت
کئے" "جب اس دس بیگھہ زمین سے بمشکل دو وقت کا بھات بھی
میسر ہو سکتا ہے۔ بابو جی میرے پاس پہلے ستر بیگھہ زمین تھی
۔ دس بیگھہ رہ گئی ہے۔ میری ساری زمینیں زرخیز تھیں اور ہر بیگھہ
سے من دھان حاصل ہو جاتا تھا۔ مگر جب سے میں نے یہ دھان
رنا شروع کیا تو اُس میں سے بیشتر حصہ لڑکے کی تعلیم میں خرچ ہو گیا۔
ر دینے والوں نے دس بیگھے کی جگہ ستر بیگھے لکھوا لئے۔ میں کیا جانوں
نوں کو۔ اِس طرح میں لُٹ گیا۔ اگر میرا لڑکا پڑھا لکھا ہوتا تو یہ دھوکا
نہیں ہو سکتی تھی نا بابو۔ اور اپنی جائداد کا حساب کتاب وہ خود ہی
سکتا تھا۔" مگر یہ کام تو وہ موجودہ تعلیم سے بھی سنبھال سکے گا۔"
بابو وہ اگر تعلیم ترک کر کے میرے ساتھ ہل چلانے پر مستعد ہو جائے تو
ے دن پھر سکتے ہیں۔ کھوئی ہوئی ساری زمینیں پھر واپس مل
ہیں۔ مگر وہ تو۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔" "ہاں! جوڑا کا سلک کی قمیص اور کوٹ،
بیٹا ہو تو وہ کیوں تمہارا ساتھ دے گا۔ دراصل تم نے ہی اُسے
بگاڑا ہے۔" امانت نے پھر ہاتھ جوڑے" لڑکا اگر اس سال پاس
ے اور اگر آپ چاہیں تو۔ ۔ ۔ ۔ ۔" "میں کیا کر سکتا ہوں بھلا۔
تو سکریٹری صاحب سے مل سکتے ہو۔ وہ یہ کام شاید کر سکیں گے۔
۔ بھی

اب جاؤ میرا وقت برباد نہ کرو۔"

امانت نے زمین کا کچھ حصہ کیلے کی کاشت کے لئے وقف کر رکھا تھا۔ گردیال بابو سے ملنے کے وقت اُسے خالی ہاتھ نہ جانا چاہیئے تھا۔ کچھ نہیں تو کیلے کی ٹوکری ہی سوغات کی صورت میں لے جاتا۔ اب جو وہ لوٹ کر آیا تو اُسے یہ خیال شدت سے ستانے لگا۔ اُس نے ایک ٹوکری میں اچھے اچھے کیلے بھرے جس کی خوشبو سے آس پاس معطر ہوا جا رہا تھا۔ ٹوکری لیکر وہ سکریٹری صاحب کے گھر پہنچا۔ سکریٹری بابو مقامی بینک کے منیجر اور آنریری مجسٹریٹ بھی تھے۔ ہر معاملے میں اُن کا اُصول ایک "معمول" بنا ہوا تھا۔ لوگ جانتے تھے اور اِس معمول کی ادائیگی پر اُن کے سب اُلجھے کام بہ آسانی سلجھ بھی جاتے تھے۔ اُنہوں نے جب امانت کی درخواست سُنی تو مسکرا دئیے اور ایک نظر اندازہ لگا لیا کہ ٹوکری میں کتنے کیلے ہونگے جو اُنہیں دعوت لذتِ طعام دے رہے تھے۔ وہ سوچ رہے تھے کہ آخری لسٹ کل نوٹس بورڈ پر لگا دی جائے گی۔ دیکھنا یہ ہے کہ ابھی کون لوگ اور اُن سے ملنے آئیں گے۔

امانت کا دیہات "موران ڈنگا" شہر سے چھ میل فاصلے پر تھا۔ عزیز اِسی لئے ہوسٹل میں ہی رہتا تھا۔ پانی بھات اور پیاز کی ڈلی کے لئے روز اتنی مسافت طے کرنا اُس کے بس کی بات بھی نہ تھی۔ امانت کے تین بچے جاڑوں کے بخار کی نذر ہو گئے تھے اور ایک عزیز ہی بچا تھا۔ امانت نے دوسری شادی بھی کی مگر یہ بیوی ہر وقت بیمار اور چڑچڑے مزاج کی تھی۔ صبح ہی سے امانت کا مزاج بگڑا ہوا تھا۔ گذشتہ شب عزیز کی سوتیلی ماں اُس کی فضول خرچی پر امانت کا دماغ چاٹ چکی تھی۔ اُسے شکایت تھی کہ کم بخت نے گھر کی مالی حالت خراب کر رکھی ہے۔ دھان بھری کوٹھریاں خالی ہیں۔ ایک سائیکل، دو بیل گاڑی۔ ایک لال ٹین کے ساتھ چاندی کے گہنے بھی اِس فضول خرچی کے نذر ہو چکے تھے۔ گھر کی ٹین کی چھت نے کھپریل بدل کر اب پھوس کو اپنا لیا تھا۔ ساری جائداد قرضداروں کے قبضہ میں چلی گئی تھی۔ گھر کے لانبے لانبے دالان ویران ہو گئے اور آنگن میں گھاس اور خود رو جھاڑیاں اُگ گئیں۔ مگر امانت نا اُمید نہ تھا۔ آخر وہ اپنی جائیداد کی زمینوں پر کھڑا اندازہ لگاتا رہتا کہ اُس کی اپنی زمین جو سر دست اوروں کے قبضہ میں ہے اُسے دوبارہ گلے لگانے کے لئے بانہیں پسارے ہے۔ وہ سوچنے لگتا کہ عزیز اِن ساری کھوئی ہوئی زمینوں کو واپس دلائے گا۔ اُس کی شادی ہو گی، پوتے ہوں گے اور یہ سب مل کر کھیتوں میں ہل گھمانے

سلام کریں گے۔ کالی گھٹائیں پھر چھائیں گی، بارش ہوگی اور سب کھیت جل تھل ہو جائیں گے۔ پھر۔ پھر دھان کے ہرے ہرے پودے اور پھر بالیاں اور پھر۔۔۔ اُف۔"

عزیز دوسرے دن دوپہر کے وقت گھر آگیا۔ "لسٹ ٹانگ دی گئی ہے ابا۔ صرف تمہیں فیل کا نام نہیں ہے۔ ہینڈ نوٹ HAND NOTE پر روپیہ نہ جمع کئے جانے کی وجہ دستخط نہیں ہوسکے ہیں"۔ باپ کو اس خبر سے خوشی نہ ہوئی۔ اُسے لڑکے کی چمک دمک اچھی نہ لگی۔ عزیز کہہ رہا تھا "میں پاس ہوگیا ہوں اور میٹرک کے امتحان میں بیٹھنے کی اجازت بھی مل گئی ہے۔ فیس اور دوسرے اخراجات سب ملاکر چالیس پچاس روپے ہوں گے۔"

روپیہ۔ روپیہ، باپ نے کپکپاتی آواز میں احتجاج کیا۔ کہاں سے لاؤں روپیہ" تو کیا میری تعلیم ادھوری رہے گی۔ کیا ناؤ کو منجدھار کی نذر کر دیا جائے گا۔" امانت سوچ رہا تھا کہ ایسا ہوتا تو اچھا ہی تھا۔ اب اسکول کی تعلیم ترک کرو عزیز" باپ نے اشک آلود نگاہوں سے کھیتوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا" دیکھو وہ ساری زمینیں ہماری تھیں آج اور کسی کے قبضہ میں ہیں۔ آؤ ہم دونوں مل کر ہل چلائیں" عزیز ہنس پڑا۔ کیسی بات کرتے ہو ابا۔ پاگل تو نہیں ہوگئے ہو۔ مجھے انسان کی طرح جینے دو۔ ساری کھوئی زمینیں پھر آپ کے قدموں میں ڈال دوں گا۔ کیا سمجھے ــــ زندگی بھر اس ٹوٹے پھوٹے پھوس کے گھر میں رہنا نہیں ہے۔ اِن کی جگہ چونا اور پتھر کی عمارتیں کھڑی ہوں گی۔ تمہیں اپنے ہاتھ سے ہل نہیں چلانا ہوگا۔ ہم زمین کا کرایہ اناج کی صورت میں وصول کریں گے اور کچھ نقدی کے روپ میں۔ مگر کس طرح میں ان زمینوں کو اپنے سینے سے دُور کروں بیٹے" باپ نے کہا۔ عزیز پھر ہنس پڑا" تم فکر نہ کرو ابا۔ مجھے میٹرک پاس کر لینے دو۔ امانت نے سوچا کشتی کو ڈوبنے سے بچانا ہی ہوگا۔ روپیہ تو کسی سے اُدھار ملے گا نہیں۔ مگر امانت نے ہمت نہ ہاری۔ اپنی پھٹی پُرانی شال کندھے پر ڈالی اور محلّے کے حاجی شیخ کے پاس گیا۔ روپیہ کے اُدھار کی بات پر ہی اُس کا دماغ گرم ہوگیا۔ "کس مُنہ سے روپیہ مانگ رہے ہو جبکہ پچھلے روپے ابھی باقی ہیں۔ تو تمہیں روپیہ کی یک بیک ضرورت کیوں پڑگئی۔ امانت نے کہا عزیز کے اسکول کی فیس کے لئے چاہیئے ہے۔

"مجھے ان باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں" حاجی صاحب مسکرائے۔ تمہیں روپے کی ضرورت ہے تو پانچ بیگہ زمین جو کچہری والوں کی بے ایمانی سے میرے ہاتھ سے نکل گئی ہے اُسے مجھے فروخت کردو۔ میں صاف گو ہوں۔ حاجی ہوں۔ خدا سے ڈرتا ہوں۔ پانچ بیگہ کے ایک مُشت سو روپے دوں گا۔" مگر مجھے

شاعر۔ بمبئی

سو روپیوں کی ضرورت نہیں شیخ صاحب"۔ "ارے میاں! روپے کی کسے ضرورت نہیں۔ باقی روپیہ کہیں چھپائے رکھتا۔ میری زمین کتنی زرخیز ہے یہ تمہیں معلوم معلوم ہے اور تم فی بیگہ دس روپے دوگے"۔ "پچاس روپے پر دو بیگہ لے لو" "میاں خود سوچو! ضرورت تمہاری ہے میری نہیں۔ تم شاید نہیں جانتے یہ پانچ بیگہ زمین بنجر اور مویشیوں کی چراگاہ ہے۔ اچھا میں تمہارے ساتھ اتنی رعایت کردوں گا۔ کہ تم ہل چلاؤ۔ بیج تم بوؤ۔ دھان ہونے پر آدھا تمہارا اور آدھا میرا اور ساتھ ہی ایک سو روپے یک مُشت تمہارے کہنے کے بموجب دوں گا، اس سے زیادہ میں کچھ نہیں کرسکتا۔ میں صاف گو ہوں، حاجی ہوں۔ اللہ سے ڈرتا ہوں۔

پانچ بیگہ زمین بک گئی۔ امانت نے پچاس روپے عزیز کو دئیے اور باقی اُسکے بکس، ہوسٹل کے اخراجات وغیرہ پر خرچ ہوگئے۔ اُدھر جب دھان بوئے گئے اور جب فصل کاٹی گئی تو بغیر محنت کئے حاجی شیخ نے آدھا حصّہ سمجھوتے کے بموجب حاصل کر لیا۔ امانت پھر بھی سنہرے خواب دیکھ رہا تھا۔ اُسے اطمینان تھا کہ اب بھی اُس کے پاس پانچ بیگھ زمین ہے۔ اُدھر بارش نہیں ہوئی تو کیا۔ زمین میں دراڑیں پڑ گئیں تو کیا ہوا۔ میں ہل چلاؤں گا۔ ہمارے اچھے دن بہت جلد آجائیں گے۔۔۔

عزیز میٹرک پاس ہوگیا۔ اُس نے باپ سے کہا۔" ابا اب مجھے مزید تعلیم کی ضرورت نہیں۔ میں اب آفس میں کام کروں گا۔ میں بابو بنوں گا۔ لاکورٹ LAW COURT میں ایک کلرک کی ضرورت ہے۔ ایک دکھاوے کا امتحان ہوگا اور ڈسٹرکٹ کورٹ کے بڑے بابو تقرر کریں گے جو اُنہیں زیادہ دے گا وہ اس کام کا مستحق قرار دیا جائے گا۔ وہ سو روپے پر رضامند ہیں مگر امانت کے پاس سوائے اُس پانچ بیگہ زمین کے جس کے بارے میں وہ سُنہرے خواب دیکھ رہا تھا اور کیا تھا مگر اب کشتی کو منجدھار میں ڈبونا نہیں تھا۔ ـــ ـــ حاجی شیخ نے وہ پانچ بیگہ زمین بھی خرید لی۔ اور سو روپے عزیز کو مل گئے۔ اب امانت کے پاس اپنے باپ دادا کے زمانے کے ٹوٹے پھوٹے مکان رہ گئے تھے۔ جب زمین ہی نہ رہی تو اس مکان کی وقعت ہی کیا۔

عزیز اب سارے کُنبے کو لے کر شہر میں آگیا جہاں اُس کا دفتر تھا۔ تیس روپے ماہوار تنخواہ تھی آمدنی کے راستے ہموار تھے۔ اُسے اُمید تھی کہ گھر کے حالات درست ہو جائیں گے۔ مگر اِدھر زمینیں کھو دینے کے بعد امانت کی حالت عجیب سی ہوگئی۔ صحت روز بروز جواب دینے لگی۔ کُنبے کے

(باقی صفحہ ۵۷ پر دیکھیں)

غزلیں

جاوید

جلنے لگیں ہیں نیند میں مانوس بستیاں
میں نے بہت اٹھائی ہیں خوابوں کی تختیاں

رخسارِ غم پہ کون ٹھہرتا ہے ان دنوں
کل تک تو آنسوؤں نے سنبھالی تھیں کشتیاں

دیکھیں گے چل کے محفلِ ماتم کا انتظام
روتے ہیں کون لوگ تو ہنستی ہیں بستیاں

سینوں میں سب کے روز مہکتی ہیں خواہشیں
پتھر کے مقبروں پہ ہیں پھولوں کی تختیاں

اُس نے بہت کہا کہ زمانے سے پوچھ لو
کیسے ہوا کے دوش پہ سوتی ہیں بستیاں

○ شعبۂ انگریزی وسنت راؤ نائک کالج
اورنگ آباد (مہاراشٹر)

عشرت ظفر

(۱)

کشتۂ تیغِ ماہ و سال ہوں میں
صورتِ نقشِ پائمال ہوں میں
کل تھا یکتائے چہرگی لیکن
آج محرومِ خط و خال ہوں میں
یوں مجھے دیکھتا ہے وہ جیسے
سر سے پا تک کوئی سوال ہوں میں
ذرّہ ذرّہ مہک رہا ہے مرا
کس کی خاکسترِ زوال ہوں میں
مر گیا مجھ سے پہلے جو عشرتؔ
اُس کے غم میں بہت نڈھال ہوں میں

(۲)

عمر بھر کے لئے آزار نہ مانگ
دشت سے سایۂ اشجار نہ مانگ
محوِ آوارگیٔ صحرا رہ
کوئی قیدِ در و دیوار نہ مانگ
تو ہنرمند بھی ہے قاتل بھی
قتل کر دے مجھے تلوار نہ مانگ
یہی خوشبو تو ہے دولت اسکی
خاک سے خاک کا پندار نہ مانگ
آرزوؤں کے کھنڈر سے عشرتؔ
نکہت و رنگ کے آثار نہ مانگ

○ قیصر راج ہاؤس۔ رحمانی مارکیٹ۔ طلاق محل، کانپور (یو۔پی)

سحر سعیدی

زندگی میں آتا ہے ایک وقت ایسا بھی
ساتھ چھوڑ دیتا ہے آدمی کا سایا بھی

گرد جو بھی دیکھی زندگی کے چہرے پر
پاس پھر نہیں ٹھہرا ان کے کوئی لمحہ بھی

تشنگی کی دوزخ ہے اور ریت میں کیا ہے
میرے خشک ہونٹوں میں چھپ گیا ہے دریا بھی

ناز خود پہ کیوں کر ہے اس قدر اجالوں کو
کٹ گیا اندھیروں سے روشنی کا تیشہ بھی

اب گھروندے کیا ہوں راکھ ہو گیا سب کچھ
جل گیا بدن کے ہی ساتھ ساتھ سایا بھی

دل کی راہ سے ہو کر دار کی بلندی تک
جانے والے جاتے ہیں فاصلہ ہو کتنا بھی

کھو گئے سحرؔ سب ہی دلکشی میں منظر کی
کون ہے پسِ منظر یہ کسی نے سوچا بھی

○ ۱۷-۱۸-۱-۱ ٹوٹی مسجد، چیلی پورہ
اورنگ آباد (مہاراشٹر)

داؤد خاں

ابنِ کنول
"بیت الشمس" جمال پور۔ مسلم یونیورسٹی۔ علی گڑھ

"حولدار کہاں گیا مینڈھا ــــ تم سب کیا سو رہے تھے۔ یاد رکھو اگر مینڈھے کا پتا نہ چلا تو تم سب کو اپنی نوکری سے ہاتھ دھونا ہوں گے"

داؤد خاں کی گرجدار آواز پورے ہال میں تاج کے گنبد میں گونجنے والی صدا کی طرح گونج گئی۔ آس پاس کھڑے کانسٹبل اور چپراسی سرحد کے محافظ کی طرح سا دھان کی حالت میں آ گئے۔ داؤد خاں کی عزت کا معاملہ تھا' معلوم ہوتا تھا کہ برسوں کا سویا ہوا "داؤد خاں آف سام نگر" ایک بار پھر اپنی ڈیوڑھی پر پہنچ گیا ہے۔ جس کی آواز سے درختوں پر سوئے ہوئے پرندے اس طرح پھڑپھڑا کر پرواز کر جاتے تھے جیسے کسی شکاری نے فائر کر دیا ہو۔ خدمتگاروں کی رگوں میں دوڑ ہوا لہو حرکت کرنا بند کر دیتا تھا۔ اتنا کہہ کر داؤد خاں پیر پٹختے ہوئے ہال سے باہر نکل گئے

زمینداری کے خاتمہ پر داؤد خاں کی عمر صرف پچیس سال ہی تھی اُس وقت انہوں نے اگر کوئی عقلمندی کا کام کیا تو وہ یہی تھا کہ سرکاری ملازمت اختیار کر کے اپنی انفرادیت کو برقرار رکھا۔ زمینداری ختم ہونے وقت داؤد خاں کو ایسا لگا تھا جیسے اُن کی کڑک دار آواز میں کچھ فرق آ گیا ہو' اُس وقت اُنکی تعلیم نے اُن کا ساتھ دیا' اُسی کے سہارے وہ پولیس کے محکمے میں پہنچ گئے۔ ترقی کی اتنی منزلیں طے کیں کہ تھانے دار کے عہدے کے لئے اُن کو منتخب کر لیا گیا۔ تھانے دار ہو کر وہ ایک قصبے شاہ گنج میں پہونچے' جہاں اُن کی بلکھی ہوئی مونچھیں کھڑی ہونا شروع ہو گئیں۔ تھانیدار داؤد خاں کی گرجدار آواز پورے علاقہ میں گونجنے لگی۔ اونچا قد' چوڑا سینہ' سُرخ پٹھانی چہرے پر راجپوتی کالی مونچھیں دیکھ کر بنئے بھی سودا غلط تول جاتے تھے۔ جس وقت داؤد خاں تھانے سے باہر نکلتے تو ذرا سی دیر میں پورے بازار میں یہ خبر آگ کی طرح پھیل جاتی کہ داؤد خاں تھانے سے چل پڑے ہیں۔ راستہ صاف ہو جاتا' تمام بدمعاش اِدھر اُدھر منتشر ہو جاتے۔ اس کے باوجود

نہ جانے کس میں اتنی ہمت پیدا ہو گئی کہ اُن کے لاڈلے مینڈھے کو غائب کر دیا۔ شکاری کتّے کی طرح مینڈھا اُن کے ساتھ تھانے جاتا اور ساتھ ہی واپس آتا' مینڈھا غائب ہونے کا تو اُنہیں اتنا غم نہیں ہوا' لیکن یہ سوچ کر اُن کا خون کھول گیا کہ کوئی ایسا شخص بھی موجود ہے جو داؤد خاں کو چیلنج کرے۔ پورے علاقے میں مینڈھے کی تلاش کے لئے کانسٹبل دوڑا دئیے گئے۔ ذرا سا بھی کسی پر شبہ ہوتا' وہی تھانے میں دکھائی دیتا۔ بازار میں کسی نے کہہ دیا کہ آج صبح خاں صاحب کے پیچھے مینڈھا نہیں تھا' بلکہ ایک جھبلی والا اُس کی گھنٹی بجاتا ہوا اُن کے پیچھے جا رہا تھا۔ پھر کیا تھا شاہ گنج کے تمام جھبلی والوں کو تھانے میں بھیڑ بکریوں کی طرح اکٹھا کر لیا گیا۔ داؤد خاں کے سامنے بڑے بڑے مجرم اپنا جرم تسلیم کر لیتے تھے۔ داؤد خاں کی آنکھوں میں غصہ کی چنگاریاں دیکھ کر غریب جھبلی والے شاخ پر لگے ہوئے سوکھے پتے کی طرح لرز گئے۔ کافی دیر بعد ایک بڈھا ہاتھ جوڑتا ہوا آگے بڑھا۔

"حجور! (حضور) میں تھا لیکن حجور قسم کھاتا ہوں میرا تنک سا بھی کسُور (قصور) نا ہیں' ایک آدمی نے ایک روپیہ دے کر کہی (کہا) تھی کہ میں تھانے تک گھنٹی بجاتا چلا جاؤں' حجور میں بے کسور ہوں۔"

آن کی آن میں گھنٹی منگائی گئی۔ گھنٹی داؤد خاں کے مینڈھے کی ہی تھی۔ داؤد خاں چیخ پڑے "کون تھا وہ بدمعاش؟ جس نے ہمارے ساتھ یہ حرکت کی۔ پکڑ لاؤ تمام بدمعاشوں کو۔" علاقے کے تمام بدمعاش اکٹھا کر لئے گئے لیکن کچھ بھی حاصل نہ ہوا۔ داؤد خاں نے جھنجھلا کر سب کو چھوڑنے کا حکم دیا اور تھکے ہوئے مایوس شکاری کی طرح کرسی میں دھنس گئے۔ اُن کی زندگی میں یہ پہلا حادثہ تھا۔ شکست کا منہ دیکھنا اُن کی عادت نہ تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ انتقام لینے کے لئے بے چین تھے۔

"حضور ایک چھوٹی سی عرض ہے"

داؤد خاں نے چہرہ اُٹھاکر دیکھا شیرا پہلوان اُن کے سامنے کھڑا ہوا تھا، بڑی دھیمی آواز میں کہا۔

"کہو"

"حضور آج دوپہر کو آپ کھانا ہم غریبوں کے ساتھ کھائیں" لمبے چوڑے بدن کے شیرا پہلوان نے اپنی درخواست پیش کی۔

"کیوں کوئی خاص تقریب ہے کیا"

"بس یوں ہی حضور کچھ خاص لوگوں کو دعوت پر بُلایا ہے۔ وعدہ کر لیجئے حضور۔ محمد شاہ پہلوان کے اکھاڑے میں انتظام کیا گیا ہے"۔

"کوشش کریں گے۔"

"کوشش نہیں حضور آنا ہوگا۔"

"اچھا آئیں گے۔"

"شکریہ حضور" آداب کر کے شیرا پہلوان لبوں پر تبسم بکھیرتا ہوا واپس چلا گیا۔ داؤد خاں نے ایک نظر جاتے ہوئے شیرا پہلوان کو دیکھا اور پھر اُسی عالم خیال میں پہنچ گئے جہاں سے واپس آکر شیرا کی دعوت منظور کی تھی۔

دوپہر کو محمد شاہ کے اکھاڑے میں خاصے لوگ اکٹھا تھے۔ تھانیدار داؤد خاں کا انتظار تھا۔ داؤد خاں کے آتے ہی دسترخوان لگا دیا گیا، بریانی اُتاری گئی۔ داؤد خاں کے ساتھ ہی بہت سے [illegible] مونچھوں والے پہلوان بھی ہاتھ دھوکر بیٹھ گئے۔ شیرا پہلوان نے اعلان کیا "بسم اللہ کیجئے خاں صاحب" جیسے لوگ اِسی کے منتظر تھے۔ اجازت ملتے ہی بریانی کی پلیٹیں اسطرح صاف کر دیں جیسے طاقتور فوج حکم ملتے ہی دشمنوں کی فوج کا صفایا کر دیتی ہے۔

"پہلوان بریانی پکانے والے کا جواب نہیں۔ ذرا بُھنڈ کی بوٹی منگواؤ" داؤد خاں نے گلاس میں پانی لیتے ہوئے کہا۔

"حضور آپ ہی کا ہے سب کچھ ۔۔۔ اے فجو بُھنڈ کی بوٹی لا خاں صاحب کے لئے"

پُشت پر کھڑے ہوئے شیرا پہلوان نے اپنی مونچھوں کو بل دیتے ہوئے فجو کو اشارہ کیا۔ فجو نے بوٹیوں کی ایک بھری پلیٹ داؤد خاں کے سامنے رکھ دی۔

"واہ سبحان اللہ۔ کیا لذیذ گوشت ہے۔" داؤد خاں نے پلیٹ میں رکھی ہوئی بوٹیاں اُٹھائیں۔

"مہربانی ہے حضور آپ کی"۔ شیرا پہلوان نے ایک بار پھر مونچھوں پر ہاتھ پھیرا۔

دعوت ختم ہوئی تو جاتے وقت داؤد خاں نے شیرا پہلوان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا۔

"بھئی پہلوان ہمارے مینڈھے کا ابھی تک پتا نہیں چلا۔"

"کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ آپ کو کس پر شک ہے جو یہ حرکت کر سکتا ہے"

"کچھ کہہ نہیں سکتا۔ کبھی ایسا واقعہ نہیں ہوا۔"

"کوشش کریں گے حضور۔ شام کو آپ اِسی جگہ آجائیں ہو سکتا ہے پتا چل جائے سب یار لوگ اکٹھا ہوتے ہیں۔" شیرا پہلوان نے کچھ دیر سوچ کر جواب دیا۔

داؤد خاں کے چہرے پر حیرت کے تاثرات نمایاں ہوئے اور پھر وہ خیالات کی وادی میں ہچکولے کھاتے ہوئے گھر تک پہونچے۔

شام کو ٹھیک ساڑھے پانچ بجے داؤد خاں اپنی راجپوتی مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے زمیندارانہ تمکنت کے ساتھ محمد شاہ کے اکھاڑے میں جا پہنچے۔ محمد شاہ کا اکھاڑہ علاقہ کے تمام پہلوانوں اور نامی بدمعاشوں کا اڈہ سا بن گیا تھا۔ شاہ گنج یا آس پاس کہیں کوئی ایسی ویسی بات ہو جاتی تو فیصلہ اسی اکھاڑے میں ہوتا تھا، اِس اکھاڑے کے پہلوانوں کو شکست دینا بہت مشکل کام تھا۔ جس وقت داؤد خاں اکھاڑے میں آئے تو وہاں اچھی خاصی رونق تھی۔ ایک طرف کچھ نوجوان کشتیاں لڑ رہے تھے، چبوترے پر پڑے ہوئے مونڈھوں اور چارپائیوں پر کسرتی بدن کے پہلوان بیٹھے خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ داؤد خاں کو دیکھ کر مودبانہ انداز میں سب کھڑے ہوگئے۔ داؤد خاں کی نگاہوں نے ایک لمحہ میں تمام لوگوں کا جائزہ لیکر شیرا پہلوان کو تلاش کیا، فجو بھانپ گیا۔

"تشریف رکھئے حضور، اُستاد ابھی آتے ہی ہوں گے۔"

داؤد خاں بیٹھے ہی تھے کہ ہاتھی کی سی جسامت کا شیرا پہلوان تہمد اور کُرتا پہنے وارد ہوا، ایک بار پھر کچھ بزرگوں کو چھوڑ کر سب جوان اُٹھ کھڑے ہوگئے، جیسے شیرا علاقہ کا دوسرا تھانیدار ہو۔ تھوڑی بہت رسمی گفتگو کے بعد داؤد خاں بہت جلد اصل مقصد کی طرف آگئے۔ شیرا بھی غالباً اسی کے لئے تیار ہوکر آیا تھا، اُس نے کہنا شروع کیا۔

"حضور بات یہ ہے کہ آپ کا مینڈھا تھا بھرے بدن کا، خوبصورت معلوم ہوتا تھا کسی جی دار آدمی کا ہے اور تھا بھی۔ اچھے بھلے آدمی کی

سے دیکھ کر نیت بگڑ جاتی تھی۔ ایک دن کچھ یار لوگ بیٹھے ہوئے تھے، کہنے لگے یار خانصاحب کے مینڈھے کی بریانی پکے تو کیسی رہے گی۔ مزہ آجائے گا۔ باقی لوگوں نے ہاں میں ہاں ملائی۔ اب حضور اُن کے سامنے بات یہ آئی کہ بلی کے گلے میں گھنٹی کون باندھے۔ سب پکے جی دار تھے، پیالا میں دھنو لالہ کی دکان سے ایک کلّا چاولوں کا لاؤں گا' دوسرے نے کہا اصلی گھی کا ٹن میرے ذمہ رہا' پکانے والوں کی کمی نہ تھی۔ ایک کے ذمّے میں یہ کام رہا کہ مینڈھا لیکر آئے۔ یہی کام سب سے مشکل تھا کیونکہ شیر کے منہ سے شکار چھیننا تھا۔"

سب کچھ داؤد خاں خاموشی سے سُنتے رہے جیسے عدالت میں بیٹھا ہوا جج کٹہرے میں کھڑے مجرم کی روداد سُن رہا ہو' بیان جاری تھا۔

"تو حضور مینڈھا لانے والے آدمی نے یہ کیا کہ بھُنے ہوئے چنے لے کر اُس وقت سڑک پر کھڑا ہو گیا جب آپ وہاں سے گزرتے ہیں۔ حضور آپ وہاں سے گزرے' مینڈھا پیچھے پیچھے تھا' اُس آدمی نے مینڈھے کی طرف بھُنے ہوئے چنے بڑھائے' مینڈھا خوشبو سونگھتے ہی اُس کے پیچھے ہو لیا۔ ــــــ اُس آدمی نے ایک کام یہ کیا کہ ایک جھلی والے کو روپیہ اور مینڈھے کی گھنٹی اُتار کے دی اور کہا کہ اِسے کھانے تک آپ کے پیچھے پیچھے بجاتا ہوا چلا جائے۔ جھلی والا آپ کے پیچھے پیچھے چلا گیا۔ اُدھر وہ آدمی مینڈھے کو اپنے ساتھ لے گیا۔

"کون تھا وہ آدمی؟" خاموش بیٹھے ہوئے داؤد خاں نے دونوں ہاتھوں کو مونڈھے کے ہتھوں پر مارا۔

"حضور آپ کے سامنے حاضر ہے" شیرا نے سر کو ذرا سا خم دیتے ہوئے بڑی عاجزی سے کہا۔

"شیرا" داؤد خاں دہاڑتے ہوئے ایک دم کھڑے ہو گئے' آس پاس بیٹھے ہوئے لوگوں میں سے بعض اُن کی آواز سُن کر سہم گئے۔

"تو مینڈھے کی بوٹی لا خانصاحب کے لئے" شیرا پہلوان بھول گیا کہ وہ داؤد خاں آف سام نگر کے سامنے کھڑا ہے جنھوں نے زمینداری کے زمانے میں شیرا جیسے کتنے ہی بدمعاشوں کو ٹھکانے لگوا دیا تھا ــ شیرا کا یہ جملہ سُنتے ہی داؤد خاں آگ پر رکھے ہوئے موم کی طرح پگھل گئے۔ اُنھیں اپنا وجود زمین میں دھنستا ہوا محسوس ہوا' اُن کے کانوں میں اُس ڈگی پیٹنے والے کی آواز گونجنے لگی جو اعلان کر رہا تھا کہ زمینداری ختم ہو گئی۔ شیرا پہلوان نے داؤد خاں کے چہرے کے بدلتے ہوئے تاثرات شاید بھی دیکھ کر کہا۔

"حضور مینڈھے پر اُسی وقت ہاتھ ڈالا گیا جب آپ نے دعوت منظور کر لی"

"شیرا تم نے اچھا نہیں کیا" داؤد خاں نے شیرا پہلوان کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا اور خاموشی سے نظریں جھکائے ہوئے باہر چلے گئے۔ پہلی بار لوگوں نے داؤد خاں کی مونچھوں کا تاؤ اُترتا ہوا محسوس کیا' دوسرے دن ہر طرف یہ خبر پھیل گئی کہ داؤد خاں استعفیٰ دے کر کہیں چلے گئے ہیں۔

○○

بقیہ: افسانہ زمین صفحہ ۵۲

سارے لوگ بیمار رہنے لگے۔ شہر کی ہوا اُنھیں راس نہ آئی۔ امانت سوچا رہا کہ اب بھی شہر چھوڑ کر گاؤں چلا جانا چاہئے۔ وہ زمین جو اُسے نئی نویلی دلہن جیسی معلوم دیتی ہے اُسے پھر گلے لگا لینا چاہئے۔ تازہ دم ہو کر اُس میں پھر ہل چلانا چاہئے۔ کھیت کی گیلی مٹی کی سوندھی خوشبو اُسے شہر کی بُو سے اچھی معلوم ہو رہی تھی۔ وہ روز بروز لاغر ہوتا جا رہا تھا۔ اُس کی زبان پر ہر دم ایک کڑواہٹ سی محسوس ہوتی۔ وہ عالم خواب میں آدھی رات گئے چلا اُٹھتا۔ زمین! میری پیاری زمین!

اُدھر حاجی شیخ اُسے ڈنڈا دکھاتا۔ وہ روتے ہوئے سوتا جاگ اُٹھتا ٹھنڈے پسینے میں شرابور۔

بیٹے نے باپ کی یہ حالت دیکھی تو بازار کے ایک گوشے میں ایک چھوٹا سا کمرہ کرایہ پر لے لیا۔ امانت اب کسان سے درزی بن گیا اور عزیز خوش تھا کہ وہ اب ایک دیہاتی گنوار کسان کا بیٹا نہیں ہے' درزی کا بیٹا ہے۔ وہ اس پر مطمئن ہی نہیں نازاں بھی تھا۔ جب بھی آسمان پر گھنگھور گھٹائیں چھانے لگتیں۔ برسات کی بوندیں چھت پر رقص کرنے لگتیں۔ امانت کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو جاتی ہیں۔ وہ مشین کو بند کر دیتا اور سوچتا کہ آسمان اُس کی حالت زار پر رو رہا ہے۔ اُس کے ساتھ ہی اُسے ایسا معلوم ہوتا کہ اُسے اُس کی پیاری زمین بلا رہی ہے۔ بلائے جا رہی ہے۔ دور سے بہت دور سے! امانت آ بھی جا۔ آ بھی جا امانت پیارے "۔ وہ رو پڑتا۔ پھر اُس دن وہ کچھ کام نہ کرتا۔ چپ بیٹھا ماضی کے خیالوں میں ڈوبا رہتا۔

(بنگلہ انگریزی کہانی کا عکس لطیف۔)

○○

غزلیں

تابش صدیقی

بیگم وارڈ - پرتاب گڑھ

یہ نہیں ہے کہ تجھی سے ہوں میں برہم تنہا
اور بھی غم ہیں، نہیں ایک ترا غم تنہا

زخم مہکا تو کوئی پاس نہ ٹھہرا میرے
مجھکو کرنا پڑا خود اپنا ہی ماتم تنہا

دل کے رستے ہوئے زخموں کو بھی دیکھے کوئی
لوگ سمجھے ہیں کہ ہے آنکھ ہی پُرنم تنہا

اور بھی غم تھے مگر راہ میں دم توڑ گئے
میرے ہمراہ چلا صرف ترا غم تنہا

سختیاں لاکھ سہی راہِ محبت میں مگر
سب پہ بھاری ہے مرے شوق کا عالم تنہا

تو بھی ہمراہ جو چلتا تو سہارا ملتا
ورنہ سہہ لیں گے زمانے کے سبھی غم تنہا

الف احمد برق

ایچ [redacted] - خلوصی پالیم مین، روڈ - بنگلور

کچھ رنگ حقیقت کی کتابوں سے اُڑالے
یوں اپنے خیالات کی تصویر بنالے

یا گردشِ دوراں سے مجھے چھین لے بڑھکر
یا خود کو بھی کردے اسی گردش کے حوالے

کوئی تو مجھے صبح کے سورج کا پتا دے
میں ڈھونڈنے نکلا ہوں سرِ شام اُجالے

میں خواب ہوں ٹوٹا ہوا تیری ہی نظر کا
آ جن کے مجھے پھر اُنہیں پلکوں پہ سجالے

دم گھٹنے لگا ہے مرا اس جسم میں رہکر
ہے کوئی جو مجھکو مرے اندر سے نکالے

میں اپنی ہی سانسوں میں اُتر جاؤں گا اک دن
بس ڈھونڈتے رہ جائیں گے سب ڈھونڈنے والے

نُدرت نواز

بنگلا اسٹریٹ - امروہہ (ضلع مرادآباد)

جو خوش نہیں کوئی ہم سے خفا خفا تو ملے
نصیب ہو کوئی آہٹ کوئی صدا تو ملے

میں اپنی ذات کے سارے نقوش چھُولوں گا
ان آئینوں میں مگر ایسا آئینا تو ملے

نہیں ہے کچھ تو یہ تنہائیاں ہی اپنائیں
کسی طرح بھی سہی کوئی دوسرا تو ملے

ترے قریب پہنچنے کے راستے تو بہت
ترے قریب پہنچ کر ترا پتا تو ملے

یہ ساری ٹھوکریں ندرت نواز کو منظور
جو اُس کو اس سے ملادے وہ راستا تو ملے

حسن رضا انجوری

یو - کے - پی کالونی - بیجاپور (ضلع گلبرگہ)

جہاں نزدیک سے جانا پڑے گا
وہاں کچھ اور کترانا پڑے گا

کسی چوکھٹ پہ سختی ہی نہیں ہے
یہاں ہر در سے ٹکرانا پڑے گا

میں اپنے کو اگر سچا کہوں تو
محلے بھر کو جھٹلانا پڑے گا

دھواں گھر سے نکلتا ہی نہیں ہے
ہمیں خود ہی نکل جانا پڑے گا

بہت کچھ کہہ چکا اب تک رضا تو
تری باتوں کو تُلوانا پڑے گا

مکتوبات

جاں نثار اختر مرحوم

○ جاں نثار اختر مرحوم پر آپکا مضمون پڑھا۔ نہ پوچھئے دل کی کیا کیفیت ہوئی۔ مبالغہ نہیں ایمانداری سے کہتا ہوں کہ "جاں نثار اختر نمبر" کے سارے مضامین پر بھاری ہے۔ اس قدر خلوص سے کون لکھ سکتا تھا۔ اب تو خود اپنی موت کے لئے دعا کرنے کو جی چاہتا ہے۔ اگر یہ یقین ہو کہ آپ ایسا ہی مضمون میری بابت بھی لکھ دیں گے

اسسٹنٹ اسٹیشن ڈائرکٹر ٹیلی ویژن سینٹر۔ سری نگر — **مظہر امام**

○ جاں نثار اختر مرحوم کے بارے میں آپ کے مضمون نے بے حد متاثر کیا۔ آپ نے گاہے گاہے جب بھی ایسی ادبی شخصیتوں کے بارے میں لکھا ہے آپ کا ذاتی خلوص اور اپنا پن ہمیشہ ابھر کر آیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اُن شخصیتوں کو آپ کے توسط سے اور قریب سے دیکھنے کا موقع ملا ہے اور یہی ان گرانقدر مضامین کا حاصل ہے۔ کیا ہی اچھا ہو اگر ایسے مضامین آپ یکجا کر کے کتاب کی شکل میں دے دیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ عکس اور تنقید کا امتزاج اور پھر اُس پر آپ کا دل چھو لینے والا اندازِ بیان، ان مضامین کو ایک عجب جِلا بخشتا ہے جو صرف آپ ہی کا حصہ ہے۔

بجاج الیکٹریکلس۔ پوسٹ بکس ۲۶۸۔ کانپور — **ستیش بترا**

○ "شاعر" (جلد ۴۸ شمارہ $\frac{8}{9}$) نظر افروز ہوا۔ مجھے یاد نہیں پڑتا ابھی تک گوشۂ شخصیات میں دل کو چھو لینے والا کوئی ایسا مضمون شائع ہوا ہو جیسا "جاں نثار اختر مرحوم — آخری نقشِ خاکِ خیرآباد" ہے۔ دراصل جاں نثار اختر کے لئے آپ کی محبت، آپکا خلوص، آپ کے تعلقات کی گہرائی اور یگانگت نے دلوں کو گرمانے والی آب و تاب پیدا کر دی ہے۔ یہ آپ کے دل کے زخم ہیں جو مہک اُٹھے ہیں۔ یاد نہیں پڑتا، جاں نثار اختر کو میں نے کبھی دیکھا ہو۔ آتشِ سیال سے جھلسا ہوا چہرہ جس میں خون کی کمی اور نشہ کی فراوانی کو اُن کے بے جان فوٹو بھی نہیں چھپا سکتے، میرے لئے ایک جیتا جاگتا انسان بن گیا تھا، جس سے میں برسوں سے آشنا تھا۔ اختر کو میں کبھی صفیہ سے علیحدہ کر کے نہیں دیکھ سکا۔ شوہر پرست بیوی جس نے بچوں کی پرورش کا بار تنہا اٹھایا۔ خود اختر کی کفالت کی اور بالآخر اپنے آپ کو اُس پر نثار کر دیا اور جس بے مثال محبت اور قربانی کا صلہ اُس کو چند خوبصورت الفاظ کی نظم کے سوا اور کچھ نہ ملا۔ "زیرِ لب" جب کبھی نظر سے گذرتی ہے تو بے اختیار آہ نکل جاتی ہے اور عورت کی بے بسی اور مظلومیت پر دل کڑھنے لگتا ہے۔ مجھے نہیں معلوم کن تلخ حالات کے تحت اختر نے بادہ و جام کا سہارا لیا لیکن اُن کی شاعری میں جو سوز و گداز و درد و داغ ملتا ہے، وہ محض شراب کی دین نہیں۔ اُن کے نرم اور دھیمے لہجہ میں جو طفلانہ معصومیت ہے وہ فلسفہ و حکمت کی بڑی سے بڑی نکتہ آفرینیوں پر بھاری ہے۔ مجھے مسرت کے ساتھ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ آپ نے اُن کی سادگی اور پُرکاری، دل سوزی اور دردمندی کو بڑی کامیابی سے نمایاں کیا ہے اور جب آپ کی بیماری اور جسمانی تکالیف کا خیال آتا ہے تو آپ کے فن کارانہ اعجاز پر ایمان لانا پڑتا ہے۔ خدا کرے اب آپ کی تکالیف کم ہو گئی ہوں

نادر بخش اینڈ کو۔ فیروزآباد (ضلع آگرہ) — **محمد عظیم فیروزآبادی**

○ تازہ شمارے میں جاں نثار اختر مرحوم کے بارے میں آپ نے جو کچھ لکھا ہے، وہ مرحوم کے ساتھ آپ کے مخلصانہ تعلقات کا اظہار بھی ہے اُن کی شخصیت اور شاعری کا بھرپور جائزہ بھی اور بعض پہلوؤں سے عبرت آموز بھی۔ اس سے زیادہ پُراثر کوئی اور تحریر میری نظر سے نہیں گذری۔

ماہنامہ تحریک، ۸ انصاری مارکیٹ۔ دریا گنج۔ نئی دہلی ۲ — **مخمور سعیدی**

○ شمارہ $\frac{8}{9}$ (۱۹۷۶) ملا۔ "بیادِ جاں نثار اختر مرحوم" میں آپ نے وہ سب کچھ کہہ دیا ہے جو بقول شاعر ؎

سمٹے تو دلِ عاشق، پھیلے تو زمانہ ہے

مرحوم کی ذاتی و شعری خوبیوں کا بڑی ہم سوزی سے آپ نے جائزہ لیا ہے

پرنسپل ایس ایس کالج۔ ہیلاکنڈی (آسام) — **(ڈاکٹر) تارا چرن رستوگی**

○ جاں نثار اختر میرے ہم عمر تھے، اس لئے اُن کی اچانک موت سے بے حد صدمہ پہنچا۔ جاں نثار اختر پر آپکا مضمون پڑھا، بے حد پسند آیا۔ اس سے اچھی اُن کی قلمی تصویر ممکن نہیں۔

لال کوٹھی۔ کاج گاؤں (ضلع جون پور) — **وامق جونپوری**

○ "شاعر" کا تازہ شمارہ کل موصول ہوا۔ حسن الدین احمد صاحب کا گوشہ موزوں اور معیاری ہے۔ جاں نثار اختر پر آپکا تاثر بڑا پُراثر ہے۔ گوکہ یہ جی چاہتا تھا کہ کچھ اور تاثرات کے لئے بھی گنجائش نکلتی۔

ای $\frac{184}{2}$ پروفیسرز کالونی۔ بھوپال ۲ — **(ڈاکٹر) سیّد حامد حسین**

○ "شاعر" کا تازہ شمارہ موصول ہوا۔ جاں نثار اختر مرحوم پر آپکا جذباتی مضمون کافی اثر انگیز ہے۔ مگر آپ نے "فن اور شخصیت" کے خاص نمبر کے

لکھا ہے۔ وہ شاید ضروری نہیں تھا۔ اس نمبر کے پیچھے تو ہرگز یہ جذبہ نہیں
یہ اُن کے لئے منحوس ثابت ہو۔ مرحوم خود بہت خوش تھے کہ اُن کے
ے ہوئے اُن کی ذات اور شاعری پر اتنا خوبصورت نمبر نکل رہا ہے۔
تا ہے یہ خوشی اُن کے بیمار دل کے لئے مہلک ثابت ہوئی ہو۔ بہرحال
اس حوالہ یا اشارہ کو اپنے مضمون میں شامل نہ کرتے تو اچھا تھا۔

ر لینگویجز آرٹس اینڈ کلچر۔ پری محل۔ شملہ — **سُرِیندر ناتھ ورما**

) اگست اور ستمبر ۱۹۷۶ء کا مشترکہ شمارہ پیشِ نظر ہے۔ ستمبر کے ماہ کا
د کھلا ہوا ہے مضمون "جاں نثار اختر۔ آخری نقش خاک خیرآباد"
یہ پڑھ چکا ہوں لیکن سیری نہیں ہوتی۔ آپ نے مضمون کیا لکھا ہے،
نثار اختر کی ممی بنادی ہے اور ایسی پختہ ممی بنائی ہے کہ شاید
بل میں اُس کو مرمت کے لئے فرانس نہ بھیجنا پڑے۔
یرا بھی جذباتی لگاؤ جاں نثار اختر سے رہا ہے۔ دو سال علیگڈھ میں
ے میں اُن کے ساتھ گزارے۔ میں آفتاب ہوسٹل میں رہتا تھا اور
گریجویٹ اُردو سیمینار لائبریری برائے طلبہ بی۔ اے (آنرز) اور
ے کا انچارج تھا۔ وہ "تہذیب الاخلاق" پر ایک مقالہ لکھ رہے تھے۔
بری کے بند ہونے کے وقت زیادہ تر تشریف لاتے تھے اور پُرانے
وں کے مختلف شمارے طلب کرتے تھے۔ اس میں کافی وقت لگتا تھا۔
ں اُن کو پریشان کرتا تھا۔ بغیر تازہ نظم سُنے کوئی کتاب یا رسالہ نہ نکالتا۔
سانسی لیکچرار ہوکر پہونچا تو جاں نثار وکٹوریا کالج گوالیار میں اُردو
رار تھے۔ ۳۱ جنوری ۱۹۴۳ء کے کالج کے سالانہ مشاعرہ میں میری
ر پر جھانسی آئے اور دو نظمیں "مسافر" اور "کارواں" سُنائیں۔ میں نے
ذکر اپنی خود نوشت میں کیا ہے۔ جب گورنمنٹ کالج مُرادآباد میں تبدیل
آیا تو جاں نثار بھوپال سے بمبئی جا چکے تھے اور آرکیڈ یا بلڈنگ بائیکلہ
تھے۔ اُن کی شاعری پر ۱۹۵۲ء میں میرا مضمون "آجکل" میں شائع
تھا۔ اُنھوں نے اُس کے ایک حصے سے اختلاف کیا تھا اور یہ

بجہ اُس اشارہ میں کوئی بُرا جذبہ شامل نہیں ہے۔ لاشعور میں کوئی بات تھی جو
سے نکل گئی۔ اس لئے کہ عام طور سے زبان پر یہی بات ہے۔ جن دنوں "نقوش" کے
بھی یہی ہوا تھا۔ "فن و شخصیت" کے "جنوری نامہ نمبر" کا کام جنوری نامہ
مرگ ہی میں شروع ہوا تھا۔
دنوں ملاقات کو ہم صرف اتفاق کہہ سکتے ہیں۔ نقوش، ساغر، ارشاد، اشخاص
ت اور جاں نثار کے سعد و نحس ہونے پر خاص بحث بھی اتفاق کیا ہے۔ اس نہ
مثالیں عام طور پر سامنے آتی رہتی ہیں۔ — **اعجاز صدیقی**

ت بمبئی

خط و کتابت شروع ہو گئی۔ بہت جلد راضی ہو گئے۔
آپ صفحہ ۵ کالم ایک میں لکھتے ہیں "اور مولانا احسن مارہروی کے بعد رشید احمد صدیقی صدر شعبۂ اُردو مقرر ہوئے تھے"۔ یہ صحیح نہیں ہے۔ مولانا احسن یونیورسٹی انٹرمیڈیٹ کالج ختم ہو جانے پر یونیورسٹی کے شعبۂ اُردو میں بحیثیت سینیئر لیکچرار کے آئے تھے۔ رشید احمد صدیقی صدرِ شعبہ تھے اور مولانا احسن ۱۹۳۸ء میں لیکچرار کی جگہ سے ریٹائر ہوئے۔ میں نے جولائی ۱۹۳۸ء میں ایم۔ اے۔ میں داخلہ لیا تھا اور مولانا کی الوداعی پارٹی میں موجود تھا۔
آخر میں کتابیات میں اضافہ کر لیجئے۔ جاں نثار اختر کے ایک اور ایک شعر حرفِ آشنا۔

محلہ سوتھہ۔ بدایوں — **مُبشّر علی صدیقی**

○ عین عالمِ انتظار میں "شاعر" کا مشترکہ شمارہ (اگست ستمبر ۱۹۷۶ء) ملا۔ جاں نثار اختر پر آپ کا مضمون بیحد تاثراتی ہے۔ اس کو پڑھ کر ایک طرف اختر مرحوم کا پیکر نگاہوں میں پھر جاتا ہے اور دوسری طرف اُن کے فن و شخصیت کی کئی تہیں کھُلتی ہیں۔ آپکی نثر میں جو سادگی، صفائی اور ایجاز کا حسن ہوتا ہے، اُس کی داد نہ دینا سراسر ناانصافی ہے۔ ہمارے بہت سے نقاد تنقید کے نام پر انشائیے لکھتے ہیں۔ اُن کے لئے یہ نثر نمونہ کا کام دے سکتی ہے۔ آپ اپنے مضامین کو یکجا کیوں نہیں کر دیتے؟ ابھی تک مجموعۂ کلام بھی شائع نہیں کیا؟ پہلی فرصت میں اس طرف توجہ فرمائیے۔ یہ قوم کا سرمایہ ہے۔ اسے شائع کر کے قوم کو سونپ دیجئے۔
گوشۂ صالحہ عابد حسین کی مقبولیت کا اندازہ اُن خطوں سے ہوا جو زیرِ نظر "شاعر" میں "مکتوبات" کے تحت شائع ہوئے ہیں۔ چند احباب نے مجھے بھی براہِ راست خط لکھے ہیں۔ دراصل "شاعر" کے بیشتر گوشے اسی طرح مقبول ہوئے ہیں۔ زیرِ نظر شمارے میں جناب حسن الدین احمد صاحب کا گوشہ بھی خاصا دلکش ہے۔ نثار احمد فاروقی کا مضمون، مجتبیٰ حسین کا خاکہ اور محمود سعیدی کا انٹرویو بہ اشتراک مظفر حنفی خوب ہیں۔ ادھر میں کئی ماہ سے یہ سوچ رہا ہوں کہ کاش آپ غزلوں اور مضامین کے انتخاب میں ذرا سی احتیاط اور برتیں۔ ہمارے بعض شاعر "شاعر" کا مزاج دیکھ کر تخلیق روانہ کر دیتے ہیں۔ اس طرح ایسے فنکاروں کی شاعری کی اپنی انفرادیت نمایاں نہیں ہونے پاتی۔ اسی طرح رسالے میں ہر قسم کا لٹریچر شائع کرنے سے اس کے مخصوص مزاج کی تشکیل نہیں ہو پاتی ہے۔ "شاعر" کا اپنا ایک خاص مزاج ہے۔ آپ اس مزاج کے پیشِ نظر مضامین لکھوائیے اور شعری تخلیقات کے انتخاب میں مزید احتیاط

نا... مقصد یہ تھا کہ جاں نثار اختر نے رشید احمد صدیقی ہی سے ادبیات کی تعلیم حاصل کی تھی

سے کام لیں تو اچھا ہے ــــــــ آپ نے اُردو کے ادبی اور علمی رسالوں کی امداد کی جو تجویز پیش کی ہے، وہ بہت اہم اور بروقت ہے۔ اِس تجویز کو منوانے کے لئے ملک کے ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں کو اُردو اکاڈمیوں کے سربراہوں کو خطوط لکھنے چاہئیں اور جلسوں میں قرار دادیں پاس کر کے ارسال کرنے چاہئیں۔ اگر اُردو کے معیاری رسالوں کو اقتصادی بحران سے نہ بچایا گیا تو ممکن ہے اُردو صحافت میں ایک ہولناک خلا پیدا ہو جائے۔ اور بعد میں کفِ افسوس ملنا پڑے۔

ڈاکٹر عنوان چشتی
ریڈر شعبۂ اُردو۔ جامعۂ ملیۂ اسلامیہ۔ نئی دہلی ۲۵

○ اگست ستمبر کا مشترک شمارہ نظر نواز ہوا۔ جاں نثار اختر کی موت پر آپ کا مضمون بڑا معلوماتی ہے۔ جاں نثار اختر کی اچانک موت نے ہزاروں دلوں کو دُکھا کر رکھ دیا ہے۔ بڑی مشکل سے بھُلایا جا سکے گا اِس شخص کے غم کو!

آپ نے سچ لکھا ہے کہ وہ آپکی بات مانتے تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ایک بار جب میں بڑودہ کے ایک مشاعرے کے سلسلے میں بمبئی آیا تھا اور آپ نے فون پر اختر صاحب کو میرے آنے کی اطلاع دی تھی اور اُنھوں نے مجھے اپنے مکان پر بُلوا لیا تھا۔ بہت سی باتوں کے بعد جب مشاعرے کے بارے میں بات ہوئی تو کہنے لگے بھئی خلشؔ میرے بارے میں آپکو جو بھی طے کرنا ہے وہ آپ اعجاز صاحب سے طے کرلیں۔ اِس سلسلے میں میری باگ ڈور اعجاز صاحب کے ہاتھ میں ہے، وہ جدھر چلاتے ہیں میں اُدھر چلتا ہوں۔ کتنا خلوص اور احترام تھا اُن کے دل میں آپ کے لئے۔

اس بار گوشۂ حسن الدین احمد پڑھنے کو ملا۔ گوشے کا سلسلہ اتنا مفید اور معلوماتی ہوتا ہے کہ فن کار کی شخصیت اگر پوری طرح اُبھر کر سامنے نہیں آتی تو ہلکی ہلکی جھلکیاں ضرور نظر آجاتی ہیں اور آج کے دور میں یہ بھی غنیمت ہے۔

حسن الدین احمد سے متعلق مجتبیٰ حسین کا خاکہ کافی دلچسپ ہے۔ خاکہ لکھنے کا اُن کا ڈھنگ بڑا پیارا ہوتا ہے۔ اِس سے پہلے مجھے عمیق حنفی کا خاکہ "آدمی در آدمی" بہت پسند آیا تھا۔ وہ اپنے مزاحیہ انداز میں بڑی نکیلی اور پیاری باتیں کہہ جاتے ہیں۔

"شاعری کا تخلیقی عمل" "غزل کا سُکھ" بہت خوب ہیں۔ "جُوتا" بھی بُرا نہیں۔ نازش پرتاب گڈھی، مظفر حنفی، حرمت الاکرام کی غزلیں اچھی ہیں۔ کرشن موہن کی غزلیں نامانوس اور ثقیل قافیوں کی وجہ سے بوجھل اور بے کیف ہو کر رہ گئی ہیں۔ انجم مظہری کی غزل کی ردیف کا شعر سے کوئی تعلق نہیں۔ قافیئے ہی سے بات پُوری ہو جاتی ہے۔ ردیف صرف وزن پورا کرنے کے لئے معلوم ہوتی ہے۔

خلشؔ بڑودوی
یعقوب پُورہ۔ بڑودہ۔ (گجرات)

○ جاں نثار اختر پر آپ کا مضمون بہت جامع ہے اور بہت ڈوب کر لکھا گیا ہے۔ خاص طور پر اُن کے خاندانی پس منظر اور ماحول کا آپ نے بُرا اچھا احاطہ کیا ہے

خلیل الرحمٰن اعظمی
اُردو باغ۔ سر سیّد نگر۔ علی گڑھ

○ اِس بار "شاعر" میں جاں نثار اختر پر آپ کے مضمون میں ایک جملہ (ندا فاضلی کی شوخی کو دخل تھا) کا تعلق مجھ سے بالکل نہیں ہے۔

اختر صاحب میرے بزرگ تھے۔ میں اُن کا احترام کرتا تھا۔ میری شوخی بزرگوں کی دل آزاری کے لئے ہرگز نہیں[س]

ندا فاضلی
بی ۲۰۵/۳ گورنمنٹ کالونی۔ باندرہ (ایسٹ) بمبئی ۵۱

○ جاں نثار اختر پر آپ کا مضمون بہت اچھا لگا۔

شہریار
فیصل ولا۔ سرسیّد نگر۔ علی گڑھ

○ جاں نثار اختر پر آپکا مضمون پڑھا۔ دو مقام پر آپ نے بڑے دکھ سے تحریر فرمایا ہے کہ حقیقت پسندی کا پرچار کرنے والے (یعنی ادیب، شاعر، قلم کار اور اسی طرح کے لوگ جو مرحوم جاں نثار کے گھر اُن کی دید و شرکت کے لئے آئے ہوئے تھے) حقیقت سے کتنی دُور تھے کہ اُن میں سے بیشتر شاداں اور ادبی مباحثوں میں مشغول تھے۔ ایک اور مقام پر تحریر فرمایا ہے کہ سانتا کروز کے قبرستان میں تدفین کے وقت شرکائے جنازہ تو کافی تھے مگر جنازے کی نماز میں دس بارہ افراد ہی شریک ہوئے۔ مجھے بھی اِس سے دُکھ ہوا۔

فیروز عابد
۳/۱۴ بتوار بگان لین۔ کلکتہ ۹

س۔ مجھے اِس کا اعتراف ہے کہ آپکی شوخی بزرگوں کی دل آزاری کے لئے نہیں ہوتی اور جس واقعہ کا میں نے اپنے مضمون میں ذکر کیا ہے، اُسے آپ یاد کریں گے تو میری بات کو غلط قرار نہیں دیں گے۔ صراحت بوجوہ مناسب نہیں۔ میری دلی تمنا ہے کہ آپ جاں نثار اختر پر مضمون لکھیں اور اُس میں وہ چند شوخیاں بھی آجائیں جن کا ذکر آپ نے مجھ سے اور دوسروں سے وقتاً فوقتاً کیا ہے۔ آپ بھی مرحوم اختر سے قریب رہے تھے۔

اعجاز صدیقی

گوشہ اور دیگر تخلیقات

○ شاعر کا شمارہ نمبر ۸، ۹ موصول ہوا۔ گوشۂ حسن الدین احمد حسبِ معمول مصنف کے فکر و فن اور زندگی کے اجمالی تعارف پر خاصا مواد فراہم کرتا ہے۔ یہ سلسلہ ادبی حلقوں میں کافی شہرت حاصل کر رہا ہے کیونکہ صفِ اوّل کے مصنفین کے علاوہ دیگر ہم عصر مصنفین کے بارے میں مواد مشکل ہی سے کہیں شائع ہوتا ہے۔ ادب کے طالب علموں کے لئے خصوصاً یہ سلسلہ بہت مفید اور کارآمد ہے۔ زیرِ نظر شمارے کے سرورق پر مصنف کی تصویر سے کہیں بہتر تو وہ کارٹون ہے جو اندرونِ صفحہ شائع ہوا ہے۔ خاکہ نگاری تو اس دور میں جیسے مجتبیٰ حسین کا خاص حصہ بن کر رہ گئی ہے۔ تمکین حنفی پر اُن کا خاکہ ابھی ذہن میں تازہ ہی تھا کہ "حسن الدین احمد۔ لفظوں کا آدمی" نے تازگیٔ فکر و نظر کے نئے نئے دریچے کھول دیئے۔ موضوع بالا کی کہانی "ایک دھنک" (ترجمہ جاجیندر اقبال) بڑی جاندار اور موثر لگی۔ بوڑھے فنکار کی ناقدری کے موضوع پر یہ تخلیق مصنف (یا مصنفہ) کی چابک دستی، دروں بینی اور نفسیاتی حقیقت نگاری کی روشن مثال ہے

۹۷، پریڈ۔ کانپور ۔۔۔ نامی انصاری

○ "شاعر" کا تازہ شمارہ نگاہ سے گزرا۔ یہ دہرانا لاحاصل ہے کہ کافی دنوں سے آپ بہت خوبصورت رسالہ نکال رہے ہیں جس کی سیرت پہلے بھی غیر متنازعہ فیہ تھی۔

گوشۂ حسن الدین احمد بھی خوب ہے مگر اُن کا فوٹو بہت خوب ہے۔ ویسے تو حسن الدین احمد کئی جہتوں کے آدمی ہیں لیکن آپ کے پورے گوشے پر الفاظ شماری طاری ہے۔ پانچ میں سے چار مضامین الفاظ شماری کے محور پر گردش کرتے نظر آتے ہیں۔ مجتبیٰ حسین کا خاکہ شاید پورے گوشے کی جان ہے اور سب سے زیادہ پڑھنے کے لائق چیز۔ اس خاکہ کے توسل سے ایک گوشت پوست کا سانس لیتا آدمی مع اپنے اخلاق و آداب اُبھرتا ہے۔ مجتبیٰ حسین کے پچھلے خاکوں کے پیشِ نظر میں سمجھتا ہوں اُنھوں نے حسن الدین احمد کے تئیں خاص رعایت کو روا رکھا ہے اور خاکہ روئی کے گالوں پر لکھا ہے۔ نثار فاروقی کا مضمون بھی اچھا ہے۔

ترقی اردو بیورو۔ ویسٹ بلاک ۸، آر کے پورم نئی دہلی ۱۱ ۔۔۔ انوار رضوی

○ جناب مجتبیٰ حسین الدین احمد کا اگست والا شمارہ خوب ہے۔۔۔ آپ نے اپنے خالص ادبی ماہنامے "شاعر" میں ستمبر ۸۶ء سے شامل مجتبیٰ فنونِ لطیفہ کے ارتقاء کی نظر سے "فن اور فنکار" کا عنوان قائم کر کے نہ صرف اُردو والوں کی دلچسپی کے سامان مہیا کئے ہیں بلکہ ممتاز فنکاروں کے فنی کے فنی اختراعات اُن کے خم چم میں اضافے کی نشاندہی کی ہے۔ اس اقدام پر میری دلی مبارکباد قبول فرمائیے۔

جناب شاہد میر کا حقیقت آفریں مضمون "غزل گائیکی" بے حد پسند آیا۔ اُنھوں نے بجا کہا ہے کہ "جب تک ہندوستانی سنگیت زندہ رہے ہے غزل گائیکی بھی پورے وقار کے ساتھ زندہ رہے گی" کیونکہ ہلکی دھن پر کہ کلاسیکی پیرایہ میں کوئی نہ کوئی غزل پوری طرح سما سکتی ہے۔ بشرطیکہ فنکار لا یعنی سُریلی دُھن کی بجائے غزل کو اپنا کر اپنے فن کو معنی خیز بنا دے۔ اس طرف میں نے متعدد فنکاروں کو بارہا توجہ دلا کر ہر ایک راگ اور راگنی میں چھوٹی اور بڑی بحروں کی غزلیات رنگ ہیج پر گوا کر وجدان کا لطف اٹھایا ہے اور آج بھی اُٹھا رہا ہوں۔

مہر مسکن۔ مُلتانی پورہ بیگم بازار حیدرآباد ۔۔۔ منجو قمر

○ "شاعر" کے ادبی گوشے ہر شمارے کے ساتھ نکھر رہے ہیں۔ حسن الدین احمد صاحب سے آپ کی بدولت ملاقات ہو گئی ورنہ بہت ممکن تھا کہ اُن کی الفاظ شماری جیسے اہم پہلو سے غافل ہی رہتا۔

مجتبیٰ حسین صاحب کا مضمون بے حد پسند آیا۔ یوں تو میں ہمیشہ سے اُن کی شوخ تحریر کا قائل رہا ہوں لیکن اس مضمون میں اُنھیں بھی قریبی طور سے جاننے کا موقع ملا۔

بجاج الیکٹریکلس۔ کانپور ۔۔۔ ستیش بترا

○ حسن الدین احمد صاحب کی شخصیت بڑی پہلودار ہے اور اس کا احاطہ عام لوگوں کے لئے مشکل ہی ہے مگر مجتبیٰ حسین نے بڑی مہارت دکھائی ہے خاکہ حسبِ حال ہے پڑھ کر جی خوش ہوا۔ ثنا احمد فاروقی صاحب کا مضمون الفاظ شماری سے متعلق معلوماتی ہے۔ البتہ برق موسوی پڑنے رہائشی رہے ہیں اُن سے زیادہ توقعات وابستہ تھیں۔ حیرت ہے انجمن کے بارے میں کسی نے کچھ نہیں لکھا ہے۔ یہاں تو مجتبیٰ بھی دامن بچا گئے۔ حالانکہ حسن الدین احمد صاحب کی خاکہ نگاری کے بارے میں بھی وہ کچھ کہہ سکتے تھے۔ بہرحال اس اچھے گوشہ کی اشاعت پر آپ کو اور اچھا خاکہ لکھنے پر مجتبیٰ حسین کو دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

ایوان شاہی کالونی۔ گلبرگہ ۔۔۔ طیب انصاری

شکر و سپاس
(۲)

ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی (علیگڈھ)

آپ کو مہاراشٹر اکیڈمی نے جو ایوارڈ دیا ہے، اُس کے آپ بہت پہلے سے مستحق تھے، میں آپ کو نہیں اکیڈمی کو مبارکباد دیتا ہوں کہ اُس نے آپکی خدمات کا اعتراف کیا۔

اکرام جاوید (حیدرآباد)

مہاراشٹر اُردو اکاڈمی نے آپ کی خدمات کے اعتراف میں آپ کو خصوصی ایوارڈ دیا ہے۔ اس خبر سے دلی مسرت ہوئی اور اس دلی مسرت کا اندازہ آپ کر سکتے ہیں۔ الفاظ کی شکل میں مجھ سے اس کا بیان مشکل ہے۔ لیکن ایک مہاراشٹر اُردو اکاڈمی ہی کیوں، ملک کی تمام اُردو اکیڈمیوں کو بھی آپ کی ۴۵ سالہ خدمات، اُردو زبان اور اُس کے ادب کے لئے بے لوث اور گرانقدر مساعی کا اعتراف کرنا چاہئے اور میرے خیال میں اس کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ ملک کی دیگر اُردو اکیڈمیوں کی جانب سے ماہنامہ "شاعر" کے لئے قابلِ لحاظ رقم سالانہ امداد کے طور پر ایصال کی جائے۔ تاکہ آپ مزید بہتر اور موثر انداز میں اُردو زبان اور اُس کے ادب کی خدمت کر سکیں۔

کوثر چاند پوری (دہلی)

آپکو مہاراشٹر اُردو اکاڈمی نے ایوارڈ دیا ہے۔ بہت مسرت ہوئی مخلصانہ مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ آپکی ادبی خدمات کا یہ ادنیٰ سا اعتراف ہے۔ خدا کرے جلد وہ دن آئے جب آپکو اور "شاعر" کو مستقل ماہانہ امداد ملنے لگے۔

ستیش بترا (کانپور)

بیحد خوشی ہوئی کہ مہاراشٹر اُردو اکاڈمی نے آپکی گرانقدر ادبی اور خصوصاً اُردو سے متعلقہ خدمات کے لئے آپ کو نوازا۔ سچ بات تو یہ ہے کہ اس سے اکاڈمی کی اپنی ہی قدر و عزت میں اضافہ ہوا ہے۔ میری طرف سے مبارکباد قبول کیجئے۔ دعا کرتا ہوں کہ کُل ہند اکاڈمیوں کی بیٹھک اُردو رسالوں کی امداد اور سرپرستی والی آپ کی تجویز کا بھی خیر مقدم کرے اور اُسے عملی جامہ پہنائے۔ لیکن اس سے بھی زیادہ ضروری یہ بات ہے کہ اکاڈمیاں اُردو زبان سیکھنے اور پڑھنے والوں کی تعداد میں اضافہ کریں تاکہ ادبی رسائل کو پڑھنے والے برابر ملتے رہیں اور یہ رسائل محض کسی عجائب گھر کی زینت نہ بنیں۔

مظہر امام (سرینگر)

مہاراشٹر اُردو اکاڈمی کے انعام کے لئے آپ کو مبارکباد نہیں دوں گا۔

یہ رقم آپکی خدمات کے مقابلے میں بہت حقیر ہے۔ بہرحال اکیڈمی کو اس کا احساس ہوا، یہی کیا کم ہے۔ میں اس کے لئے اکیڈمی کو مبارکباد دیتا ہوں۔

وامق جونپوری (کاج گاؤں)

مہاراشٹر اُردو اکاڈمی نے آپکی ادبی خدمات کے صلہ میں آپکو جو انعام دیا ہے وہ دیر آید درست آید کا مصداق ہے۔ بڑی ہی مسرت ہوئی۔ میں تو اس سے کہیں زیادہ بڑے انعامات کا آپکو مستحق سمجھتا ہوں۔

مخمور سعیدی (دہلی)

مہاراشٹر اُردو اکاڈمی کی طرف سے آپکی ادبی خدمات کے اعتراف پر مسرت کا اظہار کرنا چاہتا ہوں۔ اس اعتراف کے لئے آپ سے زیادہ اکاڈمی مبارکباد کی مستحق ہے کہ اُس نے ایک بہت صحیح فیصلہ کیا۔

بلراج کومل (دہلی)

مجھے دلی مسرت ہے کہ اکیڈمی نے آپ کی ادبی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے آپ کو انعام سے نوازا ہے۔ میری دلی مبارکباد قبول فرمائیے۔

ڈاکٹر سید حامد حسین (بھوپال)

مہاراشٹر اُردو اکاڈمی نے آپ کی جو عزت افزائی کی۔ اُس کے لئے میری جانب سے مبارکباد قبول فرمائیے۔ آپ نے جس طرح اُردو کے معیاری ادب کو اپنے خونِ جگر سے سینچا ہے اور جس طرح اپنی ساری ذہنی اور جسمانی قوت کو اس مقصد کے لئے وقف کیا ہے۔ اُس کے لئے عزت افزائی بہت پہلے ہونا چاہئے تھی۔

ڈھی کمار (ضلع)

یہ جان کر ازحد خوشی ہوئی کہ مہاراشٹر اُردو اکاڈمی کی طرف سے آپ کو ایک خصوصی ایوارڈ ملا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ اُردو زبان کی طرف حکومتوں اور اچھے لوگوں کا دھیان بڑھ رہا ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو یہ امر کافی قابلِ ذکر ہے۔

رشید الدین (حیدرآباد)

مہاراشٹر اُردو اکیڈمی کی جانب سے آپکی ۴۵ سالہ ادبی اور صحافتی خدمات کے صلہ میں پانچ ہزار روپے کے گرانقدر انعام کا اعلان پڑھا اور آپ کو یہ خط لکھنے بیٹھ گیا۔ میری طرف سے مبارکباد قبول فرمائیے۔

واحد پریمی (بھوپال)

اس خبر سے دلی مسرت ہوئی کہ مہاراشٹر اُردو اکاڈمی نے آپکی ادبی اور صحافتی خدمات کا اعتراف نقد انعام کی صورت میں کیا ہے۔ میری طرف سے دلی مبارکباد قبول فرمائیے۔ درحقیقت آپ اس کے مستحق تھے۔ خدا کرے

آپ ایسے بیسیوں انعام اور اعزاز حاصل کریں۔ (آمین)
دسمبر ۸۵ء سے حکومت مدھیہ پردیش نے مجھے بھی سو روپے ماہانہ وظیفہ دینا شروع کر دیا ہے۔ یہ سب جمیلہ شفا گوالیاری مرحوم کی شفقت و رہبری اور آپ جیسے بزرگوں کی دعاؤں کا نتیجہ ہے۔

ابراہیم اختر (بمبئی)

مہاراشٹر اُردو اکیڈمی کی طرف سے آپ کی ناقابلِ فراموش خدمات کے صلہ میں آپکو جو انعام ملا ہے اُس کے لئے دلی مبارکباد قبول فرمائیے۔

ناز قادری (بروراج بنظفرپور)

مہاراشٹر اُردو اکاڈمی کے خصوصی انعام کی خبر موجبِ مسرت ہے۔ اُردو ادب و صحافت کی خدمت کا یہ صلہ آپکو بہت پہلے ملنا چاہئے تھا۔ ہر چند یہ رقم آپکی خدمات کے پیشِ نظر حقیر سی ہے۔ لیکن اِس کا احساس قابلِ تحسین اور وجہِ انبساط ہے۔ میری جانب سے اُردو اکاڈمی اور آپ مبارکباد قبول فرمائیے خدا آپ کو عمرِ خضر عطا فرمائے۔

شاہد میر (بانسواڑہ)

مہاراشٹر اردو اکاڈمی نے آپکو خصوصی ایوارڈ سے نوازا ہے۔ میری جانب سے دلی مبارکباد قبول کیجئے

اقبال فرید (میسور)

شہر میسور کے ایک روزنامہ "آفتاب کرناٹک" کے ذریعہ یہ رُوح افزا خبر پڑھ کر دل مسرت سے جھوم اٹھا کہ آپ کو مہاراشٹر اُردو اکیڈمی نے پانچ ہزار رُوپیوں کے خصوصی انعام سے نوازا ہے۔ آپ کی اُردو "خدمات" کے پیشِ نظر دیسے یہ رقم کم ہے، لیکن یہ کوئی معمولی رقم نہیں ہے بلکہ انعامی رقم ہے، بس نایہ ایک اعزاز ہے۔ میں اپنے دل کی گہرائیوں سے آپ کی خدمت میں مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ قبول فرمائیے۔

اندر پرتاپ نیّر (لدھیانہ)

.... خوشی اِس لئے کہ آپ کو ایوارڈ ملا، گو دیر سے ملا۔ دنیائے اُردو ادب کے لئے آپ کی خدمت کا یہ صلہ بہت کم ہے۔ ہاں اعزاز ہے اور اعزاز جیسا بھی ہو، اُس کے لئے اللہ کا اور دینے والے کا شکرگزار ہونا چاہئے۔ رنج اِس لئے کہ سب سے پہلے میری مبارکباد آپ کو پہنچنی چاہئے تھی ــ اور یہ سب سے آخر میں پہنچ رہی ہے۔

بانی (دہلی)

انعام ملنے پر میری مبارکباد قبول فرمائیے۔ مجھے ایسا لگا کہ یہ انعام
شاعر، بمبئی

آپکو نہیں بلکہ ہم سب شاعروں اور ادیبوں کو ملا ہے۔

ایس۔ایم حیات بادشاہ (مدراس)

مہاراشٹر اُردو اکیڈمی نے آپ کی ۴۵ سالہ ادبی خدمات کے اعتراف میں آپ کو پانچ ہزار روپے کے ایوارڈ سے نوازا ہے۔ بیحد مسرت ہوئی۔ میری جانب سے دلی اور پُر خلوص مبارکباد قبول فرمائیں۔
مہاراشٹر اُردو اکیڈمی کا یہ فیصلہ لائق صد ستائش اور دوسری اکیڈمیوں کے لئے حق شناسی کا داعی ہوگا۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کی ذاتِ گرامی ایسے کئی انعامات و اعزازات کے لئے مختص تسلیم کی جائے گی۔ خدائے پاک آپ کو کامل صحت عطا فرمائے تاکہ آپ اپنے جہاد میں سرگرم رہیں۔

نامی انصاری (کانپور)

مہاراشٹر اکاڈمی کے انعام کے سلسلے میں "مبارک سلامت" کے متعدد خطوط کی اشاعت سے "شاعر" کے عام قارئین بھی اندازہ لگا سکیں گے کہ مدیرِ "شاعر" کے دعاگو (بہ شمول راقم الحروف) جو سارے ہندوستان میں پھیلے ہوئے ہیں، اُس کے لئے کتنی محبت اور کتنا خلوص رکھتے ہیں۔

خلش بڑودوی (بڑودہ)

مہاراشٹر اُردو اکاڈمی کی جانب سے آپ کی علمی، شعری اور صحافتی خدمات کا اعتراف یقیناً قابلِ قدر ہے۔ آخر روشنی کب تک چھپ سکتی ہے؟!

جاں نثار اختر ـــ باقیات

ڈاکٹر محمد حسن (دہلی)

جاں نثار اختر پر آپکا مضمون پڑھا، بڑا لطف آیا۔ آپنے بڑے دلنشیں پیرائے میں اور لطیف انداز میں سبھی کچھ کہہ ڈالا ہے۔

آغا رشید مرزا (کلکتہ)

جاں نثار اختر کی یاد میں آپکا مضمون نہایت پُراثر ہے۔ بشر نواز کی نظم بھی حقیقت اور تاثر سے بھرپور ہے۔ آپکی پُر درد طرزِ تحریر سے آنسو ڈھلک کر بکھر پڑتے ہیں اور وہ آبلے پھوٹ کر بہہ نکلتے ہیں جنھیں آپ نے نوکِ قلم سے چھیڑا ہے۔ کتنے زخم اِن شعر و ادب پر مر مٹنے والوں کے ہیں جنھوں نے زندگی بھر گھُل گھُل کر اپنی ایک زندگی گنوا کر شعر و ادب کو زندگی بخشی۔
مجتبیٰ حسین کا مضمون "لفظوں کا آدمی" بہت خوب ہے۔ "جی ہو" کا لطف کچھ وہی لوگ لے سکتے ہیں جو وہاں کی تہذیب اور زبان سے واقف ہیں یا وہاں رہ چکے ہیں۔

نقد و نظر

- جدید ہندوستان کے معمار ۔ ابوالکلام آزاد
- عرشؔ ملسیانی
- پبلی کیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی ۔ ۱
- قیمت: ۵ روپے

ہندوستان کی سرزمین نے سنہ ۱۸۵۷ء کے بعد جن بڑے لوگوں کو جنم دیا اُن میں ایک مولانا ابوالکلام آزاد بھی تھے۔ اُنہوں نے اپنی زندگی ایک عالمِ دین کی حیثیت سے شروع کی۔ ابتدا میں اُن کا مخاطب زیادہ تر مسلمان اور اُن کی جولانگاہ زیادہ تر دینِ اسلام تھا، مگر اُن کا مطمحِ نظر بہت اُونچا اور اُن کے عزائم بہت بلند تھے۔ شاید مسلمان ان کی اس فکری بلندی کو چھو نہ سکا لہٰذا اُدھر سے مایوس ہوکر اُنہوں نے قومی اور ملکی سیاست میں زیادہ سے زیادہ دلچسپی لینا شروع کردی اور چند ہی سالوں میں اپنی ذہانت، اپنی دُور اندیشی اور اپنے ایثار کی وجہ سے وہ قومی قیادت کا ایک اٹوٹ انگ بن گئے اور تحریکِ آزادی کے صفِ اوّل کے لیڈروں میں اُن کا شمار ہونے لگا۔ اور پھر وہ دن بھی آیا کہ جب اُن کی قربانیاں رنگ لائیں اور ہندوستان آزاد ہوگیا۔ لیکن اُس کے جو نتائج سامنے آئے وہ، وہ نہیں تھے جن کا اُنھوں نے خواب دیکھا تھا پھر بھی اُنہوں نے ہمت نہ ہاری اور اپنی زندگی کے باقی دن بھی اُنہوں نے جدید ہندوستان کی تعمیر میں صرف کردیئے۔

مولانا آزاد کی شخصیت جتنی بڑی تھی اتنی ہی مختلف فیہ بھی تھی۔ اُن کی زندگی میں اور اُن کے انتقال کے بعد اُن پر کافی لکھا گیا۔ موافقت میں بھی اور مخالفت میں بھی لیکن دونوں ہی میں جانبداری اور مبالغہ آمیزی کا عنصر اس قدر زیادہ تھا کہ یہ فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ کیا صحیح ہے اور کیا غلط۔ اسلئے ضرورت اس بات کی تھی کہ کوئی اپنے موقلم سے آزاد کی ایسی تصویر بنادے جو سچی ہو، دلکش ہو اور مبالغہ آمیزی سے پاک ہو۔ اور یہ کام اُردو کے نامور فنکار اور ملک کے نیک نام سپوت تلوک چند عرشؔ ملسیانی نے انجام دیا ہے اور بڑی خوبی سے انجام دیا ہے۔ چنانچہ زیرِ تبصرہ کتاب "ابوالکلام آزاد" انہیں کی کھینچی ہوئی صاف ستھری اور خوبصورت سوانحی تصویر ہے۔ گو کہ اُنھوں نے "عرضِ مصنف" میں لکھا ہے: "مولانا کے باب میں بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ ان کے مکمل سوانح اِدھر اُدھر کتابوں میں بکھرے پڑے ہیں، میرا کام انہیں یک جا کرنا تھا اور حتی الامکان دیانت داری سے جمع کرنا تھا، وہ میں نے کردیا" لیکن سچ یہ ہے بکھرے ہوئے سوانح کو دیانت داری کے ساتھ یک جا کردینا بھی کوئی آسان کام نہیں ہے، اس کو عرشؔ صاحب جیسا ایک سلیقہ مند قلمکار ہی انجام دے سکتا تھا۔

مولانا آزاد محض ایک عالمِ دین اور قومی لیڈر ہی نہیں تھے، بلکہ بحیثیت ادیب، شاعر، انشاپرداز، صحافی، مؤرخ، مصنف اور وزیر بھی تھے۔ انہوں نے زبان، ادب، قوم اور ملک کی بے انتہا خدمات انجام دی ہیں۔ فاضل مصنف نے اپنی اس کتاب میں آزاد کے حالاتِ زندگی مختصراً بیان کرنے کے بعد اُنکی اس رنگارنگ شخصیت پر بڑی خوبی سے روشنی ڈالی ہے۔ اور پھر اُس کی دلکشی میں مزید اضافہ کرنے کی غرض سے آخر میں نہ صرف یہ کہ پنڈت نہرو، ذاکر حسین، ہمایوں کبیر، خواجہ غلام السیدین، جے بی کرپلانی وغیرہ کے تاثرات دے دیئے ہیں بلکہ آزاد کی چند یادگار تحریروں اور تقریروں کا دلچسپ اقتباس بھی دیا ہے۔

بحیثیت مجموعی یہ کتاب آزاد کے تذکرے سے متعلق وقت کی ایک اہم ضرورت کو پورا کرتی ہے اور اب تک آزاد پر جو کچھ لکھا گیا ہے اُس میں سے الفاظ کے تنوع اور لکھنے والوں کے اُن کے اپنے نقطہ ہائے نظر کو نظرانداز کردیا جائے تو بلا مبالغہ ان سب کا خلاصہ اس میں موجود ہے۔ جو لوگ مولانا آزاد کی شخصیت کو غیر جانبداری اور انصاف کی نظر سے دیکھنا چاہتے ہیں اُن کے لئے یہ ایک قیمتی تحفہ ہے۔

شاہد بمبئی

- پروفیسر ہارون خاں شیروانی کی اُردو خدمات
- صادق نوید ـــ قیمت: ۵ روپے
- صادق نوید ۴-۸-۲-۱۲ ۔ آصف نگر ۔ حیدرآباد ۲۸

شیروانی خاندان کا نام اُردو دنیا کے لئے کچھ نیا نہیں ہے، اس خاندان کے اکثر افراد اپنا نام ہندوستان کی علمی و ادبی تاریخ میں ثبت کرچکے ہیں۔ چنانچہ حاجی موسیٰ خاں شیروانی سرسید کے ساتھی اور ایم۔ اے۔ او کالج علی گڑھ کے پہلے ٹرسٹی تھے۔ ان کے بڑے بھائی حاجی اسمٰعیل خاں شیروانی بھی سرسید کے بہت ہی قریبی ساتھیوں میں تھے اور اُن کے تعلیمی اور سماجی کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔ حبیب الرحمٰن خاں شیروانی جو نواب صدر یار جنگ کے نام سے مشہور تھے، مولانا آزاد کے گہرے دوست تھے، غبارِ خاطر کے تقریباً سبھی خطوں میں آزاد نے اُنہیں کو مخاطب کیا ہے۔ دکن کے موجودہ مشہور ادیب اور مترجم پروفیسر ہارون خاں شیروانی بھی اسی نیک نہاد اور بلند طینت خاندان کے چشم و چراغ ہیں اور دکن کی تاریخ پر سند کی حیثیت رکھتے ہیں۔

جیسا کہ نام سے ظاہر ہے زیرِ تبصرہ کتاب پروفیسر ہارون خاں شیروانی

کی اُردو خدمات کے جائزے پر مشتمل ہے۔ اس کے تین باب ہیں۔ پہلے باب میں شیروانی صاحب کے حالاتِ زندگی، دوسرے باب میں اُنکی تصانیف اور اُنکے تراجم کا تذکرہ اور تیسرے باب میں اُن کی اُردو خدمات پر مجموعی تبصرہ ہے۔ ابتدا میں "پہلی بات" کے نام سے خود مصنّف کا لکھا ہوا ایک تعارفی مضمون ہے اور پھر ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ کا پیشِ لفظ۔ اور آخر میں "کتابیات" کے نام سے اُن کتابوں اور رسالوں کی فہرست دی ہے جن سے اِس کتاب کے لکھنے میں اُنہیں مدد ملی ہے۔

"پہلی بات" کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب دراصل صادق نوید کا وہ مقالہ ہے جو اُنھوں نے سنہ ۱۹۷۴ء میں اپنے ایم۔ اے کے امتحان کے لئے لکھا تھا۔ اور پیش لفظ میں ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ نے تحریر فرمایا ہے:

"پروفیسر صاحب کی شخصیت ہزار رنگ جلوے رکھتی ہے۔ اُن کے عملی کارناموں کی داستان اُتنی ہی طویل ہے جتنی اُن کے نظری کارناموں کی فہرست، جہاں وہ اچھے مورّخ اور ماہرِ عمرانیات اور سیاسیات ہیں وہیں اُردو کے اچھے انشا پرداز بھی ہیں، اُنھوں نے اُردو میں عمرانی علوم کو منتقل کرنے کا بیڑا اُٹھایا اور بحسن و خوبی اِس فرض سے عہدہ برآ ہوئے۔ ایم اے کے طالب علم کے لئے اُن کے طویل اور کثیر کارناموں کا احاطہ کرنا خاصہ مشکل کام تھا لیکن مجھے خوشی ہے کہ صادق نوید صاحب نے دن رات کی محنت سے اِس مہم کو سر کر لیا۔"

صادق نوید بے شک شیروانی صاحب کی اُردو خدمات کا بھرپور جائزہ لیا ہے لیکن اِس سے شیروانی صاحب کی پوری شخصیت کھُل کر سامنے نہیں آتی، اور وہ ایک ایسے ادیب لگتے ہیں جن کا اردو دنیا سے باہر کوئی مقام نہیں ہے۔ یہ مقالہ امتحان کی حد تک تو اپنے موضوع اور مقصد کے مطابق ہے لیکن جب اُنہوں نے اِس کو کتابی صورت میں باقاعدہ شائع کیا ہے تو بہتر یہ ہوتا کہ آخر میں اُن کی تاریخی خدمات سے متعلق ایک باب کا اضافہ کر کے اِس کتاب کی افادیت کو اور بڑھا دیتے اِس لئے کہ اُن کا اصل کام جس نے اُنہیں عالمی شہرت عطا کی وہ اُردو سے زیادہ انگریزی میں ہے اور زبان سے زیادہ تاریخ اور خاص طور پر دکن کی اسلامی تاریخ سے تعلق رکھتا ہے۔

بہر حال ہمیں یہ کہتے ہوئے مسرّت محسوس ہوتی ہے کہ صادق نوید کا یہ مقالہ کافی معلوماتی ہے اور ایک ایسی شخصیت کے کارناموں کو ہمارے سامنے لاتا ہے جس نے پچاس سال تک نہایت خاموشی کیساتھ زبان اور علم کی خدمت کر کے دکن کا نیک نامی میں چار چاند لگائے۔

(ڈاکٹر) حامد اللہ ندوی

○○

رفتار

علمی، ادبی، اور تہذیبی خبریں

جامعۂ اُردو علیگڑھ کا سالانہ جلسۂ تقسیم اسناد

۲۶ر اکتوبر ۷۶ء کو علیگڑھ میں جامعۂ اُردو کا سالانہ جلسۂ تقسیم اسناد منعقد ہوا۔ اُتر پردیش کے وزیرِ اعلیٰ جناب نرائن دت تیواری نے جلسے سے خطاب کیا۔ اُردو اور جامعہ کی ترقی کے لئے ہر ممکن امداد کا وعدہ فرمایا۔ جامعۂ اُردو کی اپنی عمارت کے لئے ایک لاکھ روپے کا عطیہ دیا۔

جامعۂ اُردو کے چانسلر جناب ڈاکٹر رفیق زکریا وزیر حکومت مہاراشٹر نے اپنی تقریر میں یہ اُمید ظاہر کی کہ یہ ادارہ ایک دن "اُردو یونیورسٹی" کی شکل اختیار کرے گا۔

جامعۂ اُردو کی طرف سے اُردو کے بزرگ ممتاز و مشہور ادیب رشید احمد صدّیقی کو ڈاکٹرِ ادب کی اعزازی ڈگری پیش کی گئی۔

حیات اللہ انصاری ترقی اُردو بورڈ کے نئے چیرمین

اُردو کے مشہور افسانہ نگار و ناول نویس اور صحافی جناب حیات اللہ انصاری کو ترقی اُردو بورڈ، وزارتِ تعلیم حکومتِ ہند کا چیرمین بنایا گیا ہے۔ ڈاکٹر عبد العلیم کے انتقال کے بعد سے یہ جگہ خالی تھی۔ اُردو بورڈ کے چیرمین ہونے کے ساتھ ساتھ انصاری صاحب اُردو کے معاملوں میں حکومتِ ہند کے مُشیر بھی ہونگے۔ اُمید کہ اُن کی رہنمائی میں ترقی اُردو بورڈ مزید ترقی کریگا۔

ڈاکٹر گیان چند الہ آباد یونیورسٹی کے صدرِ شعبۂ اُردو

اُردو کے مشہور محقق اور ادیب ڈاکٹر گیان چند کو الہ آباد یونیورسٹی میں شعبۂ اُردو کا صدر بنایا گیا ہے۔ اِس سے پہلے موصوف جموں یونیورسٹی میں صدرِ شعبۂ اُردو تھے۔

مہاراشٹر اردو اکاڈمی کی طرف سے کتابوں پر انعامات

ادیبوں شاعروں اور مصنفوں کی حوصلہ افزائی کی اسکیم کے تحت اپریل ۱۹۷۵ء سے دسمبر ۱۹۷۶ء تک کی شائع شدہ کتابوں پر مہاراشٹر اُردو اکاڈمی نے انعامات دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ پہلا انعام دو ہزار روپے، دوسرا ایک ہزار روپے اور تیسرا پانچ سو روپے کا ہوگا۔

۱۔ یہ انعامات اُردو نظم (نظمیں، غزلیں) ۲۔ اُردو نثر (ناول، افسانہ، ڈراما) ۳۔ بچوں کا ادب ۴۔ تکنیکی ادب (سائنسی، علمی اور تنقیدی) ۵۔ صحافت پر مشتمل کتابوں کو دئے جائیں گے۔

مصنف کا ریاستِ مہاراشٹر کا باشندہ ہونا اور کتاب کا پہلا ایڈیشن ہونا ضروری ہے۔ ہر کتاب کی چھ جلدیں ۵ دسمبر ۷۶ء تک سکریٹری کے نام مصنف کے نام، پتے، موضوع اور تاریخ اشاعت کی صراحت اور اس تصدیق کے ساتھ کہ وہ مصنف کی اپنی تخلیق اور طبع زاد ہے ذیل کے پتے پر پہنچ جانی چاہئیں۔

سکریٹری مہاراشٹر اسٹیٹ اُردو اکاڈمی، سچیوالیہ، بمبئی ۳۲

شاعر۔ بمبئی۔

شاعر کا آئندہ شمارہ

نومبر۔ دسمبر سنہ ۱۹۷۶ء

مقالات

دولہ سخن (تحقیقی) ــــــ ڈاکٹر حامد اللہ ندوی

حالی اور اُن کا ماحول ــــــ رشید الدین

میری یادوں کے چنار ــــــ مجید مضمر

انحراف اور اُس کا شاعر ــــــ یونس اگاسکر

ایک طویل خط

جاں نثار اختر ــــــ عبد القوی دسنوی

کہانیاں

ایک شام اور وہ آدمی ــــــ (ہندی) ــــ دیویندر اِسّر

ــــــ ترجمہ : حیدر راحت

رنگوں کے مناد کا عاشق ــــــ انور قمر

جنگ ــــــ فیروز عابد

پنجرا ــــــ ظہیر کیفی امروہوی

آخری کشش ــــــ عبید قمر

انشائیہ

مَیں ہَوا ہوں ــــــ نریندر سنگھ بھاٹیا

ڈراما

دائرے اور دائرے ــــــ ممتاز شکیب

منظومات

اختر سعید ــ راہی قریشی ــ کرشن موہن ــ مشتاق وارثی

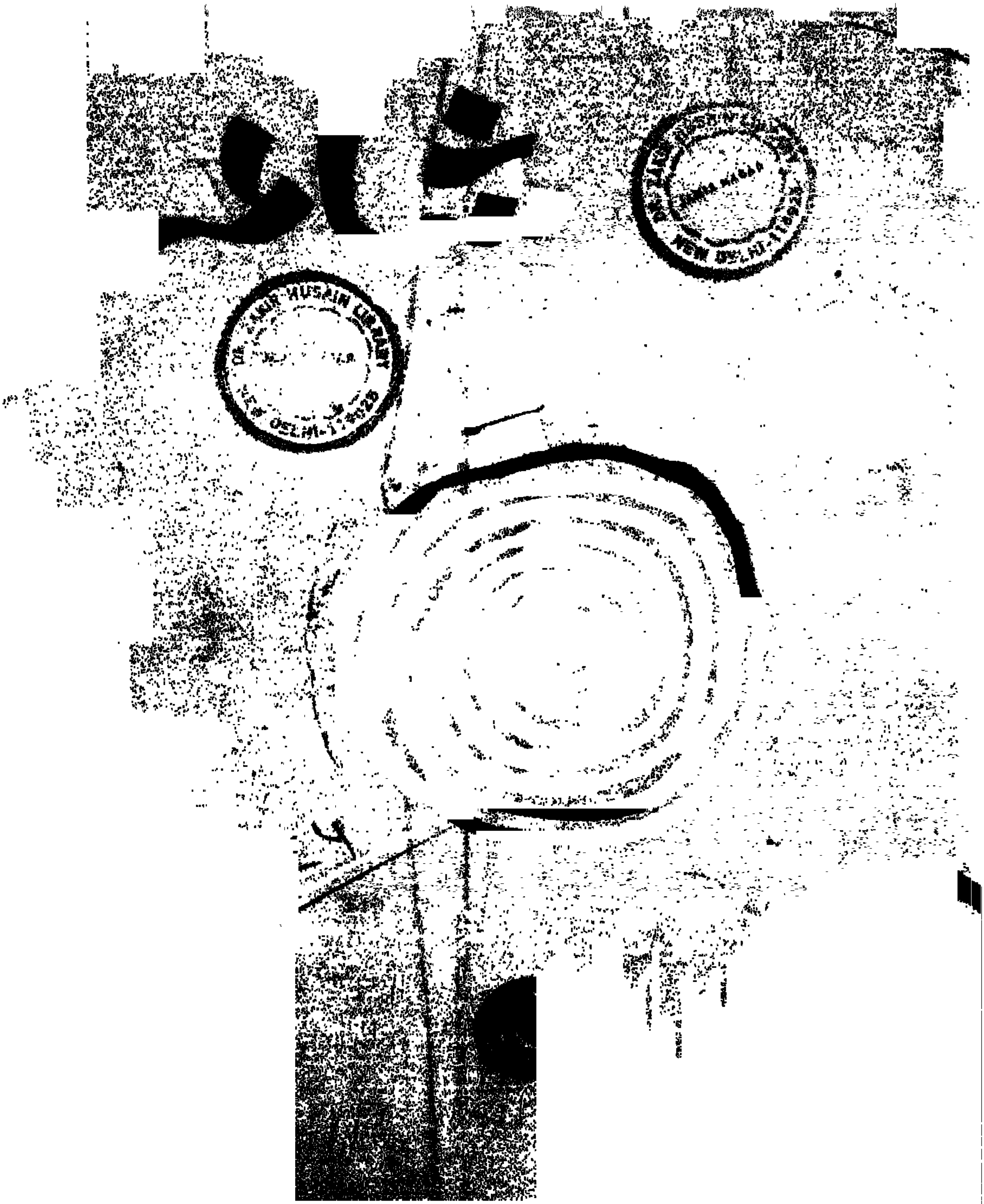
صلاح الدین نیّر ــ اشہر مرادآبادی ــ عابد مناوری ــ رشید عبد السمیع جلیل

رؤف خیر ــ ناز قادری ــ ورم ہوشیارپوری ــ رحمٰن جامی

دلکش اعظمی ــ تبسّم فاروقی ــ منوہر لال ہادی ــ پرویز رحمانی

عقار واثقی ــ انوار رضوی ــ رئیس مالیگانوی ــ اظہر غوری

غضنفر ــ انور ادیب ــ اسلم حبیب



جاری شدہ سنہ ۱۹۳۰ء
بانی علامہ سیماب اکبرآبادی (مرحوم)
اردو کا سینتالیس ۴۷ سالہ علمی ادبی اور تہذیبی ماہنامہ

شاعر بمبئی

ادارۂ تحریری مشاورت

کرشن چندر
ڈاکٹر محمد حسن
ڈاکٹر ظ۔ انصاری
آغا رشید مرزا

مدیر اعلیٰ
اعجاز صدیقی

مہتمم
ناظر نعمان صدیقی

مدیر معاون:- یونس اگاسکر

جلد - ۴۷
فون نمبر ۳۵۹۹۰۴
شمارہ - ۱۱، ۱۲

بدلِ اشتراک

زرِ سالانہ ـــــ ۱۶ ـــــ روپے
معاونین سے ـــــ ۵۰ ـــــ روپے
تاعمر خریداری ـــــ ۲۵۰ ـــــ روپے
ممالکِ غیر سے ـــــ ۲½ ـــــ پونڈ

ترسیلِ زر کا پتہ
ماہنامہ "شاعر" قصرالادب۔ بمبئی ۴۰۰۰۰۸

خط و کتابت کا پتہ
ماہنامہ "شاعر" مکتبہ قصرالادب
پوسٹ بکس نمبر ۴۵۲۶ بمبئی ۴۰۰۰۰۸

ہم عصر ادب کی قدر و قیمت اور اُس کے مسائل پر اصولی نظریاتی اور فکری و فنی مباحث

ہم عصر اردو ادب و شعر کی تازہ و شہکار تحریریں

شاعر کا (زیرِ ترتیب و طبع)

ہم عصر اُردو ادب نمبر

۱۔ ہم عصر اُردو ادب و تنقید

ہم عصر تنقید (افتتاحی مقالہ)	ڈاکٹر محمد حسن
ہم عصر اُردو تنقید	ڈاکٹر ظ۔ انصاری
اُردو ادب کے جدید رجحانات	ڈاکٹر ابو محمد سحر
جدید ادبی تنقید	شمس الرحمٰن فاروقی
ہم عصر اُردو تنقید	کرامت علی کرامت
ادب اور سمتوں کا اِغوا ر	ڈاکٹر سیّد حامد حسین
اُردو تنقید اور اُس کی ماہیت	ڈاکٹر فضیل امام

۲۔ ہم عصر اُردو تحقیق

ہم عصر اُردو تحقیق (افتتاحی مقالہ)	مالک رام
معاملات تحقیق	ڈاکٹر محمد انصار اللہ
تشنہ، شاگردِ قتیل کی داستانِ عقب ساج	ڈاکٹر گیان چند
حوالہ اور صحتِ متن	رشید حسن خاں

۳۔ ہم عصر اُردو کہانی

عصری افسانہ (افتتاحی مقالہ)	سیّد ضمیر حسن
کہانی	راجندر سنگھ بیدی
کہانی	عصمت چغتائی۔
بلا عنوان	قاضی عبد الستار
کلچرل اکیڈمی	جیلانی بانو
کہانی	رام لعل
سواریاں	جوگندر پال
کہانی	اقبال متین
پناہ گاہ	رتن سنگھ
کہانی	غیاث احمد گدی
پاؤں سے قدم تک	ابراھیم شفیق
چہرا ہے پر	رضوان احمد
نہیں کا سلسلہ ہاں سے	حمید سہروردی

ابواب کے الگ الگ سرِورق —
(ایک نہایت ضخیم و عظیم خصوصی اشاعت)
بہترین کتابت و طباعت، سفید چکنا کاغذ

۴۔ ہم عصر اُردو ناول

ہم عصر ناول (افتتاحی مقالہ)	ڈاکٹر یوسف سرمست
(ناولٹ)	سُہیل عظیم آبادی
ایک لڑکی بھٹکی ہوئی	کشمیری لال ذاکر

۵۔ ہم عصر اُردو نظم

ہم عصر اُردو نظم (افتتاحی مقالہ)	ڈاکٹر سیّد محمد عقیل
ہم عصر اُردو نظم۔ فنی اور لسانی مزاج	ڈاکٹر عنوان چشتی
معاصر نظم	ڈاکٹر وحید اختر
معاصر نظم کا علامتی کردار	ڈاکٹر حامدی کاشمیری

ممتاز و مشاہیر شعرا کی تازہ و شہکار نظمیں

۶۔ ہم عصر اُردو طنز و مزاح

عصرِ حاضر میں اُردو طنز و مزاح (افتتاحی مقالہ)	ڈاکٹر قمر رئیس
کُرسی	کوثر چاند پوری
بَرف کی الماری	مجتبیٰ حسین
جنّت سے واپسی	احمد جمال پاشا
...... برتن مری گلی کے	یُوسف ناظم
کوٹھیاں	نریندر لوتھر
....	خواجہ عبدالغفور
دعا دیتے ہیں رہزن کو	شفیقہ فرحت
پھر آگئے وہیں پہ چلے تھے جہاں سے ہم	آغا رشید مرزا

۷۔ ہم عصر اُردو ڈراما

ہم عصر اُردو ڈراما (افتتاحی مضمون)	اخلاق اثر
نہیں ہے، نہیں ہے۔! (ڈراما)	ابراہیم یوسف
آپ کیوں روئے۔! (ڈراما)	اَنِل ٹھکر

۸۔ ہم عصر اُردو غزل

جدید اُردو غزل کا مزاج (افتتاحی ڈرامہ)	انور صدیقی
ہم عصر اُردو غزل	ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید
جدید غزل	نامی انصاری

ممتاز و مشاہیر شعرا کی تازہ و شہکار غزلیں

ترتیب

جُرعات

اُردو کے مؤقف پر نظرِ ثانی کی ضرورت

ایک طویل دَورِ انتشار و ابتلاء سے گذرنے کے بعد اُردو زبان کیلئے قدرے پُرسکون فضا پیدا ہوئی ہے۔ تقسیم کے بعد اُردو کو لسانی حیثیت سے نہیں، بلکہ سیاسی مصالح کی عینک سے دیکھا گیا۔ ملکی سیاست جتنی منقلب رہی، اُس میں جتنے غیر صالح عناصر شامل رہے اور لسانی صوبوں کی تشکیل کے بعد اُردو کو جتنا نقصان پہنچا، اُس سے سبھی واقف ہیں۔ ماضی قریب میں جب ہماری سیاست میں کچھ نظم و ضبط پیدا ہوا، فرقہ پرستی کے رُجحان میں کمی واقع ہوئی اور لسانی اقلیتوں کے مسائل کو اہمیت دیتے ہوئے اُن پر ہمدردانہ نظر ڈالی گئی تو اُردو کے ساتھ کی گئی حق تلفیوں کا بھی احساس ہوا۔ خواہ اِس کی وجہ اُردو زبان کی سخت جانی ہو یا مُلک سے اُس کا اٹوٹ تہذیبی رشتہ یا اِس سرزمین میں اُس کی جڑوں کا گہرا ہونا جو اُکھاڑنے کے باوجود اُکھڑ نہ سکیں۔ اَن گنت اسباب سے قطع نظر، اِدھر چند سال میں سیاسی قیادت کی نظرِ عنایت سے اُردو کے مسائل و مقاصد میں ایک طرح کا ٹھہراؤ آیا ہے اور اب ہم یہ سوچ سکتے ہیں کہ ہماری منزل کیا ہے، کتنی دُور ہے، اس تک پہنچنے کے لئے ہمیں کیا کرنا ہے۔ کس طرح قدم بڑھانے ہیں، کتنے سنگِ میل ہم پیچھے چھوڑ آئے ہیں، کتنوں سے اب اور گذرنا ہے اور کس زادِ راہ کی ضرورت ہے۔ وقت کتنا ہے، ہماری رفتار کا عالم کیا ہے، راہ میں کتنی گھاٹیاں اور کھائیاں ہیں، اُن سے گذرنے کی صورت کیا ہوگی۔ کہیں پھر سے سیاست کی تیز آندھیاں تو ہمارے سفر کو مُشکل نہیں بنا دیں گی۔ جو مواقع، جو آسانیاں اور جو سازگار فضا اب میسّر آئی ہے، وہ ہمیں تن آسانی کی طرف تو نہیں لے جا رہی ہے؟۔

صدرِ جمہوریہ ہند نے ریاستی اُردو اکاڈمیوں کی سالانہ کانفرنس میں فرمایا۔

"مُلک کی سیاسی قیادت کا ذہن اُردو کے بارے میں بالکل صاف ہے۔ مُلک کی مرکزی اور ریاستی سطح کی سیاسی قیادت کو اُردو سے نہ صرف ہمدردی ہے، بلکہ وہ اُس کو فروغ دینے کی ہر ممکن اور بھرپور کوشش کرنا چاہتی ہے۔"

صدرِ محترم نے سرکاری پالیسی پر عمل کرنے والوں سے اپیل کی کہ وہ اپنے ذہنوں کو صاف کریں اور اُردو کے ساتھ مُنصفانہ رویّہ اختیار کریں۔ اُنھوں نے سہ لسانی فارمولے پر پوری طرح عمل کرنے کی بھی سفارش کی اور یہاں تک کہا کہ اُن کی سمجھ میں نہیں آتا کہ اُتر پردیش اسمبلی میں اُردو میں تقریر کرنے کی اجازت کیوں نہیں دی جاتی؟ جبکہ اُردو آئین میں درج زبانوں میں سے ایک زبان ہے۔

یہ مُلک کے سب سے بڑے سربراہ کے ارشادات ہیں جہاں تک اُردو زبان کے سلسلے میں سرکاری احکامات، ہمدردی اور اعانت کا سوال ہے، اُسکا اعتراف احساس تو اُردو کے ہر ادنیٰ و اعلیٰ کو ہے۔ ہماری ریاستی اُردو اکاڈمیاں، ترقی اُردو بورڈ، انجمن ترقی اُردو، اُردو کے سرکاری رسالے، درسگاہیں اور اُردو کے وہ علمی و ادبی ادارے جنھیں حکومت امداد دیتی ہے، اُس کا بدیہی ثبوت ہیں۔ اِس میں نہ سوگند کی ضرورت ہے اور نہ گواہ کی حاجت۔ اِن سرکاری اعانتوں سے انکار کُفرانِ نعمت ہوگا۔

اِس کے باوجود راقم السطور کو تلخی کے ساتھ یہ محسوس ہو رہا ہے کہ اربابِ اُردو کی نظر اُردو کے صحیح موقف سے ہٹتی جا رہی ہے۔ اور پردۂ اُردو پر اِن چمکتے ہوئے خطوط کے پیچھے اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔

۱۔ چھوٹے چھوٹے اخبارات و رسائل (جن کی اشاعت دو چار سو یا اس سے کچھ زیادہ ہے) کی معراجِ صحافت صرف ٹنڈر نوٹس اور حکومت کے جاری کردہ اشتہارات ۔!!

۲۔ ادیبوں اور شاعروں کو صرف اُردو اکاڈمیوں کی مدد سے اپنی کتابوں کی طباعت اور اُن پر انعامات حاصل کرنے کی دُھن !!

۳۔ ہر شہر میں کتابیں چھپ رہی ہیں۔ اُردو اکاڈمیاں دل کھول کر انعامات دے رہی ہیں، اِس سے کوئی سروکار نہیں کہ کتابیں فروخت ہوتی ہیں یا نہیں ۔!!

۴۔ اُردو لائبریریاں، ریاستی اکاڈمیوں اور میونسپل کارپوریشنوں سے زیادہ سے زیادہ امداد حاصل کرنے کے لئے کوشاں خواہ اُن لائبریریوں کو اُردو پڑھنے والے میسر ہوں یا نہ ہوں۔

۵۔ مرکزی انجمن ترقی اُردو "اُردو گھر" کی تعمیر اور "ہماری زبان" کی اشاعت میں منہمک ۔!! (دونوں کی اہمیت و ضرورت مُسلّم)

۶۔ ریاستوں کی انجمن ترقی اُردو اور اُس کی شاخیں، میمبر سازی، باہمی جھگڑوں اور چھوٹے موٹے ادبی و تہذیبی پروگراموں تک محدود ۔!!

۷۔ آل انڈیا اُردو ایڈیٹرز کانفرنس ہر سال لاکھ ڈیڑھ لاکھ روپئے کے خرچ سے بڑے شہروں میں اپنا سالانہ اجلاس مُنعقد کرنے کی دُھن میں مست ۔!

دانشورانِ اُردو کو سوچنا چاہئے کہ اُردو کا صحیح موقف کیا ہے۔ اُردو کی زندگی اور پائندگی کے لئے اگر اُس پر نظرِ ثانی کی ضرورت ہے تو اس کی طرف سے یہ مُجرمانہ غفلت کیوں؟ سطح پر تیرنے والے خوشنما دھبّوں اور کچّی سیپیوں پر قناعت کہیں ہمیں خزینوں سے محروم نہ کر دے۔

"ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں۔!"

اعجاز صدیقی

غزلیں

اختر سعید

زندگی شعلۂ رخسارِ تمنا ہی سہی
یہ تماشا ہے تو کچھ روز تماشا ہی سہی

سایۂ سرو سمن پہ کوئی موقوف نہیں
سر چھپانے کے لئے دامنِ صحرا ہی سہی

ہم سے چھپتا ہے کہیں شغلۂ کارِ جنوں
خاکِ ساحل نہ سہی موجۂ دریا ہی سہی

کتنی تعبیروں کو آنکھوں میں لئے پھرتا ہوں
زندگی تیرا ہر اک خواب ادھورا ہی سہی

رہنے والے ہیں اسی شہر کے ہم بھی لوگو
آن بیٹھے ہیں تو رسم و رہِ دنیا ہی سہی

ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں سب اہلِ خرد
نگہِ ناز کا مبہم سا اشارہ ہی سہی

حسن اور پاسِ وفا ہم بھی سمجھتے ہیں مگر
کچھ تعلق تو رکھو رنجش بیجا ہی سہی

آؤ اک لمحۂ اعلانِ تمنا کر لیں
ہم سے کچھ دیر زمانے میں اُجالا ہی سہی

○ اتوارہ - الہ آباد بینک روڈ - بھوپال - ۱

راہی قریشی

دُور تک بے کسی راہ گذر ساتھ رہی
کبھی تنہا نہ ہوئے، گردِ سفر ساتھ رہی

یہ بصارت کی خطا ہے کہ بصیرت کا قصور
دِن بھی نکلا تو تمنائے سحر ساتھ رہی

غم کا پُر ہول اندھیرا تھا مرے رستے میں
روشنی تیری دعاؤں کی مگر ساتھ رہی

میں کہاں زیست کے صحرا میں بھٹکتا تھا
کم سے کم یہ تو ہوا، تیری نظر ساتھ رہی

گھر کی سُلگی ہوئی تنہائی سے تا بزمِ طرب
حسرتِ چارہ گرِ دیدۂ تر ساتھ رہی

اک ترا غم ـ کہ رفاقت نہیں چھوڑی جس نے
اک تری یاد ـ کہ جو شام و سحر ساتھ رہی

سایۂ علم و ہنر میں بھی ہمیشہ راہی
کیوں یہ بے مائیگیِ علم و ہنر ساتھ رہی

○ ۸۱ - ملز روڈ کالونی - گلبرگہ ۔ کرناٹک

مقالہ

حالی کے حالات اور اُن کا ماحول

رشید الدین
۱۱-۲-۱۲/۱ ، مراد نگر ، حیدرآباد

اُردو ادب میں حالی کی شخصیت بڑی پہلو دار ہے۔ وہ ایک شاعر بھی ہیں اور نثر نگار بھی۔ مصلحِ قوم بھی ہیں اور مجتہدِ عصر بھی۔ اُردو کی روایتی اور گھِسی پِٹی ڈگر سے ہٹ کر اُنھوں نے جو غزلیں لکھیں اور جدید موضوعات پر جو نظمیں سپردِ قلم کیں وہ اُردو شاعری کا بڑا قیمتی سرمایہ ہیں۔ نثر میں اُنھوں نے تنقید نگاری اور سوانح نگاری کی بنا رکھنے کے علاوہ جدید نثر کی بھی نیو ڈالی۔ اُن کا "مقدمہ شعر و شاعری" جدید تنقید کی سب سے پہلی کڑی ہے۔ غالبؔ، سرسید اور سعدی کی جو سوانح اُنھوں نے لکھی ہیں اور خسرو کی جو آپ بیتی قلمبند کی ہے، وہ نثر میں اُن کا مرتبہ بہت بلند کر دیتی ہیں۔ اُنھوں نے صرف شعر ہی نہیں کہے یا نری نثر ہی نہیں لکھی، بلکہ قلم سے نیشتے کا کام لیا؛ اپنے زوال پذیر معاشرہ کی اصلاح کی اور اپنی مُردہ قوم میں زندگی کی نئی رُوح پھونکی اور یہ سب کرنے کے لئے اُنھوں نے نظم و نثر کے نئے فارم اختیار کئے اور روایت سے بغاوت کی۔ یہی وجہ ہے کہ اُنھیں شاعر، نثر نگار، مصلح اور مجتہد کہا گیا۔ یہ اور اِن ہی چیزوں نے اُن کی شخصیت کو بڑا پہلو دار بنا دیا ہے۔

اُردو ادب میں حالی کی شخصیت صرف پہلو دار ہی نہیں بلکہ قد آور بھی ہے۔ وہ زندگی بھر خاموشی کے ساتھ اپنے کام میں لگے رہے لیکن جو کام اُنھوں نے کئے اُس نے ساری قوم میں بیداری کی لہر دوڑا دی، سارے معاشرہ میں جاگرتی پیدا کر دی اور سارے ملک میں روشن خیالی کو عام کر دیا۔ چونکہ اُن کا دل خلوص سے معمور تھا اِس لئے اُن کے زبان و قلم میں ایک تاثیر پیدا ہو گئی تھی۔ حالی کی شاعری سے

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے
پَر نہیں طاقتِ پرواز مگر رکھتی ہے

کی بڑی عمدہ مثال ہے اور اِسی تاثیر نے اُنھیں اپنی زندگی میں بقائے دوام کا درجہ دے دیا تھا اور اُن کی شخصیت کو بیحد قد آور بنا دیا تھا۔ اِسی چیز نے حالی کو پانی پت کے ایک نوجوان سے سارے ملک کا شمس العلماء مولانا خواجہ الطاف حسین حالی بنا دیا اور قیامت تک اُن کا یہ بلند و بالا مرتبہ اُن سے کوئی شاعر چھین نہیں سکتا۔ بلکہ جوں جوں زمانہ ترقی کرتا اور روشن خیال ہوتا جائیگا اِس مرتبہ میں اضافہ ہی ہوتا جائے گا۔

حالی کے ماحول کا جائزہ لینے سے پہلے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے حالات پر ایک نظر ڈال لی جائے کیونکہ جس ماحول کا ہم جائزہ لینے چلے ہیں اُس کا سب سے فعّال کردار یہی ہے اور اِسی کے گرد آئندہ ہمیں اِس مقالے کا تانا بانا بُننا ہے۔

حالی ۱۸۳۷ء میں ہوا (ضلع کرنال) کے قصبہ پانی پت کے محلہ انصاریان میں پیدا ہوئے۔ پانی پت تاریخ میں اپنی جنگوں کے لئے مشہور ہے لیکن کسے معلوم تھا کہ اِسی سرزمین سے ایک ایسا مُصلحِ کُل اور بُردبار شخص پیدا ہوگا جو سارے آپسی اختلافات کو ختم کر کے سب کو اتّحاد و اتّفاق کی تعلیم دے گا۔ حالی کا گھرانا ایک متوسط طبقے کا شریف گھرانا تھا۔ گھر میں کچھ زمینداری برسوں سے چلی آرہی تھی۔ اُن کا سلسلۂ نسب دادیہال کی طرف سے انصاری اور نانیہال کی طرف سے سیّد تھا۔ ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی کے بیان کے مطابق اُن کے والد ایزد بخش کا سلسلہ بیالیس واسطوں سے مشہور صحابیِ رسولؐ حضرت ابو ایوب انصاریؓ سے ملتا ہے۔

حالی بچپن ہی سے بیحد ذہین مگر خاموش طبع تھے۔ پڑھنے لکھنے سے خاصی دلچسپی رکھتے تھے۔ گو معاشی طور پر یہ خاندان زیادہ آسودہ حال نہیں تھا لیکن مذہب، اخلاق، عزّت و توقیر کے لحاظ سے بیحد غنی تھا۔ اُن کی والدہ بے حد سلیقہ مند خاتون تھیں، لیکن حالی کی پیدائش کے بعد اُن پر محویت اور استغراق کی ایک خاص کیفیت طاری ہو گئی۔ بچوں کی دیکھ بھال، عزیزوں سے ملاقات اور گھر والوں سے بات چیت بالکل بند ہو گئی۔ اِس طرح حالی بچپن سے اپنی ماں کے آغوشِ تربیت سے محروم رہے لیکن اُن کے بڑے بھائی خواجہ امداد حسین اور دو بڑی بہنوں اُمۃ الحسین اور وجیہ النساء نے اُن کی دیکھ بھال میں کوئی کسر اُٹھا نہیں رکھی۔ لیکن بدقسمتی سے ۱۸۴۵ء میں جبکہ حالی کی عمر بمشکل ۹ سال تھی اُن کے والد کا

ر ف ۴۰ سال کی عمر میں انتقال ہوگیا۔ اب تو بڑے بھائی اور بہنوں نے اپنے ۔وٹے بھائی کی طرف زیادہ ہی توجہ کی اور انھیں کبھی اپنی یتیمی اور بے بضاعتی کا ساس نہیں ہونے دیا۔

اُس زمانے کے رواج اور خاندانی دستور کے مطابق حالی کی بسم اللہ ا برس کی عمر میں پڑھائی گئی۔ اُس زمانے میں حافظ ممتاز حسین انصاری نی پت کے مشہور قاری تھے اور انصاریوں کے بچوں کو قرآن شریف پڑھایا تے تھے، قرأت سکھاتے تھے اور حفظ بھی کراتے تھے۔ حالی کو بھی اُن ہی ے رجوع کیا گیا۔ وہ ایک مردم شناس بزرگ تھے۔ حالی کو دیکھتے ہی تاڑ گئے ۔ بچہ ہونہار اور ذہین ہے۔ چنانچہ بہت جلد وہ نہ صرف قاری بلکہ حافظِ قرآن ں ہوگئے۔ پانی پت کے مشہور قاری حافظ لالا نے اُن کا قرآن شریف سُن کر مایا کہ "یہ نہایت جوہرِ قابل معلوم ہوتا ہے۔ اس کی تربیت بہت اچھی طرح کی جائے" آن شریف اور عربی کی تعلیم ختم کر کے حالی فارسی کی طرف متوجہ ہوئے اور بہت لد اُس میں بھی دسترس حاصل کر لی۔ بعد میں وہ ساری عمر فارسی زبان و ادب الہ و شیدا رہے اور مشہور فارسی شاعر شیخ سعدی کی سوانح عمری بھی "حیاتِ سعدی" ے نام سے اُردو میں لکھی۔

حالی کو حصولِ علم کا شوق بہت زیادہ تھا لیکن جوں ہی وہ سنِ بلوغ کو پہنچے ن کے بھائی اور بہنوں نے شادی کے لئے اصرار شروع کر دیا۔ ہر چند کہ حالی ابھی س بکھیڑے میں پڑنا نہیں چاہتے تھے لیکن بزرگوں کے سامنے زبان بھی نہیں ول سکتے تھے۔ ناچار چپ ہو رہے اور ۱۸۵۳ء میں جبکہ اُن کی عمر بمشکل ۱۷ سال ں، اُن کے ماموں میر قربان حسین کی صاحبزادی اسلام النساء کے ساتھ اُن کی شادی ر دی گئی۔ اب حالی کے اُوپر فکرِ معاش کی ذمہ داری بھی آ پڑی۔ تاہم ایک روشن پہلو س المیہ کا یہ تھا کہ اُن کی سسرال مالدار تھی چنانچہ خود کہتے ہیں "تعلیم کا شوق ا الب تھا اور بیوی کا میکا آسودہ حال"۔

اِسی سے استفادہ کرتے ہوئے شادی کے کچھ دن بعد جب اُن کی بیوی میکے ں تھیں حالی نے تحصیلِ علم کے شوق میں چپ چاپ بغیر کسی زادِ راہ کے پا پیادہ ۔لی کی راہ لی۔ دلی پانی پت سے ۵۳ میل دور ہے۔ اُس وقت اُن کی عمر مشکل ے ۱۸ سال تھی۔ دلی میں ڈیڑھ برس رہے اور مختلف فرقوں سے تحصیلِ علم ر تے رہے۔ جب گھر والوں کو معلوم ہوا تو اُن کے بڑے بھائی پھر اُنھیں پانی پت ے آئے لیکن دلی کے قیام کا یہ اثر ہوا کہ حالی پہلی بار شعر گوئی کی طرف متوجہ ہوئے۔ اُس وقت وہ خستہ تخلص کرتے تھے جو اُس زمانے کے اُن کے حالات کے لحاظ سے بڑا حسبِ حال تھا۔ یہیں اُن کی ملاقاتیں اُس زمانے کے مشہور شعرا شاعر بھی

ذوق، غالب، داغ، آزردہ، مصحفی وغیرہ سے ہوئیں۔ آنے کو حالی پانی پت آ گئے لیکن اُن کا دل دلی ہی میں اٹکا ہوا تھا۔ پانی پت آ کے بھی وہ کتابوں میں غرق ہو گئے۔ حالانکہ اُنھیں اُس زمانے میں کسی ملازمت کی شدید ضرورت تھی۔ خیر سے ایک لڑکے کے باپ بھی ہو گئے تھے۔ بڑے بھائی ملازم تھے۔ کچھ کھیتوں کا اناج آ جاتا تھا لیکن اتنے بڑے گھر کا خرچ پھر بھی پورا نہ ہوتا تھا۔

بالآخر حالی نے کسبِ معاش کے لئے گھر سے باہر قدم نکالنے کا قصد کر لیا اور حصار پہنچے جہاں ڈپٹی کمشنر کے دفتر میں ایک جگہ خالی تھی۔ درخواست دی اور تقرر ہو گیا۔ فرض شناس حالی نے یہ نوکری بڑی دلجمعی سے کی لیکن ایک سال بھی نہ ہوا کہ غدر کا ہنگامہ اُٹھ کھڑا ہوا اور حالی کو سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر پانی پت کی راہ لینی پڑی۔ راستے میں اُنھیں ڈاکوؤں نے لوٹ لیا اور وہ گھوڑی بھی چھین لی جس پر وہ سفر کر رہے تھے۔ بمشکل تمام لٹ پٹ کر وطن پہنچے۔ جہاں اُنھوں نے اور ہی سماں دیکھا۔ دلی کے اکثر شرفا جان بچا کر پانی پت میں پناہ گزین تھے اور عجیب حشر کا عالم برپا تھا۔ خود حالی کے گھر میں کئی خاندان ٹھہرے ہوئے تھے۔ اہلِ پانی پت اور خصوصاً انصاریوں نے اُن کی ہر طرح مدد کی اور اپنے اجداد کی روایت تازہ کر دی۔

اِس کے بعد حالی تین چار سال تک پانی پت ہی میں رہے اور وہاں کے اساتذہ سے تحصیلِ علم کرتے رہے لیکن اِس طرح کب تک رہا جا سکتا تھا۔ اِس عرصے میں اُن کے ہاں دو لڑکے اور ایک لڑکی ہو چکی تھی۔ بڑے لڑکے کو اُن کے بڑے بھائی نے گود لے لیا تھا۔ کچھ بچے کمسنی میں فوت ہو چکے تھے۔ آخر تلاشِ روزگار میں حالی نے پھر دلی کا رُخ کیا۔ اب کی بار خوش قسمتی سے اُن کی ملاقات نواب مصطفٰے خاں شیفتہ سے ہو گئی جو اہلِ ثروت ہونے کے علاوہ اُردو کے مشہور شاعر تھے۔ انھوں نے حالی کو بیٹے لڑکے کا اتالیق مقرر کیا اور اپنے ساتھ جہانگیر آباد لے گئے جو اُن کی جاگیر تھی اور دلی سے قریب واقع تھی۔ لیکن دلی سے حالی کا سلسلہ ٹوٹا نہیں بلکہ وہ اکثر و بیشتر شیفتہ کے ساتھ دلی آتے اور یہاں کے مشاعروں، ادبی جلسوں اور تقاریب میں شرکت کرتے تھے۔ شیفتہ نے حالی کو اُس زمانے کی بہت سی سربرآوردہ شخصیتوں سے ملایا جن میں سرسید احمد خاں بھی شامل تھے جو بعد میں اُن کے بڑے دوست بن گئے اور دونوں نے مل کر اصلاحی تحریکوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ یہ دور حالی کی زندگی کا بڑا آسودہ دور تھا۔ اِسی زمانے میں اُنھوں نے خستہ سے حالی تخلص اختیار کیا اور باضابطہ شاعری شروع کی۔ وہ شیفتہ کے لڑکے کو پڑھاتے تھے مگر خود شیفتہ سے بہت کچھ سیکھتے تھے۔ ایک شعر

میں اس طرف اشارہ کیا ہے ؎

حالیؔ سخن میں شیفتہ سے مستفیض ہوں
شاگرد میرزا کا مقلد ہوں میر کا

لیکن افسوس کہ آٹھ سال بعد شیفتہ کا انتقال ہو گیا اور حالیؔ کو جہانگیر آباد چھوڑ کر پھر دلی آجانا پڑا۔ اب وہ پھر بے کار تھے۔ اُس زمانے میں اُنھوں نے غالبؔ کے فیضِ صحبت سے بہت استفادہ کیا اُن دنوں وہ پابندی سے اُن کے پاس جاتے اور اُنھیں اپنا کلام دکھاتے تھے۔ حالیؔ کا شمار غالبؔ کے ممتاز شاگردوں میں ہوتا ہے۔ ۱۸۶۹ء میں غالبؔ کا بھی انتقال ہو گیا اور حالیؔ سرسیّد اور اُن کی تحریک سے قریب ہو گئے۔

پیارے لال آشوبؔ کی مدد سے حالیؔ کو حکومتِ پنجاب کے سرکاری رسالہ "اتالیق پنجاب" میں جو محکمۂ تعلیمات کی جانب سے نکلتا تھا اسسٹنٹ ایڈیٹر کی جگہ مل گئی اور وہ لاہور منتقل ہو گئے جہاں مولانا محمد حسین آزاد پہلے سے موجود تھے۔ یہیں حالیؔ نے اپنی مشہور نظمیں "برکھا رُت" اور "مناجاتِ بیوہ" وغیرہ لکھیں معاصرانہ چشمک کی وجہ سے آزاد سے حالیؔ کے تعلقات ٹھیک نہیں رہے اور یہ ماحول حالیؔ کو پسند بھی نہیں آیا۔ اس لئے ۱۸۷۴ء جب اُنھیں اینگلو عربک اسکول دلی میں معلّمی کی خدمت ملی تو وہ فوراً دلی آگئے۔ حالیؔ کو اُس وقت ۶۰ روپے تنخواہ ملتی تھی۔ جب حکومتِ حیدرآباد سے سر آسمان جاہ نے اُنھیں سرسیّد کی سفارش پر ۷۵ روپے حالی (جو ۶۰ روپیہ کلدار کے مساوی ہوتے ہیں) وظیفہ مقرر کر دیا تو قناعت پسند حالیؔ نے ملازمت چھوڑ دی اور پانی پت پہنچ کر تصنیف و تالیف میں مشغول ہو گئے اور تقریباً خلوت نشین ہو گئے۔ چنانچہ خود ہی کہتے ہیں ؎

کی ہے خلوت پسند حالیؔ نے
اب نہ دیکھو گے اس کو مجلس میں

حالیؔ حکومتِ حیدرآباد کی دعوت پر دو بار حیدرآباد بھی آئے تھے اور یہاں بطور شاہی مہمان ٹھہرے تھے۔ بعد میں اُن کا وظیفہ حکومتِ حیدرآباد کی جانب سے ۱۰۰ روپے ماہانہ کر دیا گیا۔ بابائے اُردو مولوی عبدالحق نے اُنھیں اورنگ آباد بھی بلایا تھا لیکن وہ اپنی ضعیفی کی وجہ سے اتنا لمبا سفر کرنے کے قابل نہیں تھے۔ جب مولوی صاحب نے زیادہ ہی اصرار کیا تو حالیؔ نے اُنھیں لکھا کہ:

"الحمدللہ آپ اورنگ آباد میں خوش ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیشہ خوش و خرم رکھے۔ میرا بھی جی چاہتا ہے کہ چند روز وہاں آکر رہوں۔ مگر پیرانہ سالی میں اس قدر دُور دراز کی مسافت پر کسی دوست کے پاس جاکر رہنا یا تو اس کو تیمارداری کی تکلیف دینا ہے یا اُس پر تجہیز و تکفین کا بار ڈالنا ہے۔"

البتہ اُس زمانے میں بھی اُنھوں نے دلی اور علیگڑھ کا سفر اختیار کیا۔ آخری عمر میں اُن کی صحت خراب رہنے لگی تھی۔ بڑے فرزند نے بہت کچھ علاج کرایا لیکن بے سود۔ آخر میں قوّتِ گویائی بالکل جواب دے چکی تھی۔ صرف اشاروں سے باتیں کرتے اور سمجھتے تھے، بالآخر ۱۹۱۴ء کے آخری دن یعنی ۳۱ دسمبر کو جب کہ سورج غروب ہو رہا تھا دنیائے ادب کا یہ شمس بھی ۷۷ سال تک ضیا پاشی کر کے ہمیشہ کے لئے غروب ہو گیا لیکن اپنی تصانیف کے ذریعہ اپنی کرنیں آنے والی نسلوں کے لئے چھوڑ گیا۔ مرنے سے قبل یہ رباعی موزوں کی۔

السلام اے قاصدِ ملکِ بقا ۔ الوداع اے عمرِ فانی الوداع
آلگا حالیؔ کنارے پر جہاز ۔ الوداع اے زندگانی الوداع

حالیؔ کے انتقال پر سارے ملک میں کہرام مچ گیا۔ بے شمار شاعروں نے خراجِ عقیدت پیش کیا جن میں اقبالؔ بھی شامل تھے ؎

شبلی کو رو رہے تھے ابھی اہلِ گلستاں
حالیؔ بھی ہو گیا سوئے فردوس رہ نورد

حالیؔ کے حالاتِ زندگی بیان کرنے کے بعد یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اُن کی شخصیّت کا نفسیاتی تجزیہ کیا جائے۔ کیونکہ حالیؔ کے ماحول پر بحث کرنے کے لئے اُن کے حالاتِ زندگی کا مطالعہ جس قدر ضروری ہے اُسی قدر اُن کی شخصیّت کا جائزہ ناگزیر ہے۔

حالیؔ کی شخصیّت میں صبر و تحمّل، قوّتِ برداشت، وضعداری، بُردباری، سنجیدگی، انکساری اور رحم و ہمدردی کا مادّہ بدرجۂ اتم موجود تھا۔ یہ وہ خصوصیات ہیں جن کا ہر بڑے آدمی میں ہونا ضروری ہے۔ اگر کسی میں یہ خصوصیات نہ ہوں تو میرے نزدیک اُس کی بڑائی یقیناً مشکوک ہے۔ حالیؔ کی کتابِ زندگی کے اوراق پلٹتے جائیے آپ کو ایسے متعدد واقعات ملیں گے جب کہ ہر مصیبت کی گھڑی اور آزمائش کا لمحہ اُن پر آسان گزرا۔ جب اُن کی مشہور نظم "مسدّسِ حالیؔ" شایع ہوئی تو روشن خیال اور سمجھدار لوگوں نے تو اُسے ہاتھوں ہاتھ لیا لیکن تنگ نظر اور جاہل لوگوں نے (جن کی تعداد خیر سے اُس زمانے میں کچھ زیادہ ہی تھی) ایک ہنگامہ برپا کر دیا — "مسدّسِ حالیؔ" کے خلاف "مسدّسِ خالی" بھی لکھا گیا اور "مسدّسِ خیالی" بھی۔ "اودھ پنچ" کے صفحات بھی کالے کئے گئے اور اُن پر رکیک حملے بھی کئے گئے ؎

ابر ہمارے حملوں سے حالیؔ کا حال ہے
میدانِ پانی پت کی طرح پائمال ہے

لیکن حالیؔ نے کبھی اس کا برا نہیں مانا اور نہ کبھی کے اعتراض کا جواب دینا ضروری سمجھا۔ البتہ اپنے اشعار میں لطیف پیرائے میں اُن کی طرف اشارے ضرور کئے ہیں ؎

تم نے حالیؔ کھول کر ناحق زباں — کر لیا ساری خدائی سے بگاڑ
ہم نہ کہتے تھے کہ حالیؔ چپ رہو — راست گوئی میں ہے رُسوائی بہت
اُنگلیاں بزم میں اُٹھیں حالیؔ — تم نے ناحق انھیں نصیحت کی

حالیؔ کو بچپن سے ماں باپ کے سایۂ عاطِفت سے محروم ہو چکے تھے لیکن اُن کے بڑے بھائی اور بہنوں نے اُنھیں بے حد پیار دیا۔ یہی وجہ ہے کہ اُنھوں نے بھی ساری زندگی دوسروں کو پیار بانٹا۔ ورنہ اگر بچپن میں خاطر خواہ محبت اور توجہ نہ ملے تو لوگ چڑچڑے بن جاتے ہیں اُلجھنوں کا شکار ہو جاتے ہیں اور احساس کمتری یا برتری میں مبتلا ہو کر دوسروں کی زندگیاں اجیرن کر دیتے ہیں۔ لیکن حالیؔ نے ہمدردی کا جو جذبہ پایا تھا وہ اُن کے خاندان اور دوست احباب سے نکل کر قوم تک پہنچ چکا تھا اور وہ اپنی قوم کے تعلق سے بھی وہی جذبۂ خیر اپنے دل میں رکھتے تھے جو اپنی اولاد اور اہلِ خاندان کے لئے مخصوص ہوتا ہے۔ اُن کے اشعار میں جو سوز و گداز اور تاثر پیدا ہوا ہے وہ اُسی ہمدردی اور خلوص کا نتیجہ ہے۔

عام طور پر حالیؔ کو زاہد خشک سمجھا جاتا ہے لیکن ایسا نہیں تھا۔ اُن کی طبیعت میں بڑی شگفتگی اور بذلہ سنجی پائی جاتی تھی۔ بابائے اُردو مولوی عبدالحق نے "چند ہم عصر" میں حالیؔ پر جو مضمون لکھا ہے اُس میں ایک واقعہ بیان کیا ہے کہ اُن کا ایک بوڑھا نوکر بڑا چڑچڑا اور بد مزاج تھا۔ ایک بار مولوی صاحب پانی پت میں حالیؔ کے یہاں بیٹھے تھے کہ کسی بات پر وہ بوڑھا نوکر چڑ گیا اور حد درجہ بد مزاجی پر اُتر آیا۔ مولوی عبدالحق کو یہ بات بہت ناگوار گذری اور اُنھوں نے حالیؔ سے اُس کی شکایت کی تو وہ ہنس کر بولے:

"یہ ہمارا باہمی معاملہ ہے۔ کبھی ہم کو غصہ آجاتا ہے تو ہم اُسے ڈانٹ دیتے ہیں کبھی اُس کو غصہ آجائے تو وہ ہمیں آنکھیں دکھا دیتا ہے۔ آج اُس کی باری ہے۔ آپ قطعی مضمحل نہ ہوئیے"

اس واقعہ سے جہاں حالیؔ کے صبر و تحمل کا ثبوت ملتا ہے وہاں اُن کی بذلہ سنجی بھی جھلکتی ہے۔ حالیؔ کی نواسی محترمہ صالحہ عابد حسین نے اپنی کتاب "یادگارِ حالیؔ" میں اُن کی گھریلو زندگی کے ایسے بہت سے واقعات بیان کئے ہیں جن سے اُن کی شخصیت کے بہت سے گوشے اُجاگر ہوتے ہیں اور اُن کی شخصیت کا تجزیہ کرنے میں ہمیں مدد ملتی ہے لیکن یہاں ہمیں صرف حالیؔ کی شخصیت سے بحث کرنا نہیں ہے اس لئے اُن لذیذ حکایتوں اور اُن پر لطیف تبصروں کو ہم یہیں چھوڑ کر آگے بڑھتے ہیں اور حالیؔ کے ماحول میں داخل ہوتے ہیں۔

حالیؔ ۱۸۳۷ء میں پیدا ہوئے۔ یہی وہ سال ہے جب کہ آخری مغل تاجدار بہادر شاہ ظفر تختِ دلّی پر متمکن ہوا تھا جس کی حکومت قلعۂ معلّٰی تک محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ ہندوستان میں یہ ایسٹ انڈیا کمپنی کا زمانہ تھا اور انگریزوں نے اپنے قدم پوری طرح جمائے تھے۔ لیکن اِس کے باوجود ہندوستانیوں نے ابھی تک ذہنی طور پر انگریزوں کو قبول نہیں کیا تھا اور وہ کسی ایسے موقعے کی تلاش میں تھے جب وہ انگریزوں کو ہندوستان سے نکال باہر کریں لیکن یہ کوئی آسان کام نہ تھا۔ اِس کی وجہ انگریزوں کی طاقت سے زیادہ خود ہندوستانیوں کی عدم مرکزیت اور نا اتفاقی تھی۔ چنانچہ ۱۸۵۷ء میں جب ہندوستانیوں کو یہ موقع ملا تو وہ محض اپنی عدم مرکزیت اور نا اتفاقی کی وجہ سے جیتی ہوئی بازی ہار گئے۔

غدر کی ناکامی نے سب کے حوصلے پست کر دیئے۔ حالیؔ غدر کے خاموش تماشائی نہیں تھے بلکہ وہ خود اُس کے ایک فرد تھے اور بمشکل اُن کی جان بچی تھی۔ وہ حصار سے بمشکل پانی پت پہنچ سکے تھے اور پانی پت میں اُنھوں نے تذکرۂ دہلی کا جو حال دیکھا تھا وہ اُن کی آنکھوں میں تھا۔ غدر کی ناکامی کے بعد انگریزوں کی گرفت ہندوستان پر اور مضبوط ہو گئی اور ہندوستان ایسٹ انڈیا کمپنی کے بجائے راست تاجِ برطانیہ کے تحت آگیا۔ بہادر شاہ ظفر غدر میں حصہ لینے کی پاداش میں ملک بدر کر دیئے گئے۔ اُن کے بیٹوں کو قتل کر دیا گیا۔ غالبؔ کی پنشن بند ہو گئی۔ محمد حسین آزاد کو دلّی چھوڑ کر لاہور بسانا پڑا۔ کئی اُمرا اور رؤسا کو پھانسی کے تختے پر چڑھنا پڑا اور جو بچے اُن کی زندگیاں موت سے زیادہ بھیانک ہو گئیں۔ یہ حالیؔ کے دور کا سیاسی نقشہ تھا۔

اب آیئے سماجی حالات کی طرف۔ سماجی اطمینان کا انحصار معاشی صورتِ حال پر ہوتا ہے اور معاشی صورتِ حال سیاسی حالات کی رہینِ منت ہوتی ہے۔ جب سیاسی حالات ہی بہتر نہ ہوں تو پھر سارا آوا بگڑ جاتا ہے۔ حالیؔ کا زمانہ ایسا ہی زمانہ تھا۔ سماجی طور پر شرفا خصوصاً مسلمانوں کی عزت [illegible] رہی تھی۔ کچھ ذریعۂ معاش میسر نہ تھا۔ ایسے میں سماجی انحطاط کا آنا اور معاشرے کا زوال سے دوچار ہونا فطری تھا۔ ویسے تو ان حالات سے

سارے ہندوستانی ہی پریشان تھے لیکن اُن میں بھی خاص طور پر مسلمان اور اُردو داں زیادہ ہی پریشان تھے کیونکہ انگریزوں کو یہ یقین ہوگیا تھا کہ غدر کے اصل ذمّے دار مسلمان ہی ہیں ۔ اُن کا خیال تھا کہ انگریزوں نے مسلمانوں سے حکمرانی حاصل کی تھی اور اب یہ دوبارہ انگریزوں سے اُسے حاصل کرنے کے لیے کوشاں ہیں۔ ظاہر ہے ایسے میں مسلمانوں کی پوزیشن بڑی عجیب سی ہوکر رہ گئی تھی۔ ایک تو اُن پر پہلے ہی مصائب کا پہاڑ ٹوٹا ہوا تھا اور اُس پر حاکمِ وقت بدگمان تھا۔ نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن والا معاملہ تھا۔

ایسے میں سرسیّد جیسے روشن خیال مسلمان نے یہ سوچا کہ انگریزوں کی یہ غلط فہمی دُور کرانا چاہیئے ۔ چنانچہ اُنھوں نے "اسبابِ بغاوتِ ہند" نامی ایک رسالہ اُردو میں لکھ کر اُس میں تفصیلی طور پر غدر کے اسباب بتائے اور یہ ثابت کیا کہ اُس کے لئے صرف مسلمانوں کو ذمّے دار ٹھہرانا کسی طرح حق بجانب نہیں۔ سرسیّد اور اُن کے رفقا اپنی ان کوششوں میں کامیاب ضرور ہوئے لیکن پُوری طرح نہیں ۔ اس کے بعد اُن لوگوں نے یہ سوچا کہ اگر مسلمانوں کو ہندوستان میں رہنا ہے تو اُنھیں انگریزوں سے بدگمان نہیں رہنا چاہیئے اور ذہنی طور پر اُن کی حکمرانی کو تسلیم کر لینا چاہیئے۔ اِس کے علاوہ انگریزوں کے زبان و ادب اور تہذیب و تمدّن کو بھی ایک ہوّا نہیں سمجھنا چاہیئے بلکہ اُسے اپنانا چاہیئے۔ بے شک سرسیّد اور اُن کے رفقا کا (جن میں حاؔلی بھی شامل ہیں) آج کے مسلمانوں پر یہ بہت بڑا احسان ہے کہ اُنھوں نے اُنھیں عصری علم و ادب اور شعور و آگہی کی دولت سے مالا مال کیا اور اُنھیں آج کے زمانے کے شانہ بشانہ چلنے کے قابل بنایا ورنہ آج برصغیر میں مسلمان صرف مزدور پیشہ یا چھوٹے موٹے جاہل تاجر ہوتے۔

سرسیّد کے رفقا میں حاؔلی کا درجہ بہت مُمتاز ہے۔ یہ سرسیّد ہی تھے جن کی فرمائش پر اُنھوں نے اپنی شہرۂ آفاق نظم "مسدّسِ حاؔلی" لکھی تھی اور یہ سرسیّد ہی تھے جنھوں نے اِس مسدّس کا دیباچہ لکھتے ہوئے اُسے اپنا توشۂ آخرت قرار دیا تھا:

"قیامت کے دن اگر خدا مجھ سے پُوچھے گا کہ تو دُنیا سے
کیا لایا ہے تو میں جواب دوں گا کہ حاؔلی سے مسدّس
لکھوا لایا ہوں۔"

"مسدّسِ حاؔلی" نہ صرف مسلمانوں کے لئے ایک اصلاحی پیام ہے بلکہ ایک ادبی صحیفہ بھی ہے اور اُردو والوں کو گُل و بُلبُل کی شاعری چھوڑ کر نئے حالات سے ہم آہنگ ہوکر جدید شاعری شروع کرنے کی تلقین بھی ہے۔ لیکن اس کی وجہ سے حاؔلی کو سرسیّد کی "بکارِ من کا پی" سمجھنا بھی غلط ہے، بلکہ حاؔلی کی اپنی ایک شاعرانہ

انفرادیت بھی اور بہت سے معاملات میں سرسیّد سے اُن کا اختلاف تھا۔ ڈاکٹر معین احسن جذؔبی نے علیگڈھ یونیورسٹی میں پی ایچ ڈی کے لئے اپنا جو مقالہ "حاؔلی کا سیاسی شعور" داخل کیا تھا اُس میں اُنھوں نے اس مسئلہ پر تفصیل کے ساتھ بحث کی ہے ۔ یہ مقالہ کتابی صورت میں شائع ہوچکا ہے اِس لئے اس موضوع پر بحث غیر ضروری طوالت کا باعث ہوگی۔

سرسیّد اور حاؔلی میں جو ایک بیّن فرق ہے، وہ یہ ہے کہ حاؔلی تعلیم نسواں کے بہت زیادہ حامی تھے جب کہ سرسیّد کا خیال تھا کہ صرف مرد پڑھ لیں تو یہ بھی بہت کافی ہے لیکن حاؔلی کا خیال تھا کہ جب تک عورتیں زیورِ تعلیم سے آراستہ نہ ہوں گی ہمارے سماج میں روشن خیالی نہیں آسکتی کیونکہ عورت نئی نسل کی مُعلّمِ اوّل ہوتی ہے ۔ یہ بات غالباً بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ حاؔلی نے ایک ناول بھی لکھی تھی ۔ یہ ناول اُنھوں نے اپنے آپ کو ناول نگاروں کے زمرے میں شامل کرانے کے لئے نہیں لکھی تھی بلکہ اُس سے اُن کا مقصد عورتوں کی اصلاح اور لڑکیوں میں تعلیم عام کرنا تھی ۔ "مجالس النسا" کے نام سے اُنھوں نے یہ ناول دو حصّوں میں لکھی تھی۔ "مناجاتِ بیوہ" اور "چُپ کی داد" بھی حاؔلی کی ایسی نظمیں ہیں جو عورتوں سے متعلق ہیں جن میں عورتوں کے فضائل اوصاف، فرائض اور ذمّے داریاں بتائی گئی ہیں اور اُن کی بے بسی، مظلومیت اور کس مپرسی پر روشنی ڈالی گئی ہے تعلیم نسواں کے تعلق سے حاؔلی کے خیالات کے بارے میں یہاں کسی تبصرے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ یہ حقیقت اب تبصروں سے بالاتر ہوچکی ہے ۔

حاؔلی اور سرسیّد نے جس زمانے میں اپنی اصلاحی تحریکیں شروع کی تھیں اس اُس زمانے میں ہندوستان میں عام طور پر روشن خیالی پھیل رہی تھی اور دیگر اقوام اصلاح کی کوششوں کا آغاز کرچکی تھیں۔ بنگال میں راجا رام موہن رائے اور پنجاب میں آریہ سماجی لیڈروں نے ہندو سماج اور مذہب میں اصلاحی تحریکیں شروع کیں اور ذات پات اور بُت پرستی کے وجود سے انکار کرتے ہوئے مساوات اور وحدت کا پرچار کیا ۔ اُس زمانے میں عیسائی مشنریاں بھی سرگرم عمل ہوچکی تھیں اور عام ہندوستانی تو نہیں لیکن ادنا ذات کے ہندو اپنے اعلا ذات کے بھائیوں کی تنگ نظری سے بددل ہوکر عیسائیت کی گود میں پناہ لے رہے تھے ۔ ایسے ماحول میں حاؔلی نے نہ صرف سماجی اور تعلیمی اصلاحات پر زور دیا بلکہ مسلمانوں کی مذہبی تنگ نظری اور جہالت کو دُور کرنے کا بھی مشورہ دیا ؎

خندہ زن ہے اُس مسلمانی پہ کفر
جیسی ہے حاؔلی مسلمانی تری

غدر کی وجہ سے حالات کے بدل جانے کے نتیجہ میں حاؔلی کو اپنی اِس قسم کی

شاعری کے لئے میدان اور ہموار نظر آیا۔ خصوصاً اُن کے قیام لاہور کے زمانہ میں جہاں انجمن اسلام پنجاب کے زیرِ اہتمام ہر ماہ مشاعرہ ہوتے تھے اور مصرع طرح کی بجائے عنوانات دے کر نظمیں لکھائی جاتی تھیں وہاں حالی کی شاعری کے جوہر خوب چمکے اور یہیں مولانا محمد حسین آزاد کو حالی سے حسد پیدا ہوا۔ اس طرح یہ بات بلاخوفِ تردید کہی جاسکتی ہے کہ غدر کے بعد کے ماحول میں جہاں عام انسانوں کے حوصلے پست ہو گئے، حالی کے حوصلے اور زیادہ بلند ہوئے اور اُنھیں اپنی شاعری کے لئے یہ ماحول زیادہ سازگار نظر آیا۔ اُن کے ذہن میں یہ بات بیٹھ گئی کہ اس وقت لوہا گرم ہے ضرب پر ضرب لگانی چاہیئے۔ چنانچہ اسی وجہ سے وہ برسرِ عام یہ اعلان کرنے کے قابل ہو سکے کہ ؎

حالی اب آؤ پیروئ مغربی کریں
بس اقتدائے مصحفی و میر کر چکے

حالی کو اپنی زندگی میں جہاں جاہل عوام اور تنگ نظر عالموں کی جانب سے مخالفت کا سامنا کرنا پڑا وہیں روشن خیال عوام اور فراخ دل علما و رؤسا نے اُن کی عزت افزائی بھی کی۔ حکومتِ وقت نے بھی اُن کے کارناموں کو بہ نظرِ استحسان دیکھ کر اُنھیں شمس العلما کا خطاب عطا کیا جس کے بارے میں اُن کے ہم عصر اور دوست مولانا شبلی نعمانی اُنھیں ایک خط میں لکھتے ہیں:

"مولانا! آپ کو تو نہیں، خطاب شمس العلمائی کو مبارکباد دیتا ہوں۔ اب جا کر اس خطاب کو عزت حاصل ہوئی۔"

الغرض حالی نے اصلاحِ قوم و ملت اور زبان و ادب کا جو مشن شروع کیا تھا اُس میں اُنھیں خاطر خواہ کامیابی ہوئی اور اپنی زندگی ہی میں وہ اپنی محنت کا ثمر دیکھنے کے قابل ہو گئے تھے۔ اس لحاظ سے اُن کا یہ شعر کتنا حسبِ حال معلوم ہوتا ہے ؎

حالی اُٹھا ہلا کے محفل کو
آخر اپنا کہا کیا تو نے

OO

◎ زرِ سالانہ ختم ہونے کی اطلاع

اس حلقے میں سرخ نشان کے معنے یہ ہیں کہ آپ کا سالانہ خریداری نومبر ۱۹۷۶ء میں ختم ہو چکی ہے۔ ازراہ کرم سالِ رواں کے لئے مبلغ ۱۶ روپے جلد بھیج دیجیے۔ اُمید کہ آپ تجدید خریداری سے ضرور نوازیں گے۔ اگر منی آرڈر نہ بھیج سکیں تو دفتر کو وی پی بھیج دینے کی ہدایت کریں۔ زرِ سالانہ وصول نہ ہونے کی صورت میں "شاعر" کی روانگی روک دی جائے گی۔ — منیجر

بے چہرگی

مرا وجود
تپ کے اپنی آگ میں
سکڑ گیا ہے
راکھ ہو سکا نہیں
یہ وہ نہیں کہ جس کی تہہ میں
رینگتی ہے روشنی
وہ روشنی جو عکس ہے وجود کا
جو رنگ ہے نمود کا
مرا وجود آج پھر شکار ہے جمود کا
جلے تو کچھ نہیں جلے
تپے تو اینٹھ کر اٹھے
اندھیرا اور بھی بڑھے
نہ مر سکے نہ جی سکے
مرا وجود
ریت میں تپی ہوئی لکیر سا ہے
ہوا کی جو اسیر ہے۔

رشید عبدالسمیع جلیل

میرا لمحہ

وہ اک لمحہ
ازل سے بے صدا ہے جو
مری مٹھی میں اب تک قید ہے لیکن
مجھے سوتا ہوا پاکر
کبھی اڑتا کبھی تحلیل ہوتا ہے۔
مرا پرتو مری پرچھائیاں بن کر
کہیں وہ ڈوب جاتا ہے۔
عدم کے موڑ تک چپ چاپ چلتا ہے۔
مگر وہ
مری غفلت کا ہے سودائی
مرے ہاتھوں میں جب تک سانس لیتا ہے
مجھے مرنے نہیں دیتا
وہ لمحہ مجھ سے زندہ ہے
وہ لمحہ میرا لمحہ ہے۔

○ ۴۴۷/۵ - ۶ - ۵ - نامپلی حیدرآباد - ۱

ایک شام اور وہ آدمی

(ہندی)

دیویندر اسّر

ترجمہ : حیدر راحتؔ

معرفت، ساون آرا۔ بستوپور مارکیٹ، جمشید پور-۱

باہر زوروں کی بارش ہو رہی تھی۔ درختوں سے پھول اور پتے گِر گِر کر پانی میں بہنے لگے اور بھیگی ہوا کے ٹھنڈے جھونکے برف کے ذرّوں سے جسم کو چھونے لگے۔ چاروں طرف سے اندھیرا گھر جانے کی وجہ سے برآمدہ بالکل تاریک ہو گیا تھا۔ میں کرسی اُٹھا کر اندر آ گیا اور کھڑکیاں بند کر کے پردے گرا دیئے۔ بادل، بارش اور ہوا کے عجیب سے شور سے کمرہ بھر گیا تھا۔ میں نے آتشدان میں کچھ لکڑیاں اور ڈال دیں اور آگ تیز کر دی۔ ابھی ابھی اُس کا تار آیا تھا کہ وہ نہیں آ سکے گی اور میں سوچ رہا تھا کہ یہ سیاہ پتھر سی شام کیسے کٹے گی؟ ایسی شاموں میں مجھے تنہائی کا اتنا گہرا احساس ہوتا ہے کہ میں سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہوں کہ آدمی کیوں زندہ ہے؟ کس کے لئے — ؟ آخر کیوں — ؟

اس درمیان برآمدے میں کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دی لیکن یہ آہٹ اُس کے قدموں کی نہیں تھی۔ دہلیز کے قریب آ کر قدم رُک گئے۔ میں نے تھوڑی دیر انتظار کیا۔ شاید کوئی اندر آ جائے یا دروازے پر دستک ہی ہو۔ لیکن نہ کوئی اندر ہی آیا اور نہ ہی دستک ہوئی۔ ایک لمحہ کے لئے مجھ پر خوف سا طاری ہو گیا۔ اور میں ہمت نہیں کر سکا کہ باہر جا کر دیکھوں کہ کون ہے؟ برآمدے میں قدموں کی آواز پھر سنائی دینے لگی۔ میں نے کھڑکی کا پردہ ہٹا کر باہر جھانکا۔ اندھیرے میں ایک سایہ سا حرکت کر رہا تھا۔ آدھا سیاہ چہرہ — کالا کوٹ اور سفید پتلون پہنے کوئی کھمبے کے سہارے کھڑا تھا۔ اُس نے جیب سے پائپ نکالا اور دیاسلائی جلانے کی کوشش کی لیکن ایک کے بعد دوسری اور پھر کئی دیاسلائیاں جلانے کے بعد اُس نے ڈبیہ پھینک دی۔ بارش میں ماچس بھیگ چکا تھا۔ اُس نے پائپ جیب میں رکھ لیا۔ کھڑکی کا پردہ ہٹانے سے روشنی کا ایک ہالہ سا کمرے میں پھیل گیا، آدھا سیاہ چہرا کھڑکی کی طرف مڑا۔ ایک بوڑھا چہرہ، دُبلا، جھرّیوں بھرا —— لیکن اُس کی آنکھیں اتنی روشن کیوں ہیں؟ شیشے کے آر پار ہم دونوں کی آنکھیں ٹکرائیں۔ بوڑھا آدمی بارش میں پوری طرح بھیگ چکا تھا۔ اس کے کپڑوں سے پانی کی بوندیں ٹپک رہی تھیں لیکن جیسے وہ ان سب سے بے خبر تھا۔ میں نے دروازہ کھولا اور اُس سے اندر آنے کو کہا۔

’شکریہ! آپ کا برآمدہ پانی سے بھر گیا ہے‘! اُس نے اپنے بھیگے کپڑوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ وہ دروازے کی طرف مُڑا۔ دہلیز پر آ کر وہ رُک گیا اُس کے کپڑوں سے ابھی تک پانی ٹپک رہا تھا۔

’کوئی فکر کی بات نہیں۔ یہ سامنے بائیں جانب باتھ روم ہے۔ آپ آرام سے کپڑے بدل لیں۔ میں دوسرے کپڑے دیئے دیتا ہوں‘۔ میں نے اُس کی جسمانی حالت کا اندازہ لگاتے ہوئے کہا۔

بوڑھے نے میری جانب مشکور نظروں سے دیکھا۔ اُسکی آنکھیں روشن ہو گئیں۔ شاید اُس کے بجھے ہوئے چہرے پر یہ آنکھیں ہی روشن تھیں۔ وہ باتھ روم میں داخل ہو گیا۔ میں نے اپنا کرتا پاجامہ اور تولیہ اُسے دے دیا۔ اُس کے باتھ روم میں جانے کے بعد میں سوچنے لگا یہ کون ہو سکتا ہے —؟ شاید یہ کوئی ٹورسٹ (سیاح) ہو۔ اِس علاقے کا تو معلوم نہیں ہوتا۔ لیکن اِس عمر میں اکیلے گھومنا خطرے سے خالی نہیں۔ شاید وہ اپنے ہمراہیوں سے بچھڑ گیا ہے۔ میں نے تاش کے پتے سمیٹے، اسٹوو جلایا اور چائے کا پانی رکھ دیا۔ آتشدان میں دو ایک لکڑیاں اور ڈال دیں۔ میں اکیلا تھا۔ لیکن ایک ایسے آدمی کے ساتھ جو زندگی کی تقریباً ساری شامیں گزار چکا ہو، شام گزارنے کا تصوّر بھی نہیں کر سکتا تھا۔ ایک بوڑھے آدمی کے پاس کیا ہو سکتا ہے۔ ماضی کی کچھ دُھندلی یادیں۔ لیکن اِن بھیگے ہوئے کپڑوں میں، اِس سردی میں اُسے کوئی ٹھکانا نہیں ملا تو وہ یقیناً مر جائے گا۔ اور کسی کے مرنے کے خیال سے مجھے بڑا خوف سا محسوس ہوتا ہے۔ جیسے میں اکیلا اِس دنیا میں رہ گیا ہوں۔ چاہے مرنے والا اجنبی ہی کیوں نہ ہو۔

باہر بارش اور تیز ہو گئی تھی۔ بادل زور زور سے گرج رہے تھے اور اُن کی گرج پہاڑوں سے ٹکرا کر گھاٹیوں میں دیر تک گونجتی رہی۔ بوڑھا آدمی باتھ روم سے واپس آ گیا تھا۔ میری قمیص اور میرے پاجامے میں وہ ایسا

لگ رہا تھا جیسے بانس کے بنے ہوئے کسی پنجر پر کپڑے کا غلاف چڑھا دیا گیا ہو۔ اُس نے اپنے چھوٹے چھوٹے بالوں پر اُنگلیوں سے کنگھی کی۔ اور کرسی سرکا کر آتشدان کے پاس بیٹھ گیا۔ میں نے چوکیدار کو بُلا کر اُسکے کپڑے دے دئیے تاکہ وہ اُنھیں سکھا کر پریس کردے۔ بوڑھے نے اپنا پائپ نکالا اور اُس میں تازہ تمباکو بھرا۔ آتشدان میں سے لکڑی کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا نکال کر اُسے سُلگایا۔ وہ کرسی پر ٹانگیں سُکیڑ کر بیٹھ گیا اور پائپ پینے لگا۔ جب وہ آتشدان پر جھکا تھا تو آگ کی لال لپٹوں میں اس کے چہرے کی جُھرّیاں اور چھوٹی چھوٹی آنکھیں بہت خوبصورت لگیں۔ یہ کیسی خوبصورتی تھی۔؟ میں اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا لیکن اتنا جانتا ہوں کہ اس کے بعد بوڑھا میرے لئے اجنبی نہیں رہا۔

’آپ کہاں سے آرہے ہیں‘ میں نے پُوچھا۔

’شملہ سے! راستے میں بارش نے گھیر لیا، ورنہ ابھی مجھے اور آگے جانا تھا‘ اُس نے جواب دیا۔

’آج رات یہیں آرام کر لیجئے! صبح تک شاید بادل چھٹ جائیں! تب چلے جائیے گا۔ میں نے کہا۔

’اگر آپ کے آرام میں کوئی خلل نہیں پڑے تب . . .

اور میرے جواب کا انتظار کئے بغیر ہی اُس نے شکریہ ادا کیا۔

’کیا آپ اکیلے ہیں‘ میں نے پُوچھا

’اکیلا‘! وہ اس جواب سے جیسے چونک پڑا۔ ہاں اِس لحاظ سے اکیلا ہوں کہ میرا کوئی گھر بار نہیں ہے‘

’آپکے بیوی بچّے‘ — میں نے پھر سوال کیا۔

بوڑھا مُسکرانے لگا — ’شادی ابھی نہیں ہوئی اور ابھی کوئی ارادہ بھی نہیں ہے۔

ابھی ارادہ نہیں ہے۔ والی بات سُن کر اچانک مجھے ہنسی آگئی۔

’آپ بُرا نہ مانیں تو کیا پُوچھ سکتا ہوں کہ آپ کی عمر کیا ہوگی‘ میں نے پوچھا

’ساٹھ سال پہلے پیدا ہوا تھا‘ — تھوڑی دیر رُکنے کے بعد پھر اُس نے کہا —

لیکن یہ بھی کوئی عمر ہے‘۔

آتشدان میں آگ بھڑک اُٹھی تھی اور لکڑیوں کے چٹخنے کی آواز آنے لگی تھی شعلوں کے ساتھ دیوار پر بیتی یادوں کے سائے سے لہرانے لگے

میں اپنے شہر کی گہما گہمی اور دوستوں کی محفل سے بھاگ کر اس ویران پہاڑی

جگہ پر آٹھہرا تھا۔ موہن تارا نے آج یہاں ملنے کا وعدہ کیا تھا۔ لیکن پتا نہیں وہ کیوں نہیں آسکی۔ اور پھر اس ویران بستی کی شام اور تنہائی مجھے گھیر لیا —

’لیکن آپ نے شادی کیوں نہیں کی‘ میں نے کہا — اِس عمر میں تو کسی ساتھی کی بڑی ضرورت پڑتی ہے۔ اکیلے اِس پہاڑ جیسی زندگی کو کاٹنا کوئی آسان کام نہیں

میں اکیلا کہاں ہوں۔ میں اکیلا نہیں‘ بوڑھے کے چہرے پر لمحہ بھر کے لئے روشنی اور سائے ایک دوسرے کو ڈسنے لگے۔ اُس نے پائپ کا ایک لمبا کش لیا۔ میرے اور اُس کے درمیان دُھوئیں کا ایک غبار پھیل گیا۔ چائے کا پانی کھولنے لگا تھا‘ بوڑھے کے ہونٹ ہلے — مجھے تنہائی کا کبھی احساس نہیں ہوا۔ مجھے مُلک مُلک گھومنے میں بڑا مزا آتا ہے۔ اور اسی سبب میں بچپن ہی میں گھر سے بھاگ نکلا تھا۔ جب میں رنگ برنگے پھولوں سے لدے پودوں کو لہلہاتے ہوں تو میرا جسم رنگ‘ خوشبو اور مُسرّت سے بھر جاتا ہے۔ جیسے میرے جسم پر عمر کا کوئی بوجھ نہیں۔ جیسے میں ایک خوبصورت پودا ہوں۔ ہوا کے دوش پر جُھومتا اور لہلہاتا — جب میں کہیں کسی پہاڑی جگہ میں دور بانسری کی آواز سُنتا ہوں تو مجھے محسوس ہوتا ہے کہ موسیقی کی لہریں میرے چہرے کی جُھرّیوں میں داخل ہوگئی ہیں۔ اور جُھرّیاں بھر گئی ہیں۔ اور میرا جسم سِتار کی مانند بج اُٹھتا ہے۔ بغیر کسی کی اُنگلیوں کی حرکت کے —

میرے دیکھتے ہی دیکھتے بوڑھا جیسے کسی خاص شکل میں ڈھل گیا ہو۔

دوست! یہ سب شاعری ہے‘ — میں نے چائے کی پیالی اُسے دیتے ہوئے کہا۔

میں تمہارے لئے اجنبی ہوں نوجوان۔ لیکن کچھ ہی لمحوں کے میل سے عمر اور بیگانگی کے فاصلے ہٹ گئے ہیں۔ اور بے اختیاری میں تم نے مجھے دوست کے طور پر قبول بھی کر لیا۔ خیر! — یہ شاعری کی بات میری سمجھ میں نہیں آتی۔ جب کوئی خوبصورتی کا اظہار کرتا ہے تو آواز اُٹھتی ہے‘ یہ شاعری ہے۔ جب کوئی وہ زندگی کا معیار پیش کرنے لگتا ہے تو لوگ کہتے ہیں یہ نمائش ہے۔ کیا زندگی صرف . . . ‘ بوڑھے کی آواز میں کرب تھا۔ اُس کے ہاتھ کانپے اور چائے کی پیالی گرتے گرتے بچی۔ مُعاف کرنا بھائی! شاعری اور نمائش کی بحث میں کبھی ایسا حادثہ ہو ہی جاتا ہے؛ — اِس لئے پیالی سنبھالتے ہوئے کہا اور آتشدان کے لپکتے ہوئے شعلوں کی طرف دیکھنے لگا۔

تھکان‘ کمزوری‘ بڑھاپے اور چائے اور آگ کی گرمی کی وجہ سے اُس کی آنکھیں بند ہونے لگی تھیں۔ آتشدان میں آگ دھیرے دھیرے ٹھنڈی پڑنے لگی۔ دہکتے ہوئے کوئلوں پر راکھ کی سلیٹی تہیں جمنے لگیں چوکیدار اُسکے کپڑے پریس کرکے لے آیا تھا۔ چاروں طرف گہری خاموشی چھا گئی۔ بوڑھا آرام کرسی

(بقیہ صفحہ ۴۹ پر دیکھئے)

غزلیں

محبوب راہی

رات کو ایک نئے ڈھنگ سے دیکھا جائے
آؤ سورج کو اندھیروں میں اُگایا جائے

پستیاں لاکھ میری منزلِ مقصود سہی
میں ہوں چڑھتا ہوا سورج مجھے پوجا جائے

مجھ میں کردار کے موتی بھی نظر آئیں گے
ایک سمندر کی طرح مجھ کو کھنگالا جائے

پھر پرستش کو عقیدت کی جبیں ترسے ہے
پھر کوئی پیکرِ تخئیل تراشا جائے

کوئی حیلہ تو ہو تدبیر کی ناکامی کا
آؤ کوتاہیٔ قسمت ہی کو رویا جائے

تیرہ بختی میں یقیناً کبھی کام آئیں گی،
چاند کی نقرئی کرنوں کو سمیٹا جائے

بیٹھ کر آج کہیں گوشۂ تنہائی میں
راہی کچھ اپنے تعلق سے بھی سوچا جائے

○ نزد گلزار مسجد ۔ بارسی ٹکلی (ضلع اکولہ)

اقبال ماہر

تکتے ہیں بام و در مجھے انجان کی طرح
رہتا ہوں اپنے شہر میں مہمان کی طرح

ہر سمت کائنات میں بکھرا ہوا ہوں میں
اک خانماں خراب کے سامان کی طرح

فکر و خیال کے کہیں جمتے نہیں قدم
یہ ذہن ہے پہاڑ کے ڈھلوان کی طرح

سینہ میں خاک ہے کسی اُجڑے دیار کی
چہرے پہ آب و رنگ ہے گلدان کی طرح

میری انا نے توڑ دیا کاسۂ سوال
رہتا ہوں اپنے وقت کے سلطان کی طرح

سیرت بگڑ چکی ہے مگر اس کا شکر کر
صورت تو برقرار ہے انسان کی طرح

افسانۂ حیات میں مجھ کو تلاش کر
پیشانیٔ ورق پہ ہوں عنوان کی طرح

ماہر کبھی جو مرکزِ جشنِ بہار تھا
وہ دل سُلگ رہا ہے بیابان کی طرح

○ ۱۳۷ ، نخاص خانہ الہ آباد ۔ ۳

عابد تمناوری

کہا جو راحتِ یک لمحہ بخش دے مجھ کو
تمام رنج و الم اُس نے دے دیئے مجھ کو

ہوا تھمے گی کبھی اِس کا انتظار نہ کر
بکھر رہا ہوں میں، آ کر سمیٹ لے مجھ کو

سجانے چاہے تھے میں نے تو خود پہ ساتوں رنگ
مگر یہ رنگ ہی بے رنگ کر گئے مجھ کو

کٹھن نہ تھا مرا ملنا مگر تھی شرط اتنی
بجھا کر آنکھوں کو اپنی وہ ڈھونڈتے مجھ کو

جنم جنم سے مجھے انتظار ہے جس کا
وہ ہے بھی یا نہیں کچھ تو پتا چلے مجھ کو

چھپا ہوا تھا میں زیرِ زمیں مگر عابد
خلا کے دشت میں وہ ڈھونڈتے رہے مجھ کو

○ ۱۸۰ گاندھی نگر جموں ۔

"میری یادوں کے چنار" ــــــ ایک مختصر جائزہ

مجید مضمر
ہاکورہ اننت ناگ، کشمیر

کرشن چندر کا یہ ناول کئی لحاظ سے اردو فکشن میں اپنے قسم کا پہلا ناول ہے۔ مختلف ادبی تحریکوں، سیاسی افکار نفسیاتی اور فلسفیانہ نظریوں اور جمالیاتی تحریکوں نے فکشن پر جو اثر ڈالا ہے اُس سے کرشن چندر بھی مانوس دکھائی دیتے ہیں۔ برگساں کے ٹائم آرٹ کا تصوّر ہو یا فرائڈ کی جنسی تحریک یا پھر ولیم جیمز، یونگ JUNG اور ڈملن اور ایلیٹ کے فلسفیانہ اور ادبی نظریات ہوں ان سب کا براہِ راست اثر اس ناول میں نمایاں ہے۔

"میری یادوں کے چنار" میں آٹو بیوگرافی کی تکنیک استعمال کی گئی ہے۔ اس تکنیک کی خصوصیات یہ ہیں کہ اس میں مرکزی کردار یعنی مصنّف کا کردار دوسروں کے تجربوں کا محض تماشائی ہوتا ہے۔ اُسے صرف اپنے تجربوں اور مشاہدوں پر بھروسا کرنا ہوتا ہے۔ یہ تکنیک اس لحاظ سے مشکل بھی ہے کہ فنکار ان ہی واقعات کو پیش کر سکتا ہے جو اُس کے اپنے ہوں یا جن کا اُس نے خود مشاہدہ کیا ہو۔۔۔ اس تکنیک کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں تجربوں اور یادوں کے سلسلے کی اہمیت ہوتی ہے اور اسی وجہ سے یہ تکنیک ایک جدید اور نفسیاتی تکنیک تلازمۂ خیال Association of Ideas سے متاثر ہے۔

ناول کا مرکزی کردار یعنی لڑکے کا کردار خود مصنّف کا کردار ہو سکتا ہے۔ ناول کا سب سے پہلا جملہ "وہ پونم کی صبح تھی، اُٹھتے ہی ماں نے مجھے نہلایا" اس بات کا ثبوت ہے کہ مصنّف خود متکلم ہے۔ کرشن چندر کا تعلق کشمیر سے رہا ہے اور اس ناول میں بھی لڑکے کی یادیں کشمیر ہی سے وابستہ ہیں۔ باپ کا ڈاکٹر ہونا اور انسان دوستی کی بنا پر مجبوراً کشمیر چھوڑ دینا ناول کو کرشن چندر کی آپ بیتی بنا دیتا ہے اور سب سے بڑھ کر کرشن چندر کے سر پر زخم کا نشان بھی اس سچائی کا ثبوت ہے۔ تاراں کے ساتھ انگور کھاتے کھاتے درخت سے مرکزی کردار کے نیچے گر جانے اور سر میں چوٹ لگنے کے واقعے کے بعد یہ الفاظ ہمارے شک کو یقین میں تبدیل کر دیتے ہیں:

اب دل کے بہت سے زخم مندمل ہو کر بے نشان ہو چکے ہیں
لیکن سر پر اُس زخم کا نشان باقی ہے۔ اب وہاں پر ایک کالا سا
مسّا بن گیا ہے۔ کبھی کبھی بے خبری میں جب اس مسّے پر ہاتھ
لگ جاتا ہے تو ذہن سے حال کے تمام ہیولے غائب ہو جاتے ہیں
ذہن میں ایک پتنگ سی جھولنے لگتی ہے۔" صفحہ ۱۰۱

یہ کرشن چندر کے الفاظ ہیں جن کے سر پر زخم کا نشان کالا سا مسّا بن گیا ہے۔ آٹو بیوگرافی کی تکنیک کے تحت ناول نگار کو صاف گوئی سے کام لینا ہوتا ہے۔ کرشن چندر اس لحاظ سے بہت کامیاب نظر آتے ہیں۔ وہ بہت ہی بیباک ہیں۔ اُن کی بیباکی کبھی کبھی اچھی نہیں لگتی، لیکن یہی بیباکی اکثر اُن کے اسلوب کی خصوصیت بن جاتی ہے۔ باب دوم میں ندی کے کنارے جو واقعہ ہے اُسے کرشن چندر یوں بیان کرتے ہیں:

"کیوں بے تیری ماں کہاں ہے!" سُندر گھراٹیا پانی میں تیرتے تیرتے مجھ سے پوچھنے لگا۔

"وہ سو رہی ہے ــــ" میں نے بڑی معصومیت سے کہا۔

"تو اُسے میرے پاس بھیج دے" سندر گھراٹیا تیرتے تیرتے ہوا میں اُچھلا اور مجھے اپنا ننگا بدن دکھاتے ہوئے پھر پانی میں ڈبکی لگا گیا۔

سب نوجوان ہنسنے لگے ــــ" صفحہ ۵۵

شاعری ہو یا مصوّری، بُت تراشی ہو یا موسیقی، ناول نویسی ہو یا ڈرامانگاری کسی بھی فن میں فنکار اپنے آپ کو بھی ظاہر کرنا چاہتا ہے۔ اُس کی "انا" بولتی ہوئی نظر آتی ہے۔ ناول کی اس تکنیک میں انانیت ظاہر کرنے کی کافی گنجائش ہے۔ بعض ناول نگار زندگی کے اُس واقعہ کو بیان نہیں کرتے جس سے اُن کی عظمت میں فرق آ جائے۔ وہ اصلی حالات کو چھپا کے بھی رکھتے ہیں۔ "میری یادوں کے چنار" میں ایسی بات نہیں ہے۔ ہاں یہ بات اور ہے کہ ایک طرف ڈاکٹر کے رشوت نہ لینے کا ذکر ہے اور دوسری طرف اپنے گھر کی شان و شوکت اور [illegible] کا ذکر۔ اگر گھر میں آپریشن کے لئے دو ہزار روپیا نہیں تو

اتنے سارے نوکروں کی فہرست کیوں کر بنا دی گئی۔ تاہم باقی ناولوں کے مقابلہ میں اس ناول میں مبالغہ EXAGGERATION نہ ہونے کے برابر ہے۔

تلازمۂ خیال یعنی ASSOCIATION OF IDEAS کی تکنیک کی خصوصیات

خصوصیات اس ناول میں اس درجہ موجود ہیں کہ ہمیں اس تکنیک کا بار بار احساس ہوتا ہے۔ ناول کا نام علامتی ہے۔ ناول نگار نے بچپن سے لڑکپن تک کے تجربوں اور یادوں کو پیش کیا ہے۔ ہر تجربہ چنار کے درخت کی طرح استوار مستحکم اور گھنا ہے جس کی جڑیں کافی مضبوط ہیں۔ یہاں یادوں کے چنار یعنی اپنی یادوں کے مستقل نشانات کو پیش کیا گیا ہے اور ایک خاص زمانے میں یادوں کے ایسے چناروں کی نشاندہی کی گئی ہے۔ اس ناول میں یادوں کا بہاؤ شعور کی سطح پر ہے۔ لڑکا بڑا ہو گیا ہے اور وہ اپنے شعور کی رَو پر یادوں کی کڑیوں کو جھونک رہا ہے اور کچھ اس طور پر کہ ہم اس بہاؤ کو محسوس کرتے ہیں۔ مختلف ابواب میں مختلف اور کہیں کہیں متضاد مناظر پیش کیے گئے ہیں۔ ایک کے بعد دوسرا منظر آتا ہے۔ کئی مناظر بے حد خواب آلودہ ہیں۔ انتہائی خوبصورت اور دلفریب اور کئی مناظر تلخ سچائیوں کو لیے کر کرتے ہیں۔ ان مناظر میں زندگی کے کئی روپ فنکار کے مشاہدوں کی گرفت میں نہایت ہی خوبصورتی سے آئے ہیں۔ کہیں زندگی ایک خوبصورت خواب ہے، کہیں فریب، کہیں تلخ حقیقت ہے اور کہیں شیریں یاد۔ یہ احساس و تجربات کی کہانی ہے۔ یہ تجربات و محسوسات مختلف ہیں جن میں بظاہر کوئی معنی خیز رشتہ نہیں لیکن گہرائی سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ ایک داخلی اور باطنی رشتہ قائم کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ جیسے کسی ٹوٹے ہوئے آئینے کے شیشوں کو جوڑ دیا جائے اور ان سے آئینے کی ایک صورت ابھرے۔ یہاں جدید تر فلمی تکنیک مونتاژ (MONTAGE) کا اثر دکھائی دیتا ہے۔

تلازمۂ خیال کی تکنیک کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ ایک یاد سے دوسری یاد اور ایک خیال سے دوسرا خیال ابھرتا ہے۔ ایک تجربہ دوسرے تجربہ تک لے جاتا ہے۔ نفسیات کے ماہروں کے مطابق ہمیں تکلیف دہ واقعات ANNOYING SITUATIONS زیادہ یاد رہتی ہیں۔ "میری یادوں کے چنار" کا ایک ایک واقعہ المیہ رہا ہے۔ اس ناول میں جہاں ملک محمد، فجا ڈاکو، موسیٰ خان اور نیاز احمد کی موت سے دل پر ایک مغموم کیفیت طاری ہوتی ہے وہاں غریبوں کا بیگار جانا، ڈاکٹر کا رشوت لینا اور فجا کی مجبوری اور انسان دوستی کے لئے ڈاکٹر کو ریاست سے نکالنا وغیرہ سماجی و سیاسی ماحول پر ترجمہ کہنے پر مجبور کرتا ہے۔ ساتھ ہی اس ناول میں شاداں، خانم، شانو غامو، بیبی

شیریں، راج محل کی لڑکی اور خود مصنف اور تاداں کی محرومئ قسمت کا بھی گہرا احساس ہوتا ہے۔ یہ سب غمناک مناظر ہیں اور اسی وجہ سے لڑکے کے ذہن پر نقش ہو گئے ہیں اور آج بھی اُن یادوں کی ٹکروں میں تازگی معلوم ہوتی ہے۔

نفسیاتی طور پر اگر دو واقعوں میں کسی قسم کی مناسبت CONTIGUITY ہو تو ایک سے دوسرا واقعہ یاد آنا لازمی ہے اور اگر دو واقعوں میں کسی قسم کا تضاد DIFFERENCE ہو تو ایک یاد سے دوسری یاد اُبھر سکتی ہے۔ پہلے نقطۂ نظر کے تحت اس ناول میں ڈاکٹر اور فجا۔ دونوں کی مجبوریاں قدرے ایک ہی نوعیت کی ہیں۔ باب پنجم میں ڈاکٹر اپنی بیوی کے آپریشن کے لئے دو ہزار روپیا رشوت لیتا ہے اور فیض محمد خاں باب ششم میں کسی مجبوری کی بنا پر فجا ڈاکو بنتا ہے۔ اس طرح ان دو واقعوں میں مناسبت پائی جاتی ہے اور لڑکے کے ذہن میں پانچویں سے چھٹا واقعہ آتا ہے۔ اسی طرح شانو اور شیریں کے واقعوں (باب ہفتم و ہشتم) میں بھی کچھ مناسبت پائی جاتی ہے۔ دونوں عورتیں ڈاکٹر کو خوش کرنے کی کوششیں کرتی ہیں۔ ایک سویٹر بناتی ہے اور دوسری ڈاکٹر کی بیوی سے سانپ کا زہر نکال لیتی ہے۔ دونوں ابواب میں لڑکے کی ماں کا کردار اجنبی لڑکیوں کے خلاف ہوتا ہے۔ ان دونوں رومانوی واقعوں میں لڑکے کی ماں کے سخت رویّہ سے مایوس ہو کر لڑکیاں ڈاکٹر کے ہاں سے چلی جاتی ہیں۔ اس طرح اُن میں کافی مناسبت پائی جاتی ہے۔ لہذا ضمیر متکلم بلکہ مصنف کو شانو کے واقعے سے شیریں کا واقعہ یاد آتا ہے اور ہمیں تلازمۂ خیال کا احساس ہوتا ہے۔

دو متضاد واقعے بھی یکے بعد دیگرے یا ایک ساتھ یاد آ سکتے ہیں۔ تھانیدار نیاز احمد ڈاکٹر کا دوست ہے، وہ مسلمان ہے لیکن فرقہ پرست نہیں جبکہ باب دہم میں ماسٹر بہادر علی خاں بہت بڑا فرقہ پرست ہے۔ ڈاکٹر سے جھگڑتا ہے یا یوں کہئے کہ اُس کا دشمن ہے۔ باب نہم اور باب دہم کے دو افراد ـــــ تھانیدار اور ہیڈ ماسٹر اس طرح دو متضاد شخصیتوں کے مالک ہیں اور یہی تضاد لڑکے کی یاد داشت کو اُکسانے کا باعث ہو جاتا ہے۔

جدید عصوری نے جہاں موسیقی، شاعری اور بت تراشی وغیرہ کو متاثر کیا ہے وہاں فکشن بھی اُس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ یہ ناول اُس کا ایک نمونہ ہے۔ اس میں جدید عصوری کی خصوصیات میں سے چار کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔

ا۔ ذاتی یا داخلی وجدان PERSONAL VISION فنکار کی داخلی نظر VISION اس ناول میں موجود ہے۔ وہ عقل کے نہیں بلکہ وجدان کے دوش پر یادوں کی دنیا میں سفر کرتا ہے۔ ہر کہانی کا تاثر نشہ یہاں کہا ہے۔

۱۔ گنجینہ (... SO & PE) ... کی طرح اس میں بھی گریز کی اہمیت بہت ہے۔ ناول نگار نے اس ناول میں [illegible] حالات سے گریز کیا ہے۔

۲۔ ذہنی [illegible] محسوس کرتا ہے۔ یادوں کی دنیا میں کھو جاتا ہے ایسا لگتا ہے جیسے [illegible] وہ ان کی باتیں بتا رہا ہے۔

۳۔ مصنف تکنیک کے معاملے میں آزادی برتتا THE FREE TREATMENT OF THE FORM ہے۔ یک سنوارنے کی پابندیوں کے بغیر ناول نگار نے "میری یادوں کے چنار" میں یادوں کو بیان کیا ہے۔

۴۔ رنگوں کی تجریدیت ABSTRACTNESS یہ خصوصیت اس ناول میں [illegible] کے ساتھ پائی جاتی ہے۔ شام کے دھندلکے میں جیسے کچھ چھپ گیا ہے۔ اس کی تلاش خوبصورت بھی ہے اور اہم بھی۔ مبہم مبہم سی تصویریں دکھائی دیتی ہیں اور خاص قسم کے تاثرات قاری کے دل و دماغ پر نقش ہو جاتے ہیں۔

ناول "میری یادوں کے چنار" میں کرشن چندر کی نظر عورت کی نفسیات پر بہت گہری ہے۔ عورت جس سے پیار کرتی ہے اُس کا ہر قصور اپنے سر لینے کے لئے تیار رہتی ہے جبکہ مرد جس سے پیار کرتا ہے اس کا کوئی قصور معاف نہیں کر سکتا۔ عورت محبت کے لیے اپنی ہر شے وہ ایثار کی دیوی ہے۔ خانم کی بے پناہ محبت کا ہی یہ نتیجہ ہے کہ وہ بچے کی لاش سے لپٹ لیتی ہے۔ اپنے باپ کے خلاف عمل کرتی ہے اور اپنی عزت، خاندان اور ناموس کو اپنے سر کے سائیں پر قربان کرتی ہے۔ شانو ڈاکٹر کے ہاں سے جاتے وقت اپنی محبت اور اپنی وفا کی سوغات پیش کرتی ہے جب وہ ادھورا سوئٹر ڈاکٹر کی بیوی کو دیتی ہے اور کہتی ہے:

"یہ سوئٹر میں نے ان کے لیے بُن رہی تھی جو ہمیشہ سے یہ دیوتا سے اونچے رہیں گے۔ اگر تمہارے دل میں کسی عورت کے درد کو سمجھنے کی خواہش پیدا ہو تو اُسے اپنے ہاتھوں سے مکمل کر دینا۔ بس میں تم سے یہی مانگتی ہوں۔"

عورت کی وفا شعاری ان الفاظ سے پورے طور پر نمایاں ہے۔ ڈاکٹر کی بیوی (سبات اختر ہیں) ڈاکٹر کی صحتیابی کے لیے دعا کرتی ہے اور سارا غم و غصہ اور ساری ناراضگی چھوڑ کر اپنے گناہ کا اعتراف کرتی ہے۔ ڈاکٹر سے معافی مانگتی ہے اور ادھورا سوئٹر مکمل کرنا شروع کرتی ہے۔

ایک اور بات اس ناول میں قابل غور ہے کہ مرد کی عمر کتنی بھی ہو وہ دوسری عورت سے دلچسپی لیتا ہے۔ ڈاکٹر شادی شدہ ہوتے ہوئے بھی زمانے کا خیال کیے بغیر اشاروں کنایوں میں شانو سے پیار جتاتا ہے۔ انسان کی نفسیاتی اور جذباتی کیفیتوں کی تصویریں یہاں اُبھرتی ہیں۔ ڈاکٹر کی بیوی لاہور ہسپتال شانو بھی

میں ہے اور یہاں ڈاکٹر کا اکیلا ہونا کیسے ممکن۔ یونگ (JUNG) نے ANIMUS اور ANIMA دو اصطلاحوں کے تحت کہا ہے کہ ہر مرد اپنی حوا کو اور ہر عورت اپنے آدم کو ساتھ لے کر چلتی ہے۔ ہر ایک کے لاشعور میں ایک ایسی سطح ہے جس پر مخالف جنس کا پیکر موجود رہتا ہے۔ پس یہ بات اس ناول میں ظاہر ہے۔

"میری یادوں کے چنار" میں کردار نگاری کا پورا تصور نہیں ملتا۔ یہ تاثرات، احساسات اور جذبات کی کہانی ہے۔ مرکزی کردار اس میں بہت ہی اہمیت کا حامل ہے اور باقی جتنے بھی کردار ہیں وہ پرچھائیوں کی مانند ہیں۔ آتے ہیں اور چلے جاتے ہیں۔ لیکن اپنے تاثرات چھوڑ جاتے ہیں جو قاری کے دل پر نقش ہو جاتے ہیں۔

مرکزی کردار یعنی مصنف کے کردار کے گرد ساری کہانی گھومتی ہے اور مختلف پرچھائیاں یادوں کے بہاؤ سے موجوں کی صورت میں اُبھرتی ہیں جو زندگی کے نشیب و فراز، خوشی و غم، حسرت و مایوسی جیسے احساسات اور تاثرات کو اُجاگر کرتی ہیں۔ ان میں ڈاکٹر کی پرچھائیں لمبی دکھائی دیتی ہے جو ناول کے آغاز سے ناول کے انجام تک نہیں ڈوبتی۔ ڈاکٹر ایک انسان دوست اور صحیح الدماغ شخص ہے۔ اس کی روح کے اندر ایک مخلص انسان چھپا بیٹھا ہے۔ انسان دوستی کیلیے وہ بڑی سے بڑی قربانی دینے کے لئے بھی تیار ہے۔ ڈاکٹر کے علاوہ نما ڈاکو کو بہت سلیقے سے پیش کیا گیا ہے۔ وہ قدم قدم پر ہماری ہمدردی کا مستحق ہو جاتا ہے۔ وہ نڈر ہے۔ بیباک ہے۔ انسان دوست بھی ہے جبھی تو ڈاکٹر اُسے ڈاکو قرار نہیں دیتا۔ اسی طرح باقی سبھی کردار اپنی اپنی دنیا لیکر سامنے آتے ہیں اور مختلف اور متضاد کیفیات کو اُجاگر کرتے ہیں۔ کرشن چندر کا یہ ناول اُردو فکشن میں ایک مستقل اور قابل قدر اضافہ ہے اور اسے کئی لحاظ سے اُن کے باقی ناولوں پر ترجیح بھی دی جا سکتی ہے۔

کرشن موہن

پگلا

وہ مصوّر ایک عالمگیر فنکارِ عظیم
جو کہ پگلا تھا مگر پگلا نہ تھا
ایک دن پگلے نے من کی موج میں
اپنا دایاں کان کاٹا اور اُسے
اک طوائف کو کیا ارسال جو
ہو گئی بے ہوش وہ خونی تحفہ کھول کر

کتنا حسرت خیز تھا اُس کا شباب
رنگ میں سوزِ تمنّا گھول کر
اور تصویروں میں اپنی رُوحِ نمکیں بول کر
زندگی سے ہار کے۔
مر گیا سینے پہ گولی مار کے

کوئی جس کو زندگی میں پوچھتا تک بھی نہ تھا
پُوجتے ہیں آج اُسے سب اہلِ فن
اُس کی تصویروں کا دلجُو بانکپن
آج ہے سرمایۂ فخرِ زمیں
موت اُس کی زیست، اُس کی جیت کا باعث بنی
ایک دن اُس نے کہا تھا "اِس زمیں پر میں رہا ہوں تیس سال
شکریے کے طور پر
چھوڑ جانا چاہتا ہوں اِس پہ کوئی یادگارِ بے مثال

آج دُنیا اُسکو اپنا مانتی ہے
اُس کے شہکاروں کی عظمت جانتی ہے۔

○ بی - ۱۲۴ - پنڈارا روڈ نئی دہلی - ۳

مشتاق جاوید

تخلیق

برف کی چادر میں لپٹا
رات کی پُر ہول تاریکی سے گھبراتا ہوا
مضمحل سا بند کمرہ

اور اس میں

چودھویں کے چاند سے دو مرمریں افلاس کے مارے ہوئے

بیدار دِل

منہمک تھے

روشنی کی نیم بسمل سیج پر

التفاتِ جاوداں کے اِک نئے شہکار کی تخلیق میں

اور - !

اور بے بس بند کمرہ

رو رہا تھا

خوں کے آنسو

اس نئے شہکار کی تخلیق پر!!

○ ۱۷/۱۱ - B، شیروانی گیٹ - مالیر کوٹلہ (پنجاب)

کہانی

کچرا

ظہیر کیفی امروہوی
محلہ کٹکوئی - امروہہ - یوپی

(افسانہ "کچرا" ترقی پسند مصنفین (شاخ) امروہہ کی ایک "شبِ شعر و افسانہ" منعقدہ ۲۴ دسمبر ۸۵ء میں پڑھا گیا جس کے مہمانِ خصوصی جون ایلیا (مدیر عالمی ڈائجسٹ کراچی) اور کہانی کار رام لعل تھے!)

کھار ریلوے اسٹیشن کی مغربی جانب شاندار بلڈنگوں میں فضل بھائی کچرے والا کا فلیٹ یوں بھی نمایاں تھا کہ اُس کی کھڑکی کے باہر آج بھی ایک پُرانی چھتری اور اُسکا بوسیدہ لحاف، طوطے کا ٹوٹا ہوا پنجرہ اور ایک پُرانی لالٹین لٹکی ہوئی تھی!

حالانکہ بیس سال پہلے اپنے وطن سے بھاگتے ہوئے جو چیزیں فضل بھائی اپنے ساتھ بمبئی لے جا سکا تھا وہ یہی نادر و نایاب اثاثہ تھا جو فضل بھائی کے اُن دنوں کی یادگار تھا جب وہ ٹین کاٹنے والا معمولی سا مستری تھا۔ اپنے وطن میں وہ گلی گلی گھوم کر بڑی محنت اور دُشواری سے رُوپیہ آٹھ آنے کما پاتا تھا جس سے وہ نہ صحیح طور پر اپنا تن ڈھک پاتا تھا اور نہ اپنا پیٹ ہی بھر سکتا تھا!

لیکن فضل بھائی بہت کم عمری میں ہی اپنا مددگار خود بن چکا تھا۔ رُوکھا سُوکھا کھانا ہی اُس کی محنت کا صلہ تھا۔ پھٹا پُرانا پہننا ہی اُس کی جوانی کا کفن تھا۔ رشتہ دار اُس کو قریب نہ پھٹکنے دیتے تھے اور جان پہچان والے اُس سے اُسی طرح بچتے تھے جس طرح سرمایہ دار علم و ادب سے بدکتے اور بچتے ہیں۔ مگر فضل بھائی نے کسی سے کبھی کوئی شکوہ شکایت نہیں کی تھی!

جب تک وہ اپنے وطن میں گالیاں کھانے کے لائق خود کو پاتا رہا اُسی کی خاک سے چمٹا رہا۔ لیکن ایک دن وہ چُپکے سے اِس دھرتی سے اُسی طرح دُور ہو گیا تھا جس طرح موقع پرست دوست اپنی غریبی سے چھٹکارا پاکر اپنے عزیز دوستوں کو بُھلا دیتا ہے ــــ!

ٹین مستری ایک غریب مزدور فضل بھائی اب کوئی معمولی آدمی نہ تھا ـــ!

کھار ریلوے اسٹیشن سے کھار ڈانڈے تک اُس کی دھاک اور ناموری کا تھی۔ عام لوگ اُس کے نام سے تھرّاتے تھے۔ غنڈے اُس کے محتاج تھے۔ سیٹھ اُس کے دوست تھے بدقسمتی اُس کے ارد گرد دو کال ٹرینوں کی طرح ہر وقت چکّر کاٹتی تھیں!

شاعر، بمبئی

بمبئی میں رہ کر جب کوئی اتنا نام کما لیتا ہے تو اُس کی شہرت کسی مشہور ادیب سے کم نہیں ہوتی ـ!

اِس کا تجربہ مجھے اُس وقت ہوا جب میں نے کھار ریلوے اسٹیشن کے باہر ایک ہوٹل کے چھوکرے سے اُس کا پتہ معلوم کیا تھا۔ اُس نے اپنے مخصوص انداز میں فضل بھائی کے بارے میں بتایا تھا۔ "فاضل بھائی کچرے والا کھار کا سیٹھ ہے بابا! بائیں باجو میں اُس کا چار گودام کھلا ہے اُس کے آگے جھاڑ (پیڑ) کے برو بر والا بلڈنگ اُسی کا ہے۔ . . ."

فضل بھائی کی شہرت اور امارت کو سُن کر مجھے یقین نہیں آیا تھا کہ وہ ایکدم اتنا بڑا آدمی کیسے بن گیا ـ؟

لیکن مجھے اپنی نگاہوں کے سامنے ہی جب وہ بلڈنگ نظر آئی جس پر "فضل بھائی" لکھا تھا تو مجھے یقین کر لینا ہی اچھا لگا۔

اور یہ بھی مجھے بہت ہی اچھا لگا کہ اُس نے اپنی غریبی کے دور کی وہ یادگاریں اپنی کھڑکی کے باہر آج بھی اُسی طرح لٹکا رکھی ہیں جن کو وہ اپنے وطن میں اپنے کندھے پر لٹکائے پھرتا تھا!

مجھے محسوس ہوا، شاید وہ اِس طرح اپنے پُرانے زمانے کو ہر وقت یاد رکھنا چاہتا ہے یا پھر کسی جان پہچان والے کو اُس کی ناکشی سے ذلیل کرنے کا ایک ذریعہ بنائے ہوئے ہے۔ میں نے سوچا، مجھے فضل بھائی سے نہیں ملنا چاہیئے۔ میرا اُس کا تعلق ہی کیا ہے؟ معمولی سی جان پہچان ہی تو تھی جس کو بیس سال گذر چکے ہیں۔ شاید وہ مجھے پہچاننے اور اپنا ہم وطن ماننے سے انکار کر دے!

لیکن میں فضل بھائی سے ملنے پر مجبور تھا۔ میری روزی کا سوال تھا

فضل بھائی کو ایک ایسے آدمی کی ضرورت تھی جو اُس کے کاموں میں خاطر خواہ دلچسپی لے سکے' ذمہ داریوں کو نبھا سکے۔

مجھے آسانی سے یہ راستہ مل گیا تھا جو سیدھا میرے پیٹ میں اُتر رہا تھا!

میں نے بلڈنگ کے اندر پہنچ کر اُس کے فلیٹ کی گھنٹی بجائی۔

ایک مرہٹی عورت نے دروازہ کھولا "کس کو منگتا ہے؟" اُس نے سختی سے پُوچھا۔ میں نے دھیرے سے کہا "فضل بھائی ہے ــــ!"

"وہ ماہم کچرا مل گیا ہے"

"کب تک واپس آئے گا ــــ؟"

"دو کلاک پیچھے ــــ" عورت نے اپنی ساڑی کی نمائش اس انداز سے کی جیسے کہنا چاہتی ہو بہت بڑھیا اور مہنگی ہے!

میں نے اُس کے بارے میں غور کرنا چاہا کہ یہ عورت فضل بھائی کی بیوی ہے یا نوکر ــــ لیکن اُس عورت کے کسی انداز سے یہ پتا نہیں چل سکا۔ میں نے اُس سے پُوچھا۔ "فضل بھائی تمہارا کون ہے...؟"

اُس نے مجھے تیکھی نظروں سے دیکھا' پھر میری بے وقوفی پر جیسے ہنس کر بولی "میرا مرد... تم بولو... تم کون ہے... کیا کام ہے....؟ کدھر سے آیا...؟" میں نے اُس کے سوالوں سے بچنے کے لئے زینے کی طرف قدم بڑھائے تو وہ بولی۔ "اے... اِدھر آؤ.... فضل بھائی سے ملنا منگتا ہے تو باجو کے رُوم میں بیٹھ جاؤ ــــ!"

میں فضل بھائی کے شاندار فلیٹ کے خوش نما صوفوں کو اُسی طرح تکتا رہا جیسے اُس عورت کی خوبصورتی کو دیکھ رہا تھا ــــ!

سورج ڈوبنے سے کچھ پہلے فضل بھائی اپنے فلیٹ پر واپس آیا ــــ!

اُس عورت نے اُسے میرے بارے میں بتایا۔ "میں نے اُسے روک لیا' مالوم نئیں دھندے کا آدمی ہے یا خالی پیلی کچرے کی بات کرنا منگتا ہے"۔

فضل بھائی نے کچھ دیر تک مجھے گھورا' میں نے بھی اُس کے چہرے پر اپنی نگاہیں جمانے کی کوشش کی۔ وہ چھ فٹ کا بڑا لحیم شحیم آدمی نظر آرہا تھا۔ اُس کا رنگ پہلے سے بھی زیادہ غلیظ اور سیاہ ہو چکا تھا۔ روشنی کے باوجود مجھے ایسا لگا جیسے میں بلیک آؤٹ میں کسی پیڑ کو دیکھ رہا ہوں۔

جب میں نے اُسے اپنے بارے میں' اُس کے وطن کے بارے میں بتایا تو وہ مجھ سے لپٹ گیا پھر وہ مجھ سے ایک ایک گلی' محلّے' بازار' موسم' پھل' کاروبار' سڑک' رسم و رواج کی بابت پُوچھتا رہا ــــ

اور تعجب سے کہتا: "ایسا ــــ اتنا بدل گیا ہے اپنا گاؤں' چار سنیما بھی کھل گئے ہیں اپنے گاؤں میں ــ رانڈ لوگ بھی دھندہ کرتی ہے... ! مرڈر بھی ہوتا ہے سڑک پر... رابری بھی.... پر وہ سسٹم برو بر سہاگی..."

جب وہ مجھ سے پُوچھتے پُوچھتے نہیں تھکا تو میں نے اُس سے اُس کی بدلی ہوئی حالت کے بارے میں پُوچھا۔

اپنے گھنٹے جیسے چہرے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا "مالک کا شکر ہے پیارے اِبّسے میں اپنا بڑا مان اور کام ہے۔ کچرے سے لیکر کے تک کا دھندہ کرتا ہوں' چار گودام نالے والی روڈ پر ہیں۔ بلڈنگ اپنی ہے۔ کمائی پورہ' فارس روڈ' بیلا ہاؤس کے ہوٹلوں کو بھاڑے (کرایہ) پر چڑھا رکھا ہے۔ کالبا دیوی کے سٹّہ میں بھی اپنا شیئر چلتا ہے...."

"یہ تو سب ٹھیک ہے فضل بھائی! خوشی کی بات ہے کہ تمہارے دُکھ کے دن نکل گئے.... میں بھی کام کے لئے تمہارے پاس آیا تھا کیا تم مجھے کام دو گے...؟"

"تم میرے پاس چل نہیں سکو گے' میرا سارا دھندہ مارا ماری کا ہے۔ پولیس کی دھاڑ سے نمٹنا تمہارے بس کا روگ نہیں ہے۔ میرا سارا دھندہ پولیس کے ہاتھوں میں ہے۔ کبھی بھی کچھ ہو جاتا ہے...." فضل بھائی نے سگریٹ کا پیکٹ میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "دارو کا دھندہ تم چلا نہیں سکتے' مٹکے کو تم سنبھال نہیں سکتے... دس پیسے کیلو کچرا تو لنا تمہاری پوزیشن کے خلاف ہے۔ اب بولو ــــ میں تم کو کیا کام دے سکتا ہوں .... رکڑا بولو ــــ کتنا منگتا ہے؟ ایکدم بولو ــــ ابھی بندوبست کئے دیتا ہوں ــ تم چاہو تو بچّو سیٹھ کی باڑی میں رانڈ لوگ سے روکڑا اُگانے کا کام سنبھال لو ــــ"

میں نے پُوچھا: "رانڈ ــــ یعنی بیواؤں سے تم مہینہ لیتے ہو...؟"

وہ میری بات سُن کر ہنسا' پھر بولا "یہ بھی نہیں چلے گا ــــ اچھا تو تم ایسا کرو' اپنی پسند کا کوئی بھی دھندہ کرلو! باڈی بیچنے کا ....

دھوبی تلاؤ پر میں تم کو باکڑہ دلائے دیتا ہوں' سالا ایک سے ایک فسٹ کلاس پارسی چھوکری کو اُلّو بنا سکتے ہو .... اچھا تو یوں کرو ــــ میں شنکر دادا کو فون کئے دیتا ہوں وہ تمہاری ٹرالی لے کر کسی بھی ٹھکانے پر لگا دے گا۔

بولو ــــ منجور ــــ یا اب بھی ناں ہی بولے گا!"

میں اُس کے پھیلے ہوئے جال سے اُلجھ کر بولا "کوئی سیدھا سادہ کام"

"اچھا ــــ اچھا ــــ سمجھ گیا ــــ" اپنی کرخت آواز میں بولا "بسم اللہ ــــ اِدھر آنا منگتا...."

(باقی صفحہ ۹۱ پر دیکھئے)

غزلیں

اظہر عنایتی

اب وہ ماضی ہے ظلمتوں کی طرح
کل جو روشن تھا آئینوں کی طرح

راستوں کا غبار شاید ہے
ہم بھی گزرے ہیں آندھیوں کی طرح

دن کے منظر تھے میری آنکھوں میں
رات جاگا میں آہٹوں کی طرح

ایک آواز کے تعاقب میں
کھو گیا ہوں سماعتوں کی طرح

اب بچھڑ جائیں پھر کہیں ہم تم
مل ہی جائیں گے راستوں کی طرح

کیا بتائیں نشاطِ گمنامی!
ایک نشہ ہے شہرتوں کی طرح

شعر کہیے تو لفظ بھی اظہر
منتخب کیجے دوستوں کی طرح

○ [illegible] - رامپور (یوپی)
شاعر بیجھے

تسنیم فاروقی

اب کوئی چیز نہ دل ہے نہ کوئی شے ہے وفا
آپ دہراتے ہیں کیوں بوڑھی کتابوں کا لکھا

جس سے ہر چہرہ اُجالے میں نظر آنے لگے
ایک ایسی کوئی قندیل فصیلوں پہ جلا

ایسے کچھ لوگ بھی اِس شہرِ فلک بوس میں ہیں
جن کی راتوں کو میسر نہیں مٹی کا دیا

لوگ تلوار سے حق مانگ لیا کرتے تھے
ہم سے اک سچ کی حفاظت میں قلم تک نہ اُٹھا

جسم کا روح سے رشتہ بھی عجب رشتہ ہے
عمر بھر ساتھ رہا پھر بھی تعارف نہ ہوا

میں نے کانٹوں کو بھی تسنیم محبت دی ہے
میرے احساس میں شامل ہے گلابوں کی ہوا

○ باغ قاضی - لکھنؤ ۳

منوہر لال ہادی

ذوق کو رقص سکھانے نکلو
زیست کا لطف اُٹھانے نکلو

لے کے مضرابِ نظر، سازِ ہنر
دربدر گیت سنانے نکلو

اے غریبی کے بھڑکتے شعلو
لاش دشمن کی جلانے نکلو

دھوپ کچھ تیز ہوئی جاتی ہے
ریت کے قصر بنانے نکلو

جو پرانے تھے شجر، سوکھ گئے
اب نئے پیڑ اُگانے نکلو

میکدہ، پیکرِ اغراض کو آج
جامِ زہراب پلانے نکلو

تم ہی ہادی قفس و زنداں کے
درو دیوار ہلانے نکلو

○ ۱۳۱/۴ سیکٹر III - آر کے پورم
نئی دہلی ۲۳

جاں نثار اختر کی یاد میں (ایک طویل خط)

عبدالقوی دسنوی

شعبۂ اُردو - سیفیہ کالج - بھوپال - ۱

۲۸ اکتوبر ۷۶ء

محترمی و مکرمی اعجاز صدیقی صاحب ـــ السلام علیکم

ابھی ابھی اگست و ستمبر کا "شاعر" ملا، دونوں حصے اچھے ہیں۔

اختر بھائی (جاں نثار اختر) پر آپ کا مضمون پڑھا، یقین کیجئے کئی جگہ آنکھیں پُرنم ہوگئیں، آنسو چھلک گئے، وفات کے بعد یہ پہلا مضمون ہے جس میں اس قدر تفصیل سے اُن کی زندگی کے بہت سے گوشے سامنے آئے ہیں، خاندانی ابتدائی زندگی، تعلیم، شاعری، مشاعروں میں شرکت، دوستوں سے تعلقات، معترضوں سے سُلوک، چھیڑیں، برتاؤ، اُن کا ہنسنا، بولنا، شعر و شاعری سے دلچسپی، زندگی کے نئے عزائم، حوصلے، خوشیاں، مایوسیاں، دلچسپیاں، سبھی کچھ تو اس میں سما گئے ہیں، پھر ہسپتال سے گورِ غریباں تک کے حالات، کیفیات، تاثرات اور صداقتیں، جو کہیں نہیں ملتے آپ کے مضمون سے پہلی بار سامنے آئے ہیں ـــ

زخم پھر ہرے ہوگئے، یادوں نے سَر اُٹھائے، باتوں نے مُنہ کھولے، بمبئی کی، بھوپال کی، بعید کی، ماضیٔ قریب کی ـــ مُسکراتا ہوا چہرہ، دمکتی ہوئی پیشانی، سُلجھے ہوئے دراز بال، دمکتی ہوئی روشن آنکھیں، نمایاں ناک، معصوم چہرہ، دراز قد، خوش لباس، پُرکشش انداز، خلوص کے پیکر، مجسّم ظرافت، ایک ایک کر کے بہت سی تصویریں نگاہوں کے سامنے سے گزر گئیں۔ آہستہ آہستہ دھیمی آواز میں بہت دلچسپ گفتگو کرتے، کبھی اپنے متعلق، کبھی غیروں کی بات پر، کبھی شاعری کے بارے میں، کبھی تنقیدی لہجے میں، کبھی تشریحی انداز میں، گفتگو رُخ بدلتی جاتی، نئے نئے موضوعات سامنے آتے جاتے لیکن موڈ ایک ہی ہوتا، نرم شگفتہ، سنجیدہ، کہیں سے برہمی کا اظہار نہیں، خفگی کا رنگ نہیں اور لطف یہ کہ لہجہ بھی ایک، کہیں اُتار چڑھاؤ نہیں، کبھی نرم گرم نہیں۔

میں نے پہلی بار اُنہیں بمبئی میں دیکھا۔ آرکیڈیا بلڈنگ سے وہ اکثر مکتبہ جامعہ تک جاتے تھے، اُس زمانہ میں اُن کی اکثر بیٹھک وہیں رہتی تھی، میں اُنھیں جانتا نہیں تھا، وہ مجھے پہچانتے نہیں تھے لیکن بمبئی لاکھوں انسانوں کے شہر میں ایک ایسا شخص، جو اپنے انداز، مزاج، اپنے لباس، اپنی چال ڈھال اور رفتار و گفتار میں شاعر بھی منفرد ہو کیوں نہ توجہ کا باعث بنے۔ چنانچہ مجھے بھی ایک دن میں اور میرے دوست بھائی پروفیسر عبدالمغنی رضا صاحب غور کرنے پر مجبور ہوگئے لیکن پتا نہ چلنے تک قاصر رہے، آخرکار مشکل مکتبہ جامعہ میں حل ہوئی۔

اُسی زمانہ میں یا چند ماہ پہلے شاہد علی خاں مکتبہ جامعہ کے نئے منیجر ہو کر آئے تھے، اُن کی آمد کے ساتھ ساتھ مکتبہ کی اُس شاخ کا رنگ ہی بدل گیا تھا، پہلے مٹی دُھول میں اَٹی دکان رہتی تھی اور جہاں نہ آدم نہ آدم زاد کا گزر ہوتا اور نہ کتاب خواں، نہ کتابیں ہوتیں، لیکن اب وہاں جدید و قدیم ہر قسم کی کتابیں سلیقہ سے جمی ہوئی الماریوں میں سجی سجائی صرف دعوتِ نظارہ نہیں دیتی تھیں بلکہ مطالعہ کے لئے اُکساتی تھیں، چھوٹی سی جگہ، ایک طرف سامنے شاہد علی خاں اپنے دراز قد، شگفتہ چہرے، سُرخ و سپید رنگ کے ساتھ ایک کرسی پر بیٹھے ہوئے کام کرتے ہوئے اور ہنستے ہوئے نظر آتے اور ایک طرف ایک گوشے میں مولانا اپنے آپ میں مگن اور رام چندر اپنے کام میں مشغول دکھائی دیتے ـــ شاہد علی خاں کے سامنے دیوار سے لگی ایک گدے دار بنچ رہتی تھی جس پر مشکل سے دو افراد بیک وقت بیٹھ سکتے تھے۔ چنانچہ اُس پر کبھی مولانا شہاب مالیرکوٹلوی، کبھی باقر مہدی، کبھی جاں نثار اختر، کبھی سردار جعفری، کیفی اعظمی، ساحر لدھیانوی، پروفیسر نظام الدین گوریکر، پروفیسر علی جعفر اور میرے ساتھیوں میں ڈاکٹر مجاہد حسین حسینی، پروفیسر عبدالستار دلوی، سلیمان اطہر، ڈاکٹر حامداللہ ندوی وغیرہ نظر آتے، یہیں مولانا امتیاز علی عرشی اور دوسرے بہت سے ادیبوں سے ملاقات ہوئی، یہ سب کچھ شاہد علی خاں کی وجہ سے ہوتا، ہاں یاد آیا، شاہد علی خاں کوئی ایک شخص کا نام نہیں ہے، وہ خان کم ہیں، شاہد علی زیادہ، کبھی وہ دکاندار ہوتے، کبھی اُس کے منیجر، کبھی جامعہ کے معمولی ملازم معلوم ہوتے، کبھی صرف اکاؤنٹنٹ، کبھی اچھے انسان نظر آتے، کبھی خوبصورت دوست، کبھی اُن میں ادیب کی رگ بھی پھڑکنے لگتی، چنانچہ اُنھوں نے کچھ انتخابات بھی شائع کئے اور کچھ مضامین بھی لکھے، اب عرصہ سے وہ مکتبہ جامعہ دہلی کے جنرل منیجر اور ایک عدد بیوی کے شوہر ہی نہیں، بچے کے باپ بھی ہیں۔

اِنھیں شاہد علی خاں نے ایک دن اچانک میرا تعارف جاں نثار اختر صاحب سے انھیں اختر بھائی کہتے ہوئے کرایا، تو اسی دن سے حیرت اور خوشی کے درمیان میں انھیں اختر بھائی کہہ کر مخاطب کرنے لگا۔ اور وہ ہمارے ایسے قریب آئے جیسے ہم ایک دوسرے سے کبھی اجنبی نہ تھے، وہ بہت دلچسپ آدمی تھے، بہت باتونی تھے، اُردو کی ادبی شخصیتوں کا ذکر کرتے، پُرلطف واقعات سُناتے، لطیفوں سے مختصر سی محفل کو زعفران زار بناتے، تبصرہ کرتے۔ شاہد بھائی کام کرتے جاتے، باتیں سُنتے جاتے، کبھی مسکراتے، کبھی ہنستے، کبھی داد دیتے، کبھی خاطر تواضع بھی کرتے جاتے، کبھی چائے سے کبھی سگریٹ سے، کبھی پان سے، یہ سلسلہ ہمیشہ جاری رہتا۔

اس طرح اختر بھائی اکثر مکتبہ جامعہ میں مل جاتے، گھنٹوں پیاری پیاری باتیں ہوتیں، ایک دن شاہد بھائی نے انجمن ترقی اُردو سے شائع شدہ "اُردو شاعری کا انتخابی سلسلہ" کی ایک کتاب "جاں نثار اختر" میرے سامنے بڑھا دی۔ میں نے اُس انتخاب کو اُلٹ پلٹ کر دیکھا اور اختر بھائی کی طرف بڑھا دیا، اختر بھائی نے پہلے میری طرف دیکھا پھر مسکراتے ہوئے قلم کھولا اور فہرست کے صفحہ پر یوں رقمطراز ہوئے۔

"عزیزم عبدالقوی دسنوی کے لئے۔" "صد دفعہ کتنے کئے جمع تو دیوان کیا" (میر)

جاں نثار اختر
30-12-57

اسی طرح جب ۱۹۵۸ء میں "حرف آشنا" چھپ کر آئی تو اُس پر اختر بھائی نے یہ لکھ کر دیا۔

" محبّی عبدالقوی دسنوی کے لئے
" کہانیاں تھیں کہیں کھو گئی ہیں میرے ندیم"

خلوص کے ساتھ
جاں نثار اختر
27-11-58

اور ۱۹۶۰ء میں جب "نذرِ بُتاں" شائع ہوئی تو نہایت سادگی کے ساتھ انھوں نے یہ تحریر کر دیا۔

"قوی صاحب کے لئے" —

اس مجموعہ میں زیادہ سے زیادہ تین نظمیں کام کی ہیں۔ معلوم نہیں آپ میری رائے سے کہاں تک اتفاق کریں گے۔ جاں نثار اختر
9-11-60[1]

ان تحریروں کے یہاں پیش کرنے کا مقصد محض یہ ہے کہ ان سے اس بات کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ وہ کس قدر سادہ طبیعت کے مالک تھے اور ایک طالب علم کے ساتھ بھی ہمیشہ حُسنِ سلوک سے پیش آتے تھے۔

اختر بھائی سے ملنے ملانے کا سلسلہ ۱۹۶۱ء کی جنوری تک قائم رہا، اس دوران میں خدیجہ آپا آئیں تو اُن سے پہلے مکتبہ جامعہ میں پھر اُن کے مکان پر محترمی پروفیسر خواجہ احمد فاروقی صاحب کے ساتھ ملاقات ہوئی۔ جاں نثار اختر ہر جگہ اور ہر زمانے میں ایک حال میں نظر آئے اور ایک انداز سے ملے۔ فروری ۱۹۶۲ء میں میں بھوپال آگیا۔ اب اختر بھائی یہاں نہیں تھے، لیکن اُن کی یادیں تھیں۔ اتفاق سے اُن کے دونوں بڑے بچے جاوید اختر اور سلمان اختر سیفیہ کالج ہی میں زیرِ تعلیم رہے۔ اُن کی وجہ سے اختر بھائی کی یاد زیادہ آنے لگی۔ لیکن عرصہ تک اُن سے ملاقات نہیں ہوئی، اکثر ایسا بھی ہوا کہ میں جب چھٹیوں میں گھر چلا گیا تو وہ یہاں تشریف لائے۔ میرے بھوپال آنے کے تقریباً سات سال بعد جب اپریل ۱۹۶۸ء میں وہ بھوپال تشریف لائے تو سیفیہ کالج بھی آئے، اُن کے ساتھ مجروح سلطان پوری اور علی جواد زیدی بھی تھے، علی جواد زیدی صاحب نے غالب پر غالب صدی پر اور بھوپال سے غالب کے رشتے پر تقریر کی، پھر شعر و شاعری کا پروگرام شروع ہوا اور مجروح سلطان پوری، جاں نثار اختر، علی جواد زیدی، اختر سعید خاں اور اظہر سعید خاں صاحبان نے اپنا اپنا کلام سُنایا۔ بڑی خوبصورت نشست رہی۔ واہ واہ سے ہال گونجتا رہا، جانے سے پہلے جب اُردوئے معلّٰی میں اختر بھائی تشریف لائے تو بھوپال اور شعبۂ اُردو سے متعلق اپنے تعلقات و تاثرات نہایت خلوص کے ساتھ یوں قلم بند کئے:

"بھوپال کی سرزمین سے میرے تعلقات بہت گہرے اور قدیم ہیں۔ یہاں میرا بچپن بھی گزرا ہے اور جوانی کے کچھ سال بھی۔ اِس سرزمین سے میری رُوحانی وابستگی بھی رہی ہے۔ اور ذہنی وابستگی بھی۔ انجمن ترقی پسند مصنفین بھوپال کی ابتدا اور ارتقا میں تھوڑا بہت لہو میرا بھی صَرف ہوا ہے۔ آج بھی بمبئی کی مشینی زندگی سے گھبرا کر کہیں نکل جانے کو جی چاہتا ہے تو وہ صرف بھوپال ہے۔

بھوپال کی ادبی روایتیں بہت مستحکم ہیں۔ اِس دَور میں جب اُردو ادب اور اُردو شاعری ایک نازک اور غیر متعین دَور سے گزر رہی ہے بھوپال اُردو کی جائے پناہ نظر آتا ہے۔ کئی انجمنیں اپنے اپنے ڈھنگ سے اُردو کی خدمت انجام دے رہی ہیں اور مجھے یہ کہنے میں جھجک نہیں کہ اس وقت سیفیہ کالج کی اُردو انجمن سب سے اہم اور نمایاں ہے اور مجھے یہ کہنے میں بھی جھجک نہیں کہ یہ سب کچھ قوی دسنوی کی ذات سے

---

[1] ان تینوں کتابوں پر تاریخیں انگریزی میں درج ہیں۔

شاعر۔ بمبئی

سے ہے۔ میری نیک خواہشات ہمیشہ اس انجمن اور قوی صاحب کے ساتھ رہیں گی"

5-4.68)

پچھلے سال سیفیہ کالج کے مشاعرہ میں سردار جعفری اور اختر بھائی تشریف لائے۔ مشاعرہ سے پہلے کچھ دیر کے لئے ڈاکٹر شنکر دیال شرما (وزیر حکومت ہند) صاحب اور یہ دونوں حضرات اردو کے معلّی میں تشریف لائے۔ یہاں چائے کا دور چلتا رہا۔ مختلف موضوعات پر بات چیت ہوتی رہی، طلباء نے بھی گفتگو میں حصّہ لیا۔

۱۹۷۴ء میں اطلاع ملی کہ فن اور شخصیت کا "جاں نثار اختر نمبر" شائع ہو رہا ہے۔ اس نمبر کے لئے میں نے "جاں نثار اختر کی غزلیں" کے عنوان سے ایک مضمون لکھا اور اختر بھائی کو بھیج دیا تو رسید اس طرح ملی۔

دسنوی صاحب

آپ کا مضمون مجھے مل گیا تھا، بہت خوب ہے، اس میں جو کمی محسوس ہو رہی ہے وہ یہ کہ میری کتاب "پچھلے پہر" جو تمام تر غزلوں پر مشتمل ہے شائع ہو چکی ہے، ابھی سال، اس میں ۱۹۷۱ء سے ۱۹۷۵ء تک کی غزلیں ہیں۔ میں عبّاس کو لکھ رہا ہوں وہ آپ کو یہ کتاب دے جائیں گے۔ اگر آپ تکلیف کر کے اس مضمون کا دوسرا حصّہ بھی لکھ ڈالیں تو یہ مضمون آج تک کی غزلیات پر مکمل ہو جائیگا۔ آپ اس مہینے کے آخر تک بھی بھیج دیں تو شکر گذار ہوں گا۔ دوستوں کو سلام کہئے۔

آپ کا

جاں نثار اختر

مئی ۱۹۷۶ء میں جب وہ بھوپال تشریف لائے تو میں پروفیسر آفاق حسین صدیقی کے ساتھ اُن سے ملنے گیا۔ بہت خوش ہوئے۔ جاں نثار اختر نمبر کی گفتگو ہوتی رہی، شیو منگل سنگھ سُمن صاحب وائس چانسلر وکرم یونیورسٹی کا ذکر آیا، اُن سے کچھ کام تھا، تو آفاق حسین صدیقی کے حوالے کچھ کام کئے۔ نمبر کے لئے تصاویر کا ذکر آیا تو بعض بہت پُرانی تصاویر حاصل ہونے پر بہت خوش تھے۔ مضامین سے متعلق بھی بہت مطمئن تھے، اس لئے کہ بہت سے لوگوں نے مضامین لکھے تھے اور اچھے مضامین لکھے تھے۔ اُنھوں نے یہ بھی کہا کہ اس نمبر میں ہر طرح کے مضامین شامل کر لئے گئے ہیں تاکہ ایک ہی پہلو سامنے نہ آئے بلکہ ہر خیال اور رائے کی ترجمانی ہو سکے۔ پھر ایک دن اطلاع ملی کہ وہ بمبئی چلے گئے۔

غالباً جون کے آخری دنوں میں ایک صبح بادشاہ میاں نے اطلاع دی کہ اختر بھائی کی طبیعت بہت خراب ہو گئی ہے لکھنؤ سے واپسی پر یہیں اُتر گئے۔ اسٹیشن سے بڑی مشکلوں سے ہلال منزل پہنچے۔ چنانچہ شام کے وقت میں اور پروفیسر عبدالقیوم اُن سے ملنے گئے، تو معلوم ہوا کہ طبیعت زیادہ خراب ہے۔ میں ایک طرف کُرسی پر بیٹھ گیا۔ جہاں القدر چغتائی صاحب اور پروفیسر اجلال مجید صاحب جو اُن کے ہم زُلف ہیں۔ وہیں موجود تھے۔ دونوں سے اختر بھائی سے متعلق بات چیت ہوتی رہی، معلوم ہوا کہ ڈاکٹر انصاف کا علاج ہو رہا ہے۔ اسی دوران میں خدیجہ آپا آئیں اور مجھ سے مخاطب ہوئیں پہلی نظر میں انھیں پہچان نہ سکا۔ اُن کا چہرہ پریشانی کی وجہ سے پھیکا پڑ گیا تھا، لیکن جب وہ قریب آئیں اور مجھ سے مخاطب ہوئیں اور اپنی بچی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ "قوی صاحب یہ میری بچی عنبرہ ہے" تو میں نے پہچان کر فوراً سلام کیا۔ میں نے دیکھا کہ وہ نہایت خاموشی، سنجیدگی اور اپنی ذات سے بے نیاز ہو کر اختر بھائی کی خدمت میں مصروف تھیں، بیویاں شوہر پرست ہوتی ہیں ہوتی ہوں گی لیکن میں نے خدیجہ آپا کی طرح جنون کی حد تک شوہر پرست بہت کم بیویوں کو دیکھا ہے۔ محترمہ صفیہ اختر کی جاں نثار اختر سے والہانہ محبت زیرِ لب اور حرفِ آشنا کے خطوط سے ظاہر ہوتی ہے لیکن اس بیماری کے دوران میں میں نے اپنی آنکھوں سے جو کچھ دیکھا اُس پر حیرت بھی ہوئی، خوشی بھی اور فخر بھی۔ گھر آنگن کو انتساب کرتے ہوئے اختر بھائی نے ٹھیک ہی لکھا ہے۔

" خدیجہ کے نام۔ جو میرے لئے صفیہ کا دوسرا رُوپ ہے۔

خدیجہ آپا اپنے ساتھ اختر نمبر کی ایک نامکمل کاپی بمبئی سے لے کر آئی تھیں، اُسے لوگ ہاتھوں ہاتھ لئے ہوئے تھے۔ میں نے بھی ورق گردانی کی، بہت باوزن نمبر معلوم ہوا۔

میں ایک دو دن ناغہ کر کے ہلال منزل برابر جانے لگا، میرے ساتھ اکثر خالد عابدی ہوتے۔ اختر بھائی روز بروز صحت یاب ہوتے چلے جا رہے تھے۔ اب وہ خوب باتیں کرتے، ہم لوگوں کے سوالات کے جوابات بھی نہایت دلچسپی کے ساتھ دیتے۔ گفتگو کسی موضوع سے متعلق ہو نمبر کا کسی نہ کسی طرح ذکر ضرور آ جاتا، وہ بڑے نمبر کا انتظار نہایت بے چینی سے کرتے تھے، بمبئی جانے کی بھی فکر تھی لیکن ڈاکٹر نے ابھی اجازت نہیں دی تھی، اس لئے جانے کے بارے میں کچھ طے نہیں کر سکے تھے۔ ایک دن جہاں القدر چغتائی صاحب نے اطلاع دی کہ اختر بھائی یاد کر رہے ہیں۔ جاں نثار اختر نمبر کی جلدیں

جو زرد دادا لاحقہ اور سابردت ے کر آ گئے ہیں چنانچہ شام کے وقت پہنچا تو اختر بھائی کو بہت خوش پایا۔ اُنھوں نے جاں نثار اختر نمبر کی ایک جلد اندر کمرے سے منگائی اور اُس پر یہ لکھتے ہوئے۔

مجتبیٰ عبدالقوی دسنوی کی نذر — خلوص اور احترام کے ساتھ

جاں نثار اختر
3-7-76

مجھے دی اور کہا میں نے اپنی ذمہ داری پوری کر دی۔ اب صرف دو کاپیاں دینے کو رہ گئی ہیں۔ مضمون نگاروں کو وہ اِس نمبر کی کاپیاں اِس طرح دے رہے تھے جیسے قرض ادا کر رہے ہوں، حساب صاف کر رہے ہوں تاکہ بعد میں کوئی تقاضا نہ کرے۔ اُس دن کافی دیر تک نمبر کے بارے میں رائے دیتے رہے رائے سنتے رہے۔ مضامین کے بارے میں مختلف باتیں بتلاتے رہے۔

دوسرے دن جب میں خالد عابدی کے ساتھ پہنچا تو وہ لیٹے تھے، میں نے اِس نمبر میں دو کمیاں محسوس کی تھیں، ایک تو اس میں جاں نثار اختر کے حالات زندگی کو شامل نہیں کیا گیا تھا (جس کی کو آج لوگ شدت سے محسوس کر رہے ہیں) اور دوسرے اُن کے والد مضطر خیر آبادی کے متعلق بھی اس میں کچھ نہیں تھا۔ اختر بھائی کی جب توجہ اِس طرف دلائی تو اُنھیں بھی اِس کا ہلکا سا احساس ہوا لیکن مجموعی حیثیت سے وہ مطمئن تھے۔ اِس نمبر سے متعلق بہت سی دلچسپ باتیں ہوئیں بعض رکاوٹیں جو پیدا کرنے کی کوشش کی گئی تھی ان کا ذکر بھی آیا۔

دوسرے دن جب پہنچا تو معلوم ہوا کہ طبیعت پھر خراب ہو گئی ہے یا ایسا محسوس ہوا کہ کھانے پینے میں کچھ بد پرہیزی ہو گئی ہے۔ ڈاکٹر انصاف موجود نہیں تھے۔ جناب عزیز قریشی (نائب وزیر تعلیم مدھیہ پردیش) نے ڈاکٹر ان پی مشرا کو دکھلایا ہے اور انھیں کا علاج شروع ہو گیا ہے۔ مجھے یہ باتیں خود اختر بھائی نے بتائیں۔

دو دن بعد پہنچا تو بہتر تھے لیکن اب بمبئی جانے کی دُھن تھی۔ بمبئی ٹرنک لگانے کی کوشش جاری تھی، لیکن کامیابی نہیں ہو رہی تھی، کچھ دیر تو پریشان رہے۔ پھر خیال آیا کہ گھر کے فون کا کنکشن کاٹ دیا گیا ہوگا، اِس لئے کہ بل کی رقم ادا نہیں کی گئی تھی، طبیعت کے بارے میں دریافت کیا تو کہنے لگے۔ ٹھیک نہیں ہے۔ میں نے کہا اب تو اچھے معلوم ہو رہے ہیں۔ کہنے لگے نہیں ایسا نہیں ہے۔ پھر میں نے کہا ڈاکٹر کا خیال بھی یہی ہے کہ آپ اچھے ہیں، کہنے لگے ڈاکٹر کو کیا معلوم وہ کچھ نہیں جانتا۔ اپنے ہاتھ کو دل پر رکھتے ہوئے کہنے لگے اِسکا حال میں جانتا ہوں۔ خدیجہ آپا بھی یہی کہتیں کہ وہ اچھے ہیں لیکن وہ

شاعر، بمبئی

نہیں ملتے۔

خدیجہ آپا کے ددھیال کے بارے میں مختصر حال سنئے معلوم نہیں آپ کو علم ہے کہ نہیں —

• شیخ حسین بن محسن انصاری یمن سے بھوپال آئے اُن کی پہلی آمد سکندر بیگم کے عہد میں ۱۸۶۲ء میں ہوئی۔ دو سال بھوپال میں قیام کرنے کے بعد پھر یمن واپس چلے گئے۔ دوبارہ ۱۸۶۹ء میں شاہجہاں بیگم کے عہد میں تشریف لائے اور پھر کچھ عرصہ بعد چلے گئے۔ حجاز کے سفر میں نواب صدیق حسن خاں کی ملاقات شیخ حسین سے ہوئی۔ نواب صاحب شیخ کا غیر معمولی حافظہ علوم حدیث پر اُن کی غیر معمولی قدرت اور اُن کا تبحّرِ علمی دیکھ کر ایسے گرویدہ ہوئے کہ خود اُن سے سند بھی لی اور اُن کو بھوپال تشریف لانے کی دعوت بھی دی۔ ۱۸۷۹ء میں وہ پھر بھوپال آئے اور مستقل سکونت اختیار کی۔ شیخ حسین فنِ حدیث کے امام تھے۔

شیخ عبداللہ شیخ حسین کے صاحبزادے تھے اور یمن سے اپنے والد بزرگوار کے ساتھ آئے تھے۔ سید عبداللہ خود بھی عظیم المرتبت عالم تھے، وہ ناظم ندوۃ العلماء رہے۔ علی گڑھ اور لکھنؤ یونیورسٹی میں عربی زبان و ادب کے استاد رہے۔ شیخ عبداللہ کے بڑے بھائی شیخ محمد بن حسین تھے، جو طبعی ذوق، ادب اور شاعری کا رکھتے تھے۔ عرصہ تک دارالعلوم ندوۃ العلماء میں عربی کے اُستاد رہے۔ شیخ محمد بن حسین کے صاحبزادوں میں فخرِ خاندان شیخ خلیل الرحمن، عبدالرحمن، حبیب الرحمن، عبید عرب (سابق پروفیسر صدر شعبۂ عربی حمیدیہ کالج) تھے اور شیخ عبداللہ کے دو صاحبزادے تھے۔ ہارون عرب اور مامون عرب۔

خدیجہ جاں نثار اختر شیخ ہارون عرب کی صاحبزادی ہیں۔

اور ننھیال یہ ہے

خدیجہ جاں نثار کی والدہ سید علی بلگرامی کی نواسی اور سید حامد حسین بلگرامی کی صاحبزادی تھیں۔ خدیجہ صاحبہ کی شادی ۱۶ ستمبر ۱۹۵۶ء کو جاں نثار اختر کے ساتھ ہوئی [۱]"

ایک شام خالد عابدی کے ساتھ ملنے گیا تو معلوم ہوا بمبئی کے لئے روانہ ہو گئے، مایوسی تو بہت ہوئی لیکن اطمینان ہوا کہ اب وہ اچھے ہیں اور سفر کے لائق ہو گئے ہیں لیکن کسے معلوم تھا کہ وہ بڑے لمبے سفر کے لئے رختِ سفر باندھ چکے تھے۔

---

[۱] یہ حالات مجھے خدیجہ آپا کے بڑے بھائی امین انصاری سے معلوم ہوئے ہیں

۸ اگست کو شام کے وقت ابراہیم پورہ پہنچا اور برادرم محمد خلیل کی دکان پر کھڑا کچھ بات چیت کر رہا تھا کہ پروفیسر آفاق احمد نے آواز دی؛ مڑ کر دیکھا تو وہ کہہ رہے تھے: "اختر صاحب کا انتقال ہو گیا۔" میں نے پوچھا کون "اختر صاحب" کہنے لگے: "جاں نثار اختر" یقین کیجئے پروفیسر آفاق احمد تو یہ روح فرسا خبر سنا کر روانہ ہوئے۔ یہاں طبیعت بجھ گئی۔ کتب خانہ شرقیہ کی طرف بڑھا کہ شرقی عثمانی صاحب سے بات چیت کر کے دل کا بوجھ ہلکا کروں، وہ نہیں ملے لوٹ رہا تھا کہ راستہ میں پروفیسر فضل تابش اور پروفیسر قاسم نیازی صاحبان سے ملاقات ہوئی۔ میں نے ڈرتے ڈرتے یہ خبر سنائی انہیں بھی اس کا علم نہیں تھا پہلے دونوں حیرت زدہ ہوئے پھر مغموم ہوئے؛ خبر کی تصدیق کیلئے ہلال منزل روانہ ہوئے، دروازہ کھٹکھٹایا۔ امین صاحب درد و غم کی تصویر بنے باہر آئے اور جس خبر پر یقین کرنے کو جی نہیں چاہ رہا تھا اُس پر تصدیق کی مہر لگا دی۔ بے اختیار منہ سے نکلا ع

کس سے خالی ہوا جہاں آباد

ٹھیک ہی کہا ہے حالی نے ؎

بحرِ ہستی بجز سراب نہیں
چشمۂ زندگی میں آب نہیں

آپ کا۔ غم زدہ بھائی

عبدالقوی دسنوی

بقیہ کہانی "ایک شام اور وہ آدمی" ۔ صفحہ ۱۶

سو چکا تھا۔ میں نے اُسکے ہاتھ سے چائے کی پیالی لے کر میز پر رکھ دی۔ اور اُسکے جسم پر کمبل ڈال دیا۔ میں ایک کتاب اُٹھا کر پڑھنے لگا۔ مجھے اُسکی باتیں یاد آ رہی تھیں —— جب میں کوئی خوبصورت کتاب پڑھتا ہوں تو محسوس ہوتا ہے کہ میں اپنی زندگی کو پھر سے جی رہا ہوں اور پھر میں الفاظ کو ڈھونڈنے لگتا ہوں —— اِس احساس کو دہرانے کے لئے مجھے الفاظ نہیں ملتے اور میں برسوں سے اِن الفاظ کی تلاش میں بھٹک رہا ہوں —— میں اکیلا کہاں ہوں؟ میں اکیلا نہیں ہوں؟ جیسے بار بار وہ کہہ رہا ہو' اسکے ہونٹ ہل رہے ہوں۔ شاید وہ کچھ کہنا چاہتا ہے۔ شاید اُسے الفاظ نہیں مل رہے ہیں۔

باہر بارش تھم چکی تھی۔ بادل چھٹ رہے تھے اور رات بہت گہری ہوتی جا رہی تھی۔ میں کتاب پڑھتے پڑھتے سو گیا —— جب میں صبح سو کر اُٹھا تو بوڑھا نہیں تھا جبکہ کپڑے چارپائی پر پڑے تھے۔ وہ اپنے کپڑے پہن کر جا چکا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے اس کمرے میں

شاعر، بمبئی

رات کوئی نہیں آیا تھا اسطرح خالی کمرہ اور تنہائی —— میرے پاس کیا رہ گیا تھا۔ اِس بات کو برسوں بیت گئے ہیں لیکن آج بھی مجھے تنہائی کا ناگ ڈسنے لگتا ہے اور میں زندگی کی راہوں میں بھٹکنے لگتا ہوں تو میں الماری میں سے بوڑھے کا پائپ نکال لیتا ہوں اور پھر مجھے محسوس ہوتا ہے جیسے ہم باتیں کر رہے ہیں ایکدوسرے کے بہت قریب ہیں —— جہاں جسم' وقت اور جگہ کے فاصلے مٹ جاتے ہیں۔

○○

بقیہ کہانی "کچرا" (صفحہ ۲۳)

وہ مرہٹی عورت جب میرے سامنے آ کر کھڑی ہوئی تو مجھے لگا جیسے مسلمانوں نے احکامِ خداوندی کو مستعدی سے پورا کیا ہے۔

فضل بھائی مجھے بتانے لگا: "یہ میری بیوی ہے سالا عورت تو بہت ہے اپن کے پاس ... پن بچہ کوئی نہیں — بابا لوگ کی درگاہ پر نیاز نذر چڑھاتا ہوں۔ پانچ پانچ سو فقیروں کو ایک ٹائم کھانا کھلاتا ہوں پن سالا بچہ کوئی بھی نہیں ... خیر چلے گا ... کیا کیا جائے کبھی کبھار بچہ لوگ تو اپن سے محبت کرتا ہے بڑا بڑا سیٹھ اپنے ہاں آ کر متھا ٹیکتا ہے پرواہ نہیں ...."

"فضل بھائی! یار تم نے اتنا کچھ کیسے اکٹھا کر لیا تم الف کے نام سے نہیں جانتے تھے اتنا بڑا کاروبار کیسے چلاتے ہو ....؟"

اُس نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ بسم اللہ کے کان میں کچھ کہا وہ مجھے اپنے ساتھ ایک دوسرے کمرے میں لے گئی پھر اپنے کولھوں پر ہاتھ مار کر بولی۔

"تم چھوکری لوگ کو پھنسانے کو منگتا ہے ... " میں اُس کا چہرہ تکنے لگا جس پر کسی طرح کی شرم و حیا نہ تھی وہ بڑی ڈھٹائی سے بولی۔ "تم چھوکری لوگ کو پھنسا کر اِدھر لائیگا ہم بچو سیٹھ کی باڑی' یا وہ پل گرانٹ روڈ تک پہنچائے گا' پرافٹ برابر ملے گا ... بولو ... منظور ... کہ نہیں؟ فضل بھائی بولتا ہے تم اُس کے گاؤں کا آدمی ہے وہ تم کو اپنے آپ یہ بات نہیں بول سکتا۔ دھندے میں شرم کیسا؟ کھائے گا کیا؟ بھوکوں مرے گا!

فضل بھائی کے مالک سیٹھ بننا منگتا ہے تو "ناں" نئیں سننا منگتا .... !

اس عورت کی ایک ننگی تصویر سی میری آنکھوں کے سامنے آ گئی۔ مجھے لگا فضل بھائی کے فلیٹ کی کھڑکی کے باہر ٹنگا پنجرہ' چھتری اور لالٹین اور بوسیدہ لحاف جیسے میرے وجود کے حصے ہوں ....

○○

غزلیں

پرویز رحمانی

پھر پریشاں کر رہے ہیں اَن کہی باتوں کے خواب
جاگتی آنکھوں میں اَن دیکھی مُلاقاتوں کے خواب

جس قدر احساس میں گہنائی ہیں تاریکیاں
اُس قدر دیکھے ہیں ہم نے چاندنی راتوں کے خواب

روشنی تعبیر کی آنکھوں سے رخصت ہو گئی
مت سجاؤ اب تھکی پلکوں پہ باراتوں کے خواب

مٹ گئی ہونگی اُمیدوں کی لکیریں سب کی سب
ورنہ دکھلائی نہ دیتے ٹوٹتے ہاتھوں کے خواب

اب انہیں پرویز رحمانی برس جانے بھی دو
رات کی آنکھوں میں کب ٹھہریں کے برساتوں کے خواب

○ ڈورنڈہ۔ رانچی (بہار)

انوار رضوی

میری تپش سے کون جلا کون رہ گیا
سچ پوچھو اپنے وار میں خود بہہ سہ گیا
میں اور تند و تیز ہواؤں کے سلسلے
میرا وجود کائی تھا پانی میں بہہ گیا
میری شکستگی کے مناظر عجیب تھے
ٹوٹا کہیں یہ سر تو کہیں دھڑ ہی رہ گیا
سب مصلحت کے تنگ حصاروں میں قید تھے
وہ کون شخص تھا جو کھلی بات کہہ گیا

○ ترقی اُردو بورڈ۔ ویسٹ بلاک ۸۔ آر۔ کے پورم نئی دہلی ۱۱

وقار واثقی

چکرا گیا بھنور سے گذرنے کے بعد بھی
ساحل ملا نہ پار اُترنے کے بعد بھی

حیرت نہ کر، کہ ایسے بھی ہوتے ہیں بعض لوگ
ذہنوں پہ راج کرتے ہیں مرنے کے بعد بھی

پہونچا ہوں کس مقام پہ مجھ کو خبر نہیں
چلتا رہا ہے ذہن ٹھہرنے کے بعد بھی

کمبخت ہاتھ کلیوں پہ بھی مارتا گیا!
دامن کو اپنے پھولوں سے بھرنے کے بعد بھی

انسان ہی تو تھے وہ فرشتے نہ تھے وقار
وہ جو سنور گئے ہیں بکھرتے کے بعد بھی

○ شاہ عالم کالونی رسول آباد۔ احمد آباد ۲۲

رئیس مالیگانوی

اپنی غیرت کو چلو ٹھیس لگا لی جائے
کانپتے ہاتھوں میں جھولی ہی اُٹھا لی جائے
جلتے سُورج کے سمندر میں گرے ہیں نیزے
اوس ہی چاٹ کے کچھ پیاس بجھا لی جائے
اپنے چہرے سے کبھی کرب کا اظہار نہ ہو
صُورت آئینے سے بھی اپنی چھُپا لی جائے
نیم وا آنکھوں میں کب خواب کی کرچیں ٹوٹیں
اُس سے پہلے ہی شبِ تار سجا لی جائے
آج کا کام یہی سب سے بڑا ہے کہ رئیس
آبرو اپنی زمانے میں بچا لی جائے

○ مومن پورہ۔ مالیگاؤں (ناسک)

انشائیہ

میں ہوا ہوں

نریندر سنگھ بھاٹیا

۲- اورینٹ رو - پارک سرکس، کلکتہ ۱۷

ہاں' میں ہوا ہوں' تنہا' پُراسرار اور عموماً خاموش۔ میں ہمیشہ تمہارے ساتھ ساتھ رہی ہوں اور تمہاری اُن سانسوں میں بھی جس سے تم پلے ہو۔ میں تمہاری رگوں میں دوڑنے والے خون میں بھی لپٹی ہوں' رات بار ہا صاف کرتی ہوں۔ میں تمہارے سب راز جانتی ہوں' پر خاموش ہوں' رات کی اُداسیوں میں کبھی کبھی جب میری خاموشی ٹوٹتی ہے تو تم نے مجھے سسکیاں لیتے سُنا ہوگا۔ کیا تم نے میرا سُراغ لگانے کی کبھی کوشش کی ہے کہ میں کہاں سے آتی ہوں اور کہاں چلی جاتی ہوں؟

میرا ذکر قدیمی کتابوں میں بھی ہے۔ ہزاروں سال پہلے رگ وید میں بھی میرا ذکر ہے۔ سُنو اُس میں کیا لکھا ہے :-

"پہلے کوئی آسمان نہ تھا اور آسمان کے پرے کوئی بہشت بھی نہ تھا پر ایک طاقت تھی! وہ کون سی طاقت تھی اور کہاں تھی؟ پہلے کوئی موت نہ تھی اور نا کوئی لافانی۔ کوئی رات نہ تھی اور نا کوئی دن تھا' پر صرف ایک طاقت زندہ تھی۔ بہت پُر امن طاقت خدا کی جو سانس لے رہی تھی اور اس کے علاوہ اور کچھ نہ تھا"۔

ہاں وہ خدا کی دی ہوئی طاقت میں ہی تھی۔ زندگی کے وجود کی پہلی نشانی۔ میں خاموش کئی اور میں' تاروں کے ساتھ ساتھ چلتی رہی ہوں۔ جو خلا کی خاموشی میں تیزی سے سرگرداں ہیں۔ ان میں زندگی کا کوئی اور وجود نہیں سوائے میرے۔

تم نے بائیبل میں بھی میرا ذکر پڑھا ہوگا کہ جب خدا نے دنیا اور بہشت بنائی۔ اُس وقت دنیا خالی تھی اور خلاء میں خدا کی رُوح تیر رہی تھی۔ ہاں وہ پُر اسرار "روح" خدا کے وجود کی نشانی میں ہی تھی اور "میں" ہی وہ ہوا تھی جو حضرت نوحؑ کی کشتی کو آرمینیا کے پہاڑ پر حفاظت سے لے گئی تھی اور خدا کے نیک بندوں نے اپنی زندگیوں کا پھر سے آغاز کیا تھا۔ یہ خدا کا دیا ہوا آخری موقع تھا۔

تم نے سُنا نہیں کہ ایک یوگی نے اپنے مرید کو آنکھیں بند کرنے کو کہا۔ اور مُرید جیتا رہا۔ پھر اُس نے اُسے کان بند کرنے کو کہا تو بھی مرید جیتا رہا۔ پھر اُس نے اُسے ہاتھ جکڑنے کو کہا تو بھی مُرید جیتا رہا لیکن جب اُس نے مُرید کو سانس بند کرنے کو کہا تو مُرید چلّا اُٹھا " نہیں' سانس بغیر میں نہیں رہ سکتا"۔ تو دیکھا' میں ہی وہ سانس ہوں' وہ ہوا ہوں جو تم کو زندہ رکھتی ہوں اور زندگی کا وجود برقرار رہتا ہے۔

بھگوت گیتا میں ہوا کو جسم کے اندر روکنے اور چھوڑنے کا علم ہے۔ اِس کی مشق کرنے سے تم پر وحدت طاری ہو جائے گی۔ جی ہاں میں کوئی معمولی شئے نہیں ہوں۔ اِسی گیتا کے دسویں ادھیائے میں بھگوان کرشن کہتے ہیں "میں ہوا ہوں جو پالودگی دور کرتی ہے"۔

میرا ذکر قرآن شریف میں بھی ہے۔ دسویں سورۃ میں میرے وجود سے لوگوں کو خدا یاد آیا تھا' جب میں ہوا سے طوفان میں بدل گئی تھی اور جہاز سمندر میں ڈگمگانے لگا تھا تو مسافر گڑگڑا کر خدا سے درخواست کرنے لگے تھے کہ اُنھیں صحیح سلامت ساحل پر اُتار دے۔ پر ساحل پر اُتر کر وہ خدا کی ذات سے مُنکر ہو گئے تھے۔

میں وہی ہوا ہوں جو خلیل جبران کی تصنیف "پیغمبر" کے کردار المصطفیٰ کو بارہ برس بعد میں جہاز کے بادبانوں میں بھر کر اُسے واپس اپنے جزیرے پر لانے کے لئے گئی تھی۔ اور وہی ہوا ہوں جو اسپین کے آرمیڈا کو واپس اُڑا لے آئی تھی اور انگلینڈ پر حملہ کرنے نہ دیا تھا۔ اُس وقت انگریزوں نے کہا تھا کہ خدا نے ایسی ہوا چلائی کہ دشمن جہازوں کے بادبان اُلٹ گئے لیکن انگریزوں نے یہ کیوں نہ سوچا کہ بے وقوف خدا کو یہ لڑائی ہی پسند نہ تھی۔

گو میں معصوم ہوں پر بائیبل پر اعتماد رکھنے والے کہتے ہیں کہ ہوا کے بیچ

بڑاؤ گے تو پھل طوفانوں کا ملے گا۔ ہاں میں قہرِ الٰہی بھی بہت بار بنی ہوں۔ یسوع مسیح کو پھانسی دینے کے بعد تین گھنٹے تو دنیا پر تاریکی چھا گئی تھی، پر میں پھر بھی اُس کے پاس رہی تھی۔ اُس کبھو نجال کے وقت بھی ہوا، کی جان نکل جانے کے تیسرے دن بعد آیا تھا اور وہ اپنی قبر سے باہر نکل آیا تھا۔ جس کے قاتل کون تھے؟ اُن کا خدا علیحدہ کیوں تھا؟

ناگا ساکی پر ایٹم بم گرنے کے بعد فضا میں شدّت کی گرمی بڑھ گئی اور میں گرم لُو کی صورت میں، ہاں کئی ہزار سینٹی گریڈ ڈگری کی شدّت لئے ہوئے چاروں طرف بکھر گئی اور بچے کھچے انسانوں، زندہ یا مُردہ کو بھک سے بھسم کرتی نکل گئی۔ مجھ میں اتنی حرارت آگئی کہ کئی سو سُورج بھی مل کر بھی پُوری نہ کر سکیں۔ میں ایک ایسی لُو بن گئی کہ سیکنڈ کے بھی کئی سو حصّوں میں سے ایک میں، لپیٹ میں آئے ہر انسان کو مُٹھی بھر سے بھی کم دُھول میں منتقل کر کے چلی گئی۔ ایک قوم نے دوسری قوم کو ختم کر کے کیا پایا؟

میں برفیلی ہوا بھی ہوں جو پاگلوں کی طرح سیٹیاں بجاتی پہاڑوں پر انتہائی تیزی سے سرگرداں رہتی ہوں۔ میرے چاروں طرف تنہائی ہوتی ہے۔ وہاں کبھی کسی جاندار کا بھی وجود نہیں ہوتا۔ چاروں طرف سپید برف، پھر چاندنی، وہاں جانا۔ کیسا خاموش دکھائی دیتا ہے۔ شاید وہ نہیں چاہتا کہ میں پہاڑوں کے سکون کو ختم کروں پر میں ایک آوارہ رُوح کی طرح جس کے آخری مقدّر کا فیصلہ نہیں ہوا، بے چینی سے آہیں بھرتی کبھی اِدھر کبھی اُدھر تیرتی رہتی ہوں وہاں چاروں طرف صرف خدا کا وجود ہوتا ہے۔ بندوں کے اختلافات کا نہیں۔

میں نے ملکوں کی تواریخ کے اوراق بھی اُلٹے ہیں۔ میں اُس وقت بھی تھی جب تیر اور دھات کا زمانہ تھا اور جب یونان میں عُریاں عورتوں کی منڈی لگا کرتی تھی۔ جب جولیس سیزر کو بروٹس نے چھُرا گھونپا تھا۔ جب پُرانے خدا جیسے جوپیٹر جو خداؤں کا خدا تھا اور جونو کا شوہر، منروا جو عقل کا خدا تھا اور مرکری جو جوپیٹر کا لڑکا تھا اور خداؤں کے ایلچی اپنی پرستش کراتے تھے۔ اب کوئی اُن کی پرستش نہیں کرتا۔ میں وقت کے ساتھ وینس کے بیٹے کیوپڈ کے تیروں کو بھی اُڑا کر لے گئی ہوں۔ پانیوں کے خدا، پہاڑوں کے خدا، وقت کے ساتھ ساتھ وہ بھی بھُولے جا چکے ہیں اور میں اُن کے پُرانے اُجڑے مندروں میں سے اب بھی سرسراتی گذر جاتی ہوں۔ میں اُس وقت بھی تھی جب موہنجو داڑو اور ہڑپا میں تہذیب و تمدن پھیلا اور مٹا تھا۔ جب چنگیز خاں کے دندناتے لُوٹ کھسوٹ کرتے قبیلے وسطِ ایشیا میں پھیلے ہوئے تھے۔ کئی تہذیبوں نے جنم لیا اور مٹ گئیں اور میں نے اُن کی خاک بھی وقت کے ساتھ ساتھ

شاعر۔ بمبئی

دُور دُور تک بکھیر دی۔ میں نے قحط سے لوگ مرتے دیکھے اور میں اُن کی ہڈیوں اور کھوپڑیوں کے بیچ سے گذرتی ہوئی آگے بڑھ گئی اور قحط زدہ کھیتوں کی مٹی اُڑاتی اُن شہروں تک پہنچی جہاں پلیگ ہوئی تھی۔ لوگ اپنے رشتہ داروں کو سسکتے چھوڑ کر بھاگ رہے تھے لیکن جب وہ خود رستے میں اِسی مرض میں گرفتار ہو کر گر گئے اور حلق موت کی قربت سے سوکھنے لگے تو میں نے خاک اُڑا کر اُن کی اور اُن کے چہروں کی شرم کو ڈھک دیا کہ مصیبت میں انسان انسان کے کیوں نہ آیا؟

میں اُس وقت بھی موجود تھی جب جان کینیڈی کو ڈلاس میں گولی لگی تھی اور اُس کی کھوپڑی کے پرخچے اُڑا دئیے تھے۔ ایک سال خاموشی کے بعد اُس کی بیوی جیکی نے اپنے باپ کی عمر کے آدمی اوناسس سے شادی رچالی تھی تو ایک امریکی اخبار میں چھپا تھا: "جیکی تمہیں امریکی قوم نے اپنا دل دیا تھا۔ تو ہماری عزّت اور فخر کی امانت تھی۔ تُو نے اپنی جنسی ہوس کے لئے بُڈھے اوناسس سے شادی کر لی جس نے شادی سے پہلے ڈاکٹروں سے اپنا معائنہ کروایا تھا کہ وہ تمہارے 'کام' کا ہے یا نہیں"۔

ہاں میں نے تاریخ کا وہ باب بھی اُلٹ دیا۔ وقت عشق و مشق سب بھُلا دیتا ہے۔ امریکی قوم کو جو کینیڈی اور جیکی کا احترام تھا اُس کا ثبوت اُنھوں نے کینیڈی کے چھوٹے بھائی کو بھی گولی مار کر دیا۔ پر میں اِن مَرے ہوئے کینیڈی اور کینیڈی کو مارنے والے اِن سب کی قبروں پر سے سرسراتی چلی جاتی ہوں۔ ماضی اور حال کو چھُوتی اور مستقبل کی جاتی ہوئی۔ جیکی اب میری ہی طرح تنہا ہے۔

انسانی تہذیب نے اب مجھے بہت پالوٹ کر دیا ہے۔ اب بہت ایسے شہر ہیں جن کی فضا زہریلی ہو چکی ہے۔ اب ہائیڈرو کاربن، کاربن مونو آکسائیڈ اور سلفر ڈائی آکسائیڈ میرے ساتھی بن چکے ہیں۔ لوگ جو سانس کے ذریعہ اندر کھینچتے ہیں، جانتے نہیں کہ میں اُن کے پھیپھڑوں میں کینسر پیدا کروں گی۔ لوگ کھانستے ہیں۔ دن کو کھانستے ہیں اور رات کینسر کی کھانسی۔ ہنستے ہوئے کھانستے ہیں اور روتے ہوئے کھانستے ہیں۔ نہیں جانتے کہ اُن کے اندر کینسر جڑیں پکڑ رہا ہے۔ اُن کی رگ رگ میں پھیل رہا ہے۔ لیکن اب میں جان گئی ہوں کہ یہ دَور بھی ختم ہونے والا ہے۔ انسان نے اتنی ترقی کر لی ہے کہ یہ خود اُس کی دشمن بن گئی ہے۔

بھی اُس کی جان لیوا ہوگی۔

دیکھو! دنیا میں بموں کے انبار کو دیکھو۔ ہر کوئی امن کے لئے چلّا رہا ہے، لیکن فیکٹریوں میں دھڑا دھڑ ایسے بن رہے ہیں جو ہائیڈروجن بم برسائیں گے۔ بہت سے ملکوں نے مسلسل پرواز کیلئے طیارے اٹامک بموں سے بھر کر چھوڑے ہوئے ہیں کہ اشارہ ملتے پر دشمن ملک کی طرف پرواز کر جائیں۔ یوں کہو کہ موت ہمارے سروں پر ہمیشہ مسلسل پرواز کر رہی ہے۔ ان اٹامک بموں کا انبار پُوری دنیا کو ختم کرنے کے لئے چار بار کافی ہے۔ سمجھ گئے چار بار کا مطلب؟ ٹھہرو، میں سمجھاتی ہوں۔ اگر پُوری دنیا ختم کرنے کے لئے ایک ہزار اٹامک بموں کی ضرورت ہے تو سب ملکوں نے مل کر چار ہزار بم بنا کر رکھے ہوئے ہیں۔ انسان نہیں جانتا کہ وہ پیڑ کی اُسی شاخ کو کاٹ رہا ہے جس پر وہ بیٹھا ہوا ہے۔ پر یہ عقل کی کہانی تو اسکول کے بچّوں کے لئے ہے۔ پختہ اور اعلا دماغ والوں کے لئے نہیں!

مجھے الزام نہ دینا پر میں تمہیں سبز باغ بھی نہیں دکھانا چاہتی۔ دنیا باوجود سب کمزوریوں کے پھر بھی حسین ہے۔ صبح کو تازہ کھلے گلاب کے پھُول کے اُوپر شبنم کے قطرے۔ ایک اسکول جاتے ہوئے بچّے کے ہونٹوں کی مُسکان، ایک گھریلو عورت کے چہرے پر سُکون کی روشنی، ایک محنت کش تھکے انسان کے مُنہ پر شام کو اطمینان کی جھلک، ایک جوان جوڑے کے ہاتھوں کا پہلا لمس یا ایک پاکیزہ محبّت کے پہلے بوسے کی لذّت، یہ سب حسین چیزیں ہیں۔ پر جب کبھی انسانی نفرت نے دنیا غرق کر دی اور اس دھرتی پر میں دہی کئی ہزار سینٹی گریڈ ڈگری کی حرارت لے کر دوڑی تو سب بھسم ہو جائے گا۔ وہ اسکول جاتا بچّہ بھی۔ وہ گھریلو عورت بھی اور محبّت کرنے والے اور نفرت کرنے والے دونوں بھی۔ نہ وہ گلاب کا پھُول رہے گا اور نا وہ شبنم کا قطرہ۔ نہ وہ سُرور سے جھُومتے پیڑ رہیں گے اور نہ چہچہاتے پرندے۔ میں کبھی بھی دُور دراز سے تمہارے لئے نئے پھُولوں کی خوشبو لے کر نہ آؤں گی کیونکہ کوئی پھُول نہ ہوگا۔ گرمیوں میں پہلی برسات کے بعد زمین سے اُٹھتی معطّر ہوا تم نہ سونگھ پاؤ گے۔ تمہیں میں خوشی سے پُکارتی جب پیڑوں کے بیچ سے سیٹیاں بجاتی نکلوں گی تو تم کو نہ پاؤں گی۔ میں تو بھُول ہی گئی۔ وہ پیڑ ہی نہ ہوں گے جن کے بیچ سے گزر کر میں سیٹیاں بجا سکوں گی اور نا ہی تمہارے گالوں کو سردیوں کی ٹھنڈی ہوا کبھی تھپتھپائے گی کیونکہ... تم سب کا تو وجود ہی مٹ چکا ہوگا!

پر اس سُنسان خاموش دھرتی پر میں پھر بھی تنہا دوڑوں گی اور انسانی تہذیب و تمدّن کی تاریخ کے اوراق اُلٹنے کی ضرورت ہی نہ رہے گی۔ کیونکہ سب کتابی تواریخ وجود کھو دیں گی۔ انسانوں کے ساتھ وہ کتابیں بھی تو بھسم ہو جائیں گی۔ انسان کی محبّت اور نفرت کی تواریخ ہندو اور مسلم کے بھگوان اور اللہ کی کتابی تواریخ۔ مندر، مسجد اور گرجا اور خود انسان بھی مٹ جائیں گے۔ انسانی تہذیب و تمدن کے پُورے عروج کی بدولت!! اور اس کے بعد پھر وہی ہوگا کہ ایک طاقت خلا میں سانس لیتی ہوگی۔ بہت پُرامن طاقت خدا کی اور اس کے علاوہ اور کچھ بھی زندہ نہ ہوگا۔ مجھے فکر نہیں کہ میرا بھی وجود ختم ہو جائے یا رہے پر کیا دنیا میں انسان پیدا کرنے کی خدا کو دوبارہ ضرورت محسوس ہوگی؟؟؟ ○

شاعر بمبئی

نصر غزالی

آسماں کتنے، زمیں کتنی، مناظر کتنے
دل کی تہہ میں دبی تمنا کے مقابر کتنے

پارہ پارہ نہ ہو کیوں ہم سفری کا احساس
آنکھ جھپکی جو ذرا، بچھڑے مسافر کتنے

فاش لہجے کی جراحت نے کیا زخم کا راز
پرسکوں ہم نظر آتے تھے بظاہر کتنے

انگلیاں اپنی زلیخا صفتوں نے کاٹیں
حسنِ احساس کے محروم ہیں تاجر کتنے

خوں رلاتی یہ صدی ایک عجائب گھر ہے
ہیں جہاں ساعتِ سنگیں کے نوادر کتنے

○ مولانا آزاد کالج، ۸ رفیع احمد قدوائی روڈ۔ کلکتہ ۱۳

مسعود شمس

زہر میں ڈوبا ہوا اِک تیر سا
شام ڈھلتے ذہن میں پھر چبھ گیا

زرد موسم، خشک پتوں کا چمن
دور تک ویرانیوں کا سلسلہ

سب دعائیں گنبدوں میں کھو گئیں
پھر اٹھاؤ ہاتھ پھر مانگو دعا

اِتنی نامانوسیت کی دھند ہے
ڈھونڈنا مشکل ہے کوئی آشنا

خود فراموشی تھی طفلِ شیر خوار
آگہی نے مجھ کو بوڑھا کر دیا

○ فائن آرٹ، مین روڈ۔ سیتامڑھی (بہار)

ایم۔ایم وفا

موسمِ گل کی وفائیں سن لو!
زرد پتوں کی صدائیں سن لو

راہ تو راہ تکے گی ہر دم
وہ اِدھر آئیں نہ آئیں سن لو

آخرِ شب درِ دل پر پیہم
کوئی دیتا ہے صدائیں سن لو

دوستو زندگیِ پیہم کا
حالِ غم کس کو سنائیں سن لو

فکر کی انگلیوں میں جنبش ہے
لفظ کی بند قبائیں سن لو

یوں تو یہ رات اندھیری ہی بہت
پھر بھی پھوٹیں گی ضیائیں سن لو

○ معرفت مسز ہلال عظیم بھارتی۔ نلاد مین چوک۔ بتیا (بہار)

خیال انصاری

ایک بھی در سے مروت کی نہ خیرات ملی
میں جو احساسِ انا کا لئے کشکول گیا

بیٹ کی آگ میں شدت بھی نہ آئی تھی ابھی
چند سکوں میں مرا جسم مجھے تول گیا

جب تلک وا تھا دریچہ تو کوئی بات نہ تھی
بند ہوتے ہی کئی رازِ نہاں کھول گیا

جن سے لگتا تھا کہ پھوٹیں گی ہنر کی نہریں
خشک نکلے وہ کنوئیں جانچ کا جب ڈول گیا

دے گیا کچھ نئے معنی بھی ادب کو وہ خیال
سلسلہ چھیڑ کے لفظوں کا جو انمول گیا

○ ۲۰۰ - خوشامد پورہ - مالیگاؤں (ضلع ناسک)

آخری کش

عُبید قمر
گولک پُور پٹنہ - ۲

ٹرین سے اُترتے ہی جیسے یکایک اندر کی ساری گردش جمود میں تبدیل ہوگئی۔ فرسودہ معطل احساس طاری ہوا چاہتا ہے۔ ساتھ ہی رچی بسی حرکت کی رَو کے نقے بھی کہیں جل بجھ رہے ہیں۔ اور اب رکشا چلتے ہی وہ سوچنے لگ گیا ہے۔ آمد کی اطلاع —" لیکن مظاہر کو اپنا آپ اُس پہ متاسف ہوتا نظر نہ آیا۔ برس پہلے وہ بڑے بابو کا سَو روپے کا نوٹ بھنانے گیا تھا۔ تو اب واپس آیا ہے۔ بیچاری ماں پر نہ جانے خفت اور غم نے کیا تاثر چھوڑا ہوگا۔ بڑے بابو اُسے بھی اپنے بیٹے کی طرح مانتے تھے۔ لیکن ایک دن اپنے اکلوتے لڑکے حشمت بابو پر مظاہر کے بستر پر اُنھیں بیٹھے ہوئے دیکھ کر کس قدر برافروختہ ہوئے تھے وہ! — ہاں 'کسی کو ماننے کی بھی تو کئی سطحیں ہوتی ہیں!!' آخر وہ یہ سب کیوں سوچ رہا ہے؟ اُسے تو اُن کے احسانوں کا بدلہ ادا کرنا چاہیئے۔ اُن کے روپے نے اُسے آج لاکھوں کا آدمی بنا دیا ہے۔ وہ اب کلکتہ میں پیپر فیکٹری کا مالک ہے۔ وہ بھی بڑا بابو ہی کہلاتا ہے —

بڑے بابو — حشمت — مظاہر' اور اُن سے جنم لیا ایک نیا وجود ——
بڑا بابو!

حشمت بابو تو اب ڈاکٹر یا انجینئر بن گئے ہوں گے۔ اُن کی شادی بھی ہوگئی ہوگی۔ کیا وہ اپنے بچوں کو گود میں لے کر بڑے بابو کے سامنے جاتے ہوں گے؟ کتنے شرمیلے تھے وہ لیکن یہ پُرانی تہذیب کے خلاف بھی تو ہے۔ اور بڑی حویلی کا رکھ رکھاؤ' بڑے بابو کا رعب داب تو مشہورِ زمانہ ہے۔ زمینداری ختم ہونے پر انھوں نے نہ جانے کون سا بزنس اختیار کیا ہوگا۔ پتھروں سے اُنھیں کافی شغف رہا ہے۔ بہت ممکن ہے جواہرات کا کاروبار ہی شروع کر دیا ہو۔ مگر اُس کے لئے تو ایک بڑی پُونجی درکار ہے۔ ویسے اپنے آپ کو مصروف اور مستحکم رکھنے کے لئے کوئی مشغلہ تو اپنانا ہی پڑا ہوگا۔ زمینداری یکایک چلی گئی۔ روپیہ پس انداز کرنا تو کبھی جانا ہی نہیں۔ بے دریغ لُٹاتے رہے۔ اپنی والدہ کی علالت اور بیماری کے دَوران تیمارداری کرنے پر بڑے بابو نے ہماری ماں کو پانچ ہزار کی کثیر رقم یوں ہی دے دی تھی۔ جب جس سے خوش ہوئے اُسے اُس کی ضرورت سے زیادہ رقم دے ڈالی۔ پتہ نہیں یہ زمیندار لوگ اندیشۂ مستقبل سے کیوں اتنے بے حذر تھے۔ شاید فارغ البالی نے اُن کی اتھاہ لیکن محدود ذرائع کی آمدنی کو ایک خاص لائحۂ عمل میں مقیّد کر رکھا تھا۔ اور اب تو صرف زمینداری باندھی ہی کبھی کبھی ملتے ہوں گے۔ کنبہ کافی بڑا ہے۔ بڑے بابو اور چھوٹے بابو کا مخلوط خاندان! اور پھر اُن کے بچوں کے بھی.....

ماں نہ جانے کیسی ہوگی۔ کتنا بدبخت ہے وہ! اُسے ذرا بھی راحت نہ پہنچا سکا۔ ماں زندہ ہوگی تو نئے بنگلے میں بہو کو اُتارے گی۔ اُس کے ہاتھ خوشی سے کانپنے لگے۔ کاش اور بھی کوئی سگا ہوتا اُس کا — بڑے بابو...

۴۶ء میں بڑے بابو کا آبائی مکان تباہ ہوا۔ فساد میں قصبہ کے کئی لوگوں کے ساتھ اُس کی بھی ساری فیملی تباہ کر دی گئی۔ صرف حاملہ ماں بچی۔ اور وہ شہر میں بڑے بابو کے سسرالی مکان میں پیدا ہوا۔ حشمت بابو کی پیدائش اُس سے دو ماہ پہلے کی ہے۔ دونوں ہمجولی.....

اے رکشا' ذرا سنبھل کر چلاؤ بھئی۔ اب تو یہاں بھی کلکتہ کی طرح رش ہونے لگا ہے' کتنا بدل گیا ہے یہ شہر۔ نئی نئی عمارتیں' گاڑیوں کا اژدحام۔ فیشن.. اماں یار' داہنے موڑ سے — ہاں...

ارے یہ کیا؟ اس سرزمین کا تو نقشہ ہی بدل گیا ہے۔ جیسے نئے پُرانے کی اَن دیکھی جنگ چھڑ گئی ہو یہاں۔ اور اس مجہول انقلاب کے بعد یہ جگہ نئے سرے سے بسائی جا رہی ہو۔ بہت ساری قدیم عمارتیں منہدم ہو چکی تھیں۔ خالی پڑی زمینوں پر کہیں کہیں نئی اور جدید طرز کی عمارتیں ہلکی نخوت سے کھڑی تھیں۔ کئی مشہور حویلیاں تو غائب ہی تھیں۔ اور کچھ ٹوٹی پھوٹی حویلیاں اپنا نُچا کھچا وجود لئے ایک آدھ گنبد یا روشن دان کے سہارے نامانوس مکین کو ڈھونڈتے

جلال کے حصار میں لئے ڈھو رہی تھیں ۔ پتا نہیں بڑے بابو . . . .

"بس بھئی روک دینا" رکشا سے اتر کر بریف کیس سنبھالتے ہوئے وہ ذرا تن کر کھڑا ہونے میں ختم کھا گیا ۔ اور اُس کی سوچ کی فضا میں ماضی و مستقبل کے دُھندلکے سے یکایک حال کا سورج نمودار ہوا ۔

جھلاتے پیکٹ سے آخری سگریٹ نکال کر اُس نے ڈبیا پھینک دی ۔ اور گیس لائٹر کے اُبلتے شعلے سے سگریٹ جلائی ۔ اب اُس کے متوازن قدم ایک پتلی گلی میں مڑ گئے ۔ اُسے احساس ہوا جیسے اُس کے اندر کوئی چیز تن گئی ہے ۔ بڑھتے قدم میں بھاری پن اور چہرے پر آن چاہی خشونت لئے وہ اِدھر اُدھر دیکھتا چلا جا رہا تھا ۔

یکایک اُس کی نظریں دُور سامنے سے آتے ہوئے انسان میں حشمت بابو کی شبیہہ تلاش کرنے لگیں ۔ ہاں ہاں ، حشمت ہی بابو تو ہیں ۔ لیکن یہ اتنے ٹھگنے سے ہو کر رہ گئے ؟ چھاتی تو چوڑی ہے پر قد اتنا کم ؟ اُن کی تو اُٹھان بالکل بڑے بابو جیسی تھی ۔ بڑے بابو کتنے لمبے شمیم اور کیسے وجیہہ ہیں اور حشمت بابو تو ـــــ اُسے دیہاتی کٹھ پتلی یاد آگئی جس کی رسّی نیچے سے کھینچ لی گئی ہو ۔ اور اُس کا لانبا قد پھیل اور پھول کر ٹھگنا بن گیا ہو یا اُن کی گود میں کوئی بچہ ہو ۔ اب وہ بھی دُور ہی سے اُسے گھور رہے تھے ۔

ارے ۔ حشمت بابو ۔ آپ !

اور ۔ ت ۔ تم ۔ م ـــــ مظاہر ہو ۔ نا ۔ ں ؟

جی ـــ جی ہاں ؟

"اخاہ !" ۔ اور حشمت بابو بچے کو گود سے اُتار کر مظاہر کے گلے لگ گئے ۔

"واہ بھئی ، کمال کر دیا تم نے ۔ یعنی پندرہ سال بعد ہم لوگوں کی یاد آئی ۔ کہو کیسے ہو ؟

بس سب ٹھیک ہے ۔ یہ آپ کے صاحبزادے ہیں نا ؟" اُس نے غیر محسوس جبر کے ساتھ مسکراتے ہوئے لاغر بچے کی طرف ہاتھ بڑھایا ۔ خوددار بالک جیسے اُس کے من کی تلملاہٹ بھانپ گیا تھا ۔ وہ باپ ہی کی گود میں چڑھ گیا اور مظاہر کی ٹائی میں لگے شوخ کلپ کو گھورنے لگا ۔ حشمت بابو کی نظریں بھی اُس کے خوش پوش سراپا کو ٹٹول رہی تھی ۔ اُس نے پرس نکالا اور دس دس کے دو نوٹ صاحبزادے کے دونوں ہاتھوں میں پکڑا دئے ۔

شاعر ، بمبئی

"ارے ارے یہ کیا ۔ یہ پھاڑ دیں گے بھئی یعنی اِس کی کیا ضرورت تھی" حشمت بابو نے دونوں نوٹ لیکر اپنی جیب میں رکھ لئے ۔ اور اب چھپانے کی لاکھ کوشش پر بھی مسکراہٹ کا تبسم اُن کے ہونٹوں پر تول رہا تھا ۔

"بڑے بابو وغیرہ اچھے ہیں نا ؟ اور اماں . . . ."

"ہاں ابّا وغیرہ سب لوگ بخیر ہیں ۔ لیکن امّا یعنی تمہاری والدہ کو انتقال کئے پانچ سال سے بھی زائد ہو گئے ۔ بیچاری اکلوتی اولاد کے غم میں گھلتی رہیں ۔ اچھا بھئی تم رہے کہاں اتنے دنوں ؟ چلو ذرا ایک سگریٹ لے لوں ۔ ابھی چائے پی ہے نا تو خواہش ذرا جاگ اُٹھی ۔"

"ہاں ہاں چلئے" اور دونوں سڑک کی جانب مڑ گئے ۔

اُس کے بہت اندر کہیں دُھندلی سوچ اُبھری ۔ یہ خود اور اِس حلیہ میں لنگی پہن کر سگریٹ لینے ؟ اور اب ایسی بھی بیقراری کیا ۔ ہم لوگ گھر چلتے اور یہ کسی سے بھی منگو لیتے ۔ نہیں ـــ ہو سکتا ہے گھر میں پیسے ہی نہ ہوں ۔ کہتے ہیں پہلے تو لوگ بزرگوں کا نام ہی سُن کر اٹینشن ہو جایا کرتے تھے ۔ اِن خوش لمحوں نے حشمت بابو کے ذہن کو بھی گرفت میں لے رکھا تھا ۔ وہ بھی کہیں ڈوب اُبھر رہے تھے ۔ یہ دس روپے تو میں بیگم کو دے دوں گا تاکہ وہ بھی ضروریات کی کچھ چیزیں خرید سکیں ۔

ابھی ابھی جب وہ چائے پی کر کمرے سے باہر نکلنے لگے تھے ۔ بیگم بے رنگ فریم کے عالیشان سنگھار دان میں لگے دُھندلے قد آدم آئینے کے سامنے کھڑی زُلفیں سنوار رہی تھیں ۔ اور یہ موڈ ہی میں کہہ گئے تھے ۔

"آج بڑا بناؤ سنگھار ہو رہا ہے ؟"

جواب انتہائی سادہ لوحی سے ملا تھا ـ "سنگھار کیا مٹی سے ہوتا ہے ؟" حشمت بابو کے اندر ہی اندر کوئی چیز تن کر ٹوٹ گئی تھی ۔ اور یہ منّے کو لے کر دس پیسے اُس سے حاصل کر کے سگریٹ پھونکنے نکل پڑے تھے ۔ اب بیچارے ابّا آخر گھر کا تو سارا خرچ چلاتے ہی ہیں ۔ اور یہ اُوپر کا ہلکا پھلکا خرچ ۔ اُن کے من کی کھائی میں دھم سے کہیں ایک وزنی پتھر گرا ۔

"بقیہ دس روپے میں منّے میاں کا بسکٹ اور . . . . ."

"ارے ، حشمت بابو ۔ یہاں تو سارا محلّہ ہی ٹوٹا پڑا ہے ۔ اور یہ جا بجا نئی عمارتیں ؟ مظاہر نے کچھ دیر تک حشمت بابو کے کھوئے ہوئے چہرے کو گھورنے کے بعد جیسے جھجکتے ہوئے سوال کر ڈالا ۔

حشمت بابو کی پر ہیجان نظریں ایک منٹ کے لئے اُس کے پُر سکون چہرے پر جم سی گئیں اور پھر پسپا ہو کر زمین پر بے دم ہو گئیں ۔ وہ ایک "انبی" آدمی

ے ساتھ شکست خوردہ لہجے میں گویا ہوئے ——— "تم تو جانتے ہی ہو یہ
زمینداروں کا مشہور محلّہ تھا۔ زمینداری چلی گئی۔ کئی مکانات تو تقسیم ہی کے
وقت سے خالی ہو کر آہستہ آہستہ ڈھ رہے ہیں۔ کافی علاقہ یونیورسٹی نے ایکوائر
کر لیا ہے۔ یہاں نئے انداز کے کلاس اور ہوسٹل تعمیر ہوں گے۔ کئی ایک مکان
یونیورسٹی نے گروا دئیے ہیں۔ کئی خستہ حال عروج و زوال کی نشانی بنے پڑے ہیں
اور ان میں نیچے قسم کے لوگ زبردستی آ بسے ہیں۔ اور یہ ایکوائرڈ ایریے سے باہر جو
دو ایک عمارتیں ہیں وہ مکھن ساؤ اور ماکھن دھوبی وغیرہ نے حال میں بنوائی ہیں،
یہی سب اب یہاں کے کچھ لیڈر وغیرہ ہیں ——"

"اف! یہاں تو نقشہ ہی بدل گیا ہے۔ عجیب ویرانہ سا لگتا ہے۔ مجھے تو بڑا
افسوس ہو رہا ہے یہ منظر دیکھ کر ——" مظاہر نے اپنے لہجے میں ایک گنجلک
جھنجھلاہٹ محسوس کی۔

"ارے بھئی نقشہ تو بدلنا ہی چاہئے۔ اور ہمیشہ بدلتا رہے گا۔ ویرانی اور وحشت
بھی وقتی چیز ہے۔ کسی طرح کا کوئی فریب اب ہم اپنے احساس کو بھی نہیں
دینا چاہتے۔

ہمارے بزرگ یہ بڑبڑا کر اپنی تسکین کر لیتے ہیں کہ —— یادگارِ زمانہ ہیں ہم لوگ!
لیکن اپنا تو نوشتۂ تقدیر ہی نرالا ہے۔ ہم نے جب ہوش سنبھالا تو اُن چھوٹے
نوابوں کا طبقہ بحران کی زد میں تھا۔ اور . . . . ."

حشمت بابو پوری اسپیڈ میں تھے۔ اُن کا چہرہ ناکام واپس آئے اسٹرونائٹ
جیسا گمبھیر اور بے رونق تھا۔

مظاہر پر بھی ایک کیفیت طاری تھی۔ جیسے اُس کے قدم چاند کی سرزمین پر
اِدھر اُدھر پڑ رہے ہوں۔ جیسے وہ بھی ایک نئی عمارت یہاں بنانے کی سوچ رہا ہو۔

"تو حشمت بابو آپ کہیں سروس کر رہے ہیں؟" اُس نے یوں دریافت کیا جیسے
اس کے اندر کا نئیں اس کا جواب نفی میں چاہنے پر مُصر ہو۔

"نہیں بھئی، کہاں کچھ ہو پایا ہے ——— سروس حاصل کرنے کے لئے رشوت
دینے لائق کچھ رہے ہوں۔ یا پھر زوردار سفارش نصیب ہوا بی۔ اے کب کا
کر چکا ہوں۔ لیکن اب روپے کہاں سے آئیں۔ ہر ماہ کچھ زمینداری بانڈ بن جاتا
ہے اور کچھ ابا اپنے مختلف شغل میں حاصل کر لیتے ہیں۔ بس کسی طرح اُدھار نقد
لے کے تو زندگی گذر رہی ہے۔

ویسے یہاں کا کون ایسا بارسوخ شخص ہوگا جس سے ابا کے مراسم نہ ہوں۔
لیکن اُن کا قول ہے کہ میں اپنے بیٹے کے لئے کسی سے سفارش نہیں کر سکتا۔
حالانکہ میں اس پیکر بستہ ہوتا ہوں کہ کسی قماش کا بھی کام شروع کر دوں ——— تو
ناشکری بھی

یہ اُن کے وقار کا مسئلہ بن جاتا ہے۔ کاش کہ وقت سے مصالحت کر لیتا
ہم . . . . "

"السلام علیکم!" سگریٹ کی دوکان پر اُونچی آواز میں ملے سلام نے حشمت بابو
کے چہرے کی ساری تمتماہٹ دُور کر دی۔ اور اُنھوں نے اطمینان سے کہا۔
"وعلیکم السلام!" اور مظاہر کو اُن کا یہ بے تکلف جواب اِس فضا میں بڑا ہی
غیر مہذب معلوم ہوا۔

"ایک سگریٹ دینا۔ اور ہاں تم بھی پیو گے بھئی؟" ایک سگریٹ کی قیمت ہاتھ میں
لئے حشمت بابو وراثت میں ملی سہمی مسکراہٹ سے دست بہ گریباں تھے۔

"نہیں نہیں۔ میں تو پی ہی رہا ہوں۔" مظاہر کے جواب پر اُن کی نظریں اُس کے
لانبے براق سگریٹ کے گہرے طویل کش میں جھول گئیں۔

"ارے بھئی انھیں دو ٹافی دینا۔ اِس کے پیسے بس آ کر دے جاؤں گا۔ تو بھئی سنئے
شاید اُنھوں نے دس کا نوٹ نہیں بھنانا چاہا۔

دونوں مُڑے ہی تھے کہ یکایک حشمت بابو نے پُر جوش انداز میں استفسار کیا
"ہاں بھئی، تو عینی تم۔ تمہارا وہاں سلسلہ کیا چل رہا ہے؟"

مظاہر کو یوں احساس ہوا جیسے یہ پوچھتے ہوئے اُن کی آواز بس ذرا اُونچی
ہو گئی ہے۔ کئی لوگوں کی مجروح نظریں بھی اُس کے نئے وجود کو ٹٹولنے لگیں
"ہماری ایک پیپر فیکٹری ہے اور اب کچھ اور بزنس بھی پھیلا رہا ہوں۔"
اُس کی اُبھرتی آواز میں وقار کی گونج نمایاں تھی۔

"ویری گڈ! یعنی آپ تو سرمایہ دار بن گئے۔" داد دیتے ہوئے حشمت بابو کی کھوکھلی
آواز جیسے من کے گڑھے میں پھیل کر پھٹ گئی تھی۔

سڑک کراس کر کے گلی میں مُڑتے وقت مظاہر کو کش لیتے ہوئے حشمت بابو
کچھ عجیب سے لگے۔ اُسے اپنا بچپن یاد آ گیا ——— وہ اس لپک سے سگرٹ پیتا
تھا، جیسے دوبارہ سگریٹ ہاتھ آنے کی کوئی اُمید نہ ہو۔

حشمت بابو ایک لمبا کش لیتے ہوئے آہستہ سے بولے —— "ہاں بھئی، یہ تو
یعنی آپ نے بتایا ہی نہیں کہ آپ کیسے نمودار ہوئے۔؟"

"بات یہ ہے کہ اگلے ہفتہ سیٹھ انصاری کی صاحبزادی سے ہماری شادی
طے پا گئی ہے۔ آپ لوگوں کی شرکت لازمی ہے۔ مدعو کرنے کے لئے خود حاضر
ہونا فرض جانا۔"

"بہت خوب یعنی آپ . . . . ." حشمت بابو کا مبارکبادی جملہ اُدھورا ہی رہ گیا
آدھے فرلانگ پر سامنے گلی سے بڑے بابو چلے آ رہے تھے۔

مظاہر نے بڑے بابو کو ایک ہی نظر میں پہچان تو لیا۔ لیکن پہلی جھلک میں

اسے ایسا محسوس ہوا جیسے منہدم عمارتوں کی اوٹ سے نکل کر آنے والے یہ بزرگ مجاورِ کم گائڈ ہیں۔ جو بس آتے ہی تاریخ کے اوراق زبانی سنانے لگیں گے۔

بڑے بابو بس ایک ڈھانچہ ہی تو رہ گئے تھے۔ سفید کرتا پاجامہ، سفید ٹوپی اور گودڑی صدری۔ سارا ملبوس پیوند زدہ تھا، جیسے نحیف و زار شخصیت میں لگے درد کے پیوند یکایک اجاگر ہو گئے ہوں۔

بڑے بابو کے قریب آتے ہی حشمت بابو نے جھٹ بچے کو گود سے اتار دیا۔ مظاہر نے فوراً سگریٹ پھینک دی۔ اور بڑھ کے بچے کو گود میں لیکر اس نے بڑے بابو کو مؤدبانہ سلام کیا۔ بڑے بابو اشارے سے سلام کا جواب دے کر بڑی مشکل سے اپنے بڑھتے قدم روک سکے۔ حشمت بابو سے ذرا 'گج' بر تولنے کے سے انداز میں رُکے ہوئے وہ گمبھیر لہجے میں چونکے۔

"ارے مظاہر میاں تم کب آئے؟"

"جی؟ میں بس ابھی ابھی . . . . ."

اور اس سے پہلے کہ مظاہر اپنی بات پوری کرتا وہ نظریں نیچی کئے بازار کی جانب بڑھ گئے۔ دو قدم آگے جانے کے بعد وہ ذرا سا گردن موڑ کر بولے۔

"بھئی حشمت میاں۔ ان کو گھر لے جاؤ۔ میں ابھی آتا ہوں۔"

مظاہر کو محسوس ہوا جیسے اُن پر غم و غصہ نے جھنجھلاہٹ کی کیفیت طاری کر دی تھی اور وہ مظاہر سے آنکھیں نہ چار کرنے میں بے بس تھے۔ لیکن اُن کے بڑھتے قدم میں اُسے جیانہ روی نظر آئی۔ مظاہر کا ذہن دل پر غالب آنا ہی چاہتا تھا کہ حشمت بابو نے ایک لمبا کش کھینچتے ہوئے پُرسوز آواز میں کہا ــــ

"دراصل اُنھوں نے محسوس کر لیا تھا کہ میرے پاس جلتا سگریٹ ہے۔ لائیے منّے کو مجھے دے دیجئے۔"

منّا دادا ابا کے سفید رعب سے مرعوب ہوئے بغیر صدائے احتجاج بلند کرنے لگا تھا۔ منّے کو واپس دیتے ہوئے مظاہر کی نظریں سامنے ٹوٹی اینٹوں کے ڈھیر پر اٹک گئیں۔ اُس کا پھینکا ہوا سگریٹ کا ٹکڑا ایک بدرنگ گنبد کے بوسیدہ کھمبے کی جڑ سے دھوئیں کی ملگجی لکیریں پھیلاتا جا رہا تھا۔

اِدھر حشمت بابو عجیب بے کلی سے اپنا آخری کش کھینچ رہے تھے۔

○○○

مقالہ

انحراف اور اُس کا شاعر

یونس اگاسکر

شعبۂ اُردو مہاراشٹر کالج۔ بلاسس روڈ۔ بمبئی ۸

نئی شاعری کے اکثر مجموعوں میں اَدھ کچرے ذہنوں کی گھٹ گھٹی ہُو' باس رچی ہوئی ہوتی ہے۔ فکر و فن کی گہرائی اور جذبات کی پختگی سے یہ شاعری مُبرّا ہی رہتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بڑی شاعری کے لیے جس ضبط و نظم کی ضرورت ہوتی ہے وہ نہ سماج میں پایا جاتا ہے اور نہ ذہنوں میں۔ البتہ کچھ کہنے اور کچھ کہہ کر لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش جا بجا نظر آتی ہے۔ میں ان نئے شاعروں کو الزام نہیں دوں گا کیونکہ وہ اپنے دَور کی صدائے بازگشت ہیں اور وقت کے ہاتھوں میں کھلونا بننے پر مجبور۔

یعقوب راہی نئے شاعر ہیں اور "انحراف" اُن کا پہلا شعری مجموعہ ہے۔ 'انحراف' میں ۱۹۶۹ تا ۱۹۷۵ کی نظموں، غزلوں اور گیتوں کا انتخاب شامل ہے۔ نئے شاعروں میں یعقوب راہی اِس اعتبار سے مُمتاز ہیں کہ اُن کے یہاں جگہ جگہ ضبط و نظم اور فکر و فن کی ہم آہنگی دکھائی دیتی ہے۔ یعقوب راہی سنسنی پھیلانے اور اسٹنٹ کرنے سے پرہیز کرتے ہیں۔ اُنھیں معلوم ہے کہ سنسنی پھیلانا اور اسٹنٹ کرنا ایک ڈھکوسلا ہوتا ہے۔ اور ڈھکوسلے کے سہارے ادبی شخصیت کتنے دِنوں تک منوائی جا سکتی ہے؟ اِس احساس کی تصدیق "انحراف" کے مطالعے سے کی جا سکتی ہے۔

یعقوب راہی جب تازہ تازہ بمبئی وارد ہوئے تھے (۱۹۶۶ء میں) تو ترقی پسندی اور روایتی ادب پرستی کے بین بین ادبی رُجحانات کے مطابق ملغوبہ قسم کی شاعری کرتے تھے۔ پھر اُنھوں نے حالات سے لڑنا سیکھا، کبھی بگڑتے، کبھی روٹھتے کبھی خود ہی سن گئے، کبھی منانے پر بھی نہ مانے۔ آہستہ آہستہ اُن کی فنّی شخصیت اُبھرتی چلی گئی۔ میں نے یعقوب راہی کی ذات میں ہمیشہ کسی نہ کسی ذہنی سہارے کی تلاش کا عنصر پایا ہے۔ وہ فکری طور پر اتنے منجھے نہیں ہیں جتنے بات چیت اور حرکات و سکنات سے نظر آتے ہیں۔ اُن کے ذہن میں اپنے ماحول سے ناآسودگی کا اور ایکتارہا ہے جسے چند شخصیتوں کے قُرب نے کسی حد تک باہر نکلنے میں مدد دی ہے۔ اِن شخصیتوں میں، ایک ہیں مراٹھی کے نامور ادیب اور اُردو کے مترجم پروفیسر را۔ بھی۔ جوشی اور دوسرے، ہیں جناب باقر مہدی۔ اِن میں را۔ بھی۔ جوشی کی شخصیت اِس لحاظ سے اہم ہے کہ اُنھوں نے یعقوب راہی کو اُن کے ذہنی انتشار اور جذباتی تشنگی کے ابتدائی دَور میں سکون کا سامان بہم پہنچایا ہے۔ اور اُن کی صلاحیتوں کو تعمیری راہوں پر ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ باقر مہدی صاحب اِس اعتبار سے قابلِ تحسین ہیں کہ اُنھوں نے یعقوب راہی کی فکری و فنّی راہوں کو متعیّن کرنے اور اُن کی صلاحیتوں کو channelize کرنے میں بڑا حصّہ لیا ہے۔ اِن کے علاوہ جناب اعجاز صدّیقی کے دامنِ فیض سے وابستگی نے اُن میں زبان اور فن سے متعلق شعور کو اُجاگر کرنے میں بہت نمایاں رول ادا کیا ہے۔

فن کار اگر اپنے میڈیم کے تقاضوں کو پورا نہ کرے تو فکری پہلو سے بھی انصاف نہیں کر پاتا۔ اعجاز صاحب کی بدولت یعقوب راہی نے فکر و فن میں تال میل پیدا کرنا سیکھا ہے۔

عزیز قیسی نے انحراف میں شامل اپنے مضمون میں یعقوب راہی کے باقر مہدی سے متاثر ہونے کو بیساکھیوں کا سہارا لے کر چلنے سے تشبیہ دی ہے اور اس بات پر خوشی کا اظہار کیا ہے کہ انحراف میں کہیں کہیں یعقوب راہی بیساکھیوں کو چھوڑتے اور اپنے بل بوتے پر چلتے نظر آتے ہیں۔ میں نے باقر مہدی کو بغور نہیں پڑھا ہے اسلیے یہ کہنے سے قاصر ہوں کہ کن کن مقامات پر عزیز قیسی کو یعقوب راہی بیساکھی سنبھالے اور کہاں چھوڑتے نظر آئے ہوں گے۔ اور اگر میں یہ کہہ سکنے کے موقف میں ہوتا تو بھی باقر مہدی سے متاثر ہونے کو بیساکھی لینے کا نام نہ دیتا۔ میرے خیال میں باقر مہدی اور اُن کے معاصرین میں کوئی شاعر دوسرے نئے شاعر کی بیساکھی بننے کی صلاحیت نہیں رکھتا اور پھر باقر مہدی تو اِس طرح کا سہارا دینے کے قائل ہی نہیں۔ میرے نزدیک یعقوب راہی کا باقر مہدی سے متاثر ہونا ایک نوجوان شاعر کا ایک سینئر شعر

شاعر دوست سے متاثر ہونا ہے، جسے میں عزیز قیسی ہی کی طرح کوئی عیب نہیں سمجھتا۔ البتہ یعقوب راہی کو محتاط رہنے کا مشورہ ضرور دوں گا تاکہ وہ جلد از جلد اپنی آواز کو پہچان سکیں اور اُن کی شاعری بندھی ٹکی کیفیات اور احساسات کے طلسم سے باہر نکل کر ایک منفرد مقام کی مالک بن سکے۔ شاید اس کے آگے اُنھیں باز جیدی کے ساتھ بھی سرکشی اختیار کرنی پڑے۔ میرا خیال ہے اس میں انھیں جھجکنا نہیں چاہیئے کیونکہ اُن کے اپنے قول کے مطابق

زہر کو صرف زہر مارے ہے۔

عزیز قیسی نے یعقوب راہی کی ایک آزاد نظم کو نقل کر کے اُسے پابندِ شاعری کے لحاظ سے سوا دو مصرعوں کی نظم کہا ہے:

میں زندہ ہوں
اِسی لیے
تم کو بھی زندہ کہتا ہوں
ورنہ ہم سب اِس دھرتی پر
بکھرے
بے حِس
——— پتھر ہیں!

حالانکہ یہ ایک شعر ہے جسے آزاد نظم کی طرح لکھا گیا ہے، مجھے نہیں معلوم یعقوب راہی نے شعوری طور پر اس شعر کو نظم میں ڈھالا ہے یا دانستگی میں۔ میں اِسے شعر کی طرح پڑھتا ہوں:

میں زندہ ہوں اِسی لیے تم کو بھی زندہ کہتا ہوں
ورنہ ہم سب اِس دھرتی پر بکھرے بے حِس پتھر ہیں

اگر یعقوب راہی نے شعوری کوشش سے اِس شعر کو آزاد نظم کے رُوپ میں ڈھالا ہے تو اِس سے شاعری کے سلسلے میں یعقوب راہی کے اِس رویّے کا اندازہ ہوتا ہے جو اُنھوں نے اِس شعر کے سلسلے میں روا رکھا ہے۔ شاید وہ ایزرا پاؤنڈ (EZRA POUND) کی طرح الفاظ کے ٹکڑوں سے تاثر کی شدّت کو بڑھانا اور اس میں تدریجی ارتقاء پیش کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ یعقوب راہی کو ایزرا پاؤنڈ کی یہ تنبیہ یاد معلوم ہوتی ہے۔

"One should write verse like only when one 'must', that is to say, only when the "thing" builds up a rhythm more beautiful than that

شاعر بیٹے

of set metres, or more real, more a part of the emotion of the 'thing' more germane, intimate, interpretative than the measure regular accentual verse."

یعقوب راہی کی دیگر چھوٹی چھوٹی نظمیں مثلاً 'احساسِ تشنگی'، 'وابستگی'، 'زندگی ہمارا وِردِ ہے' اور 'آخری تتلی' ان کی اسی شاعرانہ بصیرت، کی مظہر ہیں۔ میں جاپانی ہائی کوز (HAIKOS) سے واقف نہیں (یہاں میری مُراد اُن کے انگریزی ترجمے سے ہے) لیکن میں نے اخترالایمان کی مختصر نظمیں پڑھی ہیں، جنھیں وہ اپنی ایجاد کہتے ہیں۔ یعقوب راہی نے مختصر نظموں میں اخترا کی طرح بڑی چُستی اور کامیابی سے خیال کی اکائیوں کو پیش کیا ہے۔ ایک جگہ اِس کا احساس البتہ ہوتا ہے کہ اُنھوں نے نثر میں بہتر طریقے سے کہی جانے والی بات کو بھی شاعری میں ڈھالنے کی کوشش کی ہے وہ اِس سے پہلو بچاتے تو اچھا ہے۔

یعقوب راہی کی شاعری میں تن اور من دونوں کی تشنگی کا احساس ہوتا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ 'انحراف' کے خالق کے سینے میں ایک خلا ہے جسے وہ مختلف احساسات و کیفیات سے بھرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ کسی کی یاد کی لَو سے نہاں خانے کو روشن کرنے میں مصروف ہے اور بھنورے کی طرح گلشن گلشن گھوم بھٹک کر کسی ازلی پیاس کو مٹانے پر تُلا ہوا ہے ساتھ ہی آگ دبے سُلگنے والی آگ سے احتجاج و سرکشی کے شعلے بلند کر کے ظلم کی موکی فصل جلا دینے بار بار آمادہ ہوتا ہے اور پھر اپنے جانثاروں کی راکھ کو کُرید کر چنگاریاں اُس کے لئے جینے کا سہارا بنی رہیں۔

یعقوب راہی کی شاعری میں آگ اور اُس کے متعلقات کے ساتھ ساتھ پانی کا ذکر بھی بار بار ملتا ہے۔ آگ اُن کی شاعری میں ظلم و جبر کے خلاف سرکشی والا کا استعارہ ہے جبکہ پانی جنس اور اُس کی تسکین کا سمبل بن کر سامنے آیا۔ پانی کو جنس کے سمبل کے طور پر عہدِ قدیم سے پیش کیا گیا ہے۔ اِس دنیا کی بھی پانی سے ہوئی ہے اور انسان بھی مچلتے ہوئے پانی سے وجود میں آیا ہے۔ ہندو تصوّر کے مطابق کائنات کا اصولِ اوّل جیسا دی پانی ہے جس کی تہہ پر تیرتا ہوا وشنو جو خالق کائنات ہے، ... جنم دیتا ہے ایک برہما کو جس

بڑھا آتا ہے۔ ایک آدم کے بعد دوسرا آدم پیدا ہوتا ہے اور قوتِ تخلیق انسان میں خواہشِ وصال کو جنم دیتی ہے جو کبھی کبھی پیاس، آسودگی اور نئی پیاس کا روپ اختیار کرتی رہتی ہے۔ یعقوب راہی نے انحراف کی ابتدائی نظموں میں اسی جذبے کی عکاسی کی ہے۔ اِس مجموعے کی پہلی نظم "پیاس" پیش کرتا ہوں

مہکا مہکا پھول سمجھ کر، خوشبو خوشبو، سونگھوں
جب تک اس میں میٹھا رس ہے، اُس کو دل سے چاہوں
قطرہ قطرہ جم کر پی لوں، اُس سے ناتا توڑوں
ڈالی ڈالی اُڑتا جاؤں، غنچہ غنچہ ڈھونڈوں
عشق و ہوس کی اِس دنیا میں، میں وہ پیاسا بھنورا ہوں
گلشن گلشن گھوموں بھٹکوں، خود کو پیاسا پاؤں!

اِس کے بعد "احساسِ تشنگی" کے نام سے شامل ایک نظم بھی قابلِ غور ہے۔ جس میں ہندوستانی لوک گیتوں کی طرح بادل اور دھرتی کے استعارے برتے گئے ہیں۔

کچھ اور سمٹو
سمٹ سمٹ کر رگوں میں اپنی
سسکتے صحرا کی تشنگی خود ہی جذب کر لو
تمہارا احساسِ تشنگی بڑھ کے جب تمہیں بے قرار کر دے
میں کھل کے بادل کی طرح برسوں
تمہاری تشنہ لبی مٹاؤں!

جنس و جذبۂ تخلیق کے علاوہ یعقوب راہی کی نظموں میں انقلابی جذبہ کی گونج بھی سُنائی دیتی ہے لیکن اُس پر نعرہ بازی کا گماں نہیں ہوتا۔ اگرچہ انقلابی خیالات کا اظہار یہاں رمز و کنایہ میں بہت کم کیا گیا ہے، لیکن یہ شاعری اتنی براہِ راست بھی نہیں ہے کہ محض ایک بیان یا ایک نعرہ ہو کر رہ جائے۔ اِس میں وہ مصنوعی جوش و خروش بھی نہیں ہے جو جذبے کی گہرائی سے زیادہ احساس کے اُتھلے پن کا نتیجہ ہوتا ہے۔ یہ شاعری ہمیں سوئی کی نوک کی طرح چبھتی ہوئی محسوس ہوتی ہے اور وقتی چبھن سے زیادہ دیر پا خلش کا احساس چھوڑ جاتی ہے۔ اِس اعتبار سے جب کبھی تیز ہوا چلتی ہے، پھر اکیلے ہی چلو، خلش، ایک سوال اور عکس جیسی نظمیں قابلِ قدر ہیں۔

یعقوب راہی نے اپنی غزلوں میں بھی سرکشی، احتجاج، انقلاب اور جنگ کی فضا پیدا کی ہے۔ اِن غزلوں میں کہیں کہیں براہِ راست شاعری کی ایسی مثالیں بھی ملتی ہیں جو ترقی پسند شاعری کی بدنامی کا باعث بنیں ؎

لوگ جنگوں کی نذر ہوتے رہے۔

منصفی چپ رہی خدا کی طرح

؎ اپنے دشمن سے خبردار رہو
فتح کے بعد بھی ہشیار رہو

؎ حرفِ مقتل ہو پکارے ہے
جذبۂ انتقام اُبھارے ہے

؎ سرحدِ دشمن میں آ
جنگ ہے چل رن میں آ

لیکن جب وہ انقلابی جذبے کو مختلف پیکروں اور استعاروں سے سجاتے ہیں تو ہر شعر نقشِ فریادی بن کر ظلم و ستم کی داستان بیان کرتا معلوم ہوتا ہے۔

؎ سب یہاں بیٹھے ہیں، ٹھٹھرے ہوئے جسموں کو لئے
دھوپ کی کھوج میں اب کوئی نکلتا ہی نہیں

؎ سُرخ لاوے کی طرح جل کے نکھرنا سیکھوں
سوکھی دھرتی کی دراروں سے اُبھرنا سیکھوں

؎ کوہ ساروں پہ چڑھوں ابرِ رواں کی صورت
آبشاروں کی طرح گر کے بکھرنا سیکھوں

؎ تمام رات جلے آنکھ آنکھ سا کاجل،
جو صبح اُٹھوں تو ہر سمت اک نئی دیکھوں

؎ گھر کے سائے سے نکل دھوپ بھرے بن میں آ

؎ ٹھہرا پانی، کائی کھائے گھٹ گھٹ کر مر جائے

؎ بہتا پانی پتھر توڑے اپنی راہ بنائے

نظموں اور غزلوں کے علاوہ "انحراف" میں تین کالے گیت بھی شامل ہیں۔ باقر مہدی کی طرح یعقوب راہی کی طرح بھی کالا رنگ احتجاج کی علامت ہے۔ شاید اسی مناسبت سے اُنھوں نے اپنے کالے گیت باقر مہدی کی نذر بھی کئے ہیں۔ اُردو میں عموماً ہندی گیتوں کے انداز میں پریم گیت لکھے جاتے رہے ہیں، جن میں عورتوں کے مختلف جذبات کی عکاسی کی جاتی رہی ہے۔ یعقوب راہی کے گیت اس اعتبار سے الگ ہیں کہ اُن میں غم و غصّہ کا بیان ہے، احتجاج کی چنگاریاں ہیں، انقلاب کی شدید خواہش اور اُس کے لیے جہد و عمل کا مستحکم جذبہ ہے۔ چوں کہ ان گیتوں میں انقلابی فکر اور جذبے کا اظہار پیکروں اور استعاروں کی زبان میں ہوا ہے اس لیے ان میں گہرائی بھی ہے اور شدّتِ تاثر بھی۔

صبح سویرے جاگے پنچھی / بال و پر لہرائیں
دانا پانی دن بھر ڈھونڈیں / شام کو گھر لوٹ آئیں
اُڑتے پنچھی / ایک ہی رستہ اب تو جائیں بھول
دھول اُڑائیں دھول!

کوچہ کوچہ بھٹکوں
بجھے بجھے ہر ذہن و دل میں
شعلہ شعلہ ڈھونڈوں
چبھتی دھوپ / بڑھے تو دیکھوں / پیلے پیلے پات
اُترے چہرے / سوکھی ٹانگیں / دُبلے پتلے ہات،
یہ بیماری پھیل نہ جائے
روز و شب میں چاہوں
جڑ سے پیڑ اُکھاڑوں!

سُوکھے دریا، پیاسے ساگر
پیلے پیلے پات
کہیں ذرا سی ٹھیس نہ پھوٹے
کیسے ہو برسات؟
بادل بادل
بوجھل بوجھل
ہر ہر ٹکرائے
جیون بیتا جائے

---

۲۴ نظموں، ۲۹ غزلوں اور تین کالے گیتوں پر مشتمل اس چھوٹے سے مجموعے پر سرسری نظر ڈالیں تو کوئی تنوع نہیں ملتا لیکن بغور پڑھنے پر احساس ہوتا ہے کہ شاعر نے آزاد نظم، نظمِ معرّا، پابند نظم، مختصر نظم جیسی مختلف ہیئتوں میں اپنے احساسات کو پیش کیا ہے۔ غزلوں میں بھی بحروں کی تبدیلی تاثیر کی شدّت کو بدلتی محسوس ہوتی ہے۔ اسی طرح کالے گیتوں میں ہندی الفاظ اور بحروں کا استعمال یعقوب راہی کی ذہنی کاوش کی گواہی دیتا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ یعقوب راہی بہ زعم علم شعر نہیں کہتے (یوں بھی اُن کا علم اُن کی سوجھ بوجھ سے کم ہے) لیکن وہ کافی سوچ سمجھ کر شعر کہتے ہیں۔

شاعر۔ بمبئی

شاید اُنھوں نے اِنس پریشن (Inspiration) اور پرس پریشن (Perspiration) کے تناسب کو پایا ہے اور روایتی شاعروں کی طرح الہامی کیفیت طاری ہونے کا ڈھونگ نہیں رچایا۔ میں نے یعقوب راہی کو یہ کہتے کبھی نہیں سنا کہ وہ کئی راتوں سے سوئے نہیں ہیں کیوں کہ کوئی شعر اپنے آپ کو ان سے کہلانے پر اڑا ہوا ہے۔ لیکن جب میں اُن کے مجموعے میں یہ شعر پڑھتا ہوں

تجھ سے ملنے پہ اَڑی ہے، تو آ
رات رستے میں کھڑی ہے، تو آ

تو سوچنے لگتا ہوں کہ راتوں کی بے چینی جس شاعر کا مقدر بن جائے اُسے یقیناً شعر کہنا چاہیئے۔ مجھے خوشی ہے کہ یعقوب راہی نے اپنی راتوں کی بے چینی کو شعر میں ڈھالا ہے۔ وہ اپنے کرب کو مٹانے یا کم کرنے کے دوسرے آسان راستے بھی ڈھونڈ سکتے تھے۔ لیکن اُنھوں نے شاعری کو ترجیح دی۔ یہ اُن کے فن کارانہ خلوص اور اپنے جذبات سے اُن کی سِنسیریٹی sincerity کا مظہر ہے۔ میں اُنھیں اس پر مبارک باد دیتا ہوں۔

(یہ مضمون 'انحراف' کی رسم اجرا کے موقع پر پڑھا گیا تھا۔ اب قدرے ترمیم و اضافہ کے بعد شائع ہو رہا ہے۔)

○○

غزلیں

دلکش اعظمی

اک ضربِ لازوال کی لذّت مکاں میں ہے
اب تک شکستگی کی کسک جسم و جاں میں ہے
مٹی کے اندر چھورہے عاجز ہیں خواہشیں
اُن ریتوں کا کوئی سرا آسماں میں ہے
صحرا نشیں ہوئے ہیں چراغوں کے قافلے
عکسِ چراغ پھر بھی دلِ کہکشاں میں ہے
صحرا کی خامشی ہی کا رکھتا نہیں جواب
اک شورِ شہر قید اسی خاکداں میں ہے
ہر آئینے کا جب کہ مکمّل جواب ہوں
پھر کیوں وہی سوال مرے امتحاں میں ہے
دلکش لبوں کو پیاس کی شبنم نہ چھو سکی
اک پھول روشنی کے مرے سائباں میں ہے

○ ایچ ۱۲۷، شیام لال لین۔ کلکتہ ۔ ۳۳

اسلم حبیب

جس نے احساس کے آئینے میں جھانکا ہوتا
وہ بھرے شہر میں رہ کر بھی اکیلا ہوتا
بارہا ایسا ہوا رُوح کے سناٹے میں
چیخ اُٹھا ہے کوئی، کاش میں زندہ ہوتا
اجنبی چہروں کی پہچان نہ دستی دِل کو
میرے گھر میں جو مرا کوئی شناسا ہوتا
لوگ پھرتے تھے لئے سنگِ صدا ہونٹوں پر
اُس نے سچائی کے آئینے میں دیکھا ہوتا
میری مانند کبھی اس کو نہ میٹھا کہتے
صبر کے پھل کو جو تم نے کہیں چکھا ہوتا
بیٹھ جائے کبھی اک پل کیلئے ہی اسلم
یہ کڑی دھوپ نکلتی، کہیں سایا ہوتا

○ حبیب کلینک۔ شیروانی گیٹ ۔ مالیر کوٹلہ (پنجاب)

غضنفر

مت سوچو کچھ یہ لمحات نہ کھونے دو
ہونا ہے جو ہو جائے گا، ہونے دو
جاگا تو انمول کھلونے مانگے گا
مشکل سے سویا ہے اُس کو سونے دو
کھیتوں کا جب ہاتھ تمہارے ہاتھ نہیں
جو بھی جو کچھ بونا چاہے، بونے دو
مانگے کی لوری سے کیونکر آنکھ لگے
بیداری تقدیر ہے اُس کی، ڈھونے دو

○ ۷ ۔ ایس۔ ایس۔ ایسٹ۔ ایس۔ ایس ہال
مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔

انور ادیب

زمیں کا رنگ اُڑے آسماں پگھل جائے
کسے خبر ہے کہ کس وقت کیا بدل جائے
کبھی برائے جنوں آندھیاں بھی ناکافی!
کبھی ہوائے نسیم ترسے دل بہل جائے
کچھ اس طرح کی رفاقت ہو درمیاں اپنے
کہ بوند بوند مری ذات میں وہ ڈھل جائے
یہ داؤ پیچ بچاؤ کے سب دھرے رہ جائیں
کسی کی تیغ کبھی صاف مجھ پہ چل جائے
میں سانس سانس پکاروں سلامتی اُس کی
وہ تیغ تیغ مرے جسم سے نکل جائے

○ منظر منیشن گو سائیں بنگی روڈ۔ جمشید پور ۔ ۲

جنگ

فیروز عابد
معرفت محمد قاسم مودی، ۱۲/۱ پٹوربگان لین، کلکتہ - ۹

تو پھر جنگ کی بات کہاں سے شروع کی جائے۔ سناٹا، خاموشی، اُداسی، ڈر خوف اور پھر ان میں اسیر ہو کر روح گمشدہ کا کمزا ہو جانا، جسم میں ارتعاش کا پیدا ہونا، دوران خون کا تیز ہونا اور رہ رہ کر دل و دماغ پر ایک جھٹکا لگنا۔ یہ بات کہاں ظہور پذیر ہوتی ہے، جنگلوں میں غاروں میں گپھاؤں میں، پہاڑوں میں، تاریکی میں، سمندر کے کنارے دریا کے دل میں، لوگوں کی بھیڑ میں، ہنگاموں میں، زندگیوں کے درمیان یا غم و خوشی کی آوازوں کی لپیٹ میں۔

ایسا ہی ایک لمحہ آن پڑا ہے جو خوف کے تمام بھاری بھرکم لمحوں سے زیادہ بکڑا ہے۔

پیشاب گھر کے سامنے اُسکی گاڑی نہ جانے کتنوں کو کچلتے ہوئے پیشاب کی گندی نالی میں رُک جاتی یا پھر پیشاب گھر کی دیوار کو توڑ کر سامنے کے ہوٹل میں گھس جاتی، مگر ایسا نہیں ہوا کہ اُس نے ڈر کر سانس پر فتح حاصل کرلی ہے اور پھر یہی حادثہ سنیما گھر کے سامنے ہوتے ہوتے بچا، کہ ایک حاملہ عورت بھی پیشگی بکنگ کاؤنٹر کے سامنے لگی قطار میں شامل ہے۔

اُس نے اپنے جسم کے تمام تناؤ پر قابو رکھا۔ ہاتھوں، آنکھوں اور پاؤں کی مدد سے جنگ جاری رکھی۔ وہ کیا بتانا چاہتا ہے، یہ کوئی نہیں جان سکا مگر یہ سچ ہے کہ وہ خون خرابے کا قائل نہیں اور داخلی تپش میں وہ بُری طرح جل بھُن رہا ہے، مگر جلنے کی بُو اب تک کسی ناک کو نہیں ملی ہے کہ اُس نے اپنی ٹیکسی کی ٹنکی میں پٹرول فل رکھا ہے۔

سب سے بڑی آزمائش کا سامنا تو اُسے سیالدہ میں کرنا پڑا ہے جہاں پُوجا کی مارکیٹنگ پر روزہ داروں کی سنجیدگی کی چادر چڑھی ہے کہ پانچ بجکر ۴۳ منٹ پر افطار کرنے کی بات ہے۔

اُسے اپنا سینہ خالی خالی لگنے لگا اور جسم کا سارا زور جیسے اُسکی پلکوں پر آکر رُک گیا۔ جھبی گھر سنیما کے سامنے اُسے تمام چیزیں بھگوے لیتی نظر آئیں "جنا آرنیہ[1]" کے فیسٹون کے پاس اُس کی گاڑی جام میں پھنس گئی۔ ارتعاش تیز تر ہوتا جا رہا ہے۔ ہاتھ، پاؤں، لب، آنکھ اور اُنگلیاں اتنی گرمی میں بھی سرد ہوئی جا رہی ہیں۔ اُس نے ایک بار پھر اپنے سارے اعصاب پر زندگی کی لہر دوڑانے کی کوشش کی کہ اُسکی گاڑی جام سے نکل چکی ہے۔ سامنے گاڑیاں اور پیچھے گاڑیاں، سامنے اَن گنت لوگ اور پیچھے اَن گنت لوگ، اغل بغل ہر طرف انسانوں کے سر اور ایسے میں اگر اُس کے اعصاب جواب دے گئے ——— اُس نے دیکھا گاڑیاں چل رہی ہیں اور انسانوں کے سر غائب ہیں اور راستوں میں خون کا سیلاب ہے۔ وہ پسینے میں شرابور ہو گیا اور اس بار پھر اپنی ٹیکسی کو سیالدہ اسٹیشن کی بھیڑ سے بچا لے گیا۔ اپنے اعصاب سے وہ جنگ لڑتا رہا کہ وہ خون خرابے کا قائل نہیں۔ وہ اپنی اعصابی کشمکش سے بچ سکتا ہے مگر نو پارکنگ کے اُصول کو کبھی توڑنا نہیں چاہتا۔ ٹنکی میں پٹرول فل ہے، سامنے آدمیوں کا جنگل ہے اور گاڑی ٹریفک کی اسپیڈ پر ہے۔ ایسے میں اگر وہ ٹھنڈا ہو جائے تو کیا ہوگا ——— ٹانگیں، سر، پیٹ، آنکھیں، دانت، چیخ، ہنگامہ، درد، گھٹن اور پریشانی ——— کتنے ہی انسان ——— نہیں وہ خود کو ٹھنڈا نہیں ہونے دے گا۔ گاڑی کو نو پارکنگ ایریا سے وہ نکال لے جائے گا اور پھر ہو ہو سو ہو ———"

وہ خود پر کنٹرول کئے رہا۔ گاڑی ٹکراتے ٹکراتے بچتی رہی۔ اُس کے ہاتھ پاؤں، آنکھیں، دل اور دماغ سب کے سب اب پھر اُونگھنے لگے ہیں۔ پھر بھی وہ جاگتے رہنے کی کوشش کر رہا ہے۔ "چین، چین، چین ———" اُس نے کتے کے پلے کو بچا لیا ——— آہستہ آہستہ اُس کی گاڑی راجہ بازار کے قریب سرکلر روڈ کے دائیں فٹ پاتھ کے پاس رُک گئی۔

گاڑی کی ہیڈ لائٹس جلتی رہیں، انجن اُسی طرح جاگتا رہا۔

خورشید ہوٹل کے لوگوں نے ہیڈ لائٹس کی روشنی محسوس کی۔ لوگوں نے انسانوں اور آوازوں کے اس جنگل میں ٹیکسی کے انجن کی اس آواز کو عجیب احساس کے ساتھ سُنا۔ ایک۔ دو، تین لوگ جمع ہوتے گئے۔ منشی ہارون نے

(باقی صفحہ ۴۶ پر دیکھئے)

[1] معنی انسانوں کا جنگل (ایک بنگالی فلم)

مکتوبات

○ "شاعر" کا تازہ شمارہ نظر نواز ہوا۔ کتنی بدقسمتی کی بات ہے کہ بھوپال کو اُردو کا مرکز تو بار بار کہا جاتا ہے لیکن بھوپال سے کسی ادبی جریدے کے اجراء کی طرف ذرا بھی دھیان نہیں دیا جاتا۔ زنجیر، آذر، مزاج، تشکیل جیسے رسالے نکلے اور دم توڑ گئے۔ یہ سب بھوپال کے اُردو نوازوں کی عدم توجہی کا نتیجہ ہے۔

خدا "شاعر" کی عمر دراز کرے جس میں ابراہیم یوسف کے بعد ڈاکٹر حامد حسین جیسے قد آور قلمکار کی خدمات کا اعتراف بجا طور پر کیا گیا ہے۔ شفیقہ فرحت کا تعارفی خاکہ دلچسپ ہے۔ انٹرویو میں نہ صرف ڈاکٹر حامد حسین بلکہ ابراہیم یوسف صاحب کی شخصیت بھی اُبھر کر سامنے آتی ہے۔ ڈاکٹر اخلاق اثر نے حامد حسین کی ادبی کاوشوں کا بھرپور جائزہ لیا ہے۔ ڈاکٹر حامد حسین نے اپنے مضمون "ادب اور حقیقت کی جبریت" میں اہم ادبی مسائل کی طرف اشارے کئے ہیں۔ مندرجہ ذیل اقتباسات نئے لکھنے والوں کے لئے مشعلِ راہ سے کم نہیں۔

"اگر ادب کا کام صرف حقیقت کی عکاسی تک محدود ہوتا تو شاید پرانے ادب پارے حقیقت شناسی کے نئے انداز اختیار کر لینے پر اُسی طرح پرانے اور از کار رفتہ ہو جایا کرتے، جس طرح نئے تکنیکی اضافوں کے بعد پرانی مشینیں بیکار ہو جایا کرتی ہیں۔"

جدید ہندی کہانی کاروں نے حقیقت نگاری کے نام پر سپاٹ بیانی کو اس قدر اپنا لیا ہے کہ کہانیاں رپورتاژ ہو کر رہ گئی ہیں۔ افسانہ ہو کہ نظم، ماحول کی عکاسی کے ساتھ ساتھ اگر فنکار کی ذات کا عکس اُس میں نظر نہیں آتا تو ایسی تخلیق دیرپا تاثر کی حامل نہیں ہو سکتی۔

شکیل مظہری کی غزل پسند آئی۔ مادھوری شاہ کی نظم۔ اس کا ترجمہ بھی بہت خوب ہے۔ شمیم سیدی کی غزل کا مندرجہ ذیل شعر پڑھ کر

اب کریدے سے کیا ہو راکھ ہو گیا سب کچھ
جل گیا بدن کے ہی ساتھ ساتھ سایہ بھی

غالب کا مشہور شعر یاد آ جاتا ہے ؎

جلا ہے جسم جہاں دل بھی جل گیا ہوگا
کریدتے ہو جو اب راکھ جستجو کیا ہے

اسی طرح نزہت نواز کی غزل کا مطلع ؎

جو خوش نہیں کوئی ہم سے خفا خفا تو ملے
نصیب ہو کوئی آہٹ کوئی صدا تو ملے

اس سے پہلے بھی کسی رسالے میں اس طرح پڑھا ہے ؎

ترے نگر میں بھٹکنے کا کچھ صلہ تو ملے
نصیب ہو کوئی آہٹ کوئی صدا تو ملے

مضمون "غزل گائیکی" کی اشاعت پر مشکور ہوں۔ "غزل گائیکی" ادبی حلقوں میں کافی پسند کیا گیا ہے۔ کوشش کروں گا کہ یہ سلسلہ جاری رہے۔

شعبۂ نباتات گورنمنٹ کالج بانسواڑہ (راجستھان) **شاہد تنویر**

○ ابھی ابھی "شاعر" کا دسواں شمارہ نظر نواز ہوا۔ گوشۂ سید حامد حسین میں شفیقہ فرحت کا خاکہ "سوتا جاگتا آدمی" اور ابراہیم یوسف کا انٹرویو بہ اشتراک خالد عابدی و انجم سلمانی بہت خوب ہے۔ حصۂ نظم بھی خاصا ہے۔

"شاعر" ہمیشہ سے ایک خاص مزاج و معیار کا رسالہ کہا جاتا ہے۔ خدارا، اپنی ڈگر سے نہ ہٹئے۔ تخلیقات کے انتخاب میں احتیاط برتئے اور ہمارے لئے ناک نکال کر بولنے کا ذرا سا موقع چھوڑ دیجئے۔

ہندوستان میں بیچاری اُردو کا دامن معیاری رسائل سے بالکل خالی ہے، اگر کچھ بھرم باقی ہے تو وہ "شاعر" سے۔

جب کبھی (ہندی میں لکھنے والے دوستوں کی محفل میں) اُردو کے ادبی رسائل سے ہندی رسائل کے مقابلہ کی نوبت آ جاتی ہے تو میں بڑے فخر سے "شاعر" کا نعرہ لگا دیتا ہوں، لیکن گذشتہ کئی ماہ سے اُن لوگوں کو اُنگلی اُٹھانے کا موقع ملا ہے جو کم سے کم میرے لئے تو باعثِ ندامت ہے ہی۔

"جرعات" میں "اُردو ادبی ماہناموں کی بدقسمتی" پر آپ کا افسوس نامہ پڑھا۔ اس وقت جبکہ متعدد اُردو اکاڈمیوں اور امدادی انجمنوں کا قیام عمل میں آ چکا ہے۔ علمی ادبی رسائل کی زبوں حالی واقعی بڑی شرم اور افسوس کی بات ہے۔ کاش اہم لوگوں میں ذرا بھی شرم کا حصہ ہوتا۔

بچھرایوں۔ ضلع مُرادآباد **وجیہہ ادیب**

○ "شاعر" کے شمارہ نمبر ۱ بابت ۸۲ء میں "شکر و سپاس" کے تحت صفحہ ۴۲ کالم ایک میں ستیش بترا لکھتے ہیں: "لیکن اس سے بھی زیادہ ضروری یہ ہے کہ اکاڈمیاں اُردو زبان سیکھنے اور پڑھنے والوں کی تعداد میں اضافہ کریں تاکہ ادبی رسائل کو پڑھنے والے برابر ملتے رہیں اور یہ رسائل محض عجائب گھر کی زینت نہ بنیں۔" ستیش بترا کی یہ تجویز نہایت معقول ہے لیکن اتر پردیش میں تجربہ یہ بتاتا ہے کہ ایسا کرنا بہت مشکل ہے۔ اُردو اکاڈمی ۱۹۷۲ء سے قائم ہے لیکن اس نے اُردو زبان سیکھنے اور اُردو پڑھنے والوں

کی تعداد بڑھانے کے لئے کوئی تعلیم بالغان مرکز یا کوئی اُردو میڈیم اسکول نہیں کھولا ہے۔ وہ اِس سلسلے میں کچھ وظیفے دیتی ہے اور وہ بھی پرائمری درجات کے طلبہ کو نہیں، بلکہ اُس سے اُوپر والی جماعتوں کے طلبہ کو ـــــ یہاں تک کہ پی۔ ایچ۔ ڈی کے طلبہ کو وظیفے پیش کئے جاتے ہیں گویا اکاڈمی کی رائے میں اُردو پڑھنے پڑھانے والے بچے جماعت ششم میں اُتر پردیش میں کافی تعداد میں مل جاتے ہیں اور اِس طرف کوئی توجہ دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ حالات بالکل اِس سے مختلف ہیں۔ بہت کم پرائمری اسکول اُتر پردیش میں ایسے ہیں جہاں درجہ ایک سے لیکر درجہ پانچ تک اُردو میڈیم کے ذریعہ تعلیم دی جاتی ہو۔ اور سرکاری منظور شدہ نصاب پڑھایا جاتا ہو۔ سرکاری طور پر منظور شدہ اور اُردو میڈیم جونیئر ہائی اسکول نہ ہونے کے برابر ہیں۔ اُردو میڈیم تعلیم بالغان مراکز کا بھی انتظام تسلی بخش نہیں ہے۔ اُردو کی ابتدائی تعلیم اور تعلیم بالغان اُردو کی ترویج کے سلسلے میں ریڑھ کی ہڈی کا کام دیتی ہے اور جب تک اُس کا معقول انتظام نہیں کیا جاتا، اکاڈمی کی انعام یافتہ کتابیں الماریوں کی زینت بنی رہیں گی اور اُن میں دیمک لگتی رہے گی۔

مبشّر علی صدّیقی
محلہ سوتھہ۔ بدایوں (اُتر پردیش)

○ "شاعر" کا تازہ شمارہ کل دفتر میں موصول ہوا۔ پرچہ دیکھ کر دل باغ باغ ہو گیا۔ "شاعر" کی جو اپنی انفرادیت ہے وہ کسی دوسرے رسالے کو نصیب نہیں۔ خصوصی مطالعہ کا سلسلہ شروع کر کے آپ نے رسالے کو چار چاند لگا دئیے ہیں۔ سرورق پر سیّد حامد حسین صاحب کی تصویر "شاعر" کے وقار میں اضافہ کرتی ہے۔ آپ "شاعر" کے ذریعہ سیکڑوں ادیبوں کو گمنامی کے غار سے نکال کر منظرِ عام پر اِس طرح لائے ہیں کہ وہ اُردو ادب، اور زبان کا ایک اہم ستون بن گئے ہیں۔ حامد حسین کے اکثر و بیشتر مقالے "شاعر" کے ذریعہ ہی مطالعہ میں آئے۔ اُردو تنقید و تحقیق میں حامد حسین اب ایک معتبر نام بن چکا ہے ـــــ ابراہیم یوسف اور اُن کے رُفقاء نے بڑے دلچسپ انداز میں سیّد حامد حسین صاحب سے انٹرویو لیا ہے۔ شفیقہ فرحت نے اپنے مخصوص انداز میں خاکہ لکھا ہے۔ پڑھتے وقت ہر جملہ پر قاری زیرِ لب تبسم کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

آپ نے جس طرح تن من دھن سے اُردو کی خدمت کی ہے، دورِ حاضر میں اُس کی مثال ملنا مشکل ہے۔ آپ کی اِن دیرینہ خدمات کے صلے میں مہاراشٹر اکاڈمی نے جو پانچ ہزار روپے دئیے ہیں وہ حقیر ہے۔ مجھے زیادہ خوشی نہیں ہوئی۔

ظہیر انور
ایڈیٹر "صبحِ نو" پوسٹ بکس نمبر ۲۴ پٹنہ ۱

○ گوشۂ سیّد حامد حسین موصول ہوا۔ شکریہ۔ اب تک نکلنے والے تمام گوشوں میں ایک یہی گوشہ کچھ پھیکا پھیکا سا لگا۔ شفیقہ فرحت کی خاکہ نگاری پڑھ کر لگا کہ جیسے وہ زبردستی قارئین کو ہنسانے پر مُصر ہیں۔ یا پھر یہ ہو سکتا ہے کہ مجتبیٰ حسین کے خاکوں نے ہی مجھ پر جادو کر دیا ہو کہ اب کسی کا خاکہ پسندِ خاطر ہی نہیں ہوتا۔

اِس شمارے میں مادھوری شاہ کی کچی کہانی "گھر باہر" کے اختتام کا یہ ٹکڑا "سر اور پیٹھ پر گھومتے ہاتھوں کے بھیگے لمس ہمیں نہلاتے رہے۔ رومال سے ناک اور آنکھ پونچھتی میں بھوں ہاں کرتی رہی" ـــــ اِس قدر موثر، گداز اور حقیقت سے قریب لگتا ہے، جیسے یہ واقعہ قاری کے ساتھ ہی پیش آرہا ہو۔ رفعت نواز نے بھی ترجمہ کا حق پورا پورا ادا کیا ہے۔ ابنِ کنول کی کہانی داؤد خاں کافی دلچسپ ہے۔ نظموں میں پریم وار برٹنی اور زیبا صابر اچھے لگے۔ غزلیات میں محمد عثمان عارف، شکیل مظہری، فصیح اکمل قادری اور نصیر پرواز نے متاثر کیا۔ ندرت نواز کی غزل شائع شدہ ہے۔

اور آپ کی خدمات کے صلہ میں اکیڈمی نے آپ کو جو ۵ ہزار کا انعام دیا ہے وہ یقیناً آپ کا حصہ تھا۔ اور کوئی کب تک حقیقت سے چشم پوشی کر سکتا ہے بقول کسے کہیں چھپتا ہے اکبر پھول پتوں میں نہاں ہو کر

خلیق الزّماں سحر
دلساگر وارڈ۔ سیونی (ایم۔ پی)

بقیہ :- "کہانی جنگ" صفحہ ۴۴

اپنا کاؤنٹر چھوڑ دیا۔ اُس کے ہاتھ اب تک اسٹرنگ پر ہیں۔ اُس کا سر ایک طرف جھکا ہوا ہے۔ لوگوں کے دل ایک ساتھ دھڑک رہے ہیں۔ قریب ہی ڈاکٹر عمر کا چیمبر ہے۔ پولیس آچکی ہے ـــــ ڈاکٹر نے اُس کی نبض پر سے اپنی اُنگلیاں ہٹالیں ـــــ نبض ڈوب چکی ہے۔

پولیس، سوچنے والی آنکھیں اور ڈاکٹر سرکلر روڈ کی شاہی لمبی سڑک کو تک رہے ہیں ـــــ یہاں سے وہاں تک گاڑیاں آرہی ہیں اور جارہی ہیں، مگر خاموشی ہے۔

کیا کچھ ہو جاتا ہے مگر سرد ہوتے ہوئے بھی اُس نے گرم رہ کر بغیر خون بہائے جنگ جیت لی ہے لیکن پتا نہیں اندر کی کون سی جنگ سے وہ شکست کھا گیا ہے ـ!

○○

نقد و نظر

تبصرے کے لئے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں

یادِ یارِ مہرباں

مُصنّف ـــــ خواجہ احمد فاروقی

ضخامت ـــــ ۱۳۸ صفحات　　قیمت ـــــ اکیس روپے

ملنے کا پتا ـــــ گلشن پبلشنگ ہاؤس۔ دہلی ۶

اُردو میں سوانح نگاری اور تذکرہ نویسی کا چلن تو پُرانا ہے، لیکن خاکہ نگاری کی عمر کچھ زیادہ نہیں ہے۔ خاکہ نگاری کے فن نے گذشتہ چند سال میں ایک ادبی صنف کی حیثیت سے بڑی اہمیت اختیار کرلی ہے۔ مُلکِ ادب کے شہزادے (ڈاکٹر اعجاز حسین) سے لیکر گنج ہائے گراں مایہ (رشید احمد صدیقی وہ صورتیں الٰہی (مالک رام) کیا خوب آدمی تھا (ڈاکٹر عابد حسین) جانے والوں کی یاد آتی ہے (صالحہ عابد حسین) اور چند ہم نفسانِ رفتہ (علی جواد زیدی) تک خاکہ نگاری کے بہترین، مگر مختلف النوع نمونے کتابی شکل میں ہمارے سامنے آچکے ہیں۔

"یادِ یارِ مہرباں" اِس سلسلے کی ایک اور اہم کڑی ہے۔ یہ اُردو کے مشہور و ممتاز ادیب پروفیسر خواجہ احمد فاروقی کے گیارہ شخصی خاکوں کا مجموعہ ہے۔ جن شخصیتوں سے مُصنّف متاثر ہوا ہے، اُسے قُربت و محبت رہی ہے، وہ سر تیج بہادر سپرو، آصف علی، مولانا ابوالکلام آزاد، صدیق احمد صدّیقی، مولوی عبدالحق، خواجہ غلام السیدین، راجہ گوپال اچاری اور ڈاکٹر تارا چند ہیں۔

ظاہر ہے، یہ سب بڑی شخصیتیں ہیں۔ اِن میں بعض کے کارنامے تاریخ ساز ہیں۔ اُن کی علمی، ادبی، تاریخی، سیاسی اور تہذیبی و سماجی حیثیتیں بھی بلند و بالا ہیں۔ خواجہ احمد فاروقی نے اِن کے خاکوں میں اپنے ذاتی تاثرات کا رنگ کچھ اسطرح بھرا ہے کہ اِن کے صفاتی خطوط بھی گہرے ہوتے چلے گئے ہیں اور یہ سب مُرقعے نہایت دلپذیر بن گئے ہیں۔ خاکہ نگاری کو مُصوّری کا درجہ دینے کے لئے خواجہ احمد فاروقی نے بیحد خوبصورت نثر لکھی ہے۔ اُن کے جملوں میں بلا کی تاثیر اور برجستگی و روانی ہے۔ پورا پورا علمی و ادبی رکھ رکھاؤ پایا جاتا ہے۔ "یادِ یارِ مہرباں" کو سیرت نگاری اور واقعہ نگاری کا اعلیٰ نمونہ کہا جاسکتا ہے۔

"مولانا نے ذوقِ حضوری کے لئے بات میں بات پیدا کی ہے اور دل کی گرمی سے محفل کی شمع کو روشن کیا ہے۔ اُنھوں نے اپنے بارِ حیات ہی کو ہلکا نہیں کیا، ہمارے احساس میں بھی بالیدگی پیدا کی اور زندگی کے احترام کے نئے دروازے کھولے۔

شاعر، بمبئی

وہ اپنے لمحات کو جاوداں بنانے کا سلیقہ رکھتے ہیں اور مَن و تو کی دنیا سے نکل کر بے کراں فضا میں پہنچ سکتے ہیں۔"

(خاکہ ابوالکلام آزاد)

"ایک سُتون تھا جو گر گیا، ایک روشنی تھی جو گُل ہوگئی، نئے ہندوستان کی تصویر کا ایک آئینہ تھا جو ٹوٹ گیا، جلوۂ آفاق رکھنے والا ایک ساغرِ جم تھا، جو ہم سے ہمیشہ کے لئے چھین لیا گیا۔"

(خاکہ۔ جواہر لعل نہرو)

"ذاکر صاحب کی سیرت اور شخصیت پر غور کرتا ہوں تو عارفوں کا وجدان، درویشوں کی محبت اور شفقت، دانشوروں کی ذہانت، صوفیوں کی بصیرت اور دیدہ وری مجسّم ہوکر سامنے آجاتی ہے۔"

(خاکہ۔ ڈاکٹر ذاکر حسین)

"اُن کی کتاب کو جسم و جاں میں مُنتقل کیجئے تو سیدین صاحب، اور سیدین صاحب کو الفاظ و عبارت میں تحویل کیجئے تو یہ مضامین۔ بلاشبہہ اُن کی ذات اُن تمام قدروں کی محرم اور محافظ ہے، جن کی اُنھوں نے اِس کتاب میں اتنی پُر زور تائید کی ہے اور یہی اُن کی عظمت کی دلیل ہے۔"

آوازۂ خلیل ز بُنیادِ کعبہ نیست
مشہور گشت زاں کہ بہ آتش نکو نشست

(خاکہ۔ خواجہ غلام السیدین)

"یادِ یارِ مہرباں" میں خواجہ احمد فاروقی نے جہاں نہایت خوبصورت شخصی خاکے پیش کئے ہیں، وہیں اِس میں ہر شخصیت کی عظمت کے محرکات کی طرف اشارے اور نہایت اہم واقعات بھی ہیں۔

یہ کتاب بہار اُردو اکاڈمی کے تعاون سے شائع ہوئی تھی۔ اگر یہ تعاون نہ بھی ملتا تو بھی، اِس کی قیمت چھ سات رُوپے سے زیادہ نہیں ہونا چاہئے تھی۔ اکیس رُوپے اِس کی قیمت بہت ہی زیادہ ہے۔ ایسی کتابیں جو کسی کے مالی تعاون سے شائع ہوں، اُن کی قیمت تو کم سے کم ہونا چاہئے۔ پھر بھی یہ کتاب اپنے مطالعہ کے لئے اپنی سفارش آپ ہے۔

(ا۔ص)

نذرِ خسرو

مُرتبہ —— سردار سُرجیت سنگھ لانبہ

ضخامت —— ۱۴۰ صفحات —— قیمت —— پانچ روپئے

ملنے کے پتے :- ایس۔ ایس لانبہ۔ کے ۱۲۴، کیرتی نگر۔ دہلی ۱۵

ولا اکیڈیمی۔ عزیز باغ۔ سلطانپورہ۔ حیدر آباد ۲۴

ہندوستان میں پہلی بار صحیح طور پر حضرتِ امیر خسرو دہلوی کی عاشقانہ، عالمانہ، صوفیانہ، شاعرانہ اور فنکارانہ شخصیت پر بھر پُور توجہ دی گئی۔ اور یہ کام امیر خسرو کے سات سو سالہ جشن کے سلسلے میں کیا گیا۔ سات سو سالہ جشنِ تقریبات کی قومی کمیٹی کی طرف سے جہاں امیر خسرو پر کئی زبانوں میں متعدد کتابیں شائع ہوئیں، وہیں بعض رسائل کے "امیر خسرو نمبر" بھی نکلے۔ جلسے ہوئے، مقالے پڑھے گئے۔ سماع کی محفلیں برپا ہوئیں اور امیر خسرو سے متعلق وہ سب کچھ ہوا جو اس سے پہلے نہیں ہوا تھا اور جس کی واقعی ضرورت تھی۔ خسرو پر از سرِ نو علمی و تحقیقی سطح پر جو کام ہوا ہے وہ بیحد قابلِ قدر ہے۔ اسی سلسلے میں حضرتِ امیر خسرو کے ایک عقیدت مند اور اُردو کے شیدائی سردار سُرجیت سنگھ لانبہ کی نظر شعرا کے خراجِ عقیدت کی طرف گئی۔ نثر میں بسا اوقات وہ تاثر آفرینی نہیں ہوتی جو نظم میں ہوتی ہے۔ شعر میں شخصیتوں کے خدوخال تشبیہوں اور استعاروں کے پیکر میں ڈھل کر کچھ اور ہی ہوجاتے ہیں۔ اُن کی ذات و صفات کو شعری لفظیات نوع علی نور کردیتی ہیں۔

حضرتِ امیر خسرو پر شعری تاثرات کم اور بکھرے ہوئے تھے۔ سردار سُرجیت سنگھ لانبہ نے اُنھیں تلاش اور یکجا کرنے کے علاوہ، بعض شعرا سے بہ اصرار نئی نظمیں لکھوائی ہیں اور اُنھیں نہایت سلیقہ سے مُرتب کیا ہے۔ کسی ایک عظیم شخصیت پر بیک وقت اتنا زیادہ شاعرانہ خراجِ عقیدت اب تک سامنے نہیں آیا تھا۔ ساٹھ سے زیادہ شعرا نے اپنا خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔ اِن سب کے ناموں کو گِنانا طُولِ عمل ہوگا۔ اِن میں معروف اور غیر معروف دونوں شعرا شامل ہیں۔ "نذرِ خسرو" کی ترتیب یوں ہے۔

پہلے حضرتِ محبوبِ الٰہیؒ، حضرت بوعلی شاہ قلندرؒ، شیخ سعدی، حافظ شیرازی اور عرفی شیرازی کے وہ فارسی اشعار دیئے گئے ہیں، جو امیر خسرو سے متعلق ہیں۔ پھر تلوک چند محروم، جمیل مظہری، ماہر القادری، ساغر نظامی، رئیس امروہوی، شمیم کرہانی، گوپی ناتھ امن، سلام مچھلی شہری، حرمت الاکرام، جگن ناتھ آزاد، محمود سعیدی، رفعت سروش، کرشن موہن، رام کرشن مضطر وغیرہ ۴۸ شعرا کی طویل و مختصر نظمیں ہیں۔ اِن میں اچھی اور کمزور، صحیح شاعرانہ مزاج اور روایتی اندازِ فکر کی حامل شاعری بھی دونوں طرح کی نظمیں شامل ہیں۔ مُرتب نے معیار کو نہیں دیکھا ہے صرف مقدار پر نظر رکھی ہے۔ ماہر القادری، ساغر نظامی، شمیم کرہانی، سلام مچھلی شہری، رئیس امروہوی، حرمت الاکرام، محمود سعیدی، منیر احمد صوفی، قمر جلالی آبادی، ظہیر غازی پوری، عبد المتین نیاز، انور مسعود، واجد سحری اور چمن لائی گوسائیں کی نظمیں فکر و فن کا بہتر نمونہ کہی جاسکتی ہیں۔ اِس باب کے بعد امیر خسرو کے اشعار پر پانچ شعرا کی تضمینیں ہیں، اس میں نظیر اکبرآبادی کی تضمین بھی ہے۔ اور آخر میں بارہ شعرا نے امیر خسرو کے فارسی اشعار کے منظوم تراجم پیش کئے ہیں۔ گوپی ناتھ امن کا یہ ایک شعری ترجمہ خوب ہے ؎

گوری سوئے سیج پر، مُکھ پر ڈارے کیس
چل خسرو گھر آپنے، رَین بھئی چو دیس

وہ حُسنِ مجسّم خواب میں ہے اور رُخ پر زُلف بکھیری ہے
اے خسرو چل تو گھر اپنے، اب چھائی رات اندھیری ہے

رام کرشن مضطر اور روشن صدّیقی نے بھی خسرو کے فارسی کلام کا اچھا منظوم ترجمہ کیا ہے۔ بعض شعرا کے ترجمے کمزور ہی نہیں بلکہ خسرو کے شعروں کی معنویت سے ہٹے ہوئے ہیں۔ قیصر حیدری اور بسمل اُلّساہی کا صرف ایک شعر خسرو کے تعلق سے ہے، باقی سب اشعار غزل کے ہیں۔ طاہر نظامی رامپوری نے حضرتِ خسرو" کے ساتھ "تیری" اور "تیرے" سے خطاب کیا ہے۔ جب شاعرانہ سُوجھ بوجھ کا یہ عالم ہو تو کیا کہا جائے ؎

براہِ راست ہے تیری رسائی حضرتِ خسرو
مبارک ہے ترے در کی گدائی حضرتِ خسرو

کتاب کا تعارف حسن الدین احمد صاحب، سکریٹری خسرو تقریبات قومی کمیٹی نے لکھا ہے۔ مُرتب کے نثری نذرِ عقیدت کے علاوہ صدرِ جمہوریۂ ہند جناب فخر الدین علی احمد اور وزیرِ اعظم شریمتی اندرا گاندھی کے پیامات بھی شریکِ کتاب ہیں۔

کتاب کی طباعت و کتابت صاف سُتھری ہے، کاغذ معیاری اور سرورق پر حضرتِ امیر خسرو کی رنگین تصویر ہے۔ قیمت بھی کم ہے۔

(ا۔ ص)

آواز نما — محمد خالد عابدی

ریڈیو ڈرامے —— قیمت ۶ روپئے ۵۰ پیسے

ملنے کا پتا —— مکتبہ شرقیہ ابراہیم پورہ بھوپال۔

"آوازنما" محمد خالد عابدی کے ۸ ریڈیو ڈراموں کا مجموعہ ہے جو تقریباً سب ہی نشر ہو چکے ہیں۔ ریڈیو ڈرامے اسٹیج کی تکنیک سے بالکل مختلف ہوتے ہیں اس میں قوت سامعہ کی مدد سے اسٹیج کا منظر اپنے ذہن میں پیدا کرنا پڑتا ہے۔ ساتھ ہی مکالمے، موسیقی اور مختلف صوتی اثرات منظر کو ذہن میں اُبھارنے میں مدد دیتے ہیں لیکن خالد عابدی کے یہ ڈرامے قاری کو مطالعہ کے دوران پُورا لطف دیتے ہیں اور اسٹیج کی کیفیت اور منظر کھل کر قاری کے سامنے آجاتا ہے کیونکہ ان ریڈیو ڈراموں میں اسٹیج ڈراموں کی بھی ساری خصوصیات ملتی ہیں۔

"آوازنما" کے سب ہی ڈراموں میں تعمیری پلاٹ ہیں۔ جس سے مصنف کا شعور ترقی کرتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ موضوعات ہلکے پھلکے ہیں، لیکن مکالمے برجستہ اور ظرافت کی ہلکی چاشنی لئے ہوئے ہیں، جو قاری کو برابر اپنی طرف متوجہ کئے رہتے ہیں۔ کردار جاندار ہیں اور سوسائٹی کے جیتے جاگتے افراد معلوم ہوتے ہیں۔ زبان اور اندازِ بیان موضوع اور کرداروں کا برابر ساتھ دیتا ہے۔ ماحول کی عکاسی اور واقعات کے اظہار میں بھی خالد عابدی کا قلم اپنے شباب پر نظر آتا ہے۔

الغرض یہ ڈرامے فنی تراش و خراش کے ساتھ خالد صاحب کے فن کے ارتقا اور اُن کے روشن مستقبل کی نشاندہی کرتے ہیں۔ بھوپال کے اس اُبھرتے ہوئے فنکار کا تعارف اُردو کے مشہور ڈرامہ نگار ابراہیم یوسف نے لکھا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"ان ڈراموں کو دیکھنے کے بعد خالد صاحب کی اس فن پر گرفت کا ثبوت ملتا ہے۔ خالد صاحب کے اس مجموعے "آوازنما" کے بارے میں چند سطور لکھ کر مجھے خوشی ہو رہی ہے۔ اُردو میں ڈراموں اور ریڈیو ڈراموں کے مجموعے کم ہیں۔ اس لحاظ سے "آوازنما" اُردو میں ایک اضافہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ آپ ان ڈراموں کو پڑھ کر کہیں گے کہ خالد صاحب آپ سے مل کر بیحد خوشی ہوئی اور یقینی یہ خوشی نہ تو تکلفاً ہوگی اور نہ رسماً، بلکہ حقیقی ہوگی۔"

(ریاض الدین ایوب)

سوکھی راتیں بھیگے دن

از۔ غلام نبی غمگین

ملنے کا پتا: بیوٹی کارنر، پی ڈبلیو ڈی روڈ بارہمولہ (کشمیر)

قیمت ۳ روپے

"سوکھی راتیں بھیگے دن" غلام نبی غمگین کے آٹھ مختصر افسانوں کا مجموعہ ہے۔ افسانے ہیں: اُلجھن، اول پھول، میری بھتیجی، زندہ لاشیں، میرا وہ میرا جنم دن، سوکھی راتیں بھیگے دن، پرارتھنا۔

ان افسانوں کی فضا کشمیری ہے اور خود افسانہ نگار کی وضاحت کے مطابق اُنہوں نے اپنے افسانوں میں اپنے آس پاس کے ماحول کی سادہ سی تصویر کشی کی ہے" لیکن چونکہ وہ نئی نسل سے تعلق رکھنے والے ایک نوجوان ادیب ہیں اس لئے اُن کی یہ تصویر کشی زیادہ تر نوجوان مردوں اور نوجوان عورتوں کے جذبات و نفسیات سے متعلق ہے۔ چنانچہ "اُلجھن" میں امجد اور نجمہ کے کردار، "سوکھی راتیں بھیگے دن" میں رشید اور شانو کے کردار اور پرارتھنا میں بھرت اور چھایا کے کردار اس کا نمایاں ثبوت ہیں۔ بعض افسانوں میں وہ ایک طرح نگار کے روپ میں بھی ہمارے سامنے آتے ہیں۔ اس سلسلہ میں "اول پھول" ایک بڑا دلچسپ افسانہ ہے اور ہمیں شوکت تھانوی کی یاد دلاتا ہے۔ افسانہ نگار کی زبان صاف ستھری اور اسلوب سادہ اور فطری ہے جس کی وجہ سے اُن کے سارے کردار افسانوی سے زیادہ حقیقی معلوم ہوتے ہیں۔

افسانہ نگار کو شکایت ہے کہ "اُردو کشمیر کی سرکاری زبان ہونے کے باوجود تعصب، تنگ نظری ظلم اور لاپرواہی کا شکار ہوتی رہی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس میں بھی کوئی سیاسی مصلحت ہو لیکن افسوس کا مقام یہ ہے کہ خود کشمیر کے اُردو دوست طبقے نے بھی اُردو کی بقا اور استحکام کے لئے کوئی عملی قدم نہیں اُٹھایا۔ مفاد پرست عملہ اُردو کے خلاف اور دوسری زبانوں کو مصنوعی طور سے ہی سہی طاقت ور بنانے کے درپے ہے۔ سرکاری زبان ہونے کے باوجود کشمیر میں اُردو کا مستقبل تاریک نظر آرہا ہے۔ ایسے حالات میں یہاں صحت مند ادب کی تخلیق گو ناممکن نہیں لیکن مشکل ضرور ہے"۔

ان نامساعد حالات کے باوجود اُنہوں نے اپنی ادبی شخصیت کے اظہار کے لئے "اُردو" ہی کو وسیلہ بنایا کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ "اُردو دنیا کی سب سے میٹھی پیاری مگر مظلوم زبان ہے"۔ اب اُردو دوستوں کا یہ ادبی فریضہ ہے کہ وہ اُن کی اس مختصر سی مگر مخلصانہ کوشش کو سراہیں اور ان کی پوری طرح حوصلہ افزائی کریں۔

(ڈاکٹر حامد اللہ ندوی)

رفتار

علمی، ادبی اور تہذیبی خبریں

اورنگ زیب کے سپہ سالار کے کتب خانہ میں گیارہ ہزار مخطوطات

بیکانیر ۲۰ دسمبر۔ راجستھان میں واقع یہ شہر اورنگ زیب کے زمانے میں راج کرنے والے اُس کے سپہ سالار انوپ سنگھ کے ایک بڑے خزانے کا اب بھی مالک ہے۔

یہ گیارہ ہزار نایاب قلمی کتابوں کا خزانہ ہے جن کی اکثریت بھوج پتر پر لکھی ہوئی سنسکرت کتابوں کی ہے۔ ان مخطوطات میں راجستھانی، ہندی، اُردو اور فارسی کے نوادرات بھی شامل ہیں۔ ان میں دکنی زبانوں کی پُرانی کتابیں بھی موجود ہیں۔ یہ سارا ذخیرہ مہاراجگانِ بیکانیر کے لال گڑھ محل میں محفوظ ہے اور اہلِ علم کے لئے اس سے فائدہ اٹھانے کی عام اجازت ہے۔

ان قلمی نسخوں میں تاریخ، نجوم، موسیقی، رقص، طب اور مذہب سے متعلق بہت اہم کتابیں ہیں۔ ان میں سُور داس کے کلام کا معاصر نسخہ بھی ہے۔ کنڑی زبان میں ایک ۷۰۰ سال پُرانی کتاب ہے۔ ایک ۹ انچ لمبا اور ۷ انچ چوڑا ایسا زُنار ہے جس پر ۷۰۰ اشلوک تحریر ہیں اور جو خورد بین کی مدد سے پڑھے جاسکتے ہیں۔

جامعہ ملیہ کیلئے پچاس لاکھ رُوپے منظور

نئی دہلی ۱۵ دسمبر۔ یونیورسٹی گرانٹس کمیشن نے جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کی ترقی و تعمیر کے لئے پانچویں پنجسالہ منصوبہ کی مدت کے دوران پچاس لاکھ رُوپے کی رقم منظور کی ہے۔ اس میں سے تقریباً نصف رقم مزید عملے کے تقرر کی مد پر ۱۲ لاکھ روپے عمارتوں کی تعمیر پر، چار لاکھ رُوپے کتابوں کی خریداری اور ۳۰ لاکھ روپے ضروری ساز و سامان پر صرف ہوں گے۔

ساحر لدھیانوی رُوبصحت ہیں

گزشتہ ماہ دسمبر ۷۶ء میں اُردو کے مشہور و مقبول ترقی پسند شاعر ساحر لدھیانوی پر دل کا دورہ پڑا تھا اور اُنھیں بمبئی کے بریچ کینڈی ہسپتال میں داخل کر دیا گیا تھا۔

وہ ہنوز اسپتال میں ہیں اور رُوبصحت ہیں۔

ساحر لدھیانوی نے اپنے تمام دعا گوؤں، پُرسش کرنے والوں اور عیادت کے لئے آنے والوں کا شکریہ ادا کیا ہے۔

جاں نثار اختر مرحوم کے مجموعۂ کلام "خاکِ دل" کو ساہتیہ اکاڈمی کا انعام

دلی ۱۰ دسمبر ۷۶ء۔ یہاں ساہتیہ اکاڈمی کے انتظامی بورڈ نے ۱۹۷۶ء کے اکاڈمی ایوارڈ ... شاعر۔ بمبئی۔

کے لیے ۷ کتابوں کا انتخاب کیا۔ سنسکرت، تامل اور تلگو زبانوں کی کوئی کتاب اکاڈمی کے معیار پر پُوری نہیں اُتری۔ مرحوم جاں نثار اختر کا آخری مجموعۂ کلام "خاکِ دل" بھی اُن کتابوں میں شامل ہے جنھیں انعام کے لئے منتخب کیا گیا۔

منتخبہ سترہ کتابوں کے مصنفین کو ایک کاسکیٹ بطور انعام دیا جائے گا جس میں تانبے کی ایک کندہ پلیٹ اور پانچ ہزار رُوپے کا ایک چیک ہوگا۔ انعامات کی تقسیم کا جشن اس بار کچھ دن کے بعد بنگلور میں ہوگا۔

اُردو زبان میں نُمایاں خدمات پر ایوارڈ

مہاراشٹر کابینہ کا فیصلہ

حکومت مہاراشٹر نے فیصلہ کیا ہے کہ تہذیبی سرگرمیوں میں نمایاں خدمات انجام دینے والوں کو ریاستی ایوارڈ دئے جائیں گے۔ وزیرِ اعلیٰ مہاراشٹر جناب ایس۔ بی۔ چوہان نے اس کا اعلان کیا۔

یہ ایوارڈ ڈراموں، موسیقی اور رقص، مراٹھی اور ہندی فلموں، اُردو تماشہ اور شاعری وغیرہ میں نمایاں حصّہ لینے والوں کو دئے جائیں گے۔ یہ ایوارڈ انفرادی طور پر یادگار تحفوں اور ایک ہزار ایک رُوپے کے نقد انعام اور ایک صداقت نامہ کی شکل میں ہوگا۔ اس کے لئے ایک خصوصی سلیکشن کمیٹی قائم کی گئی ہے۔

مخدوم محی الدین کے مجموعۂ کلام "بساطِ رقص" پر تین ہزار کا انعام

آندھرا پردیش اُردو اکاڈیمی نے گزشتہ چار سال کے دوران شائع شدہ آندھرا پردیش کے مصنفین کی ۴۲ کتابوں پر انعامات دینے کا اعلان کیا ہے۔ تین ہزار رُوپے کا خصوصی انعام مخدوم محی الدین کے مجموعۂ کلام "بساطِ رقص" کے لئے بعد از مرگ دیا گیا ہے۔

دیگر انعامات میں ایک ایک ہزار روپے کے چھ، پانچ پانچ سو رُوپے کے ۱۰ اور تین تین سو رُوپے کے ۲۴ انعامات شامل ہیں۔ انعامات کی مجموعی رقم ۳۱ ہزار ۲۰۰ رُوپے ہے۔

محمد عثمان عارف نقشبندی کو اُن کی کتاب پر ایوارڈ

مشہور شاعر محمد عثمان عارف نقشبندی ایم۔ پی۔ کو اُن کی نظموں کے مجموعے "نذرِ وطن" پر راجستھان ساہتیہ اکیڈمی نے گرانقدر انعام سے نوازا ہے۔ "نذرِ وطن" میں وہ قومی و وطنی نظمیں ہیں جو مقبول ہوچکی ہیں۔

(پرنٹر پبلشر مالک اعجاز صدیقی نے یونیورسل فائن آرٹ لیتھو پریس ۳۰ نورو جی اسٹریٹ ٹھاکر دوار بمبئی ۲ میں چھپوا کر دفتر سے شائع کیا۔)

○ جاری شدہ سنہ ۱۹۳۰ء ○

بانیٔ علامہ سیماب اکبرآبادی مرحوم

اردو کا سینتالیس ۴۷ سالہ علمی ادبی اور تہذیبی ماہنامہ

شاعر بمبئی

جلد۔ ۴۷ | فون نمبر ۳۵۹۹۰۴ | شمارہ۔ ۱۲

بدلِ اشتراک

زرِ سالانہ ——— ۱۶ ——— روپے

معاونین سے ——— ۵۰ ——— روپے

تاحیات خریداری ——— ۲۵۰ ——— روپے

ممالکِ غیر سے ——— ۲ ½ ——— پونڈ

ترسیلِ زر کا پتہ

ماہنامہ "شاعر" قصر الادب، بمبئی ۴۰۰۰۰۸

خط و کتابت کا پتہ

ماہنامہ "شاعر" مکتبہ قصر الادب

پوسٹ بکس نمبر ۴۵۲۶ بمبئی ۴۰۰۰۰۸

شاعرِ مشرق اور اُردو کے عظیم مفکّر
علامہ ڈاکٹر محمد اقبال نے 74 برس پہلے
آبادی کے مسئلے کے بارے میں فرمایا تھا:

"ضبطِ تولید
شرعاً
قابلِ اعتراض نہیں"

("علم الاقتصاد" مطبوعہ 1903ء)

شاعر بمبئی

ترتیب

آسماں اِن کی لحد پر شبنم افشانی کرے

مولانا عبدالماجد دریابادی

۶ جنوری ۱۹۷۷ء کو صبح کے وقت حضرت مولانا عبدالماجد دریابادی نے ۸۵ سال کی عمر میں داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ مولانائے مرحوم کی ذات علمی ادبی اور اسلامی حلقوں میں زبردست عظمت و وقعت کی حامل تھی۔ وہ مولوی عبدالقادر مرحوم کے چھوٹے صاحبزادے اور اپنے وقت کے بہت بڑے عالم مولانا مفتی محمد کریم مظہر کے پوتے تھے جنھیں ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کے خلاف جہاد کا فتویٰ دینے کی پاداش میں حبسِ دوام بہ عبور دریائے شور کی سزا دی گئی تھی۔ مولانا عبدالماجد ۱۸۹۲ء میں پیدا ہوئے تھے۔ کم و بیش ساٹھ سال علم و ادب و صحافت اور اسلامیات کی ایسی نمایاں خدمات انجام دیں کہ اُن کی شخصیت ہند و پاک میں اپنی مثال آپ بن گئی۔ مولانا کی ذات ایسے اوصافِ حمیدہ اور کمالات و خصوصیات کی حامل تھی جو صدیوں میں کسی ایک شخصیت میں پیدا ہوتے ہیں۔ وہ علومِ مشرقی و مغربی کا ایک بحرِ ذخّار تھے۔ بہت بڑے مفکر، صاحبِ نظر اور صاحبِ طرز انشاپرداز۔ کیننگ کالج لکھنؤ سے بی۔اے کیا تھا اور انگریزی زبان پر قدرت کا یہ حال تھا کہ منطق و فلسفہ کی کئی کتابوں کو انگریزی سے اُردو میں منتقل کیا۔ یہ کام مولانا نے دارالترجمہ حیدرآباد میں کیا۔ نفسیات اور فلسفے سے خاص لگاؤ تھا۔ عربی اور فارسی زبانوں کے منتہی تھے۔ جب وہ انٹرمیڈیٹ ہی میں تھے تو محمود غزنوی پر ایک کتاب لکھ کر شہرت حاصل کر لی تھی، پھر تو اُنھوں نے اُردو زبان کو کئی گرانقدر تصنیفات و تالیفات دیں۔ اپنے پیر و مرشد حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانویؒ سے قرآنِ مجید کا اِس طرح درس حاصل کیا کہ اُن کا شمار دنیا کے گنے چنے قرآن فہموں میں ہوا۔ اُنھوں نے ترجمہ و تفسیر میں زبردست نام پیدا کیا۔ قرآنِ مجید کی تفاسیر میں "تفسیرِ ماجدی" کو جو بلند درجہ حاصل ہے، وہ کسی تفسیر کو حاصل نہیں ہوا۔ مولانا نے اِس سلسلے میں دنیا بھر سے وہ کتابیں جمع کی تھیں جو قرآنِ مجید سے متعلق لکھی گئیں۔ اُنھوں نے عبرانی زبان بھی سیکھی۔ انگریزی اور اُردو دونوں زبانوں میں مرحوم نے تفسیر و ترجمۂ قرآن کا کام کیا۔ یہ اُن کا عظیم الشان کارنامہ ہے۔ وہ ادیب، نقّاد، تاریخ داں، فلسفی اور صحافی سب کچھ تھے۔ مرحوم نے مختلف موضوعات پر لاتعداد مضامین لکھے۔ اُن کے اخبار "صدقِ جدید" میں اُن کی تحریریں اور "سچی باتیں" نہ صرف ہند و پاک، بلکہ غیر ممالک میں بھی بےحد پسند کی جاتی تھیں۔ وہ بڑے خوددار، وطن پرست، صاف گو اور دُھن کے پکے تھے۔ تمام عمر کسی سے دب کر نہیں رہے۔ حق گوئی و بیباکی اُن کا مسلک تھا۔ مولانا عبدالماجد دریابادی کی موت قوم و وطن، ملّتِ اسلامیہ اور علم و ادب کا نقصانِ عظیم ہے۔

پروفیسر رشید احمد صدیقی

ابھی مولانا عبدالماجد دریابادی کے سانحۂ وفات سے دل و دماغ متاثر و متاسف تھے ہی کہ پروفیسر رشید احمد جیسے جلیل القدر ادیب کا بھی ۱۵ جنوری ۱۹۷۷ء کو علیگڑھ میں انتقال ہوگیا۔ رشید صاحب مرحوم کی عمر ۸۲ سال تھی۔ وہ ۱۸۹۴ء میں پیدا ہوئے تھے۔ مرحوم اُن بزرگ ادیبوں میں سے تھے جن کے فیضِ تادیب نے اُردو کو بہت سے ممتاز ادیب و شاعر دئے۔ رشید احمد صدیقی جونپور کے رہنے والے تھے لیکن علیگڑھ میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد وہیں کے ہو رہے۔ مدّتوں مسلم یونیورسٹی علیگڑھ کے صدر شعبۂ اُردو رہے۔ ریٹائر ہونے کے بعد بھی علیگڑھ نہ چھوڑا اور وہیں پیوندِ خاک ہوئے۔ وہ اِس مدینۃ العلم کے پُجاری تھے اور اسی کے باسی رشید صاحب کے پرستار۔ ویسے ایک بےحد ممتاز اور صاحبِ طرز ادیب و نقّاد اور طنز و مزاح نگار کی حیثیت سے ہندوستان اور پاکستان میں خود رشید صاحب کے فن اور شخصیت کی پرستش ہوتی تھی۔ وہ علیگڑھ ہی کی نہیں بلکہ ہماری اُردو تہذیب کی ایک علامت تھے۔ تہذیبی رچاؤ، علمی گہرائی، فکر و نظر کی وسعت، شفقت و محبّت، دل سوزی و دلداری اور پاسِ وضع کا رشید صاحب اعلیٰ نمونہ تھے۔ علیگڑھ، ڈاکٹر ذاکر حسین اور خواجہ غلام السیدین، رشید صاحب کے اِس دنیا میں تین محبوب تھے۔

اُردو طنز و مزاح کو رشید صاحب مرحوم نے اپنی فکری سنجیدگی سے ایک نئی معنویت عطا کی، ایک نیا موڑ دیا۔ تاریخِ ادبِ اُردو میں اُن کا بہت بلند مقام ہے۔

ادارۂ "شاعر" اِن دونوں بزرگوں کے سانحۂ وفات پر اُن کے پسماندگان سے دلی ہمدردی کا اظہار کرتا ہے۔ یہ نہ صرف اُن کا بلکہ پوری اُردو دنیا کا غم اور نقصان ہے۔

مہدی پرتاپگڑھی

جشنِ سالِ نومنا

آخری شب سال کی دَم توڑتی ہے گھر کے باہر
اِک سویرا آکے دَروازے پہ دستک دے رہا ہے
اِک برس کم ہوگئی عمرِ رَواں یہ کون سوچے
جب ہمکتی رُت کا سالِ نو سندیسہ دے رہا ہے

بیتے لمحوں کی ستم سامانیوں پر مت نظر کر
آنے والی صبح کی ضو دیدہ و دِل میں سمو دے
کیا خبر "دیدہ مستقبل" حیاتِ نو کا پیکر"
اپنی تابانی سے تیرا دامنِ اُمید بھر دے

حسرتوں کے تیرہ مقتل میں نہ کر نوحہ سرائی
مرثیہ مت بن کہ "رُوحِ وقت" نغمہ چاہتی ہے
زندگی کے دَوڑ میں پیچھے نہ رہ جائے کہیں تو،
اِس لئے تیری رگوں میں آگ بھرنا چاہتی ہے

چہرۂ احساس سے بیچارگی کی گرد دھو لے
وقت کے آذر نے خوابوں کو دیئے ہیں کتنے پیکر
اب صلیبِ غم پہ لٹکایا نہ جائے گا کوئی بھی
جشنِ سالِ نومنا، امرت سے ہیں لبریز ساغر

اک نئے سُورج کی کرنیں سارے گھر آنگن میں اُتریں
بُوئے گل دوشِ نسیمِ صُبح پر اِترا رہی ہے
اک نیا ادراک اپنے ذہن میں بیدار کر لے
روشنی فکر و نظر کی ہر طرف لہرا رہی ہے

اک نیا ہندوستاں انگڑائیاں لینے لگا ہے
اک نیا سُورج اُفق پر جلوہ پاشی کر رہا ہے
لوک گیتوں کی صدا کھیتوں میں کھلیانوں میں جاگی
نغمۂ فولاد سے ہر کارخانہ گونجتا ہے

○ معرفت ایگزیکٹیو انجینئر، اریگیشن ڈویژن پرتاپگڑھ (یوپی) ۶۔ بمبئی

مقالہ

ڈولہ سجن

ڈاکٹر حامد اللہ ندوی
مہاتما گاندھی میموریل ریسرچ سینٹر نیتاجی سبھاش روڈ بمبئی ۲

ڈولہ اور سجن ایک کلاسیکی کہانی کے دو بنیادی کردار ہیں۔ کہانی کا خلاصہ یہ ہے :

شاہ تبریز کی ایک لڑکی تھی جس کا نام ڈولہ تھا' بڑی ہی حسین اور خوبصورت' باپ نے بڑے ناز نخرے سے اُس کو پالا۔ اور ہر قسم کی تعلیم و تربیت دے کر اُس کو لائق بنایا۔ جب وہ جوان ہوئی تو اُس نے باپ سے درخواست کی کہ اُس کے لئے بہترین ریشمی کپڑا اور ہیرے جواہرات مہیّا کئے جائیں۔ اور کئی ماہ کی لگاتار محنت سے اُس نے ایک ایسا قیمتی رومال تیار کیا کہ جس کی بے مثال خوبصورتی کو دیکھ کر باپ بھی دنگ رہ گیا۔

کچھ دنوں بعد شام کا ایک بڑا تاجر دیس دیس گھومتا ہوا تبریز پہنچا۔ اور اپنی نادر چیزیں وہاں فروخت کرنے اور وہاں کی نادر چیزیں خریدنے لگا۔ تب ڈولہ کو اس کی خبر ہوئی تو اُس نے اپنا خوبصورت رومال فروخت کرنے کی غرض سے اپنی ملازماؤں کو اُس تاجر کے پاس بھیجا۔ تاجر اُس رومال کی خوبصورتی سے مسحور سا ہوگیا۔ اور سوا لاکھ اشرفی میں فوراً ہی اُس کو خرید لیا۔ شاہِ شام اُس کا دوست تھا۔ چنانچہ تاجر نے وہ رومال بطور تحفہ اُس کی نذر کر دیا۔

اس قیمتی اور خوبصورت رومال کی خبر ہر طرف پھیلی تو شاہِ شام کے لڑکے سجن کو اُس کے دیکھنے کی خواہش ہوئی۔ باپ اُس کو وہ رومال دکھانے کے لئے تیار نہ تھا۔ کیونکہ اُس کو ڈر تھا کہ سجن جوں ہی اُس رومال کو دیکھے گا' اُس کا دھیان رومال بنانے والی کی طرف چلا جائے گا۔ اور وہ اُس کی محبت میں پاگل ہو جائیگا سجن نے کسی طرح اُس رومال کی ایک جھلک دیکھ ہی لی۔ اور وہی ہوا جس کا باپ کو ڈر تھا۔ وہ بنا دیکھے ہی ڈولہ کی محبت میں گرفتار ہوگیا اور صبح و شام اُس کی یاد میں رونے' تڑپنے اور تلملانے لگا۔

بادشاہ سے اپنے بیٹے کی یہ حالت دیکھی نہ گئی۔ اُس نے اپنے تاجر دوست سے سارا ماجرا کہہ سُنایا۔ اور اُس سے مدد چاہی۔ تاجر بھی بے بس تھا۔ اُس نے سجن کو صرف ڈولہ کے ملک تک پہنچانے کا وعدہ کیا۔ سجن کی جان میں جان آئی اور وہ خوشی خوشی اُس تاجر کے ساتھ ہولیا اور کئی دن کے بحری سفر کے بعد دونوں ڈولہ کے ملک میں پہنچے۔ سجن اپنی قسمت آزمائی کے لئے وہیں رہ گیا اور تاجر دعائیں دے کر آگے بڑھ گیا۔

سجن نے فقیروں کا سا بھیس بدلا بھٹکتا بھٹکتا کسی طرح ڈولہ کے محل کے پاس پہنچا اور فقیرانہ صدا دینے لگا۔ ڈولہ ایک نئی آواز سُن کر فقیر کو دیکھنے چلی اور بجائے بھیک کے اُس کو اپنا دل دے بیٹھی۔ دونوں نے آنکھوں کی زبانی اپنے دل کا راز ایک دوسرے سے کہہ سُنایا۔ بات بڑھی' ملاقات بڑھی' یہاں تک کہ ایک رات چوری چھپے دونوں ایک دوسرے سے شاہی باغ میں ملے اور جی بھر کر حسرت نکالی۔ لیکن جب صبح ہوئی تو ڈولہ محل میں اور سجن جنگل میں۔ ڈولہ کے باپ نے بغیر اجازت شاہی باغ میں گھس آنے کی سزا کے طور پر سجن کو شہر بدر کر دیا تھا۔

سجن ڈولہ کے غم میں روتا صحرا نوردی کرتا ایک دُور دیس میں پہنچ گیا اور شناخت سے بچنے کی خاطر زنانہ لباس زیب تن کر کے ایک کسبی کا ملازم ہوگیا اور ناچ گانے کی تربیت حاصل کرنے لگا اور چند ہی دنوں میں اِس قدر مہارت حاصل کر لی کہ لوگ اُس کا مُجرا سُن کر عش عش کرتے تھے۔

اتفاق کی بات کہ اُسی دیس کے شہزادے سے ڈولہ کی شادی طے تھی۔ جب شاہانہ برات ڈولہ کے دیس کی طرف روانہ ہوئی تو سجن بھی ایک رقاصہ کے رُوپ میں اُس برات کا حصہ تھا۔ برات منزل پر پہنچی۔ رات کو ناچ گانے ہوئے اور سجن نے اپنے بے مثال حسن اور فن کارانہ رقص سے ساری محفل کو گرویدہ کر لیا۔ یہاں تک کہ جب ڈولہ کو دلہن بنانے کی باری آئی تو اِس کام کے لئے ڈولہ کے ماں باپ نے سجن کو پسند کیا۔ پھر کیا تھا تنہائی میں

پھر ایک بار دو بچھڑے ہوئے دل ملے۔ اور سب کو غفلت میں رکھ کر راتوں رات محل سے بھاگ کھڑے ہوئے۔ لیکن ایک خوبصورت لڑکی کا ایک نوجوان اجنبی کے ساتھ انجانی راہوں میں بھٹکنا خواہ مخواہ لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرتا ہے۔ چنانچہ ان دونوں کے ساتھ بھی یہی ہوا۔

سب سے پہلے انہیں ایک "ناستی ہندو" سے سابقہ پڑا جو شہر کا "نگر سیٹھ" تھا۔ ایک دن سجن کی غیر موجودگی میں کسی طرح ڈولہ کو اُڑا لے گیا اور اپنے محل میں بند کر کے اُس کو بہلانے پھسلانے کی ترکیبیں سوچنے لگا۔ لیکن قبل اِس کے کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو سجن نے "سائیں" کا بھیس بدل کر ڈولہ کو اُس کی قید سے چھڑالانے میں کامیابی حاصل کر لی۔

دوسری بار ایک "کور چشم" آڑے آیا۔ ایک دن اُس نے جنگل میں ڈولہ کو تنہا پاکر چھیڑ چھاڑ شروع کر دی۔ ڈولہ کو جب بچنے کی کوئی راہ نظر نہ آئی تو پیاس کا بہانہ کر کے وہ اُسے ایک کنوئیں کے پاس لے گئی اور عین اُس وقت جبکہ وہ ڈولہ کے لئے پانی نکالنے کی غرض سے کنوئیں کی طرف جھکا۔ ڈولہ نے ایک زوردار دھکا دیا اور کانا اندھے کنوئیں میں جا گرا۔

تیسری بار مصیبت ایک "بڈھے" کی صورت میں سامنے آئی۔ جب ڈولہ کور چشم سے بچ کر آگے بڑھی تو راستہ میں دریا ملا۔ دریا پار کرنے کی غرض وہ ایک کشتی میں سوار ہوئی۔ کشتی کا ملاح ایک "بوڑھا ضعیف" تھا لیکن ڈولہ کو اکیلا پایا تو اُس کی جوانی لوٹ آئی۔ اور اُس سے چھیڑ چھاڑ کرنے لگا۔ ڈولہ نے کوئی مفر کا راستہ نہ دیکھا تو وعدہ کر لیا کہ اگر تم مجھ سے باقاعدہ نکاح کر لو گے تو میں تمہاری بن جاؤں گی۔ بڈھا خوش ہو کر شادی کی تیاریاں کرنے لگا اور عین اس وقت جب کہ وہ شادی کی تیاریوں میں مصروف تھا ڈولہ نے اُس کا ایک گھوڑا چرایا اور وہاں سے بھاگ کھڑی ہوئی۔

چوتھی بار ایک چھوڑ چار نوجوان اُس کے پیچھے پڑ گئے۔ لیکن وہ چاروں شہزادے تھے جو شکار کی غرض سے جنگل میں بھٹک رہے تھے۔ اُن کی نظر اس حور پر پڑی تو وہ دل و جان سے اُس پر فدا ہو گئے۔ چاروں میں سے ہر ایک اُسکو اپنا بنانا چاہتا تھا۔ آخر طے یہ ہوا کہ جو شخص اپنا گھوڑا دوڑا کر سب سے پہلے اس کو جا لے گا وہی اُس کا حقدار ہوگا لیکن جب چاروں ایک ہی وقت میں اُس تک پہنچے تو اُن میں لڑائی ہونے لگی۔ ڈولہ نے یہاں بھی حاضر دماغی سے کام لیا۔ اُن سے کہا لڑو نہیں، میں چاروں طرف چار تیر چلاتی ہوں جو ننگے پیر جا کر سب سے پہلے تیر اُٹھا لائے گا میں اُس کی ہو جاؤں گی۔ چاروں تیار ہو گئے اور جوں ہی وہ تیر لینے کی غرض سے پیدل اُدھر دوڑے۔ ڈولہ نے تلوار لے کر اُن کے چاروں گھوڑوں کا صفایا کر دیا اور خود اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر نہایت اطمینان کے ساتھ آگے چل دی۔

آخر بار بار کی مصیبتوں سے بچنے کے لئے اُس نے مردانہ لباس زیب تن کیا اور اپنا سفر جاری رکھا یہاں تک کہ کئی دن کے سفر کے بعد وہ ایک علاقے میں داخل ہوئی جہاں کا بادشاہ ابھی ابھی مرا تھا اور اُس کے کوئی نرینہ اولاد نہ تھی۔ جب وہاں کے لوگوں نے ڈولہ کو دیکھا تو وہ سمجھے کہ خدا نے مہربانی کر کے اُن کے مُلک کی حکمرانی کے لئے آپ سے آپ ایک شہزادہ کو بھیج دیا ہے۔ چنانچہ اُنھوں نے فوراً اُسے محل میں لیجا کر بادشاہ کی لڑکی سے اُس کی شادی کر دی اور ملک کا تخت و تاج اُس کے حوالے کر دیا۔

تخت نشین ہونے کے بعد پہلا کام جو ڈولہ نے کیا وہ یہ تھا کہ ایک ماہر نقاش کو بُلا کر اُس سے اپنی چار قدِ آدم تصویریں بنوائیں اور اُنہیں شہر کے چاروں دروازوں پر آویزاں کر دیا اور محاسبوں کو حکم دیا کہ جو کوئی اِس تصویر کو دیکھ کر حیرت میں پڑ جائے اُسے میرے سامنے حاضر کرو۔

اِس تصویر کو دیکھ کر سب سے پہلا مسافر جو حیرت میں پڑا وہ خود ڈولہ کا باپ تھا جو تخت و تاج چھوڑ کر اپنی بیٹی کی تلاش میں جنگل جنگل بھٹک رہا تھا۔ محاسب اُس کو پکڑ کر ڈولہ کے پاس لے گئے۔ ڈولہ نے اپنے باپ کو پہچان لیا لیکن وہ وقت سے پہلے اپنا راز فاش ہونے نہیں دینا چاہتی تھی۔ اُس کو قید خانے میں ڈالنے کا حکم دیدیا۔ دوسری بار اُس کے سامنے جو شخص لایا گیا وہ ملاح تھا۔ ڈولہ نے اُس کو بھی بند کروا دیا۔ تیسری بار اُس کے سامنے جو لوگ حاضر کئے گئے وہ چار شہزادے تھے۔ ڈولہ نے اُن کو بھی حراست میں رکھنے کا حکم دیدیا۔ اور سب کے آخر میں جس نوجوان کو نہایت خستہ حالت میں اُس کے سامنے پیش کیا گیا وہ خود سجن تھا۔ وہی سجن جس کو حاصل کرنے کے لئے ڈولہ نے اتنی ساری پریشانیاں اُٹھائی تھیں۔ بچھڑے ہوئے محبوب کو آخر اُس نے پالیا۔ دونوں گلے مل کر خوب روئے اور اپنی اپنی بپتا ایک دوسرے سے کہہ سُنائی۔

آخری مرحلہ دائمی وصال کا تھا۔ اِدھر سے شاہ تبریز کو قید سے نکالا گیا۔ اُدھر سے شاہِ شام کی سواری آئی۔ شاہ شہر کی لڑکی پر بھی سارا راز فاش کر دیا گیا۔

شاعر۔ بمبئی

اب سجن کی صرف "دولہ دولھن" نہ تھی بلکہ خود دولہ کی خواہش پر شاہِ شہر کی دختر بھی اُس کے رشتۂ ازدواج میں شامل ہوگئی۔ سجن ایک تھا اور سجنیاں دو۔

نیند اُس کی ہے دماغ اُس کا ہے راتیں اُس کی ہیں — تیری زُلفیں جس کے بازو پہ پریشاں ہوگئیں

(۲)

اس کہانی کو بُنیاد بنا کر ایک قدیم دکنی شاعر نے "دُولہ سجن" کے نام سے ایک خوبصورت اور دلچسپ مثنوی ترتیب دی ہے۔ اس کا لکھنے والا ایک ایسا گمنام شاعر ہے جس کے ذکر سے "مخزنِ شعراء" اور دیگر تذکرے خالی ہیں۔ خود مثنوی سے جو کچھ معلوم ہوتا ہے وہ بس اتنا ہے کہ شاعر کا نام سید مکین اللہ تھا اور تخلص مکین، کیونکہ مثنوی کے ہر باب کے خاتمہ پر اُس نے یہی نام اور یہی تخلص دہرایا ہے۔

لیکن اس مثنوی میں متعدد ایسے اشارے موجود ہیں جو ہمیں شاعر کے حالات معلوم کرنے میں بالواسطہ مدد دیتے ہیں۔

(الف) پہلا اشارہ یہ ہے کہ شاعر نے مثنوی کی تمہید میں سُورت کے بعض نوابوں اور وزیروں کی تعریف کی ہے۔ وہ کہتا ہے۔

قصیدہ کہوں اور دل میں یہ گن — کہ جن سے ہے حرمت ہمیں رات دن
کہ اس شہرِ سُورت کے اندر عظیم — مسلماں کو ہے پیشۂ مستقیم
جو ہے چشم ہم میں وہ اعضا عجیب — کہ ثانی شہنشاہ شرفا نجیب
کہ میر افضل الدین خاں اُن کا نام — رعیت اُوپر وہ مہرباں مُدام
دگر حشمت جنگ بہادر خطاب — وہ سُورت کے نواب عالی جناب
کہ ہے نام اُن کا بملک ملک — ہے روشن جہاں میں کہوں کاں تلک
وہ سادات آلِ نبی معتبر — ہر اک مومنوں کے وہ ہیں سرچتر
ہیں صدر نشیں خوش خطاب پسند — (کذا) کرے مرتبہ حق اُنھوں کا بلند

دگر اُن کے ہیں پیشکار عجیب — بلند ہو گئی اُن کی عالی نصیب
کہ جس شاہ کی وہ خدمت کرے — تو کونین میں اُس کی عزت بڑھے
اُنھوں میں سے ہیں خاص عالی قدر — خدا اُن کو راکھے سلامت مگر
بہت ہے اُنہوں سے کہوں خوب نام — مثل شاہ خود کے وزیر مدام
خدا سب کو راکھے بامن و اماں — مرا یہ تو امید ہے مہرباں

دگر پہلواں زیج بخشی کا نام — خدا اُن کو راکھے سلامت مدام
وہی شیرِ ثانی ہے صاحب تمیز — ہر اک علم میں اور ہنر میں عزیز
معین الدین اُن کا اسم معتبر — لقب قمر الدولہ بہادر نشر
حسینی لقب سلسلہ شاہ کے — وہ نواب عالی قدر جاہ کے

تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اٹھارہویں صدی عیسوی میں ہندوستان کے اور حصّوں کی طرح گجرات اور سُورت بھی سیاسی بحران کا شکار رہے۔ مرکز کی گرفت کمزور ہو چکی تھی، علاقائی حاکمیت کا دَور دَورہ تھا اور انگریز بہانے تراش تراش کر ایک ایک کو ہڑپ کرتے جا رہے تھے۔ اٹھارہویں صدی کے ختم ہوتے ہوتے سورت بھی اُن کی ریشہ دوانیوں کی نذر ہو گیا۔ وہاں سالہا سال سے جو نوابی چل رہی تھی وہ اپنے خاتمہ کے انتظار میں تھی چنانچہ ۱۸۲۱ء میں اپنے باپ کے انتقال کے بعد میر افضل الدین خاں سُورت کے نواب بنے لیکن جب ۱۸۴۲ء میں اُن کا انتقال ہو گیا تو انگریزوں نے نوابی کے اس سلسلہ کو

ختم کرکے سورت کے انتظام کو براہِ راست اپنے قبضہ میں لے لیا۔

جیسا کہ شاعر کی تعریف سے ظاہر ہے، میر افضل الدین خاں کی شخصیت ایک ہردلعزیز شخصیت تھی۔ سورت کے عوام اُن کے عہدِ حکومت میں بے انتہا خوش تھے۔ ادیبوں اور شاعروں کی اُنھوں نے خصوصیت کے ساتھ سرپرستی کی۔ صرف مکینؔ ہی نے نہیں بلکہ اِس عہد کے دیگر ادیبوں اور شاعروں نے بھی میر افضل الدین خاں کو بڑے احترام کے ساتھ یاد کیا ہے۔ چنانچہ "مخزنِ شعرا" میں ہے کہ:

"شیخ احمد بخش نے جو بخشو کے نام سے مشہور تھے، جب رسول اللہؐ، خلفائے راشدینؓ، ائمہ اثنا عشرؑ، ہند، شام و روم کے ملوک اور انگریز فرمانرواؤں کی جنگوں کے حالات پر مشتمل "حدیقۂ احمدی" کے نام سے آسان زبان میں ایک کتاب لکھی تو اُنھوں نے اُس کے دیباچہ کو نواب قمر الدولہ افضل الدین خاں بہادر والیٔ سورت کے نام معنون کیا اور حُسنِ اتفاق سے جب میاں سمجھو نے اِس کتاب کے اختتام کی تاریخ کہی تو اُنھوں نے بھی اپنی تاریخ میں میر افضل الدین خاں کا نام اِس طرح منظوم فرمایا۔

بعہدِ افضل الدّین خاں نوّاب	اِتب گشت تاریخ نگارین
زگُل تاریخ ہا اعلیٰ و افضل	دلیلِ افضلیت بس بُود این
کہ آمد سالِ تاریخش برابر	بنامِ نامیٔ میر افضل الدّین

(ب) دوسرا اشارہ یہ ہے کہ شاعر نے مثنوی کی تمہید میں اپنے باپ دادا کا بھی ذکر کیا ہے۔ کہتا ہے:

پدر بود تو سیّد قادر است	کہ سیّد حسن جدِّ تو ظاہر است

مخزنِ شعرا میں سیّد قادر میاں خوشترؔ کے نام سے ایک شاعر کا تذکرہ ملتا ہے۔ لکھا ہے:

"خوشترؔ تخلص، سیّد قادر میاں نام، سیّد مہدی صاحب مرحوم کے، کہ جن کے اوصافِ جمیلہ مشہور ہیں، پوتے (بیرہ)، طبع رسا اور ذہن ذکا رکھتے ہیں، عربی فارسی کی استعداد اچھی ہے، علم فرائض سے بھی بخوبی آشنا ہیں، رفتار و گفتار بھی شاہی افراد کی طرح خوب اور درست ہے، چونکہ عام طور پر مشائخین کی طرح مُریدوں کی خدمت سے بندھی ہوئی ہوتی ہے۔ اُن کا نام کبھی سُورت میں اور کبھی احمد آباد میں رہتا ہے، راقم الحروف کے بھی اُن سے اچھے تعلقات ہیں۔"

(ج) تیسرا اشارہ یہ ہے کہ شاعر نے حمد و ثنا اور نعت و منقبت کے بعد اپنے مُرشد اور پیشوا کی شان میں بھی کچھ شعر کہے ہیں۔ لکھا ہے:

میں ہوں دست بیعِ مرشدِ پیشوا	کو الطاف اُنھوں کا کہوں اب بجا
سدا پر مرے دل کے روشن قمر	وہی اسم عالی ہیں سیّد بدر
فقیری سے ہے نعمت اُنھوں کو عطا	وہ ہیں کبر سے اور ریا سے صفا
نبی عم وہی ہیں مرے دید بیع	اُنھوں سے یہ عاجز ہوا دستِ بیع

سورت رفاعی اور عیدروس بزرگوں کا گھر ہے۔ رفاعی بزرگوں میں سیّد عماد الدین احمد اللہ الرفاعی کے نام سے ایک بزرگ گذرے ہیں جن کے سورت اور بیرونِ سورت میں ہزاروں مرید تھے۔ اُن کے نو لڑکے اور چند لڑکیاں تھیں۔ چوتھے لڑکے کا نام سیّد بدر الدّین محسن تھا۔ سیّد بدر نے سنہ ۱۲۰۷ھ (۱۷۹۲ء) میں رحلت فرمائی اور بمبئی میں مدفون ہوئے۔"

(د) چوتھا اشارہ ترقیمہ سے ملتا ہے۔ ترقیمہ میں لکھا ہے کہ یہ نسخہ ۱۲۷۱ھ (۱۸۵۴ء) میں نقل ہوا۔ خلیفہ سجادہ سیّد امین الدین رفاعی، شیخ خیر اللہ بن شیخ نصر اللہ اُس کے کاتب اور مالک ہیں۔"

اِن سارے اشاروں کو ملانے سے اِس شاعر کے جو حالات سامنے آتے ہیں وہ یہ ہیں:

شاعر کا نام سیّد مکین اللہ اور تخلص مکینؔ ہے۔ یہ سورت کا رہنے والا تھا۔ سورت کے آخری نواب میر افضل الدین خاں کے عہدِ حکومت میں اُس نے یہ مثنوی لکھی۔ مکین کے باپ کا نام سیّد قادر تھا جو خود بھی شاعر تھے اور خوشترؔ تخلص کرتے تھے، پیری مریدی اُن کا پیشہ تھا، کبھی سورت میں اور کبھی احمد آباد میں اُن کا قیام رہتا تھا۔ مکین نے دادا کا نام سیّد حسن اور پردادا کا نام سیّد مہدی تھا اور یہ بھی مشائخینِ سورت میں شمار ہوتے تھے۔

سید بدالدین رفاعی، کمین کے نہ صرف پیرو مرشد تھے بلکہ وہ اس کے بنی عم بھی تھے۔ اور اُس کا اُن سے خاندانی رشتہ تھا۔
یہ مخطوطہ خود رفاعی خاندان کے ایک سجادہ نشین خیر اللہ بن نصر اللہ کا نقل کیا ہوا ہے اور شاعر کے قریبی زمانے کا ہے۔
اور سب سے آخر میں یہ کہ شاعر کا زمانہ خدیدتی کے آس پاس کا زمانہ ہے۔ شیفتہ وغیرہ اُس کے ہم عصر تھے۔

(۳)

اِن ساری باتوں کا مطلب یہ ہے کہ یہ مثنوی کچھ بہت زیادہ قدیم نہیں ہے، بلکہ نواب افضل الدین خاں والیٔ سورت کے سالِ جلوس کے حساب سے زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ سو سال پُرانی ہے۔ لیکن چونکہ یہ ایک ایسے شاعر کے زورِ قلم کا نتیجہ ہے جو اُردو کے مرکز سے بہت دُور تھا۔ اور ایک ایسے علاقے سے تعلق رکھتا تھا جہاں آج اُردو کا نام و نشان نہیں ہے، اِس لئے اس مثنوی کا مختصر سا ادبی و لسانی جائزہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

اُوپر ہم نے اِس مثنوی کا خلاصہ دیدیا ہے۔ اِس کا سرسری مطالعہ بھی یہ باور کرنے کے لئے کافی ہے کہ اِس میں کہیں جھول نہیں، پُوری کہانی ایک خاص منطقی ربط کے ساتھ آگے بڑھتی ہے اور کہانی کی ہر اکائی دوسری اکائی کے ساتھ بڑی خوبصورتی کے ساتھ جُڑی ہوئی ہے۔ کہانی کو دلچسپ بنانے کے لئے کسی "حُور" پری جن دیو یا کسی اور مافوق البشر عنصر کا سہارا نہیں لیا گیا ہے۔ اِس کے سارے کردار ایک فطری فضا میں سرگرم عمل ہیں اور اُن کا ردِ عمل بھی بالکل وہی ہے جو اِن حالات میں کسی گوشت پوست کے انسان کا ہو سکتا ہے۔

اِس کے سارے کردار بڑے جاندار ہیں اور خصوصیت کے ساتھ سجن اور دُولہ کا کردار اپنے اندر بڑی جاذبیت رکھتا ہے مگر سجن کے مقابلے میں دُولہ زیادہ ذہین، زیادہ حاضر دماغ اور زیادہ فعّال ہے، وہ عورت ہونے کے باوجود ایک بہادر مرد کی طرح ہر مصیبت، ہر تکلیف کا سامنا کرتی ہے اور ہر مشکل میں اپنے بچاؤ کا کوئی نہ کوئی راستہ ڈھونڈھ لیتی ہے، یہاں تک کہ وہ ایک اجنبی ملک کے تخت و تاج کی وارث بن جاتی ہے تو اپنی اصلی شخصیت کو راز میں رکھ کر پُورے مسئلے کو خوبصورتی کے ساتھ حل کرنے کی راہ بھی وہی نکالتی ہے۔

اِس میں "نگر سیٹھ" "کور چشم" "بُوڑھا ملّاح" اور چار "شکاری شہزادوں" کے جو ضمنی کردار ہیں وہ بھی اپنا ایک اہم رول ادا کرتے ہیں، ان کی موجودگی کی وجہ سے نہ صرف یہ کہ کہانی کی پُوری فضا تھکا دینے والی یکسانیت سے بچ گئی ہے، بلکہ نفسیاتی طور پر کہانی کی معنویت میں ایک حقیقت پسندانہ جھلک آگئی ہے۔ عام طور پر ایسے ہی لوگ ایک جوان، خوبصورت اور بے سہارا لڑکی کو تنہا پاکر اپنی حیوانیت کا زیادہ مظاہرہ کرتے ہیں۔

اِس میں نفسیاتی طرزِ عمل کا بھی قدم قدم پر عکس ملتا ہے۔ چھوٹے موٹے چٹکلے تو بہت ہیں۔ لیکن ایک اجنبی ملک کے تخت و تاج کا وارث بننے کے بعد سجن کو پانے کے لئے دُولہ کا اپنی قدِ آدم تصویریں شہر کے چاروں دروازوں پر آویزاں کرنا ایک ایسی نفسیاتی ترکیب ہے کہ جس کی جس قدر بھی تعریف کی جائے کم ہے، اِس ترکیب سے ایک ایک کرکے نہ صرف پُرانے رشتے ایک مرکز پر آن ملتے ہیں، بلکہ سجن بھی ہاتھ آجاتا ہے۔

اِس کا آخری موڑ بھی بڑا خوبصورت اور حقیقت پسندانہ ہے۔ دُولہ سجن کو پانے کے بعد خود غرضی سے کام نہیں لیتی، اپنی خوشیوں میں اُس شہزادی کو بھی شریک کرلیتی ہے جس کے ساتھ اُس نے مرد بن کر شادی کرلی تھی۔ اور دونوں سجن کی باقاعدہ بیویاں بن کر اپنی زندگی کے باقی دن ہنسی خوشی گزار لیتی ہیں۔

اِن ساری فکری و فنّی خوبیوں کے علاوہ شاعر نے زبان و بیان کے معاملے میں بھی بڑی سادگی اور حقیقت پسندی سے کام لیا ہے۔ وہ واقعات اور جذبات کی تصویر کشی کرتے وقت مبالغہ یا رنگ آمیزی سے بالکل کام نہیں لیتا، زبان پر گو مقامی رنگ غالب ہے، الفاظ ناپ تول کر استعمال کرتا ہے اور بات صرف اُسی قدر کرتا ہے جو موقع محل کے اعتبار سے ضروری ہو، اور ہمیشہ اخلاقی پہلو کو زیادہ نمایاں کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

سجن کی توصیف :-

کہ تھا نام وہ شاہزادہ کا سُن — اسے لوگ کہتے تھے شاہ سجن
مثل چاند کے تھا اسے منہ پہ نُور — گیا چودھویں رات کا وہ ظہور
عمر میں وہ تھا پانزدہ سال کا — نہ کھایا تھا کوئی تیر جنجال کا
مگر علم میں فن میں تھا باکمال — کیا تھا اُسے حق نے صاحب جمال

دُولہ کی تعریف :-

کہا ملک ہے ایک سُن بے بہا — وہاں کا جو ہے شاہ صاحب دِیا
شاعر بمبئی

اُسی کی ہے دُختر سنو پُر حشم　　دُولہ شاہزادی ہے اس کا اسم
ہے تیرہ برس کی سِن و سال میں　　وہ ہے حُور مانند احوال میں
خدا یاد کے بیچ ہووے مُدام　　نہ اُس کو جہاں بیچ ہے اور کام

دُولہ اور سجن پہلی بار مل کر بچھڑتے ہیں۔ دونوں کے جذبات کا عالم یہ ہے:

اِدھر شاہزادی یہ افسوس تھا　　اُدھر شہ سجن عشق مدہوش تھا
اِدھر ہے قیامت اُدھر زلزلہ　　اِدھر عشق شمرن اُدھر ولولہ

اِدھر شاہ غمگین اُدھر وہ اسیر　　اِدھر آہ و ماتم اُدھر بحر نیر
اِدھر بحرِ ہجراں اُدھر آہ آہ　　اِدھر ہائے دُولہ اُدھر شاہ شاہ

سجن ایک خوبصورت مُغنیہ اور رقاصہ کے رُوپ میں برات کے ساتھ دُولہ کے محل میں ہے۔ دُولہ کا باپ خواہش ظاہر کرتا ہے کہ ایک مُجرا ہو جائے، سجن جواب میں اپنے فن کا اظہار کرتا ہے۔

کہا شاہ نے اب تو مجرا کرو　　ترقی خوشی کی زیادہ دھرو
سجن بیچ مجلس کے گانے لگی　　دلِ عاشقاں کو رِجھانے لگی
بنا ایک نرغی تنبوروں کی بان　　گویا کہ نکالی ہے مجلس کی جان
تھِرکنے لگی ناچ میں وہ پری　　الیس کی دوانی وہ مجلس کری
نہ ایسا دیکھا ناچ رنگ راگ کو　　کہ دامانِ مجلس رہے چاک ہو

دُولہ اور سجن کی شادی کے وقت انعام و اکرام کرنے، خوشی منانے اور رسم نکاح ادا کرنے کی ایک جھلک ملاحظہ ہو:

ہوا جب تجمّل یہ ہر دو طرف　　بہت خرچ پیسہ کیا باشرف
تمامی شہر کی جو دعوت کیا　　فقیروں کو زر نقد بے حد دیا
مشائخ کو انعام دے بے بہا　　فقیروں کو خلعت امیروں کو جاہ
پیادوں کو گھوڑے بحسب انفراد　　کیا ہر طرح سب کتیں شاد شاد
اوّل شہر کے شہ کی بیٹی کے ساتھ　　نکاح خواں پڑھایا نکاح کر نجات
بعد شاہ تبریز کی دختری　　پروئی ہے موتی کی بہتر لڑی
ہوئی بعد خوشحالیاں بے شمار　　پلائے ہیں شربت دیئے پان یار
ملے شاہ تبریز اور شاہ شام　　لگے سے عزیز و مجب خوش خرام
مبارک مبارک ہوئی تب پکار　　کھُلے صبر سے تب خوشی کے کواڑ
بجز صبر کے یہ نہ ہووے نمود　　رکھے کھیل ایسے وہ ربّ الوُدود

اس طرح گو کہ کہانی کی پوری فضا حسن و عشق کی ظاہری علامتوں کو خوش اسلوبی کے ساتھ جوڑ کر تیار کی گئی ہے لیکن شاعر صوفی نژاد ہے۔ اس لئے اُس کا پیغام ایک اور صرف ایک ہے اور وہ یہ ہے:

اے دل پیا کی تجسّس کرو　　یہ عشقِ مجازی سے ہردم ڈرو
کہ عشقِ حقیقی میں پاؤ ثواب　　مجازی کے اندر تو کھینچو عذاب

یہ مثنوی شائع نہیں ہوئی۔ اس کا ایک نسخہ مخطوطہ کی شکل میں بمبئی یونیورسٹی لائبریری میں محفوظ ہے۔ لیکن اس کے بعض اشعار نادرست تحریر ہیں۔ ○

حوالے: بمبئی گزیٹیر سورت اینڈ بھڑوچ جلد ۲، ص ۵۵۔ ۱۵۴، مخزن الشعراء از قاضی نورالدین ص۔ ۳۰۔ ۲۹، ۳۹
حقیقت السورت، از سیخو میاں ص ۶۔ ۵،

غزلیں

پرکاش فکری

کسی کا نقش اندھیرے میں جب اُبھر آیا
اُداس چہرہ شبِ درد کا نکھر آیا

کُھلے کواڑوں کے پیچھے چُھپا تھا سنّاٹا
سفر سے بار مُسافر جب اپنے گھر آیا

وہاں رکا جو کوئی ، حوصلہ گنوا بیٹھا
رہِ تلاش میں ایسا بھی اک نگر آیا

جو از ڈھونڈیں وہ اپنے شکستہ خوابوں کا
میں اُس کی آنکھوں سے ایسے سوال کر آیا

وہ عکس عکس خیالوں کا آئینہ نکلا
مجھے وہ شخص اُجالے میں جب نظر آیا

بلندیوں کی خموشی مجھے بُلاتی ہے
میں بیچ میں نشیبوں کے جب اُتر آیا

اُکھڑتی سانسوں میں کیا کیا بتاؤں میں فکری
یہی کہہ لو کہ قصہ تمام کر آیا

ڈورنڈی ۔ قاضی محلہ ۔ رانچی ۲

اشہر مرادآبادی

اُبھرتے چاند کی مانند ہر نظر میں تھا
میں نقشِ پا کی طرح اُس کی رہگذر میں تھا

نفس نفس میں بسا تھا نظر نظر میں تھا
وہ کون تھا جو مرے ساتھ ہر سفر میں تھا

میں اپنے جسم سے بچھڑا تو یہ ہوا احساس
اک اجنبی کی طرح کب سے اپنے گھر میں تھا

نگاہ تم نے اُٹھائی بھی احتیاط کے ساتھ
اس احتیاط کا چرچا بھی شہر بھر میں تھا

ہزار قُربتِ قلب و نظر کا حاصل تھا
وہ فاصلہ جو جبیں اور سنگِ در میں تھا

مری نزاکتِ احساس میری قاتل ہے
میں آئینہ تھا مگر پتھروں کے گھر میں تھا

کسی کے جاتے ہی میں ہو گیا تہی دامن
ابھی ابھی تو زمانہ مرے اثر میں تھا

وہ اک نظر ہی سہی سب نے اُس کو دیکھا تو
کہ مدتوں سے زمانہ اگر مگر میں تھا

معرفت سلیم مرادآبادی ۔ بھٹی اسٹریٹ ، مرادآباد (یوپی)

صلاح الدین نیّر

جدھر بھی جائیے اک مستقل اُداسی ہے
ہر ایک شخص کے چہرے پہ بدحواسی ہے

نظر ملا کے کہاں تم نے ساتھ چھوڑ دیا
وہ بیقرار نگہ آج تک بھی پیاسی ہے

چلے جو دیر و حرم سے تو میکدہ پہنچے
مگر یہاں بھی وہی ظلمت شناسی ہے

وفا کا خون ہوئے غالباً زمانہ ہوا
حدیثِ گردشِ دوراں خفا خفا سی ہے

رفیقِ دل کی طرح کون ساتھ دیتا ہے
لبوں پہ سکے تو اظہارِ غم شناسی ہے

نگاہِ دوست میں اک ہم ہی اجنبی ٹھہرے
اگرچہ شہر میں ہر شکل آشنا سی ہے

وفا پرست مزاجوں کو کیا ہوا نیّر
زمینِ کوچۂ دلدار کب سے پیاسی ہے

۲۴۴-۶-۲۰ ۔ بازار روپ لال
حیدرآباد ۲

کہانی

رنگوں کے منادر کا عاشق

انور قمر

۱۴/۱ اے مہرآباد، ہل روڈ، باندرہ - بمبئی - ۵۰

اب میری زندگی کے دن تھوڑے رہ گئے ہیں۔ میری تمام دلچسپیاں ختم ہو چکی ہیں۔ میں جلد از جلد لندن چلا جانا چاہتا ہوں تاکہ وہاں کی مٹی وہیں پہنچا دوں۔ اگر یہ ادھر منتشر ہو گئی تو میری رُوح کو تا ابد قرار نہیں ملے گا۔" ٹیبل پر رکھی موم بتی کی روشنی میں اُس کا چہرہ بہت پیلا اور مُرجھایا ہوا سا لگ رہا تھا۔ اور اُس کی آنکھوں سے بے پناہ غم جھانک رہا تھا۔

بَیرے ویٹر سُوپ کا بڑا پیالہ ہمارے درمیان میں رکھ کر جا چکا تو ہم نے اپنے پیالے میں سُوپ لیا اور اُس کے پیالے میں ابھی میں تھوڑا سا سُوپ بھی نہ ڈال پایا تھا کہ وہ بولا

"بس"

اُس نے دو ایک چمچے سُوپ پینے کے بعد اپنے آگے سے پیالا سرکا دیا۔ اُس کے چہرے پر ایسے کوئی آثار نہیں تھے کہ جن سے سُوپ کی بدمزگی کا اظہار ہوتا۔ برخلاف اِس اِمکان کے سُوپ بڑا ذائقہ دار تھا۔ دراصل وہ جس غم و اندوہ کا شکار تھا' اُس کے تئیں وہ کسی چیز کا مزہ نہیں لے سکتا تھا۔

"شاید تمہیں یہ چکن نوڈل سُوپ پسند نہیں آیا۔"

"ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ یہ رنگون کا سب سے پُرانا اور سب سے اچھا چائنیز ریستوران ہے"

"پھر؟"

"بس جی نہیں چاہتا۔ اُس نے اُکتا کر کہا۔

"جو ہونا تھا وہ ہو چکا۔ اب دل برداشتہ ہونے سے کیا فائدہ؟"

میری زبان سے یہ جملہ سُن کر وہ مجھے یوں دیکھنے لگا کہ گویا ایسا رسمی جملہ سُننے کی اُسے مجھ سے توقع نہ تھی۔

"مجھے تسلّی دینے کی ضرورت نہیں۔ میں نے تم سے کم از کم بیس سال زیادہ اِس دنیا کے شب و روز کا تماشہ دیکھا ہے۔"

لوگوں کی پگھلتوں میں دھنسی آنکھوں میں غم اب ویسے کا خود پینے نظر آ رہا تھا۔ اور چہرے کی زردی سُرخی میں بدلتی ہوئی معلوم ہو رہی تھی۔

وہ آہستہ سے بولا

"تمہارے ساتھ ساتھ یہاں سے سیکڑوں برمی واقف کاروں نے مجھے اسی انداز میں یا اس سے بہتر پیرایہ میں تسلّی دینے کی کوشش کی ہے لیکن میں اُنھیں دو ٹوک جواب دیتا رہا ہوں، کہ وہ اپنا کام کریں۔ میری فکر ہرگز نہ کریں۔"

اُس نے بعد دس پندرہ منٹ تک میں خاموشی سے کھانا کھاتا رہا اور وہ صوفے سے پُشت ٹکائے چپ چاپ بیٹھا رہا۔ پھر میں نے محسوس کیا کہ اُس کے چہرے پر سے ناخوش گواری کے آثار لمحہ بہ لمحہ رخصت ہو رہے ہیں غم پھر سے اس کی شخصیت کی سخت زمین کو چیرتا سطح پر نمودار ہو رہا ہے۔

اُس وقت واقعی اُس کے ذہن میں اُن برمی عورتوں کے مادرانہ شفقت سے پُر جملے گونج رہے تھے جو اپنی پیٹھ پر بندھے بچوں کا بوجھ اُٹھائے راہ میں اُس سے ملی تھیں۔ اِسی طرح اُسے اُن بوڑھے برمی لوگوں کی ہدایت یاد آ رہی تھی کہ جن کے چہروں پر زمانہ پیڑ کے تنے پر ہر سال پڑنے والے دائرے کی طرح جھریاں چھوڑ جاتا ہے۔ اُنھوں نے اُس کی پیٹھ تھپتھپا کر اپنی مُوندی ہوئی آنکھوں سے اُسے بُدھ کا پیغام سُنایا تھا "غم نہ کر۔ غم اُس بیماری کی طرح ہے کہ جو کوڑھ کی صورت میں جسم پر نمودار ہوتی ہے اور آہستہ آہستہ پُورے جسم کو چاٹ جاتی ہے۔" کچھ ہی دیر بعد اُس کے چہرے پر سے تمام سختی زائل ہو گئی اور گُداز گی نے اُس کی جگہ لے لی۔ پھر اُس کا چہرہ [illegible] کے چہرے کی طرح پُر سکون ہو گیا۔

"پوچھو کیا پوچھنا چاہتے ہو؟"

میں اِس لمحہ کا تو بڑی دیر سے منتظر تھا اور تقریباً ایک گھنٹہ سے اُسے اثر دور سینے پر آمادہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ لیکن وہ پیکرِ خاموشی بنا بیٹھا تھا یا مجھ سے اپنا پنڈ چھڑانے کی کوشش کر رہا تھا چکن چاؤ چاؤ کا بڑا سا لقمہ لے کر میں نے اپنی پلیٹ خالی کر دی اور شارٹ ہینڈ

کی ایک جیب سے نکال کر بال پین کا سر انگوٹھے سے دبایا۔ اُس کا شکریہ ادا کر کے میں نے پہلا سوال اُس سے پُوچھا۔

"تمہیں رنگون آئے ہوئے کتنے دن ہوئے؟"

وہ موم بتی کی لَو پر نظر گاڑے ہوئے کہنے لگا۔

"سنہ چھیالیس کی بات ہے۔ وہ سردیوں کا موسم تھا اور سردی نقطۂ انجماد سے دو ڈگری زیادہ پڑ رہی تھی۔ ہر صبح خبر آتی تھی کہ جاپان برما کی راہ ہندوستان پر حملہ کرے گا۔ میں ایک بریگیڈ فوج کے ساتھ برما کی سرحد پر واقع ساگوان اور ٹیک کے جنگلوں میں جاپانی فوج کا انتظار کر رہا تھا۔ فوج میں میرا کمیشن بحیثیت لیفٹیننٹ کرنل ہوا تھا لیکن میں اپنے سینیر افسروں کی موت اور اپنی بہتر کارکردگی کے نتیجہ میں میجر لیفٹیننٹ کرنل اور پھر بریگیڈیر بن چکا تھا۔ میرا مزاج نہ تو فوجی تھا اور نہ مجھے جنرل بننے کا شوق ہی تھا۔ میں دراصل بڑی کم عمر ہی میں فلسفیانہ باتیں سوچنے لگا تھا۔ جیسے حقیقت کیا ہے؟ ہمارا وجود کیا معنی رکھتا ہے؟ کائنات کے رموز و اسرار کیا ہیں؟ مجھے چاہئے تو یہی تھا کہ میں فلسفہ کی تعلیم حاصل کرتا لیکن میرے والد جو کہ خود فرانسیسی فوج میں میجر جنرل رہ چکے تھے اور نپولین کے ہمراہ روس میں پیش قدمی کر چکے تھے، مُصر ہوئے کہ میں فوجی تعلیم ہی حاصل کروں۔ اُن دنوں یورپ میں فوجیوں کو جو عزت و توقیر نصیب تھی' وہ بڑے بڑے عالموں کے برابر تھی۔ ساتھ ہی والد صاحب کے تمغے' اُن کی ملٹری یونی فارم میں کھینچی' دیواروں پر ٹنگی تصویریں دیکھ کر میں ہمیشہ تذبذب میں پڑ جاتا تھا۔ اسی وجہ سے میں صحیح فیصلہ نہ کر پایا کہ آیا مجھے فلسفہ سے زیادہ شغف ہے یا فوجی تعلیم سے!'

یہ کہتے کہتے وہ رُک گیا۔ اُس کی سانس زور زور سے چلنے لگی۔ شاید اُسے اُس بھیانک غلطی کا شدید احساس ہونے لگا تھا۔ اُس نے اپنی جیب سے کاغذ میں لپٹی کوئی دوا کی ٹکیہ نکالی اور دو اُنگلیوں میں تھام کر اُسے حلق میں رکھا اور پانی کا گلاس ٹیبل پر سے اُٹھا کر منہ سے لگا لیا۔ گولی شاید تلخ تھی۔ سر جھٹک کر اُس نے بُرا سا مُنہ بنایا اور پھر ٹیبل پر اپنی دونوں کہنیاں ٹیک کر صوفہ پر سیدھا بیٹھ گیا۔ اُس کا قد جو کافی لانبا تھا' اس طرح بیٹھنے پر نمایاں ہو گیا۔ چونکہ وہ روشنی سے قریب آ چکا تھا اس لئے مجھے اُس کی بھُورے رنگ کی گھنی مونچھوں میں چمکتے پانی کے قطرے بخوبی نظر آنے لگے۔

"تم نسلی اعتبار سے انگریز ہو۔ تمہیں انگلینڈ ہی میں اپنی زندگی بتانی چاہئے تھی، لیکن ایک بوڑھے برمی جرنلسٹ کی زبانی مجھے معلوم ہوا کہ تم جنگ کے بعد اب تک انگلینڈ گئے ہی نہیں۔ آخر کیا بات ہے؟"

ریستوران میں بیٹھے بیٹھے شاید وہ اُکتا چکا تھا بولا

"آؤ چلو میرے ساتھ۔ اپنی زندگی کا یہ راز بھی تمہیں بتا دوں"۔

شاعر۔ بمبئی

بل چکا کر اُس نیم تاریک ریستوران سے جوں ہی ہم نے قدم باہر نکالا' راستے اور بازار کا شور ہمارے کانوں سے ٹکرانے لگا۔ ایک گُذرتے ہوئے رکشا کو رُکنے کا اشارہ کر کے وہ اُس پر سوار ہو گیا اور دوسرے میں جو کہ پاس ہی سواری کا انتظار کر رہا تھا' اُس میں مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ گھٹنوں سے اُوپر اُٹھی ہوئی لُنگی اور ننگے بدن برمی جوان تیزی سے رکشا کھینچنے لگے۔ اور آڑی ترچھی' ٹیڑھی ٹیڑھی گلیوں اور سڑکوں سے گُذرتے تھے۔ ان گلیوں اور سڑکوں پر دو رویہ دکانیں تھیں جن میں مختلف اشیا برائے فروخت تھیں۔ ان دکانوں میں تاریکی سی پھیلی ہوئی تھی اور اُن کے مالک اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھوں سے باہر کا تماشہ دیکھ رہے تھے۔ انھیں دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ وہ بہت قناعت پسند واقع ہوئے ہیں۔ اور اُن کا معیارِ زندگی بھی اُونچا نہیں ہے۔ دس پانچ رُوپے کی یومیہ آمدنی سے اُن کی گُذر بخوبی ہو جاتی ہوگی۔

آخر ہلینگ ندی (   ) کے اُوپر بنے بڑے پُل پر سے گُذرتے ہوئے ہم ایک کچّے راستے پر آ گئے۔ حدِّ نظر تک دُھول اور مٹّی میں اَٹا ہوا میدان تھا اور اُس میدان میں تھے ٹُوٹے پھُوٹے مندروں کے کھنڈرات۔ ایسا لگتا تھا کہ بڑے بڑے ٹینکوں نے گولہ باری کر کے اُن مندروں کو تباہ و برباد کر دیا ہے۔

اُس کا رکشہ رُکا۔ وہ اُترا۔ اُس نے رکشہ والے کو ایک طرف رُکنے کا اشارہ کیا۔ میں بھی اپنے رکشہ سے اُتر پڑا۔ دن کے دو بج رہے تھے۔ مئی کا سُورج آگ برسا رہا تھا۔ ہم دونوں پسینے میں شرابور ہو چکے تھے۔ سُورج کی کرنیں کانچ کی کرچیوں کی طرح آنکھوں میں چُبھ رہی تھیں۔

'آؤ' وہ بولا۔ اور میں اُس کے پیچھے ہو لیا۔

"یہ آثار دیکھ رہے ہو؟'

تقریباً پانچ ایکڑ کے علاقہ میں بکھرے ہوئے کھنڈرات میری نظر کے سامنے تھے۔

'ہاں'

'جانتے ہو یہ کیا تھے؟'

'اندازہ ہوتا ہے کہ یہ بُدھ کے منادر تھے'

'یہ بُدھ کے مندر تھے۔ جو سو سال قبل مسیح سے سولھویں صدی عیسوی تک بنتے رہے تھے۔ یہ تمام علاقہ صرف اسی غرض سے خالی چھوڑ دیا گیا تھا

ہم آگے بڑھے۔

'جانتے ہو بُدھ مت کا سب سے اعلیٰ رکن کیا ہے؟'

'نہیں'۔

'تو سنو'۔ اُس نے مجھے ذہن نشین کرانے کے انداز میں آہستہ سے کہا

'اپنی آتما کو اگلے جنم کے لئے پوتر کرنا۔ پھر بُدھ کے مندر بنانا۔ راہ گیروں کے لئے سرائے تعمیر کرنا۔ اُن کے قیام و طعام کا انتظام کرنا۔

اتنا کہہ کر وہ رُک گیا۔ اور اپنی جیب سے رُومال نکال کر اپنی پیشانی کا پسینہ پونچھتا ہوا بولا۔

'جانتے ہو' یہاں کتنے مندر تھے؟

'نہیں'

'تقریباً دو ہزار'

'دو ہزار ـــــ' میں نے حیرت سے دُہرایا۔

'ہاں' دو ہزار۔ اور وہ تمام اُس سائیکلون (CYCLONE) کا شکار ہو گئے۔ وہ تمام مندر اُس طوفانِ باد و باراں میں منہدم ہو گئے۔"

یہ کہتے کہتے اُس کا گلا رُندھ گیا۔ اور اُس ویرانے میں سائیں سائیں کرتی ہوا اس واقعہ پر ماتم کرنے لگی۔

کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد میں نے اُس سے پُوچھا "آخر تم یہاں کیا کرتے تھے؟

میرا سوال سُن کر وہ بڑی دیر تک خاموشی سے اُن کھنڈرات کو تکتا رہا۔ پھر بولا میں صبح سویرے یہاں آجایا کرتا تھا۔ اُس وقت یہ مندر بچپن میں سُنی ہوئی کہانیوں کی طرح پُراسرار لگتے تھے۔ اُن پر سُورج کی کرنیں جب پڑتیں تو ہر زاویے سے اُن مندروں کے خالقوں کا راز مجھ پر آشکارا ہونے لگتا۔ میں جُوں جُوں اُن کے قریب ہوتا جاتا یہ ویسے ویسے میرے دل میں سماتے جاتے۔ پھر مجھ پر ہم کلامی کی سی کیفیت طاری ہو جاتی۔ میں اپنا آپ کھو کر کوئی اور رُوپ اختیار کر لیتا۔ تم کوئی کہانی سناؤ۔ میں اُن سے کہتا۔ وہ مجھ سے کہتے تم ہی سناؤ۔ میں کہانی سُنانے لگتا۔ آج سے ایک ہزار سال پہلے کا ذکر ہے کہ جب یہ دنیا گھوارے میں جُھول رہی تھی۔ اس دھرتی پر سُوکھا پڑ گیا۔ لوگ بھوکوں مرنے لگے۔ جانور نڈھال ہو ہو کر گرنے لگے۔ گرمی نے اور شدت اختیار کر لی۔ پانی بھاپ بن بن کر غائب ہو گیا۔ کہ ایک دن ایک دانا اور گیانی نے بھوک اور پیاس سے مرتے لوگوں کو تاکید کی۔ "کوشش کرو اور پاؤ" تمام لوگ ایک جگہ جمع ہو گئے۔ اور کُدالیں لے کر کانٹوں سے لدی اور چٹانوں سے بھری زمین کھودنے لگے۔ صبح سے شام تک اور شام سے صبح تک کھودتے کھودتے زمین کے سینے سے ماں کے دُودھ کی طرح ستا پھوٹ پڑا۔ اُس پانی سے اُنھوں نے اپنی زمین سیراب کی اور خوب اناج پیدا کیا۔'

شاعر۔ بمبئی

"اسی طرح ایک بُوڑھے کی کہانی ہے کہ وہ پہاڑ کاٹ رہا تھا۔ گاؤں والے اُس سے کہنے لگے۔ "اے بُوڑھے کیا تو پاگل ہو گیا ہے۔ تیری عمر کیا ہے تیری قوت کیا؟ یہ پہاڑ کہیں تجھ سے کٹنے والا ہے؟' بُوڑھے نے اُنھیں جواب دیا پہلے میں اِس پہاڑ کا کچھ حصّہ کاٹوں گا۔ پھر میرا بیٹا یہ کام سنبھال لے گا۔ اُس کے بعد اُس کا بیٹا۔ غرض کہ یہ سلسلہ چلتا ہی رہے گا۔ اور ایک دن یہ پہاڑ ریزہ ریزہ ہو کر ہمارے قدموں میں آ رہے گا۔

تیسری کہانی بھی سُن لو۔ ایک شہر کے وسط میں ایک کنواں تھا جس کا پانی بہت ٹھنڈا اور موتی کی طرح شفاف تھا۔ شہر کے تمام لوگ بلکہ بادشاہ اور اس کے درباری بھی اُسی کنوئیں سے پانی پیتے تھے کیونکہ اس کے سوا شہر میں اور کوئی کنواں نہیں تھا۔ ایک رات جب تمام لوگ محوِ خواب تھے ایک چڑیل شہر میں داخل ہوئی اور ایک عجیب سی دوائی کے سات قطرے کنوئیں میں ڈال دئیے اور کہا ـــ "اب جو شخص یہ پانی پئے گا وہ دیوانہ ہو جائے گا"۔

دوسرے دن بادشاہ اور اُس کے وزیروں کے سوا شہر کے تمام ساکنوں نے کنوئیں کا پانی پیا۔ چڑیل کی پیش گوئی درست ثابت ہوئی۔ وہ تمام لوگ پاگل ہو گئے۔ اُس دن شہر کے تمام گلی کوچوں اور بازاروں میں لوگ ایک دوسرے کے کان میں یہی کہتے رہے کہ ہمارے بادشاہ اور وزیر کی عقل ماری گئی ہے۔ اب ہم اس پاگل بادشاہ کی حکومت برداشت نہیں کر سکتے۔ ہم اُسے علیحدہ کر دیں گے۔

ایک کہانی یہ بھی تھی کہ ایک بادشاہ نے اپنے باغ میں دو پنجرے رکھے تھے۔ ایک میں وہ شیر قید تھا جسے اُس بادشاہ کے غلام افریقہ کے جنگل سے پکڑ کر لائے تھے۔ دوسرے پنجرے میں ایک چڑیا بند تھی جو گانے اور چہکنے سے معذور تھی۔ لیکن ہر روز صبح چڑیا شیر سے کہتی۔

"بھائی قیدی' صبح بخیر!!"

یہ سُن کر شیر اپنا پنجہ اُٹھاتا تھا اور اُس میں اپنے ناخن تلاش کرنے لگتا تھا۔

اِسی طرح ہر مندر مجھے کوئی نہ کوئی کہانی ضرور سُناتا۔ کوئی جنگ کی کوئی امن کی۔ کوئی دُکھ کی' کوئی سُکھ کی۔ کوئی مایا کی' کوئی دھرم کی۔ کوئی بھلائی کی کوئی بُرائی کی۔ اور میں اِن تمام کہانیوں میں اپنا کھویا ہوا وجود تلاش کرتا۔ دراصل جنگ کے بادلوں میں گھِر کر میں تباہ و برباد ہو چکا تھا۔ اُس جنگ میں میں نے اتنی تباہی دیکھی تھی کہ جتنی قدرت نے کبھی اپنے زلزلوں' سیلابوں اور طوفانوں سے اس دنیا میں نہیں پھیلائی ہو گی۔ اپنی اِسی غلطی کا خمیازہ اُٹھانے کی خاطر میں نے دنیا سے ناتا توڑ لیا تھا۔ اور ان مندروں میں بھٹکتے رہنے ہی کو اپنا مقصد سمجھ لیا تھا۔"

یہ کہہ کر وہ آگے چل دیا اور اُن کھنڈروں میں چکر کاٹنے لگا۔ میں اُسکے

بیٹھے چلتے چلتے تھک گیا۔ اور آخرکار ایک بڑی سی چٹان پر جا بیٹھا۔ میری قمیص پسینے میں تر تھی۔ کوٹ نکال کر میں نے کاندھے پر ڈال لیا۔

بڑی دیر بعد وہ لوٹا۔

"میں نے ہر منظر کو الوداع کہہ دی ہے۔ اب میں یہاں کبھی نہیں آؤں گا۔"

— × — × — × —

ہم رکشہ میں بیٹھ کر شہر واپس ہوئے۔ شہر کے چوراہے کے ایک جانب ہم نے رکشہ رکوائی۔ میں نے کرایہ ادا کیا۔ اُس کے بعد اُس سے مخاطب ہوا

اب کیا پروگرام ہے تمہارا؟'

"بس یہی کہ لندن چلا جاؤں گا۔"

'لندن ——؟ وہاں کون ہے؟'

"جاکر پتا کروں گا۔ ان تیس سالوں میں پتا نہیں کون کون سے انقلاب آئے ہوں گے وہاں۔ ویسے نہ وہاں گھر بسایا تھا میں نے نہ یہاں!"

'آخر تم وہاں جاکر کیا کروگے؟'

'جو یہاں کیا کرتا تھا۔'

'کیا کرتے تھے یہاں تم۔؟'

"سڑکوں کی صفائی۔"

"کیا؟ میں نے چیخ کر پوچھا

'ہاں منہ اندھیرے میں ان سڑکوں پر جھاڑو پھیرا کرتا تھا اور ان محلے والوں سے ایک روٹی صبح اور ایک روٹی شام کو پاتا تھا۔

یہ سنتے ہی مجھے اپنے اندر کچھ ٹوٹتا سا محسوس ہوا۔

اُس نے مجھ سے ہاتھ ملایا' پھر ملیں گے۔

'پھر ملیں گے۔' میں نے بھرّائی ہوئی آواز میں کہا۔

پھر وہ مشرق کی سمت اور میں مغرب کی طرف چل پڑا۔ اُس سڑک پر ہر ہر قدم رکھتے ہوئے مجھے اپنے آپ سے نفرت ہو رہی تھی۔ نفرت' سخت نفرت۔ کیونکہ وہ چاندنی کی طرح صاف اور مسجد کے صحن کی طرح پاک تھی اور اُسے اُس شخص نے صاف کیا تھا کہ جو بُدھ کا پیرو تھا اُس کے مُنادر کا عاشق تھا' اہنسا کا پجاری تھا' فلسفی تھا' برگزیدہ تھا اور اپنا پیٹ کاٹتا تھا اور فاقہ بھی کرتا تھا' اور مُنہ اندھیرے سڑکوں کی صفائی کرتا تھا —— اِس لئے اُس سڑک پر ہر ہر قدم رکھتے ہوئے مجھے اپنے آپ سے نفرت ہو رہی تھی' نفرت' سخت نفرت' ○○

رحمٰن جامی

فسطاطؔ

وہ نیل کی سرزمینِ شاداب
جس کی ریگِ رواں میں
اک قافلے کا سالار
خیمہ زن جب ہوا تو
اُس کی ہواؤں نے ایسا سحر پھونکا
کہ اس میں آباد ہر نفس کو خیال آیا
قیامِ تسکینِ عارضی کو دوام بخشے۔
مگر ہوا اِذنِ کوچ جس دم
تو دل ہواؤں کا رو رہا تھا۔
غموں سے دامن بھگو رہا تھا۔

سکوتِ ساحل پہ رکنے والوں کے
دل کو لیکن قرار کب تھا
مسافرانِ جہاد ساماں کو
نفس پہ اپنے جبر کرنے میں عار کب تھا

ہوا جو اذنِ سفر تو
آگے کی سمت بڑھنے کو
سارے خیمے اکھڑ چکے تھے
مگر وہ خیمہ کہ جس میں اپنا
کسی کبوتر نے آشیانہ بنا لیا تھا
اور اس میں انڈے بھی دے دیئے تھے
تو اس کو سالارِ قافلہ نے
حیات افزا مقام کہہ کر
اُس ایک خیمے کو چھوڑ دینے کا حکم دے کر رواں ہوا تھا

وہ کاروانِ جہاد ساماں
تمام تر اپنی کامرانی کے ساتھ لوٹا
تو اُس نے دیکھا
وہ خیمہ ہائے حیات افزا
ہنوز اپنے مقام پر اپنی استقامت کے ساتھ ہی
اک "حیاتِ تازہ" کا اُسکو پیغام دے رہا تھا۔
(عجیب منظر تھا دلکشی کا)
تو اس پہ سالارِ قافلہ نے یہ حکم بخشا
کہ جس کا جی چاہے اپنی بستی یہاں بسالے
مسافرانِ جہاد ساماں نے اپنی آبادیاں بسا کر
قیامِ فسطاطِ عارضی کو دوام بخشا
مجاہدانِ حیات ساماں نے اسکو "فسطاط" نام بخشا
جو آج بھی اپنی زندگی کا پیام دنیا کو دے رہا ہے،

ؔ مصر کا ایک خوبصورت تاریخی شہر
جس کے معنے ہیں "خیمہ"

○ ۱۲-۲-۸۳۰/K/۱، پل کالونی، مراد نگر۔ حیدر آباد-۲۸

امجد حیدرآبادی اور رباعی کا فن

عزیز قیسی

فلیٹ نمبر ۵ - مون کرافٹ اپارٹمنٹ، آف کارٹر روڈ۔ باندرہ - بمبئی ۵ -

سید احمد حسین امجد حیدرآبادی' حیدرآباد کے اُن شاعروں میں سے تھے' جن کی شہرت حیدرآباد کے باہر بھی ہوئی۔ اگرچہ وہ خود نام و نمود کی خواہش سے بے نیاز رہے۔ تشہیر اور ناموری کے لئے جو کوشش دوسرے شاعروں کے لئے جائز ہوتی ہے' وہ اُس سے زندگی بھر دُور رہے۔ اس لئے جس شہرت کے وہ حقدار تھے اُنھیں نہ مل سکی۔

امجد حیدرآبادی درویش صفت آدمی تھے۔ اُن کی وضع سادہ تھی اور ظاہری شخصیت فقیرانہ موٹے سُوتی کپڑوں میں وہ ہمیشہ مگن رہے۔

اُس زمانے میں جب وہ جوان ہو رہے تھے حیدرآباد ہندوستان کی دوسری ریاستوں میں سب سے ممتاز ریاست تھی جہاں باہر کے اہلِ کمال کھنچ کھنچ کر پہونچتے تھے' دربارِ آصفیہ کی عنایتوں سے فائدہ اُٹھاتے تھے اور آفتاب و مہتاب بن کر چمکتے تھے۔ اُس وقت امیر مینائی اور داغ دہلوی کے شاگردوں' خوشہ چینوں' حواریوں اور حریفوں کی آوازیں حیدرآباد میں گونج رہی تھیں۔ زبان کے چونچلے' معاملہ بندی' روزمرّہ اور محاورے کی بندش پر واہ واہ کا غُل مچتا تھا مگر امجد مرحوم کا مزاج اُن سب سے یکسر مختلف تھا۔

اُن کا سلسلہ اُن شاعروں سے ملتا ہے جو شاعری کو اخلاقیات کی تعلیم' انسانی اور رُوحانی قدروں کی تبلیغ کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ جن کے لئے شاعری عبادت تھی۔ اسے وہ فرضِ مذہبی سمجھتے تھے کہ عام آدمی کے رُوح و دل کی تہذیب اپنے شعر کے ذریعہ کریں۔ اِس طرح اُن کا سلسلہ ہندوستان کے سنت شاعروں سے مل جاتا ہے۔ اُن کی آواز کبیر' تلسی' تکارام اور نظیر اکبرآبادی کی آواز سے ہم آہنگ ہے۔ اُن کی زندگی کے معمولات بھی اُن درویشوں جیسے تھے۔ پیری مُریدی کا شغل بھی تھا تو دولت یا جھوٹی عزت کے لئے نہیں تھا بلکہ دل اور رُوح کی تسکین کے لئے تھا۔

پہلے وہ معلّم کی حیثیت سے دارالعلوم ہائی اسکول میں ملازم رہے' پھر حیدرآباد کے محکمۂ صدر محاسبی میں مُنتظم مامور ہوئے اور وہیں سے وظیفہ پر سبکدوش ہوگئے۔

۱۹۰۸ء حیدرآباد کے لئے بہت منحوس سال تھا۔ حیدرآباد اُس سال ستمبر میں موسیٰ ندی کی قیامت خیز طغیانی کا شکار ہوا۔ اُس وقت امجد جوان تھے' شادی شدہ تھے اور ایک بچّی کے باپ تھے۔ اِس طغیانی نے اُن کا سب کچھ چھین لیا۔ ماں' بیوی اور بچّی گھر کے سامان سمیت ڈوب گئے۔ رباعیات کا ایک مجموعہ بھی اِس سیلاب کا لقمہ بن گیا۔ اِس حادثے پر اُن کی ایک نظم مسدس کی شکل میں اُن کی کتاب "ریاضِ امجد" میں شامل ہے۔ یہ نظم بے حد پُر اثر ہے اور حیدرآباد میں بے حد مقبول بھی۔

امجد کی غزلیں سماع اور قوّالی کی محفلوں میں' طوائفوں کے کوٹھوں پر اور فقیروں کی زبانوں پر تھیں۔ اُن کی وہ غزل جس کا مطلع ہے۔

کس بات کی کمی ہے مولا تری گلی میں
دنیا تری گلی میں عقبیٰ تری گلی میں

صرف حیدرآباد کی گلیوں میں نہیں گونجی' بلکہ ہندوستان کے دوسرے شہروں میں بھی اِس کی بازگشت سُنائی دیتی ہے۔ اُن کی ایک دوسری غزل جس کے دو شعر یہ ہیں۔

یوں تو کیا کیا نظر نہیں آتا
کوئی تم سا نظر نہیں آتا
جھولیاں سب کی بھرتی جاتی ہیں
دینے والا نظر نہیں آتا

قوّالی کی محفلوں میں اب بھی دُھوم مچاتی ہے لیکن اُن کا اصلی ہُنر ہے رباعی۔

رباعی چار مصرعوں کی چوٹ ہے۔ رباعی کا چوتھا مصرع نشتر ہونا چاہئے' یہی مصرع شاعر کا بھرم کھولتا ہے۔ امجد کی ہر رباعی کا چوتھا مصرع نشتر ہے وہ چوتھے مصرع کے لئے بڑا اہتمام کرتے تھے اور اس میں بےساختگی پیدا کر دیتے تھے۔

ایک رباعی ملاحظہ ہو—

کیفیتِ رُوحِ پاک معلوم نہیں
حالِ دلِ دردناک معلوم نہیں
مجبوری ہے تمام علم کی لاف زنی
خاکی انساں کو خاک معلوم نہیں

کہتے ہیں رباعی شاعر کو اُس وقت کہنا چاہئے جب وہ ذہنی طور پر بالغ ہو جائے یعنی اُس کی عمر چالیس سال سے متجاوز ہو جائے۔ لیکن امجد کے یہاں چالیس سال کی عمر سے پہلے ہی شعری بلوغت پیدا ہو گئی تھی اگرچہ اُن کی رباعیات کا پہلا مجموعہ موسیٰ ندی کی نذر ہو چکا تھا۔ مگر اس طغیانی کے بعد کی اُن کی رباعی یہ بتاتی ہے کہ اُس وقت تک اُن کے شعری مزاج کا ایک سانچہ بن گیا تھا۔ طغیانی کی تباہ کاریوں کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں ؎

سیلاب میں جسم زرد گویا خس تھا
عرفانِ محیطِ غم کس نا کس تھا
اتنے دریا میں بھی نہ ڈوبا امجد
غیرت والے کو ایک چلّو بس تھا

ڈاکٹر فرمان فتحپوری نے اپنی کتاب "اُردو رباعی فنی اور تاریخی ارتقا" میں اُن کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے۔

" امجد اوّل و آخر رباعی گو شاعر ہیں۔ امجد کو رباعی کے فن پر غیر معمولی قدرت حاصل ہے۔ رباعی کو امجد نے ایسے اپنایا ہے گویا اُن کی طبیعت اور رباعی کے وزن میں خاص مناسبت ہو۔ لوگ رباعی کے وزن سے گھبراتے ہیں اور امجد ہیں کہ رباعی کے وزن ہی میں کہتے ہیں "

اُردو رباعیات، اُردو شاعری کی طرح فارسی شاعری کے سلسلے کا بڑھاوا ہیں۔ رباعی کے قابلِ ذکر شعرا میں انیس، اکبر، حالی، جوش، یگانہ، جگت موہن لال رواں اور فراق وغیرہ۔ اُردو رباعیات میں تین قسم کے مضامین کے دھارے رواں دواں ہیں۔ رندی و سرمستی و عیش کوشی، دوسرا عشقِ حقیقی۔ فنا بقا اور وحدت الوجود تیسرا اخلاقیات اور روحانی تعلیم اور پند و نصائح۔ امجد مرحوم تیسرے سلسلے کے شاعر ہیں۔ رندی و سرمستی کے مضامین تو اُن کے یہاں بالکل نہیں ملتے کیونکہ وہ اس کوچے سے ہمیشہ دور رہے اور مزاج کے اعتبار سے وہ "چھوٹے چھڑائے ہوئے جذبوں" کے شاعر نہیں تھے۔ رباعی کے باقی مضامین جو اُنکے ہاں ملتے ہیں تو اُن کے اپنے ذاتی تجربے، مشاہدے اور احساس کے اظہار کے طور پر) اگرچہ اُن کے "عشقِ حقیقی" سے مجاز کہیں کہیں جھلک آتا ہے جیسے اس رباعی میں ؎

شاعر۔ مجیبی

شمشیرِ محبت پہ گلا رہنے دے
ہاں جان کے ساتھ یہ بلا رہنے دے
امجد شبِ ہجر میں نہ کر آنکھیں بند
وہ آئے گا دروازہ کھُلا رہنے دے

لیکن اُن کی شاعری کا غالب رُجحان ہی پند و نصائح کا ترجمان ہے۔ اس طرح ان کا سلسلہ ابو السعید ابوالخیر نظامی گنجوی اور فریدالدین عطار سے ملتا ہے۔ خیّام اور سرمد سے اُنکو کوئی مناسبت نہیں ہے۔ ۱۹۳۲ء میں اُن کی یہ اخلاقی اور حکیمانہ رباعیات" ہی سید سلیمان ندوی کے پیشِ نظر تھیں۔ جب اُنھوں نے اُنھیں "حکیم الشعراء" کا لقب دیا۔

امجد مرحوم کی رباعیاں حیدرآباد میں موقع کے شعر کے طور پر استعمال ہوتی ہیں مثلاً

نادان ہیں پہلے تو خطا کرتے ہیں
ہٹ کر کے پھر اور بھی بُرا کرتے ہیں
جب تم سے کوئی گناہ ہو تو توبہ کر لو
میلے کپڑے کو دھویا کرتے ہیں

ہر دم اس کی عنایت تازہ ہے
اُس کی رحمت بغیر اندازہ ہے
جتنا ممکن ہے کھٹکھٹاتے جاؤ
یہ دستِ دعا خدا کا دروازہ ہے

ہر چیز مسبّبِ سبب سے مانگو
منّت سے خوشامد سے ادب سے مانگو
کیوں غیر کے آگے ہاتھ پھیلاتے ہو
بندے ہو اگر رب کے تو رب سے مانگو

امجد کی دنیا سے بے نیازی دُنیا چھوڑنے کے لئے نہیں تھی بلکہ اُن کی خودداری اَنا کے سبب سے تھی۔ خدا سے بھی اُن کا معاملہ عجز و تحقیر والا نہیں تھا، حریفانہ تھا۔ وہ انسان کو خدا کی سب سے برگزیدہ تخلیق سمجھتے تھے۔ اُن کی نظر میں اگر خدا سے کوئی ہستی آنکھ ملا سکتی ہے تو وہ انسان ہے۔ کہتے ہیں:

اِس سینے میں کائنات رکھ لی میں نے
کیا ذکرِ صفات، ذات رکھ لی میں نے
ظالم سہی، جاہل سہی، نادان سہی!
سب کچھ سہی، تیری بات رکھ لی میں نے

— دنیا سے "بے تعلقی" اسی خودشناسی کے سبب سے تھی اور یہ "غرور"
صرف شاعری ہی میں نہیں اُن کی زندگی میں بھی تھا۔ اُن کی شہرت اِس عہد کے صاحبانِ علم و اقتدار تک پہنچ چکی تھی۔ اُن کی عزت اور وقار کا جو مرتبہ متعین ہو چکا تھا، وہ زندگی بھر قائم رہا۔ اُن کے چاہنے والوں میں اُس وقت کے حیدرآباد کے بڑے ذی اثر اور معتبر لوگ تھے۔ سر امین جنگ اور مہدی یار جنگ سے لے کر سر اکبر حیدری تک اُن کے گھر آتے تھے۔ لیکن کبھی اُنھوں نے اُس تعلق سے فائدہ نہیں اُٹھایا۔ اپنی جگہ قانع رہے۔

مذہب اور شرع کا پابند ہونے کے باوجود اُن کے مزاج میں مُلائیت نہیں تھی۔ طبیعت میں اہلِ دل کی وسیع المشربی اور دردمندی تھی۔ شاید اسی لئے جوش ملیح آبادی جیسا رند بلانوش اور ارتداد و الحاد کا رسیا اُن کے عقیدت مندوں میں رہا ہے۔

وہ اپنا کلام جب طوائفوں سے سُنتے تو اُن پر وجد و حال کی کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ سنیما دیکھتے تھے تو پُر درد مناظر پر بے اختیار رو پڑتے تھے۔ دوسرے صوفی شعراء کی طرح وہ مذہب، ذات، رنگ اور نسل کے امتیاز کو بے معنی سمجھتے تھے۔ ان کا عقیدہ تھا ؎

انسان ہزار ہیں، مگر قسم ہے ایک
گو حرف کثیر ہیں، مگر اسم ہے ایک
اس عالمِ کثرت کا ہے منشا واحد
اعضا ہیں جُدا جُدا، مگر جسم ہے ایک

جو لوگ مذہب کے نام پر، عقیدوں کے اختلاف کے نام پر، ظاہری رُسوم و آداب کے فرق کے نام پر، انسان انسان کے درمیان تمیز کرتے ہیں اُن کو مخاطب کر کے کہتے ہیں ؎

معصوم کے قلبِ مضمحل کو توڑا
یا منزلِ فیضِ مُستقل کو توڑا
کعبہ ڈھاتا تو پھر بنا بھی لیتے
رونا تو یہ ہے کہ تُو نے دل کو توڑا

کس شان سے شیخ خود نُما بیٹھا ہے
سچ سچ کوئی سمجھے کہ خدا بیٹھا ہے
صورت میں ہے بایزید سیرت میں یزید
چمڑے کے ہرن میں بھیڑیا بیٹھا ہے

وہ عام انسان کے دکھ درد، اُس کے علم اور وجود کے کرب، اُس کی
شاعر بھی

مجبوری و بے کسی کے شاعر تھے۔ اِس لئے اُن کی زبان سادہ تھی تاکہ جو بات دل سے نکلے وہ دل میں اُتر جائے ؎

ہر چیز کا کھونا بھی بڑی دولت ہے
بے فکری سے سونا بھی بڑی دولت ہے
افلاس نے سخت موت آساں کر دی
دولت کا نہ ہونا بھی بڑی دولت ہے

اُن کی تشبیہات بے حد صاف ہیں۔ جیسے ؎

جلتا ہوا ہر ایک نفس آرہ ہے
غم کی شدّت سے سینہ صد پارہ ہے
جلتا ہے تمام جسم اسپند کی طرح
دل ہے کہ دہکتا ہوا انگارہ ہے۔

اُن کے استعارے روزمرہ کے مُشاہدات اور تجربات پر مبنی ہوتے ہیں ؎

قدموں میں گڑی ہوئی ہیں لاکھوں آنکھیں
رستے میں پڑی ہوئی ہیں لاکھوں آنکھیں
پیوند سمجھ رہا ہے تو جنھیں، آکے تو دیکھ
گُدڑی میں جڑی ہوئی ہیں لاکھوں آنکھیں

زبان کا یہی برتاؤ اُن کی غزلوں میں بھی تھا۔ اُن کی غزلیں فقیروں، گویوں اور طوائفوں میں بھی بہت مقبول ہیں۔

آج بھی جب ہم روزِ اوّل کے انسان کی طرح سوچتے ہیں کہ یہ دنیا کیا ہے؟ کیوں ہے؟ کہاں ہے؟ کب سے ہے؟ کب تک رہے گی۔ وجود کیا ہے، موت کیا ہے، انسان کہاں سے آتا ہے، کہاں جاتا ہے ۔۔۔؟؟؟ تو اُن کی یہ غزل ذہن میں گونج اُٹھتی ہے ؎

بہت سوچا سمجھ میں کچھ نہ آیا
مجھے کس نے بنایا کیوں بنایا
عدم میں کس مزے سے سو رہا تھا
مجھے کس نے جگایا، کیوں جگایا
بہت دور ایک کونے میں پڑا تھا
مجھے کس نے بُلایا کیوں بلایا
اِس آنے جانے کا کیا ماحصل ہے
بہت سوچا سمجھ میں کچھ نہ آیا

باقی صفحہ ۲۶ پر دیکھئے

جانشین

محمد طارق کھولا پوری

معرفت محمد شفیق انعامدار۔ قاضی پورہ۔ پوسٹ، کھولا پور (امراؤتی)

وہ کس شہر سے آیا تھا ــــ

کون سے مذہب والا تھا؟ اُس کا نام کیا تھا؟ یہ کوئی نہیں جانتا تھا!!

سب اُسے "باوا" کہتے تھے

شہر کے تمام لوگ اُس کے معتقد تھے۔ اکثریت بھگوان سمجھتی تھی۔ اقلیت خدا کا برگزیدہ بندہ ـــ

وہ ننگا رہتا تھا حالانکہ معتقدین نے اُسے اچھے اچھے قیمتی لباس نذرانے کے طور پر پیش کئے تھے... اکثر اوقات کپڑے پہنائے بھی' لیکن وہ لباس اُتار کر پھینک دیتا تھا۔

اُس کے رہنے کے لئے ایک اچھا سا سیمنٹ کا پکّا مکان تعمیر کیا گیا تھا جس میں وہ رہتا تھا۔

اور لوگوں کا ہجوم اُس کے مسکن کے سامنے جمع رہتا تھا...

کوئی پھولوں کے ہار لے کر آتا۔ کوئی پھل' کوئی مٹھائیاں' جسے اُس کا خادم اُسے کھلاتا تھا... اور باقی اپنے پیٹ کے لئے رات کی تاریکیوں میں لے کر چلا جاتا۔

"وہ" ہمیشہ اُسے دیکھا کرتا تھا ـــ "وہ" جسے ماں کا پیار نہیں ملا تھا۔ اُسکی ماں' جو اُسے پیدا ہوتے ہی نالی میں پھینک کر چلی گئی تھی...

یتیم خانے میں اُسکی پرورش ہوئی تھی ـــ

لیکن بھوک نے اُسے یتیم خانے کی قید سے نکلنے کے لئے مجبور کیا تھا۔

یتیم خانے کی چہار دیواری کو د کر وہ سیدھا اُس باوا کے مسکن کی طرف گیا تھا اور اُس کی نظر باوا کے خدمت گار پر پڑ گئی تھی جو طشت میں "مٹھائیاں' پھل اور رُومال میں دیگر نذرانے باندھ کر اپنے گھر لے جا رہا تھا...

اُس کے پیٹ میں بھوک کی آگ یکبارگی زور سے بھڑکی...

اور جوں ہی وہ مٹھائیوں سے بھرے طشت پر لپکا خدمت گار نے ایک زور کی لات اُس کے پیٹ میں اس طرح ماری کہ وہ زمین پر مُنہ کے بل گر پڑا..... اُسکی آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا ـــ ایک دُھند میں وہ ڈوب گیا۔

ایک بھوک سے نڈھال بدن صبح تک اوندھے مُنہ زمین پر پڑا رہا پھر صبح سُورج کی نرم کرنوں نے جب اُسے چوما تو جیسے اُس کے جسم میں ایک عجیب طرح کی جان سی آگئی۔ ایک تازگی سی اُس کے چہرے پر پھیل گئی۔

وہ اُٹھا اور اُکڑوں بیٹھ گیا گھٹنوں پر ٹھوڑی رکھ کر....

لوگوں کا ہجوم تھا ـــ

عورتیں۔ لڑکیاں۔ جوان مرد۔ بوڑھے۔ کچھ عورتوں کی گودوں میں "ٹائیں۔ ٹائیں" روتے بچّے بچوں کے چہروں کو چھوڑ کر سب کے چہروں کے تاثرات مختلف تھے۔

ہنستے ہوئے چہرے۔ رنجیدہ چہرے' مُسکراتے چہرے' غمگین چہرے' کربناک چہرے۔ دردناک چہرے۔ مسرّت سے دمکتے ہوئے چہرے' رنج و غم سے دُھندلائے ہوئے چہرے۔

پھر اُس کی نگاہیں اُن کے ہاتھوں کی طرف رینگی۔

ہاتھوں میں عرض تھی' غرض تھی' نذرانوں کی شکل میں....

لوگ مسکن میں نذرانوں سے بھرے ہاتھ لے کر جا رہے تھے اور خالی ہاتھ آ رہے تھے۔ رنجیدہ چہرے لے کر جا رہے تھے اور پھر اُن پر اُمید کی کرنیں لے کر لوٹ رہے تھے۔ مُستقبل کی تابناک اُمید کی کرنیں.....

یہ کیسی کرنیں ہیں' کہاں سے آگئیں' رنجیدہ دُھندلائے چہروں میں وہ سوچنے لگا۔ کیا وہ "بھگوان" نے اُن کے چہروں پر سجائی ہیں۔ کیسے سجائی ہیں؟؟

ہمت کر کے وہ اُٹھا اور انسانوں کے سیلاب میں مل گیا جو مسکن کی طرف بڑھ رہا تھا۔ لیکن وہ انسانوں کے سیلاب کا ایک حقیر سا تنکا تھا۔ کیونکہ اس کا ہاتھ خالی تھا...

اُسے مسکن میں داخل نہ ہونے دیا گیا۔

وہ خاموش ایک طرف کھڑا ہو گیا۔

لوگوں کا سیلاب اندر جا رہا تھا۔ لوگوں کا سیلاب باہر آ رہا تھا۔

اُسے یہ سب کچھ ایک فریب سا لگا۔ مکّاری۔ جس کے سب شکار ہیں...

صرف وہ ایک بچا ہوا ہے۔

باوا کے ایک معتقد کی آواز اُس کے کانوں سے ٹکرائی، جو کسی شخص سے کہہ رہا تھا۔

"میاں — ! وہ باوا کے خدمت گار جو ہیں نا، اُنھوں نے اُنھیں نِہال بنا کر دیا، مَن کی دل لگا کر خدمت کی — آج دیکھو وہ کتنے مالدار بن گئے ہیں! غریبوں کو بھی کافی خیرات دیتے ہیں... بڑے نیک آدمی ہیں وہ اللہ نے اُنھیں...!!

اُس نے اپنے کان اندر سے بند کر لئے اور ایک تلخ سا تبسّم اُس کے سُوکھے سُوکھے ہونٹوں پر پھیل گیا۔

.... پھر وہ تبسّم اُس کے ہونٹوں پر ہمیشہ رہنے لگا... تلخ... تلخ... کڑوا

آج تمام چہرے رنجیدہ تھے۔ اُداس اُداس سے۔ کیونکہ "باوا" رات میں اچانک چل بسا تھا۔ بھگوان مر گیا تھا —

معتقدین کی آنکھوں میں آنسو تھے، ہر چہرہ رنج میں ڈوبا ہوا تھا۔ لب سسک رہے تھے۔ صرف... صرف اُس کی آنکھیں مُسکرا رہی تھیں —

وہ خاموش مسکراتے ہوئے اُن لوگوں کو دیکھ رہا تھا جن کے ہاتھوں میں عطر کی شیشیاں۔ گلاب کے پھولوں کے ہار، کافور کی پُڑیاں اور اگربتّی کے بنڈل تھے.....

پھر اچانک باوا کے مسکن سے کچھ لوگ نکلے۔ وہ آپس میں زور زور سے باتیں کر رہے تھے — "باوا" کو ہم جلائیں گے —!"

"نہیں باوا کو ہم دفنائیں گے!!"

"باوا کو ہم جلائیں گے!"

"نہیں باوا کو ہم دفنائیں گے!!"

"جلائیں گے —!"

"دفنائیں گے!"

مجمع میں ہلچل مچ گئی تھی۔ وہ جو عرصہ سے سب ایک تھے۔ جب باوا اس شہر میں آیا تھا تب سے ایک... اُسی کے معتقد — ایک جیسے جذبات — ایک جیسے خیالات۔ ایک جیسی محبت۔

لیکن آج.... باوا کے مر جانے کے بعد اُس کی لاش کیلئے سب دو ہو گئے تھے۔

جلانے والے — دفنانے والے —

صرف اُس ایک جسم کے لئے جس کی رُوح پرواز کر چکی تھی۔ جو لاش تھی۔ جس میں اب کچھ بھی نہیں تھا — "جلائیں گے —!" "نہیں دفنائیں گے۔

ایک غیر مہذب انسان کی لاش کے لئے مہذب انسان ایک دوسرے سے لڑنے جھگڑنے کے لئے تیار ہو گئے تھے

وہ تنہا کھڑا مُسکرا رہا تھا.....

پولیس نے معاملہ اُلجھتے دیکھا تو سُلجھانے کے لئے آگے بڑھی۔

لوگ کچھ سہمے۔

پولیس انسپکٹر نے لوگوں کو سمجھایا" دیکھو! وہ مسلمان ہیں کیونکہ اُن کی ختنہ کی ہوئی ہے، اِس لئے اُنھیں دفنانے ہی دیا جائے، شاید تم یہ کچھ رہے ہو گے کہ میں مسلمان ہوں، لیکن میں ہندو ہوں، میرا نام شنکر ہے۔

"ہاں آپ انصاف کی بات کر رہے ہیں" یہ انصاف ہے" مسلم فرقہ میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔

"ختنہ تو پیدائشی بھی ہوتی ہے، باوا کی ختنہ پیدائشی ہو گی، یہ بھی تو ہو سکتا ہے۔ دوسرے فرقے کے ایک بہت عقلمند آدمی نے کہا۔

"نہیں — اُن کی ختنہ پیدائشی نہیں ہے... وہ مسلمان ہیں"

"نہیں وہ ہندو ہیں!!"

"ہندو ہیں۔ جلائیں گے!!"

"مسلمان ہیں — دفنائیں گے!!

"یہ ہندو مسلم، مسلم ہندو کیا بکواس لگا رکھی ہے، سب ایک ہی ہیں!!" شنکر کہہ رہا تھا اگر تم مانے نہیں تو ہمیں لاٹھی چارج کرنا پڑے گا۔!!

اور وہ جو دُور کھڑا ابھی تک قہقہے لگا رہا تھا۔ ایکدم خاموش ہو گیا اور اُس کے دل نے زور سے کہا — "ہاں! سب ایک ہی تو ہیں.. سب ایک... ایک جیسا جسم... ایک جیسا سُرخ سُرخ خون — سب کے دلوں کی بناوٹ ایک جیسی۔ ذہن کے خلیے بھی ایک سے۔ پھر یہ دو کیوں۔ ایک ہی شکل کے دلوں میں تفریق کیوں —؟؟!!

لیکن دل کی آواز سُننے کے لئے دل کے کان چاہئیں اور لوگوں کے دلوں کے کان نہیں تھے....

پولیس نے لاٹھی چارج کر دیا۔

اور اندر مسکن میں باوا کی لاش پر مکھیاں بھنک رہی تھیں . . . .
پولیس کی لاٹھی سے مجمع منتشر ہو گیا۔ ایک فساد دب گیا۔
" باوا کو دفنایا جائے گا ۔! باوا کا خدمت گار ہاتھ میں کاغذ لئے دوڑا دوڑا آیا۔ اُس کے پیچھے کچھ لوگ بھی تھے" میں کلکٹر سے آرڈر لایا ہوں ۔!"
شہر میں اعلان کر دیا گیا" باوا کی میت ۵ بجے اُٹھے گی۔ تمام حضرات گاندھی چوک میں جمع ہو جائیں' کسی قسم کا ہنگامہ کرنے والوں کو سخت سزا دی جائے گی۔
پانچ بجے نہایت قیمتی کپڑے میں" باوا" کو کفنایا گیا۔
لوگ گاندھی چوک میں عطر کی شیشیاں' اگربتی کے پُوڑے' کافور کے ڈبے' پھولوں کے ہار لئے جمع ہو گئے تھے . . . .
ہندو بھی ۔ مسلم بھی ۔ سکھ بھی ۔ عیسائی بھی ۔ سب . . . .
ایسا لگتا تھا جیسے پھر سب ایک ہو گئے ہیں۔
کس نے اُنھیں ایک ہونے پر مجبور کیا ۔؟!
پولیس کی لاٹھی نے ۔!"
پولیس کی لاٹھی بھی کس قدر کار آمد چیز ہوتی ہے' لیکن اُس وقت جب سچائی کے لئے اُٹھائی جائے۔ انصاف باتوں سے نہیں آتا تو انسانیت کے لئے لاٹھی چلانا پولیس کا فرض ہے۔ یہ نیکی ہے گناہ نہیں!!"
وہ اُس شخص کی طرف دیکھ رہا تھا جو پھٹے ہوئے لباس میں ملبوس تھا لیکن اُس کے ہاتھ میں قیمتی چادر تھی . . . . .
لاش کو گہوارے میں رکھ دیا گیا۔
لوگ عطر کی شیشیاں اُنڈیلے جا رہے تھے' کافور کے پُوڑے خالی کئے جا رہے تھے۔
جنازہ ڈھانپ دیا گیا اور وہ پھٹے ہوئے لباس والا شخص قیمتی چادر لئے آگے بڑھا . . . . اور پھر
چادر کو چار آدمیوں نے پکڑا اور اُسے جنازے پر پھیلا دیا اور پھر اُس پر گلاب پاش سے چھڑکاؤ کیا گیا۔ اُس پر پھولوں کے ہار ڈالے گئے۔
وہ دُور کھڑا سوچ رہا تھا' اُس پھٹے ہوئے لباس والے کے بارے میں . . .
چادر کی قیمت میں وہ اپنے لئے تین لباس آسانی سے بنا سکتا تھا جو اس کے جسم کو اچھی طرح ڈھانپے رکھتے
یہ چادر اب اُسے کیا دے سکتی ہے۔ کیا اُس کے لئے لباس فراہم کر سکتی ہے ..؟؟
یہ عطر کی شیشیاں
پھولوں کے ہار
کافور کے پُوڑے
یہ سب کیا ہے۔ پھر اس مُلک میں غریبی کہاں ہے' کوئی ننگا نہیں ہے۔ کوئی بھوکا نہیں ہے۔ صرف فرق روپئے کے غلط استعمال کا ہے . . . .!!
ایک غیر مہذب انسان کی لاش پر صرف کرنے سے کیا حاصل۔ اِتنا زندوں پر وہ صرف کیوں نہیں کرتے . . . .
جنازہ ۔! چار کندھوں پر سوار جا رہا تھا .. آگے .. آگے پھولوں کے ہاروں سے ڈھکا ہوا۔ اُس کے نتھنوں سے پھولوں کی خوشبو ٹکرا رہی تھی لیکن اُسے اُس خوشبو میں محنت کے پسینے کی بُو بھی محسوس ہوئی۔ محنت کے پسینے کی بُو جو دنیا کے تمام عطروں سے بڑا عطر ہے۔ لیکن یہ جنازے سے آ رہی تھی ... رنجیدہ ... رنجیدہ۔ اداس ... اُداس !!
پھر اُسے وہ پھولوں کے ہاروں کی جگہ کئی روٹیاں .. کئی چہرے .. کئی مکانات نظر آنے لگے۔
چار کندھے اُسے لئے جا رہے تھے ... پیچھے پیچھے انسانوں کا اژدحام تھا
عام انسانوں کی قبروں سے الگ باوا کی قبر بنائی گئی ۔
سیمنٹ کا چکنا چکنا مزار۔
مزار بیش قیمت چادر سے ڈھکا ہوا۔ سامنے اگربتیاں جلتی ہوئی۔
مُرجھائے سے کھلے کھلے پھول مزار کے اطراف بکھرے ہوئے۔
کچھ ہی دنوں میں مزار پر ایک عالیشان گنبد نما عمارت تعمیر کی گئی ہزاروں روپے لگا کر۔
اور وہ دُور کھڑا خاموش اُس عمارت کو دیکھتا رہا۔ عمارت کی دیواریں جیسے جیسے اُونچی ہوتی گئیں' ویسے ہی ویسے انسان اُسے کمزور دکھائی دینے لگے۔ دُبلے دُبلے مریل اور بھوک کے خاردار پودے زندگی کی سرزمین پر اُسے بڑھتے نظر آ رہے تھے۔ غریب کا سوکھا ہوا جسم شہر کے گلی کوچوں میں گھوم رہا تھا جیسے ۔
لیکن یہ کسی نے نہیں دیکھا' کیونکہ اِسے دیکھنے کے لئے بھی دل کی آنکھوں

• شاعر، بمبئی

کی ضرورت تھی اور دل کی آنکھوں سے تمام اہلِ شہر محروم تھے۔ . . .

عمارت تعمیر ہو گئی

اُسے یوں لگا جیسے انسانیت کا خون اُس عمارت سے رِس رہا ہے

یہ انسانیت نہیں ہے ایک مرے ہوئے انسان کے لئے لاکھوں روپے خرچ کئے جائیں اور صاحبِ حاجات زندوں کے لئے کچھ بھی نہ کیا جائے۔ بھوک ایسے ہی پیدا ہوتی ہے، غریبی یوں ہی بڑھتی ہے۔ اب شہر کے لوگ اپنی حاجتوں کے لئے محنت نہیں کریں گے، بلکہ اس مزار پر پُرستش کی بارش کریں گے اور خودی کا جذبہ کم ہوتا جائے گا۔۔ کم ہوتا جائے گا پھر مر جائے گا اور مزار پھولوں کے ہاروں سے ڈھکتا چلا جائے گا۔ انسان مر جائے گا۔ صرف قبر زندہ رہے گی۔ . . .

اور ہوا بھی یوں ہی۔

لیکن وہ خاموش دیکھتا اور سوچتا رہا۔

یہ کیسا شہر ہے، یہاں کے لوگ کیسے ہیں۔ یہاں ننگے، بکھرے ہوئے میلے والے انسان کو بھگوان سمجھا جاتا ہے۔ جبکہ بھگوان انسان کا دل ہے، انسان کا ذہن ہے، ہاتھ ہے، پیر، ناک اور منہ ہے۔ یہی انسان کی زندگی کی ضروریات پوری کرتے ہیں۔ شہر کے لوگو۔۔۔! اپنے جسم کے اندر اور باہر کو اپنے ہی بنائے ہوئے جال میں نہ گرفتار کرو، جال جو تمہارے غلط اعتقادات کا ساختہ ہے۔ . . ."

لیکن وہ صرف سوچتا رہا۔ سوچتا رہا۔ اُس کے خیالات، اُس کے الفاظ، اُس کے ذہن میں گونجتے رہے۔ اُس کے اندر بے چینی بڑھتی گئی۔ بڑھتی گئی۔ اور پھر اتنی بڑھ گئی کہ اُس کا حلیہ بگڑ گیا۔

وہ باوا کے مزار پر جانے والوں کا راستہ روک لیتا اور اُن کے شانوں پر ہاتھ رکھ کر کھڑا ہو جاتا۔ اُنھیں خاموشی سے دیکھتا۔ اُن کی ٹھوڑی کو ہاتھ لگاتا، پھر اپنا سر انکار میں ہلا دیتا۔

اور اُس کی آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑتے۔

یہ اُس کا روز کا معمول ہو گیا تھا۔

لیکن رفتہ رفتہ کچھ لوگ اُسے بھگوان، کچھ خدا کا ولی سمجھنے لگے اور اُس کے وہ خیالات۔ وہ جامع الفاظ اُس کے ذہن کے خلیوں ہی میں کروٹیں لیتے رہے۔ وہ شہر کے لوگوں کے بارے میں سوچ سوچ کر روتا رہا۔ روتا رہا کیونکہ وہ پیدائشی گونگا تھا۔

وہ شہر کے اُن لوگوں کی عقل پر اِس قدر رویا۔ اُس نے اتنا ماتم کیا کہ اندھا ہو گیا۔

اور شہر کے اُس شخص نے جو سابق باوا کا خدمت گار تھا اُس کے جسم پر بڑی عقیدت سے قیمتی دوشالہ ڈالا اور اُسے اُس کُٹی میں لے گیا جہاں وہ سر جھکائے بیٹھا لوگوں کی عقل پر ماتم کرتا رہتا ہے اور شہر کے لوگ اُسے نذرانے پیش کرتے جاتے ہیں۔ OO

شاعر۔ بمبئی

بقیہ: امجد حیدرآبادی اور رُباعی کا فن صفحہ ۲۲

پھر آخر اس بھری محفل سے امجد
مجھے کس نے اُٹھایا کیوں اُٹھایا

مارچ ۱۹۶۱ء میں کافی عمر پانے کے بعد وہ اِس بھری محفل سے اُٹھ کر چلے گئے، مگر اُن کی آواز گونج رہی ہے۔ بہت سوچا سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ O

غزلیں

رؤف خیر

سب رشتہ ہائے حرف و اشارات کھو گئے
ہم کھو گئے کہ تیرے نشانات کھو گئے

یہ دِن بھی دیکھنا تھا جو ہم رات کھو گئے
پایا جب اپنے آپ کو حالات کھو گئے

ہم لوگ جیسے قوسِ قزح کے پجاری تھے
اے اعتبارِ رنگ ترے ساتھ کھو گئے

سر سے گذر رہی ہے ہر اک موج کم سواد
ہم سوچتے ہوئے تو یہی بات کھو گئے

یہ کیسا انتقام ہے اور کس کے ساتھ ہے
آنکھیں عطا ہوئی ہیں مگر ہاتھ کھو گئے

یہ بے کناریاں ہیں کہ سب کم سوادیاں
سورج کو پالیا تھا کہ ذرّات کھو گئے

نکلے تھے اس سے ملنے کی خاطر مکان سے
صدیاں ملیں وہ راہ میں لمحات کھو گئے

الفاظ جوڑنے کا ہنر عام ہو گیا،
ہے سانحہ یہ خیر کہ نغمات کھو گئے

○ ۴۲۵۔ الامہ پنج بھائی۔ حیدرآباد ۶۲
شاعر۔ بمبئی۔

ناز قادری

مرا وجود ستارا دارِ انجمن نکلا
زمانہ وقت کے ماتھے کی اک شکن نکلا

رہِ حیات میں جب میں نے غور سے دیکھا
خودی کا جسم بھی اوڑھے ہوئے کفن نکلا

لہو لہان نظر آئے قاتل و مقتول!
ہر ایک شخص یہاں سرخ پیرہن نکلا

نہاں تھی شرطِ وفا جوئے شیر لانے میں
جنونِ شوق بہ اندازِ کوہکن نکلا

ہوئی نہ چشمِ تماشا کی جب پذیرائی
سنور کے آئینہ خانے سے گلبدن نکلا

فسونِ خواب بنا فرقِ گلشن و صحرا
مری نظر میں بیاباں بھی اک چمن نکلا

شعورِ نقد نے جب تجزیہ کیا اے نازؔ
مری حیات کی تمثیل میرا فن نکلا

○ ایوانِ ادب۔ بمورواج۔ مظفرپور

پریم شنکر درد ہوشیارپوری

دل کے درد کا درماں کر دے کون ہے اس قابل بابا
بستی بستی گھوم رہا ہوں لے کر اپنا دل بابا

منزل منزل سیلِ حوادث قدم قدم مشکل بابا
ساری دنیا کے صدمے اور ایک اکیلا دل بابا

جن آنکھوں میں بسے ہوئے ہوں جنم جنم کے اندھیارے
اُن آنکھوں سے کیسے دیکھوں تاروں کی جھلمل بابا

اپنے خول سے باہر آ کر دیکھ ذرا اس دنیا میں
منزل منزل چور ملیں گے پگ پگ پہ قاتل بابا

دیر و حرم کی زنجیروں کو توڑ چکا ہے جوشِ جنوں
حسن اور عشق کے بیچ کوئی شے آج نہیں حائل بابا

دھرتی سورج چاند ستارے سب ہی فنا ہو جائیں گے
ایک خدا کا نام رہے گا کہتا ہے سائل بابا

ماہی کو تو خیر ہے گہری دلدل میں دفنا دو گے
دردؔ میں لیکن ڈوب نہ جائے اپنا مستقبل بابا

○ سول انجینئر ماہی ڈیم بانسواڑہ راجستھان

گنج ہائے گراں مایہ - ایک مطالعہ

ملکہ خورشید

معرفت : پروفیسر نجم الہدا ۔ محلکرہ ۔ مظفرپور - ۱

۱۵ جنوری ۱۹۷۷ء کو اردو کے بزرگ ادیب و طنز نگار پروفیسر رشید احمد صدیقی کا انتقال ہوگیا۔ اُن کی کتاب پر میں اپنا یہ مختصر مضمون مرحوم ہی کی نذر کر رہی ہوں۔

لالہ و گل میں نمایاں ہوجانے والی ہستیوں کو چھوڑ کر خاک لئیم نے جنھیں ہمیشہ کے لئے اپنے دامن میں چھپالیا ہے، اُن ہی گنجہائے گراں مایا کی تلاش کرتے ہوئے رشید احمد صدیقی نے پندرہ اشخاص پر خامہ فرسائی کی ہے۔ حقیقتاً یہ کھوئے ہوئے بیش بہا جواہر پاروں کی جستجو ہے جس میں اضطرابِ التہاب بھی ہے اور محبت و اخلاص کا اُمنڈتا ہوا دریا بھی۔ اس میں زبان و ادب کے متعدد نکات ضمناً زیرِ بحث آگئے ہیں۔ ایک طرف دلنواز اور دیدہ زیب خاکہ نگاری کے بہترین نمونے ہمارے پیشِ نظر ہیں۔ دوسری جانب ایسا اسلوب بھی ملتا ہے جو نہ صرف خاکہ نگاری کے موضوع سے ہم آہنگ ہے، بلکہ رشید صاحب کی دلنواز شخصیت کا آئینہ دار بھی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ ہر شخصیت سے متعلق باتوں میں فن، ادب، زندگی، سیاست، تعلیم، تحقیق اور دوسرے مسائل پر ضمناً اس طرح روشنی پڑتی ہے کہ ہر خاکہ بجائے خود علوم کا گنجینہ نظر آتا ہے۔ چنانچہ "گنجہائے گراں مایا" کا ہر خاکہ صرف موضوع کو نمایاں نہیں کرتا بلکہ اُس کے اُسلوب کی تہہ میں اور ساتھ ہی ساتھ نفسِ مضمون کی رُو سے بھی خاکہ نگار کی شخصیت موضوع کی شخصیت سے اپنے مراسم کی لہروں پر اُبھرتی ڈوبتی، تیرتی اور ساحلِ مقصود تک پہنچتی نظر آتی ہے۔ مقصود یہ نہیں ہے کہ خاکہ نگار اپنی شخصیت کو نمایاں کرنا چاہتا ہے۔ رشید صاحب میں وہ انانیت ہے ہی نہیں جو ابوالکلام آزاد کا حصہ ہے۔ وہ اپنے موضوع کو بے انتہا اہمیت دیتے ہیں۔ اس لئے کسی شخصیت کے پیچ و خم نمایاں کرنے کے لئے بظاہر غیر اہم اور چھوٹی چھوٹی باتوں سے اپنے پیش کردہ خاکے میں رنگ بھرتے ہیں۔ معمولی جزئیات اور بادی النظر میں غیر اہم واقعات نے ان شخصیتوں کو نمایاں کیا ہے، جن پر رشید صاحب نے عقیدت کے پھول نچھاور کئے ہیں۔

رشید احمد صدیقی کا اُسلوب خاکہ نگاری کے لئے انتہائی موزوں ہے۔ اِس لئے نہیں کہ طنزیات و مضحکات کے وہ بادشاہ ہیں بلکہ اس لئے کہ شخصیتوں کے الگ الگ رُخ پیش کرنے کی خاطر جس ایجاز، جامعیت اور معنی آفرینی کی ضرورت ہے وہ رشید صاحب کی خصوصیاتِ نگارش میں شامل ہے۔ یہاں مطائبات اور طنز نگاری کی اُن خاص جلوہ نمائیوں کی بات نہیں کی جاسکتی جو رشید صاحب کی تحریر میں عمومیت کے ساتھ نظر آتی ہیں۔ شخصیتوں کے مرقعے پیش کرتے ہوئے رشید صاحب نے ترشے ہوئے فقروں اور ڈھلے ڈھلائے لفظی پیکروں سے جس طرح کام لیا ہے، وہ شخصیتوں کو واضح کرنے کے لئے انتہائی مناسب اُسلوب ہے کیونکہ مربوط اور مسلسل اندازِ بیان کسی تنقیدی مضمون کے لئے تو مناسب ہوسکتا ہے لیکن کسی انسانی شخصیت کے لئے نہیں ہوسکتا۔

جو خود ربط، تسلسل اور قاعدہ و قانون کے حصار میں ہمیشہ بند نہیں رہ سکتی۔ یہاں آلِ احمد سُرور سے لپسی ہوئی بجلیوں کا استعارہ مُستعار لیتے ہوئے اُسے رشید صاحب کے اُسلوب پر منطبق کرسکتے ہیں۔ اُن کے اُسلوب میں لپسی ہوئی بجلیاں ہیں، بکھرے ہوئے جلیے ہیں، نکھرے ہوئے دلکش رنگ ہیں، کچھ گریزپا اور کچھ دیرپا۔ رشید صاحب کے اُسلوب کے متعلق ہی سُرور صاحب نے کہا ہے کہ رشید احمد صدیقی کی عبارتوں میں کسی اچھی غزل کے شعر کا سا لطف پایا جاتا ہے۔ وہی دلآویزی، وہی جامعیت وہی اختصار اور پھر مختلف شعروں کے درمیان بظاہر وہی بے ربطی۔ بسا اوقات رشید صاحب کے تراشیدہ جملے کسی خوبصورت غزل کے مختلف اشعار کی طرح معنی و مفہوم کی الگ الگ دنیاؤں کی نشاندہی کرتے ہیں۔

ولادت تو مادرزاد ہوتی ہے لیکن محمد علی کی موت خانہ زاد تھی۔ عام طور پر موت اپنا شکار خود منتخب کرتی ہے۔ محمد علی نے خود موت کا انتخاب کیا"

اسی طرح: ۔

محمد علی کی ذہانت اور فطانت اب کہاں ملے گی، وہ تیغِ اصیل تھی جو رزم میں بے پناہ تھی اور بزم میں ایک جلوہ گری"۔

اور:۔ "اسٹیج پر محمد علی جس طرح جھوم جھوم کے بل کھاتے پہنچتے، جس کڑک، تڑپ، غدیو اور غلبہ سے بولتے وہ بہتوں نے دیکھا ہوگا وہ ہر حربے کا جواب صرف اپنی تقریر سے دے سکتے تھے"۔

مولانا سلیمان اشرف کی شبیہہ اور خصوصیات کے ضمن میں رقمطراز ہیں۔

"قد میانہ، رنگ صاف، جلد روشن، اعضا سڈول، نقشہ نرم و نازک، آنکھیں چھوٹی جن میں جذبات کا اُتار چڑھاؤ چھلکتا رہتا، نظر تیز و پُر اعتماد، انگلیاں ایسی جن میں قلم شمشیر و رباب سبھی زیب دیں۔ آواز میں کڑک اور لچک دھمک بھی، خطابت پر آتے تو معلوم ہوتا صفیں اُلٹ دیں گے۔ نماز پڑھاتے تو معلوم ہوتا کہ خدا کا کلام دوسروں تک پہنچانے میں اپنی اور اپنے مالک دونوں کی عظمت کا احساس ہے"

اور:۔ "جو قرات شروع کی ہے تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ جیسے خالد کی تلوار میدانِ جنگ میں کوندتی لپکتی، کاٹتی سمٹتی، تیرتی اُبھرتی آگے بڑھتی چلی جا رہی ہے"۔

یہ ہے وہ گل افشانیٔ گفتار اور لفظوں کی روانی جو رشید احمد صدیقی کی خصوصیت ہے۔

رشید صاحب کے اُسلوب میں گراں پایئگی اور وقار کا وصف عربی اور فارسی الفاظ کی آمیزش سے بھی پیدا ہوا ہے۔ وہ اظہارِ مدعا کے لئے اگر مناسب سمجھیں تو دقیق الفاظ کے استعمال سے گریز نہیں کرتے۔ رشید صاحب کا اندازِ فکر اُن کے اِن جملوں سے ظاہر ہوتا ہے۔

"ناظرین معاف فرمائیں، تفاخر و اہتزاز استعمال کرنے میں کبھی اور کہیں ضرور تامل ہوتا، لیکن اگر بھلے مانس موجود ہوں تو ایسے الفاظ کے برمحل استعمال سے ذوق کی تسکین ہوتی ہے ..... ابلہوں کو کون سمجھائے کہ صاحبِ ذوق تعصب کی بناء پر ایسا نہیں کرتے بلکہ مافی الضمیر کو منقح کرنے کے لئے کرتے ہیں، عوام یا لیڈر کی سمجھ میں وہ لفظ نہ آئے تو وہ جانیں، میں کب چاہتا ہوں کہ وہ جاہل بھی ہوں اور جواہر پاروں سے اُنھیں کھیلنے بھی دیا جائے ..... کبھی تو ایسا ہو جب اپنا اور اپنوں کا جی اپنے طور پر خوش کر سکیں"۔ رشید صاحب کے اُسلوب کی کلید یہی ہے۔

اُن کا انداز "جاہلوں" کا انداز نہیں ہے کیونکہ وہ عوام میں مقبولیت سے زیادہ اس ذہنی انبساط کو اہمیت دیتے ہیں جس سے اپنے ذوق کی تسکین کے علاوہ ہم مذاق لوگوں کی ضیافتِ طبع کا سامان بھی ہو۔

رشید صاحب کے انداز میں یکسانیت نہیں پائی جاتی، وہ اپنے موضوع کی شخصیت کے مطابق اندازِ بیان کو نیرنگ سامان بنا لیتے ہیں۔ کہیں دلبری اور جادوگری ملتی ہے، کہیں غزل کے شعروں کا لطف آتا ہے، کہیں مصوّر کے موقلم کا اعجاز دکھائی دیتا ہے، کہیں تفصیل ملتی ہے، کہیں استدلال پایا جاتا ہے اور کہیں خالصتاً تاثراتی رنگِ گفتگو ملتا ہے۔ ہر چند یہ تاثراتی رنگ تنقید کے لئے مناسب نہیں ہے لیکن رشید صاحب گنجہائے گراں مایا میں تنقید کب کرتے ہیں۔ شعر و ادب اور علوم و فنون کے نکات و رموز بیان کرتے ہوئے بھی وہ اپنے موضوع کی شخصیت سے ہی وابستہ رہتے ہیں۔ ہم ایسے تاثراتی تنقید کہیں یا موضوع کی شخصیت کی ایک ایسی شبیہہ جو مخصوص زاویۂ نظر سے پیش کی گئی ہے۔ علامہ اقبال کے متعلق ایک جگہ لکھتے ہیں۔

"بہت سے مقامات پر وہ خود اپنے آپ کو بہت پیچھے چھوڑ گئے ہیں، اگر یہ شاعری ہے تو پیغمبری کیا ہے اور اگر پیغمبری ہے تو شاعری کا کیا درجہ ہے"۔

اس اندازِ بیان کی رشید احمد صدیقی کے یہاں فراوانی ہے جس کی شگفتگی اور دل نشینی لازوال ہے۔

○ ○

کملی

سچیندر اُپادھیائے

(ہندی)

ترجمہ: م۔ صدیق
محبوب منزل قادر آباد پلاٹ۔ پربھنی۔

کشیدہ یا ریشم کے پھندوں والے گجرے جس دن شنکر لے آیا تھا اُسی شام کملی چہکتی پھر رہی تھی۔ شنکر کے گُن گاتی! اُس شام گھاس بیچنے سے بچاکر رکھے گئے پیسوں کو لیکر وہ مانک کے دروازے پر پہنچی اور بولی "تو کیا ایسے ہی دروازے پر بیٹھا بیٹھا بیڑیاں پھونکتا رہے گا، کچھ کام وغیرہ بھی کرے گا؟"

مانک خاموش سا اپنے گھر کے باہر نیم کے پیڑ کے نیچے بیٹھا تھا اور بیڑی پی رہا تھا۔ آج وہ بڑے سویرے جال لیکر ندی پر گیا تھا اور دوپہر ہوتے ہوتے اُس نے پندرہ بیس مچھلیاں پکڑلی تھیں اُنھیں لیکر وہ جوں ہی آنے لگا، نہ جانے کہاں سے پھرتا ہوا سرکاری انسپکٹر آگیا اور اُس نے ساری مچھلیاں چھین لیں۔ انسپکٹر اگر مچھلیاں چھین کر ہی مان جاتا تو کوئی بات نہ تھی۔ اُس نے چوری چوری مچھلیاں پکڑنے کے جرم میں مانک کو پولیس میں دینے کی دھمکی بھی دی تھی، لاچار مانک کو انسپکٹر کو بیس روپے دینے پڑے تھے۔ وہ روپے اُس نے مودی سے اُدھار لئے تھے اور وہ نہیں سمجھ پارہا تھا کہ مودی کے روپے کس طرح چکا پائیگا۔ اِسی اُدھیڑ بُن میں وہ بیٹھا بیڑی پی رہا تھا کہ کملی چلی آئی تھی۔

مانک نے بڑی حقارت سے کملی کو دیکھا اور بیڑی کا ایک لمبا کش کھینچ کر دھیرے سے بولا "چل بھاگ یہاں سے، وقت بے وقت چلی آتی ہے ــــ"

کملی کو مانک کے اِس طرح کے جواب کی اُمید نہیں تھی۔ اُس کی بات سے وہ یکبارگی تلملا گئی۔ چوٹی میں گوندھے ہوئے اپنے پھندے کو ہلاتی ہوئی وہ بولی "بڑا آیا ہے بھگانے والا۔ میں کیا پھوکٹ میں مچھلی لینے آئی تھی۔ یہ دیکھ ــــ" اور اُس نے مٹھی میں سے کڑکڑاتے نوٹ مانک کو دکھائے۔

بات شاید اور آگے بڑھتی تبھی بغل میں رہنے والی گلابی باہر آگئی۔

"کیا ہے کملی؟ کیا ہوا ری؟"

"اری، میں تو آئی تھی مچھلی لینے۔ اِس سے کیا پھوکٹ میں مچھلی لوں گی، جو یہ اِس طرح اکڑ رہا ہے۔ پیسے پھینکتی ہوں تب کچھ لیتی ہوں۔"

اُس نے مٹھی گلابی کی طرف کردی اور تیزی سے وہاں سے چلی گئی۔ بات بڑھتی دیکھ کر مانک کی بیوی گھر سے نکل آئی تھی اور اپنی باہوں میں روتے ہوئے بچے کو چپ کرانے کی کوشش کرتے ہوئے اُس نے پوچھا "کملی بائی جی کیا کہہ رہی تھی؟"

"تو چپ رہ" مانک نے اُسے ڈانٹا اور وہ بڑبڑاتی ہوئی واپس گھر میں چلی گئی۔ مانک نے بدن کی چادر کو کس کر لپیٹ لیا اور بیڑی پینے لگا۔

سحرانے میں رات اُتر آئی تھی۔ دن بھر سے چلتی ہوئی ٹھنڈی ہوا تھم گئی تھی۔ لیکن کہیں آس پاس اولے گر رہے تھے اور سارا سحرانہ سردی میں ٹھٹھرتا ہوا خاموش ہوگیا تھا۔

اندھیری پگڈنڈیوں پر اُٹھتی گرتی کملی بازار سے واپس آئی تو شنکر کچے فرش پر لیٹا اُس کا انتظار کر رہا تھا۔

شنکر کئی مہینوں بعد شہر سے لوٹا تھا، کملی اور اُس کے بیچ ہوئے جھگڑے کے دن سے وہ گاؤں چھوڑ کر بھاگا تو اُس کا پتہ بھی نہ چل سکا۔ مگر اس سے کملی کیلئے کوئی فرق نہیں پڑا۔ اُس نے کوئی افسوس بھی ظاہر نہیں کیا۔ ہمیشہ کی طرح جنگل میں گھاس لینے جاتی اور بازار میں اُس کو بیچ کر سحرانہ واپس لوٹ آتی۔

پہلے تو اُس کو نکھٹو شنکر کا پیٹ بھی بھرنا پڑتا تھا۔ اُس کے ساتھ شنکر اُس کے جوڑے ہوئے پیسوں میں سے کبھی کبھی کچھ پیسے چُرا کر لے جاتا اور ٹھیکے پر شراب پی آتا۔ اب تو کملی اکیلی تھی اور اپنے کمائے ہوئے پیسوں میں آرام سے گذر بسر کر رہی تھی۔

سحرانے کے پنچوں نے اور اُس کے ساتھ جنگل میں لکڑی گھاس لے جانیوالی عورتوں نے دوسری شادی کرنے کے لئے کہا۔ لیکن کملی کے گلے سے نیچے کسی کی بات نہیں اُتری۔

شنکر سے وہ جھگڑتی رہتی تھی۔ اُس کا بیکار بیٹھے رہنا اور بار بار پیسے چُرا کر شراب پی آنا، اُسے قطعی پسند نہیں تھا۔ ساتھ ہی شنکر اُس پر شک بھی کرنے لگا تھا۔ ہمیشہ مانک اور اُس کو لیکر جھگڑا چلتا۔ پھر بھی اِدھر اُدھر سے

جانا اُسے اچھا نہیں لگتا۔ اُس کی ذات کی عورتیں جہاں بھی جائیں گی' اُنھیں مرتے دَم تک اپنے ہاتھ پیر چلاکر محنت مزدوری کرنی پڑے گی۔ ویسے اکیلی کا پیٹ بھرنا کوئی مشکل نہیں تھا۔

اُسے دیکھ کر شنکر اُٹھ گیا اور دیوار سے پیٹھ لگا کر بیٹھ گیا۔

"کیوں مانک سے کیا بات ہوئی؟" شنکر شام ہی سے کچھ کُڑھ رہا تھا۔ اُس کے اندر جیسے کانٹے چُبھ رہے تھے۔

"کچھ نہیں مچھلی لینے گئی تھی' لیکن آج مچھلی کے انسپکٹر نے اُسے پکڑ لیا۔ بیچارے سے رُوپے بھی لے لئے۔"

"یہ تو مجھے معلوم نہیں" کملی کے اِس جواب سے شنکر مطمئن نہیں ہوا۔ گھر میں اندھیرا تھا۔ اِس لئے وہ شنکر کی آنکھوں کو نہیں دیکھ سکی۔ اُس کے دماغ میں اور ہی ہلچل مچی ہوئی تھی۔ گلابی نے جو دوسری بات کہی تھی وہ کملی کو بار بار توڑ رہی تھی۔ گلابی نے بتایا تھا کہ مانک کے گھر میں آج کھانے کو کچھ بھی نہیں ہے' مانک بھی شاید بھُو کا کروٹیں بدل رہا ہوگا' بھُو کی ماں کی چھاتی میں دُودھ نہیں تھا' اِس لئے بچّہ رُوئے جا رہا تھا۔ بچّے کے رونے کی آواز اندھیرے میں تیرتی ہوئی اُس تک آ رہی تھی۔

شنکر کے لئے اُس نے آج گیہوں کی روٹی بنائی تھی' گھر میں گیہوں کا آٹا نہیں تھا اِس لئے وہ بازار گئی تھی اور آٹا خرید لائی تھی' ویسے وہ روزانہ جوار' باجرہ پر ہی گزارہ کرلیتی تھی۔ مانک کے یہاں اُسے مچھلی نہیں ملی اُس کا اُسے افسوس بھی ہوا لیکن اندھیرے میں ہی وہ بھُورا مالی کے یہاں گئی تھی اور سبزی لے آئی تھی۔

شنکر اور وہ جب کھانا کھاکر بیٹھے تو کافی رات ہو چکی تھی۔ لمبے سفر سے چل کر آنے کے باعث شنکر کی تھکی آنکھیں بھی بند ہو رہی تھیں۔ کچھ دیر بعد وہ فرش پر ایک طرف لڑھک گیا۔

کملی نے جب دیکھا شنکر سو گیا' تو وہ اُٹھی اور گھر کا دروازہ کھول کر باہر نکل گئی۔ دروازہ کھُلنے کی آہٹ سُن کر شنکر جاگ گیا۔ گھر میں اندھیرا تھا جس کی وجہ سے کچھ بھی دکھائی نہ دے رہا تھا' شام سے تھکی ہوئی ہوا پھر تیزی سے چلنے لگی تھی۔ اِدھر اُدھر کُتّے بھی کبھی کبھی بھُونک کر رات کے سنّاٹے کو توڑ دیتے تھے۔

بہت دیر تک کملی نہیں آئی تو وہ دبے پاؤں مانک کے گھر کی طرف چل پڑا۔ اُسے تعجب ہوا کملی اُسی کے گھر سے واپس آ رہی تھی۔

"چڑیل' حرامزادی" اُسے دیکھتے ہی شنکر بے قابو ہوگیا اور کملی کے بال پکڑے ہوئے لگ بھگ اُسے گھسیٹتا ہوا بولا"

"چل ہٹ' بڑا آیا ہے بدچلن کہنے والا" اپنے آپ کو شنکر سے چھڑاتی ہوئی کملی بولی "ایک بچّے کی ماں بھُوکی سو رہی ہے اور تجھے ذرا بھی رحم نہیں۔ میں تیری باندی نہیں کہ تجھ سے دب جاؤں۔"

یہ سب شور سُن کر آس پاس کے گھروں کے کئی چہرے جھانکنے لگے تھے۔ دُبکے ہوئے کتّوں نے زور زور سے بھُونکنا شروع کر دیا تھا۔

کملی کی بات پر شنکر پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ اندھیرے میں وہ جیسا آیا تھا ویسا ہی لوٹ گیا۔

رات اُسی طرح رینگ رہی تھی اور برفیلی ہوا اُسی طرح تھپیڑے مارتی ہوئی چل رہی تھی۔

OO

اعتذار

"شاعر" کے گزشتہ شمارے میں میرا مضمون "اُردو میں ترجمہ شدہ ادب" جو ایک ریڈیائی تقریر ہے' شائع ہوا تھا جس میں ڈاکٹر ظ۔ انصاری کے ترجمہ شدہ ناول" ذلّتوں کے مارے لوگ" (مصنّفہ فیودور دستوئیفسکی) کے ساتھ مترجم کی حیثیت سے سہواً خدیجہ عظیم کا نام لکھ گیا تھا جس کا مجھے افسوس ہے۔

رُوسی ادب کے اُردو تراجم اور تعارف کے سلسلے میں ظ۔ صاحب کی خدمات اظہر من الشمس ہیں۔ اُنھوں نے نہ صرف رُوسی نثری شہ پاروں کو اُردو میں ڈھالا ہے' بلکہ شعری تخلیقات کے بھی لاجواب منظوم تراجم پیش کئے ہیں۔ نیز رُوسی ادیبوں اور شاعروں پر مستقل کتابیں بھی تصنیف کی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اِس میدان میں اُن کی خدمات کا صحیح اعتراف ایک مستقل مضمون کا متقاضی ہے۔

میں ڈاکٹر ظ۔ انصاری اور "شاعر" کے قارئین سے مذکورہ بالا سہو کے لئے معذرت خواہ ہوں۔

یونس اگاسکر

O

"شاعر" اگست۔ ستمبر کے مشترک شمارے کے صفحہ ۱۲ پر۔ منظر سلطان کی نظم بیادِ جاں نثار اختر مرحوم پر منظر سلطانپوری کتابت کی غلطی ہے۔ اِس کے علاوہ اُن کی نظم کے مصرع

احساس کی صلیب پہ مصلوب ہو گیا۔

میں مصلوب کی جگہ "مطلوب" لکھ گیا ہے قارئین تصحیح فرمالیں۔

واطلاع

غزلیں

اقبال قریشی

غم تراشا کیا حالات کے پیکر کیا کیا
کھو گئے حادثۂ وقت میں منظر کیا کیا

دستِ آذر کی تمنا میں نہ جانے کب سے
ٹھوکریں راہ میں کھاتے رہے پتھر کیا کیا

صبحِ اُمید کبھی تیرگیٔ شام کبھی
بن کے سینے میں اُترتے رہے خنجر کیا کیا

آرزوؤں کی فصیلوں پہ اُمیدوں کے چراغ
جل کے کرتے رہے ہستی کو منور کیا کیا

سُن سکے ہم ہی نہ پیغامِ خموشی اُن کا
حسنِ فطرت میں تھے مسطور پیمبر کیا کیا

قیدِ ہستی سے گذر کر ہمیں معلوم ہوا
جسم کے تنگ حصاروں سے ہے باہر کیا کیا

○ ۱۲۳/۸۱ - قلی بازار - کانپور یوپی

آزاد گلاٹی

لمحہ لمحہ اک نہ اک سعیٔ بقا کرتی ہوئی !
کٹ رہی ہے زندگی خود کو فنا کرتی ہوئی !

تیری چُپ ہے - یا - مرے اندر مچا کہرام ہے
کوئی شے تو ہے زباں کو بے نوا کرتی ہوئی

اپنے اندر ریزہ ریزہ ٹوٹ کر بکھرا ہوں میں
میرے باہر سے کوئی شے ہے دغا کرتی ہوئی

کشتِ جاں سے دن کو کٹتی ہے نئے زخموں کی فصل
رات آتی ہے اُنہیں پھر سے ہرا کرتی ہوئی

اپنے ہونے سے نہ ہونے کا سبب پیدا ہُوا
ہم کو ہستی ہی تھی اپنے سے جُدا کرتی ہوئی

موت تو آزاد ہے آزادیوں کا امتحاں
زندگی ہے ہر نفس خود کو رہا کرتی ہوئی !

○ گورنمنٹ کالج - نابھہ - پنجاب

فرحت قادری

راتوں کے اندھیرے میں یہ لوگ عجب نکلے
سب نام و نسب والے بے نام و نسب نکلے

تعمیر پسندی نے کچھ زیست پہ اُکسایا
کچھ موت کے ساماں بھی جینے کا سبب نکلے

یہ نور کے سوداگر خود نور سے خالی ہیں
گردوں پہ مہ و انجم تنویر طلب نکلے

یہ دشت یہ صحرا سب ویران ہیں صدیوں سے
اِس سمت بھی دیوانہ تکبیر بہ لب نکلے

تہذیب کی بیعا کی ایسی تو نہ تھی پہلے
ہم جب بھی کہیں نکلے تا حدِ ادب نکلے

تسکیں کیلئے ہم نے جن سے بھی گذارش کی
ہم سے بھی زیادہ وہ تسکین طلب نکلے

ہستی کی منازل میں اپنا جنھیں سمجھا تھا
جب وقت پڑا رخصت وہ مُہر بہ لب نکلے

○ معروف گنج - گیا (بہار)

نواب علی یاور جنگ

طیبہ خسرو

وائس چانسلر لاج، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

طیران گاہ حیدرآباد پر بری، بحری اور ہوائی افواج کے عہدہ داروں نے تابوت کو کاندھا دے کر انڈین ایر لائنز کے ہوائی جہاز سے اُتارا، بندوقوں نے سلامی دی اور پورے فوجی اعزاز کے ساتھ ایک شہزادہ سوئے مزار چلا۔ شہزادہ جس کا تخت و تاج نہیں تھا لیکن دلوں پر حکمرانی تھی۔ ایک بانکا پُر وقار شہزادہ تھا یہ۔ طیبہ بیگم نے سینہ تھام لیا، خدیو جنگ نے سر جھکا لیا۔ عماد الملک کے مقبرہ میں عماد الملک اپنے نواسے کے لئے ہاتھ پھیلائے منتظر تھے۔ مہدی یار جنگ اپنے داماد کے منتظر تھے۔

ہزاروں سوگواروں نے دیکھا، علی سپردِ خاک ہوا۔ اور سرزمینِ دکن علی جیسے بیٹے کو اپنی گود میں لے کر مہمان ہوگئی۔ وہ جس کے دَم سے محفلیں سجتی تھیں، جس سے راج بھون کی شان تھی جو بمبئی کی جان تھی، وہ رُوحِ رواں، راحتِ جان وہ علی یار خاں رخصت ہوگیا۔ بمبئی ماتم کدہ بن گئی، حیدرآباد سوگوار ہو گیا۔

علی سب کے تھے۔ صرف ہندوستان ہی نہیں مصر، یوگوسلاویہ، فرانس، ارجنٹائنا اور امریکہ علی کا شیدا تھا۔ علی ایک انوکھی شخصیت کے مالک تھے۔ پُر وقار، جاذب اور نفاست پسند۔ اُن میں ایک مقناطیسی کشش تھی، جو کوئی اُن سے ملتا، اُن کا مدّاح ہوجاتا۔ جو کوئی اُن سے بات کرتا، اُن کو سراہتا۔ جس کام کو بھی اُنھوں نے سنبھالا اور جس عہدہ پر فائز رہے اُس کی عظمت بڑھادی، وہ کہا کرتے تھے "پوزیشن آدمی کو بڑا نہیں بناتا بلکہ آدمی پوزیشن کو بڑائی اور وقار دیتا ہے۔" مرحوم ڈاکٹر حسین ظہیر نے علی کے لئے کہا تھا "علی کی شخصیت ایسی ہے کہ جس عہدہ پر وہ رہتے ہیں اُس کی شان بڑھا دیتے ہیں۔" علی نے جس ماحول میں پرورش پائی تھی وہی علی کی شخصیت کے بنانے کا ذمہ دار تھا جس گھر میں پروان چڑھے وہ علم و ادب کا گہوارہ تھا، آداب و اخلاق کا گنجینہ تھا۔ شرافت و نجابت کا سرچشمہ تھا۔ علی میں عماد الملک کی لیاقت و دبدبہ تھا، خدیو جنگ کا حسن و وقار تھا، عقیل کی فراست تھی اور طیبہ کی محبت و ممتا تھی۔ علی نے اپنے خاندان کے نام اور اعلیٰ اقدار کو اپنی شخصیت اور اپنی ذات کی گوناگوں خوبیوں سے روشن کر دیا۔ علی سے یہی اُمید تھی اور علی نے اس امید کو پورا کر دکھایا۔

شاعرو بمبئی

علی مجسّم اخلاق تھے، مجسّم رواداری تھے، مجسّم شرافت تھے۔ جو مہمان راج بھون آتا وہ اُن کی مہمان نوازی کو نہ بھولتا۔ ہر مہمان کو وہ موٹر تک رخصت کرنے جاتے۔ اُس کے آرام کا خیال رکھتے۔ راج بھون کی شان اور خوبصورتی علی اور زہرا کے دم سے تھی۔ راج بھون ہندوستان کی عظمت، تہذیب، تمدّن، اخلاق و انسانیت کا جیتا جاگتا مرقع تھا۔ علی غرور و نخوت سے دُور تھے۔ شان و شوکت اور دکھاوے کو ناپسند کرتے تھے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ گورنر کو عوام سے نزدیک ہونا چاہیئے لیکن شان و شوکت اُسے عوام سے دُور کر دیتی ہے۔ اُنھوں نے گورنرشپ کو امارت اور دکھاوے سے دُور رکھنا چاہا۔ اُنھوں نے اپنے عہدہ اور پوزیشن سے کبھی ناجائز فائدہ نہیں اُٹھایا وہ حکومت کے نوکر تھے اور نہیں چاہتے تھے کہ اُن کی ذمہ داریوں میں کسی بھی قسم کی کوتاہی ہو۔ اپنے اسٹاف کو کاٹ چھانٹ کر اُنھوں نے اپنے لئے ایک سکریٹری رکھ لیا۔ خود جان توڑ محنت کرتے اور جس قدر وہ کام کرتے سکریٹری سے بھی توقع رکھتے کہ وہ بھی اُسی جانفشانی سے کام کرے۔ راج بھون کے نوکروں کو اُنھوں نے کبھی تکلیف نہیں دی، جہاں تک ہو سکتا خود ہی کام کرتے صبح سویرے اُٹھنے کے عادی تھے لیکن یہ نہیں چاہتے تھے کہ کوئی اپنی نیند خراب کرکے اُن کے لئے چائے بنا لائے وہ خود ہی چائے بنا لیتے اور اپنے آفس میں جاکر بیٹھ جاتے اور کام شروع کر دیتے۔ علی میں احساسِ فرض زبردست تھا۔ فرض کے آگے اُنھوں نے اپنی جان کی بھی پروا نہیں کی۔ وہ کہتے کہ جب ذمہ داری لو تو اُسے پوری اور اچھی طرح نبھاؤ۔ اسی احساسِ فرض اور ذمہ داری نے مجبور کیا کہ باوجود علالت کے دہلی میں ہونے والی گورنروں کی کانفرنس میں شرکت کریں مگر ہوائی جہاز میں اُن کا مزاج خراب ہو گیا اور کانفرنس کے بجائے اُنھیں نرسنگ ہوم جانا پڑا اور پھر بمبئی لاکر اُن کے دل کے قریب PACE MAKER پیس میکر لگانا پڑا، ڈاکٹروں کے

روکنے کے باوجود وہ اپنے فرائض انجام دیتے رہے۔ جب گورنر شپ کی توسیع ہوئی اُنھوں نے پریسیڈنٹ سے کہا مجھ سے اب یہ ذمہ داری سنبھالی نہیں جاتی۔ میں بیمار رہنے لگا ہوں۔ حکومت کی تنخواہ لوں اور کچھ نہ کرسکوں، مجھے یہ گوارا نہیں۔ بہتر ہے میں اس عہدہ سے مستعفی ہوجاؤں" لیکن پریسیڈنٹ نے اصرار کیاکہ وہ ایک سال اور یہ عہدہ سنبھالیں۔ انتقال کے دن مسز گاندھی کے استقبال کو نہ جاسکے جس کا اُنھیں ملال تھا۔ ڈاکٹر گلوکوس چڑھا رہے تھے۔ پریس نوٹ لکھوایا کہ ڈاکٹروں نے اجازت نہیں دی اس وجہ سے مسز گاندھی کے استقبال کیلئے نہ جاسکے۔ لیکن اس پریس نوٹ کے جاری ہونے سے قبل وہ گزر گئے۔

علی ایک نڈر انسان تھے، وہ کسی سے نہیں ڈرتے تھے۔ حق و صداقت اور راستبازی اُن کے ہتھیار تھے، اور محبت و خلوص اُن کے حربے۔ جو بات پسند نہ آتی کہہ دیتے اور اس طرح کہ سُننے والے کو رنج نہ ہو۔ جائز ناجائز، حق و باطل، سچ اور جھوٹ کا اُن کے پاس ایک معیار تھا۔ وہ ہمیشہ راہِ حق پر گامزن رہے اور سچائی کو اپنا مسلک بنایا۔ جھوٹ اور غلط بیانی سے پرہیز کیا۔ اُن کے اسٹاف پر ان اوصاف کا بہت گہرا اثر پڑا اور اُنھیں خود پر مکمل بھروسہ اور اعتماد تھا۔ اُن کی رائے ہمیشہ صائب ہوتی اور جو کوئی اُن سے مشورہ طلب کرتا اُسے کبھی پچھتانا نہ پڑتا۔ وہ ایک سُلجھے ہوئے ڈپلومیٹ تھے۔ زمانے کی نبض پہچانتے تھے۔ حکومتوں کے تختے پلٹتے اُنھوں نے دیکھے تھے۔ حالاتِ حاضرہ پر اُنھیں عبور تھا اور ہر مضمون اور ہر نکتہ پر وہ بات کرسکتے تھے۔ لائق اسکالر تھے اور ماہرِ تعلیم و نظم دانش تھے۔ ساتھ ہی اعلیٰ درجے کے سفیر تھے۔ جن جن ممالک میں وہ ہندوستان کے سفیر کی حیثیت سے گئے وہاں ہندوستان کی عظمت کو بڑھایا۔ ۱۹۵۲ء میں جب ارجنٹائنا کے سفیر مقرر ہوئے تو پریسیڈنٹ پیرانPERON کو اپنا گرویدہ بنالیا۔

ایک محتاط آدمی تھے اور کسی کے گھر نہ جاتے۔ لیکن، علی کے گھر بلاتکلف آتے۔ کھانا کھاتے اور بیٹھ کر باتیں کرتے۔ علی وہاں کی تعلیم اور کلچرل زندگی میں دلچسپی لیتے رہے۔ یونیورسٹیوں کا بغور مطالعہ کیا۔ ۱۹۵۴ء میں جب مصر کو سفیر ہوکر گئے، مصر میں علی اور ہندوستان کے خلاف بہت سخت پروپیگنڈہ کیا گیا تھا۔ مہینہ بھر گزر گیا لیکن پریسیڈنٹ ناصر نے اُنھیں ملنے نہ بلایا۔ آخر علی نے چیف آف پروٹوکول CHIEF OF PROTOCAL سے کہاکہ اگر ناصر مجھ سے ملنا نہیں چاہتے اور میں اُنھیں اپنے اسناد CREDENTIALS نہیں دے سکتا تو میرا یہاں رہنا بھی بےکار ہے۔ بہتر ہے کہ میں واپس چلا جاؤں۔ دو دن بعد ناصر نے علی کو بلایا۔ پہلی ملاقات تین گھنٹے تک چلی۔ جب علی نے ناصر سے نہ بلانے کی وجہ پوچھی تو

ناصر نے ہنس کر کہا" تمہارے خلاف بہت سی باتیں کہی گئی تھیں" اور پھر اُس دن کے بعد دونوں گہرے دوست بن گئے۔ انتہا یہ کہ ناصر ہر رات گیارہ بجے علی کو اپنے پاس بلا لیتے اور صبح ۳، ۴ بجے واپس بھجواتے۔ رات دیر گئے تک بھجوانے پر بیوی کی طرف سے اعتراض ہوتا تو کہتے "ہم پہلے بکواس کرتے ہیں، پھر بزنس کی بات کرتے ہیں پھر کون سی چیز کہاں ملتی ہے معلوم کی جاتی ہے اور پھر ہم بیٹھ کر سگریٹ پیتے ہیں"۔ سوئیز کے سلسلے میں علی مسلسل ناصر سے ملتے رہے اور علی کے مشورے کو سوئیز کے مسئلہ کے حل میں گہرا دخل ہے۔ مصر میں اُنھوں نے صرف سفیر کے فرائض انجام نہیں دئے بلکہ انڈیا ہاؤز کے نام سے ایک گھر بھی کھولا جس میں ہندوستان کی دستکاری، مشینیں، راسک اور دوسری صنعتیں رکھی گئیں، ہر گھر میں ہندوستان کی صنعت و حرفت کا چرچا تھا، ایک اسٹال انڈیا ٹی ہاؤس INDIA TEA HOUSE قائم کیا جس میں ہندوستان کی چائے دی جاتی تھی۔ اِس طرح اُنھوں نے ہندوستان کی تجارت کو آگے بڑھایا۔ جب علی کی مدّتِ سفارت ختم ہونے لگی تو پریسیڈنٹ ناصر نے اُن کے اعزاز میں ایک عشائیہ ترتیب دیا جس میں علاوہ اُن کی بیوی کے حکومت کے مختلف عہدہ دار کابینہ کے ممبران، سکریٹریز، اور سفیر مدعو تھے۔ مسز ناصر جو کسی سرکاری فنکشن میں نہیں جاتی تھیں علی کے عشائیہ میں شریک ہوئیں۔ پریسیڈنٹ ناصر نے کہا"

میں نے اِس قسم کا عشائیہ آج تک کسی کو نہیں دیا۔ لیکن علی کو میں یہ اعزاز دیتا ہوں جو ایک بہت بڑا سفیر ہے، بہت بڑا آدمی ہے، اور میرا دوست ہے"۔ مصر کے وزیرِ خارجہ نے کہا" میں نے کئی بار علی سے ایسی چیزوں کی بابت مشورہ لیا ہے جو کہ خود اپنے وزراء سے بھی نہیں لے سکا۔ ۱۹۵۸ء میں یوگوسلاویہ کے سفیر مقرر ہوئے اور جزیرہ بریونی BRIONI میں جہاں مارشل ٹیٹو قیام کرتے تھے اپنے اسناد دینے گئے۔ دن بھر اُن کے ساتھ رہے کھانا کھایا اور واپس ہوئے۔

ٹیٹو سے اُن کے تعلقات بہت گہرے اور بےتکلف تھے۔ دو بار اُنھوں نے علی کو بُلایا مگر علی نہ جاسکے۔ جب ٹیٹو پر کتاب لکھی جانے لگی تو علی کو دعوت دی گئی کہ وہ اپنے خیالات ظاہر کریں اور مضمون لکھیں۔ یوگوسلاویہ میں علی بہت خوش تھے۔ وہاں کا ماحول بہت سازگار تھا اور ہر گھر کے دروازے اُن کے لئے کھلے تھے، پنڈت نہرو کی

خواہش پر یوگوسلاویہ کے کمیون سسٹم کا علی نے بغور مطالعہ کیا۔ وہاں کی یونیورسٹیوں میں دلچسپی لی۔ وہ ٹیٹو کے اتنے قریب تھے کہ بغیر کسی اجازت کے اور اطلاع کے وہ اُن سے ملنے چلے جاتے اور کوئی اُنھیں نہیں روکتا۔ ۱۹۶۱ء میں جب علی پیرس گئے تو پریسیڈنٹ ڈیگال نے اُن کے متعلق کہا: "ہندوستان نے علی کے نام سے ایک ایسا سفیر بھیجا ہے جس کی وجہ سے مجھے ہندوستان اور اُس کے مختلف مسئلوں کو جاننے کا موقع ملا" پیرس میں اُن کی دھاک تھی کہ علی سا کوئی مقرر اور فرانسیسی زبان کو اس قدر خوبی اور روانی سے بولنے والا سفیر اب آیا ہے۔ ہندوستان فرانسیسیوں کے نزدیک ایک روایت بن گیا۔ علی فرانس میں رہ چکے تھے وہ فرانسیسیوں کی فطرت اور طور طریقوں سے بخوبی واقف تھے۔ وہ فرانس میں فرانسیسیوں کی طرح رہتے اُٹھتے بیٹھتے کھاتے پیتے بات چیت کرتے۔ اُنھوں نے فرانسیسیوں کی دُکھتی رگ پر ہاتھ رکھا اُن سے قریب ہو گئے اور اُنھیں اپنایا اور ہندوستان کا ایک مقام پیدا کر دیا۔ پنڈت نہرو اور پریسیڈنٹ ڈیگال کے درمیان مضبوط روابط قائم کئے۔

علی ایک دانشور مدبر ہی نہیں ماہر تعلیم بھی تھے۔ یونیورسٹی گرانٹس کمیشن اور انٹر یونیورسٹی بورڈ اور اسکول آف انٹرنیشنل اسٹڈیز کے رکن بھی تھے ایک اسکالر کی حیثیت سے ہر جگہ اُن کا احترام کیا جاتا۔ وہ قدیم تہذیب کے دلدادہ تھے۔ جمہوریت اور سیکولرازم کے حامی تھے۔ سائنٹفک فکر پر ایقان رکھتے تھے۔ ملک میں اعلیٰ تعلیم کے فروغ کے لئے اُنھوں نے بہت سی کوششیں کیں۔

علی ۱۹ فروری ۱۹۰۵ء میں پیدا ہوئے۔ مرزا علی یار خاں نام پایا۔ نظام کالج اور کوئن کالج آکسفورڈ میں تعلیم حاصل کر کے ۱۹۲۷ء میں انگلستان سے واپس ہوئے اور عثمانیہ میں ماڈرن ہسٹری اور پولٹیکل سائنس کے لکچرر پھر ریڈر اور پھر پروفیسر مقرر ہوئے۔ ۱۹۳۵ء تک وہ پڑھاتے رہے۔ پھر نظام کی حکومت میں کابینہ میں وزیر دستوری بنے۔ علی یاور جنگ کا خطاب پایا اور مختلف وزارتی عہدے سنبھالے۔

۱۹۴۵ء سے ۱۹۴۶ء تک وہ عثمانیہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر رہے۔ ۱۹۴۷ء میں پولیس ایکشن کے زمانے میں اُنھوں نے اپنے عہدے سے استعفیٰ دے دیا ۱۹۴۸ء سے ۱۹۵۲ء تک دوبارہ وہ عثمانیہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر مقرر ہوئے اور اعلیٰ تعلیم کے لئے کئی اصلاحات کیں۔ ۱۹۵۶ء اور ۱۹۵۷ء سے لے کر ۱۹۶۰ء تک وہ اقوام متحدہ کے

جنرل اسمبلی میں ہندوستانی وفد کے نائب صدر رہے۔ ۱۹۵۹ء میں اُن کی خدمات کے سلسلہ میں حکومت ہند نے اُنھیں "پدما بھوشن" کا اعزاز عطا کیا ۱۹۶۵ء سے ۱۹۶۸ء تک وہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے وائس چانسلر رہے۔ وہاں ایوننگ کالج اور ٹمنٹر سسٹم کو جاری کیا۔ طلبا میں سماجی اور قومی خدمات کا شعور پیدا کیا۔ وہ مسلمانوں کے بہی خواہ تھے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی وائس چانسلری مسلمانوں کی خدمت کے لئے ہی اُنھوں نے قبول کی تھی۔ عماد الملک اور طیبہ بیگم نے سرسید کا ہاتھ بٹایا تھا اور ایم اے او کالج کے لئے چندے جمع کئے تھے۔ بزرگوں کی کوششوں کا نتیجہ کہ مسلم یونیورسٹی علی کے جذبۂ خدمت گزاری اور محبت کا مرکز بن گئی تھی مگر علی گڑھ نے اس پارس کو پہچاننے میں غلطی کی۔ یہ علی کی نہیں علی گڑھ کی بدقسمتی تھی کہ علی سے مدبر اور ہمدرد کی اُس نے قدر نہیں کی۔ مگر واہ ری بُردباری ہونٹوں پر شکایت نہیں لائی، اپنے فرض کو نبھایا۔ علی گڑھ جانے سے دہلی میں روکا گیا تو کہا کہ جب تک میرا مشن پورا نہ ہوگا میں علی گڑھ نہیں چھوڑوں گا۔ بچے نادان ہیں وہ سمجھے نہیں۔ اُنھیں سمجھانا ہوگا۔ مجھے ان سے کوئی شکایت نہیں۔ میں اُنھیں سمجھاؤں گا۔" اُن کے دل میں کینہ نہیں تھا۔ اُنھوں نے کبھی یہ نہ چاہا کہ اپنے نقصان پہونچانے والوں کو شرمندہ کریں بلکہ اُن کی مدد کی۔

۱۹۶۸ء میں اُنھوں نے امریکہ کی سفارت قبول کی لیکن جو صدمہ خود اُن کی قوم نے اُنھیں پہنچایا تھا اُس کا نتیجہ یہ ہوا کہ امریکہ جاتے ہی اُنھیں دل کا زبردست دورہ پڑا۔ امریکہ کے قابل ڈاکٹروں نے اُن کا علاج کیا۔ اُس وقت امریکہ میں نکسن اور جانسن میں کشمکش تھی۔ وہ دونوں سے واقف تھے بحث مباحثوں میں زیادہ وقت گذرا۔ امریکہ کی سفارت کے دوران وہ زیادہ خوش نہیں تھے۔

۱۹۶۷ – ۱۹۶۸ء میں وہ دفاعی نظم و نسق اور ماہانہ منسٹر یٹیو ریفارمز کمیشن کے صدر بھی رہے۔ ۱۹۷۰ء میں امریکہ سے آنے کے بعد مہاراشٹر کی گورنرشپ ملی اور حسن و خوبی سے اُنھوں نے اس عہدے کو سنبھالا اور خراج تحسین لیا وہ سب پر آشکارا ہے۔ وزیراعظم مسز اندرا گاندھی نے یہ کہہ کر اُنھیں خراج عقیدت پیش کیا "علی نے آخر دم تک ہماری تہذیب کے اعلیٰ اقدار کی حفاظت کی۔ ملک کی خدمت کی جو بھی ذمہ داری قبول کی بڑے ہی خلوص و تپاک سے اور نیک نیتی کے ساتھ اُس سے عہدہ برآ ہوئے۔ وہ ان سب صفات و خصوصیات کے مالک تھے جو ہم نئی نسل میں دیکھنا چاہتے ہیں۔

علیؔ اول و آخر ایک سیدھے سادے عبادت گذار مسلمان تھے۔ نماز میں زیادہ وقت لیتے اور وہ لانبی دعا یہ کرتے کہ اُن سے ہر ایک کو فائدہ پہونچے اور کسی کا نقصان نہ ہو۔ علی انسان دوست اور ہمدرد آدمی تھے۔ غریبوں، ناداروں مفلس، اپاہجوں کے دُکھ کا اُنھیں بھرپور احساس تھا۔ اور جس طرح ہوتا اُن کی مدد کرتے۔ بزرگوں کی عزّت کرنا اُنھوں نے اپنے بزرگوں سے سیکھا تھا۔ جب بھی بمبئی سے حیدرآباد آتے اپنے شفیق اُستاد ہنمنت راؤ کے گھر ضرور جاتے۔ بلومن صاحب جنھوں نے بچپن میں اُنھیں پڑھایا تھا، جب تک زندہ رہے برابر اُن کے گھر جاکر ملے۔ سوتے ہوتے تو اندر جاکر چپکے سے دیکھ آتے۔ ہر ملنے جُلنے والے دوست ہو یا رشتہ دار تھوڑی دیر کے لئے ضرور دیکھ آتے۔ اُن کے دُکھ سُکھ میں ساتھ دیتے۔ جب اُن سے کوئی خط و کتابت کرتا وقت نکال کر ضرور اُس کا جواب دیتے۔ بہت ہی خوش خُلق اور نرم زبان تھے۔ کسی نے اُنھیں ڈانٹتے یا غصّہ ہوتے نہیں دیکھا۔ بچوں سے اُنھیں بے حد محبّت تھی۔ بچّوں کے ساتھ وہ بچہ بن جاتے۔ اُن کی زبان میں بات کرتے، اُن سے کھیلتے مذاق کرتے۔ بیوی کے پرستار تھے اور بچّوں کے شفیق باپ تھے۔ بیوی کے جذبات کا اُنھیں بہت خیال تھا اور کبھی اُس کا دل نہ دکھاتے۔ بیوی اُن کے پاس ہر ایک سے پہلے اور بڑھ کر تھی۔ زہرا نے بھی بیوی کا فرض ادا کیا اور ہر موڑ پر علی کا ساتھ دیا۔ علی کی ہم نشینی نے زہرا کو ہمدوشِ ثریّا کر دیا اور زہرا کی قربت نے علی کو سُکھ چین کی زندگی دی۔

علی کا مذاق نہایت شُستہ اور اعلیٰ ہوتا گھر ہو یا دفتر، کوئی فنکشن ہو یا بسترِ علالت وہ اپنے مخصوص مزاح کو زندہ رکھتے۔ رشتہ دار اور دوستوں کے ساتھ اُن کی شرارتوں کے قصّے بھُولے نہیں جاسکتے۔ قبرستان میں بھُوت بناکر وہ اپنی ممانی کو ڈراتے، پی کے گھوش کے کمرے میں ریچھ باندھ کر اُن کی گھبراہٹ سے لُطف اندوز ہوتے۔ غوث محی الدین کے ساتھ بہت سی شرارتیں یادگار ہیں۔ ڈاکٹر بنکٹ چندر۔ اُن کے خاص ڈاکٹر تھے جو ہر وقت اُن کے دوستوں کی تیمارداری اور مدد کے لئے تیار کئے جاتے۔ ملٹری گورنری جنرل چودھری کے ساتھ سر پر بندُو مال باندھ کر شہر میں رکشا چلاتے۔ اور دیکھتے کہ پولیس ایکشن پر عوام کا کیا ردِّ عمل ہوا۔ ہر آدمی کے ساتھ مختلف قسم کی شرارتیں اور مختلف قسم کا مذاق کیا جاتا۔ مرتے دم تک اُنھوں نے مذاق کرنا نہیں چھوڑا بلکہ بسترِ مرگ پر بھی اپنے ڈاکٹروں سے مذاق کرتے رہے۔ ایک زندہ دل انسان تھے۔ اُنھوں نے لوگوں کو زندہ رہنے کی لگن دی اور اور اُداسیوں میں اُجالے بھر دئیے۔

اُنھوں نے امیر خسروؔ کی زندگی اور کلام پر مفصّل کتاب لکھی۔ اپنے نانا عماد الملک کے عاشق تھے چنانچہ عماد الملک کی زندگی اور اُن کے دور پر حیدرآباد کی تاریخ لکھ رہے تھے۔ اس سلسلے میں بلگرام بھی گئے۔ اور مختلف مواد جمع کیا۔ اُن کی مصروف زندگی اور وقت نے اُن کا ساتھ نہیں دیا اور یہ کتاب ادھوری رہ گئی۔ علی فارسی، اُردو، انگریزی اور فرنچ زبانوں میں اچھی مہارت رکھتے تھے۔ اُن کی لائبریری میں پُرانی پُرانی نایاب کتابیں تھیں جنھیں وہ بہت عزیز رکھتے تھے۔ انتقال سے پہلے اُنھوں نے عثمانیہ یونیورسٹی کو پانچ ہزار ایسی نادر کتابیں دیں جس کے لئے عثمانیہ یونیورسٹی ہمیشہ فخر کرے گی۔ اُنھوں نے ایک ماہ نامہ "آن ورڈ" بھی نکالا تھا جس کی ادارت کے فرائض وہ خود انجام دیتے۔

علی ماں کے فدائی تھے۔ اپنی ماں کی تصویر کے نیچے علی نے لکھا تھا:

"بہشت نصیب خلد مکاں"

جنّت آشیاں مرحومہ و مغفورہ والدہ مکرمہ جن کی ذات ایک اعلیٰ قوم کیلئے سرمایۂ فخر و مباہات تھی جن کی پاک زندگی اسلام کی سچی تہذیب کا نمونہ تھی اور جن کی شعاعِ اُلفت و محبّت نے میرے لئے دنیا کے بے شمار تاریک راستوں کو منوّر کر دیا تھا۔ وہی جس نے ایک گُم کردہ سبیل کو یعنی مجھے صراطِ مستقیم دکھلائی جس نے میرے دل میں خدا شناسی اور دین داری کے اصل گوہر جڑ دیئے۔

امیر خسرو کی ایک مثنوی "لیلیٰ مجنوں" کے وہ اشعار جس کو امیر خسرو نے اپنی ماں کی موت پر لکھے تھے، علی کو اپنی ماں کی یاد دلا گئے۔ اپنی تینوں بہنوں کے نام اُنھوں نے ان اشعار کی نقل کرواکر اپنے خط کے ساتھ بھجوائی۔

اے مادرِ من کجائی آخر
روی از چہ نمی نمائی آخر
خنداں ز دلِ زمین بروئی آئی!
بہ گریۂ زارِ من بہ بخشائی!
ہر جاکہ زپائی تو غبار یست
مارا از بہشت یادگار یست
ذاتِ تو، کہ حفظِ جانِ من بُود
پشتِ من و پشتیبانِ من بُود
روزی کہ لبِ تو در سخن بُود
پندِ تو صلاحِ کارِ من بُود

امروز منہ بہ مہر بپیوند

خاموش نو ہی دہد پند

اور آخر میں لکھا۔ الجنتہ تحت قدوم امہاتکم "

۱۱ دسمبر ۱۹۷۶ء کی صبح علی نے بیوی کے ساتھ چائے پی۔ پھر لفٹ کے ذریعہ نیچے اپنے دفتر میں آکر کام کرنے لگے۔ راج بھون کے دربار ہال میں کسی فنکشن کا انتظام ہو رہا تھا۔ زہرا انتظام دیکھ کر واپس آئیں تو دیکھا علی کا دم پھول رہا ہے۔ علی نے بتایا کہ وہ نہانا چاہتے ہیں۔ اور اوپر آکر وہ نہانے چلے گئے۔ نہاکر باہر نکلے تو سر پکڑ کر بیٹھ گئے ہیں۔ انھیں آکسیجن دی گئی اور کرسی پر بٹھا کر ان کے کمرے میں لایا گیا۔ علی نے پہلی بار ڈاکٹر کو بلانے کی خواہش کی سبھی ڈاکٹر بلائے گئے۔ انھیں انٹرا وینس انجکشن کی ضرورت محسوس ہوئی لیکن کمزوری اور لو بلڈ پریشر کی وجہ سے پہلے گلوکوس کا چڑھانا ضروری سمجھا گیا۔ ڈاکٹروں نے نالیاں لگائیں لیکن گلوکوس نہ پہنچ سکا سوچا کہ پیر کی درید (VEIN) کاٹ کر وہاں سے گلوکوس چڑھایا جائے لیکن علی نے کہا " آج تک میں نے ہر چیز برداشت کی ہے اب سوئی کی چبھن بھی مجھ سے برداشت نہیں ہو سکتی ۔ مجھے تکلیف مت دینا " انھیں ہر طرح کی امداد پہونچائی گئی لیکن حالت گرتی چلی گئی ۔ PACE MAKER جو ان کے دل کے قریب چند مہینے پہلے لگایا گیا تھا وہ ان کی مدد نہ کر سکا کیونکہ دل کے عضلات MUSCLES کمزور ہو گئے تھے۔ پھر انھوں نے کہا " اب سب بے کار ہے۔ میں ایک بیمار آدمی کی طرح جینا نہیں چاہتا " پھر انھوں نے اپنی بیٹی کو بلایا' اقتدار حسین کو بلایا جن سے کچھ مہینے قبل اپنی وصیت کہی تھی کہا " اب وقت آگیا ہے مجھے راج بھون کی مسجد میں نہلانا اور حیدرآباد لے جاکر عماد الملک کے مقبرہ میں دفن کرنا مگر کسی کو میرا چہرہ نہ دکھانا۔" شاید یہ خیال ہوا کہ چہرہ دیکھنے سے اپنے لوگ تڑپ جائیں گے۔ پھر وہ زہرا کی طرف پلٹے۔" آج تمہیں بچوں کے فنکشن میں جانا ہے" زہرا نے کہا کہ وہ اسے ملتوی کر دیں گی مگر علی نے کہا " نہیں زہرا پبلک اپیرنس PUBLIC APPEARANCE بہت ضروری ہے۔ اگر تم نہ جاؤگی تو مجھے بہت رنج ہوگا " لا محالہ زہرا کو فنکشن میں جانا پڑا جہاں مسز اندرا گاندھی افتتاح کر رہی تھیں' واپس آئیں تو علی نے پوچھا " کیسا رہا فنکشن ؟ زہرا نے بتایا بہت اچھا" علی نے تعریف کی " تم جو کام کرتی ہو اچھا کرتی ہو" زہرا نے علی کے جملے سے متاثر ہو کر کہا " جو کچھ میں نے سیکھا ہے تم سے ہی سیکھا ہے علی " پلٹ کر ڈاکٹر سے کہا ۔

MY WIFE IS A PERFECTIONIST

شاعر بمبئی

پھر علی نے اپنے سکریٹری کو بلا کر مسز گاندھی کے استقبال کو نہ جانے کی وجہ ایک پریس نوٹ میں خود ہی لکھوائی۔

" ڈاکٹروں نے مجھے جانے کی اجازت نہیں دی اس لئے میں مسز اندرا گاندھی کے استقبال کے لئے نہ جا سکا۔" یہاں بھی انھیں اپنی ذمہ داری کا خیال ستاتا رہا۔

دربار ہال میں اندرا گاندھی آ رہی تھیں علی نے زہرا کو بھجوایا کہ ان کی جگہ وہ وزیر اعظم کا خیر مقدم کریں۔ کیونکہ وہ نہ جا سکیں گے ۔ وزیر اعظم نے علی کا مزاج پوچھا۔ زہرا پھوٹ پڑیں۔" وہ بہت بیمار ہیں۔" وزیر اعظم نے ملنے کی خواہش کی۔ علی نے کمرے میں بلوایا" پوچھا آپ کیسی ہیں" کانپتا ہوا ہاتھ ملانے کے لئے آگے بڑھایا۔

اور پھر تین بار علی کے منہ سے نکلا

" ممّاں ۔ ممّاں ۔ ممّاں " سب دیکھتے ہی رہ گئے اور طیبہ کا عظیم بیٹا طیبہ کے قدموں میں پہونچ گیا ۔

" الجنتہ تحت قدوم اُمہاتکم "

(بشکریہ روزنامہ سیاست حیدرآباد)

بقیہ : نقد و نظر صفحہ ۹۴

سنجیدہ بات کہہ کر اس کے ساتھ ہیٹی ہیڈ گنگس قسم کا جملہ چپکا دینا الفاظ سے کھیلنا' بیان میں مبالغہ کرنا اور سب سے بڑھ کر پیراگراف کے اخیر میں وہ جملہ بازی جسے انگریزی میں "پنچ لائن" کہتے ہیں۔

بائیس ۲۲ مضامین پر مشتمل اس کتاب میں علمی' ادبی' فنی شخصیات سے متعلق اکیس شخصی مضامین اور ایک " بمبئی کا ادبی جغرافیہ " شامل ہے۔ خاکوں میں اشفاق حسین باز بیدی' جاں نثار اختر' ڈاکٹر حامد اللہ ندوی' شوکت علی خاں کے خاکے یوسف ناظم کے شاہکار ہیں جن میں ان کے قلم کی تیزی اور کاٹ کے ساتھ نرمی اور لطف اپنے شباب پر نظر آتی ہے۔ اس تبصرہ نگار کو یہ اعتراف کرنے میں کوئی باک نہیں کہ اس نے یہ کتاب ایک سے زیادہ مرتبہ پڑھی ہے اور مذکورہ خاکوں کو کئی مرتبہ پڑھا ہے۔ کتابت و طباعت عمدہ۔ (یونس اگاسکر)

پاپا ہم شہر کب لوٹیں گے

دُصرو جاسُوال

(ہندی)

ترجمہ: شرافت حسین
قاضی پورہ ٹانڈہ۔ فیض آباد (یوپی)

ابھی جب گومتی مسہری کے پائے اور پاٹیوں کے اسکرو کھول کر انھیں الگ الگ کر رہی تھی تبھی اُس کی نگاہ مسہری کے سر ہانے والے پلائی بورڈ کے ایک کونے پر کھرچ کر لکھی تاریخ پر پڑی۔ اُس کا من اندر سے بھر بھر ا اُٹھا۔ جیسے ڈھیر سارے خوبصورت لمحوں کی یادیں خوش رنگ تتلیوں کی طرح مسہری کے کونوں پر ایک لمبے عرصے سے بیٹھی رہی ہوں اور اچانک حال کی ایک ہلکی تھپکی سے پھڑپھڑا کر اُس کے ارد گرد اُڑنے لگی ہوں ـــ ادھ مٹی تاریخ کو دیکھ کر گومتی کو یاد پڑا سات آٹھ برس پہلے سُدھیر کی دفعہ اُس نے بہت ہی بچپنے انداز سے تاریخ یاد رکھنے کی خاطر ہیر پن سے اس جگہ کھرچ کر لکھ دیا تھا۔ اپنی کسی چیز کو جس کے ساتھ بہت ساری پُر کشش گواہیاں جڑی ہوں، اپنے ہی ہاتھوں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم کرنا من کو کیسا کیسا لگتا ہے۔ اور وہ بھی ایک ایسی گواہی جو اپنے تن من میں پوشیدہ سی خوشبوؤں کی مانند رچی بسی ہو!

اُسی وقت رمن نیچے سے آئے اور انھوں نے گومتی کی حالت سے انجان بنتے ہوئے کہا ـــ "ٹھیلے والا آگیا ہے۔ ۔ ۔ ڈریسنگ ٹیبل کی دراز سے سارا سامان نکال لیا ہے نا؟"

"ہوں" گومتی نے بھاری من سے کہا۔ ایک لمحے بعد دھیمے لہجے میں اتنا اور کہا ـــ "یہ مسہری دینے کو من نہیں کرتا ہے، کیسی کیسی یادیں اس میں کھُدی ہیں"

ابھی کچھ دیر پہلے رمن کے چہرے پر جو ایک تناؤ تھا، گومتی کی بے بسی ہوئی بات سُن کر ڈھیلا پڑ گیا اور انھوں نے بھی تھکی ہاری آواز میں کہا ـــ "میرا من تو کوئی بھی چیز دینے کو نہیں کرتا ہے۔ لیکن یہ سارا فرنیچر گاؤں تک پہنچنے میں ٹوٹ پھوٹ جائے گا ۔ ۔ ۔ پھر میں "اولڈ فرنیچرس مارٹ" والوں سے بات کر کے آیا ہوں۔"

گومتی جواب میں کچھ نہیں بولی۔ صرف گھوم کر ایک بار رمن کا مظلوم سا چہرہ دیکھا۔ مجبوری کا رنگ کتنا دھندلا ہوتا ہے، اُس نے اچھی طرح غور کیا، اُسے لگا جیسے رمن اس موضوع کے اصل معنوں کو ایک کڑوے گھونٹ کی طرح اُس کی نظر بچا کر چُپ چاپ نگل گئے ہیں!

ابھی کل رات ہی رمن کہہ رہے تھے ـــ "دلیش پانڈے اور مہتہ وغیرہ کو کُل ملا کر ڈیڑھ ہزار دینے ہیں۔ ویسے بھی اِس سارے فرنیچر کو ساٹھ میل دُور گاؤں لے جانا فضول ہے۔ پھر گاؤں والے مکان میں کوئی خاص اتنی جگہ بھی تو نہیں جہاں اتنا سامان قرینے سے رکھا جا سکے۔ ۔ ۔"

اپنے ہی اندر چھپے لگاؤ کو چُپ چاپ پھلانگ جانے کی مجبوری ایک عجیب طرح کی ٹریجڈی ہوتی ہے! ـــ رمن کا چہرہ کسی بُت کی طرح جذبات سے عاری نظر آنے لگا۔ وہ مزدوروں سے سامان نیچے اُتروانے میں لگ گئے۔

سامان جب نیچے ٹھیلے پر لادا جا رہا تھا تو گومتی ایک بار بالکنی کی طرف گئی تھی۔ اُس نے دیکھا، اِس مینشن کے دوسرے لوگ ٹھیلے پر لدتے سامان کو نہ جانے کس انداز اور بے لجی نگاہوں سے دیکھ رہے تھے، گومتی کو لگا جیسے اُن نگاہوں کو برداشت نہیں کر پائے گی۔ جب کبھی ایک معیار کے نقصان کو جھانکنے کی ذمہ داری دوسروں پر چلی جاتی ہے تب اُس مظلوم شخص کے حصے میں صرف شرمندگی کی حالت ہی باقی رہ جاتی ہے۔ کچھ ایسے ہی حالات جھیلتی ہوئی گومتی بالکنی پر سے فوراً ہٹ کر کمرے میں چلی آئی۔

رات کو بغل والے فلیٹ کے مہتہ صاحب رمن سے ملنے آئے۔ ڈرائنگ رُوم میں ایک عجیب خالی پن چپکا ہوا تھا۔ سب ایک دم اُجڑا اُجڑا لگ رہا تھا۔

مہتہ صاحب کے لئے رمن نے گومتی سے دری منگا کر فرش پر بچھوا دی اور تبھی جیسے ڈرائنگ روم کا خالی پن رمن کے اندر ڈھلک آیا۔ رمن نے جیسے کسی ان دیکھے ڈر سے بچتے ہوئے کہا ـــ "کل گاؤں جانے کی تیاری ہو رہی ہے۔"

"ہاں، آج شام دفتر سے لوٹ کر میں نے بھی سُنا کہ آپ کل پریوار کو دیس بھیجنے جا رہے ہیں۔" مہتہ صاحب نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

کبھی کبھی ننگے پن کی حالت جب پوری طرح ظاہر ہونے کی مجبوری میں ہوتی ہے

تب کسی شخص میں خود بخود بہت صاف گوہونے یا سچائی کی زمین کو چھونے کی عجیب لاچاری بڑھ جاتی ہے۔ رمن نے بڑے بے باک لہجے میں مہتہ صاحب سے کہا — "پچھلے ایک سال سے مل میں تالابندی چل رہی ہے اور ابھی کوئی بھروسہ بھی نہیں ہے کہ کب تک ایسی حالت رہے گی۔ پھر مہنگائی اس قدر بڑھتی جارہی ہے کہ پریوار کو اب اتنے مہنگے کرایہ والے فلیٹ میں رکھ پانا بس کی بات نہیں رہی۔ ویسے مجھے تو یہاں رہنا ہی پڑے گا۔ اپنے اکیلے رہنے کے لئے ایک چھوٹا سا کمرہ SUBURB میں لے لیا ہے"

مہتہ صاحب چپ چاپ ہمدردانہ نظروں سے رمن کو دیکھتے رہے۔ جیسے وہ کسی پختہ دیوار کو بھر بھراتے دیکھ رہے ہوں!

تبھی سُدھیر کمرے میں آیا اور خالی کپ پلیٹ اٹھا کر لے گیا۔ شاید سُدھیر کو دیکھ کر ہی مہتہ صاحب نے کہا — "سُدھیر اور انجو آپ کے یہ دونوں بچے بہت INTELIGINT اور فرماں بردار ہیں۔ وہاں گاؤں میں تو کوئی اچھا اسکول ہوگا نہیں۔ بچاروں کو وہاں کا ماحول بھی اجنبی سا لگے گا۔ یہاں جیسی اچھی سوسائٹی بھی وہاں نہیں ہوگی"

"کسی طرح وہاں ADJUST تو کرنا ہی پڑے گا۔ ویسے میں نے بچوں کو ابھی یہی بتایا ہے کہ انہیں چھٹیوں بعد لوٹنا ہے۔ سچ بتاتا تو وہ بہت FEEL کرتے۔" اتنا کہتے کہتے رمن مسکرائے تو ضرور لیکن ایسا لگا جیسے اُن کے ہونٹوں پر کانچ کی کرچیں چبھ گئی ہوں۔

سُدھیر اور انجو کمرے میں ساتھ ساتھ آئے اور مہتہ صاحب کے پاس بیٹھ گئے۔ مہتہ صاحب نے بڑے پیار سے ایک گہری خاموشی کے ساتھ دونوں کے بالوں کو سہلایا۔ دونوں چپ چاپ جیسے مہتہ صاحب کی خاموشی کا مطلب اپنے بابا کے چہرے پر ٹٹولنے لگے۔

صبح جانے کی تیاری ہو رہی تھی۔ سامان پیک کیا جارہا تھا۔ سُدھیر نے دیکھا۔ گومتی اُس کے اسکول کا ڈریس بھی ٹرنک میں ڈال رہی تھی۔

سُدھیر نے تپاک سے گومتی کے پاس آکر کہا۔ "ممی! اسکول کا ڈریس گاؤں لے جانے کی کیا ضرورت ہے؟ چھٹیوں بعد تو لوٹنا ہی ہے"۔

گومتی کا ہاتھ لمحہ بھر کے لئے رُک گیا اور وہ تھوڑی دیر سُدھیر کا معصوم چہرہ تکتی رہ گئی۔ پھر اُس نے دھیرے سے کہا — "کیا ہوا جب لوٹیں گے تو لے آئیں گے۔"

"میرا کرکٹ والا بیٹ کہاں ہے؟ اُس کو ساتھ مت لے چلنا۔ گاؤں میں کس کے ساتھ کرکٹ کھیلیں گے۔ مہتہ انکل کہہ رہے تھے کہ تم شاید بہت

بڑے ہوکر بہت بڑے کرکیٹر ہوگے، روز پریکٹس کیا کرو۔ گاؤں سے لوٹ کر میں روز پریکٹس کروں گا۔ سُدھیر نے جیسے کسی روشن مستقبل کے ٹکڑے کو مٹھیوں میں بند کرتے ہوئے کہا۔

گومتی جواب میں چپ رہی اور ایک اُبلتی خاموشی کے ساتھ ٹرنک میں کپڑے بھرتی رہی۔

سُدھیر کو گومتی کی یہ منحوس سی خاموشی اچھی نہیں لگی۔ وہ دوبارہ کچھ پوچھنے ہی جارہا تھا تبھی اُسے یاد پڑا، جب ممی اس طرح اُس کی باتوں کا جواب نہیں دیتی تو دوبارہ پوچھنے پر اُسے ڈانٹ سہنا پڑتی ہے۔ وہ ایک خوف بھری نگاہ گومتی پر ڈالتا ہوا کمرے سے باہر چلا گیا۔

تھوڑی دیر بعد سُدھیر ہاتھ میں بیٹشل باکس لئے واپس آیا اور کئی لمحوں تک گومتی کے بجھے بجھے چہرے کو دروازے کے پاس کھڑا چپ چاپ دیکھتا رہا۔ اِس بار سُدھیر کا اِس طرح دیکھتے رہنا گومتی کو عجیب سا لگا۔ جیسے سُدھیر نے کسی جلتے ہوئے کپڑے کی کسیلی سی مہک پکڑ لی ہو!

"چلو کپڑے پہن کر تیار ہو جاؤ۔ انجو کدھر ہے؟ اُسے بھی تیار ہونے کو بول دو۔ تمہارے پاپا ٹیکسی لے کر آتے ہوں گے۔" گومتی نے ایک جھٹکے کے ساتھ جیسے سُدھیر کے خاموش چہرے کو لانگھتے ہوئے کہا۔

چند لمحوں تک سُدھیر ویسے ہی چپ چاپ گومتی کا چہرہ دیکھتا رہا اور پھر روہانسی آواز میں — "ابھی میں مہتہ انکل کے ہاں دیپو سے ملنے گیا تھا دیپو نے پھر کا یہ بیٹشل باکس واپس کردی ہے۔ وہ کہہ رہا تھا، اِسے ساتھ لیتے جاؤ اب تم شہر لوٹ کر نہیں آؤ گے۔ کیا دیپو سچ کہہ رہا تھا ممی؟"

سُدھیر کا یہ سوال جیسے کسی فضول چیز کی طرح اونچائی سے گر کر ٹوٹ بکھر گیا۔

رمن تیزی سے اوپر آئے اور ہڑبڑاہٹ میں گومتی سے بولے۔

"جلدی کرو ٹرین کا وقت ہو رہا ہے۔"

سُدھیر کا وہ سوال ٹوٹ کر دوبارہ جڑا نہیں۔ کسی سچائی میں اتنی تیز آنچ ہوتی ہے کہ اُسے نہ چھونے کی بھی ایک عجیب مجبوری ہوتی ہے —

سُدھیر خاموش ہی رہا۔

ٹیکسی میں بیٹھتے وقت گومتی نے غور کیا کہ اِس بلڈنگ کے لوگ اپنی اپنی بالکنی پر کھڑے ہو کر نہ جانے کسی نگاہ سے انھیں جاتے دیکھ رہے تھے جیسے وہ سب کسی جاتے ہوئے جنازے کو خاموشی سے دیکھ رہے ہوں۔ گومتی نے اپنے بغل میں اُداس بیٹھے سُدھیر کو رستی آنکھوں سے دیکھا۔ کنارے

دالی بالکنی سے شاید مہتہ صاحب کا بچہ دیپو ہاتھ ہلا رہا تھا لیکن سُدھیر نے اُسے جیسے جان بُوجھ کر نظر انداز کر دیا۔ اب بھی اُس کے ہاتھ میں دیپو کا دالیس کیا ہوا پینسل باکس بھیچا پڑا تھا۔

"لاؤ، اِسے بیگ میں رکھ دیں۔" گومتی نے سُدھیر کے تپتے ہوئے خیالوں پر سایہ ڈالنے کی کوشش کرتے ہوئے پینسل باکس اُس کے ہاتھ سے لے کر بیگ میں ڈال دیا!

پرلیوار کو گاؤں پہونچا کر رمن واپس کلکتہ آ گئے تھے پھر پُورے ایک سال بعد ہی گرمیوں میں گاؤں جانا ہوا۔ گھر کے پیچھے آم کا باغ پڑتا تھا۔ وہ جب اِس باغ میں سے گذر رہے تھے تو اُن کی پیٹھ پر ایک کچی امیا آ کر لگی۔ رمن نے جھنجھلا کر اُس پیڑ کے اُوپر دیکھا، گاؤں کے کئی لڑکوں کے ساتھ سُدھیر بھی کرکٹ والی بیٹ سے پیڑ کی ڈال کر بیٹھ کر امیا توڑ رہا تھا۔

"ہمارے پاپا آ گئے۔" کہتا ہوا سُدھیر پیڑ سے نیچے اُتر آیا اور اُن سے لپٹ گیا۔

"یہاں کیا کر رہے تھے؟ یہی سب یہاں کرتے رہتے ہو؟" ایک عجیب جھنجھلاہٹ بھری آواز میں یہ جملہ کہہ کر رمن نے سُدھیر کے ہاتھ سے بیٹ لے لیا۔ بیٹ کو غور سے دیکھا۔ وہ ایک دم بدرنگ ہو گیا تھا۔ جگہ جگہ لکڑی کے ریشے اُبھر آئے تھے۔ پھر اُنھوں نے سُدھیر کو دیکھا۔ اُس وقت وہ اپنے کلکتہ کے کانونٹ اسکول والی ڈریس پہنے ہوئے تھا۔ اُس کی نیلی قمیص کا کالر گندہ ہو کر پھٹ رہا تھا۔ رمن کو لگا، سُدھیر اپنی پہلے والی ساری پہچان کھو چکا ہے!

سُدھیر کو اتنی گندی حالت میں دیکھ کر رمن کو اُس وقت اُبل پڑنا چاہئے تھا لیکن اُنھیں لگا جیسے اُن کا سارا اُبال کسی مضبوط ڈھکن سے بند ہو گیا ہے! وہ چُپ چاپ سُدھیر کو ساتھ لئے گھر آ گئے۔

پُورے ایک ہفتہ رمن گاؤں رہے۔ لیکن سُدھیر نے کبھی اُن کے پاس بیٹھ کر دیپو کے بارے میں نہیں پُوچھا۔ یا اُن تمام بچوں کو نہیں پُوچھا جن کے ساتھ وہ کلکتہ والی مینشن کے سامنے پارک میں کرکٹ کھیلا کرتا تھا۔ رمن کو کئی بار لگا جیسے سُدھیر کی پچھلی ساری اخلاقی خوبیاں کسی اندھیرے کی تہہ میں دب گئی ہیں!

جتنے بھی دن رمن گاؤں رہے وہ ایک گہری نگاہ سے سُدھیر میں آئی ساری تبدیلیوں کو جانچتے اور محسوس کرتے رہے اس کے بارے میں گومتی سے کچھ شکایت کرنے کی ہمت نہیں پڑی یا پھر جیسے اُس سلسلے میں اُنھیں کوئی الفاظ نہیں مل سکے۔

جس دن رمن واپس جانے کی تیاری کر رہے تھے، سُدھیر اُن کے پاس آیا اور بھاری اُکتاہٹ سے پُوچھا ــــ "پاپا! اب ہم شہر کب لوٹیں گے؟"

شاعر۔ بمبئی

جواب میں رمن کچھ نہیں بولے۔ اُنھیں لگا، جیسے سُدھیر کے اِس نوکیلے سوال کے لئے وہ صرف تنہا جواب دِہ نہیں ہیں۔ اور تب سُدھیر کا وہ سوال پھر کسی ٹوٹنے والی شے کی طرح کہیں دُور اُونچائیوں سے گِر کر ٹوٹ بکھر گیا!! ○

غزلیں

منظور ہاشمی

گرچہ خود کو بہت بااُصول کہتا تھا
عجیب شخص تھا، زخموں کو پھول کہتا تھا

زمیں کی تہہ میں بھی اسکو جگہ نہ مل پائی
جو آسمان کو قدموں کی دُھول کہتا تھا

کتاب درد کی، روشن تھیں اس پہ تحریریں
وہ اہلِ درد کو آلِ رسول کہتا تھا

ملول کر نہ سکا اس کو موسمِ گریہ
کہ آنسوؤں کو وہ پلکوں کے پھول کہتا تھا

سے بھی کھیلتے دیکھا گیا کھلونوں سے
جو ایسی باتوں کو بے حد فضول کہتا تھا

لہو کا رنگ جھلکتا تھا سُرخ پھولوں سے
مگر وہ اس کو، نگاہوں کی بھول کہتا تھا

○ شعبۂ تعلیم مسلم یونیورسٹی۔علیگڈھ

شاعر۔ بمبئی۔

جبار جمیل

سمجھ رہا ہے مرادور باکمال مجھے
مرے خدا، اسی احساس سے نکال مجھے

میں صرف ہجر نہیں وصل کا بھی دریا ہوں
شناوری سے ذرا کام لے، کھنگال مجھے

زمیں سے سُوئے فلک گر رہا ہوں تیزی سے
کہیں میں ٹوٹ نہ جاؤں ذرا سنبھال مجھے

نہ جانے کون سا موسم ہے یہ بلاوے کا
عُروج کو میں بلاتا ہوں اور زوال مجھے

سکوتِ آب جُدا کر گیا تھا ساحل سے
وہ ایک لہر تھی جو کر گئی بحال مجھے

○ معرفت روزنامہ "سلامتی"
بی بی مسجد۔ مومن پورہ۔ گلبرگہ ۲

وجیہہ ادیب

چشمِ ماضی میں ہیں ادوار کے پیکر کتنے
اور ہر دور کے سینہ میں ہیں خنجر کتنے

وقت نے پھینکے مری راہ میں پتھر کتنے
یہ نہ سوچا مرے پیچھے ہیں سکندر کتنے

کل بزرگوں کے بیانات تھے کتنے سادہ
آج ہر لفظ کے پہلو میں ہیں دفتر کتنے

ہائے! یہ بحر! کہ بے آب ہے، بے فیض بھی ہے
اُف! وہ دریا، کہ نہاں اُس میں سمندر کتنے

مجھ سے آزردہ مسافر نے ہی احسان لیا
یُوں تو ہر موڑ پہ تھے خیر سے رہبر کتنے

بے گھری کا مجھے اپنی نہ رہے گا شکوہ
جب یہ سوچونگا کہ دنیا میں ہیں بے گھر کتنے

○ بچھراؤں۔ ضلع مرادآباد۔ (یوپی)

دائرے اور دائرے

ممتاز شکیب
آل انڈیا ریڈیو جے پور

افراد:۔ ایک نوجوان لڑکا ۔ الٹرا ماڈرن لڑکی ۔ اور ایک عورت

منظر:۔ ایک اسٹوڈیو نما کمرے میں سوائے ایک اسٹول اور اسی کے نزدیک اسٹینڈ پر رکھے ہوئے خالی کینوس کے اور کچھ نہیں ہے۔ دیواروں پر کہیں کہیں ننگی عورتوں کی تصویریں آویزاں ہیں اور سامنے کی دیوار پر تسخیر چاند کی بڑی سی تصویر میں ایک آدمی خلا سے چاند کی بنجر زمین پر اُترتا ہوا دکھایا گیا ہے۔ اِسی تصویر کے مقابل ایک پریشان سا نوعمر ہپّی نما لڑکا اُسے غور سے دیکھ رہا ہے اور پھر اُس تصویر کو دیکھتے دیکھتے خود سے اِس طرح مخاطب ہوتا ہے جیسے ہذیانی کیفیت میں بڑبڑا رہا ہو۔

لڑکا۔ چاند پر اُترتے ہوئے ۔۔ اُس آدمی کو دیکھ کر ۔۔ لگتا ہے کہ اب ۔۔ انسان کے پیروں تلے وہ زمین نہیں ۔۔ جس پر وہ صدیوں سے کھڑا تھا ۔۔۔! (اس کے الفاظ فضا میں گونج رہے ہیں کہ اچانک اسکرٹ اور بلاؤز پہنے ایک تیز طرار الٹرا ماڈرن خوبصورت لڑکی جو تقریباً اُسی کی ہم عمر ہے چہکتی ہوئی اندر داخل ہوتی ہے)

لڑکی۔ ہائے ۔۔۔ ببّل!"

لڑکا۔ کون ۔۔۔ جمی ۔۔۔!" وہ ایک دم چونک پڑتا ہے)

جمی۔ او یس مائی پیٹ! یور جمی your Jimmy

ببّل۔ کیا ۔۔ تم ۔۔۔۔

جمی۔ کیا تمہیں اب بھی یقین نہیں کہ یہ میں ہوں! تمہاری جمی ۔۔؟

ببّل۔ لیکن ۔۔۔۔

جمی۔ لیکن کیا ۔۔ یہ سُن کر تمہیں اور بھی زیادہ خوشی ہوگی مائی پیٹ کہ میں آج اپنا وہی نیوڈ بنوانے آئی ہوں جس کے لئے تم مجھے پچھلے کئی مہینوں سے مجبور کر رہے تھے۔ (وہ بڑھ کر اُس کے گلے میں باہیں ڈال کر کہہ رہی ہے اور ببّل بے حس و حرکت خاموش کھڑا ہے)

ببّل۔ لیکن ۔۔۔ اِس سے پہلے ۔۔ تم نے کبھی اِس نیوڈ کا ماڈل بننا گوارا نہیں کیا تھا ۔۔!

جمی۔ ہاں ۔۔۔ (وہ اِس سے الگ ہٹ کر فضا میں برس اُچھال کر کہتی ہے) لیکن آج میں اِس نتیجے پر پہنچی ہوں ببّل کہ اگر میں ۔۔۔ تمہارے سامنے کچھ دیر ۔۔ اِس آرٹ کی خاطر ۔ ننگی کھڑی ہو جاؤں تو ۔۔۔ کیا حرج ہے ۔۔!

ببّل لیکن مجھے اچھی طرح یاد ہے جمی کہ کل تک تم نے میرے ہزار کہنے پر بھی ایسا نہیں سوچا تھا۔

جمی۔ او یس! (وہ ایکدم اُس کی طرف پلٹتی ہے) کل تک ۔۔ میں دراصل میں اِسے اچھا نہیں سمجھتی تھی ببّل!

ببّل۔ اور ۔۔۔ آج ۔۔۔!

جمی۔ آج! (وہ اچانک سنجیدہ ہو کر دانتوں سے الفاظ پیسنے لگتی ہے) آج ۔۔ میرے لئے کوئی بھی چیز اچھی اور بری نہیں ہے ۔۔ سب کچھ فراڈ ہے ۔۔۔ وہ ایکدم زور سے قہقہہ لگاتی ہے تو ببّل اُسے گھورنے لگتا ہے) میں ۔۔ تم ۔۔ ممّی اور تمہارے ڈیڈی ۔ ایکدم فراڈ ۔۔۔ ہاہاہاہا ۔۔۔۔ ....

"ارے یہ تم مجھے ۔۔ اِس طرح گھور کیوں رہے ہو ۔۔۔ (وہ نارمل ہو کر کہتی ہے)

کیا تمہیں ـــ ابھی تک یقین نہیں آیا کہ میں آج تمہارے اسٹوڈیو میں ـ
اپنی ایک ننگی تصویر بنوانے آئی ہوں ـ کیا تم نہیں چاہتے تھے کہ
میں تمہارے اس نیوڈ کا ماڈل بنوں!

ٹبل ـ یہ ـــ صرف ـــ میں نے ـــ کل تک ـــ چاہا تھا ـ
(وہ کچھ پشیمان سا ہو کر انتہائی سنجیدگی سے کہتا ہے)

جمی ـ جو کچھ تم نے ـــ شدت کے ساتھ کل تک چاہا تھا ٹبل! وہ
میں ـــ آج چاہتی ہوں ـــ!

ٹبل ـ کیا مطلب ـــ! (وہ چونک کر اُس کی طرف دیکھتا ہے)

جمی ـ یہی کہ ـــ جہاں تمہارے شوق کی حدیں ختم ہوتی ہیں وہیں سے
آج میں ـــ اپنے شوق کی ابتدا کر رہی ہوں ـــ برش
اُٹھاؤ مائی پیٹ! آخر ـــ آج تم کس پریشانی میں مبتلا ہو ـ
آج تو میں ـــ تمہاری ایک دیرینہ آرزو پوری کر رہی ہوں ٹبل!

ٹبل ـ لیکن ـــ میں ـــ میرا ـــ مطلب ہے ـــ

پھر وہی کشمکش! دیکھو نا میرا یہ سڈول جسم، بھرا بھرا سینہ اور
کل ملا کر اس مُتنگیر کا ٹوٹل امپریشن کسی بھی طرح سونیا ـ روزی
اور بل سے کم نہیں ہے ـ اور پھر یہ کہ تم خود بھی کئی بار مجھے اپنے
بازوؤں کے حلقے میں لے کر کہہ چکے ہو کہ اگر ـ اس شاندار پیکر
کا نیوڈ کینوس پر اُتارا جائے تو وہ آرٹ کا ایک بہترین نمونہ ہوگا!"
(یہ کہتے کہتے وہ اُس کے سینے سے لگ جاتی ہے)

ٹبل ـ لیکن اِس وقت میرا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے جمی! خدا کے لئے
اب ان جملوں کو مت دہراؤ ـ!
(وہ اس سے الگ ہٹ کر اُکتاہٹ سے کہتا ہے)

جمی ـ کیوں ـــ آخر آج تم اتنے سیریس کیوں ہو ـ میرا خیال ہے
آج تم نے کوئی نشہ نہیں کیا ـ کیوں کیپ سول لوگے ـــ؟"

ٹبل ـ نہیں ـــ!

جمی ـ سوچ لو ـــ میرے پاس ابھی دو باقی ہیں ـ

ٹبل ـ میں جو کچھ سوچ رہا ہوں جمی! اُس کے بارے میں شاید تمہیں
ابھی کچھ نہیں معلوم ـــ!

جمی ـ کبھی کبھی تم بھی عجیب بات کرتے ہو ٹبل! (وہ ایک ایک کر کے
دو کیپ سول مُنہ میں ڈال کر کہتی ہے) کیا میں اتنا بھی نہیں
سمجھتی کہ جب فنکار اِس طرح ڈوب کر سوچتا ہے تو اس کا مطلب
شاعر بھی

ہوتا ہے کہ اُس کا شاعرانہ خیال اُس کے احساس کے دروازے
کھٹکھٹا رہا ہے ـــ!"

ٹبل ـ لیکن اس وقت میں ایک فنکار کے موڈ میں بالکل نہیں ہوں جمی!

جمی ـ او سمجھی! (وہ اچانک ایک ادائے والہانہ کے ساتھ ٹبل کی
ـــ طرف ایک آنکھ دبا کر مسکراتے ہوئے کہتی ہے) تو کیا
ـــ اِس وقت تم کچھ اور ـــ چاہتے ہو ـــ!"

ٹبل ـ جمی ـــ" (وہ ایکدم بوکھلا کر چیختا ہے)

جمی ـ دیکھو ٹبل! اِس وقت میں یہ نیوڈ بنوانے کے مُوڈ میں ہوں ـــ
کیونکہ اب تک بس ایک یہی کام نہیں ہوا باقی تمام ـــ

ٹبل ـ او ـ تو جمی پلیز! اب اِس نیوڈ کا نام مت لو"
(وہ گھبرا کر اپنے سر کے بال نوچنے لگتا ہے)

جمی ـ ڈونٹ بی سو نروس مائی پیٹ ـ تم نے اب تک نہ جانے ایسی
کتنی تصویریں بنا ڈالیں ـ اب بھلا جھجکنے کی کیا ضرورت ہے ـ
چلو ـ اسٹینڈ ٹھیک کرو ـ میں ابھی اندر سے کپڑے اُتار کر
آتی ہوں ـــ (وہ پلٹتی ہے)

ٹبل ـ نہیں ـــ!! (ٹبل پاگلوں کی طرح چیختا ہے لیکن جمی
ایک خاص ادا کے ساتھ مسکراتی ہوئی اسٹوڈیو سے ملحق چیمبر
میں چلی جاتی ہے اور ٹبل چیختا رہ جاتا ہے) جمی ـــ جمی
خدا کے لئے رہنے دو ـــ کپڑے مت اُتارو جمی فار گاڈ سیک ـ

جمی ـ اُف ـــ! (جمی اندر سے اپنی گردن نکال کر
جھنجلاتے ہوئے چیختی ہے) یہ تم اِس وقت اس بے چارے
گاڈ کو بیچ میں کیوں گھسیٹ رہے ہو ـ

ٹبل ـ تم ـ میری بات تو سنو ـــ!
(وہ اُس کی طرف بڑھتا ہے اور جمی ہنس کر مُنہ اندر کرتے ہوئے
کواڑ بند کر لیتی ہے) جمی!
خدا کے لئے دروازہ کھولو ـــ!
(وہ دروازہ پیٹتا ہے)

جمی ـ بقول تمہارے ـ انسان کو اس خدا کے خوف ہی نے اب تک
بزدل بنا کر رکھا ہے اس لئے اب بے فائدہ اس خوف سے
مجھے بزدل مت بناؤ ٹبل! تمہارا ـــ وہ بلیڈی گاڈ کہاں
ـــ ہے ـــ جلدی بتاؤ ـــ نہیں تو میں باہر اسی طرح ننگی

چلی آؤں گی۔ اور یہ رہا ــــ ڈونٹ وری ہٹّل! گاؤن مل گیا۔ (وہ اندر سے ہی اونچی آواز میں بولتی ہے اور ہٹّل بڑی بے چینی سے دروازے کے سامنے اِدھر اُدھر ٹہل رہا ہے ...)

کیوں ہٹّل! میک اپ چلے گا ــــ وقفہ ــ)

میرا تو خیال ہے نیوڈ میں لوگ چہرہ کم اور جسم زیادہ دیکھتے ہیں اس لئے شاید میک اپ ضروری نہیں ہے ــــ اچھا تو ــــ

اب میں باہر آ رہی ہوں ــــ!

(جمی جیسے ہی آنے کی اطلاع دیتی ہے ہٹّل گھبرا کر چاروں طرف دیکھتا اور جیسے ہی چیمبر کا دروازہ کھُلتا ہے تو وہ بڑھ کر لائٹ آف کر دیتا ہے۔ کمرے میں اندھیرا چھا جاتا ہے تو جمی زور سے چیختی ہے۔

جمی۔ یہ روشنی کو کیا ہوا ــــ؟

ہٹّل۔ بجلی فیل ہو گئی ہے ــــ

جمی۔ تو پھر ایمرجنسی لائٹ آن کر دو ــــ!

ہٹّل۔ "ایمرجنسی لائٹ ــــ؟؟"

جمی۔ ہاں ــــ تمہارے چیمبر میں رکھی ہوئی ہے۔ میں ابھی لاتی ہوں ــــ وقفہ .....

(اور پھر کچھ دیر بعد ــــ روشنی کی ایک گہری دودھیا لکیر نمودار ہو کر اُن دونوں کے چہرے نمایاں کر دیتی ہے۔ جمی کے خشک سُنہرے بال شانوں پر پڑے ہوئے ہیں۔ سینہ کھُلا ہوا سا ہے اور باقی تمام جسم اندھیرے میں ڈوبا ہوا ہے۔ ہٹّل جمی کے عین مقابل ہکّا بکّا سا کھڑا ہے اور اُس کے سامنے اسٹینڈ پر خالی کینوس ہے۔

جمی۔ چلو ہٹّل! چہرے سے شروع کرو۔ اُس کے بعد میں آہستہ آہستہ اپنا گاؤن نیچے سرکاتی چلی جاؤں گی اور اس طرح تم ــــ پُورا نیوڈ ــــ کینوس پہ اُتار لینا ــــ!

ہٹّل:۔ میں نے کہا نا کہ مجھ سے اب یہ نیوڈ نہیں بن سکے گا ــــ"

(وہ جھنجلا کر بڑبڑاتا ہے)

جمی۔ آخر ــــ کیوں نہیں بنے گا ــــ؟"

ہٹّل۔ اندھیرا ــــ بہت گہرا ہو چکا ہے ــــ!

جمی۔ لیکن یہ روشنی جو ہے ــــ!

ہٹّل۔ جسے ہم روشنی سمجھ رہے ہیں وہ روشنی نہیں ہے جمی یہ روشنی کا گوشت ہے جو آہستہ آہستہ ہمیں نگل رہا ہے ــــ!"

جمی۔ اِس وقت فلسفہ مت بگھارو ہٹّل اس ملگجی روشنی میں ہی نیوڈ کا خاکہ بناؤ۔ اِس طرح تمہارے دماغ پر چھایا ہوا سنجیدگی کا غبار بھی چھٹے گا اور نیوڈ بنانے کا موڈ بھی بنے گا ــ!

ہٹّل۔ میں نے کہا نہ کہ مجھے اِس اندھیرے میں کچھ نہیں سوجھ رہا۔

جمی۔ تو پھر تیز روشنی ہونے تک اپنے ذہن پر ہی ننگی تصویر بناؤ۔

ہٹّل۔ جہاں اب ہم کھڑے ہیں وہاں کے اندھیرے نے ہمارے ذہنوں کو مفلوج کر دیا ہے۔ اب یہاں کبھی روشنی نہیں ہوگی جمی' اب یہاں کبھی روشنی نہیں ہوگی ــــ!"

جمی۔ یہ محض تمہارا وہم ہے۔ تمہارے ڈیڈی نے اس پہاڑی پر یہ ویل فرنشڈ عمارت بڑے سائنٹیفک ڈھنگ سے بنوائی ہے۔

ہٹّل۔ اِسی عمارت نے تو آج ہمیں اِس اندھیرے میں ڈھکیلا ہے ــ!

جمی۔ لیکن مجھے یہ عمارت بڑی خوبصورت لگتی ہے۔

ہٹّل۔ بے شک! یہ نئی عمارت دُور سے دیکھنے میں بڑی خوبصورت لگتی ہے۔

جمی۔ اندھیری رات میں جب یہ جہاز نُما حَسین عمارت روشنی سے جگمگاتی ہے تو دُور سے ایسا لگتا ہے جیسے اندھیرے کے سمندر میں روشنی کا جہاز تیر رہا ہے۔

ہٹّل۔ اور مجھے لگتا ہے جیسے یہ "جہاز" اندھیرے کے دلدل میں دھنستا چلا جا رہا ہے ــــ!

جمی۔ آخر آج تمہیں کیا ہو گیا ہٹّل جو تم بالکل ہی رومانٹک ہو کر بات نہیں کر رہے ہو۔ تم نے کہیں آج کچھ زیادہ نشہ تو نہیں کر لیا۔

ہٹّل۔ میں نے آج کوئی نشہ نہیں کیا۔

جمی۔ اِسی لئے میں نے تم سے یہاں آتے ہی کہا تھا کہ ایک کیپسول منہ میں ڈال لو مگر تم نے ایک بھی نہیں لیا اور میں ان دونوں کو ہضم کر گئی۔

ہٹّل۔ میرے سامنے اب اس بیہودہ شئے کا نام مت لو جمی ــــ

جمی۔ کمال ہے ــ اس ایک رات میں آخر تمہیں کیا ہو گیا ہے ــ"

ہٹّل۔ اس ایک ہی رات میں بہت بڑا انقلاب آ گیا جمی!

جمی۔ انقلاب ــــ ہاہاہا ــ! (جمی ایکدم زور سے قہقہہ لگاتی ہے)

شاعر۔ بمبئی

شبل ۔ تم ہنس رہی ہو ۔۔۔! (وہ طیش میں آکر کہتا ہے)
جمی ۔ ہاں! تمہارے منہ سے یہ انقلاب کا لفظ کچھ اچھا نہیں لگتا شبل!
تم تو نیوڈ اور ایل ایس ڈی کی بات کرو۔
شبل ۔ جانتی ہو آج صبح ناروے سے سولہ سال بعد ڈاکٹر اسرار آیا ہے ۔۔۔!
جمی ۔ جانتی ہوں ۔۔۔! (وہ یکدم حقارت سے منہ بنا کر کہتی ہے)
شبل ۔ اور شاید یہ بھی جانتی ہو کہ وہ سولہ سال پہلے اسی شہر میں رہا کرتا تھا۔
جمی ۔ میرے سامنے اس ڈاکٹر کا نام مت لو ۔۔!
شبل ۔ کیوں ۔۔۔؟
جمی ۔ مجھے اس سے شدید نفرت ہے ۔۔!
شبل ۔ یہی تو میں جاننا چاہتا ہوں کہ آخر تمہیں ڈاکٹر سے اتنی نفرت کیوں ہے ۔؟
جمی ۔ اس لئے کہ اس کے میری ممی سے ناجائز تعلقات رہے تھے ۔!
شبل ۔ اس طرح کے تعلقات تو شاید تمہاری ممی کے میرے ڈیڈی سے آج بھی ہیں ۔۔!
جمی ۔ ہاں ۔۔۔ یہ بھی مجھے ۔۔۔ پرسوں رات ہی معلوم ہوا ہے ۔۔!
(یہ کہتے ہی اس کا چہرہ سرخ ہو جاتا ہے)
شبل ۔ لیکن تم جس طرح ڈاکٹر اسرار کے نام سے چونکتی ہو اس طرح میرے ڈیڈی کے نام سے نہیں چونکتی ۔۔!
جمی ۔ ڈاکٹر اسرار کی وجہ سے میرے پاپا نے خودکشی کی تھی ۔!
(وہ مشتعل ہو کر کہتی ہے)
شبل ۔ لیکن میں نے تو یہ سنا ہے کہ تمہارے پاپا ہی اور ڈاکٹر رشید کے جوہر نہیں رہتے اس لئے انہوں نے خودکشی کی تھی۔
جمی ۔ تمہارے پاس کوئی سگریٹ ہے (وہ یکدم اکتا کر تھکی ہوئی سی بولتی ہے)
شبل ۔ نہیں ۔۔۔!
جمی ۔ حشیش ۔۔ گانجہ ۔۔ چرس ۔۔
شبل ۔ یہ میری بات کا جواب نہیں ہے ۔
جمی ۔ میرا نشہ ٹوٹ رہا ہے ۔۔! (وہ بھڑک اٹھتی ہے)
شبل ۔ اور مجھے اب اس نشے سے نفرت ہوگئی ہے۔
شاعر، بمبئی

جمی ۔ تم یہ نیوڈ بناتے ہو یا نہیں ۔۔۔؟ (وہ اسے کھا جانے والی نظروں سے گھور کر کہتی ہے)
شبل ۔ میں نے کہا نہ کہ مجھے اس اندھیرے میں کچھ نہیں سوجھتا ۔!
جمی ۔ تو پھر ۔۔۔ اس اندھیرے سے باہر چلو ۔۔
شبل ۔ اندھیرا ۔۔۔ آج ہر طرف ہے ۔۔۔!
جمی ۔ میرا اس خاموشی میں دم گھٹ رہا ہے ۔
شبل ۔ اور مجھے اس خاموشی میں آج اپنے وجود کا احساس ہو رہا ہے
جمی ۔ میں کہتی ہوں اس تاریک کمرے سے باہر چلو ۔۔
شبل ۔ باہر سوائے شور کے اور کچھ نہیں ہے ۔۔!
جمی ۔ لیکن میں اسی شور میں جینا چاہتی ہوں ۔
شبل ۔ اور میں اس شور سے گھبرا گیا ہوں ۔ اس شور نے میری دھجیاں اڑا دی ہیں۔ میرے ٹکڑے ٹکڑے کر کے مجھے ہواؤں میں بکھیر دیا ہے!"
جمی ۔ تو کیا تم یہاں سے باہر نہیں چلو گے ۔!
شبل ۔ نہیں ۔۔۔!
جمی ۔ اگر تم باہر نہیں جانا چاہتے تو پھر ۔۔۔ یہاں کی الوٹ خاموشی میں کیا کر رہے ہو ۔۔؟
شبل ۔ اپنے کٹے پھٹے وجود کی دھجیاں تلاش کر رہا ہوں ۔۔!
جمی ۔ جانتے ہو جس تہہ خانے میں آج تم اپنی یہ دھجیاں تلاش کر رہے ہو وہاں تمہارا عمر رسیدہ باپ ہر رات ننگی عورتوں کی تصویروں سے آگ کا ایک بھیانک الاؤ سلگاتا ہے ۔!
شبل ۔ اس طرح کے تہہ خانے آج ہر اونچی عمارت کے اندر بنے ہوئے ہیں
جمی ۔ کیا اس طرح کے یہ تہہ خانے تمہارے بزرگوں کی پرانی عمارتوں میں نہیں ہوا کرتے تھے ۔!
شبل ۔ نہیں! اس وقت زندگی صرف نیکی اور بدی کے دو خانوں میں تقسیم تھی۔
جمی ۔ اور ۔۔ آج ۔۔۔۔۔۔؟"
شبل آج کئی خانوں میں بٹے ہوئے آدمی کے اندر بہت سے تاریک تہہ خانے بن گئے ہیں!"
جمی ۔ میں پوچھتی ہوں ۔ تم یہ نیوڈ بنا رہے ہو یا نہیں ۔۔۔۔؟
شبل ۔ اس تانو میں اب تصور بھی نہیں کر سکتا ۔!

جمی ۔ کیوں؟ کیا میرا جسم روزی، بکی اور ریتا کی طرح خوبصورت نہیں ہے ۔۔ ؟

شبل ۔ میرے لئے اب اُن کا خیال بھی اذیت ناک بن چکا ہے ۔!

جمی ۔ میں پوچھتی ہوں کیا تم نے اس طرح کی درجنوں لڑکیوں کی ننگی تصویریں نہیں بنائیں ـــــــــــ؟

شبل ۔ خدا کے لئے ۔ مجھے میرے دُکھ بھرے ماضی کا احساس مت کراؤ ۔۔!

جمی ۔ کیوں؟ کیا اب تک ان عورتوں کی ننگی تصویریں بنانا تمہارا محبوب مشغلہ نہیں رہا ۔۔۔؟

شبل ۔ کبھی تھا لیکن ـــــ مجھے اب اِن کے خیال سے بھی وحشت ہوتی ہے ۔۔!

جمی ۔ اور میرے خیال سے ۔۔!

شبل ۔ مجھے اور زیادہ پریشان مت کرو جمی ۔ خدا کے لئے کپڑے پہن لو ــــــ مجھے آج تمہیں اِس حال میں دیکھ کر وحشت ہو رہی ہے ۔

جمی ۔ اچھا ۔ تو کیا تم نے اِس سے پہلے کبھی مجھے اِس حال میں نہیں دیکھا ـــ میں پوچھتی ہوں کیا یہ وہی جسم نہیں ہے جس نے تمہاری بہت سی سرد راتوں کو اپنے قُرب سے گرمی پہنچائی ہے ۔

شبل ۔ اگر تم اِسی طرح بولتی رہیں تو میں پاگل ہو جاؤں گا جمی! میں پاگل ہو جاؤں گا (یہ کہتے کہتے اُس کی آواز بھرّا جاتی ہے)

جمی ۔ اور اگر تم نے ۔ میری یہ تصویر نہیں بنائی تو میں بھی پاگل ہو جاؤں گی میں اپنی ہتک برداشت نہیں کر سکتی ۔ تمہیں آج یہ نیوڈ بنانا ہو گا ۔! اور اسی وقت بنانا ہوگا ۔ (وہ بپھر جاتی ہے)

شبل ۔ میں نے کہا نہ کہ میں اب تمہاری یہ بیہودہ تصویر اپنے خیالوں میں بھی نہیں بنا سکتا!

جمی ۔ آخر کیوں نہیں بنا سکتے ۔۔!

شبل ۔ میرے لئے اب اِس کا تصوّر بھی گناہ ہے ۔

جمی ۔ یہی تو میں پوچھنا چاہتی ہوں کہ جس تصویر کے لئے تم مجھے مدّتوں مجبور کرتے رہے آخر تم سے آج وہ تصویر کیوں نہیں بن رہی!

شبل ۔ اِس لئے ۔ کہ میرا ـــ یہ احساس اب ہمیشہ کے لئے مر چکا ہے (وہ اچانک ٹوٹ کر کہتا ہے)

جمی ۔ وہی تو میں جاننا چاہتی ہوں کہ آخر آج تمہارے فن کا یہ احساس اچانک کیسے مر گیا ۔

شبل ۔ سُن سکو گی ـــــ!

جمی ۔ اِسی لئے تمہارے سامنے کھڑی ہوں ۔

شبل ۔ تو پھر سُنو! میں ـــ اور تم ــــ سولہ سال پہلے ایک ہی عورت کی کوکھ سے پیدا ہوئے تھے ۔

جمی ۔ بکواس بند کرو ـــــ!

شبل ۔ یہ بکواس نہیں حقیقت ہے جمی! اس راز کو آج ہی ڈاکٹر اسرار نے ڈیڈی اور تمہاری ممّی پر ظاہر کیا ہے ۔۔!

جمی ۔ اور تم سب نے اس ڈاکٹر کی بات پر یقین کر لیا ۔

شبل ۔ اس پر یقین کرو جمی یہ سو فیصدی سچ ہے کہ سولہ سال پہلے ہم دونوں ڈاکٹر اسرار کے کلنک میں پیدا ہوتے ہی ایک دوسرے سے الگ کر دیئے گئے تھے ۔۔!

جمی ۔ اگر یہ سچ ہے تو پھر ممّی نے تمہیں اپنے سے الگ کیوں کیا ۔۔!

شبل ۔ ممّی نے نہیں یہ سب ڈاکٹر اسرار نے کیا تھا اور سب سے پوشیدہ رکھتے ہوئے کیا تھا ۔

جمی ۔ آخر یہ سب اس ڈاکٹر نے کیوں کیا تھا ۔!

شبل ۔ کیونکہ میری شکل ڈاکٹر اسرار سے ملتی تھی اور تمہارے پاپا ۔ تمہاری ممّی اور ڈاکٹر دونوں سے پہلے ہی بدظن تھے ۔ اس لئے ڈاکٹر نے صرف ایکسچینج کا اعلان کر کے مجھے تم سے ہمیشہ کے لئے الگ کر دیا اور ڈاکٹر خود اِس راز کو سینے میں چھپائے یورپ کے اُنہیں ملکوں کی طرف لوٹ گیا جہاں سے وہ ـــــ یہ سب کچھ سیکھ کر آیا تھا ۔

جمی ۔ میں کہتی ہوں بکواس بند کرو (وہ اچانک آپے سے باہر ہو کر چیختی ہے) میں اِس فرسودہ سماج کے تھوپے ہوئے کسی بھی رشتے کو نہیں مانتی ۔ اِس دنیا میں صرف عورت اور مرد ــــ کے جسموں کا ایک واحد اور اٹوٹ رشتہ ہے باقی سب فراڈ ہے ۔ ایکدم بکواس ۔ تم بزدل ہو ۔ تمہاری فنکارانہ صلاحیتوں نے آج اِسی لئے دم توڑا ہے کہ تم نے آج میرے جسم کو ایک تھوپے ہوئے رسمی رشتے کی روشنی میں ننگا دیکھا ہے ۔ تمہیں یہ نیوڈ بنانا ہوگا ورنہ میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گی (وہ بڑھ کر اس کا

پکڑ لیتی ہے۔ شبل خاموش کھڑا ہے)

"میں کہتی ہوں بولو —— جواب دو — کیا تم یہ نیوڈ بنا رہے ہو یا نہیں ——!

(وہ بے تحاشہ زور سے چیختی ہے تو دُور اندھیرے سے ایک اور نسوانی آواز سُنائی دیتی ہے)

عورت۔ جمی —— جمی —— روشنی کی تیز لکیر شبل سے ہٹ کر ایک ادھیڑ لیکن خوبصورت سی پُر وقار عورت کی شخصیت پر مرکوز ہو جاتی ہے اور جمی پلٹ کر حقارت سے اُس عورت کی طرف دیکھتی ہے)

عورت۔ تم —— یہاں اس اندھیرے میں کیا کر رہی ہو

جمی۔ [illegible] سے اپنا ایک نیوڈ بنوا رہی ہوں۔

(وہ بڑے تُرش لہجے میں گویا ہوتی ہے)

عورت۔ تو کیا تم شبل کے سامنے ننگی کھڑی ہو —!

جمی۔ ہاں — کہئے اور کیا پوچھنا چاہتی ہیں —؟"

عورت۔ یہ کہتے ہوئے تمہیں شرم نہیں آتی ——؟"

جمی۔ شرم کس بات کی ——————!

عورت۔ یہی کہ تم میرے سامنے اس طرح کی بکواس کر رہی ہو —!

جمی۔ ڈونٹ پریچ می! Dont preach me
اب آپ کے مُنہ سے یہ الفاظ اچھے نہیں لگتے۔

عورت۔ جانتی ہو میں تمہاری ماں ہوں —!

جمی۔ اور یہ بھی جانتی ہوں کہ میری ماں مجھ سے بھی زیادہ ننگی رہی ہے۔

عورت۔ جمی ——————!" (وہ بوکھلا کر چیختی ہے)

جمی۔ چیخو مت ممی! میں نے پرسوں رات شبل کے ڈیڈی کے پرائیویٹ البم میں آپ کی بے شمار ننگی تصویریں دیکھی ہیں!"

عورت۔ کیا ——————!؟" عورت کا مُنہ کھلا رہ جاتا ہے

جمی۔ ہا۔ں — اور یہی وجہ ہے کہ آج میں انتقاماً شبل کے سامنے آ کر ننگی کھڑی ہو گئی — کیونکہ اب میں یہ بھی جان گئی ہوں کہ میرے پاپا نے خودکشی کیوں کی تھی —! اور کس کی وجہ سے کی تھی

عورت۔ مجھے سمجھنے — کی — کوشش کرو جمی!

(عورت اچانک ٹوٹ کر بڑے دردناک لہجے میں کہتی ہے)

جمی۔ میں اب آپ ہی کو نہیں — شبل کے ڈیڈی اور ڈاکٹر اسرار سے آپ کے رشتوں کی نوعیت کو بھی اچھی طرح سمجھ گئی ہوں۔

عورت۔ یہ تم — کیا — کہہ رہی — ہو — جمی!"

جمی۔ کان کھول کر سُن لو ممی! میں اب سنگھ، ڈیسوزا، رمیش یا پھر کسی بھی لڑکے کے ساتھ کہیں بھی جاؤں نشے میں دُھت، کہیں بھی پھروں' اب آپ مجھ پر اُنگلی نہیں اُٹھائیں گی ——!

(عورت دونوں ہاتھوں سے اپنا مُنہ ڈھانپ کر سسکنے لگتی ہے)

"اور یہ بھی سُن لیجئے کہ اب آپ مجھے پریچ یا کسی طرح کی نصیحت نہیں کریں گی —!"

عورت۔ ایسی باتیں مت کرو جمی! خدا کے لئے کپڑے پہن لو اور میرے ساتھ گھر چلو ——————!

جمی۔ نہیں اب میں اِسی طرح ساری دنیا کا سفر کروں گی۔

عورت۔ ج — م — ی — ل — ا ——"

(یہ کہہ کر — اُس کی ممی بُری طرح پھُوٹ پڑتی ہے —)

جمی۔ گھبرائیے مت ممی! مجھے کوئی کچھ نہیں کہے گا— پتھر تو یہاں ننگے مَردوں کے مارے جاتے ہیں۔ ننگی عورتوں کو تو لوگ اپنے بستروں میں جگہ دیتے ہیں —!

(یہ کہتے ہوئے جمی دروازے کی طرف بڑھ رہی ہے۔ یہاں تک کہ وہ اندھیرے میں غائب ہو جاتی ہے۔)

عورت۔ جمیلا — جمیلا — خدا — کے لئے رک جاؤ جمیلا —!"

(وہ جمی کو پُکارتی ہوئی اُس کے پیچھے جا رہی ہے یہاں تک کہ وہ بھی اندھیرے میں غائب ہو جاتی ہے روشنی کی لکیر شبل کے اُداس چہرے سے ہوتی ہوئی سامنے اسٹینڈ پر رکھے ہوئے اُس کینوس پر جم کر رہ جاتی ہے جس پر سوائے ایک سوالیہ نشان کے اور کچھ نہیں ہے ——)

OO

مکتوبات

○ شمارہ ۱۰ پیشِ نظر ہے۔ گوشہ حامد حسین خاصا معیاری ہے۔ عصری ادیبوں سے تعارف پیش کر کے آپ قارئین پر جو احسان کر رہے ہیں وہ ہر اعتبار سے قابلِ تعریف ہے۔ اگر پسند نہیں آیا تو وہ حامد حسین صاحب کا مضمون "ادب اور حقیقت کا جبر" ہے۔ انگریزی کے اسکالر سے یہ توقع کرنا کہ وہ "حقیقت اور جبر" کی تشریح و وضاحت کرتے ہوئے آگے بڑھتے غالباً خام خیالی نہیں ہے۔ مضمون بڑا اُلجھاؤ کا بُری طرح شکار ہو کر رہ گیا ہے۔ مزید براں 'عنوان' بھی گھسا پٹا ہے' 'ندرت سے یکسر عاری۔ کہیں یہ نہ سمجھا جائے کہ میں اعتراض کر رہا ہوں' میں موصوف کی اُردو خدمت کو مستحسن سمجھتا ہوں۔

پرنسپل الیس۔ الیس کالج ہیلاکنڈی (آسام) ۷۸۸۱۵۱ (ڈاکٹر) تارا چرن رستوگی

○ "شاعر" کا شمارہ ۱۰ نظروں کے سامنے ہے۔ یہ اُردو زبان کا خالص ادبی پرچہ ہے جو اُردو زبان سے دلچسپی رکھنے والوں کی تشنگی دور کرتا ہے۔ کچھ دنوں سے "گوشوں" کے اضافے نے اُس کی اہمیت اور بھی بڑھا دی ہے۔

آپ نے جُرعات میں ادبی پرچوں کی زُبوں حالی کا ذکر اس انداز سے کیا ہے کہ دل بے اختیار ہو اُٹھتا ہے۔ اُن حضرات کا رویّہ واقعی قابلِ افسوس ہے جو اکاڈمیوں کے رکن ہونے کی حیثیت سے اس کانفرنس کی کارروائیوں میں شریک تھے اور اُنھوں نے کانفرنس میں اس موضوع پر کوئی بحث نہیں کی اور صرف "نشستند و گفتند و برخواستند" تک ہی خود کو محدود رکھا۔ حالانکہ وہ چاہتے تو اس موضوع کو زیرِ بحث لا سکتے تھے۔ حالانکہ یہ موضوع ایجنڈے میں تھا۔

شفیقہ فرحت کا "ڈاکٹر سید حامد حسین ۔ سوتا جاگتا آدمی" ابراہیم یُوسف کا "ڈاکٹر سید حامد حسین سے ایک ملاقات" بہت ہی پُر مغز ہے۔ پڑھنے والوں کو حامد حسین کی پُوری شخصیت، اُن کی شکل و صورت، تعلیم و عادات اور اُن کی مصروفیات کا علم ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر اخلاق اثر کا مقالہ "ڈاکٹر سید حامد حسین اور اُن کی ادبی کاوشیں" ریسرچ کرنے والوں کے لئے بہت ہی اچھا مواد فراہم کرتا ہے۔ کہانیوں میں عائشہ صدیقی کی کہانی "خشک پتہ" روایت پرستی کی حدود سے باہر ہے اور زندگی کی ٹھوس حقیقتوں کی پُوری پُوری نقاب کشائی کرتی ہے۔ حامد صوری شاہ کی کہانی "گھر باہر" جسے رفعت نواز نے ترجمہ کر کے قارئین کی خدمت میں پیش کیا ہے بہت اچھی ہے۔ کہانی سماج کے سفلا پن اور جھوٹی روایت پرستی کے تابوت میں آخری کیل ثابت ہوئی ہے۔ رونق دکنی سیمابی کی شاعری بھی

"زمین" پڑھنے والوں کی دلچسپی بدستور قائم رکھتی ہے۔ جناب عبدالقوی دسنوی بھی لائقِ ستائش ہیں جنھوں نے مہدی افادی کو ایک خط نگار کی حیثیت سے متعارف کیا۔ اُن کے مضمون سے مہدی افادی کی انفرادیت بحیثیت خط نگار مکمل طور پر واضح ہو جاتی ہے اور ہر پڑھنے والے کو اُن کی رنگا رنگ شخصیت سے دلچسپی پیدا ہونے لگتی ہے۔

غزلوں میں محمد عثمان عارف نقشبندی اور اقبال توصیفی کی غزلیں خاصکر بہت پسند آئیں۔ اقبال توصیفی کے یہ اشعار تو بیحد پسند آئے

وہ کاغذی سہی مگر اچھے لگے مجھے
ہر چند اُن گلوں میں نہ بُو تھی نہ باس تھی

کیا بات تھی نہ جانے جو دل ہی میں رہ گئی
کیوں اُن دنوں بہت ترے ملنے کی آس تھی

وہ آنکھیں کہہ رہی تھیں ہمیں چُوم لے کوئی
وہ میرے پاس آئی تو کتنی اُداس تھی

نمبر ۱۱۔ کولوٹولہ اسٹریٹ۔ کلکتہ ۷۳ رشید پردیسی

○ "شاعر" کا تازہ شمارہ موصول ہوا۔ دلچسپی سے پڑھوں گا۔ یونس اگاسکر کا مقالہ بہت جامع مقالہ ہے۔

منٹولہ۔ آگرہ ۲۸۲۰۰۳ (یوپی) ل۔ احمد۔ اکبرآبادی

○ "شاعر" کا تازہ شمارہ ملا۔ شروع سے آخر تک پڑھا۔ آپکا اداریہ "اُردو ادبی ماہناموں کی بدقسمتی" واقعی توجہ طلب ہے۔ اس وقت جبکہ ریاستی اُردو اکاڈمیاں' لاکھوں رُوپیوں کا کھیل کھیل رہی ہیں' چند پُرانے ادبی ماہناموں کی حالت ناگفتہ بہ ہے۔ اُردو اکاڈمیوں کی ان معیاری ادبی ماہناموں سے عدم دلچسپی' قابلِ مذمت نہیں تو افسوسناک ضرور ہے۔

ڈاکٹر حامد حسین نے "ادب اور حقیقت کا جبر" میں سمندر کو کوزے میں سمونے کی کوشش کی ہے۔ اُنھوں نے ایک جگہ کہا ہے . . . "لیکن یہ سمجھنا صحیح نہیں ہے کہ ان حادثات کی جُوں کی تُوں عکاسی ہی کا نام ادب کی تخلیق ہے" زندگی اور تجربات کی ہو بہو عکاسی ادب میں بھی ممکن ہو سکتی ہے۔ انھیں موضوعات پر گفتگو کرتے ہوئے H. games ایک جگہ کہتے ہیں If There are exact sciences There are also exact arts

افسانہ "خشک پتہ" اپنی خوبیوں کے باوجود مجھے زیادہ متاثر نہ کر سکا۔ رونق دکنی کی کوشش بہت کامیاب ہے۔

۲۸ محمد علی ۸۲۸ لے بلگاچیا روڈ۔ کلکتہ ۳۷

نقد و نظر

تبصرے کے لئے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں

مولانا محمد علی: شخصیت اور خدمات

- مرتب: نظر برنی
- ناشر: ادبی سنگم جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵
- قیمت: بیس روپے
- صفحات: ۲۲۴

یہ کتاب جس کو جناب نظر برنی نے بڑے سلیقے اور شائستگی سے مرتب کیا ہے
ور قوم پرست اور شہید وطن مولانا محمد علی کی شخصیت اور فن سے گفتگو کرتی ہے
۲۴ صفحات کی اس تالیف میں جو مضامین اور مقالے شامل ہیں وہ نہایت
ن دار ہیں۔ مرتب حامد نے محنت اور جانفشانی سے اُن کی ادبی اور غیر ادبی خصوصیات
وشنی ڈالی ہے اور مقالات بھی مولانا کی ذات اور صفات کے گرد گھومتے ہیں۔
مولانا محمد علی اُن لوگوں میں تھے جو اپنے عہد میں نابغۂ عصر کہلانے کے مستحق
ھے۔ اُنھیں تحریر اور تقریر پر قدرت حاصل تھی۔ انگریزی پر اہلِ زبان کا سا عبور تھا
زاج میں لطیف قسم کا مزاح تھا جس نے اُن کے علمی جوہر کو اور زیادہ چمکا دیا تھا
ندوستانی باشندوں کو غلامی سے متنفر کرنے اور غیر ملکی حکومت کے خلاف
تحد کرنے میں اُن کا بہت بڑا حصّہ ہے۔ وہ سچے وطن دوست تھے۔ اُن کا دل
جذبات حرّیت سے معمور تھا، صحافت میں کمال حاصل تھا۔ اُن کے قلم سے
نکلے ہوئے اداریوں میں گرمی، بیباکی اور سیاسی بصیرت ہوا کرتی تھی۔ وہ
بیباک فطرت کے مالک تھے۔ اسی لئے مخالفین نے اُن کے مقابلے میں
مضبوط محاذ بنا لیا تھا۔ وہ عزم و استقلال سے اُن کے سامنے سینہ سپر
ہے۔ جوہر کے کارنامے ایسے نہیں جن کو بھلایا جا سکے۔ ضرورت ہے کہ
ن کی وارداتِ حیات کا بار بار مطالعہ کیا جائے تاکہ سینہ میں جلتے ہوئے
اغوں کی لو مدھم نہ ہونے پائے اور آزادی کا آفتاب ہمیشہ ارضِ ہند پر
چمکتا رہے۔ محمد علی اپنے کارناموں میں ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ شہیدوں کو
ھی موت نہیں آیا کرتی۔ مذہبی نقطۂ نظر سے وہ خوش نصیب تھے۔
ر ایسی خاکِ پاک میں آرام کی دائمی نیند سونے کا موقع ملا جو ہر شخص کو
حاصل نہیں کیا کرتی۔

نظر برنی قابلِ ستائش ہیں کہ ایک زندۂ جاوید ہستی پر اتنے مفید اور
قابلِ مطالعہ مضامین جمع کرکے اُنھیں کتابی صورت میں یکجا کر دیا۔
بصیرت افروز مضامین جمع کرکے اُنھیں کتابی صورت میں یکجا کر دیا۔

کتاب عمدہ کاغذ پر دیدہ زیب گیٹ اپ کے ساتھ چھپی ہے۔ سرورق پر
مولانا کی تصویر ہے جو موت کی نفی کرتی محسوس ہوتی ہے۔ ٹائیٹل کے
چوتھے صفحہ پر شیخ عبداللہ، چیف منسٹر کشمیر کا فوٹو ہے، مرتب کی
تصویر بھی شامل ہے۔ نظر برنی کی یہ خصوصیت قابلِ تعریف ہے کہ
وہ خاموش بیٹھنے کے عادی نہیں۔ ہمیشہ علمی و عملی مضامین سے تحریک اور
جنبش پیدا کرتے رہتے ہیں۔ یقین ہے کہ مولانا محمد علی: شخصیت
اور خدمات" کا علمی حلقوں میں پُرجوش خیر مقدم ہوگا اور کوئی لائبریری
اس سے خالی نہ رہے گی۔

کوثر سیانہ پوری

سائے اور ہم سائے

- یوسف ناظم
- زندہ دلانِ حیدر آباد، معظم جاہی مارکیٹ حیدر آباد ۲
- قیمت: چھے روپے ضخامت ۱۴۴ صفحات

شیکسپیر نے چھے سو سال قبل کہا تھا۔ Brevity is the soul of wit موجودہ دَور کے مزاح نگاروں میں یُوسف ناظم نے اس
قول کو خوب اچھی طرح ذہن نشین کر رکھا ہے۔ نتیجہ میں اُن کی ہر تحریر مختصر
اور پُر اثر ہوتی ہے۔ یوسف ناظم کے مضامین کو پھلجھڑیوں سے تشبیہ
دی جا سکتی ہے۔ جس طرح پھلجھڑی تیزی سے جلتی اور دیکھنے والوں کی آنکھوں
میں چمک پیدا کرتی ہوئی یکایک بجھ جاتی ہے لیکن تصوّر کی آنکھوں سے کچھ دیر
تک جلتا ہوا ہی دکھتی ہے۔ اسی طرح یوسف ناظم کے انشائیے بھی اچانک
اختتام تک پہنچتے اور دیرپا تاثر چھوڑ جاتے ہیں۔

اِدھر یوسف ناظم مسلسل زندوں اور مُردوں پر شخصی خاکے لکھ رہے ہیں۔
اُن کی رفتار دیکھ کر لگتا ہے کہ وہ ایک ہاتھ سے زندوں پر اور دوسرے ہاتھ
سے مُردوں پر لکھتے ہوں گے۔ "سائے اور ہم سائے" میں جن شخصیتوں کا ذکر
ہے اُن میں سے چند مضامین لکھے جانے کے بعد مرحومین میں شامل ہو چکی ہیں۔
اِس لحاظ سے کتاب کی دلچسپی میں اضافہ ہو گیا ہے۔ کیونکہ ہمارا یہ وطیرہ سا ہے
کہ جب لوگ بقول میر بہت دُور بستیاں بسا لیتے ہیں تو ہم اُن کے بارے میں
سب کچھ جاننے کے لئے بے تاب ہو جاتے ہیں۔

"سائے اور ہم سائے" میں طنز و مزاح کے وہ سارے حربے استعمال ہوئے
ہیں جن سے یوسف ناظمیت" عبارت ہے۔ یعنی بات میں بات پیدا کرنا، ایک

باقی صفحہ ۳۰ پر دیکھئے

رفتار

علمی ادبی اور تہذیبی خبریں

یونس اگاسکر کی اولین تصنیف

مراٹھی ادب کا مطالعہ کی شاندار تقریب اجرا

منگل ۱۱ جنوری کی شام کو مہاراشٹر کالج بمبئی کے وسیع و عریض ہال میں مراٹھی ادب پر اوّلین اردو کتاب پروفیسر یونس اگاسکر کی تالیف "مراٹھی ادب کا مطالعہ" کی تقریب رسم اجرا مہاراشٹر اسٹیٹ اردو اکاڈمی، مہاراشٹر کالج آف آرٹس اینڈ سائنس اور نقشِ کوکن پبلیکیشن ٹرسٹ کے زیر اہتمام منعقد ہوئی۔ تقریب کی صدارت اور رسم اجرا جناب اعجاز صدیقی (مدیر رسالہ "شاعر") نے انجام دی۔ مقررین میں پدم شری علی سردار جعفری، مشہور ڈرامانگار وِدیادھر گوکھلے (مدیر مراٹھی اخبار "لوک ستا") مراٹھی کے نامور شاعر نارائن سُروے، جناب یوسف ناظم اور پروفیسر عرفان فقیہہ شامل تھے۔ اس جلسہ میں ادب نواز اور سماجی اکابرین نے شرکت کی۔ اردو، مراٹھی، انگریزی اور گجراتی کے نامہ نگار، ریڈیو اور ٹی۔وی کے نمائندے بھی موجود تھے۔ اناؤنسنگ کے فرائض پروفیسر نصیر الدین نے انجام دئیے۔

تقریب کے کنوینر مہاراشٹر کالج کے پروفیسر عبد القدوس منشی نے اپنی استقبالیہ تقریر میں کہا۔

"جناب یونس اگاسکر نے ایسے موضوع کو چھوا ہے جو ابھی تک تشنہ تھا۔ یہ ایک نیک آغاز ہے۔ مراٹھی اور اردو کا رشتہ بہت پرانا اور قدیم ہے۔ انھوں نے یہ کتاب تالیف کر کے مراٹھی اور اردو کو قریب تر لانے اور اس رشتے کو مستحکم بنانے کی جانب ایک بنیادی قدم اُٹھایا ہے۔

مہمان خصوصی جناب علی سردار جعفری نے اپنی تقریر میں کہا کہ یونس اگاسکر صاحب محض ایک قاصد نہیں ہیں جو عاشق کا خط محبوب تک پہنچاتا ہے بلکہ وہ خود عاشق ہیں اُن کا یہ کام کسی طرح تخلیقی کام سے کم اہمیت کا نہیں۔ انھوں نے بڑا کرم کیا کہ مراٹھی ادب کو اردو سے رُوشناس کرانے کے لئے یہ کتاب تالیف کی۔ اس سے ہندوستان کی زبانوں میں جذباتی ہم آہنگی پیدا ہونے میں مدد ملے گی۔

شری وِدیادھر گوکھلے نے اپنی مراٹھی تقریر کے دوران کہا کہ اردو قارئین کو مراٹھی ادب کی تاریخ سے متعارف کرانے والی یہ اوّلین کوشش علمی انداز لئے ہوئے ہے یونس اگاسکر کا یہ اقدام قابلِ قدر ہے۔

مراٹھی کے مشہور شاعر نارائن سُروے نے کہا "میں یونس اگاسکر صاحب کی اِس تصنیف کے علاوہ اُن کے دیگر ادبی کارناموں پر نظر رکھتا ہوں۔ اس سے قبل اُن کی لکھی ہوئی کہانیاں اور مشہور اُردو ادیبوں سے لئے گئے انٹرویو بھی میری نظر سے گذرے ہیں۔ اس بات کی ضرورت ہے کہ ان انٹرویوز کو مراٹھی میں ترجمہ کر کے مراٹھی قارئین کو اُردو کے ان ادیبوں اور اُن کے کارناموں سے متعارف کرایا جائے۔"

جناب یوسف ناظم نے یونس اگاسکر صاحب کا قلمی مزاحیہ خاکہ "ادبی نوشتہ" پیش کیا جو کافی پسند کیا گیا اور سامعین ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو گئے۔ یونس اگاسکر کے قریبی دوست اور بچپن کے ساتھی پروفیسر عرفان فقیہہ (شعبہ عربی۔ مہاراشٹر کالج) نے یونس صاحب کے متعلق اپنا تاثراتی مضمون پڑھا۔ جناب اعجاز صدیقی نے صدارتی تقریر کی اور یونس اگاسکر کے کام کو سراہا۔

آخیر میں یونس اگاسکر صاحب نے مختصر سی تشکر آمیز تقریر کی۔ مہاراشٹر اسٹیٹ اُردو اکاڈمی کے ایکزیکیٹو آفیسر جناب سردار عرفان کے شکریہ کے ساتھ جلسہ برخاست ہوا۔ جلسہ کے اختتام پر اُستاد مرتضیٰ خاں کی غزل سرائی کا دلکش پروگرام ہوا۔

"مراٹھی ادب کا مطالعہ" نقشِ کوکن پبلیکیشن ٹرسٹ بمبئی کے زیر اہتمام شائع ہوئی ہے۔ اس کا پیش لفظ عالیجناب ڈاکٹر رفیق زکریا اور مقدمہ مراٹھی کے اُردواں ادیب و مترجم پروفیسر را۔ بھی جوشی نے تحریر فرمایا ہے۔

منشی پریم چند کی بیوہ کا انتقال

الہ آباد ۱۲ دسمبر: ہندی کے مشہور ادیب منشی پریم چند کی بیوہ [illegible] رانی دیوی کا کل رات یہاں انتقال ہو گیا اُن کی عمر ۸۸ سال تھی۔

اُن کے پسماندگان میں دو لڑکے اور ایک لڑکی اور کئی پوتے پوتیاں اور پڑپوتے پوتیاں شامل ہیں۔

زرِ سالانہ ختم ہونے کی اطلاع

اِس حلقے میں سرخ نشان کے معنی یہ ہیں کہ آپ کا سالِ خریداری دسمبر ۱۹۸۲ء میں ختم ہو چکا ہے۔ از راہِ کرم سالِ رواں کے لئے ۲۴ روپے جلد بھیج دیجئے۔ اُمید کہ آپ تجدید خریداری سے فیض یاب ہوں گے۔ اگر منی آرڈر نہ بھیج سکیں تو دفتر کو وی۔ پی بھیج دینے کی ہدایت کریں۔ زرِ سالانہ وصول نہ ہونے کی صورت میں "شاعر" کی روانگی روک دی جائے گی۔

پرنٹر پبلشر مالک اعجاز صدیقی نے یونیورسل فائن آرٹ لیتھو پریس ۲۲ تورو نجا اسٹریٹ ٹھاکر دوار بمبئی ۲ میں چھپوا کر وہاں سے شائع کیا۔